آپ کی لائبریری

اُردو افسانے کا انسائیکلوپیڈیا

اُردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء — ۲۰۰۹ء

مرزا حامد بیگ



اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء-۲۰۰۹ء

(اردو افسانے کی تاریخ مع انتخاب)



مرزا احامد بیگ

عالمی میڈیا
دہلی

نام کتاب: اردو افسانے کی روایت
مصنف: مرزا حامد بیگ
اشاعت: فروری 2014
مطبع: مونی پرنٹنگ پریس۔ دہلی
قیمت: Rs:250/-
ناشر: عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمیٹیڈ
دہلی۔110091

ISBN: 978-93-84088-31-6

AALAMI MEDIA PVT. LTD

1/1, Kirti Apartments Mayur Vihar-1

Delhi-110091

Ph:9717474307 E-mail: rehmanbey@gmail.com

اُردو کے پہلے افسانہ نگار
راشد الخیری کے نام

اس کتاب کی خصوصی قیمت عالمی اردو ٹرسٹ کی فروغ اردو و ترویج اردو کتب کی پالیسی کے
تحت دیئے گئے عطیہ رعایت (Subsidy) کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔

ترتیب

جلد اول

عرضِ ناشر 13

ابتدائیہ — مرزا حامد بیگ 15

داستان نگاری کی روایت اور اُردو افسانہ 25
میر باقر علی داستان گو، عشرت لکھنوی اور خواجہ ناصر نذیر فراق سے اگلا قدم

اُردو کا پہلا افسانہ: ایک تعارف 33
تحقیق کی سطح پر غلط فہمیوں کا ازالہ

اُردو کے اوّلین افسانہ نگار 41
راشد الخیری، علی محمود، درد مند اکبر آبادی، وزارت علی اوریئی، حکیم یوسف حسن، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش
پریم چند، محمد علی ردولوی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، مہاشہ سدرشن، قاضی عبدالغفار

لخت لخت آوازیں: بازگشت، باز دید 65
حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، اختر اورینوی، اعظم کریوی، محمد مجیب، جلیل قدوائی، اوپندر ناتھ اشک
حیات اللہ انصاری، اختر انصاری دہلوی، سہیل عظیم آبادی اور اشرف صبوحی دہلوی

نزول رومان پسندی کی لہر 72
مجنوں گورکھ پوری، مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی اور میرزا ادیب

''انگارے گروپ'' کا باغیانہ لحن 79
سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر

ترقی پسند تحریک 83
ملک راج آنند، دیویندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، کرشن چندر، عزیز احمد
عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، شمشیر سنگھ نرولا اور بلونت سنگھ

نفسیات کا ورود 93
سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی، سید فیاض محمود، آغا بابر، رحمان مذنب
ابوالفضل صدیقی، خان فضل الرحمٰن اور سید رفیق حسین

لخت لخت آوازیں 102
غلام عباس، کوثر چاند پوری، شفیق الرحمٰن اور قدرت اللہ شہاب

اُردو افسانہ آزادی کے بعد 105
کرتار سنگھ دُگل، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، محمد خالد اختر، دیوندر اسر، انتظار حسین، بانو قدسیہ

اُردو افسانے کا نیا لحن 112
سریندر پرکاش، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، انور سجاد، بلراج مین را، خالدہ حسین، منشا یاد،
رشید امجد، بلراج کومل، اسد محمد خاں اور مرزا حامد بیگ

اُردو افسانہ: پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر 124
کل، آج اور آنے والے کل کے افسانہ نگاروں کا جائزہ

اُردو افسانے کے اسالیب بیان 177

داستان سے افسانے تک کا عبوری دور: انتخاب 195

لال قلعہ کی ایک جھلک	خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی (۱۸۶۵ء۔۱۹۳۳ء)	197
بیگموں کی چھیڑ چھاڑ	خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی	202
گھنشہ بیگ	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی (پ: ۱۸۶۸ء)	205
دربار دہلی کی کنکوا بازی	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی	208

فقیر کا تکیہ	میر باقر علی داستان گو (پ:۱۸۶۹ء)	211
ایک چاندنی رات کا نظارہ: بہار کشمیر میں	آفتاب احمد (مطبوعہ:۱۹۰۲ء)	214
اُردو کے اوّلین افسانے: انتخاب (۱۹۰۳ء۔۱۹۱۴ء)		217
نصیر اور خدیجہ (مخزن، لاہور، دسمبر ۱۹۰۳ء)	راشد الخیری	219
تصویرِ غم (مخزن لاہور، فروری ۱۹۰۴ء)	دردمند اکبر آبادی	222
ایک پرانی دیوار (مخزن لاہور، اپریل ۱۹۰۴ء)	علی محمود	224
بدنصیب کا لال (مخزن لاہور، اگست ۱۹۰۵ء)	راشد الخیری	227
غربت و وطن (اُردوئے معلیٰ، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۰۶ء)	سجاد حیدر یلدرم	231
دوست کا خط (مخزن لاہور، اکتوبر ۱۹۰۶ء)	سجاد حیدر یلدرم	233
نابینا بیوی (مخزن لاہور، دسمبر ۱۹۰۷ء)	سلطان حیدر جوش	235
عشقِ دنیا اور حُبِ وطن (زمانہ، کانپور، اپریل ۱۹۰۸ء)	پریم چند	238
دنیا کا سب سے انمول رتن (مشمولہ: سوزِ وطن، جون ۱۹۰۸ء)	پریم چند	245
گناہ کا خوف (تحریر: تگ بجگ ۱۹۰۹ء)	محمد علی ردولوی	250
نینی تال (ادیب، الہ آباد، جولائی ۱۹۱۰ء)	علی محمود	254
بہرا شہزادہ (ہمایوں، لاہور، جنوری ۱۹۱۳ء)	خواجہ حسن نظامی	257
ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر (تمدن، دہلی، جنوری ۱۹۱۳ء)	نیاز فتح پوری	259
پھول (مخزن لاہور، جنوری ۱۹۱۴ء)	مہاشہ سُدرشن	261
اُردو افسانے کے سو سال: انتخاب		267
(ترتیب میں تقدیم کی بنیاد افسانہ نگار کا اوّلین مطبوعہ افسانہ ہے)		
راشد الخیری (۱۸۶۸ء۔۱۹۳۶ء)		269
تیم کی سنگدلی	راشد الخیری	280
سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۳ء)		282
چڑیا چڑے کی کہانی	سجاد حیدر یلدرم	286
سلطان حیدر جوش (۱۸۸۶ء۔۱۹۵۳ء)		291
طوقِ آدم	سلطان حیدر جوش	295

پریم چند (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء)		303
کفن	پریم چند	314
محمد علی ردولوی (۱۸۸۶ء۔۱۹۵۳ء)		320
تیسری جنس	محمد علی ردولوی	323
خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۵ء)		329
شہزادی کی بپتا	خواجہ حسن نظامی	340
نیاز فتح پوری (۱۸۸۴ء۔۱۹۶۶ء)		342
کیوپڈ و سائکی	نیاز فتح پوری	347
مہاشہ سدرشن (۱۸۹۵ء۔۱۹۶۷ء)		369
وزیر عدالت	مہاشہ سدرشن	373
اعظم کریوی (۱۸۹۸ء۔۱۹۵۴ء)		376
اچھوت	اعظم کریوی	379
حامد اللہ افسر (۱۸۹۵ء۔۱۹۷۴ء)		383
میوہ فروش	حامد اللہ افسر	386
مسز عبدالقادر (۱۸۹۸ء۔۱۹۷۶ء)		389
بلائے ناگہاں	مسز عبدالقادر	392
جلیل قدوائی (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۶ء)		399
پتنگے	جلیل قدوائی	403
مجنوں گورکھپوری (۱۹۰۴ء۔۱۹۸۸ء)		407
سمن پوش	مجنوں گورکھ پوری	411
علی عباس حسینی (۱۸۹۷ء۔۱۹۶۹ء)		421
میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	425
محمد مجیب (۱۹۰۲ء۔۱۹۸۵ء)		429
کیمیاگر	محمد مجیب	434
اوپندر ناتھ اشک (۱۹۱۰ء۔۱۹۹۶ء)		441
پلنگ	اوپندر ناتھ اشک	447
اشرف صبوحی دہلوی (۱۹۰۵ء۔۱۹۹۰ء)		457

موئے آکا	اشرف صبوحی دہلوی	463
رشید جہاں (۱۹۰۵ء۔۱۹۵۲ء)		470
نئی بہو کے نئے عیب	رشید جہاں	473
غلام عباس (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۲ء)		476
آنندی	غلام عباس	481
عزیز احمد (۱۹۱۳ء۔۱۹۷۸ء)		491
آبِ حیات	عزیز احمد	504
سید فیاض محمود (۱۹۰۶ء۔۱۹۹۴ء)		518
کام چور	سید فیاض محمود	520
حیات اللہ انصاری (۱۹۱۲ء۔۱۹۹۹ء)		526
آخری کوشش	حیات اللہ انصاری	529
احمد علی (۱۹۱۰ء۔۱۹۹۴ء)		546
ہماری گلی	احمد علی	551
راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵ء۔۱۹۸۴ء)		561
لاجونتی	راجندر سنگھ بیدی	566
حجاب امتیاز علی (۱۹۰۸ء۔۱۹۹۹ء)		575
صنوبر کے سائے	حجاب امتیاز علی	579
	جلد دوم	
اختر اورینوی (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۷ء)		585
کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی	588
سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء۔۱۹۵۵ء)		610
نیا قانون	سعادت حسن منٹو	618
اختر حسین رائے پوری (۱۹۱۲ء۔۱۹۹۲ء)		626
تلاش گم شدہ	اختر حسین رائے پوری	630
اختر انصاری دہلوی (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۸ء)		634
لو ایک قصہ سنو!	اختر انصاری دہلوی	639
ابوالفضل صدیقی (۱۹۰۸ء۔۱۹۸۷ء)		652
جوالا مکھ	ابوالفضل صدیقی	655

ملک راج آنند (۱۹۰۵ء۔۲۰۰۴ء)		665
فطرت کا دل	ملک راج آنند	669
احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۴ء)		674
لارنس آف تھلیبیا	احمد ندیم قاسمی	682
کرشن چندر (۱۹۱۳ء۔۱۹۷۷ء)		690
کالو بھنگی	کرشن چندر	697
ممتاز مفتی (۱۹۰۵ء۔۱۹۹۵ء)		707
آپا	ممتاز مفتی	712
کوثر چاندپوری (۱۹۰۸ء۔۱۹۹۰ء)		720
میرا پیشہ	کوثر چاندپوری	724
میرزا ادیب (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء)		731
حکایہ جنوں	میرزا ادیب	736
خواجہ احمد عباس (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۸ء)		765
میری لین کی پتلون	خواجہ احمد عباس	770
عصمت چغتائی (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۱ء)		784
مغل بچہ	عصمت چغتائی	788
قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۷ء۔۱۹۸۶ء)		793
ماں جی	قدرت اللہ شہاب	796
سید رفیق حسین (۱۸۹۴ء۔۱۹۴۶ء)		804
گوری ہو گوری	سید رفیق حسین	806
دیوندر ستیارتھی (۱۹۰۸ء۔۲۰۰۳ء)		812
رفوگر	دیوندر ستیارتھی	815
شفیق الرحمٰن (۱۹۲۰ء۔۲۰۰۰ء)		832
ننانوے ناٹ آؤٹ	شفیق الرحمٰن	836
محمد حسن عسکری (۱۹۱۹ء۔۱۹۷۸ء)		854
چائے کی پیالی	محمد حسن عسکری	858
بلونت سنگھ (۱۹۲۰ء۔۱۹۸۶ء)		879

جگا	بلونت سنگھ	883
کرتار سنگھ دگل (۱۹۱۸ء۔)		897
پھول توڑنا منع ہے	کرتار سنگھ دگل	903
شمشیر سنگھ نرولا (۱۹۱۵ء۔)		908
گئوہتیا	شمشیر سنگھ نرولا	911
اشفاق احمد (۱۹۲۵ء۔۲۰۰۴ء)		919
گڈریا	اشفاق احمد	923
قرۃ العین حیدر (۱۹۲۶ء۔۲۰۰۷ء)		949
فوٹوگرافر	قرۃ العین حیدر	954
آغا بابر (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۸ء)		959
گلاب دین چٹھی رساں	آغا بابر	962
محمد خالد اختر (۱۹۱۹ء۔۲۰۰۲ء)		978
لالٹین	محمد خالد اختر	981
رحمان مذنب (۱۹۱۵ء۔۲۰۰۰ء)		1000
مُکھی جان	رحمان مذنب	1004
سُریندر پرکاش (۱۹۳۰ء۔۲۰۰۲ء)		1017
رونے کی آواز	سُریندر پرکاش	1020
جوگندر پال (۱۹۲۵ء۔)		1024
باہر کا آدمی	جوگندر پال	1028
غیاث احمد گدی (۱۹۲۸ء۔۱۹۸۶ء)		1033
سائے اور ہمسائے	غیاث احمد گدی	1035
دیوندر اسر (۱۹۲۸ء۔۲۰۱۲ء)		1057
مُردہ گھر	دیوندر اسر	1061
انتظار حسین (۱۹۲۳ء۔)		1067
آخری آدمی	انتظار حسین	1072
انور سجاد (۱۹۳۴ء۔)		1077
گائے	انور سجاد	1080

بانو قدسیہ (۱۹۲۸ء۔)		1085
انتر ہوت اُداسی	بانو قدسیہ	1088
بلراج مین را (۱۹۳۵ء۔)		1102
وہ	بلراج مین را	1105
خان فضل الرحمٰن (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۵ء)		1111
زبسی	خان فضل الرحمٰن	1114
خالدہ حسین (۱۹۳۸ء۔)		1119
پرندہ	خالدہ حسین	1121
منشا یاد (۱۹۳۷ء۔۲۰۱۲ء)		1127
راستے بند ہیں	منشا یاد	1130
رشید امجد (۱۹۴۰ء۔)		1135
ڈوبتی پہچان	رشید امجد	1139
بلراج کومل (۱۹۲۸ء۔)		1143
کنواں	بلراج کومل	1146
اسد محمد خاں (۱۹۳۲ء۔)		1152
ترلوچن	اسد محمد خاں	1155
مرزا حامد بیگ (۱۹۴۹ء۔)		1158
مغل سرائے	مرزا حامد بیگ	1162
افسانہ نگار اور اُن کے افسانوی مجموعے	مرزا حامد بیگ	1166
تصاویر، عکس تحریر، آٹوگراف	مرزا حامد بیگ	1177

عرضِ ناشر

ممتاز افسانہ نگار اور صاحبِ نظر نقاد مرزا حامد بیگ کی کتاب ''اُردو افسانے کی روایت'' (۱۹۰۳ء۔۲۰۰۹ء) اُردو افسانے کا صد سالہ انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اُردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ، جس میں اُردو کے پہلے افسانے کی واضح نشاندہی کرنے اور اُردو کے اوّلین افسانہ نگاروں کا جامع تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ رسمی اور اکتسابی تحقیق و تنقید کی اُڑائی ہوئی گرد کو صاف کر کے بہت سے جینوئن افسانہ نگاروں کی پہچان ممکن بنائی گئی ہے۔

داستان اور قصوں سے افسانے تک کے عبوری دور سے متعلق خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، میر باقر علی داستان گو اور آفتاب احمد کی مساعی کی داد دی گئی ہے۔ نیز ادبی تحاریک اور موضوعی حوالوں سے مختلف ادوار قائم کر کے افسانوں کے جائزہ کے ساتھ شاملِ انتخاب افسانہ نگاروں کی سینیارٹی کا تعین اُن کے اوّلین مطبوعہ افسانوں کے سالِ اشاعت کے حوالے سے کر دیا گیا ہے۔

شاملِ انتخاب افسانہ نگاروں کے سوانحی خاکوں میں مصدقہ تاریخ پیدائش و وفیات ناموں، تعلیمی کوائف، اوّلین تحریروں اور اوّلین مطبوعہ افسانوں کی نشاندہی، اعزازات کی تفصیل، تصاویر، عکس تحریر، آٹوگراف اور نظریۂ فن کی شمولیت نے ''اُردو افسانے کی روایت'' کو انسائیکلو پیڈیائی وقار سے ہم کنار کر دیا ہے۔

اِس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۱ء میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا تھا۔ گزشتہ اٹھارہ برس میں کئی افسانہ نگار رخصت ہوئے، کئی ایک نے اپنی شناخت مستحکم کی اور اُن کا نیا کام سامنے آیا۔ یوں بہت سے اضافہ جات کے ساتھ اب اس کتاب کا Revised ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے، اِس احساسِ افتخار کے ساتھ کہ اس کتاب میں شامل افسانہ نگاروں سے متعلق کوائف افسانہ نگاروں سے براہ راست یا افسانہ نگاروں کے متعلقین سے حاصل کردہ ہیں۔ نیز اِن حاصل کردہ معلومات کو دستاویزی سطح پر بھی جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو افسانہ اور افسانہ نگاروں سے متعلق پوری دنیا میں ریسرچ اسکالرز اور ناقدین اس حوالہ جاتی دستاویز میں فراہم کردہ معلومات پر بھروسہ کرتے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد نے شائع کیا۔ دو سال قبل اس کتاب کو ہندوستان میں شائع کرنے کی مرزا حامد بیگ صاحب سے اجازت لے لی گئی۔ اس کتاب کا ہندوستانی پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ادارہ

ابتدائیہ

اُردو افسانے کی زوال پذیری کی اوّلین نشاندہی، محمد حسن عسکری نے اُس وقت کی جب وہ خود پریم چند اور اُن کے مروجہ اخلاقی اقدار کے سلسلے میں راسخ العقیدہ ہونے پر ضرب کاری لگا چکے تھے، پھر انتظار حسین نے کہا کہ اُردو افسانے کا زوال تو پریم چند سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جب جڑوں کی تلاش شروع ہوئی تو اُردو افسانہ ایک بار پھر معتوب ٹھہرا اور یہ وہ وقت تھا جب اُردو افسانہ بیدی اور منٹو تک سفر طے کر چکنے کے بعد بھی رائج الوقت سماجی اقدار اور مروج اخلاقیات کی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا اور نعرہ باز ترقی پسند افسانہ نگاروں کا الگ شور و غوغا۔

یہ گرہ کیوں کر کھلے، کہ اُردو کا ناقد تو حسبِ معمول افسانے کے بارے میں خاموش ہے اور خیر سے ہمارے سالانہ ادبی جائزہ لکھنے والے کالم نگاروں اور یبوست زدہ پروفیسروں کو باقاعدہ ناقد مان لیا گیا ہے، اللہ اللہ۔

راشد الخیری، یلدرم اور پریم چند سے ہوتا ہوا اُردو افسانہ اصلاح پسندی، رومان، حب الوطنی اور لینن کی ہمنوائی کے بعد منٹو اور بیدی کے اہم سنگِ میل گزار کر تقسیم کی اڑائی ہوئی دھول کے بیٹھ جانے کے بعد رواں پس منظر کے سہل پسند افسانہ نگاروں کی اخباری رپورٹنگ تک آ پہنچا، تب بھی نقادنے جھرجھری نہیں لی۔ ایسے میں انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر بولے تھے۔ انہوں نے تبدیل ہوتے ہوئے منظر نامے اور نئی نفسی کیفیات کا مسئلہ اٹھایا تو، لیکن سمت نمائی نہیں کی، اس وقت تک ''جدیدیت'' کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ کاش ایسے میں کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، ممتاز حسین اور سلیم احمد اس طرف متوجہ ہوتے۔ بہر طور کڑا وقت گزر گیا۔

سعادت حسن منٹو نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ''پریم چند سے ہم کچھ بھی نہیں سیکھ سکتے۔'' یہ ایک انتہا پسندانہ بیان تھا، لیکن کچھ تو تھا، جس کا یہ ردِعمل تھا۔ پھر یہ کہ Back to nature کے رویہ نے سنبھالا لیا، اس لیے کہ رومان پسندی کا چلن نیا نیا تھا۔ میں تو کہوں گا کہ اگر ''ترقی پسندی سے رومان پسندی'' کو منہا کر دیا جائے تو بڑے بڑے بت قدموں میں آ رہیں۔

''یہ رومانی ترقی پسند'' چلن ہندوستانی ادیبوں میں بھیڑ چال کی طرح عام ہوا، نتیجہ میں ہمارے افسانے کی طبعی نشوونما ممکن نہ ہو سکی۔ داستان سے رشتہ کیا ٹوٹا، ابتدائی دور کے ناپختہ افسانہ نگار پریم چند کو ہی اُردو افسانے کا چیمپئن مان لیا گیا۔ محمد علی ردولوی کو رُدولی کی تعلق داری نے مار رکھا اور یوں اتنا بڑا نابغہ ترقی پسند ناقدین کی باہمی چوماچاٹی کے سبب اُردو افسانے کے منظر نامے سے بارہ پتھر باہر کر دیا گیا۔

اسے بھی محض اتفاق نہیں کہنا چاہیے کہ اُردو افسانے کا دوسرا چیمپئن بھی ترقی پسندوں میں سے ہی چنا گیا اور وہ تھا کرشن چندر۔ غلام عباس یا راجندر سنگھ بیدی کیوں نہیں؟ بہت زور مارا گیا۔ ''نقوش'' لاہور (افسانہ نمبر) اور ''افکار'' کراچی (افسانہ نمبر ۱۹۶۴ء) میں باقاعدہ اعلانات داغ دیئے گئے، لیکن افسوس کہ کرشن چندر کے ادبی بساط سے اٹھتے ہی یہ حال ہو گیا کہ افسانے کی زندہ روایت پر بات کرتے ہوئے ذہن پر زور ڈال کر کرشن چندر کو یاد کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ کرشن چندر کمزور افسانہ نگار تھا۔ لیکن اُسے نوازا بہت گیا۔

اس اثنا میں ''افسانہ پن'' کا گلہ گھونٹا گیا اور نعرہ بازی نے بعض بہت اچھے افسانہ نگاروں کو قاری سے محروم کر دیا یا ان کے کام کو سمجھنے اور پرکھنے کا ذوق ہی پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ سید رفیق حسین، سید فیاض محمود، ابوالفضل صدیقی، خان فضل الرحمٰن، محمد خالد اختر...... کس کس کے نام گنواؤں؟ لیکن مطمئن رہیے، آئندہ کا سنجیدہ طالب علم انہیں ایک بار پھر ڈھونڈ نکالے گا۔ اس کتاب میں اسی آئندہ کے لیے Spade work کیا گیا ہے۔ منٹو کو ترقی پسند تحریک سے خارج کر دینے سے کیا فرق پڑا؟

پھر منٹو کو تو بعض اوقات Own بھی کیا گیا، لیکن قرۃ العین حیدر کے ساتھ ایک زمانے تک ناروا سلوک روا رکھا گیا۔ یہ الگ کہانی ہے کہ کس طرح قرۃ العین حیدر کے Unique کام نے بڑے بڑے جغادریوں کے نیچے سے مسندیں کھینچ لیں۔

ترقی پسند ناقدین نے دم لیا تو اُردو افسانے کو ''نئے'' اور ''جدید'' افسانہ نگاروں نے آگھیرا۔ گرے ہوئے بیل کا حشر ہوا اس کا۔ ایسے میں ہم نے نزول افسانہ نگاروں کی بازیافت کی تو ''جدیدیے'' ان میں کیڑے نکالنے پر جٹ گئے۔ یہاں تک کہ نئے لوگوں میں سے سُریندر پرکاش کو ''نوترقی پسندوں'' نے اس وقت مانا جب اس نے افسانہ ''بجوکا'' لکھ کر پریم چند کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

لے دے کر افسانے میں جدت اور ترقی پسندی کا تڑکا لگانا ضرورت ٹھہرا، سو بیشتر افسانہ نگاروں نے اسی فارمولے کو برتا۔ اب ایک بار پھر کہانی پر آزاد وقت ہے اور ناقدین فن ''نئے''، ''جدید'' اور ''جدید ترین'' افسانے اور سادہ بیانیہ کو آشیرواد دیتے ہوئے بڑی روشنائی بہا چکے ہیں۔ ضخیم ادبی رسائل کی طویل فہرستوں میں شیر اور بکری جڑواں دکھائی دیتے ہیں۔ بُرے بھلے میں نتارا کون کرے گا؟

آج مشرق اور مغرب کی طرز ہائے فکر کو چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود قربت کا سامنا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا الگ زمینی بو باس اور الگ الگ ادبی روایات کے امتیازات بھی مٹ گئے؟

اصل قصہ یہ ہے کہ نئے افسانہ نگار کو زندہ روایت کا شعور ہی نہیں ہے۔ خود مجھے ''کہانی پن'' اور ''جدید رویہ'' طرز کی ڈھلی ڈھلائی لایعنی اصطلاحوں سے چڑ ہے۔ کیا افسانے میں افسانہ کو تلاش نہیں کرنا چاہیے؟ لیکن سادہ بیانیہ کی برتری ثابت کر کے نہیں۔

افسانے میں افسانہ پن کی نشاندہی کون کرے گا؟ ہمارا ناقد تو ڈی۔ ایچ لارنس کی طرح بدلحاظ اور بدزبان نہیں ہے، نستعلیق ہے۔ ایف۔ آر لیوس کی طرح شارح بننا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے رہے ہوئے کھانچے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں، بھرنے میں نہیں آتے۔

ادب میں جب اس نوع کی صورت احوال ہو تو میرے خیال میں ناقد پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے یعنی اول تو اسے ''اعلیٰ'' اور ''ادنیٰ'' تحریروں کی پہچان ممکن بنانا ہے اور ثانیاً Working Art کی شرح کرنی ہے؟ اور اگر ایسے میں ناقد تخلیق کار کی راہنمائی کر سکے تو یہ اس کی اضافی عطا ہے۔

یوں پہلی سطح پر تو وہ تخلیق کار کے تخلیقی مرتبے کا تعین کرے گا اور اچھے اور خراب میں حد فاصل قائم کرتے ہوئے کاٹھ کباڑ کے انبار میں

سے نزول تخلیقات کو علیحدہ کر کے بنت اور لفظ کے تخلیقی استعمال کی وضاحت کرے گا جبکہ دوسری سطح پر اسے ادب کے قاری کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دینا ہے۔ تاکہ جب پرانا کلام اپنے امکانات مکمل کر لے تو بدلتے ہوئے اسالیب اظہار اور بنت کی سطح پر احساسات کے اجنبی اور مبہم سگنلز کی قاری تک رسائی ممکن ہو سکے جبکہ ہمارے ہاں زیادہ تر محض Sweep کرنے کے انداز میں فتوے بازی کو تنقید کا نام دے دیا گیا ہے۔

خدا بھلا کرے ''نئے ادب''، ''جدید'' اور ''جدید ترین'' افسانہ نگار کا، جس نے یہ موقع ایک بار پھر فراہم کیا ہے۔ ان نجات دہندوں نے اُردو افسانے کو کچھ سے کچھ بنا دیا حتیٰ کہ ''افسانہ پن'' سے ہی نجات دلا دی۔ Modernity اور Modernism کو باہم خلط ملط کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ ''نئے ادب'' اور جدید نسل'' کے ظہور کا زمانہ ہے۔ دیکھا جائے تو یہی زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آخری سانس لینے کا زمانہ بھی بنتا ہے۔ سو ''نئے ادب'' والوں کے نزدیک ترقی پسندوں کی لاٹ کی لاٹ جو اپنے عہد میں ''بہت نئی'' کہلائی، ۱۹۵۵ء تک آتے آتے ''پرانی'' ہوگئی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ آنے والے کل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور آنے والی نسلیں آج کے ''نئے''، ''جدید'' اور ''جدید تر'' لایعنی افسانے کا کیا حشر سامنے لاتی ہیں۔

ہمارے ہاں جاگیردارانہ نظام کی شکست کے بعد اس کی جگہ لیتے ہوئے سرمایہ داری کا متبادل...... وجودیت اور جدلیاتی مادیت کی باہم آمیزش بن سکتی ہے (جس میں فرد اور سماج کی بہتری بھی ممکن ہے) لیکن ابھی ایسا ہوا نہیں۔ جبکہ ''جدید ترین'' افسانہ نگار نے یکا یک ایسا تصور کر لیا۔ اس طرح ''جدید تر'' افسانے (اس سے میری مراد پیش منظر کا تخلیقی افسانہ قطعاً نہیں) میں سائنسی اور صنعتی تہذیب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پیچیدہ زندگی کا جو خاکہ بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کی بنیاد براہ راست تجربے اور مشاہدے پر اتنی نہیں جتنی کہ سنی سنائی، اندھی تقلید اور مصنوعی خام تجربے پر ہے۔

آج مشرق اور مغرب کو (ہر دو اطراف کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود) قربت نصیب ہوئی لیکن اپنی اپنی مخصوص زندہ روایات کے سبب خارج اور داخل میں کچھ امتیازات بہرحال قائم رہے، جن کے شعور کا فقدان ''جدید تر'' افسانہ نگاروں کے ریوڑ کو تقلید محض کی اندھی کھائی تک لے آیا ہے۔ نتیجتاً جدید ترین افسانے کی ایک معقول تعداد میں سے زمین کی بوباس ہوا ہوئی اور کردار اس حد تک بے چہرہ ہوئے کہ خود اپنے چہرے کی پہچان مشکل ہوگئی۔ بیشتر ''نئے'' اور ''جدید تر'' افسانے میں جن مسائل کا بیان بڑے زور و شور سے ہوا، ان میں اقدار کی شکست اور منظم نظریات کی ناآسودگی نے کئی ہزار صفحات گھیرے، جبکہ میکانکی انداز میں جذباتی سطح پر فرد کے کھوکھلے پن کی عکاسی ہوئی۔ یوں ''صنعتی معاشرت کے ادب'' کی اندھی تقلید میں نئے افسانہ نگاروں کی ایک معقول تعداد اپنے آپ کو جذبات سے عاری، خیالی معاشرے میں رکھ کر خود ترحمی کا شکار ہوئی اور ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں بے سمت جعلی محسوسات اور بے چارگی نے راہ پائی۔ اس کے برعکس پیش منظر کے تخلیقی افسانے میں اقدار کی شکست اور منظم نظریات کی ناآسودگی کے نتیجہ میں تنہائی کی کونپل پھوٹی، ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں معاشرے کے گدلے پن سے مفاہمت کی بجائے ایک خاص قسم کے اکیلے پن نے چہرہ نمائی کی، یا شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ زیست کی ناقابل برداشت جکڑوں بندوں میں رہتے ہوئے باغی کی طرز زیست نے زندگی کرنے کا ایک نیا ڈھنگ وضع کیا۔ اس نوع کے تخلیقی افسانے میں جذبات سے عاری خیالی معاشرے کا وہ روپ ظاہر نہیں ہوا، جس کا سبب صنعتی آشوب ہے، بلکہ اس میں تیسری دنیا کے شدید موسم ہیں اور مسائل۔ یہاں تنہائی، احتجاج، افسردگی اور بے سمتی کے خصوصی محسوسات کے اپنے معنی ہیں۔

میں ''زندہ روایت'' کا قائل ہوں، مردہ تحریکوں کے سانس نہیں گن سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر تجربہ اپنی کسی نہ کسی جہت میں روایت

سے ضرور مربوط رہتا ہے لیکن ہر تبدیل ہوتے ہوئے عہد میں نزول تخلیق کار، روایت کی توسیع بھی بنتا ہے بالکل اسی طرح جیسے پیش منظر کے افسانے سے پرانا علم الکلام رخصت ہو گیا۔ آج، گزرے ہوئے کل سے ایک قدم آگے ہے، افسانے کے بدلتے ہوئے موضوعات اور نئے مسائل زیست کے شعور کے ساتھ ساتھ روایتی ہیئت اور بیان کے مروجہ اصول وقواعد بھی متاثر ہوئے اور یہ ضروری بھی تھا۔ ''آج'' ہم نے جس طرح اور جیسے، نئے منظر نامہ کو محسوس کیا۔ اس کا بیان بھی اس سے میل کھاتے ہوئے رنگوں کے چناؤ کے ساتھ اور ''آج'' کے مزاج سے قریب تر رہ کر کیا، یا کم از کم ایسا کرنے کی خواہش کی، لیکن جہاں ''جدید'' افسانے کی بھیڑ چال میں برخود غلط تجربہ برائے تجربہ کا چلن ہوا، وہاں روایت کے شعور نے آخری سانس لیے۔

ایسے میں بہت سے ''نئے'' اور ''جدید'' افسانہ نگار وقتی شہرت سمیٹنے میں ضرور کامیاب ہو گئے، لیکن ان کا انجام معلوم...... ؟ بزعم خود ''نو ترقی پسند'' افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اپنے آپ کو ایک ہی امام کے ''چیلے'' ماننے سے منکر ہے اور ان کا اصرار یہی ہے کہ ان کے لگائے ہوئے لفظوں کے ڈھیر سراسر ان کے ذاتی تجربات کے عکاس ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ لفظیات کی یک رنگی، لینڈ اسکیپ کی محدودیت اور ایک ہی طرح کی تشبیہات کا اجتماع انہیں ایک محدود حلقے کا رکن بنا کر چھوڑتا ہے۔ اگر ''نیا'' اور ''جدید تر'' افسانہ محض یہی کچھ ہے تو ہمیں چاہیے کہ جب ہم آج کے افسانے کی بات کریں تو مختصر افسانے کی موت سے اپنی بحث کا آغاز کریں۔

لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے، اور نئے منظر نامے میں تخلیقی افسانہ بھی اپنا پتا دیتا ہے تو کیوں نہ نزول تخلیق کی جڑوں کی تلاش کی جائے، نیز نزول تخلیق کاروں کی پہچان آسان بنائی جائے۔

اب جہاں تک زبان کے مروجہ قواعد وضوابط اور روایتی ہیئت کی باغی نسل کا سوال ہے تو سوچنا چاہیے کہ اسے کس خانے میں رکھا جائے گا۔ یہ سوال نہایت اہم ہے اور پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس سے پہلے طے شدہ زمروں کا نظام موقوف تو نہیں ہو جائے گا؟ اس سوال کا جواب ہمارے ناقدین نے ابھی فراہم کرنا ہے، اس لیے کہ جیمز جوائس کو اپنے خیالات کے جنگل کی جھاڑ جھنکار بھی عزیز تھی۔ جارج آرویل نے ''۱۹۸۴ء'' قبل از وقت لکھی اور اسے اس دور میں وہ پذیرائی نصیب نہ ہوئی جو آج اس کا حصہ ہے۔ اسی طرح ایڈگر ایلن پو نے ۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں Fantasy رقم کی، خود اپنے ہاں مرزا فرحت اللہ بیگ نے نصف صدی قبل ''کل کا گھوڑا'' جیسی سائنس فکشن لکھی جب ''جاز'' اور ''سٹار وارز'' کا خواب تک نہیں دیکھا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ناقدین کیا ہوئے، جو ان متذکرہ بالا ناموں کو بڑی شدومد سے رد کیا کرتے تھے؟ کچھ یہی سبب ہے کہ فی الحال میرے نزدیک یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ اُردو ادب کا ناقد تخلیق کار کے عندیے (Intention) تک سو فیصد پہنچا یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے نزدیک اہمیت ''اظہار'' کو حاصل ہے ''سو فیصد ابلاغ'' کو نہیں۔ اس لیے کہ بالغ تخلیقی عمل پہلے ''اظہار'' ہے اور اس کے بعد ابلاغ۔

یہ اگر ناممکن ہے تو اسے ممکن بنانے کے لیے سہولتیں ناقد فراہم کرے گا اور قاری اگر ابلاغ کا خواہش مند ہے تو تخلیق کار کی جانب پیش قدمی کرے گا۔ فی زمانہ تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ لاشعور، تخیل اور خفتہ جذبات اظہار چاہتے ہیں اور عقلیت زدہ لوگ استعارے سے خوف زدہ ہیں اور ابلاغ کا واویلا کر رہے ہیں۔ اب جو لوگ لفظ کو ذریعہ مانتے ہیں وہ سو فیصد ابلاغ چاہیں تو چاہیں، میں تو تخلیقی عمل کو حیاتیاتی ضرورت سمجھنے والوں میں سے ہوں اور لفظ کے ور تارے کو مقصود بالذات سمجھتا ہوں۔ جہاں تک طے شدہ علامات برتنے کا معاملہ ہے تو وہاں ابہام پیدا نہیں ہوتا، البتہ غیر متعین علامات کا استعمال ابہام کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے کہ طے شدہ علامات کی سپلائی لائن تو ہماری داستان، دیو مالا،

ملفوظات اور حکایات سے ہے جبکہ غیر متعین یا خالصتاً نجی احساسات سے متعلق علامات برتتے ہوئے محض اعلیٰ تدبیر کاری سے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن یہ سب کے بس کی بات نہیں۔

اُردو افسانے کو بڑھاوا دینے کے سلسلے میں اُردو میں لکھے گئے افسانوں کی انتھالوجیز ہمارے ہاں شائع ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن اب تک جو انتخابات کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آئے ہیں ان کے مرتبین خاص نوع کی افراط وتفریط کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ کہ ''پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا'' لیکن افسانوں کے انتخاب کا کام اکثر اس کہاوت سے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ انتخاب کرنے والوں میں ہر دور کے اہم نام بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اب تک شائع شدہ اُردو افسانوں کی اکثر انتھالوجیز ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی اس بات کا ثبوت خود فراہم کر دیتی ہیں کہ مرتبین، افسانہ نگاروں کا چناؤ کرتے وقت اپنی مخصوص گروہ بندیوں، مخصوص نظریات اور افسانہ نگاروں سے قربت کے بوجھ کو نہ سہار سکے۔ مثلاً اُردو افسانے کی اولین انتھالوجی ''انگارے'' مرتبہ احمد علی (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں محمود الظفر کی شمولیت، انگریزی میں شائع ہونے والی ہندوستانی افسانوں کی اولین انتھالوجی ''Indian Short Stories'' مرتبہ: ڈاکٹر ملک راج آنند (مطبوعہ۔ ۱۹۴۶ء) میں عطیہ حبیب اللہ کی شمولیت، بشیر ہندی کی مرتب کردہ انتھالوجی ''میرا پسندیدہ افسانہ'' میں دیوانہ مصطفیٰ آبادی اور شیلا سمیر کی شمولیت محض مخصوص نظریات اور گروہ بندی کا شاخسانہ ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ یوں دیکھا جائے تو بیشتر انتھالوجیز میں جہاں بھر پور انتخاب کا عمل دکھائی نہیں دیتا اور ہماری مخصوص مروت زدگی آڑے آتی ہے وہیں افسانہ نگاری کے تقریباً ہر دور کی کیفیت سے کسی قدر آگہی ضرور ہو جاتی ہے۔ ان شائع شدہ انتھالوجیز کی تاریخی اہمیت بہرطور ہے اور افسانوں کے یہ انتخاب اپنے اپنے مخصوص دور کے کاٹھ کباڑ سمیت اچھی تخلیقات کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ایسے میں، دو انتھالوجیز میں نے بھی مرتب کیں، اُن پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:۔

۱۔ ''انگارے'' مرتبہ احمد علی، مطبوعہ۔ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ، طبع اوّل۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کل صفحات۔ ۱۳۴۔

اس مجموعے میں کل چار افسانہ نگاروں کے نو افسانے اور ایک ڈراما ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ''نیند نہیں آتی''، ''جنت کی بشارت''، ''گرمیوں کی ایک رات''، ''دلاری'' اور ''پھر یہ ہنگامہ'' (از سید سجاد ظہیر) ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی رات'' (از احمد علی) ''دلی کی سیر'' اور ''پردے کے پیچھے'' (ڈراما) از رشید جہاں اور ''جوانمردی'' از محمود الظفر۔ آخر الذکر افسانہ انگریزی میں لکھا گیا تھا جسے سید سجاد ظہیر نے اُردو میں ترجمہ کیا۔

۲۔ "Indian Short Stories" مرتبہ۔ ڈاکٹر ملک راج آنند و اقبال سنگھ مطبوعہ۔ دی نیو انڈیا پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۷ ارونگ سٹریٹ، لندن، طبع اوّل۔ ۱۹۴۶ء کل صفحات ۱۹۳۔

اِس مجموعے میں سولہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شامل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

"Castaway" از ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، "Drought" از سرت چندر چیڑ جی، "Resignation" از پریم چند، "Javni" از راجا راؤ، "A Kashmir Idyll" از ڈاکٹر ملک راج آنند، "Coachman And The New Constitution" از سعادت حسن منٹو، "Our Lane" از احمد علی، "Fellow Feeling" از آر۔ کے نارائن، "Little Mother" از عصمت چغتائی، "The Mathematician" از الا گوبرا منیم، "One Day" از جگل کشور شکلا، "The

"Parrot in the Cage" از عطیہ حبیب اللہ، "Swallows" از خواجہ احمد عباس، "The Stars" از راجا رتنم، "When One Is In It" از اقبال سنگھ اور "Boatman Tarini" از تاراشنکر بینرجی۔

۳۔ ''کامیاب افسانے'' مرتبہ وزارت انصاری، سول ایجنٹ: صدیق بک ڈپو لکھنؤ: مطبوعہ حیدرآباد دکن، طبع اول: ۱۹۳۲ء میں علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، ایم۔ اسلم اور ظفر قریشی کے علاوہ متعدد افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۔ ''معیاری افسانے'' مرتبہ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری (مصنفین اور مترجمین کے نام درج نہیں)۔ مطبوعہ۔ مجلس اُردو' کتاب خانہ حفیظ'' اُردو بازار لاہور طبع اوّل۔ ۱۹۳۳ء۔

۵۔ ''سات تارے'' مرتبہ۔ سید وصی اشرف دہلوی، سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل۔ قیسی رامپوری، ایم۔ اسلم، شاہد احمد دہلوی، انصار ناصری، فضل حق قریشی دہلوی، اشرف صبوحی اور سید ابوطاہر کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۶۔ ''شاہکار افسانے'' میں، سدرشن، علی عباس حسینی، ایم اسلم، عابد علی اور اعظم کریوی کے افسانے شامل کتاب ہیں۔ مرتبہ: ہنر انوری، سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ طبع اول۔ ۱۹۳۹ء سے قبل۔

۷۔ ''بہترین افسانے'' مرتبہ: علی احمد مطبوعہ: دفتر رسالہ داستان گو، حیدرآباد دکن طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل۔

۸۔ ''نگارستان'' مرتبہ۔ اختر شیرانی، مطبوعہ۔ لاہور۔

۹۔ ''ریزہ مینا'' مرتبہ: شاہد احمد دہلوی مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی، طبع دوم ۱۹۴۳ء رسالہ ''ساقی'' دہلی میں ۱۹۴۲ء تک شائع ہونے والے ۱۵۰ افسانوں کا انتخاب۔

۱۰۔ ''میرا بہترین افسانہ'' مرتبہ: محمد حسن عسکری، مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۴۳ء کتاب میں محمد حسن عسکری کے دیباچہ پر ۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔

اس کتاب میں کل چودہ افسانے شامل ہیں۔ آخر میں افسانہ نگاروں کے حالات زندگی اور فن سے متعلق ان کی اپنی تحریریں شامل ہیں افسانوں کی تفصیل: ''بیگن کا پودا'' از اوپندر ناتھ اشک، ''انارکلی اور بھول بھلیاں'' از اختر اورینوی، ''مجھے جانے دو'' از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، 'تیسری جنس'' از چودھری محمد علی ردولوی، ''کنگ پوش'' از دیوندر ستیارتھی، ''دس منٹ بارش میں'' از راجندر سنگھ بیدی، ''نئی مصیبتیں'' از رشید جہاں، ''ہار جیت'' از علی عباس حسینی، ''آنندی'' از غلام عباس، ''جھیل سے پہلے جھیل کے بعد'' از کرشن چندر، ''ہاتھی کا گل'' از ممتاز مفتی اور ''حرام جادی'' از محمد حسن عسکری۔

۱۱۔ ''منتخب افسانے'' مرتبہ: قمر تسکین، مقدمہ از مولانا وحید الدین سلیم، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۴۴ء سے قبل۔

۱۲۔ ''نئی راہیں'' مرتبہ: قمر تسکین، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور مرکنٹائل پریس طبع اول ۱۹۴۳ء

۱۳۔ ''نئی منزلیں'' مرتبہ: قمر تسکین، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۴۴ء

۱۴۔ ''نئی فضائیں'' مرتبہ: قمر تسکین مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ۔

۱۵۔ ''خوشبوئیں'' مرتبہ: قمر تسکین، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۵۰ء سے قبل۔

۱۶۔ ''منتخب افسانے'' مرتبہ: تاجور نجیب آبادی، مطبوعہ: لاہور۔

۱۷۔ ''انگڑائیاں'' مرتبہ: احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ: ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن، طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۸۔ ''نقوش لطیف'' مرتبہ: احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ: ادارہ فروغ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۴ء

(یہ خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب ہے)

۱۹۔ ''نئے پیمانے'' مرتبہ: عبدالرحیم شبلی (بی۔کام) مطبوعہ: بیسویں صدی، بیرون شاہ عالمی دروازہ، لاہور، طبع اول ۱۹۴۵ء

کرشن چندر، ممتاز مفتی، سید فیاض محمود، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، میرزا ادیب، شفیق الرحمان، سید احسان علی شاہ، ہاجرہ مسرور، سہیل عظیم آبادی، خدیجہ مستور، طفیل ملک، احمد شجاع پاشا، ظہور الحسن ڈار اور پرتھوی ناتھ شرما کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۲۰۔ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو، لاہور طبع اول لگ بھگ ۱۹۴۶ء

۲۱۔ ''ستاروں کے کھیل'' مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو، لاہور، سنہ ندارد۔

۲۲۔ ''جام و مینا'' مرتبہ: حکیم یوسف حسن، مطبوعہ: مکتبہ ادب، دہلی، طبع اوّل: س۔ن

عبدالمجید سالک، سلطان حیدر جوش، پریم چند، سید نصیر احمد (ڈپٹی کلکٹر) حسن نظامی، سدرشن، نذر سجاد حیدر، علی الدین سالک، ایم۔اسلم، حامد اللہ افسر، بلقیس خاتون اور حکیم یوسف حسن کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۲۳۔ ''گناہ کے افسانے'' مرتبہ: ڈاکٹر اختر حسین

۲۴۔ ''سات ستارے'' مرتبہ: شاہد احمد دہلوی، مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

۲۵۔ ''طلوع و غروب'' مرتبہ: جمیل احمد

۲۶۔ ''اس بازار میں'' مرتبہ: ثاقب زیروی مطبوعہ: لاہور۔

۲۷۔ ''چاند کا گناہ'' مرتبہ: راجہ مہدی علی خان

۲۸۔ ''ہیبت ناک افسانے'' مرتبہ: امتیاز علی تاج، مطبوعہ: دارالاشاعت، لاہور۔

۲۹۔ ''گرد و پیش'' مرتبہ: اکرام قمر

۳۰۔ ''چنو'' مرتبہ: ساغر نظامی ''رسالہ ایشیاء''، میرٹھ (۱۹۳۵ء تا اپریل ۱۹۴۴ء سے افسانوں کا انتخاب)

۳۱۔ ''نئے زاویے'' (دو جلدیں) مرتبہ: کرشن چندر

۳۲۔ ''گل کے سائے میں'' مرتبہ: کرشن چندر، مکتبہ سلطانی، بمبئی۔ طبع اوّل: ۱۹۴۹ء

۳۳۔ ''نئے کلاسیک'' مرتبہ: آر پی ناتھ (صدر نشین) قاضی سلیم (کنوینر) مُرتبہ: جوگندر پال، بشیر نواز، بھگونت راؤ دیشمکھ، ڈاکٹر نعیم الدین، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی، ڈاکٹر بی ایچ راجور کر اور ڈاکٹر معین شاکر۔ مطبوعہ: مرہٹواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، دکن، طبع اوّل: ۱۹۷۳ء۔

بیدی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، منٹو، اقبال مجید، اقبال متین، جیلانی بانو، قاضی عبدالستار، جوگندر پال، کلام حیدری، انور عظیم، رام لعل، رتن سنگھ، سریندر پرکاش، شرون کمار ورما، غیاث احمد گدی، بلراج مین را، احمد یوسف، آمنہ ابوالحسن اور ظفر اوگانوی کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۳۴۔ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: اُردو محل ۴۵ ٹمپل روڈ، لاہور، سنہ ندارد۔ یہ انتخاب لگ بھگ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

۳۵۔ ''دھوپ اور سمندر'' مرتبہ: کمار پاشی، مطبوعہ: سطور پبلی کیشنز، دہلی طبع اول: ۷۸۔۱۹۷۷ء
قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، بلراج مین را، سریندر پرکاش، جوگندر پال، اقبال متین، رتن سنگھ، اقبال مجید، دیوندر اسر، شرون کمار ورما، کمار پاشی، امر سنگھ، بلراج کومل اور راج کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۳۶۔ ''بہترین نئی کہانیاں'' مرتبہ: اعجاز راہی و احمد داؤد، مطبوعہ: دستاویز پبلی کیشنز، نانک پورہ، راولپنڈی، طبع اول: مارچ ۱۹۸۰ء
''قصہ ایک رات کا'' از انور عظیم، ''رات'' از انتظار حسین، ''پاتال'' از جوگندر پال، ''لا'' از کلام حیدری، ''ڈوب جانے والا سورج'' از غیاث احمد گدی، ''شرمندگی'' از اقبال مجید، ''نئی بشارت'' از منصور قیصر، ''مقتل'' از بلراج مین را، ''تلقارمس'' از سریندر پرکاش، ''دریچے میں گرا ہوا قلم'' از احمد ہمیش، ''پرندہ'' از خالدہ حسین، ''کینسر'' از انور سجاد، ''گملے میں اُگا ہوا شہر'' از رشید امجد، ''بارہ ماہ'' از مظہر الاسلام، ''پہلے آسمان کا زوال'' از کمار پاشی، ''سونے کی مہر'' از مرزا حامد بیگ، ''برسات کی رات'' از سمیع آہوجہ، ''ٹیبلو'' از ساگر سرحدی، ''پہلا پاگل'' از حمید سہروردی، ''چیخ کا چہرہ'' از قمر عباس ندیم، ''اندر کا جہنم'' از علی حیدر ملک، ''سیڑھی'' از رضوان احمد، ''عجائب گھر نمبر ۲'' از احمد داؤد اور ''نیا پل'' از اعجاز راہی شامل کتاب ہیں۔

۳۷۔ ''عصر جدید کی بہترین کہانیاں'' مرتبہ: احمد ہمیش مطبوعہ: الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی۔

۳۸۔ ''اُردو کے تیرہ افسانے'' مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز، مطبوعہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ طبع اول: ۱۹۸۰ء

۳۹۔ ''ہمارے پسندیدہ افسانے'' مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز، مطبوعہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ طبع اول: ۱۹۸۲ء

۴۰۔ ''اُردو افسانہ اور افسانہ نگار'' مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔
(۳۵ افسانہ نگاروں کے احوال و آثار کے ساتھ ان کے اولین افسانوں کا مجموعہ)

۴۱۔ ''انتخاب افسانہ'' مرتبہ: ڈاکٹر سید محمد عقیل، مطبوعہ: اتر پردیش اُردو اکیڈمی طبع اوّل: ۷۸۔۱۹۷۷ء
پریم چند، علی عباس حسینی، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، رام لعل، رتن سنگھ، جیلانی بانو، کلام حیدری اور عابد سہیل کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۲۔ ''بیس نئی کہانیاں'' مرتبہ: ڈاکٹر علی احمد فاطمی مطبوعہ: کتابستان ۳۰ چک، الہ آباد، طبع اوّل: ۱۹۷۸ء
۱۹۷۰ء کے بعد بھارت میں لکھے جانے والے افسانوں کا انتخاب۔ قاضی عبدالستار، انور سجاد، افسر آذر، عابد سہیل، خالدہ حسین، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، سریندر پرکاش اور شفق کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۳۔ ''پریم چند صدی کے افسانے'' مرتبہ: اتر پردیش اُردو اکیڈمی، مطبوعہ: اتر پردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ طبع اول: ۸۳۔۱۹۸۲ء
یہ نومبر ۱۹۸۰ء میں پریم چند صدی کے سلسلے میں منعقدہ دو روزہ سیمینار میں پڑھے جانے والے افسانوں کا انتخاب ہے۔ خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رام لعل، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، جیلانی بانو، مسیح الحسن رضوی، بشیشر پردیپ، عابد سہیل، طارق چھتاری، امرت لال ناگر، رضوان احمد، عائشہ صدیقی اور صبیحہ انور کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۴۔ ''نسوانی آوازیں'' مرتبہ: مرزا حامد بیگ، مطبوعہ: سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۹۶ء
یہ خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب ہے: حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین، مسز عبدالقادر، رشید جہاں، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، تسنیم سلیم

چھتاری، صدیقہ بیگم سیوہاروی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، آمنہ ابوالحسن، عفراء بخاری، زاہدہ حنا، عطیہ سیّد اور نیلم احمد بشیر کے افسانے شامل انتخاب ہیں۔

۴۵۔ ''پاکستان کے شاہکار اردو افسانے'' مرتبہ: مرزا حامد بیگ، مطبوعہ: الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، طبع اوّل: جولائی ۲۰۰۰ء

عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، اے۔حمید، الطاف فاطمہ، اسد محمد خاں، حجاب امتیاز علی، ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، صادق حسین، اشفاق احمد، محمد خالد اختر، خان فضل الرحمن، جمیلہ ہاشمی، محمد عمر میمن، عفراء بخاری، آغا سہیل، قدرت اللہ شہاب، آغا بابر، احمد شریف، طارق محمود، منیر الدین احمد، غلام عباس، محمد احسن فاروقی، ضمیر الدین احمد، رحمان مذنب، قدرت اللہ شہاب، آغا بابر، احمد شریف، محمد سعید شیخ، ہاجرہ مسرور، حسن منظر، سید باقر علیم، انور سجاد، محمد سلیم الرحمن، محمود احمد قاضی، مسعود اشعر، مسعود مفتی، خالدہ حسین، رشید امجد، منشایاد، ظہور الحق شیخ، ذکاء الرحمن، مشرف احمد، احمد داؤد، احمد جاوید، علی تنہا، اسلم سراج الدین، یوسف چودھری، آصف فرخی، امجد طفیل اور مرزا حامد بیگ کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

''اُردو افسانے کی روایت'' میں، میں نے اُردو افسانے کی زندہ روایت سے متعلق اپنے معینہ Thesis سے مناسبت رکھنے والے افسانہ نگاروں اور ان کے نمائندہ افسانوں کا کھوج لگانے کے ساتھ منتخب افسانہ نگاروں کے احوال و آثار یکجا کرنے کا جتن بھی کیا ہے تا کہ ادب کے سنجیدہ قاری اور ناقد کو اُردو افسانے کی چھان پھٹک میں کسی نوع کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ افسانوں کے اس انتخاب کو ترتیب دیتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ یہ انتھالوجی اُردو افسانے کی صد سالہ زندہ روایت کی جملہ کروٹوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ایک مربوط تاریخ کا تاثر بھی دے۔ تا کہ آج اور آنے والے کل کے ناقد اور افسانہ نگار کو مفاہمت پسندی اور نری مغرب زدگی سے نجات حاصل کرنے میں آسانی ہو اور ہماری فسانہ طرازی کے اس کھوئے ہوئے مشرقی لحن کی بازیافت کا عمل ممکن ہو سکے، جس کے بغیر عالمی ادبی منظر نامے پر ہماری شناخت مٹی ہوئی ہے۔



''اُردو افسانے کی روایت'' کے اِس نظرِ ثانی ایڈیشن میں چند نظری مباحث، اُردو کے اوّلین افسانہ نگاروں سے متعلق ایک گوشہ اور اُردو افسانے کا صد سالہ اسلوبیاتی جائزہ نئی چیزیں ہیں۔ پہلے سے شامل کردہ افسانہ نگاروں کے کوائف میں اضافہ جات ضروری تھے۔ افسانوں کے انتخاب کی سطح پر چند نئے نام اِس ایڈیشن سے مخصوص ہیں البتہ اب بھی اُردو افسانے کے کئی ایک چیدہ افسانہ نگار ایسے ہیں، جن کے افسانے ''اُردو افسانے کی روایت'' میں زیرِ بحث تو آئے ہیں لیکن افسانہ نگاروں کے کوائف اور افسانے اس انتھالوجی کا حصّہ نہیں بن پائے۔ وجہ، اِس کتاب کی ضخامت بھی ہے اور میری ہی مُرتب کردہ دو اور انتھالوجیز بھی۔ میں نے ''نسوانی آوازیں'' اور ''شاہکار اُردو افسانے'' میں اُن افسانہ نگاروں کے کوائف اور افسانے یکجا کرنے میں اپنے تئیں سعی کی ہے۔

مرزا حامد بیگ

صدر شعبہ اُردو، ڈین آف آرٹس
گورنمنٹ اسلامیہ کالج، لاہور

دسمبر ۲۰۰۹ء

داستان نگاری کی روایت اور اُردو افسانہ

''ہم سب گوگول کے اُوورکوٹ میں سے برآمد ہوئے ہیں۔'' یہ جملہ دوستوفسکی کا ہے اور اگرچہ اس کا رُوئے سخن رُوسی افسانہ نگاروں کی طرف تھا لیکن یہ قول رُوس اور غیر منقسم ہندوستان کی اُردو دنیا پر بھی صادق آتا ہے لیکن جزوی طور پر۔ گوگول نے دنیا کا پہلا افسانہ ''اوورکوٹ'' ۱۸۴۲ء میں لکھا تھا، مختصر افسانے سے متعلق بغیر کوئی نظریہ سازی کیے اور اُسی سال ایڈگر ایلن پو نے مختصر افسانے کے فنی اصول وضع کیے۔ یوں ہمارے ہاں مختصر افسانے کی ابتداء نہ تو سراسر گوگول کے زیرِ اثر ہوئی اور نہ ایلن ایڈگر پو کے وضع کردہ اصول وضوابط کے تحت۔ ۱۹ویں صدی عیسوی کے آخری دہے میں نصابی ضروریات کے تحت محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب کی تاریخ نگاری، دلگداز، اودھ پنچ، مخزن، زمانہ، علی گڑھ منتھلی، الناظر، انتخاب لاجواب، اُردوئے معلّی، روزنامہ زمیندار، عصمت، تمدن اور عصمت کی محدود ضخامت کی مجبوری کے تحت عبدالحلیم شرر، فیض الحسن، شیو برت لال ورمن، خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی اور میر باقر علی داستان گو کے خاکہ نما مختصر قصوں اور دیگر زبانوں سے تراجم نے اُردو افسانے کے لیے راہ ہموار کی۔ جب کہ داستانوں سے مخصوص حیرت زا کیفیت کا حامل مختصر قصہ: ''ایک چاندنی رات کا منظر'' از آفتاب احمد (۱۹۰۲ء) اُردو افسانے کا اعلان نامہ ہے۔ ابتدا میں تُرک افسانہ نگاروں نے سجاد حیدر یلدرم کی راہنمائی کی اور راشد الخیری کی معرفت اُردو افسانے کے لیے ابتدائی ماڈل لیو لیپے نے فراہم کیا، سلطانہ حیدر جوش نے ارنسٹ ہیمنگوے اور سمرسٹ ماہم کو راہنما بنایا، چودھری محمد علی ردولوی نے اُردو داستان سے قصہ گوئی سیکھی لیکن آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا بھی اُن کے پیشِ نظر رہے جب کہ پریم چند کی معرفت جس افسانے کا چلن عام ہوا وہ گوگول اور ایڈگر ایلن پو کے واضح اثرات سمیٹے ہوئے تھا۔

ہمارے فاضل محققین اور ناقدین (جن میں پروفیسر وقار عظیم پیش پیش تھے) نے اس آخری تاثر کو کچھ اِس شدومد کے ساتھ محسوس کروایا کہ ہم تا حال پریم چند کو اُردو افسانے کا بانی شمار کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عالمی افسانے کی تاریخ میں گوگول اور پو کے حوالے سے ۱۸۴۲ء کا سال اہمیت کا حامل ضرور رہا ہے لیکن جہاں تک اُردو افسانے کی ابتداء کا تعلق ہے، یہ سنہ وسال ہمارے لیے چنداں اہمیت کے حامل نہ تھے۔ اس وقت کا ہندوستان تو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ لڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا بقول سلطان حیدر جوش:

''تحقیق ہو چکی کہ معرکہ یا پلٹا، غدر ۱۸۵۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۹ء میں زوال اودھ پر ختم ہوا۔ جب انگریز نے پنجاب سے لے کر

بنگال تک کی فوجیں جمع کر کے اودھ پر چڑھائی کی اور زوال لکھنؤ کے وقت، تاریخ شاہد ہے کہ انگریز فوجیں لکھنؤ کی گلی گلی اور دروازہ دروازہ پر سے وطن پرستوں کی لاشوں پر سے گزر کر بڑھ سکیں اور منشی جی کا توسن قلم دو مسلمان سرداروں کو اس وقت مضافات میں افیم کھا کر کسی پرانے کھنڈر کے اندر شطرنج کے نٹو لڑاتے پیش کر رہا تھا اور نہایت شستہ اُردو میں۔'' [1]

یہاں سلطان حیدر جوش نے گوگول اور پو کے زیرِ اثر ڈھلے ڈھلائے مغربی افسانے کے پروردہ افسانہ نگار پریم چند پر اس کے ایک مشہور افسانے ''شطرنج کی بازی'' کے حوالے سے چوٹ کی ہے، جسے عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار اور پروڈیوسر ستیہ جیت رے ''شطرنج کے کھلاڑی'' کے نام سے فلما چکے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ اس دور کے ہندوستان کو کس نوع کے تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی حالات کا سامنا تھا اور ہمارا کہانی کار داستان پرور ماحول سے جلاوطنی کے بعد کس نہج پر آگے بڑھنے کی سوچ رہا تھا۔

ماضی بعید میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں 'ہملٹ'' اور ''ہنری ہشتم' کے چیدہ اقتباسات کا ترجمہ کر کے ہندوستانی ادیب کو جو راہ سُجھائی تھی [2] اور ماضی قریب میں ہمارے مترجمین نے ۱۹ویں صدی کے خاتمے تک درج ذیل مطبوعہ کام یادگار چھوڑا تھا:

۱۔ ''مختصر کہانیاں'' از حیدر بخش حیدری، مرتبہ: عبادت بریلوی، مطبوعہ: اُردو دنیا، کراچی، طبع اوّل: س۔ن

۲۔ ''تواریخ راسلس شہزادہ حبش کی'' از ڈاکٹر سیموئل جانسن / سید محمد میر لکھنوی المعروف کمال الدین حیدر مطبوعہ: گرین وے پریس، آگرہ: طبع اوّل: ۱۸۳۹ء

۳۔ ''حکایات لقمان'' از حکیم لقمان / نظام الدین، مطبوعہ: بمبئی، نام مطبع ندارد، طبع اوّل: ۱۸۴۴ء

۴۔ ''ہسٹری آف سینڈفورڈ اور مرٹن'' از ٹامس ڈے / بابو شیو پرشاد، مطبوعہ: بنارس، نام مطبع ندارد، طبع اوّل: ۱۸۵۵ء

۵۔ ''قصہ بزرگ رابنسن کروسو'' از ڈینیئل ڈیفو / نام مترجم ندارد، بنارس، نام مطبع ندارد، طبع اوّل: ۱۸۶۲ء

۶۔ ''دادِ دریا'' از ولیم شیکسپیئر / نوشیراں جی مہربان جی آرام، مطبوعہ: نام مطبع ندارد، طبع اوّل: ۱۸۷۱ء

۷۔ ''اعمال نامہ روس'' از ڈاکٹر والس میکنزی / پنڈت رتن ناتھ سرشار، لکھنؤ، نولکشور پریس، طبع اوّل: ۱۸۸۷ء

۸۔ ''الیڈ'' از ہومر / باسط علی خاں، آگرہ: مفید عام پریس، طبع اوّل: ۱۹۰۰ء

یاد رہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے احوال و آثار نے (زوال اودھ ۱۸۵۹ء سے ۲۰ویں صدی کے آغاز تک) تقریباً چالیس برس کی مدت ہمارے لاشعور کا حصہ بننے میں لی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب داستان کی رومانی فضا نے تلخ حقیقت سے شکست کھائی اور سرسید احمد خان کی منطقی حقیقت پسندی نے ہماری نثر کی وہ ساری شعریت یکلخت معطل کر کے رکھ دی، جو سرسید سے پہلے کی نثر کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔

داراشکوہ کی شکست اور ۱۸۵۷ء کا ہنگام، جہاں داستان کی رومانوی فضا کو ملیامیٹ کر گیا وہیں داستان کی معنویت سے بھی ہم کوسوں دور جا پڑے جو ہمارے ماضی کی آئینہ دار تھی اور جہاں انسان کی حیثیت محض ٹائپ کی ہے۔

داستانوں کا علامتی مطالعہ کرنے والوں میں سوشیالوجی کے ماہرین، داستان کو انسانی معاشرے کے خاص دور سے متعلق بتاتے ہیں اور نفسیات داں جنسی الجھنوں کی طرف لے جاتے ہے البتہ سگمنڈ فرائیڈ، الفرڈ ایڈلر، ارنسٹ جونز اور آٹو رینک سے آگے نکل کر ماضی کے

انسان کی سوچ کے تعین کے سلسلے میں کارل یونگ نے دیو مالا اور مذاہب کے مطالعے سے اجتماعی لاشعور کی چھان پھٹک کرتے ہوئے تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے۔

کارل یونگ کی اس آرکی ٹائپل (Archetypal) تنقید کے مقابلے میں جیمز فریزیز (مصنف ''Golden Bough'') اور اس کے مقلدین، داستان کا مطالعہ اجتماعی لاشعور کے ساتھ فطرت کے عوامل کی روشنی میں کرتے ہیں، جب کہ ہنرخ زمر اور جوزف کیمبل نے بالترتیب ہماری دو داستانوں ''بے تال پچیسی'' اور ''الف لیلیٰ'' کا مطالعہ مشرق کے دیو مالائی سانچوں کی روشنی میں کیا ہے۔ کاش ہمارے ناقدین اور افسانہ طرازی کے دعوے داروں کو یہ توفیق ملتی کہ داستانوں میں رواں مشرق کی اس خاص خوشبو کی پہچان کر سکتے۔ اب بھی گئے وقت کو آواز دی جاسکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ داستان، جو ہمارے قدیم عہد کا حال کے نام پیغام ہیں، ہم سے کہتی کیا ہے؟ (گو اس سلسلے میں بھی اختلاف رائے موجود ہے) اول: ایک خیال تو یہ پایا جاتا ہے کہ داستان انسانی شخصیت کے مختلف امکانات کو سامنے لاتی ہے، یعنی فطرت کے ساتھ انسانی انا کا تصادم...... اور یہ کہ تسخیر کائنات کا عمل آج بھی جاری وساری ہے۔

دوم: مرکزی کردار کا خود اپنی ذات میں اور ذات سے باہر سفر ضروری ہے[۳]۔ سفر کے لیے محرک جذبہ عشق کا ہے اور اس سفر میں کامیابی خدا کی طرف سے توفیق ملنے پر مبنی ہے یعنی کامیابی کے لیے تائید غیبی ضروری ہے گو ہر مقصود اپنی ذات میں گم ہو کر حاصل نہیں ہوتا اس کے لیے پُر خطر سفر پر نکلنا لازم ہے جبکہ تائید غیبی سے مراد کائنات کی اصل قوتیں ہیں، جو خیر طلب ہیں۔ ہماری داستانوں میں مشرقی دانش اور متصوفانہ طرز احساس کی یہ مخصوص مہک اتنی کم قیمت نہ تھی جتنا ہم نے خیال کیا۔

مختصر یہ کہ داستان ہماری آزاد خیال معاشرت کی خوشیوں، خوابوں، امیدوں اور وسوسوں کا علامتی اظہار تھا جسے دارا شکوہ کی شکست اور ۱۸۵۷ء کے ہنگام کے بعد علی گڑھ تحریک کی منطقی حقیقت پسندی اور معاشرت سدھار تنظیموں نے جو ضعف پہنچایا، اس سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔

ہماری داستان نگاری کی روایت کے آخری بڑے نام میر باقر علی داستان گو نے خالصتاً مسلم حوالوں سے ''داستان امیر حمزہ'' لکھ کر داستانوی فضا کی بازیافت چاہی تو ناکام رہے اور آخر کار محمد علی جوہر کی کھدر پوش تحریک کی ہموائی میں ''گاڑھے خاں کا دکھڑا'' اور ''ململ جان کی طلاق''، ''اڑا اڑا دھم'' اور ''مقنہ ہاتھی'' جیسے رسائل یادگار چھوڑے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی اور آفتاب احمد نے میر باقر علی کے تجربے کو دوہرانے کی بجائے مختصر نویسی کو شعار کیا لیکن ان کے ہاں تجربات کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو ان کے بعد آنے والوں خصوصاً راشد الخیری، علی محمود، وزارت علی اوریئی، حکیم یوسف حسن، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، سلطان حیدر جوش اور محمد علی ردولوی کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ خواجہ صاحب کا سارا زور ماضی قریب کے بڑے تجربے (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) کو موضوعی سطح پر سمیٹنے میں صرف ہو گیا۔ لے دے کر ان کی تحریروں سے دلی کی مسلم معاشرت، رسوم و رواج، لال قلعہ کی زندگی، امراء کے مشاغل اور دلی کے میلوں اور تہواروں کا احوال معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ ناصر نذیر فراق کی مشہور تصنیف ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' ننھی خانم المعروف بی دلہن کی سنائی ہوئی کہانیوں پر مبنی ہے۔ ننھی خانم، جنہوں نے لال قلعہ کی زندگی دیکھی تھی اور خود انہیں خواجہ صاحب نے ۱۲۹۲ھ بمطابق ۱۸۷۵ء میں پہلی بار دیکھا اور سنا[۵]۔ یہ کتاب بقول فراق، مرحومہ کے ملفوظات ہیں اور انہیں جمع کرنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ناظرین اسے پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔ فراق نے بقیہ کتابیں ''بیگموں کی چھیڑ چھاڑ''، ''دکن کی پری''، ''دہلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ''، ''سات لاقتوں کی کہانیاں''، ''خوبصورت بھتنا''، ''درد جانستان''، ''چار

چاند'' اور'' دلی کا آخری دیدار'' بھی اسی غرض و غایت کے تحت لکھی ہیں۔

خواجہ ناصر نذیر فراق کی کتاب ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' کا اختتام دلی کی ایک قدیم رسم تورہ بندی سے متعلق وضاحت پر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''...... مانڈوں کے متعلق مشہور ہے، مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ یہ معمولی تورہ ہے، ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزاروں نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے، اس رسم کو بادشاہوں سے دلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے، اب تو ٹی پارٹی کی گرما گری ہے۔''

اُردو فکشن کی سطح پر بھی یہی کچھ ہوا، داستان کی تورہ بندی موقوف ہوئی اور اس کی جگہ ''ٹی پارٹی'' نے لے لی۔ کاش میر باقر علی داستان گو اور خواجہ ناصر نذیر فراق کی افسانوی تحریروں کو اُردو افسانے کے لیے کسی نوع کا ماڈل تصور کیا جاتا تو آج ہمارا رابطہ اپنی داستانوی روایت سے اس طور ٹوٹا ہوا نہ ہوتا۔ اِس خصوص میں ایک مثال: ''ایک چاندنی رات کا نظارہ: بہار کشمیر میں'' از آفتاب احمد، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور۔ جنوری ۱۹۰۲ء داستان سے افسانے تک کے عبوری دور سے متعلق انتخاب میں رکھ دی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

درحقیقت ہم نے اپنی داستانوں سے لفظ کے طلسم کے ہاتھوں شکست کھائی ہے، اس طلسم کو توڑ کر اندر کے چھپے ہوئے معانی کی تلاش نہیں کی۔ داستان ہمارے افسانے کے لیے ایک ایسی سپلائی لائن بن سکتی تھی، جس کا شعور، روایت کے ساتھ ہمارا رشتہ مستحکم کرتا اور ہم افسانہ نگاری کی اس زندہ روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے آج پیش منظر کو مزید تاب ناک بنا سکتے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ داستان کی طاقتور مشرقی سپلائی لائن سے ہم یکلخت جدا نہیں ہوئے، ہمارے اولین افسانہ نگاروں کے ابتدائی افسانے اس روایت کے تسلسل میں سامنے آئے ہیں۔

۱۔ راشد الخیری، حکیم یوسف حسن اور سلطان حیدر جوش کے اصلاحی اور معاشرتی افسانوں میں مخصوص مشرقی روایات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والوں کو مطمئن و مسرور کرنے کی کوشش نیز نثر میں شعریت کی بازیافت اسی روایت کا عکس ہے۔

۲۔ علی محمود، وزارت علی اور یپی اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں مناظر فطرت کی بہار آفرینیوں اور رنگینیوں کو جذبہ محبت کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات کی مہربان فطرت سے ہم آہنگی دکھانے کا رجحان، نیز نیاز فتح پوری کا کردار نگاری میں پُر جوش رومانی عمل سے ردعمل تک کی افسانوی پیش کش داستان کے نشاط انگیز اور تخیلی اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔ جبکہ مسز عبدالقادر نے قہار فطرت کی پیشکش میں بھی داستان سے ہی اثر قبول کیا۔

۳۔ خود پریم چند کے اولین افسانوں ''دنیا کا سب سے انمول رتن''، ''شیخ مخمور'' اور ''سیر درویش''، مشمولہ: ''حب وطن کے قصے معروف بہ سوز وطن و سیر درویش'' ۶؎ کی فضا، ماحول اور افسانے کے انجام میں حق کی فتح داستان سے ہی مستعار ہے۔

۴۔ چوہدری محمد علی ردولوی نے مشرقی دانش کے بیان کے لیے داستان سے بھرپور استفادہ کیا اور داستان گو کہلانے پر فخر کیا۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں افسانے کی صنف نے چار یکسر جداگانہ نقطۂ نظر کے حامل افسانہ نگاروں کے زیر اثر اپنا سفر آغاز کیا اور اُردو افسانے کے ایک دوسرے سے یک سر متحارب رنگ ہندوستان کی کروٹیں لیتی ہوئی سیاسی اور سماجی زندگی، نیز افسانہ نگاروں کی ذات اور

اسلوب تحریر سے پھوٹے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے افسانے نے داستان کے زیر اثر اپنا سفر آغاز کیا اور آگے چل کر فن افسانہ سے متعلق نت نئی نظریہ سازی کے تحت اپنی مشرقی سپلائی لائن (داستان، تمثیل اور لوک قصے) سے دُور ہوتا چلا گیا۔

ہماری افسانوی روایت کے سرسری جائزہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ داستان کے حوالے سے علامتی طریقہ کار کا تجربہ اُردو افسانے کی ابتداء میں ہی ہوا لیکن اس کا چلن ممکن نہ ہوا۔ نمایاں مثالوں میں راشد الخیری کا افسانہ ''چہار عالم'' یلدرم کا ''چڑیا چڑے کی کہانی'' پریم چند کا ''گلی ڈنڈا''، محمد علی ردولوی کا ''دھوکا''، اختر حسین رائے پوری کا ''قبر کے اندر''، میرزا ادیب کے دو افسانے ''درون تیرگی'' اور ''دل ناتواں''، حیات اللہ انصاری کا ''چچا جان''، اختر اورینوی کا ''کینچلیاں اور بال جبریل''، خواجہ احمد عباس کا ''تین عورتیں''، کرشن چندر کا ''غالیچہ'' اور سراج الدین ظفر کا ''تنازعہ'' ہیں۔

رواں پس منظر میں تازگی کا ایک انوکھا احساس اسی روایت کے رواں پس منظر میں براہ راست انداز بیان کے باوجود اسلوب اور موضوع کی ہم آہنگی سے پیدا ہوا۔ رواں پس منظر کے جن افسانہ نگاروں کے ہاں موضوع کا تنوع تکنیک کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آیا ان میں سے ہر ایک کے ہاں علامتی، استعاراتی اور تجریدی تدبیر کاری کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر غلام عباس کا ''آنندی'' کرشن چندر کے افسانے ''گڑھا''، ''غالیچہ''، ''بت جاگتے ہیں''، ''ہاتھ کی چوری''، ''نیکی کی گولیاں''، ''مردہ سمندر'' اور خواجہ احمد عباس کے ''تین عورتیں'' اور ''اندھیرا اجالا'' وغیرہ۔

یہاں یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ آج کا افسانہ کس حد تک داستان، تمثیل اور لوک قصے سے کہانی کا فن سیکھ سکتا ہے اور اس طور کا ورتارا آج کے افسانوی پیش منظر میں کیا معنی رکھتا ہے؟

اس سوال کی گنجائش اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اُردو افسانے کو یکلخت اخلاقی نیم موعظانہ صورت حال اور جاگیردارانہ اخلاقیات سے مذہبی اور جنسی حقیقت نگاری (''انگارے''، ''شعلے'') اور ترقی پسند تحریک کی طرف آنا پڑ گیا۔ نتیجہ زمینی حقائق کے فکری اور اسلوبیاتی حوالوں سے کٹ جانے کے سبب کہانی کی روایت کا تسلسل مجروح ہوا اور افسانہ لوک دانش سے تہی دست ہو گیا۔

انتظار حسین اس ضمن میں بدنام یوں ہے کہ اس نے داستان کی بازیافت چاہی اور لوک دانش کی جستجو کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا:

''افسانے کی اصل روایت داستانوں اور قصہ کہانیوں کی روایت ہے۔''

نیز انتظار حسین نے نئے اسالیب کی جستجو کو اپنی تہذیب سے ایمان اٹھ جانے کے مترادف جانا، اس پر خاصی لے دے ہوئی۔ ناقدین کی لاعلمی اپنی جگہ کہ اُنھوں نے انتظار حسین سے قبل لکھے جانے والے افسانے میں داستان اور قصہ گوئی سے ربط ضبط کی صورتیں ملاحظہ ہی نہیں کیں اور بعد ازاں اِس حوالے سے سارا کریڈٹ انتظار حسین کو دے دیا۔

اب ذرا دیکھنا چاہیے کہ اس کھوئی ہوئی اسلوبیاتی سپلائی لائن کی جستجو انتظار حسین سے پہلے کہاں تک ہوئی۔ اس ضمن میں اولین مثال تو خود پریم چند کے دو افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اور ''شیخ مخمور'' ہیں۔

اکا دکا نمایاں مثالوں میں میرزا ادیب کا افسانوی مجموعہ ''صحرا نورد کے خطوط۔'' مجنوں گورکھپوری کے طویل افسانے ''تنہائی''، ''سمن پوش'' اور ''خواب و خیال''، علی عباس حسینی کے افسانے ''رحیم بابا'' اور ''جل پری''، شفیق الرحمٰن کا ''قصہ پروفیسر علی بابا کا'' اور سراج الدین ظفر کا ''الف لیلیٰ کا ایک باب'' جن کی فضا بندی اور افسانوی تدبیر کاری توجہ طلب ہے۔ عزیز احمد کا افسانہ ''آب حیات'' ایک اور نمایاں مثال ہے

لیکن داستان کے وسیع تر کینوس کی انسانے میں کامیاب ترین بازیافت عزیز احمد کے طویل افسانے "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میں ہوئی۔ اس افسانے میں گزشتہ تاریخ کی کامیاب ترین فضا بندی اور زمنی حوالوں سے مطابقت رکھنے والے کرداروں (تیمور لنگ کے حوالے سے) کی پیشکش بڑی کامیابی ہے جس کا باعث عزیز احمد کا وسیع مطالعہ اور بھرپور تاریخی شعور بنا۔

اس روایت میں البتہ انتظار حسین کی اہمیت یوں ہے کہ اس نے داستانوی فضا، اس کی کردار نگاری اور اسالیب کا اپنے عصری تقاضوں کے تحت برتاؤ کرنا چاہا ہے (مثالیں "کایا کلپ"، "جل گر جے"، "گھوڑے کی ندا") لیکن اس سے ہوا یہ کہ حیرت کا کا ریلا آیا جس نے آج کے سنجیدہ قاری کے پاؤں اکھاڑ دیئے ہیں۔ یہ کام انتظار حسین کے "سرکٹے" نے انجام دیا یا "وہ جو کھوئے گئے" کی ساختہ صورت حالات جو حقیقت سے بہت فاصلے پر ہے۔ یہاں حقیقی اور Ethereal کرداروں سے "آخری آدمی" کے کردار زیادہ اہم ہیں اور Ethereal افسانے کی سب سے اچھی مثال "زرد کتا" ہے۔

سو کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے افسانہ طرازوں کو داستان، تمثیل اور لوک قصے سے ناطہ ٹوٹنے کے بعد ورثے میں جو روایات ملیں، وہ خالص افسانوی ادب کی روایات نہ تھیں بلکہ مروجہ معاشرے کی جذباتی اور ذہنی زندگی کی جھلکیاں تھیں۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ہمارے ابتدائی ناولوں کی اٹھان محض تمثیلی قصوں کی حد تک رہ گئی۔ فکشن میں نذیر احمد دہلوی اس کی رکاوٹ خاص تھے۔ ان کے نمایاں کردار کلیم، اکبری اور اصغری محض نقطۂ نظر کو واضح کرنے کا وسیلہ ہیں اور نصوح کا کردار Complex نظر نہیں آتا۔ اس نے ماضی کی تمام متاع کو بیچ چوراہے میں آگ لگائی اور الطاف حسین حالی نے پیروئی مغرب کی تلقین کی۔ بس یہی وہ مقام ہے جہاں سے شاعری میں مغرب کی پیروی کو شعار کیا گیا اور فکشن میں داستان تمثیلی اور لوک قصے کو قابل اعتنا جاننے سے انکار کیا گیا۔ ایسے میں ہمارا افسانہ راشد الخیری اور یلدرم کی تعلیم نسواں اور اصلاح پسندی یا پریم چند کی راجپوت نسل پرستی اور زمانے کے تلخ و ترش بیان سے بہت آگے آیا تو خواجہ حسن نظامی کے افسانے "بہرا شہزادہ" تک آ گیا۔ دراصل ہماری مغرب زدگی نے اُردو افسانے کی صنف کو یہاں کی فضا میں رچنے بسنے کا موقع ہی نہیں دیا اور آنے والے افسانہ نگاروں نے جہاں رومان پرور ماحول اور مافوق کے عمل دخل کو رد کیا وہیں فسانہ طرازی کے مشرقی لحن کو بھی خیر باد کہا۔ قدیم قصہ گوئی اور نئی افسانہ طرازی کا کسی مقام پر کوئی سمبندھ ہی نہیں ہونے دیا گیا یہاں تک کہ جب ہمارے اولین افسانہ نگاروں نے عموماً اور محمد علی ردولوی نے خصوصاً اُردو افسانے کا رشتہ ہماری داستانوں اور قصوں سے جوڑنے کا جتن کیا تو ہمارے ناقدین نے اس کام کو نئے ادبی منظر نامے سے بارہ پتھر باہر کر دیا۔ لیکن اب اس مسلمہ حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اگر ہمارا افسانہ مشرقی روایات کی پاسداری کرتا تو آج اور آنے والے کل میں ہمارا افسانہ مختصر افسانے کی عالمی روایت میں ایک طاقتور مشرقی لحن کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتا اور یہ بالکل اسی نوع کا کام ہوتا، جس کا سہرا بنگلہ فکشن اور شاعری کے حوالے سے رابندر ناتھ ٹیگور کے سر ہے یا ہسپانیہ کے جادوئی حقیقت نگار مارکیز کے سر۔ اب بھی وقت کی ڈور کا سرا ہمارے افسانہ نگاروں کے ہاتھ میں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے افسانوی ادب کی زندہ روایت کو سمجھنے سمجھانے کا جتن کریں اور اس مشرقی لحن کو تازہ کریں جو ہماری نرول پہچان ہے۔

O

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ بحوالہ ''پہلی کرن کے حضور'' از ابوالفضل صدیقی، مطبوعہ: ''سیپ'' کراچی ۱۹۸۸ء

۲۔ مشمولہ ''ہندوستانی زبان کے قواعد'' مطبوعہ: کلکتہ طبع اول: ۱۷۹۶ء

۳۔ جوزف کیمبل نے ''ہیرو کے ہزار چہرے'' میں داستانوی ہیرو کے کردار پر مفصل گفتگو کی ہے۔

۴۔ اس وقت خواجہ صاحب کی عمر چھ سات برس کی تھی۔ بحوالہ مقدمہ ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' مطبوعہ ساقی بک ڈپو، دہلی س۔ن

۵۔ گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، لاہور: ۱۹۳۹ء

واضح رہے کہ یہ مجموعہ پہلی بار ''سوزِ وطن'' کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے جون ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا اس وقت اس مجموعہ میں افسانہ ''سیرِ درویش'' شامل نہ تھا۔ یہ افسانہ ''زمانہ'' کانپور بابت اپریل، مئی، جون، جولائی، ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۲۹ء میں جب گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، لاہور نے ''حب وطن کے قصے معروف بہ سوزِ وطن وسیرِ درویش'' شائع کی تو یہ افسانہ اُس کتاب میں شامل تھا۔

اُردو کا پہلا افسانہ: ایک تعارف

ہمارے ہاں اُردو افسانے کی جڑوں کی تلاش کا عمل قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ محققین کو قدیم اُردو شاعری کی چو ماچائی سے فرصت نہ ملی تو ناقدین نے یہ فریضہ سنبھالا اور اس ضمن میں پہلا قدم ہی غلط پڑا۔

۱۹۵۵ء میں پروفیسر وقار عظیم نے پریم چند کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرتے ہوئے کہا: ''ہندوؤں کا زاویہ نظر خالص سیاسی تھا'' مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اس سیاسی رجحان کا حامل ہے'' دوسری طرف ۱۹۶۱ء میں پروفیسر احتشام حسین نے سجاد حیدر یلدرم کو اُردو کا پہلا اور پریم چند کو دوسرا افسانہ نگار کہا:

''...... ہم کو جو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں، ان میں دو نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک سجاد حیدر یلدرم کا، دوسرا پریم چند کا۔ دونوں کی افسانہ نویسی کی ابتداء کم وبیش ایک ہی زمانے سے ہوتی ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ملا ہے جو ۱۹۰۵ء کا لکھا ہے عنوان ہے ''دنیا کا سب سے انمول رتن۔''[۲]

یاد رہے کہ اس سے قبل پروفیسر وقار عظیم افسانے سے متعلق اپنے اولین مضامین میں سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کو اُردو کے اولین افسانہ نگار بتا چکے تھے۔ جب کہ پریم چند کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرنے والے باقاعدہ محققین میں ڈاکٹر قمر رئیس کا نام بہت نمایاں ہے۔

پریم چند اُردو کے اولین افسانہ نگار کیوں کر مانے گئے، اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۳۲ء میں پریم چند نے اپنے ہندی ادبی مجلّہ ''ہنس'' بنارس کے ''آتم کتھا نمبر'' کے لیے ''جیون سار'' کے عنوان سے اپنی قلم کاری کی روداد لکھی، جس میں انہوں نے اپنے افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کو نہ صرف ۱۹۰۷ء کی تخلیق قرار دیا بلکہ اس کی اشاعت رسالہ ''زمانہ'' کانپور ۱۹۰۷ء میں بتائی۔ پریم چند کے اس بیان کا اُردو ترجمہ پہلی بار رسالہ ''زمانہ'' کانپور (مرتبہ: دیا نرائن نگم) کے ''پریم چند نمبر'' مطبوعہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ پریم چند لکھتے ہیں:

''...... میری سب سے پہلی کہانی کا نام تھا ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ ''زمانہ'' (کانپور) میں چھپی۔''[۳]

پریم چند کے اس بیان پر ہمارے محققین نے آمنا و صدقنا کہا اور پھر چل سو چل، جملہ مضامین اور نصابی کتب میں پریم چند کو اُردو کا پہلا

افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ دیا نرائن نگم نے ''زمانہ'' کانپور ''پریم چند نمبر'' (۱۹۳۷ء) میں پریم چند اور رسالہ ''زمانہ'' کے تعلق کے حوالے سے پریم چند کی مطبوعہ تحریروں کا جو اشاریہ مرتب کیا تھا، اس میں افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کا حوالہ کہیں موجود نہ تھا۔ جب کہ ''زمانہ'' کانپور کی فائل بابت ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء بھی اس ضمن میں خاموش ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کو ہی پریم چند نے اپنا اوّلین افسانہ کیوں شمار کیا؟ اس کے جواب کی تین صورتیں ہو سکتیں ہیں:

۱۔ بطور افسانہ نگار اوّلیت حاصل کرنے کی خواہش۔ اس ضمن میں سلطان حیدر جوش کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔[۴]

۲۔ افسانہ لکھا تو ۱۹۰۷ء میں ہو لیکن جون ۱۹۰۸ء (''سوز وطن'' کا سال اشاعت) تک شائع نہ ہو پایا ہو۔ واضح رہے کہ یہ افسانہ ''سوز وطن'' کے علاوہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔[۵]

۳۔ بہت ممکن ہے کہ پریم چند افسانہ ''عشق دنیا اور حب وطن'' (مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء) کا حوالہ دینا چاہتا ہوں اور بھول کر غلط نام کا اندراج کر گئے ہوں۔

لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ پریم چند نے ''جیون سار'' ۱۹۳۲ء میں قلم بند کیا اور ۱۹۳۶ء (سال وفات) تک اس بیان کی تردید کیوں نہ کی؟

بہر طور، وجوہات کچھ بھی ہوں۔ اس دور کے جملہ ادبی مجلوں کو کھنگالنے کے بعد اب یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پریم چند کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' نہیں بلکہ ''عشق دنیا اور حب وطن'' ہے، جو ''زمانہ'' کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔

تحقیق کی سطح پر غلط فہمیوں کا یہ سلسلہ ''مطالعۂ یلدرم'' (۱۹۷۱ء) از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے ہوتا ہوا مجلّہ ''سیپ'' کراچی (۱۹۸۸ء) میں شائع ہونے والے سلطان حیدر جوش کے خاکے ''پہلی کرسی کے حضور'' از ابوالفضل صدیقی تک چلا آیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے سجاد حیدر یلدرم[۶] اور ابوالفضل صدیقی نے سلطان حیدر جوش کو (جوش کے اپنے بیانات کی روشنی میں) اُردو کا اولین افسانہ نگار شمار کیا ہے۔

یہ سب تحقیق طلب امور سے متعلق تن آسانی کا کیا دھرا ہے، ورنہ اُردو ادب کے اوّلین ادبی مجلوں سے کون واقف نہیں، رسالہ ''زمانہ'' کانپور ''انتخاب لاجواب'' لاہور، علی گڑھ منتقلی، ''معارف'' علی گڑھ، ''مخزن'' لاہور، ''اُردوئے معلّیٰ'' علی گڑھ اور ''اولڈ بوائے'' علی گڑھ جیسے ادبی رسائل کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ جن کا حصول مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں۔ اور اگر اس بحث کو چند بھارتی محققین کی طرح سر سید احمد خان کی تحریر ''گزرا ہوا زمانہ'' (مطبوعہ ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ بابت: یکم صفر ۱۲۹۰ ہجری، مطابق ۳۱ مارچ ۱۸۷۳ء) تک پھیلا دیا جائے تو بھی فنی لوازم ہی حتمی رائے قائم کرنے کی بنیاد ٹھہریں گے۔ سو لگے ہاتھوں یہ قضیہ بھی صاف کر لیا جائے، سر سید احمد خان کی تحریر ''گزرا ہوا زمانہ'' دیکھتے چلیں:

گزرا ہُوا زمانہ



سرسیّد احمد خان

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے، رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے، مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر، وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے، اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے، اتنا ہی زیادہ اُس کا غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے، اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا ''ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے!! افسوس کہ میں نے تمھیں بہت دیر میں یاد کیا۔''

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں، ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ ''او ابھی بہت وقت ہے'' اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ''ابھی وقت بہت ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے، درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں، تب وہ چلّا کر بولا ''ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات'' یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگیں کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی

نہ کر پایا، آتا تھا اور اس پر اس ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا، اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو!

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں کہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنویں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کی جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں، مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنویں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا۔ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا "ہائے وقت، ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے، نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض، اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ "واللہ لا ازید ولا انقص" ادا کر کہ انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخیر تک رہے گا، پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل آخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں، مگر انسان کی بھلائی آخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اُس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا۔ "ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دینار یں دیتا اگر وقت

پھر آتا اور میں جوان ہوسکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس کو گلے لگا کر اس کی بپی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ پشیمان بڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے، میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا۔ جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا، او خدا، تو میری مدد کر۔ آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تا کہ آخر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو آخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے، آمین۔



سرسید احمد خان کی یہ تحریر اپنے آغاز میں یقیناً افسانہ کہلانے کی مستحق ہے لیکن اس تحریر کا وسط اور اختتامیہ اسے واضح طور پر ایک اصلاحی مضمون بنا دیتا ہے۔ آغاز تمثیلی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی کے ظاہر ہوتے ہی سرسید احمد خان کی اصلاح پسندی اس افسانوی آغاز کو اصلاحی مضمون کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ جبکہ تحریر کا اختتامیہ تو ہے ہی اصلاحی مضمون کا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرسید احمد خان کی جملہ تحریروں میں فنِ افسانہ کی طرف پیش قدمی دکھائی نہیں دیتی۔ زیادہ سے زیادہ تمثیل یا حکایت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یُوں ''گزرا ہوا زمانہ'' ان کی واحد تحریر ہے جو افسانہ بنتے بنتے رہ گئی۔

دراصل یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب ہمارے ہاں فکشن کے خلاف با قاعدہ ایک ردِ عمل کی صورت دکھائی دی۔ علی گڑھ تحریک کے نمائندہ مجلے ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ میں فکشن کے لیے کوئی گوشہ مخصوص نہ تھا۔ مولانا نذیر احمد دہلوی فکشن کی طرف آئے بھی تو اصلاحی جذبے کے تحت ناول کی بجائے تمثیلی قصے کی طرف نکل گئے اور مولانا محمد حسین آزاد نے ''نیرنگِ خیال'' (حصہ اول) کے دیباچے میں لکھا:

''اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے اور اس واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے۔'' ؎

محمد حسین آزاد کی ڈانٹ کا نتیجہ کہیں یا افسانہ نگار کہلانے کا خبط، ''مخزن'' لاہور: دسمبر ۱۹۰۱ء میں مفتی غلام جعفر کی ایک افسانہ نما تحریر: ''دوراستے'' کے عنوان سے شائع ہوئی جسے سرسید کے ''گزرا ہوا زمانہ'' سے نابلد محققین اُردو کا پہلا افسانہ قرار دے سکتے ہیں۔ جب کہ ''دو

راستہ'' سرسید کے اصلاحی مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' کا چربہ ہے۔ اُس تحریر کا اختتامیہ بھی اسے اصلاحی مضمون ہی ثابت کرتا ہے۔

یہی صورت، میری متعارف کردہ ایک افسانوی تحریر ''ایک چاندنی رات کا نظارہ: بہارِ کشمیر میں'' (۱۹۰۲ء) از آفتاب احمد ہے۔ جسے داستانوں سے مخصوص حیرت زا کیفیت اور محض ایک منظر سے متعلق ہونے کے سبب میں نے داستان سے افسانے تک کے عبوری دور میں رکھا ہے، افسانہ شمار نہیں کیا۔



ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہوئے کہ:

''۱۹۰۳ء میں ''مخزن'' میں راشد الخیری کا ''نصیر اور خدیجہ'' شائع ہوا۔ جس کو اُردو کا پہلا افسانہ سمجھا جاتا ہے۔'' ۸

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خاکی کی رسائی ''مخزن'' لاہور کی فائل تک نہ ہو سکی اور اپنے تحقیقی مقالہ کو شائع کرتے وقت انہوں نے پھر اسی تساہل سے کام لیا، جس کی نشاندہی اوپر کی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر خاکی کی اس ادھوری تحقیق کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر انوار احمد نے اردو افسانہ سے متعلق پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھتے ہوئے ''مخزن'' شمارہ نمبر ۳، جلد ۶، بابت دسمبر ۱۹۰۳ء میں سے راشد الخیری کا یہ افسانہ بعنوان ''نصیر اور خدیجہ'' ڈھونڈ تو نکالا ۹ لیکن ڈاکٹر انوار احمد اُس افسانے کا متن سامنے نہ لائے۔ جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ متن سامنے لایا جاتا تاکہ وہ اُلجھاوے رفع ہوتے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ یہی سوچ کر میں نے ''مخزن'' لاہور، شمارہ: ۳، جلد: ۶ بابت دسمبر ۱۹۰۳ء کے صفحہ ۲۷ تا ۳۱ پر سے ''نصیر اور خدیجہ'' کا متن مع مفصل تعارفیہ بعنوان: ''اُردو کا پہلا افسانہ نگار'' ''فنون'' لاہور جنوری۔ مارچ ۱۹۹۱ء کی معرفت اُردو دنیا سے متعارف کروا دیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ راشد الخیری کی کتاب ''مسلی ہوئی پتیاں'' میں یہ افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کے عنوان سے شامل نہیں کیا گیا۔ ''مسلی ہوئی پتیاں'' میں اس کا عنوان ''بڑی بہن کا خط'' ہے۔ جو اس کتاب کے اوّلین ایڈیشن مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی: طبع اول ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۲۸ تا ۳۲ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

یوں تاریخی اعتبار سے اُردو میں طبع زاد افسانے کا آغاز درج ذیل طریق پر ہوا:

۱۔ ''نصیر اور خدیجہ'' از راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور : دسمبر ۱۹۰۳ء

۲۔ ''چھاؤں'' از علی محمود، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور : جنوری ۱۹۰۴ء

۳۔ ''تصویرِ غم'' از دردمند اکبر آبادی، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور : فروری ۱۹۰۴ء

۴۔ ''مرگِ محبوب'' از وزارت علی اورینی، مطبوعہ: ''اُردوئے معلیٰ'' علی گڑھ : جون ۱۹۰۵ء

۵۔ ''پُر اسرار عمارت'' از حکیم یوسف حسن، مطبوعہ: ''انتخاب لاجواب'' لاہور : ۱۹۰۵ء

۶۔ ''احمد'' از سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: ''علی گڑھ منتھلی'' علی گڑھ : مئی ۱۹۰۶ء

۷۔ ''نابینا بیوی'' از سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی : دسمبر ۱۹۰۷ء

۸۔ ''عشقِ دنیا و حُبِ وطن'' از پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور : اپریل ۱۹۰۸ء

یاد رہے کہ یلدرم کا افسانہ ''نشہ کی پہلی ترنگ'' مطبوعہ: ''معارف'' علی گڑھ، شمارہ نمبر ۴ جلد نمبر ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء خلیل رشدی کے ترکی افسانے کا ترجمہ ہے، طبع زاد افسانہ نہیں۔ یلدرم نے ترجمہ کرنے کے لیے خلیل رشدی کے اس افسانے کو مجلہ: ''ثروت فنون'' سے انتخاب کیا تھا اور یہیں سے یلدرم کی ترجمہ نگاری کا آغاز ہوا جب کہ پطرس بخاری [۱]، ڈاکٹر معین الرحمٰن [۱] اور قرۃ العین حیدر [۱] نے یلدرم کے کام کو Glorify کرتے ہوئے ان کے افسانوی تراجم: ''ثالث بالخیر''، ''صحبت ناجنس'' اور ''خارستان وگلستان'' کو بھی طبع زاد قرار دیا اور یوں اس خالصتاً تحقیقی معاملے کو تاویکھنائی میں ڈالے رکھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ایرکن ترکمان (صدر شعبہ السنہ شرقیہ، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ۔ ترکی) نے اصل متون سے تقابلی جائزہ کے بعد ان تینوں تحریروں کو ترکی افسانوں کے تراجم ثابت کر دیا۔ [۱۳]

''عصمت کراچی'' (راشد الخیری نمبر) کے مطابق راشد الخیری کو افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' [۱۴] لکھنے کی تحریک ان کی والدہ رشید الزماں بیگم کی سنائی ہوئی دو یتیم لڑکیوں کی کہانی سے ہوئی، جن کے ماموں نے ان کی طرف سے لاپروائی برتی۔ اس افسانے کو سر شیخ عبد القادر نے ''مخزن'' لاہور کے شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۶، بابت دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع کرتے وقت بطور مدیر ایک مختصر نوٹ سے مزید نمایاں کر دیا۔ عبارت درج ذیل ہے:

''یہ مضمون مدت کے تقاضوں کے بعد ہمیں اپنے دوست مولوی محمد عبد الراشد صاحب، مترجم عدالت بندوبست سے ملا ہے۔ صاحب موصوف شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد کے عزیزوں میں ہیں اور زبان پر خوب قدرت رکھتے ہیں، خصوصاً مستورات کی زبان بے تکلف لکھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب کی لاجواب کتابوں کے بعد مولوی عبد الراشد صاحب کی کتاب ''منازل السائرہ'' اپنے قسم کی ایک لاجواب کتاب ہے، جس میں مستورات کی زبان نہایت خوبی سے لکھی ہے۔ اس مضمون میں بڑی بہن ''خدیجہ'' اپنے بھائی نصیر کو خط لکھتی ہے اور دوسری مری ہوئی بہن کے بچوں کی خراب حالت کی طرف اس کی توجہ دلاتی ہے۔ خط اس بے ساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔''

واضح رہے کہ راشد الخیری (اصل نام: محمد عبد الرشید) کے ابتدائی افسانے از قسم ''نصیر اور خدیجہ'' اور 'بدنصیب کا لال' بالترتیب: ''محمد عبد الرشید'' اور ''محمد عبد الراشد'' کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ بعد میں انہوں نے 'راشد الخیری' کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔

افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' از راشد الخیری ملاحظہ کرنے کے لیے دیکھیے گوشہ: ''اردو کے اولین افسانے''



راشد الخیری کا اور اُردو زبان کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ' خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور یہ تکنیک اس دور کے فکشن کی مقبول ترین تکنیک کہی جا سکتی ہے۔ انگریزی ادب میں پہلی بار سیموئل رچرڈسن (۱۶۸۹ء......۱۷۶۱ء) نے اس تکنیک کو اپنے تمثیلی قصے ''پامیلا'' میں برتا اور لیو لیپے نے اس تکنیک میں آٹھ خطوط پر مشتمل اپنا افسانہ ''آئینہ'' مکمل کیا۔ [۱۵]

راشد الخیری عالمی سطح پر اس تکنیک کو برتنے والے تیسرے تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے ''نصیر اور خدیجہ'' (مطبوعہ: ۱۹۰۳ء) کے بعد یہ تکنیک اپنے دس دیگر افسانوں میں برتی۔ ان کا تیسرا طبع زاد افسانہ ''عصمت وحسن'' (مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور ۱۹۰۶ء)، ''کثرت ازدواج'' (مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور ۱۹۰۸ء)، ''نند کا خط بھاوج کے نام'' (مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی جون ۱۹۰۸ء) اور افسانوی مجموعہ ''مسلی ہوئی پتیاں'' (طبع اول: ۱۹۳۷ء) میں شامل کل گیارہ افسانے (زمانہ تخلیق: ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۹ء) اسی تکنیک کے حامل ہیں۔ بعد ازاں اردو کے دوسرے

افسانہ نگار علی محمود نے بھی ''نینی تال'' (مطبوعہ: ۱۹۱۰ء اسی تکنیک میں لکھا)۔ یہی صورت اردو کے چھٹے افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ جنہوں نے ''دوست کا خط'' نامی افسانہ ۱۹۰۶ء میں قلم بند کیا اور وہ افسانہ ''مخزن'' لاہور بابت: اکتوبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔

ترک افسانہ نگار احمد حکمت مفتی اوغلو (۱۸۷۰ء .... ۱۹۲۷ء) نے لگ بھگ ۱۹۰۵ء میں اس تکنیک کو برتا اور سجاد حیدر یلدرم اس کے ایک افسانے (''صحبت نا جنس'' مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور فروری ۱۹۰۶ء) کو ترجمہ کرتے ہوئے پہلی بار اس تکنیک سے متعارف ہوئے، پھر یہ تکنیک انہیں اس قدر بھائی کہ اپنے طبع زاد افسانوں ''دوست کا خط'' (مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء) اور ''گمنام خطوط'' (مشمولہ: ''حکایات و احتساسات'' مطبوعہ: ۲۷۔۱۹۲۶ء) کو اسی تکنیک میں مکمل کیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں یہ سلسلہ قاضی عبدالغفار کے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور میرزا ادیب کے ''صحرانورد کے خطوط'' تک پہنچا، جو بلا شبہ اس تکنیک کے درتارے کا بام عروج ہے۔



حوالہ:

۱۔ سمپوزیم: ''اُردو افسانے میں روایت اور تجربے''، شرکاء: سعادت حسن منٹو، وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، عبادت بریلوی، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، حمید اختر، انتظار حسین اور محمد طفیل۔ مشمولہ: ''نقوش'' لاہور (افسانہ نمبر۔ دو جلدیں) صفحہ: ۱۰۲۷ جلد دوم، طبع اوّل: ۱۹۵۵ء

۲۔ اُردو افسانے پر ایک سمپوزیم منعقدہ لکھنؤ ۱۹۶۱ء، مشمولہ: ''اعتبار نظر'' از احتشام حسین، مطبوعہ: کتاب پبلشرز لکھنؤ، طبع اوّل: ۱۹۶۵ء، صفحہ: ۱۳۸

۳۔ بحوالہ: ''زمانہ'' کانپور (مرتبہ: دیا نرائن نگم) پریم چند نمبر: ۱۹۳۷ء، صفحہ: ۸

۴۔ بحوالہ ''پہلی کرسی کے حضور'' از ابوالفضل صدیقی، مطبوعہ: ''سیپ'' کراچی ۱۹۸۸ء

۵۔ ''تپ وطن کے قصے معروف بہ سوز وطن و سیر درویش'' مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، لاہور طبع اول۔ ۱۹۲۹ء، صفحہ ۷ تا ۱۷

۶۔ بحوالہ: اُردو کا پہلا افسانہ'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مطبوعہ: ''فنون'' لاہور، بابت: نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ء

۷۔ ''نیرنگ خیال'' (حصہ اوّل) مطبوعہ: مفید عام پریس، لاہور، طبع اوّل: ۱۸۸۰ء

۸۔ بحوالہ: ''اُردو افسانے کا ارتقاء'' مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لائبریری اُردو سیکشن۔ صفحہ ۱۶۳ مطبوعہ: مکتبہ خیال، لاہور، طبع اول: اگست ۱۹۸۷ء، صفحہ نمبر ۱۵۵

۹۔ ''اُردو افسانہ۔ تحقیق و تنقید'' بیکن بکس، ملتان، طبع اوّل ۱۹۸۸ء، صفحہ نمبر ۴۲

۱۰۔ ''پگڈنڈی'' امرتسر (یلدرم نمبر) شمارہ نمبر ۵، جلد ۹

۱۱۔ ''اُردو کا پہلا افسانہ'' مطبوعہ: ''فنون'' لاہور سالنامہ ۱۹۶۹ء

۱۲۔ ''کار جہاں دراز ہے'' مکتبہ اُردو ادب، لاہور، طبع دوم: س۔ن

۱۳۔ دیکھیے: ''سجاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم'' مطبوعہ: ''ماہِ نو'' لاہور: جون ۱۹۸۸ء

۱۴۔ اس افسانے پر راشد الخیری کا اصل نام محمد عبدالراشد درج ہے۔

۱۵۔ لیو لیپے کے افسانے سے خیال مستعار لے کر ف۔م۔ افضل نے افسانہ ''آئینہ'' لکھا تھا جو ''ہمایوں'' لاہور بابت: مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

اُردو کے اوّلین افسانہ نگار

(راشد الخیری، علی محمود، دردمند اکبرآبادی، وزارت علی اورینی، حکیم یوسف حسن، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، پریم چند، چودھری محمد علی ردولوی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، مہاشہ سدرشن اور قاضی عبدالغفار)

۲۰ویں صدی کا آغاز سوشل ازم، استھیٹک ازم (Aesthticism) اور امپیریل ازم کے زور وشور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دور کے ہندوستان میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ صدیوں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں یکلخت تلاطم پیدا ہوا تھا۔ مہاجنوں اور جاگیرداروں کی بے رحم گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور فرسودہ رسم ورواج اور تعصبات کی چکی میں پسے ہوئے انسان نے نجات کی راہیں تلاش کرنے کا جتن کیا تھا۔ خصوصاً ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء کے ہندوستان کی عوامی تحریکوں نے اس قدر شدت اختیار کرلی تھی کہ سیکڑوں میل دور روس میں لینن نے کہا تھا:

''ہندوستان کے مزدور بھی بیدار ہوگئے ہیں، ان کی یہ جنگ اجتماعی سیاسی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے۔''

اس وقت کی مشینی زندگی نے نئے طبقات کو جنم دیا تھا اور مغربی تہذیب نے سوچنے نیز رہن سہن کے نئے انداز وضع کیے تھے اور ہندوستان کی ایک آنکھ مغرب کی سمت بھی کھلی ہوئی تھی۔ رڈیارڈ کپلنگ کی تحریر دائمی برطانوی راج کی خبر دیتی تھی اور برنارڈ شا کی فیبین سوسائٹی اشتراکیت کے پرچار میں جتی ہوئی تھی۔ آسکر وائیلڈ جمالیات کی موشگافیوں میں مصروف تھا اور ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے آئرلینڈ کی اسرار پسندی، آئرش قوم پرستی اور متصوفانہ اقدار کی بازیافت چاہی تھی۔ یہ ایڈورڈین عہد تھا۔ سیاسیات اور سماجیات کے ساتھ ادب میں بھی عجب طرح کی گہما گہمی تھی۔

یہ زمانہ ہندوستان کی ذہنی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی کو نئی کروٹ دے رہا تھا اور یہ تبدیلی ایک غیر ملکی نوآبادیاتی حکومت کے مفادات، اثر پذیری اور ریشہ دوانیوں کے سبب کچھ پیچیدہ بھی تھی اور ایک حد تک مصنوعی بھی۔ مصنوعی اس اعتبار سے کہ قومیت اور قومی کلچر کے جن نئے تصورات نے یورپ کے صنعتی سماج میں جنم لیا تھا اسے حکومتی سطح پر ہندوستان میں پہنچنے سے روکا جارہا تھا۔ ہندوستانی قلم کاروں کی تحریروں پر کڑی نظر رکھ کر سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یوں جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد برطانوی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ

ان کی ہندوستانی رعایا متحدہ قومیت اور وسیع تر قومی مفاد کے مشترکہ احساس شعور سے بیگانہ رہے

ان حالات میں ایک طرف تو مسلم علماء اور آریہ سماجی تھے اور دوسرے طرف ایک ''روشن خیال'' متوسط طبقہ تھا جو نئے نظام تعلیم کا پروردہ ہونے کے سبب مغربی تہذیب و تمدن کے گن گا رہا تھا۔ بابو شو پرشاد کے زیر اثر ہندوؤں میں احیائے ماضی کا جوش اٹھا تو مسلمانوں نے بھی اپنی جداگانہ تہذیبی پالیسی مرتب کرنی شروع کی، یہاں تک کہ سید احمد خان نے قیام بنارس کے دوران اپنے دائرہ فکر و عمل پر نظر ثانی کی اور قوم کا لفظ صرف مسلم جماعت کے لیے استعمال کرنے لگے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ آگے چل کر برطانوی راج میں بابو شو پرشاد ''ستارہ ہند'' کہلائے، سید احمد خان کو ''سر'' کا خطاب ملا اور ان کے بیشتر ساتھی ''شمس العلماء'' قرار پائے۔ ان تحریکوں کے اثرات اُردو کے اولین افسانہ طرازوں کی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔



اُردو کے اوّلین افسانے: ۱۹۰۳ء......۱۹۱۴ء

۱۔ ''نصیر اور خدیجہ''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	دسمبر ۱۹۰۳ء
۲۔ ''چھاؤں''	علی محمود، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	جنوری ۱۹۰۴ء
۳۔ ''تصویرِ غم''	دردمند اکبرآبادی، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	فروری ۱۹۰۴ء
۴۔ ''ایک پرانی دیوار''	علی محمود، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	اپریل ۱۹۰۴ء
۵۔ ''مرگِ محبوب''	وزارت علی اورینی، مطبوعہ: ''اُردوئے معلیٰ'' علی گڑھ	:	جون ۱۹۰۵ء
۶۔ ''بدنصیب کا لال''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	اگست ۱۹۰۵ء
۷۔ ''پُراسرار عمارت''	حکیم یوسف حسن، مطبوعہ: ''انتخاب لاجواب'' لاہور	:	۱۹۰۵ء
۸۔ ''احمد''	سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: ''علی گڑھ منتھلی'' علی گڑھ	:	مئی ۱۹۰۶ء
۹۔ ''دارالغرور''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	جون ۱۹۰۶ء
۱۰۔ ''غربت و وطن''	سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: ''اُردوئے معلیٰ'' علی گڑھ	:	اکتوبر ۱۹۰۶ء
۱۱۔ ''دوست کا خط''	سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	اکتوبر ۱۹۰۶ء
۱۲۔ ''چڑیا چڑے کی کہانی''	سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	اپریل ۱۹۰۷ء
۱۳۔ ''عصمت و حسن''	(دو اقساط) راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	اپریل، مئی ۱۹۰۷ء
۱۴۔ ''رویائے مقصود''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور	:	اکتوبر ۱۹۰۷ء
۱۵۔ ''شاہین و درّاج''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی (پہلی قسط)	:	فروری ۱۹۰۸ء

۱۶۔ ''حکایہ لیلیٰ مجنوں''	(آٹھ اقساط) سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: ''مخزن''، دہلی	:	اکتوبر ۱۹۰۷ء تا مئی ۱۹۰۸ء
۱۷۔ ''نابینا بیوی''	سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی	:	دسمبر ۱۹۰۷ء
۱۸۔ ''عشق دنیا وحب وطن''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	اپریل ۱۹۰۸ء
۱۹۔ ''نند کا خط بھاوج کے نام''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی	:	جون ۱۹۰۸ء
۲۰۔ ''کثرت ازدواج''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی	:	۱۹۰۸ء
۲۱۔ ''دنیا کا سب سے انمول رتن''	پریم چند، مشمولہ: ''سوز وطن''، زمانہ پریس، کانپور	:	جون ۱۹۰۸ء
۲۲۔ ''شیخ مخمور''	پریم چند، مشمولہ: ''سوز وطن''، زمانہ پریس، کانپور	:	جون ۱۹۰۸ء
۲۳۔ ''یہی میرا وطن ہے''	پریم چند، مشمولہ: ''سوز وطن''، زمانہ پریس، کانپور	:	جون ۱۹۰۸ء
۲۴۔ ''صلۂ ماتم''	پریم چند، مشمولہ: ''سوز وطن''، زمانہ پریس، کانپور	:	جون ۱۹۰۸ء
۲۵۔ ''شاہین و دُرّاج''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی (دوسری قسط)	:	اکتوبر ۱۹۰۸ء
۲۶۔ ''انقلاب'' (چھ اقساط)	سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی	:	اپریل ۱۹۰۹ء تا ستمبر ۱۹۰۹ء
۲۷۔ ''سارس کی تارک الوطنی''	(دو اقساط) راشد الخیری، مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی	:	اگست، ستمبر ۱۹۰۹ء
۲۸۔ ''گناہ کا خوف''	چودھری محمد علی ردولوی، تحریر: لگ بھگ	:	۱۹۰۹ء
۲۹۔ ''بے زبانوں کا صبر''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی	:	۱۹۰۹ء
۳۰۔ ''گناہوں کا اگنی کنڈ''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	مارچ ۱۹۱۰ء
۳۱۔ ''سیر درویش'' (دو اقساط)	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	اپریل، مئی ۱۹۱۰ء
۳۲۔ ''شکار''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	جون ۱۹۱۰ء
۳۳۔ ''لال کی تلاش'' (دو اقساط)	راشد الخیری، مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی	:	جون، جولائی ۱۹۱۰ء
۳۴۔ ''نینی تال''	علی محمود، مطبوعہ: ''ادیب'' الہ آباد	:	جولائی ۱۹۱۰ء
۳۵۔ ''رانی سارندھا''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	ستمبر ۱۹۱۰ء
۳۶۔ ''بے غرض محسن''	پریم چند، مطبوعہ: ''ادیب'' الہ آباد	:	ستمبر ۱۹۱۰ء
۳۷۔ ''بڑے گھر کی بیٹی''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	دسمبر ۱۹۱۰ء
۳۸۔ ''ساون کی چڑیاں''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی	:	۱۹۱۰ء
۳۹۔ ''وکرمادتیہ کا تیغہ''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	جنوری ۱۹۱۱ء
۴۰۔ ''راجہ ہردول''	پریم چند، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور	:	اپریل ۱۹۱۱ء
۴۱۔ ''خیالستان کی پری''	راشد الخیری، مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی	:	۱۹۱۱ء

۴۲۔ ''مظلوم کی فریاد'' راشد الخیری، مطبوعہ: ''عصمت'' دہلی : ۱۹۱۱ء

۴۳۔ ''ماہ جبین اندرا'' راشد الخیری، مطبوعہ: ''تمدن'' دہلی : ۱۹۱۱ء

۴۴۔ ''مسز ابیس'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور : جولائی ۱۹۱۱ء

۴۵۔ ''تائید غیبی'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور : ستمبر ۱۹۱۱ء

۴۶۔ ''چاندنی چوک کا جنازہ'' راشد الخیری، مطبوعہ: ''کہکشاں'' : ۱۹۱۱ء

۴۷۔ ''مساوات'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''الناظر'' لکھنؤ : مئی ۱۹۱۲ء

۴۸۔ ''دیور بھاوج کی خط کتابت'' راشد الخیری، مطبوعہ: ''تمدن'' دہلی : ۱۹۱۲ء

۴۹۔ ''عرب شہید کا گھر'' خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ: روزنامہ ''زمیندار''، لاہور : ۱۹۱۲ء

۵۰۔ ''سہرا شہزادہ'' خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ: ''ہمایوں'' لاہور : جنوری ۱۹۱۳ء

۵۱۔ ''ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' نیاز فتح پوری، مطبوعہ: ''تمدن'' دہلی : جنوری ۱۹۱۳ء

۵۲۔ ''ایک شاعر کا انجام'' نیاز فتح پوری، مشمولہ: ''ایک شاعر کا انجام'' مساوات پریس، الہ آباد: ۱۹۱۳ء

۵۳۔ ''پھر بھی عمر قید'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''الناظر'' لکھنؤ : اپریل ۱۹۱۳ء

۵۴۔ ''پھول'' مہاشہ سدرشن، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور : جنوری ۱۹۱۴ء

۵۵۔ ''طوقِ آدم'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''الناظر'' لکھنؤ : مارچ ۱۹۱۴ء

۵۶۔ ''پریم کی انگوٹھی'' اعظم کریلوی، مطبوعہ: ''طوفان'' الہ آباد : ۱۹۱۴ء

۵۷۔ ''اتفاقات زمانہ'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: ''الناظر'' لکھنؤ : جون ۱۹۱۴ء

۵۸۔ ''بیگمات کے آنسو'' (مجموعہ) خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ: اجازت توحید، میرٹھ : طبع اول: ۱۹۱۴ء

۵۹۔ ''حیات انسانی پر دو پرندوں کی بحث'' راشد الخیری، مطبوعہ: ''تمدن'' دہلی : ۱۹۱۴ء



۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۴ء کے گیارہ سالوں میں اُردو کے ابتدائی افسانوں میں اگر خواجہ حسن نظامی کے مجموعہ ''بیگمات کے آنسو'' طبع اول: ۱۹۱۴ء میں شامل تمام افسانوں نیز کم معروف اور فی الوقت نایاب اخبارات و جرائد میں شائع شدہ افسانوں کو بھی شمار کریں تو بھی طبع زاد افسانوں کی تعداد کسی طور ستر بہتر سے تجاوز نہیں کرتی۔ درج بالا فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ راشد الخیری (۱۹۰۳ء) کے فوراً بعد جنوری ۱۹۰۴ء میں سامنے آنے والے اُردو کے دوسرے افسانہ نگار علی محمود نے محض تین افسانے یادگار چھوڑے جب کہ اُردو کے تیسرے اور چوتھے افسانہ نگار، درمند اکبر آبادی (فروری ۱۹۰۴ء) اور وزارت علی اور یئی (جون ۱۹۰۵ء) صرف ایک ایک افسانہ لکھ کر ادبی اُفق سے غائب ہو گئے۔ بہت ممکن ہے ان دونوں افسانہ نگاروں کے دو ایک افسانے اور بھی مل جائیں لیکن یہ طے ہے کہ علی محمود، درد مند اکبر

آبادی اور وزارت علی اور یتی اُردو افسانہ کی صنف (جسے ''مخزن'' جیسے اہم جریدے میں تادیر ''مضمون'' یا ''قصہ'' کہا جاتا رہا) کے امکانات سے ناواقف تھے یا شاید انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہ تھا، اس لیے آئے اور چل دیے۔ اُن تینوں میں سے علی محمود امکانات سے پُر تھے، جس کا ثبوت افسانہ ''نینی تال'' مطبوعہ: ادیب، الہ آباد، جولائی ۱۹۱۰ء ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ بھی دردمند اور وزارت علی اور یتی کی طرح اپنی لہر میں تھے، راشد الخیری، سلطان جوش یلدرم اور پریم چند کی طرح جم کر کام نہ کر سکے اور معدوم ہو گئے۔ لے دے کر حکیم یوسف حسن بچے، لیکن اُردو کا یہ پانچواں افسانہ نگار ادبی اُفق پر تادیر متحرک رہنے کے باوجود وہ پہچان نہ بنا سکا جو راشد الخیری، جوش، یلدرم اور پریم چند کے حصے میں آئی اور ان "ابتدائی بڑے ناموں کے بعد چودھری محمد علی ردولوی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری اور مہاشہ سُدرشن تو باقاعدہ افسانہ نگار تھے اور انہوں نے خود کو منوایا بھی۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک زمانے میں پریم چند کے جس افسانے (دنیا کا سب سے انمول رتن) کو اُردو کا پہلا افسانہ شمار کیا جاتا رہا، تاریخی اعتبار سے اُردو کے طبع زاد افسانوں میں اُس کا اکیسواں نمبر ہے اور جس افسانے کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اُردو کا پہلا افسانہ قرار دیتے رہے، یعنی خواجہ حسن نظامی کا ''بہرا شہزادہ''...... اُس افسانے کا اُردو کے طبع زاد افسانوں میں پچاسواں نمبر ہے۔ نیاز فتح پوری کا پہلا افسانہ اکاون نمبر پر اور مہاشہ سُدرشن کا پہلا افسانہ چون نمبر پر۔ اب صرف ایک نام رہ جاتا ہے اور وہ ہیں چودھری محمد علی ردولوی۔ اُنہوں نے بلاشبہ افسانہ نگاری کا آغاز یلدرم اور پریم چند کے ساتھ کیا لیکن ادبی جرائد رسائی تک نہ ہونے کے سبب ان کے افسانوں کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ اس نارسائی کی وجہ اُن کا تعلقہ دار ہونا تھا۔ اُن کی سماجی حیثیت، رسائل کے مدیران کو افسانہ برائے اشاعت بھجوانے سے روکتی رہی۔ البتہ اُنہوں نے اپنی تحریروں کی اشاعت کا اہتمام خود سے کیا۔

ایک اور اہم بات کہ درج بالا فہرست میں شامل افسانوں کے باہمی موازنہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی پریم چند اپنے دیگر معاصرین سے بہتر افسانہ نگار تھے۔ زبان و بیان کے حوالے سے راشد الخیری، چودھری محمد علی ردولوی اور خواجہ حسن نظامی بہت نمایاں اور قابل توجہ ہیں، سلطان حیدر جوش کے ہاں تکنیک کا تنوع سب سے بڑھ کر ہے۔ رُومانی فضابندی میں علی محمود، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری قدرے نمایاں ہیں لیکن سب سے مضبوط بیانیہ چودھری محمد علی ردولوی کا ہے جب کہ داستان سے جڑت پریم چند کے افسانوں کا خاصہ اور قصہ گوئی کا بیانیہ چودھری محمد علی ردولوی اور حسن نظامی کے ہاں ملتا ہے، اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ آگے چل کر پریم چند نے اپنے بہتر وژن کے سبب دیگر قریبی معاصرین پر واضح برتری حاصل کر لی۔

۱۔ راشد الخیری، حکیم یوسف حسن، سلطان حیدر جوش، پریم چند اور مہاشہ سُدرشن۔
ہندو مسلم سوسائٹی کی فرسودہ رسوم و رواج، مہاجنوں اور جاگیرداروں کی بے رحم گرفت کے خلاف مزاحمت، قوم پرستی اور اصلاح نسوانی کی روایت۔

۲۔ چوہدری محمد علی ردولوی اور خواجہ حسن نظامی
فن برائے فن کے حوالے سے داستانوی روایت کی بازیافت کا عمل اور ماضی میں پناہ ڈھونڈنے کا رویہ۔

۳۔ علی محمود، دردمند اکبر آبادی، وزارت علی اور یتی، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار۔
رُومان اور اصلاح پسندی کی روایت

○

۱۔ اُردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری سرسید تحریک کے پروردہ تھے اور مسلم متوسط طبقہ کی معاشرت کے ہر پہلو کے شناسا۔ اس سوسائٹی میں کاظم جیسے دین دار اور پرہیزگار بزرگ بھی تھے اور صالحہ جیسی حیا پرور اور خوددار لڑکیاں بھی۔ راشد الخیری کے دل پر ان دو کرداروں کا نقش انمٹ تھا۔ پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی معاصر معاشرت کی فضا مسموم ہوگئی اور راشد الخیری نے اُردو کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' (مطبوعہ ''مخزن'' لاہور، دسمبر ۱۹۰۳ء) رقم کیا۔ یہ افسانہ ایک بہن کی طرف سے بھائی کے نام ایک خط کی صورت میں ہے اور افسانہ نگاری کے جملہ لوازم پر پورا اترتا ہے۔ مغربی دنیا میں لیو لیپے نے پہلی بار اس تکنیک کو برتا تھا اور آٹھ خطوط پر مشتمل ایک افسانہ لکھ کر اس تکنیک کو متعارف کروایا تھا۔[۱]

راشد الخیری نے بقول پریم چند: ''انفرادی فطرت نہ پائی تھی۔ ان کی فطرت کا رنگ اجتماعی تھا۔ صالحہ اور کاظم کی حیثیت افراد کی ہے۔ وہ اپنے طبقے کے نمائندے ہیں انہیں کے ذریعہ مولانا راشد سوسائٹی کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔

سوسائٹی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ توہمات اس کے گلے کا ہار ہو رہے ہیں۔ پیروں اور مریدوں نے اسے تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ شرک نے مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسراف ایک عذاب ہو گیا ہے اور انگریزی تہذیب اپنی نمائشوں اور دلفریبیوں کے ساتھ سوسائٹی کے حقیقی اجزاء کو منتشر کرتی جا رہی ہے۔ رواداری کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ کنبہ پروری عنقا ہو رہی ہے۔ خود غرضیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ نفسانیت کا رنگ غالب ہے۔ روحانیت معدوم ہو رہی ہے۔ عورت مظلوم ہے۔ اسے اس کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس پر جسمانی اور روحانی قیدیں اس کثرت سے عائد کر دی گئی ہیں کہ وہ مفلوج ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی رفیق حیات نہ رہ کر محض اس کی تفریح کی چیز بن گئی ہے۔ اس کی ذلت اور پستی کی مثالیں آئے دن ان کے تجربے میں آئی ہوں گی اور کوئی تعجب نہیں کہ ان کا دردمند دل اس زبوں حالی پر روتا تھا اور اس کی اصلاح کے لیے بیتاب ہو جاتا تھا۔ ان کے افسانے اور ناول زخم خوردہ دل کے نالے ہیں جن میں تاثیر کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔''[۲]

۲۔ ''غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے مسلمانوں کے لیے لکھا ہے، جس طبقہ کو اٹھانا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے، اتنا ہی نہیں، کہیں کہیں تو آپ کے افسانے مذہبی تبلیغ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔''[۳]

پریم چند نے جو گلہ راشد الخیری سے اپنے بھرپور مضمون کے آخر میں کیا ہے، اس پر مفصل گفتگو کا موقع آگے آئے گا۔ راشد الخیری نے تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اُردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی اور مسلم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اخلاقی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اپنا موضوع بنایا تھا، اور یوں راشد الخیری نے جو روش ''نصیر اور خدیجہ'' میں اختیار کی تھی اور موضوعات کا جو دھارا پکڑا تھا تادم آخر اسے نہیں چھوڑا۔ اس اعتبار سے ان کے بیشتر افسانوں میں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ بہرطور راشد الخیری کا نام اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ راشد الخیری کے ہاں متوسط طبقے کی پیشکش میں عورت موضوع خاص ہے اور آزادی نسواں مقصد خاص، جس کے حصول کے لیے عورت کی مظلومیت کو انتہائی دردمندی کے ساتھ سامنے لائے (مثال: مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ''قطرات اشک'') اکثر اوقات افسانے میں رواں جذباتیت کے دھارے نے افسانے کے وحدت تاثر کو مجروح کیا

ہے۔ سبق آموز، اصلاحی افسانوں میں ''چہار عالم'' اپنی انوکھی تدبیر کاری کے سبب نمایاں ہے۔ جس میں کہانی کی ابتدا تاڑ کے درخت پر بنے کے گھونسلے سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ ہمارا پہلا افسانہ نگار صرف مسلم سوسائٹی کی اصلاح ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کے پیش نظر عالمی سیاسی منظر نامہ بھی تھا اور ہندوستان کی آزادی کا حصول بھی ایک نمایاں اور فوری مقصد تھا۔ یہ Complex صورت حالات تھی اور راشدالخیری سے متعلق ہمارے ناقدین کا سہل پسند رویہ، جس کے سبب راشدالخیری کو محض ''مصورغم'' اور اصلاح نسواں کا پرچارک ظاہر کیا گیا۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ راشدالخیری اور سلطان حیدر جوش نے پریم چند سے بہت پہلے حب الوطنی اور انگریز دشمنی کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ اس حوالے سے راشدالخیری کا افسانہ ''سیاہ داغ'' (مشمولہ: شہید مغرب) خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ ''سیاہ داغ'' واضح طور پر جلیانوالہ باغ کے عظیم سانحہ سے متعلق افسانہ ہے، جس میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔

''عدل ورحم شہر کی چار دیواری سے کوسوں دور بھاگ چکا تھا، مسلح دوستوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کی۔ الیاس آباد کا دولہا، بیوہ کا لال، جو روز رو کر کہہ رہا تھا، ہم کچھ نہیں کہتے، فقط ہمارے بچے حوالے کر دو۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں فیر کی آواز سنتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چہرے سے خون بہنے لگا۔ صداقت کا پتلا اور اسلام کا عاشق، وطن کا شیدا قدم پیچھے نہیں ہٹاتا اور کہتا ہے کہ اس خون کے ہر قطرے سے وطن پرست جماعت پیدا ہوگی۔ یہ خون ضائع نہ جائے گا اور عنقریب وہ وقت آئے گا جب ملک اس خون پر خود قربان ہوگا۔''

(''سیاہ داغ'' ''مشمولہ'' شہید مغرب'' از راشدالخیری سے اقتباس)

راشدالخیری نے عالمی سیاسی منظر نامے کو دیکھتے ہوئے اپنے تین افسانوں ''شہید مغرب''، ''طرابلس سے ایک صدا'' اور ''دولہن دونوں کی'' میں طرابلس پر اطالوی حملے کے خلاف آواز احتجاج بلند کی ہے جبکہ خالصتاً ہندوستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ راشدالخیری ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے اور انگریز کے خلاف انہیں متحد و منظم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ''کلونیتاں'' ہندو مسلم کشیدگی اور فرقہ واریت پر آزردگی کا کھلا اور برملا اظہار ہے۔

اُردو افسانے میں اصلاح پسندی اور قوم پرستی کے حوالے سے دوسرا بڑا نام سلطان حیدر جوش کا ہے۔ جوش کے ہاں البتہ بابو شو پرشاد کے زیر اثر ہندوانہ تبلیغی جذبے اور ہندو قوم پرستی کا ردعمل بہت واضح دکھائی دیتا ہے، جیسے راجپال کی ''رنگیلا رسول'' دیانند سرسوتی کی ''ستیارتھ پرکاش'' اور چترسین شاستری کی ''اسلام کاوش ورکش'' جیسی کتابوں کی اشاعت نے اور بھڑکایا۔

حکیم یوسف حسن بھی افسانے میں اصلاح پسندی کی اسی روایت کا ابتدائی نام ہے البتہ اُن کے ہاں موضوعاتی تنوع ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے: ''سوسائٹی'' میں مظلوم کرداروں کے اصول کا بیان تلخ ہے نیز انقلاب کی گونج اُن کے ہاں پریم چند سے بھی پہلے سنائی دیتی ہے۔

جوش کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ بدایوں اور اس کا مضافاتی علاقہ ہے، جس میں مسلم سوسائٹی کے عیوب کی تلاش کی گئی ہے اور اس کی اصلاح مقصود ہے۔ اس اصلاح پسندی کی شدت نے جوش کے افسانوں میں طنز کی صورت اختیار کی اور یوں سلطان حیدر جوش نے اپنے مخصوص لینڈ اسکیپ اور طنزیہ لہجے کے سبب اپنا ایک مخصوص رنگ پیدا کر لیا۔

جوش اور حکیم یوسف حسن نے معاشرتی سطح پر مغرب کی تقلید پر بے باک تنقید کی، جس کے اثرات ردِعمل کے طور پر ''انگارے'' (مرتبہ: احمد علی) ''شعلے'' (از احمد علی) اور ''عورت'' (از رشید جہاں) تک بہت نمایاں ہیں۔

درحقیقت جوش کے ہاں یہ سب ہندوانہ تبلیغی جذبے کا انتہائی اظہار اور ردِعمل تھا جو بعض مقامات پر ان کے افسانوں کو ناصحانہ تقریر بنا گیا۔ اسلوبیاتی سطح پر بھی راشد الخیری اور جوش دو مختلف انتہاؤں پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

راشد الخیری کی تحریر میں روانی اور سلاست ہے اور دہلی کی بیگماتی زبان لکھنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ضرب الامثال کا ان کے پاس نہ ختم ہونے والا ایک خزانہ ہے جو دردناک مناظر کی تصویرکشی میں کام آیا جبکہ جوش نے روزمرہ کا چٹخارہ پیدا کر کے اور طنز میں ظرافت کا پیوند لگا کر اپنا الگ اسلوب وضع کیا۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سلطان حیدر جوش کا تبلیغی جذبہ ان کے افسانوں کی تخلیقی فضابندی کے لیے مضر ثابت ہوا۔ جوش خود اپنے فنِ افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ ''میں اس پردہ کا حامی ہوں، جس کا حکم مذہب سے دیا گیا ہے۔ چاردیواری کی قید کو میں پردہ نہیں کہہ سکتا بلکہ ناجائز ظلم سمجھتا ہوں۔ البتہ شرعی پردہ کا حامی ہوں۔''

۲۔ ''پہلے وہ کالے کتے کو نجس اور ذلیل جانتا تھا اب کالے آدمی کو اس سے بھی زیادہ ذلیل مانتا ہے۔''

(''خواب وخیال'' سے اقتباس)

۳۔ ''ہندوستان کے ہیجانِ قومیت نے مادۂ فاسد کی طرح مختلف اجسام میں عمل گوناگوں کا اظہار اس درجہ کیا ہے کہ مسٹر مانٹیگو سے لے کر سر مائکل اڈوائر تک ہر سرخ وسفید ہستی ''قلم بہ دنداں'' یا ''شمشیر بکف'' نظر آتی ہے۔

(''لیڈر'' سے اقتباس)

قوم پرستی اور اصلاح پسندی کی روایت میں ہندوانہ نقطۂ نظر کے حامل ابتدائی نام پریم چند اور مہاشہ سدرشن کے ہیں۔

دھنپت رائے، اُپنام پریم چند، جن کی اولین تحریر ایک مزاحیہ ڈرامہ تھی، ٹیگور اور سرشار کو پڑھتے پڑھتے، اپنے افسانوں میں یکلخت قوم پرستی، حب الوطنی اور اصلاح پسندی کی طرف نہیں آئے بلکہ ہندوانہ احساس تفاخر کو اجاگر کرنے اور مغلیہ دورِ حکومت کے نفسیاتی اثرات زائل کرنے کے سلسلے میں ان کی پہلی طبع زاد تحریر ''پرتاپ چندر'' ایک مضمون ہے جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا لیکن شائع نہیں ہوا[۸]۔ رانا پرتاپ سے متعلق یہ مضمون ''زمانہ'' کانپور بابت نومبر ۱۹۰۶ء میں سامنے آیا۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء کا زمانہ پریم چند نے کانپور میں گزارا تھا اور بال گنگا دھر تلک کی تحریک آزادی کی مہم میں شامل رہے۔ پریم چند پر یہ اثرات تلک کے۔ گوکھلے کے ہیں جس کا نتیجہ نومبر دسمبر ۱۹۰۵ء کے رسالہ ''زمانہ'' میں گوکھلے پر ایک مضمون کی صورت میں بھی ظاہر ہوا۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ''راجا مان سنگھ'' پر رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں ایک مضمون کے بعد مئی ۱۹۰۸ء میں ''سوامی دویکانند'' (مضمون) ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوا اور ''رنجیت سنگھ'' ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء میں۔ مضامین کے ساتھ ساتھ پریم چند نے اپنے انہی خیالات کا اظہار طبع زاد افسانوں میں بھی کیا، اس ضمن میں ''گنگا کا اگن کنڈ'' (مارچ ۱۹۱۰ء)، ''رانی سارندھا'' (ستمبر ۱۹۱۰ء) ''وکرمادتیہ کا تیغہ'' (جنوری ۱۹۱۱ء) ''راجہ ہردول'' (اپریل ۱۹۱۱ء) اور ''آلھا'' (جنوری ۱۹۱۲ء) خاص طور پر ہندو قوم پرستی کے حوالے سے بہت نمایاں ہیں۔

پریم چند نے ان افسانوں کی ابتداء نواب رائے کے قلمی نام سے کی تھی؛ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند جہاں اپنے قلمی نام کی آڑ میں پر جوش مسلم مبلغ افسانہ نگار سلطان حیدر جوش کی تحریروں کا توڑ کرنا چاہتے تھے وہیں حب الوطنی کے حوالے سے، سرکاری ملازم رہتے ہوئے انگریز راج کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ یہاں اس دور کے پریم چند کے چند نمایاں افسانوں کے اقتباسات دیکھتے چلیے:۔

۱۔ ''چوہان راجہ، آداب جنگ کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ اس کی ہمت عالی، اسے کمزور، بے خبر اور نا مستعد دشمن پر وار کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس معاملے میں اگر وہ حسن آئین کا ایسی سختی سے پابند نہ ہوتا تو شہاب الدین کے ہاتھوں اسے روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔''

۲۔ ''رنجیت سنگھ، سخاوت و شجاعت اور رحم و انصاف میں اپنے وقت کے وکرمادت تھے۔ اس مغرور کابل کا غرور، جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اٹھانے دیا تھا، خاک میں ملا کر لاہور جاتے تھے۔''

(پریم پچیسی'' صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸ و صفحہ ۳۱ سے اقتباسات)

ان دو ٹکڑوں کو دیکھیں تو واضح طور پر پہلا ٹکڑا قوم پرست ہندو ذہن کا عکاس ہے لیکن دوسرے ٹکڑے میں دھرتی کے حوالے سے پریم چند ویسی بات کر رہے ہیں جو آج کے مسلم پنجاب کے پنجابی اور مسلم سندھ کے سندھی کی آواز ہے اور تو اور ہمارے ہاں راجہ پورس کے مقابلے میں سکندر یونانی زیادہ محترم ہے اور ہمارا بے شعور طبقہ سکندر اعظم کے ہاتھوں پورس کی شکست پر بغلیں بجاتا چلا آیا ہے۔

اس ضمن میں ابوالفضل صدیقی کی معرفت پریم چند سے متعلق سلطان حیدر جوش کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

''منشی جی نے مسلمان دشمنی کی ترنگ میں ایک تاریخی کہانی نام کی اللہ جانے کون سی دو ورقی تاریخی کتاب سے نکال کر ''رانی سارندھا'' اپنے نام سے دے پٹخی، بھلا اورنگ زیب شہنشاہ نہ ہوا رنجیت سنگھ ہوا، جس نے ایک گھوڑے کی خاطر ایک ملک پر چڑھائی کر دی تھی، ادھر اورنگزیب سے بھی تین چار صدی قبل الٹی لنگور کی قلابازی جو کھائی تو قلم کی لاٹھی پکڑے محمد بن قاسم پر جا پڑے، اور اپنے زور لٹھ سے راجہ داہر کی دونوں بیٹیوں کی آبروریزی کرا دی، اور ان دونوں میں ہی فخر تاریخ ہندوستان ہستیوں کے اسمائے گرامی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان حضرت اور علیہ الرحمۃ کے سابقے لاحقے لگا کر ذکر کرتے ہیں اور یہ دونوں مسلمان اتہام کہانیاں منشی پریم کی ''پریم پچیسی'' کے زرین شاہکار ہیں، اور میاں خوبصورت پیرایہ کی جو آپ نے بات کہی تو دیانند سرسوتی کی ستیارتھ پرکاش اور لاحول ولا قوۃ، ننگ کتاب مجلد گالی چیتھڑا خاکم بدہن راجپال کی ''رنگیلا رسول'' بھی تو اُردو میں ہیں۔ یہ اپنی اپنی توفیق کا فرق تھا ورنہ منشی جی ہوں یا دیانند سرسوتی یا راجپال نا تھورام کون کون سب کا ماخذ اور اندر والا ایک تھا، اور اُردو تو ذریعہ اظہار تھا اور زیادہ سے زیادہ ان لوگوں نے مسلمانوں کی دل آزاری اور مطعونیت کے لیے ڈھٹائی کے ساتھ اختیار کیا، رعایت کبھی کسی مسخرے نے نہ کی۔ منشی جی کی بالکل ابتدائی دور کی کہانیاں مولانا شرر کے کٹ کنوں پر ہیں مگر مولانا کے ہیرو ایشیاء کے مسلمان ہیں اور ولن یورپ کے عیسائی حتیٰ کہ اپنے ملک پر مسلط انگریزوں کو بھی نہیں بخشتے، جو مولانا کے زمانے میں جان جوکھم کا کام تھا۔ جب کہ منشی جی کے ہیرو ہندوستان کے ہندو راجپوت اور ولن مسلمان ملتے ہیں، اور لطف یہ کہ گاندھی جی کی ٹھیک ٹھیک پالیسی کے مطابق گورے آقاؤں کے ذکر سے نہایت بھونڈے پن کے ساتھ پہلو تہی کرتے نظر آتے ہیں، ویسے کانگریس کے جلوس بڑے زور شور سے نکلواتے ہیں۔ اپنے جھول کے جھول افسانوں میں پہلے تو عنایت خاص یہی ہے کہ بیس روڑ ہندوستانی مسلمان، مردم شماری میں مسلمانوں کے کردار ہی خال خال پیش کیے ہیں، اور جو مسلمان منشی کے قلم کو ڈھونڈ ملا وہ چور، قاتل، ڈاکو ورنہ احمق گھامڑ، جھٹروس افیمی، الو کا پٹھا اور تو اور کردار مسخ کرنے

کا بھونڈا سلیقہ ملاحظہ کیجئے۔ تحقیق ہو چکی کہ معرکہ یا پلٹا انگریز غدر ۱۸۵۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۹ء میں زوال اودھ پر ختم ہوا۔ جب انگریز نے پنجاب سے لے کر بنگال تک کی فوجیں جمع کر کے اودھ پر چڑھائی کی اور زوال لکھنؤ کے وقت تاریخ شاہد ہے کہ انگریز فوجیں لکھنؤ کی گلی گلی اور دروازہ دروازہ پر سے وطن پرستوں کی لاشوں پر سے گزر کر بڑھ سکیں، اور منشی جی کا توسن قلم دو مسلمان سرداروں کو اس وقت مضافات میں افیم کھا کر کسی پرانے کھنڈر کے اندر شطرنج کے ہنولڑاتے پیش کر رہا تھا اور نہایت شستہ اُردو میں۔ اور میاں ہندوستان کی نہیں شاید منشی جی بیچارے نے کبھی ساحل پر دور سے پانی کا جہاز کھرا بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر نام کی مسلمان دشمنی میں بہتے سات سمندر پار جا پڑے اور سات صدیوں پیچھے الٹی قلابازی کھاتے اُموی دور کے اسپین میں جا گرے اور ہسپانوی عیسائی رعایا پر مسلمان قابضین کے وہ وہ مُہیب امن سوز مظالم پیش کئے کہ قاری کا کلیجہ ہلا ہلا دیا، اپنا قلم اور تاریخ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اور مسلمان قوم کی صورت مسخ کر دی، اور پھر پوری قوم کو بھر پیٹ مطعون کر کے کسی ایک فردِ مسلمان کے منہ سے اپنے بیٹے کے قاتل کو ایک جملہ میں معاف کرا کر افسانہ نگاری کے تاثر کا گویا حق ادا کر دیا۔ جس کے جواز کا تکنیک اور متن پورے افسانہ میں کہیں سراغ نہیں، صرف ''عفو'' افسانہ سے یہ کردار متعلق ہے۔ اب بتاؤ یہ ہجو نگاری ہوئی یا افسانہ نگاری۔ مگر اپنی قوم کی مت پر پتھر پڑے ہیں کہ گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہ ہوئی۔ اور منشی جی کی شستہ نگاری کے حسین جال میں ایسی پھنسی پڑی ہے کہ خود منشی جی تو اسے توڑ بھاگے مگر مدعی ست گواہ چست، تمام تر لسانی، سماجی، ادبی، سیاسی روگردانیوں کے باوجود منشی جی کو معاف کئے پڑی ہے جب کہ بابائے اُردو اور اختر حسین رائے پوری انتھک کوششوں کے باوجود نا اُمید ہو کر بیٹھ رہے، اور اس قطعی نتیجہ پر پہنچے کہ کانگریس کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر کوئی سبیل مصالحت کی نہیں ...... اور تو اور منشی جی مسلمان قوم کو بالکل ہی چوپٹ سمجھتے ہیں، گاندھی جی کے فرسودہ سیاسی اسٹنٹ ''ہندو مسلم اتحاد'' کی تائید میں سانحہ کربلا پر قدم اٹھاؤ الا یہ سمجھ کر کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کے تمام فرقے، جذباتی اور رقیق القلب ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے، زمین کی زمین آسمان پر تو اس کا کہیں پتہ نہیں قلابے ملا دیئے۔ معرکہ کربلا میں سات ہندو راجپوت برادران راجہ ساہس رائے نازل کر دیئے، گھوڑوں پر سوار، ہتھیار سجائے، ''امام عالی مقام'' کے حضور نذرانہ جاں لیے حاضر ہوتے ہیں اور ''اشقیاء'' سے مبارزت طلبی کی سب سے پہلے اجازت چاہتے ہیں، اور پھر ایک ایک کر کے ''یزید لعین'' کی فوج پر، منشی جی جوان راجپوت سادنتوں کو حملہ آور دکھاتے ہیں تو تیغ ہندی اور تہور راجپوتی کے جوہر پیش کر کے اپنے ڈرامہ کا اسٹیج سجاتے ہیں کہ جھوٹ کے پل اور کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔ بالآخر ایک ایک کر کے ساتوں شمع امامت پر پروانہ وار نثار ہو جاتے ہیں۔ خیر یہیں تک بس نہیں فرمایا کہ تاریخ پر بہتان باندھ کر رہ جاتے، حضرت امام حسینؑ کی ذات پاک کو بھی شریک ایکٹنگ کیا، اور ان کی زبان مبارک سے مکالمہ نگاری کی ترنگ میں ان ساتوں کو کربلا کے شہید اولین کہلوایا اور جب ان کی تجہیز و تکفین کا سوال پیدا ہوا تو خاکم بدہن ''امام عالی مقام'' نے فرمایا ''نہیں نہیں یہ ہنود ہیں انہیں دفن نہیں کیا جائے گا انہیں سپرد آتش کیا جائے گا۔'' اور ان کی چتائیں طیار کرائی گئیں اور آگ بدہن منشی جی، خاکم بدہن ان چتاؤں میں ''امام عالی مقام'' نے بذات خود اپنے ہاتھ سے فلیتہ لگایا۔

''معاذ اللہ...... لاحول ولاقوۃ''

یہ بلاشبہ ایک انتہا پسندانہ بیان ہے، ایک خاص طرح کی کڑھن کا نتیجہ، نیز سلطان حیدر جوش کے نکتہ نظر سے بیشتر مقامات پر اختلاف ممکن ہے لیکن اس بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس بحرانی دور میں ہمارے اولین افسانہ نگاروں کے پیش نظر ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات تھے اور وہ محض افسانہ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی بھی کر رہے تھے اور اگر ادب کی سطح پر یہ

صورت حالات تھی تو سماجی سطح پر کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا جو بعد میں سیاسی سطح پر دو قومی نظریہ کی بنیاد بنا۔

پریم چند کے ابتدائی افسانوں ''رانی سارندھا'' اور ''گنگا کا اگن کنڈ'' (۱۹۱۰ء) ''وکرمادتیہ کا تیغہ'' (۱۹۱۱ء) اور ''آلھا'' (۱۹۱۲ء) سے متعلق سلطان حیدر جوش کا نقطۂ نظر تو آپ نے ملاحظہ کیا۔ لیکن اب دیکھنا تو یہ ہے کہ پریم چند کو کوئی چھوٹ بھی مل سکتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں یقیناً ملتی ہے:

۱۔ پریم چند کا افسانہ ''نیائے'' پیغمبر اسلام اور صحابہ کرام کے مثالی کردار کو پیش کرتا ہے۔ جس پر جوش نے کوئی بات نہیں کی۔

۲۔ پریم چند کا افسانہ ''شما'' مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات (خصوصاً فتح اسپین) کے حوالے سے مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف اُجاگر کرتا ہے، لیکن سلطان حیدر جوش اس افسانے سے بھی خوش نہیں۔ مسلمان اگر حملہ آور تھے، تو تھے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

۳۔ پریم چند کا ڈرامہ ''کربلا'' (پانچ ایکٹ کا ڈرامہ) حضرت امام حسین کے حضور کھلا اظہارِ عقیدت ہے، جس میں راہس راؤ کی سربراہی میں ایک ہندو جماعت نے امام حسین اور ان کے بہتر ساتھیوں کے ساتھ مل کر یزیدی لشکر کا مقابلہ کیا اور ظلم واستبداد کے مقابلے میں ہندو مسلم اتحاد کی اولین مثال پیش کرتے ہوئے کربلا کی خاک کا پیوند بن گئی۔ جس کی داد جوش نے ''معاذ اللہ'' کہہ کر دی۔ یہ ناانصافی ہے۔

۴۔ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۲ء میں لکھے گئے متنازعہ افسانوں اور اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مئی ۱۹۰۸ء میں تحریر کردہ پریم چند کے فرقہ وارانہ مضامین (از قسم ''راجہ مان سنگھ''، ''رنجیت سنگھ''، ''رانا پرتاپ سنگھ'' اور ''سوامی دیویکانند'' مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور) کی اشاعت پر پریم چند کو ساری زندگی افسوس رہا۔ جبکہ ''خاک پروانہ'' (۱۹۲۸ء) میں شامل افسانوں میں تو اُنہوں نے اصل مسئلہ کی تہہ تک پہنچ کر طبقاتی کشمکش کے نتیجہ میں ہندومت کے چھل کپٹ پر چوٹیں بھی کیں۔

جہاں تک ''پریکھشا''، ''شطرنج کی بازی'' اور ''وجر'' کا تعلق ہے تو ''پریکھشا'' اور ''وجر'' سو فیصد ایسے افسانے ہیں جن میں پست ہمت مسلمان شہزادگان ہیں نہ کہ جملہ مسلمان۔ البتہ ''شطرنج کی بازی'' میں معاملہ نصف حد تک سلطان حیدر جوش کے کہے کے مطابق دکھائی دیتا ہے، لیکن کیا اس افسانے میں بھی ہندوستانی غیرت کو نہیں للکارا گیا؟ اور 'ہندوستانی'، ہندو، مسلم، سکھ سب تھے۔

اب جہاں تک ''حج اکبر''، ''عیدگاہ''، ''ہنسا پرمودھرم''، ''مندر''، ''فاتحہ'' اور ''ادیب کی عزت'' جیسے افسانوں کا تعلق ہے تو سیکولر ذہن کے لوگ کہیں گے کہ یہ ہندوستانی مسلمان کی روزمرہ زندگی کی عکاسی ہے جبکہ سلطان حیدر جوش کے ہمنوا انہیں کھلی اسلام دشمنی شمار کریں گے۔ یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کے نقطۂ نظر کو دیگر حوالوں کے ساتھ بھی پرکھا جائے۔

پریم چند اپنے ایک ہندی مضمون میں لکھتے ہیں:

''فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے۔ اسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شاید شرم آتی ہے۔ اس لیے وہ (اس) گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جماتا پھرتا ہے۔ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے، مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب، نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب۔''

(بحوالہ پریم چند: ''قلم کا سپاہی'' صفحہ ۵۳۸)

صرف یہی نہیں پریم چند نے مستقبل کے ہندوستان کو آزاد خیال اور پُرامن دیکھنے کے لیے ہر نوع کے نسلی تفاخر کو ختم کرنے کے لیے معاشرتی ڈھانچے میں موجود خرابیوں کی چہرہ نمائی کرنے کے لیے افسانہ ''نجات'' (۱۹۳۳ء) لکھ کر یہ الزام اپنے سر لیا کہ وہ اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کے خلاف نفرت کا پرچار کرتے ہیں۔

۱۹۲۳ء میں جب آریہ سماج والوں نے شدھی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے دیانرائن نگم (مدیر ''زمانہ'' کانپور) کو لکھا:

''شدھی'' پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔''

(''پریم چند شخصیت اور کارنامے'' صفحہ ۱۷۳)

فروری ۱۹۲۴ء کے ''زمانہ'' کانپور میں یہ مضمون ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں شدھی تحریک کی مخالفت کے ساتھ نیشنل کانگریس کی پالیسی پر بھی برہمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس نے بھی اجتماعی طور پر اس تحریک سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود انفرادی طور پر اس میں شامل ہونے میں کچھ بھی اٹھا نہیں رکھا۔ اتنا ہی نہیں، ایک بھی ذمہ دار کانگریسی نیتا نے اعلان کر کے ان تحریکوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔''

(''قحط الرجال'' از پریم چند مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور فروری ۱۹۲۴ء)

۱۹۳۳ء میں چترسین شاستری کی کتاب ''اسلام کا زہریلا درخت'' (ہندی نام ''اسلام کا وِش ورکش'') شائع ہوئی تو پریم چند نے ہندی ادیب بنارسی داس چترویدی کو لکھا:

''فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ نہایت شرانگیز اور سستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں لکھوں گا اور اب جب کہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور ہیں لیکن ہمیں اس کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ ہمارا مقصد مقدس ہے۔ میں آپ کا نوٹ ''جاگرن'' میں شائع کر رہا ہوں۔''

(''پریم چند کے خطوط'' صفحہ ۲۶۵)

چترویدی صاحب کا یہ اختلافی نوٹ پریم چند نے اپنے پرچے ''جاگرن'' میں شائع کیا اور اس ضمن میں ''جاگرن'' اور ''ہنس'' مرتبہ: پریم چند کے متعدد پرچے اس چیز کا کھلا ثبوت ہیں کہ پریم چند نے اس شرانگیزی کی کھل کر مخالفت کی۔ اسی طرح جینندر کمار جین کو لکھتے ہیں:

''ان چترسین کو کیا ہو گیا ہے کہ ''اسلام کا وِش ورکش'' لکھ ڈالا۔ اس کی تنقید تم لکھو اور وہ کتاب میرے پاس بھیجو...... اس کمیونل پروپیگنڈے کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔''

(''پریم چند کے خطوط'' سے اقتباس)

حب الوطنی کے حوالے سے دیکھیں تو پریم چند کا پہلا طبع زاد مطبوعہ افسانہ ''عشق دنیا اور حب وطن''[12] اس سلسلے کا نقش اول ہے اور انگریز راج کے خلاف اس کی تیزی اور تپش کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس مجموعے ''سوز وطن''[13] میں یہ افسانہ شامل کیا گیا اسے اشتعال انگیز قرار دے کر کتاب کی بکی ہوئی تین سو کاپیاں چھوڑ کر بقیہ سات سو کاپیاں ضبط کر کے جلادی گئیں۔ اُردو ادب میں وطن پرستی

کے حوالے سے یہ اوّلین بھرپور آواز تھی۔ پریم چند نے ''سوزِ وطن'' کے دیباچہ میں لکھا تھا:

''ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبِ وطن کا نقشہ جمائیں۔''

کتاب کی ضبطی کے موقع پر اتر پردیش کے جنوبی علاقے ہمیر پور کے ڈپٹی کلکٹر نے پریم چند سے کہا تھا: ''تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کر انگریزی عملداری ہے مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔''[۱۳]

درحقیقت اس دور کا پریم چند ہندوستان کی آزادی کا نقیب تھا اور اس کے ان افسانوں میں انقلاب کے قدموں کی چاپ اور دم توڑتے ہوئے مجاہدین کی للکار صاف سنائی دیتی ہے:

''افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہماں نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہوں، نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔''

(دنیا کا سب سے انمول رتن)

افسانے کا اختتام یوں ہوتا ہے: ''وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔'' افسانے کا مرکزی کردار دل فگار محبت میں امتحان سے گزرتا ہے اور محبوب (دلفریب) کے حضور یہی بیش قیمت شے اسے نذر گزارتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں سیاسی دور تک آتے آتے تحریک عدم تعاون، خلافت کی تحریک، کسان مزدور تحریک، ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کی تحریکیں اپنے عروج تک پہنچتی ہیں اور افسانے میں بقول آل احمد سرور، پریم چند جھنڈا یا نشان بن گیا۔ اس نے ہماری خلوتوں اور پناہ گاہوں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچوکے لگائے۔ اس نے انگریز اور سرمایہ دار، جاگیردار سے دوطرفی جنگ لڑی۔ (مثال: سرِ پاترا) یہ افسانے ہندوستان کے فکری تحریکوں کے نقیب ہیں جب کہ پریم چند کے کرداروں کی مثالیت ہمیشہ باعث نزع رہی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ افسانہ ''کپتان'' میں جگت سنگھ مثالی باپ کی تمام خصوصیات پریم چند کے والد کی جیتی جاگتی خصوصیات ہیں اور ''مستعار گھڑی'' کی بیگم پریم چند کی پہلی بیوی کا عکس ہے۔ اس ضمن میں پریم چند کے ایک برطانوی ناقد گورڈن سی۔ روڈارمل (Gordon C. Rodarmel) لکھتے ہیں:[۱۵]

"Critics have charged that Premchand did not understand the middle upperclasses as he did the peasants and this may be true but such a Judgment must be weighd in terms of his literary intentions."

پریم چند کے کرداروں کا زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر دنیا کو تیاگ دینے کا رویہ، چونکا دینے کی حد تک ان کی جنسی کمزوری اور پھیکے رومان کی نسبت زندگی کا گہرا مشاہدہ زیادہ قابل توجہ ہے اور اگر یہ بھی کہا جائے کہ اس نے محض کسان کو اس کی تمام سچائیوں کے ساتھ موضوع بنایا تو یہ

کیا کم ہے؟ ایملی برونٹے، مسز گاسکل اور جین آسٹن نے زندگی کے محض ایک ایک گوشے کی ہی تو تصویر کاری کی ہے۔ پریم چند کے نمائندہ افسانوں میں ''بڑے گھر کی بیٹی''، ''دو بیل''، ''گلی ڈنڈا'' اور ''کفن'' بہت نمایاں ہیں اور اسی نوع کے افسانوں کے حوالے سے پریم چند کے ایک اور برطانوی ناقد ڈیوڈ روبن (David Rubin:) لکھتے ہیں۔[۱]

> "Iflunced by Dickens, Tolstoy and impressed by Marx Premchand very early directed his fiction toword social reform."

ڈکنز ہیوگو، لیو ٹالسٹائی اور رومین رولاں سے متاثر ہونے کا اقرار تو خود پریم چند نے بھی کیا ہے لیکن اپنے ہاں ہندوستان میں ایک آواز ابتداء میں بہت متاثر کن رہی ہے اور وہ ہے مہاتما گاندھی کی آواز.... بقول اسٹیفن زویگ، گاندھی ہندوستان میں ٹالسٹائی کے خیالات کو کروڑوں انسانوں کی عملی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن یہ ساتھ بہت تھوڑی مدت تک رہا۔ گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی پریم چند کے لیے سوہان روح بن گئی اور بنگال کے بٹوارے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تب پریم چند نے افسانہ ''پریم آشرم'' لکھا، جس کا ہیرو بلراج، روس کے کسانوں کی طرح انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ ان کے افسانے ''قاتل کی ماں'' کو پریم چند کے تشدد کی طرف جھکاؤ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد پریم چند صرف افسانہ نگار ہی نہیں ایک تحریک بن چکا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ادیبوں اور دانش مندوں کو عوام کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانا ہی ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ امن اور کامرانی کی تلاش کر سکتے ہیں۔'' [۱۲]

پریم چند کا یہ حوالہ انتہائی محترم ہے اور جب جب تحریک آزادی کا مطالعہ کیا جائے گا تو سیاسی تحریکوں اور سیاسی راہنماؤں کی پالیسیوں کے ساتھ پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوگا۔

قوم پرستی اور مقصدیت کی اس روایت میں ہندوانہ نقطۂ نظر سے اُردو افسانے میں اصلاح پسندی کا آخری نمائندہ مہاشہ سدرشن ہے۔ سدرشن نے اس نوع کے افسانوں میں دیہی آبادی کا منظر نامہ چنا اور سیاسی اور سماجی حوالوں کے ساتھ ہندو طبقے کے عمومی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

بالخصوص افلاس کے زیر اثر جنم لینے والی سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کو موضوع بناتے ہوئے سدرشن نے چھوت چھات، چھوٹی عمر کی شادی، ہندو بیواؤں کے مسائل اور دیہی علاقہ جات میں تہذیب ناشناسی پر ہمدردانہ نقطۂ نظر کے ساتھ قلم اٹھایا۔ ہندو پنڈتوں کے خاندان سے متعلق ہونے کے سبب سدرشن کے افسانوں میں اس تہذیبی رچاؤ کی مہک پہلی بار دیکھنے کو ملی، جس نے راجندر سنگھ بیدی کے ہاں اساطیر کی سپلائی لائن بہم پہنچنے کے سبب ''متھن'' اور ''گرہن'' جیسے افسانوں کو جنم دیا۔

مہاشہ سدرشن کی نمایاں پہچان، مہاتما گاندھی کے افکار کا پرچار اور تکنیکی سطح پر مخصوص نوع کی اصلاح پسندی ہے، جس کی مثال سدرشن سے پہلے محض چند برس پریم چند کے ہاں دکھائی دی تھی۔ شاید اسی لیے سدرشن کو پریم چند کا مُقلد کہا جاتا ہے جبکہ ان دونوں کا فرق بہت ہے۔ سدرشن لہجہ کے اعتبار سے رومانی ہیں اور ان کا اظہار شاعرانہ۔ تشبیہات سے انسانی جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ افسانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے سدرشن نے اُردو افسانے میں نفسیاتی تجزیہ کی بنیاد رکھی اور ڈھکی چھپی نفسیاتی الجھنوں پر سے پردے اٹھائے۔ یہاں اہمیت کے قابل

بات یہ ہے کہ سدرشن کے کردار طے شدہ نفسیات کے حامل نہیں ہیں اردگرد کا تبدیل ہوتا ہوا ماحول ان کی شخصیت سازی کرتا ہے۔

سدرشن کے افسانوں کا خصوصی موضوع شہر کا ہندو سفید پوش طبقہ ہے اور اس کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ۔ (مثال: ''اپنی طرف دیکھ کر''، ''صدائے جگر خراش'' اور ''خانہ داری سبق'') دیہات کی سیاسی بیداری دوسرا موضوع ہے جو سراسر پریم چند کے تتبع میں آیا۔

مہاشہ سدرشن کا زندگی کے بارے میں نکتہ نظر متصوفانہ ہے۔ ان کے کردار زندگی کا تلخ تجربہ کر کے لوبھ لالچ سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قناعت پسندی کی انتہائی حدوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں افسانوی مجموعوں ''چندن''، ''بہارستان''، ''طائر خیال'' اور ''سدا بہار پھول'' میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

سدرشن المیہ تاثر کا افسانہ لکھنے میں ایک منفرد اسکول کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ننانوے فیصد افسانے اسی تاثر کے حامل ہیں محض ایک مثال پندرہ افسانوں کے مجموعے ''چشم و چراغ'' کی لیں، سات افسانوں کا اختتام مرکزی کرداروں کی موت پر ہوتا ہے، جبکہ ''کھرے کھوٹے'' کا مرکزی کردار آخر میں غائب ہو جاتا ہے۔

مہاشہ سدرشن کے افسانے نثر اور شاعری کے باہمی میل کی ابتدائی مثالوں میں شمار ہوں گے، خصوصاً افسانہ ''شاعر'' کامیاب ترین کوشش ہے۔ البتہ ایک خامی جس کا شکار عام طور پر سدرشن کے افسانے ہوئے وہ افسانے کے اختتام سے پہلے منتہا کی آگہی ہو جانا ہے، اور اس سے ضرور تاثر میں کمی واقع ہوئی جبکہ سدرشن کے بہترین افسانوں میں ''وزیر عدالت''، ''جانثار'' اور ''آزمائش'' ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

۲۔ اُردو افسانہ اپنے ابتدائی چند برسوں میں جہاں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی دھڑکنوں کو اپنے اندر سمو رہا تھا وہیں محمد علی ردولوی افسانے کا رشتہ ہماری داستانوں سے جوڑنے کا جتن کر رہے تھے۔ چوہدری محمد علی ردولوی ہماری افسانوی روایت کا اولین اسٹائلسٹ افسانہ نگار ہے بقول سجاد ظہیر:

''وہ اُردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطیف طنز اور تفنن ہوتا ہے، جس سے پرانے لکھنوکی مہک آتی ہے لیکن باتیں کرنے پر آتے ہیں تو جنسیات اور نفسیات کے ماہرین، فرائڈ اور ہیولاک ایلس دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، جائیداد اور اولاد کا تذکرہ کریں گے اور نوجوانوں میں ہوں گے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ گفتگو کریں گے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں...... نوجوان ترقی پسندوں کو وہ شفقت اور ہمدردی سے دیکھتے ہیں۔''

(''روشنائی'' از سجاد ظہیر سے اقتباس)

بغور دیکھا جائے تو سجاد ظہیر نے جتنے موضوعات گنوائے، ان پر محمد علی ردولوی نے محض گفتگو ہی نہیں کی، انہیں اپنے افسانوں میں بھی سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔ صوبہ جات متحدہ کی ہمہ گیر ثقافتی فضا بندی ان کے افسانوں کا وصف خاص ہے اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ ضلع بارہ بنکی (اودھ) کی قصباتی فضا اور اس کی نرم روزندگی کی پیشکش خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ جبکہ بے عیب جنسی افسانہ لکھنے والوں میں ان کا کوئی ہمسر نہیں بقول مولانا صلاح الدین احمد:

''محمد علی کی سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو بیک وقت خارجی اور داخلی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے اور مقابل کی یہ

خصوصیات ایک واحد فن کار میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی محسوسات کو اپنے افکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جامۂ تنگ اسی صنم عربدہ خو کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وہ خارجی دنیا کی معمولی سے معمولی بات کو اپنے احساسات میں سمو کر انہیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کر دیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو ہم نہیں معلوم کر سکتے کہ ان میں محرک کون تھا اور تحریک کس نے پائی۔ مثلاً وہ ایک جگہ گرمیوں کی صبح میں نسیم کی آہستہ روی اور اس کی روانی میں ایک بڑی بی کی مناجات خوانی کا ذکر کرتا ہے۔ جزئیات کا یہ مطالعہ بجائے خود بعنایت درجہ حیرت خیز ہے۔ لیکن جب وہ اس تاثر سے کردار زیرِ نظر کے ایک عمل کی نفسیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے اور لپکتے ہی تاثر کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو حیرت اپنی انگلی دانتوں تلے دبائے رہ جاتی ہے۔'' [۱۸]

ایک طرف آزادیٔ نسواں کی تحریک چل رہی تھی اور چوہدری محمد علی ردولوی نے کہا تھا:

''عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی۔''

اس قول کے پیچھے رومانی اثرات بھی نمایاں ہیں لیکن دراصل اس کا باعث:

''راقم الحروف انانیت کا شکار، باوجود استغفار کے بھی انانیت کے شکار ہی رہتا ہے ''میں'' کے استعمال سے پریشان ہے مگر ''میں'' اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔'' (محمد علی ردولوی: ''میرا مذہب''، مطبوعہ: ۱۹۳۸ء)

صاحب مطالعہ آدمی تھے۔ لکھنؤ کی نشاط انگیز زندگی بالخصوص جنسی معرکہ آرائیوں کے شاہد ہی نہیں، شریک بھی تھے، جس کا ثبوت افسانہ ''گناہ کا خوف'' ہے۔ محفل آرائی اور بزلہ سخن میں طاق، زرخیز تخیل کے مالک تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب ان کے ہاں ہنسی کھیل میں حزن و ملال کی کیفیت ابھرتی ہے تو ساری فضا کو سوگوار بنا دیتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ جنس نگاری سب سے پہلے انہوں نے کی اور ہم جنسی کے موضوع پر پہلا افسانہ لکھا (مثال: ''تیسری جنس'')۔

محمد علی ردولوی کے دیگر معاصرین خصوصاً راشد الخیری، سلطان حیدر جوش، خواجہ حسن نظامی اور مہاشہ سدرشن خارج سے داخل کی طرف بالعموم رجوع نہیں کرتے جبکہ محمد علی ردولوی نے اپنے افسانوں کی بنیاد محسوسات خارجی پر رکھی ہے اور انہوں نے جو کچھ ظاہری آنکھ سے دیکھا ہے اسے باطنی حوالوں کے ساتھ دکھانے کا جتن کیا ہے۔ ان کی اپنے موضوع کی طرف پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی حوالوں سے ہوتی ہے اور یوں محمد علی ردولوی حقیقت پسندی اور خیال آفرینی نیز انسان کی داخلی آوازوں کا ایک ایسا بے رحمانہ امتزاج متشکل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو عالمی منظر نامے پر صرف اور صرف ''گریٹ ماسٹرز'' کا خاصہ رہا ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کے معاملے میں مشقت کو اپنایا اور اس طریقہ کار میں کامیابی صرف اور صرف زبان کے خلاقانہ استعمال سے ہی ممکن ہے، بقول صلاح الدین احمد:

''اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کی بنا پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے جن نتائج کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور ان نتائج کو وہ ایک نہایت لطیف و بلیغ پیرائے میں کہ سلاست و رنگینی سے بہ یک وقت متصف ہوتا ہے، ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے اور پھر اس بات سے قطعاً بے نیاز ہو جاتا ہے کہ ہم اس پیشکش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہے اور اسے اپنی تخلیقات سے یہیں تک سروکار ہے کہ وہ اس کے نہاں خانہ محسوسات سے نکل کر لباس اظہار پہن لیں۔ رہا یہ کہ ہم ان کے جمال جہاں آرا سے کیا اثر قبول کرتے ہیں اس سے اسے کوئی غرض نہیں۔ اس کا یہ انداز نظر اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعہ اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خود سرانہ رویہ روا رکھتا ہے۔ وہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کا بھی قائل نہیں اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر

اصرار کرتا ہے، جن میں وہ اس پروارد ہوئی اور اگر آپ قبول عام یا رواج ادب یا خوف محتسب کے پیش نظر اسے کسی متبادل لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں تو وہ اسے سو میں سے نوے صورتوں میں رد کر دے گا۔" [19]

مثال ملاحظہ ہو:

"اندر والا: سنو بی ناجو تم اور صغیر پردے سے ملے گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو۔ اور جو کوئی کچھ کہہ دے؟

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرتے نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو چچی کہتا ہے۔

اندر والا: یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو؟

ناجو: تو اس میں ہرج کیا ہے۔ اگر میرے خیال میں دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی گوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا: تم ہنسنے زیادہ لگی ہو؟

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے؟

اندر والا: پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی، پرانی مثل۔

ناجو: ہوا کرے مثل! اپنے بڑھے پر سے ہزار جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا۔ جب جوانی میں اس طرح کے خیال نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اندر والا: بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو۔ اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو: میرے تو ایک لڑکا ہوا بھی ہے۔ اس کی بیوی تو ویسی ہی پچھیا ہے۔

اندر والا: مگر وہ صورت میں تو تمہارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو: یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا: اور جو ہو جائے!

ناجو: ہو جائے تو ہماری جوتی سے، لترے سے، پاپوش سے، مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا: یہ دیکھو، کھلا نا، یہی تو میں کہتا ہوں۔

ناجو: ہوگا بھئی ہم کیا کریں، نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔

اندر والا: اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی تو جاتی ہو۔

ناجو: ہاں سو جاتے ہیں، تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں۔ ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے، کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرلے گا۔

اندر والا: ہاں اب ٹھیک راستے پر آ گئیں، یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بیجا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا۔"

پھر اس کے بعد کہانی جس موڑ سے گزرتی ہے ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں لیکن، لگے ہاتھوں اس افراتفری کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیئے جو صغیر کے بامراد ہونے کے بعد اس کے دل میں اسی اندر والے نے مچائی۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یونہی کبھی دیکھ لی ہوگی۔ اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل، وہ رعب، حسن، وہ تناسب اعضا، وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھو کے بنگالی، آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی، ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا ہے۔ البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آ گئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی بات میں بڑھاپا نہیں ہے۔

اندر والا: بڑھاپا تو نہیں ہے مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے؟

صغیر: اجی محبت اصل چیز ہے۔ پنڈا اونڈا کہاں رہتا ہے!

اندر والا: محبت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے۔ ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو؟

صغیر: جوانی کے دن کی ہے، محبت تو ہمیشہ کی چیز ہے۔

اندر والا: ہے تو ہمیشہ کی۔ مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر: محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا: اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے اور بیسنی بیسنی ہی ہے۔ مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا۔''

(''دھوکہ'' از محمد علی ردولوی سے اقتباس)

اس خصوص میں نفسیات کے حوالے سے ''گناہ کا خوف''، ''آنکھوں کی زبان'' اور ''تیسری جنس'' ان کے نمائندہ افسانے ہیں اور افسانہ 'امیری کی بو' اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کا دردناک مرثیہ ہے۔

محمد علی ردولوی کے ہاں یہ آخری حوالہ مٹتی ہوئی تہذیبی قدر ہے جسے عین اسی زمانے میں خواجہ حسن نظامی نے کلی طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ خواجہ صاحب نے اپنے ہنگامہ خیز عہد کی سنگینی کو ایک الگ زاویے سے دیکھا اور مٹتی ہوئی مغل تہذیب کا نوحہ رقم کیا۔ یہ ایک طرح موجود سے ماضی کی طرف فرار کا رویہ تھا لیکن جو کام میر باقر علی داستان گو، سید ناصر نذیر فراق اور خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوئی سے محض مضامین اور خاکوں کی سطح تک ہو سکا، خواجہ حسن نظامی اسے اپنے افسانوں میں سمیٹ پائے۔

۱۹۱۳ء میں خواجہ حسن نظامی نے پیشکش کی سطح پر اس مواد کو مختلف طریقہ ہائے کار میں برتا مثلاً ''دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ''، ''شہزادی کی بپتا'' اور ''بنت بہادر شاہ'' آپ بیتی کے انداز میں لکھے جبکہ بیشتر افسانوں میں واقعات کا انتخاب اور پلاٹ کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر تخیل کی مدد سے ڈرامائی کیفیات پیدا کیں خصوصاً اس حوالے سے ''بہرا شہزادہ''، ''بیچاری شہزادی کا خالی چھپر کھٹ''، ''یتیم شہزادہ کی ٹھوکریں'' اور ''یتیم شہزادی کی عید'' یادگار افسانے ہیں۔ ان کے چند افسانوں کی ابتداء کسی مغل شہزادی یا مغل شہزادے کی ابتدائی زندگی کے منظر نامے کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کے بعد وقت کا پہیہ زمانہ حال کی طرف مڑ جاتا ہے اور یہ متضاد کیفیات المیہ تاثر کا باعث بنتی ہیں۔ ''شہزادی کی مصیبت''، ''غدر کی زچہ''، ''غدر کی سیدانی'' اور ''غدر کی بنا غلط فہمید'' سراسر مغلیہ تاریخ کے اوراق پارینہ ہیں اور ہمارے سامنے ان حقیقی

کرداروں کی چلت پھرت خواجہ حسن نظامی کی معرفت ممکن ہوئی ہے، البتہ اکثر افسانوں میں ایک ہی نوع کے کرداروں اور واقعات کے دوہرائے جانے سے دل اوبھ جاتا ہے۔

''جب انگریزی توپوں نے، کرچوں اور سنگینوں نے، حکیمانہ جوڑ توڑ کے، تخت پر قبضہ کرلیا، اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار، سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر تمام رات آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ لق ودق جنگل میں عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی۔''

(''دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ'' از خواجہ حسن نظامی سے اقتباس)

مندرجہ بالا اقتباس کو افسانہ ''بنت بہادر شاہ'' میں کلثوم زمانی بیگم کے لال قلعہ سے حیدرآباد (دکن) تک کے سفر کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ایک ہی طرح کی صورت حالات دکھائی دیتی ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ حسن نظامی کے وہ افسانے زیادہ پُراثر دکھائی دیتے ہیں جن کے پلاٹ کی تعمیر انہوں نے خود کی اور تخیل کی مدد سے ڈرامائی کیفیات اور المیہ تاثر پیدا کیا، اس اعتبار سے ''بہرا شہزادہ'' اور ''بیچاری شہزادی کی خالی چھپر کھٹ'' بھرپور تاثر کے حامل افسانے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے البتہ خواجہ صاحب کے تاریخی اور آپ بیتی کی طرز پر لکھے گئے افسانے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی نوع کے افسانوں میں خواجہ حسن نظامی کا لہجہ مغل زوال کے حوالے سے شکوہ الفاظ اور خاص نوع کی بردباری کا حامل ہے، جب کہ دیگر افسانوں میں دلی کا بولی ٹھولی کا گنگا جمنی روپ قابل توجہ ہے۔

۳۔ ایک طرف تو اُردو افسانے میں حب الوطنی، اصلاح نسواں، قوم پرستی، سماجی اصلاح پسندی، داستانوی رومانیت، ماضی میں پناہ لینے کا رویہ اور داستان طرازی کی یہ ملی جلی صورتیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ اُدھر دردمند نے اکبرآباد (آگرہ) اور علی محمود وزارت علی اورینی (جن کا تعلق صوبہ بہار سے تھا) نے اپنے دیکھے بھالے منظر نامے پر دیہی زندگی کی رومان پرور عکاسی کی۔ یہ تینوں افسانہ نگار اگر تسلسل کے ساتھ افسانہ نگاری جاری رکھتے اور تخلیقی توانائی بھی نصیب ہوتی تو جو اہمیت سجاد حیدر یلدرم کو ملی، وہ ان کے حصے میں آتی لیکن ایسا ہوا نہیں اور اُردو افسانے میں ترکی تراجم کی معرفت سجاد حیدر یلدرم یورپی وضع کی رومانیت لے کر وارد ہوئے۔ اس سے قبل ہمارے ہاں کی رومانیت کا مشرقی انگ تھا، جسے رومانی رویہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اب سجاد حیدر یلدرم نے مروج اُردو افسانے سے محض اصلاح نسواں اور سماجی اصلاح پسندی کو موضوع کی سطح پر چن کر رومانی ذات کے حوالے سے معاشرے میں انتشار اور انقلاب برپا کرنے کی ٹھانی۔

سجاد حیدر یلدرم کا اُردو افسانے میں ورود مسعود ہمارے ادب میں اس اصطلاحی رجحان کی رخصت کا اعلامیہ تھا، جسے علی گڑھ تحریک اور خصوصاً نذیر احمد دہلوی کی معرفت تقویت نصیب ہوئی تھی۔

اب اُردو افسانے پر کلام کی بلند آہنگی اور طنز کی نشتریت کی جگہ انسانی بطون کی آوازوں نے لے لی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پہلی بار سرسید احمد خان کی نثر کو خشک، بے جان اور بے مزہ کہا گیا۔

سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان سے خلیل رشدی کا ایک افسانہ ''نشہ کی پہلی ترنگ'' [۲۱] ترجمہ کرنے کے بعد ٹھیک چھ برس تک اُس ترجمے کے اثرات کے درجے نوٹ کیے اور ۱۹۰۶ء میں ''صحبت ناجنس'' اور ''خارستان وگلستان'' جیسے ترکی افسانوں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ اسی رومانی روایت کے حامل طبع زاد افسانے ''غربت و وطن'' [۲۲] اور ''دوست کا خط'' [۲۳] بھی لکھ لیے۔

احمد حکمت مفتی اوغلو کے ترکی افسانے کا ترجمہ ''خارستان وگلستان'' ایک ڈراؤنا خواب تھا، جہاں خارا کا سرپرست بڈھا جینے کا مفہوم بتاتے ہوئے کہتا ہے:

''پریم''

''پریم کیا ہے؟''

''عورت''

یہ رومانیت تھی جسے کرو سے نے کلاسیکیت کی نہیں، حقیقت پسندی کی ضد کہا، داخلیت اس کا وصف خاص ہے۔ یلدرم کے ہاں ''عورت'' کا ظہور جنسی کشش کا کھلا اعتراف تھا جو ''خارستان وگلستان'' اور ''چڑیا چڑے کی کہانی'' میں ملتا ہے۔ یہ نیا رجحان تھا اپنے زمانے کی اخلاقی اقدار اور اس کی جکڑ بندیوں کے خلاف ایک رومان پسند کی کھلی بغاوت۔ یلدرم کی آئیڈیل عورت ترکی کی باسی تھی، اس نے اسے درآمد کر لیا۔

یلدرم کے ہاں زبان کے ورتارے کے پیچھے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی ادبیات کی بھرپور سپلائی لائن تھی۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں لفظ کے برتاؤ نیز صوتی اثرات پر خصوصی توجہ اور محنت دکھائی دیتی ہے البتہ بعض مقامات پر ان کے ہاں طنزیہ لہجے کا سبب اصلاح نسواں اور سماجی اصلاح پسندی کی مقصدیت ہے۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''یلدرم کی رومانیت خالص مغربی رومانیت تھی انہوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے جھانکنے والی سرشار کی سپہر آرا نہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے، جو ہندوستان میں ناممکن تھا، انہوں نے اپنے قصبوں کی لڑکیوں کو لکھنؤ اور دلی کی حویلیوں کی چاردیواریوں سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس وقت ایران اور مصر بہت ہی پسماندہ تھے۔ ترکی میں یورپ بین الاقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔'' [۲۴]

کچھ یہی سبب ہے کہ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''عورت ان کے یہاں عیاشی اور گناہ کا مظہر نہیں، لطافت اور زندگی کے صحت مند تصور کی علامت ہے۔''

(''اردو ادب میں رومانوی تحریک'' سے اقتباس)

یلدرم کا نقطہ نظر اول و آخر رومانی ہے لیکن اس رو میں وہ سستی جذباتیت کا شکار کم ہی ہوئے ہیں۔ ان کے طبع زاد افسانوں پر معاشرتی اقدار اور اخلاقی قیود توڑنے کا الزام عائد نہیں ہو سکتا بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ ترکی افسانوں کے آزاد تراجم میں بھی مقامات اور طبقات کا خصوصی اہتمام کیا مثلاً ''سودائے سنگین'' اور ''ازدواج محبت'' کی جزئی تفصیلات کلکتہ اور بمبئی سے متعلق ہیں۔ یلدرم نے ان مقامات کو اس

لیے برتا کہ یوپی اور پنجاب میں قدامت پسندی زیادہ تھی اس طرح ''سودائے سنگین'' میں بمبئی کے پارسیوں کو پیش کیا جن کے ہاں اس قدامت پسند عہد میں بھی عشق اور محبت پر کچھ ایسی پابندیاں نہ تھیں۔ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' لکھتے ہوئے اپنے رومانی نقطہ نظر کو واضع بھی کر گئے اور کہیں سے انگلی بھی نہ اٹھی، اور اگر یہی باتیں وہ صیغہ واحد متکلم میں کہتے تو قابل گرفت قرار پاتے۔

پطرس بخاری کا یہ قیاس درست نہیں کہ یلدرم نے ترجے کو آڑ بنایا۔ آج وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یلدرم نے اپنی جتنی چیزوں کو ترجمہ یا ماخوذ بتایا وہ واقعتاً ترجمہ یا ماخوذ ہیں۔

یلدرم کے افسانے تین واضح رجحانات کے حامل دکھائی دیتے ہیں:

۱۔ مرد اور عورت کا رشتہ فطری ہے، اسے ناجائز تصور نہ کیا جائے۔

۲۔ اس فطری تعلق میں سچی محبت کا دخل ہونا چاہیے۔

۳۔ سچی محبت کی راہ میں جو چیزیں حارج ہوں انہیں دور کرنے کا جتن کرنا چاہیے۔

پہلے رجحان کی ایک مثال ترجمہ ''خارستان وگلستان'' بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

''عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں جرأت اور اعلیٰ حوصلگی نہ ہوتی۔ مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی اور دلبری رائیگاں جاتی۔''

دوسرے رجحان کا اظہار ''حکایۂ لیلیٰ ومجنوں'' اور ترجمہ ''ازدواج محبت'' میں ہوا ہے جبکہ تیسرے رجحان کی بہت نمایاں مثال ترجمہ ''صحبت ناجنس'' ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا نقطہ نظر رومانی ہے لیکن مقصدی اشاروں سے خالی نہیں اور یوں یلدرم سرور وسرمستی کے عالم میں بھی عقل کا دامن تھامے جمال اور وجدان کے ساتھ معاشی اور معاشرتی عوارض اور مسائل ومعاملات کی تشخیص کرتے جاتے ہیں۔ مقصدیت کی اس لہر نے بعض مقامات پر انہیں براہ راست تخاطب پر اکسایا ہے جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر بیانیہ لہجہ خطابیہ بن گیا ہے۔ مثلاً ''معاف کیجئے میں اب کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اس لفظ کے آتے ہی دل دھڑکنے لگا۔'' وغیرہ جملے تحریر کی دلکشی کو مجروح کرتے ہیں۔ زبان کی سطح پر ترکی فکشن کے اثرات کے تحت ان کے ہاں شعریت نمایاں ہے۔

رومان اور اصلاح پسندی کی روایت میں یلدرم کے بعد نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار نمایاں ہیں۔

اُردو افسانے میں رومانیت کے یہ ابتدائی نمائندے مزاج کے اعتبار سے رومانی رویہ رکھتے تھے نیز وسیع مطالعے کے سبب بین الاقوامی سطح پر رواں (۱۹ویں صدی کا اواخر) رومانی تحریک سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آسکر وائلڈ کی جمال پرستی، ٹیگور کی متصوفانہ اور شاعرانہ نثر، ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی اور رائیڈر ہیگرڈ اور عمر خیام کے عالمگیر اثرات ان افسانہ نگاروں کے ہاں ''رومانی انفرادیت'' کے جاندار افسانوں کا باعث بنے۔

نیاز فتح پوری نے اپنا اولین افسانہ بہ عنوان ''ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' ۱۹۱۰ء میں لکھا جو بیک وقت جنوری ۱۹۱۳ء کے ''نقاد'' اور ''تمدن'' میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں عشق کی رمزیں اور حسن کی توصیف کا ترانہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے نیاز نے خصوصی طور پر خواص کے طبقے سے کردار چنے اور اس طرح پریم چند کے Camp Followers[25] کے متوازی رومانی روچل نکلی۔

نیاز فتح پوری کے افسانوں کی ایک قسم اپنے موضوعات کے اعتبار سے مذہب، رنگ اور نسل سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے وسیع تر

دائرے، کی تکمیل چاہتی ہے۔ اس ضمن میں تین افسانوں کا مجموعہ ''نقاب اٹھ جانے کے بعد'' اہمیت رکھتا ہے ان تینوں افسانوں کے مرکزی کرداروں (مولانا وارث علی کاظمی قادری، خواجہ مسرور شاہ نظامی، مولوی حکیم ناظم صاحب ناظم یتیم خانہ) کا شمار ہندوستان کے جید علماء کرام اور ہادیان طریقت میں ہوتا ہے۔ ہر تین اصحاب کی نجی اور اجتماعی زندگی کی لغزشیں ان افسانوں میں شمار کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ادبی مقالات کے مجموعوں ''نگارستان'' اور ''جمالستان'' میں شامل افسانے بھی اہم ہیں جن میں اجتماعی معاشرتی سوالات اٹھا کر مسائل کے حل کی جانب بھی اشارے کیے گئے۔ رومانی رویہ کے سبب نیاز کے ان افسانوں میں زیریں لہر مذہبی کھوکھلے پن اور انتہا پسندی کے خلاف نفرت کی ہے۔ مجموعہ ''شبنمستان کا قطرہ گوہریں اور دوسرے افسانے'' جس میں ''دنیا کا اولین بت ساز''، ''زہرہ کا ایک پجاری'' اور ''قربان گاہ حسن'' شامل ہیں، جو اپنی خالص رومانیت اور اسلوب بیان کے باعث اہم ہے۔

دارفتہ نوائی کا شاہ کار طویل افسانہ ''ایک شاعر کا انجام'' (مطبوعہ: ۱۹۱۳ء) بھی اسی ذیل میں نمایاں مثال ہے جو دسمبر ۱۹۱۲ء کی تخلیق ہے۔ نیاز نے رومانی بیان کے لیے قدیم رومانی قصوں کو بھی چنا ہے (مثالیں: ''کیوپڈ اور سائیکی''، ''زائر محبت'' اور ''حمرا کا گلاب'') اسی طرح افسانوی مجموعہ ''حسن کی عیاریاں'' تاریخ کے گم شدہ اوراق سے رومان اور حقائق کی بازیافت ہے۔ درحقیقت نیاز کا طبعی میلان یونانی اساطیر کی طرف ہے جس کی سب سے خوبصورت مثال افسانہ ''کیوپڈ و سائکی'' ہے جو ''تمدن'' دہلی بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اس افسانے سے پہلے نیاز نے تمہیدی حصہ بھی لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں:

''غالباً اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ فطرت کا مطالعہ صحیح اولین فرض انسانی ہے اور اس لیے اگر ہم یہ نہیں کرتے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے وجود سے وہ کام نہیں لیتے جس کے لیے ہم وضع کیے گئے ہیں۔''

(تمہید'' کیوپڈ و سائکی'' مطبوعہ ہمدم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء صفحہ ب تا ج)

خود نیاز فتح پوری کے مطابق افسانہ انہوں نے محض شغلہ خلوت سمجھ کر خود لطف اٹھانے کے لیے لکھا:

''لوگ کہتے ہیں کہ تو عریانی ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عریاں، مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تکمیل عریانی پر ہوتی ہے۔''

(افسانہ ''رقاصہ'' سے اقتباس)

عورت کا تصور نیاز کی رومانیت کا مرکز و محور ہے لیکن ان کے افسانوں میں جذبات و تصورات کی مطلق العنانی دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس کی جگہ نفسیات کے پیچیدہ معاملات کی اہمیت ہے۔ رومانی اصلاح پسندی کی اس روایت کے تیسرے بڑے نام قاضی عبدالغفار سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ بہر طور ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان کا لہجہ رومانی ہے لیکن رویہ کے اعتبار سے ''لیلیٰ کے خطوط'' رومانی نہیں شمار ہوں گے۔ اس کتاب کی حد تک قاضی عبدالغفار اصلاح پسندی اور جذباتیت کے تیز دھاروں میں ڈانواں ڈول رہے اور آگے چل کر اپنے افسانوں میں وحدت تاثر برقرار رکھنے کے لیے بیک وقت داستان اور فکشن کی نئی فارم کا باہمی ادغام سامنے لائے۔

قاضی عبدالغفار کا افسانوی مجموعہ ''عجیب'' اس کی مثال ہے۔ مجموعے میں جہاں گرد (چاہ نخشب) میر صاحب (رویائے صادقہ) صحرا نورد (کھسٹیما) اور ایڈیٹر صاحب (ہرجائی) کے فرضی ناموں سے لکھا گیا ہے:

''کاش مرد جو علم و فضل کا سب سے زیادہ کم فہم مدعی ہے۔ چند ایک لمحے عورت کی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں گزارے۔ صرف چند

لیے جو صنف اعلیٰ کے قدیم تعصبات سے پاک ہوں۔"

("لیلیٰ کے خطوط" سے اقتباس)

"لیلیٰ کے خطوط" میں اصلاح پسندی اور مقصدیت اس درجہ غالب ہے کہ قاضی عبدالغفار ان خطوط کو ناول یا افسانہ تک کہلانا پسند نہیں کرتے، ان کے خیال میں یہ صفحات اپنی شرح خود ہیں۔ "ایک چھوٹا سا آئینہ جو ہندو پاک کے نام نہاد مصلحین قوم اور مذہبی رہنماؤں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں عورت کے متعلق اپنی غفلت شعاریوں کا مکروہ چہرہ دیکھ سکیں۔"

ان خطوط میں تھکی ہوئی امیدیں اور خواہشیں، تھکے ہوئے ارادے اور حوصلے، تھکے ہوئے خیالات، تھکی ہوئی محبت، تھکے ہوئے بوسے، تھکا ہوا غم غرض کہ ساری زندگی تھکن سے چور ہے۔ یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جو خودکشی کرنے والے کی آنکھوں میں دم آخر لہراتی ہے۔ ان خطوط پر گوئٹے کے ورتھر کی داستان غم کا گہرا اثر ہے۔

مجموعہ "تین پیسے کی چھوکری" میں افسانہ "ڈپٹی صاحب کا کتا" اور "سراغ رساں" میں طنز کی کاٹ بہت نمایاں ہے اور اس پر قاضی عبدالغفار کا رومانی لہجہ کمال کی حدوں کو چھوتا ہوا۔ "لیلیٰ کے خطوط" کی داستانوی تدبیر کاری کے تسلسل میں "قیس" اور "گھوڑا" جیسے اہم افسانے لکھے گئے ہیں۔

قاضی عبدالغفار کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت احساس جمال کی تسکین کے ساتھ علم وحکمت کی نکتہ آفرینی ہے جو اصلاح پسندی کی اس روایت میں ایک انوکھا اور دل موہ لینے والا لحن ہے۔

"ارادے خود بخود بدل جایا کرتے ہیں۔ منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے اور انسان مغرب کی طرف چلتا ہے۔ اس کارخانے میں جس کو دنیا کہتے ہیں ہم مع اپنے ارادوں کے فرعون کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں۔ رسیاں ہمارے گلوں میں ہیں اور کوئی ہمارے پیچھے ہے۔ چابک بہ دست! جس کے تازیانے کی ضربیں سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی کب دیتی ہیں۔ یہ غلام کیا جانیں کہ کدھر آئے ہیں اور کدھر جانا ہے۔"

("چاہ نخشب" از قاضی عبدالغفار سے اقتباس)



حوالہ:

۱۔ لیو لیپے کے افسانے سے خیال مستعار لے کر۔ م۔ افضل نے "آئینہ" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا جو 'ہمایوں' لاہور مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۳۶ء (ہمایوں۔ لاہور) کے شمارے میں کرشن چندر نے بھی اس تکنیک کو آزمایا۔ قاضی عبدالغفار، میرزا ادیب، رشید جہاں، حجاب امتیاز علی اور اے۔ حمید نے بھی اس تکنیک کو کامیابی سے برتا ہے۔

۲۔ "علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانے" از پریم چند مطبوعہ: "عصمت" کراچی فروری ۱۹۸۶ء

۳۔ ایضاً

۴۔ جوش کے ایک افسانے کا عنوان مشمولہ: ''افسانہ جوش'' مطبوعہ: الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء

۵۔ مشمولہ ''جوش فکر'' ڈسٹرکٹ گزٹ پریس، علی گڑھ سنہ ندارد

۶۔ بحوالہ پریم چند: ''نقوش'' آپ بیتی نمبر صفحہ ۱۸۷

۷۔ ایضاً صفحہ نمبر ۲۰۱

۸۔ بحوالہ ''زمانہ'' کانپور (پریم چند نمبر) ۱۹۳۷ء و ''سہیل'' گیا (پریم چند نمبر) جنوری فروری ۱۹۸۰ء

۹۔ نواب رائے کے قلمی نام سے ۱۹۱۰ء تک قلم کاری کی، افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' ان کی پہلی تحریر ہے جو پریم چند کے قلمی نام سے شائع ہوئی، دیکھئے: ''زمانہ'' کانپور بابت دسمبر ۱۹۱۰ء

۱۰۔ ''پہلی کرسی کے حضور'' از ابوالفضل صدیقی، مطبوعہ: ''سیپ'' کراچی بابت ۱۹۸۸ء

۱۱۔ ہندی میں یہ ڈرامہ پہلی بار گنگا پستک مالا لکھنؤ نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ اُردو میں ''مخزن'' لاہور جولائی ۱۹۲۶ء تا اپریل ۱۹۲۸ء قسط وار شائع ہوا۔

۱۲۔ مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء میں یہ افسانہ نواب رائے کے قلمی نام سے لکھا گیا تھا۔

۱۳۔ ''سوزِ وطن'' مطبوعہ زمانہ پریس کانپور طبع اول: جون ۱۹۰۸ء میں یہ مجموعہ نواب رائے کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔

۱۴۔ بحوالہ پریم چند کا ایک خط مشمولہ: ''ماڈرن ہندی لٹریچر'' از اندر ناتھ۔

۱۵۔ ''The Gift of Cow'' ترجمہ از گورڈن سی۔ روڈارمل مطبوعہ: برطانیہ

۱۶۔ ''The World of Premchand'' از ڈیوڈ روبن مطبوعہ: برطانیہ

۱۷۔ بحوالہ پریم چند ایک مطالعہ'' از وی۔ ایس۔ نکر وتی'' (مضمون بہ زبان انگریزی)

۱۸۔ ''محمد علی ردولوی'' از مولانا صلاح الدین احمد مطبوعہ: ''ادبی دنیا'' لاہور شمارہ اول۔ دورِ پنجم

۱۹۔ ''محمد علی ردولوی'' از مولانا صلاح الدین مطبوعہ: ''ادبی دنیا'' لاہور شمارہ اول۔ دورِ پنجم

۲۰۔ خواجہ حسن نظامی کے افسانہ ''بہرا شہزادہ'' کی ارنسٹ ہیمنگوے کے افسانے ''A Clear Well Lighted Place'' سے گہری مشابہت ایک انوکھا تجربہ ہے۔

۲۱۔ مطبوعہ: ''معارف'' علی گڑھ بابت شمارہ نمبر ۴ جلد نمبر ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء

۲۲۔ مطبوعہ: ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۲۳۔ مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء

۲۴۔ مطبوعہ: ''پگڈنڈی'' یلدرم نمبر صفحہ نمبر ۲۶

۲۵۔ سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی

لخت لخت آوازیں: بازگشت، بازدید

(حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، اختر اورینوی، اعظم کریوی، جلیل قدوائی، محمد مجیب، اوپندر ناتھ اشک،
حیات اللہ انصاری، اختر انصاری دہلوی، سہیل عظیم آبادی اور اشرف صبوحی دہلوی)

حامد اللہ افسر نے سدرشن کے برعکس مسلم متوسط طبقے کو موضوع بنایا اور اختر حسین رائے پوری کی طرح ذہنی پستی اور سیاسی امور میں ناسمجھی پر طنز کیا۔ ان کے افسانوں کی فنی پختگی خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے اپنے ماحول کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ حامد اللہ افسر نے اپنے کرداری افسانوں میں اعلیٰ معیار کی جستجو کی ہے اور اس میں سب سے نمایاں مثال افسانہ ''لاٹری کا روپیہ'' ہے۔

علی عباس حسینی کے ہاں حقیقت پسندی میں رومانیت کے گہرے رنگ نمایاں ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس روایت کا سب سے معتبر نام بھی علی عباس حسینی کا ہی ہے۔ اس کا باعث علی عباس حسینی کا طویل ادبی سفر ہے جو ساٹھ سالہ قلم کاری پر محیط ہے۔

برٹرنڈ رسل نے اپنی ۹۵ ویں سالگرہ پر برطانیہ کے وزیر جنگ (۱۹۲۴ء) اور کیپ ٹاؤن کے ایڈیٹر ۱۹۲۳ء جان سیکسن مل (پ۔ ۱۹۰۱ء) سے کہا تھا:

''یہ میری زندگی کا نیا دن ہے۔''

علی عباس حسینی کی مثال بھی ییٹس، پاؤنڈ، سپنڈر اور پکاسو کی سی ہے، جو ایک تحریک سے دوسری تحریک میں جست لگاتے گئے۔ پہلے رومانی عہد میں سانس لیے، پھر ڈن کا زمانہ دیکھا اور پھر یکے بعد دیگرے نیوکلس، آرٹ برائے آرٹ اور آخر میں علامت نگاری کی تحریک میں شامل دیکھے گئے۔

علی عباس حسینی کا فنی سفر ایک ایسے سلیقہ میں ڈھل گیا جو حقیقت نگاری میں رومانیت اور مثالیت کی اس روایت میں حسن بیان کی انتہائی حدوں کو چھو آیا (مثالیں: ''میلہ گھومنی''؛ ''رفیق تنہائی'')۔

اس روایت میں شمولیت کی گنجائش علی عباس حسینی کی دردمندی نے نکالی جس کی نمایاں مثال افسانہ ''سیلاب کی راتیں'' ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانوں کی ابتدا خالصتاً رومانیت اور شاعرانہ انداز نگارش سے ہوئی۔ جس کی مثالیں ''جذب کامل'' (اوّلین افسانہ: تخلیق ۱۸ یا ۱۹۱۷ء) اور ''پژمردہ کلیاں'' ہیں'' جذب کامل'' رسالہ ''زمانہ'' کانپور ۱۹۲۴ء میں چھپا۔

علی عباس حسینی کے افسانے طبعی تلون اور بے باک حقیقت نگاری کی مثالیں بھی سامنے لاتے ہیں (مثال: مجموعہ ''باسی پھول'') جبکہ شگفتگی تحریر کا باعث ان کی طبعی ظرافت بنی۔ حسینی نے ہندوستان کے شہر اور دیہات کی اجتماعی تحریکات کو موضوع بنایا (مثالیں ''وکیل اور منشی'' اور ''میخانہ'') جبکہ نفسیات کے بھرپور ادارک کی مثالوں میں افسانہ ''بوڑھا بالا'' اور ''بہو کی ہنسی'' ہیں۔ حسینی کے ہاں کرداروں کا تنوع قابل لحاظ ہے خصوصاً ''بیٹی'' کی اینگلو انڈین لڑکی، ''بدلہ'' کی انگریز خاتون، ''حسن رہ گزر'' کی نامعلوم محبوبہ، ''سیلاب کی راتیں'' کا مرد مرکزی کردار اور ''پہرے دار'' کے شوہر نامدار کی کردار نگاری۔

علی عباس حسینی کے بہترین افسانوں میں ''خوش قسمت لڑکا'' (۱۹۳۹ء) ''میلہ گھومنی'' اور ''سیلاب کی راتیں'' نمایاں ہیں۔

اختر اورینوی کا اوّلین افسانہ ''بدگمانی'' اور دوسرا ''زود پشیمانی'' تھا۔ یہ دونوں افسانے ''شمیم'' پٹنہ (۱۹۳۱ء) میں شائع ہوئے البتہ ''نیا شوالہ'' مطبوعہ ''نگار'' لکھنؤ (۱۹۳۲ء) کی اشاعت سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔

اختر اورینوی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ بہار کے دیہات رہے ہیں اور یوں وہ بہار کی مخصوص خوشبو سمیٹنے میں کامیاب ہوئے۔

''گاؤں کے اکثر کھیتوں میں سے ربیع کی فصل کٹ چکنے کے بعد تال کی سیاہ کوال مٹی بہت ہی نمایاں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک وہاں گیہوں اور بونٹ کے سنہرے کھیت شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچھوائی چل رہی تھی جس کی لہروں میں گیہوں کے خوشے اور بونٹ کی چھوٹی اور گداز ڈھیریاں جھول رہی تھیں۔ ہوا میں ہنوز گرمی تھی، گاؤں کے قریب بھیٹھ کی قسم کے کھیتوں میں ترکاریوں کی لیتن اور پودے اپنی ہریاول سے دل ونظر کو فرحت وتسکین بخش رہے تھے۔ ان سبز وشاداب کھیتوں کے درمیان کنوؤں پر لاٹھے لگے ہوئے، جو اکثر چل رہے تھے۔''

(''تسکین حسرت'' سے اقتباس)

اس ماحول میں مالک اور مزارع کی کشمکش اختر اورینوی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اختر اورینوی نے دیہات نگاری سے آگے آ کر جب شہر کو موضوع بنایا تو کچلے ہوئے مزدور پیشہ افراد کی زندگی پیش کی جس کی خوبصورت مثالیں ''گندے انڈے''، ''جونیئر''، ''اب؟'' اور ''بے بس'' جیسے افسانے ہیں البتہ دیہات اور شہر کے نچلے طبقے کی زندگی کی پیشکش میں اختر اورینوی خاص طرح کی جذباتیت کا شکار ہوئے ہیں جس کی مثالیں ''منظر و پس منظر'' میں کثرت سے ملتی ہیں۔ نمایاں مثالوں میں ''بیل گاڑی'' اور ''تسکین حسرت'' ہیں۔ ان افسانوں میں مارکس ازم کا پرچار پمفلٹ بازی بن گیا ہے:

''کلو کا سینہ اپنے قہر کی آگ سے پھنک رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ان سارے بنگلے اور کوٹھیوں کے رہنے والوں کے سر پر دنیا بھر کے گندے انڈے لا کر پٹک دے۔''

(گندے انڈے)

''کلیاں اور کانٹے'' میں نسبتاً بردباری اور ٹھہراؤ ملتا ہے اور توازن کی اعلیٰ ترین مثال افسانہ ''کچلیاں اور بال جبریل'' ہے۔ اختر اور

نیوی نے زندگی کی تصوراتی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ زندگی کی بے کیفی اور اکتاہٹ میں سے زندگی کی امنگ کی تلاش ممکن ہو سکے۔

اعظم کریوی کا نام پوربی علاقے ضلع غازی پور (یوپی) کی کردار نگاری کے ضمن میں نمایاں ہے اور منفرد انداز یہ کہ اعظم کریوی اپنے افسانوی کرداروں کو ہر طرح کی سچویشن میں ڈال کر انسانی کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔

کریوی کی کردار نگاری کا نمایاں وصف کردار کی سچی پیشکش ہے اور اسی کے باعث افسانہ نگار جذبے کی شدت سے بچ گیا۔ نتیجہ انسانی جذبات کی کھری تصویر کشی ممکن ہوئی۔

اعظم کریوی ؒ کے ہاں زبان کا ورتارا خصوصیت کا حامل ہے۔ اُن کے ہاں فارسی اور ہندی کے قطبین کے درمیان ایک نئے لہجے کی دریافت ہوئی جو ان کے مخصوص دیہاتی لینڈ اسکیپ کے لہجہ سے قریب تر تھا۔ دیہات کی سادگی میں انسانی زندگی اور اس کے معاشی پہلو کو کریوی کے ہاں خصوصی موضوع بنایا گیا ہے۔

اعظم کریوی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ موضوع پارہ ضلع غازی پور (یوپی) مہیا کرتا ہے۔ معاشی کشاکش یہاں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ البتہ انفرادیت کی حامل وہ زبان ہے جو اعظم کریوی نے دیہاتی کرداروں کی پیشکش میں برتی ہے۔

اعظم کریوی زندگی کا کھرا ترجمان ہے لیکن نفسیاتی تجزیہ کی گہرائیوں اور پریم چند کے ''کفن'' جیسی ایمائیت سے یکسر مبرا۔ ان کے ہاں دیہات کا رومانی تصور ملتا ہے نیز انہوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ دیہات کے موسم، مناظر فطرت، رہن سہن، طور اطوار، لباس اور بدلتے ہوئے موسموں کی کیفیات کے مطابق گیتوں کو جہاں تک ممکن ہوا اپنے افسانوں میں سمیٹ لیں۔

وہ زبان کے ورتارے کے اعتبار سے ہمارے ابتدائی دیہات نگاروں میں سب سے مضبوط لحن کے مالک ہیں۔ جس کا سب سے بڑا سبب عالمی ادبیات کا مطالعہ اور ترجمے کی روایت سے متعلق ہونا ہے۔

جلیل قدوائی کا اولین افسانہ ۱۹۱۹ء میں طبع ہوا تھا اور اس کے بعد ''سیر گل'' اور ''اصنام خیالی'' کے عنوانات سے جو دو افسانوی مجموعے طبع ہوئے ان میں طبع زاد اور ترجمہ کردہ افسانوں کو یکجا کرنے سے جلیل قدوائی کا شمار ہمیشہ سے ترجمہ کرنے والوں میں ہوتا آیا ہے۔

جلیل قدوائی کی اس پہچان کو مستحکم ہمارے ناقدین نے کیا جن سے اتنا نہ ہو سکا کہ ان دو افسانوی مجموعوں کی گرد جھاڑ لیتے۔ دوسری طرف جلیل قدوائی کی اکثر تحریریں جنہیں خاکہ شمار کیا گیا، وہ درحقیقت افسانے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل کے اودھ کے تبدیل ہوتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی جلیل قدوائی کا موضوع خاص رہا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب نے ''اصنام خیالی'' کے مقدمہ میں جلیل قدوائی کی حقیقت نگاری اور نفسیات سے خصوصی شغف کو موضوع بناتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''اس مجموعے میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے، جس سے فقط دل بہلانا یا تخیل کو لبھانا مقصود ہو، اور ایک سطر نہیں جو محض زیب داستان کے لیے بڑھائی گئی ہو۔ ہر تصویر کسی حقیقت کا عکس معلوم ہوتی ہے اور ہر حقیقت کسی اور بڑی حقیقت کی طرف رہبری کرتی ہے۔''

جلیل قدوائی کے افسانوں میں یہ سب کچھ تو ہے لیکن سب سے بڑھ کر ان کے ہاں زبان کا وہ جادو بولتا ہے جو دلی کی ٹکسالی کا پاکیزہ روپ ہے۔

محمد مجیب نے ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا لیکن اُردو دنیا میں ان کی دھما کہ خیز آمد افسانوی مجموعے ''کیمیا گر اور دوسرے افسانے'' (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) کے ساتھ ہوئی۔ ان کے طبع زاد افسانوں کے علاوہ ایک اہمیت ان کے تراجم کے سبب بھی ہے۔ محمد مجیب

نے خصوصی طور پر روسی افسانہ نگاروں خصوصاً چیخوف کو نہ صرف اُردو دنیا سے متعارف کروایا بلکہ اپنے طبع زاد افسانوں کے ذریعے روسی فکشن کے باغیانہ لحن کو فروغ دیا۔

مجموعہ ''کیمیا گر'' میں شامل نو افسانے مذہبی اور معاشرتی جکڑ بندیوں سے کھلی بغاوت کا اوّلین اعلان تھے۔ یہ افسانے نوسٹلجیا کے زیر اثر گردوپیش میں بکھرے ہوئے مجبور اور بے بس کرداروں اور کچلی ہوئی نفسی کیفیات کے کھرے عکاس تھے جبکہ تقریباً سب کے سب افسانوں میں رواں زیریں لہر مارکس ازم کی تھی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ محمد مجیب کے افسانوں نے ایک حد تک ''انگارے'' (مرتبہ احمد علی) کے لیے زمین ہموار کی۔

اوپندر ناتھ اشک کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ ''یاد ہیں وہ دن'' مطبوعہ ۱۹۲۸ء سے ہوا۔ ایک زمانے میں وہ پریم چند کی طرح صرف ہندی ہی ہو کر رہ گئے لیکن اس کے بعد اُردو کی طرف مراجعت بھی کی۔ اُردو میں کم و بیش ڈیڑھ سو افسانے لکھے، جن میں ''کونپل''، ''ڈاچی''، ''ناسور''، ''بینگن کا پودا''، ''پلنگ''، ''اُبال''، ''ایمبیسڈر'' اور ''کاکڑاں کا تیلی'' جیسے شاہکار افسانے بھی ہیں۔ اشک کا اوّلین افسانوی مجموعہ ''نورتن'' ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اور یوں اشک منزل بہ منزل افسانے کی تکنیکی اور موضوعاتی تدبیر کاری کی نت نئی کروٹوں کا ساتھ دیتے چلے آئے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک کے ابتدائی افسانوں میں اصلاح پسندی کا جذبہ موجزن دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کے فوراً بعد نفسیاتی تدبیر کاری ان کا من پسند طریقہ کار رہا ہے۔

''بات یوں ہوئی کہ دودھ کو انگیٹھی پر رکھ کر وہ اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔ اگرچہ دن کافی چڑھ آیا تھا اور چندن نے دوپہر کے کھانے کے لیے آٹا تک گوندھ لیا تھا لیکن وہ دونوں ابھی بستر ہی میں تھے اور کچھ ہی دیر پہلے اس کے مالک نے وہیں سے چندن کو چائے بنانے کا حکم دیا تھا۔

اس نے دودھ کی پتیلی کو انگیٹھی پر رکھ دیا تھا اور دروازے کی طرف کان لگائے اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے لگا تھا۔ جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی وہ دیر سے اٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا۔ نور کے تڑکے اُٹھ کر وہ چندن کو اٹھاتا، مالش کرواتا، ورزش کرتا، بار ہا سیر کو بھی جاتا لیکن اب وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ دن چڑھے تک سویا رہتا۔ اور جب جاگتا تو وہیں لیٹے لیٹے چندن کو چائے بنانے کا حکم دے کر باتوں میں مشغول ہو جاتا۔ میٹھی مدبھری باتیں۔ چندن کو ان باتوں میں رس آنے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوتے، وہ بیٹھا انہیں سننے کی کوشش کیا کرتا۔

آنچ کی تیزی کے باعث دودھ پتیلی میں بے طرح بل کھا رہا تھا اور چندن اس طرف سے بے خبر ہمہ تن گوش اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''میں مجبور ہو جاتا ہوں تمہارے گال ہی ایسے ہیں۔''

''آپ کے ہاتھوں کا تو کوئی قصور نہیں۔''

''اتنے اچھے ہیں تمہارے گال کہ......''

''جلنے لگے ہیں آپ کی چٹکیوں سے۔''

''لو میں ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔''

اور چندن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نرم و نازک پھول ریشم کے فرش پر جا پڑا ہو۔ تصور ہی تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے ہونٹ اپنی بیوی کے گالوں سے چپکا دیئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعضاء تن گئے اور تصور ہی تصور میں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔ (''افسانہ''،''اہال'' سے اقتباس۔)

اوپندر ناتھ اشک کا افسانوی مجموعہ ''ڈاچی'' انہیں اصلاح پسندوں کے گروہ میں شامل کر دیتا ہے۔ البتہ ان افسانوں میں ہندوستان کی سیاسی بیداری کا بہترین شعور ان افسانوں کی اہمیت بناتا ہے۔

اشک کی رومان پسندی مجموعہ ''ناسور'' میں ظاہر ہوئی البتہ ان افسانوں کی تخیلاتی فضا کے باوجود اصلاح پسندی کا جذبہ انہیں سلطان حیدر جوش کی طرف لے گیا۔ اس سے پہلے اوپندر ناتھ اشک کا شمار خالصتاً پریم چند کے کیمپ فالورز میں ہوتا رہا ہے اور اس کی مثالیں ''نورتن'' اور ''عورت کی فطرت'' (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) تک ملتی ہیں۔

لفظ کے ملٹی ڈائمنشنل استعمال کی طرف حیات اللہ انصاری کی طرح اوپندر ناتھ اشک نے بہت پہلے توجہ کی۔

اوپندر ناتھ اشک کے دیگر افسانوی مجموعوں ''کونپل''،''ڈاچی''،''قفس''،''چٹان'' اور ''پلنگ'' کے خصوصی موضوعات دو ہیں، عورت اور ہندوؤں کے متوسط گھرانے کی ذہنیت، مروج رسومات اور زندگی گزارنے کے رویے۔ ایسے میں اشک نے زندگی کی نفسیاتی حقیقت بنی خوب کی ہے۔

حیات اللہ انصاری کا اوّلین افسانہ ''بڈھا سود خوار'' جامعہ دہلی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور پہلا افسانوی مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' ۱۹۳۸ء میں۔ حیات اللہ انصاری زندگی کے مصور ہیں اور حقیقت نگاری کی روایت سے پوری طرح جڑے ہوئے لیکن فن کی نزاکتوں کو کبھی پس پشت نہیں ڈالا۔ ان کا افسانہ ''چچا جان'' شعور کی رو کی تدبیر کاری کا شاہکار ہے جبکہ زندگی سے جڑے ہوئے ہونے کا ثبوت ان کا افسانہ ''شکر گزار آنکھیں'' ہے جس میں ۱۹۴۷ء کے حوالے سے وسیع تر انسانی جدل کی شدت خود مختار دکھائی دیتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے ہاں موضوعات کا تنوع، باریک بینی اور زبان کے ورتارے میں متین لہجہ خصوصیت کا حامل ہے (نمایاں مثالیں ''پرواز''۔''آخری کوشش'') حیات اللہ انصاری کے طویل افسانوں میں فارم ہمیشہ قابل توجہ رہی ہے اور حیات اللہ انصاری کا نام فن افسانہ نگاری میں روایتی قواعد و ضوابط کی کڑی کسوٹی۔ ''شکستہ کنگورے'' اُن کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اصلاح پسندی کی اس روایت میں حیات اللہ طنز سے کام لیتے ہیں اور یہ طنز ان کی افسانوی تدبیر کاری میں بہت کم جگہ ضعف کا باعث بنا ہے۔ زبان سلیس، رواں اور طنز کی کاٹ لیے ہوئے ہے (مثالیں مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' کے بیشتر افسانے ہیں)

حیات اللہ انصاری بنیادی طور پر ناول کے وژن کے ساتھ اُردو افسانے کی دنیا میں آئے تھے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ مختصر افسانے کی حدود و قیود انہیں تا دیر راس نہیں آئیں اور وہ ناول نگاری کی طرف نکل گئے۔ لیکن ان کے چار افسانے آخری کوشش، شکستہ کنگورے، چچا جان'' اور ''شکر گزار آنکھیں'' مختصر افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اگر حیات اللہ انصاری اپنے وسیع وژن سے مطابقت رکھنے والی کردار نگاری اور مختصر افسانے کی تکنیکی تدبیر کاری میں کامیاب ہو جاتے تو اُردو افسانے کے کینوس پر آج ایک نیا جہان آباد دکھائی دیتا اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں کی پیدا کردہ خود فراموش کائنات اپنے سربستہ راز افشا کرنے کا باعث بنتی اور یہ بلاشبہ اُردو افسانے کا ایک

الگ اور نرول تجربہ شمار ہوتا۔

اختر انصاری دہلوی کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریاں ان کے منفرد زاویہ نظر کے تحت افسانوں میں ڈھلتی رہی ہیں جبکہ موضوعات کا تنوع اور اس کی مناسبت کے ساتھ اسالیب اظہار کی نت نئی کروٹیں خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

اختر انصاری کے افسانوں کا آغاز شدید جذباتیت کے تحت ہوا۔ افسانوی مجموعے ''اندھی دنیا'' میں افسانہ نگار ساری کائنات کو اپنی مٹھی میں بھینچ لینے کی خواہش کرتا ہے۔ ''نازو'' کے افسانوں میں یہ جذباتی اتار چڑھاؤ اعتدال کی سمت آیا ہے جبکہ تیسرا مجموعہ ''خونی'' توازن کی مثال ہے، اور مجموعہ ''یہ زندگی'' اُن کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ کائنات کو مٹھی میں بھینچ لینے کی خواہش آخر آخر حلقہ در حلقہ پھیلتی اکتاہٹ میں سے زندگی کی امنگ تلاش کرنے پر ٹھہری۔

اختر انصاری کی خوش طبعی، بردباری اور نفاست پسندی اُن کے ہاں موضوعات کے تنوع کے ساتھ پہچان بنی۔ افسانہ نگار کے بدلتے ہوئے لہجوں اور اسالیب کی گنجائش موضوعات کے تنوع میں نکلی۔ اس کی مثالیں اختر انصاری کے دو آخری دور کے افسانے ''ازلی بدنصیب'' اور ''غیر مرئی انسان'' (مطبوعہ: نقوش) ہیں۔ دونوں افسانوں کا آغاز قاری کو ابتدا میں ہی اپنی مضبوط گرفت میں لیتا ہے۔ یہ چونکا دینے والی صورت حال افسانوں کے اختتام کے بارے شدید گمراہ کن ہے۔ ''ازلی بدنصیب'' ازل کے ننگے بھوکے انسان کا استعارہ ہے، جس کی خواہش ہے کہ وہ سب کچھ اپنے زور بازو سے کرگزرے۔ اس کی مسلسل ناکامیابی ایک کامیابی کی صورت اس وقت اختیار کرنے لگتی ہے جب اس کی لاٹری نکل آتی ہے۔ لیکن وہ تو چاہتا تھا کہ سب کچھ اپنے زور بازو سے کرگزرے۔ یہ کامیابی دراصل اس کی زندگی میں سب سے بڑی ناکامی کی صورت ہے۔

''غیر مرئی انسان'' کا میجر برائٹ جو دوسری جنگ عظیم میں شدید زخمی ہو کر محض اس لیے زندہ ہے کہ کیپٹن ہنری کی خبر مل جائے کہ کس حال میں ہے لیکن جنگ اپنے شباب پر ہے، کسی کو کسی کی خبر نہیں اور جسے دراصل مرجانا چاہیے، وہ زندہ ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانے بہار سے متعلق رہے ہیں۔ جن میں بہاری زندگی نیز دیہاتی اور شہری ماحول کی مخصوص بو باس ان کی نمایاں پہچان ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی سب سے بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ بہار کی ہی زندگی پر ان کے ایک پیش رو اختر اورینوی اس مخصوص لینڈ اسکیپ سے متعلق بھرپور افسانے قلم بند کر چکے تھے اور کوئی طرز خاص ہی سہیل عظیم آبادی کو نمایاں مقام دلوا سکتا تھا۔ اس طرز خاص کی جستجو میں سہیل عظیم آبادی نے اختر اورینوی کی کرخت حقیقت نگاری کے برعکس بہاری لینڈ اسکیپ کے سکون، ٹھہراؤ اور لوک گیتوں کی فضا بندی پر توجہ صرف کی اور یہی ان کا اسلوب خاص ٹھہرا۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوں میں بہار کے دیہات اور شہر کی فضا کو یکجا کر کے بھی دکھایا ہے اور ایسے میں معاشرتی اور معاشی ناانصافیاں موضوع خاص ہیں۔ یہ صورت حال تازہ ترین افسانوی مجموعے ''تین تصویریں'' تک چلی آئی ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کی تکنیک خصوصی مطالعہ کی طالب ہے جبکہ ان کے ہاں پہلی بار افسانہ بیان کرنے کے روایتی انداز کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ انحراف ایک طرف تو پلاٹ کی سطح پر ہے اور دوسری طرف کہانی کی اٹھان، ارتقا اور منتہا کی پیش کاری ہیں۔ سہیل کے افسانوں سے متوقع نتائج کبھی برآمد نہیں ہوتے، اس کی نمایاں مثال مجموعہ ''الاؤ'' کے افسانے ہیں۔

اشرف صبوحی دہلوی کے افسانوں سے مخصوص کردار نگاری کی جزئیات اور دلّی کی ٹکسالی زبان کا پاکیزہ روپ بے مثل ہے۔

''میں عورت ذات پردے کی بیٹھنے والی ٹھہری، میرا تو ذکر کیا۔ تقدیر سے جس کے پلّے بندھی، وہ بھی ایسے گھر گھسنے ہیں کہ باہر جانے کے نام سے دشمنوں کا برا حال ہو جاتا ہے۔ دس برس سے خاصے تیس روپے کے نوکر تھے۔ صاحب نے کہیں باہر بدلی کر دی۔ بس پھر کیا تھا، دفتر سے جو آئے تو بخار چڑھ آیا۔''

(''سفر ریل کا'' سے اقتباس)

''آ کا کی شہ زوری اور بیکیتی کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ اُن دنوں شاہ بولا کے بڑ کا تراہا سانڈوں کا اکھاڑہ تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ سیلانیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اُس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔''

(''موئے آ کا'' سے اقتباس)

نزول رومان پسندی کی لہر

(مجنوں گورکھپوری، مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی اور میرزا ادیب)

مجنوں گورکھپوری اپنے دور کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۲۰ء کے بعد ادب لطیف کا زور تھا۔ ناول اور افسانے میں یا تو اصلاحی میلان تھا جس کی تنہا نمائندگی پریم چند کر رہے تھے یا وہی رومانی میلان تھا جو ادب لطیف کی روح رواں تھا اور جس کے نمائندے سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی سرکردگی میں اکثریت میں تھے، میرے ناولٹ اور افسانے اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔''[1]

مجنوں گورکھپوری نے مرد اور عورت کی محبت کو معاشرتی جکڑبندیوں سے آزاد دیکھا ہے اور اسی تصور سے نزول رومان پسندی کی ایک نئی لہر چلی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں رومان اور فلسفے کا امتزاج پیش کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خواب وخیال'' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں پر بات کرتے ہوئے سید سبط حسن لکھتے ہیں:

''ان میں حقیقت اور رومان کا ایسا دلکش امتزاج ہوتا تھا کہ اٹھتی جوانیاں جذبات کے طوفان میں بہنے لگتی تھیں۔ ان کہانیوں کے کردار اور ماحول عموماً دیہاتی ہوتے اور جن لوگوں نے بستی گورکھپور یا پوربی یو۔ پی کے دیہات دیکھے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ مجنوں صاحب نے وہاں کے درمیانہ طبقے کے رہن سہن اور مسائل زیست کی بڑی سچی تصویر کھینچی تھی۔ مجھ کو کہ پوربی بھی ہوں، دیہاتی بھی۔ مجنوں صاحب کی ہر کہانی اپنے دیس، اپنے گاؤں بلکہ اپنے گھر کی کہانی نظر آئی۔ اس وقت تک عشق کا ذاتی تجربہ تو نہیں ہوا تھا لیکن ان کہانیوں کو پڑھ کر دل میں ٹیس ضرور اٹھتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش ہم کو بھی عشق ہو جائے۔''[2]

مجنوں کے ان افسانوں میں ٹامس ہارڈی کا گہرا عکس جھلکتا ہے اور مجنوں کے کردار مذہب اور طبقاتی اختلاف اور اونچ نیچ سے بے پروا ہو کر عشق کرتے دکھائی دیتے ہیں اور بالآخر ان کی محبت کا انجام حزن وملال یا بے بسی کی موت ہوتا ہے۔ اس کی سب سے خوبصورت مثال افسانہ ''سمن پوش'' ہے، جسے پڑھ کر بریلی کے ایک نوجوان شفقت نے خودکشی کر لی۔[3]

مجنوں گورکھپوری کے ان افسانوں سے متعلق پروفیسر احتشام حسین کی رائے انتہائی وقیع ہے، لکھتے ہیں:

"محبت میں جو غم اور تلخی ہے، گھٹن اور ناکامی ہے، وہ ان کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے افسانے کسی طرح بھی آج کی فضا میں عام مسائل سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے، لیکن اس وقت کسی نہ کسی حد تک یہ صورت ضرور تھی کہ گھروں کے اندر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، خون تھوکتے تھے، اور دق کا شکار ہوتے تھے اور ان کو سوائے اس کے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا کہ وہ اپنے غم کو چھپائے ہوئے دنیا سے گزر جائیں۔" ۲

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی رومانی فضا مخصوص نفسیاتی اور فلسفیانہ نظام کے تحت ہے، خصوصاً ٹامس ہارڈی اور ہیگل کے اثرات نمایاں ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا خاص موضوع محبت اور اس کے متعلقات ہیں جنہیں روحانیت سے ملا کر انوکھی معنویت دے دی گئی ہے۔ یہاں محبت کا المیہ انجام اہم ہے اور نفسیاتی انفرادیت نمایاں ترین وصف۔

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں یوپی کے سفید پوش طبقے اور نابغۂ روزگار افسانوی کردار ڈھالے گئے ہیں۔ یہ فلسفی شاعر اور زندگی کرنے کی وسیع معلومات کے حامل افراد ہیں۔ واضح رہے کہ قیسی رام پوری کا نام اسی روایت کی کڑی ہے مجنوں کی رومان پسندی اور کرداری سطح پر بقراطیت ٹھوس علمی بحث مباحثہ کے ساتھ شعر کا لحن لیے ہوئے ہے (مثال: "شکست بے صدا" اور "سمن پوش") بعض اوقات افسانے میں رواں فلسفیانہ بحثیں اصل کہانی سے کٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور محض علم کا اظہار رہ جاتا ہے۔

"سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے دماغ میں کوئی فتور نہیں ہے، اور نہ واہمہ پرست ہوں جیسا کہ اکثر ناظرین کو شبہ پیدا ہو جائے گا میں نفسیات کا ماہر سمجھا جاتا ہوں۔ میں نے قوائے انسانی اور ان کے افعال کا پورا پورا مطالعہ کیا ہے۔ میں فلسفہ اور منطق کی تکمیل کر چکا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ سینکڑوں کو ان علوم میں سبق دے چکا ہوں یعنی مدتوں سے پروفیسری کر رہا ہوں البتہ میں صرف علمی اصطلاحوں میں نہیں الجھا۔"

(افسانہ "تم میرے ہو" سے اقتباس) ۱

"سمن پوش" مجنوں کے نمائندہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں کی تکنیک ایک زمانے تک قابل توجہ رہی ہے اور افسانوں میں باطنیت کا موضوع بھی۔ بیانیہ انداز میں مجنوں کا یہ اضافہ کہلائے گا کہ ان کے افسانوں کی ابتداء دراصل کہانی کی انتہا بنتی ہے اور سارا افسانہ نوسٹیلجک رویہ کا غماز ہوتے ہوئے اپنے اختتام پر المناک منظر یاد کھی کر دینے والی صورت حال سے دوچار کرتا ہے جسے المیہ کا منطقی انجام کہنا چاہیے۔

خالص رومان پسندی کی اس روایت میں مسز عبدالقادر کا نام تحیر، خوف اور خون آشامی کی پیشکش کے حوالے سے بہت نمایاں ہے۔ مسز عبدالقادر نے ایڈگر ایلین پو کے گہرے اثرات کے تحت افسانہ نگاری کا آغاز کیا لیکن اس باب میں ان کی اپنی مخصوص افتادِ طبع اور نفسی کیفیات کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔

مسز عبدالقادر اوائل جوانی سے ہی پُر اسراریت کے زیر اثر رہی ہیں۔ اس خاص نوع کی نفسی کیفیات سے باہر نکلنے کی انہیں صرف پندرہ برس تک مہلت ملی، جب ان کی شادی ہوئی۔ بقول مسز عبدالقادر "جب میرے شوہر کا انتقال ہوا تو مجھے پرانی سوچیں پھر آنے لگیں پھر میں نے سیاحت شروع کی تقریباً تمام دنیا دیکھی تمام یورپی ممالک کی سیاحت کی اور تمام اسلامی ممالک کی بھی۔ ہندوانی چیزیں بہت دیکھیں ان چیزوں کو دیکھ کر مجھے سکون ملتا۔ سیاحت کے دوران میں نے انجیل، تورات، زبور اور قرآن مجید کا تفصیلاً مطالعہ کیا۔ اس تمام مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ

میرا فلسفہ آواگوں پر یقین ہو گیا اور مجھے یہ خیال آنے لگے کہ میرا دوسرا جنم ہے اور اس لیے میرا اس دنیا میں دل نہیں لگتا۔ لیکن یہ اعتقاد ہندو عقیدے کی وجہ سے نہیں ہوا کیونکہ مجھے ہندوؤں سے بہت نفرت ہے بلکہ میرا یہ اعتقاد مطالعہ سے اور اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر ہوا کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ جب میں کسی چیز کو دیکھتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں اس چیز کو پہلے بھی دیکھ چکی ہوں لیکن یہ یاد نہ آتا کہ یہ چیز پہلے کہاں دیکھی تھی۔

اس بات کو بیس برس ہوئے کہ مجھے ایک خواب آیا کہ میں ایک سونے کے بنے ہوئے شہر میں پہنچ گئی ہوں۔ جہاں کی ہر چیز سونے کی بنی ہوئی ہے۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون سا شہر ہے تو کسی نے مجھ سے کہا کہ یہ اگلا جہان ہے تو میں نے کہا کہ یہ کون سا اگلا جہان ہے جو اتنا سنسان ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں ایک مکان میں داخل ہوتی ہوں۔ یہ مکان بھی سونے کا بنا ہوا ہے اور اندر صوفے سجے ہوئے ہیں۔ کمرے کے ایک طرف رجسٹر لگے ہوئے ہیں۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ یہ نوشتے ہیں جو دنیا میں کوئی شخص کام کرتا ہے اس کے اعمال ان میں لکھے جاتے ہیں اور مجھے کہنے لگے کہ پڑھ لو لیکن میں نے ان نوشتوں کو پڑھنے سے انکار کر دیا اور کمرے سے باہر آ گئی تو میں نے دیکھا کہ صحن میں دو چوکیاں بچھی ہوئی ہیں۔ میں اس پر بیٹھ گئی۔ ایک عورت جس کی چاندی کی پیشانی تھی سفید لباس میں جس پر چاند ستارے بنے ہوئے تھے، میں نے آتے ہوئے دیکھی۔ جب وہ میرے پاس پہنچی تو میں نے دیکھا کہ وہ میری سہیلی کی بیٹی تھی جو مر گئی ہوئی تھی تو وہ لڑکی کہنے لگی میں یہاں اکیلی رہتی ہوں لیکن چند دنوں تک میرا ایک ساتھی آ جائے گا۔ پھر وہ مجھے کہنے لگی کہ میرے گھر آیئے۔ اس کے کمرے میں خنکی ایسی تھی جو بدن کو چبھتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں تو بہت سردی ہے تو وہ سونے کی قندیلیں لے آئی جس میں ایک ایک کوئلہ دھک رہا تھا لیکن مجھے سردی محسوس ہونے لگی تو میں نے اس سے کہا کہ میں تو واپس جا رہی ہوں۔ جب میری نیند کھلی تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میں نے فوراً اپنے بیٹے سراج الدین ظفر کو اپنی سہیلی کے گھر بھیجا تو پتہ چلا کہ اس کی بہت فوت ہوگئی ہے۔

میں کشمیر سے واپسی پر گڑھی کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری تو ساتھ میری بھانجی اور اس کا خاوند بشیر بھی تھے۔ رات کو میں سوگئی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک جگہ پھر رہی ہوں اور سامنے کوٹھری کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے اندر سے سورۃ یٰسین کے پڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ آواز میاں محمد (جنہوں نے سیف الملوک لکھی ہے) کی ہے۔ میں نے ان سے ملاقات کرنی تھی۔ مجھے کسی نے کہا کہ وہ اپنی منزل سے فارغ نہیں ہوئے تو میں وہیں باغیچے میں ٹہلنے لگی۔'' ۵

کچھ یہی سبب ہے کہ مسز عبدالقادر کا تخیل ہیبت ناک ماحول کی بھرپور عکاسی پر قادر ہے۔ ان کا اولین افسانوی مجموعہ ''لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے'' ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا اور ''صدائے جرس'' ۱۹۳۶ء تک کے افسانوں پر مشتمل ہے۔

''لاشوں کا شہر'' سے ''صدائے جرس'' تک کے افسانوں پر ایڈگر ایلن پو کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں خصوصاً افسانہ ''بلائے ناگہاں'' اور پو کے ''The Black Cat'' کی مماثلت توجہ طلب ہے۔ ۶

پو کے افسانے میں مکان جل گیا لیکن دیوار پر جس میں قہر و غضب کے عالم میں بلی کو چن دیا گیا تھا، بلی کی شبیہ ابھر آئی، یہ مجبور و مقہور حیوان کا انتقام تھا، جبکہ ''بلائے ناگہاں'' میں دیوار سے شیر کی تصویر غائب ہو جاتی ہے اور عین اس وقت ایک درندہ اپنی خون آشامیوں کی ابتداء کرتا ہے۔

''وادی قاف'' کے افسانے مناظر فطرت اور ''راہبہ'' کے افسانے دنیا کی گم نام سیاحت گاہوں کے حوالے سے اہمیت کے حامل

ہیں۔ان افسانوں میں قہارِ فطرت اور انسانی زندگی کی جدوجہد خصوصی موضوع رہا ہے۔

''اس کا بدن بخار سے پھنک رہا تھا۔اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ادھر ادھر سر پٹکتا تھا اور ''مجھے بچاؤ بچاؤ'' کہہ کر جگر خراش چیخیں مارتا، کبھی کہتا ''ہائے چچی حفیظ گرم سلاخوں سے میرا بدن داغ رہی ہے۔'' کبھی کہتا ''ریشمہ مجھے آتشیں بھالا نہ مارو۔ہائے مجھے دوزخ کے فرشتے پابجولاں کر کے لے چلے ہیں، مجھے چھڑاؤ۔''

غرض کہ اسی طرح چیختا چلاتا صبح کے وقت مر گیا۔ادھر طوفان بھی تھم گیا تھا۔

(افسانہ ''پاداشِ عمل'' سے اقتباس)

مسز عبدالقادر کے افسانے نہ صرف موضوعی سطح پر منفرد ہیں بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بھی الگ ذائقہ کے حامل ہیں۔تحیر خیزی اور دہشت ناکی کی پیشکش کے ساتھ ان کا رومانی رویہ انہیں اُردو کے بڑے رومانی تخلیق کاروں میں اہم مقام دلاتا ہے اور ان کے نمائندہ افسانوں میں ''بلائے ناگہاں''، ''کاسہ سر''، ''راہبہ''، ''ناگ دیوتا''، ''وادی قاف'' اور ''پاداشِ عمل'' خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حجاب اسماعیل (یا حجاب امتیاز علی) کا نام رومانی کردار نگاری اور فضابندی کے اعتبار سے رومانی افسانے کا نقطۂ عروج ہے۔اجنبیت کا احساس پہلی بار حجاب کے افسانوں میں ظاہر ہوا، اس پر مستزاد حجاب کے افسانوں کا رومان پرور اور سحر آفریں ماحول تھا۔

ہندوستان کے جنوب میں ضلع کرشنا، دریائے گوداوری کے کنارے فرساپور کے مضافات حجاب کے افسانوں کے لیے لینڈ اسکیپ مہیا کرتے ہیں۔ جہاں کنول کے بہکتے پھولوں سے بھرے تالاب اور دھان کے گہرے سبز کھیت لہلہاتے۔کیوڑے کے جنگل، تاڑ کے نمایاں درخت اور ٹھہرے ہوئے پانی میں گہرے گلابی پروں والی قد آدم حواصلیں، جو سارا سارا دن ایک ٹانگ پر سرنگوں کھڑی رہتی تھیں۔کال کلچیاں اور کالی سنگھاپوری مینائیں اور اس پر کالی راتوں میں دریا کے دونوں کناروں پر اگیا بتیال کی ہیبت ناکی۔حجاب نے پہلی بار بصری رومانیت کا تجربہ کیا۔ایسے میں مولانا راشد الخیری کی المناک اور نیاز کی رومانی کہانیوں کے اثرات کا نتیجہ ''ڈاکٹر گار''، ''چچا لوٹ'' اور ''دادی زبیدہ'' جیسے پُر اسرار اور روحی، صبوحی، صوفی اور ریحانی جیسے رومانی نسوانی کرداروں کی صورت ظاہر ہوا۔

حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی طلسماتی فضا اور گہری رومانیت میں ڈوبے ہوئے کرداروں کی نقل و حرکت حد درجہ پُر اسرار ہونے کے باوجود ہیبت ناکی کی حدود میں داخل نہیں ہوتی اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا مزاج ہے۔حجاب کے افسانوں میں نفسیات، تاریخ، کلاسیکی اور بین الاقوامی ادب، سائنس، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ اور علم نجوم اپنی چھب دکھاتے ہیں اور تخلیقی ادب کو کسی جغرافیے کا پابند نہیں دیکھنا چاہتیں۔

حجاب امتیاز علی اُردو افسانے کے ان گنے چنے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہمارے افسانوی ادب کو کئی زندہ جاوید کردار عطا کیے ہیں اور ان کرداروں میں خصوصیت کے ساتھ دادی زبیدہ، جسوتی، سر جعفر، چچا لوٹ، ڈاکٹر گار، روحی اور زوناش بہت نمایاں ہیں۔

دادی زبیدہ ایک دبلی پتلی باوقار خاتون ہیں جو اپنا حکم منوانے میں خاص نوع کی لذت محسوس کرتی ہیں اور انہیں اپنے بناؤ سنگھار کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی ہے۔سر جعفر اور ڈاکٹر گار اس خاندان کے دیرینہ رفقاء خاص ہیں، جس خاندان کے سربراہ چچا لوٹ ہیں، جبکہ روحی، جسوتی، صوفی، صبوحی اور ریحانی محبت کرنے والے دل ہیں۔ہمیشہ سدا بہار اور دائم جوانی کی امنگوں سے بھرے ہوئے اور ان کرداروں کے ہمراہ ایک بوڑھی اور بھدی حبشن کنیز زوناش ہے جو انتظامی صلاحیتوں میں جملہ ملازماؤں میں سب سے بڑھ کر ہے۔

یہ سب کردار حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے فنٹاسٹک ماحول میں جیتے ہیں۔ یہ وہ جہان ہے جہاں مشرق اور مغرب گلے مل رہے ہیں۔ یہ حجاب کی خیالی ریاستوں کیپاس اور شموگیہ کے باشندے ہیں۔ یہ سب کردار آپ کو کبھی تو ریاست کیپاس یا شموگیہ کے ساحل سمندر پر یکجا ملیں گے اور کبھی دریائے ناشپاس کے کناروں سے ہوتے ہوئے ناشپاس کے جنگلوں میں۔ یہی نہیں حجاب کے افسانوں میں خیالی محل قصر آرفین، قصر عشرت اور قصر نسریں کی اپنی دنیا ئیں ہیں، جزیرہ عباس، نہر عطوس، کوہ فیروزا اور کوہ الماس کا منفرد ماحول ہے۔

حجاب امتیاز علی نے اپنی اس مخصوص اور منفرد افتادِ طبع سے متعلق تفصیل کے ساتھ راہنمائی کی ہے لکھتی ہیں:

''میری ادبی زندگی کا گہرا تعلق میرے بچپن کی تین چیزوں سے ہے۔ فضا، ماحول اور حالات۔ میرے بچپن کا ابتدائی زمانہ جنوب میں دریائے گوداوری کے ہوشربا کناروں پر گزرا۔ ان کناروں کو میں نے ہوشربا کیوں کہا یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے یہ بتاتی ہوں کہ مجھے وہاں رہنے کا اتفاق کن حالات میں ہوا۔ ایک زمانے میں موسم سرما میں عموماً حیدرآباد دکن میں طاعون کی وبا ایسے ہولناک طریق پر پھیل جاتی تھی کہ دنوں میں سینکڑوں اور ہفتوں میں ہزاروں خاندان موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ ایک عرصے کے لیے گھربار چھوڑ کر کسی نئی جگہ جا کر جمنا ایک مرحلہ بن گیا تھا۔ چنانچہ میرے والد مرحوم کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ کچھ عرصے کے لیے جنوبی ساحل پر اقامت پذیر ہو جائیں۔ اس طرح مجھے ایک مدت تک اپنے خوابوں کے جزیرے میں رہنا پڑا۔ یہ وہ پرستانی مقام تھا جہاں کے زمین و آسمان کے درمیان حسن و شاعری کا ایک ابدی چشمہ ابلتا رہتا تھا ایک طرف کنول کے پھولوں کے مہکتے ہوئے تالاب دور تک فردوس نظر بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف دھان کے گہرے سبز لہلہاتے ہوئے کھیت صاحب نظر کو دعوت نظارہ دیتے تھے۔ اس میں کہیں کیوڑے کے عطر بیز جنگل کھڑے تھے جن کی ہوشربا نکہتوں سے وارفتہ ہو کر چاندنی راتوں میں سیاہ پھن والے ناگ اپنے اپنے ٹھکانوں سے بتیابانہ باہر نکل آتے تھے تو کہیں تاڑ کے دیوقد درختوں پر میخواری کے متوالے کوّے تاڑی کی شراب پی کر بدمست ہو جاتے اور شور مچایا کرتے تھے۔ کنول کے معطر تالابوں اور چاول کے سبز پودوں میں چوبیس گھنٹے گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہوتا تھا جو دن کے وقت آفتاب کی شعاعوں میں طلائی اور شب ماہ میں ماہ تاب کی کرنوں سے نقرئی رنگ میں دمکتا رہتا تھا اور پھر سمندری حواصلیں...... !! گہرے گلابی پروں والی قد آدم حواصلیں تمام تمام دن ایک ٹانگ پر سرنگوں کھڑی رہتی تھیں جنہیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی دقیق کائناتی مسئلے پر غور کر رہی ہیں۔ پھر کال کلچیاں تھیں اور کالی کالی سنگھاپوری مینائیں...... جن کی نغمہ سرائیوں سے فضا اکثر تھرا اٹھتی تھی۔ دیکھیے یہ نہ سمجھیے کہ اس وقت میں آپ کو اپنی کسی کہانی کا ایک باب پڑھ کر سنا رہی ہوں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ شاعری نہیں بلکہ خالص حقیقت ہے۔ یقین نہ آئے تو آپ ہی جا کر میرے بچپن کے اس پرستان کی سیر کر آیئے۔ وہ ضلع کرشنا میں ساحل گوداوری پر واقع ہے اور اس کا نام فرساپور ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میں نے خزاؤں اور بہاروں میں امتیاز کرنا سیکھا۔

میں نے ابھی ابھی ان ساحلوں کو ہوشربا کہا تھا اور اس کی وجہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس کی وجہ خوفناک ہے شاید آپ سننا پسند نہ کریں۔ اس لیے میں اسے چھوڑ دیتی لیکن چونکہ کہہ چکی ہوں کہ میں گوداوری کے کناروں کی خوفناک ہوشربائیت کی تفصیل بتاؤں گی اس لیے اب مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ ہوتا یہ تھا کہ کالی اندھیری راتوں میں گوداوری کے سنسان کناروں پر ہندوؤں کی لاشیں جلائی جاتی تھیں۔ جلانے کے دوران ہڈیاں اور سر اس قدر ڈراؤنے شور کے ساتھ چٹختے تھے کہ انہیں سن کر ہوش اڑ جاتے تھے۔ اس سرزمین پر گوشت پوست سے عاری انسانی ڈھانچے اور ہڈیاں جگہ جگہ پڑی رہتی تھیں اور چیخ چیخ کر انسان کے فانی ہونے کا یقین دلایا کرتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب ان ساحلوں پر رات پڑتی تو ہڈیوں کا فاسفورس اندھیرے میں جل اٹھتا تھا اور میلوں فاصلے سے غول بیابانی کی طرح ان ویرانیوں میں روشنیاں

رقصاں نظر آتی تھیں۔ یہ دہشت خیز منظر ہیبت ناک کہانیوں کے لکھنے کی ترغیب دیتا تھا۔ غرض ان کا حسن اور رات کی خوفناکی۔ یہ تھی فضا۔ ایسی فضا میں جو شخص بھی پلے اور بڑھے اس میں تھوڑی بہت ادبیت، شعریت اور وحشت نہ پیدا ہو تو اور کیا ہو۔

تیسری بات حالات کی تھی۔ جنھوں نے مجھے کتاب و قلم کی قبر میں مدفون کر دیا۔ مدفون کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ اگر میں نے اس زمانے میں اپنے آپ کو ادبی مشاغل میں دفن نہ کر دیا ہوتا تو میں کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ زمانہ مرے لیے بے حد حزن و ملال کا تھا۔ مری والدہ ابھی جواں سال ہی تھیں کہ اللہ کو پیاری ہو گئیں ان کی موت مرے خرمن پر بجلی بن کر گری۔ اس زمانے میں میرا ذہنی توازن درست نہ تھا۔ لڑکپن تھا، اس پر شدید ذہنی دھچکا ماں کی موت کا تھا۔ ان دونوں نے مل کر مجھے اعصابی بنا دیا تھا۔'' ؎

کچھ یہی سبب ہے کہ حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ورڈز ورتھ، آسکر وائلڈ اور ٹیگور کے ساتھ ڈاکٹر گار، دادی زبیدہ اور چچا لوٹ بھی جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ان شفقت اور محبت لٹاتے ہوئے کرداروں کے ساتھ ریحانی، صبوحی، صوفی اور روحی زندگی کی لہریں ہیں اور ان لہروں پر رواں حجاب امتیاز علی آگے اور آگے چلی جاتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی کے منفرد رومانی انداز نگارش میں تراشی ہوئی تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب کا ورتارا قابل لحاظ ہے۔ حجاب نے اپنے تازہ افسانوں میں زندگی کے تلخ ترین حقائق کا اظہار بھی کیا ہے۔ (مثالیں ''پے انگ گیسٹ'' اور ''عناصر میں ظہور ترتیب'') لیکن ان کے افسانوں کی پُر اسرار طلسمی فضا قائم و دائم ہے۔

اُردو افسانے میں میرزا ادیب نے ۱۹۳۶ء میں ''افسانہ خواتین'' لکھ کر ایک رومان نگار کی حیثیت سے قدم رکھا۔ ۱۹۴۲ء تک ان کے دو رومانی مجموعے ''صحرانورد کے خطوط'' اور ''صحرانورد کے رومان'' شائع ہو کر مقبول عوام ہو چکے تھے لیکن یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ میرزا ادیب اول و آخر رومانی افسانہ نگار نہیں۔ ''صحرانورد کے خطوط'' اور ''صحرانورد کے رومان'' البتہ لہجے کے اعتبار سے رومانی کہلائیں گے اور میرزا ادیب کی یہ اولین پہچان بھی ہے۔

میرزا ادیب کا ''صحرانورد کے خطوط'' سے ''صحرانورد کے رومان'' تک کا سفر داستان کے بنیادی عناصر سے اپنا تعلق رفتہ رفتہ توڑنے کا سفر ہے۔ ان افسانوں کی تحیر آفرینی کہانی کہنے کی روایت میں خاص معنویت کی حامل ہے اور میرزا ادیب کے یہ افسانے اپنے عہد کے دو متحارب رویوں (کھری رومانیت اور حقیقت پسندی) میں توازن کی مثال ہیں۔

''کل صبح جب کہ آفتاب کی پہلی کرن ریگ صحرا کی پیشانی کو چوم رہی تھی، میں ایک وادی کے نزدیک چشمے کے کنارے ٹھہر گیا، خیمہ لگایا اور اِدھر اُدھر پھرنے لگا، اچانک میری نظر وادی میں ایک سنگ مرمر کی تربت پر پڑی۔'' (افسانہ ''خونیں'' سے اقتباس)

لق و دق صحرا، مصر، بابل اور نینوا کی غلام گردشوں کی نامانوس رومانی فضا اور عشقیہ قصے کے سبب یہ افسانے کھری رومانیت کے کھاتے میں ڈالے گئے۔ حتیٰ کہ انہیں داستانیں تک کہا گیا، حالانکہ ''ٹائپ'' اجنبی کردار اور یکسر اجنبی ماحول کی واحد مثال افسانہ ''ساوت کا قیدی'' ہے۔ جبکہ دیگر افسانوں خصوصاً ''سیل حوادث'' اور ''حکایۂ جنوں'' میں معروض اور ماورا کا بُعد اس حد تک نہیں بڑھا کہ وہ داستان کہلاتے۔ رومان پسندی کی اس روایت میں شمولیت سے متعلق میرزا ادیب خود لکھتے ہیں:

''خبر نہیں وہ کون سا دن تھا...... کون سی تاریخ تھی...... کون سا مہینہ تھا۔ میں اس زمانے میں لمبی سیر کا عادی تھا۔ ایک صبح منٹو پارک کے عقبی حصے سے گزرتا ہوا مستی گیٹ سے ہو کر اس جگہ پہنچ گیا جو لاہور کے شاہی قلعے کی سیڑھیوں کے آگے پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سیڑھیاں پہلے نہیں

تھیں بعد میں بنائی گئی ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ان سیڑھیوں کے نیچے قدم رکھا تھا کہ یکا یک ایک بڑی میٹھی، مترنم اور دل آویز آواز لہرائی ''تم کہاں صحرا نوردی کروگی؟'' میں نے چونک کر دیکھا............ بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک لڑکی چہرے سے نقاب ہٹائے اپنی سہیلی سے مخاطب تھی............ ابدیت کے سمندر سے ایک موج اٹھی اور مجھے بہا کرلے گئی............ میں نے اسے دیکھا، وہ جارہی تھی۔ لاکھوں آوازوں میں وہ آواز پھر کبھی سنائی نہ دی............ اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجتے رہے اور ایک دن میں صحرا نورد بن گیا............ میں نے زندگی بھر صحرا نہیں دیکھا۔ صحرا تو رہا ایک طرف کوئی گھنا جنگل بھی نہیں دیکھ سکا۔'' ۸

بس یہیں سے میرزا ادیب نے خواب سے حقیقت اور حقیقت سے خواب کی دنیا میں چہل قدمی شروع کردی۔ میرزا ادیب کے ابتدائی افسانے پُرشکوہ اور مرصع زبان لکھنے کے حوالے سے ان کی ایک الگ شناخت سامنے لاتے ہیں جو یلدرم، نیاز، مجنوں، مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی سے یکسر مختلف لحن ہے البتہ آدرش حقیقت نگاری کے حوالے سے یہ افسانے قاضی عبدالغفار کی ''لیلیٰ کے خطوط'' سے اگلا قدم ہیں۔

''میری طرح ہزاروں، لاکھوں انسان تاریخ کے بھاری بوجھ کے نیچے کچلے جارہے ہیں...... روشنی کے بغیر جینا، یہ کیا جینا ہے۔ یہ کیا زندگی ہے۔ تمسخر، مذاق، بے دردی۔ انسان روشنی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

(افسانہ ''روشنی'' سے اقتباس)

اس اعتبار سے دیکھیں تو میرزا ادیب نے جہاں فنتسی تخلیق کی ہے وہیں برطانوی راج اور سماجی گھٹن کی نشاندہی بھی کرتے چلے ہیں۔ اس حوالے سے ''نئے انسان''، ''غلاموں کی بغاوت''، ''روشنی'' اور ''دیا'' جیسے افسانے ایک الگ مطالعے کے حامل ہیں۔ موضوعاتی سطح پر تنوع کے باوجود افسانوی مجموعوں ''جنگل'' اور ''کمبل'' سے تازہ ترین افسانوں ''دیا اور چڑیا'' اور ''علیا کی تلی'' تک معاشرتی اصلاح پسندی اور انسانی نفسیات سے گہرا شغف پورے شد و مد کے ساتھ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔



حوالہ:

۱۔ بحوالہ دیباچہ ''صحن پوش اور دوسرے افسانے'' مطبوعہ: کتب خانہ علم و ادب، دہلی: طبع سوم: ۱۹۴۷ء
۲۔ بحوالہ ''مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں'' از سید سبط حسن مطبوعہ: ''الفاظ'' علی گڑھ جنوری۔ اپریل ۱۹۸۳ء
۳۔ اس حادثے کا ذکر رسالہ ''ایوان'' اگست ۱۹۳۳ء اور ''افسانہ کا افسانہ'' از مجنوں ''ایوان'' گورکھپور بابت ستمبر ۱۹۳۴ء میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔
۴۔ بحوالہ ''نگار پاکستان'' کراچی ''اصناف ادب نمبر''
۵۔ بحوالہ مسز عبدالقادر کا ایک خط مشمولہ: ''مسز عبدالقادر'' مقالہ برائے ایم اے (اُردو) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لائبریری، لاہور
۶۔ ''Great Tales And Poems Of Edgar Allan Poe'' مطبوعہ: دی پاکٹ لائبریری نیو یارک، امریکہ ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۸ تا ۲۹۔ اس افسانے کا ترجمہ مولانا حامد علی خان نے رسالہ ''ہمایوں'' یکم جون ۱۹۴۵ء کے لیے ''کالی بلی'' کے عنوان سے کیا تھا۔
۷۔ بحوالہ ''میری ادبی زندگی'' از حجاب امتیاز علی مطبوعہ: ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی ''سالنامہ''
۸۔ بحوالہ ''نقوش'' لاہور آپ بیتی نمبر صفو ۱۱۸۸

''انگارے گروپ'' کا باغیانہ لحن

(سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر)

۱۹۳۲ء میں پروفیسر محمد مجیب کا افسانوی مجموعہ ''کیمیاگر اور دوسرے افسانے'' اُردو افسانے کو ایک نئی کروٹ دینے کے لیے بنیادیں فراہم کر گیا۔ روسی افسانہ نگاروں کے زیر اثر لکھے گئے نو افسانوں کا یہ مجموعہ مذہبی اور معاشرتی جکڑ بندیوں سے بغاوت کا اوّلین اعلان تھا۔ اس روایت میں توسیع ''انگارے'' مرتبہ احمد علی (مطبوعہ: ۱۹۳۲ء) کی اشاعت اور ضبطی ہے۔ یہ نو افسانوں کا مجموعہ تھا۔ پانچ سجاد ظہیر کے، ایک رشید جہاں، دو احمد علی اور ایک محمود الظفر کا۔ یہ تمام افسانے فرائیڈ کے ساتھ فرانسیسی فطرت نگاروں اور مارکس ازم کے اثرات کے تحت لکھے گئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''انگارے'' کے افسانے تدبیر کاری کے اعتبار سے ایمائل زولا، جیمز جوائس، ڈی ایچ لارنس اور فلابیئر موضوعاتی سطح پر سگمنڈ فرائیڈ اور نظریاتی اعتبار سے مارکس اور اینگلز کے زیر اثر تھے اور مذہب پر حملے، شدید پابندیوں کا شدید ردِعمل تھا۔

''انگارے'' کی اشاعت کے خلاف بھی اتنا ہی شدید ردِعمل دیکھنے میں آیا۔ لوگوں نے ''انگارے'' کی کاپیاں بک اسٹالوں سے اٹھا کر مختلف شہروں میں نذرِ آتش کیں۔ ''انگارے'' کے جملہ افسانہ نگاروں کو Iconoclast کہا گیا اور مشرقی روایات کے ان باغیوں کا سماجی بائیکاٹ بھی کیا گیا بقول سجاد ظہیر:

''انگارے اور اس کے مصنفین کے خلاف بڑا سخت پراپیگنڈہ کیا گیا، حسب دستور مسجدوں میں ریزولیوشن پاس ہوئے۔ عبدالماجد دریابادی خم ٹھونک کر ہمارے خلاف اکھاڑے میں آ گئے، ہمیں قتل کرنے کی دھمکی دی گئی اور بالآخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروایا گیا۔''

(''روشنائی'' سے اقتباس)

اس مجموعے کی ضبطی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد اور سماجی جکڑ بندیوں کے خلاف اندر ہی اندر پلنے والی تحریک ایک نئے مرحلے تک آن پہنچی تھی۔ یہ مرحلہ طبقاتی تضاد کے شعور کا مرحلہ بھی تھا۔ یوں ''انگارے'' کی اشاعت سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ترویج ملی۔

اس سے قبل سجاد حیدر یلدرم نے جذبے اور شعریت کی بازیافت چاہی اور پریم چند نے ''عقلیت پسندی'' اور ''مقصدیت'' میں

قومیت کا تصور شامل کر دیا۔ یوں آدرش حقیقت پسندی (راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش) اور ''رومانی مثالیت'' (نیاز فتح پوری) کی دو الگ الگ دھارائیں بہنے لگیں۔

ترجمہ نگاروں کی معرفت عالمی ادبی منظرنامے کے زیر اثر موضوعات اور تدبیر کاری کے نئے اُفق سامنے آئے اور افسانہ نگاری سے متعلق نظریہ سازی نے اہمیت حاصل کی۔

پروفیسر محمد مجیب کا افسانوی مجموعہ ''کیمیا گر'' اور ''انگارے'' (مرتبہ احمد علی) کی روایت۔ نفسیات کا ورود۔ فرائیڈ، ڈی۔ ایچ لارنس اور تکنیک کا تنوع۔ طبقاتی تضاد کا شعور۔ سیاسی اور سماجی سطح پر جدوجہد کا نیا مرحلہ۔

''قیامت کے دن میں جانتا ہوں کیا ہوگا۔ یہ عورتیں وہاں چیخ و پکار مچائیں گی، وہ غمزے کریں گی، وہ آنکھیں ماریں گی کہ اللہ میاں بیچارے.....''

(''نیند نہیں آتی'' از سجاد ظہیر سے اقتباس)

سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں کے ان افسانوں میں زیریں لہر کیمونزم کی ہے اور روحانی اعتقادات پر کاری ضربیں لگائی گئی ہیں۔

۱۔ ''موت یا آزادی؟''

''مجھے موت پسند نہ آزادی، کوئی میرا پیٹ بھر دے۔''

۲۔ ''اڑ گئی سونے کی چڑیا، رہ گئی دم ہاتھ میں۔ اب چاہتے ہیں کہ دُم بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ دُم نہ چھوٹنے پائے۔

''شاباش ہے میرے پہلوان! لگائے جا زور! دُم چھوٹ گئی تو عزت گئی۔''

''کیا کہا! عزت؟ عزت لے کے چاٹنا ہے۔ سوکھی روٹی اور نمک کھا کر کیا بانکا جسم نکل آیا ہے۔ فاقہ ہو تو ہو پھر کیا کہنا، اور اچھا ہے، پھر تو عزت ہے اور عزت کے اوپر خداوند پاک.....''

(''نیند نہیں آتی'' از سجاد ظہیر سے اقتباسات)

۱۔ ''جب دوران درس میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو طالب علم سمجھتے تھے کہ مولانا پر کیف روحانی طاری ہے۔''

۲۔ ''ان کے لمبے کُرتے اور قبائیں، اُن کی کفش اور سلیپر، اُن کی دو پلی ٹوپیاں، اُن کا گھٹا ہوا سر اور اُن کی متبرک داڑھیاں، جن کے ایک ایک بال کو حوریں اپنی آنکھوں سے ملیں گی۔''

(''جنت کی بشارت'' از سجاد ظہیر سے اقتباسات)

''سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے، اس کے تو خزانے پر ہیں۔''

(''مہاوٹوں کی رات'' از احمد علی سے اقتباس)

''انگارے گروپ'' کے افسانہ نگاروں میں سید سجاد ظہیر سب سے نمایاں تھے۔ ۱۳۴ صفحات کے اس مجموعے میں ان کے پانچ افسانے

بالترتیب ''نیند نہیں آتی''، ''جنت کی بشارت''، ''گرمیوں کی ایک رات''، ''دلاری'' اور ''پھر یہ ہنگامہ'' ۷۶ صفحات گھیرے ہوئے ہیں۔

''انگارے گروپ'' کے نقاد کارلو کپولا کے مطابق ''انگارے'' کی ضبطی کا فوری سبب سجاد ظہیر کا افسانہ ''جنت کی بشارت'' تھا جبکہ سارے شواہد اس بات کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ''انگارے'' کا سب سے خوفناک افسانہ ''نیند نہیں آتی'' (از سجاد ظہیر) ہی کا تھا۔

سید سجاد ظہیر کے افسانوں میں شعور کی رو کے ذریعے داخلی خود کلامی، سرریلزم اور دادازم کے رویے غالب دکھائی دیتے ہیں جبکہ موضوع کے مطابق بیانیہ پر خصوصی توجہ صرف کی گئی ہے۔

رشید جہاں کا نام ''انگارے گروپ'' کا دوسرا بڑا نام ہے لیکن اس مجموعے میں ان کا صرف ایک افسانہ بعنوان ''دلی کی سیر'' شامل ہے جسے اس کتاب کا سب سے بے ضرر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ رشید جہاں کی جو شہرت آج ہے اس کا ''انگارے'' میں شامل تحریروں سے کوئی تعلق نہیں۔[۲]

رشید جہاں نے کل انیس افسانے لکھے ہیں جو ''عورت اور دیگر افسانے'' اور ''شعلہ جوالہ'' نامی مجموعوں کے علاوہ ''انگارے'' (مرتبہ احمد علی) اور ''میرے بہترین افسانے'' (مرتبہ محمد حسن عسکری) میں یکجا کیے گئے۔

رشید جہاں نے ہندوستان کی پہلی ترقی پسند خاتون ہونے کے ناطے اپنے افسانوں میں جرأت فکر اور جرأت بیان کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے اس دور میں ''سودا'' (مشمولہ ''عورت'') جیسا افسانہ لکھنا مرد افسانہ نگاروں کے بس کی بات نہ تھی۔ رشید جہاں کے افسانوں میں چڑ کر لگانے اور چوٹ کرنے کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اسے اس دور کی ادبی فضا پر چھائی ہوئی رومانیت کا شدید ردعمل بھی کہا جا سکتا ہے لیکن بقول قرۃ العین حیدر:

''۱۹۳۸ء تک پہنچتے پہنچتے دنیا بدل چکی تھی۔ گھر آنگن وہی تھے مگر باہر کی دنیا میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ڈیوڑھیوں پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے اور محل سراؤں اور کوٹھیوں کے ڈرائنگ رومز کے مخملیں پردے، سب کے سب اس آندھی میں پھڑپھڑانے لگے تھے اور ان کے اٹھنے سے اندر کی ایک بالکل نئی اور غیر متوقع جھلک دکھلائی دے گئی تھی۔''[۳]

احمد علی نے ''انگارے'' کے مرتب ہونے کی حیثیت سے انگارے گروپ کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ شہرت پائی اور اس شہرت کو استحکام ان کے افسانوی مجموعوں بالترتیب ''شعلے'' (۱۹۳۶ء) ''ہماری گلی'' (۱۹۴۳ء) ''قید خانہ'' (۱۹۴۴ء) ''موت سے پہلے'' (۱۹۴۵ء) اور سب سے بڑھ کر ان کے ناول ''دلی کی شام''[۴] سے ملا ہے۔

تکنیک کے میدان میں احمد علی اضافے کا باعث بنے، انہوں نے افسانے کو ابتدائی سالوں میں ہی سریلسٹ انداز سے متعارف کروایا (مثال ''موت سے پہلے'') اور آزاد تلازمہ خیال میں لارنس اور جوائس کی تدبیر کاری کے تحت اپنا اولین افسانہ ''مہاوٹوں کی رات'' (مطبوعہ ہمایوں ۱۹۳۲ء) تخلیق کیا اور بعد میں اسی تدبیر کاری کے تحت ''ہماری گلی'' لکھ کر آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک کا معیار قائم کر دیا۔

''اے کاش! وہ ہوتے، وہ ٹانگیں، ایک سرسبز درخت، گوشت اور ہڈی اور گودے کا۔ اس کا رس خون سے زیادہ گرم اور اس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم۔ ایک تنا، سبک اور مضبوط اور دو ڈالیں اور ایک تنا، ایک دوسرے میں پیوند۔ ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی، ایک دوسرے میں ایک تیسری روح کی امید، ایک پوری زندگی کا خزانہ، ایک لمحہ کا سرمایہ، پرنیستی میں ہستی کی طاقت۔ آہ! وہ ٹانگیں، دو ناگ بل کھائے

ہوئے، اوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر مست پڑے ہیں۔ ایک سوئی کے ناکے میں تاگا اور دو انگلیاں تیز تیز چلتی ہوئی۔''

(''مہاوٹوں کی رات'' از احمد علی...... اقتباس)

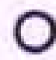
احمد علی کے افسانوں میں تبرکا استعارہ معاشرتی جکڑ بندیوں اور گھٹن کا خوبصورت تخلیقی اظہار ہے اور اُن کے افسانوں میں ماتمی انداز لیے ہوئے یادوں کا دھارا اُن کے منفرد اسلوب کی پہچان۔ سرریلسٹ تدبیر کاری اور شعور کی رو کی افسانوی تدبیر کاری کا شمار احمد علی کی اولیات میں ہوگا۔ بیسویں صدی میں پہلی بار ڈرامائی مونولاگ کا استعمال براؤننگ نے کیا تھا اور پھر ایلیٹ کی ''Prof Rock''۔ احمد علی کے موضوعات میں ہندوستان کی اخلاقی اور سیاسی صورت حال، مسلم گھرانوں کی زندگی، مذہب اور مجموعی طور پر معاشی بے اطمینانی بہت اہم رہے ہیں (مثالیں ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی رات'' مشمولہ ''انگارے'') شعور کی رو ان کے افسانوں میں حال، ماضی اور مستقبل کو بھی باہم یکجا کرتی ہے اور کبھی قطع۔ ایسے میں دہلی کی کروٹ لیتی ہوئی معاشرت اور مشرق و مغرب کا تمدنی، اخلاقی اور فکری تصادم عجیب و غریب اظہار پاتا ہے۔

شکست کا احساس (گزرے دنوں کی یاد) نیم سیاسی اور جذباتی (دیار شفق) اور نتیجہ میں Isolation (مثال ''قید خانہ'')۔ احمد علی کو ان موضوعات کی پیشکش میں انفرادیت بخشنے کا باعث ان کے افسانوں میں تنہائی اور افسردگی کی لہر ہے جس کی خوبصورت مثالیں ''ہماری گلی'' کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ ''شعلے'' مسائلی تحریروں کو افسانہ بنانے کا ایک جتن ہے جس میں بعض مقامات پر فنی تقاضوں سے پہلوتہی کی صورتیں بھی ملتی ہیں۔ کہانی پن اور کردار نگاری کی مثالوں میں ''استاد شموخان'' اور افسانہ ''ہماری گلی'' نمایاں ہیں۔ احمد علی کا نمائندہ افسانہ ''میرا کمرہ'' اس عہد کے فرد کا ذہنی عکاس ہے۔ اس فرد نے زندگی کے بارے میں جو سوچا وہ ہندوستان میں مروج سچائی کا معیار ٹھہرا:

''ہم جو زندگی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کے مانند ہیں۔ اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جس طرح اس کا جی چاہے ہم کو نچائے۔''

احمد علی کے اس فکری ارتکاز کی بازگشت ہم آج بھی اُردو اور ہندی فکشن میں سنتے ہیں۔

محمود الظفر کا صرف ایک افسانہ بعنوان ''جوانمردی''، ''انگارے'' میں شامل ہے[5]۔ جبکہ یہ افسانہ بھی محمود الظفر نے انگریزی میں لکھا تھا اور سید سجاد ظہیر نے اسے اُردو میں منتقل کیا۔ ''جوانمردی'' میں محمود الظفر نے مردانہ جبریت کے حوالے سے ہندوستانی جوڑے کی بچی تصویر کشی کی ہے۔



حوالہ:

۱۔ ''انگارے'' کی ضبطی کے بارے میں بعض تحریروں نے غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کی ابتداء احمد علی کے ناول ''دلی کی شام'' کے دیباچہ از اینڈرسن سے ہوتی ہے اور انتہا ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مضمون ''اُردو افسانے کے رجحانات''، مطبوعہ: ''سیپ'' کراچی افسانہ نمبر میں۔

۲۔ ''انگارے'' میں شامل رشید جہاں کی دوسری تحریر ''پردے کے پیچھے'' اس کتاب کا واحد ڈراما ہے۔

۳۔ بحوالہ: ''افسانہ'' مشمولہ: ''پکچر گیلری'' مطبوعہ: قوسین، لاہور صفحہ نمبر ۳۸

۴۔ ''Twilight In Delhi'' مطبوعہ: برطانیہ طبع اول: ۱۹۴۰ء

۵۔ صاحبزادہ محمود الظفر (۱۹۰۸ء۔۱۹۵۶ء) ترقی پسند تحریک کی نظریہ ساز شخصیت، ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل اور ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر تھے۔

ترقی پسند تحریک

(عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، اختر حسین رائے پوری، ملک راج آنند، احمد ندیم قاسمی،
کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، دیوندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، شمشیر سنگھ نرولا)

سجاد ظہیر اور احمد علی نے ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کے ایک گوشے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ابتدائی لائحہ عمل مرتب کیا (بمطابق احمد علی کا انٹرویو از سحر انصاری ۶۹۔۱۹۷۰ء کراچی)

احمد علی اپنے ایک مضمون ''تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف''..... (مطبوعہ ''سیپ'' شمارہ ۴۲) میں لکھتے ہیں:

''محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورہ سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے، ان کی رضامندی کا ذمہ لیا جو بعد میں انہوں نے خود بذریعہ خط بھیج دی۔ چنانچہ ۳۳۔۱۹۳۲ء میں اس کے بانی بانیوں کے سامنے جو مقصد تھا وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ:

''ہم ان تمام اہم مسائل زندگی پر آزادی رائے اور تنقیدی حق چاہتے ہیں جو نسل انسانی کی بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں۔'' [1]

اسی زمانے میں لیکن اس اعلان کے بعد برصغیر کے ادیبوں کا ایک جلسہ لندن میں بھی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ملک راج آنند، راجا راؤ، اقبال سنگھ اور سجاد ظہیر کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے، جنہوں نے اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔

جب ۱۹۳۵ء۔۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور العمل زیر غور تھا، ان دنوں، ملک راج آنند، سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری انجمن کے نصاب سے متعلق بحث مباحثوں میں سرگرمی سے حصہ لینے والے اہم نام تھے۔ واضح رہے کہ ان میں سے بیشتر اصحاب انڈین کیمونسٹ پارٹی کے رکن نہیں رہے اور نہ ہی اشتراکی نظام سے سرگرم دلچسپی رکھتے تھے، خصوصاً مجنوں گورکھپوری، رگھوپتی سہائے فراق، اعجاز حسین اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔

اقبال سنگھ نے اپنا افسانہ ''When one is in it'' اور ڈاکٹر ملک راج آنند نے ''مرغزار''، ''فطرت کا دل'' اور ''A Kashmir Idyll'' لکھ کر ترقی پسندانہ افسانہ لکھنے کا فارمولا وضع کیا۔ ملک راج آنند نے دیہات نگاری کو ترقی پسندی کا تڑکا لگایا۔

''دن بھر مطلع صاف رہا تھا، لیکن شام ڈھلتے ہی بادل گھر آئے تھے اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ہیبت ناک دیو چنگھاڑ رہا ہو اور اس کے نوکیلے دانتوں کی چمک سے بجلی کوند رہی ہو۔ دفعتاً بادلوں کی دہشت ناک گڑگڑاہٹ وادی میں گونج اٹھی اور کسانوں کی لڑکیاں مرغی کے چوزوں کی مانند سہم کر اپنی اپنی پھوس کی جھونپڑیوں میں دبک گئیں۔''

(''فطرت کا دل'' سے اقتباس)

اس ضمن میں اقبال سنگھ کے افسانے کا بے روزگار مرد اور عورتوں کا ہجوم ''کھمباٹا اینڈ کھمباٹا لمیٹڈ'' طرز کا کارخانہ، بہتا ہوا خون اور مل کے مینجنگ ڈائریکٹر کا کرداری مطالعہ کرتے ہوئے سماجی موضوعات پر نفسیاتی تجزیہ بہت اہم ہے اور یوں یہ فارمولا پریم چند کے ''ڈامل کا قیدی'' سے ہوتا ہوا آج کے نوترقی پسند افسانہ نگار تک پہنچا۔

شروع سے ترقی پسند افسانے میں یہ گھپلا رہا کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر پارٹی کے مرتبہ عقائد کو بار بار دہرایا گیا اور وہ بھی اسی صورت میں کہ ترقی پسند اصولوں سے ذرہ برابر روگردانی نہ ہونے پائے۔ اس سے یہ تو ہوا کہ ترقی پسند مینی فیسٹو کی پابندی احسن طریق پر ہوئی لیکن ادب کا باقاعدہ قاری بار بار لکیر پیٹنے کے اس عمل سے بیزار بھی ہوا۔ البتہ ترقی پسند افسانہ اپنے عقائد زندگی کے ہر طبقہ فکر کے لوگوں تک پہنچانے کی فکر میں نئے موضوعات کی پیشکش کے امکانات بعد میں آنے والوں کے لیے ایک حد تک ختم کر گیا۔ افسانے کی فارم، تدبر کاری اور زبان کے درتارے کی سطح پر البتہ ترقی پسند نظریات کا حامل افسانہ جامد نظر آتا ہے اور ایسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ناموں کی فہرست طویل ہے جن کے افسانے ترقی پسند مینی فیسٹو کے تحت خارجیت، حقیقت نگاری اور مقصدیت کی تثلیث کا شکار ہوئے۔ اس کے باوجود ترقی پسند تحریک نے اُردو افسانے کو متعدد جاندار آوازیں بخشیں۔ ایسے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر ملک راج آنند، دیویندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، شمشیر سنگھ نرولا اور بلونت سنگھ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ڈاکٹر ملک راج آنند ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز و فارمولسٹ افسانہ نگار تھے اور یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ انہوں نے ترقی پسند افسانہ تراشنے میں پہل کی، ایک ایسا افسانہ جو ترقی پسند مینی فیسٹو کے عین مطابق ہو اور جس کے ذریعہ طبقاتی شعور اجاگر کیا جا سکے۔

ملک راج آنند نے بیک وقت انگریزی اور اُردو میں لکھ کر عالمی سطح پر شہرت پائی۔ انگریزی میں ان کے ناولوں ''Tne Untouchable''، ''Sword And the Sickle''، ''Coolie'' اور ''The big Heart'' بہت مشہور ہوئے۔ آپ کا تعلق پنجاب سے تھا اور پیدائش سرحد کی، اور اس دور کا ہندوستان ناقابل برداشت باجگذاری اور معاشرتی بغاوت کا گڑھ تھا۔ آپ نے کچلے ہوئے لوگوں کی نفسی کیفیات کو ''A Kashmir Idyll''، ''مرغزار''، ''فطرت کا دل'' اور ''دھرتی کا پھل'' جیسے افسانے لکھ کر کمال ہوشمندی کا مظاہرہ کیا۔ افسانوں میں

سماجی موضوعات کی سطح پر طبقاتی تناؤ اور تدبیر کاری کی سطح پر نفسیاتی تجزیے ان کے من پسند موضوع رہے ہیں، لیکن کچھ اس طرح کہ ابلاغ کا کوئی مسئلہ سر نہ اٹھا سکا۔ ان کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ زیادہ تر کشمیر اور آسام کا علاقہ رہا ہے۔

''دھرتی کا پھل میٹھا ہے!

اور محنت کا رنگ کڑوا ہے

گنگو اس گیت کو بے خودی نیم خوابی اور ماندگی کی حالت میں گائے جارہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پھاوڑے سے زمین کا سینہ چاک کئے جارہا تھا۔ اس کے دو بیل بھی تھے موتی اور دینا لیکن اس ملک میں آنے سے پہلے وہ انہیں بیچ آیا تھا، اور آج کی تکان سے اسے وہ بیل یاد آ رہے تھے۔ موتی اور دینا!

اس کا ایک دوست تھا بوٹا۔ وہ اسے یوں ہی سبز باغ دکھا کر آسام میں لے آیا۔ چونکہ بوٹا میکفرسن اسٹیٹ میں ملازم تھا۔ اس لیے گنگو کو بھی اس کی باتوں کا یقین آ گیا۔ اسے یہ کہا گیا تھا کہ تمہیں پندرہ روپے ماہوار ملیں گے چائے کے کھیتوں میں کام کرنا ہوگا اور ساتھ ہی زمین کا ایک ٹکڑا بھی مل جائے گا۔ جس میں وہ چاول وغیرہ بو سکے گا۔ یہاں پہنچ کر ایک مدت تک اسے زمین کا ٹکڑا نہ مل سکا۔ آخر ایک دن اس کی بیوی ساجنی ملیریا سے مرگئی۔ جو ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا اس نے گنگو کی حالت پر ترس کھایا۔ منیجر صاحب کو بھی ڈانٹ پلائی تو اسے زمین کا ٹکڑا ملا۔''

(''دھرتی کا پھل'' از ملک راج آنند سے اقتباس)

دیوندر ستیارتھی کی نمایاں پہچان ترقی پسندی اور وطن پرستی ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہی فضا کو گرفت میں لینے کے ضمن میں رنگوں اور گیتوں کی خاص اہمیت ہے۔ ابتداء میں ستیارتھی نے من کی لہر پر لکھا اور تکنیکی لوازمات کا اتنا خیال نہیں رکھا جس قدر کہ لینڈ اسکیپ اور لوک گیتوں کے حوالے سے کردار سازی پر توجہ صرف کی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہاں تکنیکی تنوع اہمیت حاصل کرتا گیا اور یوں ان کے کامیاب افسانوں میں تکنیکی مہارت اور دھرتی کی بوباس کا انوکھا تال میل اور رابندر ناتھ ٹیگور کے طرز کی کردار نگاری ایک انوکھے تجربے میں ڈھل گئی۔

دیوندر ستیارتھی کے افسانوں کا ایک نمایاں وصف انشا پردازی کا مخصوص رنگ، الفاظ کا مناسب ترین انتخاب اور بیان کا ٹھہراؤ ہے۔

دیوندر ستیارتھی کے افسانوں کا ہر لحہ تبدیل ہوتا ہوا دیہاتی لینڈ اسکیپ ہمیشہ قابل توجہ رہا تھا۔ بعض اوقات ستیارتھی کے افسانوں میں دیہات، شہر اور جنگل اپنے باسیوں سمیت باہم ایک ہو گئے ہیں اور اس نئی ترتیب کی پور پور سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اور گیتوں کی مدھر لے امڈ امڈ پڑتی ہے۔ دیوندر ستیارتھی کے ہاں جنسی الجھنیں، معاشی ناہمواریاں اور ''عورت'' بنیادی موضوعات رہے ہیں۔ ایسے میں ''مائی تلساں'' جیسی کامیاب کردار نگاری ستیارتھی کا ہی حصہ ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں تدبیر کاری کی سطح پر کیمرہ تکنیک اور بیان کی سطح پر صحافیانہ اپروچ سے کام لیا، جس کے سبب ان کے افسانوں میں کبھی تصنع کی فضا محسوس ہوئی اور کبھی انتہا کی صاف گوئی اور بے باکی کھلنے لگی۔ ان ہر دو طرح کی خامیوں یا خوبیوں کے ضمن میں خواجہ احمد عباس کو کرشن چندر کا پیش رو کہنا چاہیے۔ اسی طرح خواجہ احمد عباس کا نام اپنے اسلوب کے اعتبار سے کرشن چندر کی

روایت سے متعلق ہے لیکن موضوعات کی سطح پر خواجہ احمد عباس خود کرشن چندر اور بیشتر ترقی پسند افسانہ نگاروں از قسم ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی کے لیے راہ نما ثابت ہوا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خواجہ احمد عباس سب سے پہلے بطور موضوع شہر کی مصروف زندگی اور کاروباری ذہنیت کو گرفت میں لینے پر قادر ہوا۔ احمد عباس سے پہلے اُردو افسانے میں شہر کی خام تصویر کاری، پریم چند، مہاشہ سدرشن، علی عباس حسینی اور رشید جہاں کے ہاں بہت ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مصروف کاروباری شہر اپنے تمام شر اور خیر سمیت صحافت کے وسیلے سے اپنی اصل ذہنیت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ یوں شہر کے ہنگامے اور حادثات نے افسانے کو نیا منظر نامہ مہیا کر دیا۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوی مجموعے ''زعفران کے پھول'' کے تینوں طویل افسانے اخباری رپورٹر کا طریقہ کار لیے ہوئے ہیں۔ زعفران کے کھیت میں کھڑی بڑھیا کا شہری بابو سے مکالمہ رفتہ رفتہ خود کلامی میں ڈوب جاتا ہے اور شہر کی جانب تیزی سے جاتی بل کھاتی ہوئی سڑک پر افسانہ نگار رواں دواں ہے۔ ''زعفران کے پھول''، ''اجنتا'' اور ''اندھیرا اجالا'' بالترتیب شہر کی مقتدر ہستیوں کرشن چندر، علی سردار جعفری اور پرتھوی راج کپور کے نام کیے گئے ہیں۔ پہلا افسانہ کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے کرشن چندر کے افسانوں کا انداز لیے ہوئے ہے جبکہ ''اجنتا'' سردار جعفری کے باغیانہ مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ پرتھوی راج کے نام ''اندھیرا اجالا'' کیا گیا ہے جس میں انڈین فارمولا فلم کی تکنیک کامیابی سے برتی گئی ہے۔ موضوعاتی سطح پر تینوں افسانے شہر کے کھوکھلے پن کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''اندھیرا اجالا'' کی ابتدا ہیرو کے تعارف سے ہوتی ہے پھر ہیروئن ہے، ہیرو کی امید کے جگمگاتے چراغ: ہیرو کا ہیروئن کو چھوڑ کر سنہری تتلی کی طرف جھکاؤ، ہیروئن کا عشرت کدہ اور گڑ کی چائے، وقفہ۔ وقفہ کے بعد ہیرو کی واپسی، ہیروئن سے قربت، ہیروئن بجائے مغموم غزل گانے کے انقلابی نعرہ بلند کرتی ہے، زہر عشق تنگچر آیوڈین ثابت ہوا ہے، شادی کی تیاری...... آخر کار ملاپ۔

اس افسانے میں فلم تکنیک کا کامیاب برتاؤ پہلی بار کیا گیا ہے جب کہ اسی تدبیر کاری کے تحت ''بمبئی رات کی بانہوں میں'' شاہکار ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ہاں ایک طرف تو ''چاکلیٹ اور وقت'' جیسے کومل افسانے میں اور دوسری طرف ''چوراہا'' جیسے چونکا دینے والے کرخت حقائق پر مبنی افسانے۔ جن میں سٹہ بازار، رام کنڈ کا پوترپاپی، نیو یارک کاٹن۔ اوپن کلوز اور فلم پروڈیوسر سب ایک ہو گئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کا بطور افسانہ نگار سب سے بڑا جوہر ان کے مخصوص نکتہ نظر میں پوشیدہ ہے۔ وہ شدید قسم کے قوم پرست واقع ہوئے ہیں اور ان کی یہ قوم پرستی پاکستان کے کٹھ ملا ادبی حلقوں میں ناگوار خاطر رہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کیا کہتے ہیں اور اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے، اُردو افسانے کی تاریخ میں خواجہ احمد عباس ایک واضح اور دوٹوک نکتہ نظر کے حامل افسانہ نگار کے طور پر ہمیشہ باعث نزع بھی رہیں گے اور یاد بھی رکھے جائیں گے۔ البتہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فکری سطح پر خواجہ صاحب کے فکری نظام کے سائنٹیفک تجزیے کی ضرورت بھی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

خواجہ احمد عباس کی طرح کرشن چندر کے ہاں شہر میں روزمرہ ضروریات کے تحت تبدیل ہوتا ہوا انسانی برتاؤ مفاہمت اور حرص کی عجیب وغریب تصویریں سامنے لاتا ہے۔ احمد عباس کے منگو (میرلین کی پتلون) اور کرشن چندر کے چندرو (چندرو کی دنیا) کی ایک سی کائنات ہے، ایک سی معصوم خواہش اور ان کے چہار جانب منافقت کا دریا رواں ہے۔ ''میری لین کی پتلون'' میں افسانہ نگار جو مناظر دیکھ اور دکھا رہا ہے، اس

منصب پر'' بمبئی رات کی بانہوں میں'' کا پریس رپورٹر ''ارجن'' بھی فائز ہے۔ ارجن جس نے زندگی کے پھیلاؤ سے بھاگ کر چند گھڑیاں محبوب کی بانہوں میں گزارنی چاہی ہیں۔ بڑے شہر کی تاجرانہ ذہنیت کس طرح انسانی اقدار کی صورتیں مسخ کرتی ہے اور مجرم کرداروں کے ساتھ خیر چاہنے والے کردار کیسے ہیں جو نیکی اور پاکیزگی کے خواب دیکھتے ہیں؟ ان سب کی تصویر کاری خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کے بعد کشمیری لال ذاکر کے افسانوں میں ایک معیار قائم کرتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں جب کرشن چندر کا ''ہوائی قلعے'' (انشائے لطیف) رسالہ ''ہمایوں'' میں شائع ہوا تو مدیر ہمایوں میاں بشیر احمد نے اسے مندرجہ ذیل الفاظ میں سراہا تھا:

''مسٹر کرشن چندر کا شمار اُردو کے موجودہ ادباء کی صف اول میں ہوسکتا ہے۔ اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زوردار زبان، سیر حاصل اور رنگین تخیل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہوگا۔''

آگے چل کر کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے ذریعے موضوعی سطح پر اس روایت کو آگے بڑھایا جو پریم چند سے ہوتی ہوئی کرشن چندر کے سینئر ہم عصر علی عباس حسینی تک پہنچی تھی اور جس میں حسینی نے دلکش نثر نگاری کا اضافہ کردیا تھا۔ کرشن چندر نے اپنے بہترین افسانوں خصوصاً ''مہالکشمی کا پل''، ''دس کا نوٹ''، ''جوتا'' اور ''چندرو کی دنیا'' میں اُردو افسانے کی اس پھیلتی پھولتی ہوئی روایت کو اپنی تکنیکی مہارت اور شوخی بیان سے مزید سنوارا۔

اس روایت میں کرشن چندر کی ایک منفرد خوبی اس کی جرأت فکر ہے، کچھ یہ سبب ہے کہ اس کے افسانے تقریباً پینتیس برس پر محیط معاشرتی اور سیاسی کروٹوں کے ترجمان بن گئے۔

اختر حسین رائے پوری کی اولین شہرت ترقی پسند ادب کے نقاد کی ہے اور ان کا مضمون ''ادب اور انقلاب'' اُردو میں ترقی پسند تنقید کی بنیاد ہے۔ بطور افسانہ نگار اختر حسین رائے پوری کی پہلی اور آخری پہچان افسانوی مجموعہ ''محبت اور نفرت'' کے افسانے ہیں۔ یہ الگ قصہ ہے کہ انہوں نے اس پہچان کے حصار کو طویل سفر اختیار کرکے توڑنے کی سعی کی اور ۱۹۴۷ء کے ہنگام سے بہت پہلے مسافرت کے دوران لکھے گئے نسبتاً وسیع منظرنامے سے متعلق افسانوں کا مجموعہ ''زندگی کا میلہ'' ترتیب دے لیا تھا لیکن یہ مجموعہ بہت بعد میں جا کر شائع ہوا اور ''محبت کا نفرت'' کی شہرت جوں کی توں رہی۔

''زندگی کا میلہ'' میں شامل افسانوں کو خود انہوں نے ''ایک بھٹکی ہوئی روح کا سفر کا جستہ جستہ احوال'' اور ''انسانیت کے پُرسوز المیہ کا ماتم'' قرار دیا ہے۔ ان افسانوں میں شدید بے زاری، تلخی اور بے تابی کا عنصر نمایاں ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری کا آغاز افسانہ ''زبان بے زبانی'' مطبوعہ ''نگار'' لکھنؤ مارچ ۱۹۳۴ء سے ہوا اور انہوں نے اپنے افسانوں میں رومان اور حقیقت پسندی کا ایک انوکھا امتزاج پیش کیا۔ اس ضمن میں وہ خود رقم طراز ہیں:

''رومان بھی زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کی کلفتوں کو چھپایا جائے۔ میں ایسا دن نہیں چاہتا جس کی کوئی رات نہ ہو اور نہ اس نیند کا قائل ہوں جس میں سپنے نہیں دکھائی دیتے۔''

(دیباچہ ''محبت اور نفرت'' سے اقتباس)

اختر حسین رائے پوری نے سنسکرت، ہندی، بنگالی، انگریزی اور فرانسیسی فکشن کے وسیع مطالعے سے اپنے اس مخصوص اسلوب کی نوک پلک سنواری ہے۔ تقریباً سب رومان پسندوں نے رومان کو کلاسیکیت کی نہیں حقیقت پسندی کی ضد خیال کیا ہے جبکہ اختر حسین رائے پوری رومان اور حقیقت پسندی دونوں کی جانب بازو پھیلائے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے میں نے اختر رائے پوری کو رومان پسندوں میں شمار نہیں کیا۔

اختر حسین رائے پوری نے اپنے افسانوی مجموعے ''محبت اور نفرت'' میں اپنے افسانوں کو یہی دو عنوانات دیئے۔ ''محبت'' کے افسانے رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ نثر میں شعریت کی جستجو کرتے ہیں جبکہ ''نفرت'' کے افسانے حقیقت پسندی کی مثال ہیں۔ افسانوی تدبیر کاری کی یہی دو انتہائیں مجموعہ ''زندگی کا میلہ'' میں بھی نمایاں ہیں۔ جنسی اور اخلاقی پستی پر اختر حسین رائے پوری کا طنز بہت گہرا ہے اور زندگی کا میلہ کے افسانے اپنے کرداروں کی سیماب صفتی، تلخ کلامی اور گردوپیش کی صورت حال سے شدید بیزاری کے مظہر ہیں۔[۲]

اختر حسین کے افسانوں میں لینڈ اسکیپ کا تحرک خصوصی طور پر توجہ طلب ہے۔ ایک طرف افسانہ ''کافرستان کی شہزادی'' چترال کی وادی بمبریت سے متعلق ہے اور دوسری طرف ''دل کا اندھیرا'' جنگ عظیم کے فوراً بعد کے پیرس کی پیشکش۔ اختر حسین رائے پوری کی رومانوی رو میں داستانوی انداز بہت نمایاں ہے:

''کافرستان کی شہزادی کا جسم نازنین ایک صندوق میں بند کر کے کسی پہاڑ پر رکھ دیا۔ امیلیا نے کسی سے شادی کر لی اور پیرس کے کسی ریستوران میں اس روز ایک دوسرے کو دیکھ کر بھی نہ پہچان سکے۔ نوجوانی میں برگد کے پیڑ کی پھیری پر ہنستے تھے اور نہ جانتے تھے کہ اس ہنسی کی صدائے بازگشت آج سنیں گے۔''

(''زندگی کا میلہ'' سے اقتباس)

عزیز احمد بنیادی طور پر بیانیہ کے آدمی ہیں اور افسانے میں حقیقت واقعہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے کہانی کا پلاٹ بنانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ انہوں نے بیان کے لیے ہمیشہ تاریخ اور کہانی کو ہم اصل خیال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے خصوصاً ''شعلہ زار الفت'' (مطبوعہ ''نگار'' نومبر ۱۹۳۰ء)، ''میرا دشمن میرا بھائی'' (مطبوعہ ''نقوش'' شمارہ اول) ''زریں تاج'' اور ''آب حیات'' (مطبوعہ ''سویرا'' شمارہ نمبر ۱۰۔۱۱) تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ تاریخ سے متعلق ان افسانوں کو سرکاری درباری یا تبلیغی نوعیت کے کام سے الگ کر کے دیکھنا ہوگا، اس لیے کہ عزیز احمد تاریخ سے متعلق اپنا ایک مخصوص فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ یوں یہ کہنے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' محمد احسن فاروقی کا ''سنگم'' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' اور سلمان رُشدی کا ''مڈ نائٹس چلڈرن'' عزیز احمد کی اُردو ادب میں پیدا کردہ روایت کی چیزیں ہیں۔

عزیز احمد کے افسانوں میں تمثیل کے زیر اثر عاشق اور محبوب پہلی دوسری ملاقات میں ہی کھیل کھیلتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمارے بیشتر داستانوی کرداروں کی طرح عاشق کا کردار حد درجہ فعال اور محبوب انتہا درجے کا مخص واقعہ ہوا ہے۔

عزیز احمد نے ترقی پسند فارمولہ کے تحت لکھے جانے والے افسانوں کی پیدا کردہ یکسانیت کے تنگ حصار کو تمثیل، داستان اور اساطیر کی ٹریٹمنٹ سے توڑنے کا جتن کیا ہے۔ میری اس بات کو مان لینے میں اس لیے بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے کہ عزیز احمد ''آدرش

حقیقت نگار'' اور'' ترقی پسند ادیب'' ہونے کے باوجود کمیونسٹ مینی فیسٹو کے پابند لکیر کے فقیر کبھی نہیں رہے۔ بقول عزیز احمد:

''اشتراکی ملک کے رہنے والا'' نیا انسان'' بھی جب عام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی خلاء محسوس کرے گا، جس کے لیے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی۔''

(''ترقی پسند ادب'' سے اقتباس)

عزیز احمد اپنے افسانوں میں اسی وجدانی احساس کی بازیافت کے لیے کوشاں رہے۔

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کا آغاز لگ بھگ ۱۹۳۵ء میں اس دور کے بڑے رومان پسندوں خصوصاً نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی کے زیر اثر ہوا لیکن ۱۹۳۸ء تک آتے آتے عصمت چغتائی کی فکر اشتراکی سوچ کی آماجگاہ بن گئی، جس کی اولین مثال افسانہ ''نیرا'' (مطبوعہ ''ساقی'' جون ۱۹۳۹ء) ہے۔ اس تسلسل میں عصمت چغتائی نے اپنے متعدد شاہکار افسانے تخلیق کیے ہیں جن میں ''لحاف''، ''اف یہ بچے''، ''ساس''، ''چھوئی موئی''، ''پنکچر''، ''مغل بچہ''، ''چابڑے''، ''ایک بات''، ''چوتھی کا جوڑا''، ''جڑیں''، ''مٹھی مالش'' اور ''ننھی کی نانی'' ایسے لازوال افسانے ہیں جن کی گونج اُردو افسانے کے ایوان میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی جرأت فکر اور جرأت اظہار ہے، جس کے ذریعے عصمت چغتائی نے پردے کے پیچھے بسورتی ہوئی ہندوستانی عورت کو باہر کھینچ نکالا اور حجاب امتیاز علی کی رومان پسندی کے برعکس لبریٹڈ ہندوستانی عورت کی دنیا پر توجہ صرف کی۔

عصمت چغتائی نے عورت کے جہان کی معاشرتی پیچیدگیوں اور گھٹن کے احساس کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ مرد افسانہ نگار منہ تکتے رہ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ عصمت کے ہاں مرد کی جبریت کا ردعمل کسی حد تک ابھر کر شدید باغیانہ لہجے میں بھی ڈھل گیا، تاہم عصمت چغتائی کی زبان و بیان پر کامل گرفت نے انہیں وہاں بھی سہارا دیا اور یوں بقول پطرس بخاری ''انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔''

عصمت چغتائی کو ہمارے ادبی ناقدین ایک زمانے تک مان کر نہیں دیئے۔ ان کے اولین افسانے ''بچپن'' اور ''کافر'' (مطبوعہ: ''ساقی'' ۱۹۳۸ء) کی اشاعت کے بعد یکے بعد دیگرے ''خدمت گار'' اور ''ڈھیٹ'' جیسے شوخ و شنگ افسانے ۱۹۳۸ء کے ہی سال میں سامنے آئے تو ادبی دنیا میں کھلبلی بھی مچی اور کسی کو یقین بھی نہ آیا کہ یہ عصمت چغتائی کے ہی افسانے ہیں۔ یہاں تک کہ عصمت کا اولین افسانوی مجموعہ ''کلیاں'' (مطبوعہ: ۱۹۴۰ء) چھپ کر آ گیا اور ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد نے ''لحاف'' پڑھ کر کہا:

''عصمت کے فن کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی ایک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں اور اگرچہ ان کی یہ ترجمانی ان کی نگارش کی پرکاری کا نقاب اوڑھے رہتی ہے لیکن از بسکہ وہ ایک ہندوستانی عورت ہیں، اس لیے اس نیم پختہ دور میں انہیں اپنی جرأت کی وہ داد نہیں مل سکتی جو ان کا حق ہے۔ داد تو ایک طرف اگر وہ اس بیداد سے بچ جائیں، جس کی ارزانی میں معترضوں کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے تو بسا غنیمت ہے۔''

یہاں تک کہ ''چابڑے''، ''مغل بچہ'' اور ''گلدان'' تک آتے آتے عصمت چغتائی کے افسانوں کے فقروں، کنایوں، آوازوں، اشاروں، کرداروں، احساسات اور جذبات کے بلاخیز بہاؤ نے توصیف و تنقید سے بے نیاز ہو کر اپنا ایک الگ جہان خلق کیا ہے، جس کی مکین

عصمت سب سے الگ اور منفرد مقام پر دکھائی دیتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار کسی زبان میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی یہ سب سے بڑی عطا ہے کہ اُردو افسانے کو بیدی جیسا افسانہ نگار ملا۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں خارجی زندگی کی پیشکش کے دوران انسانی شخصیت کے داخلی عناصر اس قدر چپکے سے شامل ہو جاتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتا اور بیدی خارج اور داخل کا ایک ایسا مونتاج بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں میں سب سے بڑا محرک ان کی جذباتیت کی زیریں لہر ہے جو قاری پر نامحسوس طور پر اثر انداز ہوتی ہے اور زبان و بیان کی کمزوریوں کو بیدی کی سب سے بڑی طاقت بنا دیتی ہے۔ اس منفرد سحر کاری کا اعجاز ''صرف ایک سگریٹ''، ''ایک روز افیم چور ستے کے پاس کیا ہوا''، ''گرم کوٹ'' اور ''بولو'' جیسے افسانوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف بیدی کے ہاں موضوعات پر ارتکاز کے سبب تنوع کی کمی کے باوجود اہم ترین چیز ہندی اساطیر کے ساتھ گہری پیوستگی ہے جس نے اُردو ادب کو ''گرہن''، ''لاجونتی''، ''لمبی لڑکی''، ''ببل''، ''سونفیا''، ''جوگیا'' اور ''متھن'' جیسے شاہکار بخشے ہیں جو کچھ اس نوع کے رچاؤ کے حامل افسانے ہیں جس کی مثال عالمی ادب میں بھی خال خال دکھائی دیتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے فن پر بات کرتے ہوئے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ۱۹۵۶ء میں بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ اس کے افسانوں میں تعمیر اور تکمیل کا جوہر سب افسانہ نگاروں سے بڑھ کر ہے اور بیدی کی قوت تعمیر اپنی سست روی کے لحاظ سے ناول نگاری کے لیے نہایت موزوں۔

یاد رہے کہ اس وقت تک بیدی کا ناولٹ ''اک چادر میلی سی'' شائع نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد بیدی کے آخری افسانہ ''بولو'' کی تکمیل تک وہ کوئی ناول نہیں لکھ پائے۔ اے کاش! ایسا ممکن ہوتا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیہات کی چہرہ نمائی کی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں رومانی فضا بندی اور رومانی کردار نگاری کا رنگ غالب ہے، لیکن شاید اس کی ایک وجہ ان دونوں کا پنجاب سے متعلق ہونا اور پنجاب کے دیہات کا ہندوستان کے دیگر دیہی علاقوں کی نسبت زیادہ رومان پرور ہونا ہے۔

اس نظریاتی رومان نگاری میں ندیم اور بلونت سنگھ کا فرق کچھ ایسا ہی ہے جیسے ولیم ورڈز ورتھ اور کولرج کی رومانی شاعری کا فرق۔ یعنی ندیم معصوم فطرت کو چنتے ہیں اور بلونت قہار فطرت کو۔ دوسری طرف بلونت سنگھ نے پنجاب کے سکھ طبقے کی ترجمانی کی اور ندیم نے مسلم معاشرت کی۔

احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ اپنے اولین مجموعوں ''چوپال'' اور ''جگا'' کے بعد حقیقت نگاری کی طرف آئے اور جہاں جہاں حقیقت اور رومان میں توازن قائم کر پائے وہاں شاہکار افسانوں نے جنم لیا جیسے ندیم کا ''پرمیشر سنگھ''، ''کنجری''، ''گنڈاسا'' اور ''لارنس آف تھلیبیا'' یا بلونت سنگھ کا ''اُرداس'' اور ''کالی تیتری''۔

جس طرح سعادت حسن منٹو نے فکر رسا کی کمی کو زور تخیل اور جرأت اظہار سے پاٹنے کی کوشش کی بعینہٖ ندیم اور بلونت سنگھ نے اس کمی کو اپنے اپنے مخصوص لینڈ اسکیپ اور مخصوص کردار نگاری پر توجہ مرکوز کر کے اپنی انفرادیت کو منوا لیا۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ شمال مغربی پنجاب کی سطح مرتفع اور مغربی پنجاب کے تھل کا علاقہ ہے اور بلونت سنگھ کے

افسانوں کی بوباس مشرقی پنجاب خصوصاً ماجھے کے علاقے سے متعلق ہے۔

دیہات کے اولین کہانی کاروں پریم چند اور سلطان حیدر جوش نے کہانی کہنے کا فن گاؤں کے حجرے میں بیٹھ کر اور دیہات میں زندگی کر کے سیکھا تھا لیکن دیہات کی اس عنایت کا شکریہ انہوں نے معاشی سطح پر آویزش اور اخلاقیات کی تبلیغ کر کے ادا کیا۔ پھر ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ہوا تو مجبوراً احمد ندیم قاسمی نے دیہات میں غربت اور افلاس کی تلاش کی اور طبقاتی آویزش کو موضوع بنایا جس کی مثالیں ''رئیس خانہ'' اور ''لارنس آف تھلیبیا'' ہیں۔ دوسری طرف بلونت سنگھ نے مشرقی پنجاب کی مخصوص تند مزاجی اور اس کے ابنارمل جذبوں (قتل، غارت گری، اغوا اور آبرو ریزی) کی پیشکش میں اکھڑے ہوئے لہجوں کو گرفت میں لیا ہے۔ جذبوں کی شدت کے باعث جلے ادھورے اور کھردرے ہیں (نمایاں مثال ''ناگ پھنی'') اس افسانے میں بنجر، خشک زمین کے تیز نوکیلے کانٹوں والے خورر و پودے ''Cactus'' کی طرح ایک کردار کو ابھار کر اس کے کرخت لہجے سے نارمل صورت حال کو ابنارملٹی کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کی سرزمین کی مست بوکو سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔

اس کے ہٹیلے اور اناپیشہ کردار جوانی کے نشے میں دلیر زبان بولتے ہیں۔ کرداروں کا تند اظہار بیان اور اکھڑا ہوا لہجہ بلونت سنگھ کے اسلوب اظہار کو انفرادیت سے ہمکنار کر گیا ہے:

''جہاز جیسے ڈیل ڈول والے دربھ کو دور سے ہی دیکھ کر پہچان لینا اس کے لیے مشکل نہ تھا، اسے ذرا گانہ تعجب ہوا۔ اس کا تعاقب کرنے والا محض وہی ایک جوان تو نہیں تھا۔

چند قدم کے فاصلے سے دربھ سنگھ نے کھنکھیا کر ذرا زور سے پوچھا ''چک میرا جا رہی ہو کیا؟''

جواب میں بسنتی نے ریت کی موٹی تہ میں ٹھوکر لگائی تو دھول کا چھوٹا سا بادل بلبلا کر اوپر کو اٹھا اور رکی ہوئی ہوا میں معلق ہو گیا۔''

(''ارداس'' از بلونت سنگھ سے اقتباس)

احمد ندیم قاسمی کے ہاں البتہ جب موضوعات کے تنوع کی تڑپ جاگی تو انہوں نے شہری زندگی کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ اس قبیل کے افسانوں میں ''گھر سے گھر تک'' ان کا شاہکار ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ بلونت سنگھ تادیر اس طرف نہیں آئے اور ''جگا'' یا ''کالی تیتری'' ان کی پہچان بنے رہے یہاں تک کہ بلونت سنگھ نے اپنی سوانح سے متعلق افسانہ ''عہد نو میں ملازمت کے تیں مہینے'' لکھا۔ بلاشبہ شہری زندگی سے متعلق یہ اسی آن بان کا افسانہ ہے جو بلونت سنگھ سے مخصوص رہی۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں آخری بڑا نام شمشیر سنگھ نرولا کا ہے اور وہ ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز ادیبوں میں نمایاں تر ہیں۔ نرولا حقیقت پسند ہونے کے ناتے کسی بہت بڑے دعوے کے ساتھ ادب کی طرف نہیں آئے، ''ستاروں کی محفل'' (مرتبہ: بشیر ہندی) کے لیے افسانہ بھجواتے وقت انہوں نے اپنی افسانہ نگاری سے متعلق لکھا تھا:

''ترقی پسند ہوں لیکن عریاں پسند نہیں...... جنسی یا جسمانی بھوک، بیکاری یا کسی عزیز کی موت کی وجہ سے ادیب نہیں بنا۔ ادب کے ذریعے اپنے قومی و انسانی فرائض سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ہم وطنوں کو جھنجھوڑنے کا ذریعہ ہے۔ مجھے دوام کے لیے لافانی ادب لکھنے کی خواہش نہیں۔ میں اسی ایک ثانیہ کے لیے اپنے وطن عزیز کے اسی فیصلہ کن لمحہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وطن پہلی اور واحد محبت ہے اور ادب اسی کے ایفا کا ایک ذریعہ۔''

شمشیر سنگھ نرولا سے اُردو میں دو افسانوی مجموعے بعنوان ''جالے'' اور ''بے زبان'' یادگار ہیں، اس کے بعد وہ ہندی اور انگریزی کی طرف چلے گئے اور زیادہ تر ناول نگاری کی۔ نرولا کی جڑیں اساطیر سے پوری طرح جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس کے سبب افسانوی حقیقت احوال محض یک رخی حقیقت نگاری میں جلوہ گر نہیں ہوتا، اس میں علامتی ابعاد پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نرولا کی افسانوی تدبیر کاری کا جوہر ان کے مخصوص اسلوب سے وابستہ ہے۔ انسانیت سے ہمدردی اور مضبوط بیانیہ اُن کی تحریروں کی پہچان ہے۔

نرولا کے افسانوں میں موضوعی تنوع اور بھائی چارے کی فضا بندی خصوصی توجہ کی حامل ہے۔ ان کے شاہکار افسانے ''گنو بتیا'' اور ''بے زبان'' کے بیشتر افسانوں میں دان کرنے کا جذبہ قومی یک جہتی کے احساس کے تحت رنگ و نسل نیز نظریے کے تفاوت کو کم کرتا ہے۔ یوں شمشیر سنگھ نرولا کے افسانوی کردار ہندوستان کے مشترک قومی ورثے کے ہوشیار محافظ دکھائی دیتے ہیں۔



حوالہ:

۱۔ ''لیڈر'' الہ آباد مورخہ ۵ اپریل ۱۹۳۳ء

۲۔ دیباچہ: ''زندگی کا میلہ'' طبع دوم: مئی ۱۹۵۶ء

نفسیات کا ورود

(سید فیاض محمود، سعادت حسن منٹو، ابوالفضل صدیقی، ممتاز مفتی، سید رفیق حسین،
محمد حسن عسکری، آغا بابر، رحمان مذنب، خان فضل الرحمٰن)

''انگارے'' کی اشاعت سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ترویج ملی۔ احمد علی کا افسانوی مجموعہ ''شعلے'' ۱۹۳۴ء میں چھپ کر سامنے آیا، اس طرح جنس کے دائرہ کو انفرادی سطح سے اٹھا کر پورے سماج تک پھیلا دیا گیا۔ رشید جہاں کا افسانوی مجموعہ ''عورت'' اور احمد علی کا ''ہماری گلی'' سامنے آئے۔ ''انگارے'' اور ''شعلے'' کے افسانے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کے عجیب الخلقت شخصی خاکوں اور ذہنی کیفیتوں کو پیش کرتے ہیں۔

''پھر ضد یہ ہے کہ تم میرا بیاہ کرواؤ۔ شرع میں چار بیویاں جائز ہیں۔''

(''پردے کے پیچھے'' از رشید جہاں اقتباس)

''صاحب اور میم تو بوا، دلی اسٹیشن پر اتنے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ مٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں کم بختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا:

''ذرا منہ بھی دکھا دو'' میں نے فوراً......

''تو تم نے کیا نہیں دکھایا؟'' کسی نے چھیڑا۔

''اللہ اللہ کرو بوا...... میں ان موؤں کو منہ دکھانے لگی تھی۔'' دل بلیوں اچھلنے لگا (تیور بدل کر)

''سنتا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو''۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔

(''دلی کی سیر'' از رشید جہاں سے اقتباس)

''انگارے'' اور ''شعلے'' سے پہلے کا اُردو افسانہ رفتہ رفتہ فکر اور جذبے کو Elevate کرنے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں نے سنسنی خیزی کی طرح ڈال دی۔ قدیم سنسنی خیز داستانوں کا تربیت یافتہ ذہن اسے قبول کرنے کو

تیار بیٹھا تھا۔ سنسنی خیزی کو قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے نتیجے میں منٹو کے ہاں افسانے کے اختتام پر دھماکہ اور ممتاز مفتی سے واجدہ تبسم تک افسانے کا اختتام انتہائی حیران کن صورت حالات سامنے لانے لگا۔

سگمنڈ فرائیڈ کے اثرات مواد اور تکنیک دونوں میں تنوع کا باعث بنے۔ نفسیاتی الجھنوں کے ضمن میں ابتدائی نام احمد علی، محمد حسن عسکری، منٹو، شیر محمد اختر، عزیز احمد، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے ہیں۔

ہنری جیمز نے کہا تھا: ''نوجوان کنواری لڑکیوں کے لیے آدھی زندگی بند کتاب ہے۔'' جب کہ ڈی ایچ لارنس نے سگمنڈ فرائیڈ کے Spade work پر انسان کو محض جنسی محرک کا ایک کرشمہ دکھا کر عورت اور مرد کی باہمی کشمکش کو نیا میدان فراہم کر دیا اور اُردو افسانے میں پہلی بار ہم جنسی کے موضوع پر عصمت کا ''لحاف'' اور عسکری کا ''پھسلن'' سامنے آئے۔ ''لحاف'' اور ''بو'' (سعادت حسن منٹو) ''Ban'' کر دیے گئے اور ممتاز مفتی نے اس تسلسل میں کئی افسانے لکھے۔ ''ترقی پسند ادب'' میں عزیز احمد نے کڑی تنقید کی، ڈاکٹر اعجاز حسین نے منٹو کو ''لذت گیر الجھنیں'' پیدا کرنے والا کہا اور علی سردار جعفری نے افسانہ ''بُو'' کو نامناسب موضوع قرار دیا۔

۱۹۴۵ء کے حیدر آباد کنونشن میں ایسے جنسی اظہار کے خلاف قرارداد پیش کی گئی جس کی خود صاحب صدارت، حسرت موہانی، اور قاضی عبدالغفار نے شدید مخالفت کی۔ قرارداد پر خاصے بحث مباحثے کے بعد ترقی پسند مصنفین نے اپنے طور پر یہ فیصلہ دیا کہ عصمت چغتائی، منٹو، محمد حسن عسکری اور قرۃ العین حیدر رجعت پسند ہیں۔ اس لیے ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ بعد میں اس فہرست میں عزیز احمد کا نام بھی شامل ہو گیا۔ بعدازاں بقول میرزا ادیب (''خیالات'' لاہور، ممنوعہ کتب نمبر) ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے خلاف قرارداد پیش کریں اس وقت انجمن کے سیکرٹری جنرل احمد ندیم قاسمی تھے۔ میرزا ادیب نے خود اس قرارداد کی مخالفت کی، قرارداد کی حمایت کرنے والوں میں سرکردہ نام احمد ندیم قاسمی کا تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے رسالہ ''سویرا'' میں ایسے موضوعات اور طرز اظہار کو رد کیا اور ان افسانوں کے بارے میں لکھا کہ یہ فحاشی کو ترویج دیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے مجلّہ ''فنون'' میں بھی جنس سے متعلق افسانوں کو شائع کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔

ادھر لارنس اور فلابیئر پر انگلیاں اٹھی تھیں ادھر منٹو اور عصمت پر مقدمے چلے۔ منٹو کے ''لذت سنگ'' میں ایسے افسانے یکجا ہیں جن پر فحش نگاری کے الزام میں زیر دفعہ ۲۹۲ مقدمات قائم کیے گئے۔

مقولہ ہے کہ ''ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔'' محمد حسن عسکری نے بتایا کہ ابن العربی سے متعلق فرائیڈ نے نظریہ سازی کرتے وقت اسی مقولے کو بنیاد بنایا ہے۔ ابن العربی نے کہا ''ہر جز اپنی کل کی طرف لوٹتا ہے'' خدا نے آدم کو تخلیق کیا، آدم نے حوا کو اپنی پسلی سے جدا کر کے دیکھا اور اس کی طرف راغب ہو گیا۔ یہ اس کی ''کل'' کی طرف واپسی تھی واضح ہوا کہ واپسی کا راستہ جنس کے شاداب خطے سے ہو کر نکلتا ہے۔

ابن العربی نے معرفت حق کے خارزار کے حوالے سے حضرت ادریس کی مثال دی۔ کوہ لبنان پھٹا اور آتشی گھوڑا برآمد ہوا۔ حضرت ادریس اس پر سوار ہوئے، یہ ایسا عمل تھا جس سے ان کی خواہشات نفسانی اپنے اختتام کو پہنچیں۔ ابن العربی نے کہا یہ معرفت حق میں زوال کی گھڑی تھی، وجود کی خواہشات ختم ہو جانے سے معرفت حق میں کمی واقع ہو گئی۔ پتا چلا کہ ہم اپنی نفسانی خواہشات کے حوالے سے بھی اپنی ہستی کے ''جزو'' کو کل کے قابل بنا سکتے ہیں۔

اوپر کا دھڑ (عقل اور شعور...... کائنات کو سمجھنے کی صلاحیت) اور نچلا دھڑ (جنس کے متعلقات) دونوں فعال حالتوں میں باہم ایک ہو کر

''پورے آدمی'' کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ''پورا آدمی'' تخلیق کی ضرورت ہے۔ بقول سلیم احمد عورت بھی پورا آدمی مانگتی ہے اور پیش منظر کا فن پارا بھی۔ جنسی موضوعات کے افسانوں میں ''پورا آدمی'' خال خال ہی نظر آتا ہے کہیں محض اوپر کا دھڑ فعال حالت میں ہے اور کہیں محض نچلے دھڑ کی کرشمہ سازیاں۔ منٹو جیسے کامیاب جنس نگار کے ہاں اس تفرقے کے کئی روپ ہیں ایک طرف تو اس کے ہاں جنسی فرسٹریشن کا شکار فرد گندگی اور گناہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ (مثال: اس کے کرداروں میں دلال، بدکار عورتیں اور عیاش مرد) دوسری طرف ایشر سنگھ کا بانجھ پن ہے (مثالیں: ٹھنڈا گوشت۔ بانجھ) یا فطری طور پر بھی فعال نہیں اور اس کی وجہ معاشرے کی جکڑ بندیاں ہیں۔ مثال: ''ڈرپوک''۔

پورا آدمی جہاں جہاں ظاہر ہوا ہے وہاں اُردو میں بھی لازوال افسانوں نے جنم لیا ہے۔ اس ذیل میں سعادت حسن منٹو کے افسانے ''کھول دو''، ''بو''، ''دھواں'' اور ''کالی شلوار''، ممتاز مفتی کے ''جھکی جھکی آنکھیں'' اور ''ماتھے کا تل'' جان فضل الرحمان کے ''ترلبی'' اور ''دوپٹمبلی'' ''عصمت چغتائی کا ''مغل بچہ'' اور رحمان مذنب کا ''تکی جان'' شاہکار افسانے ہیں۔

''انگارے''، ''شعلے'' اور ''عورت'' سے ہوتا ہوا ہمارا افسانہ زندگی کے ہر ہر شعبے میں جنس کی کرشمہ سازیوں کا جائزہ پیش کرتا رہا ہے۔ محمد حسن عسکری، عصمت اور بیدی نے عورت کے جنسی جذبے کی اٹھان اور بالترتیب کرسچین، مسلم اور ہندو معاشرے میں جنسی گھٹن کو نمایاں کیا۔ منٹو نے ہیجانی جذبات کی تصویر کاری کی اور موپاساں کی طرح اس کا پسندیدہ موضوع ''عورت کی تضحیک'' رہا یا طوائف میں ماممتا اور نسائیت کی تلاش۔ عسکری اور مفتی نے براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع کر کے جنسی کجرویوں کے لاشعوری محرکات کا ٹھوس علمی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا اور عزیز احمد نے فلابیئر کی طرز نگارش میں جنس کے حریری پردوں کو اٹھایا (مثالیں: ''خطرناک پگڈنڈی'' اور ''ممولشکا'') اور ضمیر الدین احمد کے ہاں جنسی لذت کوشی کا متین انداز اور بیان کی ایمائیت قابل توجہ ہے۔

جس طرح عسکری، منٹو، مفتی، عصمت اور خان فضل الرحمٰن کے ہاں انسان کی جنسی جبلت بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہیں آغا بابر اور رحمان مذنب کے ہاں ابنارمل جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

محمد حسن عسکری نے فیصلہ کن بات کہہ دی تھی کہ:

''گندی سے گندی بات اچھا ادب بن سکتی ہے مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جاسکتا۔''

اُردو افسانے پر موپاساں اور چیخوف کے اثرات دو غالب رجحانات کی صورت میں ظاہر ہوئے اور افسانے کی بلوغت کے ابتدائی چند سالوں میں ہی منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کی صورت دو نمایاں رویوں میں ڈھل گئے۔ موپاساں کے کردار مروجہ بندشوں کے خلاف لڑنے والے شکست کھائے ہوئے کردار ہیں۔ یہ اندر سے مشتعل، برانگیختہ، غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے اور خوشی کے ہاتھوں بے بس ہیجانی جذبات کا اظہار ہیں۔ اس ضمن میں Irony کی خوبصورت مثال افسانہ Necklace ہے اور اس برتاؤ کی مثال منٹو کا افسانہ ''ہتک''۔

سعادت حسن منٹو اپنی ابنارمل افتادِ طبع اور کثیر الجہات تجربے کے باعث اپنے بعد آنے والوں خصوصاً بیانیہ سے متعلق افسانہ نگاروں کے لیے موضوع اور تدبیر کاری کی سطح پر امکانات ختم کر گیا۔ جہاں تک اس کا اپنا معاملہ ہے تو اس نے جنس نگاری کے حوالے سے اپنی دنیا محدود تر کر لی تھی اور اس میدان میں بھی اس کے ہاں عالمی سطح کے بڑے جنس نگاروں کی طرز کا گہرا جنسی ادارک خال خال جھلک دکھاتا ہے۔

منٹو نے اپنی اس کمی کو چرب زبانی کے چٹخارے کے ذریعے پر کرنے کی کوشش کی۔ جس سے بات گہری رمزیت کو سمیٹنے کی بجائے چٹکلوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس ضمن میں منٹو کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:

''عشق ومحبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پتھر کی ایک مورت رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں۔ میں جانتا ہوں، نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے؟ کیا ہونا چاہیے؟...... اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہوگا۔ لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ کس قدر افسوس ناک چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے ہو کر بھی ہم ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لیے روکے!''

(''منٹو کے خطوط'' بنام احمد ندیم قاسمی، مرتبہ، احمد ندیم قاسمی سے اقتباس)

منٹو کے ہاں موضوعات کے تنوع کے باوجود بمبئی کی شہری فضا سے متعلق ''موذیل'' اور ''بابو گوپی ناتھ''، چکلے سے متعلق ''کالی شلوار'' تحریک آزادی سے متعلق ''نیا قانون''، تقسیم سے متعلق ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' اور سماجیات سے متعلق ''ٹھنڈا گوشت'' کل سات شاہکار افسانے نکلتے ہیں۔ منٹو کی اس ناکامی کا باعث ہمارے سماجی اور اخلاقی عقائد سے متعلق ان کا انتہائی درجے کا چونکا دینے والا رویہ ہے۔ (مثالیں:''سرمہ'' اور ''مسواک'') جو بعض اوقات پختہ اعتقادات کے قاری کو Shock پہنچاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں قاری منٹو کی تخلیق کردہ ناقابل یقین عناصر سے پیدا کردہ فینٹسی کو رد کر دیتا ہے اور چونکہ منٹو Shock پہنچانے پر تلے رہے اس لیے تدبیر کاری اور بیان پر گرفت اتنی مضبوط نہ رہ سکی جو درجہ اول کے افسانہ نگار سے متوقع ہوتی ہے۔ یوں منٹو پستش بہ ئت پست و بلندش بہ غایت بلند کی مثال ہے۔

محمد حسن عسکری اول و آخر افسانہ نگار تھے، یہاں تک کہ ان کے تنقیدی عمل میں بھی افسانہ نگار عسکری کا چونکنے اور چونکانے والا عمل ایک زیریں لیکن طاقت ور لہر کی طرح جاری و ساری رہا۔ افسوس کہ افسانہ نگار عسکری کو ناقد عسکری نے کچل کر رکھ دیا۔ یہ اُردو دنیا کا سب سے بڑا ادبی قتل ہے۔

محمد حسن عسکری نے محض دو افسانوی مجموعے ''جزیرے'' اور ''قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے'' یادگار چھوڑے ہیں اور ان کے تقریباً تمام افسانوی کردار اپنے گرد و پیش سے خاص طرح کی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بے زاری عمر کے تقاضوں، جذباتی یا فکری اختلافات سے کہیں بڑھ کر نفسیاتی الجھنوں کے باعث ہے اور اس نوع میں خاص طرح کی نفسی کیفیت محمد حسن عسکری کے افسانوں کا موضوع بنی اور یوں افسانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے محمد حسن عسکری شعور کی رو کو ایک نئی کروٹ سے آشنا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس نوع میں وہ جوائس کی طرح نمایاں ہیں جبکہ جوائس کی نسبت عسکری کی تدبیر کاری مختلف ہے۔ محمد حسن عسکری نے عقلیت اور منطقیت کی مطیع شعور کی رو برتی ہے۔ (مثالیں:''حرام جادی'' مطبوعہ 1941ء اور ''چائے کی پیالی'' مطبوعہ اپریل 1942ء۔''ادبی دنیا'')۔

شعور کی رو اور نفسیاتی تجزیہ نگاری کے طفیل عسکری کے ہاں نئی وضع کی کردار نگاری نے جنم لیا، جس کی مثالیں ''کالج سے گھر تک''، ''پھسلن''، ''چائے کی پیالی'' اور ''قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے'' کے کردار ہیں۔

بلند شہر کا لینڈ اسکیپ عسکری کے ہاں بالکل انہیں حوالوں سے آیا ہے جیسے عصمت چغتائی کے ہاں لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ کا گھر آنگن۔ مجمل طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محمد حسن عسکری کی تکنیک اور لینڈ اسکیپنگ ان کے طویل مختصر افسانوں کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوئے جبکہ سماجی شعور کے حوالے سے ان کے مختصر افسانے بھی خاصے کی چیز ہیں۔

محمد حسن عسکری کے افسانوی مجموعوں ''جزیرے'' اور ''قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے'' کے افسانوں کو ترقی پسند ناقدین فن نے شکست خوردہ ذہنیت کا اظہار کہا۔ خوف اور فنا کے احساس کو افسانوں کی بنیادی روح کہا اور یاسیت کو قدامت پسندی۔ لیکن یہی کچھ احمد علی کے موضوعات اور تدبیر کاری بھی ہے۔ کیا یہی محاکمہ احمد علی کے بارے میں دیا جا سکتا ہے؟

ممتاز مفتی نے سگمنڈ فرائڈ ڈاکٹر سٹیکل کو نجی نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ملا کر قبول کیا اور اپنے افسانوں کو لاشعوری رجحانات اور دبی ہوئی خواہشات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں بعض اوقات ممتاز مفتی کا افسانہ احمد علی، محمد حسن عسکری، منٹو اور شیر محمد اختر کے کمزور افسانوں کی طرح تحلیل نفسی کا تجربہ بن گیا، لیکن ایسا تو عالمی سطح پر تسلیم شدہ فکشن رائٹرز کے ہاں بھی ہوا مثلاً ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور گستاؤ فلابیر کے ہاں فرائیڈ کے Spade Work پر انسان کو اکثر مقامات پر محض جنسی محرک کا ایک کرشمہ ثابت کیا گیا۔ زولا کی ''تھریسا'' اور ''ناناں'' میں اس نوع کی مثالیں آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں اور ممتاز مفتی کے اس نوع کے افسانے بلاشبہ 'لذت گیر الجھاوے' پیدا کرنے والی تحریریں ہیں۔

ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور منٹو یا عصمت چغتائی کے مشہور افسانوں کی طرح ان کے افسانوں کی بنیاد کوئی نہ کوئی نفسیاتی الجھاوا ہے جبکہ اس خصوص میں ممتاز مفتی کی الگ پہچان، نوجوان جذبوں کی پیشکش ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں دو طرح کے کردار ہیں، ایک تو وہ، جو مفتی کے ایام جوانی کی یاد تازہ کرتے ہیں جیسے ''آپا'' اور ''اسمارائیں'' کے کردار، اور دوسرے وہ جو آج کے عہد سے متعلق ہیں جیسے ''روغنی پتلے'' اور ''آدھے چہرے'' کے کردار۔ جبکہ آخری دور کے افسانوں میں مفتی نے اُردو میں ہندی کی آمیزش والے درجن بھر افسانوں میں موضوع کی مناسبت سے بیتے زمانوں کے ٹائپ کرداروں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے ابتدائی افسانوں میں سماجی تجزیہ نگاری کی خاطر کرداری سطح پر لاشعور اور تحلیل نفسی کا طریقہ کار برتا تھا اور یہی سبب ہے کہ ہمارے مجہول ناقدین کو مفتی کے کردار سگمنڈ فرائیڈ کی کیس ہسٹریز کی طرح لاشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکے ہوئے مریض دکھائی دیئے۔ جبکہ یکسر ایسا نہیں ہوا۔ ممتاز مفتی نے زیادہ اثر ڈاکٹر سٹیکل سے لیا، نیز ممتاز مفتی نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا بھرپور جائزہ لیا اور سماجی محرکات کے شعور کا ثبوت فراہم کیا۔ افسوس کہ ہمارے ناقدین نے مفتی سے متعلق رائے قائم کرنے میں صرف ''جھکی جھکی آنکھیں'' سے ''آپا'' تک کے مطالعہ کو بنیاد بنایا۔

ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور ''روغنی پتلے'' سے ''آدھے چہرے'' تک کا دور ہے، جس میں اس نوع کی سماجی حقیقت نگاری ملتی ہے جو لکیر کے فقیر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا مقدر کبھی نہیں رہی۔ جبکہ ممتاز مفتی کے تیسرے دور کے افسانے خصوصاً ''اپرا حویلی''، ''چکٹ گاڑی، ہُونکتا ہوٹر اور موم بتی''، ''کنڈی ہلتی رہی''، ''ان پورنی'' اور ''ایمان آپ میں آپ'' یکسر نئے لحن کے حامل افسانے ہیں۔

ممتاز مفتی بنیادی طور پر بیانیہ کے آدمی ہیں اور زبان کے بناؤ سنگھار کا اہتمام مفتی کے ہاں شروع سے ہی دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ راجندر سنگھ بیدی کی طرح ممتاز مفتی کو بھی اُردو زبان لکھنے کا محاورہ نہیں تھا، سو شعوری کوشش کرنا پڑی۔ کاش مفتی اس شعوری کوشش میں بیانیہ کے جھول پر نظر رکھتے اور ایک جملے کی جگہ دس جملے نہ لکھتے۔

ممتاز مفتی کے آخری دور کے افسانوں کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے پریم چند کا ہندی کی جانب سفر اور اپنے بھرپور اظہار اور کہانی کہنے کے لیے کینوس کو پھیلانے کا جتن (ناول کی طرف) پھر راجندر سنگھ بیدی کا مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' اور کرشن چندر کا ''مینا بازار''

قرۃ العین حیدر کے ہاں ترکی ادب کے عمیق مطالعے کے ساتھ اپنی جڑوں کی تلاش اور محمد حسن عسکری کی 35 سالہ ادبی زندگی کا وحدت الوجودی تشریح اور تفہیم پر اختتام جو زندگی کی فلسفیانہ آبسٹریکشن کی کامیاب مثالیں ہیں۔

سید فیاض محمود نے چیخوف اور مارس میٹر لنک کے طریقہ کار کو ایک نئی تدبیر کاری میں ڈھالا اور یوں مجبور و مقہور انسان کی نفسی کیفیات کو ایک انوکھا لحن بخشا۔ ان کی کہانیاں کہرے کی مانند ہیں جو روح کے اندر ہی اندر پلتی ہیں اور دائمی غم میں ڈھل جاتی ہیں۔ اس کی نمائندہ مثالوں میں فیاض محمود کے دو افسانے ''کام چور'' اور ''اللہ کے نیک بندے'' نمایاں ہیں، جبکہ اس تدبیر کاری کا نقش اول سید فیاض محمود کا اولین افسانہ ''زبیدہ'' (مطبوعہ: ''ہمایوں'' جولائی 1932ء) ہے۔

سید فیاض محمود کا یہ دھیما، نرم ولطیف پیچ وخم کا رفتہ رفتہ گرفت میں لینے والا منفرد اسلوب اپنی جزئیات نگاری اور روزمرہ زندگی کے بکھرے ہوئے موضوعات سے مطابقت رکھنے کے باعث موپاساں (یا منٹو) اور چیخوف (یا راجندر سنگھ بیدی) کے نمایاں اثرات کی طرح ایک تیسرے غالب رجحان کی صورت اختیار کر گیا۔

آغا بابر کے افسانوں میں انسانی نفسیات اور خصوصی طور پر جنسی رمزیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور اس خصوص میں بھی ابنارمل جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ آغا بابر کی پہچان بنا۔

1947ء کے فسادات سے متعلق اپنا مشہور افسانہ ''کبو'' لکھنے کے بعد آغا بابر کی معتبر پہچان ادھیڑ عمر عورتوں کی نفسی کیفیات کا بیان ہے۔ جس کی مشہور مثالیں ''باجی ولایت'' اور ''خالہ تاج'' جیسے افسانے ہیں۔ چکلے کی زندگی اور تیسری جنس کے حوالے سے انہوں نے زندگی کے کچھ ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو پچانوے فیصد لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں اور اس حوالے سے ''گلاب دین چھٹی رساں'' اور ''چارلس ہیجڑا'' ہمیشہ زندہ رہنے والے افسانے ہیں۔ آغا بابر سے متعلق یہ بات یقیناً حیران کن ہی رہتی ہے کہ اتنے وسیع تجربات رکھنے اور بھرپور زندگی گزارنے کے باوجود آغا بابر کی افسانہ نگاری کا مرکز ومحور ہمیشہ محدود تر مشغلہ اور سماج کا محدود ترین طبقہ رہا لیکن اس میں شک نہیں کہ آغا بابر نے اس قدر Selective ہونے کا حق بھی ادا کیا۔

نفسیات سے متعلق افسانہ نگاروں میں رحمان مذنب کی نمایاں پہچان تیسری جنس اور جنسی بے راہروی سے متعلق افسانہ طرازی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کا بیشتر خام مال لاہور کے شاہی قلعہ سے متصل آبادیوں، خصوصاً عزیز تھیٹر سے متصل ہجڑوں کی بیٹھکوں، نکیائیوں کی گلی (ٹبی)، ڈیرہ دارنیوں کے بازار اور مدرسہ نعمانیہ کے متبرک ماحول سے چنا ہے۔

رحمان مذنب کے افسانوں میں جتنے تکیے، جوا خانے اور چنڈو خانے ہیں وہ سب کے سب ان کے روزمرہ مشاہدے میں رہے ہیں اور لاہور کا شاہی محلہ ان کی دن رات کی گزرگاہ۔ کچھ یہی سبب ہے کہ گھناؤنی زندگی نیز عورت ہی نہیں طوائف کی پیشکش میں بھی رحمان مذنب سے بڑا افسانہ نگار کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔

رحمان مذنب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تیسری جنس، پیشہ کرانے والی عورت اور شہوت میں پھنستے ہوئے افراد کی نفسی کیفیات کو تمام تر جزئیات اور تاریخی پس منظر کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔ بطور افسانہ طراز، رحمان مذنب اپنے پسندیدہ لینڈ اسکیپ (خصوصاً ہجڑوں کی بیٹھک یا چکلے) پر چھوٹا کھیل نہیں کھیلتے، بڑی بازی لگاتے ہیں جس کے طفیل ان کا قاری ہجڑے، طوائف اور تماش بین کے علاوہ نوسرباز، کبابیے، جیب تراش، دتے اور سفید کپڑوں میں پولیس کے کارندوں کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ اس خصوص میں رحمان مذنب کے

''گوری گلاباں''، ''پٹھی جان''، ''گشتی''، ''لال چوبارہ''، ''چڑھتا سورج'' اور ''باسی کلی'' لازوال افسانے ہیں۔



افسانہ طراز کا مشاہدہ اور تجربہ شہر سے بڑھ کر مضافات تک گیا اور وہیں محدود ہو گیا، اس سے آگے دشت پڑتا تھا۔ بیاباں کی دنیا دیکھی بھالی دنیا کی نسبت اجنبی تھی۔ ایسی دنیا جہاں پھول کھلتے ہیں اور داد کی خواہش میں مرجھاتے ہیں۔ جہاں گم متحان پیڑ اور بوٹے چپکے چپکے زندگی کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور چرند پرند کا اپنا نظام زیست ہے۔ ایسی انجان زندگی کے اطوار فکشن میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تخلیقی سطح پر صرف نقاشی کی دنیا ہی ایسی ہے جو اس معاملے میں امیر کہلا سکتی ہے۔ ادب میں لے دے کے چند نام ہیں۔ بلجیم کا مارس مترلنک اور کیوبا کی ڈورا الونسو، دونوں نے دنیا کی حقیر مخلوقات کو اپنا موضوع بنایا۔ مترلنک نے چیونٹی، مکھی اور کتے کی زندگی کا رزمیہ لکھتے ہوئے ویرانے کے برگ و بار کو اہمیت دی۔ ڈورا نے چیونٹی، چوہیا اور دیگر ارضی کیڑے مکوڑوں کی سرگذشت قلم بند کی۔ جنگل کے تخلیقی اظہار کی صورتیں برطانیہ کے رڈیارڈ کپلنگ (جنگل بک) اور جوزف کونرڈ (''Lord Jim'') اور (''Heart of Darkness'') افریقی رہمن گیری (''Roots of Heaven'') اور نائجیریا کے اموس توتولا (نمائندہ افسانہ۔ ''شریف زادہ'') کے ہاں ملتی ہیں جنہوں نے بھارت اور افریقہ کے جنگلوں اور ان کی حیوانی زندگی کو پیش کیا ہے۔

اُردو افسانے میں اس پیشکش کے حوالے سے ''چڑیا چڑے کی کہانی'' (سجاد حیدر یلدرم: ۱۹۰۷ء)، ''سارس کی تارک الوطنی'' (۱۹۰۹ء)، ''بے زبانوں کا صبر''، ''حیات انسانی پر دو پرندوں کی بحث''، ''داستان بلبل اسیر'' اور ''جانور کون ہے'' از راشد الخیری کے بعد صرف تین نام نمایاں ہیں۔ سید رفیق حسین، ابوالفضل صدیقی اور خان فضل الرحمٰن۔ ان تینوں کے ہاں دیہات سے جنگل کی طرف میلان بطور خاص قابل توجہ ہے۔ ضلع سہارن پور میں شوالک کی پہاڑیوں اور گرداگرد پھیلے ہوئے جنگل کے پرندے فضل الرحمٰن کو بہت مرغوب ہیں۔ خان فضل الرحمٰن نے اپنے رومانی افسانوں میں ہجر کی کیفیات کی عکاسی کے لیے پربت پپیہا اور کوکتی کوئل کو اس کی عادات اور خصائل سمیت چنا ہے، نمائندہ مثال افسانہ: ''پربت پپیہا۔''

ابوالفضل صدیقی کے شکاریات اور جنس کے موضوع پر افسانوں میں تلنگانہ کی پتھریلی وادیوں کو ان کے چرند پرند سمیت موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نوع کی اکا دکا دیگر مثالوں میں بانو قدسیہ کا ''کال کلیچی'' (چڑیا گھر کے پرندوں اور جانوروں کی زیست کا مطالعہ) اشفاق احمد کا ''بندر لوگ'' (کشمیری بندروں کی عادات کے حوالے سے ہماری منافقانہ معاشرتی زندگی پر طنز) اوپندر ناتھ اشک کا ''کالو'' (کتے کے شب و روز) اور سید محمد اشرف کے افسانوی مجموعہ ''ڈار سے بچھڑے'' (۱۹۹۴ء) میں شامل افسانے، بالخصوص لکڑ بگھا سیریز کے افسانے اس روایت کی توسیع ہیں۔ سید محمد اشرف کے ہاں علامت اور تمثیل کے ذریعے غیر مرئی حقائق کو جانوروں کا تمثیلی روپ ملا ہے۔

سید رفیق حسین نے بطور خاص جنگل کے لینڈ اسکیپ کو اس کی مخلوقات سمیت موضوع بنایا ہے۔ رفیق حسین کے ''آئینہ حیرت'' کے افسانوں میں دونوں طرح کے چوپائے (وحشی اور پالتو) بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ پالتو چوپائیوں میں افسانہ ''ہیرو'' کا سانڈ، ''گوری ہو گوری'' کی گائے، ''بے زبان'' کی گھوڑی اور ''کلوا'' کا کتا...... وفاداری اور قربانی کی جبلتوں کے مختلف رنگ ہیں۔ رفیق حسین کے اس

سانس لیتے ہوئے جنگل کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے:

''تو کاں آں ھ'' آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے ''ہرے رام گوری بولے۔'' کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رم کلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا: ''گوری ہو گوری۔''

جواب آیا: ''تو کاں آں ھ''

اور پھر باغ سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رم کلیا نے پھر پکارا، وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی لیکن دور سے ایک اور آواز آئی۔

''اوماں آں ھ''

باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس کی آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی۔

''گوری ہو گوری۔''

''ارے گوری، اے آئے جا۔''

''ہائے رے میا نا ہیں آوت۔''

''گوری ہو گوری''

''گوری میا آئے جاری......''

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رم کلیا کی طرف دیکھا۔ ارا کر بولی اور ادھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آرہی تھی۔''

(''گوری ہو گوری'' سے اقتباس)

سید رفیق حسین کے ان راجپوتانہ کے ریگزار سے متعلق افسانوں میں جنگل سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جانوروں کی نفسیات سے متعلق یہ افسانے اُردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ شمار ہوئے ہیں۔

سید رفیق حسین نے جنگل کے قانون کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور خود جنگل کی زندگی کو سہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جنگلی جانوروں (شیرنی، کتے، نیل بیل، بلی، بندر، گھوڑی اور ہاتھی) کی سیرت کو اس حسن اور خوبی کے ساتھ رقم کر پائے ہیں جو محض شکاریات پر لکھنے والوں کے نصیب میں نہیں۔

منفرد لینڈ اسکیپ کے افسانوں میں ابوالفضل صدیقی اور خان فضل الرحمٰن نے بالخصوص جاگیردارانہ نفسیات اور تمدن کی عکاسی کی ہے اور یوں ان دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں میں قرن ہا قرن کی سماجی عوامل سے مرتب شدہ تہذیبی اقدار کی بازیافت اردو افسانے میں ایک Unique Approch ہے۔

خان فضل الرحمٰن اور ابوالفضل صدیقی کے ہاں بے اختیار جذبوں (شدید محبتیں اور شدید نفرتیں) کی عکاسی کے باوجود رنگین، بیانیہ

اسلوب کی گرفت کہیں بھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں دیہات نے بچے سانس لیے ہیں مثالیں ''پربت پپیہا'' از خان فضل الرحمٰن ''دن ڈھلے'' اور ''جوالامکھ'' از ابوالفضل صدیقی۔

خان فضل الرحمٰن کے ہاں ہندو، مسلم، سکھ آبادی میں انگریزوں اور اینگلو انڈین کردار نگاری کا تنوع ہے جبکہ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کی انفرادیت افسانوں میں رواں کڑوے اور میٹھے خواب ہیں۔ ہر دو قسم کے خوابوں میں اجارہ داروں، حکومت کے پروردہ جاگیرداروں، مزدوروں اور کسانوں کی چہرہ نمائی ہوتی ہے۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کا منفرد لینڈ اسکیپ ''تلنگانہ'' کی پتھریلی وادیوں اور ''اراکان'' کی سنگلاخ چوٹیوں نے ترتیب دیا ہے:

''سر پہ بڑھیا قراقلی لگائے، علی گڑھ یونیفارم کی یادگار شیروانی زیب تن کیے۔ بائیں آستین میں سفید رومال اڑسے، ٹانگوں میں مخصوص علی گڑھ کا پائجامہ اور پاؤں میں سیاہ جوتا، موزوں قد اور گداز جسم میں بڑھاپے کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے بھی جوانی کے دم خم مچلتے تھے۔ حنا اور شمامہ میں بسے مخصوص لکھنوی انداز میں پان چباتے داخل ہوئے تو پرسنٹی کے ساتھ ساتھ عطر اور پان کی ملی جلی بکھری ہوئی خوشبوؤں نے ہم سب کو چونکا دیا۔''

(''دوعیدیں'' از ابوالفضل صدیقی)

یہ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کے منفرد مرکزی کردار کی ایک جھلک ہے۔ یہ داخلی طور پر خوش باش جاگیردار طبقے کے افراد ٹھیٹھ دہلوی اور لکھنوی انداز لیے فکری طور پر برٹش گورنمنٹ کے زمانے کی یادگاریں ہیں اور ان کے ساتھ ان کی ریاست اور قدموں میں افسانہ ''جوالامکھ'' کا کچلا ہوا، اخلاق باختہ طبقہ کلبلا رہا ہے۔

حوالہ:

ا۔ ''آئینہ حیرت'' پہلی بار دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد یہی افسانے ''گوری ہو گوری'' کے نام سے کراچی سے طبع ہوئے۔ تیسری بار یہ مجموعہ ''بے زبان'' کے عنوان سے میجر جنرل شاہد حامد نے راولپنڈی سے شائع کیا، چوتھی بار یہی مجموعہ ''شیر کیا سوچتا ہوگا'' کے عنوان سے کتاب کار پبلی کیشنز رام پور یو۔ پی بھارت سے شائع ہوا ہے۔

لخت لخت آوازیں

(غلام عباس، کوثر چاند پوری، قدرت اللہ شہاب، شفیق الرحمٰن)

اُردو افسانے میں شگفتگی بیان کی اولین مثالیں سلطان حیدر جوش کے تین افسانے ''خواب وخیال''، ''ہاں نہیں'' اور ''طوق آدم'' ہیں۔ اس کے بعد راشد الخیری کا کردار ''نانی عشو'' سامنے آیا اور فضل حق قریشی کے بیشتر افسانوں میں شگفتگی کی لہر رواں دکھائی دی۔ لیکن یہاں تک کے افسانوں میں مزاح سے زیادہ طنز نمایاں ہے۔

اُردو ادب میں پہلی بار ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے بودلیئر کی طرح اپنے آپ پر قہقہہ لگانے کا حوصلہ پیدا کیا اور یہاں سے خالص مزاح نے جنم لیا۔

یہ قہقہہ وسیع کائنات میں انسان کی ہستی کا تعین کرتا ہے۔ عظیم بیگ، ملا رموزی اور شوکت تھانوی کے ہاں یہ قہقہہ اس وقت ہمہ گیر نوعیت اختیار کرتا ہے جب وہ اس کی بنیادیں خانگی زندگی سے اٹھاتے ہیں۔ ان تینوں افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں بیوی بچے، بھائی بھاوج اور یار آشنا طنز کی تلوار کی دھار پر ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی نے زندگی کی ناہمواریوں سے خط اٹھانے کی طرح ڈالی تھی۔ اس کی ظرافت مخصوص طرح کی فضابندی نیز واقعاتی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ شاید افسانہ ''انگوٹھی کی مصیبت'' کی مقبولیت نے عظیم بیگ کو یہ راہ سجھائی اور یوں افسانوں کے پانچ مجموعے اس تسلسل میں سامنے آئے، نام ہیں ''خانم، کولتار، روح ظرافت، روح لطافت اور مضامین چغتائی (جس میں 32 مضامین کے علاوہ افسانے بھی شامل تھے) عظیم بیگ کا نمائندہ افسانہ ''مہارانی کا خواب'' ہے۔ گھر کی بے تکلف فضا کی پیشکش میں توازن کھو بیٹھنے کی مثال ملا رموزی کی تحریروں میں ظاہر ہوئی اور رفتہ رفتہ ظرافت پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اہمیت کھو بیٹھی۔ زبان کے ورتارے کے سلسلے میں شوکت تھانوی نے ملا رموزی اور عظیم بیگ چغتائی کی لکھنویت کو نئی ترکیبی ہیئت دے کر پوربی کے مخصوص لہجوں سے آشنا کر دیا۔ شوکت تھانوی کا اولین افسانہ ''میٹھے چاول'' تھا اور نمائندہ افسانے ''افسانہ ما''، ''دو دیوانے'' اور ''سودیشی ریل۔'' شفیق الرحمٰن کے افسانوں کی شگفتگی چلبلاہٹ اور لاابالی پن شگفتہ افسانوں کی روایت میں ایک مثال ہے:

''بڑی مشکلوں سے ہم نے وہ میچ جیتا یا یوں کہیے کہ ہارتے ہارتے بچے۔ سب سے زیادہ اسکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی سٹروک ایسا نہ تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے بعد تین رنز بنائیں۔ اس کے بعد جو اچھل اچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک سکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بے حد تیز کھیلا۔ آگے بڑھ بڑھ کر وہ ہٹیں لگائیں کہ پانچ رنز کا اضافہ اور کر دیا۔ جب ہم شام کو رو پیٹ کر جیتے اور آخری کھلاڑی نے آخری ہٹ لگائی تو مقصود گھوڑا بیس رنز بنا چکا تھا۔''

(ننانوے ناٹ آؤٹ)

شفیق الرحمٰن نے اپنے افسانوں میں رومانی سرشاری اور لطائف کو کامیابی سے سمیٹا اور ہر دلعزیز ہونے میں سب سے بازی لے گئے ان کا اولین افسانوی مجموعہ ''کرنیں'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا اور تب سے اب تک ان کے مزاحیہ افسانوں میں جیسے زندگی کا سارے مسائل سمٹ آئے ہیں۔

مزاح پیدا کرنے کے لیے شفیق الرحمٰن نے پلاٹ، واقعات، الفاظ اور جملے بازی سے ایک قدم آگے بڑھ کر خیال کی ندرت اور کنایہ کی دوہری معنویت سے اپنے افسانوں کو سنوارا ہے:

''تمنا وہ لڑکی تھی جسے جنوبی ایران میں پہلے میں نے دیکھا اور جب شیطان نے اسے شمالی ہندوستان میں دیکھا تو فوراً عاشق ہو گیا۔''

(''تمنا'' از شفیق الرحمٰن سے اقتباس)

شفیق الرحمٰن کا یہ عجیب و غریب کردار ''شیطان'' اس کے متعدد افسانوں میں بہت نمایاں ہے۔ اس کردار کی پیشکش کے ساتھ شفیق الرحمٰن نے سفید پوش طبقے میں چھپے بیٹھے دل کے چور کو پکڑا ہے۔ شفیق الرحمٰن کے افسانوں میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کے سفر کا بولتا ہوا تجربہ قابل رشک ہے۔

کوثر چاندپوری کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ ''گداز محبت'' کی اشاعت کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ وہ اپنے افسانوں میں موضوعات کے تنوع اور ہندوستانی معاشرے میں بھائی چارے کی فضابندی کی پیشکش کے سبب اُردو افسانے کی ایک نمایاں آواز ہیں۔

افسانوی تدبیر کاری میں کوثر چاندپوری نے موپاساں سے اثر قبول کیا۔ ابتداء میں رومان پسند تھے۔ آگے چل کر ہندوستانی سماج اور اخلاقیات کو موضوع خاص بنایا۔ ہندو مسلم اتحاد، بھائی چارے اور قومی یکجہتی سے متعلق ان کے افسانے خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں۔ اس خصوص میں ان کا افسانہ ''میرا پیشہ'' ہندوستان کے مصروف ترین شہروں کی ملی جلی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی معاشرت کا خوبصورت ترین عکاس ہے۔

غلام عباس نے جاپانی افسانوں کے تراجم (مجموعہ: ''چاند کی بیٹی'') اور بچوں کے لیے کہانیاں (مجموعے: ''جادو کا لفظ'' اور ''ثریا کی گڑیا'') لکھتے لکھتے ۱۹۴۱ء میں افسانہ نگاری شروع کی اور ۱۹۴۲ء میں اچانک ''آنندی'' لکھ کر اُردو کے افسانوی ادب میں ایک دھماکہ ثابت ہوئے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ''آنندی'' کے بعد ان کے دیگر ابتدائی افسانوں میں بھی رومان پسندی اور جوان جذبوں کا تحس نحس کر دینے والا رویہ دکھائی نہیں دیتا۔ یوں بھی غلام عباس دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ موضوعات کے تنوع کے باوجود ان کے افسانوں کا وصف خاص ماحول سے متعلق کامیاب جزئیات نگاری، زندگی کا گہرا ادراک اور منفرد رمزیہ اسلوب نگارش ہے۔

غلام عباس نے اپنے بیشتر افسانوں کا تانا بانا ایسے کرداری مطالعوں سے بنا ہے، جن کے پیچھے نفسیات کا گہرا شعور اپنا پتا دیتا ہے۔ انہی

اوصاف کا خوبصورت ادغام ان کے شاہکار افسانوں ''آنندی[1]''، ''اوورکوٹ''، ''کن رس'' اور ''سایہ'' میں دکھائی دیتا ہے۔

اس دور کی لخت لخت آوازوں میں قدرت اللہ شہاب آخری نمایاں نام ہے اور ان کا خصوصی موضوع سیاسی اور سماجی ناانصافیاں رہا ہے اور تدبیر کاری میں امتیازی خصوصیت تحلیل نفسی سے الگ رہ کر نفسیات نگاری ہے۔ ''غریب خانہ''، ''سب کا مالک''، ''تلاش''، ''دورنگا''، ''پھوڑے والی ٹانگ'' اور ''ریلوے جنکشن'' اس ذیل میں بہت نمایاں افسانے ہیں، جبکہ ''ماں جی'' جوان کا شاہکار شمار ہوتا ہے، سماجیات اور اخلاقیات کا ایسا گہرا مطالعہ سامنے لاتا ہے جسے نادر و نایاب کہنا چاہیے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق جہاں ان کا طویل مختصر افسانہ ''یا خدا'' ایک عظیم شاہکار ہے، وہیں مختصر افسانہ ''اور عائشہ آ گئی'' بازیافتہ خواتین کی حالت زار پرخون کے آنسو رلاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانوں میں تیسری نمایاں لہر جنسی اور نفسیاتی اُلجھاووں سے متعلق ہے اور اس کی خوبصورت مثالوں میں ''نفسانے'' کے بیشتر افسانے نیز ''شلوار''، ''سردار جسونت سنگھ''، ''جگ جگ'' اور ''جلترنگ'' بہت نمایاں ہیں۔



حوالہ:

۱۔ ''آنندی'' مطبوعہ: ''ادب لطیف'' لاہور (مدیر فیض احمد فیض) سالنامہ ۱۹۴۲ء کے صفحہ ۶۹ پر پہلی بار سامنے آیا۔ یہ غلام عباس کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے عالمی سطح پر اُردو افسانے کی پہچان ممکن بنائی ہے۔ لیکن یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ''الفاظ'' کراچی میں شائع شدہ اپنے آخری انٹرویو میں کسی شدید غلط فہمی یا غلام عباس کی کردارکشی کی خاطر اس افسانے کو الگزینڈر پشکن سے ماخوذ بتایا تھا اور ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔

۱۹۶۴ء میں چیکوسلواکیہ کے افسانوں سے متعلق بین الاقوامی مقابلے میں ''آنندی'' کو اول انعام کا حق دار قرار دیا گیا اور ۱۹۸۳ء میں بھارت کے نامور ہدایت کار شیام بینیگل نے اس افسانے پر مبنی مشہور تجرباتی فلم ''منڈی'' (مرکزی کردار۔ سمیتا پاٹل، شبانہ اعظمی اور نصیرالدین شاہ) مکمل کی۔ غلام عباس نے بتایا (The Herald کراچی فروری ۱۹۸۲ء) کہ ۱۹۴۲ء میں دہلی کی میونسپل کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کر کے طوائفوں کو شہر بدر کر دیا اور شہر سے باہر اجمیری گیٹ، نزد ریلوے لائن انہیں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ بقول غلام عباس 'آل انڈیا ریڈیو علی پور میں قائم تھا اور دہلی سے ریلوے اسٹیشن تک آتے جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے طوائفوں کی یہ بستی ایک گنجان آباد علاقے میں بدل گئی۔ وہیں سے اس افسانے کا بنیادی خیال اٹھا اور ''آنندی'' ایک ہی رات میں تکمیل پا گیا۔

یاد رہے کہ انجمن اصلاح بدکاراں، لاہور کی تحریک پر ۱۹۲۱ء میں بھی میونسپل کمیٹی لاہور نے ۱۹۱۱ء کے ایک ایکٹ کے تحت انارکلی، دھوبی منڈی، لوہاری گیٹ، لنڈا بازار، دہلی دروازہ، شالامار روڈ، موتی بازار اور قلعہ روڈ پر برسوں کی آباد طوائفوں کو مکان خالی کرنے کے نوٹس جاری کیے تھے اور بالآخر عدالتی جھگڑوں کے بعد طوائفوں کو مذکورہ علاقہ جات سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ میونسپل کمیٹی نے ان علاقہ جات سے بے دخلی کا جو اشتہار شائع کیا تھا اس پر کے ایل رلیارام ایم ایل سی سیکرٹری میونسپل کمیٹی کے دستخط تھے اور تاریخ اجرا، ۲۵ اگست ۱۹۲۲ء درج تھی۔

واضح رہے کہ میونسپل کمیٹی لاہور نے ۱۹۱۳ء میں بھی ایک قرارداد نمبر ۲۷۴ کے تحت ہیرا منڈی کو ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا تھا لیکن کوچہ یا گزر شہباز خان کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور یہی سبب ہے کہ ہیرا منڈی کی جملہ طوائفیں کوچہ شہباز خان اور اس کے گرد و نواح میں اقامت پذیر ہو گئی تھیں۔

اُردو افسانہ آزادی کے بعد

(کرتار سنگھ دُگل، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، محمد خالد اختر، دیوندر اسّر، انتظار حسین اور بانو قدسیہ)

انسانی جدل کی تصویر کاری نے عالمی ادب کو بڑے بڑے شاہ کار دیئے ہیں۔ اُردو افسانے کا ایک اہم موڑ ۱۹۴۷ء کے فسادات ہیں لیکن اس تہ و بالا زندگی کی خونریزی، درندگی اور گھناؤنی بربریت کی محض تفاصیل اخباری رپورٹنگ سے زیادہ کچھ نہیں۔ صحیح فوکس میں لی گئی تصویر کا نام افسانہ نہیں، سارا کھیل تخلیقی عمل کی تکمیل کا ہے۔ پھر فسادات کے بارے ''ترقی پسند فارمولا'' بناوٹی اور سطحی افسانوں میں اضافے کا باعث بنا۔ اس مصلحت کوشی کی مثالیں:

کرشن چندر (پشاور ایکسپریس)، احمد ندیم قاسمی (چڑیل)، خواجہ احمد عباس (انتقام) اور ممتاز مفتی (گھور اندھیرا) جیسے نمایاں ناموں کے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات اور زوال ڈھاکہ (۱۹۷۱ء) سے متعلق دو طرح کے افسانے ملتے ہیں۔ پہلی قسم وہ جہاں ''ڈاکٹر ژواگو'' کی طرح فرد بھیانک جدل میں گھرا ہوا ہے، اس کا کوئی عمل اپنا نہیں۔ حالات کا ریلا اسے جہاں چاہے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ بہالے جائے۔ وسیع تر انسانی جدل کی شدت خود مختار ہے۔ منٹو کے دو افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''شریفن'' احمد ندیم قاسمی (پرمیشر سنگھ) اشفاق احمد (گڈریا) حیات اللہ انصاری (شکر گزار آنکھیں) خدیجہ مستور (مینو لے چلے بابلا) کے افسانے اس ذیل میں نمایاں ہیں۔

بربریت کے خاتمے پر متاثرہ افراد کی کہانیاں سامنے آئیں۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے طور پر سچے ہیں لیکن حالات اور وقت نے انہیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ منٹو کا ''کھول دو'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' راجندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی'' اور قدرت اللہ شہاب کا ''اور عائشہ آ گئی'' اس ذیل میں عمدہ مثالیں ہیں۔ بازیافتہ نسوانی کرداروں کی پیشکش میں اکثر افسانہ نگار جذباتیت کا شکار ہوئے اور آخر میں آتے آتے افسانے کے المیہ انجام کی نسبت عصمت چغتائی (ڈراما: ''دھانی بانکیں'') کی Wishful Thinking ظاہر ہوئی اور افسانہ بگڑ گیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بحرانی دور کے خاتمے کے بعد بہت حد تک فسادات افسانے کا موضوع بنے رہے۔ افسانے کے اس رواں پس منظر میں انتظار حسین کا نام سب سے اہم ہے، جس کی بہترین مثال افسانہ ''ہندوستان سے ایک خط'' ہے۔ انتظار حسین کے اس نوع کے

افسانوں میں یادیں، بچھڑے ہوئے گلی محلوں اور بازاروں میں لیے لیے پھرتی ہیں اور انتظار حسین کے یہ افسانوی کردار لاہور کی سڑکوں پر گڑ کی گزک تلاش کرتے ہیں جو ماضی میں بیت گئی۔

ہندوستان کی اس تقسیم کبیر کے ساتھ دونوں اطراف میں فرد کی تنہائی کا احساس حد درجہ بڑھ گیا اور افسانے میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ تخلیق کار کے انفرادی محسوسات سے لے کر اجتماعی زندگی کی داخلی کیفیات تک کی تبدیلیاں تھیں۔

سیاسی مجبوری اور محکومی کا احساس ختم ہوتے ہی دونوں اطراف میں عصری حوالوں سے معاشرتی سطح پر مسائل اور ان کا حل ڈھونڈنے کی سعی کی گئی اور یہ سب محسوساتی سطح پر نسبتاً آزاد فضا میں سامنے آیا، معروضی انداز نظر پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں اظہار کی سطح پر ترقی پسندوں کا رقت آمیز رویہ افسانے میں دم توڑ گیا۔ نئی طبقاتی تقسیم موضوع بنی تو، لیکن اجتماع کے خوف کے سبب یک۔ و تنہا تخلیق کار نے استعارے اور علامت کا سہارا لیا۔ نشان متروک قرار پایا جس سے ترقی پسندوں کی صحافیانہ اپروچ اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔ فسادات بیت گئے تھے اور اس کا ردعمل یہ ظاہر ہوا کہ جغرافیائی سرحدوں کو بھول کر ''انسان دوستی'' ایک موضوع کے طور پر سامنے آئی لیکن ایسے میں سیاست کا نفوذ بعض افسانوی تحریروں کو شاہکار بننے سے روکتا بھی رہا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ترقی پسند اور رجعت پسند افسانہ نگار ایک ہی سطح پر تھے۔ دونوں پراپیگنڈے پر اتر آئے۔ ترقی پسندوں نے جو کچھ لکھا اسے محمد حسن عسکری نے تو رد کیا ہی، نسیم حجازی اور ایم اسلم کی قبیل کے لوگوں نے بھی رد کیا اور جیسے کو تیسا۔ اس کو ''ہنگامی ادب'' کا نام ملا اور کھرے تخلیق کار نے جب غور کیا تو پتا چلا، سب خواہ مخواہ لڑتے ہیں۔ جیت تو ہندوستان میں برلا اور ٹاٹا کی ہوئی یا پاکستان کے جاگیرداری، عام لوگ تو ہمیشہ ہارنے والے رہے ہیں۔

قومی سطح پر تخلیقی عمل کا پہلا فیز ایسے ہی متحارب میلانات اور نظریات کا ہوتا ہے جو ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد ہماری زندگی اور ادب میں ظاہر ہوئے۔

دوسرے فیز میں خیر اور شر کا تصادم ایک ''Chaos'' کی صورت اختیار کر کے آگہی کے نئے جہانوں کے در وا کرتا ہے، ایسے میں فرد اجتماعی سطح پر اپنی شناخت کے مرحلے سے گزر جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اپنے حوالوں اور زمینی بوباس کے ساتھ نزول تخلیقی عمل ظہور پاتا ہے۔

تقسیم کبیر سے ۱۹۶۵ء کی جنگ تک ایک ''Chaos'' کی صورت پیدا ہوئی جس کے مثبت نتائج بڑی طاقتوں کے زیر اثر قومی سطح پر صلح صفائی کی نذر ہو گئے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد دونوں اطراف کے افسانے میں نئے تجربات اور نفسی کیفیات کے مثبت اور منفی اثرات کا حقیقت پسندانہ توازن ظہور پاتا لیکن اس طرز احساس کا ادارک رواں پس منظر کے افسانے میں بہت کم ممکن ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ مشترک وطنیت کا تصور تھا جو دم توڑ چکنے کے باوجود پرانے لکھنے والوں کے ہاں تعصبات کی صورت اختیار کر گیا اور دوسری طرف نئے افسانہ نگار کی نہ تو معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار پر پوری گرفت تھی اور نہ ہی وہ آزاد خیالی کے ساتھ اجتماعی نفسیات کا تجزیہ تخلیق کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس کا اپنا جواز کن حوالوں سے ممکن تھا؟ اس کا اسے علم نہ تھا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے گناہ اور ثواب ''Own'' کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رواں پس منظر کا افسانہ نگار محسوسات اور اظہار کی سطح پر ماضی کے حقیقت پسند، رومانی یا ترقی پسند کیمپ میں پناہ گزین ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود اُردو افسانے کو انتظار

حسین، قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد، محمد خالد اختر، کرتار سنگھ دگل، بانو قدسیہ اور دیویندر اسر جیسے سات اچھے افسانہ نگار میسر آئے۔

اس حوالے سے ان میں سب سے نمایاں نام انتظار حسین کا ہے جسے ''ذہنی جلاوطن'' کہا گیا۔ انور عظیم کے خیال کے مطابق یہ جلاوطن اس ''میں'' کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہے جو تہذیبی بحران میں ماضی کی کسی اندھی گلی میں کھو گیا۔

انتظار حسین کی یہ بھٹک مجموعوں: ''کنکری'' اور ''گلی کوچے'' سے ہوتی ہوئی ''شہر افسوس'' اور ''کچھوے'' کے افسانوں، یہاں تک کہ تازہ ترین افسانے ''چیلیں'' تک چلی آئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کو زوال ڈھاکہ کے ساتھ دوسری بار ہجرت کا سامنا کرنا پڑا، تب انتظار حسین نے اسی تسلسل میں پورا اترتے ہوئے اپنے کئی پرانے افسانوں کو ''شہر افسوس'' میں یکجا کیا اور انہیں نئے معانی سے دوچار کر دیا۔ ہجرت کے حوالے سے انتظار حسین کے ہاں خاص طرح کی Tension جاری وساری ہے۔ انتظار حسین نے ایک زمانے میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا تھا اور رفتہ رفتہ ''آخری آدمی'' کی بے حرمتی اور توقیری کی طرف آئے تھے لیکن اب وہاں سے واپسی بڑی شدومد کے ساتھ ہوئی ہے جس کی مثالیں: ''شہر افسوس'' کے افسانوں کے بعد'' کچھوے'' اور ''واپس'' جیسے تازہ ترین افسانے ہیں۔

انتظار حسین کے چند افسانے البتہ قدیم طرز احساس سے عاری لوگوں کے لیے وہ اہمیت نہیں رکھتے جس توجہ کے وہ طالب ہیں۔ '' کچھوے'' شاید انتظار حسین کو صدائے بازگشت کا اسیر کہلوائے لیکن ''بادل'' میں تصوف کے رچاؤ اور اجتماعی لاشعور کو ساتھ لے کر مستقبل کی جانب اشارے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں شاید انتظار حسین کے بارے میں سوئے ہوئے آدمی کا بیان معتبر نہ ٹھہرے۔

محمود ہاشمی نے اس ''ناسٹلجیا'' کو تاریخ کے دھارے سے خود کو کاٹ لینے کا جتن کہا ہے۔ لیکن کچھ لاجیکل چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انتظار حسین کٹنے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بچ نہیں سکتے۔ انہیں تاریخ کی طرف پیچھے لوٹ کر جانا پڑتا ہے اور انتظار حسین تو گھر کی چیزوں کو رکھے رکھے جڑیں پکڑتے ہوئے محسوس کرتے ہیں پھر آخر ایسا کیوں نہ ہو۔

انتظار حسین نے بہت پہلے سوال اٹھایا تھا ''ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ اس زمین کے ساتھ میرا رشتہ کیسا ہے؟''

''شہر افسوس'' اور بعد کے افسانوں میں یہی سوال دہرایا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انتظار حسین ماضی اور حال میں وجہ امتیاز یا وجہ اختلاف تلاش نہیں کرتا بقول انتظار حسین پوری تاریخ حاضر ناظر ہے۔ واقعہ کربلا لوگوں کے لیے ماضی ہو تو ہو، وہ تو اسے حاضر ناظر جانتا ہے۔ لوگ حال اور ماضی میں فرق کر کے حافظے سے محروم ہوتے چلے گئے ہیں لیکن افسانہ نگار تو ہمیشہ حافظے کی تلاش میں ہے۔ اسے زندگی کی رو سے کوئی خاص دلچسپی نہیں البتہ باطن میں جو روئیں چلتی ہیں ان کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ یہی باطن کی غوطہ زنی اور اسلوبیاتی تنوع انتظار حسین کی پہچان ہے۔ اس کے ہاں اسلوبیاتی تنوع کے اعتراف کے ساتھ باطن کی غوطہ زنی کو فکری اور نظری پسماندگی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے اٹھائے ہوئے سوالات کو اتنی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مانا کہ اس بیسویں صدی میں انتظار حسین کے تعصبات سے کہیں زیادہ اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ یہ بھی درست کہ اقتصادی اور سماجی مسائل جس قدر گزشتہ دو دہائیوں میں تبدیل ہو کر سامنے آئے بقول میکن مارا گزشتہ دس لاکھ سالوں میں اس قدر تبدیلیاں نہیں آئیں، لیکن انتظار حسین ان تبدیلیوں کا مکمل شعور رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انتظار حسین

ہر زمانے میں موجودہ معروضی صورت حال کا تجزیہ کرتا چلا آیا ہے۔ افسانہ ''دوسرا راستہ'' ایوب خانی عہد کے سیاسی جبر اور بے حرمتی کا احساس لیے ہوئے ہے، ''شرم الحرم'' عرب اسرائیل حوالے سے نمایاں ہے اور ''نیند'' زوال ڈھاکہ کا خوبصورت عکاس۔

انتظار حسین نے ''دوسرا راستہ'' کے معاشرتی حوالے سے اٹھائے ہوئے سوالات سیاسی پھیلاؤ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر یہی وہ مقام ہے جہاں سے انتظار حسین اُردو افسانے کے پیش منظر میں داخل ہوتے ہیں:

''لگتا ہے کوئی جلوس ہے'' کنڈکٹر نے اعلان کیا۔

''بادشاہو' اپنے اپنے سر اندر کرلو۔''

جو جو آدمی گردن نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اندر کرلی۔ سب اس طرح سکڑ سمٹ گئے جیسے پوٹلی بن گئے ہیں۔

(''دوسرا راستہ'' از انتظار حسین سے اقتباس)

بس کی علامت یہاں ہماری اجتماعی زندگی کا رخ اور رفتار متعین کرتی ہے اور انسانی عمل جیتے جاگتے مسائل سے آنکھیں میچ لینے کا ''سفید پوش'' عمل۔ انتظار حسین نے ایسے میں فرد کی انفرادی سطح پر اخلاقی جدوجہد کو بے معنی قرار دیا ہے۔ مثالیں ''زرد کتا'' اور ''آخری آدمی'' جیسے افسانے ہیں۔ یوں انتظار حسین کے ہاں بھی قومی تشخص سوائے محرومی کے احساس کے کچھ نہیں رہا۔ اس نکتے پر انتظار حسین اور پیش منظر کے تمام افسانہ نگار ایک ہی نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے اولین مجموعے ''ستاروں سے آگے'' میں خصوصاً بورژوا طبقے کی نوخیز لڑکی کے خواب بنے گئے ہیں، بے معنی محفلیں اور لایعنی مصروفیات۔ ''شیشے کے گھر میں'' میں یہی لڑکی میچورٹی تک پہنچتی ہے۔ ''ستاروں سے آگے'' کے افسانوں میں اس زمانے کا ہندوستان اور بنگال کا قحط دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے کہ ان افسانوں میں موضوع کی سطح پر بالائی طبقے کی محفلوں میں مائکل اینجلو موضوع بحث ہے، لارنس اور آسکر وائلڈ کی دھوم ہے۔ اور رمبا، کتھا کلی اور برج کی محفلوں میں الجھے ہوئے بورژوا نسائی کردار...... یہ ان کی سچی پیشکش ہے۔

لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس کی عورت کی پیشکش کے برعکس یہ قرۃ العین حیدر کی خاص عطا ہے۔ ان کا افسانہ ''کارمن'' مڈل اور بورژوا نسائی کرداروں کا کامیاب ترین عکاس کہا جائے گا۔

قرۃ العین حیدر کا ایک اپنا منفرد انداز تحریر ہے اور تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان کے فکری افق کو جلا بخشی ہے۔ یوں مشرقی تہذیب کا وقار اور مغربی تمدن کا نکھار ان کے افسانوں میں کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ رنگوں کے اس انوکھے ادغام سے حسیاتی تاثر کی موسیقیت نے جنم لیا ہے اور جس کی خوبصورت ترین مثالیں ''فصل گل آئی یا اجل آئی''، ''یہ داغ داغ اجالا'' اور افسانہ ''سرراہے'' کا آغاز ہے۔ تہذیبی اور تاریخی شعور کی ابتدائی مثالوں میں ''جب طوفان گزر گیا'' اور آپ بیتی کے رنگ میں ''دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم'' اور ''کیکٹس لینڈ'' بہت نمایاں ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا موضوع خاص جذباتی سطح پر انسان کی قلب ماہیت ہے، جس کا سب سے بڑا سبب جذبہ محبت یا جذبہ نفرت کے متعلقات ہیں۔ چاہے جانے کے جذبے کا تنوع (خصوصاً حسیاتی سطح پر اس جذبے کی متنوع صورتیں) اشفاق احمد کے ہاں اس کے نمائندہ

افسانوں خصوصاً ''گڈریا''، ''اُجلے پھول'' اور ''قصہ گل دَمتی'' میں ظاہر ہوا ہے۔ جبکہ لوک دانش کا حوالہ (افسانہ: ''حقیقت نیوش'') اور تصوف کی جانب میلان (افسانہ: ''مانوس اجنبی'' اور ''قصاص'') اشفاق احمد کے ہاں پاکیزگی اور خیر کی فضا بندی کرتا ہے۔ دوسری طرف اشفاق احمد نے ''رشوت'' جیسے شدید جنسی حسیت کے افسانے بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ افسانوں میں خاص نوع کی گہرائی پائی جاتی ہے (مثالیں ''چچا سام کے دیس میں'' اور ''بندر لوگ'') ان افسانوں میں اشفاق احمد نے تیسری دنیا کی بے بسی اور سامراج کی ریشہ دوانیوں پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' اُردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

محمد خالد اختر کا نام ان کے دو افسانوی کرداروں چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار کی معرفت اُردو افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ شفیق الرحمٰن کے سست رفتار ہونے کے بعد اُردو افسانہ ایک خاص نوع کی اکتاہٹ کا شکار ہو چلا تھا اور عین اس مرحلے پر محمد خالد اختر نے اسے نہ صرف سنبھلا دیا بلکہ اس کی اٹھان میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

ان کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور ان کرداروں کی شخصی اور انتہائی نجی زندگی کی تفاصیل سامنے لاتے ہیں۔ محمد خالد اختر نے اپنے ان کرداری افسانوں کی معرفت انسانی ذات کی گہرائی میں چھپی ہوئی مضحکہ خیزی کو کامل ہنر مندی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے اور اس ضمن میں چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار سلسلے کے افسانوں کے علاوہ افسانہ ''لالٹین'' کے مستری مہتاب دین، ننھا مانجھی، کے کردار اور ''مقیاس المحبت'' کے ڈاکٹر غریب محمد کی کردار نگاری لاجواب کہی جا سکتی ہے۔

محمد خالد اختر کے اس منفرد طرزِ اظہار کی سپلائی لائن بیک وقت مشرق اور مغرب کے بہترین ادب سے جڑی ہوئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں محمد خالد اختر اپنے آدرش کو افسانے کے فن سے متصادم ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتے بلکہ افسانے کے بناؤ سنگھار میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

کرتار سنگھ دگل نے اُردو افسانے کو خیال اور طرزِ اظہار خصوصاً بات کرنے کے تیکھے انداز سے تازگی اور نیا لحن دیا۔ دگل کے افسانوں میں علامت اور استعارے کے ورتارے کے باوجود ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں۔

کرتار سنگھ دگل کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت کردار کے بجائے پلاٹ کی تعمیر پر خصوصی توجہ کا رجحان ہے جبکہ ان کے چنیدہ موضوعات کی نوعیت کردار کی نفسی کیفیات کی عکاسی کی متقاضی ہے اور دگل اس کیفیت کو اجاگر کرنے کے لیے واقعات کی مختلف النوع کڑیوں کی جوڑ توڑ پر توجہ صرف کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔

معمول کے دنوں میں یکلخت غیر معمولی گھڑیاں فرد کی زندگی کا نظام تلپٹ کر دیتی ہیں۔ یہ انسانی لاشعور اور اجتماعی لاشعور کا کیا دھرا ہے۔ بعض اوقات ہم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ماضی قریب کے بیتے ہوئے لمحات میں خود ہماری غیر معمولی حرکات کے محرکات کیا تھا۔ کرتار سنگھ دگل کے ہاں ایسی کیفیات کا بیان کرتے ہوئے محرکات کے طور پر خارج کا ماحول اور باطن کا سناٹا ایک نیا منفرد آہنگ وضع کرتا ہے۔

''میری عادت ہے، سڑک پر چلتے وقت میں آنکھیں نیچے کئے چلتا ہوں۔ اس روز نہ معلوم کیا ہوا؟ پل پار کرنے کے بعد کونے والے مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر میری نظر سامنے گیٹ پر جا پڑی۔ گیٹ سے تین پہیوں والی سائیکل چلاتا ہوا ایک بچہ نکلا۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال...... بچہ باہر نکلا اور کسی کے ہاتھ آگے بڑھ کر گیٹ بند کرنے لگے اور گیٹ ویسے کا ویسا ہی ویسا ہی کھلا رہ گیا۔ ہنستی

ہوئی آنکھیں، گوری گوری، سرخ سرخ مسکراہٹ، رقص نرماں چہرے پر...... دانت موتیا کے دانے، ہلکے ہلکے لرزتے ہونٹ...... گویا ایک لمحے کے لیے رک جانے کو کہہ رہے ہیں۔''

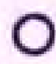
(''انتظار'' از کرتار سنگھ دگل سے اقتباس)

یہ معمول کے دنوں میں غیر معمولی لمحات ہیں۔ ان کے بعد یکلخت ساری کائنات جیسے اس ایک لمحے کے زیر اثر چلی جاتی ہے۔ افسانے میں دگل نے ان لمحات کو ایک موڑ دے کر نئی صورت حال میں یہی غیر معمولی گھڑیاں Recall کر لی ہیں اور یوں افسانہ اپنا دائرہ مکمل کرتے ہوئے ایک نہ ختم ہونے والی کہانی بن جاتا ہے۔ جس کے کردار بدل سکتے ہیں، معاشرتی اور معاشی صورتحال بدل سکتی ہے، لیکن وہ غیر معمولی گھڑیاں اپنی جگہ جوں کی توں رہیں گی۔ کرتار سنگھ دگل کے ہاں اس نوع کی مثالیں ان کے مطبوعہ افسانوی مجموعہ: ''اِک کرن چاندنی کی'' میں اپنی نمایاں پہچان کرواتی ہیں۔

بانو قدسیہ کی شہرت کا آغاز ان کے مشہور افسانہ ''کلّو'' سے ہوا اور جب سے اب تک ان کے افسانوں میں مرد اور عورت کے معاشرتی، روحانی اور جسمانی روابط نت نئی کروٹیں لیتے آئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے عورت کی آدھی دنیا کو جس طرح اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے یہ انہی کا حق ہے۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں نئی اور پرانی اقدار کا تصادم اور رسوم و رواج کی جکڑ بندیاں، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط اور منسلک ہیں کہ انہیں الگ الگ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس ضمن میں ان کا شاہکار افسانہ ''انتر ہوت اداسی'' ہے۔

دیوندر اِسّر کی افسانوی تدبیر کاری میں ''شعور کی رو'' کا استعمال بطور خاص توجہ طلب ہے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''گیت اور انگارے'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں عقلیت اور منطقیت کی مطیع شعور کی رو برتی گئی تھی، جس کی اُردو میں اولین امثال محمد حسن عسکری کے دو افسانوں: ''حرام جادی'' (۱۹۴۱ء) اور ''چائے کی پیالی'' (۱۹۴۲ء) میں دیکھنے کو ملی تھیں۔ دیوندر اسر کے دو افسانوں: ''مردہ گھر'' اور ''کالی بلی'' نے شہرت پائی۔



واگہ سے لے کر کھوکھرا پار تک یہ وہ مقامات ہیں جہاں ۱۹۴۷ء میں ایک عہد تمام ہوا اور دوسرے عہد نے جنم لیا لیکن 6 ستمبر ۱۹۶۵ء تک ادبی سطح پر خصوصاً پاکستانی افسانہ نگاروں کے لیے یہ مسئلہ چلا آتا تھا کہ اس نئے عہد کو جسے ''پاکستان'' کہتے ہیں، کیسے اور کیوں کر اپنے شعور کا حصہ بنائیں یا شاید بقول انتظار حسین یہ واردات بڑی تھی اور ہم چھوٹے تھے۔ پاکستان کی صورت میں جنم لینے والی سرزمین سے ہماری نئی نئی رشتہ داری تھی، شاید اسی لیے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء تک کے اُردو افسانے میں اس دھرتی کی مہک بالغ نہ ہو پائی۔

اس کے باوجود ابوضیاء اقبال کا افسانوی مجموعہ ''دشمن'' غلام الثقلین نقوی کا افسانوی مجموعہ ''نغمہ اور آگ'' اور لخت لخت افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا ''کپاس اور پھول'' اور انتظار حسین کا ''آخری خندق'' اس روحانی واردات کے گواہ ٹھہرے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ستیش بترا، غلام محمد، مسعود اشعر اور زین العابدین اپنے افسانوں میں بنگال کے پانیوں کا مزاج جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ موسموں کے رنگ، برہم مزاج کے درجے اور لہروں کی سرگوشیاں سمجھ سمجھا رہے ہے۔ ایسے میں شہزاد منظر نے بگڑی ہوئی صورت حالات کا تجزیہ زمینی رشتوں اور معاشی ناہمواریوں کے حوالے سے کیا تھا جبکہ افسانہ ''یوٹوپیا'' تک آتے آتے امن اور مشرقی پاکستان کی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے شہزاد منظر اور شاہد کامرانی کے کردار اپنے ہی ملک میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ ام عمارہ نے اس صورت حالات کی فلسفیانہ توضیح افسانہ ''یہ گناہ بے گناہی'' جیسے افسانے لکھ کر کی اور آخر میں جا کر پتا چلا کہ یہی سوچ کا انداز زوال ڈھاکہ کا سبب بنا۔

ان سب افسانہ نگاروں کے کام کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب لوگ انتظار حسین کے لیے Spad Work کر رہے تھے۔ انتظار حسین نے ''وہ جو کھوئے گئے''، ''نیند'' اور ''شہر افسوس'' لکھ کر یہ میدان بھی مار لیا۔

پاکستانی افسانے کی سطح پر زوال ڈھاکہ تک آتے آتے ہماری سمجھ میں یہی نہیں آیا کہ سرزمین پاکستان یا ہندوستان، ان کی مختلف النوع قومیتوں اور لسانی مسائل پر اپنے شعور کی گرفت کیسے مضبوط کریں۔ اس بڑے سانحہ کے ساتھ پاکستان میں از سرنو اپنی دریافت کے سوال نے سر اٹھایا۔ اپنی جڑوں کی تلاش شروع ہوئی۔

''زمین سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟'' بہت پہلے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر نے یہ سوال اٹھایا تھا۔ اب نئے حالات میں اس سوال کا جواب بہت آسان تھا لیکن مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وضاحت میں پہل کون کرے؟ پھر روحانی نوعیت کے سوالات تھے۔ پرانے عقائد اور نظریات کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔

یہ ایسی روحانی واردات ہے جو پیش منظر کے افسانہ نگار کو مقام حیرت تک لے آئی۔

پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں اُردو افسانہ مصلحین اور مجاہدین کے درمیان کھینچا تانی میں جگہ جگہ سے ادھڑ گیا۔ سماجی سطح پر مصلحین نے زور مارا اور سیاسی معاشی جدوجہد کے تحت مجاہدین نے۔ یہ بہت لمبا عرصہ ہے جس میں افسانہ۔ سماج دشمن، وطن دشمن اور انسانیت دشمن عناصر کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف رہا۔ بیسویں صدی عیسوی میں ساٹھ اور ستر کے دہوں کا افسانہ نگار مقام حیرت سے چلا اور اپنی ذات کے سفر پر نکلا، ایسا سفر جس میں اپنے مشاہدے تھے اور اپنے خواب۔ افسانوی پیش منظر میں نئے رجحانات، نئی تدبیر کاری، اسلوبیاتی سطح پر تجربے اور لفظ کا نیا ورتارا اس عظیم تر روحانی اور فکری واردات کا نتیجہ ہے اور اس کا پس منظر سیاسی اور معاشرتی مسائل کا لامتناہی سلسلہ۔

○

حوالہ:

۱۔ بحوالہ: ''تحفظ کی طاقت'' از میکن مارا، چیئرمین عالمی بینک

اُردو افسانے کا نیا لحن

(سُر یندر پرکاش، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، انور سجاد، بلراج مین را، خالدہ حسین،
منشایاد، رشید امجد، بلراج کومل، اسد محمد خاں، مرزا حامد بیگ)

1958ء تک کا اُردو افسانہ مختلف النوع سیاسی، سماجی لہروں اور تحریکوں کے زیر اثر رہا لیکن اس کے بعد یہ کسی خاص رجحان یا تحریک کا پابند دکھائی نہیں دیتا۔ اب افسانہ نگاروں کے انفرادی کام کو اہمیت حاصل ہوئی۔

وجودیت ہمارے ایٹمی عہد کا فلسفہ ہے، جسے انتشار کی شکار بورژوا سوسائٹی کی عطا کہنا چاہیے۔ ماضی میں پاسکل نے سائنس کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ اب سچ ثابت ہونے لگے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کو مختلف سہولتیں بخشیں، وہیں انسان کو خارج پر قادر ہونے کے باوجود جذباتی اور محسوساتی سطح پر دائمی کرب کا مریض بھی بنا دیا۔ فرد تنہا رہ گیا۔

یہ تنہا انسان اپنے اعتقادات اور روشن خیالی کے درمیان گم سم ہے۔ مستقبل غیر واضح ہے اس لیے سوال جنم لیتا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی تجسس ہے جیسا غالب کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک تہذیب کی شکست کے بعد نئی صورتحال کو دیکھ کر سوال ...... کامیو والی بغاوت نے بھی ظہور کیا۔ مختار کل اور مجبور محض انسان جس کی تنہائی، انفرادی سطح پر بھی ہے اور انبوہ میں بھی۔ یہ تنہائی جذباتی اور فکری دونوں سطحوں پر ہے۔

اس اہم موڑ پر افسانوی اظہار سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، بلراج مین را، خالدہ حسین، بلراج کومل، غیاث احمد گدی، منشایاد، رشید امجد اور اسد محمد خاں کی معرفت علامت، سرئیل ازم، تجربہ اور استعارہ سازی کے حوالے سے تکنیکی سطح پر علامتی ابعاد اور نئے وژن سے متعارف ہوا۔

یوں پیش منظر کے افسانے میں بھرپور اظہار کی خاطر "میں" اور بے نام کردار Persona کے طور پر ابھر کر پس منظر اور رواں پس منظر کے افسانے سے الگ، اظہاری سطح پر اپنی پہچان کراتا ہے۔ یہ "میں" انفرادی اظہار کا ذریعہ ہے، اس طرح آج کا افسانہ پس منظر کے افسانوی پبلک وژن سے مختلف اظہاری صورت سامنے لاتا ہے۔ یہ صورت حالات حیران کن اس وقت بن جاتی ہے جب پیش منظر کے چیدہ افسانہ نگار اپنے طور پر کسی نہ کسی سیاسی نظریے سے وابستگی کے باوجود افسانہ لکھتے وقت اس نظریے کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کی بہترین تخلیقات میں ان کا

سیاسی عقیدہ ایک زہریں لہر کی صورت ہردم رواں رہتا ہے اور یہ لوگ کمال احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارمولا تدبیر کاری سے بچ جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کی پیدا کردہ صورت حالات ہو یا سیاسی سطح پر جبر کی عطا لیکن ہوتا یہ ہے کہ آج کے افسانہ نگار کا زاویہ نظر اور اسلوب، خودمختار فضا میں منفرد تجربات کا اظہار بنتا ہے۔

پیش منظر کا افسانہ Economy of Expression کا افسانہ ہے جو افادی نظریات کے روایتی ٹائپ کرداروں خصوصاً جاگیردار، کسان، سرمایہ دار، مزدور، تماش بین اور طوائف سے اوپر اٹھ کر فطری وجود کے ساتھ انسانی باطن کا نروان اظہار ہے۔

سریندر پرکاش کی افسانہ کا آغاز یوں تو 1944ء میں افسانہ ''دیوتا'' کی تخلیق کے ساتھ ہوا، لیکن ان کی مستقل پہچان 1960ء اور 1970ء کے عشرے میں ''ادب لطیف'' لاہور، ''سات رنگ''، کراچی اور ''شب خون''، الہ آباد میں شائع ہونے والے افسانوں سے بنی۔ سریندر پرکاش کے اجتماعی نفسیات کے حوالے سے لکھے گئے افسانے ہندوستانی کلچر اور اجتماعی انسانی ذہنیت کی تشکیل اور تعمیر کے باب میں خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں۔ جبکہ سریندر پرکاش کا بنیادی موضوع انسانی باطن کا اندرونی اجاڑپن اور ویرانی کا شدید احساس ہے۔ یہ بنیادی احساس سریندر پرکاش کے کرداروں کو جائے پناہ ڈھونڈنے میں سرگرداں رکھتا ہے۔ اس کیفیت کے اظہار کے لیے سریندر پرکاش کے موسم شدید ہیں، منہ زور ہوائیں اور بے کنار پانی کی تند لہریں۔ جائے عافیت کے طور پر آسیب زدہ گھر اُبھرتا ہے، جس میں چوکیدار ہے اور آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیاں۔ سریندر پرکاش نے بیتے ہوئے وقت کے دھارے کو تجریدی تدبیر کاری کے تحت اپنے بس میں کرلیا ہے۔ اس کا بے پناہ تہذیبی اور تاریخی شعور امیجری اور آوازوں کے Distort ہو جانے پر بھی ایک خاص قسم کی ماورائی کیفیت برقرار رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ ''چھوڑا ہوا شہر'' کے ریلوے اسٹیشن کی Crud معروضی صورتحال اور سینما میں سکرین اور اجتماعی لاشعور کا پھیلاؤ باہم ایک ہوکر بھی لایعنیت کو جنم نہیں دیتے۔ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' اور ''جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں'' میں ندی کی علامت انسانی زندگی کی علامت ہے جو قرنوں سے رواں دواں ہے۔

''یہ طے پا گیا ہے کہ ندی کنارے بسے ہوئے جس نگر میں میں رہتا ہوں اس کے بڑے چوراہے پر مجھے مصلوب کردیا جائے اور میری لاش کو اسی تابوت میں رکھ کر، اس پر میرا یوم ولادت لکھ کر ندی میں پھینک دیا جائے تاکہ آئندہ جب کبھی پھر میری ضرورت پڑے، اس وقت کے لوگ مجھے حسب خواہش مصلوب کرسکیں۔''

دونوں افسانے یقین اور رجائیت کی انتہائی زیریں لہروں سے تکمیل پاتے ہیں اور ان میں ماورائیت کا احساس سریندر پرکاش کے پختہ تہذیبی اور تاریخی شعور کا پیدا کردہ ہے۔

سریندر پرکاش کے افسانوں میں لفظوں کی طے شدہ معنویت کے پیچھے ایک اور جہان سانس لے رہا ہے، جس میں داستان کی سی واقعیت اور قصے کہانی کی سی کشش ہے۔ افسانہ ''جپی ژاں'' بظاہر ابہام کے نیم روشن اور نیم تاریک بوجھل دھند لکے میں لپٹا ہوا ہے لیکن اس علامت کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ''جپی ژاں'' کی علامت سیموئل بیکٹ کے ''Waiting For Godot'' کے مرکزی کردار ''گوڈو'' کی یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح سریندر پرکاش کا افسانہ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' فرد کے اندرونی اجاڑپن، ویرانی اور ضعف کا زندہ استعارہ ہے۔

سریندر پرکاش کے دیگر نمائندہ افسانوں میں ''بجوکا''، ''بازگوئی''، ''رونے کی آواز'' اور ''جمغورہ الفریم'' سلسلے کے افسانوں میں

علامتوں کا ایک مکمل نظام کارفرما ہے، جس کے تحت فرد اپنی ابتدائی اپنائیت سے صنعتی عہد کے بنجر پن تک کا سفر کرتا ہے۔

جوگندر پال کی اولین شہرت افسانوی مجموعہ "دھرتی کا کال" سے متعلق رہی ہے جس میں تدبیر کاری کی سطح پر داخلی خود کلامی کا طریقہ کار اپنی پہلی جھلک دکھاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تدبیر کاری ان کی نمایاں پہچان بن گئی (نمایاں مثالیں "پاتال" اور "باہر کا آدمی") اور جوگندر پال کے افسانوں کا مرکزی کردار" میں" مروج افسانوی پبلک وژن سے مختلف اظہاری صورت سامنے لایا۔ ایسے میں ابسرڈٹی کی عمومی فضابندی، شناخت کا مسئلہ اور یکسر جداگانہ لحن جوگندر پال کے کارگر ہتھیار رہے ہیں، جبکہ "Other Self" اور "Self" کے بارے میں فکری ارتکاز جوگندر پال کا موضوع خاص ہے۔

جوگندر پال کردار کو دولخت کر کے گہری نفسیاتی بصیرت کے ساتھ سماجی اور ثقافتی مسائل کے الجھاوے فلسفیانہ سطح پر رفع کرتا ہے۔ پستیوں میں گرتے ہوئے فرد کا ذہنی اور اخلاقی تجزیہ "روشن پہاڑ" ہے۔ لیکن ایسے افسانے لکھتے وقت جوگندر پال نے ہمیشہ ابلاغ کے مسئلہ کو سر اٹھاتے ہوئے محسوس کیا۔ اُنہیں اپنی رو میں لکھتے ہوئے بھی غیر تربیت یافتہ قاری کی الجھنوں کا احساس ستاتا رہتا ہے۔

محض ایک افسانے "ہارویسٹ" کی ایک طویل بریکٹ ملاحظہ ہو:

"میں اپنے آپ سے وعدہ کر کے لکھنے بیٹھا ہوں کہ میری یہ کہانی بڑی شریف ہوگی، اتنی شریف کہ ہر ایک کی سمجھ میں یوں آسانی سے آ جائے جیسے کوئی غیر شریف (عورت؟) بلا جھجک ہر کسی کے پرائیویٹ ایریا میں، کہ بھئی بوجھ ہر کسی کا اپنا پرائیویٹ ایریا رہی ہے۔"

افسانہ لکھتے ہوئے یہ بے تکلفی کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتی۔ مثال دیکھیے:

"لیجئے جناب۔ یا جناب! کہانی کا رنگ روپ خوب نکھر آیا ہے اور اپنے سیکس کے عین مطابق دکھائی دینے لگی ہے۔ عورت کا عورت پن، کہانی کا کہانی پن...... میری اس بھولی بھالی کہانی نے برقع اوڑھ رکھا ہے تاکہ بری نظروں سے بچی رہے، یا کوئی منچلا اسے دیکھنے پر تل ہی جائے تو آنکھیں بند کر کے اپنی توفیق کی حد تک اسے دیکھ سکے۔"

اس خصوص میں "لیکن"، "بے ارادہ" اور "بے محاورہ" کے افسانے خصوصی طور پر، بہت نمایاں ہیں۔

جوگندر پال نے افسانہ "رہائی" کے ایک داخلی مونولاگ میں اظہار کی پابندیوں اور اسالیب کے الجھیڑوں کو موضوع بنایا تھا۔

"نئے واقعات، نئے خیالات، زندگی کے نئے اسالیب کی راہیں ہم پر کیوں بند کر دی ہیں۔ ہم نے اپنی اپنی جان کی بازی کھیل کر اپنی رہائی کا یہ اقدام کیا ہے۔ آؤ، اس کھڑکی کی راہ سے نکل جائیں، آؤ جلدی کرو۔ باہر نئی زندگی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

("رہائی" سے اقتباس)

اور اس کے بعد جوگندر پال نے اپنی پہچان کے تمام حوالے یکسر بھلا کر اسلوب اور موضوع میں سے موضوع کا چناؤ کیا۔ جب سے اب تک جوگندر پال کے ہاں موضوع کو اولیت حاصل ہے اور انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہر موضوع اپنا طرز اظہار ساتھ لے کر وارد ہوتا ہے۔ "سلوٹیں" کے افسانچے اسی بولڈ اقدام کے غماز ہیں۔

غیاث احمد گدی کی اولین پہچان افسانہ "سائے اور ہمسائے" (مطبوعہ: "سویرا" لاہور) ہے۔ آگے چل کر اس نوع کے افسانوں میں غلام عباس اور سید فیاض محمود کے ملے جلے اثرات نے غیاث احمد گدی کے ہاں اسلوبیاتی سطح پر ایک خوبصورت توازن قائم کیا۔

''بابالوگ'' میں شامل پانچ افسانوں ''بابالوگ''، ''ڈورتھی جون سین''، ''بدصورت سیاہ صلیب''، ''پیاسی چڑیا'' اور ''صبح کا دامن'' کا تعلق اینگلوانڈین معاشرت سے ہے۔ شاید اسی لیے جوگندر پال نے لکھا تھا کہ ''بابالوگ'' کا مصنف ایک طویل مدت تک آدرشوں کے سائے میں آنکھیں موندے اپنی عبادت میں مگن رہا اور پھر آدرشوں کی دیوار اچانک ڈھتے کراس پر آ گری، تو وہ اچانک چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ذہن ''نارمنی'' کی بے چینی سے جھپکنے لگا، جھپک رہا ہے۔ افسانہ ''نارمنی'' غیاث احمد گدی کے فنی سفر کا نیا موڑ تھا اس کی یہ پہچان دوسرے افسانوی مجموعے ''پرندے پکڑنے والی گاڑی'' سے واضح ہوئی۔ اس کتاب میں شامل افسانوں خصوصاً ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، ''دیمک''، ''کیمیا گر'' اور ''افعی'' میں سماجی حقیقت نگاری، نفسیاتی پیچیدگیوں اور قلبی وارداتوں کا بیان خصوصی طور پر توجہ طلب ہے اور استحصال کے خلاف باغیانہ لحن گدی کے بیانیہ کا اگلا قدم:

''دراصل اس روز ہم دونوں پیئے ہوئے تھے، بلکہ معمول سے کچھ زیادہ ہی پی گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے قدموں میں لرزش، ہماری حرکات خلط ملط ہو رہی تھیں اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ چنانچہ شہر سے دور، اسٹیشن جانے والی سڑک کی ڈھلان جیسے ہی آئی، میرا دوست نارد، نارد کمار سین گپتا نے اپنے پاؤں کے پاس پڑے ہوئے ڈھیلے کو اٹھایا اور سامنے پیڑ کی شاخ پر جھولتے ہوئے امرود کا نشانہ لگا کر زور سے ڈھیلے کو پھینکا۔ ذود...... دوں کی آواز اور تڑاخ سے امرود، ڈھیلے کی زد میں آ کر اڑ گیا۔

''کہاں گیا...... ماں کی...... ب......!''

''دیکھا...... یوں...... یوں...... اڑ جائیں گے سالے۔!'' نارد زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

مجھ سے کہا: ''بیٹھ جاؤ۔''

میں نے کہا: ''کہاں بیٹھوں، نیچے زمین ہی نہیں ہے۔''

(''نارمنی'' از غیاث احمد گدی سے اقتباس)

غیاث احمد گدی کے ہاں ایسی کیفیات کا بیان کرتے ہوئے محرکات کے طور پر خارج کا ماحول اور باطن کا سناٹا ایک نیا اور منفرد آہنگ وضع کرتا ہے۔

انور سجاد نے اپنے افسانوں میں ہر سود ندناتے ہوئے شر کی چہرہ نمائی کی ہے۔ سیاسی جبر، معاشی ناہمواری کا احساس اور معاشرتی سطح پر زندگی کی منفی جہت خاص موضوعات ہیں جبکہ افسانوی تدبیر کاری کی سطح پر انور سجاد اور بلراج مین را میں وہی فرق ہے جو Elevate اور Sublime کرنے کا ہے۔

انور سجاد کے لہجے کی کرختگی اوس بورن کی تیزابیت سے ملتی جلتی ہے اور زبان کا ورتارا ایسا کہ جیسے کوڑے برس رہے ہوں اور کھال ادھڑ رہی ہو۔ یہ کیفیت اس نے اوقاف نگاری سے پیدا کی ہے۔ سکتہ، ختمہ اور خط کے ساتھ فجائیہ یا ندائیہ اوقاف کا استعمال انور سجاد کی نثر کی نمایاں پہچان ہے۔

یوں تو انور سجاد ترقی پسند فکر کے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے بعض افسانوں میں لایعنیت کا فلسفہ ایک زیریں لہر کی طرح رواں دکھائی دیتا ہے، افسانہ ''سنڈریلا'' اس ذیل میں بہت نمایاں ہے۔ جبریت کے شدید احساس کے تحت انور سجاد کے افسانوی کردار زندگی کے مظاہر میں عملاً

شرکت کر کے براہ راست نعرہ لگاتے ہیں۔ جس کی نمایاں مثالوں میں انور سجاد کے افسانے "پی ایل فورایٹی"، "کینسر" اور "کونپل" ہیں۔

"وہ اپنی بے ہوشی میں بھی مسکراتی ہے۔

اپنے ہونٹوں پر کھڑکی میں کھلے تنہا، روشن سورج کبھی کی مسکراہٹ لیے اور باہر کومل ہواؤں پر سوار، اڈتے روشن بادلوں کے پیچھے سورج، یوں زمین اور آسمان کے اتصال میں دراڑ بناتا ابھرتا ہے کہ بادلوں کے پیچھے اس کی کومل، سرخ، نارنجی، پیلی کرنیں، نیلاہٹ مائل سرمئی چٹان کی دراڑ سے تمازت اور حدت لیے باہر کورینگتی نکلتی کیکڑے کی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔

شاید اس لیے کہ یہ وہ دن ہیں جب سورج چوتھے برج یعنی سرطان میں طلوع ہوتا ہے۔"

("کینسر" از انور سجاد سے اقتباس)

انور سجاد کے افسانے اپنے فکری نظام اور فارم کے اعتبار سے یکسر مختلف اور نئے ذائقے کے حامل ہیں۔ انہوں نے استعارے اور علامت کو اتنی ہنرمندی کے ساتھ برتا ہے کہ اردگرد پھیلی ہوئی کائنات Transparent صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور Private Persona اس نئی ہیئت ترکیبی میں ڈھل کر Public Persona بن جاتا ہے۔ انور سجاد کے ہاں اس نوع کی خوبصورت مثالیں "گائے"، "سرویئر درشن"، "کیکر" اور "یوسف کھوہ" ہیں۔

بلراج مین را نے سادہ بیانیہ کے عروج کے دنوں میں کمپوزیشن سیریز کے افسانے لکھ کر افسانہ سے متعلق طے شدہ مسلمات کو تہس نہس کر دیا اور یوں 'مہمل'، 'لسانی شعبدگر' اور 'لایعنیت کے پرچارک' قرار پائے جب کہ عین اُسی زمانے میں بلراج مین را نے "وارادات"، "بس اسٹاپ"، "انٹروورٹ"، "وہ" اور "آتمارام" جیسے افسانے بھی لکھے، جن سے مخصوص دوہری معنویت کا افسوں سر چڑھ کر بولا۔ افسانہ "کمپوزیشن دو" میں اُن کی گرافکس مین شپ قابلِ لحاظ ہی نہیں قابلِ داد تھی:

"مارو!"

"مارو، سالے کو!"

آن کی آن میں پورا ہجوم اسٹیج پر ٹوٹ پڑا اور ہم یہی دیکھ پائے کہ جوتے، گھونسے، چھڑیاں، پتھر برس رہے ہیں۔

اور جب قیامت تھمی، ہم نے دیکھا، وہ شخص ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اُس کی پیشانی، ناک، کان اور منہ سے خون بہہ رہا ہے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے سانس اکھڑ گئے اور پھر ایک شخص نے اُس کی سیاہ چادر کے پلو سے اُس کا منہ ڈھک دیا۔

جب ہم اُس کے گھر گئے، ہم نے دیکھا: ایک کمرہ ہے...... ایک کمرہ...... کمرہ کیا ہے، اب کیا کہیں؟ ایک کمرہ ہے، جس کی دیواریں سیاہ ہیں، چھت سیاہ۔"

("کمپوزیشن دو" سے اقتباس)

بلراج مین را کے افسانہ: "وہ" میں کوئلوں کی بھٹی اور سڑک کے کنارے دھری، حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے میں لپٹی لالٹین کو اگر کوئی اور معنی نہ بھی پہنائے جائیں تو بھی بیان کردہ ماجرا اُتنا ہی طاقتور رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مین را کے افسانہ "بس اسٹاپ" کو انتظار حسین کے افسانہ "دوسرا راستہ" کی طرح کی سیاسی اور سماجی اتھل پتھل اور ہڑبونگ کی دوہری معنویت نہ بھی اوڑھائی جائے تو بھی بیان

کردہ ماجرا کچھ کم اہم نہیں۔

بلراج مین را کے افسانوں بالخصوص ''انٹروورٹ'' کا اپنی ہی دُھن میں سرگرداں، دنیا اور دنیا کے بکھیڑوں سے بظاہر لاتعلق مرکزی کردار، زندگی سے اتنی مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ جب اُس کی زندگی سے جڑت کی گانٹھ موت کے ہاتھوں ڈھیلی پڑتی ہے تو ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ مین را کے کئی افسانے موضوعاتی سطح پر یکسانیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں لیکن اُن کا پلاٹ اسٹرکچر مختلف ہے۔ جیسے ''وہ'' اور ''مقتل''۔ پھر یہ کہ مین را کے کئی افسانے اک دُوجے کی ضد ہیں، جیسے ''انٹروورٹ'' اور ''پرورٹ''۔ کمپوزیشن سیریز کے افسانوں کو چھوڑ کر دیگر افسانوں میں کوئی میڑھ نہیں۔ عام قاری بھی اُن کی قرأت سے حظ اٹھا سکتا ہے جبکہ تربیت یافتہ قاری کے لیے اُن افسانوں میں اُس کے سوا بھی بہت کچھ ہے، جو تہہ در تہہ معنوی ابعاد کی پرتیں کھلنے سے ہی ہاتھ آئے گا۔

بلراج مین را کے افسانوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے قرأت کی سطح پر لطف اندوزی کے محدود اور روایتی مفہوم کو تج دینا ضروری ہے۔ بطور خاص پیکر تراشی کے حوالے سے مین را کا بیانیہ وہ نہیں جو اُن کے پیش رو رومانی اور ترقی پسند افسانے کے زیر اثر وجود میں آیا، نیز مین را کے کمپوز کردہ جملوں کی تشکیل میں لفظوں کی نشست و برخاست جداگانہ ہے:

''اور پھر میں نے دیکھا۔ میری تپتی ہوئی گھڑی میں ایک بج رہا تھا۔

بس کا دُور دُور تک کوئی نشان نہ تھا۔

میں تھا، دھوپ تھی، سڑک تھی اور بجلی کا کھمبا تھا اور زندگی کے اُس موڑ پر اُس لمحے، مجھے انتظار کرنا تھا۔ بس انتظار کرنا تھا۔''

(''بس اسٹاپ'' سے اقتباس)

عورت کی دنیا کے ضمن میں پطرس بخاری نے کہا تھا کہ یہ خواتین کا وصف خاص ہے کہ ان کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے اور ان شخصی اور ذاتی الجھنوں کا سلجھاوا بھی اپنے پھیلاؤ میں معرکے کی چیز ہے۔ لیکن پیش منظر کے افسانے میں یہ معرکہ کون مارے گا؟ قرۃ العین حیدر کے بعد نئے منظر نامے میں یک و تنہا خالدہ حسین کا نام ہے۔[1]

خالدہ حسین کے ہاں صنف نازک کا احساس عدم تحفظ بنیادی موضوع ہے جبکہ خوف، نفرت، اذیت اور تشکیک عورت کا ازل سے مقدر۔

عالمی سچائیاں ایک کے بعد ایک، رد ہوتی چلی جاتی ہیں، زندگی رفتہ رفتہ گزشتہ اقدار سے خالی ہوا چاہتی ہے۔ عدم تحفظ کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی خالدہ حسین کے افسانوں کا بنیادی طرز احساس ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں خوف، نفرت، اذیت اور تشکیک سر اٹھاتے ہیں۔ یہ سب اس کے باوجود ہے کہ خالدہ حسین کے بیشتر افسانوں کا منظر نامہ درمیانے درجے کے گھریلو ماحول سے ترتیب پاتا ہے۔ جانے پہچانے کردار فنکارانہ تدبیر کاری کے سبب تجریدی اور ماورائی فضا بندی کرتے ہوئے (مثال: ''سواری''، ''ایک رپورتاژ''، ''پہچان'') زندگی کے وسیع تر تناظر میں سوالیہ نشان بن کر پھیل جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ماورائی کیفیت سے سرشار بنتے ہوئے وقت کے وسیع تر تناظر میں ''ایک رپورتاژ'' ماتا کا استعارہ ہے۔ افسانے میں دھرتی کی حیرانی نے نیم کی تیلی بن کر لجلجے جسم میں کڑھے ڈال

دیے ہیں۔ یہ افسانہ ہجرت کے تجربے، جبر کی انتہائی صورتوں اور انا کی رواں منافقت کی تین پرتیں لیے ہوئے ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ خالدہ حسین کے دورِ اوّل سے متعلق افسانوں میں ''سواری'' کے بعد ''ایک رپورتاژ'' ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔

''مجھے چاول دو۔'' میں چارپائی سے اتر کر بیوی کے قریب آن بیٹھا۔ دونوں بچے کچھ الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے چھوٹے ہو گئے تھے اور آنکھیں بڑی۔ میری لڑکی کی پشت میری طرف تھی اور اس کے بال کمر تک آئے تھے۔ اس کی پشت بالکل میری بیوی کی سی لگتی تھی۔''

(''ایک رپورتاژ'' سے اقتباس)

ادبی منظر نامے سے تقریباً پندرہ برس الگ رہنے کے بعد خالدہ حسین کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوئیں اور یکے بعد دیگرے ''ڈیڈ لیٹر''، ''پرندہ''، ''سایہ'' اور ''مکڑی'' جیسے افسانے لکھ کر ایک بار پھر اُردو افسانے کی پہلی قطار میں نمایاں تر دکھائی دینے لگیں۔ اب ان کے افسانوں میں تصوف کا رچاؤ اور بالغ عصری شعور ایک انوکھے لحن میں ڈھل گیا ہے جس میں نہ مروج افسانے کی جھنجھلاہٹ ہے اور نہ شدت۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور اس میں روندے جانے والی نفسی کیفیات پر خالدہ حسین کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ قرۃ العین حیدر کے بعد یہ خوبی کسی خاتون افسانہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔

منشایاد نے پیش منظر کے افسانوں میں رواں فکری اور نظریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورتوں یا فلسفیانہ توجیہات کے مقابلے میں حجاب، سرگوشی، اسرار اور گم شتگی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ اس کے ہاں کرداری سطح پر گہری نیند سے چونکنے اور نظارے کی تاب نہ لاتے ہوئے مضمحل ہو کر دوبارہ آنکھیں میچ لینے کی معصوم خواہش اور کوشش دکھائی دیتی ہے (مثالیں: ''دھوپ، دھوپ، دھوپ''، ''تماشا''، ''راستے بند ہیں۔'' اور ''پانی میں گھرا ہوا پانی'')۔

منشایاد کی افسانہ نگاری کا آغاز سیدھے سادے بیانیہ افسانے سے ہوا اور 1970ء کے لگ بھگ تشبیہاتی، علامتی اور تجریدی تدبیر کاری کے تحت ان کے ہاں فرد کے آشوب نے موضوعی سطح پر اہمیت حاصل کی۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے ''بند مٹھی میں جگنو'' (1975ء) کے دس افسانے خصوصاً ''سورج کی تلاش''، ''سانپ اور خوشبو'' اور ''تیرھواں کھمبا'' اسی دور کی یادگار ہیں۔

1975ء کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں ''ماس اور مٹی''، ''خلا اندر خلا'' اور ''وقت سمندر'' میں منشایاد علامت نگاری سے متعلق اپنا ایک رنگ وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ''راستے بند ہیں''، ''ماس اور مٹی''، ''پانی میں گھرا ہوا پانی''، ''کچی پکی قبریں'' اور ''تماشا'' جیسے نمائندہ افسانوں میں ان کا طاقتور منظر نامہ دیہات سے متعلق رہا ہے۔ اسی منظر نامے سے چنے گئے کردار خصوصاً کوڈو فقیر، علیا نائی، مادو، شیدو مہترانی، صادو ترکھان اور گاؤں کی منڈیروں پر بیٹھے کاگ کی جگ بیتی کو منشایاد نے ''ہڈ بیتی'' بنالیا ہے:

''میری اس کی دوستی بھی تو کہانی ہی کی بدولت ہوئی تھی۔

ماں جی نے بتایا تھا کہ ایک روز اس نے چڑیا کے ساتھ مل کر کھچڑی پکایا۔

چڑیا دال کا دانہ لائی اور وہ چاول کا۔ کھچڑی پک گیا تو چڑیا نے اسے کنوئیں سے پانی لانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ پانی بھر کر لوٹا تو اس دوران میں چڑیا پوری ہانڈی چٹ کر کے چکی کے نیچے چھپ گئی۔ پھر جب اس نے ہونڈا جلایا تو چیخنے چلانے لگی۔ ''ہائے ہائے میرا ہونڈا اسڑیا۔

کیوں پرایا کھمڑ کھاہدا۔''

ماں جی کہانی سناتیں تو میں چڑیا کی چیخیں سن کر زور زور سے ہنستا۔ زندہ مارنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

(''اپنا اپنا کاگ'' از خشایاد سے اقتباس)

پنجاب کے دیہی منظرنامے سے مطابقت رکھنے کے سبب زبان کے ورتارے کی سطح پر خشایاد نے پنجابی الفاظ کو موقع کی مناسبت سے برتا ہے۔ اس ضمن میں لسانیات سے خصوصی شغف رکھنے والے ناقدین کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں، اس کی منشایاد کو پروا نہیں۔ وہ تو کہانیاں بنتے چلے جا رہے ہیں اور اپنے آپ میں مگن اپنے افسانوی کرداروں کی زندگی بینے کے جتن میں جتلا ہیں۔

رشید امجد نے اسلوبیاتی سطح پر اپنے افسانوں کی بنیاد سادہ بیانیہ کے انہدام پر رکھی۔ یہ افسانوی تدبیر کاری کے مروجہ پیٹرن سے بغاوت، نئے موضوعات کی تلاش اور نئے پن کی جستجو تھی۔ فرسودہ افسانوی پلاٹ اور روایتی بیانیہ سے برگشتہ اس ''نئے'' افسانہ نگار نے انبوہِ کثیر میں کھوئے گئے ''میں'' کی تلاش، بے حسی کی لپیٹ میں آئے ہوئے معاشرت کے آشوب اور قومی تشخص کے متنوع مسائل کو موضوع بناتے ہوئے اسلوبیاتی سطح پر ایک انوکھا تشبیہاتی نظام وضع کیا، جس کا چلن اُن کے قریبی معاصرین (اعجاز راہی، حمید سہروردی، مظہر الاسلام، احمد داؤد اور طاہر نقوی) کے ہاں بھی دیکھنے کو ملا۔ یوں اتنے بہت سے کمپ فالوورز کا مل جانا، رشید امجد کو پیش منظر کے افسانے میں نمایاں کر دینے کے لئے کافی تھا لیکن رشید امجد نے اسی پر قناعت نہیں کی۔ وہ مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ اُن کے اوّلین افسانوی مجموعے ''بیزار آدم کے بیٹے'' (1974ء) میں شامل افسانہ: ''سمندر، قطرہ، سمندر'' اُن کے افسانوی سفر کا پہلا اہم سنگِ میل تھا جب کہ افسانوی مجموعہ: ''ریت پر گرفت'' (1978ء) زوالِ ڈھاکہ کے بعد اٹھنے والے قومی نوعیت کے سوالات اور عالمی طاقتوں کے ہمارے سیاسی اور معاشی معاملات میں بڑھتے ہوئے عمل دخل کے حوالے سے بیزار آدم کے بیٹوں کی بیزاری کا ٹھوس جواز فراہم کرتا ہے۔ ہوا، دریا اور زمانہ...... یہ تین زور آور رشید امجد کے افسانوی آفاق کی تعمیر کرتے ہیں۔

''شام کی نیم تاریکی میں دُور سے آتے گھوڑوں کی چاپ اور غبار نے وقت کی گنتی کو اُلٹ پلٹ کر دیا۔'' (''دُھند سے نکلا دن'')

''ہوا، دریا اور زمانہ...... تینوں گورکن ہیں
اور ہم جو سانسوں کے چپوؤں سے
اس بے کنار، بے گنت سمندر میں
اپنے وجود کی کشتیاں کھے رہے ہیں
مدتوں سے
ہے اور نہیں کی بھول بھلیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں
اپنے ہونے کے احساس کا کڑوا پھل کھا رہے ہیں

(''نارسائی کی مٹھیوں میں'')

افسانہ: ''ڈوبتی پہچان'' رشید امجد کے تخلیق کردہ جادوئی حصار کو توڑ کر بین الاقوامیت کی ایک نئی قوس بنا رہا ہے، جس میں جغرافیائی

حد یں مٹتی جارہی ہیں۔ اس کے بعد رشید امجد کے افسانے گلوبل ویلیج کے عصری آشوب کے عکاس بن گئے۔

پیچھے مڑ کر دیکھیں تو افسانوی مجموعہ: ''سہ پہر کی خزاں'' (1980ء) کا ایک الگ لحن تھا۔ اسرار اور گم گشتگی..... سحر انگیز شعری منطق سے برآمد ہونے والی فضا، جس میں نامعلوم اور گمنام کا عکس، عصری تقاضوں کے تحت انگنت سوالات میں ڈھل جاتا ہے:

''ب ـــ چپ چاپ اُسے چائے پیتے دیکھتا رہا۔

اُس نے پیالی میز پر رکھ دی اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا: ''اس کے بعد ہم چپ چاپ اٹھے، خاموشی سے باہر آئے اور کچھ کہے بغیر اپنے راستوں پر ہولیے۔''

ب، اب بھی چپ رہا۔

''میں کیا کروں؟''

ب کے ہونٹ اُس کے چہرے میں دفن ہوگئے۔

''میں کیا کروں؟''

گہری الف خاموشی۔

اُس نے ب کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

ب، مٹی کے کھلونے کی طرح بُھر کر زمین پر بکھر گیا۔

سنسان، ویران سڑک پر دُھند چپ چاپ، قدم قدم چل رہی ہے۔''

(''سہ پہر کی خزاں'')

یوں دل دُکھانے والی تشکیک کو رشید امجد کی تخلیقی روش ہی کہیں گے۔

پیش منظر کے افسانے میں بلراج کومل موضوعی سطح پر تنوع کی ایک مثال ہے اور یہ تنوع تکنیک کا بھی ہے اور اسلوب کا بھی۔ جب کہ اس تکنیکی تنوع میں بلراج کومل کا بیانیہ کہیں زیادہ طاقتور دکھائی دیتا ہے (مثالیں: ''کنواں''، ''آنکھیں اور پاؤں''، اور ''تیسرا کتا'')۔ اس خصوص میں بلراج کومل نے خوف، دہشت اور اسراری کیفیات سے پُر منظر ناموں کا انتخاب کیا اور کمال ہنر مندی سے علامتی ابعاد پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے، جس کی خوبصورت ترین مثالیں ''کنواں''، ''سائے کے ناخن'' اور ''تصویر'' ہیں۔

بلراج کومل کے افسانوی کرداروں کی مشترکہ خصوصیت ان کا بے پناہ بھولپن اور معصومیت ہے اور ان کی یہی خصلت انہیں منافق اور بے چہرہ ہجوم میں گم نہیں ہونے دیتی۔ بلراج کومل نے ان کرداروں کی ان نفسیاتی الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جو محبت اور نفرت جیسے طاقتور جذبوں سے جنم لیتی ہیں، اس کی مثال افسانہ ''کنواں'' اور ''سائے کے ناخن'' ہیں۔ ''کنواں'' پھلانگنے کا ماہر گولنکر، خودکشی چاہنے والے نوجوان کے تلخ جوابات کے دوران ہمدردی اور لاتعلقی کے درمیان دیر تک جھولتا رہتا ہے۔ اور فیصلہ اس کا جسم کنویں پر سے گزرتے ہوئے قوس بنا کر کرتا ہے۔ تب خودکشی چاہنے والے نوجوان کا فوری ردعمل وہی ہوتا ہے جو گولنکر چاہتا تھا۔ جبکہ بلراج کومل نے افسانہ ''تصویر'' میں بوسیدہ کباڑ خانے کے ماحول میں سری نواس اور کارتک کے دو کرداروں کا مکالمہ دیا ہے۔ اول الذکر کباڑ خانے کا مالک ہے اور کارتک چلتے ہوئے کاروبار کا نیا خریدار۔ اس مکالمے سے ہوتے ہوئے بلراج کومل نے افسانے کے آخری پیراگراف میں نہایت چابکدستی کے ساتھ

افسانے کو ماورائی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے:

''کارتک نے اپنی نظریں تصویر سے ہٹا کر سری نواس کے منجمد چہرے پر گاڑ دیں اور تھوڑی دیر کے لیے خود بھی منجمد ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو تصویر کے شیشے پر چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت میں بہنے لگے۔''

اس مقام پر دونوں کردار دیکھی بھالی تصویر کے قیدی بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا وجود تحلیل ہو گیا ہے۔ اب وہاں محض بوسیدہ کباڑ خانہ ہے اور تصویر کے شیشے پر ندیوں کی صورت میں بہنے والے آنسو رواں ہیں۔

اسد محمد خاں کی افسانہ نگاری کا آغاز ''باسودے کی مریم'' اور ''ہے للا للا'' لکھ کر بیک وقت عجز اور غصے کی انتہائی صورتوں کے اظہار سے ہوا۔ ''باسودے کی مریم'' دم دے گئی، یہ کہتے ہوئے کہ: ''جی جی، سرکار میں آتی ضرور مگر میرا ممدو بڑا حرامی نکلا، میرے سب پیسے خرچ کرا دیئے۔'' جب کہ ''ہے للا للا'' میں راوی کا بیان ہے: ''استاد عاشق علی خاں مر گیا اور بکرے کی آواز والا ایم ایف رحیم زندہ ہے۔ اور آنکھ مارنے والی تسوفتی اور حقے کی ٹرٹری بجانے والا آرسول ڈکاسٹا اور متورم چہرے والا ہوموسیکچوئل پروڈیوسر اور چالیس ہزار نیم مردہ بیوروکریٹس زندہ ہیں۔''

''غصے کی نئی فصل'' (1977ء) کاٹنے سے پہلے اسد محمد خاں نے ''ترلوچن'' اور ''مئی دادا'' جیسے دو شاہکار افسانے لکھ لیے تھے، جن میں عجز اور غصہ ایک انوکھی ہیئت ترکیبی میں ڈھل چکا تھا۔ ان دونوں افسانوں میں معاشرتی ناہمواریوں کے حوالے سے کرخت معروضی صورت احوال کی پیشکش میں طنز، غصہ، جھلاہٹ اور درشت لب و لہجہ تو موجود ہے لیکن غارت گری نام کو نہیں۔ ''سرکس کی سادہ سی کہانی'' میں سیاست کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے لیکن نعرہ لگا کر نہیں۔ اسی طرح ''مردہ گھر میں مکاشفہ''، ''وقائع نگار'' اور ''گھس بیٹھیا'' میں موت کا موضوع پوری سفاکی کے ساتھ موجود ہے لیکن ہولناکی نام کو نہیں۔

اسد محمد خاں کے طوائفوں سے متعلق افسانے مجرے کی محافل میں سُر اور ٹھمکا لگانے والی بے کسی کی تصویروں اور تنگ و تاریک کوٹھوں میں رات دن بے رحمانہ جسمانی مشقت جھیلنے والی بے بس عورتوں کے ذکر سے خالی ہونے کے سبب منٹو اور رحمان مذنب کے افسانوں کے مقابلے میں مختلف فضا کے حامل ہیں۔ درحقیقت اسد محمد خاں کے افسانوں کا جادو، جو سر چڑھ کر بولتا ہے، عطا ہے اُن کی بے پناہ زبان دانی کی۔ پھر یہ کہ اُن کے افسانوں کے راوی کے بیان میں ایک لااُبالی پن ہے۔ مروج ڈھرے کی زندگی سے پیدا شدہ کرداری خصلتوں سے الگ، یکسر جداگانہ:

''ایک پہر رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آیا اور یہ دیکھا کہ کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا ہے اور اس کی پیٹی اوندھی پڑی ہے۔ کوئی کٹے کا مُوت اُس کی فہرست چرا کر لے گیا تھا۔'' (''ترلوچن'')

''میں نے اکثر مئی دادا سے اُس تینچے کا ذکر سنا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے پہل کسی حرامی ازل گر بھتا بھان کے گھوڑے نے اُسے چرا لیا۔'' (''مئی دادا'')

اسد محمد خاں نے جنوبی ایشیاء کی تاریخ سے کچھ ایسا مواد چنا، جس کے ڈانڈے کرداری سطح پر نسلی افتخار سے بھی جڑے ہوئے ہیں، جیسے افسانہ: ''یوم کپور'' میں اہلِ یہود سے نسبت یا مغلوں کے مقابلے میں شیر شاہ سوری کی چڑھت۔ یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ اسد محمد خاں کو کٹھ ملائیت سے چڑ ہے۔ بیوروکریسی اور ہیئت حاکمہ سے خاص طرح کی کد۔ اس سارے سے ایک انوکھا ڈراما تشکیل پاتا ہے، جو اسد محمد خاں کے

افسانوں کی پہچان ہے۔

فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''مرزا حامد بیگ نے خاص معاشرتی سیاق وسباق میں انسانی لاشعور کو نہیں بلکہ اس کے شعور کو کھرچنے اور اس سے منسلک ذہنی رویوں اور سوچ کی لہروں کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ پہچان کے اس سلسلے میں تنقیدی زاویہ نگاہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ دکھایا ہے کہ گزرے ہوئے زمانے اور گزرے ہوئے لوگ عصری شعور پر اپنی گرفت رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو دہراتے اور یاد دلاتے رہتے ہیں۔

حامد بیگ نے بیانیہ میں عمل پر نسبتاً کم اور محرکات پر زیادہ زور دیا ہے۔ حسد، ہوس، طبقاتی امتیازات، جھوٹے اعزازات، مصنوعی شان وشوکت اور خاندانی وجاہت وغیرہ کو مصنف نے مجموعی افسانوی کشمکش کے فوری محرکات کے طور پر برتا ہے۔ انہوں نے اپنے کئی افسانوں مثلاً ''مغل سرائے''، ''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا''، ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' اور ''گمشدہ کلمات'' وغیرہ میں ماضی بعید سے متعلق واقعات، تجربات اور رسومات کو جدید استعاراتی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانیاں ماہ وسال کی حدود کو توڑ کر ان زمانوں اور ان انسانوں تک پہنچتی ہیں جو ظاہر ہے کہ اب نہیں رہے لیکن جب جن سے (ردو قبول سے قطع نظر) افسانہ نگار کو بہر حال ایک طرح کی جذباتی اور اخلاقی ہمدردی ہے۔ یہیں سے ان افسانوں میں موضوع، کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک حامد بیگ کے تہہ دار اور پیچیدہ استعاراتی اسلوب کا تعلق ہے یہ واضح کردوں کہ ان کے اس اسلوب کا تعلق تجریدی معنویت سے نہ ہو کر تجرباتی معنویت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں لفظی ابہام کے بجائے معنیاتی ابہام نظر آتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں، منتخب اور منفرد لفظیات اور خوب صورت استعاروں کی مدد سے اپنے لیے ایک ایسا نستعلیق اسلوب وضع کیا ہے، جو ان افسانوں کو پڑھنے اور پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے قاری سے بھی کم از کم ثقافتی اور لسانی سطح پر نستعلیق ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا نثری اسلوب بنیادی طور پر نہایت ہی پُرسکون، نرم اور مدھم ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں شوریدہ اور برانگیختہ جذبات کا اظہار بھی نرم، غیر جذباتی لیکن مؤثر انداز میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی افسانے یوں شروع یا ختم ہوتے ہیں:

(الف) شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے، اور وہ دونوں ملگجے اندھیرے میں دھندلائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے ہیں۔

(مغل سرائے)

(ب) وہ ایک ایسی ہی خنک شام تھی اور میرے دروازے پر گرتے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

(دھوپ کا چہرہ)

(ج) بادلوں کے رنگین بجرے شفاف نیلے آسمان پر تیر رہے تھے۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا، اور دریا ایک حد تک پُرسکون تھا۔

(گمشدہ کلمات)

واضح رہے کہ مظاہر فطرت کی طرف حامد بیگ کا رویہ سائنسی یا آرائشی نہ ہو کر حیاتی اور فن کارانہ رہتا ہے...... بسا اوقات بیانیہ اور

مناظر متوازی دھاروں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بیانیہ کرداروں کے حالات اوران کے خارجی اعمال کا احاطہ کرتا ہے جب کہ منظر کا تعلق ان کے احساسات، شعور، لاشعور اور ماحول سے ہوتا ہے۔ دونوں مل کر تاثر کی وحدت کی تشکیل اور تکمیل کرتے ہیں۔'' ۳



حوالہ:

۱۔ اوّلین قلمی نام: خالدہ اصغر

۲۔ ''ایک رپورتاژ''مطبوعہ''سویرا''لاہور خالدہ اقبال کے قلمی نام سے لکھا گیا۔

۳۔ بہ حوالہ:''جواز''مالیگاؤں، بھارت شمارہ نمبر22بابت اکتوبر1984ء تا اگست1985ء

پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر

(صادق الخیری، احمد شجاع، حکیم یوسف حسن، حامد اللہ افسر، اوپندر ناتھ اشک، ل۔ احمد اکبر آبادی، عظیم بیگ چغتائی، مجنوں گورکھ پوری، عبدالرحمٰن چغتائی اور عزیز ملک)

پس منظر:

ہمارے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کی روایت کے تسلسل میں، صادق الخیری کا نیا پن نئے تقاضوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے اور عورت کا نفسیاتی مطالعہ (مثالیں: ''در نا سفتہ'' اور ''غنچہ نارس'') مشرقی معاشرت اور عورت کے زندگی کرنے کا جتن، صادق الخیری کا موضوع خاص، یہاں اصلاح پسندی اور آزادی نسواں کی تحریک کا اثر معاشرت کی جکڑ بندیوں پر طنز کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مثال: ''نشیمن''

مجموعہ ''بلقیس'' کے تمام تر افسانے اور ''شمع انجمن'' کے افسانوں کی ایک معقول تعداد راشد الخیری کے گہرے اثرات لیے ہوئے ہے۔ جبکہ ''شمع انجمن'' سے ''دھنک'' کے افسانوں تک آتے آتے صادق الخیری کی شخصیت اپنے منفرد رنگوں کے ساتھ اظہار پانے لگی۔

بمبئی کے قرب و جوار میں پھیلے جزیروں کا رومانی ماحول صادق الخیری کے افسانوں کی فضا بندی کرتا ہے جبکہ کرداروں کی پیشکش دہلی کے سفید پوش گھرانوں کی طرف سے ہے البتہ اکا دکا افسانے (مثال: ''نگار خانہ چین'') شہر کی مصروف زندگی کی نمائندگی بھی کرتے ہیں جہاں سرمایہ اور مزدور کی کشاکش رومانی اثرات کو زائل کرتی ہے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان کا لوچ صادق الخیری کے افسانوں کا خاصہ ہے۔

علی محمود، وزارت علی، حکیم احمد شجاع اور حکیم یوسف حسن کے تمام تر افسانے اصلاح پسندی کی اسی روایت کا حصہ ہیں جبکہ احمد شجاع، حکیم یوسف حسن اور حامد اللہ افسر کے افسانے کرداری سطح پر خاص طرح کے معیار کی جستجو کرتے ہیں۔ حامد اللہ افسر کا افسانہ ''لاٹری کا روپیہ'' اور احمد شجاع کا ''اندھا دیوتا'' اس کی مثالیں ہیں۔ البتہ حکیم یوسف حسن (مجموعہ: ''سوسائٹی کے گناہ'' مطبوعہ: 1943ء) کے ہاں سماج میں مظلوم کے حال اور تلخ نوائی کے ساتھ انقلاب کی گونج بھی شامل ہو گئی ہے۔

اوپندر ناتھ اشک کا افسانوی مجموعہ ''ڈاچی'' انہیں اصلاح پسندوں کے اس گروہ میں شامل کر دیتا ہے۔ البتہ ان افسانوں میں ہندوستان کی سیاسی بیداری کا بہترین شعور ان افسانوں کی اہمیت بنا ہے۔

اس اخلاق سدھار، معاشرتی اصلاح کی روایت میں اکا دکا بکھری ہوئی مثالیں اور بھی ہیں۔ اس روایت میں یلدرم کے دو افسانے ''ازدواج محبت'' اور ''نکاح ثانی'' بھی شمار ہوں گے جن میں جنسی بے راہ روی کی نسبت بے لوث محبت کو کامیاب و کامران دکھایا گیا۔ دیگر مثالوں میں خواجہ حسن نظامی کا ''شہزادی کونمونیہ'' (مطبوعہ 1929ء نیرنگ خیال) نیاز فتح پوری کا ''کیوپڈ اور سائیکی'' ل۔ احمد کا ''بھینٹ''، عظیم بیگ چغتائی کا ''انگوٹھی کی مصیبت'' اور مجنوں گورکھپوری کا ''سمن پوش'' نمایاں ہیں۔ اس روایت کے رواں پس منظر میں عبدالرحمٰن چغتائی (مجموعے: ''کاجل'' اور ''لگان'') اور عزیز ملک کے نام نمایاں تر ہیں۔ چغتائی کا ''بہو'' اور عزیز ملک کا ''اچھری'' اس ضمن میں اہم افسانے ہیں۔



مترجمین:

19ویں صدی کا آغاز تھا اور اُردو افسانے کی نمو کا عہد، اور ترکی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں سے ترجمے کا زمانہ۔ اولین افسانے جو اُردو میں منتقل ہوئے، ترک افسانہ نگاروں خلیل رشدی اور مفاخر بے کے تھے اور انہیں ''نشے کی پہلی ترنگ'' (مطبوعہ ''معارف'' اکتوبر 1900ء) اور ''فطرت جوانمردی'' (مطبوعہ: ''مخزن'' جولائی 1901ء) کے ناموں سے سجاد حیدر یلدرم نے ترجمہ کیا۔

سجاد حیدر یلدرم، جلیل احمد قدوائی، حامد علی خاں، منصور احمد خاں، ل۔ احمد اکبر آبادی، محمد مجیب، محشر عابدی اور فضل حق قریشی کے طبع زاد افسانوں کے علاوہ ہر ایک کی اہمیت ان کے ترجموں کے باعث بھی ہے۔ یلدرم نے ترکی ادب جبکہ جلیل قدوائی اور محمد مجیب نے روسی افسانے کے ساتھ چیخوف کو اُردو میں متعارف کروایا۔ حامد علی خاں نے انگریزی اور فرانسیسی کی چیدہ تخلیقات کا ترجمہ کیا اور بودلیئر کو متعارف کروایا۔ منصور احمد خاں نے انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور جاپانی زبانوں سے ترجمے کیے۔

یلدرم، مہاشہ سدرشن، جلیل احمد قدوائی، حامد علی خاں، ل۔ احمد، محمد مجیب، محشر عابدی، فضل حق قریشی، عبدالقادر سروری، ظفر قریشی جیسے اہم اولین ترجمہ نگاروں کے بعد مولوی عنایت اللہ، محمد حسن عسکری، منٹو، انور عظیم، ظ۔ انصاری، محمد خالد اختر اور محمد سلیم الرحمٰن نے ترجمے کو تخلیق کا درجہ دلانے کی سعی کی۔

ترجمہ نگاروں میں مولوی عنایت اللہ (فرانسیسی خصوصاً اناطول فرانس) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (سنسکرت)، ڈاکٹر عابد حسین (یونانی)، منہاج الدین اصلاحی (عربی)، عزیز احمد (اطالوی)، محمد حسن عسکری (فرانسیسی: گستاو فلابیر اور ستاں دال)، ریاض الحسن (جرمن)، شاہد احمد دہلوی (بلجیم خصوصاً مارس میتر لنک)، منٹو (روسی)، قرۃ العین حیدر (انگریزی، روسی)، ابن انشاء (امریکن، چینی، جاپانی خصوصاً ایڈگرایلن پو، بی شنگ اور موراساکی) انتظار حسین، انور عظیم، ظ۔ انصاری (روسی)، محمد سلیم الرحمٰن، منیر الدین احمد (انگریزی۔ جرمن)...... اپنی انفرادی حیثیت سے جو فن کار اُردو میں ترجمہ ہوئے ان میں گالز وردی (قاضی عبدالغفار) ٹیگور (سجاد ظہیر بنکم چندر چیڑ جی (مہاشہ سدرشن، فدا

علی خاں، جوالا پرشاد برق، شو برت لعل ورمن اور گوری شنکر لال اختر) لوشون (ہنس راج رہبر) خلیل جبران (بشیر ہندی۔ ابوالعلا چشتی اور حبیب اشعر) موپاساں (نوح فاروقی اور سید قاسم محمود) بالزاک اور ڈی۔ ایچ لارنس (سیدہ نسیم ہمدانی) کے نام نمایاں ہیں۔ (یہ فہرست قطعاً نامکمل ہے) یوں دنیا بھر کا افسانہ اُردو میں منتقل ہوا اور اُردو افسانے کی روایت میں نئے موضوعات کی پیشکش کے ساتھ تکنیک کے تنوع کا باعث بنا۔

ل۔ احمد اکبر آبادی اور جلیل قدوائی بعض اوقات ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی ملی جلی شکلیں سامنے لاتے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں یہ بات خصوصیت کے ساتھ روسی فضا بندی کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ ایک مثال ل۔ احمد کا افسانہ ''بیوی'' (مطبوعہ ''نقوش'') ہے۔ یہ مکتوباتی افسانہ روسی افسانہ نگار P.Romanov سے بحذف و اضافہ مستعار ہے۔ البتہ ل۔ احمد اور جلیل قدوائی (مجموعہ: ''اصنام خیالی'') نے ایسی کہانیوں کا چناؤ کرتے وقت اپنے مزاج سے مطابقت کا ضرور خیال رکھا ہے۔ مثلاً P.Romanov کے قلم کی کاٹ اور طنزیہ انداز ل۔ احمد کو بھی مرغوب ہے۔ نیز افسانوں میں اسی عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً کوثر چاند پوری (ابتدائی دور کے افسانے) اور طالب باغپتی کی طرح زندگی تک حقیقت پسندانہ رسائی کی کوشش، رومانی امگ لیے ہوئے ہے۔ یوں افسانوں کی بنت میں خاص طرح کا میکانکی انداز بھی در آیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا پسندیدہ موضوع معاشرتی سطح پر طبقاتی کشمکش رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے جذبات سے مغلوب صورت حالات پیش کرتے ہیں، جس سے افسانے کی تعمیر کا توازن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔



(راشد الخیری، سلطان حیدر جوش، پریم چند، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، اعظم کریوی، حکیم احمد شجاع، قاضی عبدالغفار، حجاب امتیاز علی، رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر)

مادر سری نظام زیست سے لے کر موجود لمحے تک بطور موضوع ''عورت'' سربستہ راز چلی آتی ہے۔ سو اس موضوع کے اجتماعی نوعیت کے سوالات کو حل کرنے کے لیے بھی بہر طور خاتون افسانہ طراز کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی۔ ورنہ ہوگا کیا کہ عورت کا موضوع موپاساں اور منٹو کے ہاں بعض ہیجانی جذبات کی تصویر کاری بھی سامنے لائے گا اور عورت کی تضحیک بھی، اور یہ کام منٹو کے ہاں نظر آئے گا جس نے اس موضوع کو ہمہ وقتی کام سمجھا۔ ورنہ تو صاحب ناول نگار السٹر میکلین اپنی تخلیقات میں عورت کا ذکر محض اس لیے نہیں کرتا کہ عورت کے کردار کی پیشکش کہانی کا ٹیمپو مجروح کرتی ہے اور دوسری طرف ہنری جیمز نے کہا اور شاید ٹھیک ہی کہا کہ فکشن لکھنا خواتین کے بس کا روگ ہی نہیں۔

کنواری لڑکی آدھی بند کتاب ہے اور دیکھا جائے تو باقی زندگی میں عورت جس قدر اپنے آپ کو فکشن تخلیق کرنے کے قابل بنا پاتی ہے، اس کے مقابلے میں جنس مخالف یا صنف کرخت کٹھن پہاڑ سر کر لیتی ہے، موضوع سے تکنیک، منفرد اسلوب اور نغمگی کی دریافت تک۔ اس طرح تخلیقی اعتبار سے پوری عورت بننے تک کا وقفہ عورت کے نجی موضوعات اور محسوسات کی لولی لنگڑی تصویر بنا پایا ہے اور بعد کی زندگی میں موضوعات کی گھمبیرتا کو تخلیق کار خاتون اس کی شایان شان ٹریٹ منٹ (Treatment) نہیں دے پاتی۔ نتیجہ کے طور پر ادھوری تخلیقات کے انبار لگتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے یعنی اولاً موضوعات کا محدود دائرہ کار۔ ثانیاً موضوعاتی دائرہ کار کی یکسانیت

جع تکنیکی شعور سے شدید کی حد تک روابط اور تلاش موضوعاتی دائرہ کار کی وسعت کے مقابل محدود تدبیر کاری۔ منفرد اسلوبیاتی سطح تک رسائی تو بعد کی منزل ہے۔ ایسی منزل جس تک بہت کم خواتین تخلیق کاروں کی رسائی ممکن ہوئی۔

ہوا یوں کہ اُردو افسانہ اپنی ابتدا میں ہی طبقہ نسواں کی آزادی اور اصلاح و بہبود کی راہ پر انتہائی دردمندی کے ساتھ نکل چلا۔ ''عورت'' کا موضوع راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش کے ہاں نذیر احمد کی جائز جانشینی اور رومانویوں کے ہاں رومانوی مثالیت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ عورت کا تصور یلدرم کے ہاں زندگی کا محور اور پریم چند کے ہاں سراسر وفا سے عبارت تھا۔ نیاز کے ہاں عورت کا تصور اکتساب لذت کا باعث ہے جب کہ علی عباس حسینی کے ہاں یہی تصور محض کہانی میں المیہ تاثیر پیدا کرنے کا ذریعہ۔ مجنوں گورکھپوری اپنی عالمانہ بردباری اور عورت کے مسحور کن تصور کے درمیان ڈانواں ڈول رہے جبکہ اعظم کریوی نے عورت کے تصور کے نام دیہات کا سارا رومان انتساب کیا۔ ایک طرف آزادی نسواں کی تحریک چل رہی تھی اور چودھری محمد علی ردولوی نے کہا تھا..... ''عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی۔''

اس قول کے پیچھے رومانی اثرات بھی نمایاں ہیں لیکن دراصل اس کا باعث:

''راقم الحروف انانیت کا شکار، باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے۔ ''میں'' کے استعمال سے پریشان ہے مگر ''میں'' اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔''

(محمد علی ردولوی ''میرا مذہب'' مطبوعہ 1938ء)

یہی موضوع افسانے میں ادب لطیف اور رومانویوں کے نئے نثری آہنگ کا باعث بھی ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا:

''کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نثر میں شاعری کرنا چاہتے ہیں اس حسن کے ذکر سے تائب ہو جائیں۔''

(مقدمہ کیوپڈ سائکی)

احمد شجاع نے تو اسی موضوع کی پیشکش کے لیے مصور اور شاعر ہونے کی آرزو کی لیکن آزادی نسواں کی تحریک اور اصلاح پسندی کے جذبے تلے اس کی شاعرانہ نثر کراہ کر رہ گئی۔ قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' لکھ کر اصلاح پسندی اور رومان کو یکجا کیا اور بعد میں کھری حقیقت پسندی کے تحت جنسی جکڑ بندیوں سے بغاوت کا اعلان ''تین پیسے کی چھوکری'' میں کر دیا..... اس سے آگے افسانے میں سگمنڈ فرائیڈ، لارنس اور فلابیر کا دائرہ کار تھا۔ حجاب امتیاز علی، رومانی نقطہ نظر اور ڈاکٹر رشید جہاں، لادین انقلابی افکار لے کر ظاہر ہوئیں تو رومانی مثالیت کے متوازی دوسری رو رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے حوالے سے چل نکلی۔ تب سے اب تک خواتین لکھنے والیوں کا ایک مروج دھڑا رومانی ہے جو حمیدہ نسیم کی پوچ جذباتیت تک چلا آیا ہے اور دوسری مقبول ترین راہ عصمت کے بعد واجدہ تبسم نے نکالی ہے۔

زمینی بو باس کے ساتھ عورت کے احساسات اور جذبات کی اٹھان پر عصمت چغتائی کی نگراں آنکھ کھری تصویر کشی کر پائی ہے اور دوسرا بڑا نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔

رواں پس منظر:

اس روایت کے رواں پس منظر میں رحمان مذنب، ہاجرہ مسرور، واجدہ تبسم اور خدیجہ مستور کا پسندیدہ موضوع، سماجی ناانصافیوں میں

گھڑی ہوئی عورت ہے۔ رحمان مذنب کے ہاں طوائف کے گردو پیش کے ماحول کی جذئیات توجہ طلب ہیں۔ (''گوری گلاباں''، ''لال چوبارہ''، ''چڑھتا سورج''، ''باسی کلی'') تکنیکی اعتبار سے ان چاروں افسانہ نگاروں کا ابتدائیہ عصمت چغتائی کی طرح جزئیات نگاری کے سبب خاموشی کے ساتھ رفتہ رفتہ پھیلا ہے اور آخر میں منٹو کے افسانوں کی طرح یکلخت سکڑ کر یا نئی ترتیبی ہیئت اختیار کر کے چونکا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں کی مقصدیت احتجاج سے بغاوت تک آ جاتی ہے۔

تسنیم سلیم چھتاری اور رضیہ فصیح احمد کی انفرادیت ان کے نسوانی کرداروں کی Isolation اور معروضیت میں ہے۔ یہ سفید پوش طبقے کے سماجی اور نفسیاتی مسائل میں سے گزرتی ہوئی عورت کی سچی تصویر کشی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے کچھ افسانے خارجیت اور معروضیت میں توازن کی مثالیں سامنے لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چھتاری کا ''کاش'' اور رضیہ فصیح احمد کا ''موڑ'' ادھیڑ عمر خواتین کے ایسے کردار سامنے لاتے ہیں جو زندگی کی مار کو تنہا سہہ رہی ہیں۔ ان افسانوں میں خلوص کا جذبہ اور گھریلو روزمرہ زندگی کی صداقتیں خاصے کی چیز ہے جبکہ رضیہ فصیح احمد کا افسانہ ''سرخ پلنگ پوش کی رات'' عورت کے ان جذبات کا اظہار ہے جن کی پیشکش مرد کبھی نہیں کر پائے گا۔

جمیلہ ہاشمی، شکیلہ اختر، جیلانی بانو، صدیقہ بیگم سیوہاروی، الطاف فاطمہ اور نکہت حسن کے ہاں یہ موضوع معاشرتی اقدار کی تبدیلی کے احساس کے ساتھ اس حیرت کی جانب مڑ گیا ہے جو داستانوی اسلوب کی بنیاد، لوک دانش کا خاصہ ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ہاں کھری سکھ معاشرت کا جادو سر چڑھ کر بولا ہے جبکہ شکیلہ اختر اور جیلانی بانو کے افسانوں میں عورت کی ابنارمل نفسیات کا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ صدیقہ بیگم کے بیان کی شگفتگی اور ہندی گیت کی خاص فضا بندی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

الطاف فاطمہ کی بامحاورہ زبان اور ملازمت پیشہ نسوانی کردار نگاری خصوصاً عورت کے تجرد کی زندگی کا تجربہ بے مثال ہے (مثال: بیچلرز ہوم)۔ شکیلہ اختر، جیلانی بانو اور الطاف فاطمہ کے افسانوں کو ان کے جذباتی لہجے نے نقصان پہنچایا۔ اس کی ایک وجہ ماتا کا شدید جذبہ ہے جس کی مثالیں شکیلہ اختر کے ''آشا''، جیلانی بانو کے ''ادھوری بات''، ''اکیلا'' اور الطاف فاطمہ کے ''آگیا بیتال'' سے ملتی ہیں جب کے بعض افسانوں میں بچوں کی صورت میں آسودگی حاصل کرنے کی تمنا بھی در آئی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر، اختر جمال اور آمنہ ابوالحسن کے افسانوں کا خصوصی موضوع متوسط گھرانوں کی روزمرہ زندگی سے عبارت ہے جس میں یکا یک نمودار ہونے والے ان ہونے واقعات فرد کی زندگی کو تلپٹ کر رہے ہیں۔ نمائندہ مثالوں میں رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ ''نئی نویلی''، اختر جمال کا ''چکن کا کرتہ'' اور آمنہ ابوالحسن کا ''ستون'' ہیں۔ افسانہ ''ستون'' کی باغی لڑکی نفیسہ کا کردار ان تینوں افسانہ نگاروں کے ہاں بندھے ٹکے روایتی حالات کو کروٹ دینے کا باعث بنتا ہے۔

امرتا پریتم کے افسانوں میں پنجاب کی رہتل اور افسانوں میں امرتا پریتم کے اپنے کردار کی جلوہ نمائی ہمیشہ قابل توجہ رہی ہے۔ اس کی ایک مثال افسانہ ''زندگی کا باقی'' ہے، جس میں شری دیودت کی بیوہ چیتنا کماری اور امرتا پریتم ایک ہی کردار میں ڈھل رہی ہیں اور یہی امرتا پریتم کا جامع الحیثیات کردار ہے۔ اور ''شاعر یگ راج'' دراصل ساحر لدھیانوی ہے۔ اب جبکہ ''رسیدی ٹکٹ'' میں خود امرتا پریتم نے اس پرانی محبت اور عقیدت کا برملا اظہار کر دیا ہے تو اس افسانے میں رواں دکھ اور رومانوی فضا کا تاثر دوچند ہو گیا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں نے خالصتاً نسوانی احساسات کا ایک وسیع پنورا ما ترتیب دیا ہے جو انفرادی سطح کے احساسات سے کنبہ اور پھر خاندان سے پھیل کر پوری نسوانی برادری (یا بہناپے) تک یہ دائرہ پھیل گیا ہے۔

رواں پس منظر میں محمد احسن فاروقی، آغا بابر، رام لعل اور راجندر سنگھ بیدی نے خاص طور پر جنس مخالف کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔
اس ذیل میں محض بیدی کے افسانوں سے مثالیں دیکھیے: لمبی لڑکی، ٹرمینس سے پرے، جوگیا، ببل، متھن، دیوالہ، لاجونتی، گرہن، اغوا، وہ بڈھا
اور حادثات ہندو معاشرت میں عورت کے ہر ہر زاویے کے عکاس ہیں:

''وہ اداس تھا، اور یوں ہی ادھر بھٹک رہا تھا،

وہ اکیلی تھی اور پارک کے پاس سوکھی زمین پر بیٹھی تھی......

اور سامنے کئی بچے کھیل رہے تھے۔

وہ چاہتی تھی، کوئی راہرو اسے بلائے، اور اس سے باتیں کرے۔ خود بلانے کی ابھی ہمت نہ تھی۔

وہ لڑکی تھی۔

لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے اور پھر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے......

''یہ لڑکی یہاں، اکیلی بیٹھی ہے؟''

گویا مرد کے لیے اکیلے ہونے کا تصور بندھ سکتا ہے، عورت کا نہیں......شاید یہ ٹھیک ہی ہے، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اکیلا پاتے ہی دو ہو جانے کی کوشش کرتا ہے......

اداس لڑکا بھٹکتا ہوا وہاں آ نکلا......اور پھر وہی......

''یہ لڑکی یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہے؟''

پھر اس نے مڑ کر دیکھا، لڑکی نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور اپنی ہی ابروؤں، اپنی پلکوں کے سایوں میں بیٹھی مسکراتی رہی۔

''ہو گی!''

......لڑکے نے سوچا، اور چلا گیا

......یہ ترسی ہوئی دھرتی، وہ ابر کا ٹکڑا،

اور یہ حوادث کی ہوا......

کچھ دور جا کر لڑکے نے سوچا......

''مگر وہ اکیلی کیوں بیٹھی تھی۔''

اور وہ لوٹ آیا

لڑکی کی پیشانی پر تیور تھے......

لڑکے نے اسے ایک عام بدمزاج لڑکی سمجھا، اور چلا گیا......

بات صرف اتنی ہی،

تم نے پہلے کیوں نہ مجھے بلایا؟''

یہ ازل سے اکیلی، وہ ابد تک اداس

اور سامنے کئی بچے کھیلتے رہے،

(مکمل افسانہ: ''حادثات'' بیدی)

اب شوخی بیان کے حوالے سے پسند نام:

''مبل اور میں'' پطرس بخاری کا واحد مضمون ہے جسے افسانہ تسلیم کر لیا گیا، البتہ ''عشق کی خودکشی'' ابتداء میں ہی باقاعدہ افسانے کے طور پر شائع ہوا۔ پلاٹ اور باقاعدہ کردار نگاری کے فقدان کے باعث پطرس کی باقی تحریریں کبھی مضمون کہلائیں اور کبھی انشائیے، جب کہ میں ''ہاسٹل میں پڑنا''، ''سویرے۔ جو کل آنکھ میری کھلی'' اور ''مرید پور کا پیر'' کو افسانہ ہی سمجھتا ہوں، اگرچہ یہ مسئلہ ہمیشہ باعث نزع رہا ہے اور شاید مزید کچھ مدت رہے۔

''مبل اور میں'' میں پطرس نے ظاہر و باطن، اصلیت اور امر واقعہ کے تضاد سے زندگی کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اور یہی پطرس کی تحریر کا وصف خاص ہے۔ ہلکا طنز، بذلہ سنجی اور موضوعات کا دائرہ لامحدود۔

شاہد احمد دہلوی کا ''تقلید شباب'' ظفر قریشی دہلوی کے افسانوں کے تین مجموعے ''نئے محل''، ''گزرگاہ خیال'' اور ''دریچے'' اور سراج الدین ظفر کا افسانوی مجموعہ ''آئینے'' (مطبوعہ 1943ء) اپنے طنزیہ (''مولانا''، ''جنت بوالہوس کی'') اور مزاحیہ افسانوں (''رانجشش''، ''الف لیلیٰ کا ایک باب'') کے سبب یادگار ہیں۔ اسی ذیل میں کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ ''گھونگھٹ میں گوری جلے'' اور امتیاز علی تاج کی مزاحیہ کردار نگاری (خصوصاً چچا چھکن) آتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کا افسانوی مجموعہ ''کہتے ہیں جس کو عشق'' رومانی ادب پر شدید طنز کے سبب یادگار ہے۔ اس روایت کے رواں پس منظر میں ست پرکاش سنگر (''ہم بیاباں میں ہیں اور'')، اشفاق احمد (''چچا سام کے دیس میں'')، اعجاز حسین بٹالوی (''سرد خانہ'') اور مشتاق قمر (''کنویں میں گرا ہوا آدمی'') نمایاں ہیں۔

اُردو افسانے کے دوسرے دور میں جس طرح عسکری، منٹو، مفتی، عصمت اور شیر محمد اختر کے ہاں انسان کی جنسی جبلت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اسی طرح آغا بابر (مجموعہ: اڑن طشتریاں، چاک گریباں اور لب گویا) میرزا ریاض (مجموعہ: آندھی میں صدا) سید امجد الطاف (مجموعہ: ''کچے دھاگے'') اور ضمیر الدین احمد (مجموعہ: ''سوکھے ساون'') ابنارمل جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جب کہ سلیم اختر کے ہاں مردانہ اور زنانہ ہم جنسی کے میلان کا مطالعہ (مثال: ''پابندی وقت'') اور جنسی کجرویوں کے محرکات کی تلاش ملتی ہے۔ مثالیں ''جلے پاؤں کی بلی''، ''بکری'' اور ''پاؤں کی جنت'' سلیم اختر کے ہاں بلی، پاؤں اور گندے پانی کی موری کی جنسی علامات توجہ طلب ہیں۔

بڑے شہر کی تاجرانہ ذہنیت کس طرح انسانی اقدار کی صورتیں مسخ کرتی ہیں اور مجرم کرداروں کے ساتھ خیر چاہنے والے کردار کیسے ہیں جو نیکی اور پاکیزگی کے خواب دیکھتے ہیں؟ ان سب کی تصویر کاری احمد عباس اور کرشن چندر کے بعد کوثر چاند پوری، حیات اللہ انصاری، اختر اور ینوی، سید فیاض محمود، عبدالرحمٰن چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، کشمیری لال ذاکر اور مہندر ناتھ کے افسانوں میں ایک معیار قائم کرتی ہے۔

ان افسانہ نگاروں نے شہر کی غالب آبادی (متوسط اور نچلا طبقہ) کی حسرتوں، محرومیوں اور گراوٹوں کو اپنا موضوع بنایا، اس ذیل میں حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش''، کوثر چاند پوری کا ''میرا پیشہ'' اور ''چاندنی کا سفر''، اختر اور ینوی کا ''جونیئر''، سید فیاض محمود کا ''کام

چور''،رضیہ سجاد ظہیر کا''نئی نویلی''،ممتاز شیریں کا''کفارہ''،حسن منظر کا''ندیدی''،عبدالرحمٰن چغتائی کا''لت پت''،محمد عمر میمن کا''تاریک گلی''، اوپندر ناتھ اشک کا''بیمار سی کلی''،کشمیری لال ذاکر کا''میرا آنچل میلا ہے''اور مہندر ناتھ کا''چاندی کے تار''یادگار افسانے ہیں۔

اس روایت میں کشمیری لال ذاکر اپنے موضوعات کے تنوع اور افسانوں میں خاص طرح کی بھائی چارے کی فضا کے باعث خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔''میرا آنچل میلا ہے''،''پہلا دن''اور''طلاق''کے مرکزی کرداروں میں دان کرنے کا جذبہ اس کے افسانوں میں فروعی قسم کے اختلافات کے باوجود قومی یکجہتی کے جذبے کے تحت، رنگ، نسل اور نظریے کے تفاوت کو کم کرتا ہے۔ ذاکر کے کرداری افسانے ہندوستان کی مضبوط تہذیبی بنیادوں سے اپنے رنگ اور عادتیں چنتے ہیں اور اکثر افسانوی کردار اپنے مشترک قومی ورثے کے ہوشیار محافظ ہیں جبکہ مہندر ناتھ کا مجموعہ''چاندی کے تار''بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کی معاشرت اور شہر کے متوسط طبقے کی جوان آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان رہا ہے۔

اس روایت کے رواں پس منظر میں بیشتر افسانے شہر کی مصروف زندگی کے کسی ایک رخ کی بجائے کُل کو ناول کے انداز میں سمیٹنے کی کامیاب کوششیں ہیں۔ان پیش کاروں میں رتن سنگھ، سید قاسم محمود، سلیم اختر اور کلام حیدری نمایاں ہیں۔

رتن سنگھ اس روایت میں مختصر ترین افسانہ لکھنے کے سبب نمایاں ہے اور اس کے ہاں شہری زندگی کی معمول سے ہٹی ہوئی گھڑیوں اور اجنبی ساعتوں کی کامیاب پیشکش اس کے شاداب لہجے کے سبب ہے۔ مثالیں:''دکھ کی عمر''اور''آخری اداس آدمی''۔سید قاسم محمود کا موضوع نجاستوں کی لپیٹ میں آیا ہوا شہر ہے۔قاسم محمود نے اس شہر میں مقدور بھر خیر کی جستجو کی ہے۔مثالیں:''دس پیسے''،''تانگے والے کی لڑکی''اور ''چیونٹی کا قاتل''۔اس دور میں سلیم اختر کے غیر روایتی تدبیر کاری کے افسانے نمایاں ہیں۔''بیلنس شیٹ''،''لولیتا 1969ء''،''محاذ 1971ء'' اور''مسٹر اینڈ مسز 1971ء''جیسے افسانے تکنیکی اعتبار سے اور''پابندی وقت کے فوائد''جیسے ان چھوئے موضوعات خصوصاً جنسی تلذذ اور ہم جنسی اور بہت الجھے ہوئے نفسیاتی مسائل (خصوصاً''آشوب چشم''میں کبھی کی طرف دوستی کا ہاتھ) جیسے افسانے سلیم اختر کو اس روایت میں بہت نمایاں کر دیتے ہیں۔کلام حیدری (مجموعہ:صفر) کے افسانوں میں''گیا''شہر کی زندگی قابل لحاظ ہے۔اس کے افسانے''زندگی''کا شوہر اور ''بخی''کا ایڈیٹر، گھر اور گھر سے باہر جس منافقت کا تانا بانا بنتے ہیں اس کی مکروہات کلام حیدری کے''سب سیاہ''اور''لا''میں ظاہر ہیں۔

دیہات نگاری کے ضمن میں، جمیلہ ہاشمی کے ہاں سکھ معاشرت کی کھری عکاسی، مدہم سریلے بول، کرداروں کی انا پینگی اور دھیمے دھیمے درد کی لے انوکھا اثر رکھتی ہے خوبصورت مثالوں میں''سرخ آندھی''،''لہو رنگ''،''آتما کی شانتی''اور''بن باس''ہیں۔جبکہ صادق حسین (مجموعہ:''پھولوں کے محل'') نے پوٹھوہار کے غیرت مند اور دلیر کرداروں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں سے بنے ہوئے حیران کر دینے والے ثقافتی مظاہر اور رومانی فضا کے افسانے لکھے ہیں جس کی ایک مثال''پونچھیاں''ہے جب کہ فہمیدہ اختر (مجموعے:''کشمالہ''،''اپنے دیس میں'') اور لطیف کاشمیری (نمایاں افسانہ:''رسل جو'') نے پہاڑوں کے دیہات، خصوصاً پشاور اور کوہ مری کی کھردری نفسیات کو اپنا موضوع بنایا۔

دوسری طرف، منفرد لینڈ اسکیپ کے افسانوں میں قاضی عبدالستار اور واجدہ تبسم نے بالخصوص جاگیردارانہ تمدن کی عکاسی کی ہے۔ان افسانوں میں قرن ہا قرن کے سماجی عوامل سے مرتب شدہ تہذیبی اقدار کا شعور آج کے عہد میں ایک Unique Approach ہے۔صرف واجدہ تبسم کے ہاں ہی خوبصورت مثالوں میں جاگیردار طبقے کا زوال''دیار حبیب''حویلی کی ڈھلتی ہوئی فصیلیں (گلستان سے قبرستان تک) اور باطنی طور پر جاگیرداری کی زوال پذیری کی مثال''ناگن''جیسے افسانے پیشکش کا معیار قائم کرتے ہیں۔

شہر سے نکلی یہ آگے بڑھتی ہوئی چاروں اطراف میں پھیلتی سڑک ان دیکھے اوران چھوٹے نسبتاً نیم تاریک رسوم ورواج اورروایات تک گھر کرگئی ہے۔

دیوندر ستیارتھی ''نگری نگری'' لیے پھرے،اور یہ خانہ بدوشی کی روایت مانک ٹالہ تک آتی ہے۔(مجموعہ ''پیاسی بیل'')مانک ٹالہ کے ہاں مصر کے اہرام اورافریقہ کے جنگل ...... پیرس اور بنکاک کی سڑکوں کے شور میں بولتے ہیں۔

سکھ معاشرت کی پیشکش جمیلہ ہاشمی (سرخ آندھی۔ بن باس) ہندوسماج۔خواجہ احمد عباس (''کرشن چندر کی محبوبہ'')مسلم معاشرت، عصمت چغتائی (چوتھی کا جوڑا) کرسچین معاشرت: پریم چند (عشق دنیا اور سیر درویش، نیز لندن کا مضافاتی علاقہ) محمد حسن عسکری (بیشتر افسانوی کردار) راج (سومنات کے بعد ...... پیغمبر کی موت) اعجاز حسین بٹالوی (سردخانہ) مقصود الٰہی شیخ (مجموعہ:''برف کے آنسو'' کے بیشتر افسانے) منیر الدین احمد اور خالد ابراہیم کے ہاں نمایاں ہوئی ہے۔جب کہ سرحدی اور قبائلی علاقوں کے قصے فہمیدہ اختر،مسعود مفتی اور سیدہ حنا نے لکھے بالترتیب ''کشمالہ''،''راضی نامہ'' اور ''تنہا اداس لڑکی۔''

شملہ کی پچی تصویر: اشفاق احمد (''بندر لوگ'') بلوچستان اور سندھ کی سیاسی اور معاشرتی صورت گری: نجم الحسن رضوی (چہروں کے پہاڑ۔ساڈھ بیلا میں اجنبی) ...... سون سکیسر کی جھلک: احمد ندیم قاسمی (الحمدللہ۔رئیس خانہ) کے ہاں ملتی ہے۔

رام لال اور رضیہ فصیح احمد کے ہاں سفرنامے اور رپوتاژ کی دھوپ چھاؤں انفرادی رنگ لیے ہوئے ہے۔

ہرچرن چاولہ کے ہاں یادوں کے حوالے سے میانوالی کا لینڈ اسکیپ اور سید انور کے ہاں سمندر کا سفر (بحر ہے پایاب مجھے)اور بندرگاہوں کے رومانی وقوعہ جات کے ساتھ متحدہ بنگال جلوہ گر ہوا ہے۔سید انور کو ایک شعلہ،ایک طوفان اور ایک زلزلہ کہا جاتا رہا ہے۔بحری سفر کے حوالے سے اس نے ہرطرف سلگتی ہوئی معاشرت میں Live کیا ہے۔مثال: مجموعہ:''آگ کی آغوش میں'' کے افسانے۔

اے حمید کے افسانے جذبہ محبت اور فطرت کی خوبصورتی کو باہم ایک کرکے ماورائی فضا ترتیب دیتے ہیں۔(دوگیت۔چاندنی رات میں سفر) خودسپردگی کے نشے میں سرشار افسانہ ''دیوداسی''،''گلاب اور دریا'' کے کردار اپنی نوع میں بہت معتبر ہیں۔اوراس کے افسانوں کی سحر انگیز فضاؤں میں ادھوری، ناکام محبتوں کی مدھم سریں اور رومانی یادیں۔اس کی ایک مثال افسانہ ''خزاں کا گیت'' ہے:

''کانسی کے گلدان میں لگی یوکلپٹس کی ٹہنیوں کوموم بتی کے قریب کردو اور چرچ مین کا سگریٹ سلگا کر ٹیبل لیمپ بجھادو اور پھر مجھے بتاؤ کہ یوکلپٹس کی کمسن ٹہنیوں کے پاس موم بتی کو روشن دیکھ کرتمہیں یوں نہیں لگتا جیسے گرتی برف میں آتش دان کے پاس بیٹھے کسی قدیم اندلسی موسیقار سے بچپن کا سوگوار گیت سن رہے ہو؟ میں بھی تمہیں بچپن کا ایک سوگوار گیت سنانا چاہتا ہوں۔یہ گیت سردیوں کی ایک ٹھٹھری سنسان گلی سے شروع ہوتا ہے۔جس میں ایک پرانے چھجے والے مکان کی کھڑکی میں چک کے پیچھے کشمیری شال میں لپٹا ہوا چہرہ ابھرتا ہے۔نسواری آنکھوں،ناک میں سرخ کیل اور براؤن ہونٹوں والا گرم چہرہ۔''

(''بارش میں یوکلپٹس کا درخت'' ازاے حمید)

محمد احسن فاروقی اوراحمد شریف کے ہاں کرخت حقائق کے علاوہ کردار کی سطح پر عجیب طرح کی غیر متوازن صورت حال قابل توجہ ہے۔

''نہایت معمولی چہرہ بلکہ معمولی سے بھی گراہوا، دھنسی کنپٹیاں، چھوٹی آنکھیں،گال پھولے ہوئے، ناک چپٹی تو نہیں مگر بہت چھوٹی۔''

یہ احسن فاروقی کے افسانے ''پتھر'' کی ہیروئن کا ناک نقشہ ہے جو تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ احمد شریف اوراحسن فاروقی کے بیشتر

نسوانی مرکزی کرداروں کی پہچان ہے۔ چاہنے والوں اور چاہے جانے کی خواہش کرنے والوں سے سماجی مرتبے اور عمروں کا تفاوت دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں عجیب وغریب صورتیں سامنے لاتا ہے۔ احمد شریف کے ہاں اس کی مثالیں: ''گھر میں اجنبی'' اور ''چھتر کاؤ گاڑی'' اور احسن فاروقی کے ہاں ''بھتنی لگتی ہے'' میں ہیں۔ ایسے مرکزی کرداروں کی پیشکش افسانوی کرداروں کی سطح پر روایت کی توسیع ہے۔ محمد احسن فاروقی نے جنسی نفسیات کے حوالے سے محبت اور بوالہوسی کے دوسرے بُعد تک کا سفر حیرت ناک کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ اور وہ جو سارتر کے مجموعے ''Intimacy'' کے بارے میں کہا جاتا ہے:

''محبت میں بوالہوسی کا ذہین مطالعہ'' تو یہ بات محمد احسن فاروقی کے افسانوی مجموعے: ''افسانہ کردیا'' پر پوری بیٹھتی ہے۔ احسن فاروقی کے افسانوں میں مٹی ہوئی تہذیب کے گم شدہ نقوش از سرِ نو اجاگر ہو کر افسانے میں خاص طرح کی جاذبیت کا باعث بنتے ہیں۔

ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی کے افسانے زبان اور تکنیک کے تنوع کے باوجود سماجی انصاف کی خواہش اور سنسنی خیزی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس روایت میں شوکت صدیقی کی منفرد مریض اور مجرم کردار نگاری (''راتوں کا شہر'' اور ''خلیفہ جی'') قابل لحاظ اس لیے نہیں رہتی کہ ان کے ہاں سماجی انصاف کی شدید خواہش، ان کے افسانوں کو مبالغے کی حدود تک لے جاتی ہے۔ شوکت صدیقی کے بعض افسانے تو سوشلسٹ افکار کے سٹڈی سرکل کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثال دیکھئے: ''ابوالہول کا سایہ'' کی ابتدا لینن کے قول سے ہوتی ہے:

''انقلابی قوتوں کو جب پوری طرح ابھرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ زندگی کے لیے زہراب بن جاتی ہیں۔'' یہ افسانہ اسی قول کی تشریح ہے۔ بھوکے، زندگی سے ہارے ہوئے زخمی سپاہی کا دن ڈھل رہا ہے۔ ''کرفیو آرڈر کی رات'' میں اس کی آخری ہچکیاں اس افسانے کا موضوع بنی ہیں۔ ایسے جذباتی مقامات پر شوکت صدیقی کے طنز کی زہرناکی نے ان کے افسانوں کو ضعف پہنچایا۔

ست پرکاش سنگر بھی اسی نسل سے متعلق ہے۔ اس کے ہاں یہ حادثہ گزرا ہے کہ افسانہ نگار اپنی حاضر جوابی اور ڈرامہ نگار طبیعت کی شگفتگی سے ایک پل بھی پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اس طرح افسانہ نگار کی نسبتاً اونچی سطح پر کھڑی ذات کے مقابل اس کا افسانہ نشیب میں اترتا چلا گیا۔ اس طرح ''گنگا اشنان'' اور ''ہم بیابان میں ہیں'' جیسے نمائندہ افسانوں کی تمام تر وتازگی جملہ بازی اور شگفتگی بیان میں دب کر رہ گئی۔

راج کے افسانوں میں کرسمس کی تعطیلات اور گرجے کا ماحول اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے بعض افسانے گرجے کے اثرات سے بہت دور نکل کر بھی لکھے جو غیر معمولی لمحات کی روداد ہیں اور محبت کے متعلقات اور نفسیاتی الجھنوں کے لامتناہی سلسلے۔ راج کے افسانوں کی زندگی ملی جلی معاشرت کی ہے، جس کے لیے اس نے کیمرہ تکنیک کا برتاؤ کیا ہے اور اپنے افسانوی کرداروں کو ہجوم میں سے چن کر ہجوم کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ایسے میں راج کے موضوعات کا نیاپن اور اسلوب کی ندرت اہمیت کی حامل ہے۔

عنایت اللہ اور میرزا ریاض کے اکثر افسانے کرداری ہیں اور ان افسانہ نگاروں کی جزئیات نگاری قابل توجہ ہے۔

عنایت اللہ اپنے کرداروں کے گرد پھیلی ہوئی لاتعلق زندگی اور اشیا میں سے معنی کی تلاش کرتا ہے۔ (نمائندہ مثال: ادھوری کہانی) عنایت کے دونوں افسانوی مجموعوں ''منزل منزل دل بھٹکے گا'' اور ''سوز عشق جاگ'' کے بیشتر افسانے لاتعلقی میں تعلق کی تلاش سے متعلق ہیں۔ بعینہٖ یہی طریقہ کار میرزا ریاض اس وقت اختیار کرلیتا ہے جب وہ اردگرد کی پوری صورت حال کو مجرم کردار نگاری کا عینی گواہ بناتا ہے۔ اس کے افسانوی مجموعے ''آندھی میں صدا'' کے بیشتر افسانے اس کی مثال ہیں اور افسانوں میں انبارمل جنسی نفسیات کا مطالعہ اور آپس میں الجھتے ہوئے شر اور معاشرتی گراوٹوں میں خیر کی جستجو اہمیت کی حامل ہے۔ ایک مثال: ''چگادڑ''

اس روایت میں عاشق حسین بٹالوی (مجموعہ: ''سوز ناتمام'') اور شمس آغا (مجموعہ: ''اندھیرے کے جگنو'') نے حسن و عشق کی گھسی پٹی روایتی فارمولا کہانیوں کو نئی تدبیر کاری کے تحت چونکا دینے کی حد تک قابل توجہ بنا دیا ہے۔ عاشق حسین بٹالوی اور شمس آغا کے ہاں غم و الم کی فضا بالترتیب عورت کی بے وفائی اور جوان جذبوں کی اٹھان (اور ان کی معصومیت) کے حوالے سے توجہ طلب ہے۔

رواں پس منظر میں عرش صدیقی، رام لعل، احمد یوسف، کنور سین، قمر احسن، عبدالصمد، شوکت حیات، انور خان اور محمد عاصم بٹ کے ہاں موضوعات کا تنوع اور اس کی مناسبت کے ساتھ اسالیب اظہار کی نت نئی کروٹیں قابل توجہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریاں ان کے منفرد زاویہ نظر کے تحت افسانوں میں ڈھلتی رہی ہیں۔

رام لعل کے افسانوں میں مرد اور عورت کا جنسِ مخالف کے داخل سے آگہی حاصل کرنے کا عمل ازلی تکرار میں اس وقت ڈھلتا ہے جب رام لعل اس دنیا کے چل چلاؤ میں فرد کو جسمانی طور پر بھی مسافر بنا دیتے ہیں (مثالیں: ''حیرت زدہ لڑکا''۔ ''اکھڑے ہوئے لوگ۔'')

رام لعل کے ہاں یہ سفر ملٹی ڈائمنشل معنویت کا استعارہ ہے۔ ایسا سفر جو انسان کے داخل اور خارج دونوں سطحوں پر یکساں طور پر جاری وساری ہے۔

احمد یوسف اور عرش صدیقی نے متنوع موضوعات کے برتاؤ کے ساتھ روایتی طرز اظہار سے علامت اور تجرید کے معتدل دھارے تک سفر کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا انسانی نفسیات سے گہرا شغف اور بیان میں شگفتگی کا عنصر قابل لحاظ ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں تیسری سمت کی تلاش بھرپور معنویت کی حامل ہے۔ قمر احسن، انور خان، کنور سین، عبدالصمد، شوکت حیات اور محمد عاصم بٹ کے افسانے اس روایت میں توسیع کا باعث بنے ہیں۔ یہ گنجائش ان کے خالصتاً نجی منطقے کے موسموں اور رنگوں کی عطا ہے۔

انور عظیم، اقبال متین، عوض سعید، اقبال مجید، ہرچرن چاولہ اور منیر احمد شیخ نے افسانوں میں فلسفیانہ نوعیت کے سوالات اٹھائے۔ ان افسانہ نگاروں کے اجتماعی نفسیات کے حوالے سے لکھے گئے افسانے، کلچر اور اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور تعمیر کے باب میں توجہ طلب ہیں۔

انور عظیم زندگی کی بے معنویت کو کس طرح سماجی مسائل کے روبرو کھڑا کرتا ہے۔ اس کے افسانے ''قصہ دوسری رات کا'' سے مثال ملاحظہ کیجئے۔

''ہر طرف اندھیرا تھا۔ کتے تھے اور کتوں کے سائے تھے اور زنجیروں کی جھنکار تھی۔ سب کا رنگ ایک تھا، سمت بھی ایک تھی، یکا یک ہوا کے زوردار ہاتھوں نے کتوں کے چہروں سے نقابیں نوچ لیں۔ سارے کتے بے چہرہ تھے۔ جن کے ہاتھوں میں کتوں کی زنجیریں تھیں، وہ بھی بے چہرہ تھے۔ بے چہرہ قافلہ ایک ہی سمت چل رہا تھا۔ اپنے گنبد کی تلاش میں جو خود ان کے اندر تھا، ریزہ ریزہ ریت کی طرح، ٹھنڈا کہرے کی طرح۔''

اقبال متین کے ہاں اس روایت میں شہری زندگی اور اس کی مناسبت کے ساتھ الجھی ہوئی کردار نگاری قابل توجہ ہے:

''ہم سڑک پر بیٹھے ہوئے ایسے لوگ ہیں جو شاید کسی حادثے کے منتظر ہیں اور انتظار، سچ پوچھئے تو ہم کر نہیں سکتے بلکہ زندگی اور وقت نے سازش کر کے ہمیں ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے جہاں بہرحال کسی کا انتظار ہے۔ دراصل یہ انتظار امید وبیم کے دوراہے پر وقت کی کسی سازش کا دوسرا نام ہے اور جب یہ سازش مکمل ہو لے گی، تب وہ حادثہ وقوع پذیر ہو گا ہی اور کون جانے کہ تب بھی ہو گا یا نہیں۔''

(آگہی کے ویرانے)

عوض سعید کے افسانوں (مجموعہ: رات والا اجنبی) میں انسان کی داخلی کیفیات اپنی معروضی صورتحال کے منظر نامے میں توجہ طلب ہیں۔ عوض سعید کا خاص موضوع انسانی ذات کا اس کی تمام جہتوں میں مطالعہ اور مشاہدہ ہے اور اس حوالے سے ''جلاوطن'' اور ''مردہ گاڑی'' نمائندہ افسانے ہیں۔

اقبال مجید کی افسانوی تدبیر کاری روایت اور جدّت کا توازن سامنے لاتی ہے۔ تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کا سنجیدہ مطالعہ اقبال کا موضوع خاص ہے۔ نمایاں مثالوں میں ''پیٹ کا کیچوا'' اور ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' ہیں۔

ہر چرن چاولہ کے افسانوی مجموعے ''عکس آئینے کے'' کا پس منظر برصغیر کی تقسیم کبیر اور اس کے تمام حوالے ہیں۔ ان افسانوں کا لینڈ اسکیپ میانوالی، کیمبل پور اور سرحد کی طرف دریا پار کے علاقے خصوصاً شہباز خیل اور تھل کا علاقہ ہے۔ اس بوباس کو لیے ہوئے یادوں کے طویل سلسلے ہیں اور اقدار کی شکست وریخت پر فلسفیانہ زاویہ نظر۔ ان افسانوں میں وقوعہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور اس کی بنیاد غیر منقسم ہندوستان کی یادوں پر ہے۔ نمایاں مثالوں میں ''بندیا میرے نام کی'' اور ''چاچی گلاباں'' اور مجموعہ ''ریت سمندر اور جھاگ'' کی کہانیاں ہیں۔

''نقشے میں انگلی رکھ کر بتانے کے لیے میں اسے پاکستان کا نام دے رہا ہوں۔ ورنہ میری ماں کے پاس ان جگہوں کا نام نہ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان بلکہ تھل، کچھ، شہباز خیل اور میانوالی تک محدود ہے۔ وہاں کے کسی بھی ذکر سے پہلے وہ سر پر ہاتھ رکھ کر ضرور کہتی:

ہائے ربا، تو نے کیا کر دیا۔''

(''عکس کے آئینے'' سے اقتباس)

منیر احمد شیخ کے ہاں پاکستانیت کا حوالہ توجہ طلب بھی ہے اور بحث طلب بھی۔ افسانوں کی نمایاں مثالوں ''پی۔ بی۔ ایل 536'' اور ''پابوس'' ہیں اور مجموعہ ''لمحے کی بات'' کے بیشتر افسانے۔

اسی روایت میں خیر اور شر کے تصادم کے حوالے سے عزیز ملک، سید انور، اختر جمال، نکہت حسن، ناصر بغدادی اور علی حیدر ملک نے آدرش حقیقت نگاری کی ہے۔ نمایاں مثالوں میں عزیز ملک کے ''آپ میں آپ سائیوری''، ''یاترا'' اور ''اچھری'' سید انور کا ''شہر کی خودکشی'' اختر جمال کا ''نیا کپڑا''، نکہت حسن کا ''زبان'' ناصر بغدادی کا ''وصال کا موسم'' اور علی حیدر ملک کے دو افسانے ''تیسری آنکھ'' اور ''بے زمین آسمان'' ہیں۔ ان افسانوں میں فارم کے اعتبار سے داستان اور تمثیل کا لہجہ اور خیر طلبی ایک نئی کمپوزیشن میں ڈھلی ہے جبکہ عزیز ملک کے ہاں مذہبی، اختر جمال اور نکہت حسن کے ہاں تہذیبی اور سید انور اور علی حیدر ملک کے ہاں مارکسی نقطہ نظر کی یکسر متضاد دھارائیں چل رہی ہیں۔



پیش منظر:

مارچ 1978ء میں شائع ہونے والا چھیانوے صفحات پر مشتمل چودہ افسانوں کا مجموعہ ''گواہی'' مرتبہ: اعجاز راہی ناشر: عوامی دارالاشاعت، کراچی خاص طور پر یادگار ہے۔ ''گواہی'' کے افسانے ظالمانہ طبقاتی نظام اور اس کی جبریت کے خلاف شدید احتجاج کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ ''گواہی'' کے ابتدائیہ میں اعجاز راہی لکھتا ہے:

''فن اور اس کی قدریں زمانی اور مکانی صورتحال سے تبدیل ہوتی ہیں۔ اگر معصوم جسموں پر پڑنے والے کوڑوں کی ظالمانہ آوازیں ادیب کے احساسات کو مجروح نہیں کرتیں تو ادب ٹھہرے ہوئے گندے پانی کے کائی زدہ جوہڑ سے بدتر ہے۔ (جس سے کتا بھی پانی پینا پسند نہیں کرتا) میں یہ بات واضح کردوں کہ ادیب کو سلطان یا سلطنت سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہوتا لیکن ریاست پر ظالمانہ طبقاتی نظام کی چاپ اس کے جذبات و احساسات پر قطرہ قطرہ تیزاب کی طرح گرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کے قلم سے نظام کی جبریت کے خلاف احتجاج جنم لینے لگتا ہے۔'' (ابتدائیہ: ۱۰ مارچ ۱۹۷۸ء)

اس مجموعے میں انور سجاد، منشایاد، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، مظہرالاسلام، احمد داؤد، احمد جاوید، اسلم یوسف، جوہر میر، رحمان شاہ عزیز، فریدہ حفیظ، منصور قیصر، نعیم آروی اور اعجاز راہی کے افسانے شامل تھے۔

ان افسانوں میں مارشل لاء کی جبریت کے خلاف نفرت کا سمندر موج زن ہے۔ ہر ہر لفظ کے ورتارے میں شدید تیزابیت گھلی ہوئی ہے۔ یہ نفرت اور جھنجلاہٹ انسانی ہاتھوں کی پھولی ہوئی نسوں اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ تخلیق کار کے اظہار میں اپنی واضح پہچان کرواتی ہے:

''میں زور سے ہنسا۔ ''قومی سلامتی۔ یہ بھی خوب چیز ہے۔''

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولا:

''عصمت فروش عورت کی انا جو بگڑ جائے تو عصمت دری کے الزام میں پکڑواتی ہے۔ ہماری قومی سلامتی بھی اسی قسم کی چیز ہے۔''

(''وہسکی اور پرندے کا گوشت'')

اسی طرح مستنصر حسین تارڑ نے اپنے افسانوں میں فکری اور نظریاتی محاذ آرائی ان طاقتوں کے خلاف کی ہے جو ترقی پذیر ممالک میں اپنے استحصال کرنے والے پنجے گاڑے ہوئے ہیں، مثال: ''آکٹوپس'' اور ''بابا بگلوس''۔

یوں پیش منظر کے افسانے میں ایک طرف تو فکری اور نظریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورتیں ہیں یا فلسفیانہ توجیہات اور دوسری طرف حجاب اور سرگوشی ہے۔ لیکن یہی معروضی صورتحال اسد محمد خاں (افسانہ: ''ہے للہ للہ'') کے ہاں شدید طنز اور درشت لہجے کا باعث بنی ہے۔ اس سامنے کی صورتحال کو اسد محمد خاں نے یہودی اجتماعی لاشعور کے حوالے سے نئی معنویت سے دوچار کردیا ہے۔ خصوصی افسانہ: ''یوم کپور'' افسانہ کا مرکزی کردار اسرائیل کی سرزمیں سے چل کر ہندوستان تک آیا ہے۔ موضوع سے مطابقت رکھنے والا ایک منفرد اسلوب یہاں جنم لے گا جب عبرانی زبان کے لہجے میں پشتو اور ہندی سے اُردو تک کا سفر ہوگا (افغانوں کے متعلق روایت ہے کہ وہ یہودی النسل ہیں نیز پشتو مابعد الطبیعات کا بیان بہت نیا نہیں رہا۔ اس ضمن میں پولینڈ کا آئزک باشیوز سنگر عالمی شہرت کا حامل افسانہ نگار، ناول نگار ہے۔ اس کے نمائندہ افسانے ''بوڑھا آدمی'' کا یہی موضوع ہے جو ''یوم کپور'' میں اسد محمد خاں نے بھی برتا۔ مرسے اخراج، دیوار گریہ اور مصائب کا بیان، لیکن افسانے کا اختتامیہ سنگر کے ہاں بالآخر آزادی ہی بنتا ہے۔

اس رو میں احمد ہمیش (مجموعہ: ''مکھی'') کے افسانوں کا داخلی رویہ ماورائیت کے احساس کا باعث ہے اور اس احساس کا جنم انتہا کی کرخت معروضی صورتحال میں ہوتا ہے۔ (مثال: ''ذریخ میں گرا ہوا قلم'') ذکاء الرحمٰن اور انوار احمد کے ہاں بن چھوئے موضوعات اور بہت

الجھی ہوئی نفسی کیفیتیں منفرد پیرایہ اظہار اور زندگی کے عجیب و غریب معیارات کا باعث بنی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور مشرقی ممالک اپنے اپنے طور پر۔ نئے مسائل میں گھر گئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو اضافے کئے انہوں نے انسان کو خراج پر قادر ہونے کے باوجود جذباتی اور محسوساتی سطح پر دائمی کرب کا مریض بنا دیا۔ فرد تنہا رہ گیا۔ یہ تنہا انسان اپنے اعتقادات اور روشن خیالی کے درمیان گم سم ہے۔ مستقبل غیر واضح ہے اس لیے سوال جنم لیتا ہے یہ بالکل ویسا ہی تجسس ہے جیسا غالب کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک تہذیب کی شکست کے بعد نئی صورتحال کو دیکھ کر سوال۔ البیر کامیو والی بغاوت نے بھی ظہور کیا۔ مختار کل اور مجبور محض انسان جس کی تنہائی، انفرادی سطح پر بھی ہے اور انبوہ میں بھی۔ یہ تنہائی جذباتی اور فکری دونوں سطحوں پر ہے۔ انفرادی تنہائی کی مثال کامیو کی ناول ''The out Sider'' جس کا مرکزی کردار سوچتا ہے۔ ''میری ماں کل مرگئی، یا ممکن ہے پرسوں، مجھے کچھ یاد نہیں'' یہ تنہا فرد اس خوابیدگی کی حالت میں قتل کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لیکن قتل کرنے کی وجہ اسے نہیں معلوم۔ اس فرد کی Alienation کی دوسری بڑی مثال فرانز کافکا کا Land Surveyor ہے کامیو کے ناول۔ ''The Plague'' میں اجتماعی تنہائی ملاحظہ ہو: خیالی شہر میں چوہوں کی موت سے انسانوں کی موت تک شہر کا رابطہ دیگر جگہوں سے کاٹ دیا گیا ہے۔ اس ذہنی اور نفسیاتی خلفشار کا اولین تجربہ یورپ کے ان ممالک کو ہوا جو صنعتی انقلاب میں پیش پیش تھے۔ پھر نفسیاتی الجھنیں، سماجی دھڑے بندیاں اور مادی مسائل انسان کا مقدر بن گئے۔ صنعتی سرمایہ کاری سے مالیاتی سرمایہ داری تک کے سفر کی عطا: انسان انسان کے خلاف نبرد آزما ہے۔ سرمایہ دارانہ جبر کا شکار فرد اپنے شہر اور اپنے گھر میں اجنبی ہے۔ مصلحت اسے کاکروچ، بندر اور گینڈا بنا رہی ہے۔ اس کے سر پر کانٹوں کا تاج ہے۔ یہ فرد ٹیشکر کی طرح ہے جو اپنی چتا کے لیے ایندھن خود فراہم کرتا ہے یا مسیحا کی طرح ہے، جس نے اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔

پگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے نرم کانٹوں کا دائرہ لپیٹے، سوکھے بدن پر ارغوانی رنگ کا ٹاٹ اوڑھے، پیروں سے مونجھ کی پنڈلیاں باندھے بالساوڈ کی لمبی صلیب گھسیٹتا ہوا، اب جو اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک رفیق کے دروازے پر دستک دیتا چلا جائے گا کہ اے رفیق الاسد اپنے مکان سے باہر آ اور اے علیم عبیداللہ کچھ قدم میرے ساتھ چل اور اے ایلی اطہر نفیس اے کشادہ دل رفیق میری پیشانی کو بوسہ دے اور اے جان برادر الوداع کہہ اور واویلا کر کہ میں اپنی صلیب اٹھائے اپنے مقتل کو جاتا ہوں: (براود براود۔ اسد محمد خان)

یہ مدمقابل انسان مجموعی طور پر اجتماعی ترقی کی راہ میں حائل فطرت کے مقابل بھی رزم آراہ ہے۔ یہ دوہری جنگ بین الاقوامی سطح پر جاری ہے۔ بنتے بگڑتے اقتصادی، سیاسی اور مذہبی تصورات نئی نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ آج کی نئی ضرورتیں پرانی سچائیوں کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ آج کا عہد فرد کا سایہ ہے جو اس کی گھات میں دفتروں، گھروں، سڑکوں، گلیاروں میں خنجر بکف چلتا ہے۔ بلجیم کے مصور بوش کی لرزتی اور منہدم ہوتی عمارتیں آج کے افسانوی کردار کی دھنستی ہوئی بدن کی دیوار ہیں۔ بدی نے چاروں کھونٹ انسان کو گھیر رکھا ہے۔

مثالیں: احمد یوسف کا ''اونچی اونچی عمارتیں''، انور سجاد کا ''چھٹی کا دن''، نیئر مسعود کا ''مشک کافور''، رشید امجد کا ''قطرہ سمندر قطرہ''، احمد داؤد کا ''سانپ کی سرگزشت''، شرون کمار ورما کا ''لب یا نکا''، نجم الحسن رضوی کا ''انکوبیٹر'' اور عرش صدیقی کا ''باہر کفن سے پاؤں۔''

فرد اپنی تخلیقات کا اسیر، مشینوں کا غلام خود کمپیوٹر بن گیا ہے۔ مشین کے شور میں فرد کی دبتی ہوئی آواز کی مثالیں ڈاکٹر ژواگو کا آخری ٹرام کا سفر ہے۔ اسی لیے Absurd Theater نے جنم لیا۔

○

''Wating For Godut'' کا اختتام: انتظار کرتے ہوئے دونوں دوست اکتا جاتے ہیں۔ پہلا دوسرے کو کہتا ہے۔'' Let us Go'' دوسرا جواب میں کہتا ہے: ''Yes, Let us Go'' اور بیکٹ نے آخر میں لکھا ہے کہ وہ دونوں حرکت نہیں کرتے، بیٹھے رہتے ہیں۔ ولیم بلیک کارخانوں کی چمنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں اور چنگھاڑتی سڑکوں سے بھاگ کر جنگل میں نکل گیا، جوگی بن گیا۔

چاروں اطراف پھیلی زندگی کی شور مچاتی گڑگڑاتی مشین کا ادنیٰ سا پرزہ بن جانے کا احساس آ گیا ہے۔ جھوٹ، مکروفریب، سیاست، معیشت اور اخلاقی اقدار ایسے سوالیہ نشان ہیں جن کی گرفت سخت ہے۔ فرد قریہ قریہ منافق...... آزادی، فساد، خوف، نفرت، تعصب سکون کا سوال ہے بابا۔

یہ کرب کا احساس، اظہار سے مطابقت رکھنے والے پیرائے کا طالب ہے۔ افسانہ نگار جانتا ہے کہ کمزور، بونوں، ذہنی مریضوں اور نامردوں کی یہ گھناؤنی دنیا جس قدر مکروہ اور ناقابل قبول ہے اسی قدر ناقابل انکار حقیقت بھی ہے۔

''نامردو، یہ بھی تو سوچو کہ صرف اس ماں کے خصم کے ہاتھ کا پھنکارتا ہوا سانپ ہی کیوں بولتا ہے۔ وہ کیوں نہیں بولتا جو رسیوں سے جکڑا کھڑا ہے اور جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے۔ رنگیلے اسے پکڑنا، میتے اس تخم حرام کی خبر لو۔ وسور کا بچہ یہاں کیسے آ گیا......

خلقت کی آنکھوں کے شہر روشن ہو گئے اور نوجوان بھاگتا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے رنگیلے، میتے اور جانے کون کون'' (''اک منظر سامنے کا'' از احمد یوسف) یہ جبر کے خلاف پہلی آواز تھی جو ہمت کر کے اٹھائی گئی اور یکایک صورتحال الٹ گئی...... سمیع آہوجہ کا ''الوژن ڈزالوژن'' جبر کی دیگر جہتیں سامنے لاتا ہے۔

اُردو ادب میں آج تک اجتماعیت کا دوردورہ رہا ہے۔ افادی ادب اور ترقی پسند تحریک میں انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ اب جس طرح اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف جھکاؤ بڑھا ہے پہلے افسانے کی سی اجتماعی نظریاتی وابستگی بھی نظر نہیں آتی۔ آج افسانے کی اس کھلی فضا میں صورتحال کا تجزیہ انفرادی سطح پر ملتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی نئی نسل کے سامنے بہت سے سوالات ہیں، جواب کوئی نہیں۔ موجود بے معنویت کی عطا، لخت لخت فرد کی تنہائی میں خود اپنی پہچان اور انفرادیت کی تلاش ہے۔ یہ وہ سوچ کی معتوب نہج ہے جو کمپیوٹر کے اس عہد میں قبولیت حاصل کر گئی ہے۔ اپنی پہچان میں نکلا ہوا تنہا فرد ہر ہر گام پر ڈگمگاتا ہے۔ اس ڈگمگاتے فرد کے Inner Self کے ظہور کی عجیب وغریب صورت کی مثالیں: بڑے ابا کے پورٹریٹ کے سامنے پریشان حال جوان لڑکی کی کہانی، خالدہ حسین کا ''پیاسی جھیل''۔ آج کے مصروف دور کے پڑوسی کا ناطہ سریندر پرکاش کا '' دنے کی آواز'' وغیرہ۔

بے حسی، تشکیک: انور قمر کا ''چوراہے پر ننگا ہوا آدمی'' آج کا بدھا جسے دھیان کی کئی سیڑھیاں ابھی چڑھنی ہیں، ہانپ رہا ہے۔ ذکاالرحمٰن کا ''وہ ایک تنہا شخص''، احمد تنویر کا ''دھیان پرت پرت''، بلراج کول کا ''تیسرا کتا''، صادق موتی کا ''خیالوں کے مینار''، علی امام کا ''آگ اپنے اندر کی'' ہیں۔ یہ فرد اپنے Pigeon Holles میں سانس لیتا ہوا ایک ٹائپ بن گیا ہے۔ یہ بیوروکریسی کا ایک تحفہ ہے کہ ہم اپنی شناخت افسانہ نگار کی بجائے ڈاکٹر اور پروفیسر کی حیثیت سے کرواتے ہیں۔ اپنی پہچان کرواتے کرواتے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ آج کا

یہ فرد Aspidistra کا وہ پودا ہے جو عموماً برطانیہ کے مڈل کلاس گھرانے کے دروازے پر تانبے کے چمکدار مرتبان میں سجا رہتا ہے۔ جارج آرویل کے ناول Keep The Aspistra میں یہ آج کا فرد اپنی ہر جہت اور ہر اقدا... مضحکہ خیز ہے۔

دنیا بھر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہاتھوں ہر محاذ پر پرانی اقدار کو شکست ..دی ہے۔ خود ہمارے یہاں یہی صورتحال ہے لیکن یہاں کے عقائد اور مذاہب ابھی تک زندگی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ گو تشکیک نے بڑے پیمانے پر اپنا اثر دکھایا ہے لیکن یہ سب اندر ہی اندر ہے ابھی بیچ چوراہے میں سوالات نہیں اٹھائے جاسکتے، فوراً ملحد ہونے کا فتویٰ لگے گا۔ آج وہ صورت حال ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کی تھی وہاں مذہب اور عقیدے کی جگہ پُر کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی نے پورے پچاس سال لیے۔ ہمارے ہاں ابھی عقائد کے متبادل کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ نیا سائنسی طرز فکر اپنانے میں ابھی طویل مدت درکار ہے...... قدیم صداقتیں آج شک کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ پرانی صداقتیں اپنے معانی کھو بیٹھی ہیں اور ان کا متبادل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسی ہی صورتحال میں یورپ کی آواز تھی۔

"One World is Dead While The Other is Struggling to Take Birth"

ہمیں اس تکلیف دہ صورتحال کا آج سامنا ہے لیکن افسانے میں یہ نراج کی صورتحال مستقبل قریب میں وجودیت کا Pattern اختیار کرتی نظر آتی ہے۔

اب وجودیت ہی ایسا فلسفہ رہ گیا ہے جس نے دوسری جنگ عظیم کے ہارے ہوئے انسان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے یہ فلسفہ پیش منظر کے انسان کی ڈھارس بن سکتا ہے۔ وجودیت نے کائنات کو واہموں کی دنیا سے نکال کر کائنات میں مسلسل برسرِ پیکار انسان کے جسمانی اور ارضی وجود کی معنویت کی تلاش کی ہے گو اب تک ہمارے ادب پر اس فلسفے کا براہ راست اثر نہ ہونے کے برابر پڑا ہے لیکن یہ اس زمانے کی مجبوری بنتا جا رہا ہے۔ ہماری فکر میں وجودیت کے عناصر بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر خود بخود شامل ہو رہے ہیں۔ وجودیت کے لیے جدلیاتی مادیت (مراد ایک طریقہ کار ہے کوئی جامد اور اٹل نظام کائنات نہیں) راہیں متعین کرتی ہے۔ ہمارے ہاں جاگیردارانہ نظام کی شکست کے بعد اس کی جگہ لیے ہوئے سرمایہ داری کا متبادل وجودیت اور جدلیاتی مادیت کی باہم آویزش بن سکتی ہے جس میں فرد اور سماج کی بقا اور بہتری ممکن ہے۔

پیش منظر میں لازم و ملزوم مرد اور عورت کے معاشرتی روابط بھی نئی کروٹ لے رہے ہیں۔ اس نئی متشکل چال ڈھال کے بارے میں جمیلہ شاہین (نئی عورت اور اُردو افسانہ۔ ادب لطیف) نے افسانہ نگاروں سے توقع باندھی تھی کہ وہ نئی عورت کی تلاش اور تربیت کا کام سرانجام دیں گے جو داستانوی عورت اور قرۃ العین حیدر کی اینگلو انڈین عورت کے درمیان کی کڑی ہے، جس کی روح کے مسائل کے ساتھ جسمانی مسائل بھی ہیں۔

پیش منظر کے افسانے کی عورت کا گھر سے باہر قدم سرکس کے تنے ہوئے تار پر پہلا قدم ہے اور وہ خواہش کی ہڈی کو سونگھتی اپنے نحیف پنجر کے ساتھ ڈولتی سنبھلتی سفر کرتی ہے۔ توازن قائم کرنے کے لیے اس نے دونوں بازو پوری طرح پھیلا رکھے ہیں۔ علی امام کا افسانہ ''رپورٹ'' ایک کوئلہ چننے والی کے کردار کا مطالعہ ہے۔ جو مزدوروں کے ڈیزل سے لتھڑے جسموں کے تصرف میں ہے۔ افسانہ نگار کی نگراں آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے، اس کوئلے چننے والی کے لیے ''استقاطی ٹیبلٹ'' سنبھالے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن تب تک وہ زہر اگلتی ہے، بے نام کیفیتوں کی بے نام اولاد۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں آج کی اینگلو انڈین عورت کا تجربہ ہے، جس کے نزدیک وصال شفاف ندی ہے جس کے اندر کوئی رمز نہیں۔

اس کے مقابلے میں فراق جان لیوا ہے لیکن اسرار سے پُر سمندر کی مانند خوبصورت ہے۔ اس عورت کا چناؤ فراق ہے۔

پیش منظر کے ملٹی ڈائمنشنل افسانے کی رسائی مرد اور عورت کے دن رات سے بچپنے کی معصومیت تک ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کا افسانہ ''نیند کا بچپن'' گھر کی چوکھٹ پر بیٹھے ایک ننھے بچے کی سوچوں سے ترتیب پاتا ہے۔ اس کے لیے اردگرد پھیلی کائنات اسرار سے پٹی پڑی ہے۔ کیا درخت رات کو سو جاتے ہیں؟ اور بہت سے سوال، یہ سب سوچتے ہوئے وہ چوکھٹ پر ہی اونگھ جاتا ہے۔ افسانے میں خیال کی بنت تصوف کے عمیق مطالعے کا پتا دیتی ہے۔ بچے کی متحیر کائنات پر اشفاق احمد کا ''گڈریا'' انور سن رائے کا ''ماں کی موت'' مظہر الاسلام کا ''ہرا سمندر'' احمد داؤد کا ''گرتے آسمان کا قصہ'' اور کمال مصطفیٰ کا ''شریر پری'' جیسے خوبصورت افسانے ملتے ہیں۔

سو بات ہو رہی تھی قدیم صداقتوں کی کہ جو دم توڑ رہی ہیں اور زندگی کرنے کے لیے مذہب اور قدیم عقائد کے متبادل کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ بے یقینی کی صورتحال ہے۔ یہاں پاکستان میں ہم اس دھرتی پر پہلا قدم رکھنے والے پہلے مسلمان اور موہنجو دڑو کی تہذیب کے درمیان کہیں کھڑے ہیں۔ ماضی قریب تک کا لکھنے والا اس تمام تجربے سے خود گزرا ہے لیکن اس کے تجزیے کے لیے بعض اوقات اگلی نسل سے امید رکھی جاتی ہے۔ آج کی نئی نسل کا افسانہ اس تجزیہ کے باعث لاشعور اور سامنے کی صورتحال کا رچا ہوا احساس رکھتا ہے۔

یہ مسلسل تبدیلیاں اپنے نئے مزاج اور نئی Sensibility کے اظہار کے لیے نئے اسالیب بیان کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس نئی Sensibility کا اظہار نئی علامتوں اور نئے پیرایہ اظہار کے بغیر ممکن نہیں۔ آج کے افسانہ نگار نے اس ملٹی ڈائمنشنل صورتحال کے اظہار کے لیے نئے اسالیب چنے ہیں۔ جن میں وہ تمام عناصر کارفرما ہیں جن سے آج تک شاعری میں کام لیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں علامت اور استعارہ کے ساتھ شعور کی رو اور تجرید سامنے آئی ہیں۔

اپنے عہد کا ہر سچا فن کار نئے امکانات سامنے لاتا ہے اور یہ نئے امکانات دراصل نئے عہد کی صورتحال میں ماضی کے سوئے ہوئے احساسات اور تلازمہ کو نئی انسانی صورتحال میں دیکھنے کا نام ہے۔

زبان ابلاغ کا آلہ ہے اور اسلوب اس کی طاقت۔ اسلوب صرف طریقہ اظہار ہی نہیں اس کا تعلق فن کار کی سوچ کے انداز سے بھی ہے اور وہ سوچ کا انداز اس کے عہد کی عطا ہے۔ بقول سراج منیر، اسالیب کی بنیاد پر ادوار کی پہچان ہوتی ہے کہ اسلوب کسی دور کے باطن کا مسئلہ ہے۔ کروچے کے نزدیک فن اظہار کا دوسرا نام ہے۔ تو کیا فن محض حسی لذت اندوزی ہے؟ جس کی تلاش ہمارا قاری کرتا پھرتا ہے اور یہ تلاش کا عمل اسے ڈائجسٹوں کی رومانی اور جاسوسی دنیا تک لے آیا ہے۔ فن اگر محض حسی لذت اندوزی ہوتا تو پکی پکائی روٹی کی طرح ہر تہذیب یافتہ یا غیر مہذب فرد کے لیے طاقت بخش ثابت ہوتا...... لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا قطعی طور پر نہیں ہے۔ ''لفظ کا جادو'' تسلیم، لیکن کیا وہ ہر ایرے غیرے کے لیے بھی ہے؟

سرریلزم کے سب سے بڑے نظریہ ساز آندرے برتوں کے نزدیک تخلیق کار کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو یہ موقع بہم پہنچائے کہ وہ اپنے الفاظ میں اپنے آپ کو ظاہر کریں۔ اس لیے سرریلسٹوں کا اسلوب اظہار اتنا غیر شعوری اور اضطراری ہوتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی تکنیکی کوششوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ایک طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سرریلسٹ تحریر محض تکنیک ہے (یہاں تکنیک کا لفظ عام مروج معنوں میں ہے) البتہ ایسی تکنیک جو شعوری اور عقلی نہیں ہوتی۔

ہمارے ہاں محض تکنیکی فکشن کچھ عرصہ پہلے خاصی Thrilling رہی ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ نئی تکنیک کا حامی ہونے

کے باوجود میں تکنیک کو حاصل نہیں ذریعہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک محض تکنیکی نئے پن کے کوئی معنی نہیں۔ تکنیک موضوع کی عطا ہے۔ اسی طرح اسلوب اپنے عہد کا انکشاف ذات۔ فن کار اپنی تخلیقات میں تمام حیثیتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ قاری کو صرف اپنی ذات کے ساتھ مناسبت رکھنے والی جہتیں چننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ تخلیق کی فطرت میں اپنے عہد کی ودیعت شدہ تمام بھلی بری جہتوں کا مخصوص توازن ہی فن پارے میں اظہار پاتا ہے۔

علامت واستعارہ، ترسیل کے وسیلے ہیں اور بقول کونرڈ، ادب کی عظیم تخلیقات علامتی ہیں جس کے باعث ان کی قوت، گہرائی اور حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ بودلیئر کی نظم ''بدی کے پھول'' علامتی طرز اظہار کا اولین خوبصورت نقش ہے۔ پھر فکشن میں ایڈگر ایلن پو، ہرمن میل ویل، مارسل پروست، سارترے، کامیو، چیخوف، کافکا اور جارج آرویل سے ہوتے ہوئے علامت کا سفر آج کے پیش منظر کے افسانے کا ہم عصر تناظر ہے۔

کافکا کا اسلوب ذہنی افتاد کے باعث سرریلی ہے لیکن اس کی بڑی پہچان علامت نگاری ہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ہاں افسانے میں علامت نگاری کا چلن کافکا کے طفیل ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ ہمارا افسانہ کافکا کے دو ناولوں The Trail اور The Castle سے متاثر ہو۔ ان ناولوں میں کافکا نے عجب سرشاری کی کیفیت میں علامت کو برتا ہے۔ اس کے ہاں حقیقت کا اتنا گہرا مشاہدہ ہے کہ اردگرد پھیلی کائنات Transparent صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اشیاء اپنی انتہائی گہرائیوں کے اسرار بھی کھول دیتی ہیں۔ ''The Trail'' کا ملزم عجیب بے بسی کی تصویر ہے۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ مقدمہ کیوں چلایا جا رہا ہے۔ ''The Castle'' اتنی بڑی کائنات میں جستجو بنتا ہے شروع سے آخر تک اس کے اسرار نہیں کھلتے، سب راستے ادھر ہی جاتے ہیں پر کوئی راستہ وہاں تک پہنچاتا نہیں۔ ''K'' نام کا Land Surveyor صبح نکلتا ہے اور شام کو ناکام واپس لوٹتا ہے۔ کافکا کی کہانی Meata Morphosis جبر کی صورتحال میں مفاہمت کی داستان ہے۔ ناجائز مفاہمت کایا کلپ کا باعث بنتی ہے۔ ہیرو انسان سے کاکروچ بن جاتا ہے جس کا مقدر Dust Bin ہے۔

علامتوں کا یہ انداز ہماری داستانوں میں خیر اور شر کے جدل پر ظاہر ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں افسانہ: ''کایا کلپ'' میں اعلیٰ روایات کا پاسدار جان عالم، مکھی بن جاتا ہے۔ یہ کایا کلپ آئنسکو کے ''گینڈے'' اور فرانز کافکا کے افسانے: ''کایا کلپ'' (Meata Morphosis) سے مستعار ہے، جب کہ انتظار حسین کے ''آخری آدمی'' میں کامیاب علامت کا ورتارا دیکھنے کو ملا۔

ہمارے ہاں علامت نگاری، داستان سے اولیں اُردو افسانے میں منتقل ہوگئی تھی۔ یہ اس لیے بھی کہ بقول سوسن کے لینگر، علامت سازی بنیادی تقاضا ہے جو صرف انسان سے مخصوص ہے۔۔ اس کے ذہن کا ایسا بنیادی عمل جو ہر وقت ہر لمحے ہوتا رہتا ہے۔ اکثر یہ عمل شعوری ہوتا ہے اور بعض دفعہ غیر شعوری، ہم اس کے نتائج کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ ذہن میں سے کچھ تجربات گزرے ہیں جن کو اس نے محفوظ کر لیا ہے۔
ہمارے افسانے میں علامت نگاری ایک واضح رجحان کی صورت یورپی اثرات کے تحت ہی سامنے آئی۔ ہمارے اولین افسانوں ''چڑیا چڑے کی کہانی'' اور ''سودائے سنگین'' (یلدرم) اور ''الاؤ'' (سہیل عظیم آبادی) سے احمد علی تک علامت نگاری پر اسلوب کے اعتبار سے خصوصی توجہ صرف نہیں کی گئی۔ احمد علی کے ''قید خانہ''، ''موت سے پہلے''، ''ہمارا کمرہ'' کافکا کے زیر اثر اُردو کے پہلے کامیاب علامتی افسانے ہیں۔ کافکا ابنارمل تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کی تحریر میں سرئیلزم نے راہ پائی۔ سرئیلسٹ ٹریٹمنٹ ہمیں احمد علی کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ یہ ان کی کامیاب شعوری کوشش ہے جس کی مثالیں: ''پریم کہانی'' اور ''گزرے دنوں کی یاد'' ہیں۔

استعارہ اور علامت نگاری کے ضمن میں منٹو کا افسانہ ''پھندنے'' کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس میں کردار کا تجزیہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ کیا گیا ہے، وہ لڑکی جس کی کوٹھی کے ملحقہ باغ کی جھاڑیوں میں بدعادت مرغیاں انڈے دیتی تھیں، اس کی جوان نوکرانی کو انہی جھاڑیوں میں کسی نے قتل کر دیا۔ اس کے گلے میں سرخ پھندنے کا ازار بند تھا جو اس نے ایک روز پہلے پھیری والے سے خریدا تھا۔ بچپن کا یہ تجربہ اور گلی کے بھونکتے ہوئے کتے۔ ایک دن اس نے دونوں نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں جو اس کے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں۔ تب کتے بھونکنے لگے، نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے فرش پر اچھلیں۔ ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگ گئیں۔ کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے رہتے۔

اسی طرح ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' اور ''غالیچہ'' (کرشن چندر) آنندی (غلام عباس) اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن علامت اور استعارے کے لیے سب سے زیادہ سازگار ماحول اب اس وقت پیش منظر کے افسانے میں موجود ہے۔ اس لیے کہ گزشتہ برسوں میں تکنیک کے اس قدر تجربے ہوئے ہیں کہ علامت اور استعارے کی مناسب ترین کھپت ممکن ہے۔ ایک مدت تک علامت نگاری اور روایتی کہانی پن دو الگ الگ دھاروں کی صورت میں جعلی فضابندی کی تخلیق کرتے رہے ہیں۔ آج کہانی کی نچی بنت، اس کے تمام شیڈز کے ساتھ پیش منظر کے افسانے میں ممکن ہے کہ یہ اس عہد کی چیز ہے۔ آج کے افسانے میں تکنیک کا تنوع ہے۔ یہ افسانہ کسی منشور کے تحت نہیں لکھا گیا، اس لیے ہر افسانہ نگار نے پس منظر اور رواں پس منظر سے تربیت یافتہ ہونے کے باوجود اپنی خاص نفسیاتی افتادِ طبع کو آزمایا ہے۔ لیکن اب ابلاغ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ افادی ادب اور ترقی پسند افسانے کا بگڑا ہوا مزاج کسی طور نہیں مانتا۔ اس ضمن میں اپنے سے پہلے افسانہ نگار سے یہ گلہ ہے کہ اس نے نئے اظہار کی علامتی شکلوں کی وضاحت پورے طور پر قدم قدم نہیں کی۔ دوسری وجہ فیشن پرست ہیں جنہوں نے علامت اور استعارے کو اپنی طرزِ فکر، زبان کی اپنی روایات اور اپنی دیو مالا کے حوالے سے نہیں برتا۔ ابہام کی قابلِ مذمت صورت بے معنویت ہے اور اس کی ایک وجہ لکھنے والے کی ذاتی علامتیں ہیں جن کا تعلق غیر منطقی سوچ سے ہے اور جو تربیت یافتہ قاری کے لیے بھی مبہم رہ جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ افسانہ نگار کے لیے خود بھی وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہتی ہیں۔

ابہام کی ایک وجہ علامت اور استعارے کا تغیر بھی ہے۔ نئے افسانے کی علامتیں اور استعارے موجود صورتحال کا تجزیہ کرنے والے نئے ذہن کی پیداوار ہیں اور آج کا افسانہ نگار انہیں Life Symbols کے طور برتتا ہے۔ غیر تربیت یافتہ قاری جب تک اپنے آپ کو الفاظ کے مخصوص آہنگ کے ساتھ سیڑھیاں اترتا افسانے کی اندرونی ہیئت کے سپرد نہیں کر دیتا، افسانہ نگار تک رسائی ناممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ تو قاری کی تنہا زندگی ہے، نئے تجربے کا فقدان اور دوسری وجہ اس کی فکر کا زمانی تعصب۔ وہ آج بھی ماضی کا باشندہ ہے۔ اس کا بس چلے تو آج ریڈیو کمرشل سروس سے کانن بالا، خورشید اور کندن لال سہگل نشر کرے۔

ابلاغ کے ضمن میں ایک مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ تخلیق کار کے نادر افکار کے مکمل ترین اظہار کی صورت شاذ ہی سامنے آتی ہے ورنہ کوئی نہ کوئی پہلو ضرور تشنۂ اظہار رہ جاتا ہے اور سرتوڑ کوشش کے باوجود خیال اپنی تمام جہتوں کے ساتھ ظاہر نہیں ہو پاتا۔ ترسیل کی اس ناکامی کا ایک سبب شمس الرحمٰن فاروقی (ترسیل کی ناکامی کا المیہ) نے بولنے اور سننے والے کے درمیان مشترک نسب نما کا فقدان بتایا ہے۔ اس طرح جب ترسیل ناکام ہو گی تو ابلاغ بھی ناکام ہو گا۔ آج کے حالات بھی ادب کے لئے آئیڈیل نہیں۔ چونکہ آئیڈیل حالات میں بھی مکمل ابلاغ ناممکن ہے اس لیے موجودہ حالات میں ابلاغ کی سطح اور بھی گر گئی ہے۔

پھر فن کار یہ قیاس بھی کر لیتا ہے کہ جس انفرادی نوعیت کے تجربے کو وہ پیش کر رہا ہے، قاری اس کی نوعیت سے آگاہ ہے۔ یہ مفروضہ ترسیل کے مختلف ابتدائی نوعیت کے مراحل کو نظر انداز کرنے کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے میں قاری پہلی منزل پر رہ جاتا ہے اور مکمل ابلاغ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

بعض اوقات تجربے کے شخصی اظہار میں فن کار کے انتہائی نجی محسوسات قاری کی گرفت سے باہر رہتے ہیں۔

ابہام کے پیدا ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ فن کار تخلیقی عمل کے وقت محسوس کو خارجی متعلقات سے قطعی طور پر کاٹ دیتا ہے تب اس کا استعاراتی نظام قاری کی پہنچ سے باہر رہ جاتا ہے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ لسانی تشکیل کا عمل ہی زبان کی زندگی کا باعث ہے لیکن تشکیلات کا عدم توازن بھی ابہام کا باعث بنا ہے۔ ایسی مثال اس مقام پر ظاہر ہوتی ہے جب فن کار کا برتا ہوا لفظ انتہائی نجی محسوسات کا اظہار کرتے ہوئے گرد و پیش سے اپنی جڑیں ختم کر لیتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ کہ تخلیقی عمل میں اظہار کو اولیت اور ابلاغ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ عام بول چال میں جس طرح ابلاغ کو اولیت حاصل ہے اور اظہار کو ثانوی حیثیت، اور یہاں معاملہ الٹ ہے۔ بقول سجاد باقر رضوی ہر تخلیقی عمل، حیاتیاتی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پہلے اظہار ہے اور بعد میں ابلاغ۔ بالکل اس معصوم بچے کی طرح جو پہلے اظہار کرتا ہے اور بعد میں ابلاغ بھی چاہتا ہے۔ سو بالغ تخلیقی عمل پہلے اظہار ہے اور بعد میں ایک خاص سطح پر ابلاغ، جس کے لیے قاری، ناظر اور سامع کو بھی پیش قدمی کرنا ہے۔ اظہار محض بچپنے کی نشانی ہے جس کی مثالیں بڑی آسانی سے ہم عصر ادب میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

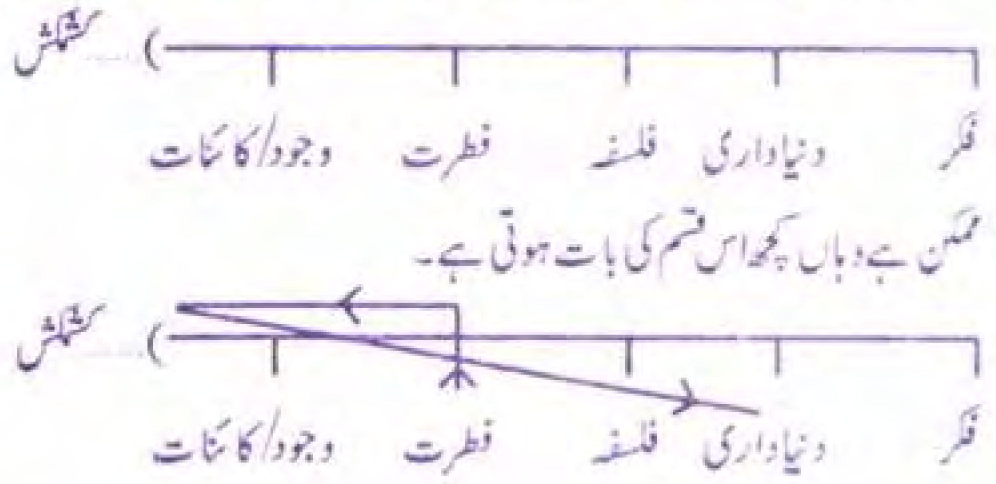
دراصل ہر نیا فنکار جس کا طریق ادراک نئے عہد سے مطابقت رکھتا ہے، اپنے سے پہلی نسل کے ہم عصروں کے لیے الجھا ہوا رہتا ہے جبکہ فوراً بعد آنے والی نسل کو اس کا پروردہ کہنا چاہیے، وہ اسے خوب سمجھ رہی ہوتی ہے۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ فن پارے کو پرکھنے والے قاری کا ذہنی رویہ وہی ہونا چاہیے جو فنکار کا تھا۔ قاری کے ابلاغ کے ضمن میں بے اعتنائی برتی گئی۔ قاری کی تربیت کا مرحلہ ہمیشہ سے صبر آزما رہا ہے۔ ہمارا قاری تو ابھی پورے طور پر ابتدائی دور کے افسانوی ادب کے مزاج اور علامتوں سے نابلد ہے اور آج کا افسانہ نیا طرز احساس مانگتا ہے۔

ہر سطح کے قاری کو مطمئن کرنا بھی فنکار کا کام نہیں۔ کیا نظم اور غزل کے صاحب طرز شاعر مجید امجد کی غزلیں تمام لوگوں کے لیے ہیں؟ قاری کو اپنے ذوق کی تربیت بھی کرنی چاہیے، ابلاغ کے سلسلے میں اسے فنکار کا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ ادب کا معاملہ تو افہام و تفہیم کا معاملہ بھی ہے، دوستی کا ہاتھ دونوں طرف سے بڑھنا چاہیے ورنہ مسلسل ارتقاء پذیر زندگی ٹھہر نہیں جائے گی اور فنکار قاری کا انتظار نہیں کرے گا۔

ترسیل کی ناکامی کی ان بنیادی وجوہات میں آج کے افسانے کی تکنیک اور اسلوب کے نقائص بھی ایک وجہ ہو سکتے ہیں لیکن کیا منٹو اور بیدی اس سے مبرا ہیں؟ میں یہاں بے ہیئت، وحدت تاثر سے خالی، کہانی پن سے عاری افسانے کی حمایت نہیں کروں گا۔ لیکن نہ ہی میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ماضی کے فنی اصولوں کو بلا ضرورت برتا جائے۔ میں معیار کی شناخت کرانے سے بھی معذور ہوں۔ اس لیے کہ اعلیٰ قدر کی پہچان ممکن ہے، اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

میرے نزدیک کوئی افسانہ محض اسلوب اور تکنیک کی قلابازی نہیں ہوتا، اس لیے کہ لایعنی افسانہ لکھنا ایک بددیانتی ہے اور فنکار سے اس کی توقع، میں نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اظہار مکمل طور پر نہ کیا جا سکا ہو، ابہام ہو۔ اکرام باگ کے افسانے ''عکس فنا'' (شب خون) سے مثال:

''افسانہ شروع ہوتا ہے: فرض کیجئے: وہاں ایک تنویمی ماحول میں ایک ایسی تختی رکھی ہوئی ہے۔



ممکن ہے وہاں کچھ اس قسم کی بات ہوتی ہے۔

حقیقت: اس کائنات پر ٹکرانے سے ایک لمحہ پہلے اور اس کو ایک لمحہ چھوڑنے سے پہلے وہ مکمل ''کیوں'' بن گیا تھا۔''

(اکرام باگ۔ ''عکس فنا'')

دوسری مثالیں: انور سجاد کا افسانہ ''کیکر''، بلراج منیر کا افسانہ ''کمپوزیشن چار'' اور سریندر پرکاش کا افسانہ ''جپی ژاں'' ابہام کے نیم روشن اور نیم تاریک بوجھل دھند لکے میں لپٹے ہوئے ہیں۔

ابہام کی مندرجہ بالا چار مثالیں میں نے کامیاب علامت نگاروں سے پیش کی ہیں۔ لیکن ایسے ناکام تجربے کامیاب اظہار کے لیے ضروری بھی ہیں۔ انہی کے طفیل اکرام باگ ''اسم اعظم'' انور سجاد ''کونپل'' بلراج منیرا ''کمپوزیشن دو'' اور سریندر پرکاش ''رونے کی آواز'' تخلیق کر پائے ہیں۔ تخلیق کار جن تجربات سے گزرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد ان تجربات سے گزرے، عام فرد وہ ذہنی اور جذباتی سطح بھی نہیں رکھتا جو فنکار کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن فنکار کے تجربات انسان کے اس اجتماعی لاشعور میں ڈوب کر ابھرتے ہیں، جس میں تمام انسان حصہ دار ہیں۔ اس لیے سطح خواہ کوئی سی ہو اعلیٰ تخلیق غیر تربیت یافتہ قاری پر بھی کم یا زیادہ اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔ پیش منظر کے افسانے کی موسیقیت اور الفاظ کی نشست و برخاست اس کی مثال ہے۔ آج افسانے کی نثر میں نظم کے بیچ خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا، اس لیے کہ یہ کام نثر کے منصب کو گھٹاتا ہے۔ نثر اور نظم تصویریت، آہنگ اور ترنم کے راستوں پر چلتی ایک ہو رہی ہیں۔

''زمین تا حد نظر، نظروں کے ہر زاویے کی حد میں، ان گنت رنگوں کے ملبوس میں، سبز لکیریں، پیلے دائرے، گلابی تکونیں، کالے، لال، سفید، بینگنی نکتے ...... پوجا کے رنگ۔ ہوا، دھیمے دھیمے بہتی ہوئی سیٹیاں بجاتی ہوئی۔

باس، نا آشنا سرور انگیز

پھول، پیڑ اور پودے، حیران۔ تنہائی، پریشانی، اداس لرزاں۔

کھوئی ہوئی پگڈنڈیاں، بھولے بھٹکے راستے، دھوپ، پیلی اور مدھم

میں وہ دنیا دیکھا کیا، دیکھا کیا، جگ بیتتے گئے۔''

(''میرا نام میں ہے۔'' بلراج مین را)

لیکن اس ضمن میں بیشتر افسانہ نگار محض بھیڑ چال میں مارے گئے اور قاری نے عدم ابلاغ کا شور مچایا۔

افسانے میں وحدت تاثر بنیادی شرط ہے، جس پر پیش منظر کا افسانہ اس لیے بھی پورا اترتا ہے کہ افسانہ نگار کی ظاہری صورتحال کے

ساتھ باطن سے بھی افسانہ گزر رہا ہے۔ اس طرح اس کا تاثر پائیدار ٹھہرتا ہے۔ بات اس طرح واضح ہوگی کہ ترقی پسندوں کے نزدیک افسانہ محض پہلے سے طے شدہ اندازِ نظر کے ساتھ خارج کا تجزیہ تھا یا رومانی افسانہ سراسر باطن میں غوطہ، جس کا خارج سے ناطہ ٹوٹ گیا تھا۔ افسانہ چاہے جیسا بھی ہو استعاراتی، علامتی یا تجریدی، ضرورت باہمی رابطے کی ہے۔ میری مراد یہ نہیں کہ ہم عام قاری سے گلے ملتے ملتے ماضی کی طرف لوٹ چلیں، جہاں ہمارا قاری ابھی تک پھنسا ہوا ہے اور یہ نیک کام ہم صرف اپنے افسانے میں (پڑھے جانے کی صلاحیت) پیدا کرنے کے لیے سرانجام دیں۔ نہ ہی میری مراد یہ ہے کہ محض ''نئے'' پن کی رو میں عجز بیان کا شکار ہو جائیں۔ اُردو افسانے سے جس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

جدیدیت کا نعرہ لگانے والوں نے روایت سے بغاوت کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ افسانے میں اف..ہ ہی اپنا پتا نہیں دیتا۔ اینڈرسن نے پلاٹ کو افسانے کے لیے زہر کہا اور ای ایم فوسٹر نے کہانی پن کی جگہ نغمگی اور سچ کے ادراک کی خواہش کی۔ کہیں اس نہج پر چلتا ہوا ہمارا افسانہ امریکی ڈرامے کا نیا فنامنا ''The un-comfortable Theater'' نہ بن جائے۔

ہمارے ہاں افسانہ پہلے وقوعہ کی صورت تھا، پھر خارجی ماحول کا عکس بنا اور اس کے بعد منٹو کے عہد میں صرف کرداروں کا تجزیہ رہ گیا۔ پیش منظر کے افسانے میں یہ تینوں عنصر روایت کے ساتھ سمبندھ کے باعث اور رواں پس منظر کے طور پر موجود ہیں۔ پیش منظر کے حقیقی افسانے کی کہانی ڈھانچے کی مانند پس منظر میں موجود ہے اور سامنے کا منظر اور واقعات دھندلے اور کردار محض ہیولے ہیں۔ ایسی صورت میں کہانی Under Curent چلتی ہے اور افسانویت کی مانگ اپنی جگہ موجود۔

اس کا باعث وہ ''نئے افسانے'' ہیں جو محض افسانہ لکھنے کی خواہش میں لکھے گئے، ان پر خوبصورت طنز عصمت چغتائی نے ''سانپ کے تلوے'' اور منظر امام نے ''کہانی نامکمل ہے'' لکھ کر کی ہے۔ جب کہ کہانی کا احیا ہم عصر تناظر کے افسانے کو وقیع بناتا ہے۔ مثال کے طور پر ظہور الحق شیخ (دھبے)، قمر عباس ندیم (تھکی ہوئی زخمی شام)، رام لعل (چاپ)، شمس نعمان (سون مکھی)، کلام حیدری (صفر)، سمیع آہوجہ (دوربین چھوٹے شیشے، بڑے شیشے)، قمر احسن (صدیاں)، شعیب شمس (سک رمولی)، احمد جاوید (کبوتر)، بدیع الزماں (کتھارسس)، طاہر مسعود (سمندر کی جھیل)، عبدالصمد (بے کار لوگ)، شوکت حیات (گنبد کے کبوتر)، نیر مسعود (مسکینوں کا احاطہ)، تقی حسین خسرو (کھانسی)، ساجد رشید (مکڑیاں)، سید محمد اشرف (تلاشِ رنگِ رائیگاں)، خالد جاوید (کوبڑ)، غضنفر (کڑوا تیل)، صدیق عالم (فورسپس) اور امجد طفیل (مچھلیاں شکار کرتی ہیں)۔

پیش منظر کے افسانے کی تکنیک، علامتیں اور استعارے عصری تقاضوں کے تحت ہیں۔ اگر انہیں 1936ء کی صورتحال میں زندگی کرتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ کبھی گرفت میں نہیں آئیں گی۔ تشبیہ، علامت اور استعارے کی الگ الگ وضاحت بھی ضروری ہے کہ انہیں ہمیشہ آپس میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔

علامت، استعارے کے بعد کا قدم ہے اور تشبیہ کے سلسلے کی آخری کڑی۔ علامت کی صورت میں تخلیق کار اور قاری کے درمیان مفاہمت کا ہونا ضروری ہے۔ جسے کالنگ وڈ نے Agreement کہا ہے لیکن یہ مفاہمت تو استعارہ میں بھی موجود تھی۔ ہم استعارے کی مفاہمت کو قانونی معاہدہ کہیں گے اور علامت کے ضمن میں غیر قانونی، علامت میں استعارہ کی طرح زبان و بیان کی پابندی ممکن نہیں۔ البتہ منطق کے اصول کی کڑی نگرانی ہوتی ہے جسے علامتی تحریک کے سرخیل، ملارمے نے نظر انداز کر دیا تھا اور اس طرح ذاتی افکار و تلازمات کی

طرف جھکاؤ بڑھ گیا۔ اسی طرح استعارہ کے مجازی معنی غیر تربیت یافتہ قاری کے لیے گمرہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں سے پہلی بار ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

علامت، لاشعور کو شعور سے وابستہ کرتی ہے لیکن نئے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے عصری شعور اپنے اندر سے گزارے۔ علامت کا استدلال قابل فہم بنایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے غیر استدلالی عنصر کی پورے طور پر وضاحت نئے طرز احساس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ علامت میں تاثراتی، اظہاری، شعوری و لاشعوری عناصر اپنے تمام تر تضادات کے ساتھ کارفرما رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ان کیفیات کے بیان پر قادر ہے جن کے لیے لفظی تصورات کا فقدان ہو۔ آج کے افسانے کی بڑائی یہی ہے کہ اس میں طرز احساس کی ہر نہج اپنا پتا بہم نہیں بناتا۔ یہ تو جسم اور نفس، عقل اور ہیجان، انبوہ اور تنہائی کے تضادات رفع کرنے میں مشغول ہے۔ آج کی علامتیں پرانی اصطلاحات کو ختم کرتے ہوئے زیادہ معنویت کے مترادفات پیش کر رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علامت نگاری، رومانیت کی مسخ شدہ صورت ہے۔ حالانکہ بقول نسیم بخاری ''رومانیت جس کلاسیکی مکتب فکر Calssicism کا پہلا ردعمل تھی، علامت نگاری اس کا دوسرا متوازی ردعمل ہے۔'' نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں تحریکوں کی سپلائی لائن ایک ہے اور نشو و نما کے زمانے مختلف، البتہ افسانے کا علامتی اظہار کئی اعتبار سے ترقی پسند تحریک کی ضد بنتا ہے۔ داخلی اور خارجی تجربات کی ضد، فنکار کی اپنی ذات اور اجتماع کی کشاکش، ذاتی علامتوں اور اجتماعی علامات کی ضد وغیرہ۔ دراصل علامتی اظہار ہے ہی معروضیہ کو پھلانگنے کا وسیلہ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے بھی علامت کا استعمال کیا ہے اور علامتی اظہار ترقی پسند اظہار کی ضد نہیں بنتا۔ حالانکہ میرا استدلال یہی ہے کہ ترقی پسندوں نے مجموعی طور پر اشاروں سے کام لیا ہے نہ کہ علامت سے۔ اکا دکا مثالیں یہاں اہمیت نہیں رکھتیں، ترقی پسندوں کے اشارے متعین تھے اور یہی ان کی ادبی کمٹ منٹ بھی ہے۔



علامت اور اشارے کا فرق بھی جاننے کی ضرورت ہے۔ یہ اپنے مفاہیم اور معنویت میں الگ الگ دائرۂ عمل کے حامل ہیں۔ ٹنڈل نے ''Litrary Symbol'' میں Sign کو اشارہ کہا ہے۔ ایسا جو کسی یقینی شے کی جانب ہو۔ سوسن کے لینگر کے نزدیک اشارہ کمتر درجے کا حامل ہے جو معنویت کے اعتبار سے ایک عام رشتہ ہے اور علامت اپنی وسعت میں تہ در تہ محسوسات اور احساسات کے پُراسرار سلسلوں تک رسائی رکھتی ہے۔ فرائیڈ علامت کو شے کا بدل (Substitution) اور موازنہ (Comparision) سمجھتا تھا جبکہ یونگ نے اس محدود تصور کو رد کیا اور یوں اشارہ اور علامت کا واضح فرق سامنے آیا۔

علامت (Sign) کی طرح ایک یقینی اشارہ تو مہیا کرتی ہے مگر اس کی معنویت یقینی نہیں ہوتی اس کا سفر ہمہ جہت ہے، اشارہ کی طرح واحد معنویت کی قید سے آزاد۔ مختلف اقدار اور نظریات کے حامل ذہن علامت سے اپنے اعتقادات کی روشنی میں مطالب اخذ کرتے ہیں۔ یورپ کی علامت نگاری کی تحریک کی طرح ہمارے ہاں بھی یک رخی، میکانکی سوچ کی ضد کے طور پر علامت نگاری کا رجحان پیدا ہوا اور پیش منظر کی صورت حال سے مطابقت کے باعث اہمیت اختیار کر گیا۔

استعارہ نادر افکار کی باریک ترین دلالتوں اور دقیق ترین کیفیتوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ استعارے کے برتاؤ سے لغوی مفہوم،

مجازی مفہوم کے تعین میں مدد دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی استعارہ کثرت سے اور بار بار استعمال کیا جائے گا تو ہم مخصوص لفظ کے استعاری مفہوم کو لغوی معنوں میں سمجھنے لگیں گے۔ متواتر مجازی معنوں میں مستعمل ہونے کے باعث اس کے مفاہیم میں ایک قسم کی عمومیت پیدا ہو جائے گی، فلپ ویگز نے ایسے الفاظ کو مرجھایا ہوا استعارہ کہا ہے۔ ہماری لغت گویا ان مُرجھائے ہوئے استعاروں کا ذخیرہ ہے۔ استعارہ تجریدی مشاہدے کا بہترین ثبوت ہے۔ یہ تمثیلی علامتوں کو استعمال کرنے کی قوت ہے۔ ہر نیا تجربہ یا نیا تصور سب سے پہلے استعارے کا روپ دھارتا ہے۔ پھر مرجھا کر لغوی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اس طرح یہ زبان کی زندگی کا قانون ہے۔

آج کے بکھرتے ہوئے فرد کے لیے لایعنیت میں مفاہیم پنہاں ہیں۔ وہ کسی ایک مخصوص خطۂ ارض پر زندہ نہیں، اس لیے کہ دور دراز کے رہنے والے براہ راست نہ سہی اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس بین الاقوامی فرد کے اظہار کے اسالیب نئے ہیں کہ وہ استعاروں میں سوچتا ہے۔ ایک مثال انور سجاد کے افسانے ''سنڈریلا'' کی بے بس لڑکی کا استعارہ ہے جو مامتا اور شفقت سے خالی دنیا کی بھیانک نقاب کشائی ہے۔ پیش منظر کے افسانے میں شعور کی رو کے تحت علامت اور استعارے کی کارفرمائی نے مزید جوہر دکھائے ہیں۔ اس خصوص میں حسین الحق، مسعود اشعر، شوکت حیات، شمس نعمان، علی تنہا، احمد داؤد، قمر احسن، غضنفر اور یوسف چودھری کے متعدد افسانے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔

شعور کی رو Stream of Consciousness فرائیڈ کے نظریہ لاشعور کی عطا ہے کہ شعور کی رَو، یورپ میں پرابلم ڈراموں کا باعث بنی اور سریلزم کو شہرت نصیب ہوئی۔ یہ موضوع سے زیادہ Method سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں دماغ میں آئے ہوئے بے ربط امور کو نئی ترتیب دی جاتی ہے۔ اس میں انتخاب اور تکرار کی اہمیت ہے۔ بیان کی بجائے اشارا اور فقرے کی جگہ جملے سے کام لیا جاتا ہے۔ شعور کی رو کی تصویروں میں ربط کسی منطق یا استدلال کی وجہ سے نہیں بلکہ ہر لحظہ ذہن کی بدلتی ہوئی کیفیت کے باعث ہے۔ اس طرح تصورات اور خیالات کا تلازم اور یادداشتیں، خارجی واقعات سب ایک ہی رو میں سامنے آتے ہیں۔ ہنری جیمز نے شعور کے مرکز کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرح وحدت کی وہ فنی گرفت سامنے آئی جو اس تکنیک کی جان ہے۔ شعور کی رو کا شعری طور پر اثر سب سے پہلے ڈی ایچ لارنس (Son And Lovers) مطبوعہ 1913ء کے ہاں نظر آتا ہے۔ پھر ڈورتھی رچرڈسن نے Pilgrimage (1915ء) لکھی اور جیمز جوائس نے 1916ء میں ناول ''A Portrait of the Artist as a Young man'' مکمل کیا۔ ورجینیا وولف کی ناول To the Light House کا سال اشاعت 1927ء ہے۔

شعور کی رو کے برتاؤ میں جوائس، ورجینیا وولف اور مارسل پروست کے ہاں افسانوی کردار محض ڈمی کا روپ رکھتے ہیں، اس طرح بخوبی لاشعور کی تجریدی کیفیت کا اظہار ممکن ہے۔ شعور کی رو کے سلسلے میں حسیاتی تاثر، داخلی خود کلامی اور داخلی تجزیہ کی تکنیک خاصی مقبول رہی ہے۔

حسیاتی تاثر (Sensory Impression) میں فنکار اپنی ذاتی زبان برتتا ہے جو ضروری نہیں کہ مروجہ لسانی پیرائیوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔ اس میں شاعری اور موسیقی کے اثرات نمایاں رہتے ہیں۔ ذاتی زبان برتنے کا تجربہ پہلی بار ''یولی سیز'' میں کیا گیا۔ گو جیمز جوائس کی زبان سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اس کا مخصوص آہنگ ذہن میں خاص قسم کی کیفیت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ہمارے ہاں قرۃ العین حیدر ہیں جو حسیاتی تاثر کی موسیقیت بھی رکھتے ہیں:

''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہم طامس بیکٹ کی ان بے چاری عورتوں کی طرح چلا رہی ہیں پتھر کو دھو، ہوا کو دھو، فضا کو دھو، ہڈیوں کو دھو، پتھر کو پتھر سے جدا کر کے دھو، جب میں پتھروں کو ہاتھ لگاتی ہوں تو ان میں سے خون رسنے لگتا ہے۔'' (''فصل گل آئی یا اجل آئی'')

داخلی خود کلامی (داخلی مونولاگ) میں افسانوی کرداروں کے شعور میں بہنے والے خیال کے حقیقی بہاؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل یہ زبان کی گرفت میں آنے سے پہلے ذہنی تصورات کی کیفیت ہے جسے نثر کی نسبت شاعری میں زیادہ کامیابی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس تکنیک کو برتنے والے افسانہ نگار شاعرانہ وژن کے حامل ہوتے ہیں۔ بقول جان گراس، یولی سیز کی خود کلامیاں اگرچہ کھردری اور نامکمل سی ہیں لیکن ان کا ڈھانچہ نہایت احتیاط کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ جوائس کا آخری ناول Finnegans Wake بھی اس کی مثال ہے۔ داخلی خود کلامی کی خوبصورت ترین مثال: ''ہیمنگوے کا ناول Oldman and the Sea ہے۔ اُردو میں اے حمید کی ''شہر اور گلیاں'' کے بعض حصے اور قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے ''شیشے کے گھر'' کے افسانے خصوصیت کے ساتھ ''یہ داغ داغ اجالا'' اس کی مثالیں ہیں۔

''داخلی تجزیہ'' میں کردار کے تجربہ اور تاثر کا خلاصہ تخلیق کار اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس طرح افسانوی کردار کی سوچ تک فنکار کی دسترس میں رہتی ہے۔ اس میں ذہن کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے جسے فرائیڈ نے قبل از شعور کا نام دیا تھا۔ شاعری میں اس کی مثال براؤننگ کی نظم ''Fralippo-Lippi'' ہے۔ اس میں اٹلی کے ایک قدیم مصور کو گرجا میں مقدس تصاویر بنانے پر مامور کیا گیا ہے، لیکن وہ اپنے داخلی اظہار سے مجبور ہو کر Nudes بنانے لگا۔ اس نظم کا موضوع مصور کے داخلی اظہار اور پادریوں کے احکامات کے درمیان کشمکش ہے۔ ہنری جیمز اور مارسل پروست نے اس تکنیک کو خوبی سے برتا ہے۔ اُردو افسانے میں اس کی خوبصورت مثال امجد الطاف کے دو افسانے ''چونے کی کلھیا'' اور ''آملیٹ'' ہیں۔

''تخلیق کار'' کا مقصد تشریح کرنا نہیں بلکہ محض اشیاء کے آہنگ سے مسرت حاصل کرنا ہے۔ تجرید کے بانی مصور مونے کا یہ قول تجرید کاری کی مکمل ترین تشریح ہے۔ اُردو افسانے کے پیش منظر میں کارفرما مصوری کی اصطلاح تجرید کا باقاعدہ تحریک کی صورت ابھرنا صرف اٹھہتر برس پہلے کا قصہ ہے، جب یورپ میں فطرت سے قریب مصوری نے آخری سانس لیے۔ یہ تحریک یکا یک Expressionism اور Cubism کے سنہری زمانے میں مصوری کی نئی کروٹ تھی۔ اسے فن برائے فن کی خوبصورت مثال کہہ لیجیے...... Cubism میں ہندسی اشکال کو اہمیت حاصل تھی یعنی مکعب نما دائرہ اور متوازی خطوط وغیرہ۔ روایت سے اس شدید بغاوت کا تعلق بہر طور فطرت سے ضرور تھا، تجرید Cubism سے آگے کا قدم ہے۔ اس میں فطرت سے رابطہ توڑ دیا گیا۔ اب آنکھ کی جگہ چہرے پر نہیں رہی وہ بدن کے کسی حساس حصے پر اُگ سکتی ہے۔

مصور سیزاں نے جب اس تحریک کا جواز مہیا کیا کہ ''تجرید حقیقت کی عکاسی نہیں ہے بلکہ ایک نئی حقیقی منطق کی رو سے اپنی حقیقت خود تخلیق کرتی ہے۔'' تو ہرایرے غیرے نے اس کام کو سہل جانا اور تصویر کو گورکھ دھندا بنا دیا۔ اس سلسلے میں دھوکہ دہی کا اعتراف پکاسو نے Living Museum کے ایک انٹرویو (1966ء) میں کیا ہے۔ تصویر کاری سے تجرید ادب تک پہنچی۔ ہمارے ہاں تجریدیت کی تحریک کا اثر براہ راست کم پڑا ہے لیکن ہمارے طریق ادراک میں بھی وہ عناصر جو تجریدیت کی تشکیل کرتے ہیں، بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر خود بخود شامل ہو رہے ہیں۔ یورپ کے ادب سے تجرید کی مثال پیش کرتے وقت عام طور پر فرانز کافکا کا نام لیا جاتا ہے جس کا طریقہ کار سریلسٹک ہے، یعنی تجرید اور سریلزم میں ہم فرق نہیں کرتے۔ سریلزم کو خواب اور حقیقت کا سنگم کہہ لیجیے، جس کا جنم تحت الشعور سے ہے، یعنی شعور اور لاشعور کا مقام اتصال، اس سرحد (تحت الشعور) پر تخلیق کار لاشعور کی گہرائیوں سے تخلیق کا مواد اخذ کرتا ہے یہ نہایت نازک مرحلہ ہے۔ اس میں کوشش کی جاتی ہے کہ خارجی دنیا سے تشکیل شعور کا عکس نہ پڑنے پائے۔ سریلسٹ فن کار ایک تو سامنے کی دنیا کی تصویر بناتا ہے اور ساتھ ہی دوسری دنیا کی تصویر بھی جو ظاہر حقیقت سے بالاتر ہے۔ کافکا کا انداز سرریلی ہے۔ اس لیے اس کے ناولوں میں اور کہانیوں میں باقاعدہ پلاٹ ہے اور واضح

کردار بھی۔ اس کے ہاں انسانی ذہنوں کے ان سربستہ رازوں کی نقاب کشائی ملتی ہے جنہیں ظاہر کی حقیقت (سماجی اقدار۔ جبر کی صورتحال) پنپنے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ لاشعور کے تہہ خانوں کی تڑپ ہے۔ آندرے برتوں نے 1924ء میں سریلزم کا جو باقاعدہ منشور پیش کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض طرزِ تخلیق نہیں بلکہ طرزِ زندگی بھی ہے۔ سریلسٹوں کے دو اسکول سامنے آئے، فوٹوگرافک اور غیر متشکل۔ چونکہ سریلسٹ اپروچ شعور سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس لیے پاگل پن، خواب، بیداری کے خواب اور خودکار تحریروں میں جھلک دکھاتی ہے مشہور سرریلسٹ بنجمن پریٹ کا ایک محاورہ مشہور ہے۔ ''اپنی ماں کو اس وقت پیٹو جب وہ جوان ہو۔''

فرانز کافکا اپنی ذہنی اُفتاد کے باعث اس میں کامیاب ہوا لیکن اس کی ادبی دنیا میں بے مثال کامیابی کا باعث اس کی کامیاب علامت نگاری بھی ہے۔

تجرید کے ضمن میں یہ کہنا کہ مصوری کے اس طریقہ کار کا اُردو افسانے میں منطقی جواز موجود نہیں، کامیاب تجریدی افسانوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ تجریدیت آج کے منتشر ذہن کی خوبصورت عکاس ہے۔ البتہ محض چونکانے والا کوئی بھی عمل دیرپا ثابت نہیں ہوتا اور تجرید کار کا ضرورت سے زیادہ داخلیت پسندی کی طرف جھکاؤ ابہام کا باعث بنتا ہے۔ کامیابی حسن انتظام کا نام ہے۔ تجرید، ضرورت اس وقت بنتی ہے جب موضوع کی ہمہ جہتی کا سامنا ہوتا ہے۔ غیر یقینی صورتحال کا بہر صورت یقین میں ظہور تجرید سے ممکن ہے۔ کامیاب تجریدیت کا ادب میں ظہور پذیر ہونا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ تمام فنون کا باہم رابطہ اعلیٰ فن پارے کے لیے ضرورت کے معنی رکھتا ہے۔ اس حوالے سے اُردو میں لکھے گئے تجریدی افسانوں میں ''غالیچہ'' (از کرشن چندر)، ''تہہ در تہہ'' اور ''کمپوزیشن: دسمبر 1964ء'' (از بلراج مین را)، ''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا'' اور ''ایک یادگار مخطوط'' (از مرزا حامد بیگ) نمایاں امثال ہیں۔

اُردو افسانے میں تکنیک کے تجربات کے ضمن میں ایک خوبصورت تجربہ تمثیل نگاری کا انداز بھی ہے لیکن یہ افسانے اخلاقی حکایتیں نہیں، یہاں کسی سوچے سمجھے منصوبے پر افسانہ نگار عمل پیرا نظر نہیں آتا اس لیے بھی کہ افسانے میں کسی قسم کا عقیدہ ٹھونسنے یا درس دینے کی گنجائش نہیں ہوتی، یہ کام صرف Science Fiction سے لیا جا سکتا ہے جس کی کامیاب مثال اُردو افسانے میں نہیں ملتی۔

ہمارے علامت نگاروں کے ہاں روزمرہ زندگی کے سامنے کے واقعات میں بھی اسرار دیکھنے کا میلان ملتا ہے۔ یہ خوبی تمثیل سے چن کر علامتی اور استعاراتی افسانے کے مخصوص رچاؤ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش ہے بالکل اسی طرح کمار پاشی، اکرام باگ، اسلم سلازار، احمد جاوید اور شفق اپنی تمثیلی کہانیوں میں علامت کا تڑکا بھی لگاتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جہاں کہیں علامت نگاری حد سے بڑھی، افسانے پر قاری کی گرفت نہیں رہتی۔ اس کی بڑی وجہ تمثیل میں علامت کا بے جوڑ ملاپ ہے۔ تمثیل کی پہچان کرداروں اور واقعات کے مفاہیم کا تعین اور اکہرا پن ہے۔ یہ کسی قسم کے داخلی الجھاوے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی، اس کے برعکس علامت انسانی زندگی سے قربت کے باعث واقعاتی صداقتوں سے دور رہتے ہوئے بھی انہیں سے طاقت پکڑتی ہے اور معانی کی تہہ در تہہ سطحیں واضح کرتی چلی جاتی ہے۔ ان چاروں تمثیل نگاروں کے تمثیلی کردار اور واقعات مخصوص معانی کو ہی سامنے لانے کی کوشش ہیں۔ مثال: کمار پاشی کے افسانے ''صد سطری حکم نامہ'' کا سرخ ٹائی باندھے مرکزی کردار جو بستی کے لوگوں کو بتاتا، پہاڑ سے اترتا ہے اور جس کے پاس ایک حکم نامہ (کورا کاغذ) ہے آخر میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے، یہ واضح طور پر ایک مذہبی اساطیری کردار ہے۔ لیکن اس کے برعکس علامتی افسانوں ''آخری آدمی''، (انتظار حسین) ''براوو۔ براوو'' (اسد محمد خاں) ''یوسف کھوہ'' (انور سجاد) ''بچھوؤں کی رات'' (انوار احمد) ''وجود'' (مشرف احمد) کے کرداروں کے

بارے میں ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے۔

پیش منظر کا افسانہ اپنے موضوعات، تکنیک اور اسالیب کے اعتبار سے غیر معمولی حد تک انوکھا اور تجرباتی ہے۔ یہ آج کی زندگی کے بطن سے جنم لینے والے تغیرات کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کا کوئی مخصوص جغرافیہ نہیں یہ امیجز کا سیل رواں ہے۔

پیش منظر کے افسانے میں گزشتہ سے پیوستہ معین اصولوں سے اختلاف کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں، اس لیے کہ افسانے کا منظر نامہ تبدیل ہوگیا ہے۔ روایت سے یہ انحراف روایت کی توسیع بن گیا ہے۔ اب بیانیہ کے یک رُخے انداز کی جگہ علامت اور استعارے نے تجریدی اور سرریلسٹ ورتارے نے لے لی ہے۔ پیش منظر کے افسانے میں برتا گیا لفظ اپنے معانی کے بطون سے جنم لیتا ہے۔ اکثر انتہائی اظہار کے لیے لفظ کی جو نشست و برخاست ضروری تھی وہی برتی گئی ہے۔ اس طرح متنوع، پیچیدہ اور معانی کے اعتبار سے دوررس واردات کا بیان دیکھنے والی آنکھ کے زاویہ نظر کے مطابق اپنی صورت بدلتا رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لیے فلابیر نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک خیال کو ادا کرنے کے لیے مخصوص الفاظ کی خصوصی نشست و برخاست معین ہے۔ یہاں لفظ کا جوہر متنوع Dimensions میں سفر کرتا ہے، جو تا حال بیسویں صدی عیسوی کے چھٹے اور ساتویں دہوں سے متعلق فعال افسانہ نگاروں کی پہچان ہے۔

یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ پیش منظر کے بیشتر افسانے میں ہمارا روایتی تہذیبی پس منظر غائب ہے، جس کی موجودگی افسانے کے قدیم تربیت یافتہ قاری کے لیے افسانے کی تفہیم کو آسان اور قابل قبول بنا سکتی تھی۔ یا پھر کم از کم اگر ہمارے ہاں تہذیبی یکسانیت ہوتی تو بھی بات بن جاتی۔ ماضی بعید میں تہذیبی یکسانیت کی بنیادیں تصوف نے فراہم کی تھیں، لیکن داراشکوہ کی شکست کے بعد ایسا بھی نہ رہا۔ آج کل فلسفہ اور مارکسزم کے حوالوں سے مذہب پر جس قدر بولا اور لکھا جاتا ہے یہ اس بات پر دال ہے کہ آج ہم مذہبی حقائق سے کس قدر دور نکل آئے ہیں۔

تہذیبی یکسانیت کا فقدان اور انواع واقسام کی نظریہ سازی نے اس صورتِ حال کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ کم از کم مجھے اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ مکمل ابلاغ اور افسانے کی تفہیم کی خاطر کوئی معیار یا پلیٹ فارم قسم کی چیز مہیا کردی جائے تو کیا اُلجھیڑوں کا حل نکل آئے گا؟ جن سے یہ ممکن ہے، ایسا کر دیکھیں۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ میرے معترضین کی ایک بڑی تعداد بہت ممکن ہے پاکستان کی بیشتر Intellect کی طرح کلچر اور تہذیب کے ناموں پر ہی سر پھٹول میں مصروف ہو اور 'پاکستانی کلچر' کی تلاش میں نکل کر تیل تلاش کرنے والی کمپنیوں کی طرح نتیجہ صفر سامنے لائیں۔

ہمارے افسانوی پیش منظر کا حال ایلیٹ کی اس شاعری والا ہے (خصوصاً مذہب کے حوالوں کے ساتھ) جس کا پیغام ہم تک نہیں پہنچتا۔ وجوہات وہی ہیں، ایلیٹ کے عہد کی تہذیبی یکسانیت کا فقدان اور نت نئی نظریہ سازی۔ Graham Hough ایلیٹ سے متعلق "Vision of doetrin in four quartets" لکھتے وقت ایلیٹ کے بار بار گرفت سے نکل جانے کا گلہ کرتا ہے۔ البتہ انگلیاں اُٹھا کر شور وغوغا نہیں کرتا اس لیے کہ Hough ہمارے نادان قاری کی نسبت اپنی تہذیبی روایت سے قریب ہے۔ سو ایلیٹ کو سمجھنا ہو یا ہمارے افسانوی پیش منظر کو، کامیابی اسی صورت ممکن ہوگی، جب ہم شش جہات میں سفر کرتی تہذیب پر نظر رکھیں گے اور ساتھ ہی مختلف النوع نظریہ سازی کو لگام دیں گے۔ اب آپ کہیں گے کہ پہلا کام نسبتاً آسان ہے جبکہ ہر دس سال بعد ''نیا ادب'' یا ''جدید ادب'' یا ''جدید ترین ادب'' کا نعرہ لگانے والوں کی نظریہ سازی سمجھنا سمجھانا مشکل ہے چہ جائیکہ اسے لگام دینا۔ آپ اگر ایسا ہی سوچتے ہیں تو آپ حق بجانب ہیں اور میں مانتا

ہوں کہ صورتِ حال کو بگاڑنے میں اس قاری کی طرف جو ہمارا دوست نما دشمن ہے، ایسے نظریہ سازوں نے زیادہ مصیبت کھڑی کی ہے جو یہ نہیں جانتے کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں۔ ان کو پیش آنے والے غیر معمولی اور معمولی حالات وواقعات ان کی نظریہ سازی پر اثر انداز ہوتے رہے۔ یہاں ثبوت کے طور پر افسانے کے پیش منظر پر نقادانِ فن کی تحریروں کا جائزہ لیجئے، وہ آج جسے "نیا افسانہ" کہتے ہیں۔ کل اُسے رد کرتے نظر آتے ہیں اور کل اس سے بڑھ کر Vague ہے۔

افسانے کے اس نئے منظر نامے سے پہلے ادب میں دو بڑی اور بہت واضح نظریاتی گروہ بندیاں موجود تھیں۔

۱۔ ترقی پسندی کا چلن زیادہ تھا بلکہ فیشن کی حد تک، اور

۲۔ کلاسیکی اندازِ نظر، روایت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا

ترقی پسندوں کے نزدیک ادبی نظریات کے ساتھ ساتھ مخصوص سماجی، معاشی اور سیاسی جغرافیہ بھی اہمیت کا حامل تھا۔ اس اندازِ نظر کا نتیجہ آدرش حقیقت نگاری تھی جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کے قد کاٹھ کی پیمائش کا پیمانہ بنی۔

دوسری طرف کلاسیکی اندازِ نظر رکھنے والے افسانہ نگاروں کے ہاں سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوالوں کے ساتھ نظریہ سازی ممکن ہی نہ ہو سکی۔ لے دے کر ایک مقام رہ گیا جہاں انہوں نے اتفاق کیا اور وہ تھا مذہبی عقائد اور اس سے متعلق میلانات کی تنگ تاریک راہداری۔ یہاں نئی پود کے لیے صرف اور صرف تشکیک اور بے یقینی رہ گئی نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ افسانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے بھی۔ یہ نسلیں پس منظر کے گہرے اثرات کے زیرِ اثر محض "رواں پس منظر" تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ تیسری دنیا میں زیست کا نیا منظر نامہ پرانی سچائیوں کو غلط ثابت کر رہا تھا، اور رواں پس منظر کی نسلیں حیران تھیں کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تو یہ کہا اور مانا جاتا تھا کہ:

"The system works, with reservations."

لیکن اب کہا جا رہا تھا: "The system does not work, but used to"۔ مقابلے کا رجحان اپنے معانی بدل چکا تھا، اس لیے کہ "محنت" بہترین نتائج سامنے نہیں لا رہی تھی۔ کام اپنے طور پر ایک اہم قدر نہیں رہ گئی تھی۔ ماضی سے آواز آتی تھی: "آزادی روپے پیسے کی دین ہے، جس قدر روپیہ اسی قدر آزادی اور بے فکری۔" لیکن اب سچائی یہ تھی کہ:

"Freedom is a state of mind, it requiers only minimum money, hunting aftar money and success curtail freedom."

اور اس طرح کی سینکڑوں عالمی سچائیاں ایک ایک کر کے بے نقاب ہو چکی تھیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اس صورتِ حال کو سمجھنے کی بجائے افسانے میں انفعالیت اور ماضی پرستی نے راہ پائی بلکہ ایک حد تک ہیجانی جذبات کی عکاسی بھی ہوئی۔ دیگر کاٹھ کباڑ کو تو چھوڑیئے قرۃ العین حیدر اس سے نہ بچ سکیں اور جس نے اس طرف اشارہ کیا وہ انتظار حسین تھے۔ اور پھر انتظار حسین بھی رفتہ رفتہ ماضی کے اسیر ہوئے، سوائے دو افسانوں کے۔ یہاں میرا اشارہ "دوسرا راستہ" اور "صبح کے خوش نصیب" کی طرف ہے۔

انتظار حسین کے سفر کی ایک جہت البتہ ایسی ہے جو اُن کے بیان کو "کتھا" سے قریب رکھتی ہے خصوصاً "ہمسفر"، "سوئیاں" اور "گھوڑے کی ندا" جیسے افسانے۔ "کچھوے" انتظار کی افسانہ نگاری میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے نمایاں موڑ ثابت ہونے کے ساتھ

ساتھ بھاری اعتراضات کی گنجائش بھی پیدا کر گیا۔ پہلا اعتراض یہ کہ اب انتظار حسین نے جان بوجھ کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مائیتھالوجی کے حوالے سے لکھنا چاہا ہے اور یہ شعوری کوشش قابلِ قبول نہیں۔

ایک نظر انتظار حسین کے افسانہ ''کچھوے'' پر ڈال لیجیے:

''ودیا ساگر چپ ہو گیا تھا۔ اس نے بھکشوؤں کو اونچی آواز سے بولتے سنا۔ لڑتے دیکھا۔ اور چپ ہو گیا۔ سنتا رہا دیکھتا رہا اور چپ رہا۔ پھر اُن کے بیچ سے اُٹھا اور نگر سے باہر باسیوں سے دور ایک مثال کے پیڑ کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ گیا، اور کنول کے ایک پھول پر نظریں جمائیں جو پھولا، مسکایا اور مرجھا گیا۔ ایک پھول کے بعد دوسرا پھول، دوسرے کے بعد تیسرا پھول۔ جس پھول پر وہ درشٹی جماتا وہ پھولتا، مسکاتا اور مرجھا جاتا۔ یہ دیکھ کر اس نے شوک کیا اور آنکھیں موند لیں۔ نسدن آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔''

افسانہ ''کچھوے'' اور ''واپسی'' جاتک کہانیوں سے مرصع ایک ایسی رَو ہے جو بدھ بھکشوؤں کے تجربات سے بہت قریب ہے اور ہندی زبان کا ورتارا اس کی ایک اضافی خوبی۔

میں تو اس سارے کام کو جڑوں کی تلاش ہی گردانتا ہوں اور حال کے لمحے میں ٹھہرے انتظار حسین کے ماضی کے حوالے سے مستقبل کی جانب روشن اشارے۔

سو بات چلی تھی ماضی پرستی سے اور یوں قرۃ العین حیدر کے ساتھ انتظار حسین اور افسانوی تدبیر کاری زیرِ بحث آ گئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، افسانے کے پیش منظر میں داستانوی تدبیر کاری یا Allegorical Treatment کا معاملہ ہے تو اُردو افسانے کے نئے نام کمار پاشی، احمد جاوید، شفق، سلام بن رزاق، اسلم لازار اور علی حیدر ملک اس راہ پر چلے ہیں۔

''مگر مچھ کا یہ دار بہت صاف اور تیکھا تھا۔ شدید تکلیف سے اُن کے لہو میں گرہیں پڑ گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غصہ، ذلت اور ندامت نے ان کی عجیب کیفیت کر دی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کوئی انہیں رسی کی طرح بٹتا جا رہا ہے، مگر وہ کیا کر سکتے تھے کہ ان کے پاس نہ سانپ کا سا پھن تھا، نہ بچھو کا ڈنک، البتہ وہ چیخ سکتے تھے کہ اب اُن کی چیخ ہی اُن کے وجود کی گواہی بن سکتی تھی۔''

(''ندی'' از سلام بن رزاق)

دوسری مثال اسلم سلازار کا ''گورکن'' ہے۔ اس روایت میں کمار پاشی کے افسانے نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں اور تقریباً تمام تر افسانے اس تدبیر کاری کی مثال، لیکن کمار پاشی کے ہاں تمثیل نگاری میں علامت سازی کا بے جوڑ ملاپ خاصا کھلتا ہے۔

یورپ کے افسانوی ادب میں آرویل کا 'Animal Form' اور Brave New World جیسے نمایاں ناول داستانوی فضا کے حامل ہیں۔ اسی طرح آئرس میڈوک کے دو ناول 'Unicorn' اور 'Sveard Head' داستانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے اور 'Be!!' فینٹسی سے قریب تر ہونے کے سبب بہت نمایاں ہے، اور گولڈنگ کے 'Lord of Flyes' کی فنٹاسٹک اپروچ نے تو یورپ میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کیا۔ 'Lord of Flyes' میں معصوم بچوں کی موجودگی اور سؤر کا کٹا ہوا سر چورا ہے کے بیچ لٹکتے ہوئے جس طرح محض سؤر کا سر نہیں رہتا بلکہ لاتعداد علامتوں میں بٹ جاتا ہے بالکل اسی طرح اُردو افسانے کے نئے منظر نامے میں یہ تدبیر کاری ماضی کی اسیری قرار نہیں پاتی۔ میں تو اُسے صنعتی دور کا لامحالہ نتیجہ قرار دوں گا۔ یہ صنعت کا ہی کیا دھرا ہے کہ ہر کوئی 'Mind your own business' کا راگ الاپتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر داستانوی تدبیر کاری اور 'Allegorical' طریقہ کار صنعتی دور کے شعور کے خلاف لاشعور کی بغاوت بن کر اُبھرتے ہیں۔

سریندر پرکاش کا افسانہ 'بازگوئی'، اس صنعتی دور کی ذہنیت اور سیاسی روش کے خلاف باغیانہ ردِعمل کا خوبصورت ترین عکاس ہے۔ میں تو کہوں گا کہ ایسا افسانہ لکھ لینا خاص توفیق ملنے کی بات ہے اور اس کا انحصار کسی حد تک تخلیق کار کے اندرونی جوار بھاٹے پر بھی ہے۔ یہ ایک ایسے حسی نظام کی عطا ہے، جس کا واحد فعل دنیا کے بارے علم اکٹھا کرنا نہیں۔ یہ خصوصی حسی نظام زندگی گزارنا نہیں زندگی کرنا سکھاتا ہے۔

زندگی کرنے اور زندگی گزارنے میں جو فرق ہے وہ تخلیقی سطح پر زندہ رہنے اور عام انسانی سطح پر پیدا ہو کر آدھی زندگی سو کر گزار دینے اور باقی زندگی معاشرت سدھار تنظیم کے رکن کی حیثیت سے دن پورے کرنے میں ہے۔ بہت ہوا تو کچھ لوگ چائے کی پیالیوں پر گپ شپ کی خاطر اپنے سامنے کے مشاہدات پر تکیہ کر لیتے ہیں۔ یہاں Robert E. Ornstein نے سوال اُٹھایا ہے کہ کیا ہمارے حسی نظام کا واحد فعل دنیا کے بارے میں عمومی معلومات اکٹھی کرنا ہی ہے؟ ایسا یقیناً نہیں ہے، یہ مانا کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کہ دنیا کے بارے علم اکٹھا کرنا تجسس کے پیشِ نظر ہے اور حسیات کا عمل دخل اس کام میں سب سے زیادہ ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارا حسی نظام اپنے روزمرہ کے بالکل برعکس بھی عمل پذیر ہوتا ہے اور اس کا علم سامنے کے مشاہدات پر تکیہ کرنے والوں کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے نزدیک انتظار حسین کے 'لمبا قصہ' سریندر پرکاش کے 'رونے کی آواز' خالدہ حسین کے ''سایہ'' اور خود میرے افسانے ''سونے کی مہر'' کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک ہمارے اندرونی جوار بھاٹے کے کوئی معنی نہیں۔ دوسری طرف سیدھی سادی کومٹ منٹ کے افسانے انہیں سمجھ میں نہیں آتے اس لیے کہ ان کے کندھوں نے کبھی کومٹ منٹ کا بوجھ نہیں سہا۔

دنیا کے بارے میں ہمارا عام شعور انتخابی بھی ہے اور نظامِ حس کی اپنی خصوصیات کے تحت محدود بھی۔ یہ بات پہلے بھی کہی جاتی رہی ہے لیکن ماضی قریب میں اس کے صحیح عضویاتی ثبوت بھی میسر آ گئے۔ Huxley اور Broad نے برگساں Bergeson کے ''عمومی نظریہ شعور'' کی وضاحت کی ہے (برگساں کے نزدیک ذہن ایک سکڑنے سمٹنے والا آلہ'' ہے) ہکسلے نے The doors of reception of heaven and hell' میں کیمبرج کے ڈی۔ سی براڈ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''دماغ اور نظامِ عصبی کا کام ہمیں علم کے اس بڑے ذخیرے سے خوفزدہ اور پریشان ہونے سے بچانا ہے۔ جو زیادہ تر زاید اور غیر موزوں ہوتا ہے، اکثر باتوں کو ہمارے ادراک اور حافظے کا مستقل حصہ بننے سے روک دینا اور صرف اس بہت تھوڑے سے خصوصی انتخاب کو اجازت دینا جو عملی طور پر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔''

یہاں دماغ اور نظامِ عصبی کی کارکردگی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ زیادہ غور طلب بات وہ 'زائد اور غیر موزوں' محسوسات ہیں۔ جن کی ضرورت انسان کو عام حیوانی سطح کی زندگی گزارنے میں کبھی محسوس نہیں ہوتی یا نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ چائے کی پیالی پر 'گپ شپ' یا پیدا ہو کر آدھی زندگی سو کر اور باقی کھانے پینے اور گزر جانے کی صورت میں دنیا سے محض واجبی سی (ضرورت کے مطابق) آگہی کافی ہے، باقی اس کے لیے 'زاید اور غیر موزوں'۔

براڈ سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے ہکسلے لکھتا ہے: ''اس نظریئے کے مطابق ہم میں سے ہر شخص ممکنات کی حد تک 'Mind at large' ہے۔ لیکن جہاں تک ہم حیوان ہیں، ہمارا مقصد ہر طرح سے یہ ہے کہ ہر طرح سے زندہ ہیں۔ عضویاتی بقا کو ممکن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس 'ذہنِ وسیع' کو دماغ اور نظامِ عصبی کے 'Reducing Valve' میں سے گزارا جائے۔ اس عمل میں سے گزرنے کے بعد دوسرے سرے پر جو کچھ باقی بچ نکلتا ہے وہ ننھا قطرہ ہے، جسے ہم 'شعور' کا نام دیتے ہیں۔ جو ہمیں اس مخصوص سیارے پر زندگی کرنے میں مدد دیتا ہے۔

سارتر کے فلسفے کا مرکزی نکتہ ہی یہ شعور ہے'' جسے اس نے عدمیت'' کا نام دیا۔ سارتر کے نزدیک وجود ساکت و جامد کائنات ہے اور شعور اس بے جان و بے شعور وجود کی نفی۔ یہ وہ خلاء ہے جو ساکت و جامد کائنات ہے اور شعور اس بے جان و بے شعور وجود کی نفی۔ یہ وہ خلاء ہے جو ساکت و جامد کائنات میں پیدا ہو کر'' جہان من و تو'' خلق کرتا ہے۔ یہ کسی لمحے بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا، اس کا سفرِ تکمیل دراصل اس کی عدمیت کی دلیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو لہٰذا یہ (انسانی شعور یا خود انسان) بھی بذاتہ، بے جان و بے شعور وجود میں تبدیل ہو جائے۔ شعور، ارادے، اختیار اور آزادی کا مظہر ہے بلکہ مجسم اختیار۔ ہیڈیگر کے نزدیک شعور ذات ہیبت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جبکہ سارتر کے نزدیک کرب سے گزر کر۔ یہاں 'کرب' سے سارتر کی مراد عدم وجود کی صورت میں اپنے مستقبل کے ہونے کا شعور ہے۔

سو یہ شعور جو ہمیں زندگی گزارنے میں مدد دیتا ہے وہ تخفیف شدہ آگہی ہی ہے۔ جس کے اجزا کا صحیح طور پر بیان اور اس کا اظہار کرنے کے لیے انسان نے اشاروں اور کنایوں کا وہ نظام وضع کیا جس کی تفصیلات بالآخر زبانوں کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

یوں تو عالمی سطح پر ہر شخص اس لسانی روایت کا جس میں کہ وہ پیدا ہوا بیک وقت Benificiary اور Victim ہوتا ہے۔ جہاں زبان اسے دوسرے لوگوں (تمام انسانی برادری) کے تجربات کے جمع شدہ ذخیرے میں شریک بناتی ہے وہاں اس کا یہ یقین بھی پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ تخفیف شدہ آگہی ہی سب کچھ ہے۔ اس طرح ہر فرد لسانی روایت کا کچھ اس طرح شکار ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے محدود تعقلات کو 'سب کچھ' سمجھ بیٹھتا ہے اور دوسری طرف لفظ کو 'شے' یا 'جذبے'' کے متبادل خیال کرتا ہے۔

''تیسری دنیا'' (گروپ ۷۷) کے پسماندہ ممالک (جن میں لاطینی امریکہ، ایشیاء اور افریقہ کی محکوم اور کچلی ہوئی آبادیاں شامل ہیں) میں اس لسانی روایت کو انسانی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے، اور ان محکوم کچلی ہوئی آبادیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے خود ہمارے خطے سے بھی اس کی مثالیں ایک ڈھونڈے ہزار ملتی ہیں۔ ان محدود تعقلات کے اسیروں اور لفظ کو'' شے'' یا'' جذبے'' کا متبادل سمجھنے والوں کی محض ایک جھلک دیکھنے کے لیے بھی سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔

پتا چلا کہ'' نئے پن'' کے ڈھول پیٹنے سے بھی روایت میں توسیع ممکن نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ'' نئے'' افسانہ نگاروں نے اپنے گرد و پیش کی عکاسی بہت اچھی طرح کی ہو، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے محکوم کچلی ہوئی آبادیوں کی نفسی کیفیت کو دیکھ پرکھ کر کوئی نیا رُخ دینے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ کہ وہ فکری رُخ اُن کا جینا بھی آسان بنا دیتا، وہ زندگی کو'' گزارنا'' نہیں،'' کرنا'' سیکھتے، نزولِ تخلیقی عمل سے گزرتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں نہ ممکن ہو سکا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قلم کار کے محدود تعقلات ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ وہ لفظ کو جذبے کا متبادل خیال کرتے رہے یا شاید اس لیے کہ مینی فیسٹو کے پابند ترقی پسندوں اور اُن کے رواں پس منظر کے بیشتر افسانہ نگاروں نے وہ زبان برتی جو لغت کی پابند زبان تھی، اس طرح یہ مردنی تخلیقی عمل کا مقدر ہوئی اور کیسی عجیب بات ہے کہ اس عمل قبیح سے گزرنے کا واحد سبب'' ابہام'' کے پیدا ہونے کا خوف تھا۔ یہ جسے مذہب کی زبان میں'' یہ دنیا'' کہتے ہیں، تخفیف شدہ آگہی کی کائنات ہی رہی، جس کا اظہار زبان کے ذریعے کیا گیا اور جسے زبان نے ہی محدود تر کر کے رکھ دیا۔ جبکہ'' دوسری دنیائیں'' (جن سے بنی نوع انسان اپنے محدود تر وسائل کے سبب عجیب اور بے ہنگم طریقے سے رابطہ قائم کرنے میں جتا ہوا ہے) خاص طرح کی معنویت کی حامل ہیں۔ یہ دراصل اُس آگہی کے کل کے ہی ایسے اجزاء ہیں جس کا تعلق نفسِ وسیع سے ہے۔ بیشتر لوگ بعض اوقات محض وہی کچھ جانتے ہیں جو کچھ کہ انھیں'' ذہن کے تخفیفی والو'' کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور جسے خصوصاً ہمارے ہاں، ان کی

علاقائی زبان خالص اور اصلی ہونے کا تقدس بخشتی ہے۔

اس گری پڑی دنیا کے نزول تخلیق کار ایسی اضافی صلاحیت کے مالک ہوتے آئے ہیں جو ذہن کے اس ''تخفیفی والو'' کو چکمہ دے سکتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کا اظہار ان کے ہاں ایسی زبان کا ورتارا سامنے لاتا ہے جو سراسر ترسیل معنی کی حدود میں قید دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ تصورات اور احساسات کی ایسی پیشکش ظہور پاتی ہے، جس کا منطقی پیرا فریز مشکل ہوتا ہے لیکن جو اپنے سامع اور قاری کے تعلقات کو محدود سے لامحدود کی راہ دکھاتی ہے اس کی ابتدائی مثالیں اگر اسی خطے کی قدیم تہذیبی روایت سے تلاش کی جائیں تو صوفیاء کا بیان اس کی ایک خوبصورت ترین شکل رہی ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی عائد کردہ جکڑ بندیاں اسی ''تخفیفی والو'' کی دوسری شکل ہیں اور دارا شکوہ کے خواب اس ''تخفیفی والو'' کو چکمہ دینے کی اضافی صلاحیت کا سبب۔ پیش منظر کے افسانے سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

''میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں...... تم...... اور تم کہتی ہو، تم وہاں کبھی نہیں گئیں۔''

''میں کھڑی تھی؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ہاں تم...... اور پھر جانتی ہو سب سے بڑا اہم لمحہ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا...... تم چپکے سے آئیں، پنجرہ کا غلاف اُٹھایا...... پھر تمہارے منہ سے عجب حقارت اور کراہت سے بھری آواز نکلی...... ''اُوں ہوں۔'' تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے اُٹھایا۔

''اُوں ہوں...... سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے......'' تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا۔ اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی۔ میں آگے لپکا کہ دیکھوں اسے دیکھوں مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آدبایا کہ کہیں یہ اس نہتے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رک گیا...... چلا آیا...... چلا آیا، بھاگتا ہوا...... دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں۔''

(''پنجرہ'' از خالدہ حسین)

''وہ اس قصبے میں یوں نمودار ہوتا ہے جیسے کائنات میں کوئی نیا قدرتی مظہر نمودار ہوتا ہے۔ چپ چاپ اور کچھ عرصے کے لیے، بے معلوم، بے اطلاع اور وہ جب کھلتا ہے تو اُسے جامع مسجد کا پیش امام ''شیطان رجیم'' قرار دیتا ہے۔ جبکہ سرائے کے غریب مالک کی بیوی اس کی طرف سے پیش کی ہوئی چھوٹی سی لکڑی کی تختی پر کھنچی لکیروں میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ اپنے تمام بیتے ہوئے زمانوں کو یکجا پاتی ہے۔ یہ مشقت کرتے ہوئے لوگ ساری زندگی اتنی فرصت بھی نہیں پاتے کہ یہ جان سکیں کہ کفر کیا ہے اور کیا نہیں؟''

(''صورت گر ہ گن'' از ذکاء الرحمٰن)

اِس حوالے سے نیر مسعود کے افسانوں میں حسیات کا عمل قابل توجہ ہے۔ دیکھنے سے زیادہ سونگھنے، سننے اور چھونے کے ذریعے اس روبہ زوال دنیا کو بار دگر عدم سے وجود میں لانے کی خواہش اور کچھ افسانوں میں اِس سے اُلٹ صورت حال بھی ہے۔ یعنی موجود کو لاموجود بنانے کی خواہش۔

''یہ ممکن ہے کہ کافور باقی رہے اور اس کی خوشبو اُڑ جائے۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ کافور اُڑ چکا ہو مگر اُس کی خوشبو باقی ہو...... اس ویرانی میں

کچھ دکھائی دیناآب صرف عطر کافور کے سونگھنے پر موقوف ہے۔''

(''عطر کافور'' از نیر مسعود)

''شیشہ گھاٹ''، ''سیمیا'' اور ''ساسان پنجم'' جیسے افسانوں میں تخیل اور واہمے کی مدد سے اُس ''تخفیفی والو'' کو چکمہ دے کر ایک ایسا جہان تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کائناتی طرز کا ہے۔

دوسری طرف Mediocre کے ہاں یہ عارضی By Pass یا تو محض لمحاتی طور پر یا ارادی کوششوں اور تنویم کے ذریعے یا پھر منشیات کی مدد سے ممکن ہوتا ہے۔ اولین گروہ کے نزول تخلیق کاروں کے ہاں مستقل اور دوسری صورتوں میں ان عارضی By Passes میں سے ادراک کا ایسا دھارا بہتا ہے جو کائنات میں ہر جا وقوع پذیر ہونے والی ہر شے کا ادراک تو نہیں (کیونکہ By Pass تخفیفی والو کو، جو کہ ابھی تک نفس وسیع کے کل اجزا کو روک رہا ہوتا ہے، بالکل ختم کر کے نہیں رکھ دیتا) لیکن جو محتاط انداز اور طریقوں سے منتخب کیے گئے کسی عامی کے چھنے ہوئے مفید اور اہم مواد (جسے ہمارا محدود انفرادی ذہن حقیقت کی ایک مکمل تصویر سمجھتا ہے) سے کہیں زیادہ اور بہت مختلف ہوتا ہے۔

اپنے محسوسات سے زیادہ مہذب لوگوں کی ایک تصویر دیکھیے:

علاحدہ، منشیات زدہ، مغرب کے دلدادہ، میکانکی، سفید پڑتی ہوئی آنکھوں والے، جو قدرتی روشنی کو ترستے ہیں۔ عقل جن پر ظالم حکمران کی حیثیت سے حکومت کرتی ہے۔ احساسات سے کٹے ہوئے، ریزہ ریزہ لوگ، مختلف فنون میں ماہر، اپنے گرد کھنچے ہوئے حصار میں قید، کھلی فضا میں سانس لینے کو بیتاب لوگ۔

''Tomorrow Never Knows'' میں یہ لوگ مشہور نغمہ نواز گروہ 'Beatles' کا موضوع ہیں:

''اپنے ذہن کو بند کرلیں، سوچیں رہنے دیں
جسم ڈھیلا چھوڑ دیں، اور پانی کے بہاؤ پر بہہ جائیں
یہ موت نہیں ہے
چھوڑیں، سوچنا چھوڑ دیں
اور اپنے آپ کو وسعتوں کے حوالے کردیں
تاکہ آپ اپنے آپ کو جان سکیں، پہچان سکیں
جو تاباں ہے، روشن''

ان عارضی By Passes کی خواہش کرنے والوں کی بھی کمی نہیں، یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ ایسی کوششیں جو مراقبہ کی مانند آگہی کی خاص کیفیت کے حصول کے لیے ہوتی ہیں، لمحاتی ہوتی ہیں اور ان میں بھی کامیابی معلوم، اور پھر ایسی کامیابیاں بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہیں، جس طرح ہمارا عشق مسلسل زوال پذیر ہے، ہمیں پہاڑ سے اُترنا ہی پڑتا ہے۔

مسلسل زوال پذیر، پہاڑ سے اُترے ہوئے افسانہ نگاروں میں سے محض ایک کی مثال دیکھیے:

''میری نانی مجھے ایک بوٹی بھی کھانے کو نہیں دیتی۔''

''میں بڑے دھیان سے کٹی ہوئی رسیوں کو دیکھتا ہوں۔''

''میں ان کی طرف سے آنکھیں ہٹاتا ہوں تو اچانک مجھے ماں کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ ماں کی آنکھوں میں کچھ دیر جمی ہوئی سیاہ پتلیاں اب سرے سے غائب ہو چکی ہیں اور اُن میں چاروں طرف دودھیا سفیدی پھیل رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ پھیل پھیل کر ماں کے چہرے پر اُترنے لگی ہے۔ چہرے سے گردن تک آ گئی، چھاتیوں سے ٹانگوں تک پہلے ہی ایک سفید چادر پڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا سفیدی گردن سے اُتر کر ماں کی چارپائی پر ڈھلک گئی ہے۔ اس نے بغلوں میں پڑے ہوئے سنپولوں کو سفید کر دیا۔ ایک مٹی کے پرئی میں رکھے تو میہنوں کے سیاہی مائل جمے ہوئے ٹکڑوں پر سفیدی پھیل گئی ہے۔''

''اب مجھے یہ منظر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔''

''جب پائیدار نہیں تھی تو کسی کی موت، خدا کی انسان نما اپاہج مرضی ہوگی۔ اب احساس کا مسئلہ یوں حل ہو گیا ہے کہ موت ضرورت سے قبل ہی پائیدار بن کر آتی ہے۔''

''محض موت ہی باخبر ہے۔''

''اگر موت یہ کہے کہ وہ ہندوستان کا سیاسی نظام ہے تو خدا کو اپنے محدود اختیار پر حیرت ہو سکتی ہے۔''

''19 سال کے بورڈم کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خدا کی مرضی اتنی طویل ہو سکتی ہے تو اس کا ایک مطلب ہے کہ 19 سال سے اب تک چنڈال ہی مسلسل ہے۔ بھلا یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اسے کسی نے گولی ماری تھی یا اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا! بلکہ وہ تو خدا سے ماورا آج تک دائیں ہاتھ میں سرخ کپڑے سے ڈھکا ہوا کوزہ لئے پھر رہا ہے۔''

''دیومالا میں کوئی دیوتا بھکاریوں سے بور نہیں ہوتا بلکہ انہیں بھیک مانگنے کے انوکھے ڈھنگ بتاتا ہے۔''

''خودسری تو محض راکشسوں میں ہے۔''

''میں اکثر خواب میں راکشسوں کو چلاتے دیکھتا ہوں۔ وہ ہندوستانی سنگیت سے واقف نہیں۔ ہاتھ جوڑ کر التجا نہیں کر سکتے اور غالباً اسی لئے انہوں نے ''ایئر انڈیا'' کے ٹریڈ مارک کو دھیان سے دیکھا نہیں۔''......

یہ تحریر آپ نے گیارہ ٹکڑوں میں دیکھی۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ یہ ایک ہی افسانے کا طویل اقتباس ہے؟ لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ افسانہ تھا ''مکھی'' اور لکھنے والے احمد ہمیش۔ اس خیال کے انتشار اور خلیل جبران کے گھسے پٹے طرز میں ''لوک دانش'' اور ''کہا سنا'' کو افسانے کے نام پر یکجا کر کے، قلم کار رنگ رداد بھی چاہے تو اس کا کیا کیا جائے؟

جدید نفسیات میں اس عمومی نظریئے کی حمایت کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے کہ عام آگہی ایک Personal Construction ہے نہ کہ خارجی دنیا کا ریکارڈ اکٹھا کرنا۔ سو ''زمین کے گرے پڑوں کے استحصال'' اور ''تہی شکموں کی بغاوت'' (فرانز فینن) کو یقیناً سامنے لایا جا سکتا ہے۔

''اُس نے کھڑکی میں اندھیرے اور بگولوں سے آنکھیں چھڑا کر زمین کو دیکھا۔

''ہوں پھر زبان خشک ہے۔''

اس نے اُٹھتے ہوئے گدھے کو ہانکا۔ ''آؤ پھر دریا کو چلیں کہ پانی بھاپ بن کے آسمان پر چلا گیا ہے۔ آؤ کہ ہم اس دائمی عمل کا حصہ

ہیں۔ یہی ہمارا انعام ہے۔ یہی ہماری سزا ہے کہ یہ ہمارا اپنا فیصلہ ہے کہ ہم زندہ رہیں گے۔ ہماری کشمکش کا ثمر ہماری خواہشوں کا تسلسل ہے۔
اس نے گدھے پر بالٹیاں لادیں اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا دریا کو چل دیا۔''

(''کیکر'' از انور سجاد)

''کب برف پگھلے گی اور کب میرے بازو مجھے ملیں گے؟
لیکن یقین جانو ایک دن ایسا ہوگا ضرور! اور ہم سب پھر مچھلیوں کی طرح اس سمندر کی بے کرانی میں تیرتے پھریں گے تب تک سب کے بازو کٹ چکے ہوں گے کہ مچھلیوں کے بازو نہیں ہوتے!''

(''برف پر مکالمہ'' از سریندر پرکاش)

واضح رہے کہ ایک زمانے تک براہِ راست تصادم کی حالتوں کا بیان کرتے ہوئے محض خارجی دنیا کا ریکارڈ مرتب کیا گیا، جبکہ ان دونوں مثالوں میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ براہِ راست کوئی ٹکراؤ نہیں ملتا۔ بس دو محنت کشوں کا ایک فیصلے تک پہنچنا ہے کہ ''ہم نے زندہ رہنا ہے'' اور بس یہ فیصلہ ہی استحصالی طاقتوں کے خلاف بڑی بغاوت ہے۔ ایسی استعاراتی اور تمثیلی پیشکش اس سے پہلے روایتی طریقہ کار میں ممکن ہی نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہاں ''ابہام'' پیدا ہو جانے کا خوف تھا اور یوں نادانستگی میں قاری کی آ گہی کی بنیاد خارجی دنیا کی Registration پر رکھی جا رہی ہے۔

فلسفہ، نفسیات اور مخفی علوم کو چھوڑ کر خاص طور پر ہمارے ہاں عام نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہمیں اُس شے یا وقوعہ کا تجربہ ہوتا ہے جو موجود ہو، اور یہ کہ خارجی دنیا مکمل طور پر داخلی، نفسی تجربے میں منعکس ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اُن مختلف النوع قسم کی طاقتوں پر غور کریں جو کسی بھی ایک لمحے میں بیک وقت ہم پر اپنے اثرات چھوڑ رہی ہوتی ہیں تو یہ خیال ایک بہت ہی سادہ اور بنیادی درجے پر بھی قائم رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ برقی قوت، آوازیں، روشنی کی شعاعیں، بُو، ہمارے اندر کی کیمیائی اور برقی روئیں، مقناطیسیت، خیالات، اندرونی عضلاتی تحسسات اور بہت کچھ مستقل طور پر کس ڈھب سے ہمیں اپنے حصار میں لیے رہتے ہیں اس کی پیشکش پس منظر اور رواں پس منظر کے افسانے میں محض ''نشان'' اور ''اشارے'' کے ذریعے ممکن تھی ہی نہیں۔ اس لیے جو کچھ چھوا اور دیکھا جا سکا اس کا بیان ہوا۔ آج پیش منظر کے افسانے میں یہ ناممکن کو ممکن بنانے کا کام استعارے، علامت، تمثیل اور اسطوری تلمیح کا کیا دھرا ہے۔

بیسویں صدی کے ساتویں دہے کے حسین الحق، شوکت حیات، عبدالصمد اور علی امام تو خیر اِس حوالے سے اپنی پہچان مستحکم کر چکے لیکن آگے چل کر آتی کے دہے میں سید محمد اشرف (لکڑ بگھا سیریز)، غضنفر (افسانہ: کڑوا تیل) اور بیسویں صدی کے اختتام پر اُبھر کر سامنے آنے والے خالد جاوید (افسانے ''پیٹ کی طرف مڑے ہوئے گھٹنے'' اور ''کوبڑ'') نے بھی بیانیہ کے دھوم دھڑکے کی گونج اور ناقدین کے سادہ بیانیہ پر صدقے واری جانے سے بے پروا رہ کر علامت اور استعارے کا تخلیقی استعمال کیا۔

سادہ بیانیہ کے گال تھپتھپانے والے ناقدین آخر کیوں نہیں جانتے کہ سادہ بیانیہ ایک گھسی پٹی راہ ہے اور تخلیقی نثر ایک جہانِ معنی ساتھ لے کر آگے بڑھتی ہے۔

''اچانک متحرک بکھرا ہوا مجمع نظر آیا۔ اس نے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سمیٹ کر چشمہ کے دونوں شیشوں کو صاف کیا۔ رومال سے پسینہ

تھپتھپا کر فٹ پاتھ پر آیا اور باری باری سب کو دیکھنے لگا۔ انگلی جھٹک کر سگریٹ کی راکھ گرائی۔ زور سے لمبی سی سانس لینی چاہی تو لگا جیسے گلے میں دھوئیں کی رسی تن گئی ہو۔ اُس نے جلدی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس رُک گئی۔ اس نے چشمہ کے شیشے صاف کرنا چاہے تو ہاتھ اور ٹانگیں کانپنے لگیں اور چاروں طرف بے پناہ شور مچنے لگا۔ ساری آ[illegible]یں تیزی سے گڈمڈ ہونے لگیں۔ پھر پھٹ کی آواز کے ساتھ ہی تمام آوازوں سے اس کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ شور کے معدوم ہوتے ہی سارا منظر ڈوبنے لگا اور آوازیں چھوٹے چھوٹے دھبوں میں بدلنے لگیں۔ پھر وہ دھبے آسمان بنے۔''

(''گھمسان کا بے آواز رن'' از قمر احسن)

''شاہراہ سے ہٹ کر پیچ در پیچ گلیاں عبور کر اُس بت تک پہنچا جا سکتا تھا۔ جس کی ہزار آنکھیں، ہزار ہاتھ، ہزار پاؤں اور اتنے ہی کان تھے اور جو اتنا مستحکم تھا کہ کتنی صدیاں گزر گئیں، لیکن سورج بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا، لُو کے تھپیڑے بھی اسے شکستہ نہ کر سکے، نہ سیلاب نے اُسے منہدم کیا، نہ ہی اس کے پجاریوں میں کمی آئی...... وہ سب کا دشمن تھا اور انفرادی طور پر سب اس کے دشمن تھے......''

(''بہروپیا''...... شفق)

پیش منظر کے افسانے سے یہ تخلیقی نثر کس طرح اپنے اردگرد کی دھندلی اور پُر اذیت دنیا کو بامعنی بنانے کا جتن کرتی ہے...... میرے نزدیک محض دو طرح سے، ایک تو یہ کہ تخلیق کار اپنے خصوصی حسی نظام کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے اردگرد کے سارے کو سمیٹ کر سادہ بناتا ہے اور اس میں سے چند ایک خصوصی جہتوں کو آگہی تک پہنچنے کی اجازت دیتا ہے، دوسرا یہ کہ ان نہایت محدود ذرائع (خصوصیاتِ تحسس) سے جو کچھ سمیٹ پاتا ہے اس کی کتر بیونت کرتے ہوئے اسے ایک خاص سلیقے سے دوچار کرتا ہے جبکہ باقی ماندہ مواد میں سے آگہی کو تعمیر کرنے کا کام لیتا ہے۔ اب اس سے وہ کیا تعمیر کرتا ہے، اس کا انحصار مصنف کے سٹائل اور اس کے تجربہ کی سطح پر ہے۔

عام زندگی گزارنے کی حد تک ہماری ہر سطح کا حسیاتی نظام صرف مخصوص حدود کے اندر اطلاع موصول کرنے کے لیے عضویاتی طور پر مسلح ہوتا ہے، مثلاً آنکھوں سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ وہ آرگن کے نچلے بیس نوٹ کے لیے ردِّعمل ظاہر کریں، کان سے باجرے کی روٹی کا ذائقہ معلوم نہیں کیا جاتا۔ لیکن تیسری دنیا کے تخلیق کار سے یہ ناممکن کو ممکن بنانے کی توقع محض اس لیے باندھی جائے گی کہ اسے لامحدود کا سامنا ہے۔ اس نے چھپے ہوئے ہاتھوں کے لکھے کو سننا بھی ہے اور سونگھنا بھی۔

''کورے بدن جھلس رہے تھے...... گلیاں، بازار، یونیورسٹیاں، کھیت کھلیان، ندی نالے، پہاڑیاں، بادل سب ایک سلگتا نعرہ تھے۔ لفظ، معنی...... آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی تھی، معنی تھے۔

ہر حس اک معنی بن گئی۔

کتابیں حوصلہ، کھوپڑیاں ٹائم بم، ہاتھ رائفلیں، پہاڑیاں پناہ گاہیں۔''

(''آخری کمپوزیشن''...... بلراج مین را)

ابھی کنواریاں، بہورانیاں اپنے سروں سے چادریں نوچ پھینک کر، چار دیواری کے حصار کو توڑ کر مستقبل کو جنم دینے کی خواہش میں باہر نہیں نکلیں۔ ابھی بستی کے جوانوں کا بودھی کی جڑوں میں ٹپکتا لہو ان کی کوکھوں میں نوحہ کناں ہے، تڑپ بن کر لہروں کی صورت ان کے بطن

میں نہیں جاگا کہ مائیں ابھی چار دیواریوں میں محصور آیت کریمہ کا ختم پڑھتی ہیں ...''

(''نئی کونپل''۔۔۔انور سجاد)

یہاں شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن کی وقوفی (Cognitive) تھیوری کی مثال بھی سودمند رہے گی اس لیے کہ اس کی بنیادیں بھی ذہن کی تاریک اتھاہ گہرائی (Black Box) سے ہی ہیں (S) یا محرک کا کام تحریک پیدا کرنا ہے جبکہ ذہن کا Black Box ایک وقوعہ یا صورتِ حال کا جائزہ لیتا اور اس کا نتارا کرتے ہوئے ردِعمل پیش کرتا ہے۔ یہ نتارا ہمارے گزشتہ تجربات، عقائد اور ہر شخص کی انفرادی شخصیت کے پرتو کی چھلنیوں میں چھاننے سے ہوتا ہے۔ تب ہم اپنا مخصوص ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ردِعمل ہماری مختلف الانوع طبقاتی حیثیتوں کے حوالے سے ہو گا۔ مثال کے طور پر ایک دیہات کا منظر ہے۔ پنگھٹ پر پانی بھرتی ہوئی جوان لڑکیاں۔ یہ دیکھ کر کسی کسان کا ردِعمل کسی بھی سرمایہ دار یا جاگیردار کے ردِعمل سے یکسر مختلف ہوگا۔ سرمایہ دار یا جاگیردار کا ذہن، ان کی پُر باش زندگی کے سبب، یہ منظر دیکھ کر بہت ممکن ہے عیاشی کی طرف جائے۔ تیسری دنیا میں ردِعمل کا یہ فرق زیادہ شدید خصوصیات کا حامل اس لیے بھی ہے کہ طبقاتی حیثیت کا فرق اپنی انتہائی حدود پر ہے۔ مفلس آدمی مسلسل زوال پذیر ہے، جبکہ دولت منداسی نسبت سے اپنے سماجی مرتبہ میں عروج کی طرف گامزن۔

مسعود اشعر کے افسانوں ''ذاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل''، ''بیلا نائی رے جولدی جولدی''، ''دکھ جو مٹی نے دیئے'' اور ''اپنی اپنی سچائیاں'' کی اسی نوعیت کی انسانی صورتِ حال اپنی انتہاؤں پر پہنچ کر زوال ڈھاکہ کا جواز بنی۔ ''بیلا نائی رے جولدی جولدی'' کچلے ہوئے بنگال کی ایک ایسی فریاد ہے جو صرف اپنوں کے سننے کے لیے ہے۔ ایک ایسی پکار جس کی پہچان سچے انسانی جذبوں سے ہی ممکن ہے۔

''ساڑھی ختم ہوگئی ہے کہ میری بیٹی دروپدی نہیں تھی۔'' یہ ''اپنی اپنی سچائیاں'' میں بنگال کی ایک ماں کا بیان ہے اور اس دُکھی کر دینے والی صورتِ حال کی تفصیل ''بیلا نائی رے جولدی جولدی'' کے پاگل بوڑھے کی زبانی سنائی دیتی ہے۔ اس سنہرے دیس میں جہاں مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کے لیے سکھ چین ہے اور عیاشی کا تصور، وہاں کوڑیوں کے مول بکتے ہوئے انسان کے احساسات کیا ہیں؟ مجبور اور بے بس لوگوں کو شدید احتیاج کیا کیا صورتیں سامنے لاتی ہے۔ اس کی مثالیں مسعود اشعر کے ان افسانوں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

ہماری روزمرہ زندگی سے ایسی کئی مثالیں یہ واضح کرتی ہیں کہ کیسے کسی شدید احتیاج کی حالت میں ہم زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ بھوک کی حالت میں ہمیں محض کھانوں کی خوشبو کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔ بھوکے کو چاند بھی روٹی دکھائی دیتا ہے۔

12

A 13 C

14

تصویر کے درمیان میں دیئے ہوئے حروف یا ہندسے اوپر سے نیچے یا بائیں سے دائیں دیکھنے پر یا تو حروف ہیں یا ہندسے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اسے کس حوالے سے دیکھ رہے ہیں۔ اس تصویر کو اگر بھورے (بلراج کومل کے افسانے ''دلِ ناتواں'' کا مرکزی کردار) دیکھ رہا ہے اور A سے مراد پانچ روپے ہیں تو 13 یقیناً روٹی ہوگا۔ C کی طرف تو وہ دیکھے گا بھی نہیں۔ اس کے پاس وقت کہاں ہے، پہلے روٹی کی طرف ہاتھ کیوں نہیں بڑھائے گا؟ اور اگر 12 کا نمبر پانچ روپے ہے تو اوپر سے نیچے گنتے وقت وہ 12 سے 13 اور پھر 14 نمبر نہیں

گنے گا، 13 کا نمبر اُسے روٹی ہی نظر آئے گا اس لیے کہ وہ پانچ روز سے بھوکا ہے۔ اُسے تو پنجرے میں دھاڑتے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے شیر تک نظر نہیں آرہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلراج کومل کے 'بھورے' (دلِ ناتواں) اور منشایاد کا ''وہ'' (راستے بند ہیں) اپنے فکر و عمل میں اس قدر محدود کیوں ہیں؟ مارکس نے اس سوال کا جواب دیا۔

''انسان کا سماجی مرتبہ ہی اس کے سماجی شعور کا تعین کرتا ہے۔''

دوسری طرف سرمایہ دار کا نظریہ یہ ہے کہ ''سماجی شعور فرد کے سماجی مرتبے کا تعین کرتا ہے۔''

سرمایہ دار یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ اس کے سماجی مرتبے کا بہت بہتر تعین ہو چکا ہے اور اس کے بہت بہتر وسائل ہی اس کے سماجی شعور کو وسعت بخش رہے ہیں۔ بلراج کومل کے افسانے ''دلِ ناتواں'' اور منشایاد کے ''راستے بند ہیں'' میں ظاہری سطح پر کوئی المیہ نظر نہیں آتا اس لیے کہ بہتر وسائل کے حامل افراد کے بہت بہتر سماجی شعور کے مقابلے میں ''بھورے'' اور ''راستے بند ہیں'' کے ہیرو کا ہر ہر عمل مضحکہ خیز ہی نظر آئے گا۔ 'بھورے' نے اپنے تعین خودکشی کا فیصلہ بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے اور منشاء یاد کے بھولے ہیرو نے اپنے آپ کو بہتر سماجی شعور والے، 'مہر وسانسی' کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا دیا ہے۔ لیکن دونوں کو اب سامنا ہے بہت بڑی وسعتوں کا، نتیجہ میں دونوں جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔

''اس کی تار تار قمیص میں سے اس کے کمزور جسم کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بمشکل قدم اُٹھا سکتا تھا۔ بھوک اور نقاہت اور خندق میں کودنے اور باہر نکلنے کے عمل سے وہ مکمل طور پر چکرا گیا تھا۔ اس کی چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شور و غل سے غافل تھا اور ہوش و حواس کی حدود سے پرے کسی اور عالمِ نامعلوم میں تیر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف لوگوں کے قہقہوں، تالیوں، سیٹیوں کا طوفان تھا۔ یکا یک بھورے کی چال زیادہ غیر متوازن ہوگئی اور پھر وہ یکا یک لڑکھڑا کر گر پڑا۔

باوردی افسر اور چڑیا گھر کے ملازم اس کو سنبھالنے کے لیے دوڑے، ننھا موہن بے ساختہ کہہ اُٹھا: ''یہ تو مر گیا۔''

بھورے بلاشبہ مر چکا تھا۔

پانچ روپے کا وہ نوٹ جو اس نے چند لمحے پہلے زندگی کی بازی لگا کر حاصل کیا تھا، اس کی پھٹی ہوئی جیب میں سے جھانک رہا تھا۔''

(''دلِ ناتواں''......بلراج کومل)

ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

''کیا بات ہے بھائی؟'' وہ پوچھتا ہے۔

''حادثہ ہو گیا ہے...... آدمی ٹرک کے نیچے آ کر کچلا گیا۔'' وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:

''ٹرک۔ میرے اُوپر سے ٹرک گزر رہا ہے۔''

''نہیں''...... میں چلاتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔''

(''راستے بند ہیں''......منشایاد)

اُوپر دی ہوئی تصویری مثال سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہم اپنے گزشتہ تجربات اور شدید ضروریات کے پیشِ نظر ایک کم بہت ہی کم موصول ہونے والی اطلاع کی بنیاد پر بھی ایک تصویر کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ ایک مرتب اور بامعنی تحریر کی شناخت اور اس کا یاد رکھنا اس تحریر کے یاد رکھنے سے زیادہ آسان ہے جو بظاہر بے ہنگم اور بے معنی ہو۔ اس لئے کہ ہمارا گزشتہ تجربہ اور ضرورت کی شدت ہمیں اس طرح سے تربیت دیتے ہوئے ہم پہلے ہی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ فلاں لفظ یا جملے کے بعد کیا آنے والا ہے۔ Jerome Bruner اسے "دی ہوئی اطلاع سے آگے نکل جانا" کہتا ہے۔

لیکن ہوتا کیا ہے؟ یہ بامعنی اور مرتب، بڑھئی کی کَسی ہوئی تحریریں آگہی کی تعمیر نہیں کر پاتیں اور نہ ہی انسانی سوچ کو مہمیز کرتی ہیں۔ اس لیے کہ تحریر سے آگے ہمارا محدود تصورِ حیات رہنمائی کرتا چلا جاتا ہے، سو تحریر نے ہمیں کیا دیا؟ البتہ ایسی تحریریں یاد رہ جاتی ہیں جبکہ دوسری طرف وہ بظاہر بے ہنگم اور بے معنی (اپنے وقت سے بہت آگے کے تجربات) نظر آنے والی تحریر عمومی سطح پر اپنی نامقبولیت کے باوجود کسی نہ کسی حد تک عام سطح پر بھی آگہی کی تعمیر کرتی ہے۔ اب یہ توفیق ملنے کی بات ہے کہ کوئی ایسی بظاہر بے معنی اور بے ہنگم تحریر سے کیا کچھ حاصل کرتا ہے۔ سو دیکھا جائے تو ترسیل کی ناکامی سے بچاؤ کی صورتیں تلاش کرتے کرتے اُردو افسانے میں رواں پس منظر کے بہت سے نام یا افسانوی پیش منظر میں "نوترقی پسندوں" کی بھیڑ کی بھیڑ اپنی "ترقی پسندی" کے باوجود کیا کر پائی؟ اس کے مقابلے میں فرانز فینن کی "افتادگانِ خاک" (Less Damnes De Laterre) کی بظاہر بے ہنگم اور بے معنی تحریر کی مار ملاحظہ کیجئے۔ آج پیش منظر کے افسانہ نگار نے یہ بات جان لی ہے کہ اس نے ماحول کی سطح پر ہو یا تحریر وتقریر کی سطح پر یبوست زدگی کا خاتمہ کرنا ہے۔

ایک عافیت کا گوشہ کچا پکا۔ کان، اس کے سامنے چھتنار درخت اور اس کی طرف نکل جانے والی بل کھاتی پگڈنڈی، بذاتِ خود ایک دلچسپ تجربہ ہے لیکن اُسی راستے پر آنے جانے کا روز کا تجربہ رفتہ رفتہ ہمیں ہر چیز کا عادی بنا دیتا ہے۔ ایسے میں پگڈنڈی کے بل اور چھتنار درخت پر چڑیوں کی چہکار کے بارے ہمارا ردِ عمل خود کار ہو جاتا ہے۔ تھکا اور اُکتا دینے والا، زندگی کی اُمنگ رفتہ رفتہ مفقود ہوتی چلی جاتی ہے۔

تیسری دنیا کی بہت بڑی آبادی اس خودکار عمل کا شکار ہوئی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھیں (اُن کے نزول جذبوں سمیت) کبھی "دائیں" اور کبھی "بائیں" کے نام پر یکجا کرتے ہوئے ہیئتِ حاکمہ کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر Exhaust کر دیا گیا ہے۔ اُنھیں رفتہ رفتہ یقین آیا اور اُنھوں نے تجربہ کر کے دیکھا کہ "عوامی عدالتوں" کی حقیقت کیا ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ حکمران ٹولے ایک دوسرے کو تحفظات دیتے چلے آتے ہیں، تقریر کچھ ہے اور عمل کچھ...... وہ دکھائے گئے خواب کیا ہوئے، وہی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی......"انقلاب"......"انقلاب" چیخ کر گلے بیٹھ گئے، کچھ نہ بدلا۔ "وہی کلہاڑی اور وہی کلہاڑی کا دستہ" اور سامنے نئی ضروریات کا جمِ غفیر...... کیا ایسے میں تخلیق کار بھی اُن کی کچھ مدد نہ کرے؟ اگر ایسے میں تخلیق کار بھی اُنھیں جمود کی طرف ہی لائے گا تو اس کا نتیجہ انتہائی بھیانک نکلے گا۔ اس لیے کہ جو بھی تھوڑی بہت زندگی کی اُمنگ جاگے گی، اسے ٹھنڈا کرنے کا ایک طریقہ اسٹیبلشمنٹ کے پاس موجود ہے۔ تیسری دنیا کی ملکی سیاست کی سطح پر جا کر حکمران ٹولے یہ جو تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اک ذرا سی تبدیلی خود ہی لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، وہ آخر کیا ہے؟ کیا اس سے کچھ زیادہ کہ ان کی حکومت کی معیاد کو بڑھاوا مل سکے، لوگ مطمئن ہو کر ان کی طرف دوبارہ توجہ دینا شروع کر دیں، نئی آس اور آرزو کے دفتر کھلیں...... ہمارے ہاں مسئلہ کشمیر اور عرب دنیا میں فلسطین کا مسئلہ اسی سکے کے دو رُخ ہیں۔ نفسیات میں اس اُکتاہٹ پیدا کرنے والے فنامنا کو Habituation کا نام دیا جاتا ہے۔

ہمارے ذہن کی موضوعات منتخب کرنے کی اہلیت ہمیں مفلوج حالت سے باہر لے جانے کا جتن کرتی ہے اور نادانستگی میں ہم حکمران ٹولے کے نفسیاتی حملے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کی تھوڑی بہت اُمنگ اور کیا کرے...... اُن کے دیئے ہوئے نعروں میں آواز ملانے لگتی ہے...... ''کشمیر بن کے رہے گا پاکستان'' کشمیر، کشمیری مسلمانوں کا کیوں نہیں رہے گا؟ یہ ہم کبھی نہیں سوچتے۔ آج پیش منظر کا افسانہ نگار وقت کی اس آواز کو سنتا ہے جو اسے Habituation کا شکار بنانا چاہتی ہے اور آواز کو گھٹانے اور بڑھانے والی طاقتوں کو بھی جانے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس خصوصی نوع کی اہلیت کے پیدا کرنے میں ہماری نسلوں کی مشقت اور صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کو دخل ہے۔ معتبر ممالک میں اس حسیاتی سطح کی مثالیں ادب میں خال خال ہی نظر آئیں گی، لیکن ہمارے ہاں پیش منظر کے افسانے میں اس کی پہچان مشکل نہیں۔ اس کی چند خوبصورت مثالیں ''بازگوئی''، (سریندر پرکاش) ''نئی کونپل''، ''پی ایل۔ فورایئ'' (انور سجاد)، ''آخری کمپوزیشن'' (بلراج مین را) اور ''خانقاہ محمد پناہ'' (ذکاء الرحمٰن) ہیں۔

ہمارے ہاں لوگوں کے عمومی مزاج میں بے حسی اور تماش بینی کے جو عناصر نمایاں ہوئے ہیں۔ وہ نفسیات کی انہی پیچیدگیوں پر دال ہیں۔

دیکھا جائے تو گزشتہ چند برسوں میں یہ صورتِ حال بہت واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ اس کی دیگر وجوہات جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے گزشتہ چند برسوں میں ظاہر ہونے والی عام آگہی کی interactive اور Constructive فطرت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جیرم برونر نے انسانی ادراک کی سطح پر پیدا ہونے والی خاص طرح کی جماعت بندیوں کا جائزہ خوب لیا ہے۔ اُس کے نزدیک، دنیا کے ساتھ لین دین کرنے میں ہم اپنے تجربات کو تو بروئے کار لاتے ہی ہیں اس کے علاوہ ہم حسیاتی سطح پر موصول ہونے والی اطلاعات کے ذخیرہ میں سے اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ چناؤ کرتے وقت ہم جو فہرستیں بناتے ہیں وہ موصول ہونے والے ذخیرے کی نسبت کم تر اور محدود تر درجے سے اُوپر نہیں اُٹھتیں۔ سماجی سطح پر اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی شخص کو جارحیت پسند سمجھنے لگتے ہیں تو ہم اس کے تمام تر افعال کو اسی خاص جماعت بندی یا کیٹے گری کے تحت جانچنے کی کوشش کریں گے۔ اشیاء اور واقعات کے ساتھ ہمارا گزشتہ تجربہ ہمارے اس جماعت بندی والے نظام کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ سو اسی جماعت کے تحت ہمارے ہاں جمہوریت سے ایک خاص قسم کی ہلڑ بازی اور سیاست سے جھوٹ یا پسند اور ناپسند کے جھگڑے اور ہیرو ورشپ ہی مراد لیتے ہیں۔ برونر کے خیال میں ہمارا یہ تجربہ دراصل ایک خاص طرح کی جماعت بندی کا تجربہ ہوتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ''On Perceptual Readiness'' میں کہتا ہے کہ صحیح ادراک...... نمائندگی کا اتنا معاملہ نہیں جتنا کہ نمونہ بنانے کا ہے۔

اس کیٹے گری سسٹم کی کمزوریاں اور خرابیاں بھی ہیں اور بے شمار ہیں لیکن جب تک ہمارے ہاں یہ انداز نظر پیدا نہ ہوا تھا، تیسری دنیا میں سیاست کی اچھل کود، کھوکھلی نعرہ بازی اور مختلف دھڑے بندیاں باقاعدہ سنجیدگی کے ساتھ بحث مباحثے کا موضوع رہیں پھر رفتہ رفتہ اس انداز نظر کے طفیل پتا چلا کہ اسلام کے نام پر ''اسلامی کانفرنس'' تو ممکن ہے لیکن امیر مسلم ممالک اپنے غریب مسلم ہمسائیوں کے ساتھ سرحدی حد بندیاں ختم نہیں کر سکتے۔ بیان کی حد تک دانت کاٹی روٹی کھائیں نے لیکن مجبوری بھر مجبوری ہے، اور یہ بھی کہ بھارت میں اندرا گاندھی اور پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کا سوشلزم اسی قدر ہے جس قدر امریکہ اجازت دیتا ہے۔ اب ہوا کیا کہ عوام کی سطح پر ماضی کے بڑے سے بڑے توپ لیڈر ٹھس ہو گئے، عوام نے اس خاص طرح کے کیٹے گری سسٹم کے تحت اپنے آپ کو اور اپنی سوچ بچار کو ڈھال لیا۔ اخبار پڑھتے وقت جس

طرح کتابت کی غلطی ہم اپنی ''صحیح زبان'' کی کیبئے گری کی مدد سے صحیح کر لیتے ہیں اسی طرح ہر اخباری بیان اور حکومتی ذرائع ابلاغ کی اطلاعات تک ہماری پہنچ خود ہمارے وضع کردہ طور طریقوں سے ہوئی۔

اب ذرا جوگندر پال کا افسانہ 'باہر کا آدمی' دیکھتے چلیں۔ اس کرداری کہانی میں مرکز توجہ ''تھیلے والا'' ہے۔ جو لوگوں کی چہل پہل میں ایک خاص طرح کی خوشی سے سرشار ہر طرف گھوم گیا ہے۔ بظاہر اس اطمینان اور خوشی کا سبب صرف یہ ہے کہ لوگ اس کی دی ہوئی چیزوں کو ٹھکرائیں نہ، مراد اس کی ذات سے اجتناب نہ برتیں۔ اس کے کندھے سے لٹکا تھیلا ہر طرح کی ضرورت کی اشیاء سے بھرا پڑا ہے، بچوں کے لئے چاکلیٹ، عورتوں کے لیے پھول بیماریوں کے لیے دوائیں اور بائبل اور پنیر، شرابیوں کے لیے...... افسانے کا دوسرا کردار خود افسانہ نگار کا ہے جس کی آنکھیں دو سپاہیوں کی مانند تھیلے والے کے تعاقب میں ہیں اور تیسرا کون ہے؟ محض ایک خیال، جو تھیلے والے کی ذات کا مسٹر ہائیڈ ہے۔ افسانہ نگار سوچتا ہے ''وہ ضرور کوئی ایسا ویسا دھندا کرتا ہے''..... اور اسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں تھیلے والے کی نگراں ہیں۔

اس افسانے میں انسانی نفسیات کے پیچ در پیچ کھلتے رہنے سے ایک ایسی فضا بندی ممکن ہو سکی ہے جس میں لاتعداد سطحوں پر (پارک کے رنگا رنگ لوگوں کی سوچ، افسانہ نگار کی سوچ..... جس کی تین جہتیں تو بہت نمایاں ہیں، پھر تھیلے والا خود..... دو سطحوں پر، اس کی نگراں آنکھیں، پولیس غرضیکہ بہت کچھ انسانی نفسیات کے کیبئے گری سسٹم کی کرشمہ سازیاں نمایاں ہو سکی ہیں۔

AMES نے عام آگہی کی فطرت میں ردو قبول کرنے والی حسیات اور گردو پیش کے حالات کے درمیان ایک باہمی لین دین کے رشتے کی نشاندہی کی ہے لیکن بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ تخلیق کار کی حسیات اپنے گردو پیش کی اطلاعات کے اُمڈتے سیلاب کے میسر ہونے کے باوجود موزوں ترین مواد (content) کے چناؤ میں ناکام رہتی ہیں۔ یہاں موزوں ترین سے میری مراد ایسے مواد سے ہے جس کی مار سہ رُخی ضرور ہو۔ ایسا شش جہاتی سفر جس کی دو زائد سیڑھیاں (پانچویں اور چھٹی) بطون کی گہرائیوں اور ذات کے دُور دراز علاقوں تک بھی رسائی پا سکیں جبکہ محض چار سمتوں میں حدوں کا پھیلاؤ صرف دو رُخی تصویر کاری کی ذیل میں آئے گا اور باطن کا اظہار جو فن کار سے تو ممکن ہو ہی نہ سکا قاری کی رسائی سے بھی باہر رہے گا۔ یہ بھی عجیب قصہ ہے کہ Tri-Dimensionalty کا تعین براہ راست نہیں کیا جا سکتا۔

خالدہ حسین کے افسانے ''سایہ'' میں بوڑھے آدمی کی خود کلامی اس کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ فطرت کو رد و قبول کرنے والی حسیات اور گردو پیش کے درمیان باہمی لین دین کی اعلیٰ ترین صورتوں کا اظہار ہے۔ اس نوع کی پیشکش کی گنجائش خواجہ احمد عباس کے افسانے ''میری لین کی پتلون''، کرشن چندر کے ''رنگی'' اور احمد ندیم قاسمی کے ''فالتو'' میں ''سایہ'' (از خالدہ حسین) کی نسبت کہیں زیادہ تھی لیکن تینوں افسانہ نگاروں سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ''سایہ'' کی طرح دیگر کامیاب مثالوں میں ''کینسر'' اور ''پرومیتھیس'' (انور سجاد) ''سواری''، ''آخری سمت'' اور ''پنجرہ'' (خالدہ حسین) ''کمپوزیشن۔دو'' (بلراج مین را) ''صورت گرکن'' (ذکاء الرحمٰن) ہیں۔

George Kelly نے عام شعوری تجربے کی نفسیات اور طبی نفسیات میں ملے جلے تجربات کئے۔ اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہر شخص اپنے ذاتی رابطوں کی بنا پر اپنی ذاتی دنیا خلق کرتا ہے۔ یہ گزشتہ تجربات پر مبنی ایک نجی کوشش ہے جو ممکنہ حد تک نئے تجربات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر فرد کے خالصتاً نجی مسائل کی بڑی تعداد، اس کے ماحول کے برخلاف اس کے غلط رابطوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، سو مسائل کے حل کیلئے نئے رابطے بنانے کی ضرورت پیش آئے گی، جیسے بلراج کومل کے گونگر ''کنواں'' مین را کے ''انٹرووٹ'' اور سریندر پرکاش کے تنہائی میں دھاڑیں مار مار کر رو دینے والے (رونے کی آواز) اور غیاث احمد گدی کا افسانہ نگار کردار (پرندہ پکڑنے والی گاڑی)۔

لیکن نئے رابطے قائم کرنے کے لیے جس خاص طرح کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی عدم موجودگی پہلی کٹھن صورتِ حال سے کہیں زیادہ خطرناک موڑ کا متی ہے اس کی ایک خوبصورت مثال بلراج کومل کے افسانے ''آنکھیں اور پاؤں'' کا مرکزی کردار ''ستیارتھی'' ہے جو سیاسی شعور سے تہی انقلابی لہر کے تیز دھارے پر تنکے کی صورت ڈولتا، سنبھلتا المناک انجام کو پہنچتا ہے۔

اَب یہ بات تو واضح ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنی ضروریات، ماضی کے تجربات اور مستقبل کے بارے میں توقعات اور خدشات کی بنا پر Tune کرتے رہتے ہیں لیکن Cantril اور Hastorf نے اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا کہ ہم ایک انتہائی پیچیدہ توقع کے بل بوتے پر بھی اپنے ادراک کو Tune کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ دو متحارب طاقتوں میں سے کسی ایک کی ہم طرفداری کرنے لگتے ہیں اور ہمارے اسی متعصب رویے کی وجہ سے ہمارا ادراک متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا۔ ذرا بلراج مین را کے افسانے ''واردات'' کو یاد کیجئے...... بس میں سیٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں تھکا ہوا نوجوان لڑکا فوری طور پر ہماری ہمدردیاں کھو نہیں بیٹھتا، کچھ وقت لیتا ہے، لیکن عین اس لمحے جب اس کا سر ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی کے شانوں سے ٹکراتا ہے، اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے لڑکی ابھی اس کے بارے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی لیکن ہم اس وقت تک اس نوجوان کے جانی دشمن بن چکے ہوتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ لڑکی کی سوچیں اور لڑکے سے ہماری ہمدردیاں کچھ اس طرح خلط ملط ہونے لگتی ہیں کہ ٹرمینس تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم اس لڑکی کو اس دُکھی پریشان حال نوجوان کا خدمت گار دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ خواہش ہی رہتی ہے کہ کاش ہم اس لڑکی کو یہ تاکید کر سکتے کہ اُس نوجوان کا بہت خیال رکھے۔

Spinelli اور Pribram کے لیبارٹری تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ دماغ کا حرکی نظام دماغ کے حسی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے یعنی دماغ اپنی ''درآمد'' کا اپنی پسند کے مطابق انتخاب کرتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ رجحان کہ دماغ کی Output ہماری آگہی کے اجزاء کے تعین میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، ادراک کی نفسی عضویات کے میدان میں کچھ ہی عرصے سے ظاہر ہوا ہے جبکہ بعض نفسیات دان تو اَب اس انتہا کو پہنچ گئے ہیں کہ ''صرف دماغ کی Output ہی پر شعور کا انحصار ہے۔'' اس طرح اگر ان تحقیقات کو ''کیبٹے گری سسٹم'' کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو زیادہ بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ہماری آنکھیں محض اپنے اندر کی طرف نہیں کھلی رہنی چاہئیں اور ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اپنی خبر رساں ایجنسیوں کے کہے اور لکھے کا ہم صحیح تجزیہ کر سکنے کے اہل بھی ہوں۔ انور سجاد کا افسانہ ''پی۔ ایل فورائی'' حقیقت تک رسائی کی ایک ایسی ہی کامیاب کوشش ہے۔

عام آگہی کے بارے میں اس سے ملتا جلتا تجزیہ اور نتائج اخذ کرنے کا رجحان معتبر ممالک کے اَدب میں بھی نظر آتا ہے۔ Lawrnce Durrell کے چار ناول ''Alexandaria Quartets'' واضح طور پر آگہی کی Interactive فطرت کی تحقیق ہیں۔ Durrell اُن ایک ہی قسم کے واقعات کا مطالعہ پیش کرتا ہے اور اس میں اندازِ نظر کا فرق اس کے مطالعے کو بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اہم نہیں کہ واقعہ پیش کیسے آیا، بلکہ یہ کہ وقوعہ کا ادراک کیا ہوا ہے۔ Durrell کے ناول زندگی کے متنوع تجربات اور نفسی پیچیدگیوں کے عکاس ہیں۔

ولیم جیمز نے (''نفسیات کے اصول'') آگہی کو ایک ایسی ندی کہا ہے جو مسلسل بہہ رہی ہے اور مسلسل سمت تبدیل کرتی جارہی ہے۔ بقول جیمز شعور ٹکڑوں میں بٹا ہوا نظر نہیں آتا جیسے زنجیر یا ریل گاڑی کے ڈبے۔ یہ کوئی باہم جڑی ہوئی شے نہیں، یہ بہاؤ میں ہے، اس لیے ایک ندی کا استعارہ ہی اس کی اصل سے قریب تر ہے، اس لیے کیوں نہ اسے Subjective Life کی رواں ندی کہیں۔

ہمارے خیالات میں مسلسل ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ آگہی ہمارے اردگرد کے مہیجات کے ایک پہلو سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی

رہتی ہے۔۔۔۔۔ ماضی کے کسی خیال کی طرف تو کبھی جسمانی تجسس کی طرف کبھی کسی منصوبے پر، کبھی آگے کبھی پیچھے۔ یہ ندی خود اپنا نیا راستہ بناتی جاتی ہے۔ جیمز کے نزدیک آگہی ایک Construction اور Simp!ification ہے۔ اس نے لکھا:

''ذہن ہر ہر مرحلے پر مختلف النوع ممکنات کے لیے پلیٹ فارم ثابت ہوتا ہے۔ ہمارا شعور ان متنوع ممکنات میں سے ردو قبول کرتا رہتا ہے۔ ہمارا ذہن ایک وسیع پیش منظر میں سے کچھ انتخاب کرتا ہے پھر مختلف مرحلوں پر وہ انتخاب در انتخاب ہوتے احساسات وافکار ہماری ذہنی پیداوار کے لیے بنیادوں کا کام کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک بہت بڑی چٹان میں سے سنگ تراش ایک پیکر تراشتا ہے اور باقی چٹان کو رد کر دیتا ہے۔ وہ پیکر تو اس چٹان میں پہلے سے موجود تھا سنگ تراش نے تو بس اُسے علاحدہ کر دیا۔ انفرادی طور پر اس کائنات کے بارے میں خواہ کتنے ہی مختلف نظریات ہوں لیکن وہ خام مواد جن سے ہم سب نے اپنے اپنے لیے پیکر تراشتے ہیں اس کی اصل ایک ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم انفرادی سطح پر پھر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہی ٹھہرتے ہیں۔

اگر ہم چاہیں تو اپنے استدلال کی بنا پر اپنے اذہان کا رُخ ماضی کی طرف واپس موڑ سکتے ہیں اور خلا میں ایٹوں کے ہجوم کی دُھند تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے محسوسات کی اس موجود دُنیا تک قدیم وقتوں سے ہم نسل در نسل اپنے لیے پیکر تراشتے آئے ہیں۔ خام مواد ایک ہی تھا ہر زمانے میں نئے آنے والے اپنی مناسبتوں کے رنگ روپ تراشتے رہے۔ بنیاد وہی گھسا پٹا خام مواد ہے، جس کا جنم ہنگامے اور بے ترتیبی سے ہے۔ میری کائنات، میری طرح کے لاکھوں افراد کی اپنے ڈھنگ کی نرالی کائنات ہے۔ حقیقی، مختلف، لاکھوں میں ایک۔ کتنا مختلف ہوگا حشرات الارض کا تصور، کائنات کے بارے میں؟ میں سوچتا ہوں۔''

آگہی کی کچھ اس سے ملتی جلتی تعریف انڈین یوگی دیوکانندہ نے کی ہے، وہ عام آگہی کی مثال ایک شراب کے نشے میں مخمور بندر سے دیتا ہے۔۔۔۔۔ بھوک کا خیال، ماضی کی یاد، حال کے کسی پہلو کی جھلک، مستقبل کی فکر، کسی کام کا ارادہ۔۔۔۔۔ ایک بندر کی طرح مسلسل ایک جگہ سے دوسری پر چھلانگیں لگاتے رہنا۔

مخفی علوم میں جدید نفسیات سے ملتے جلتے انداز میں شعور وآگہی کی وضاحت میں اولین مثالیں صوفیاء کے ہاں ملتی ہیں۔ صوفیاء کی پندو نصائح سے مملو تمثیلیں اکثر ان لوگوں سے متعلق تھیں جو بے حد ذہنی مصروفیات کی وجہ سے کسی کی بات پر دھیان نہیں دے سکے، یا اپنی بے جا توقعات کی بنا پر ہدایات کی غلط ترجمانی کرتے رہے، یہ نہ دیکھ پائے کہ ان کے سامنے کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ان کے Constucts کی نوعیت کمزور بنیادوں پر محدود تر تھی۔ دیکھا جائے تو صوفیاء کا عمل دخل خواہ جس قدر بھی رہا ہو (کم یا زیادہ) لیکن وہ متواتر تبدیل ہونے والے ان تعصبات پر زور دیتے رہے جو ہماری عام آگہی کی تعمیر کرتے ہیں۔ ''آپ کو روٹی کا ٹکڑا کیسا نظر آتا ہے؟ اس بات کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ آیا آپ بھوکے ہیں یا نہیں۔'' (جلال الدین رومیؒ)

صوفیاء ہمارے کیٹے گری سسٹم کے آگہی پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں شک وشبہ کا شکار نظر نہیں آتے اس لیے کہ آگہی کے بارے میں صوفیاء کی کئی وضاحتیں آج Bruner کے کیٹے گری سسٹم کے بیان کا خلاصہ دکھائی دیتی ہیں۔ صوفیاء کے اقوال میں سے ایسی کئی مثالیں Ornstein نے تلاش کیں، اُن میں سے ایک دیکھیے:

''گدھے کو سلاد پیش کیا جائے تو وہ پوچھے گا، یہ کس قسم کا بھوسہ ہے۔'' (ایک صوفی کا قول)

صوفیاء اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ آگہی صرف ان اشیاء کی ہی ممکن ہے جن کی موجودگی کا ہمارے ذہن میں تصور ہوتا ہے اور

وہ، جن کی اطلاع ہمیں تحسسات کے ذریعے ملتی ہے۔ صوفیانہ افکار اور تعلیمات کے زیرِ اثر جنم لینے والی ہمارے ہاں کی بیشتر روایات اس بات پر بحث مباحثہ کی گنجائش پیدا کرتی رہی ہیں کہ آ گہی کی انتخابی اور محدود فطرت ایک ایسی رکاوٹ ہے جس پر قابو پایا جانا چاہیے اور یہ کہ دوسری کئی روحانی اور جسمانی مشقوں کے علاوہ مراقبے کا عمل ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے اُن پابندیوں اور رکاوٹوں کو گرایا جا سکتا ہے جو عام طور پر آ گہی کو محدود کرتی ہیں۔ یہاں مراد ''فکرِ عمیق'' کے ذریعے اپنے گرد و پیش کے علم کا حصول اور ظاہر اور باطن کی چھان پھٹک ہے۔

''یہ ایک ایسی پُراسرار تاریکی ہے جس کے اندر لامحدود ''اچھائی'' شامل ہے۔ ہم اُس ایک، سادہ، الٰہی اور تاباں حلقے میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ پھر ہم اس سے علیحدہ یا فرق نہیں رہتے۔ اس باہم مدغم ہو جانے میں دوئی کا احساس جاتا رہتا ہے۔'' [Augustine]

جب عمل کرنے والا اپنے آپ میں واپس آتا ہے تو اپنے آپ کو زیادہ واضح علم سے قریب تر، زیادہ تاباں اور زیادہ کامل پاتا ہے۔

ہندو فلسفے کے مطابق عام آ گہی ''مدہوش بندر'' ہے جو صرف التباس Constructs کی دُنیا میں رہتا ہے۔ سِکھ مذہب میں انسان کی ''گراوٹ'' کا ذکر بھی انہی حوالوں کے ساتھ آیا ہے۔ حسین الحق کے کچھ افسانوں میں خانقاہ و تصوف کا ایک جداگانہ رنگ ہے۔

مراقبے اور اس سے ملتی جلتی روحانی اور جسمانی مشقیں کرنے کا ایک مقصد ''اندھے پن'' اور ''التباس'' کو ختم کرنا رہا ہے۔ جیسے ہندومت میں تیسری آنکھ کے کھولنے کا ذکر بار بار ہوا ہے، نظر پیدا کرنے کے لیے، ایک نئے انداز اور نئے مقام سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لیے...... تیسری آنکھ:

''سوو نجات کے راستے پر روانہ ہوئے اور رات کا سفر شروع کیا۔ دو پہر، اُدھر اس شخص نے پلکیں کھولیں اور ستارۂ سحری کو آسمان پر دیکھا اور رات کا اندازہ کیا اور پھر جب اپنے جسم پر نظر ڈالی تو حیران ہوا، مگر جب لوگوں کو دیکھا تو ذرا حیرت نہ ہوئی کہ اب وہاں کچھ نہ تھا سوائے ان بند آنکھوں کے کہ جو دیکھ سکتی تھیں مگر کسے دیکھتیں؟ حتیٰ کہ برگد تلے بھی کچھ نہ تھا...... مگر آنکھیں کہ جواب بھی کھلی تھیں کائنات کی طرف سے مگر بند تھیں شہر کی طرف سے......''

(''ایک گمشدہ شہر کی داستان'' از احمد جاوید)

احمد جاوید کے اس افسانے میں شروع سے آخر تک اُس حالت ''Satori'' کو پا لینے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے جو بدھ مت کے ''ZEN'' فرقے کے نزدیک اصل بیداری اور اصل آ گہی کی حالت ہے۔ اس افسانے میں ایک بستی۔ کے حوالے سے اس پورے خطے کی انسانی نفسیات، انسان کی گراوٹ اور سیاسی اور سماجی عوامل اور مسلسل جمود کی حالت کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان الجھاووں کو سلجھانے کے لیے ہمیشہ ''فکرِ عمیق'' کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی۔ ولیم بلیک نے کہا تھا: اگر ادراک کے دروازوں کی صفائی کی جائے تو انسان کو ہر شے لامحدود دکھائی دے گی۔'' سب سے بڑی بات تو یہ کہ دکھائی دے گی، دوسری بات یہ کہ پھر اُسے سمجھنا سمجھانا ممکن ہے۔

ہم عصر نفسیات اور مخفی علوم کی کچھ شقیں بعض اوقات ایک دوسرے سے متحارب بھی دکھائی دی ہیں مثال کے طور پر جیسے جدید نفسیات میں یہ مان لیا گیا کہ انسان Input کو اپنے بس میں کرنے کی سعی کرتا ہے، ماڈل بناتا ہے اور خارجی ماحول کے لیے خودکار ردِ عمل سامنے لاتا ہے جبکہ مخفی علوم کے نزدیک یہ عمل ماحول کے بارے میں انسان کی آ گہی کو گھٹا دیتا ہے، اسے ''اندھا پن'' کہا گیا ہے۔ ایسا ''اندھا پن'' جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس مراقبے کی مشق ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ اپنے فکری دھارے کو تھوڑی دیر

کے لیے روک کر ہم خارجی دُنیا کے ساتھ اپنے گھسے پٹے رابطوں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ میں خارجی دُنیا کے ساتھ دوبارہ جوڑنے سے گردوپیش نیا، تازہ اور مختلف دکھائی دیتا ہے۔ ہماری آگہی De Automized ہو جاتی ہے۔

اسی لیے ''ZEN'' میں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ بیداری کی حالت میں فکر کرنا چھوڑ دیا جائے۔ یوگا میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ ''التباس'' کو ترک کر دیا جائے اور خارجی دُنیا کو اپنے ماڈل سے مماثل تصور کرنا چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برے نتائج کا جس قدر سامنا تیسری دنیا کے فرد نے کیا اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

اَب دیکھنا یہ ہے کہ دُنیا بھر کے تخلیق کاروں نے اسے کیسا پایا۔ یوں تو کئی نثر نگاروں اور شعراء نے ایسے مراقباتی تجربات اور طور طریقوں کے بارے میں براہِ راست لکھا ہے مثلاً ولیم بلیک، ہرمن ہیسے، ہکسلے اور ٹی۔ ایس ایلیٹ وغیرہ نے۔ لیکن Robert E. Ornstein کی طرح میں بھی مناسب یہی خیال کرتا ہوں کہ یہاں ایک ایسے مصنف کا ذکر کیا جائے جس کا کام مختلف ہو اور جسے زیرِ بحث موضوع سے بالکل متعلق نہ سمجھا جائے۔ وہ مصنف ہے ہنری مِلر جسے دنیا ایک جنس نگار کی حیثیت سے جانتی ہے اور جو بظاہر مراقبے کی حالتوں اور بصری آرٹ کے نظریات اور قدیم رسومات کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتا جتنا کہ ہکسلے یا ایلیٹ وغیرہ رکھتے تھے۔

ہنری مِلر کا قول ہے: ''لوگ اندھے ہیں اور اُنھیں بصارت کے حصول کی ضرورت ہے۔'' اس کے خیال میں: ''دنیا کو مزید مرتب اور منظم کرنے کی ضرورت نہیں، وہ تو ازل سے ہی ترتیب میں ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے آپ کو اس نظام کی ترتیب سے ہم آہنگ کریں۔ یہ جانیں کہ دُنیا کا نظام کیا ہے۔ یہ یقیناً ان نظاموں سے مختلف ہے جو ہم خود ایک دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔ وہ طاقت جسے حاصل کرنے کی ہم میں خواہش ہوتی ہے تاکہ نیکی، حق اور خوبصورتی کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے، ہماری تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بے طاقت ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں بصیرت کی ضرورت ہے، پھر تنظیم اور یقین کامل کی۔ جب تک ہم میں اپنے گردوپیش سے بہت آگے کی بصیرت نہ ہوگی اور جب تک کہ ہم میں عظیم قوتوں (اور عظیم تر فکر) پر یقین کامل نہ ہوگا تو اندھے ہی اندھوں کو راہ دکھاتے رہیں گے۔''

''World of Sex'' میں ہنری مِلر ایک ایسے نقطے کو بیان کرتا ہے جسے بقول Ornstein کوئی جین راہب ہی بیان کر سکنے کا اہل ہو سکتا تھا:

''عام مصروفیات بھی کامل توجہ کی مدد سے ترقی کی طرف لے جاسکتی ہیں۔'' یہاں اس نے اس کا بھی حوالہ دیا کہ: ''وہم، غیر تشفی بخش نفرت اور شدید محبت، تینوں ہمیں ارتکازِ توجہ کی ایسی قوت عطا کرتے ہیں جو ہمیں کسی ایسے ہی مقصد کی طرف لے جاتی ہے۔''

زندگی تو جاری و ساری ہے، خواہ ہم بزدل بن کر یا ہیرو بن کر عمل کریں۔ اگر ہم ذرا سا بھی احساس رکھتے ہیں تو پتا چلے گا کہ زندگی کے پاس کوئی اور مذہب اور نظام ایسا نہیں جو زندگی ہم پر ٹھونسے، ماسوا اس کے کہ ہم زندگی کو بغیر تنقید کے قبول کر لیں۔ ہر وہ شے جس کے لیے ہم آنکھیں بند کر لیں، ہر شے جس سے ہم دور بھاگیں، ہر شے کہ جس کا ہم انکار کریں یا اس سے نفرت کریں...... بالآخر ہماری شکست کا باعث بنتی ہے۔ قابلِ نفرت ناخوشگوار اور بری سے بری شے بھی ہمارے لیے حسن، خوشی اور قوت کا باعث بن سکتی ہے اگر کھلے ذہن اور وسیع النظرفی سے اس کا سامنا کیا جائے۔

اگر ہم میں ماحول کو پہچاننے کی بصیرت ہو تو ہر لمحہ سنہری لمحہ بن سکتا ہے۔ خواہ دُنیا موت کے دہانے پر ہو، ہر لمحہ زندگی بن سکتا ہے۔ موت

تو صرف زندگی کی خدمت گزار بن کر ہی کامیاب و کامران کہلاتی ہے۔

O

ستر کی دہائی کا افسانہ:

معاملہ خواہ تخلیقی ہو یا نظری، ہر اہم موڑ شکوک وشبہات کو جنم دیتا آیا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں لاَرَیْبَ فِیْہِ کو آغاز میں جگہ ملی۔ تصوف، نفسیات، ماورائی نفسیات (Parapsychology)، ٹیلی پیتھی اور برون حسی ادراک میں Willing Suspension of Disbelife پر زور دیا جاتا ہے۔ اِس حوالے سے رُومانی شاعر اور ناقد کولرج نے مشورہ دیا تھا کہ ایسے میں نظری اُلجھاوؤں کی سطح پر ہمیں تدبر اختیار کر کے اپنے شکوک وشبہات کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ یوں اُردو افسانے کے حوالے سے ستر کی دہائی واضح طور پر ایک چونکا دینے والا موڑ اور اُردو شارٹ فکشن کا ہنگامہ خیز زمانہ تھا اور ناقدانہ سطح پر تدبر عنقا۔

بطور افسانہ نگار میرا تعلق بھی انیس سو ستر کی اُسی مقہور ومردود دہائی سے ہے، جب میں نے بارہا سوچا تھا: کہاں گئی ناقدین کی اُمتِ وسط، جس نے نظری الجھاوؤں اور نئے پرانے کا جھگڑا نمٹانا تھا؟

اردو شارٹ فکشن کے حوالے سے بیسویں صدی عیسوی کے اُسی ساتویں دہے میں اِس فقیر نے ہی نہیں منشا یاد، رشید امجد، نیر مسعود، اسد محمد خاں، سمیع آہوجا، ظہور الحق شیخ، ساگر سرحدی، ذکاء الرحمٰن، اعجاز راہی، خالد ابراہیم، قمر احسن، سلام بن رزاق، مظہر الاسلام، شمس نعمان، علی تنہا، احمد داؤد، احمد جاوید، حسین الحق، شوکت حیات، انوار احمد، طارق محمود، اسلم سراج الدین، فیروز عابد، علی امام، علی حیدر ملک، حمید سہروردی، ممتاز یوسف، ساجد رشید، انور قمر، زاہدہ حنا، انور سن رائے، اسلم سلازار، منظر امام، احمد عثمانی، احمد تنویر، اسلم یوسف، بدیع الزماں، کمال مصطفیٰ، طاہر نقوی، طاہر مسعود اور رخسانہ صولت نے بھی دیکھا کہ جدید انسان، آئینسکو کے ہاں گینڈے اور فرانز کافکا کے ہاں کاکروچ میں ڈھل چکا تو ہمارے ہاں انتظار حسین کے افسانہ ''کایا کلپ'' میں اُردو کی داستانوی فکشن کے ہیرو شہزادہ آزاد بخت کو مکھی اور ''آخری آدمی'' میں الیاسف کو بندر کی جون عطا ہوئی جو درحقیقت غلام عباس، منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت اور کرشن چندر کی گھنی چھاؤں سے باہر نکلنے کے جتن میں داستان سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی ایک کوشش تھی اور اِس قلب ماہیت کے بعد اُردو شارٹ فکشن کے گملے میں اُگائے گئے جدید انسان کے لیے اپنی جون میں پلٹنا ممکن نہیں رہا تھا۔ مغرب میں تو جو ہوا سو ہوا، ہمارے ہاں شاید اس کا ایک سبب تقسیم کبیر 1947ء تا پاک بھارت جنگ 1965ء تک کے افسانوی ادب میں ایک ابتری (Chaos) کی صورت تھی، یا شاید تخلیقی سطح پر نئے تجربات اور نفسی کیفیات کے مثبت اور منفی اثرات کا حقیقت پسندانہ توازن مفقود تھا۔ جس کے نتیجہ میں اُس دور کے اہم افسانہ نگاروں بالخصوص احمد علی کا آزاد تلازمۂ خیال اور سرریلسٹک اپروچ، احمد ندیم قاسمی اور اختر حسین رائے پوری کی لینڈ اسکیپ کے تحرک کو سمیٹنے کی اِستعداد، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، آغا بابر، رحمان مذنب اور شیر محمد اختر کا نفسی تجزیہ، محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں کی عقلیت اور منطقیت کی مطیع شعور کی رو اور سید فیاض محمود کا جزئیات نگاری سے مرصع بیانیہ، اِس خطے میں وسیع پیمانے پر ہونے والی فکری، سماجی اور سیاسی اُتھل پتھل کو سمیٹنے میں ناکام رہا۔

اِس ابتری اور ناکامی کا ایک سبب مشترک وطنیت کا وہ تصور بھی تھا، جو سیاسی سطح پر ہونے والے انہدام میں چکنا چور ہو کر ہمارے

بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں تعصبات کی صورت اختیار کر گیا۔ اشفاق احمد ''گڈریا'' سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ پائے، اے۔حمید گزشتہ امرتسر کے اسیر ہو کر رہ گئے اور ضمیر الدین احمد نے ''پچھم سے چلی پروا'' ایک ہی افسانہ مختلف عنوانات سے تین بار لکھا۔

یہی نہیں، اُن کے بعد واقعہ نگاری اور بیانیہ سے متعلق بہت سے افسانہ نگار معاشرے کی بدلی ہوئی اقدار پر کامل گرفت سے قاصر رہے اور یوں انور عظیم، مسعود مفتی اور منیر احمد شیخ جیسے تجزیاتی اذہان بھی ماضی کے قائم شدہ حقیقت پسند، رومانی یا ترقی پسند Camps میں پناہ گزیں ہوئے۔

اِس سے قبل قرۃ العین حیدر نے سوال اٹھایا تھا کہ زمین سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟

یوں تو اِس سوال کا جواب حد درجہ آسان تھا، لیکن جواب دیتا کون؟ آزاد خیالی اور خرد افروزی مفقود تھی اور روحانی نوعیت کے لاتعداد سوالات، جن کا جواب کھوجتے کھوجتے قرۃ العین حیدر بھارت پلٹ گئیں اور حاصل کردہ نتائج کو ضابطۂ تحریر میں لانے کے معاملہ میں مختصر افسانہ کو ناکافی تصور کر کے، ناول نگاری کی راہ لی۔

اِدھر پاکستان میں دیکھنے اور محسوس کرنے کو بہت کچھ تھا، یعنی سیکولر قانون دان اور قائد محمد علی جناح کا 11 اگست 1947ء میں فراہم کردہ دستوری خاکہ، اُن کی رحلت (11 ستمبر 1948ء) کے بعد سرد خانے کی نذر ہو گیا اور 1949ء میں ''پاکستانی دستور کی تمہید'' مرتب کرتے ہوئے سیکولر اسٹیٹ کا رُخ تھیوکریسی کی جانب موڑ دیا گیا۔

پاکستان میں شاید یہ ضرورت تھی اُس دور کے ہمارے مسلم لیگی نمائندین کی کہ دستور سازی اور الیکشن ٹلتے رہیں۔ ہمارے ہاں 1956ء میں دستور بن تو گیا لیکن ایک دن کے لیے بھی اُسے لاگو نہ کیا جا سکا۔ اِس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان ایک شکستہ کشتی تھی، جس پر سے جلدی میں اترتے ہوئے مسلم جاگیرداروں اور ہندو سرمایہ داروں نے اِس خطے کے نئے تعمیری خاکہ پر سرمایہ کاری کی، اور اب وہ اقتدار کو اپنے ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کراچی تا دہلی اور دہلی تا ڈھاکہ عوام کو دو بڑی عالمی طاقتوں کو باہمی کشاکش میں آلۂ کار کے طور پر برتا گیا۔ پھر بیوروکریسی کا گھناؤنا کردار، ہندو مسلم اور شیعہ سنی فسادات، لسانی سطح پر سندھ کا خونیں تصادم، مشرقی بنگال میں فوجی ایکشن، بلوچستان اور سرحد میں سیاسی تناؤ...... ایسے میں غلام محمد، مسعود اشعر، شاہد کامرانی، نورالہدیٰ سید، زین العابدین، اُم عمارہ اور شہزاد منظر (جو بنگال کے پانیوں کے مزاج دان تھے) کے افسانوں میں بروقت خطرے کا الارم سنائی دیا۔ پھر ہم سب نے مشرقی بازو سے اکثریت کے ساتھ اُبھر کر آنے والے شیخ مجیب الرحمٰن کو سلاخوں کے پیچھے دیکھا اور اُس کا نتیجہ زوالِ ڈھاکہ کی صورت ظاہر ہوا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پرانے عقائد اور نظریات کی چولیں ہل گئی تھیں۔ بعد ازاں طارق محمود نے اِس آنکھن دیکھی واردات کو اپنے افسانوں ''آئی لینڈ'' اور ''لال باغ'' کا موضوع بنایا۔

یہ ایک ایسی روحانی واردات تھی، جو ستر کی دہائی کے افسانہ نگار کو مقامِ حیرت تک لے آئی تھی۔ اب ہم لوگوں کے سامنے دو ہی راستے تھے، یعنی یا تو ہم اپنے سینئرز کے تتبع میں لکھتے اور اُن کے Camp Followers شمار کیے جاتے اور یا پھر یہ صورت تھی کہ 55-1950ء تک لکھے گئے اُردو افسانے کے گھسے پٹے سٹرکچرل ڈھانچے کا انہدام کریں۔

سو، ہم لوگوں نے یہی دوسری راہ اپنائی۔ یہ ایک ایسا سفر تھا، جس میں نرول مشاہدہ تھا اور نرول خواب۔ ستر کی دہائی کے بیشتر افسانہ نگار برطانوی تسلط سے چھٹکارے کے بعد شعور کی منزل تک پہنچے تھے۔ ہم لوگوں نے تقسیم کبیر (1947ء) کے نتیجہ میں لٹے پٹے مہاجرین کی

آبادکاری کے معاملہ اور لسانی الجھیڑوں کو پنپنے کی آنکھ سے دیکھا۔ لڑکپن میں ''آنہ لائبریری'' میں دستیاب سرخ انقلابی، نیم تاریخی اور رومانی ناولوں کے سہارے طویل دوپہروں کو کاٹ کر بمبئی ٹاکیز، نوکیتن انٹرنیشنل اور راج کپور پروڈکشنز کے رُومانی خوابوں کے ساتھ رہ کر جاگے تو اپنے اردگرد کے سیاسی اور سماجی منظرنامے کو حددرجہ پُرآشوب پایا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِحکومت میں 1972ء تا 1977ء فکری اور اظہاری سطح پر ایک کھلا پن (Open Ness) اور اُس کے بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں زباں بندی دیکھی۔ رجعت پسند دھڑوں کا اتحاد، بحالی جمہوریت کے لیے خُودسوزی کی تحریک اور 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی۔ یہ ریئلزم اور رُومان کا ایک انوکھا سنگم تھا۔ اس منظرنامے کو سمیٹنے کے لیے نئی تدبیرکاری، اسلوبیاتی سطح پر نئے تجربات اور لفظ کا نیا ورتارا ہماری اہم ضرورتیں تھیں۔

ضرورت اس لیے کہ ہم نے انبوہِ کثیر کی دھکم پیل اور چیختی چنگھاڑتی زیبرا کراس پر کھڑے رہ کر طویل انتظار کھینچا تھا کہ شاید حقیقت پسند اور بیانیہ افسانے میں سے اِس نئے طرزِ احساس کے لیے تخلیقی سطح پر کوئی راہ نکلے۔ اِن مُتحارب رنگوں اور روّیوں سے پُر نظام ہائے زندگی کے سیلاب کے بیچ آہنی سلاخوں کی ڈھال سے اُلجھتے اور بھاری بوٹوں تلے کچلے جانے والے، مکھی اور بندر کی جُون میں منقلب انسان کی کوئی صورت ظاہر ہو۔ لیکن ایسا ہُوا نہیں۔

سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشی، ہر سطح پر نفسی کیفیت دُھندلی تھی اور شدید غیریقینی۔ لہٰذا ہم سے جو بَن پڑا لکھا۔ یہ لکھت ملٹی ڈائمنشنل تھی اور اُس کا مقابلہ پُرانے یک رُخے افسانے سے کرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ لیکن ایسا ہُوا، اور ہمارے نزولِ تخلیقی کام کو مُبہم اور تاریک (Obscure) کہہ کر ردّ کیا جاتا رہا۔

میں مانتا ہوں کہ ہمارا تخلیق کردہ افسانہ تاریک بھی تھا اور مبہم بھی، لیکن اِس سے سوا بھی کچھ تھا۔ ہم سب کے سب پوسٹ وار پیریڈ یا شاید پری وار پیریڈ کی اوڈیسی لکھنے میں مگن تھے۔ ستر کی دہائی میں لکھے گئے افسانے کی بڑی پہچان اور قوت ہی یہ ہے کہ اُس نے قاری کے تعصبات کو مجروح کیا۔ نظری سطح پر بھی اور تکنیکی سطح پر بھی۔ ان افسانوں میں نشان سے پیچھے ہٹ کر تمثیل، علامت اور استعارے کے ورتارے کے ساتھ ساتھ آزاد تلازمۂ خیال، سرریئلسٹک اپروچ اور تجریدی حوالے بھی دیکھنے کو ملیں گے اور ٹھوس بچویشن بھی۔ لیکن ہمارے سہل پسند قاری اور قُطبِ دوراں نقاد نے اس مختلف النوع تدبیرکاری کو محض ایک نام دیا...... ''علامتی افسانہ''۔ جب کہ یہ محض علامت نگاری کہاں تھی؟ یُوں اِس فقیر کی عمر کا بڑا حصّہ اِسی نوع کی بنی اسرائیلیات کو ردّ کرنے میں صرف ہوگیا۔ جس کی یادگار ''افسانے کا منظرنامہ'' (1980ء)، ''تیسری دنیا کا افسانہ'' (1983ء) اور ''اُردو افسانے کی روایت'' (1991ء) ہیں۔ ستر کے دہے میں، ہماری مشکل سوا تھی۔ ہم نے بیک وقت تین کہانیوں کو ایک کہانی کی صُورت رقم کیا۔ جن میں سے ایک بڑی انسانی ہجرت کے نتیجہ میں جنم لیتی زندگی کے تال میل کی کہانی تھی۔ دوسری تہذیبی اور رُوحانی ٹوٹ پھوٹ کی، اور تیسری بے چہرہ اور گم شدہ آدمی کی شناخت کی کہانی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح پیچیدہ صورتِ حالات اور نئی بے نام زندگی کے مظاہر کو کوئی نہ کوئی نام دینے کے لیے جیمز جوائس اور ولیم فاکنر کو فکشن اور سیموئل بیکٹ کو ڈراما میں نئی لفظیات وضع کرنا پڑی اور اُن کے لیے پیچیدہ تکنیک کا استعمال ناگزیر ہوگیا، بالکل ویسی ہی صورت حالات ہمیں پیش آئی۔ تب جا کر معلوم ہوا کہ تخلیقی تجربے کی شدت کیا ہوتی ہے اور ہمارے ہاں راجندر سنگھ بیدی اگر پیچیدہ تر بچویشنز کی پیش کش میں زبان و بیان کی غلطیاں کرتا ہے تو اُس کے معنی کیا ہیں اور اُس کے بیان میں کیا اعجاز چھپا ہے۔ محض زبان دانی کے زُعم میں یہ کہہ دینا آسان ہے کہ بیدی نے زبان کے استعمال میں ٹھوکر کھائی۔ جب کہ بیان کی سطح پر بیدی کی کامیابیوں کی تحسین انتہائی مشکل کام ہے، جو ہم پر

واجب ہے۔

آج کون ایسا جی دار ہے، جو کہے کہ جیمز جوائس کے ناول "یولی سز" کے آخری منظر میں ناول کی ہیروئن نولی لوم، زندگی کی بازی ہارتے ہوئے، بستر پر لیٹے لیٹے جب اپنی داخلی خود کلامیوں میں ہمیں شرکت کا موقع دیتی ہے تو اُس کی اکھڑتی ہوئی سانسوں کے تحت اُس کے ادا کردہ مکالمے، گرائمر کے اصولوں کے خلاف جاتے ہیں؟ یا جب ہسپتال میں، بسترِ مرگ پر ناصر کاظمی اپنی آخری غزل کہتا ہے۔

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے

تو کوئی کہے کہ اُس نے کبھی بے وزن شعر کہا۔ کبھی نہیں۔ لیکن ناصر کی یہ آخری غزل کچھ کم فہموں کو بے وزن محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ ناصر کاظمی نے تو اِس غزل کے ہر شعر میں آدھا رُکن گرا کر کمال مہارت کے ساتھ اپنی ٹوٹتی ہوئی سانسوں کی بھی آخری غزل میں سمو دیا۔

ہم نے بھی ایسا کچھ ہی کیا، لیکن ہم لوگ بدنام بہت ہیں اور بہت سے بے بنیاد الزامات کا سامنا بھی کرتے رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ہر بار نئے تقاضوں کے تحت لکھنے والے گزشتہ "نئی پود گروپ" کی طرح کسی ایک دن مل بیٹھ کر یہ طے کرتے ہیں کہ ماضی کو رد کریں گے اور پیش منظر کو گرفت میں لینے کے لیے نیا اندازِ نظر اپنائیں گے۔ یہ سارا کچھ، جو 1970ء کے فوراً بعد سامنے آیا، کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا اور ہر افسانہ نگار اپنے گناہ اور ثواب کا خود ذمہ دار ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کسی نوع کی فکری تحریک بھی نہیں تھی اور اس کا کوئی مینی فیسٹو بھی نہیں رہا تو یہ اتنے بہت سے نام، پُرانے فکری اور فنی ڈھانچے کے انہدام پر کیوں اُتر آئے؟ اِس Zero Time کا تجزیہ ازحد ضروری ہے۔ اور یہ وہ کام ہے، جس کی طرف ہمارے نقاد نے کبھی توجہ نہیں دی۔

یاد رہے کہ کچھ افسانہ نگار ایسے بھی تھے، جیسے انور سجاد، سُریندر پرکاش اور خالدہ حسین، جو 1970ء سے قبل اپنی پہچان بنا چکے تھے، اُن افسانہ نگاروں کی ہمرہی بھی ہمیں میسر تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اِن تینوں افسانہ نگاروں نے ستر کے دہے میں اپنے تخلیقی کام کو فنشنگ ٹچ دیے تو بے جا نہ ہوگا۔ انور سجاد کی ترقی پسندانہ فکر نے "چوراہے" (طبع اوّل: 1964ء) سے "اِستعارے" (طبع اوّل: 1970ء) تک کے فنی سفر کا ایک اور اہم موڑ کاٹا اور اُن کے افسانوی مجموعے "آج" (طبع اوّل: 1983ء) میں شامل چار افسانوں ("دی آئیڈز آف مارچ"، "نئی کونپل" اور "ماں بیٹا") کا یونٹ، جہاں سیاسی جبر کے خلاف ایک قہر آلود چیخ کا درجہ رکھتا ہے، وہیں اُن کے دیگر افسانوں میں حالات سے بے زاری کے نتیجہ میں لایعنیت کا فلسفہ بھی ایک زیریں لہر کی صُورت رواں دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ سریندر پرکاش نے اُسی دور میں "بجوکا" لکھا۔ یُوں "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" اور "رونے کی آواز" کے خالق کی تحریر کردہ کہانی کا جو ہر بدلی ہوئی صورت میں دکھائی دیا اور ان کی ذاتی واردات، اجتماعی واردات میں ڈھل گئی۔ اسی طرح خالدہ حسین نے اپنے نمایاں افسانوں "سواری" اور "ایک رپورتاژ" (مطبوعہ: "سویرا" 1965ء) کے بعد ستر کی دہائی میں لگ بھگ پندرہ برس کی خاموشی کا حصار توڑ کر "پرندہ" اور "ڈیڈ لیٹر" کی صُورت نسوانی احساسِ عدم تحفظ، خوف، اذیت اور تشکیک سے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنے افسانوں میں عصری شعور اور تصوف کے رچاؤ کو جگہ دی۔

یہ تخلیقی سطح پر باہمی لین دین کا معاملہ ہے، جسے ایلیٹ نے زندہ روایت کا شعور کہا تھا۔

اب آیئے اُن افسانہ نگاروں کی جانب، جن کا پیچیدہ تخلیقی کام ظاہر ہی 1970ء کے بعد ہوا۔

رشید امجد: افسانوی مجموعہ: "بیزار، آدم کے بیٹے" (طبع اول: 1974ء)، اعجاز راہی، افسانوی مجموعہ: "تیسری ہجرت" (طبع اوّل:

1973ء) اور احمد داؤد، افسانوی مجموعہ: ''مفتوح ہوائیں'' (طبع اوّل: 1980ء) نے یکسر تشبیہاتی اسلوب اپنایا اور بیانیہ کی گردن مروڑ کر شعر اور نثر کی حد بندیاں توڑ کر رکھ دیں۔ اِن افسانہ نگاروں کے ہاں بے نام کرداروں کے حوالے سے زندگی کی بے معنویت، یاسیت اور بے حسی کی بطور موضوع پیشکش، نیز سیاسی اور سماجی تناظر توجہ طلب ہے۔

منشایاد کے ابتدائی افسانے بھی اُسی تشبیہاتی اسلوب میں سامنے آئے، خصوصاً اوّلین افسانوی مجموعہ: ''بند مٹھی میں جگنو'' (طبع اوّل: 1975ء) کا وقیع حصہ، لیکن ''ماس اور مٹی'' (طبع اول: 1980ء) تک آتے آتے منشایاد دیہی منطقے سے کچھ اس طرح جڑے کہ فرد کا آشوب باقاعدہ جانے پہچانے کرداروں میں ڈھل گیا اور تجرید کی جگہ ٹھوس واقعیت اور تشبیہ کی جگہ علامت نے لے لی۔

میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''گمشدہ کلمات'' یکم جنوری 1981ء میں نکلا تھا اور ''تار پر چلنے والی'' (1984ء) تک میں نے ستر کے دہے میں لکھے ہوئے اپنے سارے افسانے دو مجموعوں میں سمیٹ دیے تھے۔ وہ ستر کی دہائی جس میں ایک طرف تو فکری اور نظریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور دوسری طرف فلسفیانہ توجیہات یا حجاب اور سرگوشی ہے، جس کی مثالیں علی امام، ظہور الحق شیخ اور اسلم سراج الدین کے چیدہ افسانوں میں دیکھنے کو ملیں۔ اسی طرح جبر کے مقابل مہربان فطرت کی طرف جھکاؤ کی صورت میں اسرار اور گم گشتگی کی مثالیں مظہر الاسلام کے اوّلین افسانوی مجموعہ: ''گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی'' طبع اوّل: 1981ء اور انور سن رائے کے ہاں دیکھنے کو ملیں۔ مظہر السلام اور انور سن رائے کے افسانوں میں استعارے تراشنے کا عمل، موضوعاتی سطح پر معصوم فطرت کا چناؤ اور تکنیکی سطح پر مجرد کی تجسیم، نیز مجسم کو مجرد میں ڈھال دینے کا عمل دکھائی دیتا ہے۔

اسد محمد خاں کے پہلے افسانوی مجموعہ: ''کھڑکی بھر آسمان'' طبع اوّل: 1982ء کے افسانوں میں نفسیاتی الجھنوں اور معاشرتی ناہمواریوں کے حوالے سے کرخت معروضی صورتِ احوال، شدید طنز اور درشت لہجے کا باعث بنی۔ ایسے میں اُن کے ہاں اوتار اور یونانی سورما والا مخصوص زاویۂ نظر خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے۔

سمیع آہوجا کے پہلے افسانوی مجموعے ''جہنم + میں'' (طبع اول: 1982ء) میں شامل 1971ء تا 1979ء کے درمیانی دور میں تخلیق کردہ گیارہ افسانے، ہماری لہو میں لتھڑی سماجی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ کے کھرے تجزیے ہیں اور موضوعاتی اعتبار سے پیدا شدہ گھمبیرتا، حد درجہ کھردرے نثری اسلوب اور تکنیک کے تال میل کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح رشید امجد، احمد داؤد اور حسین الحق کے افسانے اپنے عہد کے زخموں کو کریدتے ہوئے فکری اور نظری محاذ پر اُس نادیدہ دشمن سے بھی لڑے ہیں، جس کی انگلیوں سے سیاسی کٹھ پتلیوں کی ڈور بندھی ہے۔

انور قمر، قمر احسن، سلام بن رزاق، شوکت حیات، ذکاء الرحمٰن اور علی تنہا کے افسانوں کی سب سے بڑی پہچان ان کا طاقتور لحن ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے کردار نگاری کرتے اور الجھی ہوئی نفسی کیفیتوں سے متعلق علامات تراشتے ہوئے بیانیہ کو شعور کی رَو کے تحت انوکھی جہتوں سے آشنا کر دیا۔ افسانہ نگاروں کی اسی کیٹگری میں زاہدہ حنا کی نسوانی Feminine اپروچ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُنہوں نے ہمارے عہد کے مضطرب انسانی جوکھم کے بیچ عورت اور مرد کے ازلی تنازعہ کو اُبھارا۔ زاہدہ حنا کے پہلے افسانوی مجموعہ: ''قیدی سانس لیتا ہے'' (طبع اول: 1983ء) کے افسانوں میں اسی انسانی تماشا کا مطالعہ معاملاتِ دل اور بدنی تقاضوں کے بیچ تنی ہوئی رسی کے دونوں سروں سے کیا گیا ہے۔

احمد جاوید نے اپنے اوّلین افسانوی مجموعہ: ''غیر علامتی کہانی'' (طبع اول: 1983ء) اور علی حیدر ملک نے افسانوی مجموعہ: ''بے زمین، بے آسمان'' (طبع اوّل: 1986ء) میں برصغیر کی تاریخ کا تجزیہ جدلیاتی اصولوں کے تحت کیا۔ اُن کے ہاں تاریخ کا مطالعہ وژن کی سطح

پر ہے لہٰذا کبھی تو وہ حال کی کہانی بیان کرتے ہوئے ماضی میں نکل جاتے ہیں اور کبھی ماضی کو کریدتے ہوئے عصری حقائق تک آگے بڑھ آتے ہیں۔ ایسے میں کمار پاشی، شفق اور اسلم سلازار داستانوی انگ اور تمثیل سے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ انوار احمد علامت سازی کرتے ہیں۔

جہاں تک واقعہ نگاری اور بیانیہ کا معاملہ ہے تو گزشتہ پچیس برسوں میں لایعنی افسانوں میں اُسے بری طرح رڈ کیا گیا یا نا قابلِ توجہ تصور کیا گیا جبکہ اس حوالے سے ستر کے دہے میں بیانیہ افسانے سے متعلق احمد یوسف، غلام محمد، نکہت حسن، تقی حسین خسرو، مشرف احمد، حسین الحق اور ساجد رشید کا کام توجہ طلب ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریاں اُن سے مخصوص زاویۂ نظر کے تحت بیانیہ کی نت نئی صورتوں میں ڈھلتی رہی ہیں۔ نیر مسعود کا بیانیہ کافکا سے قریب ہے اور ساجد رشید کھرے حقیقت نگار۔

دیکھیے: بت تراش، اجسام تراشتا ہے: مصور اور خطاط اُنہی اجسام کا فطرت کے ساتھ تعلق واضح کرتا ہے۔ موسیقار انسان کی داخلی کیفیات کو جذبے کی سطح تک اوپر اٹھاتا ہے اور کہانی کار اِس وسیع و عریض کائنات میں انسانی Existence کی رُوداد بیان کرتا ہے۔ بیلے کا فن، جملہ فنون کا مونتاج ہے اور اُس کی اثر پذیری سب سے بڑھ کر۔ عجب اتفاق ہے کہ ستر کے دہے میں جملہ فنونِ لطیفہ کے پرانے فکری اور سٹرکچرل ڈھانچے میں دراڑیں ڈال کر ایک بیلے ترتیب پا گیا۔ راولپنڈی کے مصور حمید ساغر اور کراچی کی مصورہ لبنیٰ لطیف نے موقلم سے فطرت اور انسان کی نئی افسانوی معنویت کو ابھارا تو ہمارے نصرت فتح علی اور بھارت کی پروین سلطانہ نے اِس سارے منظرنامے کو پیلو کی ایک انوکھی سُر سے سنوار دیا۔ یہ سب لوگ ستر کے دہے میں ہمارے ساتھ سامنے آئے تھے۔ یوں ہم لوگوں نے الگ الگ اور مل کر انسانی Existence کی کہانی کو جداگانہ انگ میں رقم کرنے کی سعی کی...... مصوری اور موسیقی کے تال میل سے ایک افسانوی مونتاج بنا گیا۔ یہ سارا کچھ یوں بھی ہوا کہ مصوری میں رنگ اور جنبشِ موقلم، موسیقی میں سر اور فکشن میں زبان یا اظہاری صنف کی حدود، ایک حد تک متعین ہیں اور حقیقی تصور کی عکاسی کے لیے ناکافی۔ اسی لیے بعض اوقات فن کار کامل فنی اظہار کے لیے رنگوں اور لفظوں میں لے کی تلاش کرتا ہے، سُر میں رنگ بھرتا ہے اور الفاظ کو محض سُننے یا پڑھنے کی چیز ہی نہیں، بلکہ چھونے اور دیکھنے کی چیز بھی بنا دینا چاہتا ہے۔ لیکن یہ سب توفیقِ ربّی پر منحصر۔

پھر یہ بات بھی طے ہے کہ جب کبھی فنکارانہ چابکدستی کے بغیر اپنی حدود کو توڑا جائے گا تو اظہاری سطح پر تفہیم کی کمی واقع ہوگی اور ترسیلِ معنی کا المیہ سامنے آئے گا۔ یقیناً ستر کی دہائی میں بھی محض جدت برائے جدت اور نئے پن کی آرزو میں لکھنے والوں کے ہاں ایسا کچھ ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تجرید، شعور کی رَو، علامت، استعارہ اور تمثیل سے بنی ہوئی تنگ و تاریک سرنگ میں سے بے خبری میں گزرنے والے افسانہ نگاروں میں سے کسی کا سر پچک گیا اور کسی کی پسلی ٹوٹ گئی یا کندھا اُتر گیا اسی نوع کی کسی نامعلوم کھنڈت کے نتیجہ میں شمس نغمان، فیروز عابد، اکرام باگ، ساگر سرحدی، کمال مصطفیٰ، خالد ابراہیم، مظہر الاسلام، منظر امام، طاہر مسعود، اعجاز راہی، حمید سہروردی، ذکاء الرحمٰن، احمد عثمانی، ممتاز یوسف، صادق موتی، قمر احسن، انور سن رائے، انوار احمد، اسلم یوسف، بدیع الزماں، رخسانہ صولت اور احمد تنویر ایک مدت سے خاموش دیکھے گئے۔

صوفیانہ اِصطلاح میں بات کریں تو عبادات کی سپرٹ کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ مجاہدات کے ذریعے عرفان حاصل کیا جائے۔ سو، ستر کی دہائی میں بھی کچھ افسانہ نگاروں کے ہاں مجاہدے کی کمی ضرور کھٹکی اور یوں ہمارے کچھ ساتھی افسانہ نگاروں نے اعصاب کو توڑ

کر رکھ دینے والی الجھنوں کا بیان پُرغلط بازی اور ہینڈ بل جیسے ہتھوڑے برسانے والے انداز میں بھی کیا۔ یقیناً بڑے عرفان کو سنبھالنا بھی ایک مشکل کام ہے۔

اسی طرح ہمارے کچھ ساتھی افسانہ نگاروں نے زبان و بیان کی سطح پر بھی یقیناً ٹھوکریں کھائیں۔ اب یہ فریضہ ہمارے ناقدین کا ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ برتے گئے لفظ کے معنی خواہ کچھ بھی ہوں، انہیں برتتے وقت لکھنے والوں کی نیتیں کیا تھیں اور کہاں کہاں زبان و بیان کی لغزشیں قابلِ گرفت ہیں اور کہاں ہیں۔

ستر کے دہے میں جہاں تک ترسیل کی ناکامی اور عدم ابلاغ کا معاملہ ہے تو میں عرض کروں کہ سعود اور نزول، تکمیلِ ذات کی دو کیسی کیفیتیں اور سطحیں ہیں۔ اِس جتن میں سعود کی معرفت پا کر ولی، قطب، غوث اور ابدال کے درجوں تک اوپر اٹھنا بھی کچھ آسان نہیں، لیکن نزول اِس سے بھی مشکل کام ہے۔ یوں، نزول تخلیق کار کے لیے عام قاری کی سطح تک نیچے اترنا بڑا جوکھم ہے۔ لیکن ہمارے ناقدین اور غیر تربیت یافتہ قاری نے ہم سے دونوں سطحوں تک رسائی کی توقع کی۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ ہر دو سطحوں تک پہنچ صرف انبیاء کا حصہ ہے، جو اپنے مجاہدے کی معرفت نہیں، بلکہ وہبی عطا اور توفیقِ ربی کے سبب آغاز میں اُوپر (سعود) اٹھتے ہیں اور جب نیچے (نزول) اترتے ہیں تو ایک عام بدو کے ہاتھ میں سے بھی اپنا ہاتھ اُس وقت تک نہیں چھڑاتے، جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے۔ ہم سے جو بن پڑا، سو کیا لیکن ہمارے ساتھ تو یہ مشکل بھی رہی کہ اگر سعود سے نزول میں آئے تو بدو نے ہمارا ہاتھ ہی نہیں تھاما۔ اب بدو کو کون سمجھائے کہ ہر بالغ تخلیقی عمل پہلے اظہار ہے اور بعد میں ابلاغ۔ یہ لازم ہے کہ ہر تخلیقی عہد کے قاری کا ذہنی رویہ بھی وہی ہونا چاہیے جو فنکار کا ہے۔ یوں قاری کے لیے تخلیق کار کی جانب پیش قدمی شرط ہے۔

مجمل طور پر دیکھیں تو محض ناکامیاں ہی ہمارا مقدر نہیں بنیں۔ ہم نے اپنے تئیں لفظ کے وسیلے سے تیسری دنیا کے اعصاب شکن ماحول کے ایسے ان چھوئے منطقوں کو ظاہر کرنے کی سعی کی، جو قدرے مختلف جہات سے محسوس کیے گئے علاقے ہیں۔ یوں اُس دور کے متحرک سینئر افسانہ نگاروں بالخصوص احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، رحمان مذنب، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو تجریدکار اور علامت نگار افسانہ نگاروں کی تازہ دم کھیپ کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اُن میں سے ہر ایک کا ردِعمل اک دوجے سے مختلف تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک طرف تو ہم لوگوں کو رد کیا، نیز سیدھے سادے بیانیہ افسانوں کی تعریف و توصیف میں حد سے گزر گئے اور دوسری طرف خود علامتی افسانہ لکھنے کی کوشش کی۔ افسانہ: ''پھاڑ'' از احمد ندیم قاسمی اُسی دور کی یادگار ہے۔ عصمت چغتائی نے ستر کے دہے کے افسانہ نگاروں کا مضحکہ اُڑانے کے لیے افسانہ ''سانپ کے کوے'' لکھا اور بیان بازی کی سطح پر طنز کے تیر برسائے۔ پھر یہی کام ممتاز مفتی نے بھی کیا۔ اُنھوں نے ''راول پنڈی گروپ'' کے تجریدی، استعاراتی، تشبیہاتی اور علامتی افسانوں میں سے ٹکڑے چُن کر ایک افسانہ ترتیب دیا، جسے حلقۂ اربابِ ذوق، اسلام آباد کے ایک تنقیدی اجلاس میں پڑھ بھی دیا، ہم سبھی لوگوں کی موجودگی میں۔ لیکن اُن کا وظیفہ اُلٹ گیا۔ بڑی ہوئی اُن کے ساتھ، اُس اجلاس میں۔ اُس کے بعد اُنھوں نے دوسری راہ اپنائی؛ ''چوہا''، ''روغنی پتلے'' اور ''چکٹ گاڑی، ہونکا ہوٹر اور موم بتی'' کے عنوانات سے تین علامتی و تجریدی افسانے لکھے۔ اسی دور میں اشفاق احمد نے ''بندر لوگ''، رحمان مذنب نے ''خوشبودار عورتیں'' اور بانو قدسیہ نے ''انتر ہوت اُداسی'' کے عنوانات سے علامتی اور تجریدی افسانہ لکھنے کا تجربہ کیا۔

20ویں صدی: ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں کے کام کو پرکھنے کے اہم حوالے ''شب خون'' الہ آباد، ''اوراق'' لاہور، ''جواز'' مالی

گاؤں،''اسلوب''،''گیا''،''سیپ'' کراچی اور''نئی نسلیں'' کراچی ہیں۔صرف ایک نیا نقاد ملا...... مہدی جعفر۔ یا وارث علوی اور فضیل جعفری تھے، جنہوں نے توجہ کی نظر سے دیکھا۔ جب کہ ہم اپنے ناقدین۔ سے ایمسن اور ایف۔ آر لیوس کی سطح کی شرح اور تنقیدی معیار کی توقع کر رہے تھے۔ کیا تماشا تھا کہ ناقدین کی مصلحت آمیز خاموشی کے حصار کو توڑتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے''افسانے کی حمایت میں'' لکھ کر طنز ملیح سے کام لیا اور نحس ناقدین نے پڑھے اور پرکھے بغیر ہمارے اس جتن کو ایک بے جواز بکھیڑا قرار دے دیا۔ یوں جس قسم کی مضحکہ خیز صورت حالات کا سامنا ہم نے کیا، اُس کا اندازہ بیسویں صدی کی آٹھویں اور آخری دہائی کے سیّد محمد اشرف اور خالد جاوید کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن اچھا ہے کہ تادیر ایسا ہی رہے اور وہ اپنے کام میں مگن رہیں۔



اُردو افسانے کے اسالیبِ بیان

ہمارے افسانوی ادب کی پیشکش زبان کے ورتارے کی سطح پر چھ زندہ روایات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اوّل اوّل جب نذیر احمد دہلوی کی مقصدی حقیقت نگاری نے افسانہ طرازی کی داستانوی روایت کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیا تو جذبہ اور شعریت کی بازیافت کے ساتھ رومانی مثالیت کو رواج ملا۔ اس کی اولین مثال اُردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کے افسانے ہیں:

''بادشاہی باغ جس نے صاحبقران ثانی جیسے جلیل القدر شہنشاہ سے لے کر بے چارے بہادر شاہ ظفر تک کے جلوس اپنی آنکھ سے دیکھے تھے، خواتین مغلیہ کے قدم اپنے سر آنکھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل شاہدرہ اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ متواتر پانچ ساڑھے پانچ صدی تک بادشاہی باغ نے جو عیش کئے ہیں ان کی نظیر پردہ دنیا پر مشکل سے ملے گی۔ برسات کے موسم میں باغ کا اندھیری حصہ ایک طلسم کدہ تھا۔ آم اور جامن کے درخت زمین میں اس طرح جھول رہے تھے کہ مالی اور باغ بان تو در کنار بہتر سے بہتر صناع دنگ رہ جاتے تھے۔ ڈھائی تین فرسنگ درختوں کی یہ دورویہ قطار اس طور پر چھائی ہوئی تھی کہ چھاجوں پانی پڑ جائے مگر ایک قطرہ زمین پر نہ پہنچے، اندھیری حصہ کی مشرقی سمت پر جمنا لہریں لیتی تھی۔ ساون بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن مغل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب اودی اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر چھاتی تھیں، بجلی کوندتی تھی، بادل گرجتا تھا تو یہ سیر کے رسیا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے، گنگا جمنی ڈوریوں میں روپہلی سنہری پڑیاں پڑتی جاتی تھیں، قلعہ معلی کی پریاں لال سبز جوڑے پہن پینگیں بڑھاتی تھیں، جھولنے والوں کی بھیری آوازیں زمین سے اٹھ کر کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدا سے ٹکراتی تھیں۔ شمع آفتاب جھلملا جھلملا کر دم توڑ رہی تھی۔ روز روشن کا جنازہ دفن کرنے کے قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں لٹکائے کھڑے تھے، اپنے دور شباب کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پتوں کی موسیقی اور پرندوں کا نغمہ شام کا گجر بجا رہا تھا کہ فیروزہ اپنے میلے ڈوپٹے کے بائیں آنچل کو کندھے پر ڈالتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی۔ اس کی کٹیا مصنوعی دنیا کے جھوٹے تکلفات اور ان سامانوں سے جو امیر زندگی کا جزو ہو گئے ہیں پاک تھی۔ مگر اطمینان کی ایک خاموش مسرت گھاس پھونس کے اس ڈھیر پر برس رہی تھی۔''

(''بھنور کی دولھن'' از راشد الخیری سے اقتباس)

ہندوستانی فکشن میں رومان کا داوایا میڈیا رابندر ناتھ ٹیگور تھا۔ اس کے دونوں ابتدائی افسانوی مجموعوں ''Hungry Stones'' اور

''Mashi'' کے اثرات اُردو افسانے میں نمایاں ہوئے اور ٹیگور کی دوررس حیرت پوری ہندوستانی فکشن پر چھا گئی۔

اُردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کو یہ اعزاز ان کے طبع زاد افسانوں کے سبب حاصل ہوا وگرنہ زمانی اعتبار سے سجاد حیدر یلدرم کے تراجم خصوصاً ''ثالث بالخیری''، ''صحبت ناجنس''، ''خارستان وگلستان''، ''فطرت جوانمردی''، ''نکاح ثانی''، ''سودائے سنگین'' اور ''نشہ کی پہلی ترنگ'' راشد الخیری کے اس نوع کے افسانوں سے پہلے شائع ہوئے۔

راشد الخیری کے تسلسل میں زبان کے درتارے کی سطح پر یہ پہلی بھرپور روایت یلدرم، نیاز فتح پوری، قیسی رام پوری، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، مسز عبدالقادر اور قاضی عبدالغفار کی جذباتیت، شعریت، تصویریت اور نغمگی سے مملو نثری روایت ہے، جو اے حمید تک چلی آئی ہے۔

ا۔ ''آسمان پر قوس قزح نکلی ہوئی تھی جس کے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہ ہو وہ یہاں نہ رہے۔''

۲۔ ''تیر ایک ہوا چاک سراسرہٹ سے اس کی طرف گیا اور گردن میں گھسا تھا۔''

۳۔ ''اس کے دل میں ایک طغیان غرور اٹھا۔ جس کی تمام ہیئت کذائی سے گویا بوئے نخش کے بھپکے نکل رہے تھے۔''

۴۔ ''اس کی سیاہ آنکھیں اندیشہ ناک تھیں، اپنے بازوؤں کو جس کی گوشت کی پھڑک کو میں نے ہر وقت ایک عجیب خوف سے دیکھا تھا، اس نے کولہوں پر گرا دیا۔''

(یلدرم کی نثر سے چند اقتباسات)

ا۔ ''عورت کا حسن ان کے نزدیک صرف دیکھنے کے لیے..... آزاد رمیدہ۔ آغوش سے دور......''

(''ایک رقاصہ سے'' از نیاز)

۲۔ ''عورت..... ایک لذت ہے مجسم۔ ایک تسکین ہے متشکل۔ ایک سحر ہے مری۔ ایک نور ہے مادی۔''

(''عورت'' از نیاز)

۳۔ ''ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے، وہ ایک نطق موسیقی ہے۔ حسن کا ساز نسائیت اور صرف نسائیت ہے۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہے تو گویا ہوا میں نقش ترنم بنا دیتی ہے۔ وہ چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشان موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔''

(''چند دن بمبئی میں'' از نیاز)

یلدرم، نیاز، مجنوں گورکھ پوری، قیسی رام پوری اور قاضی عبدالغفار کے ہاں فارس کی مٹھاس اور حلاوت کے ساتھ عربی کی فصاحت نمایاں ہے۔ اس روایت میں پھیلاؤ کی خاصی گنجائش تھی جس سے بعد میں قرۃ العین حیدر اور اے حمید نے فائدہ اٹھایا۔

نیاز فتح پوری کے ہاں جو گیرائی بعد میں پیدا ہوئی، اس کا باعث اس نثری روایت میں غرابت کا بتدریج کم ہونا تھا، جو عربیت کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس ذیل میں ان کے تین افسانے ''دنیا کا اولین بت ساز''، ''زہرہ کا پجاری'' اور ''قربان گاہ حسن'' خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

''اسے قبول کر اور جس وقت میں رومال کو تیسری بار جنبش دوں اپنی خدمت تکمیل کے ساتھ انجام دے۔''

یہ کہا اور اپنا سر تختہ پر رکھ دیا۔ شہزادہ نے سر رکھتے ہی اپنے رومال کو پہلی بار جنبش دی اور جلاد مستعد کھڑا ہو گیا جب شہزادہ نے دوسرا اشارہ کیا تو اس نے تلوار سونت لی، اور اس کے بعد ہی تیسرے اشارے پر ہوا میں شہزادے کے سر پر ایک چمک سی پیدا ہوئی اور تلوار اس کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ ہجوم میں ایک شور پیدا ہوا، دیکھنے والوں کے چہرے متغیر ہو گئے اور دلوں پر حسرت و تاسف کا ایک گہرا سکوت مستولی ہو گیا۔ مرانداب بے ہوش تھی۔"

("قربان گاہ حسن" از نیاز سے اقتباس)

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی رومانی فضا ان کے ترتیب کردہ مخصوص نفسیاتی اور فلسفیانہ نظام کے ماتحت ہے جو بقراطیت کے ساتھ شعر کا لحن لیے ہوئے ہے:

"مجھے پلنگ پر بٹھا کر اس نے چراغ جلایا اور خود زمین پر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے بھی زمین پر بیٹھنا چاہا مگر اس نے صرف ایک نگاہ سے مجھ کو روک دیا۔"

"ہاں تو میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو" حسن شاہ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ اس کے چہرہ کی عجب کیفیت تھی۔ میں چراغ کی دھندلی روشنی میں دیکھ رہا تھا کہ کبھی وہ آگ کی طرح سرخ ہو جاتا ہے اور کبھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد۔ وہ کسی شدید آزمائش سے گزر رہا تھا، کسی جانکاہ تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس پر ہوش و حواس اپنا غلبہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

"کہو حسن شاہ! تم کس عالم میں رہا کرتے ہو اور تم پر کیا گزرا کرتی ہے؟ تم نے مجھ سے کون سا قصہ بیان کرنے کو کہا تھا؟"

("حسن شاہ" از مجنوں سے اقتباس)

مسز عبد القادر نے رومان پسندی کی اس روایت میں ہیبت ناکی کا عنصر شامل کر کے اپنا ایک الگ لہجہ دیا اور حجاب امتیاز علی نے حسن و لطافت، شعر و نغمہ اور رنگ و رومان سے معمور ایک ایسی فضا پیش کی جس میں محو ہو کر قاری دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر ان دونوں خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں عربی اور فارسی کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔

"باغ کا یہ احتتامی کونہ بالکل خشک اور ویران پڑا تھا۔ ہر طرف سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جن پر کہن سالہ اور ڈراؤنے درختوں نے اپنا تاریک سایہ ڈال رکھا تھا۔ ان درختوں کے بے ترتیب اور ان گنت تنے اس بے ڈھنگے پن سے لٹک رہے تھے جیسے بلاؤں کے ڈھانچے اور پنجر۔ اس سونے اور متوحش ماحول میں جب کسی گلہری کی کود پھاند یا کسی نیولے کی وحشیانہ دوڑ سے گھبرا کر دم کشی کی مشق کرنے والا گوشہ نشین الّو اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگتا تو اس شبہ سے کہ شاید ان پنجر نما تنوں میں جان پڑنے لگی ہے، دل دہل جاتا۔"

("راہبہ" از مسز عبد القادر سے اقتباس)

"وہ بہار کی قرمزی شام تھی۔ والد ندی کی سیر کے لیے کشتی پر چلے گئے تھے۔ دادی جان نیچے کمرہ ملاقات میں لوگوں سے ملاقات کر رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں دریچے کے پاس کوچ پر لیٹی ہوئی باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ کشتیاں ندی میں تیر رہی تھیں۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔"

("میری ناتمام محبت" از حجاب امتیاز علی سے اقتباس)

1936ء سے قبل اس رومانی روایت کا آخری بڑا نام قاضی عبدالغفار کا ہے، جنہوں نے اس اسلوبیاتی لہر میں احساس جمال کو تسکین پہنچانے کے ساتھ علم وحکمت کی نکتہ آفرینی کو کچھ اس طرح شامل کیا کہ مجنوں گورکھپوری کی بقراطیت اور قاضی عبدالغفار کی نکتہ سنجی و معنی آفرینی کی الگ پہچان ممکن ہوئی۔

''سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزاء کو شامل سمجھتے ہو، وہ دراصل زہر کے اندر موجود ہی نہیں۔ وہ خود تمہارے اندر ہیں، اپنے اندرون کو ان اجزاء سے پاک کرلو، پھر سانپ کے منہ میں انگلی ڈال دو۔ ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا کہ میں ہوں۔''

(''کھلیما'' از قاضی عبدالغفار سے اقتباس)

اُردو میں اسالیب کی سطح پر دوسری بھرپور روایت کی سپلائی لائن عوام میں تھی، جس کی اٹھان ہندوستان کی عوامی بولیوں سے ہوئی۔ دراصل یہ ہندوستان کے شریف وحشی (Noble Savage) کی زبان تھی۔

اُردو افسانے میں اس کی دو صورتوں نے اظہار پایا۔ پہلی صورت زبان کے روزمرہ کے حوالے سے سامنے آئی۔ یہ صاف اور سادہ زبان تھی جس میں آخر آخر (پریم چند کے ہاں) سنسکرت آمیز ہندی کے اثرات نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اس زبان کا ابتدائی رنگ ملاحظہ ہو:

''دویادھری نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں۔ پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔''

(افسانہ ''سیر درویش'' از پریم چند سے اقتباس)

اس کی دیگر خوبصورت مثالیں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے ہاں ملتی ہیں۔ علی عباس حسینی کے تین افسانے: ''دیکھی''، ''سو بیگھے'' اور ''سیلاب کی راتیں'' اور اعظم کریوی کے موضع پارہ ضلع غازی پور (یو۔پی) کے لینڈ اسکیپ سے متعلق افسانے اس کی مثالیں ہیں۔

علی گڑھ کی عقلیت پسندی اور نذیر احمد کی مقصدی حقیقت نگاری کی عمارت اسی ورتارے کی روایت پر قائم ہے۔ پریم چند نے اس میں ''قومیت'' کا اضافہ کیا تو جذباتیت راہ پاگئی:

''اے وہ بات یاد آگئی۔'' آبدیدہ ہوکر بولی۔

''میرے لیے بھی کچھ لائیں؟''

میں: ''ہاں ایک بہت اچھی چیز لائی ہوں۔''

دویادھری: ''کیا ہے۔ دیکھوں۔''

میں: ''پہلے بُوجھ جاؤ۔''

دویادھری: ''سہاگ کی پٹاری ہوگی۔''

میں: ''نہیں اُس سے اچھی۔''

دویا: ''ٹھاکر جی کی مُورتی؟''

میں: ''نہیں اُس سے اچھی۔''

دویا: ''میرے پران آدھار کی کچھ خبر۔''

میں: ''نہیں اُس سے بھی اچھی۔''

ودیا: ''تو کیا وہ باہر کھڑے ہیں؟''

یہ کہہ کر وہ بیتابانہ جوش سے اٹھی کہ دروازہ پر جا کر پنڈت جی کا خیر مقدم کرے، مگر ضعف نے دل کی آرزو نہ نکلنے دی۔ تین بار سنبھلی اور تین بار گری، تب میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آنچل سے ہوا کرنے لگی۔''

(''سیر درویش'' از پریم چند سے اقتباس)

''گوشائن پور کے مفصلات شروع ہوئے۔ پختہ مکانات، سر بفلک عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ شہر کے پھاٹک سے ملے ہوئے آموں کے درخت۔ کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا۔''

''ایک پیسہ، پاؤ بھر آٹا۔ ایک پیسہ، پاؤ بھر آٹا۔ اندھے فقیر کا سوال'' کی رٹ لگی تھی اس کے زرد زرد دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کی میلی داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے پاؤں کی چاپ سنتے ہی ان کی طرف رُخ کیا۔ اپنا سوکھا ہوا زرد ہاتھ پھیلا دیا۔ ''بابا بھلا ہو گا...... اندھے کا سوال، ایک پیسہ، پاؤ بھر آٹا۔''

(''خوش قسمت لڑکا'' از علی عباس حسینی سے اقتباس)

''اس نے چوں تک نہ کی۔ بھری دو پہر میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے...... ''ہائے میری ہی وجہ سے گھر کا دلدر دور نہیں ہوتا۔ میں گھر کی بلا ہوں۔''

وہ منہ میں بوند بھر پانی بھی نہ ڈال سکی۔ اس رات اسے بہت زور کا بخار چڑھ آیا۔ اس سے پیارے لال کی باتوں کی چوٹ نہ سہی گئی۔ وہ اس بخار میں تین دن بے سدھ پڑی رہی۔ چوتھے دن اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے پیارے لال کو پکار کر کہا:

''بیٹا پیارے! اپنے بچے کو میری چھاتی پر رکھ دے۔ بہو کو بھی بلا لے۔ آ، آج میرے پاس تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جا۔ میں چلتے وقت تو جی بھر کر تم سب کو دیکھ لوں۔''

(''ساس اور بہو'' از اعظم کریوی سے اقتباس)

''ایک دن دُرگا کی ایک سہیلی گورا اس سے ملنے آئی تو اس نے کہا:

''جیجی پریما کا بیاہ کب کرو گی؟ لڑکی بہت سیانی ہو گئی ہے اس کو کنواری بٹھا رکھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ گاؤں بھر میں تمہاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔''

دُرگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ''بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی اب تک کوئی بر ہی نہیں ملا۔''

گورا: ''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہ چلے گا میرے خیال میں تم کو اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

دُرگا: ''بہن تمہیں پریما کو کہیں ٹھکانے لگا دو بڑی کرپا ہو گی۔''

گورا نے کہا ''اچھا میں دیکھوں گی۔'' یہ کہہ کر گورا چلی گئی۔ دو چار دن بعد وہ پھر آئی۔ اس نے آتے ہیں درگا سے کہا ''جیجی مٹھائی کھلاؤ، میں نے پریما کے لیے بر ڈھونڈ لیا ہے۔'' درگا نے خوش ہو کر کہا ''کہاں؟''

''گورا:'' مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہو۔''

درگا:'' ہاں ہاں وہی وہی۔''

درگا:'' ان کی تو عمر بہت زیادہ ہے وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں؟''

گورا:'' عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مرد ہیں ان کی عمر کا کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت سے لوگ بیاہ کرتے ہیں اور جیجی برا نہ مانو تو کہوں تمہاری لڑکی بھی بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو، بڑے امیر ہیں۔ بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب، باغ سب ہی کچھ تو ہے اور سب سے زیادہ اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دان دہیز بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں۔''

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریما کا بیاہ کرنے کے لیے کبھی راضی نہ ہوتی لیکن جب اس نے سنا کہ دان دہیز بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہوگئی۔

گورا:'' ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریما کو دیکھنے آئیں گی۔''

درگا:'' بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا میکہ کھاگا میں ہے۔ وہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو نہیں دیکھ سکتے۔''

گورا:'' خیر تم ایک کام کرو۔ کل سویرے پریم کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا، امر چھ سے جب عورتیں میرے یہاں آئیں گی۔ میں کسی بہانے سے پریما کو اپنے گھر بلا لے جاؤں گی، اس طرح وہ پریما کو دیکھ لیں گی۔ اس میں کوئی ہرج نہ ہوگا'' درگا نے خوش ہو کر کہا'' ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے۔''

(''پریم کی چوڑیاں'' از اعظم کریوی سے اقتباس)

ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اکثریت کو اپنے ''مینی فسٹو'' کی پابندی کے باعث یہ اسلوب اظہار مناسب معلوم ہوا۔ پریم چند اور اس کے Camp Followers کے فوراً بعد اس زبان کے فوری چناؤ کی مثالیں اقبال سنگھ، ملک راج آنند، سجاد ظہیر، جگل کشور شکلا، اختر انصاری، اوپندر ناتھ اشک اور دیوندر ستیارتھی کے ہاں مل جاتی ہیں۔

زبان کی اس اسلوبیاتی روایت کی دوسری پرت (سرت چندر چیٹر جی کے حوالے سے) رومانی جذباتیت کی روایت کے ٹوٹنے سے سامنے آئی۔ سرت چندر چیٹر جی نے بنگال کے شہری سماج کی پیشکش Draought میں اسی زبان کو بنیاد بنایا۔

اُردو افسانے میں حامد علی خان، جلیل قدوائی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی اس روایت کے نمایاں نام ہیں۔ اس اسلوبیاتی پرت کی بنیاد بھی عوامی بولیاں ہی بنی ہیں۔ لیکن یہاں Noble Savage کے گنوار پن اور رومانی جذباتیت کی بجائے خارجیت کا عنصر غالب ہے۔ اس کا شہری لہجہ نکھرا ستھرا ہے اور اختصار اس کی نمایاں خوبی۔ اس اسلوبیاتی روایت میں مختصر افسانہ لکھنے کے تجربات، رتن سنگھ اور گربچن سنگھ نے بھی کیے۔

ا۔ ''یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کی مانند لٹکتی رہتی ہیں...... آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔''
(''پہچان'' از منٹو سے اقتباس)

۲۔ ''امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغلپورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے، متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے...... کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں۔ وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف، بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں...... لوٹ، آگ، بھاگم بھاگ، سٹیشن، گولیاں، رات اور سکینہ! سراج الدین ایک دم کھڑا ہو گیا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ سکینہ سکینہ، پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہیں ملا۔''

(''کھول دو'' از منٹو سے اقتباس)

عام طور پر اس زبان میں ایسی تشبیہات جن میں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو قابل توجہ نہیں رہتیں لیکن منٹو، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کے دُور رس تصور نے موزوں ترین مماثلتیں اور مشابہتیں تلاش کر کے تشبیہ کو مفہوم اور تجربے کی گہرائی بخش دی۔

''نواب سنگھ مردانہ شباب اور وجاہت کا نمونہ تھا۔ اس کے قد و قامت، ڈیل ڈول اور تیور دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ رنگ بے شک گندم گوں تھا اور چہرے سے کبھی خشونت کے آثار ظاہر ہوتے تھے، پھر بھی وہ مجموعی حیثیت سے خاصا دل کش نظر آتا تھا۔ اس کے رعب داب کی تو حد ہی نہیں تھی۔ علاقے بھر کے نوجوان اور بگڑے دل غنڈوں کے دل دہل کر رہ جاتے تھے اور وہ اس کے ایک ہی جھانپڑ سے خون تھوکنے لگتے تھے۔''

(''چاند اور کمند'' از بلونت سنگھ سے اقتباس)

''جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں میں تھما دی تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اٹھے اور ملائم دہکے ہوئے، بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے۔''

(''طلائی مہر'' از احمد ندیم قاسمی سے اقتباس)

''میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے، جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔''

(''چوتھی کا جوڑا'' از عصمت چغتائی سے اقتباس)

زبان کے ورثے کی ایک بھرپور روایت نے چوہدری محمد علی ردولوی کے افسانوں میں جنم لیا۔ بحیثیت اسٹائلٹ محمد علی ردولوی کا نام یلدرم اور پریم چند کے بعد سب سے نمایاں ہے۔ ردولوی کے ہاں قدیم روایات سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی ایک منفرد نثری آہنگ میں

ڈھل گئے ہیں۔ یہ داستان کی نثری روایت کی بازیافت ہے جس میں محمد علی ردولوی نے اپنی انفرادیت زبان کے برجستہ استعمال کے ساتھ ساتھ قلم کے شوخ و شنگ Stroke اور مزاج کے بانکپن سے پیدا کی ہے۔ محمد علی ردولوی Paradoxes کا بادشاہ ہے:

''سنئے صاحب، میں کہانی لکھتا نہیں ہوں، کہانی کہتا ہوں، اچھی معلوم ہو تو سنتے جایئے۔''

اندر والا: سنو بی ناجو تم اور صغیر جو پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کرتے ہو اور جو کوئی کچھ کہہ دے؟''

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرتے نہیں تو ڈر کس کا، بھلا مجھ سے آٹھ سال چھوٹا اور پھر وہ تو مجھے چچی کہتا ہے۔

اندر والا: تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کیا کوئی کرے۔''

(''دھوکا'' از محمد علی ردولوی سے اقتباس)

''راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔''

(''کشکول محمد شاہ فقیر'' سے اقتباس)

آگے چل کر زبان کے ورتارے کی اس روایت میں ابوالفضل صدیقی، خان فضل الرحمٰن، سید رفیق حسین اور قاضی عبدالستار کے نام ابھر کر سامنے آئے۔ سید رفیق حسین نے جنگل کو اس کے تمام رنگوں سمیت اس اسلوب کا حصہ بنا دیا اور قاضی عبدالستار نے نشتریت، انگیخت اور Paradox کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ اسے ایک نیا لحن دیا۔

''اجی ٹھاکر جی آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟'' استاد رضا خان نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''آپ پچیس تیس آدمی ایسے فراہم کیجئے جو بیٹری سے نیچے گڈھے میں سے پانی اٹھا کر اس بھٹ میں بھر دیں۔''

(''بازگشت'' از ابوالفضل صدیقی سے اقتباس)

''دڑو کی بیوی اس سے گت تھی۔ جسے وہ سراؤ گیوں کے گاؤں جیبن پورے سے لایا تھا۔ اس کے گاؤں میں کسی نے بھی اپنی لڑکی اسے دینے کی حامی نہیں بھری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نوزائیدہ لڑکی کے لیے زچہ خانہ میں شادی کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے کانوں میں گرام یا چک کی یہ آواز پڑی تھی: ''دڑو تجھے تو یہ بات کہہ کر لاجنا چاہیے۔''

(''نربسی'' از خان فضل الرحمٰن سے اقتباس)

''کلوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دیئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر، یہ روانہ ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں، ہر طرح کی بُوؤں میں چندو کی بُو اس کے واسطے الگ تھی۔ بُو لیتا، بُو ہی بو چل دیا۔''

(''کلوا'' از سید رفیق حسین سے اقتباس)

''سدھولی، جہاں سے سیتاپور کے لیے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا، میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکہ والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا:

''میاں الی شاہ جی، بھسول کے ساہوکار ہیں، ان کے یکہ کا بم ٹوٹ گوا ہے۔ آپ برا نہ مانو تو الی بیٹھ جائیں۔''
میری اجازت پا کر اس نے شاہ جی کو آواز دی۔ شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکے والے نے میرے اور ان کے سامنے ''پیتل کا گھنٹہ'' دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں موگری کی چوٹ کا نشانہ بنا تھا۔ دوانگل کے حاشیے پر سوراخ میں سوت کی رسی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور یکہ والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکہ والے سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا...... ''کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو۔''
ہاں! کل شام کو معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے دیہن بلائے کے۔ الی......''
''ہاں وقت وقت کی بات...... شاہ جی، نا ہیں تو ای گھنٹہ...... اے گھوڑے کی دم راستا دیکھ کے چل......''
یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔
میں، ''میاں کا برا وقت'' چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔''
(''پیتل کا گھنٹہ'' از قاضی عبدالستار سے اقتباس)

زبان کی پانچویں روایت رویلدرم اور پریم چند کے Camp Followers نے تشکیل کی۔ یہ آدرش حقیقت نگاری اور رومانی لہجے کی باہم آمیزش تھی۔ اس کی ایک ابتدائی مثال خواجہ حسن نظامی کے ہاں (افسانہ ''بہرا شہزادہ'') ظاہر ہوئی تھی۔ اس روایت میں حسن نظامی کا لہجہ مغل زوال کے حوالے سے شکوہ الفاظ اور بردباری کا حامل تھا۔
زبان کے ورتارے کی سطح پر رومان اور حقیقت پسندی کا یہ ملاپ ملک راج آنند سے ہوتا ہوا کرشن چندر کے ہاں ظاہر ہوا اور معیار قائم کر گیا۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں آدرش حقیقت نگاری، رومانیت کے زیر اثر شعریت اور نغمگی کی دریافت کرتی ہے۔
''رنگی مجھ سے شادی کرو گی۔''
چلتی ہوئی فاسٹ لوکل کا طوفانی شور۔ پہیے مہیب آواز کھنکھناتے ہوئے۔ ان آوازوں کی ہیبت ناک گونج میں ایک تنکے کی طرح لکھی کی آرزو بھنور میں چکر کھاتی ہوئی، پھر شور تھم گیا۔ گاڑی چلی گئی۔ یکا یک سناٹا بہت بڑھ گیا۔
رنگی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ریل کی پٹڑی پار کرنے لگی۔ ریل کی پٹڑی پار کر کے وہ دوسری طرف چلے گئے۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ایک خالی نشیبی زمین سے گزر کر اسٹیشن جانے والی سڑک سے مل جاتی تھی۔
رنگی نے وہ چھوٹی سی پگڈنڈی بھی پار کر لی۔ اب وہ سڑک پر آ گئی پھر بھی وہ کچھ نہ بولی۔ لکھی ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ماہم کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔''

(''رنگی'' از کرشن چندر سے اقتباس)

کرشن چندر کے حوالے سے اس اسلوبیاتی روایت کا اثر قبول کرنے والوں میں رواں پس منظر کے نوترقی پسند افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد ہے۔
زبان کی چھٹی بھرپور اسلوبیاتی روایت نے چیخوف کے عالمگیر اثرات کے تحت اُردو افسانے میں جنم لیا۔ یہ زبان کے تخلیقی امکانات کی

دریافت کرنے کی روایت ہے۔ یہ اسلوب ظاہر میں باطن کو دیکھنے اور دکھانے کے تخلیقی عمل کی ضرورت ٹھہرتا ہے۔ اس میں نثر کی موسیقیت موضوعات کے ساتھ یکجا ہو کر شاعرانہ سطحوں کو چھونے لگ جاتی ہے۔ اس اسلوبیاتی روایت کی داغ بیل ہندوستانی فکشن میں راجا راؤ' سے پڑی:

"She was nervous and Tremeled over and say Between Her Sobs "Oh mother." The Cartman asked me to get in. I jumped into the cart with a havy hert. "Hoi-Hoi," Cried the cartman and the bullocks stepped into the river. Till we were on the other bank, I could see Javni sitting on a rock and looking towards us. In my soul, I still seemed to hear her sobs. A huge peepal rose behind her 'and across the blue waters of the river and the vast sky above her' she seemed so small So-insignificant-" ("Javni"- Raja Rao)

اُردو افسانے میں زبان کے اس درتارے کی ابتدائی مثالیں راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور سید فیاض محمود کے ہاں ظاہر ہوئیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں تصویر کے ظاہر میں باطن کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کا تخلیقی عمل تخلیقی امکانات کو روشن کرتا چلا گیا ہے البتہ زمینی بوباس اور ہندوستانی اساطیر کی اٹوٹ سپلائی لائن اس میں بیدی کی انفرادیت ہے۔ اس روایت میں استعاراتی تدبیر کاری کی مثالیں ''گرہن'' (بیدی) اور ''آنندی'' (غلام عباس) ''کام چور'' (سید فیاض محمود) ہیں۔ اس اسلوب کی نرم ولطیف مزتی اور باہم الجھتی راہداریاں، تخلیقی عمل کے دوران رفتہ رفتہ دیومالائی عناصر (بیدی) شائستگی (غلام عباس) اور حلاوت (سید فیاض محمود) کو جگہ دیتی ہیں جوان افسانہ نگاروں کی انفرادیت ٹھہری۔

''پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی، سرپٹ بگٹٹ...... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی...... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا...... دودھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لیے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے...... چاروں طرف اندھیرا تھا اور دور اسا ڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں...... دان کا وقت ہے......

چھوڑ دو...... چھوڑ دو...... چھوڑ دو......

ہر پھول بندر سے آواز آئی...... پکڑلو...... پکڑلو...... پکڑلو......

چھوڑ دو...... دان کا وقت ہے...... پکڑلو...... چھوڑ دو!!''

(''گرہن'' از راجندر سنگھ بیدی سے اقتباس)

آگے چل کر بلراج مین را اور خالدہ حسین نے اسلوب بیان کی اس روایت کی انتہاؤں کو چھولیا۔

اُردو افسانے میں رواں زبان کی ان بھرپور اسلوبیاتی روایات کے علاوہ بھی نئے امکانات کی تلاش جاری رہی۔ البتہ منٹو کا استعاراتی افسانہ ''پھندنے'' کرشن چندر (''غالیچہ''، ''النادرخت''، ''ہاتھ کی چوری''، ''گدھا''، ''بت جاگتے ہیں''، ''نیکی کی گولیاں'') اور میرزا ادیب (''دل ناتواں''، ''درون تیرگی'') کے علامتی افسانے۔ ''آہ دوست'' (قرۃ العین حیدر) اور ''مردہ سمندر'' (کرشن چندر) جیسے کامیاب تجریدی افسانے، بھرپور اسلوبیاتی روایات کی داغ بیل ڈالنے میں ناکام رہے۔ اسی طرح اختر اورینوی کے ''کینچلیاں اور بال جبریل'' کی

اساطیری اشاریت، عزیز احمد کا ''تصور شیخ'' اور انتظار حسین کا ''زرد کتا''، اپنے ملفوظاتی لہجہ کا چلن نہ کروا سکے۔ عزیز احمد اور انتظار حسین داستانوی اسلوب کے Revival میں ناکام ہوئے۔

''میں عورت ذات پردے کی بیٹھنے والی ٹھیری، میرا تو ذکر کیا۔ تقدیر سے جس کے پلے بندھی، وہ بھی ایسے گھر گھسنے ہیں کہ باہر جانے کے نام سے دشمنوں کا برا حال ہو جاتا ہے۔ دس برس سے خاصے تیس روپے کے نوکر تھے۔ صاحب نے کہیں باہر کی بدلی کر دی۔ بس پھر کیا تھا دفتر سے جو آئے، تو بخار چڑھ آیا۔ دست چھوٹ گئے۔ اماں جان نے جو سنا، تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا جھلسا لگے ایسی نوکری کو، صدقے کیے تھے یہ تیس روپلی۔ بڑا جوانا مرگ پردیس بھیجنے والا آیا۔ اس بندی کا ایک تو پھونسڑا ہے۔ نابابا، مجھے اپنے بچے کی جان پیاری ہے، روزگار پیارا نہیں۔''

(''سفر ریل کا'' از اشرف صبوحی سے اقتباس)

راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور اشرف صبوحی دہلوی کے افسانوں میں دلّی کی ٹکسالی زبان کا پاکیزہ روپ صادق الخیری اور آمنہ نازلی کے ہاں لوک ایمایت کے ظہور کا باعث تو بنا لیکن ٹکسالی کی تمام متانت اور پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی افسانے میں کسی زندہ روایت کو جنم نہ دے سکا۔

زبان کے ورتارے کی سطح پر ان آخر الذکر ناکامیوں کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زبان کو اس کی باطنی اور نامیاتی نشوونما کے بغیر بدلنے کی کوشش کی گئی اور یہ حرکت اس وقت سرزد ہوتی ہے جب اسالیب میں بنیادی نوعیت کی ترامیم اور اضافے کرنے سے پہلے زبان کی روایت کو نہیں سمجھا جاتا اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان لسانی تشکیلات کی ماضی کے اجتماعی تجربے اور اجتماعی شخصیت سے کوئی نسبت ہے بھی یا نہیں۔

ہندوستان میں تصوف کی باقاعدہ فکری بنیادیں ہونے کے باوجود، داراشکوہ کی شکست سے یہ صورت حالات سامنے آئی۔ ''سب رس'' کی صوفیانہ تمثیل خود ہندوستان کے ایک بہت بڑے طبقہ کے لیے ''راز'' بن گئی۔ قاری تصوف کی اصطلاحوں اور وارداتوں سے دور ہونے کے سبب ''حسن کی ہمزاد''، ''وصال کا چھپی'' اور ''حسن کی انگوٹھی'' سے کچھ بھی مراد نہ لے سکا اور اسے واقعات کی صوفیانہ تشریح کی ضرورت پیش آئی۔ دوسری طرف علمی اور اسلوبیاتی سطح پر اس کے دور رس اثرات میر امن کے علاوہ پونے دو سو سال بعد آنے والی تصنیف ''فسانہ آزاد'' تک نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف زبان کے ورتارے کی سطح پر حقیقت پسندی کا اظہار یوں ہوا کہ جذبے کی آمیزش کے بغیر خارج کی اشیاء کی فہرست سازی عمل میں آئی یا یوں کہیے کہ شے کی جزوی تفصیلات بہم پہنچائی گئیں، جبکہ دوسری لہر جذبے کے زیر اثر لفظ کے برتاؤ کی تھی۔ ایسا بہت کم ہوا کہ لفظ کے حوالوں سے تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو، جس کی ایک مثال راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ ''جوگیا'' سے ملتی ہے۔ جہاں لفظ، رنگ ہیں اور رنگ جذبات کی چہرہ نمائی کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی کے تحت تخلیقی استعاروں کا کال پڑا اور لفظ کا برتاؤ نشان کی حدود سے آگے نہ نکل سکا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نثر میں بیان کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی یا جذبے کے برتاؤ کے سلسلے میں افسانہ نگار عوامی سطح سے ذرا اونچا نہ اٹھ سکا۔ خیال محض کی نثر کیسے وجود میں آئے؟ اُردو میں گورکی، کانٹ اور ٹیگور کا ترجمہ تو ممکن ہے۔ مارسل پردست یا استاں دال (عسکری صاحب کی ایک مثال کے علاوہ) کا ترجمہ ممکن نہیں۔ اس لیے کہ ہر دو، جذبات کا تجزیہ فکر محض کی زبان میں کرتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں آج تک فکر محض کی زبان کی کوئی روایت پنپ ہی نہیں سکی۔ ہم نے شستہ نثر کی جستجو کی ہے، ایسی نثر جو بقول ہربرٹ ریڈ، ''پیش خیمہ ہے فکر عمیق کا۔''

محمد حسین آزاد کے ہاں اُردو زبان کی تنگ دامانی قوت مدرکہ کی تسکین نہیں کر پائی۔ تخیل کا زور و شور البتہ قابل لحاظ ہے جس کے سبب نیم خوابی کی کیفیت کا اظہار حد درجہ کمال تک پہنچ گیا اور ابوالکلام آزاد ہیں جن کے لہجے کی کھنک نیاز کے ہاں نرے رومان میں ڈھل گئی ہے۔

زبان کے ورتارے کی سطح پر مل ملا کر یہی کچھ زور مارا گیا۔

رہا آج کے افسانوں میں زبان کے ورتارے کا سوال، تو اس کا جنم ہمارے آج کے طرزِ احساس سے ہوگا۔ ایسی زبان جو فکری اور تہذیبی سطح پر نت نئی تبدیلیوں کو اپنے اندر کھپانے کی لچک رکھتی ہو۔

پیش منظر کے افسانہ نگار کو طرزِ احساس کی تبدیلیاں محسوس کرتا ہوں گی اور پھر پرانے جذباتی نظام کو نیا پرانا کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ پیش منظر کا افسانہ نگار ان موجود اسلوبیاتی روایات کی حدود سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے نئی تدبیر کاری کا جتن کرنا، رواں پس منظر کو رد کرنا ہے تاکہ زندہ روایت میں پھیلاؤ کی گنجائش نکلے۔ یہی روایت سے انحراف کل روایت کی توسیع ٹھہرے گا۔

پس منظر اور پیش منظر کے افسانے کا واضح فرق اسلوبیاتی سطح پر یک رخے افسانے اور ہم جہت افسانوی تدبیر کاری کا ہے۔ تشبیہ اور نشان یا اشارہ، پس منظر کے اظہار کا وسیلہ ہیں اور استعارہ پیش منظر کے اظہار کا وسیلہ، جبکہ تشبیہ یا اشارہ کی معنوی رینج استعارے کے مقابلے میں بہت محدود ہے۔

ڈی۔ ایچ لارنس کا ''لیڈی چیٹر لیز لور'' اور ہیوبرٹ سلبی کا ''لاسٹ ٹو بروکلن'' ایک معاشرت کی ٹوٹ پھوٹ اور نئی طرزِ زیست کے جنم لینے کے درمیانی عرصے کی پیداوار ہیں۔ (ان ناولوں کی ایک اہمیت یہ ہے کہ وہ معاشرتی بکھراؤ میں اضافے کا باعث ہے) بالکل اسی طرح پیش منظر کے افسانے میں منافق، حرام کار، آبرو باختہ، حریص اور خصّی کردار آج کے افسانہ نگار کے سامنے سوالیہ نشان بنا کھڑا ہے۔ یہ بہت ٹیڑھا کردار ہے اور اس کی خصلتیں روایتی اسالیب اظہار سے باہر بم توڑ دیتی ہیں۔ اس کردار کی پیشکش کے لیے افسانے کی فارم اور زبان کے ورتارے کی سطح پر تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ وہی طریقہ کار ہوگا جو، ڈی۔ ایچ لارنس اور ہیوبرٹ سلبی نے اختیار کیا یعنی اپنے عہد کے ہجڑے پن، لواطت، زناکاری اور کمینگی کو گرفت میں لینے کے لیے مروجہ تدبیر کاری کو خیر باد کہا گیا۔

آج رواں پس منظر کے افسانہ نگاروں اور نئے لوگوں کے ہاں زبان کے ورتارے کا واضح اختلاف ماضی تا حال، نسلوں کے خارجی اور باطنی تجربات کا اختلاف ہے۔ پس منظر اور رواں پس منظر کا زیادہ تر افسانہ ترسیل محض، جب کہ پیش منظر کا افسان، ترسیل محض سے اختلاف کی صورت ہے۔



اس تناظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو افسانے کے سٹرکچر کو زیرِ بحث لاتے ہوئے کیا حقیقت واقعہ، کردار نگاری، غائیت اور اسلوبِ بیان یکساں اہم ہیں یا اُن میں سے کوئی ایک؟

اس سوال پر غور کیے بغیر ہمارے ہاں عمومی طور پر اُردو افسانے سے متعلق تنقیدی مباحث میں حقیقت واقعہ اور کردار نگاری کے مقابلے میں اسلوبِ بیان بہت کم زیرِ بحث آیا ہے۔ جبکہ فن پارے کے باہم گتھے اور رچے ہوئے عناصرِ ترکیبی کا کامل تجزیہ اسلوبِ بیان کو زیرِ بحث لائے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا پیچھے مُڑ کر دیکھنا ہوگا۔ اس لیے بھی کہ اُردو کے پہلے افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' از راشد الخیری مطبوعہ ''مخزن'' دسمبر 1903ء تا حال کے دورانیہ پر مشتمل اُردو افسانے کے ایک سو پانچ سالہ سفر میں بروئے کار لائے جانے والے اسالیبِ بیان کا جائزہ ہمیں آنے والے کل کے لیے اُس بہترین کا چناؤ کرنے کے قابل بنا سکتا ہے، جس کی خواہش ہمیشہ کی جاتی ہے۔

آج اِس خصوص میں کام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ گزشتہ صدی کے سنہ ساٹھ اور سنہ ستّر کے افسانہ نگار کا حدف موجود سے پرے کا علاقہ بھی رہا ہے۔ یوں موجود اور واضح کے مقابل غیر واضح، شعور کے مقابل لاشعور اور اجتماعی لاشعور، حقیقت اور رومانیت کے مقابل شک اور خارجیت کے مقابل داخلی اُلجھیڑوں نے اہمیت اختیار کر لی اور حقیقت واقعہ، جسے افسانے کا جوہر اور توانائی کا مرکز تصور کیا جاتا تھا کی اہمیت بدرجہ ہا کم ہو کر رہ گئی۔ جس کے نتیجہ میں آدرشک، مینی فیسٹو کے پابند اور رومانوی یک رُخے بیانیہ کی جگہ علامتی، استعاراتی، تجریدی اور کیوبسٹک اظہار بیان نے اہمیت حاصل کی۔

یہ طے ہے کہ 20ویں صدی کا آغاز بہت بڑی اکھاڑ پچھاڑ سے ہوا۔ جمالیات، امپریل ازم، سوشل ازم اور اسٹھیٹک ازم کے ریلوں اور یورپ کی نت نئی تحاریک کے اثرات نے ہمارے افسانوی بیان کو حد درجہ متاثر کیا۔ بے شک، کسی بھی نوع کی بڑی ہلچل کا پہلا فیز ایسے ہی متحارب میلانات سے ظہور پاتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کی اِدراک پسندی اور ڈپٹی نذیر احمد کا مقصدیت کے مقابل کہانی کے سادہ بیانیہ، تمثیلی لحن اور داستانوی بیان کی شعریت نے دم توڑ دیا تو اُردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کی معرفت ڈپٹی نذیر احمد کے تمثیلی قصوں سے مخصوص زبان کا دہلوی انگ اُردو مختصر افسانے کے فریم میں منتقل ہو گیا اور اُس اسلوب اظہار میں مختلف علاقہ جات اور تہذیبی مراکز کے محاورے اور روزمرہ کے اضافہ جات دیکھنے کو ملے۔ جیسے عباسی بیگم (والدہ حجاب امتیاز علی) کے ہاں جنوبی ہند کے ضلع کرشنا اور فرساپور کا مضافاتی انگ اور روزمرہ کا استعمال، نذر سجاد حیدر (والدہ قرۃ العین حیدر) کا اُتر پردیش سے متعلق مخصوص لہجہ، آمنہ نازلی کا دہلوی محاورہ اور اُمت الوحی کے ہاں پنجابی زبان کی آمیزش سے پیدا ہونے والا مخصوص آہنگ نسوانی آدرشک حقیقت نگاری اور رُومان نگاری سے مخصوص رہا جس میں آگے چل کر صدیقہ بیگم سیوہاروی، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی اور بانو قدسیہ نے اپنے اپنے علاقائی اثرات کے تحت نئے لہجے تراشے۔

اُردو کے دیگر دو ابتدائی افسانہ نگاروں علی محمود اور وزارت علی اورینی نے 1904ء تا 1906ء کی مختصر درمیانی مدت میں علاقہ بہار سے مخصوص ہندوستانی Noble Savage کی سادہ زبان کا چلن عام کر دیا۔ مثال کے طور پر علی محمود کے ہاں سوکھے درخت کی بجائے ''ٹھوٹھے درخت''، اکیلا کی بجائے ''اکلا''، کارنس کی بجائے ''کنگنی'' اور سناٹا کی بجائے ''سناٹی'' بانکی پور، بہار سے مخصوص لفظیات دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب کہ وزارت علی اورینی کے ہاں بہار کے مضافات سے مخصوص لفظیات کم بہت ہی کم ہے:

''میں نے مصوری کا فن چھاؤں سے سیکھا۔ جن چیزوں کو میں دیکھ کر نہ بنا سکتا، سایہ سے اُن کو بڑی اچھی طرح بنالیتا..... گلستان کی چھاؤں، نہر اور سڑک کے کنارے کے درختوں کی چھاؤں، قبرستان کی چھاؤں..... کیا تم نے اپنے پروردگار پر نظر نہیں کی کہ اُس نے کیوں کر چھاؤں کو پھیلا رکھا ہے؟ اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا ہوا کر دیتا۔ پھر ہم نے آفتاب کو اس سبب ٹھہرا دیا ہے۔ پھر اسے ہم اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں۔''

(''چھاؤں'' از وزارت علی اورینی، ''مخزن'' لاہور، جنوری 1904ء ص 31 تا 35)

بعد ازاں سہیل عظیم آبادی، اعظم کریوی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، انور عظیم، احمد یوسف، اُم عمارہ، حسین الحق، عبدالصمد، علی امام، شوکت حیات اور شموئل احمد کے افسانوں میں اِس بہاری انگ کی گھلاوٹ اور اکھڑ پن کے متنوع رُوپ ظاہر ہوئے۔

1906ء سے سجاد حیدر یلدرم کی معرفت اُردو نثر میں رومانی مثالیت نے رواج پایا۔ یہ کلاسیکیت کی نہیں، مقصدی حقیقت پسندی کا ردِ عمل تھا۔ داخلیت، جس کا وصف خاص ہے۔ جب کہ نیاز فتح پوری کی رومانیت کی نمایاں پہچان وارفتہ نوائی ہے جس کے ڈانڈے بعض اوقات

کھردری حقیقت پسندی سے بھی جڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں مجنوں گورکھپوری کی رومانی بقراطیت اور حجاب امتیاز علی کے ہاں پایا جانے والا احساسِ اجنبیت دو الگ ذائقے ہیں۔

یہ بھی طے ہے کہ اُس دور کی فکشن میں رومان کا دایا میڈیا رابندر ناتھ ٹیگور تھے۔ ٹیگور کے ابتدائی افسانوں میں پائی جانے والی دُوررس حیرت اور شاعرانہ لحن سے ہمارے اولین رُومانی افسانہ نگار متاثر دکھائی دیے لیکن آگے چل کر نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری اور حجاب کے ہاں آسکر وائلڈ کی نرول جمال پرستی، ہیگل کی نفسی فضابندی نیز رائڈر ہیگرڈ اور عمر خیام کی رومانی انفرادیت کے اثرات بھی محسوس کیے گئے جب کہ مسز عبدالقادر صرف و محض ایڈگر ایلن پو کی قہار رومانیت سے متاثر دکھائی دیں۔

یلدرم اور نیاز کے ہاں فارسی کی مٹھاس اور حلاوت اُن کے اسالیبِ بیان کا وصفِ خاص ہے۔ زبان و بیان کی اسی روایت میں حجاب کے ہاں جو نکھار دیکھنے کو ملتا ہے اُس کا باعث غرابت کا بتدریج کم ہونا تھا، جو عربی کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی۔ آگے چل کر یہ اسلوبیاتی روایت قرۃالعین حیدر کے ہاں ایک معیار میں ڈھل گئی۔

1908ء تک آتے آتے علی گڑھ تحریک کی ادراک پسندی اور ڈپٹی نذیر احمد کی مقصدیت کے باہمی اِدغام کی صورت پریم چند، سلطان حیدر جوش اور سدرشن کے افسانوں میں ظاہر ہوئی۔ یہ روزمرہ کے حوالے سے صاف اور سادہ زبان تھی جسے پریم چند کے ہاں جذبۂ قومیت نے قدرے جذباتی بنا دیا اور سلطان حیدر جوش کے ہاں طنز کی کاٹ دیکھنے کو ملی۔ بعدازاں علی عباس حسینی نے بھی یہی زبان برتی لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ پریم چند اور سدرشن کے ہاں ہندی لفظیات کی کثرت ہے۔

1936ء میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اکثریت کو مینی فیسٹو کی پابندی کے، باعث یہی اسلوبِ اظہار مناسب معلوم ہوا، البتہ ہندی الفاظ کا استعمال رفتہ رفتہ گھٹتا چلا گیا۔ اِس اسلوبِ اظہار کے فوری چناؤ کی امثال ملک راج آنند اور جگل کشور شکلا کے ہاں مل جاتی ہیں۔ بعدازاں ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی نے یہی زبان برتی۔

یادرہے کہ پریم چند کے شاہکار افسانہ ''کفن'' کی تخلیق (1935ء) سے قبل 1932 میں محمد مجیب کے افسانوی مجموعہ ''کیمیا گر'' اور ''انگارے'' مرتبہ: احمد علی میں سگمنڈ فرائڈ اور ڈی ایچ لارنس کے ملے جلے اثرات کے تحت متنوع نفسی کیفیتوں سے مطابقت کے تحت تکنیک کا تنوع، اظہار بیان کے نئے اسالیب کے ساتھ متعارف کروایا گیا، جس کا ورتارا ترقی پسند تحریک کے ہنگام کے سبب تادیر دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملا۔

''انگارے'' گروپ کے افسانہ نگاروں میں سجاد ظہیر اور رشید جہاں کے ہاں منجھی ہوئی زبان میں عوامی روزمرہ، طنز کی کاٹ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس اسلوبِ بیان کی نمایاں خوبی اوقاف نگاری کا قرینہ بھی ہے جو ان سے قبل سوائے راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور چودھری محمد علی ردولوی کے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملا۔

''انگارے'' گروپ کے افسانہ نگاروں میں سجاد ظہیر اور رشید جہاں کے ہاں منجھی ہوئی زبان میں عوامی روزمرہ طنز کی کاٹ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس اسلوبِ بیان کی نمایاں خوبی اوقاف نگاری کا قرینہ بھی ہے جو ان سے قبل سوائے راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور چودھری محمد علی ردولوی کے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملا۔

''اُن کے لمبے کرتے اور عبائیں، اُن کے کفش اور سلیپر، اُن کی دوپلی ٹوپیاں، اُن کا گھٹا ہوا سر اور اُن کی متبرک داڑھیاں، جن کے

ایک ایک بال کو حوریں اپنی آنکھوں سے ملیں گی۔"

("جنت کی بشارت" از سجاد ظہیر سے اقتباس)

احمد علی کے ہاں یادوں کے دھارے سے مطابقت رکھنے والی سرریلسٹک تدبیر کاری اور آزاد تلازمۂ خیال سے جنم لینے والے ڈرامائی مونولاگ سے مخصوص ماتمی لے ایک منفرد اسلوب کا باعث بنی۔

"اے کاش! وہ ہوتے۔ وہ ٹانگیں، ایک سرسبز درخت، گوشت اور گودے کا۔ اُس کا رس خون سے زیادہ گرم اور اُس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم۔ ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی۔ ایک دوسرے میں، ایک تیسرے، کی اُمید۔ ایک پوری زندگی کا خزانہ، ایک لمحے کا سرمایہ۔"

("مہاوٹوں کی رات" از احمد علی سے اقتباس)

اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سے ایک چودھری محمد علی ردولوی نے داستانوی بیان کو قدرے مختلف انداز سے برت کر ایک نیا لہجہ تراشا تھا۔ زبان کے برتارے کی اس روایت میں قاضی عبدالستار کا نام اُبھر کر سامنے آیا اور اِس خصوص میں جملہ امکانات مکمل کر گیا۔ قاضی عبدالستار کا "پیتل کا گھنٹہ" اِس اسلوب کا بام عروج ہے۔

پریم چند کے اولین افسانوی مجموعے "سوز وطن" میں شامل داستانوی اسلوب کے حامل افسانوں کے بعد عزیز احمد نے حقیقت واقعہ کو افسانے کا جوہر اور توانائی کا مرکزہ خیال کرتے ہوئے "زریں تاج"، "شعلۂ زار الفت"، "میرا دشمن میرا بھائی"، "مدن سینا اور صدیاں" نیز "آب حیات" جیسے تاریخ سے متعلق افسانے لکھتے ہوئے داستانوی اسلوب برتا یا تصور شیخ قلم بند کرتے ہوئے ملفوظاتی پیرایۂ اظہار اختیار کیا۔ اِن افسانوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن داستانوی اور ملفوظاتی اسالیب اظہار کا چلن اُردو کے مختصر افسانے میں عام نہ ہو سکا۔ انتظار حسین کا "آخری آدمی" اور "زرد کتا" اِسی روایت میں لکھے گئے افسانے ہیں۔

ایک بھرپور اسلوبیاتی روایت چیخوف اور مارس میترلنک کے عالمگیر اثرات کے تحت اُردو افسانے میں جنم لیا اور خوب پھلی پھولی۔ یہ زبان کے تخلیقی امکانات اور بیان میں علامتی ابعاد پیدا کرنے کی روایت ہے۔ جس میں راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور سید فیاض محمود نے افسانے لکھے۔

یاد رہے کہ اُردو افسانے کے ابتدائی دور ہی میں دہلی کی ٹکسالی زبان میں آدرشک حقیقت نگاری اور رومانی لحن کی آمیزش سے راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی نے فصیح اور مستند زبان لکھنے کا تجربہ کیا تھا۔ موضوعی سطح پر مغلیہ زوال سے مناسبت کے حوالے سے یہ تسلیم و رضا کی زبان تھی۔ بعدازاں صادق الخیری، آمنہ نازلی اور الطاف فاطمہ نے اِسی زبان کو برتا۔ دہلی سے مخصوص ٹکسالی کی اِس اسلوبیاتی روایت کے علاوہ قدرے بے عیب زبان لکھنے کے حوالے سے چند دیگر افسانہ نگار بھی نمایاں دکھائی دیے جیسے عزیز ملک، آغا بابر اور اعجاز حسین بٹالوی کے افسانوں سے مخصوص ہوشیار پور اور بٹالہ کی لوک ایمائیت سے بھرپور زبان یا محمد حسن عسکری اور انتظار حسین کے افسانوں میں میرٹھ کے نواحی علاقہ جات سے مخصوص لفظیات کی شمولیت۔ یہ جامع مسجد، دہلی کی سیڑھیوں سے مخصوص ٹکسالی کی طرح بے عیب زبان ہرگز نہیں، البتہ اس کی ایک اپنی چاشنی ہے۔

اردو افسانے میں زبان و بیان کی سطح پر جو اسلوب بیانیہ میں سب سے زیادہ کامیابی سے برتا گیا وہ عوامی روزمرہ سے متعلق ہے۔

کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس نے اُس میں شعریت اور نغمگی کے اضافہ جات کے ساتھ اُسے اپنایا۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس اِسی اسلوب اظہار کے سبب جذبات کی Sublime صورتوں پر قادر تھے۔ لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ دکھائی دیتی ہے لیکن اُن میں سے جو نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اُن میں اے۔حمید، غیاث احمد گدی، احمد شریف، ضمیر الدین احمد اور بلراج کومل نمایاں ہیں۔

جب کہ زبان و بیان کے حوالے سے ایک ملٹی کلر اسلوبیاتی روایت کو ترویج ملی۔ سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی اور عصمت چغتائی کے افسانوں سے۔ اِس اسلوبیاتی روایت کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر ایک بنیاد علاقائی زبانیں اور عوامی بولیاں ہیں۔ ہر ایک صورت میں شہری لہجہ نتھرا ستھرا ہے اور اختصار اُس کی نمایاں خوبی۔ مثال کے طور پر پنجابی کی آمیزش کے ساتھ جس اسلوبیاتی روایت نے منٹو اور ممتاز مفتی کے افسانوں سے ترویج پائی، اُسے بعد ازاں اشفاق احمد، منشا یاد، ہرچرن چاولہ اور احمد داؤد نے برتا لیکن اہل زبان کے لیے پنجابیت ناگوار خاطر ہی رہتی ہے۔

اس نوع کے بیان میں ایسی تشبیہات جن میں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو، قابل توجہ نہیں ٹھہرتیں، لیکن اِن افسانہ نگاروں کے دُوررس تخیل نے موزوں ترین مماثلتیں اور مشابہتیں تلاش کر کے تشبیہہ کو مفہوم اور تعبیر کے لیے تجربے کی گہرائی فراہم کر دی نیز اُن کے افسانوں میں حقیقت واقعہ اِس قدر دلچسپ ہے کہ زبان و بیان کی خامیاں قاری کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔

زبان و بیان کی اس روایت میں راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ دو ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں تہذیبی رچاؤ اور منظر ناموں کی مناسبت سے پنجابی اور ہندی الفاظ کی شمولیت کا باقاعدہ تخلیقی جواز دکھائی دیا۔ اُن کے اسلوب بیان پر انتظار حسین سمیت، ناک بھوں چڑھانے والے شاید زبان کے تخلیقی درتارے کی اہمیت سے واقف ہی نہیں۔

اِس خصوص میں ابوالفضل صدیقی کے ہاں دورِ انگلشیہ کی اشرافیہ سے مخصوص زبان اور خان فضل الرحمٰن کے ہاں تلنگانہ کی لفظیات کا درتارا یکسر نئے اسالیب بیان کا باعث بنا۔

یوں ابوالفضل صدیقی اور خان فضل الرحمٰن اِن اسالیب بیان کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ جب کہ اسی روایت میں دیوندر ستیارتھی کے ہاں ہندوستان کے قریہ قریہ سے سمیٹے گئے گیتوں کی بُو باس اور واجدہ تبسم کے حیدرآبادی انگ کا الگ ذائقہ ہے۔

برصغیر کو Socity of diglossia بھی کہا جاتا ہے۔ اس ملٹی لنگول سوسائٹی کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے فرگوسن نے برصغیر کو زبانوں کا جنگل قرار دیا تھا۔ یہاں بڑی زبانوں کے علاوہ دراوڑی، آریائی اور قبائلی زبانوں کے کئی سلسلے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں سے مخصوص لفظیات کے اُردو میں در آنے کے علاوہ کلکتہ، ممبئی اور کراچی کی بندرگاہوں اور بڑے شہروں میں جنم لینے والا عامی اور غیر مہذب لب و لہجہ نزول زبان پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ خاص طور پر بھارت میں کچھ عرصہ قبل ہندی کو عمومی بول چال بنانے کے حوالے جو کچھ اُردو سے ہندی نے مستعار لیا تھا، اب ہندی وہی کچھ قدرے بگڑے ہوئے تلفظ اور غلط املا کے ساتھ اُردو کو لوٹا رہی ہے۔ یہ ایک نئی اُفتاد ہے جو نئے بھارتی افسانہ نگاروں کی زبان و بیان پر پڑی۔ خود ہمارے ہاں پاکستان میں پنجابی، بلوچی، سندھی، سرائیکی، پوٹھوہاری، شنا، ہندکو اور پشتو لفظیات کو تن آسان افسانہ نگار بلا کسی تخلیقی جواز کے بے دریغ برت رہے ہیں...... جب کہ اِس نوع کی زبان اور لب و لہجے کا درتارا کردار نگاری سے مطابقت کے حوالے سے مکالماتی سطح پر تو جائز ہے، جیسا کہ ممبئی کے ساجد رشید کے ہاں دکھائی دیتا ہے لیکن اگر افسانہ نگار کا بیانیہ بھی اُس عامی لفظیات اور لب و لہجے سے آلودہ ہونے لگے تو یہ ایک لمحۂ فکریہ ضرور ہے...... میں یہ بات ممبئی، کلکتہ، کراچی، بہار، علاقہ سرحد، بلوچستان اور سرائیکی بیلٹ سے متعلق بہت سے افسانہ نگاروں کا نام لیے بغیر کر رہا ہوں۔

دیکھیے، یہ جو کہا جاتا ہے کہ قدیم فکشن ماضی کے اُس انسان کی آئینہ دار تھی جس کی حیثیت محض ٹائپ کی ہے تو کچھ غلط نہیں کہا جاتا۔ انسان کا یہ قدیمی ٹائپ کردار، جنگل کے اُس اکیلے درخت کی مانند تھا جو اپنی انفرادیت جنگل میں ضم کر دیتا ہے۔ لیکن وہ بیتا ہوا کل تھا اور آج عہد حاضر کے تصادمات کچھ اِس نوعیت کے ہیں کہ جنھیں اُس طرح Share نہیں کیا جا سکتا۔ اب افسانہ نگار کو محض اپنے اوپر وارد شدہ یکسر جداگانہ روحانی اور جذباتی واردات ہی رقم نہیں کرنا بلکہ اپنے عہد کی بے رنگی کو بھی سمیٹنا ہے۔ اِس جوکھم کا سامنا، ساٹھ کے دہے میں سُریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج مین را اور خالدہ حسین نے بھی کیا اور ستر کے دہے میں میرے ساتھی افسانہ نگاروں نے بھی۔ یوں ساٹھ اور ستر کے دہوں کے چیدہ افسانہ نگاروں کا اسلوبیاتی تنوع آج نئے افسانہ نگار کی توجہ کا طالب ہے۔

سُریندر پرکاش کے افسانے بے یقینی اور رجائیت کی انتہائی زیریں لہروں سے تشکیل پاتے ہیں اور اُن میں ماورائیت کا احساس پختہ تہذیبی اور تاریخی شعور کا پیدا کردہ ہے۔ یہ اُن کے اسلوب بیان کی خوبی ہے کہ وہ تہذیبی اور تاریخی شعور امیجری اور آوازوں کے Distort ہو جانے پر بھی اُس خاص نوع کی ماورائی کیفیت کو برقرار رکھتا ہے۔ انور سجاد اور بلراج مین را نے ہر سودندناتے ہوئے شہر کی چہرہ نمائی اُس فرق کے ساتھ کی جو Sublimation اور Elevation کا فرق ہے۔ انور سجاد کے لہجے کی کرختگی اوس بورن کے "Look Back in Anger" سے ملتی جلتی ہے"۔ جب کہ بلراج مین را کے ہاں ایک خاص نوع کی کوملتا، جو اُس کی Ethereal کردار نگاری سے مطابقت رکھتی ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں پایا جانے والا احساسِ عدم تحفظ، اُن سے مخصوص نسوانی اسلوب بیان کے سبب خوف، نفرت، اذیت اور تشکیک کی چہرہ نمائی کرتا ہے اور یوں خالدہ حسین کے ہاں جانے پہچانے کردار تجریدی اور ماورائی فضا میں سانس لیتے ہوئے زندگی کے وسیع تر تناظر میں سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔

رشید امجد نے سادہ بیانیہ کی گردن مروڑ کر شعر اور نثر کی حد بندیاں توڑ دینے والا ایسا ردمک تشبیہاتی اور علامتی اسلوب وضع کیا جو ستر کے دہے میں حد درجہ مقبول ہوا۔ بعد ازاں یہی اسلوب منشا یاد، اعجاز راہی، احمد داؤد اور حمید سہروردی کے ابتدائی افسانوں میں اپنی پہچان کرواتا ہے۔ البتہ بہت جلد منشا یاد اور احمد داؤد کے ہاں تشبیہ کی جگہ علامت اور تجرید کی جگہ ٹھوس واقعیت نے لے لی۔

اسد محمد خاں کے ہاں نفسیاتی الجھاووں اور کرخت معروضی صورت حالات کا علامتی اظہار کہیں تو شدید طنز اور درشت لب و لہجے کا طالب ہوا اور کہیں اسلوبیاتی سطح پر مجرد کی تجسیم اور مجسم کو مجرد میں ڈھالنے کی صورتیں دکھائی دیں، البتہ معیاری زبان کا گراف گرنے نہیں پایا۔

پھر کمار پاشی، اسلم سلازار، علی حیدر ملک، شفق اور احمد جاوید ہیں جنہوں نے معاصر صورتِ حال کا مطالعہ تاریخ کے تناظر میں کرتے ہوئے تمثیل نگاری کی البتہ اُن کے ہاں زبان کا ورتارا مختلف ہے اور زبان کا معیار بھی یکساں نہیں۔

قمر احسن، سلام بن رزاق، ذکاء الرحمٰن، انور قمر، علی تنہا، انوار احمد اور انورسن رائے نے اُلجھی ہوئی نفسی کیفیتوں کے اظہار کے لیے کہیں تو حجاب اور سرگوشی سے کام لیا اور کہیں بیانیہ کو شعر کی رَو کے تحت اپنے اپنے طور پر برت کر اک دُوجے سے یکسر الگ اسالیب تراشے، نیر مسعود کا کا فکائی لحن اس کے علاوہ ہے۔ لیکن یہ سارا کام سادہ بیانیہ کو ترک کر کے ہی کیا گیا، جس سے ہوا یہ کہ گزشتہ چار دہائیوں کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے بے چہرہ انسان کی ذہنی پژمردگی اور احساساتی تناؤ کو افسانوی بیان میں جگہ ملی۔ لیکن ترسیل کی سطح پر تن آسان قاری کی اپنی مشکلات تھیں۔ جب ایک تسلسل میں کام کیا جا رہا تھا تو نامحسوس طور پر قاری کی تربیت بھی ہوتی چلی گئی۔ سب ٹھیک جا رہا تھا کہ سنہ 80 کے اواخر میں چند ٹھس اور بودے ناقدین نے افسانے سے روایتی کہانی پن کے اِخراج کا رونا کچھ اِس شدومد سے رویا کہ نئے افسانہ نگار کی راہ کھوٹی کر گیا۔

بعد میں سامنے آنے والے افسانہ نگاروں کی ایک مُشکل تو یہ تھی کہ وہ سنہ ستر کے قریبی اور متحرک معاصرین سے کیا الگ راہ نکالیں۔ کسی کا Campfollower بننا بھی انہیں منظور نہ تھا اور کوئی نئی راہ بھی نہیں سوجھتی تھی۔ لے دے کر ایک ہی راستہ انہیں بھائی دیا کہ سادہ بیانیہ کی طرف لوٹ چلیں، جسے سنہ ساٹھ اور ستر کے دہے میں تیج کر ہی نزول کام کیا گیا تھا۔ لیکن اِس تمام عرصے میں کوئی معرکہ سر نہیں کیا کسی نے۔ اگر یہ انحطاط ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔ انحطاط پر تعجب، حیرت اور غصہ بھی انحطاط ہی کی ایک قسم ہے۔ صحت مند ردِ یہ تو انحطاط سے خوشگوار تعلقات اُستوار کرتا ہے۔

نئے افسانہ نگار کو طرزِ احساس کی تبدیلیاں محسوس کرنا ہوں گی نیز موجود اسلوبیاتی روایت سے کامل آگہی اس لیے ضروری ہے کہ ردّ اور اختیار بڑا نازک کام ہے۔ اسی سے اسالیب بیان کی زندہ روایت میں پھیلاؤ کی گنجائش نکلتی ہے۔

ہمیں ذہنی طور پر پسماندہ قاری اور بودے نقاد کی آہ اور واہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ پیش منظر بہت دھندلا ہے۔ اور اس دھند میں عہدِ موجود کا حریص، منافق اور آبرو باختہ انسانی کردار سوالیہ نشان بنے کھڑا ہے۔ اُس از حد ٹیڑھے کردار کے نفسی بحران اور چال چلن کو روایتی بیانیہ میں سمیٹنا کسی طور ممکن نہیں۔ لہٰذا افسانے کی فارم اور زبان کے درتارے کی سطح پر تبدیلیوں کا جتن کرنا ہوگا۔ نئے لسانی پیرائیہ اظہار وضع کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج حسیات کی حدود لامحدود ہیں۔ اب اوّل درجہ کی بصری اور سامعی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ اس میں مشکل صورتِ حال وہاں درپیش ہوگی جب بصارت اور سماعت کا تجربہ لامسہ اور ذائقہ کی حدود میں داخل ہو رہا ہو اور ہمیں اُس کا اظہار کرنا پڑ جائے تو کیا کریں گے؟ ایسے میں محض اشارہ یا تشبیہہ سے مرصع بیانیہ کی یک رخی طرح داری سے کام نہیں چلنے کا۔ بے شک استعارہ اور علامت کی معرفت ہمہ جہت معنوی تلازموں کی جستجو کریں۔ پر کچھ تو کرنا ہوگا۔ مستقبل کے افسانہ نگار کے ہاں نئے اسالیب بیان کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

اس ضمن میں نئے افسانہ نگار کا کوئی واہمہ ہو تو ہو...... میں نہیں سمجھتا کہ اس راہ میں کوئی بھاری پتھر دکھائی دیتا ہے۔



حوالہ:

۱۔ رفیع راؤ: ریاست میسور کے کہانی کار اور ناول نگار۔ نمائندہ ناول: "Kantha Pura" (مطبوعہ: 1938ء)
نمائندہ افسانہ: "جاونی" جو سب سے پہلے مجلّہ "ایشیا" میں شائع ہوا۔ انگریزی سے اس کا اُردو ترجمہ بہ عنوان "جاونی" مجلّہ "سویرا" لاہور میں شائع کیا گیا۔ راجا راؤ کے اسلوب پر فرانسیسی فکشن کے اثرات نمایاں ہیں۔ راجا راؤ نے حال ہی میں انتقال کیا۔ اُس کا بیشتر وقت فرانس میں گزرا۔

۲۔ انور سجاد کے ہاں سکتہ، ختمہ اور خط کے ساتھ فجائیہ یا ندائیہ اوقاف کا استعمال ملتا ہے۔ البتہ اوقاف نگاری کے دیگر اطوار مثلاً رابطہ، تفصیلیہ، زنجیرہ اور قوسین کا استعمال نہیں ملتا نہ ہی مکالمہ کے لیے واوین کا برتاؤ ہوا بلکہ ایک طویل خط کے بعد مکالمہ کی ابتداء ہوتی ہے۔

داستان سے افسانے تک کا عبوری دور: انتخاب

لال قلعہ کی ایک جھلک

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی[1]

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جو آگ میں نہ لگا دوں تو داغ نام نہیں

جمادی الآخر 1003ء میں سترھواں سال شاہجہاں کے جلوس کا دھوم دھام سے ختم ہوا تو جہاں آرا بیگم صاحب جنہیں بادشاہ بیگم بھی کہتے تھے ان کی سالگرہ کا جشن شروع ہوا۔ لال قلعہ میں محل سرائے سے لے کر دیوان عام، دیوان خاص تک رات کے وقت جھاڑ فانوس، کنول وقندغوں کی روشنی تھی۔ شمع چربی موی بتیاں جل رہی تھیں۔ موقع موقع سے فتیل سوز چاندی سونے کے کھوپرہ اور زیتون کے تیل کی روئی کی موٹی موٹی فیتلوں کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک اور لال قلعہ کے دلی دروازے سے شہر پناہ کے دلی دروازے تک اور تمام خاص بازار میں جامع مسجد کی سیڑھیوں تک دوطرفہ ٹھاٹھر بندی تھی اور ان پر کڑوے تیل کے چراغ جل رہے تھے اور رات کا دن ہو گیا تھا۔ جہاں آرا بیگم کو صدر دالان میں محل کی مشاطہ دلہن بنا رہی تھیں، لباس ہزاروں کا تو زیور لاکھوں کا...... صدر دالان کے سامنے صحن چبوترے کے نیچے دور تک انگنائی میں دری چاندنی کا فرش تھا اور فرش پر رستہ بیچ کا چھوڑ کر دورویہ قطار مردنگیوں کی۔ مردنگیاں بلور کی بھی تھیں اور سفید کانچ کی بھی۔ سب میں شمع روشن تھی۔ جب سگھڑ عورتوں نے اچھی طرح بیگم کو بنا سنوار لیا تو خاندان کی بڑی بوڑھیاں انہیں پکڑ کر بسم اللہ کرتی ہوئی انگنائی میں پہنچانے چلیں۔ جہاں تک یعنی فولادی ترازو کھڑی تھی، تک کے دونوں پلڑوں میں مخملی گھیے بچھے ہوئے تھے، پاس ہی سونے چاندی کی اینٹوں کا ڈھیر لگ رہا تھا تاکہ بیگم کو ایک بار سونے کے برابر اور ایک بار چاندی کے ہموزن تول کر منوں سونا اور منوں چاندی خیرات کر دی جائے، ادنیٰ اعلیٰ عورتوں سے صحن کھچا کھچ بھر رہا تھا۔ اور سب کی نگاہ بیگم کی طرف تھی، بیگم کے پاؤں میں گبتیلی جوتی تھی جس کا تلا بہت چکنا تھا۔ صحن چبوترے کی سیڑھی سے اترنے میں پاؤں پھسلا مگر پکڑنے والیوں نے بیگم کو سنبھال لیا اس پر بھی بیگم اپنے سیدھے ہاتھ کو جھکیں اور جھکنے کے ساتھ دوپٹہ کا آنچل کوئی بال بھر اس شمع پر گرا جو سیڑھی کے پاس مردنگی میں کھڑی

جل رہی تھی ۔ دوپٹہ بہت ہلکی بک کا تھا آنچل نے آگ لے لی اور دوپٹہ پھر پھر ہوتا ہوا شعلہ کو سر اور چوٹی تک لے پہنچا اور بیگم نے عورتوں سے کہا خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ وہ ٹیک بندی جل گئی۔ سنبھالنے والیوں نے بیگم کو چھوڑا تو آگ قیص کے گریبان کو پہنچ کر سینہ تک پہنچی اور سینے کو جلا کر شلوار میں پہنچ گئی۔ بیگم تڑپ کر فرش پر گریں اور حویلی میں شور قیامت برپا ہوا۔ ہزاروں عورتیں بیگم کے کپڑوں کی آگ بجھاتی تھیں مگر آگ نہ بجھتی تھی۔ بیگم کی چار وفادار لونڈیوں نے نمک کا حق ادا کیا بیگم کو لپٹ کر آگ بجھادی۔ مگر بیگم کے کپڑوں کی آگ ان کے کپڑوں میں لگی۔ دونوں آگ کی جلن کی تاب نہ لائیں اور قربانت شوم قربانت شوم کہتی ہوئی اپنی بیگم پر سے نثار ہوگئیں۔ حضرت بادشاہ اور خواجہ سرا عورتوں کے غل کو سن کر محل میں آئے اور بیگم کو اور دو پرستاروں کو زمین پر تڑپتے اور دو لونڈیوں کو مردہ پایا۔ بہ ہزار وقت بیگم کو پلنگڑی پر ڈالا کمرہ میں پہنچایا۔ بیگم برابر ہائے جلی ہائے جلی کہے جاتی تھیں۔ طبیب باشی اور حکیموں، ویدوں، جراحوں، معالجوں سے محل بھر گیا یوں تو بقول درد:

کیا دل کے داغوں نے سرو چراغاں
کبھی تم نے آ کر تماشہ نہ دیکھا

بیگم سر سے پاؤں تک جلی تھیں، مگر آگ نے سینہ اور پیٹ کو بھرتہ کر دیا تھا۔ یہ کیا لکھا جائے کہ بیگم کے آبلوں اور پھولوں پر چارہ گروں نے کیا کیا دوائیں لگائیں۔ تقویت روح قلب کے واسطے کیا کیا عرق پلائے۔ نقد اور جنس خیرات اور تصدق میں دینے لگے۔ بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو دریا کی طرح رواں مگر منہ سے اف نہ کرتے تھے کہ زخمی بیٹی زیادہ گھبرائے گی۔ بیگم کی سگی بہنیں زار و قطار روتی تھیں اور کہتی تھیں۔ آپ کو نظر لگ گئی اس بار آپ سالگرہ کی دلہن بھی ایسی بنی تھیں کہ جنت کی حوریں اور پرستان کی پریاں قربان تھیں، یہ منحوس خبر آناً فاناً سارے شہر میں اڑگئی ساری رعایا ہاتھ ملنے لگی۔ جشن کی رات شب شہادت بن گئی۔ شاہجہاں نے منت مانی کہ جب بیگم غسل صحت کر لیں گی اور سفر کے قابل ان میں طاقت آجائے گی تو خواجہ غریب نواز کے آستانہ پر اجمیر شریف حاضر کروں گا۔

عیش و نشاط کی رات مصیبت کا پہاڑ بن کر ٹوٹی اور صبح اپنا مرہم کافور لے کر بیگم کی مزاج پرسی کے لیے مشرق کے دارالشفا سے سے لال قلعہ میں حاضر ہوئی، بادشاہ سلامت ابھی صبح کی نماز پڑھ کر مصلے سے نہ اٹھے تھے کہ خفیہ کے محکمہ سے ایک گمنام عرضی پہنچی کہ بیگم نے اپنی جاگیر کی بے گناہ رعایا پر بڑا ظلم توڑا ہے۔ ان کی گرم آہیں شمع کے قالب میں ڈھل گئیں اور بیگم ان سے جل گئیں۔ جب تک مظلوم رعایا کے دل ٹھنڈے نہ ہوں، زخموں کی آگ نہ مٹے گی۔ بیگم کو یاد دلایئے کہ آپ نے ایک خطاوار بندے کے بچاے میں سانپ چھڑوا دیا تھا، جس نے اس خطاوار کو جابجا کاٹا اور وہ مر گیا۔

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت
تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا برمن کرد
برگردن او بماند از ما بگذشت

ہر چند کہ وہ خطاوار تھا مگر اس قہر کا سزاوار نہ تھا کہ سانپ سے اسے ڈسوایا جائے، ابھی تو دنیا کی آگ نے جلایا ہے، آگے قبر کے سانپ اور دوزخ کی آگ باقی ہے۔

اس عبرتناک مضمون کو پڑھ کر بادشاہ نے ایک چیخ ماری اور وزیر کو بلا کر حکم دیا کہ ہماری قلمرو میں جتنے بھاری مجرم ہیں بندی خانوں سے آزاد کر دیئے جائیں اور سات لاکھ روپیہ بیت المال شاہی سے لے کر ان پر تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی تلافی مافات کریں اور اس سات لاکھ کے علاوہ جو بیگم کے معالجہ اور ان کے اوپر سے صدقے کے صلہ میں روپیہ صرف ہوا اس کی تفصیل میں آگے لکھوں گا۔ اب تو میں یہ لکھتا ہوں کہ کسی طبیب یا حکیم کے علاج سے بیگم کو تندرستی نصیب نہ ہوئی تو بادشاہ نے فرمایا کہ شہر سورت سے فرنگی حکیم بلایا جائے۔ بندر سورۃ سے شاہجہاں آباد تک ڈاک لگائی جائے اور وہ پنسیوں میں سوار ہو کر جلد آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرنگی آیا اور اس نے علاج کیا لاکھ روپے سے اوپر اوپر لے کر چلتا ہوا اور بیگم بدستور بستر مرض پر پڑی رہیں اور اسی طرح چھ سات مہینے کٹ گئے۔ طبیب باشی برابر یہی کہے جاتے تھے کہ مریضہ کی جانبری مشکل سے ہوگی۔ کیونکہ خون پیپ بن کر بدن سے نکلا جاتا ہے۔ بادشاہ دو دو پہر برابر جانماز پر بیٹھ کر اپنی لڑکی کی شفا کے لیے دعا کرتے تھے۔ ایک روز عارف نام بیگم کے چیلے نے بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ فدوی کو جلے ہوئے کے لیے ایک مرہم آتا ہے اسے لگا کر مریض اچھا ہو جاتا ہے فدوی کے ہزار بار سے کم تجربے میں نہیں آیا ہے۔ کبھی خطا نہیں کی، بادشاہ علاج کرتے کرتے تنگ ہو گئے تھے مرتا کیا نہ کرتا۔ حکم دیا کہ فوراً بناؤ۔ مرہم تیار ہوا اور بیگم کے زخموں پر لگایا گیا اور زخم اچھے ہونے شروع ہوئے اور زندگی کی توقع پیدا ہونے لگی۔

بیگم کچھ چلنے پھرنے لگیں جشن سالگرہ کی دوبارہ تیاری کی گئی اور عارف چیلہ کو چاندی میں تولا۔ خلعت اور انعام الگ دیا۔ مکہ مدینہ جو زرنقد اس خوشی میں بھیجا گیا اس کے علاوہ بیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ حکیم داؤد کو ایک مہر اور ایک روپیہ، پانچ سو تولہ سونے اور چاندی مع خلعت اور منصب دو ہزاری دو سو سوار اسپ و فیل ملے۔ حکیم سومنا دوسرے چارہ گر کو تیس ہزار روپیہ سالانہ اور منصب دو صد سوار و اسپ و فیل عطا ہوئے۔ اور تمام فقراء، حکما امراء اور ارباب طرب فیض یاب ہوئے۔ چار لاکھ شریف مکہ اور ایک لاکھ روپیہ حرمین کے مستحقوں کے لیے احمد سعید معتمد کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ بادشاہ اور بیگمات نے بار شاہزادی صاحبہ کے سر پر سے خود کھڑے ہو کر جواہرات اور سونے چاندی کے پھول نچھاور کئے۔ دوسرے دن بیگم بادشاہ کی خدمت میں تسلیم کے لیے حاضر ہوئیں تو حضور والا نے ان کی کلائی میں ایک سو تیس موتیوں کی سمرن اپنے ہاتھ سے باندھ کر دعا دی۔

پھر بہار آئی چمن میں زخم گل آلے ہوئے
پھر مرے داغ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے

جہاں پناہ نے چاہا کہ بیگم کو منت پوری کرنے کے واسطے اجمیر شریف لے جائیں اس لئے شاہجہاں آباد سے روانہ ہو کر اکبر آباد تک یہ حاجتی پہنچ گئے تھے جو بیگم کے بھرے بھرے گھاؤ کا انگور پھٹ گیا اور حکماء نے کہا ابھی سفر اجمیر کا ملتوی کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ راستہ کی تکان سے حرارت پیدا ہو کر ہلاکت کا باعث ہو۔ اس لحاظ سے جمنا میں کشتیوں سے شاہجہاں کی واپسی ہوئی، آگرہ سے متھرا چار دن میں بجرے پہنچے، متھرا کے فوجدار نے حاضر ہو کر شہنشاہ کی خدمت میں گزارش کی، اس شہر میں مامون نام ایک بے نوا فقیر رہتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ

چار دمڑی میں ایک مرہم بنا کر دوں گا، بیگم کے زخموں پر لگایا جائے اگر ایک اٹھوارے میں زخموں کا نام رہ جائے تو جو چور کا حال وہ میرا حال۔ بادشاہ نے فرمایا اچھا۔

ماموں مع مرہم کے دہلی حاضر ہوا اور دہلی پہنچ کر اس کا علاج کیا گیا اور تین دن میں زخم اور ناسور اچھے ہو کر خاک سے اڑ گئے اور تیسرا جشن غسل صحت کا پھر لاکھوں کے خرچ سے ہونے لگا، ماموں کو سونے چاندی میں تلوادیا اور زر بکھر دے کر اسے نہال کر دیا۔ بیگم ہنسی خوشی اجمیر گئیں اور منت پوری ہوئی۔



حوالہ:

ا۔ خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی (1865ء۔1933ء) میر درد کے نواسے تھے۔16 اگست 1865ء کو میر محسن علی کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم کے بعد طب کی طرف توجہ کی۔ رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر کے طبیب خاص تھے، بعد ازاں علی گڑھ کالج کے سفیر کی حیثیت سے بمبئی، بڑودہ اور احمد آباد کا دورہ کرتے رہے۔ یہ کام نبھا تو پھر اور کچھ نہ کیا اور دہلی آ کر کوچہ چیلان، میر درد کی بارہ دری میں بیٹھ رہے۔ مولوی سید احمد مولف ''فرہنگ آصفیہ'' نے آپ کو ''سلطان زبان اردو'' کا خطاب دیا تھا۔ معلومہ مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

ا۔ ''بیگموں کی چھیڑ چھاڑ'' مطبوعہ: شاہجہاں بک ایجنسی، دہلی

۲۔ ''مضامین فراق'' مطبوعہ: کتب خانہ علم وادب، دہلی

۳۔ ''دکن کی پری'' (ناول) مطبوعہ: کتب خانہ علم وادب، دہلی

۴۔ ''دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ'' مطبوعہ: شاہجہاں بک ایجنسی، دہلی

۵۔ ''چار چاند'' مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی

۶۔ ''سات طلاقنوں کی کہانیاں'' مطبوعہ: شاہجہاں بک ایجنسی، دہلی

۷۔ ''دلی کا آخری دیدار'' مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی

۸۔ ''درد جانستان'' (ناول) مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور

۹۔ ''میخانہ درد'' (میر درد کے حالات واقعات)

۱۰۔ ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' ناشر: خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی، مطبوعہ: دہلی

۱۱۔ ''خوبصورت بختنا'' ناشر: خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی، مطبوعہ: دہلی

۱۲۔ محمد حسین آزاد کا ڈراما ''اکبر'' مکمل کیا (جس کے متعلق ''شباب اردو'' اور ''ہزارداستان'' میں مفصل مضامین شائع ہوئے)

نوٹ: اُن کا پہلا مختصر قصہ ''شہید وفا'' ''مخزن'' لاہور جنوری 1901ء میں شائع ہوا۔

سید علی امام پر مضمون، مطبوعہ ''زمانہ'' کانپور: جنوری 1913ء کے علاوہ چیدہ مطبوعہ قصے درج ذیل ہیں۔

''المورکھا'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور: جون 1913ء

''آپ بیتی'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور، جولائی 1913

''پیاز کا پتہ''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: مارچ1914ء

''گھن کا کیڑا''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: اپریل1914ء

''شادی مرگ''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: اپریل1914ء

''کسی کی یاد''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: دسمبر1915ء

''بھول بھلیاں''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: اگست1916ء

''جمنا کی لاڈلی''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: اکتوبر1916ء

''اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: اکتوبر: 1916ء

''نیرنگ فراق''(قسط وار) مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: جنوری1916ء تا فروری1919ء

''دلی کی ایک بادشاہزادی''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: ستمبر1919ء

''رادھا رانی''مطبوعہ: ''مخزن''لاہور: اگست1915ء

''دوست دشمن کو ترے ناز نے اکثر مارا''مطبوعہ: ''اردوئے معلیٰ''دہلی: اگست1926ء

نوٹ: نومبر1914ء اور جنوری1917ء کے ''مخزن''لاہور میں خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کے گھر کا پتا یوں درج ہے: مکان میاں ظریف، مدرسہ ارادت مند خاں، محلہ رودگراں، دہلی شہر۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر درد کی بارہ دری سے اس کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ 12 فروری1933ء کو بعارضہ فالج انتقال کیا۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی

ایک بیوی کا ے محل سے مہمان آئی تھیں۔ ان کا نام تھا ''حضرت بیگم'' وہ بڑی اکھل کھری اور مزاج کی بڑی کڑوی تھیں۔ حسن جہاں کی باتیں سن سن کر بہت کڑھتی تھیں اور بیٹھی کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔ بی دولتی اپنے جیے میں آپ ہی آپ کھولتی۔ کھانا پینا، چھالیہ، زردہ، الائچی، چٹنی، اچار، مربہ، مٹھائی، ناشتہ سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔ سچ مچ خالہ جان نے انہیں کل کلاں کا مالک کر دیا تھا۔ اس مارے بعض بے وقوفیں ان سے اور کھسیاتی تھیں ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں۔ ''اے بوا رضیہ سلطان سنتی بھی ہو۔ قلعہ کی بیگمیں بلی کو نکٹی کہا کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی ناک بھی کیا بری معلوم ہوتی ہے۔ کم بخت پہیہ پھرا ہوا اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے۔ جیسے پھیکا شلجم۔''

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی ان کا ٹپکا پڑتا تھا سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈھالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''پھیکا شلجم تمباکو کے پنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے سل کا بٹہ کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔ اونچی ناک سو جھے کیا خاک۔ چھوٹی ناک سہاگ کا پڑا، اونچی ناک کو لاؤ چھرا۔ یہ مثل تو تم نے سنی ہوگی۔'' حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی ان کی بے ڈول اونچی تھی حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں بیگمیں ہنس پڑیں اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہوگئی اور بی حسن جہاں کی اور ان کی خوب دنگو دنگ ہوئی۔

حضرت بیگم: ''موئی لکھنؤ کی ٹھیکری، کنجر، کنجی، پوربی، ارہر کی دال، خشکہ کھانے والی، ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہے۔ لو اور سنو۔''

حسن جہاں: ''میں پوربی ہوں تو تم پنجابن ہو۔ لکھنؤ والے ارہر کی دال کے ساتھ خشکہ کھاتے ہیں۔ تو پنجابیوں کو اوجھری نصیب ہوتی ہیں۔ آئی تھی کہیں کی دلی۔ بلی، اجڑی، پجڑی۔''

حضرت بیگم: ''بس بی! میں نے کہہ دیا ہے دلی کا نام ذرا منہ سنبھال کر لینا۔ دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ اجڑیں اس کے دشمن، وہ کیوں اجڑنے لگی تھی۔ وہ تو اب بھی لعلوں کی لعل ہے۔ ہاتھی لینڈے گا بھی تو سوا لاکھ کا کہلائے گا۔ تمہارے بے ڈھنگے لکھنؤ سے اجڑی بچڑی بھی ہزار درجہ اچھی ہے۔ تمہیں خبر نہیں بادشاہ سلامت سات سمندر لانگھ کر دلی تشریف لائے اور بادشاہ بیگم کو بھی ساتھ لائے۔ تخت پر بیٹھے دربار کیا۔ انعام دیئے اور سدھارتے وقت دلی کو سارے ہندوستان کا سرتاج بنا گئے۔ پھر کے سے بسنے کا حکم دے گئے۔ جلنے والے جلے۔ درانداز یاں کر کے ملے، دل کے پھپھولے بھی پھوڑے مگر ایک بھی نہ چلی۔ دیکھنا کوئی دن میں کیسی کینچلی جھاڑی ہے اور کیا بہار آتی ہے۔ دلہن بنے گی دشمن بیری انگاروں پر لوٹیں گے۔''

حسن جہاں: ''میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا تھا۔ نہیں تو میں خود دلی پر جان دیتی ہوں۔ کیونکہ میری ننھیال ہے، دوسرے حضرت شاہ مرداں کی درگاہ اسی میں ہے۔ آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک دلی جم جم بسے اور جلنے والے ملیامیٹ ہوں۔''

اس بختم بحثا کو سن کر خالہ جان دوڑی ہوئی آئیں اور حضرت بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں۔ ''خدا کے واسطے آپ بزرگ ہیں۔ اس چھوکری کے منہ نہ لگیئے۔'' حضرت بیگم کہنے لگیں۔ ''بہن اسے چھوکری کون کہے؟ یہ تو اچھی خاصی سانڈ ہے۔ اللہ اکبر قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔'' حسن جہاں نے کہا۔ ''خیر سانڈ کمبخت کالی بھینس سے تو اچھا ہوتا ہے۔'' خالہ جان نے دیکھا کہ حضرت بیگم لڑائی پر تلی ہوئی ہیں تو حسن جہاں کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف لے گئیں۔ اور انہیں سمجھانے لگیں۔ کہ ''للہ ذرا اپنی للو کو روکو۔'' تو ہنس کر کہتی ہیں۔ ''خالہ اماں! آپ کے سر کی قسم جو میں نے انہیں کچھ بھی کہا ہے وہ مجھے کنجی، کنجری اور خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ جھاڑ کا کانٹا بن کر مجھے چمٹ گئیں۔ میرے گلے کا ہار ہو گئیں بے بات۔ مگر میں ان کے کہنے کا برا تھوڑا ہی مانتی ہوں۔'' ادھر تو یہ نوکا چوکی ہو رہی تھی۔ ادھر صدر دالان میں ڈومنیوں کا ناچ ہو رہا تھا۔ بیل پر بیل پڑ رہی تھی۔ ان ڈومنیوں سے تو کمبخت ''ہیجڑے دروازے پر آ کر اچھا گاتے بجاتے ہیں۔''

رات کے بارہ بجے برات آئی۔ سمدھنیں بڑے جلوے کے ساتھ اتریں۔ کمخواب، زری، بوٹی، پوتھ کی تہہ پوشیاں، نیچے نیچے کرتے، ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کرتہ پہنے آ جایا کرتی تھی تو اس پر تیلن گھوسن پھبتیاں اڑا کرتی تھیں۔ یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی ہے سچ ہے۔ ''کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات۔'' سمدھنیں بڑے ٹھسے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیے سے لگ بیٹھیں۔ شربت پلانے کے لئے بھی بجلی بسنت، بی حسن جہاں اور لنکا مبارک نساء کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی، اور اس میں شربت کا شیشہ بلور کی پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال منہ پونچھنے کے لئے، اللہ کی بندی رومال کا گھسا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی پھڑک جاتی تھی۔ منہ اور باچھیں چھل کر لال ہو جاتی تھیں۔ بعض جلاتن کہہ دیتی تھیں: ''اے پھنکار یہ منہ پونچھتی ہو تو کبھی کا بیر نکالتی ہو؟''

آغائی بیگم دولہا کی بہن کا جو منہ پونچھا تو رگڑے کے ساتھ ان کی ناک کی کیل الجھ کر ناک میں سے نکل گئی۔ ''شاباش بوا شاباش۔ دیکھنے کی تو تم کامنی سی ہو۔ مگر ہاتھ تو ماشاءاللہ لوہے کی میخیں ہیں۔ دیکھو میری ناک کی کیل تمہارے رومال میں الجھ کر چلی گئی ہے۔''

حسن جہاں: ''بوا او کھلی میں سر دیا تو دھمکیوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپے ڈھیر سارے تمہارے تھڑے میں جائیں گے۔ سمدھن بننا ٹھٹھہ ہے۔ ابھی تو منہ ہی پچھوانے میں بولا گئیں۔ جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہوگا کہ کے بیسی کا ساٹھ ہوتا ہے اور بوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن گھر سے پہن کر بھی آئی تھیں یا مفت خدا میں مجھے لئے مرتی ہو۔''

"رومال جھاڑ تو اس میں سے کیل نہ نکلی۔"

آغائی بیگم: "بھئی اللہ جانتا ہے، ہماری کیل ڈھونڈو اس میں ترملی جڑی ہوئی ہے۔"

حسن جہاں: "بہن آغائی بیگم تم کیل کے مارے کیوں ہلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمہاری نہ ملے گی تو میں اپنی ہیرے کی کیل تمہیں دے دوں گی۔ ذرا چھری تلے دم تو لو۔"

اتفاق کی بات کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی۔

کہنے لگی: "واہ بوا، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ کیل تو آپ چرائے بیٹھی ہیں اور لوگوں کے اوپر دوڑے پکڑتی ہیں۔"



گھنٹہ بیگ

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی[1]

سلطنت اودھ کی مغل فوج میں ایک مغل، مرزا عنایت علی بیگ بھی تھے، جو رسالے میں ملازم تھے۔ نہایت قد آور جوان کیم شحیم گورے چٹے۔ اس زمانے میں سواروں کی تنخواہ قلیل ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تین روپے مہینے کا سائیس گھوڑے کا دانہ گھاس وغیرہ سب کا ان کو انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے سواروں سے پیدل اچھے رہتے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ مرزا اس قدر وزنی تھے کہ کوئی گھوڑا سواری میں دو مہینے سے زائد زندہ نہ رہتا تھا۔ اول تو خود بھی گراں ڈیل تھے۔ دوسرے فوجی اسلحہ، جن کا زیب بدن کرنا لازمی تھا۔ خود، چھلتا، چار آئینہ، زرہ بکتر، تلوار، ڈھال، نیزہ، قرابین، بندوق وغیرہ دو من کا بوجھ یہ بھی ہو جاتا تھا۔

مرزا صاحب خوش خوراک تھے۔ عملے کی طرف جب کبھی تعینات کئے جاتے تھے تو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن بیچارے پیدل جاتے تھے۔ ایک دفعہ دس کوس کا سفر کر کے کسی سرا میں داخل ہوئے۔ تو بھٹیاری سے کہا کہ ڈھائی سیر کی روٹی، آدھ سیر گوشت، چھٹانک بھر گھی لے کر کھانا پکاؤ۔ اس نے پوچھا آپ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟ کہنے لگے۔ آٹھ آدمی اور آتے ہیں۔ جب وہ کھانا پکا کر لائی۔ مرزا صاحب نے اکیلے بیٹھ کر ناشتہ کر لیا۔ بھٹیاری دیکھ کر حیران ہوگئی۔ آپ نے اسے بلا کر چپکے سے کہا کہ "بھٹیاری کسی سے کہنا نہیں میں آدمی نہیں ہوں۔ جن ہوں جو کچھ تم کہوگی میں تمہارا کام پورا کروں گا۔ کچھ کھانا اور بھی ہو تو لے آؤ۔" اس نے ڈرتے ڈرتے جو کچھ کھانا مسافروں سے ملا تھا اور کچھ گھر میں بچا تھا۔ سب ان کے آگے رکھ دیا۔ مرزا صاحب سب نوش جان کر گئے۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ کسی گڑھی کے راجہ نے دو برس سرکاری مالگذاری ادا نہ کی اور مضبوط قلعہ بنوا کر فصیل میں چاروں طرف روزن رکھوائے اور بندوقیں وغیرہ کثرت سے خرید کر فوج بھی فراہم کر لی۔ جب بادشاہی فوج اس جگہ کے راجہ کو گرفتار کرنے گئی تو اس نے قلعہ کا پھاٹک بند کر لیا۔ اور روزن سے گولیاں برسانا شروع کیں۔ دو مہینے تک ساری فوج قلعہ گھیرے رہی۔ مگر کسی طرح قلعہ فتح نہ ہوا۔ مجبور ہو کر فوج واپس چلی آئی لیکن اس کے پچاس سوار اس جنگ میں کام آئے۔

اراکین سلطنت اس تشویش کی حالت میں مختلف تجویزوں پر غور کر رہے تھے۔ بادشاہ کو بھی بہت غصہ تھا۔ فوج کے تمندار، رسالدار، سپہ

سالار سب دم بخود موجود تھے۔ مرزا عنایت علی بیگ بھی موجود تھے۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ ''اگر حضور فدوی کو تھوڑی فوج عنایت کریں تو حضور کے اقبال سے دس دن میں قلعہ فتح کر کے راؤ کو قید کر کے لے آؤں۔'' اس بات پر اراکین ہنسنے لگے اور بادشاہ نے غصّے کی حالت میں فرمایا: ''اگر تم بھی ناکام آئے تو سر اُڑا دیا جائے گا۔'' مرزا نے کہا: ''حضور میں نے اپنا خون معاف کیا۔ اسی وقت توپ دم کرا دیجیے گا۔''

اہل دربار مرزا کی حماقت پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اس دراز قد بے وقوف کی موت آئی ہے۔ تاہم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کی سرکردگی میں فوج روانہ کی جائے۔ مرزا نے اپنے ساتھ دو ہشیار بڑھئی لئے اور فوج کے سپہ سالار بن کر روانہ ہوئے۔ قریب شام کے قلعہ سے دو تین میل کے فاصلے پر فوج کو ایک جنگل میں پوشیدہ اتار دیا۔ اور آپ نے رات کو دونوں بڑھیوں سے کہا کہ ''اس کے دونوں پٹ آرے سے کاٹ ڈالو۔'' ابھی پو بھی نہ پھٹنے پائی تھی کہ پھاٹک کے دونوں پٹ کٹ گئے۔ سب سے پہلے پٹ ہٹا کر آپ تنہا قلعے میں داخل ہوئے۔ اہل قلعہ اس آفت سے بے خبر پاؤں پھیلائے سو رہے تھے۔ مرزا نے جاتے ہی راجہ کو دبوچ لیا اور اس کے سپاہیوں سے کہا۔ ''اگر میرے پاس کوئی آیا یا مجھ پر کسی نے وار کرنے کا قصد کیا تو راجہ کی جان کی خیر نہیں۔ اہل قلعہ اس دیو صورت انسان کو دیکھ کر ڈر گئے۔ اتنے میں مرزا کی فوج بھی قلعے میں داخل ہوگئی۔ قلعے والے کچھ بھاگ گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے۔ فوج نے قلعہ لوٹ لیا اور راجہ کو گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور میں لائے۔ راجہ نے بادشاہ سے معافی مانگی اور ازسرِ نو معاہدہ کیا۔

بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں مرزا کو ایک ہاتھی مرحمت فرمایا۔ اور ہاتھی کی خوراک اور فیلبان کی تنخواہ اپنے خزانہ عامرہ کے ذمے لی۔ مرزا بے چارے غریب آدمی تھے۔ ان کے گھر میں ہاتھی باندھنے کی جگہ نہ تھی۔ مشکل سے گزارہ کرتے تھے۔ طوعاً و کرہاً ہاتھی تو لے آئے مگر دوسرے دن اسے تین ہزار روپے کا بیچ کر اور فیلبان کو بھی ہاتھی کے ساتھ روانہ کر کے آپ اپنی ذات پر روپیہ اڑانے لگے۔ البتہ صرف ہاتھی کا گھنٹہ جو اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا اتار رکھا۔

مہینے دو مہینے کے بعد بادشاہ کو پرچہ گزرا کہ مرزا نے ہاتھی بیچ ڈالا۔ چنانچہ بادشاہ نے استفسار حال کے لئے ان کو طلب فرمایا۔ آپ نے ہاتھی کا گھنٹہ اپنے گلے میں باندھ لیا۔ اور اسی حالت سے شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ''مرزا یہ آج خلاف انسانیت آپ کے گلے میں ہاتھی کا گھنٹہ کیوں پڑا ہوا ہے۔ اور ہاتھی کہاں ہے؟'' دست بستہ عرض کی کہ ''حضور ہاتھی میں خود ہوں۔ جس کے دم کے ساتھ ایک کنبے کا خرچ لگا ہوا ہے۔ پھر دو دو ہاتھی باندھ کر کیا کرتا۔ امیدوار ہوں کہ ہاتھی کا راتب اور فیلبان کی تنخواہ فدوی پر جاری رہے کہ اپنے کنبے کی پرورش کر سکوں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ ''چودہ سیر آٹا اور سیر بھر گھی روزانہ کے حساب سے مرزا کو ہاتھی کی خوراک کی بجائے ملا کرے۔'' مرزا نے بھی اپنی وضع کو مرتے دم تک نباہ دیا۔ یعنی زندگی بھر ان کے گلے میں ہاتھی کا گھنٹہ پڑا رہا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کا نام عنایت علی بیگ کی بجائے گھنٹہ بیگ رکھ لیا۔ اور محلے والے مرزا گھنٹہ بیگ کہنے لگے۔

مرزا کا مکان حضرت عباس کی درگاہ کے پشت کی طرف زنانی درگاہ کے پاس ایک میدان میں تھا۔ اور وہیں کچھ کچھ چھوٹے مکان اور بھی بنوا لئے تھے۔ جو دو روپے ماہوار پر اور بعض ایک روپیہ ماہوار پر اٹھا دیئے تھے۔ حسن اتفاق سے ایک مرتبہ بارش اس کثرت سے ہوئی کہ شہر کے تمام کچے مکان گر گئے۔ مرزا کے مکانوں پر بھی بلا نازل ہوئی۔ اور سب مکان خاک سیاہ ہوگئے آپ نے اس کی لکڑی تو فروخت کر ڈالی اور مٹی ہر آدمی کو دو آنے روز پر دینا شروع کی۔ یعنی جس کو ضرورت ہو مرزا صاحب کو دو آنہ دے کر جتنی مٹی لے جا سکے لے جائے۔ محلے میں جن لوگوں

کے کچے مکان منہدم شدہ بن رہے تھے۔ ان سب نے مٹی خریدنا شروع کردی۔ جب مٹی ختم ہوگئی تو آپ نے زمین کھدوا کر مٹی بیچنا شروع کی۔

اسی طرح آپ سال بھر تک مٹی بیچا کئے۔ اور اس میں مکانات کی قیمت سے زیادہ روپیہ حاصل ہوگیا۔ برسات میں وہی زمین گڑھیا بن گئی۔ اور آج تک لکھنؤ میں گھنٹہ بیگ کی گڑھیا اتنی بڑی تھی کہ اس میں ہاتھی ڈوب جاتے تھے۔ اب بھی یہ کبھی خشک نہیں ہوتی اور اہل محلہ کو اس سے بہت آرام ہے۔ آج تک اس میں دھوبی کپڑے دھوتے اور جانور پانی پیتے ہیں۔ چوپائے نہلائے جاتے ہیں۔ برسات میں یہ گڑھیا ایک تالاب بن جاتی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی مرزا اعظم بیگ تمندار نے بھی اپنا مکان کھدوا کر مٹی بیچ کر کشمیری محلہ کے قریب ایک گڑھیا بنوائی تھی۔ مگر اس میں شاید وہ خوش نیتی شامل نہ تھی۔ کیونکہ یہ گڑھیا کچھ عرصے کے بعد پٹ کر بالکل صاف ہوگئی۔ اور اب مرزا اعظم بیگ کی گڑھیا ایک میدان ہے۔ جس میں برسات میں قدرے پانی جمع ہو جاتا ہے۔ لیکن گرمی میں خشک ہو جاتی ہے۔ مرزا گھنٹہ بیگ کی خوش نصیبی دیکھیے کہ ان کی گڑھیا درگاہ کے قریب آج تک موجیں مار رہی ہے۔

مرزا گھنٹہ بیگ اسی برس کی عمر تک زندہ رہے آخری عمر میں شاہی مسخروں میں شامل ہوگئے تھے، اس میں انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ مرزا صاحب بہادر بھی تھے اور خوش مزاج بھی۔ طاقتور ایسے تھے کہ املی کے دو پھلے ہاتھ سے چیر کر رکھ دیتے تھے۔ فن سپہ گری سے بھی خوب واقف تھے۔ مگر افسوس ان کی زندگی کا آخری زمانہ بہت عسرت میں بسر ہوا تاہم وہ نہ کسی کے قرضدار اور نہ کسی کے محتاج تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ بھی نہیں پھیلایا۔ اپنی جائیداد بیچ بیچ کر کھاتے رہے اور خانہ نشین ہو کر گھر سے باہر نہیں نکلے۔ دروازے پر ہمیشہ ایک پہرہ دار نوکر رہا۔ شریفانہ آن بان سے زندگی بسر کی۔ ہاتھی کا گھنٹہ ہمیشہ گلے میں پڑا رہا۔ امجد علی شاہ کے زمانہ سلطنت میں دنیا سے کوچ کیا۔



حوالہ:

۱۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی (1868ء۔ لگ بھگ 1930ء) کے جد امجد، خان بہادر عبدالشکور خاں 1180ھ میں بلخ سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے۔ فیض آباد پہنچے تو شجاع الدولہ نے ان کو قلعہ داری کے منصب اور خلعت سے نوازا۔ 1190ھ میں ان کی وفات کے بعد قلعہ داری کا منصب نسل در نسل اس خاندان میں منتقل ہوتا رہا۔ ننھیال کی طرف سے عشرت لکھنوی کا تعلق عبداللہ خاں کے خاندان سے تھا، جو لاہور میں جلیل القدر عہدہ رکھتے تھے۔ عشرت کی پیدائش بروز سوموار 6 ربیع الاول 1285ھ مطابق 27 جون 1868ء کی ہے۔ ان کے اساتذہ میں مولوی امید علی قدوائی، مولوی مہدی حسن، مولوی فتح محمد لکھنوی اور مولوی فریاد حسین مراد آبادی کے نام لیے جاتے ہیں۔ شاعری میں شیخ محمد جان شاد سے تلمذ تھا۔ لکھنؤ کے ایک کالج میں پرنسپل کے اسسٹنٹ رہے۔ ملازمت کے علاوہ ان کا ایک تجارتی کتب خانہ بھی تھا، سو فارغ البالی سے بسر ہوئی۔ 1930ء تک حیات تھے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔

مطبوعہ کتب: تذکرہ ''آب بقا''، ''خم خانہ عشرت'' (شاعری)، ''قواعد میر''، ''نکات اردو'' (چار جلدیں: ''جان اردو''، ''اصول اردو'' اور ''زبان دانی'' وغیرہ)، ''ہندو شعراء'' مطبوعہ: نامی پریس، لکھنؤ: 1931ء

مختصر قصے: (۱) ''لکھنؤ کا شاہی زمانہ'' مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: جنوری 1911ء

(۲) ''چالاک لیڈر''، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: اگست 1913

(۳) ''فتوچور''، مطبوعہ: ''مخزن'' کانپور: جولائی 1928ء

(۴) ''رجب غالب جنگ''، مطبوعہ: ''یادگار'' لاہور: سالنامہ 1935ء

دربارِ دہلی کی کنکوا بازی

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

لکھنؤ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ دہلی میں بادشاہ کا دربار ہوگا۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ فرمائیں گے۔ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ پیشوائی کو آنے لگے۔ تمام ہندوستان میں اس بات کی خوشی تھی کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دہلی میں رونق افروز ہوں گے۔

لوگ اس تماشہ کو دیکھنے کے واسطے دور دور سے آرہے تھے۔ ہر فن کے اہل کمال جمع ہو رہے تھے۔ فوجیں جنگ کا نمونہ دکھانے کے واسطے بلائی گئیں۔ مرغ باز نامی گرامی، بٹیر باز سرنام بلائے گئے۔ نیولاک صاحب ڈپٹی کمشنر نے لکھنؤ میں سید آغا حسین صاحب کو لکھنؤ کے کنکوا بازوں میں انتخاب کیا اور بلا کر کہا کہ کچھ آپ نے سنا بھی ہے، دہلی میں دربار ہونے والا ہے۔ تمام دنیا کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمام بازیوں کے کھلاڑی، شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ اپنے فن میں یکتا ہیں۔ ہم آپ کو چٹھی دیں گے۔ آپ شاہی خیمے میں شاہی مہمان ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی عزت نہیں ہوسکتی۔

آغا صاحب سوچنے لگے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دوست احباب سے مشورہ لیا، سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آغا صاحب ایسا اچھا موقع آپ کو عمر بھر نصیب نہیں ہوسکتا۔ ایک تو ہندوستان بھر میں عزت دوسرے امید بہبودی یعنی اگر بادشاہ کو آپ کی کنکوا بازی پسند آ گئی تو کچھ جائیداد گورنمنٹ سے انعام میں مل جائے گی۔ عمر بھر چین کیجئے گا یا کم سے کم تنخواہ بیش بہا، تاحیات مقرر ہو جائے گی۔ سب سے عزت کی بات یہ ہے کہ خود ڈپٹی کمشنر آپ کو اپنی طرف سے بھیجتے ہیں۔ شاہی خیموں میں آپ فرد کش ہوں گے اور شاہی مہمان تصور کئے جائیں گے اور پھر سیر بھی ایسی دیکھنے میں آئے گی جس کے واسطے لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے تمنا رکھتے ہیں کہ دہلی میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے۔ لوگ تو اسی حسرت میں رہتے ہیں۔ یہ دن کس کو نصیب ہوتا ہے۔ نواب بنے صاحب نے فرمایا: ''ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ لاٹ صاحب سے انگریزی میں گفتگو کر کے ایک خیمہ ڈلوالیں گے۔ اسی میں ہم آپ سب رہیں گے۔'' منجھو صاحب سوز خواں نے کہا: ''آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے ہم آپ کے ساتھ چلیں گے، آپ ڈپٹی کمشنر سے جا کر چٹھی تو لکھوا لائیے۔''

آخر بے چارے آغا صاحب سب کی اشتعالک سے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ چٹھی لکھوا کر لائے۔ اچھے کاریگروں سے عمدہ کنکوے

ہنوائے۔ مانجھا ستوایا، ایک ڈیڑھ تارے پر ''دیکم'' بنوا کر کہا یہ بادشاہ کے خیمہ میں گرادیں گے۔ کنکوؤں کو کسا، کنے باندھے، چرخیوں پر سادی اور مانجھا چڑھا کر ان پر غلاف اطلس کے چڑھائے۔ پوشاکیں نفیس بنوا کر بکسوں میں رکھیں اور بہت سی امیدیں، بہت سے ارمان لے کر ہمراہ نواب بنے صاحب، منجھو صاحب سوز خواں، دہلی کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے، دیکھا تو پرانی دہلی کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہے اور نئی دہلی میں جہاں شاہی خیموں کا جنگل ہے، فوجی پہرے موجود ہیں۔ آدمیوں کو رستہ نہیں ملتا۔ میدان حشر معلوم ہوتا ہے، کوئی کسی کو نہیں سنتا۔ بہت مشکل سے بنے صاحب اور ہم خیموں تک پہنچے۔ وہاں کمپنی کو ڈپٹی کمشنر کا خط دکھایا۔ انہوں نے بہت عزت کی۔ ایک خیمہ آغا حسین صاحب کو دیا اور اس پر گوروں کا پہرہ مقرر کردیا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ اب آغا صاحب کو کھانے کی فکر ہوئی۔ یہ سمجھے تھے شاہی مہمان ہیں، کھانے کے خوان آتے ہوں گے۔ مگر جب کھانے کو کسی نے نہ پوچھا تو یہ خیال ہوا کہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوایا جائے مگر یہاں سرکاری خیموں میں ہوٹلوں کا ذکر کیا۔ کھانے کی بو باس پر گوروں کا پہرہ تھا اور کارونیشن ہوٹل شہر سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ آخر ہم سب لوگ خیمہ چھوڑ کر ہوٹل میں مقیم ہوئے مگر دن بھر خیموں میں رہتے ہیں۔ سرکاری کمیٹی نے حکم دیا کہ آغا صاحب آج کنکوا لڑائیں۔ دہلی کے نامی کنکوا بازان سے کنکوا لڑائیں گے۔ آغا صاحب نے چاہا کہ پہلا کنکوا بڑھا کر بادشاہی محل میں ڈھادیں تاکہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گزرے کیونکہ اس پر دیکم لکھا ہوا تھا۔ مگر ہوا مخالف تھی، مجبور ہو کر خاموش رہے اور اس ناکامی پر سخت تعجب کیا۔

سہ پہر کو آغا صاحب نے کنکوا اڑایا۔ دہلی والوں نے بھی کنکوا اڑایا۔ شام تک کنکوا اڑایا گئے اور بارہ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو کمیٹی میں بلائے گئے۔ وہاں مسٹر داس صاحب سیکرٹری کمیٹی نے کہا کہ آج آپ کے بارہ پیچ زیادہ ہوئے مگر دہلی کے لوگوں نے ہم سے کہا کہ یہ دہلی کے اچھے کنکوا باز نہیں تھے، اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ پھر ایک دن ہم کو دیا جائے تاکہ ہم اچھے اچھے لوگوں کو پیش کریں جو کنکوا بازی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کل پھر کنکوا لڑایئے۔

دوسرے دن پھر دہلی والوں سے لڑے، 20 پیچ زائد ہوئے۔ شام کو پھر کمیٹی میں گئے تو سیکرٹری صاحب نے کہا۔ آج تو آپ کے بیس پیچ زائد ہوئے۔ اور سب لوگوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا کل آپ میرٹھ والوں سے کنکوا لڑایئے۔

تیسرے روز آغا صاحب نے میرٹھ والوں سے کنکوا لڑایا اور ان سے بھی 52 پیچ زائد رہے۔ کمیٹی نے شام کو آغا صاحب کو بلا کر کہا کہ سارا دربار آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ سے بہتر کنکوا لڑانے والا کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج آپ کے 52 پیچ زائد رہے۔ آغا صاحب کی خوشی کو کچھ نہ پوچھئے۔ ہاتھوں دل بڑھ گیا اور کہنے لگے اب تو ضرور کوئی علاقہ سرکار سے ملے گا اور زندگی بھر عیش کریں گے۔

چوتھے روز بریلی والوں نے کنکوا لڑایا اور وہاں بھی آغا صاحب کو کامیابی ہوئی اور شام تک 22 پیچ کاٹے۔

پانچواں کنکوا بڑھایا اور برابر کاٹتے رہے۔ بتیس پیچ کاٹے۔ شام کو پھر دربار میں بلائے گئے اور لاٹ صاحب کی میم صاحبہ نے اور بڑے جلیل القدر انگریزوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا تمام ہندوستان میں آپ سے بڑھ کر کوئی کنکوا نہیں لڑا سکتا۔ ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی اور آغا صاحب دل میں خوش تھے کہ آج بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے انعام کا اعلان لاٹ صاحب کریں گے۔ سب انگریزوں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اتنے میں میم صاحبہ نے آغا صاحب کو ایک کرسی پر کھڑا کیا اور ایک روپے سے بڑا نکل کا بنا ہوا ایک تمغہ سینہ پر آویزاں کیا اور سب لوگوں نے چیرز دیئے اور سرکاری فرمان بھی نہایت خوشی سے پیش کیا۔

یہ دیکھ کر آغا صاحب تو جیتے جی مر گئے، ضبط نہ ہوسکا، آخر بے اختیار ہو کر بول اٹھے۔

''میم صاحب ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں آئے ہیں اور پانچ سو روپیہ ہمارا صرف ہو چکا۔ خیال تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ہماری پنشن مقرر کی جائے گی یا کوئی علاقہ انعام میں عطا ہوگا کہ بقیہ عمر عیش و آرام سے کٹے گی۔ آپ نے اس سب خدمت کے بدلے ایک روپیہ ہمارے سینے سے لٹکا دیا اور ایک کاغذ ہم کو دیا، اسے ہم لے کر کیا کریں گے؟ ہمارے کس کام کا؟ یہ تو ہمارے درد کا علاج نہیں ہے۔''

میم صاحبہ نے کہا۔ ''آغا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی چیز آپ کو دی جاتی ہے جو فوجی افسروں کو جنگ کی کامیابی پر بادشاہ دیتے ہیں۔ اسی کے سبب سے آپ ہر ایک دربار میں جا سکتے ہیں اور ہر سرکاری جلسہ میں آپ کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ ہر فوجی افسر کے پاس یہی تمغہ ہوتا ہے جس سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بہت عزت کی چیز ہے۔ آپ کو بادشاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو اتنی بڑی عزت عطا ہوئی اور شاہی فرمان کے کاغذ میں آپ کو کامیابی کی مبارکباد دی گئی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ نے آپ کی بہت قدر کی۔''

آغا صاحب کا چہرہ اتر گیا اور بادل ناخواستہ اپنے اوپر ہزاروں نفرین کرتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہنے لگے۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہنے لگے کہ کنکوا تو ہزاروں جگہ لڑانے گئے مگر یہ سوختی کبھی نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد کنکوا بازی سے توبہ کر لی۔

فقیر کا تکیہ

میر باقر علی داستان گو

شام۔ تھوڑا سا دن ڈوبتا سا سورج۔ راستہ کے دونوں طرف کھنڈرات، اینٹ، پتھر، چونا، مٹی کے ڈھیر، خود رو سبزے سے ڈھکے ہوئے، جن پر کمزور سورج کی شعاعیں پڑ کر اچٹ رہی ہیں۔ کہیں دیوار کا کچھ حصہ جو باقی رہ گیا ہے، اس کی کنگنی پر شاما بول رہی ہے۔ دور کسی املی کے درخت کی پھننگ پر بیٹھا ہوا پنچھی چہچہا رہا ہے۔ مغرب کی طرف پھٹے پھٹے بادل کا سلسلہ جو سادی انجم ہوا میں رکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اتنے بطئی السیر ہیں کہ نظر ان کی حرکت محسوس نہیں کر سکتی۔ آفتاب کی کرنوں نے ان کو نارنجی رنگ دیا ہے۔ ان بادلوں کے نیچے ابابیلیں جھرمٹ کھا کر سریلے راگ گا رہی ہیں اور ہوا منہ پر لئے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور کچھ ابابیلیں جو چکر لگاتے وقت ٹکڑی سے پیچھے رہ جاتی ہیں تو پھر ہوا پرتن کر جھومر میں آ ملتی ہیں۔

آثار صنادید۔ کہیں دروازہ کی محراب، جو کسی جگہ سے کھل گئی ہے اور فلک کی سرد مہری نے سیاہ کر دیا ہے۔ اوپر دو تین کنگرے باقی ہیں جن پر چیل کوؤں کی بیٹ کے سفید سفید نشان۔ کہیں دالان کی بنگڑیدار کا کچھ حصہ۔ کہیں شہ نشین کی کرسی۔ کہیں چبوترے کا نشان۔ کسی جگہ دو تین سیڑھیاں، کہیں...... لداؤ کی چھت کا کونہ۔ کہیں حوض کا کنارہ۔ کہیں طاق کا اجارہ۔ کہیں دیوار میں انگوٹھے کی علامت۔ کہیں کانس کا ٹکڑا۔ کسی جگہ مٹے مٹے نقش و نگار۔ کہیں پھول۔ گوکھ دریچہ۔ کسی دیوار میں قلبہ دبے ہوئے۔ غرض وہ کہنہ عمارتیں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان حال سے اگلے زمانہ کی صنعت اور کاریگری، گویا زبان حال سے اظہار کر رہی ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

تکیہ۔ الختصر میں اور شہر کے تماشائی جو میلہ کر کے آ رہے ہیں۔ دلی دروازے سے ایک میل کے فاصلہ پر سائیں مگہ شاہ کا تکیہ ہے۔ مگہ شاہ، کواڑ شاہ کے مرید اور دمڑو شاہ آپ کے دادا پیر ہیں اور مگہ شاہ کے دو مرید ہیں۔ لیا شاہ اور جھنجی شاہ گویا بے دام کے غلام ہیں۔ میں تکیہ کے

قریب آیا تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے پر دو تین درخت بڑ اور پیپل کے بلند سڑک کے دونوں طرف سایہ دار اور لب سڑک مسجد کا ایک چبوترہ، جس کے قریب شاہ صاحب کا کچا ڈھابہ، جس کی دیواروں کی مٹی بارش سے دھل گئی ہے اور منڈیروں پر کنکر ٹھیکریاں نکل آئی ہیں۔ اس ڈھابہ کی پشت کی طرف دس بارہ گز لمبا لکڑی کا پرنالہ جس کو بان سے باندھ کر منڈیرے سے اٹکا رکھا ہے۔ پرنالہ کے دونوں طرف جو اچھل اچھل کر برساتی پانی بہا ہے اس نے مٹی گلا کر منڈیرے سے زمین تک لمبا گھونٹ کھول دیا ہے۔ اندر کوٹھری کے تھپو اں اپلے، کچھ جنگل کے چنے ہوئے ارنے کیکر کے خاردار جھانکڑ، گلی ہوئی کٹی جوار کی جڑیں، کچھ بوسیدہ چھپر کا پھونس گیلا پڑا ہے اور اس ڈھیر کے قریب ایک بکری اور دو اس کے بچے بندھے ہوئے۔ موت اور مینگنیوں سے چونکہ برسات ہے ایک سڑا ہوا بھبکا نکل رہا ہے۔ ڈھابہ کی منڈیروں پر پرانے پلپلے کے بوریے کے ٹکڑے پڑے ہیں اور ان کی حفاظت کے واسطے پرانے بان کے توڑوں میں، کہیں مٹکے کا گلا بندھا ہوا ہے۔ کسی طرف اینٹ باندھ کر لٹکا دی ہے۔ کوٹھڑی کے دروازے کے قریب ایک مٹکا جس کا ٹونی لگ کر گلا جھڑ گیا ہے...... کائی کے ٹکڑے جو خشک ہو کر چٹخ گئے ہیں، مٹکے کے چاروں طرف لپٹے ہوئے۔ پانی مٹکے کے پیندے میں گل آلودہ گیا ہے اور ہزاروں کیڑے اس میں کلبلا رہے ہیں۔ چپنی کی جگہ ٹھیلہ کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ڈھکا ہے اور اوپر اس کے ایک دودھ کا کھٹرا کنارہ ٹوٹا ہوا، پانی پینے کے ٹھیکرے میں اوندھا ہوا۔ چوکھٹ میں اندر کی طرف ایک گدڑی بچھی ہوئی، اس پر سائیں نگہ شاہ بیٹھے۔ پچاس پچپن برس کا سن کچی کڑبڑی داڑھی۔ نشہ میں جو رال پینک کے وقت بہی ہے، اس سے داڑھی کے بال چپک کر بتیاں سی بندھ گئی ہیں، سر پر ایک گاڑھے کا میلا پرانا چیتھڑا لپٹا ہوا۔ کان کی لوؤں میں پیتل کی دو بالیاں، گلے میں گزی کی دوہری کمری جس کا ابرا پھٹ گیا ہے اور فقط استر باقی رہ گیا ہے، ایک آستین کہنی پر سے نکلی ہوئی دوسرے شانے پر سے ندارد۔ کمرلوئی میں کوبڑی کے قریب ایک جیب، جس میں تمباکو کی چمڑے کی تھیلی جس کے منہ پر ڈورا بندھا ہوا اور ڈورے کے سرے پر ایک ٹوٹی ہوئی جھنجی کوڑی بندھی ہوئی۔ برسات کی پن بھری ہوا سے جو تمباکو کا گڑ پگھلا ہے تو بالشت بھر تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کمری یہاں سے ہے کس کپڑے کی۔

ٹانگوں میں نیلا لنگ جس پر پسینہ آ کر جو خشک ہوا ہے تو جس طرح کسی قطعہ پر موش و نداں بناتے ہیں، پسینہ کے شوریت سے ایک سفید جال سا بن گیا ہے۔ پاؤں میں ایک منکا، جس کو رتوا کہتے ہیں گھٹنے کے قریب ڈورے سے بندھا ہوا، آگے ٹوٹے ہوئے مٹکے کا ایک کڑیل دھوئیں سے کالا۔ راکھ بھری ہوئی اور کڑیل کے گرد چلمیں جو اٹی گئی ہیں، تو گل تمباکو کے جلے ہوئے چاروں طرف پڑے ہیں۔ راکھ میں ایک تھپو اں اپلہ دبا ہوا، کنارے پر اپلے کے تھوڑی سی آگ اور اس پر کچھ کرسیاں رکھی، شاہ صاحب لنگی کا آنچل دونوں ہاتھوں سے پکڑے جھل رہے ہیں۔ کبھی منہ سے پھونکتے ہیں، چہرے کا رنگ لال ہو گیا ہے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ کڑیل کے قریب اک مٹی کا مداریہ حقہ جس پر نرسل کا نیچہ۔ نیچے پر جو میلی دھجیاں لپٹی ہیں وہ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں اور پھٹا ہوا نیچہ نکل آیا ہے، گنا سڑ کر چیک پیدا کر لایا ہے اور حقہ پینے والوں نے جو گنا دبا دبا کر پیا ہے، گٹے کے دونوں طرف گڑھے پڑ گئے ہیں۔ آپ نے کا سرا، جس کو نہرو کہتے ہیں جلا ہوا۔ اس پر ڈنڈی اور کنارہ ٹوٹی چلم رکھی ہے اور شاہ صاحب کا سامان فقیری۔ سہنکا، مٹکا، سیلی، تاگہ، کنٹھا، جھولی، لوٹا، تابنا میا، مندرہ، حلقۂ تسبیح، الفا، کفنا، سونٹا، کوبڑی، کشتی کملی، تسلا، چلی، مالا، بندا، تسمہ چھڑی، کھڑاؤں، لنگ، جبہ، چادر، خرقہ، صافہ، ہاتھوں میں تانبے پیتل لوہے کے کڑے پڑے۔ گدڑی پر بیٹھے، بھنگ کے نشہ سے ہونٹ خشک آنکھیں جھکی ہوئی لال لال۔ بار بار ہونٹ خشک ہونے کی وجہ سے زبان ہونٹوں پر پھیر لیتے ہیں۔ میرے اوپر جو شاہ صاحب کی نظر پڑی تو با آواز بلند کہا میر صاحب، بابا حقہ پیتے جاؤ۔ میں نے صاحب سلامت کی اور شاہ صاحب نے گھمہ اینٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے اپنے چیلے کو آواز دی۔ بنیالیہ شاہ چلم بھرو۔ لیکن آگ جھاڑ کر اور دھو کر رکھنا۔

جھنجی حقہ تازہ کرواور وہ جھکاؤ کا تنکا پڑا ہے آبنے میں پھیرلو۔ بیٹا یہ میر صاحب داستان گو ہیں۔ بڑے اٹ کی سٹ لڑاتے ہیں۔ یہ امیروں کے کھلونے ہیں۔ ان کے تو دیدار ہی مشکل سے ہوتے ہیں۔ میاں میر صاحب، آپ تو ہفتہ اور منگل کو اپنے مکان پر داستان کہتے ہیں ٹکٹ لگا کر۔ میں ان دونوں کو داستان میں بھیجوں گا۔

آپ داستان میں مرشد کا ادب۔ صبر و قناعت کی خوبیاں۔ بادبود کے فائدے۔ نفس کشی کے طریقے، ان کو سنا دینا۔ آپ تو ہر قسم کے مفید عام مضمون بیان کرتے ہیں۔ میں تو ان دونوں کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ گیا، یہ ایسے خچر ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں۔



حوالہ:

۱۔ میر باقر علی داستان گو (دہلوی) اردو داستان نگاری کے آخری بڑے نام۔ خالصتاً مسلم حوالوں سے "داستان امیر حمزہ" لکھی۔ آخری عمر میں محمد علی جوہر کی کھدر پوش تحریک میں شامل ہوکر" گاڑھے خان کا دکھڑا اور ململ جان کی طلاق"؛ "اڑ اڑا دھم" اور "معنہ ہاتھی" جیسے رسائل یادگار چھوڑے۔

ایک چاندنی رات کا نظارہ: بہار کشمیر میں

آفتاب احمد[1]

مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: 1902ء

رات کا ایک بجا ہے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں پڑے بے غل وغش سوتے ہیں۔ چرند چراگاہوں میں گردن جھکائے آنکھیں مُوندے آرام کر رہے ہیں۔ پرند شاخوں پر پروں میں سر دیئے ہوئے بسیرا لیتے ہیں۔ کیا انسان کیا حیوان ہر ایک گہری نیند لے رہا ہے اور اپنے حال سے بے خبر ہے۔ آسمان پر ماہتاب مع انجم کی سپاہ کے نکلا ہوا ہے اور خلق خدا کا پاسبان ہے۔ تاروں کی فوج میں بعض سوار ہیں بعض پیادہ لیکن سب اپنے اپنے قرینے سے استادہ ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ لب ہلا سکے اگر کوئی حکم بھی سنایا جاتا ہے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر طرف پہنچایا جاتا ہے۔ جانب مشرق ایک باغ ہے۔ دائیں بائیں سیب، ناشپاتی، گلاس[2] کے تختے ہیں۔ سبزانِ چمن نور کی چادر اوڑھے، کرن پھول جھمکے پہنے، بندے لٹکائے، شرماتے لجاتے عجیب انداز سے کھڑے ہیں۔ وسط میں ایک وسیع مکان ہے جس کے دریچے ہوا کی آمد و رفت کے لیے کھلے ہیں۔ اندر شمعیں روشن ہیں اور ہر قسم کا سامانِ آسائش اور آرائش موجود ہے۔ قد آدم آئینے دیواروں پر آویزاں ہیں۔ ان کے پیچھے دونوں جوان ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یکا یک اُس مکان کا دروازہ کھلا اور وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے باتیں کرتے باہر نکلے۔ دس ایک قدم آگے چل کر ٹھہر گئے اور پھر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ صاحب خانہ واپس پھرا اور دوسرا نوجوان سیٹی میں وقت کی راگنی نکالتا، چھڑی ہلاتا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر میں ایک جھیل کے کنارے پر جا پہنچا جہاں ایک شکاری[3] درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ کشتی کھول اُس میں سوار ہولیا اور کھیتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ جھیل کے کنارے کنارے قدرت نے غیر معمولی دریادلی سے قسم قسم کے پھول لگائے ہیں۔ جن کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا ہے۔ بادِ صرصر کبھی اِن سے اڑ کر چلتی ہے۔ کبھی پانی پر جا کر لہروں کی البیلی چال کی تعریف میں زبان تر کرتی ہے۔ خشکی پر عالیشان عمارتیں بنی ہیں اور پانی پر چند کشتیاں بھی کھڑی ہیں۔ جابجا شمعیں روشن ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ بعض بعض مکین اور اہلِ کشتی جاگتے ہیں۔ لیکن قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جلتی بتیاں چھوڑ کر سو گئے ہیں۔ پانی میں قدرت کا کچھ اور ہی تماشا دکھائی دیتا ہے۔ سونے کے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے محل کانپتے ہوئے ستونوں پر استادہ ہیں۔ سبزانِ شمشاد قامت آبِ رواں کی چادر اوڑھے کھڑے ہیں۔

تارے متحرک پانی میں گھٹتے بڑھتے ہیں اور چراغاں کی کیفیت پیش نظر کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں نے مل کر اس نوجوان کو ایسا محو حیرت کر دیا کہ وہ اپنی خودی کو بھول گیا۔ چپّو گود میں رکھ فکر کے گھوڑے دور اور نزدیک دوڑانے لگا۔ ناگاہ قریب ہی پانی میں اُس کو ایک شخص متین صورت نظر پڑا۔ اس نوجوان نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ اس آبادی کا کیا نام ہے۔ یہ مرتفع محلات اور مشرف بارہ دریاں کن لوگوں کی رہائش کے لیے بنائی گئی ہیں اور یہ باغات اور چمنستان کن کی تفرج گاہیں ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس پر فضا مقام کی سیر کروں۔ تو مجھ کو اپنے ساتھ لے چل اور ذرا کی ذرا سیر کرا لا۔ اُس شخص نے جواب دیا: "دیکھو نیچے ہرگز قدم نہ رکھنا۔ ورنہ یہاں کھل بلی مچ جائے گی۔ میں مثل نقش بر آب دم کی دم میں معدوم کر دیا جاؤں گا اور تم بھی خطرہ میں پڑ جاؤ گے۔ یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ بھلا کسی غیر شخص کا تو کیا مذکور ہے۔ تم وہیں بیٹھے رہو۔ میں تم کو اس جگہ کا مختصر حال سنائے دیتا ہوں۔ لو سنو۔ اس مقام کو خموشستان کہتے ہیں۔ یہاں کی آبادی لاکھوں ہی پر پہنچتی ہے۔ یہ لوگ مختلف وقتوں میں ہر نواح سے آ آ کر آباد ہوئے ہیں۔ سینکڑوں بچے ہیں جو گنگا جمنی فرش پر بیٹھے کھیلتے ہیں۔ ہزاروں نوجوان مرادوں اور آرزوؤں کو آغوش میں لیے چین کرتے ہیں۔ یہاں ایک بستی سورما سپاہیوں کی ہے جن کی تلوار کی چمک نے کبھی تمہارے ملک میں بجلی کوندا دی تھی۔ جن کے تیر وتفنگ نے کسی زمانہ میں پہاڑوں کے سینے چھلنی کر دیے تھے اور جن کی بندوقوں کی گرج نے ایک وقت میں گھاٹیوں کو گونجا دیا تھا۔ لیکن جب سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں ان کے اسلحے بیکاری کے باعث زنگ خوردہ پڑے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے نظم ونسق میں تلوار اور قلم کو دخل نہیں۔ ایک معتدبہ حصہ ملاحوں کا ہے جن پر ہمیشہ آفات زمانہ کی بوچھاڑ رہی اور کوئی ایسی باد مخالف نہیں چلی جس نے ان کو بیڑے کی تباہی کی دھمکی نہ دی ہو۔ اخیر تنگ ہو کر یہ بھی اس مامن میں چلے آئے اور مدت کی کشمکش کے بعد اب تھل بیڑے سے بیٹھے ہیں۔"

بات ختم کرنے کے بعد اس شخص نے اجازت چاہی اور اپنی جگہ سے ہلا۔ ہمارے نوجوان نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر ٹھہرائے۔ پانی ہلا اور وہ غائب۔ پھر تو یہ ہوش میں آیا اور اپنے تخیل پر خود ہی تعجب کرنے لگا۔ کشتی تیز تیز چلانی شروع کی اور نیم ساعت کے بعد اس کو اپنے مکان کے محاذ کنارے پر جا لگایا۔ کشتی درخت کے ساتھ رسی سے باندھ دی اور آپ قریب کے ٹیلے کی طرف چلا جہاں ایک پختہ مکان بنا ہوا تھا۔ کمرے روشن تھے اور دروازہ نیم کشادہ تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر بند کرنے سے پیشتر اس نوجوان نے سامنے کے میدان اور جھیل پر ایک وداعی نظر ڈالی۔ پھر اندر جا کر چراغ گل کیا اور سو رہا۔ صبح جو آنکھ کھلی تو سورج کا عمل پایا۔



حوالہ:

۱۔ آفتاب احمد سے متعلق "مخزن" لاہور کے صفحات خاموش ہیں۔ ان کی اس نوع کی کوئی اور تحریر نہ تو "مخزن" میں اور نہ ہی "زمانہ" کانپور، "اردوئے معلّی" علی گڑھ، "ادیب" الٰہ آباد یا کسی اور معاصر جریدہ میں دکھائی دی۔

۲۔ آلوچہ کی قسم کا ایک پھل۔ دیکھنے میں سرخ اور ذائقہ میں شیریں۔

۳۔ چھوٹی کشتی، جسے "شکارہ" بھی کہا جاتا ہے۔

اُردو کے اوّلین افسانے

انتخاب (1903ء-1914ء)

نصیر اور خدیجہ

راشد الخیری[1]

اُردو کا پہلا افسانہ: مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: دسمبر 1903ء

شاباش بھائی نصیر شاباش! چھوٹی بہن مر کے چھوٹی۔ بڑی بہن کو جیتے چھوڑا۔ غضب خدا کا تین تین چار چار مہینے گزر جائیں اور تم کو دو حرف لکھنے کی توفیق نہ ہو۔ حفیظ کے نکاح میں، وہ بھی چچی جان کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ملتان کی بدلی ہوگئی۔ وہ دن اور آج کا دن خیر صلاح کیسی، یہ بھی خبر نہیں کہ لاہور میں ہو یا ملتان میں۔ نصیر میاں، بہن بھائیوں کا رشتہ تو بڑی محبت کا ہوتا ہے۔ ایسی کون سی پانچ سات بہنیں بیٹھی ہیں جو دل بھر گیا۔ دور کیوں جاؤں، بھائی سلیم ہی کو دیکھ لو، ایک چھوڑ دو بہنیں ساتھ ہیں اور کس طرح؟ گھر بار کی مختار، اندر باہر کی مالک۔ سیاہ کریں چاہے سفید۔ نہ بھائی کی اتنی مجال کہ دم مار سکے، نہ بھاوج کی اتنی طاقت کہ ہوں کر سکے۔ کسی کو دیکھ کر تو سیکھا کرو۔ ایک وہ بھائی، بہنوں کو آنکھوں پر بٹھایا، بھانجا بھانجی کی شادیاں کیں، بھانجوں کو پڑھا لکھا کر نوکر کرایا۔ ایک تم بھائی ہو، کس کا بھانجا اور کیسی بہن۔ چاہے کوئی مرے یا جئے تمہاری بلا سے۔ خدا کا شکر ہے، میں تو تمہاری روپیہ پیسہ کی بھی بھوکی نہیں خالی محبت اور میٹھی زبان کی خواستگار ہوں۔ جو کہیں خدانخواستہ تمہارے در پر آ کر پڑتی تو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلوا دیتے۔ آخر میں بھی تو سنوں خطا قصور وجہ سبب۔ کچھ تو بتاؤ ایسی لاپروائی بھی کس کام کی، اچھے سے غرض نہ بُرے سے مطلب۔ بہن کے تم نہیں بھائی کے تم نہیں۔ صادقہ مرتے مرگئی اور تمہاری صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اماں رہیں نہیں، ابا ادھر چلے گئے میں اس قابل نہیں، بڑے بھائی اس لائق نہیں۔ اب تمہارا دتی میں کون بیٹھا ہے جس کو خط لکھو، تم تو خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی موقعہ ملے تو ایک سرے سے سب ہی کو عاق کردوں۔ ابا کا حج کو جانا او تمہتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہوگیا۔ بہن اور بھائی، ماموں اور ممانی سب کو بالائے طاق رکھا۔ چچا لاپروا، چچی خطاوار۔ بھائی خود غرض، بہن گنہگار، غرض کنبے کا کنبہ اور خاندان کا خاندان چھوٹے اور بڑے، بڈھے اور جوان، مرد اور عورت، بوڑھا اور بچہ، ایک بھی اچھا نہیں، محبت نہیں مروت ہی سہی۔ بال بچوں کا ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے، دنیا جہاں میں ہوتی آئی ہے۔ مگر یہ اندھیر کہیں نہیں دیکھا کہ الگ گھر کرتے ہی سب کو دھتا بتائی۔ اماں کا مرنا ہماری تو مٹی پلید ہوئی مگر تم کو عید ہوگئی۔ شفقت محبت

پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی۔ جو کچھ تھوڑا بہت لحاظ تھا وہ بھی گیا گزرا ہوا۔ اللہ تم کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے الٰہی تمہارے بچوں کو ہزاری عمر ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو اب سے دو ور اگلے برس ذرا ظہیر کو بخار ہو گیا تھا۔ کیسے گھبرائے گھبرائے پھرتے تھے۔ تم کو آٹھ برس کے بچے کی یہ کچھ مامتا تھی۔ اماں کو تمہاری کتنی ہوگی؟ نصیر میاں دنیا کے جھگڑے تو ہمیشہ ہی رہیں گے، بال بچے شادی بیاہ سب ہی کچھ ہوگا۔ اب اماں تمہاری صورت دیکھنے نہیں آئیں گی۔

صادقہ کے بچوں کو اماں اپنی زندگی تک کلیجہ سے لگائے رہیں ان کا مرنا تھا کہ تینوں کی مٹی ویران ہوگئی۔ پرسوں دونوں لڑکے بسم اللہ کا حصہ لے کر آئے تھے میں باہر کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی رضائی ٹانک رہی تھی۔ چھوٹا آ کر گلے سے لپٹ گیا کچھ خون کا جوش تھا کہ اس کی صورت دیکھتے ہی میری طبیعت بھر آئی۔ غلاموں کی بھی حالت اچھی ہوگی جیسی ان بچوں کی تھی۔ پھٹا ہوا کرتہ ٹوٹی ہوئی جوتی، پاجامہ چکٹ، ٹوپی چوہا، بدن پہ سیروں میل، آنکھوں میں الفاروں چیپڑ، ان بچوں کو دیکھ کر مجھ کو وہ دن یاد آ گیا کہ جب تک دونوں کی اناتقین نہ آ گئیں۔ صادقہ رابعہ کی چوتھی میں نہ گئی۔ دیکھو تو تین چار ہی برس کے اندر اندر کیا کیا ہو گیا۔ برا نہ مانناتم قیامت تک بھی اپنے بچوں کو اس طرح نہ پالو گے جس طرح صادقہ اپنے بچوں کو پال گئی۔ خدا کی قسم بھری ہوئی عطر کی شیشیاں کھڑے کھڑے سعید نے غارت کی ہیں۔ تقدیر کی خبر نہ تھی کہ صادقہ کی اولاد یوں برباد ہوگی۔ میں نے دیکھا نہیں مگر دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ غدر سے پہلے اس مکان پر ہاتھی جھومتا تھا۔ آج جا کر دیکھو بے کنڈی کا ایک کواڑ چڑھا ہوا ہے اور چکنی مٹی کی ایک دیوار چنی ہوئی ہے۔ بڑے نواب کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ گھر بھر میں جھاڑو پھر گئی۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مسعود کے بیاہ میں صادقہ کی ساس کو گنگا جمنی پنکھے جھلے جا رہے تھے۔ لونڈیاں اور مامائیں گوندنی کی طرح زیور میں لدی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ آج پانی پینے کا کٹورہ بھی نہ رہا۔ مٹکے میں آٹا برکت، پتیلی میں کپڑے اللہ کا نام۔ بدن میں طاقت نہیں، ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں، چلنے پھرنے سے مجبور، دیکھنے سے معذور۔ آنکھیں تھیں تو ایک آدھ کرتہ دو ایک ٹوپیاں کر کرا لیتی تھیں۔ اب اتنی بھی نہیں، پڑوس کا حق سمجھو خدا کا خوف جانو۔ ہاتھ پاؤں کی خیرات کھو چچی جان تین روپیہ مہینہ دیتی ہیں۔ بس یہ کل کائنات ہے۔ اس میں کیا آپ کھائیں کیا بچوں کو کھلائیں تین روپیہ چار دم، ایک لڑکی کا ساتھ، کیا کریں کیا نہ کریں۔ تین روپیہ مہینہ کا تو سوکھا اناج چاہیے۔ جو جو کچھ لکھا تھا سب ہی کچھ کر چکیں۔ چکیاں پیسیں، سلائیں کیں، ہاں اتنی بات رہ گئی کہ در در ہاتھ نہیں پھیلایا۔

صادقہ کے بچے کسی غیر کے بچے نہیں ہیں۔ مری ہوئی بہن کی نشانی ہیں۔ شاباش تمہاری ہمت پر، تم پردیس میں بیٹھے راج کرو اور صادقہ کے بچے دو دو دانے کو محتاج ہوں۔ دلی میں آ کر دیکھو شہر میں کیا نام بدنام ہو رہا ہے۔ آخر برس میں دو برس میں اپنے ہاں کی نہیں سسرال کی شادیوں میں تو آؤ گے۔ سب کو یاد ہے کہ اللہ رکھو لڑکی کا بیاہ سر پر آ رہا ہے یا یہ بھی وہیں کر لو گے؟ اپنے پرائے، کنبہ، محلہ، میل ملاپی جان پہچان تمام دنیا جنم میں تھوک رہی ہے۔ کس کس کا منہ کیلو گے؟

بڑے بھائی اس لائق ہوتے تو تم سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بچارے آپ ہی اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ نوکری چھوٹی، چوری ہوئی۔ مقدمہ ہارے چار روپیہ مکان کے آ جاتے تھے وہ بھی نہ رہے۔ اندر کا دالان ہوا ہی رہا تھا ایک ہی چھینٹے میں اڑ اڑا کر کے آن پڑا۔ اس کے ساتھ ہی لمبی کوٹھڑی بھی بیٹھ گئی۔ اتنا بھی پاس نہیں کہ اینٹیں اور ملبہ تو ہٹوا دیں۔ چار سو روپیہ کے قرض دار بیٹھے ہیں۔

ایک لے دے کر منجھلی خالہ رہ گئیں وہ اکیلی کیا کیا کریں۔ صادقہ کے بچوں کو پالیں، بڑی بہو کی ٹہل کریں، اپنے گھر کو دیکھیں، جس کا نہ کریں اسی سے بری، روپیہ پیسہ کے قابل نہیں، ہاتھ پاؤں سے باہر نہیں، جس کے ہاں ضرورت دیکھتی ہیں آ موجود ہوتی ہیں۔ کنبے کو جس کا جو

جی چاہے کہہ لو غلق کا حلق تھوڑی بند ہو سکتا ہے۔

ماموں اور باپ میں فرق نہیں ہوتا۔ مگر سمجھو تو۔ نہ سمجھو تو بھانجا بھانجی تو خیر، اپنی اولاد بھی غیر ہے۔ خدا گواہ ہے میری تو اگر جان تک کام آجائے تو دریغ نہیں اپنے بچے کم اور صادقہ کے بچے زیادہ۔ مگر ذرا عقل سے کام لو ساری دنیا میں بدنام ہوں، مری ہوئی ہڈیاں اکھڑواؤں، اما باوا کی ناک کٹواؤں، دادی دادا تک کو پنواؤں، جب ان کو ساتھ رکھنے کا نام لوں۔ میں خود پرائے بس میں ہوں۔ شہر کا معاملہ، سسرال کی بات، ساس نندوں کا ساتھ ہر وقت کی جھک جھک، رات دن کی پٹ پٹ، کنبے بھر میں ذلیل ہونا، عمر بھر کے لئے مٹی پلید کرنی، گھروں میں لڑائیاں ڈالنی، دلوں میں فرق ڈالنے کس خدا نے بتائے ہیں۔ اماں جان تو پہلے ہی فرماتی ہیں کہ میکے کا بھرنا بھرتی ہے۔ بچوں کو رکھ لوں تو زندگی ہی دوبھر ہو جائے۔ تم کو ماشاءاللہ اسی روپیہ ملتے ہیں۔ دو میاں بیوی دو بچے کل چار دم۔ اسی روپیہ کیا کم ہیں۔ برا مانو یا بھلا جس طرح ہو سکے صادقہ کے بچوں کو پانچ روپیہ مہینہ دو۔ یہ روپیہ رائیگاں نہیں جائیگا۔ یہاں نیک نام وہاں سرخرو۔ نصیر میاں حق داروں کا حق سمجھو۔ اللہ برکت دے گا پھلو گے پھولو گے، دنیا کی بہار دیکھو گے، روزگار میں ترقی ہوگی۔ ان بچوں کو غیر نہ سمجھو ظہیر اور حمید میں فرق نہیں ہے۔ بھائی بہن کی اولاد ایک ہوتی ہے۔ یہ بچارے بھی کیا یاد کریں گے کہ کوئی ماموں تھا۔

دلہن بیگم کو بہت بہت دعا۔ بچوں کو پیار۔ اب تو ماشاءاللہ بچی پاؤں پاؤں چلتی ہوگی۔ اچھا خدا حافظ۔

روز جمعہ خدیجہ



حوالہ:

ا۔ راشد الخیری کا یہ افسانہ محمد عبدالراشد، کے نام سے شائع ہوا تھا۔

تصویرِ غم

درد مند اکبر آبادی[5]

تاریخی اعتبار سے اردو کا دوسرا افسانہ مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: فروری 1904ء

لمبے، سیاہ اور باریک بالوں کی لٹ اُس کے رخسار پر جس میں آج زردی سرخی پر غالب ہے، پڑی ہوئی تھی۔ ہونٹ کسی قدر خشک تھے۔ چہرہ اُداس سا تھا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے۔ میں دیکھتے ہی محوِ حیرت ہو گیا۔ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ یہ چہرہ تو رنج سے آشنا ہی نہ تھا۔ ان ہونٹوں کو تو میں نے ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھا۔ یہ آنکھیں اور آنسو۔ میں نے سلام کیا۔ جواب میں چشم پُر آب نے پلکوں سے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤں۔ پاس ہی ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک عزیز بیٹھے تھے۔ مگر وہ بھی سر جھکائے ہوئے کچھ افسوس کی سی صورت بنائے۔ کچھ دیر تک سکوت رہا۔ آخر میں نے آہستگی سے پوچھا: ''فرمایئے مزاج کیسا ہے۔ خیر تو ہے؟'' جواب میں نہایت دھیمی سی آواز آئی۔ ''اچھی ہوں۔'' اور ساتھ ہی ایک آہ سرد بے اختیار لب سے نکلی اور آنکھیں بیخودانہ چھت کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہاتھ کمر کی طرف گیا۔ پیشانی پر چین کے نمودار ہونے نے دردِ پنہاں کا پتا دیا اور ایسا معلوم ہوا۔ جیسے ایک ہوک سی نکلتی ہے۔ مَیں نے دوبارہ سوال کیا۔ ''کچھ حال تو کہیے۔'' آنکھوں نے جواب میں طفل اشک کو روانہ کیا۔ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جو صاحب پاس بیٹھے تھے وہ بولے کہ آج انہیں بہن کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ وہ اسی شہر میں تھیں۔ مگر اُن کے شوہر اور ان کی والدہ میں کچھ ایسی ناراضگی ہو چکی ہے اور خاندانی بکھیڑے کچھ اس قسم کے پڑے ہیں کہ آمد و رفت ملنا جلنا قطعی بند ہے۔ نہ بیماری میں یہاں سے کوئی خبر لینے گیا اور نہ ادھر سے کوئی پیام آیا۔ یہ سننے میں آیا ہے کہ مرنے والی آخر دم تک گوش بر آواز رہی کہ آج کوئی میکے سے آتا ہے۔ کہتی تھی بلا سے اگر ماں نے دل پتھر کر لیا ہے تو بہن بھائی ہی آ کر مسافرِ عدم کو رخصت کر جاتے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ ادھر تو ان کی والدہ یہ نہیں مانتی تھیں کہ یہ جائیں اور ادھر ان کے شوہر روادار نہیں کہ سسرال میں سے کوئی آئے۔ اب انہیں دوہرا صدمہ ہے۔ ایک تو ماں جائی، ساتھ کی کھیلی ہوئی بہن کے گزر جانے کا جو بہن کی بہن اور سہیلی کی سہیلی تھیں۔ اور دوسرے یہ قلق ہے کہ بہن ملنے کا ارمان لے کر قبر میں جا رہی ہے۔ اور یہ ارمان کی قبر دل میں بنائے ہوئے ہیں۔ ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی، اِدھر

چپکے چپکے رومال اشکوں سے تر ہو چکا تھا۔ چشم خانوں کے گرد باریک سی سرخ لکیر۔ چہرہ کی حالت بعینہٖ وہ جو ہلکے سے زکام میں حسین چہروں کی ہوتی ہے اور جو چشم حسن پسند کے لیے آفت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ حسن اگر واقعی حسن ہو تو خفیف مرض میں اور نکھرتا ہے۔ غم میں اس میں بھی پیر نہیں۔ حسین کے نازک دل پر جو گزرتی ہے اس کے سبب تو دعا مانگی پڑتی ہے کہ خدا اُسے غم سے محفوظ رکھے۔ لیکن حسن پر تو غم میں وہ انداز آتا ہے جس سے حسن خود آگاہ نہیں ہے مگر ہوتا قیامت ہے۔ یہی رنگ اس غم کی تصویر کا تھا جس کے سامنے میں بت بنا بیٹھا تھا۔ بوڑھی ماما آئی اور بھیگا ہوا رومال دیکھ کر کہنے لگی: ''بیٹا کب تک روئے جاؤ گی۔ یوں تو عمر بھر یہ داغ دل سے نہ مٹے گا۔ لیکن اس طرح آنکھیں کھونے سے کیا حاصل ہے۔ صبح سے جوں یہ چارپائی کی پائنتی سے لگ کر بیٹھی ہو، زانو تک نہیں بدلا۔ اُٹھو منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ میں گرم پانی لے آتی ہوں۔'' ہاں خالہ جان، منہ ہاتھ بھی دھوئیں گے سرمہ بھی لگائیں گے پان بھی کھائیں گے، بال بھی سنواریں گے، کپڑے بھی بدلیں گے، کون سا کام ہے جو چھوٹ جائے گا مگر اس وقت تو معاف کیجیے، مجھے اپنے حال پر چھوڑیے، تمام دنیا اور اس کی ہمدردی اس وقت میرے زخم کا مرہم نہیں بن سکتی۔'' ماما چپکے سے کھسک گئی۔

وہ مغموم سر جھک کر زانو پر آ رہا۔ لٹ اور بھی پریشان ہو کر موتیوں سے پروئی ہوئی پلکوں کی پردہ داری کرنے لگی۔ میری آنکھ اس غمناک منظر سے ایک دم کے لیے نہیں ہٹی تھی، اب اور ٹکٹکی بندھ گئی۔ اچانک جو اس نے سر اٹھایا تو تصویرِ غم کا عکس میری آنکھ کی پتلی میں پایا۔ یہ بھی ہمدردی کا فوٹو تھا اور واقعی میرے دل پر اُس وقت ایک ایسی کیفیت طاری تھی۔ کہ میں چاہتا تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو، جس سے میں تھوڑا سا حصہ اس درد کا لے سکوں۔ تھوڑی سی تخفیف اس رنج میں کر سکوں۔ تھوڑا سا شریک اس غم میں ہو سکوں۔ یہ پیغام دل نے دل سے کہہ دیا۔ اور فوراً اس کا کچھ اثر چہرہ پر نظر آیا بھی۔ لٹکتی ہوئی لٹ کو رُخ پر سے ہٹایا، آنکھ کو رومال سے پونچھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: ''افوہ آج وحشت اتنی کی ہے۔ یہ تو خیریت ہوئی کہ آپ آ گئے۔ ورنہ میں تو سر پھوڑ لیتی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔''



حوالہ:

۱۔ دردمند قلمی نام تھا۔ اصل نام سے متعلق ''مخزن'' لاہور خاموش ہے۔ یہ افسانہ ''دردمند از اکبرآباد'' کے نام سے شائع ہوا۔

ایک پرانی دیوار

علی محمود [1]

اردو کے تیسرے افسانہ نگار علی محمود کا ابتدائی افسانہ مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: اپریل 1904ء

رات کے دو بجے، جبکہ اُس وقت کا اُداس چاند اُدھر مغرب کی طرف جھکا جا رہا تھا۔ اور ایک ٹھوٹھے درخت کی چند سوکھی ٹہنیاں اس کو رخصت کر رہی تھیں۔ ہوا بھیانک رفتار سے چل رہی تھی اور چند پرانے تاڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سے سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میں اُس گھڑی اکلا ایک پرانی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ جس نے میری طفلی دیکھی تھی! آہ آج اُس میں کتنا فرق تھا! خیال پچھلی باتوں کو یاد دلاتا تھا اور عبرت موجودہ سماں دکھلا رہی تھی! اس وقت کی ڈھلتی چاندنی نے اس کی بیکسی کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ میری آنکھیں بھر آئیں اور بچپن کا سارا زمانہ سامنے آ گیا۔ مگر ہاں اُسی نئے نئے طرح سے جس طرح ایک ڈبڈبائی آنکھ سے نظارہ ہوا! رات کے اکیلے پن نے اِس درجہ محو کر دیا کہ موجودہ حالت بالکل بھول گئی اور خیال ہی خیال میں اُس گزرے زمانے میں پہنچ گئے جو حقیقت میں اب پھر کبھی نہ آئیگا!!

یہ دیوار جس کے اس وقت ہم سامنے کھڑے ہیں۔ بستی کی بہت پرانی دیواروں میں سے ہے۔ زمانہ اس کے آگے گزر گیا۔ ہائے کسی وقت میں یہ جگہ کیا تھی اور اب کیا ہے! ان دنوں آبادی تھی آج ویرانہ ہے۔ کل مکانات تھے آج کھنڈر ہے۔ مجھے اس کا نقشہ بھولا نہیں ہے۔ اِدھر آنگن تھا اُدھر دالان تھا۔ یہاں پر سائبان تھا وہاں پر کوٹھری تھی۔ اِدھر باورچی خانہ تھا اُدھر کو خلوت تھی! ہائے سب مٹ گیا! اس جگہ وہی خلوت تھی جہاں سے یہ پرانے تاڑ نظر آیا کرتے تھے۔ یہاں اکثر ہم گرمیوں میں شام کو لیٹے ہوتے تھے۔ چڑیاں دیوار کی کنگنی پر آ بیٹھتیں اور اندھیرا ہونے تک چہچہایا کرتیں۔ کوٹھے کے اوپر فاختہ کا گھونسلا تھا جو میری بڑی پیاری تھی۔ دوپہر سناٹی گھڑیوں میں ہم اُس کی دردبھری آواز گھنٹوں سنا کرتے تھے۔ ہائے وہ فاختہ بھی تو اب مر تا گئی ہوگی۔ افسوس اگر ہم کو اُس کے چند پر بھی مل جاتے تو ہم ان کو اپنے پاس رکھتے!!

ہاں وہ دالان جس میں ہم گرمیوں کی دوپہر میں سویا کرتے تھے۔ اُسی کی یہ ایک دیوار رہ گئی ہے۔ ہائے یہاں کیسا لطف تھا۔ راتوں کو خوبصورت لیمپ جلا کرتا تھا اور یہاں کے اجلے اجلے فرش پر ہم لوٹا کرتے تھے۔ ہمیں خوب یاد ہے۔ ان خوش دنوں میں جب ہم خوش رہتے تھے تو اے دیوار تجھ پر خوشی ظاہر ہوتی تھی۔ بیشک تجھے میرے گھر بھر سے محبت تھی۔ میری خوشی میں تجھے خوش ہوتی تھی اور میرے رنج میں تجھے غم ہوتا

تھا۔ ان دنوں کے ایک ساون میں جبکہ میرا بھائی مرا تھا، ہمیں خوب یاد ہے کہ میرا سارا گھر غمگین ہو گیا تھا۔ ہم ایک کھری چارپائی پر پڑے رہے تھے تو اے دیوار، اُس وقت تجھ پر اداسی چھا گئی تھی۔ ان جیٹھ بیساکھ کے دنوں میں جبکہ گرم اور تند ہوا کی وجہ سے ہم سب لوگ پریشان سے رہا کرتے تھے، اس وقت تجھ پر بھی ایک قسم کی پریشانی معلوم ہوتی تھی۔

اے میری پرانی دیوار، وہ زمانہ کیا ہوا؟ وہ دن اب پھر نہیں آسکتے؟ میرا بچپن مجھے پھر نہیں مل سکتا؟ وہ خوشنما چاندنی رات جس میں ہم کھیلا کرتے تھے، پھر ویسی نہیں آسکتی؟ اے اُس وقت کے ڈوبتے ہوئے چاند، تجھ میں اب ویسی روشنی نہ رہی؟ اے اسی جگہ کے تارو، تم نے بھی آنکھیں بدل لیں؟ وہ نگاہیں کیا ہوئیں، جس سے تم مجھے بچپن میں دیکھا کرتے تھے؟ اے ہوا کے جھونکو! تم بھی مجھے اب لڑکپن کی سی نیند نہیں سلا سکتے؟ آہ یہ نہ سمجھے تھے کہ بچپن کی سب چیزیں بدل جائینگی۔ بھائی بہن، دوست آشنا سب کی صورتوں میں فرق آ گیا۔ سب کا خیال جدا جدا ہو گیا تو پھر تو کیوں نہ بدلتی؟ تیری اتنی یہ رفاقت بہت ہے کہ اس وقت تک تو ہم سے جدا نہ ہوئی! اگرچہ تو خود بے کسی میں ہے اور تجھ پر بڑھاپا آ گیا لیکن ہمیں یقین ہے کہ تو اپنے جی سے بری نہیں۔ تو آج بھی کچھ دیر کے لیے سہ پہر کے وقت اپنے سایہ میں بیٹھانے کو موجود ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتھر جن پر میں دیوانہ تھا۔ وہ نکیلی ٹھیکریاں جو مجھ سے اکثر نوک کی لیا کرتی تھیں۔ آج ان سب کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن اے میری باوفا دیوار تو نے آج بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس لئے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ آج بھی تیرے سایۂ میں پڑے ہیں۔

آہ۔ اے دیوار کیا یہ میرا خیال ہے کہ تو مجھے بھی بھولی نہ ہوگی؟ کیونکر یقین کروں؟ ہاں جی تو یہی چاہتا تھا کہ تو بھی مجھے بھولی نہ ہو۔ شاید نہ بھولی ہو، مگر میرے برتاؤ سے تجھے ضرور یہ خیال ہوتا ہوگا کہ میں تجھے بھول گیا۔ میری تیری جدائی میں مدت گزر گئی۔ زمانہ ہو گیا۔ ہم دور رہے، رنجور رہے۔ لیکن اے میری قدیم رفیق "تیرے خیال سے غافل نہیں رہے!" بچپن کا زمانہ جب جب یاد آیا تیرے خیال کے ساتھ یاد آیا۔ میرے لڑکپن کے دن تیرے ہی گود میں گزرے۔ مجھے پاؤں پاؤں چلنا تجھی نے سکھایا۔ جب میری دایہ مجھے چھوڑ دیتی تھی تو میں تیرے ہی سہارے کھڑا ہو جاتا اور چلنا سیکھتا۔ ہائے وہ بات عمر بھر یاد رہے گی کہ جب کبھی میں روٹھ جاتا یا میرے حسب خواہ کوئی چیز نہ ملتی اور میں رو دیتا تو اے دیوار اکثر تجھ سے آ کر لگ جاتا اور لوگوں کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے غمزدہ گال کو تجھ سے ملائے رکھتا۔ تو مجھے خوب یاد ہے کہ تو مجھے لپٹائے رکھتی اور میرے آنسو پونچھتی۔ جب اور بڑا ہوا اور گیند کھیلنا سیکھا تو اس وقت کی باتیں بھی مجھے خوب یاد ہیں۔ جب پانی برستا ہوتا اور میرے ساتھی میرے ساتھ کھیلنے کو نہ آ سکتے تو اس وقت میں تجھ سے کھیلتا۔ میں تجھے گیند دیتا اور تو مجھے گیند دیتی۔ میں تیری طرف پھینکتا۔ اور تو میری طرف پھینکتی ہائے طفلی! یہ نہ سمجھا تھا کہ تو اس قدر جلد گزر جائے گی اور اگر تو گزر ہی گئی تھی تو اے کاش یہ دیوار ویسی ہی رہتی۔ مانا کہ لڑکپن پھر نہ آتا اور اُس طرح پاؤں پاؤں چلنے کے لیے اُس کے سہارے کی ضرورت نہ ہوتی لیکن بڑھاپا تو آتا اور اس سے تکیہ لگانے کی حاجت ہوتی۔ ہائے! میری قدیم رفیق۔ میں دیکھتا ہوں کہ تو اب بہت ہی چند دنوں کی مہمان ہے۔ غم سے تو نڈھال ہو گئی اور مارے صدمے کے بیٹھی جارہی ہے۔

یہ تو ایک اتفاق تھا کہ یہاں آ گئے۔ نہیں معلوم کہ پھر آنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ میری قدیم دیوار، میں نے تو اب بہت آہیں بھریں اور دل غمگین ہو گیا۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ لے تیرا خدا حافظ!

جب میں چپ ہو گیا تو نہایت عبرتناک آواز میں دیوار نے اپنی زبان بے زبانی میں یہ کہا کہ:

''بیٹا! میری عمر تو اب پوری ہو چکی۔ شاید تمہیں دیکھنا اب پھر نصیب نہ ہو۔ میری ایک وصیت ہے اسے یاد رکھنا۔ یہ کچھ تم کو فائدہ دے گی۔''

''بیٹا! ہم کو جب اس جگہ پھر کھڑا نہ پاؤ اور اس کے عوض میں میرا ڈھیر ہو تو نادانوں کی طرح سے ہم پر ہو کر گزر نہ جانا۔ گرچہ میں تو نہ رہوں گی لیکن عبرت کو چھوڑے جاتی ہوں۔ اس سے بے رخی نہ کرنا۔ اس سے اکثر ملنا اور اس کی باتوں کو توجہ سے سننا۔ بیٹا، عبرت کی صحبت بڑی پاک صحبت ہے۔ خدا کے نیک بندوں کو ہمیشہ اس کے ساتھ دیکھو گے۔ بیٹا، بڑھاپے کی وجہ سے اب ہم سے زیادہ بولا نہیں جاتا۔ بس میری نصیحت یاد رکھنا اور عبرت کا ساتھ نہ چھوڑنا کہ یہ سب سے بڑی نصیحت ہے۔ جا تیرا اللہ نگہبان!



حوالہ:

۱۔ علی محمود کا یہ افسانہ ''علی محمود از بانکی پور'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

بدنصیب کا لال

راشد الخیری[1]

راشد الخیری کا دوسرا مطبوعہ افسانہ: مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: اگست 1905ء

مصیبت کا زمانہ پریشانی کے دن رات کا وقت، برسات کا موسم۔ مفلسی بے کسی بے بسی۔ ماں باپ، بھائی بند، دیور جیٹھ، ساس نند کچھ مر کر چھوٹے کچھ جیتے جی چھوٹے۔ دو دن کی بیاہی چوتھی کھیل سسرال آئی۔ ادھر بیٹی سوار ہوئی ادھر ماں کو بخار چڑھا۔ ہر چند ٹالا مگر کچھ ایسی گھڑی کا چڑھا کہ جان ہی لے کر ٹلا۔ دن بھر لوتھ پڑی رہی شام کو سرسام رات کو سکرات صبح ہوتے ہوتے رخصت۔

چوتھی کی دولہن گم سم سسرال سے چلی اور روتی پیٹتی میکے آئی۔ صبح کو پھول ہوئے۔ گھر میں مہمان بھرے تھے، باہر ابا جان کا نکاح ہو رہا تھا۔ قصہ مختصر اماں یوں گئیں ابا یوں گئے۔ اور کوئی اول تو تھا ہی نہیں اور جو تھیں بھی تو ایک رشتے کی نانی۔ وہ آپ جٹھانی کے ٹکڑوں پر تھیں۔ ساٹھ پینسٹھ برس کی بڑھیا، پھوس بھری بھنڈ، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بات کی نہ چیت کی۔ کام کی نہ کاج کی۔ ہونا نہ ہونا دونوں یکساں۔

بھائی، جس کے دم سے میکا ہے، بدنصیب دولہن کا کوئی نہ تھا۔ بہنیں کہنے کو تو ماشاءاللہ ایک چھوڑ دو دو مگر دونو اپنے اپنے گھر بار کی۔ ایک خوشحال، وہ پردیسن، دوسری شہر میں، وہ کنگال۔ اور کنگال بھی کیسی کہ اناج تک کو محتاج۔ غرض میکے میں تو نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوا۔ لے دے کر ایک باپ کا دم سمجھو وہ کہیں بیٹی کل کی مرتی آج ہی مر جائے۔ رہیں سوتیلی اماں، وہ ایک دفعہ کیا کئی دفعہ اور اپنوں میں نہیں محلے والوں تک کے آگے اور چوری چھپے نہیں ہانکے پکارے اور کھلے خزانے کہتی تھی: ''زندہ کو روٹی کیسی، اللہ کرے مردے کو کفن بھی میسر نہ ہو۔''

ساس جب تک زندہ رہیں بہو کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتی رہیں۔ امیری نہیں غریبی اور غریبی کیسی کہ فقیری چھ ساڑھے چھ روپیہ کی آمدنی خرچ پورا کال پڑا ہوا مگر صبح کا ناشتہ مرتے دم تک ناغہ نہ کیا۔ وہ جیتی ہوتیں تو حمیدہ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ پیٹ بھر کر نہ ہوتی، آدھا پیٹ، سالن نہ سہی روکھی۔ روکھی نہ ہوتی سوکھی۔ دو وقت نہیں، ایک وقت۔ تازی نہیں، باسی۔ گھر کی نہیں بازار کی۔ بازار کی نہیں محلّہ کی، غرض پوری آدھی، اونی پونی، اچھی بری لشتم پشتم کسی نہ کسی طرح پیٹ میں پڑ جاتی۔ یہ نہ ہوتا کہ صاف تین وقت کا کڑاکا گزر گیا اور چوتھے وقت بھی

اللہ ہی اللہ ہے۔

ساس کا مرنا بہو کے سر پر دنیا بھر کی تکلیفوں کا دھرنا تھا۔ کچھ ایسی ہوا چلی اور ایسا نصیبہ پھوٹا کہ چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ برس کے اندر ہی اندر گھر بھر کی صفائی ہوگئی۔ میراں جی میں، ساس مدار میں۔ دونو نندیں، رجب میں دیور، غرض تین مہینے میں چار جنازے ایک گھر سے نکل گئے۔ ساری کا ئنات، دو باپ بیٹے باقی رہے۔ شب برات کا چاند ایسا بھاگوان آیا کہ ابا جان بھی چل بسے۔ ٹنوں ٹوں، ایک میاں ہی میاں رہ گئے۔ پانچ روپیہ باپ کی پنشن کے تھے، وہ بند ہوئے۔ ایک روپیہ ماں کے دم تک تھا، وہ بھی ختم ہوا۔ آٹھ آنہ چاہے کھاؤ چاہو پیو۔ چاہ اوڑھو چاہو بچھاؤ۔ کچھ دن یوں بھی گزرے مگر کہاں تک اور کب تک کچھ نہ ہو تو دو میاں بیوی میں سر بھرآ تا روز تو ہو۔ مگر ہو کہاں سے؟ بیوی معذور، میاں مجبور۔ اس پر طرہ یہ کہ ادھر آیا زچہ خانہ ادھر آیا رمضان۔ دونو کے چھکے چھوٹ گئے۔ زچہ خانہ کا تو ایک بہانہ تھا۔ دلوں میں غبار بھرے ہوئے تھے۔ میاں بیوی کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے۔ بیوی میاں کو دیکھ دیکھ کر بھلستی تھیں۔ اٹھائیسواں روزہ ہوگا، چار بجے کے قریب بیوی کو بخار چڑھا۔ میاں سے کہنے لگی:

''ایک روزہ اور رہ گیا ہے اللہ یہ بھی پورا کروا دے۔''

میاں: ''ایک ہو یا دو، میں تو جیسا پریشان اب کے رمضان بھر رہا میرا ہی دل جانتا ہے۔ اماں جان کے سامنے میرے تیسوں روزے ہوتے تھے۔ اب کے ایک پہلا اور ایک منجھلا کل دو ہوئے! کیا کھا کے رکھوں اور کیا دیکھ کے کھولوں۔''

بیوی: ''مجھ سے پہلے رکھتے ہو تو خبر نہیں اگلے برس تو تم نے ایک بھی نہیں رکھا تم کیا اللہ بخشے خود ابا جان ہی گنڈے دار رکھتے تھے۔ گھر بھر میں ایک اماں جان البتہ روزے کی پابند تھیں باقی تو سب چھوٹے اور بڑے دن دہاڑے دھڑلے سے کھاتے تھے۔''

میاں: ''تم ایسی بیہودہ باتیں کیوں کرتی ہو پندرہ دن کی بیاہی چالوں کی دلہن تم کو کیا معلوم کس کو روزہ ہے کس کو نہیں؟ یا جو دل میں آیا کہہ دیا جو منہ میں آیا بک دیا۔ رَو میں آئیں تو چھوٹے بڑے، مردے زندے سب کو اکھاڑ پھینکا۔''

بیوی: ''سبحان اللہ! دولہن تھی اندھی تو نہ تھی! منہ پر گھونگھٹ تھا یا کانوں میں ٹینیاں، دیکھتی نہ تھی سنتی تو تھی، پکتا تھا اور میں جانتی نہ تھی کھاتے تھے اور مجھے خبر نہ ہوتی تھی۔''

میاں: ''جب کیا میں تو اب بھی اور فقط اندھی ہی نہیں اس کے ساتھ بدتمیز، بے ڈھنگی پھوڑ، بدسلیقہ بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ ایسی نیک قدم آئیں کہ سب ختم ہوگئے۔

بیوی: ''میں منحوس تھی کہ گھر بھر کو بوس لیا۔ ساٹھ برس کے بڈھے پھوس میں کھا گئی۔ تم تو بھاگوان تھے کہ میری جوان اماں کو نوش جان کر گئے۔ تقدیر پھوٹنی تھی پھوٹ گئی۔ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا، فاقوں تک کی تو نوبت آ گئی اور کیا ہوگیا۔''

میاں: ''ہم نے تو چڑھاوے ہی کے وقت کہہ دیا تھا کہ روکھی بلکہ سوکھی روٹی ہے اماں کی قبر پر جا کر جوتیاں مارو اندھی تھوڑی تھیں۔ کیا دیکھ کر کیا تھا؟ ہاتھی جھوم رہے تھے؟''

بیوی: ''کیوں مرے ہوؤں کا صبر سمیٹتے ہو! خیر اس تو تو میں میں سے کیا حاصل میں تو ڈیڑھ کلام جانتی ہوں، ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کرو۔ تم کو سلام، تمہارے گھر کو سلام، میں ایسے گھر سے باز آئی۔ اشراف ہوں گی تو پھر نام نہ لوں گی۔''

میاں: ''شرافت کیا ہوئی ایک آفت ہوگئی۔ میری طرف سے تم ابھی بسم اللہ کرو۔ تم نام نہ لوگی تو میرا بھی کوئی پیغام نہ جائے گا بس اب

منہ سے کہا ہے تو کر کے دکھاؤ۔"

بیوی: "آگ لگے ایسا بیاہ کو اور پہاڑ میں جائے ایسا سہاگ۔ اذان کی آواز کان میں آ رہی ہے، روزہ نماز سب گیا گزرا ہوا۔"

دن بھر کا روزہ رات بھر کا فاقہ۔ مٹکے پاس گئی تو پانی کی بوند نہیں آبخورے میں نون ڈھونڈا، وہ نہ ملا۔ کنورے میں دو چھوہارے رکھے تھے وہ چوہا لے گیا۔ چولہے کے پاس یہ کہتی ہوئی آئی:

"خاک میں ملوں میں رکھتی جو راکھ سے روزہ کھولوں۔"

چوبیس پچیس گھنٹے کی بھوکی پیاسی، بخار چڑھا ہوا، آنکھوں میں حلقے، زبان پر کانٹے، ہاتھ میں طاقت نہ پاؤں میں سکت، روزہ کھول کر نماز کو چلی! چکر آیا اور چکر کے ساتھ ہی دیوار کی ٹکر اس زور سے لگی کہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ رو کر کہا:

"بس میں بہت جی اب خدا مجھ کو موت دے۔"

بیوی نماز کو کھڑی ہوئیں، میاں نے اپنا اسباب باندھنا شروع کیا۔ وہ اسباب ہی کیا تھا، پرانے تین جوڑوں کی ایک گٹھڑی، ٹوٹا ہوا حقہ، پھٹی ہوئی رضائی، چوہا تکیے، ایک چیتھڑا دری۔ بیوی کھڑی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی اور میاں اپنا اختر بختر لے لوا، یہ جا وہ جا۔

گئے اور ایسے گئے کہ بچہ تنک ہو گیا اور بچے کے باپ نہ پلٹے۔

اچھے برے، امیر فقیر، کماؤ نکھٹو، شریف رذیل، معزز ذلیل، ہندو اور مسلمان، بڈھے اور جوان، شیخ سید، مغل پٹھان، پنجابی اور بنگالی، سیری در ستم اور دل والے کچھ دیکھے کچھ برتے مگر یہ اندھیر نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ پورے دن بیوی پہلوٹی کا زچہ خانہ سر پر ساس نہ ادھی پاس۔ تانبے کا برتن نہ گھنٹے کا تار۔ ماں سوتیلی، باپ بیزار اور میاں کو گھر میں قدم رکھنا حرام۔ کمبخت صورت شکل کا اچھا جوان تندرست پڑھا لکھا موٹا تازہ کچھ نہ ہوتا تو چپڑاسی تو ہو جاتا مگر کون ہوتا اور کیوں ہوتا۔ بری صحبت نے غیرت اور حمیت سب غارت کروا دی۔ مزے سے تاش پچیسی اور چین سے سلہٹی کعبتیں۔ دن بھر پھڑوں میں رہے، رات کو جہاں جگہ ملی پڑ رہے۔

تکلیف ہو خواہ آرام، عمریں ختم ہو رہی ہیں اور زمانہ اڑا چلا جا رہا ہے۔ وہ وقت آن بھی پہنچا اور نکل بھی گیا۔ کسی کا کام اٹھا نہیں رہتا۔ خدا اس کی بیوی کا بھلا کرے ساس سے زیادہ اور ماں سے بڑھ کر خدمت کی۔ بچہ ہوا، پلا بڑھا۔ جس رات کا یہ ذکر ہے ماشاءاللہ برس سوا برس کا تھا۔

برسات کے دن تو تھے ہی مہینہ کا برسنا کوئی نئی بات نہ تھی مگر خرابی یہ ہوئی، ادھر تو پڑا مہینہ، اور مہینہ بھی کیسا کہ موسلا دھار اور گھنٹہ نہ آدھ گھنٹہ بلکہ پورا چار پہر اوپر سے چلی ہوا اور وہ بھی پورا۔ ہوا کیا، ایک طوفان تھا کہ مکان اور دکان درے اور دالان اُڑ اُڑ کر آ رہے تھے۔ نہ اندھیاؤ کم ہوتا تھا نہ جھکڑ تھمتا تھا۔ رات کا سناٹا ہوا کا فراٹا۔ کڑک، چمک، مُردوں تک کے کلیجے دہل رہے تھے۔ بارش کیا ایک آفت بلکہ قیامت تھی کہ جانوں کے لالے پڑ گئے۔ عورتیں اور مرد، بڈھے اور جوان، گھر بار کرے دالان، کپڑے لتے، اوڑھنا بچھونا، روپیہ پیسہ چاندی سونا، گہنا پاتا، برتن بھانڈا، پلنگ چارپائی سب چھوڑ چھاڑ انگنائی میں آ بیٹھے۔ بھیگیں گے تو بلا سے جان تو بچے گی۔ ہر طرف آفت بپا تھی۔ مکان گرا، دیوار آئی، سائبان اڑا، چھل نکلی، چھجہ پھولا، زینہ پھٹا، آدھی رات اور خلق خدا کی گریہ وزاری۔ مینہ کیا ایک چاند ماری تھی کہ چاروں طرف سے دھواں دھواں آوازیں آ رہی تھیں۔

حمیدہ غریب بدقسمت بدنصیب۔ عورت ذات، نہ کوئی سنگ نہ ساتھ۔ اس قیامت کی گھڑی کو اکیلی کھڑی گزار رہی تھی۔ قدرت کے

کھیل تھے، چراغ تھا نہ تیل۔ اندھیرا گھپ اور اس آفت کا سامنا۔ بدقسمتی سے دروازہ میں کواڑ بھی ایک تھا۔ ہوا کا جھکڑ کواڑ کی دھڑ دھڑ۔ دم پر بنی ہوئی تھی۔ ذرا کھٹکا ہوا اور جان نکلی۔ عالی شان محل، بڑی بڑی حویلیاں، پکی پکی محل سرائیں، کوئی گر رہا تھا، کوئی جھنک رہا تھا کوئی بیٹھ رہا تھا۔ حمیدہ مظلوم کا مکان تو کس گنتی میں تھا۔ لمبی کوٹھری، چھوٹا درا، حمام والی دیوار شام ہی کو بیٹھ چکے تھے۔ پاخانہ اور پاخانے کے ساتھ ہی باورچی خانہ اب آئے۔

مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور حمیدہ کھڑی اللہ اللہ کر رہی تھی۔ آسمان پر نگاہ اور بچہ میں جان دروازے پر دھیان اور درے کی طرف کان۔ ایک آفت ہو تو کہی جائے، ہر طرف مصیبت ہی مصیبت تھی۔ حمیدہ اکیلی کا اللہ ہی بیلی تھا۔ چھت کہتی تھی اب گری۔ درہ کہتا تھا اب بیٹھا۔ پہاڑ سی رات ایک کواڑ کا گھر جان کا خوف، چور چکار کا ڈر، جن بھوت کا اندیشہ، دل ہوا ہو رہا تھا۔ مٹی تو دو پہر ہی سے جھڑ رہی تھی اب منڈیر کی اینٹیں بھی شروع ہو گئیں۔ اینٹوں کا گرنا تھا کہ حمیدہ بالکل ہی بے آس ہو گئی۔ بدحواس ہو کر بچہ تو گود میں اُٹھا لیا اور انگنائی میں آن کھڑی ہوئی۔ بچہ کا اٹھانا تھا کہ اُس اللہ کے بندے نے بکنا شروع کیا۔ بہتیرا ہی بہلایا مگر تو بہ کس باپ کا بچہ تھا۔ جو جو چمکارتی تھی اور دگنا ہوتا تھا۔ تھپکا دودھ دیا۔ بہلایا پھسلایا۔ ٹہلی، کلیجہ سے لگایا۔ سب ہی کچھ کیا مگر اس کی چیخم دھاڑ نہ تھمی۔ ہائے ماتا اُس برس بھر کی جان پر اپنی جوان جان قربان تھی۔ اس پھول کے رونے میں سب بھول گئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوتے ادھر مینہ تھما ادھر ہوا کم ہوئی بچے نے بھی دم لیا تو ذرا جان میں جان آئی۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھٹولی اندر سے لائی پھٹی ہوئی رذائی اس پر بچھائی اور بچے کو کلیجے سے لگا کر انگنائی میں لیٹ رہی۔ بچہ ہلکان ہو کر جو پڑا ادھر ملی لوری، ادھر، کا پکھوا، دودھ منہ میں لیتے ہی گلے میں ہاتھ ڈال کر سو رہا۔ اللہ اللہ بچہ کا کلیجے سے لگ کر سونا تھا کہ وہ رات بھر کی مصیبت و پریشانی کچھ بھی یاد نہ رہی۔ میاں کی بے اعتنائی، باپ کی لاپروائی، اپنی تنہائی سب بھول گئی۔ ماتا کے جوش میں زور زور سے بھینچتی تھی اور کہتی تھی۔

''میں کیا کسی کی پروا کرتی ہوں۔ اللہ میرے بچے کی عمر میں برکت دے۔ میرا میاں تو یہ ہے۔''

زندگی کی تمام خوشیاں اور جوانی کی بہاریں اُس ننھی سی جان پر نثار تھیں۔ اُس ہی دم کے ساتھ عمر کی تمام آرزوئیں اور ارمان لگے ہوئے تھے۔ لپٹ رہی تھی اور لپٹا رہی تھی۔ چمٹ رہی تھی اور چمٹا رہی تھی۔ حمیدہ مظلوم اسی طرح قربان ہو رہی تھی کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی۔ اٹھی، درود شریف کا جزودان بچے کے پاس لا کر رکھا۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔



حوالہ:

راشدالخیری کا یہ افسانہ ''محمد عبدالراشد'' کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔

غربت و وطن

سجاد حیدر یلدرم[1]

یلدرم کا پہلا افسانہ مطبوعہ: ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ: اکتوبر 1906ء

رشید لکھنے کی میز پر، داہنا ہاتھ سر پر رکھے ہوئے خیال میں مستغرق بیٹھا ہے۔ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ گو شہر میں (اُس شہر میں جہاں رشید غربت کے دن، اُنس و اضطراب کی کچھ عجیب آمیزش کے ساتھ کاٹ رہا ہے)

اس وقت خاموشی چھائی ہوئی ہے، لیکن اس کے دل میں خیالات کا طوفان موجزن ہے۔

چہار طرف سناٹا ہے اور تاریکی، صرف کمرے میں گھڑی کھٹ...... کھٹ...... کھٹ کر رہی ہے۔ گلی کا کتا بھونکتا ہے۔ قریب کے کمرے میں نوکر دن کا کام ختم کر کے گہری نیند (حیات ساعیانہ کا انعام!) سو رہا ہے، اور اُس کی خرخراہٹ کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔ رشید اپنے خیالات سے عاجز آ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور بہت مضطرب حالت میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے اور باتیں کرنے لگتا ہے۔

''غربت اچھی کہ نئی دنیا، نیا آسمان، نئے مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔

نہیں، وطن اچھا کہ پرانے دوست، پرانے رفیق۔

جانی پہچانی آوازیں، جانی پہچانی صورتیں، سنائی دیتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔

نہیں، غربت اچھی جس میں ہر تجربہ نیا، ہر بات نئی جو دو آدمی ملتے ہیں، گویا دو دریا ہیں کہ پہلے جدا جدا بہ رہے تھے، اب سنگم ہوا۔

نہیں وطن اچھا، جہاں پرانے دوست گویا دو پودے ہیں، کہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اُگے اور بڑھے۔

نہیں، غربت اچھی، جہاں دوست نما دشمن اور آشنا صورت اغیار تو نہیں ہوتے، جن کی مدارات کرنی پڑے، جہاں غیر یہ صاف کہہ کے ملتا ہے کہ میں غیر ہوں اور دوست، آہ! دوست نہیں، تو شناسا بن کے جدا ہوتا ہے۔

نہیں، وطن اچھا، جہاں وہ آدمی نہیں ملتے، جن سے دل میں نہ حس محبت پیدا ہو، نہ ایام گزشتہ۔

نہیں، نہیں، بے یار نہ غربت اچھی، نہ وطن اچھا، اور با یار...... یہ اُن خوش نصیبوں سے پوچھیے، جو یار رکھتے ہیں۔''

رشید ایک۔ آرام کرسی پر گر پڑتا ہے اور پھر خاموش خیالات میں محو ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد کاغذ کے ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھتا جاتا ہے۔

یہ ایک نوزائیدہ اضطراب غزل تھی، جسے وہ تسکین خاطر کے لئے کونے میں رکھے ہوئے ہارمونیم پر جاکر بجاتا ہے۔

غزل

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کیلئے
ہے سینہ وقف مرا سوزشِ نہاں کیلئے

کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے
ہمارے سارے گلے اپنے مہرباں کیلئے

ہلاک کر کے رہے گا، مجھے تغافلِ دوست
ہے اک نگاہ کا اغماض نیم جاں کیلئے

ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سب مجھ پر مشتق اے احباب
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے

ہوئے جو طعنہ اعداء کبھی ذرا کو بند
زباں سے کام اعزا نے خود ستاں کیلئے

کڑک چمک تو نہ اے برق اس سے کیا حاصل
شرارہ ایک تھا کافی اس آشیاں کیلئے

مرا جو حصہ ہے وہ مجھ کو اے مصیبت دے
ہوا کرے ہے اگر عیش کل جہاں کیلئے

چمن میں بلبلِ مجبور کی نہیں فریاد
تڑپ رہی ہے قفس میں وہ بوستاں کیلئے

بھلا دے یادِ وطن جب میں جانوں اے غربت
وطن کا عشق ہے اک روگ میری جاں کیلئے

مقابل کے مکان کی کھڑکی کھلتی ہے، اور رشید کا پڑوسی اس شہر کی زبان میں کہتا ہے:

''مسٹر رشید! شاید آج آپ کے وطن سے کوئی بڑی خوشخبری آئی ہے۔ اگر چہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے، لیکن میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، اور (ذرا معترضانہ تبسم سے) مگر آدھی رات کو تو خوشی نہ منانی چاہیے۔

O

حوالہ:

۱۔ سجاد حیدر یلدرم کا یہ افسانہ اُن کے قیام بغداد کی یادگار ہے۔ 'یلدرمؔ' کے قلمی نام سے شائع ہوا۔

دوست کا خط

سجاد حیدر یلدرم [1]

سجاد حیدر یلدرم کا ایک اور ابتدائی افسانہ، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور، اکتوبر 1906ء

تُو پیارے دوست کا پیارا خط ہے۔ تجھ میں وہ کون سی برقی شے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہے۔ تجھے کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں؟ آخر تجھ میں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تُو بھی کاغذ کا ٹکڑا، وہ بھی کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وہ تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں باعث تفاخر وتفوق یہی ہے نا کہ دوست نے تجھے لکھا! لب پان خوردہ سے اُف، لب پان خوردہ سے لفافہ بند کیا؟ بے شک، بے شک یہ بہت بڑا تفوق ہے۔ اچھا میں تیرا امتحان لیتا ہوں، تجھے نمبر دیتا ہوں، سو میں دیکھوں تجھے کتنے نمبر ملتے ہیں۔

ان کے ہاتھوں سے چُھوئے جانے کے	......	40
اس بات کے کہ دستہ کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا	......	50
ان لبوں سے لفافہ کو بند کیا	......	70
		160

ہیں! تو نے سو سے زیادہ نمبر پائے۔ نہیں یہ امتحان نہیں ہوا۔ دوسرے طریقے سے شمار ہونا چاہیے۔

اس بات کے کہ تجھے میرے لیے انتخاب کیا اور کسی دوسرے کے لیے نہیں منتخب کیا	......	60
اس بات کے کہ ان کے قلم کی تحریر تجھ پر ہے	......	40
اس بات کے کہ ان کے چہرے کا عکس تجھ پر پڑا کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ رات کو لکھا ہے	......	500
		600

کیا؟ پھر سو سے زیادہ ہو گئے۔ یہ ٹھیک نہیں،

اچھا تیسری بار پھر امتحان

اس بات کے کہ تو ان کے مژدہ صحت و خوشنودی مزاج کی خبر لایا۔

1000 اس بات کے کہ تجھے چاک کر دیے جانے کا حکم ہے

یہ کیا؟ نمبر تو سو سے پھر بڑھ گئے ....

نہیں۔ نہیں! میں بے فائدہ کوشش نہیں کرنے کا۔ تُو امتحان سے بالا، موازنہ سے اعلیٰ، قید مقابلہ و مقائسہ سے آزاد، پیارے دوست کا پیارا پیارا، ہائے میں کیسے ظاہر کروں، کتنا پیارا خط ہے! تُو سینہ سے لگایا جائے گا، تو نظر اغیار سے بچایا جائے گا مگر حاشا تُو چاک نہیں کیا جائے گا۔ تُو میرے پاس محفوظ رہے گا اور میں ہزاروں مرتبہ تجھے تنہا گوشوں میں پڑھوں گا۔

O

حوالہ:

ا۔ ''مخزن'' اکتوبر 1906ء کے صفحہ 10 پر افسانہ نگار کا نام ''یلدرم از (بغداد)'' درج ہے۔

نابینا بیوی

سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش کا پہلا مطبوعہ افسانہ..... مطبوعہ: ''مخزن'' دہلی[1]، دسمبر 1907ء

میرے گھر کے برابر دیوار بیچ، ایک قاضی صاحب کا مکان تھا۔ بیچارے ایک زمانے میں بڑے متمول آدمی تھے مگر ریاست کی زندگی خصوصاً ملازمت انقلاب کی تصویر ہوا کرتی ہے۔ ذرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور پر آفت برپا ہوگئی۔ اسی طرح ان شریف قاضی صاحب کے تمول نے افلاس کا پہلو بدلا اور فقط پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار وقت بچ بچا کر رہ گئی۔ اسی پر صبر شکر کے ساتھ قانع تھے اور اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت سے دور دور تک ان کا شہرہ تھا، اور باہر سے اکثر اشخاص مشکل سے مشکل مسئلے حل کرانے آتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحب زادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا مگر چند در چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا۔ مگر ہمسایہ تھا، واقعات کی خبر برابر مل گئی۔ معلوم ہوا کہ دولھا کو پہلے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب اس کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا، اور عین نکاح کے وقت نہ معلوم کس بات کے علم پر اس نئی روشنی کے شیدا نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخر کار برات واپس آ گئی۔ اس کے بعد خود دولھا سے میری راہ و رسم ہوگئی اور اس کی وجہ اس نے غریب لڑکی کی بدچلنی بیان کی۔ یہ سن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے، اور میں نے ان سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ راستہ میں بھی ان سے کترا کر نکل جاتا۔ وہ دراصل مجھ سے محبت کرتے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچے دوست تھے۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے، اب گرمی کا موسم آ پہنچا۔ میری والدہ ضعیفہ تو صحن میں سویا کرتی تھیں۔ مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا۔ چلچلاتی گرمی تھی۔ پہر بھر دن سے ہوا بند تھی دونوں وقت ملتے ہی مار امار کر کے میں نے کھانا کھایا اور سیدھا کوٹھے پر جا پڑا۔ چاروں طرف اجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تارے اکا دکا نظر آتے تھے۔ دو تین گھنٹے یوں ہی کروٹیں بدلتے اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کر کے 11 بجے ہوا ذرا سرسرائی اور کچھ جان میں جان آئی۔ نیند کی غنودگی میں یکا یک مجھے یہ معلوم ہوا کہ کوئی میرے

سرہانے بول رہا ہے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر آدمی تو آدمی پر چھائیں تک دکھائی نہ دی۔ اتنے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک دردبھری آواز قاضی صاحب کی چھت پر سے آئی۔ ''خدا جانے کیونکر بدنامی ہوتی ہے۔ مگر خیر رب العالمین خوب جانتا ہے، مجھے کسی سے غرض ہی کیا! پاک پروردگار!! میں نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔ مجھ دکھیاری اندھی کو کون قبول کرے گا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ میں پاک ہوں اور باعصمت ہوں۔ آپ سے میں یہ چاہتی ہوں کہ میری بدنامی نہ ہو، اور برا کہنے والوں کا منہ تو بند کردے۔ ان دردبھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی۔ یہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کر رہے تھے، اور میری ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح ہوتے ہی میں جناب والد صاحب کی اجازت پر ایک دوست کے ذریعے سے پیغام بھیجا اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا۔ مگر ان سچے اور پاک باز انسان نے اس کے جواب میں آبدیدہ ہو کر کہا کہ ''ان سے کہہ دینا، ابھی صاحب زادہ ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو۔ وہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے۔ میں تمہارے والد کا نیازمند ہوں۔ قیامت کے دن انہیں کیا منہ دکھاؤں گا؟''

بمشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کرلیا، اور اس مصیبت زدہ نابینا لڑکی سے چپ چپاتے شادی کر لی۔ اب وہ میرے گھر میں آئی اور میری بیوی بن کر رہنے لگی۔ اس کی خصائل کی نسبت میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صبر، قناعت، سچائی، ہمدردی، محبت اور پاکبازی کی مجسم تصویر تھی۔ اکثر اوقات پچھلی رات کبھی میری آنکھ کھل جاتی۔ تو میں ایک عجیب مؤثر نظارہ دیکھتا وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا میں مشغول ہوتی اور ہزار ہزار طرح سے پہروں میری ترقی، آرام اور آسائش کے لیے دعائیں مانگتی حتی الامکان میں اس کی خوشی کا خیال از حد رکھتا۔ جب تک میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں۔ میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غائب میں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچی۔ مگر انہوں نے بھی ایک دن اس دارفانی کو الوداع کہا اور ان کے صدمے نے میری ہمت پست کر دی۔ اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی اور ڈیوڑھی پر ایک نوکر، والدہ صاحبہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی خادمہ نے اسے تکلیف پہنچانی شروع کی۔ مگر میں سچ عرض کرتا ہوں، کبھی بھول کر بھی اس نے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی، اور مجھے قطعی اس بات کی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز اتفاقیہ خلاف معمول دوپہر کو گھر میں واپس آیا۔ جبکہ میری بیوی کھانا کھا رہی تھی، اور خادمہ دسترخوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن وغیرہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا، اور اس ماما کو برا بھلا کہنے لگا کیونکہ پورے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے اچھا کھلاتی تھی اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے روکھی سوکھی روٹیاں اور بچا کھچا سالن رکھ دیتی تھی اور باقی سب اچھا اچھا تیر کر جاتی تھی۔ اسی دن سے میں صبح کو جب تک میری قابل رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہو لیتی تھی، باہر نہ جاتا، اور دوپہر سے پہلے واپس آ کر کھانا اسی کے ساتھ کھاتا۔ پھر شام سے ہی گھر میں آ پڑتا اور تمام رات کہیں نہ نکلتا۔ اس کی سچی محبت اور راست بازی نے اس قدر میرے دل میں گھر کرلیا تھا کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر میں خود کام کرتا۔ اس کے لیے وضو وغیرہ کے لیے پانی لانے میں مجھے عار نہ تھا۔ اس طرح گھر میں گھسے رہنے کی وجہ دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگے اور میرے ہم عمر میرا مذاق اڑانے لگے۔ مگر میں نے پروا [illegible]ر میرے معمول میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔

اسی اثناء میں ان نئی روشنی کے نوجوان کی جس نے میری نابینا بیوی پر جھوٹا الزام لگایا تھا بڑی دھوم دھام سے شادی ایک متمول لڑکی سے ہوگئی۔ مشکل سے ایک برس گزار ہوگا کہ شکر رنجی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی۔ تمام شہر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کی بیوی

آوارہ ہے۔ انہوں نے اس کو نکال دیا۔ اس نے میکے پہنچتے ہی نان نفقہ اور مہر کی نالش ٹھونک دی، اور نئی روشنی کے نوجوان کو چھٹی کا کھایا ہوا یاد آ گیا۔ غرض خوب عرضی پرچہ ہوتا رہا۔ ان پر بیوی کی ڈگری ہو گئی۔ اب انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی اور صلح ہو گئی۔ ان کی بیوی گھر میں آ گئی۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی تکا فضیحتی شروع ہو گئی۔ بہر حال ڈگری کے خوف سے وہ غصہ دباتے اور بیوی کی جوتیاں کھاتے رہتے۔

اس دار ناپائیدار کے قانون کے موافق مجھ بدنصیب پر ایک اور مصیبت آئی۔ میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا میں نے ڈاکٹر، حکیم، ملا، سیانے، دوا، ٹھنڈائی، گنڈا غرض کچھ نہ چھوڑا۔ مگر بخار میں کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ میں نے بالکل ہر جگہ کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ وہ برابر چھ مہینے تک بیمار رہی۔ میں نے ہر قسم کی خدمت کی۔ یہاں تک کہ چوکی پر لے جاتا۔ دوائی پلانا وغیرہ میرا روزانہ معمول تھا۔ کئی بار میرے اگالدان اٹھاتے ہی ابکائی آئی، اور جونہی میں نے اگالدان سامنے کیا۔ اس نے ڈالنا شروع کیا جس سے میرے ہاتھ بھی بھر گئے۔ اگرچہ میں شہر میں نازک مزاج مشہور ہوں۔ لیکن بخدا کبھی مجھے ایسی کراہت نہیں آئی کہ محبت پر غالب آتی۔

ایک دن اس نے متواتر بارہ گھنٹے آنکھ نہ کھولی اور مجھے از حد تشویش ہوئی۔ رات کے تقریباً نو بجے جبکہ اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اسے ہوش آیا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ تم اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے اور مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو؟ میں اس شرمندگی سے مر جاؤں تو اچھا ہے۔ تمہیں ماما پر اعتبار نہ ہو۔ تو اپنی شادی کسی سے کر لو۔ وہ گھر کا انتظام خود کرے گی، اور تمہیں اس قدر دردسری نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سوکن کا خیال ہوگا۔ تمہارا یہی ایک احسان کہ تم نے میرا سرتاج بننا منظور کیا، ایسا ہے جس کا میں کسی طرح بدلہ نہیں دے سکتی۔ تم نے میرے ساتھ شادی کر کے واقعی اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔"

کچھ نہ پوچھئے کہ ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے خون میں چکر آیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ قاضی صاحب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس لیے اس نے اپنی والدہ کو بلایا اور درد بھرے الفاظ کے ساتھ مہر معاف کر دیا، اور میں روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔ اسی دن سے ہچکی لگ گئی۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "اگر تم کو تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا۔"



حوالہ:

۱: "مخزن" 1907ء میں لاہور کی بجائے دہلی سے شائع ہوا کرتا تھا۔

عشقِ دنیا اور حُبِ وطن

پریم چند [1]

پریم چند کا پہلا مطبوعہ افسانہ، مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور، اپریل 1908ء

شہر لندن کے ایک پرانے خستہ حال ہوٹل میں، جہاں سرشام سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جس خطہ میں فیشن ایبل لوگ آنا ہی گناہ سمجھتے ہیں اور جہاں قمار بازی شراب خواری اور بدکاری کے نہایت عبرتناک نظارے ہردم پیش نظر رہتے ہیں۔ اس ہوٹل میں، اس بدکاریوں کے اکھاڑے میں اطالیہ کا نامور محبِ وطن میزینی خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا وجیہہ چہرہ زرد ہے۔ آنکھوں سے فکر برس رہی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں اور شاید مہینوں سے حجامت درست نہیں ہوئی کپڑے میلے کچیلے ہیں۔ کوئی شخص جو میزینی سے پہلے واقف نہ ہوا سے دیکھ کر یہ خیال کرنے سے نہیں رک سکتا کہ یہ بھی انہیں محروم القسمت شخصوں میں ہے، جو اپنے نفس کے غلام ہو کر ذلیل ترین حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

میزینی اپنے خیالات میں غرق ہے۔ آہ! بدنصیب قوم! اے مظلوم اٹلی! کیا تیری قسمتیں کبھی نہ سدھریں گی۔ کیا تیرے سینکڑوں سپوتوں کا خون ذرا بھی رنگ لائے گا۔ کیا تیرے ہزارہا جلاوطن دیس سے نکالے ہوئے جاں نثاروں کی آہوں میں ذرا بھی تاثیر نہیں! کیا تو ظلم و جفا۔ غلامی اور اطاعت گزاری کے دام میں ہمیشہ گرفتار رہے گی۔ غالباً تجھ میں ابھی سدھرنے کی، خود مختار بننے کی صلاحیت نہیں آئی۔ شاید تیری قسمت میں کچھ دنوں اور ذلت و خواری جھیلنی لکھی ہے۔ آزادی! ہائے آزادی! تیرے لیے میں نے کیسے کیسے دوست جان سے پیارے دوست قربان کئے۔ کیسے کیسے نوجوان، ہونہار جن کی مائیں اور بیویاں آج ان کی قبر پر آنسو بہا رہی ہیں اور اپنے آلام و مصیبت سے بیزار ہو کر ان کی جدائیوں کی تکلیف میں بدقسمت، حرماں نصیب، آفت رسیدہ میزینی کو بددعائیں دے رہی ہیں۔ کیسے کیسے شیر جو دشمنوں کے مقابل پیٹھ پھیرنا نہ جانتے تھے۔ کیا یہ سب قربانیاں، کیا یہ سب نذریں کافی نہیں ہیں؟ آزادی تو ایسی قیمتی شے ہے!! ہاں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں۔ کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا پیارا وطن میرا پیارا دیس دغا پرست۔ جفا شعار دشمنوں کے پیروں تلے روندا جائے میرے پیارے بھائی میرے پیارے ہموطن جور و تعدی کا شکار بنیں۔ نہیں، میں یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا!!

میزینی انہیں خیالات میں غرق تھا کہ اس کا دوست رفیق۔ جو اس کے ساتھ جلاوطن کیا گیا تھا اس کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ

میں ایک بسکٹ کا ٹکڑا تھا۔ رفیق عمر میں اپنے دوست سے دو چار برس چھوٹا تھا۔ بشرے سے شرافت جھلک رہی تھی۔ اس نے میزینی کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا "جوزف! یہ لو کچھ کھالو" میزینی نے چونک کر سر اٹھایا اور بسکٹ دیکھ کر بولا "یہ کہاں سے لائے، تمہارے پاس پیسے کہاں تھے؟"

رفیق۔ "پہلے کھالو پھر یہ باتیں پوچھنا۔ تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

میزینی۔ "پہلے یہ بتاؤ کہاں سے لائے۔ جیب میں تمباکو کا ڈبہ بھی نظر آتا ہے اتنی دولت کہاں ہاتھ لگی!"

رفیق۔ پوچھ کر کیا کرو گے۔ وہی اپنا نیا کوٹ جو والدہ نے بھیجا تھا گروی رکھ آیا ہوں۔"

میزینی نے ایک ٹھنڈی سانس لی! اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر پڑے۔ روتے ہوئے بولا "یہ تم نے کیا حرکت کی۔ کرسمس کے دن آتے ہیں۔ اس وقت کیا پہنو گے۔ کیا اطالیہ کے ایک لکھ پتی تاجر کا اکلوتا بیٹا کرسمس کے دن بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کوٹ میں بسر کرلے گا۔ ایں!"

رفیق۔ "کیوں کیا اس وقت تک کچھ آمدنی نہ ہوگی۔ ہم تم دونوں نئے جوڑے بنوائیں گے اور اپنے پیارے وطن کی آنے والی آزادی کے نام پر خوشیاں منائیں گے۔"

میزینی۔ "آمدنی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو مضمون ماہواری رسالوں کے لیے لکھے گئے تھے وہ واپس ہی آ گئے۔ گھر سے جو کچھ ملتا ہے وہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب اور کون ساذریعہ ہے؟"

رفیق۔ "ابھی کرسمس کو ہفتہ بھر پڑا ہے۔ ابھی سے اس کی کیا فکر کریں اور اگر بالفرض یہی کوٹ پہنا تو کیا؟ تم نے نہیں میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس کے لیے میگڈالن کی انگوٹھی بیچ ڈالی تھی۔ میں عنقریب یہ واقعہ اسے لکھنے والا ہوں تمہیں کیسا بناتی ہے۔"

کرسمس کا دن ہے۔ لندن میں ہر چہار طرف مسرت کی گرم بازاری ہے۔ صغیر و کبیر، امیر و غریب سب اپنے اپنے گھر خوشیاں منا رہے ہیں اور اپنے نفیس سے نفیس کپڑے پہن کر کلیساؤں میں جارہے ہیں۔ کوئی مغموم صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت میں میزینی اور رفیق دونوں اسی تنگ و تار حجرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں۔ میزینی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے، اور رفیق رہ رہ کر دروازے پر آتا ہے اور بدمست شرابیوں کو معمول سے زیادہ بہکتے اور دیوانہ پن کی حرکتیں کرتے دیکھ کر اپنی بے نوائی اور ناداری کی فکر دور کرنا چاہتا ہے۔ افسوس! اطالیہ کا سرتاج، جس کی ایک للکار پر ہزاروں آدمی اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ آج ایسا محتاج ہو رہا ہے کہ اسے کھانے کا ٹھکانہ نہیں۔ حتیٰ کہ آج صبح سے اس نے ایک سگار بھی نہیں پیا۔ تمباکو ہی دنیا کی وہ نعمت تھی جس سے وہ دست بردار نہیں ہو سکتا تھا، اور وہ بھی آج اسے نصیب نہ ہوا مگر اس وقت اسے اپنی فکر نہیں۔ رفیق۔ نوجوان خوشحال و خوش رو ہونہار رفیق کی فکر اسے سوہان روح ہو رہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ میں ایسے شخص کو اپنے ساتھ عسرت کی تکلیفیں جھیلنے پر مجبور کروں جس کے خیر مقدم کے لیے دنیا کی سب نعمتیں آغوش کھولے ہوئے کھڑی ہیں۔

اتنے میں ایک چٹھی رساں نے پوچھا جوزف میزینی یہاں کہیں رہتا ہے۔ اپنی چٹھی لے جا۔ رفیق نے خط لے لیا اور جوش مسرت سے اچھل کر بولا۔ "جوزف! یہ لو میگڈالن کا خط ہے!"

میزینی نے چونک کر خط لے لیا اور بڑی بے صبری سے کھولا۔ لفافہ کھولتے ہی چند بالوں کا ایک گچھا گر پڑا جو میگڈالن نے کرسمس کے تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ میزینی نے اس گچھے کو بوسہ دیا اور اسے اٹھا کر اپنے سینے کی جیب میں کھونس لیا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا۔

''مائی ڈیئر جوزف! یہ ناچیز تحفہ قبول کرو۔ خدا کرے تمہیں ایک سو کرسمس دیکھنے نصیب ہوں۔ اس یادگار کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ اور غریب میگڈالن کو بھولنا مت۔ میں اور کیا لکھوں کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔ ہائے جوزف! میرا پیارا میرا آقا، میرا مالک جوزف! تو مجھے کب تک تڑپائے گا اب ضبط نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں میں تیرے ساتھ مصیبتیں جھیلوں گی۔ فاقوں مروں گی۔ یہ سب مجھے گوارا ہے۔ مگر تجھ سے جدا رہنا گوارا نہیں۔ تجھے قسم ہے تجھے اپنے ایمان کی قسم، تجھے اپنے وطن کی قسم! یہاں آجا۔ تجھے میری قسم یہ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ کب تجھے دیکھوں گی۔ کرسمس قریب ہے! مجھے کیا۔ جب تک زندہ ہوں تیری ہوں۔ تمہاری میگڈالن۔

2

میگڈالن کا گھر سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ وہ ایک مرفہ حال تاجر کی بیٹی تھی اور انتہا درجہ کی حسینہ و جمیلہ۔ حسن باطن میں بھی اس کا نظیر نہ تھا۔ کتنے ہی امراء و روساء اس کا سودا سر میں رکھتے تھے۔ مگر وہ کسی کو کچھ خیال میں نہ لاتی تھی۔ میزینی جب اطالیہ سے بھاگا تو سوئٹزرلینڈ میں آکر پناہ گزیں ہوا۔ میگڈالن اس وقت بھولے بھالے شباب کی گود میں کھیل رہی تھی۔ میزینی کی سرفروشوں کے تعریفیں پہلے ہی سن چکی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ اس کے یہاں آنے لگی۔ اور باہمی ارتباط جو بڑھا اور میزینی کے محاسن باطنی کا جوں جوں اس کے دل پر نقش ہوتا گیا۔ اس کی محبت اس کے دل میں پختہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن خود شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر میزینی کے پیروں پر سر رکھ کر کہا مجھے اپنی خدمت میں مقبول کیجئے۔

میزینی پر بھی اس وقت شباب کا عالم تھا۔ قومی تفکرات نے ابھی دل کو پژمردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ جوانی کی پرجوش امیدیں دل میں موجزن ہو رہی تھیں۔ اگرچہ اس نے عہد کر لیا تھا کہ میں ملک و قوم پر اپنے تئیں نثار کر دوں گا، اور اس عہد پر قائم رہا ایک ایسی نازنیں کے نازک نازک لبوں سے ایسی درخواست سُن کر رد کر دینا میزینی ہی جیسے اعتقاد کے پکے بہاؤ کے پورے آدمی کا کام تھا۔

میگڈالن باچشم تر اٹھی۔ مگر مایوس نہ ہوئی تھی، اس ناکامی نے اس کے دل میں آتش محبت اور بھی تیز کر دی، اور گو آج میزینی کو سوئٹزرلینڈ چھوڑے کئی سال گزر رے مگر وفادار میگڈالن ابھی تک میزینی کو نہیں بھولی۔ دنوں کے ساتھ اس کی محبت اور بھی گاڑھی اور سچی ہوتی جاتی ہے۔

میزینی جب خط پڑھ چکا تو ایک لمبی آہ بھر کر رفیق سے بولا ''دیکھا میگڈالن کیا کہتی ہے؟''

رفیق۔ ''اس غریب کی جان لے کر دم لوگے۔''

میزینی پھر خیال میں ڈوبا ''میگڈالن تو نوجوان ہے۔ حسین ہے۔ خدا نے تجھے دولت بے انتہا عطا کی ہے۔ تو کیوں ایک غریب دکھیارے، مفلس، قلاش اور غربت زدہ شخص کے پیچھے اپنی زندگی مٹی میں ملا رہی ہے۔ مجھ جیسا مایوس آفت زدہ مصیبتوں کا مارا شخص تجھے کیوں کر خوش رکھ سکے گا۔ نہیں نہیں میں ایسا خود غرض نہیں ہوں دنیا میں بہت سے ایسے شگفتہ مزاج خوشحال نوجوان ہیں جو تجھے خوش رکھ سکتے ہیں۔ جو تیری پرستش کر سکتے ہیں۔ کیوں تو ان میں سے کسی کو اپنی غلامی میں نہیں لے لیتی۔ میں تیری محبت، سچی نیک اور بے غرض محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے لئے جس کا دل قوم اور وطن پر نثار ہو چکا ہے تو بجز ایک پیاری اور ہمدرد بہن کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھ میں ایسی کیا خوبی

ہے، ایسے کون سے اوصاف ہیں کہ تجھ جیسی دیوی میرے لیے ایسی مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ آہ! میزینی کمبخت میزینی تو کہیں کا نہ ہوا جن کے لیے تو نے اپنے تئیں نثار کر دیا وہ تیری صورت سے بیزار ہیں۔ جو تیرے ہمدرد ہیں وہ سمجھتے ہیں تو خواب دیکھ رہا ہے!'' ان خیالات سے بے بس ہو کر میزینی نے قلم دوات نکالی اور میگڈالن کو خط لکھنا شروع کیا۔

3

'' پیاری میگڈالن! تمہارا خط معہ بیش بہا تحفہ کے آیا۔ میں تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں کہ تم نے مجھ جیسے بے کس و بے بس شخص کو اس تحفہ کے قابل سمجھا۔ میں اس کی ہمیشہ قدر کروں گا۔ یہ میرے پاس ہمیشہ ایک سچی بے غرض اور غیر فانی محبت کی یادگار رہے گا اور جس وقت یہ جسم خاکی آغوش لحد میں جائے گا میری آخری وصیت یہ ہوگی کہ یہ یادگار میرے جنازے کے ساتھ دفن کر دی جائے۔ میں شاید خود اس تقویت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جو مجھے اس خیال سے ہے کہ دنیا میں جہاں ہر چہار طرف میری نسبت بدگمانیاں پھیل رہی ہیں کم از کم ایک ایسی فرشتہ خصال عورت ہے جو میری نیتوں کی صفائی اور میری آلائشوں سے پاک کوششوں پر پکا اعتقاد رکھتی ہے اور شاید تمہارے ہی ہمدردی کا یقین ہے کہ میں زندگی کے ایسے سخت امتحانات میں کامیاب ہوتا جاتا ہوں۔

مگر پیاری بہن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم میری تکلیفوں کے خیال سے اپنا دل مت دکھانا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ تمہاری محبت جیسی لازوال دولت پا کر بھی اگر میں چند جسمانی تکالیف کا رونا روؤں تو مجھ جیسا بدقسمت شخص دنیا میں کون ہوگا۔

میں نے سنا ہے تمہاری صحت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ تجھے دیکھوں کاش میں آزاد ہوتا، کاش میرا دل اس قابل ہوتا کہ تیرے نذر کیا جاتا۔ مگر ایک پژمردہ، افسردہ دل تیرے قابل نہیں میگڈالن! خدا کے واسطے اپنی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے شاید اس سے زیادہ بات کی تکلیف نہ ہوگی کہ پیاری میگڈالن تکلیف میں ہے اور میرے لئے! تیری پاکیزہ صورت اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے! میگا! دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو! بخدا میں تمہارے قابل نہیں۔ آج کرسمس کا دن ہے۔ تمہیں کیا تحفہ بھیجوں۔ خدا تم پر ہمیشہ اپنی بے انتہا برکات نازل کرتا رہے۔ اپنی ماں کو میری طرف سے سلام کہنا۔ تم لوگوں کے دیدار کی بہت آرزو ہے۔ دیکھیں کب تک یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔ تیرا جوزف۔''

4

اس واقعہ کے بعد بہت دن گزر گئے۔ جوف میزینی پھر اطالیہ پہنچا اور روم میں پہلی بار جمہوری سلطنت کا اعلان کیا گیا۔ تین شخص کاروبار سلطنت کے انصرام کے لئے منتخب کئے گئے۔ میزینی بھی ان میں ایک تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں فرانس کی زیادتیوں اور شاہ پنڈمانٹ کی دغابازیوں کی بدولت اس جمہوری سلطنت کا انتزاع ہوگیا۔ اور اس کے ارکان و مشیر اپنی جانیں لے کر بھاگ نکلے۔ میزینی اپنے معتمد دوستوں کی دغابازی و دنیا سازی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا خستہ حال و پریشان روم کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اس کا یہ خواب کہ روم کو میں ضرور ایک دن جمہوری سلطنت کا مرکز بنا کر چھوڑوں گا پورا ہو کر پھر پریشان ہو گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ سے آشفتہ حال ہوکر وہ ایک درخت کے سائے میں ذرا دم لینے کے لئے ٹھہر گیا، کہ سامنے سے ایک لیڈی آتی ہوئی دکھائی دی اس کا چہرہ زرد تھا۔ کپڑے بالکل سفید اور سادہ، سن تیس سال سے متجاوز، میزیتی خود فراموشی کے عالم میں تھا کہ یہ نازنین جوش محبت سے بیتاب ہوکر اس کے گلے لپٹ گئی۔ میزیتی نے چونک کر دیکھا۔ بولا" پیاری میگڈالن! تم ہو۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ میگڈالن نے روکر کہا۔" جوزف! اور منہ سے کچھ نہ نکلا۔"

دونوں خاموش، کئی منٹ تک روتے رہے آخر میزیتی بولا" تم یہاں کب آئیں میگا!"

میگڈالن۔" میں یہاں کئی ماہ سے ہوں۔ مگر تم سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ تمہیں کاروبار میں محو دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اب تمہیں مجھ جیسی عورت کی ہمدردی کی ضرورت باقی نہیں تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھتی تھی (رک کر) کیوں جوزف! یہ کیا سبب ہے کہ اکثر لوگ تمہاری برائی کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اندھے ہیں کیا خدا نے انہیں آنکھیں نہیں دیں؟"

جوزف۔" میگا! غالباً وہ لوگ سچ کہتے ہوں گے فی الواقع مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں۔ جو میں نخوت کے باعث اکثر کہا کرتا ہوں کہ مجھ میں ہیں، یا جنہیں تم اپنی سادگی اور پاک نفسی سے مجھ میں موجود سمجھتی ہو۔ میری کمزوریاں روز بروز مجھے معلوم ہوتی جاتی ہیں۔"

میگڈالن۔" جبھی تو تم اس قابل ہو کہ میں تمہاری پرستش کروں۔ مبارک ہے وہ انسان جو خودی کو مٹا کر اپنے تئیں ہیچ سمجھنے لگے۔ جوزف! خدا کے لئے مجھے یوں مت جدا کرو۔ میں تمہاری ہوگئی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم ویسے ہی پاک وصاف ہو جیسا ہمارا یسوع تھا۔ یہ خیال میرے دل میں نقش ہوگیا ہے اور اگر اس میں ذرا کمزوری آگئی تھی تو تمہاری اس وقت کی گفتگو نے اسے اور بھی مضبوط کر دیا۔ بیشک تم فرشتے ہو۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ دنیا میں کیوں لوگ اس قدر کوتاہ نظر اور کم بیں ہوتے ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جنہیں میں تنگ خیالوں سے بالاتر سمجھتی تھی۔ رفیتی رماری نو، پلائی نو۔ برناباس یہ سب کے سب تمہارے دوست ہیں۔ تم انہیں اپنا دوست سمجھتے ہو مگر وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔ اور انہوں نے مجھ سے میرے روبرو سینکڑوں ایسی باتیں تمہارے نسبت کہی ہیں جس کا میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتی۔ وہ سب غلط، لغو بکتے ہیں۔ ہمارا پیارا جوزف ویسا ہی ہے جیسا میں سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی افضل۔ کیا یہ بھی تمہاری ایک ذاتی خوبی نہیں ہے کہ تم اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہو۔"

جوزف سے اب صبر نہ ہوسکا اس نے میگڈالن کے زرد ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔" پیاری میگا میرے دوست بے قصور ہیں اور میں خود خطاوار ہوں (روکر) جو کچھ انہوں نے کہا وہ سب میرے ہی اشارے اور مرضی کے موافق تھا۔ میں نے تم سے نری دغا ہی کی۔ مگر میری پیاری بہن یہ محض اس لئے تھا کہ تم میری طرف سے بے پروا ہو جاؤ اور اپنے شباب کے باقی دن مسرت سے بسر کرو۔ میں بہت نادم ہوں میں تمہیں مطلق نہ سمجھا تھا۔ میں تمہاری محبت کی گہرائی سے ناواقف تھا، کیونکہ جو میں چاہتا تھا اس کا الٹا اثر ہوا مگر میگا میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

میگڈالن۔" ہائے جوزف۔ تم مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ ایں! تم جو دنیا کے سب انسانوں سے زیادہ نیک، زیادہ سچے اور زیادہ لائق ہو مگر ہاں بیشک، تم نے مجھے بالکل نہ سمجھا تھا۔ جوزف! یہ تمہاری غلطی تھی۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم اتنے سنگ دل کیوں کر ہوگئے۔"

جوزف۔" میگا! خدا جانتا ہے جب میں نے رفیتی کو یہ سب سکھا پڑھا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں جو دنیا میں نیک نامی کی سب سے زیادہ وقعت سمجھتا ہوں اور جس نے حریفوں کے ذاتی حملوں کو بھی بلا کامل تردید کئے ہوئے نہ چھوڑا۔ اپنے منہ سے سکھاؤں کہ جا کر مجھے برا کہو۔ مگر یہ محض اس لئے تھا کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور مجھے بھول جاؤ۔"

حقیقت یہ تھی کہ میزینی نے میگڈالن کے عشق کو روز افزوں ہوتے دیکھ کر ایک خاص حکمت کی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میگڈالن کے شیدائیوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اس سے زیادہ شکیل، زیادہ جری، زیادہ دولت منداور زیادہ ذہین ہیں مگر وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی۔ مجھ میں اس کے لئے جو خاص کشش ہے وہ میرے چند اوصاف ہیں اور اگر میرے ایسے احباب کی جن کی وقعت میگڈالن کی نگاہوں میں بھی ہے، اس سے میری شکایت کر کے ان اوصاف کی وقعت اس کے دل سے مٹا دیں تو وہ خود بخود مجھے بھول جائے گی۔ پہلے تو اس کے احباب اس فعل کے کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے مگر اس خوف سے کہ کہیں میگڈالن نے گھل گھل کر جان دے دی تو میزینی اپنی زندگی بھر انہیں بھی نہ معاف کرے گا۔ انہوں نے یہ ناگوار کام قبول کر لیا تھا وہ سوئٹزر لینڈ گئے اور جہاں تک ان کی زبان میں گویائی تھی اپنے دوست کی غیبت اور بدگوئی میں صرف کی۔ مگر میگڈالن پر محبت کا رنگ ایسا گہرا چڑھا ہوا تھا کہ ان کوششوں کا بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہ ہو سکتا تھا جو ہوا۔ وہ ایک روز بیقرار ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور روم میں آ کر ایک سرائے میں مقیم ہوگئی۔ یہاں اس کا روز کا وطیرہ تھا کہ میزینی کے پیچھے پیچھے اس کی نگاہ سے دور گھوما کرتی مگر اسے مطمئن اور اپنی کامیابی سے خوش دیکھ کر اسے چھیڑنے کی جرأت نہ کرتی تھی۔ بالآخر جب پھر اس پر ناکامیابیوں کا وار ہوا، اور پھر وہ دنیا میں بے کس و بے بس ہوگیا تو میگڈالن نے سمجھا اب اس کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے اور ناظرین دیکھ چکے ہیں جس طرح وہ میزینی سے ملی۔

5

میزینی روم سے پھر انگلستان پہنچا اور یہاں وہ عرصے تک مقیم رہا۔ 1870ء میں اسے خبر ملی کہ سسلی کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہے اور انہیں میدان جنگ میں لانے کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہے۔ بس وہ فوراً سسلی پہنچا مگر اس کے جانے کے قبل شاہی فوج نے باغیوں کو زیر کر دیا تھا۔ میزینی جہاز سے اترتے ہی گرفتار کرا گیا اور ایک زندان خانہ میں ڈال دیا گیا۔ مگر چونکہ اب وہ بہت ضعیف ہوگیا۔ حکام شاہی نے اس خوف سے کہ کہیں وہ تکالیف قید سے مر جائے تو رعایا کو شبہ ہوگا کہ بادشاہ کی تحریک سے وہ قتل کر ڈالا گیا، اسے رہا کر دیا۔ مایوس اور شکستہ دل میزینی پھر سوئٹزر لینڈ کی طرف روانہ ہوا اس کی زندگی کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے متفق اور متحد ہو جانے کے دن بہت قریب آ گئے تھے۔ مگر اس کی حکومت کی حالت اس سے ہرگز بہتر نہ تھی۔ جیسی اسٹریا ئیلپز کے عہد حکومت میں۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ایک غیر قوم کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ اب اپنے قوم کے ہاتھوں خستہ و خوار۔ ان متواتر ناکامیوں نے مستقل مزاج میزینی کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ غالباً عوام کی ملکی تعلیم اس حد تک نہیں ہوئی کہ وہ اپنے لئے ایک جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالیں، اور اس نیت سے وہ سوئٹزر لینڈ جا رہا تھا کہ وہاں سے ایک زبردست قومی اخبار نکالے۔ کیونکہ اطالیہ میں اسے اپنے خیالات کی اشاعت کی اجازت نہ تھی۔ وہ رات بھر نام تبدیل کر کے روم میں مقیم رہا پھر وہاں سے اپنے نژاد بوم جنیوا میں آیا۔ اور اپنی پاک خصال ماں کی قبر پر پھول چڑھائے، بعد ازاں سوئٹزر لینڈ کی طرف چلا اور سال بھر تک چند معتمد احباب کی اعانت سے اخبار نکالتا رہا۔ مگر متواتر تفکرات اور مصائب نے اسے بالکل لاغر اور نحیف بنا دیا تھا۔ 1870ء میں وہ صحت کے خیال سے انگلستان آ رہا تھا کہ کوہ آلپس کے دامن میں نمونیا کی بیماری نے سلسلہ حیات منقطع کر دیا اور وہ ایک پُرارمان دل لئے ہوئے جنت کو سدھارا۔ اٹلی کا نام مرتے دم تک اس کی زبان پر تھا۔ یہاں بھی اس کے متعدد حامی، ہمدرد شریک تھے اور ایک

بڑے پر فضا فرحت بخش مقام پر ایک شفاف چشمے کے کنارے پر اس فنائی القوم کو سلا دیا گیا۔

6

میزینی کو کنج لحد میں سوئے ہوئے آج تین دن گزر گئے۔ شام کا وقت تھا سورج کی زرد شعائیں اس تازہ قبر پر حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی ہیں کہ ایک ادھیڑ عورت، خوبصورت، شہانے جوڑے پہنے لڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ یہ میگڈالن تھی۔ اس کا چہرہ نہایت مغموم و پژمردہ تھا۔ گویا کہ اُس جسم میں جان نہیں باقی رہی۔ وہ اس قبر کے سرہانے بیٹھ گئی اور اپنے سینے پر گھسے ہوئے پھول اس پر چڑھائے۔ پھر دوزانو ہو کر صدق دل سے دعا کرتی رہی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا۔ برف پڑنے لگی تو وہ چپکے سے اٹھی اور خاموش سر جھکائے قریب کے ایک گاؤں میں جا کر رات بسر کی اور علی الصباح اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔

میگڈالن اب اپنے گھر کی مالک تھی اس کی ماں بہت عرصہ ہوا انتقال کر گئی تھی۔ اس نے میزینی کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی اور خود خانقاہ نشیں، عیسائی لیڈیوں کے لباس میں وہاں شب و روز رہنے لگی۔ میزینی کا نام اس کے لئے نہایت پر درد اور دلکش نغمے سے کم نہ تھا۔ ہمدردوں اور قدر دانوں کے لئے اس کا گھر، خانہ بے تکلف تھا۔ میزینی کے خطوط اس کی انجیل اور میزینی کا نام اس کا معبود تھا۔ آس پاس کے غریب لڑکے اور مفلس بیویوں کے لیے یہی بابرکت نام حصول معاش کا وسیلہ تھا۔ میگڈالن تین برس تک زندہ رہی اور جب مری تو اپنی آخری وصیت کے مطابق اسی خانقاہ میں دفن کی گئی۔ اس کا عشق معمولی محبت نہ تھا بلکہ وہ ایک پاک اور بے لوث جذبہ تھا اور وہ ہم کو ان پریم رس میں ڈوبی ہوئی گوپیوں کی یاد دلاتا ہے جو سری کرشن کے پریم میں بندرابن کی کنجوں اور گلیوں میں منڈلایا کرتی تھیں۔ جو اس سے ملے ہونے پر بھی اس سے الگ تھیں۔ اور جن کے دلوں میں پریم کے سوا اور کسی چیز کی جگہ نہ تھی۔ میزینی کی خانقاہ آج تک قائم ہے۔ اور غرباء اور فقراء ابھی تک میزینی کا پاک نام لے کر وہاں ہر طرح کی آسائش اور راحت پاتے ہیں۔

O

حوالہ:

ا۔ پریم چند کا یہ افسانہ ''نواب رائے'' کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔

دنیا کا سب سے انمول رتن

پریم چند[1]

پریم چند کا تحریر کردہ پہلا افسانہ، مطبوعہ: ''سوزِ وطن'' طبع اوّل، جون 1908ء

دلفگار ایک پُر خار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا، ان عشاق میں نہیں جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سے سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں۔ بلکہ ان سیدھے سادھے بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ و بیاباں میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔ اگر تجھے وہ چیز نہ ملے تو خبردار، ادھر رخ نہ کرنا، ورنہ دار پر کھنچوا دوں گی۔ دلفگار کو اپنے جذبے کے اظہار کا شکوہ و شکایات کا، اور جمال یار کے دیدار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ دلفریب نے جونہی یہ فیصلہ سنایا۔ اس کے چوبداروں نے غریب دلفگار کو دھکے دے کر باہر نکال دیا اور آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اُسی پر خار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے کہ کیا کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شے! مجھ کو ملے گی! ناممکن، اور وہ ہے کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آب حیات؟ تاج خسرو؟ جام جم؟ تخت طاؤس؟ زر پرویز؟ نہیں یہ چیزیں ہر گز نہیں۔ دنیا میں ضرور ان سے بھی گراں تر، ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں مگر وہ کیا ہیں کہاں ہیں۔ کیسے ملیں گی؟ یا خدا میری مشکل کیوں کر آسان ہو گی!

دلفگار انہیں خیالات میں چکر کھا رہا تھا، اور عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ میر شامی کو حاتم مدد گار مل گیا اے کاش کوئی میرا بھی مددگار ہو جاتا۔ اے کاش مجھے بھی اس چیز کا جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے ہے نام بتلا دیا جاتا۔ بلا سے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے اتنا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے۔ میں گھڑے برابر موتی کی کھوج میں جا سکتا ہوں۔ میں سمندر کا نغمہ، پتھر کا دل، قضا کی آواز اور ان سے بھی زیادہ بے نشان چیزوں کی تلاش میں کمر ہمت باندھ سکتا ہوں۔ مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شے! یہ میرے پر پرواز سے بہت بالاتر ہے۔

آسمان پر تارے نکل آئے تھے دلفگار یکایک خدا کا نام لے کر اٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا، برہنہ تن، خستہ و زار وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ جسم میں تار مسطر کی طرح ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ مگر

وہ چیز جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے تھی نہ میسر ہوئی اور نہ اس کا کچھ نشان ملا۔

ایک روز وہ بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں جا نکلا۔ جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بیچ میں کئی عمامے اور عبا والے ریشائیل قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ غرفش کر رہے تھے۔ اور اس جماعت سے ذرا دور پر ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ تو ناتوانی کے غلبے سے اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے سے ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کئی برقنداز ایک دست و پابہ زنجیر قیدی کو لیے چلے آرہے ہیں۔ سولی کے قریب پہنچ کر سب سپاہی رک گئے اور قیدی کی ہتھکڑیاں بیڑیاں سب اتار لی گئیں۔ اس بدقسمت شخص کا دامن صدہا بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو رہا تھا اور اس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا۔ اسے کالا چور کہتے تھے۔ سپاہیوں نے اسے سولی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔ موت کی پھانسی اس کی گردن میں ڈال دی، اور جلادوں نے تختہ کھینچنے کا ارادہ کیا کہ بدقسمت مجرم چیخ کر بولا اللہ مجھے ایک دم کے لیے پھانسی سے اتار دو تا کہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں۔ یہ سنتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیرت میں آ آ کرتا کنے لگے۔

قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو روکنا مناسب نہ سمجھا اور بدنصیب سیہ کار کالا چور ذرا دیر کے لیے پھانسی سے اُتار لیا گیا۔

اسی مجمع میں ایک خوبصورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار ہو کر اپنے پیروں پر اچھل اچھل فرضی گھوڑا دوڑا رہا تھا اور اپنے عالم سادگی میں ایسا مگن تھا گویا وہ اس وقت واقعی کسی عربی رہوار کا شہسوار ہے۔ اس کا چہرہ اس سچی مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا جو چند دنوں کے لئے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہے اور جس کی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی۔ اس کا سینہ ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا اور معصومیت اسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی۔

بدقسمت کالا چور پھانسی سے اترا۔ ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں وہ اس لڑکے کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اسے اس وقت وہ زمانہ یاد آیا جب وہ خود ایسا بھولا بھالا، ایسا ہی خوش و خرم اور آلائشات دُنیوی سے ایسا ہی پاک و صاف تھا۔ ماں گودیوں میں کھلاتی تھی۔ باپ بلائیں لیتا تھا اور سارا کنبہ جانیں وارا کرتا تھا۔ آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایام گزشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے جنہوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا اور نہ جھپکی تھی۔ آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے لپک کر اس دریکتا کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس کے دل نے کہا'' بیشک یہ شے دنیا کی سب سے انمول چیز ہے جس پر تخت طاؤس اور جام جم اور آب حیات اور زر پرویز سب تصدق ہیں۔''

اس خیال سے خوش ہوتا کامیابی کی امید میں سرمست دلفگار اپنی معشوقہ، دلفریب کے شہر مینوسواد کو چلا۔ مگر جوں جوں منزلیں طے ہوتی جاتی تھیں اس کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ کہیں اس چیز کی جسے میں دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھتا ہوں دلفریب کی نگاہوں میں قدر نہ ہوئی تو میں دار پر کھینچ دیا جاؤں گا اور اس دنیا سے نامراد جاؤں گا۔ پر ہر چہ بادا باد۔ اب تو قسمت آزمائی ہے۔ آخر کوہ و دریا طے کرتے شہر مینوسواد میں آ پہنچا۔ اور دلفریب کے در دولت پر جا کر التماس کی کہ خستہ و زار دلفگار بفضل خدا تعمیل ارشاد کر کے آیا ہے اور شرف قدم بوسی چاہتا ہے۔ دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا۔ اور ایک زرنگار پردہ کی اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیہ بیش بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امید و بیم کے عالم میں وہ قطرہ پیش کیا اور اس کی ساری کیفیت نہایت موثر لہجے میں بیان کی۔ دلفریب نے کل روئداد بغور سنی اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کر کے بولی۔

دلفگار بیشک تو نے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈ نکالی۔ تیری ہمت کو آفرین اور تیری فراست کو مرحبا! مگر یہ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں اس لئے تو یہاں سے جا اور پھر کوشش کر شاید اب کی تیرے ہاتھ در مقصد لگے اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو۔ اپنے عہد کے مطابق میں تجھے دار پر کھنچوا سکتی ہوں مگر میں تیری جان بخشی کرتی ہوں، اس لئے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کبھی سرخرو ہوگا۔ ناکام و نامراد دلفگار اس عنایت معشوقانہ سے ذرا دلیر ہو کر بولا۔ ''اے محبوب دلنشین! بعد مدت ہائے دراز کے تیرے آستاں کی جبہ سائی نصیب ہوتی ہے۔ پھر خدا جانے ایسے دن کب آئیں گے۔ کیا تو اپنے عاشق جانباز کے حال زار پر ترس نہ کھائیگی، اور اپنے جمال جہاں آراء کا ایک نظارہ دکھا کر اس سوختہ تن دلفگار کو آنے والی سختیوں کے جھیلنے کے لئے مستعد نہ بنائیگی۔ تیری ایک نگاہ مست کے نشہ سے بیخود ہو کر میں وہ کر سکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا ہو۔'' دلفریب عاشق کے یہ اشتیاق آمیز کلمات سن کر برافروختہ ہوگئی۔ اور حکم دیا کہ اس دیوانے کو کھڑے کھڑے دربار سے نکال دو۔ چوبدار نے فوراً غریب دلفگار کو دھکے دے کر کوچہ یار سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر تک تو دلفگار معشوقہ ستم کیش کی اس تندخوئی پر آنسو بہاتا رہا بعد ازاں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاؤں۔ مدتوں کی راہ نوردی و بادیہ پیائی کے بعد یہ قطرہ اشک ملا تھا۔ اب ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت اس در آبدار سے زائد ہو۔ حضرت خضر تم نے سکندر کو چاہ ظلمات کا راستہ دکھایا تھا کیا میری دستگیری نہ کرو گے؟ سکندر شاہ ہفت کشور تھا، میں تو ایک خانماں برباد مسافر ہوں تم نے کتنی ہی ڈوبتی کشتیاں کنارے لگائی ہیں۔ مجھ غریب کا بیڑا بھی پار کرو۔ اے جبرئیل عالی مقام! کچھ تمہیں اس عاشق نیم جام و اسیر رنج و محن پر ترس کھاؤ۔ تم مقربان بارگاہ سے ہو۔ کیا میری مشکل آسان نہ کرو گے؟ الغرض دلفگار بیزار نے بہت فریاد مچائی مگر کوئی اس کی دستگیری کے لیے نمودار نہ ہوا۔ آخر مایوس ہو کر وہ مجنوں صفت دوبارہ ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔

دلفگار نے پورب پچھم تک اور اتر سے دکھن تک کتنے ہی دیاروں کی خاک چھانی، کبھی برفستانی چوٹیوں پر سویا، کبھی ہولناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا، مگر جس چیز کی دھن تھی وہ نہ ملی۔ یہاں تک کہ اس کا جسم ایک تودۂ استخواں ہوگیا۔

ایک روز وہ شام کے وقت کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا نشہ بیخودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ صندل کی ایک چتا بنی ہوئی ہے اور اس پر ایک نازنین، شہانے جوڑے پہنے، سولھوں سنگھار کئے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے زانو پر اس کے پیارے شوہر کی لاش ہے۔ ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں۔ یکا یک چتا میں سے خود بخود ایک شعلہ اٹھا۔ ستی کا چہرہ اس وقت ایک پاک جذبہ سے منور ہو رہا تھا۔ مبارک شعلے اس کے گلے لپٹ گئے۔ اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودہ خاکستر ہوگیا۔ معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کر دیا اور دو فدائیوں کی سچی لافانی اور پاک محبت کا آخری جلوہ نگاہ ظاہر سے پنہاں ہوگیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے سے اٹھا اور اپنے گریباں چاک دامن میں یہ تودۂ خاک سمیٹ لیا اور اس مشت خاک کو دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمور کوچہ یار کی طرف چلا۔ اب کے جوں جوں وہ منزل مقصود کے قریب آتا تھا اس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی اس کے دل میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا اب کی تیری فتح ہے اور اس خیال نے اس کے دل کو جو جو خواب دکھائے ان کا ذکر فضول ہے۔ آخر وہ شہر مینو سواد میں داخل ہوا اور دلفریب کے آستان رفعت نشان پر جا کر خبر دی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہے اور حضوری میں باریاب ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے عاشق جانباز کو فوراً دربار میں بلایا اور اس چیز کے لیے جو دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی ہاتھ پھیلا دیا۔ دلفگار نے جرأت کر کے اس ساعد سیمیں کا بوسہ لے لیا اور وہ مشت خاک اس میں رکھ کر اس کی ساری کیفیت نہایت دلسوز الفاظ میں کہہ سنائی اور معشوقہ دلپذیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا

مبارک اور جانفزا فیصلہ سننے کے لیے منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشت خاک کو آنکھوں سے لگالیا اور کچھ دیر تک دریائے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی "اے عاشق جاں نثار دلفگار، بیشک یہ خاک کیمیا صفت جو تو لایا ہے دنیا کی نہایت بیش قیمت چیز ہے اور میں تیری صدق دل سے ممنون ہوں کہ تو نے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیشکش کیا مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گرانقدر کوئی چیز ہے، جا اسے تلاش کر۔ اور تب میرے پاس آ۔ میں تہ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔ یہ کہہ کر وہ پردہ زرنگار سے باہر آئی اور معشوقانہ ادا سے اپنے جمال جانسوز کا نظارہ دکھا کر پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک برق تھی کہ کوندی اور پھر پردہ ابر میں چھپ گئی۔ ابھی دلفگار کے حواس بجانہ ہونے پائے تھے کہ چوبدار نے ملائمت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کوچہ یار سے نکال دیا اور پھر تیسری بار وہ بندہ محبت وہ زاویہ نشین کنج ناکامی یاس کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

دلفگار کا ہیاؤ چھوٹ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں دنیا میں ناشاد و نامراد مر جانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اور اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے تئیں گرادوں۔ تاکہ معشوق کی جفا کاریوں کی فریاد کرنے کے لیے ایک ریزہ استخواں بھی باقی نہ رہے۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور افتاں و خیزاں ایک سر بفلک کوہ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ کسی اور وقت وہ ایسے اونچے پہاڑ پر چڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹیکرے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے کود پڑے کہ ایک سبز پوش پیر مرد سبز عمامہ باندھے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا لیے برآمد ہوئے اور ہمت افزا لہجہ میں بولے "دلفگار نادان دلفگار! یہ کیا بزدلانہ حرکت ہے۔ استقلال راہ عشق کی پہلی منزل ہے بایں ہمہ ادعائے عاشقی، تجھے اتنی بھی خبر نہیں۔ مرد بن اور یوں ہمت نہ ہار۔ مشرق کی طرف ایک ملک ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ وہاں جا! تیری آرزو پوری ہوگی۔ یہ کہہ کر حضرت خضر غائب ہو گئے۔ دلفگار نے شکریے کی نماز ادا کی اور تازہ حوصلے تازہ جوش اور غیبی امداد کا سہارا پا کر خوش خوش پہاڑ سے اترا اور جانب ہند مراجعت کی۔

مدتوں تک پر خار جنگلوں، شرر بار ریگستانوں، دشوار گزار وادیوں اور ناقابل عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا۔ اور ایک خوشگوار چشمہ میں سفر کی کلفتیں دھو کر غلبہ ماندگی سے لب جوئبار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کف دست میدان میں پہنچا جہاں بیشمار نیم کشتہ و بیجان لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی۔ مرنے والوں کا کراہنا، سسکنا اور ایڑیاں رگڑ کر جان دینا۔ درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا۔ میدان کارزار ہے اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں۔ اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص جس کا مردانہ چہرہ ضعف جاں کنی سے زرد ہو گیا ہے زمین پر نگوں پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ مگر شمشیر آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لے کر دہان زخم پر رکھ دیا تاکہ خون رک جائے اور بولا "اے جوانمرد تو کون ہے؟" جوانمرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجہ میں بولا "کیا تو نہیں جانتا میں کون ہوں کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لخت جگر ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ زرد چہرہ خشمگیں ہو گیا۔ اور شمشیر آبدار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لیے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کر رہا ہے۔ ملائمت سے بولا "اے جوانمرد میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارہ وطن۔ غربت زدہ مسافر ہوں ادھر بھولتا بھٹکتا آ نکلا۔ براہ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر۔ یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شیریں لہجہ میں بولا "اگر تو مسافر ہے تو آ۔ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین

سکتا۔ افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے بابا، دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں۔ مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا خون نکلنے دے اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہوں۔ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا، اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔''

جوانمرد کی آواز مدھم ہوگئی۔ اعضا ڈھیلے ہو گئے خون اس کثرت سے بہا کہ اب خود بخود بند ہو گیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخر کار سارا جسم بیدم ہو گیا قلب کی حرکت بند ہوگئی اور آنکھیں مند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہو گیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا ''بھارت ماتا کی جے'' اور اس کے سینے سے آخری قطرہ خون نکل پڑا۔ ایک سچے محب وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔ دلفگار اس نظارہ سے بیحد متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا بیشک دنیا میں اس قطرہ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہوسکتی۔ اس نے فوراً اس رشک لعل رمانی کو ہاتھ میں لے لیا اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازم وطن ہوا۔ اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالآخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم خوبی اور در صدف محبوبی کے در دولت پر جا پہنچا اور پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو کامگار لوٹا ہے اور دربار گہر بار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے فوراً اسے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ خود حسب معمول پردہ زرنگار کے پس پشت بیٹھی اور بولی۔ ''دلفگار اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا۔ لا دنیا کی سب سے بیش بہا چیز کہاں ہے؟'' دلفگار نے پنجۂ حنائی کا بوسہ لے کر وہ قطرۂ خون اس پر رکھ دیا اور اس کی مشرح کیفیت، پرجوش لہجے میں کہہ سنائی، وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکا یک وہ پردہ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا۔ جس کی ایک ایک نازنین رشک زلیخا تھی۔ دلفریب صد شان رعنائی مسند زرین کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا، اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا کہ دلفریب مسند سے اٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہوگئی، رقاصان دلنواز نے شادیانے گانے شروع کئے۔ حاشیہ نشینان دربار نے دلفگار کو نذریں گزرانیں اور ماہ و خورشید کو بہ عزت تمام مسند پر بٹھا دیا۔ جب نغمۂ دل پسند بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہوگئی اور دست بستہ ہو کر دلفگار سے بولی ''اے عاشق جانثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہدف ہوئیں اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کامیاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا ہے اور میں تیری کنیز ناچیز۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آب زر سے لکھا ہوا تھا:

''وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔''

O

حوالہ:

ا۔ یہ افسانہ پہلی بار ''سوز وطن'' مطبوعہ: جون 1908ء میں سامنے آیا۔ یہ مجموعہ ''نواب رائے'' کے قلمی نام سے شائع کیا گیا تھا۔

گناہ کا خوف

محمد علی ردولوی

محمد علی ردولوی کے اولین افسانوں میں سے ایک، مشمولہ: ''گناہ کا خوف''، لکھنؤ تحریر: لگ بھگ 1909ء

عبدالمغنی صاحب۔ مختاری کے پیشے میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ ڈپلوما والے وکیل بیرسٹر کیا کریں گے۔ بڑے بڑے زمیندار، تعلقدار، مہاجن خوشامدیں کرتے تھے۔ کمشنری بھر میں کون ابتدائی مقدمہ ایسا ہوتا تھا جس میں عبدالمغنی صاحب دو فریق میں سے ایک کے مددگار نہ ہوں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی مسل دیکھ کر چوٹی کے وکلا دنگ رہ جاتے تھے اکثروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر اس شخص نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا ہوتا تو یہ ہائی کورٹ کے بہترین ایڈوکیٹس میں سے ہوتا۔

عبدالمغنی صاحب نے بلا کا دماغ پایا تھا۔ پر نہیں کٹے تھے۔ صوبہ بھر میں کہیں کا مقدمہ ہو اور کیسے ہی پیچیدہ معاملات ہوں، اگر فریق مقدمہ ان تک پہنچ گیا تو سب مشکلیں حل ہو گئیں۔ زبان میں نہ معلوم کیا جادو تھا اور نہ معلوم کیسے انجھر یاد تھے کہ آدمی کو رام کر لینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جہاں صلح کا موقعہ ہوا، دوسرے فریق کے دل میں جگہ کر کے صلح کرا دی۔ جہاں لڑائی کا موقع ہوا، مخالف فریق کے بہترین آدمی توڑ لئے۔ کوئی دوسرا ہزار دو ہزار میں کام نکالے، یہ سو دو سو میں کامیاب ہو جائیں۔

وکیل نہ ہونے کا خود ان کو کبھی افسوس کرتے نہیں سنا، اور افسوس کرنے کا موقعہ ہی کہاں تھا۔ کام اتنا تھا کہ فضول خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقعہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وکیلوں کے یہاں ایک محرر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہی بڑا ہوا جس کے یہاں دو ہوئے۔ ہائی کورٹ کے اونچے اونچے وکلاء کے ساتھ دو تین جونیئر لگے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں بیس آدمی کام کرنے والے تھے اور پھر نہ جونیئر کا سوال نہ سینئر کا۔ خالی ہر شخص کی فطری قابلیت دیکھ کر کام سپرد کیا جاتا تھا۔ جو اپنا کام سمجھ کر کرتا تھا ان کے جلسے میں مقدمہ کے ہر پہلو کے اسپیشلسٹ موجود تھے۔ حسب حیثیت با موقع اعتبار والے دیدار و چشم دید گواہ مہیا ہو سکتے تھے۔ ان کے جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سو پچاس برس کا سادہ کرم خوردہ کاغذ نکال دیں۔ دھواں دے کر نئے کاغذ کو پرانا بنا دیں۔ تین دن کے اندر حاشیہ کو دیمک سے چٹوا دیں، متن ویسے کا ویسا ہی رہے۔

دستاویزوں میں سے الفاظ غائب کر دیں اور عبارتیں اس طرح داخل کر دیں کہ بڑے سے بڑا تحریر شناس دھوکا کھا جائے۔ ان کے

ملنے والوں میں ایک منشی صاحب تھے جو بائیں ہاتھ سے اور پاؤں سے بھی لکھ لیتے تھے اور نشان خط بدل دیتے تھے ہفت قلم تھے۔ اس معنی میں نہیں کہ نسخ نستعلیق شکست وغیرہ وغیرہ لکھ لیتے تھے بلکہ اس رو سے کہ مختلف لوگوں کے انداز خط کی ایسی نقل اتارتے تھے کہ خود لکھنے والا اگر کچھ دن بعد دیکھے تو نہ جانے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اکثر ضرورت ہو تو مسل گُما دیں ریل پر سے، کچہری کے احاطے سے، گھر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو۔ بستے سے ضروری کاغذ غائب ہو جائے، باقی ویسے ہی رکھے رہیں۔ بالکل اسی طرح کا بستہ رکھ دیا گیا اور گواہ گھر سے کا جل کا چور اصلی بستہ لے گیا۔ اپنے یہاں کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص کی خود تعریف کرتے تھے کہ انہوں نے وہ جرأت کی اور صفائی کا وہ کمال دکھایا کہ دوسرا ہوتا تو پاؤں کانپ جاتے اور دھر لیا جاتا۔ اک بہت بوڑھے فریق مخالف، عبا قبا پہنے، جاڑوں کے دن، بغل میں بستہ دبائے اپنے وکیل کے پیچھے کھڑے بحث سن رہے تھے ان کی بغل سے بستہ نکل گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لگے رہتے تھے جو لڑائی بھڑائی میں بھی بند نہ تھے مگر یہ سب دوسروں کے لیے کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مقدمہ بازی میں اور عشق بازی میں سب کچھ جائز تھا مگر خود اپنے لئے عبدالمغنی صاحب ان تمام باتوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ مقدمات معاملات کی اور بات ہے۔ مثلاً بیان ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان زمیندار تھا جو بالغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی پر مقدمہ چلانے والا تھا، سب سامان لیس تھا۔ صرف دعویٰ داخل کرنا تھا۔ اسٹامپ خرید لیا گیا تھا۔ میعاد میں صرف تین دن باقی تھے اگر وہ دعویٰ ہو جاتا، بڑے بھائی کا دیوالیہ نکل جاتا اور یہ بھی زیر بار ہو جاتا۔ بڑا بھائی ان کے پاس آیا۔ عبدالمغنی نے شکار کے بہانے سے اس لونڈے کو پھانسا اور تین دن کے بجائے چار دن کے لیے اس کو نہ جانے کہاں الوپ کر دیا۔ کسی کو خبر تک نہ لگی۔ میعاد نکل جانے کے بعد چھوڑ دیا اور کچھ ایسی چالیں چلے کہ وہ لونڈا جس بے جا کا دعویٰ کرتا کیسا ان واقعات کا ذکر کرتے ڈرتا تھا۔ یوں بلاوجہ کسی کو کبھی نہیں ستایا۔ نہ اپنے ذاتی معاملات میں ان کو کسی کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا۔ محلّہ میں ہر شخص سے یکا نگی کا برتاؤ تھا اور کون ایسا تھا جس کی خدمت انہوں نے نہ کی ہو، اپنی بات کے دھنی تھے اور ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ جس بات پر قائم ہو گئے پھر اس سے نہیں ہٹتے تھے چاہے کچھ ہو جائے۔

ایک مرتبہ طاعون آیا۔ بیماروں کی خبر گیری، غریبوں کی تیمارداری، میتوں کا دفن کروانا، سب اپنے ذمے لے لیا۔ طاعون کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں مگر یہ ہر جگہ چل پڑتے تھے۔ نہ معلوم کتنے مردے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارے، لوگوں نے کہا انجکشن لے لو مگر انہوں نے پروا بھی نہ کی۔ ان کے مرشد نے ایک تعویذ بھیجا تھا، وہ تو ضرور کرتے کے نیچے گلے میں ڈال لیا تھا۔ اور سورۃ تغابن کی مزاولت رکھتے تھے اور بس طاعون کی بلا ختم ہونے کے بعد عبدالمغنی کا اثر اور گرد اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ اوّل تو ایسے آڑے وقت میں لوگوں کے کام آئے تھے۔ دوسرے رفتہ رفتہ کچھ جائیداد بھی پیدا کر لی تھی، بہت سی دکانیں بنوالی تھیں، جن میں کرایہ دار بساتے وقت کرایہ کا خیال اس قدر نہیں کیا جاتا تھا جتنا اثر بڑھانے کا اور لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کا، چنانچہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے الیکشن میں ان کا کینڈیڈیٹ اور ان کی پارٹی ہمیشہ جیتتی تھی۔ انہیں وجوہ سے اگر مختار صاحب سے کوئی بات کہہ دیں تو اس کو ٹالنا مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے مکان کے قریب ایک زمین تھی جو ایک شخص نے مول لی تھی۔ عبدالمغنی اس کے خواہش مند تھے۔ یہ اراضی ان کے بھی موقع کی تھی اور اس کے بھی مگر اُن کے رعب کی وجہ سے وہ انکار نہ کر سکا۔ اسی زمین پر انہوں نے ایک مختصر سا مکان بنوایا تھا جو ابھی ابھی تیار ہوا تھا، اور خیال تھا کہ مہمانوں کے لئے وقف رہے گا۔ نماز روزے کے بڑے پابند تھے مگر اسی کیساتھ ہی زاہد خشک بھی نہ تھے۔ دوست احباب کے ساتھ چوک بھی چلے جاتے تھے۔ خود ان کے گھر پر بھی

اس طرح کی صحبتیں آراستہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے کمرہ میں کونے میں بایال اور تان پورہ بھی رکھا رہتا تھا مگر یہ سب دوسروں کی خاطر اور آشنا پرستی میں گوارا کرتے تھے۔ خود ہمیشہ بے لوث رہتے تھے، حسن پرستی تک کو جائز جانتے تھے۔ مگر تر دامنی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ریاست پور میں کسی زمانہ میں مختار تھے اس سلسلہ کو منقطع ہوئے برسوں گزر گئے تھے لیکن ان کے نام کا مختار نامہ آج تک پڑا تھا۔ رئیس صاحب کی جائیداد چوتھائی نہیں رہ گئی تھی کچھ اسی وجہ سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے رئیس صاحب کو مشورہ دیا کہ مختار نامہ صاحبزادے کے نام ہو جائے۔ یہ سب کچھ تھا، مگر آج تک رئیس کو اپنا آقا ہی سمجھتے تھے، اور جو کام ہوتا تھا اپنا سمجھ کر کرتے تھے۔ رئیس صاحب کے بیٹے اور یہ قریب قریب ہم سن تھے۔ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کرتا ہوں، عبدالمغنی صاحب چالیس اکتالیس برس کے رہے ہوں گے اور شہامت علی رئیس صاحب کے بیٹے کا سن 35 برس کے قریب رہا ہوگا۔ آدمی ذرا شوقین مزاج تھے، مقدمات کی پیروی میں بہت آیا کرتے تھے:

فکر بازاری بھی، ہر وقت ہی درباری بھی
اک مصیبت ہے جوانی بھی زمینداری بھی

اور چونکہ عبدالمغنی صاحب کی وجہ سے کھانے اور قیام کی جگہ سے بے فکر تھے، اس لئے شوق بھی آزادی سے پورا ہوتا تھا۔ عبدالمغنی صاحب کے گھر میں ان کا کمرہ علیحدہ تھا جو سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ اس لئے اگر رات کو انہوں نے کسی کو بلایا بھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ عبدالمغنی صاحب سے کوئی تکلف نہ تھا۔ خود ان کا دل چاہا یا شہامت علی کی خاطر سے منٹ دو منٹ کو چلے بھی آئے اور یہ دیکھ کر کہ خاصدان میں پان اور لوٹا، گلاس پانی کا، گھڑا سب موجود ہے چلے گئے۔

شہامت علی جب مقدمہ کے سلسلہ میں آتے تھے تو عموماً دو تین دن رہتے تھے اور جب شہر کے قیام کوئی عذر معقول نہ رہ جاتا تھا تو چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ خلاف عادت کئی دن رہے چہرے کی کچھ پریشانی، کچھ فکر مندی سے عبدالمغنی کو پتہ چلا، پوچھنے لگے خیر تو ہے۔

شہامت علی: ''یار کیا کہیں، یہ سامنے درزی کی دکان نہیں ہے اس کوٹھے پر ایک رنڈی آئی ہوئی ہے۔ کہیں باہر کی ہے۔ میں نے اب کی ہی دورے میں دیکھا ہے۔ بھئی ہم تو کھیت رہے مگر وہ ظالم کسی طرح رنگ پر آتی ہی نہیں۔ کچھ ہم نے بھی حماقت کی کہ اپنے دل کا راز اس پر ظاہر کر دیا۔ اس کے بعد اب تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ گھسن خان کو درمیان میں ڈالا مگر وہ پابندی کا عذر کرتی ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ خواب وخور حرام ہے۔ رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور جو جو ہم کوشش کرتے ہیں وہ اور کھنچی جاتی ہے۔''

عبدالمغنی: ''ان اونچی رنڈیوں میں یہی تو خرابی ہوتی ہے کہ یوں خاطر مدارات میں لگاوٹ، سب کچھ کریں گی مگر معاملے کی بات پر عجیب مزاج کی لینے لگتی ہیں۔ اور اگر کہیں جھوٹ موٹ کی نتھ پہنے ہوئیں تو آشنائی نہ ہوئی قلعہ ہی فتح کرنا سمجھئے۔ چھوٹتے ہی بی نائکہ صاحب کہتی ہیں۔ نا صاحب، ابھی مری بچی کم سن ہے کچھ دن آیئے جایئے، اٹھئے بیٹھئے، لڑکی سے مانوس ہو جایئے، آپ اس کی طبیعت پہچان لیں وہ آپ کے مزاج سے واقف ہو جائے پھر لونڈی کو عذر ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اگر پیشے میں آ چکی ہے تو نوکری کا سوال پہلے ہی دھرا ہے، مستقل تعلق کیجئے، پابند کیجئے، اور خود بھی پابند ہو جئے۔ پھر سب سے بڑی

خرابی یہ ہے کہ ادھر تعلق ہوا نہیں، ادھر عیاشی کے گزٹ میں نام چھپا نہیں۔ اگر بڑے بڑے لوگوں کے نام سے یا اپنے کو نہ منسوب کریں تو اعلیٰ طبقے والی کہلائیں کیوں کر؟ اگر چوری چھپے تعلق کیجیے تو اس میں بھی جب تک مہینوں حاضری نہ دیجیے اور ایک کی جگہ چار خرچ نہ کیجیے کام نہیں چلتا۔ تمہارے معاملے میں اتنا غنیمت ہے کہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ باہر والے کی رسائی، چوری چھپے کبھی کبھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں دام بھلے چنگے ہاتھ آ جاتے ہیں اور عام طور سے کمانے کا نام بھی نہیں ہوتا۔ خیر چلو ذرا ہم بھی دیکھیں۔ اسی طرف سے نیا مکان بھی دیکھتے آئیں گے۔ آج کئی دن سے نہیں گئے۔ تخت، پلنگ، کرسیاں وغیرہ تو پہنچ گئی ہیں ذرا دیکھنا ہے کہ کس طرح سے سجایا جائے اس طرف سے کھڑے کھڑے وہاں بھی چلنا مکان کی آرائش وغیرہ میں تمہارے سلیقے کے ہم ہمیشہ سے قائل ہیں۔"

اس رنڈی کے یہاں پہنچ کر میاں عبدالمغنی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہ کہا، مگر شہامت علی کا ایسا ادب ولحاظ کیا گویا یہ ان کے ادنیٰ ملازم ہیں۔ ایک ایک گلوری نوش کی اور رئیس صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اٹھ آئے۔ لیجیے صاحب وہاں رنگ ہی بدل گیا ادھر یہ لوگ رخصت ہوئے اور اُدھر نائکہ نے استاد گھسن خاں کو بلایا کچھ سرگوشیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ رو براہ ہوگیا۔ پیغام بھیجا کہ لونڈی کو حکم میں کبھی عذر تھا، نہ ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے، دن کو جب چاہے گھڑی دو گھڑی کے لیے طلب کر لیجیے۔

اب دقت یہ آن پڑی کہ رات کے لیے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر دن کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔ عبدالمغنی کے اعزا، نوکر چاکر، لڑکے سب ہی موجود تھے۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ وہی نوتعمیر مکان تخلیہ کے لئے کام میں لایا جائے۔

عبدالمغنی کچہری جا چکے تھے۔ چنانچہ شہامت علی نے ایک لڑکے کو دوڑایا کہ عبدالمغنی سے اس مکان کی کنجی مانگ لائے، یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کنجی تو انہوں نے بھجوا دی اور خود تھوڑی دیر میں آنے کو کہا۔ کلید مراد ہاتھ آ گئی، اب عبدالمغنی کو کون یاد کرتا ہے۔ انہوں نے نوکر کو تو اس رنڈی کے یہاں بھیجا اور خود کنجی جیب میں لے کر اس نئے مکان کی طرف چلے۔ سب سے پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آ رہا ہے۔ اس کے بعد پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نواڑ کی پلنگڑیاں متعدد بچھی ہوئی تھیں۔ ادنھ، تکیہ بچھونا نہیں ہے نہ سہی، لوٹا بھی نہیں ہے۔ مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں۔ یار کچھ پان منگوانے چاہئیں۔ نوکر جب آئے گا تو وہی لے آئے گا۔ شہامت علی صاحب کی بے تابی بیان کر کے اپنے پڑھنے والوں پر ناتجربہ کاری کا اتہام لگانا نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر کچھ انتظار کے بعد معشوقۂ محبوبہ تشریف لائیں۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے استقبال کیا۔ نوکر کو گلوریاں، برف، لیمنیڈ لینے کو بھیجا اور پاس تو بٹھا لیا مگر نوکر کی واپسی کے انتظار میں دست ہوس اور زیادہ نہ بڑھایا۔ ہاں جو باتیں اظہار شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں در ہی سے لڑی رہی۔ اتنے میں نوکر بھی آ گیا اور اس کے ساتھ میاں عبدالمغنی بھی آ دھمکے۔ ان کو دیکھ کر شہامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت، خلوص اور شکر گزاری کا اشتہار لگ گیا، مگر عبدالمغنی صاحب کے چہرے پر خلاف بعید اور سنجیدگی متانت بلکہ اس سے بھی بالاتر وہ کیفیت ظاہر تھی جو اس وقت ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی مروت کو توڑ کر کسی دوست کے خلاف دوٹوک فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہامت علی کا دل دھک سے ہوگیا۔ رنڈی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی مگر عبدالمغنی نہ بیٹھے۔ ایک دو سیکنڈ چپ کھڑے رہے، اس کے بعد کہنے لگے: "یار سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہماری چیز، جان مال، دوستوں کے لئے وقف ہے مگر ابھی مکان میں یہ کام نہیں ہوسکتا۔ ابھی اس گھر میں میلاد شریف نہیں ہوا ہے۔

نینی تال

علی محمود

علی محمود کا تحریر کردہ تیسرا افسانہ، مطبوعہ: ''ادیب'' الہ آباد، جولائی 1910ء

پیارے ودود!

قیامِ نینی تال اب اس قدر مختصر رہ گیا ہے کہ شاید یہاں سے یہ آخری خط ہے۔ تمہارے یہاں آنے کی مجھ کو حسرت رہ گئی۔ عجب جانفزا و نزہت افزا مقام ہے۔ تم دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور دل پر ایک کیفیت لے کر جاتے۔ بہر حال جب کبھی بھی آؤ گے تو یہاں کے مناظر زیبا تم کو مست و مخمور کر دینگے۔ نیلا آسمان، ہوائے جان پرور کے سرد جھونکے، برگہائے نوخیز کی ٹھنڈی و فرح ناک سبزی، پھولوں کی نازک و رنگین پتیاں، سایہ دار کنجوں کی تخیل پرور تنہائی، فاختہ دردمند کی دلدوز آواز، تمہیں وارفتہ و مدہوش کر دیگی! چونکہ فضا عموماً گرد سے صاف رہتی ہے، اس لئے چاندنی اتنی اُجلی، موثر و توبہ شکن ہوتی ہے، کہ تم دیوانہ وار گھر سے باہر نکل پڑو گے۔ نظر اُٹھا اُٹھا کر کبھی تاروں کو دیکھو گے، کبھی ماہ تاباں کو، کبھی بیٹھ جاؤ گے، کبھی کھڑے رہ جاؤ گے، یہاں تک کہ اِس طرح ساری رات آنکھوں میں کٹ جائے گی۔

نسیم سحری طلوع آفتاب سے بہت پہلے تمہاری خوابگاہ میں آ کر تمہیں جگائے گی، کہ آس پاس کے درخت کی چڑیاں نغمہ سنجیاں کر رہی ہیں، شبنم آلود گھاس پر موتیوں کا انبار پڑا ہے، اُفق مشرق میں دولتِ ضیالٹ رہی ہے، گلہائے نازک و رنگین بے پردہ کھڑے ہیں اور تم سو رہے ہو؟ یہاں تک کہ ہوائے شوق تمہیں دور دور لے جائے گی، ناہموار بلندیوں پر چڑھا کر دامن صحرا کا لطف دکھلائے گی۔ کمرِ کوہ پر پرخم اور پرپیچ راستے بتائیگی۔ صاف، و سرد پانی کے جھرنے دیکھو گے، جگہ جگہ پر چھوٹی چھوٹی کھیتیاں نظر آئینگی، چڑیوں کی میٹھی اور رسیلی آواز سنو گے، یہاں وہاں گلہائے خوشرنگ تمہیں آگے بڑھنے سے روکیں گے ان کو دیکھو گے۔ مسرت سے مسکراؤ گے، اُن کی نزاکت مانع ہوگی، مگر تم سے صبر نہ ہو سکے گا، تم انہیں توڑو گے، سونگھو گے اور بدمست ہو کر بیٹھے رہو گے۔

دوپہر اور جگہوں کی طرح یہاں کی بھی کسی قدر افسردہ اور سنسان معلوم ہوگی، مگر یہاں اس وقت بھی ایک عالم ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کا دلدادہ کسی بلند، سایہ دار اور ٹھنڈے کنج میں نرم گھاسوں پر پڑا ہوا ہے اور تخیل کی باگ چھوڑ دی ہے کسی پاس کے پتھر سے پانی کے رسنے اور

گرنے کی نرم آواز کانوں میں پڑ رہی ہے اور ہوائے خوشگوار کے خواب آور جھونکے اُس کے سر کے بالوں کو الجھا رہے ہیں کہ دفعتاً کسانوں اور گلہ بانوں کی تندرست لڑکیوں کی بشاشت آمیز صدا کانوں میں پڑتی ہے، وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور دیر تک محو نظارہ رہتا ہے، اس لئے کہ وہ عموماً خوش گلو، موزوں اندام اور نظر فریب ہوتی ہیں، اور گو ان کا لباس بد قطع ہے، مگر اُن کا تناسب اعضا اہل نظر کے لئے صبر آزما ہوتا ہے! وہ عموماً بکریاں چراتی ہوتی ہیں، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کپڑے سیتی ہیں، بے باکانہ اُچکتی ہیں، کودتی ہیں، اور پھر غائب ہو جاتی ہیں۔

پہاڑیوں کی بولیاں تمہاری سمجھ میں تُس آئیں گی، مگر اُن کے پہاڑی گیت میں تم سادگی، گھلاوٹ اور درد پاؤ گے، جس کے اثر سے تمہارا دل بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ وہ سناٹے کے عالم میں جس وقت اونچی اور ولولہ انگیز لے سے گاتے ہیں تو اُن کی آوازیں چٹانوں سے اُچٹ اُچٹ کر دلوں سے ٹکراتی ہیں اور دیر تک ریشہ ہائے دل کانپتے رہتے ہیں۔

ان دنوں میں ہمارے پردار دوستوں کی ادائیں بھی کچھ کم دلفریب نہیں ہوتیں۔ حریص و بلانوش گدھ اونچی اور نکیلی چٹانوں پر بیٹھے ہوئے کسی جاں بلب جانور کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ بدنیت اور دھوکہ باز کوا اس طرح گردن موڑے بیٹھا ہے گویا کچھ نہیں جانتا، مگر حقیقت میں اس تاک میں ہے کہ چیل نے جو شکار کیا ہے اُسے کھسکا لے۔ گلہری اُکڑوں بیٹھی ہوئی اخروٹ کے چھلکے کتر رہی ہے۔ پہاڑی مینا کسی شاخ پر بیٹھی زبانہائے مختلفہ کی مشق کر رہی ہے اور ادھر چند نفاست پسند طیور ٹھنڈے پانی میں غسل کر رہے ہیں۔

انہیں تماشوں میں تمہیں شام ہو جائے گی اور غروب آفتاب کا عالم دیکھ کر پھر تم سر دُھننے لگو گے، کیونکہ یہ وقت بھی یہاں نہایت ہی نشاط انگیز ہوتا ہے۔ ادھر آفتاب سرکوہ کی طرف جھکا اور اُفق مغرب میں آگ لگی! الہکتی ہوئی سنہری کرنوں سے تمام جنگل گلزار و روشن ہو گیا، تیتریاں اڑنے لگیں، ہوائے سرد کے جھونکے چلنے لگے، بلند نشیں و تنہائی پسند طیور آشیانوں کے قریب آ بیٹھے۔ شفق پھولنی شروع ہوئی، ابابیلیں اڑنے لگیں اور آفتاب غروب ہو گیا! اب گھاس نم ہونے لگی، پھول سرنگوں ہو گئے، تاریکی پھیلنے لگی، چڑیاں چپ ہو گئیں اور چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا ہو گیا! گہرے گہرے غار تاریک ہو گئے اور ویران بلندیوں پر ہولناک سکوت چھا گیا۔

یہ نہ سمجھنا کہ فرصت ہو گئی۔ ابھی سر پر تاروں بھری رات بے چین کرنے کو کھڑی ہے۔ مدّت کے جذبات خفتہ جاگ اٹھیں گے، حسرت دامنگیر ہو جائے گی، ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کا ہجوم ہو جائے گا اور خدا جانے تمہارا دل کیا کیا چاہنے لگے گا۔

مگر تم کہو گے کہ ابھی تک مجھ کو شہر نہیں دکھایا۔ میں نے اس لئے نہیں دکھایا کہ وہاں کچھ دیکھنے کے لائق نہیں۔ بازاروں کے مکانات عموماً پست، تاریک و بے فضا ہیں جن میں کم مایہ اور ملازم پیشہ لوگ گرمیوں بھر خانہ گیر رہتے ہیں۔ تم اکثر کسی ضرورت سے ان مکانات میں جاؤ گے تو کئی بار تمہارے سر میں چوٹ لگے گی، اکثر سیڑھیوں پر سے پیر پھسلیں گے اور تھوڑی دیر کہیں بیٹھنے نہیں پاؤ گے کہ دھوئیں سے گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہو گے۔ وجہ یہ ہے کہ جگہ کی قلت کے سبب باورچی خانہ قریب ہے اور نہ صرف باورچی خانہ...... باورچی خانہ، نعمت خانہ، غسل خانہ، صحت خانہ، سب ایک جگہ پر ہے اور اس روش کے مکانات اس قدر کثیف اور گھنونے ہیں کہ دیکھ کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر غربت و افلاس نے صفائی و نفاست پسندی کے احساس کو اتنا کند کر دیا ہے کہ اس طرح کا بھی کوئی مکان خالی نہیں۔ البتہ انگریزوں کی کوٹھیاں اور بامذاق اہل وطن کے بنگلے، جو بازاروں سے دور اور ایک دوسرے سے الگ الگ بلندیوں پر واقع ہیں، وہ حقیقت میں عیش و راحت کے ایوان ہیں، جن میں ہر وقت ایک کیفیت رہتی ہے۔ رات کے وقت ان مکانات کی روشنیوں سے پہاڑوں پر چراغاں ہو جاتا ہے۔ کسی بنگلے سے پیانو کی آواز آ رہی ہے، کہیں بادہ پرست انگریزوں کے گلاس اور بوتل ٹکرا رہے ہیں۔ روشن و آراستہ کمروں میں بتانِ فرنگ محو آرائش و سرگرم ناز ہیں۔ ایک طرف

افسران اعلیٰ اور جلیل القدر حکام، سگار کشی و اخبار بینی میں مصروف ہیں، دوسری طرف سائبانوں میں فراغت پسند دولت مند انگریز آرام کرسیوں پر لیٹے ہوئے قہقہے لگا رہے ہیں۔ انہیں بنگلوں کے قریب اور پہاڑوں کی گود میں وہ بڑا اور خوشنما تالاب یا ''تال'' ہے، جس میں رات کے وقت تارے نہاتے اور ماہتاب منہ دیکھتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک سڑک گھوم گئی ہے، جس پر سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ جن میں ارباب محبت شکایت ہائے رنگین کے لئے آ بیٹھتے ہیں۔ شام کے وقت سطح آب پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں دوڑتی پھرتی ہیں اور اُن میں بادشاہان ملاحت تفریح و تعشق کا وقت گزارتے ہیں۔

آج تم تمام دن مناظر پرستی میں مصروف رہے، کل کچھ احباب تمہیں محفل رقص و سرود میں شریک کرینگے۔ مگر یہاں تمہیں گانے کا کچھ بہت زیادہ لطف نہیں آئے گا۔ کیونکہ زبان و لہجہ کی ناقص واقفیت کے سبب اکثر ہمارے گیت اور غزلوں کا خون ہو جاتا ہے۔ گو انہیں بعض مستثنیات بھی ہیں، خیر گانا نہ سہی، مگر تم دیکھو گے کہ اہل محفل میں سے ارباب ذوق و اہل نظر محو نظارہ ہو گئے۔ اس لئے کہ کسی کی نگاہ غلط انداز دل میں اُتر گئی اور کسی کا قدِ رعنا آنکھوں میں کھُب گیا۔

فغان کین لولیان شوخ و شیرین کار و شہر آشوب
چنان بروند صبر از دل کہ ترکان خوان یغمارا



بہرا شہزادہ

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی کے ابتدائی افسانوں میں سے ایک، مطبوعہ: ''ہمایوں'' لاہور، جنوری 1913ء

بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں مہاراجہ بھاؤنگر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ برسات کا موسم تھا۔ سمندر میں صبح شام طوفان برپا رہتا تھا اور پانی کی آوازوں سے مسافروں کو قریب کی بات سننی بھی دشوار تھی۔

تاج محل ہوٹل میں ایک خانساماں ستراسی برس کی عمر کا نوکر تھا، جو اپنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار مانا جاتا تھا۔ اس خانساماں کا نام قسمت بیگ تھا۔ ایک دن صبح کے وقت مہاراجہ بھاؤنگر نے پلنگ پر لیٹے لیٹے قسمت بیگ سے کہا ''میں نے چند مہمانوں کو لنچ پر بلایا ہے۔ منیجر سے کہہ دینا کہ دس مہمانوں کا انتظام کر دے'' سمندر کے پانی کا غل شور مہاراجہ بھاؤنگر کی دھیمی آواز اور بہرہ خانساماں یہ حکم کیونکر اس کے کانوں تک پہنچتا مگر قسمت بیگ کی تمیزداری کا یہ عالم تھا کہ ہونٹوں کی حرکت سے مطلب سمجھ لیتا تھا آج ایسے اسباب جمع ہوئے کہ قسمت بیگ مہاراجہ کے حکم کو نہ سمجھا۔ اور اس نے ذرا پلنگ کے قریب آ کر نہایت تہذیب اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سوال کیا کہ ''جو ارشاد ہوا ہے اس کی تعمیل ہو جائے گی لیکن اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑی سی تفصیل اور فرمائی جائے۔'' مہاراجہ بھاؤنگر بالکل نہیں سمجھے کہ خانساماں نے ان کی بات نہیں سنی تھی اور انہوں نے خانساماں سے دوبارہ کہا کہ جن دس آدمیوں کو بلایا ہے وہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔ لنچ کا اہتمام اعلیٰ قسم کا ہونا چاہیے۔ قسمت بیگ نے بات سمجھ لی اور ادب سے کہا ''جو حکم۔ فرمان کی پوری تعمیل کی جائے گی'' اور یہ کہہ کر بڑی تمیزداری کے ساتھ پچھلے قدم چل کر سامنے سے ہٹ گیا۔

مہاراجہ بھاؤنگر دیر تک سوچتے رہے کہ انگریزی ہوٹلوں میں سب خانساماں انگریزی ادب آداب استعمال کرتے ہیں۔ یہ بڈھا کون ہے۔ جو پرانے زمانے کے مشرقی ادب آداب کو استعمال کرتا ہے اس کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ انہوں نے خدمت گار کو بلا کر حکم دیا کہ ''آج لنچ کے بعد ملاقات کے کمرے میں قسمت بیگ خانساماں کو بلایا جائے۔ ہم اس سے کچھ باتیں کرنی چاہتے ہیں۔'' خدمتگار نے کہا ''حضور! وہ بہت بدمزاج آدمی ہے۔ نوکری کے وقت تو بہت اچھا ہے لیکن دوسرے وقت میں وہ بہت بدمزاج ہو جاتا ہے۔'' مہاراج نے کہا ''ایسا کیوں ہے؟'' خدمت گار نے جواب دیا ''حضور! وہ کہتا ہے کہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں۔ صاحب لوگ کہتے ہیں کہ اس کے دماغ میں کچھ خرابی ہے۔'' یہ سن

کرمہاراج مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر خدمت گار سے کہا'' کچھ پرواہ نہیں۔ قسمت بیگ سے کہہ دو کہ وہ لنچ کے بعد ہمارے پاس آئے۔''

مہاراجہ بھاؤنگر اور چند عمائد بمبئی دو پہر کا کھانا کھا کر باتوں کے کمرے میں آئے۔ تو مہاراج نے قسمت بیگ کو بلایا۔ قسمت بیگ نہایت ادب سے حاضر ہوا۔ اور تین فرشی سلام کئے۔ مہاراج نے کہا'' قسمت بیگ تم کون ہو؟'' قسمت بیگ نے کہا'' حضور گستاخی معاف۔ اس کا جواب تو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم سب کون ہیں اور کیوں اس دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں۔''

قسمت بیگ کی یہ عجیب تقریر سن کر حاضرین مبہوت رہ گئے، کہ خانساماں کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہا ہے۔ مہاراج نے کہا'' بے شک ہم کو اس کا جواب معلوم نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی کی ان مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔''

قسمت بیگ نے کہا'' حضور میں ایک آدمی ہوں۔ نسل کے لحاظ سے تیموری مغل ہوں۔ پیشہ کے لحاظ سے تاج محل ہوٹل کا خانساماں ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بڈھا۔ طبیعت کے اعتبار سے کبھی بچہ اور کبھی جوان۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ خدمت خلق کو اپنا مقصد زندگی مانتا ہوں۔ گدا ہوں لیکن دل کے تخت پر شہنشاہ ہوں۔'' قسمت بیگ کی موثر، مسلسل اور برجستہ تقریر سن کر بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا '' کیا تم تیموری شہزادے ہو؟'' قسمت بیگ کو جوش آ گیا اور اس نے کہا'' شاہ زادہ نہیں ہوں۔ آہ زادہ ہوں، تیموری خاندان تو اب مٹ چکا جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی۔ آپ نہیں تو آپ کے باپ دادا تو اس کے غلام تھے۔''

یہ فقرہ سن کر مہاراج نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر کے بعد قسمت بیگ نے کہا'' حضور! میں ان لوگوں میں نہیں ہوں۔ جو ماضی پر فخر کریں یا افسوس کریں میں ماضی کا مالک ہوں، حال کا مالک ہوں، اور مستقبل کا بھی مالک ہوں۔ یہ آسمان بھی میرا ہے یہ زمین بھی میری ہے۔ یہ سمندر بھی میرا ہے۔ اور آپ سب لوگ بھی میرے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے قسمت بیگ نے اچھلنا شروع کیا۔ اچھلتا جاتا تھا، اور کہتا جاتا تھا۔'' میں ہوں۔ میں ہوں۔ جو کچھ ہے جو کچھ تھا۔ کچھ ہو کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔ میں۔''

اس کے بعد قسمت بیگ نے کہا۔'' اب سنئے مجھ لاچار خانساماں کی کہانی سنئے۔''

'' بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میری ماں لونڈی تھی، اور بادشاہ کی معتوب۔ غدر 1857ء کے انقلاب میں میری عمر دس سال کی تھی۔ گھبراہٹ میں بادشاہ کو میرا اور میری ماں کا شاید خیال بھی نہ آیا ہو گا، کیونکہ میری ماں لال قلعہ کے باہر ایک مکان میں رہتی تھیں۔ جب دہلی کے باشندے بھاگے تو میری ماں نے مجھ کو اپنے ساتھ لیا اور پیدل گھر سے روانہ ہوئیں۔ دہلی سے نکل کر ہم دونوں قدم شریف کی درگاہ میں گئے اور رات بھر ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ صبح ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے میری ماں کو گرفتار کر کے ایک انگریز افسر کے سامنے پیش کیا۔ جس نے تمام حالات سن کر حکم دیا کہ ان دونوں کو آرام سے رکھا جائے۔ چنانچہ ہم کو ایک چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا۔ اور دو وقت کھانا ہم کو مل جاتا تھا۔

امن ہوا، تو میری والدہ کے نام دس روپے ماہوار گزارہ کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔ میں نے دہلی ہی میں ایک خانساماں کی شاگردی کر لی اور جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا تو میں دہلی سے بمبئی چلا آیا، اور اب مدت سے تاج محل ہوٹل میں ہوں۔''

مہاراج نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ انہوں نے اسے ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیا اور کہا۔'' آئندہ بھی ہر سال ہوٹل کے منیجر کی معرفت ہزار روپے تم کو مل جایا کریں گے۔'' قسمت بیگ نے پھر سلام کیا اور چیک لے کر رونے لگا اور پیچھے قدم ہٹ کر باہر چلا آیا۔

ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر

نیاز فتح پوری[1]

نیاز فتح پوری کا پہلا مطبوعہ افسانہ، مطبوعہ: ''نقاد'' جنوری 1913ء

سیر کرنے والی، عالم نُور کی شہزادی، ایک نور پاش اہتزاز کے ساتھ شفاف، خرامان، پیکر آتش، اک بے خبر، مصروف تماشا روشنی کی پتلی، اک تبسم تفریح، خندۂ ضیاء سے مخروج گلابی رنگ میں ڈوبی ہوئی برق متحرک، مجھ میں اپنے اشارہ مبہم سے اک انجذاب مضطر پیدا کر رہی ہے، اور میں ہوں کہ اس وقت مجہول کی طرف کھنچا جا رہا ہوں۔

روشنی کی تیز کرنیں، مجھے اِک مودب فاصلہ پر رکے ہوئے تڑپ رہی ہیں، تڑپا رہی ہیں، آہ، وہ برق پاش نگاہیں، وہ حیات سوز نظریں، میرے دل وجگر سے پار ہو کر گزر رہی ہیں۔ اور میں اُن کو سمیٹ کے، اپنی حریص آتش عشق سے ملا کے، اپنی متحیر، طامع، کشادہ آنکھوں میں اُس شعلہ معطر کی پرستش کر رہا ہوں۔

آہ، یہ نزہت بار زندگی، یہ مصفا ترکیب عناصر، یہ شاداب حسن روان، میرے وجود کو، میری روح لرزاں کو مسحور کر رہا ہے، اپنی آنکھوں کے خندۂ سیال سے، اپنے بالوں کی بوئے شگفتگی سے، اپنی شان بے خبری سے، اپنے خرام وقار سے، اپنی کان کے متبسم آویزوں سے، اپنی بلوری کلائیوں سے، اپنی گوری گردن سے۔

میری روح ٹوٹ ٹوٹ کے، پاش پاش ہو کے اپنے نقطۂ کشش سے مل رہی ہے، جس کو شعلہ نظر جلائے ڈالتا ہے، اور یہ خاک ہو ہو کے اس کے نازک قدموں کے نیچے پس پس کے فنا ہو رہی ہے۔ اے نقرئی آواز، نقرئی آواز والی دوشیزہ، اے ہر سانس کے ساتھ سینہ کو اُبھار کے دماغ سے قوت احساس چھین لینے والی تصویرِ خرامان، اے شانوں پر چھوٹی ہوئی زلفوں کے پر لگا کے اڑنے والی پری، اے کالی پتلی والی، لانبی پلکوں والی، نازک کمر والی لڑکی، ٹھہر، ٹھہر، میں بھی تیرے ساتھ تیرے سبک خرام وجود کے ساتھ، تیرے یاسمینی شباب کے ساتھ چلتا ہوں، تو چلتی چلتی گھڑی ہو کے نغمہ نہ بن، تو خود اک شعر ہے ذی حیات، موسیقی ہے خراماں، تو مجھے دیکھ کے ایسی نہ بن کہ گویا مجھے نہیں دیکھتی، میری روح بے آرزو، اک آرزوئے بے روح ہے، جس کو سوائے مٹ جانے، خاک ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا۔ اپنے وجود کا صدقۂ نزہت، اپنی ہستی

کا صدقہ نزاکت اک زخم کاری اور لگائے جا.....افوہ.....خدا کرے، تیری شگفتگی قائم رہے تو خوش رہے، تجھ کو یہ تیری سحر آگینی مبارک ر۔
مجھ ایسے، مجھ ایسی مجروح روح والے، لاکھوں، روز تیرے اس حسنِ دشوار پر قربان ہوتے رہیں۔



حوالہ:

ا۔ نیاز فتح پوری کے اپنے بیان کے مطابق یہ افسانہ نمائش الٰہ آباد سے متاثر ہو کر 1910ء میں لکھا گیا اور دو سال بعد جنوری 1913ء میں شائع ہوا۔

پُھول

مہاشہ سدرشن [1]

سدرشن کا پہلا مطبوعہ افسانہ، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور، جنوری 1914ء

میں ابھی غنچہ نا شگفتہ اور نرم و نازک سبز پتیوں کی آغوش میں مصروف استراحت تھا کہ ایک روز آسمان پر ابر تھا، بادل تھا، اور کالی کالی گھٹائیں تھیں۔ بادِ نسیم مستانہ چال سے، ناز سے، آہستہ آہستہ چلتی تھی اور مجھے تھپکیاں دے دے کر پیار سے، محبت سے اٹھانے کی کوشش کرتی تھی۔

بادل گرجا، بجلی کڑکی اور بوندا باندی ہونے لگی۔ میری آنکھوں پر پٹی اور منہ پر نقاب تھا۔ میں دیکھ نہ سکا تاہم میں نے سنا کہ باہر والے پھول بھائی خاموش ہو گئے۔ اُن کے سانس لینے کی آواز بتاتی تھی کہ وہ سہم کر ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے ہوئے کانپ رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد سناٹا ٹوٹا اور پھر وہی قہقہے اُڑنے لگے۔ میں نے سمجھا بارش بند ہو گئی یا کم از کم خطرے والی بات گزر گئی۔ جب میں ٹھنڈی ہوا کے لگنے سے سمٹتا، سکڑتا، کانپتا اور کانپ کر ہلنے لگتا میرے پھول بھائی آوازے کستے، تالیاں بجاتے، اور...... اور مجھ پر پھبتیاں اڑاتے تھے۔

ایک پھول نے کہا: ''ننھے میاں! کب تک برقع پہنے رہو گے؟ آؤ نکلو، ہنسو، کھیلو اور خوش ہو۔''

دوسرا بولا: ''یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تنہائی میں اُٹھے اور تنہائی میں سو رہے۔ باہر آؤ۔''

تیسرے کی رائے تھی۔ ''تم بے وقوف ہو، بے سمجھ ہو اور کیسی زندگی جی رہے ہو۔''

میں نے کہا: ''میں بادل سے ڈرتا ہوں۔ بجلی سے ڈرتا ہوں، مجھے ہوا کا خوف ہے، مجھے پانی کا خوف ہے، ایک پھول نے جواب دیا ''چھی چھی چھی۔ تم بہت ڈرپوک ہو۔ دیکھو تو سہی، نہ بادل ہے نہ بجلی۔''

اتنے میں کوئی پاس سے گزرا۔ وہ کون تھا، میں نہیں جانتا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ وہ شاعر تھا۔ خیر وہ میرے پاس رکا، مجھے چھوا اور گا گا کر کہنے لگا:

اے پھول تیری عمر طبعی ہے ایک دن
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یہ آواز سن کر، یہ شعر سمجھ کر میرے دل پر چوٹ لگی۔ میں ضبط نہ کر سکا، بیتاب ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں مارے، پھیلا، بڑھا، اچھلا، کودا، مگر میں نازک تھا اور نقاب سخت۔ میرے ہاتھ دکھے، پاؤں دکھے، ہزار کوشش کی، لاکھ سر ٹپکا نقاب نہ اترا، مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔

ابھی ایک ہی سیکنڈ گزرا ہو گا کہ ایک آواز ہوئی اور پھول بھائیوں نے خوشی سے، مسرت سے، جوش سے تالیاں بجائیں۔ مرحبا کے نعرے بلند ہوئے اور شاباش آفرین کی آوازوں سے آسمان ہل گیا۔

مجھے کیا خبر تھی؟ ایک پھول نے کہا: ''دیکھو تو تمہارا ایک بھائی تاریکی سے نکل کر روشنی اور راحت کی سرزمین میں قدم رکھتا ہے۔ ہم بھی خوش ہیں، وہ بھی خوش ہے۔ آؤ اُٹھو تم بھی، کرو ہمت، پھاڑو نقاب، اتارو پردہ، نکلو باہر اور سرزمین راحت میں لطف سے دن گزارو۔

پھول کی زندہ مثال۔'' سب نے مل ملا کر، ایک زور کے ساتھ، ایک جوش کے ساتھ، مجھے اُٹھایا۔ اُٹھا کر بٹھایا، بٹھا کر اُٹھایا۔

میرے بدن میں از خود طاقت آ گئی۔ میں نے زور لگایا، کوشش کی، اور ایک آواز پیدا ہوئی۔ آواز کے ساتھ ہی میرا پردہ، میرا نقاب اتر گیا اور میں نے پہلی دفعہ باہر دیکھا۔

سچی کہوں۔ دنیا دیکھ کر میں خوش ہوا۔ خصوصاً اپنے آپ کو نازک، دلفریب اور خوشرنگ پھول بھائیوں کے درمیان دیکھ کر تو میں باغ باغ ہو گیا۔ میرے باہر نکلنے پر چیرز دیئے گئے اور خوشی کے نعرے لگائے گئے۔

تمام پھول میری طرف دیکھتے تھے مگر میں اُس کی طرف دیکھتا تھا جو ابھی، دو منٹ پیشتر، مجھ سے پہلے دنیا میں غنچے سے پھول بنا تھا۔ وہ بھی بار بار میرے چہرے پر نگاہیں ڈالتا تھا۔

ہم دونوں، نئے پھولوں میں شان تھی، دلفریبی تھی اور معصومیت تھی۔ سینکڑوں نگاہیں ہمارے چہروں پر تھیں۔ کسی نے ہماری بابت ہی کہا تھا

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

دن بھی ڈھل گیا اور ان کے ساتھ ہی روشنی بھی ڈھل گئی۔ سب پھول سو گئے۔ میرا ہم عمر نیا پھول بھی سو گیا اور میں بھی سو گیا۔

رات گزر گئی اور دن چڑھا۔ ہم دونوں پھول بھائیوں، دونوں ہم عمروں نے مصافحہ کیا۔ مَیں نے اُسے دیکھا اور مسکرایا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ بات یہ تھی، رات ہی رات میں ہمارا حسن دونی ترقی کر گیا تھا۔ سفید چہرے پر ہلکا گلابی رنگ قیامت برپا کیے دیتا تھا۔

میں خوش تھا، میرے رفیق خوش تھے۔ بات بات پر قہقہے اُڑتے تھے مگر میرے دل میں، سینے میں کوئی کانٹا تھا۔ خوشی کے دریا کے راستے میں بند تھا۔ میں ہنستا تھا، مگر اوپرے، باہر سے، ظاہرداری سے۔ یہ ہنسی دل کی ہنسی نہ تھی، ہرگز نہ تھی۔

اتنے میں میرے نزدیک ایک بلبل آئی۔ اُس نے مجھے دیکھا، پھر دیکھا، پھر دیکھا، ایک بار پھر دیکھا۔ تب اُس نے پر پھیلا دیے، چونچ کھولی اور میرے نزدیک آ کر، زیادہ نزدیک آ کر اُس نے میرے نرم و نازک رخسار سے اپنا رخسار ملایا اور ایک لمحہ کے لئے بے حس و حرکت پڑی رہی۔

اُس نے میرے ہونٹ چومے، میرا ماتھا چوما۔ میری آنکھیں چومیں، اور محبت بھری نگاہوں سے میرے چہرے کو تاکنے لگی۔ مجھے چھیڑنے لگی۔ آہ! اس چھیڑ چھاڑ میں مجھے جو لطف اور مزہ آ رہا تھا، سخت سے سخت تکلیف اس قسم کے مزے کے لیے برداشت کی جا سکتی ہے۔

دھوپ سخت تھی اور میرا نرم و نازک جسم کالا ہوا جاتا تھا۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے، ہونٹ خشک ہو گئے۔ بلبل نے یہ دیکھا اور چر چوں چر چوں کر کے کہنے لگی۔ ''پیاسے ہو، ٹھہرو، ابھی پانی لاتی ہوں۔'' مجھے اس کی جدائی شاق گزری، آہ اتنی جلدی میں اُس سے اور، اور وہ مجھ سے اتنا ہل گئی کہ ایک لمحے کی جدائی پہاڑ دکھائی دینے لگی۔ میں نے کہا: ''نہ جاؤ، ہرگز نہ جاؤ۔ میں پیاسا مروں گا، دھوپ میں جلوں گا۔ مگر تمہیں نہ چھوڑوں گا۔'' بلبل نے میری آنکھیں چوم کر جواب دیا۔ ''میں واری، میں صدقے۔ دو منٹ ٹھہرو۔ (چٹکی بجا کر) اس طرح گئی اور (پھر چٹکی بجا کر) اسی طرح آئی۔''

یہ کہہ کر اُس نے اپنے خوبصورت بازو کھولے۔ اور اُڑی دو گز بھی نہ گئی ہو گی کہ کسی ظالم، نابکار، اور بے رحم شخص کی غُلیل سے نکلا ہوا ایک مٹی کا ڈھیلا شاں شاں کرتا آیا اور بلبل کے سینے میں بیٹھا۔ مٹی کا ڈھیلا کیا تھا۔ فرشتۂ اجل کی کمان سے نکلا ہوا تیر تھا۔ بلبل نے ادھر ادھر دیکھا، تڑپی اور مجھے پاس نہ دیکھ کر زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتی ہوئی ٹھنڈی ہو گئی۔

میں نزع میں تھا بُلوا نہ سکا، کوئی مجھ کو وہاں پہنچا نہ سکا
میں جا نہ سکا وہ آ نہ سکا، یہ بھی نہ ہُوا وہ بھی نہ ہُوا

مجھے جتنا رنج ہوا، جتنا قلق ہوا، بیان سے باہر ہے۔ دنیا نظروں میں تاریک ہو گئی۔ میں نے چلا کر پوچھا۔ شمال سے پوچھا، جنوب سے پوچھا، مشرق سے پوچھا، مغرب سے پوچھا۔ پوچھا اور بار بار پوچھا کہ یہی دنیا سرزمینِ راحت ہے؟ کیا یہی دنیا آرام کی جگہ ہے؟ میں نے اتنا کہا، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ تسلی کے الفاظ تھے، ہمدردی کے الفاظ تھے، مگر میرے سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

میرا دل ٹوٹ گیا تھا، اور میری خوشی کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں، میں نیچے جھک گیا۔ سیکنڈوں سے منٹ اور منٹوں سے گھنٹے گزر گئے، دن گزرا، رات گزری۔ مگر میں آہ! میں بدنصیب تنہائی میں، چپکے چپکے رویا کیا، رویا کیا، بس رویا کیا

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے
کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
ہماری یہ شب کیسی شب ہے الٰہی
نہ روتے کٹے ہے، نہ سوتے کٹے ہے

آہ وزاری کی رات بھی کٹ گئی۔ ابھی ٹھیک، اچھی طرح سے دن نہ چڑھا تھا کہ میرے کانوں میں ایک بار یک، مہین اور سریلی آواز پڑی۔ یہ آواز ایک حسینہ کی آواز تھی۔ جو اپنے عاشق سے گفتگو میں مشغول تھی۔ آفتاب کی پہلی کرن مجھ پر پڑی اور میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان لڑکا اس حسینہ کے آگے دوزانو بیٹھا ہے۔ وہ کبھی رویا، کبھی ہنسا، کبھی اٹھا، کبھی بیٹھا۔ وفا کے وعدے کیے، قسمیں کھائیں۔ جو کام زبان نے نہ کیا، وہ آنکھوں نے کیا اور جس کو آنکھیں بھی نہ کرسکیں، اُسے آنسوؤں نے کردیا۔

میں رویا، میں چیخا، میں چلایا۔ ہائے! میرا بھی کوئی محبوب تھا۔ میرا بھی کوئی عاشق تھا۔ سورج سر پر پہنچا۔ نازنین نے رحم کی نظروں سے، محبت کی نظروں سے اپنے عاشق کو دیکھا۔ وہ باغ باغ ہوگیا۔ میں رویا، میں چیخا، میں چلایا۔ ہائے کوئی میرا بھی محبت کرنے والا، محبت کروانے والا تھا۔ اسی خیال میں، اسی تصور میں آفتاب نے اپنی مسافت طے کرلی۔ شام ہوئی، اندھیرا بڑھا، منظر بدل گئے۔ خیمے لگ گئے، پردے اُٹھ گئے، حجاب اُڑ گیا۔ نازنین نے اپنے آپ کو اپنے عاشق کی بانہوں میں گرادیا۔ چھاتی سے چھاتی اور لب سے لب مل گئے۔

جب سورج نکلا، نظارہ اور تھا۔ نازنین وہی تھی، بابو صاحب وہی تھے، مگر اُن کی نظریں اور تھیں۔ نازنیں روتی ہے، چیختی ہے مگر کسے پروا ہے۔ رنگیلا عاشق دوسری طرف متوجہ ہوا۔ نازنین نے چھری، چمکدار چھری لے کر اپنے سینے میں بھونک لی۔ یہ دیکھ کر میں رویا، میں چیخا، میں چلایا۔ پھر اپنا سوال، وہی پہلا سوال دہرایا، رو کر دوہرایا۔ ایک بار نہیں ہزار بار دوہرایا۔ میں نے سر بفلک درختوں سے پوچھا، ننھی گھاس سے پوچھا کہ کیا یہی دنیا سرزمین راحت ہے؟ کیا یہی دنیا آرام کی جگہ ہے؟ مرنے والی کا تڑپنا تھا، کراہنا تھا مگر میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

رات زیادہ گزر گئی۔ آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو دنیا کا راجا سورج تخت پر قدم رکھ چکا تھا۔ میرے ہم عمر پھول نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔ ''پھول بھائی! مجھ میں بے قراری ہے، بیتابی ہے، میں خیال کرتا ہوں کہ میرے سینے میں کوئی خلا ہے۔'' جب میں اندھیرے میں تھا، جب میں پردے میں تھا، لوگ کہتے تھے۔ باہر آؤ، آزادی ہے، خوشی ہے، مگر اب کہ میں آزاد ہوں۔ میری خواہش نہیں نہیں میں غلطی کرتا ہوں میری تمنا، نہیں نہیں میں پھر غلطی کرتا ہوں، میری آرزو ہے کہ کوئی زندہ ہستی، کوئی وجود آئے اور میری آزادی میں خلل ڈالے۔ وہ مجھے چھیڑے، وہ مجھے ستائے اور مجھ پر حکومت کرے۔ جب تک ایسا وجود نہیں۔ مجھے کوئی خوشی خوشی نہیں۔ میں نے سوچا اس کے دل میں محبت کا خلا ہے، عشق کا تخت خالی پڑا ہے، جب تک بادشاہ عنان حکومت ہاتھ میں نہ لے۔ ضرور بلکہ لازمی ہے کہ ملک میں ابتری، بے قاعدگی پھیلی رہے۔

میں نے چلا کر کہا: ''تمہیں معشوق کی خواہش ہے، تمہیں عاشق کی تمنا ہے۔ روگ جو تمہیں لگا ہے، اسے عشق کہتے ہیں۔ نہ اس کا دوا نہ دارو۔ علاج سے بڑھتا ہے، اور بے پروائی سے ترقی پاتا ہے۔ مریض کو نہ دنیا کا چھوڑتا ہے، نہ دین کا۔''

وہ مسکرایا اور چپ ہو رہا۔ مگر بار بار پہلو بدلنا، اور ادھر ادھر دیکھنا صاف بتاتا تھا کہ اُسے کسی کی تلاش ہے۔ محبت کی کشش دو وجودوں کو کھینچتی ہے، بلاتی ہے اور ملا دیتی ہے۔ چنانچہ کوئی ایک ہی گھنٹے کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک بھونرا اُس پھول کے سامنے آیا اور پھڑ پھڑانے لگا۔ ایک............ دو............ تین سیکنڈ گزرے، اور پھول اور بھونرا مل گئے۔

بھونرا پھول کے گرد طواف کرتا تھا، اور پھول مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔ میں نے پوچھا اور اُس نے بتایا کہ یہ لمحے حقیقت میں مسرت بخش کہے جاسکتے ہیں مگر افسوس، فلک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔

ایک لمبا تڑنگا، بدصورت، بدتمیز لڑکا باغ میں داخل ہوا اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ بھونرے نے ''بھوں بھوں، بھر بھوں، بھر بھوں'' کر کے سمجھایا۔ ہم اکٹھے بیٹھے ہیں، ادھر نہ آنا۔ مگر وہ وحشی، بدتمیز ادھر ہی جھکا۔ بھونرا پھول سے کوئی گز کے فاصلے پر ہوگا،

جب لڑکے نے اپنا دست تعدی پھول پر دراز کیا، اور اسے دیکھتے دیکھتے، ایک پل میں، چشم زدن میں شاخ سے علیحدہ کر دیا۔ بھونرے کے دل میں بھالے چبھ گئے، برچھیاں چل گئیں۔ وہ تڑپ کر لڑکے پر ٹوٹا، اور اس طرح ٹوٹا کہ پھول کو زبردستی اُس کے ہاتھوں سے چھڑائے گا۔ لڑکے کا ہاتھ ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ اٹھا، اور بھونرا، جانباز بھونرا بے جان ہو کر نیچے گر گیا۔ یہ دیکھ کر میں رویا، میں چیخا، میں چلایا۔ اور ایک دفعہ پھر زور زور سے، پورے زور سے، چاروں طرف دیکھ کر اپنا وہی، پرانا سوال دوہرایا کہ کیا یہی دنیا سرزمین راحت ہے؟ کیا یہی دنیا آرام کی جگہ ہے؟ بھونرے کے تڑپنے کی آواز آئی۔ لڑکے کے گانے کی آواز آئی، مگر میرے سوال کا جواب نہ آنا تھا، نہ آیا۔

کچھ دیر گزری، وہ لڑکا پھر باغ میں داخل ہوا اور سیدھا میری طرف آیا۔ ذرا ٹھٹکا، ذرا دیکھا۔ ذرا سوچا، اور ہاتھ بڑھا کے توڑ لیا۔۔

مجھ کو لیے وہ چلتا چلتا چلتا...... چلتا...... چلتا ایک بڑے عالی شان محل میں پہنچا، جہاں چاروں طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ چھوٹا اور بڑا، جوان اور بوڑھا، مرد اور عورت سب روتے تھے۔ درمیان میں ایک نازنین کفن میں لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ یہ وہی تھی وہی، جو کل باغ میں خودکشی کر کے مری تھی۔ مجھے اس کے کفن پر رکھ گیا۔

مرتی دفعہ اُس نے دو وصیتیں کی تھیں۔ کفن پر پھول ہو اور تابوت پر ایک فقرہ۔ میں نے وہ فقرہ دیکھا

''اس زندگی سے، خواہ وہ سو برس سے زیادہ کی ہو، جس میں محبت کی دھوپ نہیں۔ گھنٹہ، صرف ایک گھنٹہ جو محبت سے بھرا ہوا ہو، ہزار درجہ اچھا ہے۔''

میں نے دیکھا، میں نے جانا، میں نے سمجھا کہ اب تک میں غلطی پر تھا۔ یہ فقرہ یقیناً ہاں یقیناً سچ ہے۔ محبت کا ایک گھنٹہ روکھی پھیکی زندگی سے بیش قیمت ہے۔ دنیا سرزمین راحت نہیں، اور ہرگز نہیں آرام کی جگہ نہیں، اور ہزار بار نہیں۔ مگر صرف محبت اسے قابل قبول چیز بنا دیتی ہے۔ جب میں نے بلبل کو مرتے دیکھا، جب میں نے بھونرے کو تڑپتے دیکھا، اور جب میں نے نازنین کو آپ موت کے غار میں کودتے دیکھا تھا، میں رویا تھا۔ مگر اب میں کہتا ہوں، یہ رونے کا موقعہ نہیں تھا۔ اگر وہ دنیا سے محبت کا ذائقہ چکھے بغیر رخصت ہو جاتے تو افسوس کا مقام ہوتا۔

مبارک ہے وہ، جو محبت کرتا ہے، یا جس سے کوئی محبت کرتا ہے۔ محبت کا ایک گھنٹہ میں نے لے لیا ہے۔ اب مجھے مرنے کا کوئی ڈر نہیں، کوئی خوف نہیں۔ میں خوشی سے اُس وقت کا منتظر ہوں، جب میں مرجھاؤں۔ میری پنکھڑیاں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں، میں مٹی ہو جاؤں، اور مٹی میں مل جاؤں۔



حوالہ:

۱۔ ''مخزن'' جنوری 1914ء میں سدرشن کا پورا نام ''بدری ناتھ شرما سدرشن'' ملتا ہے۔

اُردو افسانے کے سو سال: انتخاب

ترتیب میں تقدیم کی بنیاد افسانہ نگار کا اوّلین مطبوعہ افسانہ ہے

راشد الخیری

نام : محمد عبدالرشید (والدین "ابی" پکارتے تھے)

قلمی نام : س۔ش۔ر/ محمد عبدالراشد/ مولوی عبدالراشد الخیری دہلوی/ راشد الخیری ("مصورِ غم" کا خطاب "شام زندگی کی" اشاعت پر "اُسوہ حسنہ" کے مدیر احسان الحق نے دیا۔)

پیدائش : جنوری 1868ء بہ مقام دہلی (۱)

وفات : 3 فروری 1936ء صبح سات بج کر پچپن منٹ پر بہ مقام دہلی

تعلیم : عریبک سکول دہلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، جہاں خواجہ شہاب الدین (ہیڈ ماسٹر) مرزا احمد بیگ (انگریزی) خواجہ الطاف حسین حالی (اردو، فارسی) اور امتیاز حسین (ریاضی) پڑھاتے تھے۔ نویں جماعت میں تھے جب دادا کا انتقال ہوا اور اُنہوں نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ اس کے بعد کچھ دن اپنے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی شاگردی کی، کچھ مدّت گورنمنٹ ایڈورڈ ہائی سکول، اورئی میں تعلیم پائی لیکن میٹرک نہ کر سکے۔

مختصر حالات زندگی:

راشد الخیری کے والد عبدالماجد ریلوے میں ملازم تھے اور زیادہ وقت پردیس میں گزارا۔ اس پر مستزاد راشد الخیری کی والدہ پر ایک اینگلو انڈین سوکن لا بٹھائی۔ راشد الخیری کی والدہ رشید الزمانی اور نابینا دادا مولوی عبدالقادر نے راشد الخیری کو اپنی نگرانی میں رکھا۔ نو برس کے تھے جب والد کا انتقال ہوا۔ کچھ وقت اپنے چچا ڈپٹی کلکٹر عبدالحامد کے ہاں اناؤ میں گزارا۔ چودہ برس کی عمر تک پتنگیں اڑائیں، گلی ڈنڈا اور گیڑیاں کھیلیں"۔ نوجوانی میں گلستان، بوستان، شاہ نامہ، رومی، جامی، شیکسپیئر، ٹینی سن اور ملٹن کو پڑھا، امام غزالی کا "احیا العلوم" کا ساتھ بڑھاپے تک رہا۔ چچا کی سفارش پر 1891ء میں کلرک بھرتی ہو گئے اور محکمہ بندوبست، علی گڑھ سے 1901ء تا 1902ء منسلک رہے۔ 1903ء میں مترجم عدالت بندوبست تھے۔ 5 جنوری 1890ء کو نور فاطمہ عرف فاطمہ خانم بنت مولوی شاہ عبدالرحیم سے شادی ہوئی۔ محکمہ بندوبست ٹوٹا تو

ڈپٹی کمشنر بی جی وائٹ کے دفتر میں کلرکی کی۔ اس زمانے میں یو۔پی اور میرٹھ میں قیام رہا۔ کئی ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ آخر میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے دفتر میں سب آڈیٹر ہو گئے۔ پہلا ناول ''صالحات'' لگ بھگ 1896ء میں مکمل کیا جو 1898ء میں شائع ہوا۔ محمد احسن وکیل (''عصمت'' فروری 1939ء) کے مطابق مولانا شاعری بھی فرماتے تھے۔ افسانے لکھنے کی ترغیب والدہ سے ملی اور 1903ء میں انہوں نے اردو کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' لکھا۔ 1907ء میں ''مخزن'' کے دہلی منتقل ہو جانے پر شیخ عبدالقادر کے ساتھ مل کر پرچہ مرتب کیا اور 1908ء میں بیگم شیخ محمد اکرام کی ادارت میں دہلی سے رسالہ ''عصمت'' جاری کیا۔ 1910ء میں ملازمت چھوڑ دی۔ اپریل 1911ء میں دہلی سے رسالہ ''تمدن'' شروع کیا جس میں ابتدائی ایک برس شیخ محمد اکرام ان کے شریک کار رہے۔ رسالہ ''تمدن'' اپنے ذاتی پریس سے شائع کرتے تھے۔ یہ پرچہ ان کے اپنے مضمون ''طرابلس سے ایک صدا'' کی اشاعت پر 1913ء تک حکومتی پابندی کا شکار رہا اور زرِ ضمانت ضبط کر لیا گیا۔ 1915ء میں ہفتہ وار رسالہ ''سہیلی'' جاری کیا جو محض چند ماہ نکل سکا۔ 1919ء میں تمدن پریس کو آگ لگ جانے سے ''مخزن''، ''عصمت''، ''تمدن'' اور ''سہیلی'' کے تمام پرانے فائل جل کر راکھ ہو گئے۔ اس کے بعد دہلی سے ہی خواتین کا پرچہ ''بنات'' جاری کیا۔ 1919ء میں کالے خاں کی مسجد، ترکاری منڈی، دہلی کے قریب رہائش تھی۔ 1923ء میں ''تربیت گاہ بنات'' قائم کی اور لکھنا پڑھنا تقریباً موقوف ہوا۔ 3 فروری کی صبح 7 بج کر 55 منٹ پر دہلی میں وفات پائی اور کوٹلہ فیروز شاہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔[۳]

اوّلین تحریر:

''احسن و میمونہ'' (ناول) زمانہ تصنیف 1894ء[۴] یہ رومانی ناول ''روہیل کھنڈ گزٹ'' بریلی میں 1894ء میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''نصیر اور خدیجہ'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور جلد نمبر 6، شمارہ نمبر 3، دسمبر 1903ء۔ صفحہ 27 تا 31 مشمولہ: ''مسلی ہوئی پتیاں'' مطبوعہ عصمت بک ڈپو دہلی، طبع اول 1937ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

1. صالحات (حیاتِ صالح) اس ناول میں بقول پریم چند: ''انسانیت کا اونچا آئیڈیل پیش کیا گیا ہے۔''

یہ ناول ہے۔ تصنیف 1896ء یا 1897ء ناشرین: محمد شفیع الدین مالک اقبال پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: دہلی 1898ء طبع دوم: دہلی 8 یا 1907ء، طبع سوم: دہلی 1930ء

2. ''منازل السائرہ'' (ناول) تکمیل: 1898ء تا 1900ء۔ طبع اوّل: علی گڑھ 1902ء۔

یہ ناول علی گڑھ سے محمد احسن وکیل نے شائع کروایا۔ دوسرا ایڈیشن سر شیخ عبدالقادر نے لاہور سے شائع کیا طبع دوم: لاہور 1909ء

3. ''قطراتِ اشک'' (افسانے اور مضامین) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اوّل: 1921

اوّلین افسانوی مجموعہ۔ اس کتاب میں درجن بھر افسانے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ جن میں ''عصمت و حسن'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور

1907ء بھی شامل ہے۔ دیگر افسانے ہیں: ''ایک مظلوم بیوی کا خط'' (جو ''مخزن'' دہلی، 1908ء) میں ''کثرت ازدواج'' کے نام سے شائع ہوا تھا) مضمون: ''دارالغرور'' (مطبوعہ مخزن 1906ء) ''بدنصیب کا لال'' (مطبوعہ ''مخزن'') ''رویائے مقصود'' (مطبوعہ ''مخزن'' 1907ء) ''سارس کی تارک الوطنی'' (مطبوعہ ''مخزن'' 1909ء) ''نند کا خط بھاوج کے نام'' (مطبوعہ ''عصمت'' دہلی اولین شمارہ جون 1908ء) ''ساون کی چڑیاں'' (مطبوعہ ''عصمت'' دہلی 1910ء) ''مظلوم کی فریاد'' (مطبوعہ ''عصمت'' دہلی 1911ء) ''ماہ جبین اندرا'' (مطبوعہ ''تمدن'' دہلی 1911ء) ''دیور بھاوج کی خط کتابت'' (مطبوعہ: ''تمدن'' دہلی 1912ء) ''چاندنی چوک کا جنازہ'' (مطبوعہ ''کہکشاں'' دہلی 1918ء) ''جھولے کی یاد'' (مطبوعہ ''تہذیب نسواں'' 1921ء)

4. ''شاہین ودرّاج'' ۔1908ء ''مخزن'' لاہور میں قسط وار شائع ہوا طبع اوّل: دارالاشاعت پنجاب لاہور طبع دوم: 1940ء

5. ''صبح زندگی'' (تکمیل 1907ء) مخزن پریس، دہلی، طبع اول: 1909ء

1935ء تک اس کتاب کے 18 ایڈیشن شائع ہوئے۔

6. ''سوکن کا جلاپا'' (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: 1921ء

اس کا دوسرا نام ''شہید بیداد'' تھا۔ اس کے کل 9 ایڈیشن طبع ہوئے۔

7. ''گوہر مقصود'' (2 افسانوں کا مجموعہ) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: 1918ء

اس مجموعے میں شامل افسانہ ''لال کی تلاش'' جون اور اس کے بعد جولائی 1910ء کے رسالہ ''عصمت'' دہلی میں شائع ہو چکا تھا۔ دوسرا افسانہ ''خیالستان کی پری'' ''عصمت'' 1911ء میں طبع ہوا تھا۔

8. ''لڑکیوں کی انشاء'' (زنانہ خط کتابت پر) دفتر ''عصمت'' دہلی، طبع اول: 1911ء

دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے اس کتاب کے چھ سات ایڈیشن مولوی سید ممتاز علی نے شائع کیے۔

9. ''شام زندگی'' (ناول) ناشر: محمد واحدی، ایڈیٹر نظام طبع اوّل: اپریل 1917ء المشائخ، دہلی،

نومبر 1917ء تک تین ایڈیشن نکل گئے تھے۔ یہ کتاب 1964ء تک 27 بار چھپ چکی تھی۔ کل صفحات 160۔

10. ''الزہرا'' (فاطمۃ الزہرا کے سوانح حیات) ناشر: محمد واحدی، ایڈیٹر نظام طبع اوّل: 1917ء المشائخ دہلی،

مئی 1959ء میں اس کتاب کا 14واں ایڈیشن شائع ہوا۔

11. ''سات روحوں کے اعمال نامے'' (افسانے/مضامین) ناشر: محمد واحدی، ایڈیٹر نظام طبع اوّل: 1917ء المشائخ دہلی،

رسالہ ''خطیب'' میں قسط وار شائع ہوا۔ اس میں سات کہانیاں ہیں جو باہمی طور پر آپس میں مربوط ہیں۔ یہ کتاب 1964ء تک 10 بار چھپ چکی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہی ہے۔

12. ''طوفان حیات'' (ناول) ناشر: مولانا عبدالمجید سالک، لاہور

1964ء تک یہ کتاب 14 بار چھپ چکی ہے

13. ''نوگ'' (ناول) ناشر: سید ممتاز علی طبع اوّل: 1918ء

یہ ناول ''تہذیب نسواں'' لاہور میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ برائے دارالاشاعت پنجاب، لاہور،

1964ء تک اس کتاب کے 10 ایڈیشن طبع ہوئے۔

14. ''ماہ عجم'' (تاریخی ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اوّل:

یہ ناول امتیاز علی تاج نے ''تہذیب نسواں'' لاہور کے لئے 1918ء

میں لکھوایا تھا۔

15. ''بنت الوقت'' (ناولٹ) ناشر: محمد واحدی 1918ء

راشد الخیری نے یہ ناولٹ اپریل 1918ء میں مکمل کیا تھا۔ ایڈیٹر نظام المشائخ، دہلی،

16. ''آفتاب دمشق'' (تاریخی ناول) ناشر: محمد ظہور الدین مالک رسالہ

''مخزن'' لاہور

یہ ناول 1918ء میں لکھا گیا۔ طبع دوم: مبارک علی شاہ گیلانی۔ گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ 1964ء تک یہ کتاب دس بار شائع ہوئی۔ 1960ء سے یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ادیب عالم امتحان میں شامل نصاب رہی۔

17. ''محبوبہ خداوند'' (تاریخی ناول) ناشر: احسان الحق مالک ''اخبار دین طبع اوّل:

1964ء تک 9 ایڈیشن طبع ہوئے۔ ودنیا'' دہلی،

18. ''جوہر قدامت'' (ناول) ناشر: ملک محمد دین طبع اول: تکمیل 1919ء

ایڈیٹر صوفی، پنڈی بہاؤالدین،

اس ناول پر کئی فلمیں بنیں۔ قیام پاکستان سے قبل مدراس یونیورسٹی میں نصابی کتاب رہی۔ راشد الخیری نے اس ناول پر جنوری 1932ء میں نظر ثانی فرمائی۔ 1964ء تک اس کے 8 ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔

19. ''سراب مغرب'' (طویل مختصر افسانہ) ناشر: محمد واحدی: نظام المشائخ، دہلی، طبع اول: فروری 1918ء

تکمیل: 1917ء........ 1964ء تک 12 ایڈیشن طبع ہوئے۔

20. ''عروس کربلا'' (تاریخی ناول) صوفی پبلشنگ ہاؤس پنڈی بہاؤالدین طبع اول: 1919ء

راشد الخیری نے 1933ء والے ایڈیشن پر نظر ثانی کرتے ہوئے ترامیم واضافے بھی کیے۔ 1964ء تک اس ناول کے 11 ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔

21. ''شب زندگی'' (ناول) دو جلدوں میں مطبوعہ: دفتر ''عصمت'' دہلی، طبع اول: اگست 1919ء

یہ ناول جون 1918ء میں لکھنی شروع کی گئی تھی۔ جولائی 1919 میں مکمل ہوئی۔ پہلی جلد اگست 1919ء کو طبع ہوئی۔ تمدن پریس دہلی

کی آتش زدگی کے بعد راشد الخیری کی یہ پہلی کتاب ہے۔ جلد اوّل 1964ء تک 24 بار طبع ہو چکی۔ دوسری جلد راشد الخیری نے جنوری فروری 1923ء میں اپنی بہو خاتون اکرم کی رونمائی کے لیے محض پانچ ہفتوں میں مکمل کی تھی۔ 1923ء میں ہی اس کے تین ایڈیشن چھپ کر بک بھی چکے تھے۔ دوسری جلد کے 1924ء تک 11 ایڈیشن طبع ہوئے۔ 1964ء کے بعد کے ایڈیشن میں جلد اول و دوم کو یکجا کر دیا گیا۔

22۔ ''نوحہ زندگی'' (ناول) ناشر: قاری عباس حسین ایڈیٹر "قوم" دہلی، طبع اوّل: اگست 1919ء

1931ء کے ایڈیشن میں مصنف کا دیباچہ نئی چیز ہے۔ اس ایڈیشن پر بھی راشد الخیری نے نظر ثانی کی۔ 1964ء تک 12 ایڈیشن چھپ چکے تھے۔

23۔ ''موودہ'' (ناولٹ) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس طبع اوّل: 1919ء

اس ناولٹ کے 1964ء تک آٹھ ایڈیشن طبع ہوئے۔ کل صفحات 56۔ پنڈی بہاؤالدین،

24۔ ''روداد قفس'' (شعری مجموعہ) مطبوعہ: دفتر ''عصمت'' دہلی، طبع اوّل: ستمبر 1918ء

راشد الخیری کی وہ نظمیں جو افسانوں اور مضامین کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ 1927ء میں جب یہ کتاب چوتھی بار عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی تو راشد الخیری کی ''عصمت'' اور ''سہیلی'' میں شائع شدہ ان نظموں کا اضافہ کر دیا گیا جو راشد الخیری نے اپنے نام سے شائع نہیں کروائی تھیں۔ یوں کتاب کی ضخامت 72 صفحات ہو گئی۔

25۔ ''انگوٹھی کا راز'' (طویل مختصر افسانہ) ناشر: حکیم محمد یعقوب مطبوعہ: دہلی، طبع اوّل: 1918ء

26۔ ''جوہر عصمت'' (افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اول: جنوری 1920

پہلے ایڈیشن میں صرف تین افسانے شامل تھے اور ضخامت صرف 48 صفحات تھی۔ طبع دوم 1927ء کے ایڈیشن میں دس مزید افسانے شامل کر دیئے گئے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے ''عصمت'' اور ''تمدن'' میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں مظلوم بیوی کا پاک جذبہ، بھنور کی دلہن، فسانہ تنویر، مامون الرشید کا دربار، اگلی محبتیں، جہانگیری عدل، ملکہ شہرزاد، بلبل کی شہادت، بے گناہ کا قتل، برقع کی مستحق، بھاوج کا کینہ، غلط فہمی اور خاتمہ بالخیر کل 13 افسانے ہیں۔

27۔ ''تائید غیبی'' (ناولٹ) ناشر: ممتاز ہاشمی مطبوعہ: دہلی، طبع اوّل: 1920ء

یہ ناولٹ دس بار طبع ہوا۔ آخری ایڈیشن منشی عبدالحمید مدیر ''مولوی'' دہلی نے ''اندلس کی شہزادی'' کے نام سے شائع کیے۔

28۔ ''فسانہ سعید'' (ناولٹ) ناشر: حافظ عزیز حسن بقائی مدیر ''پیشوا'' دہلی، طبع اوّل: 1920ء

یہ ناولٹ حافظ عزیز نے چار بار شائع کیا۔ آخری ایڈیشن 1931ء میں دہلی سے نکالا تھا۔ تین ایڈیشن عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئے۔

29۔ ''در شہوار'' (تاریخی ناولٹ) ناشر: مدیر ''قوم'' دہلی، طبع اوّل: 1921ء

اس ناولٹ کے مزید 3 ایڈیشن قاری عباس حسین نے دہلی سے طبع کروائے۔ پانچواں ایڈیشن رازق الخیری نے عصمت بک ڈپو، سے طبع کروایا۔

30۔ ''یاسمین شام'' (تاریخی ناول) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین طبع اوّل: 1921ء
کل سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ ناول پونے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

31۔ ''تربیت نسواں'' (ناول) مطبوعہ: لاہور، طبع اوّل: 1923ء
ناول کا دوسرا نام ''سمرنا کا چاند تھا'' دوسرا اور تیسرا ایڈیشن سید مبارک علی گیلانی نے گیلانی پریس لاہور سے شائع کیے۔ اس ناول کے آخری تین ایڈیشن عصمت بک ڈپو دہلی نے شائع کیے۔ کل چھ بار طبع ہوا۔

32۔ ''تیغ کمال'' (ناول) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین، طبع اوّل: 1923ء
راشد الخیری نے یہ ناول گنگا پور میں صرف ایک ہفتے میں مکمل کیا تھا۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہوئی۔

33۔ ''امت کی مائیں'' (تاریخ و سیرت) ناشر: منشی عبدالحمید مالک و مدیر ''مولوی'' دہلی، طبع اوّل: 1925ء
ازواج مطہرات پر کیے گئے اعتراضات کا جواب۔ ضخامت ڈیڑھ سو صفحات کل چھ ایڈیشن طبع ہوئے۔

34۔ ''ستونتی'' (طویل مختصر افسانہ) عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1926ء

35۔ ''منازل ترقی'' (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1927ء
یہ افسانہ سب سے پہلے ''عصمت'' دہلی بابت: اکتوبر 1918ء اور اس کے بعد نظام المشائخ، دہلی میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات 30۔ کل چار ایڈیشن دہلی سے طبع ہوئے۔

36۔ ''بچہ کا کرتا'' (مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1927ء
یہ دردانگیز افسانہ پہلے پہل ''عصمت'' بابت: جولائی اگست 1923ء مرتبہ: رازق الخیری میں طبع ہوا تھا۔ آٹھواں ایڈیشن: 1946ء میں طبع ہوا۔

37۔ ''امین کا دم واپسیں'' (تاریخی افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: مارچ 1927ء
یہ افسانہ پہلے پہل فروری 1919ء میں ''خطیب'' دہلی میں شائع ہوا۔ کل صفحات 32۔

38۔ ''ویڈیا کی سرگزشت'' (افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: اکتوبر 1927
کل صفحات 32۔ پہلے پہل ''مگر آہ وہ سوتی تو وہاں بھی نہ تھا'' کے عنوان سے ''خطیب'' دہلی میں طبع ہوا۔ کتاب کا ساتواں ایڈیشن ستمبر 1956ء میں عصمت بک ڈپو، کراچی سے طبع ہوا۔ طبع زاد افسانہ ہے۔

39۔ ''گلدستۂ عید'' (مضامین اور افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1927ء

40۔ ''نانی عشو'' (مزاحیہ قصے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: جنوری 1928
کل صفحات 56۔ ''نانی عشو'' سلسلے کی ابتدائی تین چار قسطیں ''عصمت'' دہلی بابت 1927ء میں شائع ہوئی تھیں۔ ''نانی عشو''

سلسلے پر ریڈیو سے فیچر نشر ہوئے۔ یہ کتاب دس بار طبع ہوئی۔

41۔ ''سیلاب اشک'' (7 افسانے) مصور ایڈیشن: مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1928ء

اس مجموعے میں پرستار محبت، بلوچن کے تین رنگ، طلاقن کا سفید بال، رج اکبر، عدل گل بدن، بے قصور بچی اور ثریا کا تخیل نامی کل سات افسانے ہیں۔ جن میں سے اکثر ''عصمت'' دہلی بابت 1926ء تا 1927ء میں شائع ہوئے۔ کل پانچ ایڈیشن طبع ہوئے۔ آخری ایڈیشن 112 صفحات معہ تصاویر 6 ورق۔

42۔ ''قلب حزیں'' (مضامین اور افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: 1928ء

یہ 30 مضامین اور افسانے راشد الخیری نے س۔ش۔ر کے قلمی نام سے لکھے تھے، جو 1927ء تک ''عصمت'' دہلی میں شائع ہوئے تھے۔

43۔ ''وداع ظفر یعنی نوبت پنج روزہ'' (تاریخ) مطبوعہ: ''عصمت'' بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: نومبر 1928ء

کل صفحات 128۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد سے متعلق بہادر شاہ ظفر کی زبانی نوحہ خوانی۔ 1964ء تک نو ایڈیشن طبع ہوئے تھے۔

44۔ ''طوفان اشک'' (12 افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: 1929ء

یہ افسانے 1915ء تا 1927ء عصمت میں شائع ہوئے۔ 1964ء تک چار ایڈیشن طبع ہوئے۔

45۔ ''تمغہ شیطانی'' (طویل افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: 1929ء

یہ طویل مختصر افسانہ جنوری 1928ء تا ستمبر 1929ء کے ''عصمت'' دہلی میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ کل صفحات۔ 88

46۔ ''شہید مغرب'' (افسانے اور مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اوّل: 1929ء

اس کتاب میں شامل افسانے اور مضامین ''عصمت'' دہلی ''تمدن'' دہلی (12-1911ء) کے علاوہ ''ہمدرد'' دہلی، ''تنظیم'' امرت سر اور ''انقلاب'' دہلی میں اس سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ کتاب میں شہید مغرب، دو آسمانی مسافر، شہید طرابلس، طرابلس سے ایک صدا، ایک عرب سیدانی، سیاہ داغ، افراط اور تفریط، صدائے دل گداز، کلونتیاں اور میمونہ کل دس چیزیں شامل ہیں۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن 1934ء میں طبع ہوا۔

47۔ ''تفسیر عصمت'' (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1929ء

یہ افسانہ پہلے پہل ''عصمت'' دہلی کے نقرئی جوبلی نمبر 1928ء میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات 60۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہو چکی ہے۔

48۔ ولایتی نخمی'' (مزاحیہ افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: نومبر 1929ء

یہ افسانے ''عصمت'' دہلی میں قسط وار شائع ہو چکا تھا۔ جنوری 1946ء میں ساتویں بار طبع ہوا۔

49۔ ''شہنشاہ کا فیصلہ'' (تاریخی ناول) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1929ء

یہ ناول پہلے پہل ''خطیب'' 1917ء میں شائع ہوا تھا۔ کل صفحات 32۔ کل سات بار طبع ہوا۔

50۔ ''وداع خاتون'' (3 مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1929ء

راشد الخیری نے یہ 3 مضامین اپنی جواں مرگ بہو خاتون اکرم سے متعلق 1924ء اور 1925ء میں ''مہمان دلہن'' ''تعزیت نامہ'' اور آپ بیتی کے عنوان سے لکھے تھے۔ کل صفحات 24۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہوئی۔

51۔ ''منظر طرابلس'' (تاریخی ناولٹ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1929ء

یہ ناولٹ پہلی بار ''خطیب'' 1918ء میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات 40۔ کل چھ بار طبع ہوا۔

52۔ ''آمنہ کالال'' (مولودشریف) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: دسمبر 1930ء

یہ کتاب 1924ء تک 128 صفحات کی ضخامت میں 16 بار طبع ہوئی۔

53۔ ''گرفتارقفس'' (شعری مجموعہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1931ء

نظمیں، سلام اور پہیلیاں۔ کل تین ایڈیشن طبع ہوئے۔

54۔ ''نسوانی زندگی'' (افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1931ء

اس کتاب میں ماستا، فرشتہ بیوی، اشک ندامت اور بہن کی محبت کل چار افسانے ہیں۔ کل 54 صفحات۔ 1947ء تک اس کتاب کے چار ایڈیشن طبع ہوئے تھے۔

55۔ ''سودائے نقد'' (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1932ء

یہ 36 صفحات کا افسانہ پہلی بار ''خطیب'' 1918ء میں طبع ہوا۔

56۔ ''سیدہ کالال'' (تاریخی شہادت) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: جولائی 1931

یہ کتاب پانچویں بار 1935ء میں چھپی۔ 1964ء تک اس کے سولہ ایڈیشن طبع ہوئے۔ یہ شہادت نامہ آج تک محرم کی محفلوں میں پڑھا جاتا ہے۔

57۔ ''بیلہ میں میلہ المعروف، غدر کی ماری شہزادی'' مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1932ء

اس کتاب میں کئی تصاویر ہاف۔ ٹون بلاک کی تھیں اور ان میں تین رنگوں میں تصاویر تھیں۔ کل صفحات 88۔ مئی 1929ء کے ''عصمت'' دہلی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا اور جنوری 1932ء میں تمام ہوا۔

58۔ ''چہار عالم'' (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1935ء

یہ 24 صفحات کا افسانہ ''عصمت'' دہلی 1924ء میں طبع ہو چکا تھا پھر ''عصمت'' کے ''گلدستہ عید'' میں شامل ہوا۔

59۔ ''عروس شرق'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1936ء

یہ 76 صفحات پر مشتمل کتاب کل 5 بار طبع ہوئی۔

60۔ ''بزم رفتگاں'' (خاکے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1936ء

64 صفحات کی یہ باتصویر کتاب کل تین بار طبع ہوئی۔ اس میں نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ام عطیہ النساء، خاتون اکرم، نجمہ اختر بانو سہروردیہ، ز۔ ب۔ ش، جان ہار سید، جان ہار بجی مرحوم بیگم بھوپال، مولوی بشیر احمد، مرزا غالب، میر جالب، میر ناصر علی، صغرا بیگم، مولوی اشرف حسین، قاری سرفراز حسین اور اشرف گورگانی کے خاکے ہیں۔

61۔ ''قرآنی قصے'' (مذہبی مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1936ء

کل 144 صفحات کی کتاب 1964ء تک چار بار شائع ہوئی۔

62- ''بے فکری کا آخری دن'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1936ء
یہ مضامین کنواری لڑکیوں کے لیے 1912ء تا 1922ء ''عصمت'' اور ''سہیلی'' میں شائع کیے گئے یہ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا۔
63- ''نالۂ زار'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1936ء
یہ مضامین ''عصمت'' دہلی و ''تمدن'' دہلی میں 1908ء تا 1918ء شائع ہوئے۔ کتاب کے کل صفحات 88۔ یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا۔
64- ''گرداب حیات'' (25 افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1936ء
کتاب میں شامل 16 افسانے مصنف نے اپنے نام سے طبع کروائے تھے۔ یہ افسانے 1910ء تا 1922ء کے ''عصمت'' اور ''سہیلی'' دہلی میں طبع ہوئے۔ کل صفحات 122۔ تین ایڈیشن طبع ہوئے۔
65- ''سیاحت ہند'' (سفرنامے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: اگست 1936
1923-33ء میں تربیت گاہ بنات کے سلسلے میں جو دورے کیے ان کے حالات ''عصمت''، ''بنات''، ''رہبر دکن'' اور ''تنظیم'' میں شائع ہوئے تھے۔
66- ''دادالال بجھکڑ'' (مزاحیہ افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1935ء
اس مجموعے میں مولوی صاحب کا وعظ، شاہدرہ بل، بھائی ظفر اقرار نامہ لکھ رہے ہیں اور کبڑی بیگم کل چار افسانے شامل ہیں۔
67- ''گدڑی میں لعل'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1936ء
1909ء تا 1924ء رسالہ ''عصمت'' دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ 1964ء تک 5 بار طبع ہوا۔
68- ''بساط حیات'' (4 افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1937ء
بے زبانوں کا صبر (عصمت 1909ء) حیات انسانی پر دو پرندوں کی بحث (تمدن 1914ء) داستان بلبل اسیر (عصمت 1916ء) جانور کون ہے (نظام المشائخ 1927ء) کل چار افسانے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔ کل صفحات 48۔
69- ''نشیب و فراز'' (کہانیاں) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1937ء
8 کہانیاں جنھیں علامہ نے لڑکیوں کے فرضی ناموں سے رسالہ ''عصمت'' 1909ء تا 1918ء میں لکھا تھا۔ یہ 32 صفحات کا مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔
70- ''مسلی ہوئی پتیاں'' (4 افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1937ء
11 افسانوں کا مجموعہ، تمام افسانے خطوط کے انداز میں لکھے گئے ہیں جو 1903ء تا 1919ء تک ''مخزن'' لاہور ''عصمت'' دہلی اور ''تمدن'' دہلی میں طبع ہوئے۔ اس مجموعے میں ''بڑی بہن کا خط'' کے عنوان سے اردو کا اولین افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' مطبوعہ: 1903ء مخزن لاہور بھی شامل ہے۔
71- ''بلبل بیمار'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1937ء
19 مضامین کا مجموعہ مضامین ''عصمت'' دہلی اور ''خطیب'' دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔
72- ''احکام نسواں'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول: 1937ء

یہ کتاب تین بار طبع ہوئی۔ یہ مضامین رسالہ ''بنات'' دہلی میں شائع ہو چکے تھے۔۔

73۔ ''دعائیں'' (نظم ونثر) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

کل صفحات 64۔ تین بار طبع ہو چکی ہے۔

74۔ ''چمنستان مغرب'' (تراجم) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

یہ تراجم اوّل اوّل رسالہ ''سہیلی'' دہلی 1923ء میں طبع ہوئے۔ کتاب کی ضخامت ایک سو صفحات سے زائد۔ اس کتاب میں لارڈ ٹنی سن کی ''لیلیٰ'' کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ تراجم علامہ نے مختلف قلمی ناموں سے کیے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

75۔ ''محسن حقیقی'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

حضور اکرمؐ کی ذات گرامی سے متعلق 14 مضامین جو پہلی بار ''نظام المشائخ'' دہلی میں طبع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہو چکا ہے۔

76۔ ''حوا اور انسان'' (افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

7 افسانوں کا مجموعہ۔ کل صفحات 96۔ کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

77۔ ''یادگار تمدن'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

رسالہ ''تمدن'' دہلی کے لیے لکھے گئے مضامین۔ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔

78۔ ''دلی کی آخری بہار'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

25 مضامین جن میں دلی کا مرثیہ لکھا گیا ہے۔ کل صفحات 128۔ کتاب 5 بار طبع ہو چکی ہے۔

79۔ ''داستان پارینہ'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1937ء

غیر مسلم متعصب مورخین کے اعتراضات کا 18 تاریخی مضامین میں جواب۔ یہ مضامین ''عصمت'' دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ کل صفحات 88۔ یہ مجموعہ 4 مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

80۔ ''ساجن موہنی'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء

شوہر کیوں کر بگڑتے ہیں۔ بے وقوف بیوی وغیرہ 13 مضامین کا مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

81۔ ''زیور اسلام'' (مذہبی مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء

کل صفحات 108۔ یہ مجموعہ چار بار طبع ہوا۔

82۔ ''عالم نسواں'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء

کل 64 صفحات کا یہ مجموعہ 3 بار طبع ہوا۔

83۔ ''فریب ہستی'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء

کل صفحات 48۔ یہ مجموعہ 3 بار طبع ہوا۔

84۔ ''خدائی راج'' (افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء

کل صفحات 132۔ سات افسانوں کا مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

85۔ ''مسلمان عورت کے حقوق'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء
کل صفحات 104۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

86۔ ''شادی کا انتخاب'' (مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء
کل صفحات 56۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔ اس کتاب میں ایک مضمون ڈاکٹر شائستہ سہروردی (شائستہ اکرام اللہ) کا بھی شامل ہے۔

87۔ ''بکھری ہوئی پتیاں'' (نظمیں اور مضامین) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1938ء
یہ مضامین اور نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے راشد الخیری کی بکھری ہوئی تحریریں کہنا چاہیے۔ کچھ مضامین اور نظمیں غیر مطبوعہ بھی ہیں۔

88۔ ''بزمِ آخر'' (ناول) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: 1964ء

غیر مطبوعہ قلمی آثار:

۱۔ تربیت گاہ بنات سے متعلق بارہ تیرہ سالوں میں علامہ نے جو مضامین لکھے ان میں سے انتخاب ممکن ہے۔
۲۔ علامہ کے خطوط اور آٹوگراف کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

نظریۂ فن:

''مجھے معلوم ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ، ہر مذہبی حکم کو عقل کی ترازو اور فلسفہ کی کسوٹی پر تولتے اور پرکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ حقوق نسواں کے سلسلے میں میری زبان سے، جو کچھ نکل رہا ہے، مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقلِ سلیم متفق نہ ہو۔''
(خطبہ: انجمن حمایت اسلام لاہور، جنوری 1925ء)



حوالہ جات:

۱۔ ''بہترین انشائی ادب'' مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں تاریخ پیدائش غلط درج ہے۔
۲۔ بحوالہ: ''شاہجہان آباد کے عناصر اربعہ'' از راشد الخیری، مشمولہ ''بزمِ رفتگاں''
۳۔ علامہ نے بستر مرگ پر آخری شعر کہا:

ہے یہ بہار آخری، اس کو غنیمت جانیے
صحبت شب پھر کہاں راشد کے اٹھ جانے کے بعد

۴۔ بحوالہ: دیباچہ ''صالحات'' مطبوعہ: اقبال پرنٹنگ ورکس، دہلی طبع اوّل: 1898ء

قسیم کی سنگ دلی

راشد الخیری

قسیم دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھڑی آدھ گھڑی کو کھڑے کھڑے آتا۔ مزاج میں غصہ، دل میں کپٹ، آنکھ میں میل، تیوری پر بل الٹی سیدھی ایک آدھ بات کی اور دیوان خانے میں جالیٹا۔ پھر یہ بھی حکم نہ تھا کہ کوئی وہاں آسکے۔ نسیمہ تو خیر بیوی تھی اور بیوی بھی دور اندیش۔ اس نے قسیم کی محبت پر کبھی بھروسہ ہی نہ کیا، مگر معصوم بچے پر سخت مصیبت آ کر پڑی۔ باپ کی یہ بے اعتنائی پھول سے کلیجے پر سخت چرکا تھا۔ ساری ساری رات اور پورے پورے دن باپ کو یاد کرتا۔ اور ابا ابا کہتا۔ تین ساڑھے تین برس کا بچہ۔ بہت سی باتیں اپنی سمجھ کے لائق خاصی سمجھ لیتا۔ گرتا پڑتا باپ کے پیچھے پیچھے اس کے پاس پہنچتا اور وہ کم بخت رخ نہ کرتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ ابا ابا رٹتا ہوا اور روتا بلکتا اس کے پیچھے گیا اور ظالم نے بازو پکڑ کر گھر میں چھوڑ کر کنڈی لگالی۔ بہتیرا نسیمہ اس کو بہلاتی چمکارتی اور سمجھاتی مگر باپ کی یاد ننھے سے دل سے دم بھر کو بھی فراموش نہ ہوتی۔ ایک دن، رات کے وقت گیارہ بجے ہوں گے، نسیمہ اپنے لال کو کلیجے سے چمٹائے بے خبر پڑی تھی، کہ باپ کے ٹھٹھوں کی آواز سے نسیم کی آنکھ کھل گئی۔ سیدھا اٹھ کر مسکراتا ہوا باپ کے پاس چلا گیا۔ بچے کا آنا اس وقت جبکہ قسیم اپنے نئے دوستوں کی صحبت میں مزے اڑا رہا تھا، بہت ہی غضب معلوم ہوا۔ اس بیدردی سے اس کو باہر نکالا کہ دیکھنے والے بھی دنگ رہ گئے۔ قسیم کی دونوں بہنیں چند روز کے واسطے وطن گئیں اب صرف نسیمہ اور اس کا بچہ گھر میں رہ گئے تھے۔

بیس پچیس روز تک باپ کی اس سنگ دلی پر بھی نسیم پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ اس نے صبر و تحمل سے کام لیا، اور ضبط کیا۔ مگر اس کے بعد ننھی سی جان زیادہ تاب نہ لا سکی۔ ایک دن ادھر قسیم گھر آیا اور ادھر وہ جا کر باپ کے پاؤں میں لپٹ گیا لیکن افسوس شقی القلب باپ نے اس طرح پاؤں جھٹکا یا کہ بچے کے منہ میں ایڑی لگی اور خون نکل آیا۔ وہ تڑپتا ہی رہا اور قسیم یہ جا وہ جا۔

اس واقعے کا تیسرا روز تھا کہ نسیمہ نے بچے کو نہلایا، سر میں تیل ڈالا، کنگھی کر چکی تو اس کی صورت دیکھی، پیار آیا، گود میں اٹھا کلیجے سے لگایا۔ مگر آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نسیم ماں کی حالت دیکھ کر کچھ ایسا بے چین ہوا کہ اپنے کرتے کے دامن سے ماں کے آنسو پونچھے اور کہا: ''اماں جان! کیوں روتی ہو؟''

نسیمہ: ''بیٹا رونہیں رہی چلو چل کر لیٹ جاؤ۔''

نسیم: ''اماں! ابا ہم کو گود میں نہیں لیتے۔ خیر میں اب بڑا ہو جاؤں گا۔ میں بھی اماں ہی کو گود میں لوں۔ ان کو کبھی نہ لوں گا۔''

نسیمہ بچے کی بات پر مسکرا دی۔ خوب بھینچ کر پیار کیا اور کہا۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے تم جیتے رہو یہی سب کچھ ہے۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ لے کر لیٹی تو بچہ سو گیا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو نماز کو اٹھی۔ فارغ ہو کر بچے کے پاس آئی تو اس کا پنڈا پھکا تھا۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ بچے کو تو اس غضب کا بخار چڑھا کہ ابھی تو یہ عشا کے وقت تک وہ معصوم چنوں کی طرح بھن رہا تھا۔ اتنا بڑا ڈھنڈار گھر ماما چلی گئی اور نسیمہ اپنے لال کی گود میں لئے پڑی رہی۔ دن کی باتیں یاد آئیں۔ کلیجے پر تیر برسے۔ لمحہ لمحہ بعد دیکھتی تھی کہ شاید بدن پسیج گیا ہو مگر وہاں تو بھاڑ بھن رہا تھا۔ قسیم آج کسی خاص جلسے میں تھا۔ معصوم بچہ ظالم باپ کو بخار کی حالت میں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً آنکھ کھولی۔ ابا کہہ کر ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے ہر چند چمکارا مگر وہ روتا پیٹتا گود سے اترا اور دیوان خانے کے دروازے پر گیا اور باپ کو بلاتا رہا۔ لاکھ نسیمہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا ابھی نہیں آئے، مگر وہ بلک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اماں جان! اندر لیٹے ہیں، کنڈی لگائی ہے۔ اب نسیمہ بچے کو گود میں اٹھا کر اندر کے دالان میں آئی۔ منہ پر منہ رکھا۔ پیار کیا۔ چمٹایا، گلے میں ہاتھ ڈالے ننھے ننھے ہاتھوں کو سینے پر رکھا اور رو کر کہا۔ ''معبود حقیقی! یہ دکھیا مصیبت زدہ نسیمہ کا لال تیری امانت ہے الٰہ العالمین! مجھ بدنصیب پر رحم کیجیو۔ بچے آقا! اچھے معبود! دکھیاری کا لال شکستہ دل کا چراغ ہے۔'' نسیمہ یہیں تک پہنچی تھی کہ نسیم پھر اٹھا اور کہنے لگا۔ اچھی ماں جان! چھوڑ دو دیکھو ابا جان گملوں کے پاس کھڑے ہیں۔

نسیمہ کے پاس اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔ کبھی اس کو سینے سے لگاتی اور کبھی اس کی ضد پر چھوڑ دیتی۔ تین بج چکے تھے۔ چار برس کا پلا پلایا بچہ آج ماں کے ہاتھوں میں تھا۔ بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور اس عظیم الشان مکان میں ایک بدنصیب ماں اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو لئے بیٹھی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرتی پاؤں کو پیار کرتی۔ بلبلاتی اور روتی۔ بچے نے پانی مانگا رات کا وقت تھا۔ گود میں لے کر دروازے پر آئی کہ کسی سے شربت منگوا کر معصوم کا حلق تر کر دوں۔

مگر سڑک پر سناٹا تھا۔ الٹی لوٹی اور یہ کہہ کر پانی پلا دیا۔ ''کلیجے کے ٹکڑے! شربت بھی نصیب نہ ہوا۔''

نسیمہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ نسیم کو پھر غفلت ہوئی اور ماں کا منہ اس کے ہونٹوں پر تھا کہ وہ چونکا اور کہا اچھی اماں! وہ آ گئے۔ ابا آ ؤ ابا......

بہتیرا ہی نسیمہ نے اس وقت بہلانا چاہا مگر بچہ نہ سنبھلا۔ کھڑا ہوا، مگر گرا۔ گرتے ہی ماں نے گود میں لیا، لیتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ''ابا'' زبان سے نکلا۔ مگر پہلی ہی آواز پر اس کو ایک ہچکی آئی۔ آنکھیں، ماں کی صورت پر، اور زبان باپ کی یاد میں تھی کہ نسیمہ کی گود میں اس کا لال ہمیشہ کی نیند سو گیا۔



سجاد حیدر یلدرم

اصل نام : سید سجاد حیدر۔
قلمی نام : خانی خان/مسٹر شولری علیگ/یلدرم (از بغداد)/سجاد حیدر یلدرم
تاریخ پیدائش : 1880ء بہ مقام: موضع نہٹور، ضلع بجنور (بھارت)
تاریخ وفات : 11 اپریل 1943ء رات دو بجے لکھنؤ میں انتقال کیا۔
تعلیم : ابتدائی تعلیم بنارس میں پائی۔

انٹرمیڈیٹ: ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ۔الٰہ آباد یونیورسٹی کے تحت لیے گئے امتحان میں صوبہ بھر میں اوّل تھے، لیکن ریاضی میں فیل ہو گئے۔اس سے قبل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طالب علم تھے۔1901ء میں ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ سے بی۔اے کیا اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں سیکنڈ رہے۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد سیّد جلال الدین حیدر شہر بنارس کے کوتوال تھے۔یلدرم بی۔اے پاس کرنے کے بعد ناگ پور کے راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگ پور گئے، بعد میں گورنمنٹ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر علی گڑھ کالج بھجوا دیا۔1901ء میں بغداد کے برطانوی قونصل خانے میں ایک ترجمان کی جگہ نکلی تو کالج کے پرنسپل موریسن کی سفارش اور ترکی زبان میں شدبد کی وجہ سے یلدرم کا انتخاب عمل میں آیا اور یلدرم بغداد چلے گئے۔وہاں سے ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے سفارت خانے میں ہو گیا۔کئی برس تک سلطنت عثمانیہ اور مشرقی یورپ میں سیر و سیاحت کا موقع ملا۔ایک بار ہندوستان آئے اور واپس بغداد نہ گئے۔''مخزن'' دہلی: فروری 1908ء میں اطلاع دی گئی کہ یلدرم نے بغداد سے بھارت آ کر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ہی رپورٹ کی اور ڈیرہ دون میں پہلی پوسٹنگ ہوئی اس کے بعد پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے یلدرم کو معزول امیر کابل امیر یعقوب علی خان پر مسوری میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا۔امیر یعقوب علی خان کے انتقال کے بعد پولیٹیکل

سروس سے فراغت ملی تو 1914ء میں راجہ صاحب محمود آباد کے پرسنل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہاں سے ان کی خدمات یو۔پی سول سروس کے سپرد کر دی گئیں اور ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ جب راجہ صاحب محمود آباد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے تو یلدرم کی ملازمت یونیورسٹی میں منتقل کر دی گئی اور یلدرم 1920ء میں مسلم یونیورسٹی کے اولین رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی میں مالی معاملات میں خورد برد سے متعلق انکوائری شروع ہوئی تو معطل کر دیے گئے۔ رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ (1930ء) کے بعد یونیورسٹی کی انتظامیہ تبدیل ہوئی تو سبکدوش ہو کر بطور ریونیو کمشنر جزائر انڈمان ونکوبار چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر غازی پور اور اناوہ کے ضلعوں میں تعینات رہے۔ 1935ء میں خرابی صحت کی بنا پر پنشن لے لی۔ عمر کے آخری ایام دہرہ دون میں گزارے۔ انہیں گاؤٹ کا مرض لاحق تھا، وفات، حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''احمد'' مطبوعہ: ''علی گڑھ منتھلی''، علی گڑھ: مئی 1906ء

۲۔ ''دوست کا خط'' مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: اکتوبر 1906ء

۳۔ ''غربت و وطن'' مطبوعہ: اردو معلّی، اکتوبر 1906ء

نوٹ: ''نشہ کی پہلی ترنگ'' (ترکی سے خلیل رشدی کے افسانے کا ترجمہ) ''معارف'' علی گڑھ۔ جلد نمبر (۳) شمارہ (۴) اکتوبر 1900ء میں شائع ہوا۔[۲]

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''خیالستان'' (سات افسانے، چھ مضامین اور ایک نظم) ادارہ ''مخزن''، مکلیگن روڈ، لاہور طبع اوّل: فروری 1911

ا۔ 'خارستان و گلستان'' (''مخزن'' میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ گلستان کے عنوان سے جلد ۱۱ شمارہ ۳ جون 1906ء کے صفحات ۱ تا ۱۱ پر خارستان کے عنوان سے جلد ۱۱ شمارہ ۵ اگست ۱۹۰۶ء کے صفحات ۱ تا ۱۱ پر اور شیرازہ کے عنوان سے جلد ۱۱ شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۰۶ء کے صفحات ۱ تا ۹ پر تیسری قسط کے اختتام پر ملخص بھی لکھا گیا ہے)۔ ۲۔ ''دوست کا خط'' ''مخزن'' کی جلد ۱۲ شمارہ ۱ اکتوبر ۱۹۰۶ء کے صفحات ۹ اور ۱۰ پر شائع ہوا۔ ۳۔ ''غربت و وطن'' (''اردوئے معلّی'' علی گڑھ کی جلد ۷ شمارہ ۴ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا) ۴۔ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' (''مخزن'' کی جلد ۱۳ شمارہ ۱، اپریل ۱۹۰۷ء کے صفحات ۲۷ تا ۳۵ پر شائع ہوا)۔ ۵۔ ''نکاح ثانی'' (''مخزن'' کی جلد ۱۲ شمارہ ۳، جون ۱۹۰۷ء کے صفحات ۲۲ تا ۳۵ پر شائع ہوا)۔ ۶۔ ''حکایہ لیلیٰ مجنوں'' (''مخزن'' میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ پہلی قسط جلد ۱۴ شمارہ ۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء کے صفحات ۹ تا ۲۳ پر دوسری قسط جلد ۱۵ شمارہ ۱ اپریل ۱۹۰۸ء کے صفحات ۱۹ تا ۲۶ پر اور تیسری قسط اسی جلد کے دوسرے شمارہ (مئی ۱۹۰۸ء) کے صفحات ۱۲ تا ۱۹ پر موجود)۔ ۷۔ ''اگر میں صحرانشیں ہوتا'' (''مخزن'' کی جلد ۱۴ شمارہ ۳ (دسمبر ۱۹۰۷ء) کے صفحات ۹ اور ۱۰ پر شائع ہوا)۔ ۸۔ ''سودائے سنگیں'' (پہلی قسط ''مخزن'' کی جلد ۱۵ کے شمارہ (۵ اگست ۱۹۰۸ء) کے صفحات ۹ تا ۲۰ پر اور دوسری قسط اگلے شمارے (دسمبر ۱۹۰۸ء) کے صفحات ۸ تا ۲۲ پر شائع ہوئی۔ ۹۔ ''صحبت ناجنس'' (''مخزن'' کی جلد ۱۰ شمارہ ۸ (فروری ۱۹۰۶ء) میں لڑکیاں اور یورپی تربیت کے عنوان سے شائع ہوا

یہ ترکی افسانے کا ترجمہ ہے۔ ۱۰۔ ''ازدواج محبت'' (ترکی افسانے کا ترجمہ)۔ پونے چار سو صفحات کی یہ کتاب میر نیرنگ کی تمہید کے ساتھ شائع ہوئی۔

نوٹ: اس کتاب کا ایک ایڈیشن الناظر بک ایجنسی لاہور، نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ افسانہ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کا خیال پروفیسر شہباز (اورنگ آباد۔ دکن) کے منظوم طبع زاد قصے ''چڑیا چڑے کی کہانی'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۴ بابت: نومبر ۱۹۰۲ء سے مستعار ہے۔ جب کہ اس مجموعے میں یلدرم کا پہلا مطبوعہ افسانہ: ''احمد'' مطبوعہ ''علی گڑھ منتھلی'' مئی ۱۹۰۶ء دکھائی نہیں دیتا۔

۲۔ ''حکایات واحساسات'' (۱۳ افسانے اور ۱۲ مضامین) مسلم یونیورسٹی، پریس، علی گڑھ، طبع اوّل: ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۷۔۱۹۲۶ء

(حکایات) ۱۔ ''آئینے کے سامنے'' ۲۔ ''نشہ کی پہلی ترنگ'' (خلیل رشدی کے ترکی افسانے کا ترجمہ) ۳۔ ''فسانہائے عشق'' (الف ہندوستان کی رقاصہ (ب) مصر قدیم کی محبوبہ ہائے عاشق نواز (ج) بخت نصر کا قیدی۔ ۴۔ ''گمنام خطوط'' (فہرست میں گمنام خط درج ہے) ۵۔ ''بزم رفتگاں'' ۶۔ ''کوسم سلطان'' ۷۔ ''عورت کا انتقام'' ۸۔ ''دامات کا انتخاب'' (احساسات) ۹۔ ''ایک مغنیہ سے التجا''۔ ۱۰۔ ''آہ یہ نظریں''۔ ۱۱۔ ''تیتری''۔ ۱۲۔ ''اے مادر وطن''۔ ۱۳۔ ''ویران صنم خانے''

نوٹ: ''حکایات'' کے حصے کی چند چیزیں خالدہ ادیب خانم کے ترجمے ہیں۔

۳۔ ''حکایات لیلیٰ مجنوں'' (افسانے) الناظر بک ایجنسی، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

اس کتاب کی اکثر چیزیں ''خیالستان'' اور ''حکایات واحساسات'' سے چنی گئی ہیں۔

۴۔ ''ثالث بالخیر'' (ترکی ناول) از احمد حکمت (ترجمہ) طبع اوّل: ۱۹۰۲ء

۵۔ ''زہرا'' ترکی ناولٹ (ترجمہ)

۶۔ ''مطلوب حسیناں'' ترکی ناولٹ (ترجمہ) طبع اوّل: ۱۹۰۲ء

۷۔ ''آسیب الفت'' ترکی ناولٹ (ترجمہ) مکتبہ جامعہ دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۰ء

۸۔ ''ہما خانم'' ترکی ناول (ترجمہ) ادارۂ ادبیب حیدرآباد دکن، طبع اوّل: س۔ن

۹۔ ''ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی'' (بہ اشتراک)

۱۰۔ ''جلال الدین خوارزم شاہ'' (ترکی ڈراما) از نامق کمال (ترجمہ) طبع اوّل: ۱۹۲۶ء

۱۱۔ ''جنگ وجدل'' ترکی ڈراما (ترجمہ)

۱۲۔ ''پرانا خواب'' (طویل نظم ترکی زبان سے ترجمہ)

۱۳۔ ''مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں'' (طویل طبع زاد نظم) علی گڑھ کالج میگزین طبع اوّل: ۱۹۰۳ء

۱۴۔ ''پرانا خواب'' (ڈرامہ۔ ناولٹ)

اس کتاب میں ''پرانا خواب''، ''آسیب الفت'' اور ''مطلوب حسیناں'' تین مختصر کتب یکجا ہیں۔

نظریۂ فن:

''ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر، میں اردو میں اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انہیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔''

سجاد حیدر یلدرم

(''التماس مترجم'' مشمولہ ''ثالث بالخیر'' ۱۹۰۲ء سے اقتباس)



حوالہ جات:

۱۔ ''کارِ جہاں دراز ہے'' از قرۃ العین حیدر میں، یلدرم کی پیدائش قصبہ کانڑیڈ، ضلع جھانسی کی بتائی گئی ہے جب کہ یلدرم اپنی پیدائش موضع نہٹور، ضلع بجنور کی بتاتے رہے ہیں۔

۲۔ سجاد حیدر یلدرم کے ابتدائی دور کے تراجم اور افسانے ''یلدرم (از بغداد)'' کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ ''مخزن'' میں لکھنے والوں کے تعارف کرواتے ہوئے سر عبدالقادر (مدیر ''مخزن'') نے پھبتی کسی: ''یلدرم بغدادی، بغداد کے اوٹ نہیں، مضمون نگار ہیں۔'' اصل قصہ یہ تھا کہ ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد بغداد کے برطانوی کونسل خانے میں ملازمت ملی تو بغداد چلے گئے۔ وہاں تین برس مقیم رہ کر جو کچھ لکھا، اُس پر ''یلدرم (از بغداد)'' اشاعت پذیر ہوا۔

چڑیا چڑے کی کہانی

سجاد حیدر یلدرم

مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور: اپریل 1907ء

''چوں چو چوں، چو چوں'' سب غلط، سب جھوٹ! چڑیا چڑے کی کہانی بہت انسانوں نے لکھی ہے مگر قلم در کف دشمن ست، ''چوں، چو چوں، چوں'' میری اور چڑیا کی لڑائی، بہتان! چڑیا کی آنکھیں دکھنے کا بہانہ کرنا، افترا، چوں، چڑ چوں، چوں چوں، آؤ اب میں تمہیں چند باتیں سناؤں کہ تمہاری آنکھیں کھلیں:

حضرت انسان کو باتیں بنانی بہت آتی ہیں، اور بس مجھ کو خدا نے مشاہدے کی قوت عطا کی ہے۔ ویسے دیکھو تو میں بے وقوف بھولا بھالا ادھر ادھر پھدکتا نظر آتا ہوں مگر میں دیکھتا سب کچھ ہوں، سمجھتا سب کچھ ہوں، کہتا بھی سب کچھ ہوں، مگر تم نہیں سمجھتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ خدا نے مجھے آزاد، آزادی طلب اور آزادی پسند مخلوق بنایا ہے۔ پرندوں اور چرندوں میں بہت سے ایسے ہیں کہ انسان سے بالکل نفرت کرتے ہیں اور جنگلوں میں انسان کے گھونسلوں سے دور جا کے رہتے ہیں۔ بعض بیوقوف ایسے ہیں کہ انسانوں میں انسان کے خادم ہو کے رہتے ہیں، مگر میں انسان کی کارستانیوں کو دیکھنے کے لیے شہر میں رہتا ہوں۔ ان کے بڑے بڑے بھونڈے گھونسلوں میں اپنا پیارا پیارا چھوٹا چھوٹا گھونسلا بناتا ہوں، لیکن وہ پکڑ کے مجھے رکھنا چاہیں تو کبھی نہیں رہتا۔ پنجرے میں بند کر کے رکھنے کی بات دوسری ہے۔ یا میرے پر کاٹ دیں تو وہ اور ہی بات ہے ورنہ میں کبھی حضرت انسان سے مانوس نہیں ہوتا۔ میں انہیں خود غرض سمجھتا ہوں اور پرلے درجے کا ظالم۔

مگر مجھے اپنی کہانی سنانی ہے، ضمناً حضرت انسان سے بھی دو باتیں ہو جائیں گی۔ (پھدک کے اور پروں کو پھیلا کے) خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا اچھا لباس دیا ایک حد تک خوبصورت، مگر نہ اتنا کہ انسان کی حریص نگاہوں کا ہدف بن جاؤں۔ جسم میں پھرتی دی کہ خوشی خوشی پھدکتا پھروں۔ چھوٹے پروں میں پرواز کی تیز طاقت دی کہ انسانوں کی رفیق، ان کی ہم خصال ان کی چہیتی بلی کی دست برد سے بچوں، جسم ایسا موزوں دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا، نہ اتنا بڑا کہ شاہین اور باز مجھ پر جھپٹیں، جیسے وہ کبوتر پر جھپٹتے ہیں، نہ اتنا چھوٹا کہ حشرات الارض کی طرح

بالکل حقیر ہی ہو جاؤں اور کوئی مجھے دیکھے ہی نہیں۔

آواز کیسی اچھی، چوں چوں، چڑ چوں چڑ چوں کہ آپ کے نزدیک اگر یہ خوش آئند نہ ہو تو نہ سہی اور میں خوش ہوں کہ آپ اسے پسند نہیں کرتے لیکن میرے ننھے دل کی خوشی اور طمانیت ظاہر کرنے کے لیے یہ بہت کافی ہے۔ چوں چوں، چڑ چوں۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے بلبل کا ترانہ شیریں اور نالہ رنگین مجھے نہیں دیا ورنہ صیاد اور قفس یہی میرے رفیق ہوتے۔ بے وقوف بلبل کو دیکھئے قفس میں بیٹھ کے بھی گاتی ہے اور اپنی اسارت پر درد انگیز نہیں، دل آویز نالے کرتی ہے اور یہ نہیں سمجھتی کہ یہ اس کی اسیری کو اور بڑھاتے ہیں۔

گل و گلچیں کا گلہ بلبل ناشاد نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اگر ذرا بھی عقل ہوتی، قفس میں پہنچتے ہی خاموش ہو جاتی اور اس وقت تک خاموش رہتی کہ یا قفس کھلتا یا موت آتی۔

میں اڑتا ہوں، پھدکتا ہوں، دانے چگتا ہوں، مگر الحمد للہ کسی کو آزار نہیں دیتا۔ خدا کی زمین سب کے لیے اور اس کے دانے سب کے لیے ہیں یہ فلسفہ قدرت نے مجھے سمجھا دیا ہے اور اس لیے میں سب سے کہتا ہوں آؤ اور خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ جہاں بہت سے دانے ہوئے اور ہم اپنے تمام ہم جنسوں کے ساتھ پہنچے، پھر وہاں اگر اور مخلوق چگ رہی ہے تو میں معترض نہیں ہوتا۔ کبوتر ہوں، مینائیں ہوں، فاختائیں ہوں سب کو صلائے عام ہے سب ساتھ آئیں اور کھائیں۔ میں اکل کھرا نہیں، تنہا خوری میری عادت نہیں۔

حضرت انسان کی بعض باتوں پر مجھے بے ساختہ ہنسی آتی ہے: قہ، قہ، قہ، چوں، چڑ چوں، چڑ، چوں، چوں، چوں کس قدر مغرور، مگر سادہ لوح جنس ہے میرا نام گنجشک خانگی رکھا ہے۔ یعنی جب انسان کے یہ گھونسلے جن میں وہ آج کل رہتے ہیں، نہ تھے اور وہ بہائم کی طرح غاروں اور کھوؤں میں رہتے تھے تو میں نہ تھا؟ میرا گھونسلا نہ تھا؟ یا کیا اب میں سوائے ان کے گھونسلوں کے کسی اور جگہ اپنا گھونسلا نہیں بناتا۔ اب بھی چمن، صحرا، مرغزار، وادی، درخت جھاڑی میرے گھونسلے کے لیے ویسے ہی موجود ہیں جیسے انسان کے گھونسلے۔

میں تو ان کے بے ہنگم، موٹے جھوٹے گھونسلوں میں اپنا گھونسلا صرف اس لیے بناتا ہوں کہ یہاں رہ کر اس ریا کار مخلوق کے کرتوتوں کو اچھی طرح مشاہدہ کروں اور پھر اپنے ہم جنسوں میں بیٹھ کر ان خود بینوں، ان بے وقوفوں، مغروروں کے اوپر ہنسوں، اگر میں انہیں انسان خانگی کہوں تو زیادہ زیبا ہے۔

پھر ان کے گھونسلوں کا حال سنئے، ایک بڑا ہے، ایک چھوٹا ہے، ایک اونچا ہے ایک نیچا ہے، یہ کیوں؟ مساوات کیوں نہیں؟ اسے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے گھونسلوں کے اندر کے خس و خاشاک جنہیں انسان کیا کہتے ہیں، بھول گیا، ہاں! میز، کرسی، فرش فروش مختلف رنگوں کے ہوں، کیونکہ میں بھی کہیں سے تاگا، کہیں سے تنکا، کہیں سے پتا لا کر اپنا گھونسلا بناتا ہوں۔ لیکن، بڑائی چھوٹائی کیوں ہے؟ ہاں، ہاں، یہ خیال نہیں رہا تھا اس کی وجہ معلوم ہوئی میں نے دیکھا ہے۔ چھوٹے گھونسلے والا انسان، بڑے گھونسلے والے انسان کے سامنے سر جھکا کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، لاحول ولا قوۃ، کس قدر بے غیرت مخلوق ہے۔ میں نہ اپنے ہم جنس کی اور نہ کسی غیر جنس کی خدمت کرتا ہوں، اگر مار بھی ڈالو تو خدمت نہ کروں، اور کیوں کروں خدا کے فضل سے ہم سب مساوی ہیں۔ کسی کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی

ضرورت ہے نہ آرزو۔ اپنے بال بچوں کے سوا کسی کی خدمت کرنا، کسی کے گھونسلے پر جا کر دریوزہ گری کرنا عار کی بات ہے، ننگ کی بات ہے مگر انسان وہ مدعیٔ عقل، احمق جو اپنے تئیں درس آموز قدرت خیال کرتا ہے اس نکتے کو نہیں سمجھتا۔

ہائے ریاکار انسان، اس نے ایک لفظ نکالا ہے اور اس پر اسے بہت ناز ہے، کہتا ہے: ''سوائے میرے کسی میں حیا نہیں، سب جاندار سوائے انسان کے بے حیا ہیں، حیا اور شرم کا احساس صرف مجھ میں ہے'' اوڈینگ مارنے والی مخلوق، بس، بس، جسے تو حیا کہتا ہے وہ ریاکاری ہے۔

انسان چڑا اور انسان چڑیا، کبوتر چڑا اور کبوتر چڑیا، دانہ بدلی کرنے اور پوٹا بھرانے میں ایک ہیں۔ میں نہیں جانتا انسان نے یہ عادت کبوتر سے لی ہے یا کبوتر نے انسان کی نقل اتاری ہے۔ میں اس کی تحقیق نہیں کر سکتا کیونکہ کبوتر اگر چہ پرندہ ہے، لیکن ایسا احمق قدر حریت ناشناس پرندہ ہے کہ انسان سے بہت مانوس ہے اور ایسا کاہل ہے کہ اپنے لیے گھونسلا بھی نہیں بناتا، انسان اس کے لیے گھونسلا بناتا ہے اور یہ اس کے عوض میں اس کا درم ناخریدہ غلام بن جاتا ہے۔ وہ اسے پکڑتا ہے مگر پنجرے میں بند نہیں کرتا پھر بھی یہ اس سے نفرت نہیں کرتا اور اڑ نہیں جاتا۔

لیکن کبوتر، گو اسے رات دن غٹرغوں کی ضربیں لگانے اور دانہ بدلی کرنے کے سوائے کوئی کام نہیں (صبح سے شام تک یہ حضرت دانہ بدلی کیا کرتے ہیں اور یہ خیال رہے کہ دانہ بدلی بچوں کا پوٹہ بھرنے کے لیے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ بیچارے بچے اڑ نہیں سکتے اور ان کا پوٹہ ماں باپوں ہی کو بھرانا پڑتا ہے مگر کبوتر یونہی بے فائدہ ایک دوسرے سے چونچ ملایا اور پھڑ پھڑایا کرتے ہیں اور ایک منٹ دو منٹ نہیں، گھنٹوں یوں ہی کیا کرتے ہیں) گو، کبوتر کو اس کے سوا، کوئی اور کام نہیں تاہم سادہ لوح اور صاف دروں مخلوق!..... وہ کبھی انسان کی طرح چھپ چھپ کے دانہ بدلی نہیں کرتا۔

مگر حضرت انسان، ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ دانہ بدلی میں یہ کبوتر سے کم نہیں بلکہ بڑھے ہوئے ہی ہوں گے مگر وہی خود ایجاد حیا اور شرم کی پابندی سے اپنے گھونسلوں میں چھپ چھپ کے لیکن پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ حیا، شرم نہیں ہے بلکہ وہ ریاکاری ہے۔ جو گھونسلوں میں وہ چوری چھپے کرتے ہیں، جسے وہ علانیہ نہیں کر سکتے۔

کل ہی کی تو بات ہے یہ تمہارے پڑوس کے گھونسلے میں کئی انسان چڑیا بیٹھے تھے۔ میں اوپر چھت میں تھا، وہ اپنی زبان میں چوں چوں کر رہے تھے، میں اپنی زبان میں چوں چوں کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس گھونسلے کے ایک حصے میں جسے تم کمرہ کہتے ہو، اور سب انسان تو چلے گئے بس ایک انسان چڑا اور ایک انسان چڑیا، یا تمہاری زبان میں میاں بی بی رہ گئے۔ اب انہوں نے دانہ بدلی شروع کر دی اور پھر وہی پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ تم کہو گے اس میں ریاکاری کی کون سی بات ہوئی؟ سنئے۔ جب ان کے ہم جنس بیٹھے تھے، تو اس وقت انہوں نے یہ باتیں کیوں نہ روا رکھیں؟ اگر کہو شرم کی وجہ سے، بہت خوب! تو بعد میں بھی تو میں کمرہ میں موجود تھا، پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید انہوں نے مجھے دیکھا نہیں، اس لیے میں اڑ کے اور پھڑ پھڑا کے ان کے قریب میز پر جا بیٹھا، کرسی پر جا بیٹھا، وہاں سے اڑ کے دیوار میں جو تصویر لگی ہوئی تھی، اس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا، تب بھی ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اپنے کام سے کام! آخر میں نے زور سے چلانا شروع کیا: ''میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں، چوں، چوں، چوں۔'' مگر بے حیائی دیکھئے، مجھے دیکھ کے دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھے نہایت غصہ آیا اور میں ان کو گالیاں دیتا ہوا پھر سے کمرے سے باہر اڑ گیا۔ فرمائیے! آپ ہی فرمائیے! آپ اسے کیا کہتے ہیں، حیا یا ریاکاری؟

اسی ایک بات پر کیا منحصر ہے، حضرت انسان کے ڈھنگوں سے میں خوب واقف ہوں۔ کوئی مجھ سے پوچھے کوئی لاکھ بار تو میں نے انسان چڑے کو انسان چڑیا کے سامنے ادعائے وفاداری کرتے سنا ہوگا۔

''آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں'' بے چاری بھولی بھالی چڑیا اسے یقین کرتی ہے اور محبت کی آنکھوں سے، ان آنکھوں سے، جن سے آنسو اور احسان مندی ٹپکتی ہوتی ہے اسے دیکھتی ہے۔ یہ ایسا منظر تھا کہ شروع شروع میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا، لیکن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی انسان چڑا دوسرے دن دوسرے گھونسلے میں دوسری چڑیا سے (پہلی چڑیا کی نظروں سے دور) کہہ رہا ہے: آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں۔'' اور یہ بیچاری معصوم چڑیا بھی اس دھوکے باز کے پھندے میں پھنس جاتی ہے اور اپنا محبت بھرا دل اس کے سپرد کر دیتی ہے۔

تیسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ وہی چڑا ایک اور گھونسلے میں ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہے'' آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں'' اور تیسری تشنہ محبت بھی، ان باتوں پر یقین کر کے، دل ہار بیٹھتی ہے۔ آخر کار ایک دن آتا ہے کہ تینوں کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اور یا کنوؤں سے چند جان باختہ انسان چڑیوں کی لاشیں نکلتی ہیں یا افیم انہیں ابدی نیند سلا دیتی ہے۔

دل چاہتا ہے، اس ناپاک مخلوق کو ٹھونگیں مار مار کر مار ڈالوں۔ یہاں چڑیا بول اٹھی۔ ''چڑے کا قطع کلام تو ہوتا ہے مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ انسان چڑیا کا بھولا پن یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرا چڑا، میں اس کے سامنے کہتی ہوں، کچھ ڈرتی تھوڑا ہی ہوں، رات دن، مجھ سے کہا کرتا ہے'' تم بے حد خوبصورت ہو، تمہاری برابر دنیا میں کوئی خوبصورت نہیں'' مگر خوشامد سے میرا دماغ نہیں چل جاتا۔ میں اس کان سنتی ہوں اور اس کان اڑا دیتی ہوں، کیونکہ گو اس کی نظروں میں میں خوبصورت ہوں، لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں۔ اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں، مگر کہیں آدم نے حوا سے کہہ دیا تھا کہ'' تم بہت خوبصورت ہو'' بس وہ دن اور آج کا دن کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں ہٹتا۔ آئینہ نہیں تو آرسی ہے، آرسی نہیں تو پانی میں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے اور اپنے عکس کو دیکھ دیکھ کے خود ہی جھوما کرتی ہے اور مارے غرور کے زمین پر قدم نہیں رکھتی۔ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامد کی باتیں ہیں اور بس۔

پھر گھر میں بیٹھی، چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے اور چڑا اس کی غیبت میں رنگ رلیاں مناتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ ''مال عرب پیش عرب'' ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں اس نکتے کو سمجھتی ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں۔ یہاں تک کہ تدارک معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں۔ میں چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی۔'' چڑے نے پھر کہنا شروع کیا'' اب مجھے دیکھیے یہ کچھ غرور اور ستائش کے طور پر نہیں کہتا اور اپنی پیاری چڑیا کو سنانے کے لیے کہتا ہوں۔ بلکہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں ایک، بس ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں، ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں، میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کے ساتھ پیمان وفا باندھتا ہوں اور اس پیمان کو نہیں توڑتا، مگر یہ کہ موت آ کے اسے توڑ دے۔

میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری کل حرکتوں کی نگرانی کرے میں جہاں جاؤں، جس مجلس میں پہنچوں میرے ساتھ ہو، لڑائی لڑوں تو میرا دل بڑھائے چہکوں تو میرا نغمہ بنے، انسانوں کی طرح ہم علاحدہ علاحدہ زندگی بسر نہیں کرتے۔

میں (سچ کہنا چاہیے) کبھی کبھی اپنے پر دوسری چڑیا کے لیے بھی پھلا دیتا ہوں، لیکن یہ محض شوخی اور کلیل ہوتی ہے۔ اس سے کوئی خاص ارادہ مقصود نہیں ہوتا اور میری چڑیا بھی اسے جانتی ہے۔ اس لیے نہ وہ ناراض ہوتی ہے اور نہ میری طرف سے اس کے دل میں شبہ بیٹھتا ہے۔

لو، تم سے باتیں کرنے میں میں بھول ہی گیا کہ مجھ پر فرائض پدری ہیں۔ میں انسان باپوں کی طرح نہیں کہ اکثر اپنے عیش میں اپنے بال بچوں کا خیال تک نہیں کرتے بلکہ بعض تو ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ دیتے ہیں، نان ونفقہ بھی نہیں دیتے۔ میں ایسا بے غیرت نہیں، جب ان بچوں کو دنیا میں لانے کا میں ہی سبب ہوا ہوں، تو جب تک خود نہ اڑ سکیں، میں خود بھوکا رہوں گا لیکن ان کا پوٹہ بھروں گا۔ بڑی دیر ہوگئی، وہ چونچ کھولے انتظار میں بیٹھے ہوں گے، ہاں ذرا مجھے دانے یا روٹی کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر تو ڈال دو۔''

آہا، تم نے میری خواہش پوری کی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں، خدا تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے پوتوں کو بھی ہمیشہ بھرا رکھے۔ لو اب جاتے ہیں۔

ع ''پھر ملیں گے اگر خدا لایا''

اور یہ کہتے ہوئے دونوں پھر سے اڑ گئے۔

سلطان حیدر جوش

نام : سلطان حیدر
قلمی نام : جان بُل/ سلطان حیدر جوش
پیدائش : ۹ نومبر ۱۸۸۶ء بہ مقام دہلی[۱]
وفات : ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء بہ مقام علی گڑھ
تعلیم : میٹرک/ انٹر میڈیگ

ابتدائی تعلیم شیخو پورہ، بدایوں میں حاصل کی۔ مشن اسکول بدایوں میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور ایک سال بعد انہیں دہلی منتقل کر دیا گیا۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک کے خلاف طلبہ نے جو ہنگامہ کیا، اس کے سرکردہ لیڈر تھے اور جان بُل کے نام سے مشہور تھے، نتیجہ میں ان کا نام علی گڑھ کالج سے خارج کر دیا گیا اور انہوں نے فورتھ ایر ہی میں تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔[۲]

مختصر حالات زندگی:

شیخو پور، بدایوں کے فریدی خانوادے کے رئیس نذیر الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلیٰ شیخ شرف الدین تھے جبکہ والدہ کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب حکیم احسن اللہ دہلوی سے ہوتا ہوا ۳۲ ویں واسطے سے حضرت بابا فرید گنج شکر سے جاملتا ہے۔ اسی مناسبت سے ''شیخ فریدی'' کہلاتے تھے۔ نذیر الدین، جدی پشتی رئیس تھے، سوان کے طور اطوار کے سبب، جوش کی والدہ نے زیادہ وقت میکے (دہلی) میں گزارا۔ یوں جوش کا بچپن دہلی میں گزرا اور ابتدائی تعلیم و تربیت والدہ کے زیر اثر ہوئی۔ مولوی عبدالسلام سے علم منطق اور گنجفہ سیکھا۔ لڑکپن میں گنگناہٹ سے شاعری کا کیریئر شروع کرنا چاہا لیکن جوانی میں چپ لگ گئی۔[۳]

سلطان حیدر جوش کو تم جانتے نہیں
وہ ایک ہی تو لوگ ہیں پہچانتے نہیں

سلطان حیدر جوش اپنے خاندان کے پہلے انٹر پاس انگریزی داں تھے اور انگریز سرکار کے وفادار۔ دیگر رؤسا کی گوناگوں دلچسپیوں کے علاوہ کسرت، ڈنڑ بیٹھک، کشتی اور گھڑ سواری سے شوق رکھتے تھے اور اپنے وقت کے شہ زور پہلوان تھے۔ خوبصورتی اللہ کی دین تھی اور تن سازی ان کا اپنا کمال۔ علی گڑھ کالج سے بے دخلی کے بعد ۱۹۱۳ء تک بے کاری کے دن گزارے۔ ۱۹۱۲ء میں ان کے چچا خان بہادر ممتاز الدین کی سفارش پر لارڈ میسٹن نے جوش کو نائب تحصیلدار کی ملازمت پر فائز کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں ہردوئی کے مقام پر قیام رہا۔ نائب تحصیلداری اور تحصیلداری سے ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے تک اپنے سرکاری بنگلوں میں اکھاڑہ بنواتے اور کشتی سے شوق فرماتے رہے۔ اس شوق سے ایڈمنسٹریشن میں خلل پڑا تو ان کے والد نے اکھاڑہ بند کروا دیا۔ ۱۹۳۸ء میں مین پوری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ۱۹۴۶ء میں بطور ڈپٹی کلکٹر پینشن پائی تو اپنے آبائی علاقے شیخو پور کی بجائے علی گڑھ میں میرس روڈ پر خالد منزل کو مستقل ٹھکانہ بنایا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے فاؤنڈر ممبر تھے۔ بیکٹر کے پیٹے میں اپنا رنگین افسانہ ''حلالہ'' قلم بند کیا جو غالباً ان کا آخری افسانہ تھا۔ آخری عمر میں قوت سماعت سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی ایک بیٹی عابدہ کی شادی ہندوستان کے صدر فخر الدین علی احمد کے ساتھ ہوئی، دوسری بیٹی علی گڑھ کے گرلز کالج میں پروفیسر تھیں۔ بیٹے کا نام احسان حیدر جوش تھا۔ جوش صاحب نے سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ ساری اولاد زندہ چھوڑی۔ دمِ آخر دو لڑکیاں اور ایک نواسی اُن کے قریب موجود تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

جان بُل کے قلمی نام سے ایک مزاحیہ تحریر مولانا شوکت علی کے رسالہ ''اولڈ بوائے'' کے لیے اپنی یادوں کے حوالے سے لکھی۔
ابتدائی تحریریں ''کامریڈ''، ''نقیب'' اور ''تمدن'' میں شائع ہوئیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''نابینا بیوی'' مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور شمارہ نمبر (۳) دسمبر ۱۹۰۷ء بہت ممکن ہے رسالہ ''نقیب'' یا ''تمدن'' بابت ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۶ء میں سلطان حیدر جوش کا کوئی افسانہ شائع ہوا ہو، جس کا دعویٰ وہ اکثر کیا کرتے تھے۔[۳]

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''مہر کی دیوی'' (ایک افسانہ/کتابچہ) مطبوعہ: عزیزی پریس، آگرہ طبع اوّل: ۱۹۲۶ء سے قبل

۲۔ ''مساوات'' (ایک افسانہ/کتابچہ)
(یہ افسانہ بعد میں ''فسانہ جوش'' میں شامل کر دیا گیا۔)

۳۔ ''اتفاقاتِ زمانہ'' (ایک افسانہ/کتابچہ) مطبوعہ: الناظر پریس، لکھنؤ طبع اوّل: ۱۹۱۴ء
(یہ افسانہ بعد میں ''فسانہ جوش'' اور ''جوش فکر'' نامی مجموعوں میں شامل کر دیا گیا۔)

۴۔ ''فسانہ جوش'' (۶ افسانے اور ۹ مضامین) مطبوعہ: الناظر پریس لکھنؤ طبع اوّل: ۱۹۲۶ء

اس کتاب میں ''مساوات'' (مطبوعہ: ''الناظر'' مئی ۱۹۱۲ء) ''پھر بھی عمر قید'' (مطبوعہ: ''الناظر'' اپریل ۱۹۱۳ء) ''طوق آدم'' (''الناظر'' مارچ ۱۹۱۴ء) ''تلاش عجیب'' (''الناظر'' یکم جنوری ۱۹۱۵ء) ''اتفاقات زمانہ'' (''الناظر'' جون ۱۹۱۴ء) ''اعجاز محبت'' (''الناظر'' یکم اپریل ۱۹۱۶ء) کل چھ افسانے اور نو مضامین بہ عنوان ''انکشاف حقیقت''، ''عمر قید سے کس طرح رہائی اور نتیجہ''، ''آئینہ خود نما''، ''نرگس خود پرست''، ''اتفاقات زمانہ''، ''سنسر''، ''جدید دوستی''، ''مرد یا عورت''، ''قرض و مقراض'' اور ''پہلا گناہ'' شامل ہیں۔ یہ سلسلۂ الناظر کی دوسری کتاب ہے۔

۵۔ ''جوش فکر'' (۵ افسانے اور ۶ مضامین) مطبوعہ: ڈسٹرکٹ گزٹ پریس، علی گڑھ طبع اوّل: س۔ن

کتاب میں شامل ''التماس'' از مرتب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ''فسانہ جوش'' کے بعد شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ''مسٹر ابلیس'' (مطبوعہ ''مخزن'' لاہور جولائی ۱۹۱۱ء) ''ہاں! نہیں!''، ''خواب وخیال'' (مطبوعہ: ''نقیب'' فروری ۱۹۲۰ء)، ''جذب دل کی دو تصویریں'' (مطبوعہ: ''ہمایوں'' لاہور، ۱۹۲۲ء) ''اتفاقات زمانہ'' کل پانچ افسانے اور ۶ مضامین بہ عنوان ''طلسم ازواج''، ''معما''، ''جنون ترقی''، ''لیڈر''، ''عالم ارواح'' اور ''خانہ جنگی'' شامل ہیں۔

۶۔ ''ابن مسلم'' (ناول) دارالبلاغ، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۲۶ء طبع دوم: ۱۹۵۲ء۔ سے قبل،

۷۔ ''نقش ونقاش'' نظامی پریس، بدایوں، طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

(ناولٹ سمرسٹ ماہم کے ''The Moon and Six Pence'' سے ماخوذ۔)

۸۔ ''نواب فرید'' نظامی پریس، بدایوں طبع اوّل: ۱۹۱۷ء

(یہ کتاب بانی شیخو پور، بدایوں محتشم خان نواب فرید کی سوانح ہے۔)

۹۔ ''اصلاح سخن'' (مختلف شعراء کے کلام پر اساتذہ کی اصلاح/تحقیق)

۱۰۔ ''ہیری'' (ایک انگریزی ناول کا ترجمہ/کتابچہ) مطبوعہ: دہلی طبع اوّل: ۱۹۰۶ء

۱۱۔ ''ہوائی'' نظامی پریس، بدایوں، طبع اوّل:

(ناولٹ۔ ارنسٹ ہیمنگوے کے ''A Farewel To Arms'' سے ماخوذ)

غیر مدون

اس دور کے مشہور ادبی پرچوں ''صوفی''، ''الناظر''، ''مخزن''، ''ہمایوں''، ''تمدن''، ''کامریڈ'' اور ''نقیب'' کی فائلوں میں جوش کے متعدد مضامین اور افسانے بکھرے پڑے ہیں۔ محض رسالہ ''مخزن'' لاہور میں مندرجہ ذیل چیزیں دستیاب ہیں۔

۱۔ ''انقلاب'' (طویل مختصر افسانہ)، پہلی قسط ''سوتیلی ماں'' اپریل ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۱)، کے صفحات ۴۸ تا ۵۴ پر، دوسری قسط ''خدیجہ'' مئی ۱۹۰۹ء، (جلد ۱۷، شمارہ ۲ کے صفحات ۳۸ تا ۴۴ پر، تیسری قسط ''زبیدہ'' جون ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۳) کے صفحات ۱۳ تا ۳۶ پر، چوتھی قسط جولائی ۱۹۰۹ء، (جلد ۱۷، شمارہ ۴) کے صفحات ۵۷ تا ۶۰ پر، پانچویں قسط اگست ۱۹۰۹ء، (جلد ۱۷، شمارہ ۵) کے صفحات

۵۵تا۵۸پر اور آخری قسط ''شیر علی'' کے بعد ''فتح یاب زبیدہ'' ستمبر ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۶) کے صفحات ۴۱ تا ۵۱ پر)

۲۔ ''دل'' (مضمون) مئی ۱۹۱۰ء (جلد ۱۹، شمارہ ۲) کے صفحات ۲۵ تا ۳۰)

۳۔ ''تائیدِ غیبی'' (افسانہ) ستمبر ۱۹۱۱ء (جلد ۲۲، شمارہ ۶) کے صفحات ۲۷ تا ۳۸

۴۔ ''فرقِ مراتب'' (مضمون) نومبر ۱۹۱۸ء (جلد ۳۶، شمارہ ۱۱) کے صفحات ۳۹ تا ۵۱)

ان افسانوں اور مضامین کے علاوہ ''شباب'' کے عنوان سے ایک ناول بھی غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

خالد منزل، میرس روڈ، علی گڑھ (بھارت)

نظریۂ فن:

''میں نے ہمیشہ افسانہ اس وقت لکھا جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی، کبھی یہ تحریک دفعتاً وجود میں آئی اور کبھی مہینوں میں اس حد تک پہنچی کہ میں پوری طرح اس کو محسوس کر سکا۔ اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے، کبھی صحبت احباب، کبھی ریل کا سفر، کبھی کسی مقام کی سیر اور کبھی غیر معمولی واقعات کا مشاہدہ..... ایسی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار کے لیے افسانہ بنانا ہے، یہ مرحلہ اکثر و بیشتر میں نے رات کی تنہائی میں اور کچھ نہیں تو حقہ کی امداد سے، پلنگ پر لیٹے ہوئے طے کیا، واقعہ یہ ہے کہ تحریک صادق کے ساتھ محض ایک خیال، ایک مخصوص جملہ، ایک غیر معمولی تصویر یا ایک نیا مصالحہ دماغ میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اس مخصوص تحریک کو افسانہ کے سانچے میں ڈھالنا بالکل ایسا ہی کام ہے، جیسے گوندھی ہوئی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ برنگ کھلونے بنانا۔''

سلطان حیدر جوش

* (بہ حوالہ: ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں'' مرتبہ: حکیم محمد یوسف حسن
دارالادب پنجاب، بارود خانہ، لاہور، طبع اوّل: س۔ن)



حوالہ جات:

۱۔ اکثر کتب میں سلطان حیدر جوش کا سال پیدائش ۱۸۸۸ء درج ہے جو درست نہیں۔

۲۔ مختلف کتب نیز ''بہترین انشائی ادب'' مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں انہیں سال ۱۹۱۳ء میں بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے متعلق بتایا گیا ہے جو درست نہیں۔

۳۔ بہ حوالہ: ''پہلی کرسی کے حضور'' از ابوالفضل صدیقی مطبوعہ: ''سیپ'' کراچی ۱۹۸۸ء۔

۴۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے ''اردو افسانے کا ارتقاء'' مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی (پنجاب یونیورسٹی) میں جوش کی افسانہ نگاری کی ابتداء کا زمانہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۰ء بتایا ہے جو درست نہیں۔

طوقِ آدم

سلطان حیدر جوش

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں رسالہ یا اخبار کے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے "ضرورت ہے" والے کالم کو کیوں پڑھتا ہوں اور اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں اس کا جواب صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ پر ہوتے اور آپ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میری کالج کی زندگی ایک عجب آزادی کے ساتھ گزری ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب نہیں ہوا۔ کبھی امتحان دینے کے بعد مجھے اپنی کامیابی کا یقین نتیجہ آنے سے پیشتر نہیں ہوا۔ مجھے کتاب کے نام سے بلا کسی استثنا کے نفرت تھی۔ اگر کبھی اخبار وغیرہ کے دیکھنے کی خطا مجھ سے سرزد ہوتی تھی تو محض اس خیال سے کہ کسی نئے اشتہار کو معلوم کرسکوں۔ ریاضی سے مجھے اسی قدر لگاؤ تھا جس قدر ایک مسلمان کو ہوسکتا ہے۔ لاجک سے مجھے ایک ناقابل بیان الجھن ہوتی تھی اور فلاسفی سے مجھے للّہی بغض تھا۔ میں خود تعجب کرتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے بی اے کا ڈپلومہ کس طرح پالیا۔

مستقل مزاجی مجھ سے اس طرح کوسوں بھاگتی تھی جس طرح لاحول سے شیطان۔ ہمیشہ ایک ہی چیز کو اچھا کہنا میری رائے میں اوّل درجہ کی جہالت تھی۔ میں کبھی فٹ بال ٹیم کے ساتھ ٹور پر جاتا تھا اور کبھی روزانہ سب کی استدعا پر بھی روزانہ کھیل میں شریک ہونے سے گھبراتا تھا۔ کالج کی زندگی نے مجھے "سیماب" کا خطاب دلوا دیا تھا، اور میں اسی خطاب سے عام طور پر مشہور تھا۔ ایسی طبیعت اور ایسا دل لئے ہوئے میں نے ڈگری لینے کے بعد سارے کالج کو خدا حافظ کہا۔ ایک بھری دنیا میری اپنی بے شمار دلچسپیوں کے ساتھ میرے سامنے موج زن تھی، اور میں ناتجربہ کار، ناواقف، حیران۔ ان کے ساحل پر کھڑا سوچتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے کود پڑوں یا نہیں۔

یہ سن لیجئے کہ میں اپنے فرسٹ ایئر کے زمانے میں اپنے جونیئر، کم عمر، دوست کے بار بار کہنے پر اس کے ساتھ بمبئی گیا تھا۔ میں کالج میں اسی سال پاس ہو کر شامل ہوا تھا، اور وہ یعنی جرائسٹ انٹرنس میں تھا۔ آپ کو جرائسٹ کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔ مگر یہ بھی ایک خطاب مجھ

لیجئے۔ جو اس کو تیسری جماعت کے زمانے میں ملا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک روز اپنی ریڈر کے یاد کرنے میں با آواز بلند مشغول تھا اور ''سی۔ایچ۔آر۔ایس۔ٹی۔ کرائسٹ بہ معنی عیسیٰ'' کی رٹ لگا رہا تھا کہ کسی بڑے طالب علم نے سن پایا اور بس اسی روز سے وہ ''کرائسٹ'' مشہور ہوگیا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنی عمر میں سب سے پہلے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میں اسی کے یہاں مہمان ہوا، اور یہ بھی سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کی والدہ اور اس کی نوعمر چھوٹی بہن نے مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ بمبئی سے پردہ، گدھے کے سر سے سینگ سے زیادہ مفقود ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہاں لوگ نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ میری رائے میں پردہ کیسی سے کیسی معتدل شکل میں بھی ایک نہایت وحشیانہ حرکت ہے...... ممکن ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نہ ہوں مگر آپ کی کمزوری کا جواب وہ سوائے آپ کے اور کوئی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس گھر میں جو راحت مجھے اس قلیل زمانے میں ملی، میں اس کو کبھی نہ بھول سکا۔ اور اس گھر والوں کا بے حد خلق اور مہمان نوازی میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہی۔ دماغ پر تو اس وجہ سے کہ اس کے بعد سے کرائسٹ کے والدین کو ہمیشہ خط لکھتا رہا اور وہ انتہائے انسانیت کے ساتھ برابر جواب دیتے رہے اور دل پر اس وجہ سے کہ...... خیر اس کی نسبت آگے چل کر معلوم ہوگا۔

ہاں اس جملۂ معترضہ کو چھوڑیئے۔ میں نے جب کالج چھوڑا تو اپنا سامان وغیرہ ڈھونے سے فراغت حاصل کرتے ہی مجھے بمبئی کی لو لگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں۔ مگر کوئی چیز تھی جو مجھے زبردستی لے گئی۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ دن کو گشت لگاتا تھا شام کو سمندر کے کنارے دل دماغ کو تازہ کرنے جاتا تھا۔ مگر پھر یہ سوچتا تھا کہ آخر میں اس بحرِ ناپیدا کنار میں کود پڑوں یا نہیں!

کرائسٹ کے والدین مجھے قریب قریب روز ملتے تھے اور قریب قریب روز مجھے اپنے مکان میں اٹھا لے جانے پر مجبور کرتے تھے مگر میں خدا جانے کس کشمکش میں مبتلا تھا۔ میرے دل کو ایک گونہ تسلی بلا ناغہ ہوتی رہتی تھی اور میری آنکھیں اپنا مشغلہ روز کم از کم ایک مرتبہ ضرور پا لیتی تھیں۔ مگر میں پھر بھی یہی سوچتا تھا کہ آخر اس تموج جادو فریب میں کود پڑوں یا نہیں۔

ایک ایک معمولی واقعہ بیان کرنا گویا داستان کہنا ہے اور سلسلہ وار کہتا گانا ایک دقیانوسی طریقہ ہے۔ میں بلا تفریق ہر پرانی حرکت سے متنفر، لہٰذا اس قدر سن لیجئے کہ میں بھی آخر کار اس دل فریب بحرِ ذخار میں کودا، کودا اور آنکھیں بند کر کے کودا۔ دوسرے سال کے جاڑے میں میں اپنے ڈرائنگ روم میں کرائسٹ کی نوعمر بہن حمیدہ سے، یانی زمانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا تھا'' کیوں پیاری! آج تو غضب کی سردی ہے۔ بدن کانپا جاتا ہے۔''

2

میں غالباً کہہ چکا ہوں اور میری ہیئت بھی ہر دیکھنے والی کو بتا سکتی ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں اور نہ خدانخواستہ کسی حالت میں کولہو کا بیل بننے کے لیے تیار ہوں کیونکہ مستقل مزاج اور کولہو کا بیل میری نظر میں ہر لحاظ سے مرادف نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو میں آج پسند کرتا ہوں، کوئی وجہ نہیں کہ کل بھی اسی کو پسند کروں۔ مجھے اس منطق کے صغریٰ و کبریٰ میں حصہ مشترک ہی مفقود نظر آتا ہے، جو شخص مستقل مزاجی کا حامی ہو۔ وہ بشرطِ فرصت مجھ سے تبادلہ خیالات کر سکتا ہے۔ خدا جانے یہ بوسیدگی دماغ کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ زمانے کے ساتھ برابر بڑھتے رہنا اور مستقل مزاجی کے معنی یہ ہیں کہ معاف فرمایئے۔ تھکے اونٹ کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانا۔

دراصل میرا مزاج اور میری طبیعت انگلینڈ کا موسم تھی! کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل میری حالت کیا ہوگی۔ میں کس بات میں دلچسپی لوں گا اور کس بات سے نفرت کروں گا۔ میں اس زندگی کا عادی تھا اور میرے لئے اس کو چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسے مچھلی کا پانی کو چھوڑنا۔ میں کبھی کسی ایک چیز کا مداح برابر نہیں رہا، اور خدا کا شکر ہے کہ تقلید کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی مگر یہ سچ ہے کہ حمیدہ نے میری اس عادت کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ میری گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی طبیعت کو تاڑ گئی تھی، اور میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ مجھے روز نئے نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔ یہ ایک فیکٹ ہے کہ وہی ایک پہلی چیز تھی جس سے میں کبھی نہیں اکتایا۔ وہی پہلی صورت تھی جس سے میرا دل کبھی سیر نہیں ہوا۔ وہ میری طبیعت کے ساتھ ساتھ روزانہ چمٹ جاتی ہو یا کسی اور طرح میں قطعی نہیں بتا سکتا کہ وہ مجھے چھ مہینے خوش اور مطمئن رکھنے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔

اس کی حقیقت اگر میں بلا کم و کاست بیان کروں تو غالباً آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی بیوی کو رشک پروین بنانا چاہتا ہوں یا میں خود اس کے پیچھے رشک قیس بن گیا ہوں۔ مگر پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیس عامری اور فرہاد ایرانی دونوں میری نظر میں اول درجہ کے مخبوط الحواس تھے۔ میں ایسے عشق کو جہالت سمجھتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ایسے آندھی اندھیر، جذبہ عشق میں سوائے حیوانیت کے اور کچھ نہیں۔ شاعروں نے اس کو چار چاند لگانے میں بہت کچھ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا ہے مگر سرے سے شاعروں ہی کی حقیقت میری نگاہ میں کچھ نہیں۔ میں نفس شاعری میں ہی کوئی بات قابل ستائش نہیں پاتا۔ شاعری اور دنیا کی اور بہت سی فضولیات سب ایک قطار میں ہیں۔ تضیع اوقات کے لیے اب دنیا نے شاعری سے زیادہ دلچسپ مشغلے ایجاد کر لئے ہیں۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔ آپ کی یا اور کسی کی آنکھوں سے دیکھوں آپ یقین کیجئے موسیقی اور شاعری میں اگر کچھ اثر مانا جاتا ہے تو میں ''واٹر پروف'' کی طرح ''میوزک پروف'' یا ''پوئٹری پروف'' ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کسی بات میں شاعری کرنی نہیں چاہتا۔ اس لیے میرا یہ کہنا کہ حمیدہ میرے نقطۂ خیال سے تمام خوبیوں اور حسن دلفریب سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کے لیے نہایت موزوں تھی۔ البتہ اس میں صرف ایک عادت تھی جو آخر میرے مزاج کے خلاف ثابت ہوئی۔

وہ میرا ہی دل لبھانے کے لیے سہی روز نت نئی صورت و لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اس کی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غضب تھا۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا، اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ دلکش، سب سے زیادہ دلفریب، نیچر کی انتہائی صنعت، تہذیب اور ترقی کی نقش آخریں وغیرہ وغیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ خودستائی اس میں بھڑک اٹھتا، اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا نام...... کالج کا نام...... سیماب تھا۔

اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے خوبصورت سننا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں، اور میں کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطب شمالی، قطب جنوبی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حسن کی تعریف سننا نہیں چاہتی

تھی، اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں باد صرصر کا طوفان کہے جا سکتے ہیں، اکثر واقع ہوتے تھے، لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اوپر ہی اوپر اتر جایا کرتی تھیں۔ اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز میں اس وقت جبکہ وہ اپنے ٹائلیٹ سے یا بالفاظ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ ہو چکی تھی، اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبی اور حسن بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی تھی۔ میں ایک تصویر، انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹریس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ غالباً وہی خودنمائی اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آ کر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے نظارے میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلۂ خودنمائی زیادہ مشتعل ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی اور میں نے آخرکار کہا۔

''پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹرس کس قدر خوبصورت ہے!''

''کیا خاک خوبصورت ہے، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا۔

وہ یہ چاہتی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ غور کے ساتھ اس کو سر تا پا دیکھ تو لوں، اور مجھ پر یہ جن سوار تھا کہ اسے میری ہاں میں ہاں ملانی چاہیے۔ میں نے تصویر پر نظر جمائے ہوئے پھر کہا۔ ''بھلا کیا کہتی ہو؟ اس کی آنکھیں تو دیکھو۔ اس کے بال تو دیکھو؟''

''ہزار حسینوں کی ایک حسین سہی۔ مجھے کیا؟ میں نہیں سمجھ سکتی۔ تم ایسی فضول باتوں میں کیوں اپنا اور میرا دونوں کا سر پھرایا کرتے ہو۔''

''سچ یہ ہے کہ دن کو دن کہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں تو صرف اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ اگر تم اس کے خلاف ہو تو یہ تمہاری ذاتی رائے ہے۔ جس میں ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی پوشیدہ ہو۔ مگر اختلاف رائے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی آزاد رائے ظاہر نہ کر سکوں، اور سینکڑوں سوالات کو محض تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے ایک کاک لگی ہوئی بوتل کی طرح اپنے میں بند رکھوں۔''

یہ بحث برابر بڑھتی چلی گئی۔ مجھ پر اور اس پر، دونوں پر اپنی محبت کے موافق ایک جن سوار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ یہ آندھی بلا نقصان عظیم کے نہیں اتری۔ حمیدہ نے بات بڑھ جانے پر اپنی ریشمیں نقاب اٹھائی اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں نے گاڑی کے باہر جانے کی آواز سنی اور اس وقت مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا فقرہ، جو وہ تمسخر کے طور پر ہمیشہ کہا کرتا تھا، یاد آیا کہ ''شادی کر اور بربادی لے۔''

3

پہلے روز تو میں اپنے اسی خیال میں مستغرق رہا۔ میری نگاہ میں حمیدہ کی یہ دیدہ دلیری ناقابل عفو جرم نظر آتی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس بھی تھا۔ افسوس اور بے حد افسوس۔ صرف اس بات کا افسوس کہ میں نے اپنی بیش بہا آزادی کو محض وہ فتنہ زا آنکھوں، وہ دلکش رخساروں اور چند ایسی ہی دلفریب چیزوں کے عوض کیوں غارت کر دیا۔ میری رائے میں اس وقت شادی ''زر دادن و درد سر خریدن'' سے زیادہ وقیع چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میں مرحوم غالب کی رباعی کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھ رہا تھا۔

به آدم زن به شیطان طوق لعنت
سپردند از رہ تکریم و تبجیل
ولیکن درد اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لیے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کیے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادمہ کی ضد تھی کہ پہلے برتن دیکھ لیے جائیں، وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کیسی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب وکتاب ناممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سب سے برابر آتی ہوگی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہیے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قلابہ کے اسٹیشن پر اتری تھی۔ بفرض محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہر جگہ پہنچنا۔ میرے دل ودماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جا کر خوشامد کرتا یا دو ایک کو درمیان میں ڈال کر اور زیادہ تشہیر کرتا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ مجھے اس سے پہلے سوچنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا، کیونکہ سوچنا میرے خیال میں ایک بہت نازیبا بات ہے۔ اس سے انسان کی پیشانی پر جھریاں پڑتی ہیں۔ اس سے طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے عمر زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے آدمی بڈھا ہو جاتا ہے اور؟ اور کیا نہیں۔ اس سے تمام نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں۔ بہر حال بندہ مجبور ولاچار۔ سوچنا ہی پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی چیز دماغ میں بجلی کی روشنی کی طرح پرتو افگن ہوئی۔ میں فوراً اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس قدر عرصہ میں گھڑی کی بڑی سوئی نے ۲۰ منٹ کا فاصلہ طے کیا، اسی قدر عرصہ میں میں نے اپنا راستہ ختم کرلیا۔ ۲۰ منٹ کے اختتام پر میں...... روزانہ اخبار کے آفس میں مینجر سے نہایت تعجیل کے ساتھ کہہ رہا تھا "اچھا تو آپ الفاظ کے حساب سے چارج کریں گے۔ خیر جس طرح آپ چاہیں۔ میں جو عبارت شائع کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی لکھ دیتا ہوں آپ ملاحظہ کرلیں۔"

مینجر نے میری عجلت کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم دوات میری طرف بڑھایا اور میں نے کھڑے ہی کھڑے میز پر ایک ہاتھ ٹیک کر جھکے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

"ضرورت ہے"

ایک چھ مہینے کے شادی شدہ شوہر کو اپنی حسین بیوی کی جو دو روز سے تبدیلی مزاج کی غرض سے کہیں چلی گئی ہے۔ آنکھیں سیاہ، رنگ

سرخ و سفید، بال گھونگھر والے، قد میانہ، عمر ۱۸ سال۔ نام حمیدہ۔ جو شخص مذکورہ بالا کو کسی طرح نمبر ۱۴۰ منزل نمبر ۱ بائیکلا میں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ اس کو دو اشرفیاں بطور معاوضہ محنت نذر کی جائیں گی۔ خط و کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ مزید حالات بتائے جا سکتے ہیں۔''

بے چین شوہر۔ عبدالحئی سیماب

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منیجر نے اس اعلان کو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ جو غالباً کوشش خودداری کی زنجیروں میں جکڑے جانے کی وجہ سے مسکراہٹ ہی بن کر رہ گئی تھی، ورنہ قہقہہ بننے کے لیے تیار تھی، اس کے ہونٹوں پر بلکہ تمام چہرے پر ظاہر ہوئی۔ میں نے اجرت، بلا حجت نقد ادا کی اور خدا حافظ کہتا ہوا باہر تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو چار کلرکوں اور منیجر کے دل کھول کر ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار کو دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزانہ اخبار میں کیا۔ کیا اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے، میری حالت سے آگاہ ہو، جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھی ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہوگا۔ اور اگر اس نے مان لیجئے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گزر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی۔

میں اپنے ڈرائنگ روم میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا۔ ڈوبا ہوا تھا کہ میرا نوکر کواڑ کھول کر اندر گھسا اور کہنے لگا ''حضور ایک شخص اور ایک نقاب پوش عورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں'' میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عزیز، حمیدہ کا چچا زاد بھائی ہوگا۔ حمیدہ کو لایا ہوگا۔ ممکن ہے کہ کسی کو حمیدہ اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں نے فوراً اندر آنے کی اجازت دی اور کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر نہایت سرعت کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ آخر میں کہوں گا کیا۔ دروازہ کھلا اور جاہل شخص جو صورت سے کوئی دکاندار معلوم ہوتا تھا، اندر گھسا اور یہ کہتا ہوا اندر گھسا ''حمیدہ، حمیدہ اندر آؤ'' اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان عورت جس نے نقاب اتار ڈالی تھی، اندر آئی۔ اس کا چہرہ اس کی بے باکی، اس کی وضع، غرض اس کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ نہایت چلتی ہوئی عورت تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ اور ادا شناسی کام کرتی ہے، میرے خیال میں وہ کوئی بازاری، آوارہ گرد عورت تھی۔ لانے والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''لیجئے یہ اب یہاں موجود ہیں، یہ ہم کو ایک ہوٹل میں ملیں۔ ہم نے کل سے اخبار پڑھ کر تمام بمبئی ڈھونڈ ڈالا۔ آج ہم کو ملی تو ہم نے فوراً پکڑ لیا۔ اس نے بہت کچھ شکایت کیا۔ تمہارا برائی کرتا ہے۔ خیر تم جانے یہ جانے۔ یہ خود کہے گا تم سنے گا، اب ہمارا معاوضہ۔ بس ہم خلاص۔''

مجھے تعجب تھا، حیرت تھی، پریشانی تھی۔ میری زبان سے نکلا ''تم کہتے کیا ہو؟ یہ عورت کون ہے؟''

وہ۔ ''ہم کہتا ہے کہ تم نے اخبار میں لکھا کہ جو کوئی اس کو لائے گا، وہ دو گنی پائے گا۔ ہم کل بارہ گھنٹے تلاش کیا۔ رات بھر اسی خیال میں رہا۔ آج برابر صبح سے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں، رنگ گورا ہے، سرخی نہیں ہے تو وہ اس چار دن کی پریشانی میں جاتا رہا۔ بال گھونگھر والا ہے۔ قد بیچ کا ہے۔ عمر کون اس کا ۱۸ سال سے زیادہ بتا سکتا ہے؟ نام اس کا حمیدہ ہے (اس کی طرف) کیوں ہے نا؟''

اس میں شک نہیں کہ اس میں سب باتیں تھیں، مگر آخر اس جہالت کے معنی کیا؟ وہ میری پیاری حمیدہ نہیں تھی۔ نہیں خدا نہ کرے۔ میں

نے جواب دیا۔ ''مگر یہ میری بیوی نہیں ہے۔''

وہ۔ (عورت کی طرف) ''کیوں یہ کیا بات ہے۔''

عورت۔ ''کیا پیارے سیماب! پیارے سیماب۔ اب تم ایسے خفا ہو کہ پہچانتے تک نہیں۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں؟''

میں۔ ''حمیدہ۔ میری طرف تو دیکھو!''

اب تک مجھے استعجاب تھا۔ مگر میرے جواب پر وہ استعجاب غصہ میں بدل گیا۔ یہ نالائق عورت اور میری بیوی۔ اس گستاخی کے معنی کیا؟ یہ بدمعاشی، پکی دغابازی، جعلسازی، غصہ سے بڑھ چلا اور میرے منہ سے نکلا۔ گستاخ عورت اس بدتمیزی کے کیا معنی......؟''

میں فقرہ بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ وہی لانے والا شخص بولا ''دیکھو سیٹھ۔ بدتمیزی وغیرہ کا وجہ تنہائی میں پوچھو۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کا قصور ہے۔ سب کے سامنے ایسا مت کہو۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہے۔''

میں۔ (نہایت غصہ کے ساتھ) ''بدمعاش! یہ پاجی عورت میری بیوی کیوں ہونے لگی......''

وہ۔ ''دیکھو سیٹھ۔ ہم پر زبان مت چلاؤ۔ تم جانو تمہارا بیوی جانے۔ ہم سے کچھ مطلب نہیں۔ چاہے تم اسے رکھو چاہے نکالو۔ مگر ہمارا دوگنی ہم کو دو بس۔''

مجھے غصہ تھا، پریشانی تھی، الجھن تھی، سب کچھ تھا۔ قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لڑوں، کیا کروں۔ اتنے میں دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور گنوار جاہل، ایک عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر گھسا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ لو۔ حمیدہ موجود ہے۔ میں دو دن سے مارا مارا پھرتا تھا۔ آخر میں نے ایک دکان پر کھڑا دیکھ کر پایا اور کھینچتا ہوا لایا۔ آنکھ، رنگ، بال، قد، عمر، سب دیکھ لو۔ یہ تمہاری بی بی حمیدہ ہے کہ نہیں۔ اور میرا انعام؟''

اب میرے غصے نے بھی مجھ سے بھاگنا شروع کیا۔ میں ساکت تھا، خاموش تھا، مبہوت تھا۔

دوسری عورت۔ ''پیارے سیماب! کیا اب بھی تم اپنی پیاری حمیدہ سے نہیں بولو گے۔''

پہلی عورت۔ ''تو کون چڑیل ہے جو میرے شوہر کو اپنا شوہر بتاتی ہے؟''

دوسری عورت۔ ''چل لچے۔ تجھ جیسی مکاریں میں نے ہزاروں دیکھ ڈالیں۔ سیماب میرا شوہر ہے یا تیرا؟''

دونوں لانے والے۔ (تقریباً ساتھ ہی ساتھ) ''بتایئے سیٹھ آپ کا بیوی کون ہے؟''

''بولو صاحب بولو۔ ہاتھ پکڑ لو ایک کا۔''

گورنمنٹ کا قانون کہیئے۔ اپنی پوزیشن کا لحاظ سمجھئے۔ یکا یک حیرت زدہ ہو جانا اس کی وجہ ٹھہرایئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خیال نے اس وقت مجھے دست درازی سے روک لیا۔ میری حالت عجیب تھی۔ میں حیرت زدہ بھی تھا۔ اور پریشان بھی۔ خائف بھی تھا اور غصہ سے لرزاں بھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ ملازم فوراً اندر تھا، میں یہ کہتا ہوا کہ ''دیکھو پولیس کو بلاؤ اور سب بدمعاشوں کو ان کے حوالے کر دو۔'' ڈرائنگ روم سے نکل کر سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں جاتے ہی پلنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

برابر والے کمرے میں سے سب کے باہر جانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ پھر کچھ تکرار نہ ہوا اور تھوڑی دیر میں سناٹا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسی طرح دس پانچ زبردستی بیوی بننے والیاں...... میرا سلسلہ خیال

کواڑ کھلنے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو پیاری حمیدہ ریشمیں نقاب ڈالے ہوئے ایک عجیب شان دلربائی کے ساتھ میرے سامنے تھی......!

تھوڑی دیر کے بعد جس میں، معمولی شکوہ وشکایت کا دفتر ختم ہو چکا تھا، وہ میری آغوش میں تھی۔ اس کا شعلہ خود ستائی پھر بھی بھڑک اٹھا مگر میں اس کے بجھانے کے لیے کئی روز سے تیار تھا۔ اس وقت اور صرف اس وقت، مجھے معلوم ہوا کہ دونوں بازاری عورتیں اور اوباش آدمی حمیدہ ہی کے اشارے پر آئے تھے اور عزیز نے اس کا انتظام کیا تھا۔ میری دو اشرفیاں تو بچ گئیں۔ لیکن حمیدہ کو اس پلاٹ کے تیار کرنے میں دو گنیاں نذر کرنی پڑیں۔ آہ شریر شوخ...... پیاری حمیدہ۔

وہ دن اور آج کا دن، دو باتوں میں پورا پورا اعتقاد رکھتا ہوں، ایک تو یہ کہ اخبار کا ''ضرورت ہے'' والا کالم قابل فروگذاشت چیز نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مرحوم مرزا نے سچ کہا۔

ولیکن درد اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل



پریم چند

نام : دھنپت رائے سری واستو
قلمی نام : نواب رائے الہ آبادی، نواب رائے بنارسی، پریم چند
پیدائش : ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء بمقام لمہی گاؤں، متصل پانڈے پور ضلع بنارس، بھارت۔
وفات : ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء بہ مقام بنارس۔
تعلیم : بی۔اے الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد ۱۹۱۹ء

ابتدأ آٹھ برس تک فارسی پڑھی اور گورکھ پور کے ایک مڈل سکول میں براہ راست چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۰۲ء میں ٹیچرز ٹریننگ کالج الہ آباد (Prepartary Class) میں داخلہ لیا۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں جونیئر کلاس کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کر کے جونیئر ورنیکلر (J-V) کی سند لی۔ اسی سال اردو اور ہندی میں الہ آباد یونیورسٹی سے سینئر ورنیکلر (S-V) کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کئی بار دیا اور ریاضی میں فیل ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۱۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام منشی عجائب لال کائستھ تھا، جن کی سکونت موضع مڈھوا لمہی متصل پانڈے پور، بنارس میں تھی۔ پریم چند کے والد ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ پریم چند سات برس کے تھے، جب ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند نے بچپن اور لڑکپن میں سخت تنگی ترشی کا زمانہ دیکھا اور سہا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد پانچ روپے ماہانہ کے حساب سے ایک وکیل کے بیٹے کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور پھر اسی سال بنارس سے بیس میل دور چنار گڑھ، مرزا پور کے ایک چھوٹے سے عیسائی مشنری اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار پر اسسٹنٹ ماسٹر کے طور پر پرائیویٹ ملازمت کر لی۔ ۲ جولائی ۱۹۰۰ء کو گورنمنٹ ڈسٹرکٹ مڈل سکول بہرائچ سے سرکاری

ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں ادبی زندگی کا آغاز ایک ناول بہ عنوان: 'ایک ماموں کا رومان'' لکھنے سے کیا، اسی سال اپنا پہلا مضمون ''پرتاب چندر'' لکھا۔ ۱۹۰۲ء میں ٹیچرز ٹریننگ کالج الہ آباد میں جے۔ وی کا امتحان پاس کرنے کے لیے داخلہ لیا اور اپریل ۱۹۰۴ء میں سند حاصل کی اور سینئر ورنیکلر (S-V) کا امتحان دینے الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے، جہاں سے جنوری، فروری ۱۹۰۵ء میں واپسی پر ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پرتاب گڑھ کر دیا گیا۔ پرتاب گڑھ سے ۱۹۰۷ء میں کانپور تبادلہ ہوا۔ جہاں ۱۹۰۸ء تک قیام رہا اس زمانے میں بال گنگا دھر تلک کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور تلک کی بجائے گوکھلے سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۰۶ء کے پھاگن میں شوراتری کے دن پریم چند کی دوسری شادی منی دیوی پرشاد کی بیوہ بیٹی شورانی سے ہوئی۔ ۲۴ جون ۱۹۰۹ء میں ترقی پا کر کانپور سے مہوبا ضلع ہمیر پور کے ڈسٹرکٹ بورڈ سب انسپکٹر مدارس ہوئے۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۱۰ء تک ''نواب رائے'' اور ''نواب رائے بنارسی'' کے قلمی ناموں سے لکھا کرتے تھے، اس کے بعد پریم چند کا قلمی نام اختیار کیا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' پریم چند کے قلمی نام سے شائع ہوا، اس وقت پریم چند شدید بیمار تھے۔ لکھنؤ، بنارس اور الہ آباد سے علاج کروایا۔ ۱۹۱۱ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع ہمیر پور رہے۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں مہوبا سے گورنمنٹ بستی ہائی اسکول تبادلہ ہوا جہاں سے جولائی ۱۹۱۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر واپس لوٹ آئے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں بستی سے گورنمنٹ نارمل سکول گورکھ پور تبادلہ ہو گیا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں نارمل سکول بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ رہے جہاں فروری ۱۹۲۱ء میں پریم چند نے عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جو ۱۵ فروری ۱۹۲۱ء کو منظور کر لیا گیا۔ کچھ مدت ہندی ماہنامہ ''مریادا'' بنارس کی ادارت کی۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں اس کے مدیر مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے پوتدار جی کی امداد و اعانت سے چرخے بنانے کا کاروبار شروع کیا مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مارچ ۱۹۲۲ء میں بنارس منتقل ہو گئے جہاں رسالہ ''آج'' بنارس کے ایڈیٹر رہے۔ لیکن چند دن بعد مارچ ہی میں کانپور جا کر مہاشہ کاشی ناتھ کے مارواڑی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ مہاشہ کاشی ناتھ کے ساتھ نباہ نہ ہوا اور وہاں سے مستعفی ہوئے۔

اب پریم چند نے کاشی ودیا پیٹھ میں ملازمت اختیار کرنے کے ساتھ مہاشہ سُدرشن کا قائم کردہ چھاپہ خانہ ''سرسوتی پریس'' خریدا اور نقصان اٹھایا۔ ۱۹۲۷ء میں پریم چند نے نول کشور کے پرچے ''مادھوری'' کی ادارت سنبھالی اور دو سو روپے ماہوار پانے لگے۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے مہاشہ سُدرشن کا مجلّہ ''ہنس'' سنبھالا جس کا پہلا پرچہ سرسوتی پریس بنارس سے مارچ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور جون ۱۹۳۰ء میں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ۱۹۳۱ء میں نول کشور پریس میں ملازمت کے دوران، ان کی مرضی کے خلاف اُنہیں درسی کتب کے شعبہ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں نصاب ساز کمیٹی کی منظوری کے لیے نصابی کتب مرتب کیں۔ ۱۹۳۳ء میں نول کشور کی ملازمت ترک کر دی اور بنارس منتقل ہو گئے۔ پندرہ روزہ ''جاگرن'' بند ہونے کو تھا، پریم چند نے اسے سنبھالا اور ہفت روزہ بنا دیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل انہوں نے ''ہنس'' بنارس کو جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری کر دیا تھا۔ جسے ۱۹۳۳ء تک مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں پریم چند کا ہندی ناول ''سیوا سدن'' (مطبوعہ دسمبر ۱۹۱۸ء) ''اجنتا سنے ٹون'' بمبئی کے ہدایت کار ڈی موہن بھاونانی کو پسند آیا تو اس نے بنارس رابطہ قائم کیا۔ پریم چند نے اپنا پرچہ ''ہنس'' بنارس ہندی ساہتیہ پریشد کی نگرانی میں دے کر بمبئی کی راہ لی اور ''اجنتا سنے ٹون'' میں بطور منظر نامہ نگار، آٹھ ہزار روپے سالانہ پر ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۳۳ء میں ''سیوا سدن'' کی کہانی پر مبنی فلم ''رنگیلا راجپوت'' بنی اور کامیاب رہی۔ اب پریم چند نے ''اجنتا سنے ٹون'' کے لیے

''مل مزدور'' لکھی جس میں مل مزدوروں کے مسائل کو پہلی بار انڈین سکرین کا موضوع بنایا گیا[۳]۔ سنسر بورڈ کے نامناسب رویہ کے باوجود ناقدین نے اس فلم کی دل کھول کر داد دی۔ ۱۹۳۵ء میں جب موہن بھاونانی نے اپنا ذاتی ادارہ بھاونانی پروڈکشنز کو تنک لاج، دادر، بمبئی میں قائم کیا تو پریم چند بھی اجنتا سائن ٹون سے الگ ہو کر ادھر منتقل ہو گئے اور بھاونانی کے لیے فلم 'جاگرن'' لکھی، جس میں بے روزگاری کے شکار تعلیم یافتہ افراد کے مسائل کو پیش کیا۔ لیکن اس ادارے نے اپنی ساکھ بنانے میں کچھ وقت لیا اور پریم چند فلمی دنیا سے مایوس ہو کر ۱۹۳۶ء میں بنارس آ گئے۔ (''جاگرن'' ۱۹۳۶ء کے آخر میں ریلیز ہوئی) جبکہ پریم چند نے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے اوّلین اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی اور ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی صبح بنارس میں وفات پائی۔[۴]

۱۹۴۵ء میں موہن بھاونانی نے پریم چند کے ہندی ناول ''رنگ بھومی'' (مطبوعہ ۱۹۲۵ء) کو اس نام سے فلمایا۔ فلم ''رنگ بھومی'' ۱۹۴۶ء میں ریلیز ہوئی اور ہندوستان کے ہر سرکٹ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ لیکن اس وقت تک پریم چند کی راکھ کو گنگا کے سپرد ہوئے پورے دس برس گزر چکے تھے۔[۵]

اوّلین مطبوعہ تحریر:

ناول ''اسرار معابد'' کی پہلی قسط مطبوعہ ہفت روزہ ''آوازہ خلق'' بنارس: ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ یہ سلسلہ یکم فروری ۱۹۰۵ء تک رہا۔ پہلا تنقیدی مضمون ''زمانہ'' کانپور بابت: جنوری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''عشق دنیا اور حب وطن'' مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور، بابت: اپریل ۱۹۰۸ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''سوز وطن'' (پانچ افسانے) ناشر: نواب رائے: زمانہ پریس کانپور طبع اوّل: جون ۱۹۰۸ء

یہ کتاب دوسری بار گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو ۴۵ ٹمپل روڈ، لاہور سے ''حب وطن کے قصے معروف بہ سوز وطن و سیر درویش'' کے عنوان سے ۲۹-۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ سال اشاعت درج نہیں۔ طبع دوم میں ''سیر درویش'' نامی افسانے کا اضافہ کر دیا گیا۔

۱۔ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ۲۔ ''شیخ مخمور'' ۳۔ ''یہی میرا وطن ہے'' ۴۔ صلۂ ماتم'' ۵۔ ''عشق دنیا اور حب وطن'' ۶۔ ''سیر درویش''

یہ کتاب تیسری بار ''سوز وطن'' کے عنوان سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے مرتب کر کے انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، ۲۷۲، چک، الہ آباد سے ۱۹۸۰ء میں شائع کی۔

۲۔ ''پریم پچیسی'' دو جلدیں (پچیس افسانے) دارالاشاعت، پنجاب: جلد اوّل: طبع اوّل:۱۹۱۵ء

جلد دوم:۱۹۱۸ء

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار دارالاشاعت پنجاب نے ۱۹۳۹ء اور چوتھی بار ماڈرن بک ڈپو، حیدرآباد دکن نے ۱۹۴۴ء میں شائع کی۔

حصہ اوّل: (۱) ماتا۔ (۲) وکرمادت کا تیغہ۔ (۳) بڑے گھر کی بیٹی۔ (۴) رانی سارندھا۔ (۵) راج ہٹ۔ (۶) راجہ ہردول (۷) نمک کا داروغہ۔ (۸) عالم بے عمل۔ (۹) گناہ کا اگن منڈ۔ (۱۰) بے غرض محسن۔ (۱۱) آہ بے کس۔ (۱۲) آلھا۔

حصہ دوم: (۱) خون سفید۔ (۲) صرف ایک آواز۔ (۳) اندھیر۔ (۴) بانکا زمیندار۔ (۵) تریا چرتر۔ (۶) امرت۔ (۷) شکاری راجکمار۔ (۸) کرموں کا پھل۔ (۹) مناؤن۔ (۱۰) مرہم۔ (۱۱) اماوس کی رات۔ (۱۲) غیرت کی کٹار۔ (۱۳) منزل مقصود۔

۳۔ ''پریم بتیسی'' دو جلدیں (اکتیس افسانے) زمانہ کانپور، حصہ اوّل: طبع اوّل: اگست ۱۹۲۰ء

حصہ دوم: دسمبر ۱۹۲۰ء

یہ کتاب دوسری بار دارالاشاعت پنجاب، لاہور نے ۱۹۴۰ء میں شائع کی۔

حصہ اوّل: (۱) سرپرغرور۔ (۲) راجپوت کی بیٹی۔ (۳) نگاہ ناز۔ (۴) بیٹی کا دھن۔ (۵) دھوکہ۔ (۶) پچھتاوا۔ (۷) شعلۂ حسن (۸) اناتھ لڑکی۔ (۹) پنچایت۔ (۱۰) سوت۔ (۱۱) بانگ سحر۔ (۱۲) مرض مبارک۔ (۱۳) قربانی۔ (۱۴) دفتری۔ (۱۵) دو بھائی۔

حصہ دوم: (۱) بازیافت۔ (۲) بوڑھی کاکی۔ (۳) بنک کا دیوالہ۔ (۴) زنجیر ہوس۔ (۵) سوتیلی ماں۔ (۶) مشعل ہدایت۔ (۷) خنجر وفا۔ (۸) خواب پریشاں۔ (۹) راہ خدمت۔ (۱۰) حج اکبر۔ (۱۱) آتما رام۔ (۱۲) ایمان کا فیصلہ۔ (۱۳) فتح۔ (۱۴) درگا مندر۔ (۱۵) خون حرمت۔ (۱۶) اصلاح۔

۴۔ ''خاک پروانہ''۔ (سولہ افسانے) نگار پریس لکھنؤ: طبع اوّل:۱۹۲۸ء

(۱) خاک پروانہ۔ (۲) نادان دوست۔ (۳) نغمہ روح۔ (۴) ستیہ گرہ۔ (۵) مزار آتشیں۔ (۶) بڑے بابو۔ (۷) عجیب ہولی۔ (۸) دعوت۔ (۹) فکر دنیا۔ (۱۰) خودی۔ (۱۱) مستعار گھڑی۔ (۱۲) تالیف۔ (۱۳) کپتان۔ (۱۴) ملاپ۔ (۱۵) علیحدگی۔ (۱۶) تحریک۔

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو لاہور نے ۱۹۴۴ء سے قبل شائع کی۔

۵۔ ''خواب و خیال'' (چودہ افسانے) لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور، دہلی، طبع اوّل:۱۹۲۸ء

(۱) نخل امید۔ (۲) نوک جھونک۔ (۳) موٹھ۔ (۴) شدھی۔ (۵) شطرنج کی بازی۔ (۶) عبرت۔ (۷) شکست کی فتح۔ (۸) دست غیب۔ (۹) دعوت شیراز۔ (۱۰) مایہ تفریح۔ (۱۱) فلسفی کی محبت۔ (۱۲) خودی۔ (۱۳) لال فیتہ۔ (۱۴) ستی۔

نوٹ: ''خودی'' وہی افسانہ ہے جو ''خاک پروانہ'' میں شامل ہے۔

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار نرائن دت سہگل، لاہور نے ۱۹۴۴ء سے قبل شائع کی۔

۶۔ ''فردوس خیال'' (بارہ افسانے) انڈین پریس الہ آباد: طبع اول: ۱۹۲۹ء

(۱) توبہ۔ (۲) عفو۔ (۳) مریدی۔ (۴) نیک بختی کے تازیانے۔ (۵) راہِ نجات۔ (۶) ڈگری کے روپے۔ (۷) نزول برق۔ (۸) بھاڑے کا ٹٹو۔ (۹) بھوت۔ (۱۰) سوا سیر گیہوں۔ (۱۱) تہذیب کا راز۔ (۱۲) لیلیٰ۔

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار نرائن دت سہگل، لاہور نے ۱۹۴۱ء میں شائع کی۔

۷۔ ''پریم چالیسی'' دو جلدیں (چالیس افسانے) گیلانی الیکٹرک پریس لاہور: طبع اول: ۱۹۳۰ء

پہلا حصہ: (۱) منتر۔ (۲) کشمکش۔ (۳) خانہ برباد۔ (۴) کفارہ۔ (۵) ترسول)۔ (۶) بہنی۔ (۷) داروغہ کی سرگزشت۔ (۸) استعفیٰ۔ (۹) انتقام۔ (۱۰) انسان کا مقدم فرض۔ (۱۱) مقدر۔ (۱۲) رام لیلا۔ (۱۳) دینداری۔ (۱۴) چوری۔ (۱۵) الزام۔ (۱۶) قزاقی۔ (۱۷) آنسوؤں کی ہولی۔ (۱۸) سہاگ کا جنازہ۔ (۱۹) دیوی۔ (۲۰) قوم کا خادم۔

دوسرا حصہ: (۱) دوسکھیاں۔ (۲) حرزِ جاں۔ (۳) ماں۔ (۴) لیلیٰ۔ (۵) مجبوری۔ (۶) مزار الفت۔ (۷) ابھاگن۔ (۸) جہاد۔ (۹) دیوی۔ (۱۰) حیرت۔ (۱۱) چکمہ۔ (۱۲) جنت کی دیوی۔ (۱۳) عفو۔ (۱۴) بند دروازہ۔ (۱۵) جلوس۔ (۱۶) امتحان۔ (۱۷) سزا۔ (۱۸) گھاس والی۔ (۱۹) بیوی سے شوہر۔ (۲۰) پوس کی رات۔

نوٹ: اس حصے میں شامل افسانہ ''لیلیٰ'' اس سے قبل ''فردوس خیال'' میں شامل رہا ہے۔ یہ کتاب ''پریم چالیسا'' کے عنوان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۸۔ ''آخری تحفہ'' (تیرہ افسانے) نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور، طبع اول: ۱۹۳۴ء

(۱) آخری تحفہ۔ (۲) دو بیل۔ (۳) وفا کی دیوی۔ (۴) طلوع محبت۔ (۵) شکار۔ (۶) ادیب کی عزت۔ (۷) قاتل۔ (۸) ستی۔ (۹) ڈیمانسٹریشن۔ (۱۰) برات۔ (۱۱) آخری میلہ۔ (۱۲) نجات (قاتل اور برات۔ پریم چند کے رسالے ''ہنس'' میں ان کی بیوی شیورانی کے نام سے شائع ہوئے)

یہ کتاب دوسری بار نرائن دت سہگل، لاہور نے ۱۹۳۸ء میں شائع کی اور بارہواں ایڈیشن بھی اسی ادارے نے دہلی سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ واضح رہے کہ اس مجموعے کا ایک جعلی ایڈیشن ''نجات'' کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں صدیق بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔

۹۔ ''زادِ راہ'' (پندرہ افسانے) حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی: طبع اول: ۱۹۳۶ء

(۱) وفا کی دیوی۔ (۲) زیور کا ڈبہ۔ (۳) آشیاں برباد۔ (۴) خانہ داماد۔ (۵) قہر خدا کا۔ (۶) فریب۔ (۷) لاٹری۔ (۸) نیور۔ (۹) ہولی کی چھٹی۔ (۱۰) زادِ راہ۔ (۱۱) لعنت۔ (۱۲) بڑے بھائی صاحب۔ (۱۳) مس پدما۔ (۱۴) حقیقت۔ (۱۵) ڈامل کا قیدی (''آخری تحفہ'' میں شامل ''وفا کی دیوی'' اور ''زادِ راہ'' میں شامل افسانہ ایک نہیں)

اس کتاب کو دوسری بار گیلانی الیکٹرک بک ڈپو، لاہور نے شائع کیا اور تیسری بار حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی نے ۱۹۳۹ء میں طبع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ ''دودھ کی قیمت''(نو افسانے)　　عصمت بک ڈپو، دہلی:　　طبع اوّل: ۱۹۳۷ء

(۱) دودھ کی قیمت۔ (۲) کسم۔ (۳) اکسیر۔ (۴) عیدگاہ۔ (۵) سکون قلب۔ (۶) ریاست کا دیوان۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اسی ادارے سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ ''واردات''(تیرہ افسانے)　　مکتبہ جامعہ دہلی:　　طبع اوّل: ۱۹۳۷ء

(۱) شکوہ و شکایت۔ (۲) معصوم بچہ۔ (۳) بدنصیب ماں۔ (۴) شانتی۔ (۵) روشنی۔ (۶) مالکن۔ (۷) نئی بیوی۔ (۸) گلی ڈنڈا۔ (۹) سوانگ۔ (۱۰) انصاف کی پولیس۔ (۱۱) غم نہ داری بز بخر۔ (۱۲) مفت کرم داشتن۔ (۱۳) قاتل کی ماں۔

اس کو دوسری اور تیسری بار بھی اسی ادارے نے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نواں ایڈیشن جنوری ۱۹۵۹ء میں طبع ہوا۔ واضح رہے کہ اس مجموعے میں شامل افسانہ ''شانتی'' اس سے قبل ''سکون قلب'' کے عنوان سے افسانوی مجموعے ''دودھ کی قیمت'' میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن اردو مرکز لاہور نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔

نوٹ: پریم چند کے مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل ایک سو نوے افسانوں کے علاوہ ''کفن'' اور ''سبحان بھگت'' جیسے متعدد عمدہ افسانے خود پریم چند یکجا نہیں کر پائے۔ پریم چند کے اپنے ترتیب دیئے ہوئے محولہ بالا گیارہ افسانوی مجموعوں کے علاوہ متعدد جعلی ایڈیشن مختلف ناموں کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔

نوٹ: نمبر شمار ۱۲ تا ۲۶ چند ایسے مجموعے ہیں جن کا تذکرہ پریم چند سے متعلق کسی کتابیات میں نہیں ملتا، البتہ مختلف اشاعتی اداروں کی فہارس کتب میں ان کا حوالہ موجود ہے اور ان کی موجودگی کی تصدیق میں نے خود کتب خانوں سے کی ہے۔

۱۲۔ ''نجات''(افسانے)　　صدیق بک ڈپو، لکھنؤ　　طبع اوّل: ۱۹۳۶ء

اس مجموعے میں برات'' آخری حیلہ، آخری تحفہ، جیل، وفا کی دیوی، ستی، ادیب کی عزت، دو بیل، طلوع محبت، شکار اور قاتل کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن تیرتھ رام ہربنس لال بک سیلرز لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔

۱۳۔ ''بازیافت''(افسانے)　　مطبوعہ: لاہور　　طبع اوّل: س۔ن

یہ مجموعہ ''پریم بتیسی'' حصہ دوم کا جعلی ایڈیشن ہے صرف نام کی تبدیلی کی گئی ہے۔

۱۴۔ ''سپیرن'' (افسانے) بنگلہ زبان سے شرت چندر چیٹر جی کے افسانوں کا ترجمہ۔

۱۵۔ ''میرے بہترین افسانے''(افسانے)　　مکتبہ شاہراہ، دہلی،　　طبع اوّل: س۔ن

اس مجموعے میں راہ نجات، منتر، مہاتیرتھ، پنچ پرمیشور، رانی سارندھا، دو بیل، شطرنج کے کھلاڑی، ستی، معافی، پرائشچت اور سبحان بھگت کل گیارہ افسانے ہیں۔ یہ مجموعہ دوسری بار مغل بک ڈپو لاہور نے شائع کیا۔

۱۶۔ ''مسافر اور دوسرے افسانے''(افسانے)　　کتابستان اردو، لاہور:　　طبع اوّل: ۱۹۴۲ء

اس مجموعے میں مسافر، موت کا خوف، ہمدردی، مسوس، نوکری، باپ، زن و شوہر، بہاری اور کیسر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ کیشو رام دت اینڈ سنز لاہور نے بھی شائع کیا۔

۱۷۔ ''دیہات کے افسانے'' (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۳۹ء

اس مجموعے میں پنچایت، بانگ سحر، قربانی، طلوع محبت، وفا کی دیوی، بیٹی کا دھن، دوبیل، خانہ داماد اور رزادراہ کل نو افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ دوسری بار کلاسیک لاہور نے شائع کیا۔

۱۸۔ ''جیل'' (افسانے) نرائن دت سہگل اینڈ سنز، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۱۹۔ ''مفلحہ کالم اور دوسرے افسانے'' (افسانے) کتابستان اُردو، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہندوستانی کتاب گھر، لاہور نے شائع کیا جو انجمن ترقی اردو، کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

۲۰۔ ''منورما'' (افسانے) عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

۲۱۔ ''طلسم مجاز'' (افسانے) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۲۲۔ ''قاتل'' (افسانے) نرائن دت سہگل اینڈ سنز، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

(یہ کتاب ''آخری تحفہ'' کے چار افسانوں کا انتخاب ہے۔ (۱) قاتل۔ (۲) آخری تحفہ۔ (۳) ادیب کی عزت اور (۴) دوبیل۔)

۲۳۔ ''کوچوان'' (افسانے/مغربی زبانوں سے تراجم) جین بک سٹال، لاہور: طبع اوّل: س۔ن

۲۴۔ ''ہوائی محل'' (افسانے/مضامین) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اوّل: س۔ن

۲۵۔ ''خاموش محبت اور دوسرے افسانے'' (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) نیشنل لٹریچر کمپنی، لاہور طبع اوّل: س۔ن

۲۶۔ ''چوگان اور دوسرے افسانے'' (مغربی زبانوں سے تراجم) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اوّل: س۔ن

اس انتخاب میں ٹالسٹائی، پامر، گورکی، ٹامس ہارڈی، آرتھر مارلیسن، مارک ٹوئن اور وکٹر ہیوگو کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

(نوٹ): نمبر شمار ۲۳ تا ۲۶ کے سارے مجموعے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئے۔

۲۷۔ ''اسرار معابد'' (اردو ناول)

یہ پریم چند کا پہلا اردو ناول ہے جو ہفتہ وار اخبار ''آوازِ خلق'' بنارس میں اکتوبر ۱۹۰۳ء تا فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ قسط اوّل پر پریم چند کا نام نواب رائے الہ آبادی درج ہے۔

۲۸۔ ''کشنا'' (اردو ناول)

بقول ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند کے ایک اور رفیق بابو لال کرشن جو ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں الہ آباد ٹریننگ کالج میں پریم چند کے ہم جماعت تھے، ان کا پہلا ناول ''کشنا'' قرار دیتے ہیں جوان کے قول کے مطابق ٹریننگ کالج کے زمانے میں ہی شائع ہوا تھا۔

(بہ حوالہ: ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'')

۲۹۔ ''ہم خرما و ہم ثواب'' (ناول۔اردو) ناشر: مہادیو پرشاد ورما لکھنوی۔ طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو:

پریم چند کے رفیق خاص منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:

''جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا، پریم چند کا سب سے پہلا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے نام سے مہادیو پرشاد ورما لکھنوی کے اہتمام

سے ہلکے کاغذ پر معمولی چھپائی میں شائع ہوا۔''[6]

منشی پیارے لال شاکر لکھتے ہیں:

''میرے کانپور آنے سے برس ڈیڑھ برس قبل ان کا پہلا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کو ۱۹۰۷ء میں بنوں میں پڑھا تھا۔''[7]

۳۰۔ ''اسرارِ محبت'' (ناول۔ اردو)

''...... مدن گوپال اور اندر ناتھ مدان نے اپنی انگریزی اور ہندی کی تصانیف میں پریم چند کے پہلے ناول کا نام ''اسرار محبت'' بتایا ہے جو ان کے خیال میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔''[8]

۳۱۔ ''جلوۂ ایثار'' (اردو ناول) انڈین پریس، الہ آباد: طبع اوّل: ۱۹۱۲ء

کل صفحات ۲۴۰۔ اسی ادارے نے دوسری بار ۱۹۲۸ء اور تیسری بار ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن کتاب منزل لاہور نے بھی شائع کیا ہے اس ناول کا ہندی روپ ''وردان'' کے نام سے شائع ہوا۔

۳۲۔ ''روٹھی رانی'' (اردو ناول) زمانہ پریس، کانپور، طبع اوّل: ۱۹۰۷ء

پانچواں ایڈیشن لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور نے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا۔ یہ ناول دراصل راجپوتانہ کے ایک تاریخی قصہ کا اردو روپ ہے۔

۳۳۔ ''بازارِ حسن'' دو جلدیں (اردو ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۱۸ء

یہ ناول ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا اور پہلے ''سیوا سدن'' کے عنوان سے ہندی میں شائع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن اسی ادارے سے ۱۹۳۸ء میں اور ایک ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے ستمبر ۱۹۵۴ء میں طبع ہوا، جس کی ضخامت ۳۴۴ صفحات ہے۔ پریم چند کی اس ناول پر بھارت میں ایک فیچر فلم بن چکی ہے۔ اس کتاب کا ایک جعلی ایڈیشن شیخ بک ایجنسی، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۳۴۔ ''گوشۂ عافیت'' (اردو ناول) دو جلدیں۔ دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اوّل: ۲۹۔۱۹۲۸ء

اسی ادارے نے ایک ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ یہ ناول ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سے ۲۹۵ صفحات کی ضخامت میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۵۔ ''چوگانِ ہستی'' دو جلدیں (اردو ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اوّل: ۱۹۲۷ء

اسی ادارے نے دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ ہندوستانی کتاب گھر، لاہور نے اسے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن مکتبہ رنگین دہلی سے ۸۴۸ صفحات کی ضخامت میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دراصل ہندی ناول ''رنگ بھوم'' کا اردو روپ ہے۔

۳۶۔ ''پردۂ مجاز'' دو جلدیں (اردو ناول) لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور طبع اوّل: ۱۹۳۱ء

پانچویں بار لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار، دہلی نے ۴۰۲ صفحات کی ضخامت کے ساتھ شائع کیا۔

۳۷۔ ''نرملا'' (اردو ناول) گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۲۹ء

کل صفحات ۲۵۰۔ اس کا ایک ایڈیشن شاہین پبلی کیشنز، راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔

۳۸۔ ''غبن''(اردو ناول) لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل

یہ ناول تیسری بار ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد نے جون ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن اعوان پبلی کیشنز راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔

۳۹۔ ''بیوہ''(اردو ناول) ناشر: پریم چند، سرسوتی پریس، بنارس: طبع اوّل: ۱۹۳۵ء سے قبل

دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا اور عصمت بک ڈپو دہلی نے ۱۹۴۵ء میں چھاپا۔

۴۰۔ ''میدان عمل''(اردو ناول) ناشر: پریم چند، سرسوتی پریس، بنارس طبع اوّل: ۱۹۳۲ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور اور چوتھا ایڈیشن مکتبہ جامعہ، دہلی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ ایک جعلی ایڈیشن ظفر احمد قریشی لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۴۱۔ ''گئودان''(اردو ناول) ناشر: پریم چند، سرسوتی پریس، بنارس طبع اوّل: ۱۹۳۶ء

دوسری اور تیسری بار مکتبہ جامعہ، دہلی نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ اس ناول کا ایک جعلی ایڈیشن عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۴۲۔ ''منگل سوتر''(ہندی ناول) ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، بنارس: طبع اوّل:

یہ پریم چند کا آخری ناول بلکہ آخری تحریر ہے جو مکمل نہ کر سکے۔ اسے ۱۹۳۶ء میں بستر علالت پر لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے اسے اردو میں لکھا تھا لیکن اردو روپ سے پہلے اور پریم چند کے آنجہانی ہونے کے بعد ان کے بیٹے امرت رائے نے ہندی زبان میں شائع کروایا۔ اصل اردو روپ تا حال شائع نہیں ہو سکا۔

۴۳۔ ''سیوا سدن''(ہندی ناول) ہندی پُستک ایجنسی، کلکتہ: طبع اوّل: ۱۹۱۸ء

۴۴۔ ''پریم آشرم''(ہندی ناول) ہندی پُستک ایجنسی، کلکتہ: طبع اوّل: ۱۹۲۵ء

۴۵۔ ''رنگ بھومی''(ہندی ناول)

۴۶۔ ''کایا کلپ''(ہندی ناول)

۴۷۔ ''پرتاپ چندر''(ہندی ناول)

۴۸۔ ''آسمان کی پری''(اردو ناول) سول ایجنٹ: صدیق بک ڈپو: طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل

۴۹۔ ''سنگرام''(ہندی ناول)

۵۰۔ ''درگا داس''(ہندی ناول)

۵۱۔ ''کربلا''(اردو ڈراما) لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۲۔ ''روحانی شادی''(اردو ڈراما) عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

۵۳۔ ''دوزخ''(اردو ناول) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۴۔ ''وفا کی دیوی''(اردو ناول) نرائن دت سہگل، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۵۵۔ ''عشق کا روگ'' (اردو ناول) حجازی پریس، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۶۔ ''چھٹکارا'' (اردو ناول) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

اس ناول کا دوسرا ایڈیشن شاہین پبلی کیشنز، راولپنڈی نے شائع کیا۔

۵۷۔ ''باکمالوں کے درشن'' (سوانحی خاکے) رام نارائن لال، الہ آباد: طبع اوّل: ۱۹۲۹ء

۵۸۔ ''سوچ وچار'' (ہندی مضامین)

۵۹۔ ''مہاتما شیخ سعدی'' (سوانح)

۶۰۔ ''پریما'' (ہندی ناول کا ترجمہ) طبع اوّل: ۱۹۰۷ء

۶۱۔ ''رام چرچا'' (رام چندر جی کی سوانح) ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل

۶۲۔ ''قرون وسطی میں ہندوستان کی تہذیب'' ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد طبع اوّل: ۱۹۳۱ء

لیکچرز از رائے بہادر شنکر سپرا چند اوجھا کا اردو ترجمہ: کل صفحات ۲۳۸۔۶۰۰ء تا ۱۲۰۰ء کی ہندوستانی تہذیب، مزاہب اور اقتصادیات کے حالات مع تصاویر۔

۶۳۔ ''معاشیات کے ابتدائی اصول'' (علم معاشیات) (صفحات ۲۹۸) امرت الیکٹرک پریس، لاہور طبع اوّل: ۱۹۳۶ء

۶۴۔ ''قسمت'' (بابو یکندر ناتھ کے انگریزی ناول کا ترجمہ) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور طبع اوّل: س۔ن

۶۵۔ ''مضامین پریم چند'' مرتبہ: عتیق احمد: انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی۔

۶۶۔ ''مضامین پریم چند'' مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی: طبع اوّل: ۱۹۶۰ء

۶۷۔ ''گپت دھن'' (دو جلدیں) مرتبہ: امرت رائے

یہ ہندی میں ۵۶ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

۶۸۔ ''من مودک'' (بچوں کے لیے/ ہندی)

۶۹۔ ''کتے کی کہانی'' (بچوں کے لیے/ اردو)

۷۰۔ ''جنگل کی کہانیاں'' (بچوں کے لیے/ اردو)

۷۱۔ ''شطرنج کے کھلاڑی'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۷۲۔ ''مجموعہ منشی پریم چند'' (افسانوں کی کلیات) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل: ۲۰۰۲ء

۷۳۔ ''مجموعہ منشی پریم چند'' (ناول) ''دو جلدیں'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل: ۲۰۰۳ء

غیر مدوّن:

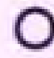
محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ پریم چند نے اناطول فرانس کے ناول ''تائیس'' کا اردو ترجمہ اہلنکار کلکتہ اور جارج ایلیٹ کے ناول سائلاس مارنر (Silas Marner) کا اردو ترجمہ سکھداس کلکتہ کے لیے کیا تھا۔ یہ دونوں تراجم تا حال شائع نہیں ہوئے۔ ''سپ سروج''

(ہندی ماہنامہ) میں شائع ہونے والے ہندی افسانے اس کے علاوہ ہیں۔

نظریۂ فن:

''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی، میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔''

(بہ حوالہ: مکتوب بنام: حکیم یوسف حسن مدیر ''نیرنگ خیال'' ۱۹۳۲ء)



حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی ''بہترین انشائی ادب'' اور دیگر کتب میں پریم چند کو ۱۹۰۵ء میں کانپور میں بتایا گیا ہے، جو درست نہیں۔

۲۔ اجنتا سنے ٹون، بمبئی کی تیار کردہ فلم: ''رنگیلا راجپوت'' ۱۹۳۳ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم کی موسیقی بی ایس ہوگن نے ترتیب دی تھی۔ اداکاروں میں ماسٹر نثار، ببو، اے آر کابلی، ڈبلیو ایم خاں اور مہتہ نمایاں تھے۔ ہدایت کار: ڈی موہن بھاونانی تھے۔

۳۔ اجنتا سنے ٹون، بمبئی کی تیار کردہ فلم ''مل مزدور'' کی موسیقی بی ایس ہوگن نے ترتیب دی۔ اداکاروں میں ببو، جے راج، خلیل، نوین یگنک اور امینہ نمایاں تھے۔ ہدایت کار تھے: ڈی موہن بھاونانی۔ یہ فلم ۱۹۳۴ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

۴۔ بھاونانی پروڈکشنز، بمبئی کی فلم ''جاگرن'' کی موسیقی ایس پی کرجی نے ترتیب دی۔ اداکاروں میں مینا کشی، راما راؤ، نوین یگنک، پربھا اور ویاس نمایاں تھے۔ یاد رہے کہ اس فلم کی اداکارہ پربھا، لاہور کے بدنام زمانہ پبلشر راجپال کی بیٹی تھی، جس نے ''رنگیلا رسول'' نامی کتاب شائع کی اور جسے علم دین، قتل کر کے خود پھانسی چڑھ گیا۔

۵۔ سری ساؤنڈ سٹوڈیوز، دادر، بمبئی میں تکمیل پانے والی اس فلم کے موسیقار پریم ناتھ، گیت کار آرزو لکھنوی اور مکالمہ نگار پی۔ ٹی۔ پھائی تھے۔ اداکاروں میں جگدیش سیٹھی، نگار سلطانہ، سلوچنا، کے۔ این سنگھ، خاتون، گوپ، شرما اور نوین یگنک نمایاں تھے۔

۶۔ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۷۰

۷۔ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۷۰

۸۔ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۷۰

کفن

پریم چند

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں، ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا، جا دیکھ تو آ۔''

مادھو دردناک لہجے میں بولا ''مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔''

''تو بڑا بیدرد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا۔ اسی کے ساتھ اتنی بی وپھائی۔''

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے جگ میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام، مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹے بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا۔ اس لئے اسے کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا، اور جب تک وہ پیسے رہتے، دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں، پھٹے، چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے مار بھی کھاتے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے

دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھالیتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے آلو بھون رہے تھے، جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا، مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی۔ اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردزہ میں مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے" اس کی چڑیل کا پھسار ہو گا اور کیا، یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کی بڑا حصہ صاف کر دے گا، بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تمہیں جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن تک اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں، اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں، کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اکھرا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو، جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں، وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نولڑکے ہوئے، گھر میں کچھ بھی نہ تھا مگر اس طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرپنچ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کر رہا تھا پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بیجا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا، اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔

اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی، وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا ''وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں، سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رس دار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی، جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا، مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول، مہکتی ہوئی کچوریاں ڈال دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے پتل کو ہاتھ روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ انڈے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بڑا پان بھی ملا مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ جھٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔''

مادھو نے ان تکلفات کا مزا لیتے ہوئے کہا ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا؟ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو، کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے۔ مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔''

''تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔''

''بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔''

''میں پچاس کھا جاتا۔''

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی، اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔'' آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے۔ جیسے دو بڑے بڑے اژدھے گینڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

2

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غمزدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں

پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں، وعدے پر کام نہ کرنے کی علت میں۔ پوچھا'' کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔''

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ ''سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا، سب کیا۔ مگر ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک۔ تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا، وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔''

زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں ''چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔'' مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً۔ دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے اور لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آ کر لاش کو دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

3

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کی مل گئی ہے۔ کیوں مادھو۔''

مادھو بولا ''ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کفن چاہیے۔''

''تو کوئی ہلکا سا کفن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا! لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کفن کون دیکھتا ہے۔''

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے، اسے مرنے پر نیا کفن چاہیے۔''

''اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانہ کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک لی اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا ''کھن لگانے سے کیا ملتا۔ آ کھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔''دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ باہموں کو ہجاروں روپے کیوں دیتے ہیں۔کون دیکھتا ہے۔ پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔''

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں، ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے کھن کہاں ہے؟''

گھیسو ہنسا۔''کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے، بہت ڈھونڈا۔ ملے نہیں۔''

مادھو بھی ہنسا۔اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔''بڑی اچھی تھی بچاری مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں، گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے دکان تھی، مادھو لپک کر دو پتوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا۔''

مادھو نے فرطِ عقیدت سے سر جھکا کر تصدیق کی ''جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان! تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا ''کیوں دادا ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی'' گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت کے انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگ سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کھن کیوں نہیں دیا، تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمہارا سر۔''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''تو کیسے جانتا ہے اسے کھن نہ ملے گا؟ تو مجھے اب گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا، جو ہم دیں گے۔''

مادھو کو یقین نہ آیا۔''بولا کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیے۔''

گھیسو تیز ہو گیا۔''میں کہتا ہوں اسے کھن ملے گا۔تو مانتا کیوں نہیں؟''

''کون دے گا، بتاتے کیوں نہیں؟''

''وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اس طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کھن تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، میخانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلو میں ہی الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے تو صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ در گور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں، پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا، جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور دینے کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا، اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔ گھیسو نے کہا "لے جا کھوب کھا اور آشیرباد دے" جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا آشیرباد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے آشیرباد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔" مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "وہ بیکنٹھ میں جائے گی۔ دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔" گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے لوگ جائیں گے، جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کے دھونے کے لیے گنگا نہاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا...... نشہ کی خاصیت سے یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا! کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔ ٹھگنی کیوں نینا جھمکاوے ٹھگنی۔

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشے سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

O

محمد علی ردولوی

نام : محمد علی
قلمی نام : چوہدری محمد علی ردولوی/محمد علی ردولوی۔
پیدائش : ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء بہ مقام ردولی، ضلع بارہ بنکی، صوبہ اودھ (بھارت)
وفات : ۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء تک بقید حیات تھے۔
تعلیم : مکتب میں پائی (با قاعدہ کوئی سند نہ لے سکے)
کالون تعلقہ دار اسکول لکھنؤ میں داخلہ لے کر چھوڑ دیا۔

مختصر حالات زندگی:

قوم شیخ صدیقی، ساکن ردولی، آبائی پیشہ تعلق داری۔ نام تعلقہ امیر پورہ، ضلع بارہ بنکی، صوبہ اودھ۔ ماں باپ کا مذہب شیعہ تھا۔ جس زمانے میں شبلی نعمانی اسلامی دنیا کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے ہوش سنبھالا۔ میرزا عبدالقادر بیدل اور میرزا غالب کے تتبع میں قلم کاری کا آغاز کیا اور نثر میں صاحب اسلوب ہوئے۔

محمد علی ردولوی ابھی اڑھائی برس کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا اور وہ خود تعلقہ دار ہو گئے۔ تعلقہ امیر پورہ ضلع بارہ بنکی کو کورٹ آف وارڈز نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ والدہ نے مارے لاڈ پیار کے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور یوں اسکول کی با قاعدہ تعلیم سے محروم رہے۔ کورٹ آف وارڈز کے انگریز منیجر نے زبردستی کالون تعلقہ دار اسکول، لکھنؤ میں داخلہ کروادیا۔ جہاں انگریز سرکار کے مراعات یافتہ طبقے کی اولاد شہسواری کے ساتھ تاج برطانیہ سے متعلق درس وفاداری پاتی تھی۔ اسکول سے فرار کے بعد چوہدری صاحب نے انگریزی ادب، فلسفہ، نفسیات اور آرٹ کے گہرے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ اور کارل مارکس میں دلچسپی لی۔

چوہدری صاحب بطور تعلقہ دار، تاج برطانیہ کے منظور نظر رہے اور اپنے کردہ یا ناکردہ گناہوں کے صلے میں مزید جاگیروں کے علاوہ

''نائٹ ہڈ'' کے خطاب سے نوازے گئے۔ نوجوانی میں جج کرامت حسین کے عقیدت مند اور آخر میں مجتہد ناصر حسین کے حلقۂ ارادت میں رہے۔ زندگی بھر لٹریچر کو بطور مشغلہ اور فلسفہ کو اوڑھنا بچھونا کیا۔ جس زمانے میں ان کا تعلقہ، کورٹ کے زیر انتظام رہا تو چند دن کے لیے بینک میں ملازمت کا شوق پورا کیا۔ چھ برس تک صوبہ کونسل میں اودھ کی نمائندگی کی۔ بہت اچھے شاعر تھے، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ۱۹۴۹ء میں محرم کی مجالس اور تعزیہ داری یک لخت چھوڑ دی۔ سنی احباب اور اعزہ نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا سُنّی ہو گئے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ اگر سُنّی ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔

۱۹۵۱ء میں جب انھوں نے اپنی کتاب ''میرا مذہب'' مکمل کی تو شیعہ اعزہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیق کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ تاحال یہ نہ کھلا کہ وہ درحقیقت کیا تھے۔ چوہدری صاحب نے دو شادیاں کیں اور بہت سی شادیاں کرنے کی خواہش دل میں لیے گزر گئے۔

اوّلین تحریر:

''امامن مہری'' سلسلے کے مضامین (مطبوعہ: ''اودھ پنچ'') میں سے کوئی ایک تحریر ''اتالیق بی بی'' (کتابچہ) اس کے ناشر خود چوہدری محمد علی ردولوی تھے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

مجلّہ ''نیا ادب'' اور ''ہندوستان'' میں شائع ہونے والے افسانوں میں سے کوئی ایک افسانہ۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''گناہ کا خوف'' (افسانے)	ناشر: محمد علی ردولوی، تقسیم کار: نیا سنسار، لکھنؤ	طبع اوّل: س۔ن
۲۔	''کشکول محمد شاہ فقیر'' (افسانے/خاکے)	مطبوعہ: صدیق بک ڈپو، لکھنؤ	طبع اوّل: س۔ن
۳۔	''اتالیق بی بی'' (مزاحیہ)	دلگداز پریس، لکھنو، ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی	
۴۔	''صلاح کار'' (جنسیات)	ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی: سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	طبع اوّل: س۔ن
۵۔	''نقادی کے نکتے'' (قلمی تصاویر کی پرکھ سے متعلق کتابچہ)	سرفراز قومی پریس، لکھنو	طبع اوّل: س۔ن
۶۔	''خبطی'' (مزاحیہ)	انوار بک ڈپو، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۷۔ ''یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ'' ناشر: چودھری محمد علی ردولوی طبع اوّل: ۱۹۱۷ء
(سوانحی کتابچہ) یہ رسالہ مفت تقسیم ہوا مطبوعہ: نول کشور پریس، لکھنؤ۔

۸۔ ''میرا مذہب'' (مذھبیات/فلسفہ)

۹۔ ''پردے کی بات'' (ضبط تولید سے متعلق کتابچہ) ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی۔
تقسیم کار: نیا سنسار، لکھنؤ۔

۱۰۔ ''گویا دبستان کھل گیا'' (خطوط) اکادمی پنجاب، لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۶ء

۱۱۔ ''نادر کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ کشکول'' (مرتبہ: سید علی کاظم) اردو اکیڈمی سندھی، کراچی طبع اوّل: ۱۹۸۰ء
(اس کتاب میں ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''، ''گناہ کا خوف'' اور ''اتالیق بی بی'' تین کتابیں یکجا کر دی گئی ہیں۔)

۱۲۔ ''سیرۃ الاقطاب اردو'' (سوانح) نولکشور، لکھنؤ طبع اوّل: قبل ۱۹۴۴ء

غیر مدوّن:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ مجلّہ ''معلومات'' میں شائع شدہ ایک ایکٹ کے تین ڈرامے ''عیاش کسان''، ''کسان'' اور ''سعید و سلمیٰ'' ہیں۔ ''معلومات'' اور ''اودھ پنچ'' میں بکھرے ہوئے مضامین اکٹھے کیے جائیں تو ایک کتاب کا مواد مل سکتا ہے۔ آسکر وائلڈ کے ''مقدمہ فند موت'' اور برنارڈ شا کے ''پیراڈاکس'' کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

اعزاز:

۱۔ نائٹ ہڈ (تاج برطانیہ کا اعلیٰ ترین سول اعزاز)

نظریہ فن:

''ان دو چار کہانیوں میں برخلاف اس نئے طرز کے، وہی پرانا رویہ برقرار رکھا گیا ہے یعنی، جہاں تک ممکن ہو نیچر کی پیروی رہے۔ چھوٹا دماغ بڑا تخیل نہیں پیدا کر سکتا۔

کافر نہ تو رانی شد نا چار مسلمان شو

اور

عصمت بی بی از بے چادری

میں نے بھی وہی پرانا طرز اختیار کیا ہے۔ نئی بات نہ سہی، خدا کرے قدیم ہی ڈھرے پر چلتے بن گیا ہو۔''

(بہ حوالہ: دیباچہ ''گناہ کا خوف'' از محمد علی ردولوی)

تیسری جنس

محمد علی ردولوی

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا، کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کو زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا، دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں۔ مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ ہونٹ کی شرم، نہ لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لیے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضاء سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کے حفاظت کے، زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں، بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے، ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سے ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گزرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوش حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سنتے جایئے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جایئے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کو بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی، جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم ایسے بوڑھا لوگ اس کو مرد ہی سے منسوب کرتے ہیں، یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کر مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا، اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے، تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجیے گا جان کر، مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات، کچھ خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے، مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی بے مرکز سی ہوگئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ دو تھان راد ھانگری ڈوریئے کے لیے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

''ارے میاں حسن علی، یہ ڈوریہ کیا لائے ہو؟''

حسن علی: ''آپ کے کرتوں کے لیے۔ ڈوریہ وضعدار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا۔''

''کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لیے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔''

''پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی۔ برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔''

''خیر بھئی!''

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں۔ ''میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی۔''

''آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے، صبح کو مرغ پک جائے گا۔'' تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے۔ تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفا چٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھبو داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی دان حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی ضمنی نکالیں گے۔

بہر حال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے، وہ یہ تھا کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہاں میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں

کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھر کم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو حسن علی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دستر خوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دستر خوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا۔ دستر خوان پر شوربا گرانا، لقمہ ڈبونے میں دال کا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے یہی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دستر خوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب کے یہاں رہنے لگیں۔ یا گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تنقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آ گیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا۔ کھانا پکوانا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھی تو آئینہ کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انہوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں۔ لیجئے صاحب شادی ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی۔ مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولہا بھی تحصیلدار صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری، بہت رہیں تو ایک رات، نہیں تو اسی دن واپس آ گئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام ٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کمسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوار پنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا اندازہ اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی پیچ میرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آ جاتا تھا۔ اس لیے چپ تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا، دلائی جھاڑی، پائنتی جھٹک کے دیکھا، گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی انہوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولہا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجئے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آ کر بہت سخت سست سنایا، اور غصہ میں

یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہوگئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا داماد ممکن ہے کچھ شہدا پن ہی کر بیٹھے اس لیے مدی کا پورے طور سے تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لیے معطل کر دیے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہوگئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے، مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انہوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لیے علیحدہ گھر اور کچھ بودگی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہوگیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انہوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک، گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں، اب صرف بی مدی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا برا کیا ہوگا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ تھی۔ کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانہ نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پاندان سے کھائے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کیلیں لیں، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پر گت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہوگیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا مگر مدی اور

اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کرلیا۔ ان عورتوں نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گزرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین میں بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ بیچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ، تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کردیتے ہیں، یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انہوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو غلام ساختے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہوگی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں، اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے، اور ہر مرد میں کچھ جز عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کا فطرتاً اپنے ہی جنس سے اچھے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا سے ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مدی اور اس عورت میں دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہوگئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راہ آئی تھی۔ اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی بچھڑی رانڈ پا کھینے لگیں۔ جوئندہ یابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملا کیں مگر

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اسی لیے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیلدار کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہوگئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کئے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوا لیا۔ چکن کورشیا کا بھی ڈھچر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد تو تیر میں بھی فرق آ جاتا ہے مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقہ کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لئے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آ گیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا ''بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے'' بی مدی بول اٹھیں ''سچ کہتی ہو بہن'' ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گزرتا گیا مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کیے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے، لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھہرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلعم باعور تھے۔ جی چاہے انگلی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کئی گلنے میں اب بھی دیر تھی مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا لیکن اگر غور کیجئے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت، مرد پر۔



خواجہ حسن نظامی

نام : سید علی حسن (والدین نے قاسم علی نام رکھا تھا جبکہ ماموں ''علی حسن'' پکارتے تھے۔ آخر میں یہی نام قرار پایا۔)

قلمی نام : سید محمد علی حسن نظامی/ خواجہ حسن نظامی[1]

پیدائش : ۲ محرم بروز جمعرات ۱۲۹۶ھ بمطابق ۲۵ دسمبر ۱۸۷۹ء صبح صادق کے وقت بمقام بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، دہلی۔

وفات : ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء بہ مقام بستی نظام الدین، دہلی[2]

تعلیم : پہلے ناظرہ قرآن حکیم پڑھا پھر فارسی کی معمولی کتابیں، اس کے بعد عربی صرف ونحو پڑھی۔ استاد اوّل مولانا محمد اسماعیل ساکن کاندھلہ ضلع مظفر گڑھ تھے۔ ان کے دیگر اساتذہ میں مولوی وصیت علی، مولوی عبدالعلی محدث، مولوی حکیم الدین پنجابی اور مولوی رضی الحسن (ساکن کاندھلہ) جیسے بزرگوں کے نام نمایاں ہیں۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کا تعلق مولانا سید بدرالدین اسحاق کی نسل سے ہے۔ والد کا نام سید عاشق علی تھا، جو جلد سازی کا کام کرتے تھے یا درگاہ نظام الدین اولیاء کے چڑھاووں پر گزارا تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں والد انہیں تونسہ شریف (ڈیرہ غازی خان) لے گئے اور حضرت اللہ بخش کے ہاتھ بیعت کروایا۔ ۱۲ برس کی عمر میں والدین انتقال کر گئے۔ ۱۶ برس کی عمر میں بڑے بھائی سید علی حسن شاہ کے ساتھ چاچڑاں شریف (بہاولپور) گئے اور حضرت خواجہ غلام فرید کے ہاتھ بیعت کی۔ چوبیس برس کی عمر میں پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے مرید ہوئے۔ ملا واحدی کے مطابق شریعت میں ان کے استاد مولوی محمد ایوب تھے اور طریقت میں خواجہ نظام الدینؒ۔ ۱۸۹۶ء میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۰۳ء میں مطبوعہ کتب اور دہلی کی تاریخی عمارات کے فوٹو، پھیری لگا کر بیچنے لگے۔ شادی مرحوم چچا سید معشوق علی کی بیٹی حبیب بانو سے ہوئی جو زیادہ مدت حیات نہ رہیں۔ جولائی ۱۹۰۹ء سے رسالہ ''نظام المشائخ'' مرتب کرنا شروع کیا۔ جبکہ ''حلقۂ نظام المشائخ'' کے ارکان کا ایک کام یہ بھی تھا کہ درگاہوں پر جائیں اور طوائفوں کا ناچ گانا ختم کروائیں۔ ۱۹۱۳ء میں میرٹھ منتقل ہو گئے اور اخبار ''توحید'' کی ادارت سنبھالی۔ ستمبر ۱۹۱۷ء

میں رسالہ ''مرشد'' جاری کیا۔ مختلف اوقات میں روز نامہ، ہفت روزہ، ماہانہ اور دو ماہی اخبارات و جرائد مرتب کیے۔ ''ینگ مُسلم'' اور ''ڈکٹیٹر'' کے نام سے انگریزی اخبار جاری کیے جبکہ بقول ان کے انہیں انگریزی نہ آتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں حیدر آباد دکن میں جا بسے تھے، لیکن حالات بہتر ہوئے تو دہلی واپس آ گئے۔ مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ نہیں بنی لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریک چلی تو تینوں نے اس کی مخالفت کی۔ خواجہ صاحب کا سوامی شردھانند سے مباہلہ ہوا اور سوامی جی میدان چھوڑ گئے۔ خواجہ صاحب نے طبابت میں بھی بڑا نام کمایا، مسمریزم کے ذریعے نفسیاتی علاج کیا کرتے تھے۔ جوڑوں کے درد کے لیے ان کا تیار کردہ فاسفورس کا تیل بہت مشہور ہوا۔ وہ اکثر اپنے مریدوں کو نت نئے خطابات سے نوازتے تھے۔ علامہ اقبال کو ''شاعر مشرق'' کا خطاب بھی آپ نے ہی دیا۔ ایشیا ٹک موو ی ٹون لمیٹڈ لاہور کی اولین فلم ''افغان شہزادہ'' المعروف ''ترکی خون'' کے مکالمے ۱۹۳۴ء میں لکھے اس فلم کی کہانی علامہ اقبال نے تحریر کی تھی۔[۳] لیکن ان دو ناموں سے اس فلم کے ریلیز ہونے کی تصدیق کسی فلم ڈائریکٹری سے نہیں ہوتی۔ بہت ممکن ہے بات، کاغذی تیاریوں سے آگے نہ بڑھی ہو۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

''مُفلسی کے مُجرب علاج'' از مولانا جلال الدین سیوطی کے عربی رسالہ کا ترجمہ، مطبوعہ لگ بھگ: ۱۹۰۰ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''عرب شہید کا گھر'' مطبوعہ روز نامہ ''زمیندار'' لاہور، ۱۹۱۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

۱۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (جلد اوّل: بیگمات کے آنسو)	مطبوعہ: اخبار توحید، میرٹھ	طبع اوّل: ۱۹۱۴ء
۲۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (جلد دوم: انگریزوں کی بپتا)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۷ء
۳۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (جلد سوم: محاصرہ دہلی)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۰ء
۴۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (جلد چہارم: بہادر شاہ کا مقدمہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۰ء
۵۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (جلد پنجم: گرفتار شدہ خطوط)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۰ء
۶۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (جلد ششم: غدرِ دہلی کے اخبار)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:
۷۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (ساتواں حصہ: غالب کا روز نامچہ غدر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۱ء
۸۔	''غدرِ دہلی کے افسانے'' (آٹھواں حصہ: دہلی کی جانکنی)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۲ء

نوٹ: ان آٹھ کتب کے کئی کئی ایڈیشن نکلے۔ مثال کے طور پر آخری کتاب کا تیسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۲۵ء میں نکلا

۹۔ ''سفرِ بمبئی کا روز نامچہ'' مطبوعہ: ۱۹۱۲ء

۱۰۔	''اسلام کا انجام'' از شیخ توفیق بکری (عربی سے ترجمہ)		مطبوعہ:۱۹۱۲ء
۱۱۔	''اسرار'' از بہاء اللہ آفندی بانی، فرقہ بابیہ کا ترجمہ		طبع اوّل:۱۹۱۳ء
۱۲۔	''مجموعہ مضامین حسن نظامی'' دیباچہ میر نیرنگ صفحات ۱۵۲	مطبوعہ:	طبع اوّل:۱۹۱۳ء
۱۳۔	''سی پارۂ دل'' (مضامین/نثر لطیف)	مطبوعہ:	طبع اوّل:۱۹۱۳ء
۱۴۔	''سفرنامہ مصر و شام و حجاز'' صفحات ۲۱۲	مطبوعہ: اخبار ''توحید'' میرٹھ	طبع اوّل:۱۹۱۳ء
۱۵۔	''اعمال حزب البحر'' صفحات ۱۰۰	مطبوعہ: اخبار ''توحید'' میرٹھ	طبع اوّل:۱۹۱۳ء
۱۶۔	''مفلسی کے مجرب علاج'' (ترجمہ: جلال الدین سیوطی)		طبع اوّل:۱۹۰۰ء
۱۷۔	''ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی'' (جلد اول) ۳۲ صفحات		طبع اوّل:۱۹۱۱ء
۱۸۔	''فیضان سنوسی'' (جلد سوم)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۱۹۔	''تین پر ایک'' (فیضان سنوسی کا چوتھا حصہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۴ء
۲۰۔	''ناگفتہ بہ'' (فیضان سنوسی کا پانچواں حصہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۲۱۔	''جرمنی خلافت'' (فیضان سنوسی کا چھٹا حصہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۲۲۔	''اردو دعائیں'' (صفحات ۷۰)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۲۶ء
۲۳۔	''کم نو موت'' صفحات ۱۶۰ (فنا اور بقا پر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۲۴۔	''قبروں کے غیبی نوشتے'' (الواح قبور)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۲۵۔	''محرم نامہ'' (واقعات کربلا)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۶ء
۲۶۔	''میلاد نامہ'' (میلاد نامہ و تاریخ اسلام)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۲۷۔	''بیوی کی تعلیم'' (زنانہ تعلیم سے متعلق)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۲۸۔	''کتاب الامر عرف امام مہدی کے انصار''	ترجمہ: جلال الدین سیوطی	طبع اوّل:۱۹۱۱ء
۲۹۔	''یزید نامہ'' (محرم نامے کا دوسرا حصہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۳۰۔	''اتالیق خطوط نویسی'' (دو جلدیں)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۶ء
۳۱۔	''مجموعہ خطوط حسن نظامی'' صفحات ۱۲۰	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۳۲۔	''محفل نامہ گیارہویں شریف'' (غوث پاک کے حالات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۸ء
۳۳۔	''کرشن بیتی'' (کرشن مہاراج کے حالات) باتصویر	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۳۴۔	''رہنمائے سیر دہلی'' (دہلی گائڈ بک) باتصویر	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۷ء
۳۵۔	''انتخاب توحید'' (مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۳ء
۳۶۔	''چٹکیاں اور گدگدیاں'' (مزاحیہ مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل:۱۹۱۸ء

۳۷۔	''جگ بیتی'' (کہانیاں) صفحات ۸۰۰	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۷ء
۳۸۔	''رسول کی عیدی'' (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۳ء
۳۹۔	''فلسفہ شہادت'' (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۴۰۔	''توپ خانہ'' (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۴۱۔	''نمونہ جنگ صفین'' (خطوط)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۴۲۔	''پرندوں کی تجارت'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۳ء
۴۳۔	''پڑوس کے سترہ پاجی'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۴ء
۴۴۔	''دیا سلائی''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۴۵۔	''آخری سانس یا بہادر شاہ کا روزنامچہ''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۴۶۔	''غدر کا نتیجہ''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۲۶ء
۴۷۔	''کانا باتی'' (خطبات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۴۸۔	''اپنی آنکھ اپنی دید'' (مضامین)	مطبوعہ: درویش پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۳ء
۴۹۔	''انقلاب دہلی'' (شاعری)	مطبوعہ: نظامی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۱ء
۵۰۔	''مسلمان مہارانا'' (سوانح)	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۵۱۔	''اردو سکھانے کے مضامین'' (تعلیم)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۴ء
۵۲۔	''تاریخ سلاطین عباسیہ'' (حصہ اول)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۵۳۔	''تاریخ سلاطین عباسیہ'' (حصہ دوم)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۵۴۔	''سلاطین بہمنی'' (تاریخ حیدرآباد دکن)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۵۵	''غزنوی جہاد'' (تاریخ ہند)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۵۶۔	''دو سفرنامے''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۳ء
۵۷۔	''سفرنامہ ہندوستان''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۴ء
۵۸۔	''آپ بیتی''	مطبوعہ: کارکن لقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۱ء
۵۹۔	''علاج بالخیال'' (طب)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۶۰۔	''بیوی کی تربیت'' (اخلاقیات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۷ء
۶۱۔	''بچوں پر ستم'' (کفار کے مسلمانوں پر ظلم کی داستان)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۶۲۔	''روزنامچہ ہندوستان'' (سفری روزنامچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۶۳۔	''دل کی عیدیاں'' (نعتیہ مضامین نظم ونثر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن

۶۴۔	''دس سبق'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: س۔ن
۶۵۔	''درویشی مولود'' (میلاد شریف)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: س۔ن
۶۶۔	''داعی اسلام'' (تبلیغی لٹریچر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: س۔ن
۶۷۔	''خدائی انکم ٹیکس'' (زکوۃ کے فلسفے پر ۴۰ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۶۸۔	''حلوائی کی تعلیم'' (مٹھائیاں بنانے پر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۲۹ء
۶۹۔	''چار درویشوں کا تذکرہ'' (غیر ملکی مشائخ کا ذکر)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۲۲ء
۷۰۔	''تین شہید'' (طرابلس، ایران اور مراکش کے شہدا)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: س۔ن
۷۱۔	''پنواڑی کی دکان'' (پان سازی سے متعلق)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: س۔ن
۷۲۔	''تعلیم خدمتگاری''	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۳۔	''تسکین احساس'' (تصوف)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۳۹ سے قبل
۷۴۔	''تسخیر مہر و قہر'' (یعنی اعمال حزب البحر جدید پیرائے میں)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۵۔	''پھکّی اور دست پناہ'' (لطائف)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۶۔	''ہندو مذہب کی معلومات''	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۷۔	''مکاتیب اکبر'' (دو جلدیں۔ اکبر الہ آبادی کے خطوط)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۸۔	''مرگ نامہ'' (سبق آموز قصے)	خواجہ پریس، بٹالہ،	طبع اول: ۱۹۲۳ء
۷۹۔	''مرغی انڈے کی تجارت''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۰۔	''محمد کی سرکار'' (ایک سکھ بیرسٹر کی عقیدت)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۱	''مجالس حسنہ'' (نظامی کے خاص ارشادات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۲	''لے دور کا سلام'' (حضورؐ سے کلام)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۳	''لڑائی کا گھر'' (عالمی جنگ کی پیروڈی)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۴	''لاہوتی آپ بیتی'' (حضرت انساں کی سرگزشت)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۵	''کائنات بیتی'' (جمادات اور سیارگان کے حوالے سے معرفت)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۶	''قرآن: آسان قاعدہ'' بچوں کے لیے)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۷	''فرانسیسی درویشوں کے ملفوظات''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۸	''فاطمی دعوت'' (شیعہ سنی بزرگان کے حوالے سے)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۹	''غزنوی فتوحات'' (محمود غزنوی کے ۱۷ حملے)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۰	''عالم سکرات میں'' (کہانی کے انداز میں)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۱	''طمانچہ برخسار یزید'' (ناول یزید، ابن زیاد اور شمر سے متعلق)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۲	''قرآن پاک کی آسان تفسیر'' (پارہ نمبر ۱ تا نمبر ۳۰)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۳	''طریقت کی پہلی کتاب'' (تصوف)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۴	''طریقت کی دوسری کتاب'' (تصوف)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۵	''شیطان کا طوطا'' (مغربی تعلیم کی برائیاں)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۶	''شامی جہاد'' (تاریخ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۷	''سکھ قوم'' (گروگرنتھ صاحب کے حوالے سے)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۸	''اردو کی پہلی کتاب'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۹۹	''اولاد کی شادی'' (سماجیات)	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۰۰	''ایڈورڈ ڈائری''	مطبوعہ: دفتر ''منادی''، دہلی،	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء سے قبل
۱۰۱	''جرمن نامہ'' (تاریخ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۵ء
۱۰۲	''جرمن خلافت'' (تاریخ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۵ء
۱۰۳	''حلال خور'' (سماجیات)	خواجہ پریس، بٹالہ	طبع اوّل: ۱۳۴۱ھ
۱۰۴	''خوشی کی زندگی'' (سماجیات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۱۰۵	''شراب خوری اور جوئے بازی'' (سماجیات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۰۶	''گاندھی نامہ''	مطبوعہ: نظامیہ بک ڈپو، پٹیالہ	طبع اوّل: ۱۹۲۲ء
۱۰۷	''دستِ غیب''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۱۰۸	''اولاد کے کان میں کہنے کی باتیں''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۰۹	''اورنگ زیب کی اصل تاریخ'' (تاریخ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۱۰	''انگریزوں کی دعوت اسلام''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۱۱	''اعمال حزب البحر'' (دعا کے فوائد)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع دوم: ۱۹۳۷ء
۱۱۲	''امام حسین کا ماڈرن کیریکٹر''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۱ء
۱۱۳	''تمباکو نامہ: یعنی ترک سگریٹ''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۳ء
۱۱۴	''ترغیب حساب''	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع دوم: ۱۹۲۶ء
۱۱۵	''نوکری''	مطبوعہ: چمن اُردو بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۱۱۶	''تبلیغی اشتہاروں کا مجموعہ''	مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۱۱۷	''ایک سو چھبیس عید کارڈ''	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع چہارم: ۱۹۲۸ء

۱۱۸	''اسلام کے ضروری عقائد''	مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۱۹	''بابا فرید گنج شکر کا روزنامچہ''	مطبوعہ: دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء
۱۲۰	''تاریخ مسیح'' (لالہ جے چند کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)	مطبوعہ: حمیدیہ پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۱۲۱	''سفرنامہ پاکستان''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۴ء
۱۲۲	''تاریخ رسول'' (تاریخ)	مطبوعہ: حیدرآباد دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۱۲۳	''اردو سبق'' (تعلیم)	مطبوعہ: اہل بیعت پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۱۲۴	''قرآن مجید کے معجزات''	مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۱۲۵	''گھریلو دھوبی گھاٹ''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۱۲۶	''گیارہویں نامہ''	مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۱۲۷	''حدیث کی پیش گویاں''	مطبوعہ:	طبع اوّل: ۱۹۴۰ء
۱۲۸	''جمعہ اور عیدین کے اردو خطبے''	مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۱۲۹	''ترکیب نماز''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۳۰	''روزہ کے سب احکام و مسائل''	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۱۳۱	''تعلیم اسرار تصوف''	کارکن: حلقہ مشائخ، دہلی	بارہواں ایڈیشن: ۱۹۵۱ء
۱۳۲	''شیخ چلی کی ڈائری'' (مزاح)	مطبوعہ: اہل بیعت پریس، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۱۳۳	''دلائل اسلام'' (صفحات ۱۱۲)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۱۳۴	''نادان وہابی'' (اہل حدیث کے عقائد سے اختلاف۔ کتابچہ)	مطبوعہ: شاہجہان پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۳۵	''روٹی سالن''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۱۳۶	''روپیہ عالم سکرات میں''	مطبوعہ: خواجہ پریس، پٹیالہ	طبع اوّل: ۱۹۲۳ء
۱۳۷	''مرگی نامہ''	مطبوعہ: خواجہ پریس، پٹیالہ	طبع اوّل: ۱۹۲۳ء
۱۳۸	''نظامی بسری''	مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء
۱۳۹	''ترک گاؤکشی''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۳ء
۱۴۰	''دہلی کی جان''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۲ء
۱۴۱	''اردو سکھانے کے مضامین''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۴ء
۱۴۲	''ہندو مذہب کے معلومات''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۱۴۳	''حضرت امیر خسرو کا تذکرہ''	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۴۴	''دہلی کی آخری شمع''	مطبوعہ: ریاست برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۸ء

۱۴۵	''دلی کی سزا''		طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۱۴۶	''سرطامس منکاف کی ڈائری''	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۰ء
۱۴۷	''عام فہم تفسیر''	مطبوعہ: درویش پریس، دہلی،	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۱۴۸	''انسداد گداگری اور اصلاح خیرات''	مطبوعہ: حمیدیہ پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۱۴۹	''بولتا قرآن''	مطبوعہ: دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی	
۱۵۰	''قرآن وحدیث کے فرمان''	مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۱۵۱	''نئی تہذیب کی بوتل کا کاگ''	مطبوعہ: برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۱۵۲	''سناتن سندیسہ''	مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۵۳	''اسلامی توحید''	مطبوعہ: ہمدرد پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۱۵۴	''قرآن مجید کے فوجداری قوانین''	مطبوعہ: ہمدرد پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۱۵۵	''حق پرستوں پر ستم''	مطبوعہ: حمیدیہ پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۴ء
۱۵۶	''بندوق'' (کتابچہ ۱۶ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۵۷	''بم'' (کتابچہ ۱۶ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۵۸	''مچھر کا اعلان جنگ'' (کتابچہ ۳۲ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۵۹	''ہوائی جہاز'' (کتابچہ ۱۶ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۰	''جرمن شہزادہ کی لاش'' (کتابچہ ۱۶ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۱	''فرام قبلہ ٹو شملہ'' (لارڈ ہارڈنگ کے نام خط۔ صفحات ۱۸: کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۲	''مرشد'' (کتابچہ: ۳ صفحات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۳	''دینی یادداشت'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۴	''ہمارے رسول کی دعائیں'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۵	''آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۶	''تشریح بخاری''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۷	''دہلی کی جاں کنی''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۸	''غدر دہلی کے اخبار'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۶۹	''کرشن کتھا'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۰	''خضری پہاڑوں میں محمدؐ کا نام'' (سفرنامہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۱	''نادرشاہی قتل عام'' (ترجمہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	

۱۷۲	''تاریخ فرعون''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۳	''حسن نظامی کا پیام مسلم پریس اور مسلم لیڈروں کے نام'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۴	''مہارانا''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۰ء
۱۷۵	''سرکار کے خوشامدی سرکش''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۶	''خلاصہ تعلیم تصوف'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۱۷۷	''عمر بڑھانے کے طریقے'' (طب)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۸	''گورنمنٹ اور خلافت'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۷۹	''تاریخ اولیاء'' (ترجمہ)	مطبوعہ: اولیاء کتاب گھر، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۱۸۰	''انگریزوں کی بپتا''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۸۱	''تبلیغی کارڈ''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۸۲	''بچوں کی کہانیاں'' (باتصویر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۸۳	''داعی اسلام''	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۸۴	''درویشی مولود'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۸۵	''مرشد کو سجدۂ تعظیم'' (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۱۸۶	''ہوم رول کی پہلی لڑائی'' (کل صفحات ۱۱۲)	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۱۸ء
۱۸۷	''حیدرآباد نامہ'' (کتابچہ ۸۰ صفحات)	افضل برقی پرنٹنگ پریس، حیدرآباد دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء
۱۸۸	''حیدرآباد کے قانون دان'' (کتابچہ ۸۰ صفحات)	افضل برقی پرنٹنگ پریس، حیدرآباد دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۱۸۹	''اطبائے حیدرآباد'' (کتابچہ ۳۲ صفحات)	افضل برقی پرنٹنگ پریس، حیدرآباد دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۱۹۰	''جاگیردار'' (کتابچہ ۳۲ صفحات)	دفتر ''منادی'' دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۱۹۱	''بنک کار'' (کتابچہ ۱۲ صفحات)	دفتر ''منادی'' دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۱۹۲	''تجار'' (صفحات ۲۸۸)	دفتر ''منادی'' دہلی	
۱۹۳	''مرزا مغل کی بیٹی'' (افسانے)		
۱۹۴	''حیدرآباد کے دکان دار'' (کتابچہ صفحات ۳۲)	دفتر ''منادی'' دہلی	
۱۹۵	''جواز عکسی تصاویر کی شرعی بحث'' (کتابچہ صفحات ۴۸)	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۱۹۶	''تائید اسلام و تردید اسلام'' (از مولانا حفیظ الدین کا ترجمہ) جید برقی پریس اس کتابچے کے کل صفحات ۷۶ ہیں۔		طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۱۹۷	''پرانی دہلی کے حالات'' (کتابچہ صفحات ۹۶)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۹ء

۱۹۸	"خلاصہ سیرۃ نبوی"	کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	
۱۹۹	"اسلام کا نظام" (کتابچہ)	عصر جدید پریس، میرٹھ	
۲۰۰	"امام آخر الزماں کی آمد"	محبوب المطابع، دہلی	
۲۰۱	"بچوں کی حدیثیں" (کتابچہ)	محبوب المطابع، دہلی	
۲۰۲	"ذکر غوث پاک" (کتابچہ)		
۲۰۳	"سیرۃ امام حسینؓ"		
۲۰۴	"قرآن کی کہانیاں"	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۰۵	"پیغمبروں کی کہانیاں" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۰۶	"محمدؐ درشن" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۰۷	"مجالس حسنہ" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۰۸	"انتخاب توحید" (کتابچہ)	خواجہ پریس، بٹالہ	طبع اوّل: ۱۹۲۲ء
۲۰۹	"اسلامی رسولؐ" (کتابچہ)	دفتر "منادی" دہلی	
۲۱۰	"اسلام کیونکر پھیلا" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۱۱	"ہندو لغت" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۱۲	"اسلامی رسولؐ کے معجزات" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۲۱۳	"تبلیغی مرثیے" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۱۴	"عرب کا ارتداد اور اس کا بزور تیغ انسداد" (کتابچہ)	محبوب المطابع، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۶ء
۲۱۵	"محمودی حملوں کے اسباب" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۱۶	"نمازوں کا بیان" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۱۷	"تعلیم الاسلام" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۵ء
۲۱۸	"عام فہم تشریح بخاری" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	
۲۱۹	"آسان قاعدہ تعلیم القرآن" (پہلا اور دوسرا حصہ)	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی،	طبع اوّل: ۱۹۲۳ء
۲۲۰	"خلاصہ تعلیم تصوف" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۲۲۱	"تاکید تسلی" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۲۵ء
۲۲۲	"کتاب تسلی" (کتابچہ)	کارکن حلقۃ المشائخ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۵ء
۲۲۳	"کتاب الامر" (کتابچہ)	روز بازار پریس، امرتسر	طبع اوّل: ۱۹۱۲ء
۲۲۴	"واجب الوجود" (کتابچہ)	روز بازار پریس، امرتسر	طبع اوّل: ۱۹۱۳ء

۲۲۵	''رسولِ نبی'' (کتابچہ)		
۲۲۶	''پہلے درویش کے جنگی کارنامے'' (کتابچہ)	منیجر راز و نیاز درویش، میرٹھ	
۲۲۷	''خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ''	کارکن حلقہ المشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۲۵ء
۲۲۸	''اناالحق اور موت کا علاج'' (کتابچہ)	کارکن حلقہ المشائخ، دہلی	
۲۲۹	''بچوں کی تعلیم: پہلی کتاب'' (کتابچہ)	کارکن حلقہ المشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۲۳ء
۲۳۰	''اشتراکیت کا فتنہ'' (کتابچہ)	حلقۂ ادب، پاکستان	طبع دوم: س۔ن
۲۳۱	''آواز: ہندوستان میں اسلام کو بچاؤ''	کارکن حلقہ المشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۲۷ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، پرانی دہلی

نظریۂ فن:

''یہ کوشش کرتا ہوں کہ واقعہ قطعی جھوٹا نہ ہو، کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہو، اور میں ایک ذرہ کو آفتاب بنادوں اور اسی بات کو اپنا کمال سمجھوں...... البتہ جب کوئی آواز یا صورت یا واقعہ یا خبر میرے دل پر اثر کرے تو سوچنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی اور ابتدائی عمر کی طرح قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہوں۔''

خواجہ حسن نظامی

(بہ حوالہ ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں''

مرتبہ: حکیم یوسف حسن، دارالادب پنجاب، بارود خانہ، لاہور)



حوالہ جات:

۱۔ خواجہ حسن نظامی کے قلمی نام سے پہلا مضمون اخبار ''وکیل'' امرتسر میں شائع ہوا۔

۲۔ ''نقوش'' لاہور (آپ بیتی نمبر) اور ''بہترین انشائی ادب'' مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں سال پیدائش اور سنہ وفات کا اندراج درست نہیں۔

۳۔ دیکھیے: ماہنامہ ''تصویر'' لاہور، جنوری ۱۹۳۵ء۔ صفحہ نمبر ۶۔ ایشیاٹک سوویٹون لمیٹڈ، لاہور، ڈاکٹر شاہ جی آغا کا ذاتی ادارہ تھا۔

شہزادی کی بپتا

خواجہ حسن نظامی

ہونے کو تو غدر پچاس برس کی کہانی ہے مگر مجھ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اُن دنوں میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ میں اپنے بھائی یاور شاہ سے دو برس چھوٹی اور مرنے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے۔ ابا جان میرزا قویش بہادر ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ کے چہیتے اور نونہال فرزند تھے۔

بھائی یاور شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ بس ہر ایک دوسرے پر فدا تھا۔ آ کا بھائی کے لیے باہر کئی استاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے تھے۔ کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی کوئی خوشنویس تھا اور کوئی تیر انداز۔

اور ہم محل میں سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا مغلانیوں سے سیکھتے تھے۔ دستور تھا کہ حضرت ظل سبحانی جن بچوں اور بڑوں پر خاص عنایت رکھتے تھے۔ اُن کو صبح کا کھانا شاہی دستر خوان پر حضور والا کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ظل سبحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور میں ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور چچا ابو بکر کے لڑکے میرزا سہراب سے میری نسبت ٹھہر گئی تو حضور کے دستر خوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی، کیونکہ وہاں مرزا سہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ شرعی نامحرم گھر میں آتے جاتے تھے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ میں ایک آن کے لیے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرتی، حضور کے حکم کے خلاف دستر خوان پر کس طرح نہ جاتی۔ لیکن یہ غنیمت تھا کہ آداب سلطانی کے باعث سب نظریں جھکائے رکھتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ ایک بچّہ بھی ادھر ادھر دیکھے یا آواز سے بولے۔

قاعدہ تھا کہ جب حضور معلّی کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچّہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد اپنی جگہ سے اُٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر تین سلام بجالاتا۔ ایک دن میرے ساتھ بھی یہی اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا: "سلطانہ! تو تو کچھ کھاتی ہی نہیں۔ ادب ولحاظ ایک حد تک اچھا ہوتا ہے۔ نہ کہ اتنا کہ دستر خوان پر سے بھوکا اٹھا جائے۔ میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جا کر تین آداب بجالائی مگر کچھ نہ پوچھو۔ اس مشکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے۔ ہر قدم پر الجھتی تھی اور اوسان خطا ہوئے

جاتے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا۔ وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے جب ہم اپنے محلوں میں آزاد و بے فکر پھرا کرتے تھے۔ ظل سبحانی کا سایہ سر پر تھا، اور لوگ ہمیں ملکہ عالم کہہ کر پکارتے تھے۔ دنیا کے اتار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور معلی، مقبرہ حضرت ہمایوں میں گرفتار کیے گئے اور ایک گورے نے چچا جان حضرت مرزا ابوبکر بہادر کے تپنچہ مارا تو میرزا اسہراب تلوار گھسیٹ کر دوڑے مگر دوسرے گورے نے ان کے بھی گولی مار دی اور وہ ایک آہ کر کے چچا جان کی نعش پر گر پڑے اور تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے اور میں بت بنی تماشہ دیکھتی رہی۔ اتنے میں خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا بیگم کیوں کھڑی ہو، چلو تمہارے ابا جان نے بلایا ہے۔ میں اسی بے خودی کی حالت میں اُس کے ساتھ ہو لی۔ دریائی دروازے سے اتر کر دیکھا کہ ابا جان میرزا قویش بہادر گھوڑے پر سوار، ننگے سر کھڑے ہیں۔ تمام چہرے اور سر کے بال خاک آلود ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا ''تو سلطانہ اب ہمارا بھی کوچ ہے۔ جوان بیٹا جس کے سہرے کی آرزو تھی، آنکھوں کے سامنے ایک سکھ کی سنگین کا نشانہ بن گیا۔'' یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یا ور کہہ کر رونے لگی۔ وہ گھوڑے سے اتر آئے۔ مجھ کو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار اور تسلی دینے لگے اور کہا ''بیٹی! اب لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں بھی دو چار گھڑی کا مہمان ہوں۔ تم ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہو۔ اپنی چھوٹی بہن کو دلاسا دو۔ اور خود آنے والی مصیبتوں پر صبر کرو۔ خبر نہیں اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو تن تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ پر ایک نہ ایک دن تمہیں بن باپ کا بننا پڑے ہی گا۔ ناز بانو تو ابھی بچہ ہے اس کی دلداری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا اور دیکھو ناز بانو اب تم شہزادی نہیں ہو۔ کسی چیز کے لیے ضد نہ کرنا۔ جو میسر آئے شکر کر کے کھا لینا اور اگر کوئی شخص کچھ کھاتا ہو تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ ورنہ لوگ کہیں گے کہ شہزادیاں بڑی بدنیت ہوتی ہیں۔'' پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کر کے کہا: ''اِن کو جہاں ہماری خاندان کے آدمی ہوں پہنچا دینا۔'' اُس کے بعد ہم کو پیار کیا اور روتے ہوئے، گھوڑا دوڑاتے جنگل میں گھس گئے۔ پھر پتہ نہ لگا کہ وہ کیا ہوئے۔ خواجہ سرا ہم کو لے چلا۔ یہ ہمارے گھر کا قدیمی نمک خوار تھا۔ تھوڑی دور تک ناز بانو جو نازوں کی پلی ہوئی تھی چلی، مگر پھر پاؤں کی طاقت نے جواب دے دیا اور دو قدم چلنا دوبھر ہو گیا۔ مجھ کو بھی کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی، مگر بانو کو لیے ہوئے چلی جاتی تھی۔ اتنے میں ناز بانو کے ایک نوکدار کانٹا چبھ گیا اور وہ ہائے کہہ کر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اُس کو اٹھایا اور کانٹا نکالنے لگی مگر موا خواجہ سرا دیکھا کیا۔ اور یہ نہ ہوا کہ میرا ہاتھ بٹا لیتا۔ بلکہ چلنے کی جلدی کرنے لگا۔ بہن بولی آپا جان مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا، ناظر کو بھیج کر گھر سے پالکی منگا لو۔ گھر اور پالکی کا نام سن کر میرا جی بھر آیا اور اُس کو تسلی دینے لگی۔ خواجہ سرا نے پھر کہا کہ چلو بس ہو چکا، جلدی چلو۔ ناز بانو کا مزاج تیز تھا۔ وہ نوکروں کو ہمیشہ سخت سست کہہ لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سن لیتے تھے۔

اسی خیال سے اس نے خواجہ سرا کو پھر دو ایک باتیں سنا دیں۔ کم بخت کو سنتے ہی اتنا غصہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترسی سے بن ماں باپ کی دکھیا بچی کے ایک طمانچہ مارا۔ بانو بلبلا گئی۔ وہ کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ پٹی تھی۔ یا ایسا طمانچہ لگا۔

اس کے رونے سے مجھ کو بھی بے اختیار رونا آ گیا۔ ہم تو روتے رہے اور خواجہ سرا کہیں چلا گیا۔ پھر خبر نہ ملی کہ وہ کیا ہوا۔ ہم دونوں بمشکل تمام گرتے پڑتے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں پہنچے۔ یہاں دہلی کے اور خاص ہمارے خاندان کے سینکڑوں آدمی تھے۔ مگر ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار، قیامت کا نمونہ تھا۔ کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ اسی اثناء میں وبا پھیلی اور پیاری بہن ناز بانو اس میں رخصت ہو گئیں۔ میں اکیلی رہ گئی۔ امن ہوا۔ جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا۔ آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنی چاہی اور میرا پانچ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر ہوا، جو اَب بھی ملتا ہے۔

نیاز فتح پوری

نام : نیاز محمد خاں (والدہ کی طرف سے)
تاریخی نام : لیاقت علی خاں (والد کی طرف سے) بہ مطابق تاریخ پیدائش: ۱۳۰۲ھ
قلمی نام : نیاز فتح پوری
پیدائش : جنوری تا مارچ کے کسی مہینہ میں۔ ۱۸۸۴ء بہ مقام سٹی گھاٹ، ضلع بارہ بنکی، بھارت۔
وفات : ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء بہ مقام کراچی (سندھ) پاکستان۔
تعلیم : میٹرک، مدرسہ اسلامیہ فتح پور ۱۸۹۹ء

فتح پور ہسوہ میں ابتدائی تعلیم مولوی حبیب الدین سے اور بعدازآں لکھنؤ میں مولوی صدیق حسن غازی پور سے پائی۔ دس برس کے تھے کہ ۹۴۔۱۸۹۳ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی مڈل پاس کیا۔ اس اثنا میں دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ، رام پور میں تقریباً ڈیڑھ برس مولانا عرب محمد طیب اور مولانا ظہور الحق خیر آبادی کی شاگردی کی۔ بعدازاں مدرسہ اسلامیہ، فتح پور سے ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی

نیاز کے والد محمد امیر خان پولیس انسپکٹر تھے۔ آبائی وطن فتح پور ہسوہ (یو۔پی) تھا۔ والد کے تبادلوں کے سبب بارہ بنکی، فتح پور، لکھنؤ اور رام پور میں بچپن اور لڑکپن گزرا۔ تاہم ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۴ء تقریباً اکیس بائیس برس فتح پور میں قیام رہا۔ ۹۷۔۱۸۹۶ء میں جب والد صاحب ریٹائر ہوئے اور رام پور میں وکالت شروع کی تو نیاز بھی ان کے ساتھ رام پور میں رہے، جہاں سے واپسی پر فتح پور سے مڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کیے۔ ان دنوں شعر کہنے لگے تھے۔ نیاز نے ۱۹۰۰ء میں بطور سب انسپکٹر مرادآباد میں پولیس ٹریننگ لی۔ ۱۹۰۱ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر تھانہ ہنڈیا (الہ آباد) میں تعینات ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شاخ) کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۷ء بادنی اسٹیٹ (کدورا) میں نواب ریاض الحسن خاں کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر، کوتوال شہر اور پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔

۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء اجے گڑھ اسٹیٹ بندیلکھنڈ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ۱۹۰۸ء تا ۱۹۰۹ء اسکو اسٹیٹ ہانسی (ضلع ہسار) میں بہ حیثیت میونسپل سیکرٹری ملازمت کی۔ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء دوبارہ مدرسۂ اسلامیہ سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۰ء میں اخبار ''زمیندار'' کے عملے میں چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک بار پھر ہانسی (ضلع ہسار) میں میونسپل سیکرٹری کے طور پر کام کیا اور ہفتہ وار ''توحید'' کے معاون مدیر رہے۔ ۱۹۱۲ء میں تیسری بار مدرسۂ اسلامیہ کے تدریسی عملے میں شامل ہو گئے، جہاں ۱۹۱۴ء تک کام کیا۔ اس کے بعد دِلّی چلے گئے اور حکیم محمد اجمل خاں کے قائم کردہ انگریزی اسکول کے نگران مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۲ء بھوپال میں رہے۔ ۱۹۱۹ء میں اخبار ''رعیت'' کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۶۲ء لکھنؤ میں قیام رہا۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور ۳۱ جنوری ۱۹۶۲ء تا وفات کراچی (پاکستان) میں قیام رہا۔ نیاز صاحب نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۹۰۱ء میں بہ عمر سترہ سال، الہ آباد میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری شادی بہ مقام لکھنؤ مختار بیگم سے ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں مختار بیگم کا انتقال ہوا تو اسی سال مرحومہ کی چھوٹی بہن گلزار بیگم بنت محمد ولایت خاں سے لکھنؤ میں تیسری شادی ہوئی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں ل۔ احمد کی تحریک پر آگرہ سے ادبی ماہنامہ ''نگار'' جاری کیا۔ یہ پرچہ دسمبر ۱۹۲۲ء تک آگرہ سے، جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۷ء بھوپال سے، اور جولائی ۱۹۲۷ء تا جولائی ۱۹۶۲ء لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ اگست ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۶ء تک کراچی سے یہ پرچہ ''نگار پاکستان'' کے نام سے جاری رکھا۔ ''نگار'' آگرہ کے اجراء سے قبل نیاز کی تحریریں ''انتخاب لاجواب'' لاہور، ''صدائے عام'' دہلی، ''زمیندار'' لاہور، ''صوفی'' پنڈی بہاؤالدین، ''رعیت'' میرٹھ، ''خطیب'' دہلی، ''الہلال'' کلکتہ، ''تمدن'' دہلی اور ''نقاد'' آگرہ میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء کے آغاز پر معلوم ہوا ہے کہ نیاز سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں، اس موذی مرض نے ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء تک مہلت دی۔

اوّلین تحریریں:

ابتدائی مضامین (۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء ''صلائے عام'' دہلی، ''انتخاب لاجواب'' لاہور، ''تمدن'' دہلی اور ''نقاد'' آگرہ میں شائع ہوئے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' مطبوعہ: ''نقاد'' آگرہ ''تمدن'' دہلی جنوری ۱۹۱۳ء

بقول نیاز، یہ افسانہ نمائش الہ آباد سے متاثر ہو کر ۱۹۱۰ء میں قلم بند کیا گیا تھا۔ یہ افسانہ ''نگارستان'' کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھا۔ دوسرے ایڈیشن سے اسے خارج کر دیا گیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''ایک شاعر کا انجام'' (طویل مختصر افسانہ)	مساوات پریس، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۱۳ء
		نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع دوم: ۱۹۲۹ء
		عبدالحق اکیڈمی، حیدر آباد دکن	طبع سوم: س۔ن
۲۔	''نگارستان'' (چھبیس افسانے، مضامین)	صدیق بک ڈپو، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۲۹ء
۳۔	''نقاب اٹھ جانے کے بعد'' (تین افسانے)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۳۲ء

۴۔	''جمالستان'' (افسانے)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۳ء
۵۔	''حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے'' (چوبیس افسانے)	زاویہ ادبیہ، حیدرآباد	طبع اوّل: س۔ن
	یہ مجموعہ بعد میں ''تاریخ کے گمشدہ اوراق'' کے نام سے شائع ہوا۔		
۶۔	''مختاراتِ نیاز'' (اٹھارہ افسانے، مضامین) دہلی		طبع اوّل: س۔ن
	یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا، اس میں ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء تک کی تحریریں ہیں، جن میں سے بیشتر ترجمہ کردہ ہیں۔ اسی کتاب کا ایک ایڈیشن ادارۂ فروغ اردو۔ نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔		
۷۔	''شہاب کی سرگزشت'' (طویل مختصر افسانہ)	صدیق بک ڈپو لکھنؤ	طبع اوّل: س۔ن
	یہ کتاب ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوئی۔ صدیق بک ڈپو نے ۱۹۴۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔		
۸۔	''شبستان کا قطرہ گوہریں'' (طویل مختصر افسانہ) آخری بار یہ کتاب ادارہ ادب العالیہ، کراچی نے شائع کی		
۹۔	''قربان گاہِ حسن'' (ارض بابل کا ایک تاریخی طویل مختصر افسانہ)		طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۰۔	''کیوپڈ اینڈ سائکی'' (طویل مختصر افسانہ)		طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۱۔	''صحابیات'' (سوانحی مضامین)		طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۲۔	''المسلمۃ الشرقیۃ'' یہ سیاسیات اسلامی سے متعلق کتاب کا عربی از مصطفیٰ کمال پاشا سے ترجمہ ہے۔		طبع اوّل: قبل ۱۹۳۹ء
۱۳۔	''فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع''		
۱۴۔	''مکتوبات نیاز'' (تین جلدیں)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۵۔	''جذبات بھاشا'' (مضامین)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۶۔	''ترغیبات جنس'' (جنسیات، نفسیات)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۷۔	''مجموعہ استفسارات و جوابات'' (تین جلدیں)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۴ء
۱۸۔	''انتقادیات'' (تین جلدیں، مضامین)	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۱۹۔	''مذہب'' (مذہبیات)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	
۲۰۔	''مالہ وماعلیہ''	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	
۲۱۔	''کہکشاں کا ایک سانحہ''	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	

۲۲۔	''اصحاب کہف'' (تاریخ، سوانحی اشارے)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	
۲۳۔	''جھانسی کی رانی'' (سوانح)		
۲۴۔	''چند گھنٹے علمائے کرام کی روحوں کے ساتھ'' (تاریخ، خاکے)		
۲۵۔	''ناد مین کا مذہب'' (مذہبیات، فلسفہ)		
۲۶۔	''مشکلات غالب'' (تنقید)		
۲۷۔	''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ'' (فلسفہ، مذہبیات)		
۲۸۔	''تاریخ الدولتین'' از جرجی زیدان کا عربی سے ترجمہ (تاریخ اسلام)	جامعہ ملیہ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۲۹۔	''عرض نغمہ'' از رابندر ناتھ ٹیگور کا ترجمہ المعروف ''گیت نجلی''		
۳۰۔	''فراست الید'' (علم نجوم)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: س۔ن
۳۱۔	''مذاکرات نیاز'' (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء کے مضامین)	آزاد بک ڈپو، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۳۲۔	''مطالعات نیاز''	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	
۳۳۔	''من ویزداں'' (فلسفہ، مذہبیات) دو جلدیں		
۳۴۔	''گہوارہ تمدن'' (سماجیات)	ناشر: مولوی قمر الحسن، نور محل، بھوپال	طبع اول: ۱۹۲۲ء سے قبل
۳۵۔	''نقش ہائے رنگا رنگ''		
۳۶۔	''محمد بن قاسم سے بابر تک'' (تاریخ، سماجیات)		
۳۷۔	''اسلامی ہند'' (تاریخ بھارت)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: س۔ن
۳۸۔	''توقیت'' (تاریخ)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: س۔ن
۳۹۔	''مریخی سیاح کی ڈائری'' (مضمون) یہ مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ اس کا مقصد ہوم رول کی تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنا تھا۔	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۰۔	''صدا بصحرا'' (قومی نظم)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۱۔	''علماء قدیم'' (تین مقالات)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۲۔	''حرکت کے کرشمے'' (تین مقالات)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۳۔	''قمر زمانی بیگم'' (سوانح)	مطبوعہ: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

نوٹ: ''نیاز فتح پوری پر ایک نظر'' از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ: سالنامہ ''نگار پاکستان'' کراچی ۱۹۶۳ء میں فراہم کردہ فہرست کتب میں کئی مطبوعہ کتب کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

غیر مدوّن:

لاتعداد علمی وادبی مضامین اور تبصرے۔ نیاز کے تحریر کردہ ''نگار'' کے خاص نمبر، جن کی اہمیت باقاعدہ مطبوعہ کتب کی سی ہے:

۱۔ ''ملاحظات نمبر'' جنوری ۱۹۲۶ء

۲۔ ''ڈرامہ اصحاب کہف نمبر'' جنوری ۱۹۳۷

۳۔ ''قرآن نمبر'' جنوری ۱۹۴۵ء

۴۔ ''پاکستان نمبر'' جنوری ۱۹۴۸ء

۵۔ ''ایک مستقبل کی تلاش نمبر'' (نصف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء

۶۔ ''فرمانروایان اسلام نمبر'' جنوری ۱۹۵۴ء

۷۔ ''علوم اسلامی وعلمائے اسلام نمبر'' جنوری ۱۹۵۵ء

۸۔ ''معلومات نمبر'' جنوری ۱۹۵۸ء

۹۔ ''تنقیح اسلام نمبر'' جنوری ۱۹۵۹ء

۱۰۔ ''غالب نمبر'' جنوری ۱۹۶۱ء

اعزاز:

۱۔ ''پدم بھوشن'' حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز: ۱۹۶۲ء

نظریۂ فن:

سب سے زیادہ عجیب وغریب بات (جو غالباً اصول افسانہ نگاری کے بالکل خلاف ہے) میں اپنے اندر یہ پاتا ہوں کہ آج تک میں نے کوئی افسانہ پلاٹ متعین کر کے لکھا ہی نہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اس سے بھی بے خبر ہوتا ہوں کہ ''زیرتحریر'' لفظ کے آگے دوسرا لفظ مجھے کیا لکھنا ہے، لیکن چونکہ اکثر وبیشتر میرے افسانوں کا آغاز ''تجزیہ سیرت'' (Charcterisation) سے ہوتا ہے اس لئے ابتداء ہی میں کچھ ہلکے سے نقوش دماغ میں ایسے ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو پلاٹ کی تخلیق میں غیرارادی طور پر معاون ہوتے رہتے ہیں۔''

نیاز فتح پوری

(بہ حوالہ: ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں'' مرتبہ: حکیم یوسف حسن،

دارالادب پنجاب بارود خانہ، لاہور: طبع اوّل: س۔ن)

کیوپڈ و سائکی

نیاز فتح پوری

یوں تو یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود ایک حسن آباد تھا، لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً ''عورت کی دنیا'' میں ایک سحر تھا، ایک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر ایک ماہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا، جسے سائکی کے حسن عالم افروز سے کوئی نسبت دی جا سکتی، پھر یہ خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اس کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی، تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب الٹ الٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

اگلارس و کیوپڈس میں بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقش حسن و شباب (سائکی) اور نہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں، کہ دنیا انہیں کے لیے ترستی، انہیں کے لیے تڑپتی، اس لیے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے خوش نہ تھیں، تو جائے عجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لیے وہ اپنی تسلی اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین سہی، مگر کم از کم وہ ان لذات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں۔ ''کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی؟'' اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی اک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آئے، خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لیے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے تو اس پیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ سائکی کے لیے کوئی بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب سائکی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو برے بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی وہ تو اب پوری جوان تھی اور اس لیے انتخاب

شوہر کی حس، جو عورت کی جوانی کی تنہا حس ہے اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی اول تو بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی بھی جاتی تھیں، تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غور سے ازسرتاپا دیکھ لیتی۔ ہاں اسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھوا دیا کہ ''اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں۔'' مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک سچی پیشن گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ ہر دنیا کے گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اس کی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو گیا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اٹھا لیتی اور جذبات حسن وعشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوتا کہ جب کتاب دیکھتے دیکھتے اسی حالت انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی، تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتی غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی، خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم وحجاب پر ختم نہ ہوتا، اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں، جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھنا، یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ سافی نصف عورت تھی اور نصف انفعال وجستجو۔

دن گزر گئے، یہاں تک کہ سافی کا شباب، سرور سے سکر، اور سکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا جس کی زمین کے نسبت فرش گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ سافی اپنے باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی، یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لیے روشنی ہے اور اس کی ہر رات چاندنی، وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کیے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھیں، اپنا درد کہہ رہی تھی، شکایتیں کر رہی تھی کہ

> ''اے چاندنی تو تو آسمان کی سافی ہے، آسمان ہی میں رہ، دنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک سافی سے بیزار ہے، زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونی بند ہو گئی ہے سنسان ہے۔ لیکن نہیں تو مجھے پاتا تو تو روز یہاں آ کے ڈھونڈ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی، شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے۔ میں اسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھنورے کو گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں، کہ جب شمع نہ ہو گی تو پتنگے کیا کریں گے، کلیاں نہ ہوں گی تو بھنورے کہاں جائیں گے۔ لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری انگلیوں کے سرے چراغ کی لو ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔

میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں، ڈھلی جاتی ہے، میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں، روناچاہتی ہیں، میرا وہ چہرہ جس پر اے چاندنی، ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے، افسردہ ہے کیوں کہ دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگار حسن باقی رکھے، کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے، اور کوئی مغنی ایسا نہیں جس کے بربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں۔ پھر اے آسمان کی سائگی، تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے، جو سمندر کو لکھ سکے، جو نگہت کو گا سکے، کہاں ملے گا۔''

سائگی جیسی حسین و جمیل تھی ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی، اور اس لیے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ایسا ہی بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی، یہاں تک کہ وہ خستہ ہو گئی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کیے۔ بربط کو پھینک دیا، گویا وہ اس سے بھی بیزار ہو گئی تھی اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی تھیں، اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں...... ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اتر رہی تھیں، سو رہی تھی مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بے ہوش سائگی کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ، اس حالت کو نیچر گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

پایان کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی۔ یعنی صبح جاگی، ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی یعنی کلیاں جاگ اٹھیں۔ سائگی اٹھی اور کنج ابھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اٹھا، وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی، اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اٹھا سکی، جس کے ہر تار چڑھاؤ کے ساتھ اس کا شباب صرف ہوتا تھا۔ گیت کے بول جن میں اس کے سارے حسیات لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے چنانچہ وہ سو گئی اور انہیں تمناؤں، شکایتوں اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لیے ہوئے سو گئی، جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اٹھی تو اس کے اعضا دکھ رہے تھے، اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ لٹ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہو لی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر، تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں، بلکہ ایک جدا حسن ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سائگی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا تھا۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں، مگر ہوا اس سے معمور ہے، جھنجیری اڑ کر نکل گئی، مگر اس کی لچک اور سبک پرواز اب بھی نگاہ میں تھرتھرا رہی ہے۔ سائگی کنجوں میں غائب ہو گئی، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں اپنی خواب گاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی، اس نے سمجھا کہ بدن کا درد، اعضا کی دکھن، عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے، اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں، لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی، کہ نسرین جو سائگی کی محبوب سطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زریں بربط لیے ہوئے آئی اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بربط کے تار اپنی نازک انگلیوں

سے درست کیے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے، اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے، اس نے افسوں خواب نہایت ہی نرم و شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

''اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملادے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے، اے نیند آ، اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے، والئی یونان کی بیٹی کو دختر رز انگور کی ضرورت نہیں، اس کا شباب خود شراب ہے، میں نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر سے اسے ٹہلتے دیکھا ہے، اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزش رفتار نہ پہچان لے۔ اے نیند آ جا، کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ ساگمی کروٹیں لے رہی ہے، اس کا بدن شاید دکھ رہا ہے، رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ......''

''نسرین خاموش۔ افسوں خواب کو ختم کر کے میرا جی گھبراتا ہے۔''

اب ساگمی اٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن، ایک ننھی سی موج بلوریں، ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی، آخر کار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا اور یوں ہی بغیر کسی نظام و اصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ نسرین خاموش مودب کھڑی ہوئی ساگمی کی اس خلاف معمولی بدمزگی سے ڈر رہی تھی، یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل احکام اور ضروریات صبح کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ لیکن ساگمی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی:

''اے نسرین! آج تو ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکال۔ جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے۔ تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر، جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آ جائیں، تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری ان راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں، تو تو مجھے لوریاں سنا کہ میں اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لیے ناقابل برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو اک ایسی صدا ہے، جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو تو ہزار دفعہ وہی گا۔ جو ابھی گائی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں اتار دے، نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ، اور میرے ساتھ کراہ۔''

قبل اس کے ساگمی اپنی گفتگو ختم کرتی، وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور ساگمی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دی۔

ساگمی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سترھویں سالگرہ تھی اور اسے

حسب رواج دربار میں شریک ہوتا تھا۔ ملک کے تمام شعراء، شاہزادے، سفیر، مغنی، سبھی موجود تھے۔ اور دربار میں سائگی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو سائگی کتاں کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور سائگی اپنی جگہ پر جو بہت مرتفع تھی، کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہار ہوتا تھا اور دوسرے میں وہ چیز جو نذر کے لیے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھولوں کو ڈال دیتا تھا اور پھر نذر پیش کرتا تھا چنانچہ تھوڑی دیر میں سائگی کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صناعت انسانی کے نازک و لطیف ترین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعرا نے اپنے قصائد شروع کیے مغنیوں نے اپنے ساز درست کیے یہاں تک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آ گیا۔ جس کے لیے ہر دل تڑپ رہا تھا اور جس ایک لمحہ کے لیے یہ سارے تکلفات تمہیدی برداشت کیے گئے تھے۔ یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا تو ان ہدایا کی پذیرائی میں سائگی کو ایک لمحہ کے لیے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دینا پڑتی تھی اور غالباً اس برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں سائگی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دنیا اس جلوہ عریاں کے لیے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنا ہے کہ جس وقت سائگی پورے بارہ برس کی ہو گئی اور اول دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب پانزدہ سالہ سائگی کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اس کے حسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی اور اس سال جب کہ اس کا شباب پورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہوگا، غرضیکہ وہ ساعت آئی۔ جب سائگی کو بے نقاب ہونا تھا۔ یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطرار ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا، اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی، لب باہم وصل ہو کر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخرکار سائگی اٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لیے اور اپنے سحر حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لیے پتھر کا بنا کے چل دی۔

2

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا، تو بے جا ناز نہ تھا، کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا، گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انہوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی، بت تراشوں نے اس کے مجسمے تیار کیے، مصوروں نے اس کی تصویریں بنائیں، شعرا نے اس کے حسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دنیا کو مبہوت و متحیر کرنا چاہا۔ مگر یہ پرستاران حسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لیے آخرکار انہیں منہ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ "اے ملکہ حسن تیرے مجسمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں ان کی تیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں، نادرست

ہیں، ہمارے قصائد جن میں حسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے، نامکمل ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانہ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانہ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں، کمزور ناقص ہیں، پھر اے تو، کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے، اے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پر شکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کہ تو کیسی ہے!'' — یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا اک عام بے چینی و وارفتگی کا حال۔

وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے جوسما میں چمکتی تھی، آج بھی شاید اسی انداز سے درخشاں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے، اور ہم ایک کرہ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہوسکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا اور وینس وہاں کی ملکہ ہو، اور اگر نہیں ہوسکتا تو بھی، ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کی حکمراں ایک حسین وجمیل عورت تھی، جو ہر چند طبقہ انسان سے نہ تھی، مگر طبقہ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا، جو سائکی نے زمین میں۔

اسی زمانے میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں، مگر ہمیں معلوم نہیں کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں) بہر حال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے، وینس اپنے کاشانہ بلور میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشہ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی، ایک بلوریں حوض جس کی تہہ اور دیواریں صیقل کیے ہوئے آئینہ کی تھیں، نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی، اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لیے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا، غرضیکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جدوجہد کا تماشہ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اروش، وینس کے ملک کی مشہور سیاح اور شہرت کی دیوی، جو اس سے قبل کئی بار کرہ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرب درباریوں میں تھی، وینس سے ملنے آئی تھی، وینس پہنچی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اس کی نئی سیاحت دنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ ''اے وینس، میرے حالات سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر، کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لیے اضمحلال وافسردگی کا باعث ہو۔''

وینس نے نہایت متحیر ہو کر پوچھا ''اے اروش آخر تو وہ کون سی بات اب کے دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہوگی، مجھے یقین ہے کہ تو نے کرہ ارض کے ان ذلیل باشندوں میں، جن کی ہوا نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی بات ایسی نہ پائی ہوگی، جس کو سن کر وینس جلے، کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ سن کر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہوگئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیر بن جاتی ہیں۔ اے اروش کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ، جو کچھ تو نے دیکھا ہے میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلاف معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے۔''

اروش جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ ومتین دیوی تھی، یہ سن کر کچھ چیں بہ جبیں ہوئی اور بولی۔ ''اے وینس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور اس کے رہنے والے، جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے، جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن جب تو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سن میں بتاتی ہوں کہ والی یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائکی ہے، ایسی حسین ہے اگر خاک پا مل جائے تو وینس کو چاہیے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے، کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس

تقریب میں اتفاق سے پہنچ گئی تھی، لیکن اے وینس یقین کرو کہ میں جو اس وقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں، اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں، اس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکی، جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا۔ اے وینس، میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو تو اپنے دل میں پیدا کر سکتی۔''

وینس جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا ہے، یہ سن کر ایک عورت اور وہ بھی کرہ ارض کی، اس سے زیادہ حسین ہے، چونک پڑی اور اس کے غرور حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکرمند ہو کر خاموش ہو گئی، لیکن کچھ سوچ کر بولی:

''اے روئس ٹھہر، میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں، اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے، تو یہ سمجھ رکھ کہ وینس جس طرح حسن خدمات پر انعامات کی بارش کرتی ہے اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے؟''

اس نے اروئس کو رخصت کیا اور کنیزوں سے طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا اور سب کو علیحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی، یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا۔ کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی، لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا، جو حقیقتاً وینس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی اور نسبتاً بے تابی میں کچھ کمی پیدا ہوئی۔ ''بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی، پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہیے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے اور اس کی رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اس کو جلد سے جلد درس عشق دینا چاہیے، اور عشق بھی نہایت شدید، سخت ناکام و مایوس، یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ، وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لیے، اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے، روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیر اندازی کرے (ہر چند اس وقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی شکل میں دکھائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اس کا عنفوان شباب تھا اور اس لیے اس کی نازک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی اور بیٹے کا منہ چوم کر کہنے لگی ''اے کیوپڈ میں نے سنا ہے کہ جب تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اچھے کیوپڈ جی، چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے، لیکن خدا کے لیے پیروں میں زنجیر محبت نہ ڈال، کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیر محبت سے زیادہ آسان ہیں، کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ ان تیروں سے کیونکر وہ زنجیر تیار کرتا ہے، کرہ ارض میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قائل نہیں، جا اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز و غرور شکن ہے۔''

کیوپڈ یہ سن کر پھڑک گیا، نئے شکار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں بے چین ہو گئیں۔ کمان شانہ سے اتر کر ہاتھ میں آ گئی اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں اور دفعتاً نگاہ سے غائب، ہو گیا۔

3

ساگی کی رسم سالگرہ، جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافہ قیامت کیا ختم ہوگئی اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس لمحہ عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، جس کو دیکھنے کی تمنائیں اس درجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مان بھی لیا جاتا تو ساگی کے بے نقاب چہرہ اور نگاہ بے محابا کے سامنے خاکستر حسیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لیے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھانا چاہتا تھا، اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دنیا سے اب یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ ساگی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ اس کے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لیے میسر آ جائے، آہ! یہ خواہش تو ایسی تھی، جو اب کفر میں داخل تھی کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے، عالم اسے پوجنے لگے، ساگی کا نام لیا جائے، تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اٹھ چکی ہے وہیں تک اٹھ کر رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیماں قابل اعتبار سمجھا جائے جو ساگی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو۔ غرضیکہ رئیس یونان کو پورا یقین تھا کہ اب ساگی کی شادی کسی طرح نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اس کو کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ ساگی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ ساگی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ ساگی کے حسن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، بہر حال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو ساگی اپنے باغ میں حوض میں بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید چند لمحوں کے لیے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی ساگی ہے جس کی ناکامیاب رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ اس سال بھی اپنے شباب کو خلوت مہجوری میں کاٹنے کے لیے مجبور ہے ورنہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دنیا کی تمام تفریحیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا، اور ذرا حسین ہونا ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ غذا بقائے حیات کے لیے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے جی الجھا تو اٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ ساگی جہاں کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یوں ہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید گجروں کو کوئی اپنے لیے نہیں پہنتا۔ ہار اس لیے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نکہت کو صرف ہوا اڑائے لیے پھرے۔ ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پر پڑے پڑے سوکھ جائیں بلکہ شاید ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نکہت سے بیقرار ہونے والا ہو اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے اپنے بیقراری کا جواب دے ورنہ یوں ناکام سینہ ایک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا، اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی کیونکہ وہ لحن میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی۔ سازوں کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تاروں میں کسی خاص تار کی کمی ہوگئی ہے اور

پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے، اگر گانا سکون ہے، تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو دل کو بیقرار کئے دیتا ہے۔

غرضیکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دیئے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حسیات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہو گئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھیں اور چاہتی تھی کہ مضبوط ہاتھ انہیں پکڑتے اور پھر نہ چھوڑے، وہ اپنی نازک کمر، وہ ایک مٹھی میں بھر کے آ جانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دکھائے اور دکھائے جائے، وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت و دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرور حسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی۔ اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی اور ہنس کو بھی گردن اٹھائے، ابھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی، تو وہ چاہتی تھی کہ یہی بازو کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی نڈھال گردن پر اپنی زبردست گردن ڈال دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اول تمکنت نے معاملہ کی صورت کو اس قدر راہم بنا دیا تھا، اب چارہ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے۔ لیکن آہ، کون جانتا ہے کہ ایک دیوی، جس کو دنیا معصوم جانتی ہے، اس وقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لیے ہوئے تھی۔

بہر حال وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی اور نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی، کنیزیں پھولوں کے پنکھے لیے اسے ہوا پہنچا رہی تھیں اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سر گود میں لیے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی، کہ ساگمی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی کہ "نسرین، یہ تو کیا گنگنائی، پھر کہہ، ذرا آواز سے کہہ، ساز لے اور گا، کہ مجھے کچھ لطف آیا۔" نسرین جو ساگمی کی افسردگی سے بہت فکر مند تھی، خوش ہو گئی اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا:

> "وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانہ میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، گئے وہ۔ راتیں، جب سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی گزر گئیں، اب تو جی چاہتا ہے کہ نقاب میرے چہرے سے جدا ہو اور پھر چاروں طرف کی چاندنی سمٹ کر ایک ہالہ نظر آئے، تمہیں آرزو تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا، شاید میں افسردہ تھی کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ عرصہ سے محروم تھیں، راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغموں نے انہیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا، لیکن اب اے صبح اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کر لے کہ میں آج پھر بے نقاب پھر رہی ہوں۔ اے شام اپنے تئیں خوب بسا لے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر رکھے ہوئے ہیں اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے، میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی، انہیں مسحور ہونا نہیں آتا، میرا حسن اگر دیویت ہے تو ہمیشہ اس کی پرستش ہی کی جائے گی۔ وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو دنیا اگر میرے لیے تڑپ رہی ہے تو تڑپے میں کسی کے لیے کیوں تڑپوں۔ میری رعنائی ایک مستقل استغنا ہے، اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوہ گریز پا کا ادنیٰ خراج۔"

ساگمی یہ سن کر جوش میں آ گئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی، سیاہ ریشمی چادر جو اس کی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہنچ گئی تھی، ڈھلک گئی، شانے کھل گئے، بیاض گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی، سیاہ ریشمی بال

پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے، ابرو ئیں تن گئیں، مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں، ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش ساگی پر خالی کر دے گا۔ لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لیے، کیوپڈ نے ساگی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی، چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ، کاش کوئی ساگی سے اس وقت جا کر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزو مند ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے، صیاد خود اس کا مجروح ہے۔ عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے، خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کیے ہوں گے، لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکاں، جنہیں صرف ایک حسین دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جا، تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ، جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج ساگی کے باغ میں بے ہوش پڑا ہے۔

وینس کو یقین تھا، اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ یہی یقین کرے گا کہ ایک ساگی کیا اگر اس جیسی ہزار ہوں تو وہ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے۔ مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تھا، ایک ناوک اور تھا، جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا، مگر ان سے زیادہ کارگر تھا اور جس وقت ساگی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اس کی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا، کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی، اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے، لیکن ساگی کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں، نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھی اور نہ کسی اہتمام کو، وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھی اور نہ کسی انصرام سے، ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

غرضیکہ کیوپڈ، ساگی کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا، اور اس کی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اپنے اضطراب و بیقراری کا لطف اٹھا رہا تھا کہ وینس آئی اور خلاف معمول اس درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا مضمحل ہو کر لوٹنا، وہ کچھ سمجھی اور سمجھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی اور ایک خاص انداز سے بولی ''اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تو تیر چلاتے چلاتے چٹکیاں دکھ گئیں، ہاں، ہاں، سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہوگا کہ کیوں ساگی کو زخمی کیا، وہ ایسی ہی حسین ہے، اور اے کیوپڈ یہی وجہ تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی کو لازم کر ایا تھا۔ اے کیوپڈ بول، جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں کہیں خراب و خستہ پھر رہی ہے۔''

کیوپڈ، ساگی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بے قرار ہو کر بول اٹھا۔

''ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دکھتی ہیں، کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کے لیے یہ عذر کافی نہیں ہیں، میں ساگی کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا وادیوں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوگی، کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی، تیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ ساگی کے درد و مصیبت میں، اپنے تئیں

اتاوے۔ اے وینس مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی ذیہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے، آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا، تو میں اس کو اس حال بن کہ وہ میرے خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا، اولمپس و اٹیلس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپیٹر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر ڈالے۔''

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پر کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا، وہ انتہائی غیض و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی، اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آ کر دیا یہ تھا کہ ''سامان سفر درست کیا جائے۔''

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ اہتمام و تیاری میں مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لیے آمادہ۔ پردار گھوڑے جن کا ساز دیراق جواہرات کا تھا اور جن کی دم و دایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے، وینس کے زریں رتھ میں لگائے گئے اور معہ اپنی کنیزوں، اور پریوں کے دفعتاً بادلوں کی طرح جو سا پر چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئیں۔

4

سارا یونان آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر، بزم رقص و سرود...... ایک سیلاب مسرت تھا کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی۔ ایک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا، ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی، شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔ آگسٹس، والئی یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ رعایا کا خیر خواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس سے بہتر موقع اس کے لیے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا، سارا دربار زر اندود تھا اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔

یونان کے تمام امراء جمع تھے اور پایہ تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی، اگلارس و کیوپڈس، سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دولہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہران کے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی، اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری و الماسی گلاسوں میں چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آ کر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے، مسرتیں مفقود ہو گئیں، سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی، اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا، اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا، آنکھیں شدت درد سے ابل پڑی تھیں، اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے، ملکہ چیخ کر

بادشاہ سے لپٹ گئی، کہ ''خدایا یہ کیا ہوا؟'' اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر وہاں ایک وینس، جو لوگوں کی نگاہ سے غائب گویا یہ کہتی ہوئی چل دی کہ ''یہ ابتداء ہے، انتقام کی۔ سائکی، وینس کے بیٹے کو بے قرار کرکے زندہ رہے، ناممکن ہے۔''

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہوگیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے لوگ دوڑ پڑے، ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کردیں، شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوئی اور اس لیے بایان کار تمام اراکین وعقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے اور جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی، اور اس عرض والتجا کے لیے ایک خاص مقام مقرر تھا، یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگ مقدس کہتے تھے، اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آجاتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفع بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی، چنانچہ اس وقت صعب میں، جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لحمہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا، سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگ مقدس سے مدد چاہی جائے۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ملکہ، امرائے دربار، اراکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کیساتھ روانہ ہوگئی، اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہنچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کیے گئے، جن کا ادا کرنا ضروری تھا، مگر آہ کسے خبر تھی کہ وینس کے ہاتھ نے اس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے، جس کے دیکھنے اور سننے کے لیے نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہوگئیں تو ملکہ دھڑکتا ہوا دل لے کر بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا، جو سنگ مقدس پر پڑا ہوا تھا۔ اس تحریر کا مفہوم یہ تھا۔

> ''رئیس یونان بیمار ہے، لیکن اس کی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے، سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ، لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے، ساری دنیا کے اختر شناس جمع کرو، لیکن وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے، وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دور کرسکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر نے اس پر نازل کیا ہے، یہ اس کا غصہ ہے کہ اگر اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی، تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا، اگر یونان کی ملکہ، یونان کے امراء، یونان کی رعایا، اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن وسکون کے آرزومند ہیں تو ان کو چاہیے کہ شہزادی سائکی کو کوہ الوند کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپیٹر اس قربانی کو کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرے گا، اور بادشاہ فوراً صحیح وتندرست ہو جائے گا، اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار سالوں کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور نہ کرسکیں گی۔''

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امراء متحیر رہ گئے، کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں، اس حلقہ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا، اور جن کے لیے اس ظالم پتھر کی یہ ظالم تحریر اک شعر سے زیادہ پرلطف ایک نغمہ صہبائی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلارس و کیو پڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور ہوش میں لا کر جلد واپس چلنے پر اصرار کرتی ہوئی بولیں "اے ماں اٹھ، خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہوگا۔ ہر چند جیوپیٹر کا فیصلہ نہایت شدید وظالم ہے، لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہوگا۔ اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہ کیا گیا۔"

بہرحال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لیے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی، تو وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلہ میں برداشت کر لیتی، مگر نہیں فطرت اس وقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی۔ سخت المناک آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی، شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس لئے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے، یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے، مگر کس کو دے اور کس کو لگائے رکھے، یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا، لیکن جب اس نے سائکی کو باپ کے پاس سخت حالت فسردگی میں بیٹھا پایا۔ تو وہ "ہائے سائکی" کہہ کر زمین پر گر پڑی۔ اور بے ہوش ہوگئی، ہمیں خبر نہیں کہ وہ کب تک اس عالم میں رہی اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا، مگر ہاں، جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ضعف اور نقاہت کا وہ عالم تھا کہ کسی کے سہارے سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ وہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا، مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اس نے اپنے پندار میں بحالت خواب و بے ہوشی پایا تھا۔

نہ صرف امراء، دربار وارا کین سلطنت، بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھیے ملکہ کس نتیجہ پر پہنچتی ہے، بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ، ایسا نئی ورحیم حکمران پھر یونان کو نصیب نہ ہوگا، اس لئے جس قدر گراں قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے، لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو سائکی زندہ رہے، کیونکہ بادشاہ تو ضعیف ہے اور بہرحال یونان کو ایک نہ ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن سائکی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جس کی ذات ساری زمین کے لیے مایہ ناز ہے، روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت منتظرہ میں دفعتاً بادشاہ کی خواب گاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتاً آنکھیں کھول دیں۔ اور اس سکوت کے دور کرنے کے لیے جو اس وقت سارے دربار پر چھایا ہوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے جس کے سننے کے واسطے یونان کا ہر متنفس ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ وہ اٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال میں لیے ہوئے، اس عجیب وغریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کر کے کوئی فتح حاصل کر چکی ہے، اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لیے تیار نہیں۔۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ سائکی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اس لیے مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوکہ سے نفع نہ اٹھانے دوں۔ اگر سائکی کو ہاتھ سے دے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کرلے گا تو وہ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے سائگی کو مخاطب کر کے بولی کہ:

''اے بیٹی تیار ہو جا، میں تجھے اجازت دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر، اے سائگی ہر چند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی۔ لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی تو کیا مجھے پس و پیش کرنا چاہیے تھا، پھر تیرا چلا جانا بھی تو میری اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے، اے میرے جگر کے ٹکڑے دیکھ، اپنی کمزوری سے اس وقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو، کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آ ملے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لیے تجھے اپنی آغوش میں لے لے گی۔''

اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ امڈ آنے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اس بات کا اشارہ کرنا پڑا کہ ''بس اب سائگی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو۔''

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائگی نے اول اول اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی، کس طرح سنا اور اس حالت انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا، مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، تو وہ بالکل مردہ سی تھی اور اس کے قوانے بالکل جواب دے دیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے، اس لئے سائگی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی تھی لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنا دیا، جس صدمہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو جذب کر لیے، وہ صرف یہ تھا کہ ''میری جدائی کو ماں، کیونکر برداشت کر سکے گی۔'' اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ بدن ڈھیلا کر دیا اور اس طرح گویا اس نے اجازت دے دی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔

اگلارس دکیوپڈس نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب سائگی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الوند کی طرف چل دیے۔

سوگوار ماں، جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی اور اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ کو گھیرے ہوئے تھا، سارے شہر میں ایک کہرام برپا تھا، اور گھر میں نالہ و ماتم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خوں بار نہ ہو اور کوئی دل نہ تھا جو بے قرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات پلٹ دی جانے کو ہے اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں سائگی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں، پس پشت رسی سے باندھ دی گئی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لیے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی، اس کی دھانی ریشمی چادر جسے وہ نصف باندھتی اور نصف اوڑھ لیتی تھی اس کے جسم پر تھی، لیکن وہ نقاب جو ۵ سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا، اب جدا تھا، کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

سائگی کا یہاں تک لایا جانا، اس کی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا، یہ سب عالم بے ہوشی میں ہوا، لیکن جس وقت اس کی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اس کی پیشانی کا لیا تو سائگی کی آنکھیں کھل گئیں اور چونکہ اب وہ ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے) وہ قدموں پر نہ گر سکتی تھی، (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس

لیے اس نے وہ ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضاء سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کھچ کر آ گئی تھیں، اور اس لئے عالم یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے رحم طلب کرنا، حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں کیا لا سکتی تھی، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی، لوگوں نے اسے اٹھایا اور سائکی کو یوں ہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیے۔

مگر آہ، وہ سائکی کا کسمسا، کسمسا کر اک آخری نگاہ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی، مگر آہ، نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا، اور نہ ماں وہاں موجود تھی کہ پھر ایک بار چیخ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور دحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں سائکی کی نگاہ واپسیں گم اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بے ہوش۔

5

''اے خواب کی ملکہ اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سکون بھر دے، اور تو بھی اے نسیم کی دیوی اٹھ اور اس کی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے، کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا ساحر دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کر و کیونکہ میرا دل اس کی محبت میں پھنک رہا ہے۔'' کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور دفعتاً کوہ الوند کی اس خوفناک چوٹی پر پہنچ گئیں، جہاں ایک شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبشیں شروع ہوئیں۔ چیتاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نکہت بیز ہوا نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائکی کے دماغ کا اس تغیر سے متاثر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ باد نسیم نے درخت سے جدا کر کے، اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر فرش پر لٹا دیا۔

سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی، چادر اس کے سر و سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے اپنا عریاں حصہ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیے، اس کے بال ہوا سے اڑ اڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پر لے آ رہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے، اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی، مگر محو خواب نہ تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائکی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو، اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ سائکی کی سیاہ خمار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے، وہ متحیر تھا کہ اس کی نازک کمر پر اپنے تئیں تباہ کرے یا اس کی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر۔ وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا، اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سائکی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے رنگین تلوؤں پر ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ:

''اے سائکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا، تجھ سے پیار نہیں کروں گا، تجھ سے عشق نہیں کروں گا، کیونکہ یہ بھی ایک ناقص طریقہ اظہار جذبات کا ہے، میں تیری عظمت کروں گا، تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈروں گا، ایک ایسا ڈر اپنے دل میں لیے ہوئے جو کبھی جیو پیٹر کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا، تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا، بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی میں تجھے ایک ملکہ نہیں ایک دیوی آہ، یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا، اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم، ایک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب، فقیر، اک ذلیل گدا، ایک خوار بھکاری، اور اس سے زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا، جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔''

مارفیس و زفر نے سائکی کو اٹھایا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کوہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر، سائکی کے لیے تیار کرایا تھا، وہ اک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا، لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نینداس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہوگئی۔

سائکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنے تئیں اک طلائی برج میں جواہر کار فرش پر پایا، اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو، مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا اور اک شیریں آواز سائکی کے کانوں میں آئی کہ ''یہ خواب نہیں حقیقت ہے'' اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے، سونے کی بوچھاروں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ ''متعجب نہ ہو، تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے، اسے کوئی حکم دے شاہانہ لب و لہجہ کے ساتھ کچھ کرنے کو کہہ، کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے، اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں۔ جس کے لیے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی، اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشات قلب مہیا کردے۔''

سائکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت، مردم خوار عفریت اس کا شوہر بنے گا، لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہرچند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب، اس کا کندنی رنگ، جو نقاب سے چھنا پڑتا تھا، کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے ایک نہایت ہی خوبصورت اور پر شباب چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حسیات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے، دفعتاً زندہ ہو کر پھر اس کے خون میں دوڑنے لگے، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا، انفعال سے بھیگ گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آگئی جس سے اس کا حسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخر کار اپنی تمنا سے مغلوب ہو کر اٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ ''اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات، اپنی تمناؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں ان سے محبت کرنا سیکھوں گی، گو انہیں مجھ سے محبت نہ ہو، میں اپنے بہترین ہدایائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی۔ خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائی رہیں'' یہ کہتے ہوئے سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و پر لجاجت لہجہ میں بولا کہ:

''اے سائکی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر، جس کو میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھی کو افسوس کرنا پڑے، اگر تو مجھ پر صرف اس لئے رحم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لیے تیار

نہیں، تو تو رحم کر، ورنہ اے سائکی پھر میں تجھ سے چھٹ جاؤں گا اور مر جاؤں گا۔"

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پا کر رک گئی۔ ٹھہر گئی اور ایسا محسوس کرنے لگی، گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اس کے بدن میں سکت نہیں اور وہ بے اختیار اس کی طرف کھینچی جا رہی ہے۔ آخر کار اس نے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا، اپنے تئیں اس کے آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اور جس کے لیے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی، آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہو کر گر پڑی۔

ہر چند، ملک، وطن، ماں باپ کو اس طرح یکا یک چھوڑنے کا رنج، ایسا معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، اور ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع، جلد فراموش کر سکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے، یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغل حیات میں بھی منہمک ہو، مختلف اسباب تفریح سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ یکسر محویت واستغراق ہو جائے، لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کرو جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو، پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے، یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن وشباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی، حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوار کر مزے کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو، اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سائکی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ الفت یہ جاں نثاری یہ قربانی اسی وقت تک تھی جب تک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا، لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا اور اس کی وارفتگی، اس کی افتادگی اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، کانوں سے سن لی اور ہاتھوں سے چھو لی، تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کوہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیات معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بار شباب سے خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی، آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے، اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے، حسین ہے اس لیے اس نے مطلق پروا نہیں کی، اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا، اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لیے آمادہ ہے، اس لیے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی، وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا، غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں، کبھی وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب، کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے، غرضیکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا، مجنوں تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پرنم ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیے، اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا اور اس کی آغوش میں بے ہوش ہو کر پڑا رہا۔

6

ابتداءِ آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا واقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو کیونکہ اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تجلی گاہ تھیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا ایک انسانی قوت سے باہر تھا ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں۔ ناقابل پیائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے عمیق چشموں کی اس وسعت میں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا، ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت، بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ، اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ! یہ تھا کوہ اولمپس جہاں کیوپڈ نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا، اور یہ انتخاب اس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی، تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہ اولمپس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن وسکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا، کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑی کی چوٹی پر اترآتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہ اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپیٹر کا غصہ آگ بن کر نکلا اور دور دور آبادیوں کو تباہ وبرباد کر گیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا، مگر چونکہ کیوپڈ، جیوپیٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لیے وہ وہاں پہنچ سکا، اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں، مارفیس اور زفیر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زریں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لیے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت، ایک ایسی مسرت سائکی کے لیے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اسے ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ انہیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ جانے سے کرہ ارض میں کج خلقی، بے رحمی، اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لیے ضرورت تھی کہ وہ اپنا تیر وکمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرے، لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ آئے گا سائکی کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟ اس کا جواب ذرا دشوار تھا، مگر آخر سائکی نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالی قصر میں ان تمام اسباب تفریح کو مہیا کر دے، جن کی وہ اپنے زمانہ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اٹھا کر زمین پر دے مارے جو خود تو غائب ہو گئے، لیکن بجائے ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹنکے ہوئے تھے اور جن کی عمریں ۱۳-۱۴ سال سے زائد نہ تھیں نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے ان سے کہا کہ ”جاؤ اور قبل اس کے کہ ملکہ سائکی دروازہ تک پہنچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کر دو جو والئی یونان کے محل سے متعلق ہیں۔“ ان کو رخصت کر کے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش زمین پر پٹکنا شروع کیا، یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے بھر گیا اور سائکی ان پرداز پیش خدمتوں سے گھر گئی، ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مسحر خوشبو پیدا ہوتی تھی، سائکی اس زمانہ قیام میں اس نوع کے عجائب وغرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر

ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اس کی نگاہ دروازے سے باہر نکل کر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہو گئی کہ شاہ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشنیوں، نہروں، کنجوں، فواروں، درختوں اور حوضوں کے کیونکر یہاں منتقل ہو سکا، وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی، سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس تھے، وہاں حوض سنگ مرمر، بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں وہ اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرتی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ مست و سرشار تھی۔ سائکی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں۔

شام ہو گئی تھی، چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر سائکی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اس نے کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

7

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لیے باہر چلا جاتا اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائکی کے پاس رہتا ہر چند سائکی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں انتظار کی گھڑیاں، مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی لیکن وہ کیوپڈ کی اس گھڑی گھڑی کی مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی، اور وہ اپنے کنجوں، پھولوں اور پریوں سے بیزار، اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسی کا ہم جنس مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کیں، جن سے سائکی گفتگو کر سکتی۔ غرضیکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہ ان بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں۔"

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے، وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار، جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں، لیکن جب کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کیلئے قابل فہم بنا دیتا ہے، تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شادکام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے، اس لئے سائکی بعض وقت گھبرا اٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم ان کی بہنیں، اگلارس و کیوپڈس ہی آ کے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلاف معمول کئی دن کے بعد آیا، تو سائکی مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی، اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انہیں کو یہاں بلواؤں گی، یا تو وہ اس کے پاس ہٹا نہ کرے یا پھر کیوپڈس و اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انہیں کے ساتھ بسر ہوں۔

کیوپڈ خاموشی سے سائکی کی ضدوں کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے سائکی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کردوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منغض نہ کردے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سرِ نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آجائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کردیں اور یہی ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا نہیں چاہتا۔

مگر سائکی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی، اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو بادلِ نخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے مارفیس و زفر کو بلایا، اور اگلارس و کیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کردی کہ ان کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

''میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گزر جاتی ہیں، کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے، لیکن ہاں میں ان راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو ادھر مجھ پر اور ادھر تجھ پر تنہا گزریں، کیونکہ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انہیں کے ساتھ ہے، لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں، کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں، اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی، تجھ سے محبت کرنے کی۔ پھر اگر تو مجھ سے علیحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو تیرے ساتھ ہے پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشاغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے، وہ سکوت وہ فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں، تو رات کو کسی دور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے، گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے، یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائکی ہے جو تیری آنکھوں میں آجاتی ہے، اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں محبت بری ہے، مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا۔''

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لیے بول اٹھا کہ "اے سائکی، کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا؟''

سائکی بولی ہاں سچ ہے، تمہیں نے چلایا، تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہوسکتے کیونکہ میں نے سنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا اس کے دل میں ذرا رحم نہیں ہے، اس کا سینہ گدازِ عشق سے خالی ہے، وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو۔ کیوپڈ'' ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہوسکتی، شاید درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔''

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر، سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لیے ہوئے آئیں اور جگا کر غائب ہوگئیں۔ سائکی اپنی بہنوں کو لے کر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ اور جلیں کہ

ساگمی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے لیکن ظاہر میں انہوں نے ساگمی کو مبارک باد دی اور پوچھا کہ "یہ زر و جواہر یہ سامان نشاط کہاں سے آیا۔"

ساگمی نے جواب دیا کہ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے، جس نے مہیا کیا؟" انہوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

"آہ! میں اس کا نام نہیں جان سکتی، اس کی ممانعت ہے۔"

"مگر اے بہن، تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا، کیا بہت خوبصورت ہے۔"

"نہیں، میں نے اس کی صورت تو نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے۔"

"ہاں ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب اور میری نیندیں اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اٹھتی ہیں۔"

بہنیں بولیں۔ "اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھالے گا۔" ساگمی نے کہا "نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔" مگر دونوں بہنوں نے پھر یہی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ ساگمی بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اس فکر سے انہوں نے اور فائدہ اٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ ابھی جائے اور نقاب الٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہوگئی تھی، کیوپڈ اپنی خواب گاہ میں بے ہوش پڑا سو رہا تھا، ساگمی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ سے نقاب الٹ دیا، مگر بجائے اس کے کہ وہ عفریت کی ڈراؤنی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں ساگمی کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لئے۔

کیوپڈ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ "اے بے وقوف ساگمی یہ تو نے کیا کیا، کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں اک قوت غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت ساگمی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح وہ لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہر چند کیوپڈ، ساگمی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رک گیا، کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر فانی روح اس سے چھین لی جاتی۔ اس لیے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور ساگمی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور ساگمی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بے ہوش رہی، لیکن ہاں، جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا، نہ وہ اس کی مکلف خوابگاہ، نہ وہاں باغ تھا، نہ کوئی کنیز، وہی وحشت ناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لیے لائی گئی تھی، اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ کبھی کس کے باندھ دی گئی تھی، پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا پڑا کہ خواب نہیں ہے، بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پرلطف زندگی بسر کی، مگر ایسا خواب، ایسا طویل خواب نہیں ہوسکتا، مگر پھر کیا تھا!

آہ! وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی، وہ بالکل مبہوت تھی، دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مر جانا چاہتی تھی۔

8

سائکی دیوانہ وار پہاڑی پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے اور سارا بدن چوٹوں سے داغدار، کراہتی تھی، اور روتی تھی، چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی، لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا، اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس چلی گئی۔ جیوپیٹر اس کا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی، اس لئے اس نے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا، مگر جس وقت سائکی لائی گئی، تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوصف تمام تدابیر حسن افروز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، عرق عرق ہوگئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیے، لیکن جیوپیٹر نے رات کو وینس کے خواب میں آکر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پر، سر پائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اٹھی، کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب کے نیچے اور عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے۔" یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی۔ نہ اس نے دشوار گزار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور: مہیب غاروں کا، کیونکہ ایک روشنی تھی، ایک محبت پاش جھلک تھی جو اس کے آگے آگے تھی، اور اسے ان مصائب میں تسکین دیتی جاتی تھی، راستے میں درندے اسے ملے، مگر وہ اس کے حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے، غرضیکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسر پائن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا، سائکی خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا، اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ پھر واپس آجائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی۔ لیکن وینس، سائکی کے اس عزم واستقلال سے اور زیادہ جلی اور بدعہدی پر آمادہ ہوگئی۔ جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آگیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، آخر کار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی۔

9

کیوپڈ وسائکی پھر اسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی شروع ہوگئی، جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی، اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا، مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر ان پر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

O

مہاشہ سُدرشن

نام	:	پنڈت بدری ناتھ شرما
قلمی نام	:	بدری ناتھ شرما سدرشن/ مہاشہ سدرشن/ سدرشن
پیدائش	:	نومبر ۱۸۹۵ء بہ مقام سیالکوٹ
وفات	:	۱۶دسمبر ۱۹۶۷ء بہ مقام بمبئی
تعلیم	:	بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مختصر حالات زندگی:

سیالکوٹ میں تھے لیکن ان کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہا۔۱۹۲۲ء میں بنارس جا کر سرسوتی پریس قائم کیا اور ۱۹۳۰ء میں بنارس سے ادبی مجلّہ ''ہنس'' جاری کیا۔۱۹۳۰ء میں ہی لاہور منتقل ہو گئے اور سدرشن پبلشنگ ہاؤس قائم کیا، جہاں سے پہلی کتاب خود ان کی اپنی شائع ہوئی۔ یہ ان کا افسانوی مجموعہ تھا ''طائر خیال'' ۔۱۲افسانوں کا یہ مجموعہ بعد میں تاج کمپنی بھنڈار، لاہور نے بھی شائع کیا۔۱۹۳۱ء میں ماہنامہ ''چندن'' جاری کیا۔ ۱۹۳۹ء تک تنگ دست رہے۔قسمت آزمانے کے لئے ۳۹۔۱۹۳۸ء میں کلکتہ بھی گئے۔مختلف کتب کے تراجم کر کے روزی کمائی۔ اسی سال لاہور کی ایک فلم کمپنی کے لیے کہانیاں، سکرین پلے اور مکالے لکھے لیکن یہ کام ان کے مزاج نہ تھا، چھوڑ دیا۔ ڈرامہ ''محبت کا انتقام'' پر حکومت پنجاب نے پانچ سو روپے انعام سے نوازا۔

۱۹۴۵ء تک فری لانسر کی زندگی گزارنے کے بعد ایک بار پھر فلمی دنیا کا رخ کیا اور منروا اسٹوڈیو کے باقاعدہ ملازم ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے بمبئی منتقل ہو گئے۔بمبئی میں اپنے بیٹے شاش بھوشن کے ساتھ قیام تھا۔ ہمارے اولین ترقی پسند ادیبوں میں نمایاں تھے۔بہتر سالہ زندگی میں ڈیڑھ سو کے قریب افسانے لکھے۔اُن کے نو افسانوی مجموعوں میں ایک سو ستائیس افسانے شامل ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

''پھول'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور، بابت: جنوری ۱۹۱۴ء

یہ افسانہ سدرشن نے ۱۹۱۲ء میں قلم بند کیا تھا جب اُن کی عمر سترہ برس کی تھی۔ خود میں نے ''اردو افسانہ کی روایت'' کے پہلے ایڈیشن میں افسانے کا سال اشاعت ۱۹۱۲ء درج کیا تھا لیکن ''مخزن'' لاہور اس افسانے کا سال اشاعت جنوری ۱۹۱۴ء ظاہر کرتا ہے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱ ''طائر خیال'' (بارہ افسانے) ناشر: مہاشہ سدرشن — سدرشن پبلشنگ ہاؤس، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۳۰ء

۲ ''سدابہار پھول'' (اٹھارہ افسانے) ناشر: مہاشہ سدرشن — رام کتیا بکڈپو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۲۱ء
طبع دوم: رام کتیا بک ڈپو، لاہور — طبع دوم: ۱۹۲۶ء
طبع سوم: راجپال اینڈ سنز، لاہور — طبع سوم: ۱۹۴۶ء

۳ ''چندن'' (افسانے) — مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۲۰ء

اس مجموعے میں ۱۵ افسانے ہیں۔ کتاب کا دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا۔ یہ کتاب تاج کمپنی لمیٹڈ، قرآن منزل، ریلوے روڈ لاہور نے بھی شائع کی۔

۴ ''چٹکیاں'' (مضامین) — مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور

۵ ''قوس قزح'' (بارہ افسانے) — مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۲۱ء
مطبوعہ: سرسوتی آشرم، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۳۰ء

۶ ''بنگال بیتیی'' (دو جلدیں) — گیلانی الیکٹرک پریس لاہور — طبع اوّل: ۱۹۲۳ء

اس کتاب میں رابندر ناتھ ٹیگور، بابو پربھارت کمار چٹرجی، شریمتی انپورنا دیوی، بابو شرت چندر چٹرجی، بابو شرچند گھوشال، بابو کیشو چندر گپتا، بابو جلدھر سین، بابو اپندر ناتھ گنگولی، سریندر موہن مکرجی، شریمتی نروپما دیوی، بابو ہیم ناتھ سرکار اور بابو گرجا کمار گھوش کی بنگالی کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ ہے۔

۷ ''وجے سنگھ'' (ڈراما) — مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور

(یہ بابو ڈی۔ ایل۔ رائے کے بنگالی ناٹک کا ترجمہ ہے)

۸ ''عورت کی محبت'' (ڈراما) — گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۲۷ء

(یہ بابو۔ ڈی۔ ایل۔ رائے کے بنگالی ناٹک کا ترجمہ ہے۔)

۹ ''من کی موج'' (مضامین) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور طبع اول: ۱۹۲۴ء

۱۰ ''پتھروں کا سوداگر'' (ناول) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور

۱۱ ''گناہ کی بیٹی'' (ناول) گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور طبع اول: ۱۹۲۶ء

(یہ ناول بنگالی سے ترجمہ ہے)

۱۲ ''آزمائش اور دیگر افسانے'' (بارہ افسانے) مطبوعہ: راجپال اینڈ سنز، لاہور

۱۳ ''راج سنگھ'' (ترجمہ/ناول) مطبوعہ: لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی طبع اول: س۔ن

بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناول کا ترجمہ ہے، اس ناول کا مرکزی کردار بائی چنچل کماری کا حقیقی کردار ہے۔

۱۴ ''قدرت کا کھیل'' (ترجمہ/ناول از بنکم چندر چٹرجی بعنوان ''رجنی'') مطبوعہ: لاہور

۱۵ ''گلدستۂ سخن'' مطبوعہ: نرائن دت سہگل، لاہور طبع اول: ۱۹۲۲ء

(اردو شاعری کی مختصر تاریخ معہ شعراء کے حالات زندگی و انتخاب کلام)

۱۶ ''تہذیب کے تازیانے'' از بنکم چندر چٹرجی کا بنگلہ سے ترجمہ مطبوعہ: لاہور

۱۷ ''زہریلا آب حیات'' از بنکم چندر چٹرجی کا بنگلہ سے ترجمہ مطبوعہ: لاہور

۱۸ ''بے گناہ مجرم'' (ترجمہ/ناول) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور

۱۹ ''محبت کا انتقام'' (باتصویر) (ڈراما) مطبوعہ: تاج کمپنی بھنڈار، لاہور

یہ کتاب پہلے ہندی میں شائع ہوئی تھی بعد میں سدرشن نے اسے اردو روپ دیا۔

۲۰ ''قوم پرست'' از بابو دیجندر لال رائے کے بنگلہ ناٹک کا ترجمہ۔ مطبوعہ: تاج کمپنی بھنڈار، لاہور طبع اول: ۱۹۳۱ء

۲۱ ''اندھے کی دنیا'' (تین ایکٹ کا ڈراما) مطبوعہ: تاج کمپنی بھنڈار، لاہور طبع اول: ۱۹۴۱ء

۲۲ ''بہارستان'' (سولہ افسانے) رام کتیا بک ڈپو، لاہور طبع اول: جنوری ۱۹۲۵ء

سدرشن کے طبع زاد افسانوں کے اس مجموعے کا دیباچہ پریم چند نے لکھا ہے۔

۲۳ ''چشم و چراغ'' (پندرہ افسانے) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور طبع اول: ۱۹۲۸ء

مطبوعہ: تاج کمپنی بھنڈار، لاہور طبع اول: ۱۹۴۵ء

۲۴ ''سولہ سنگھار'' (سولہ افسانے) مطبوعہ: لالہ لاجپت رائے، لاہور طبع اول: جنوری ۱۹۳۸ء

۲۵ ''صبح وطن'' (بارہ افسانے) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور

۲۶ ''پریم چالیسی'' (دو جلدیں) مطبوعہ: لاہور

۲۷ ''شکست مہابھارت'' (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۲۸ ''رشی دیانند'' (ڈراما/ترجمہ) مطبوعہ: لاہور

۲۹ ''پربلا'' (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۳۰ ''راجپوت کی شکست'' (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۳۱ ''چھایا'' (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۳۲ ''گناہ کا پرائشچت کنڈ'' (ڈراما۔ چار جلدیں) مطبوعہ: لاہور

۳۳ ''خوش انجام'' (ترجمہ) مطبوعہ: لاہور

۳۴ ''کنج عافیت'' (ناول) مطبوعہ: لاہور

۳۵ ''امرت'' (بچوں کے لیے)

۳۶ ''بچوں کے لیے ہتوپدیش'' (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور ۱۹۳۹ء سے قبل

۳۷ ''بچوں کے لیے مہابھارت'' (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور ۱۹۳۹ء سے قبل

۳۸ ''بچوں کے لیے رامائن'' (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور ۱۹۳۹ء سے قبل

۳۹ ''مہارشی کی پیاری باتیں'' (اخلاقیات) مطبوعہ: پنجاب پرنٹنگ ورکس، لاہور ۱۹۳۹ء سے قبل

۴۰ ''پارس'' (پندرہ افسانے) مطبوعہ: مقبول عام پریس، لاہور طبع اوّل: ۱۹۲۶ء

۴۱ ''پھول وتی'' (بچوں کے لیے) مطبوعہ: تاج کمپنی بھنڈار، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۴۲ ''رستم وسہراب'' (ڈراما بچوں کے لیے) پنجاب پرنٹنگ ورکس، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۴۳ ''آنریری مجسٹریٹ'' (فکشن) مطبوعہ: تاج کمپنی، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

۴۴ ''دنیا کے عجائبات'' (بچوں کے لیے)

۴۵ ''رس بھری کہانیاں'' (بچوں کے لیے)

۴۶ ''خوش انجام'' (ترجمہ بنکم چندر چیڑجی کے ناول کا ترجمہ)

۴۷ ''ستیانند'' مطبوعہ: دیانند پرکاش، دہلی طبع اوّل: ۱۹۲۴ء

اعزاز:

۱۔ ڈراما ''محبت کا انتقام'' پر حکومت پنجاب کا ایوارڈ: نقد انعام، پانچ سو روپے

وزیر عدالت

مہاشہ سدرشن

ایک دن شام کے وقت جب کہ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے۔ایک اجنبی، ششو پال برہمن کے دروازے پر آیا اور لجاجت آمیز لہجے میں بولا: ''کیا مجھے رات کاٹنے کے لیے پناہ مل سکے گی؟'' ششو پال اپنے گاؤں میں سب سے غریب تھے۔ تاہم اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر ان کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا: ''یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔''

ششو پال کے لڑکے نے اجنبی کی خاطر مدارت کی۔ اجنبی اس پر لٹو ہو گیا۔ اس نے برہمن سے کہا: ''آپ کا لڑکا بڑے کام کا ہے۔ اس کی خدمت سے میرا جی خوش ہو گیا۔'' ششو پال نے اس طرح سر اٹھایا: جیسے کسی نے سانپ کو چھیڑ دیا ہو اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا: ''تم ہمارے مہمان ہو ورنہ برہمن ایسے الفاظ سننے کی تاب نہیں رکھتے۔'' اجنبی نے اپنی غلطی پر نادم ہو کر کہا: ''شما کیجئے! میرا مطلب یہ نہ تھا۔ مگر آج کل وہ برہمن کہاں ہیں۔ اب تو آنکھیں ان کے لیے ترستی ہیں۔'' ششو پال نے جواب دیا: ''برہمن تو اب بھی ہیں۔ کمی صرف کشتریوں کی ہے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

ششو پال نے ایک عالمانہ تقریر شروع کر دی۔ اجنبی حیران ہوا کہ ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں ایسا متبحر بھی موجود ہے۔

''مجھے خیال نہ تھا کہ گودڑ میں لال چھپا ہے۔ مہاراج اشوک کو معلوم ہو جائے تو وہ آپ کو بہت بڑا عہدہ دے۔''

ششو پال (مسکرا کر) آج کل بڑی بے انصافی ہو رہی ہے۔ جب دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے اجنبی (پینترا بدل کر) ''شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں۔''

ششو پال: ''رہنے بھی دو، میں سب جانتا ہوں۔''

اجنبی: ''نقص نکالنا آسان ہے مگر کچھ کر کے دکھانا مشکل ہے۔''

ششو پال: ''اگر مجھے موقع ملے تو دکھا دوں انصاف کسے کہتے ہیں۔''

اجنبی: ''اگر میں اشوک ہوتا تو آپ کی خواہش پوری کر دیتا۔''

2

دوسرے دن مہاراجہ اشوک کے دربار میں ششو پال کی طلبی ہوئی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ ششو پال کے لیے یہ طلبی کا حکم پیام مرگ ہے۔ سب کو یقین تھا کہ اب ششو پال زندہ نہ لوٹیں گے۔ شام ہو گئی تھی۔ جب ششو پال پاٹلی پتر پہنچے تو ان کو شاہی محل میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک انہیں خیال تھا کہ شاید اُن کے افلاس کی کہانی یہاں تک پہنچ گئی ہے، اس لئے مہاراج نے کچھ دینے کے لیے بلایا ہوگا۔ لیکن جب نوکر نے کہا مہاراج آ رہے ہیں تو ان کا کلیجہ دھڑ کنے لگا۔ اتنے میں مہاراجہ اشوک شاہانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئے اور مسکرا کر کہا: ''برہمن دیوتا غالباً آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ ششو پال گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اجنبی مہمان راجہ اشوک تھا۔ اگر چہ مہاراجہ کو دیکھ کر وہ بہت ڈرے۔ مگر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

3

ششو پال: ''مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی مہاراج ہیں۔ ورنہ میں ایسی آزادی سے کبھی گفتگو نہ کرتا۔''

مہاراج: ''ہوں''

ششو پال: ''لیکن میری بات میں رتی بھر مبالغہ نہ تھا۔''

مہاراج: ''لیکن آپ کی غلطی تھی۔''

ششو پال: ''نہیں میں ثبوت دے سکتا ہوں۔''

مہاراجہ: ''میں آپ کی آزمائش کرتا ہوں۔ دیکھوں تم کیسے انصاف کا ڈنکا بجاتے ہو۔ کل صبح سے تم وزیر عدالت ہو۔ سارے شہر پر تمہارا اختیار ہوگا اور تم امن کے ذمہ دار سمجھے جاؤ گے۔''

4

ایک ماہ گزر گیا۔ وزیر عدالت کے انتظام اور انصاف کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ ایک امیر نے ایک عالی شان مکان پر دستک دی۔ دریچے سے ایک عورت نے سر نکال کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں۔ دروازہ کھول دو۔''

''مگر وہ یہاں نہیں ہے۔''

''پروا نہیں تم دروازہ کھول دو۔''

''دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شہر پر ششو پال کی حکومت ہے۔''

''میں دروازہ توڑتا ہوں۔''

امیر نے تلوار نکال کر دروازے پر حملہ کیا، ایک پہرہ دار نے آ کر اسے روکا، دونوں کا مقابلہ ہوا اور پہرہ دار قتل ہو گیا۔ اب تو امیر کا خون خشک ہو گیا۔ اس نے پہرے دار کی لاش کو ایک طرف پھینکا اور بھاگ گیا۔

5

ششو پال کے تقرر کے بعد یہ پہلا وقوعہ تھا۔ اس نے سرگرمی سے تحقیقات کی، مگر قاتل کا پتہ نہ لگا۔ آخر مہاراجہ نے اسے بلا کر کہا تم کو تین دن کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصہ میں قاتل نہ پکڑا گیا تو اس کی جگہ تم کو پھانسی دی جائے گی۔ رات کا وقت تھا۔ مگر ششو پال کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ شہر کے اس گنجان حصہ میں گھوم رہا تھا، جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ یکا یک ایک مکان کے دریچے سے ایک عورت نے جھانک کر باہر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عورت نے آہستہ سے پوچھا: ''تم کون ہو؟ پہرے دار؟'' ششو پال نے جواب دیا: ''نہیں میں وزیر عدالت ہوں۔'' ذرا ٹھہرو، کہہ کر عورت کھڑکی سے غائب ہو گئی اور روشنی لے کر دروازے سے نمودار ہوئی۔ اور وزیر عدالت کو اپنے کمرے میں لے جا کر ایک چوکی پر بٹھایا اور کہا: ''یہ آخری رات ہے؟'' ششو پال نے جواب دیا: ''ہاں آخری رات۔'' عورت تلملا کر کھڑی ہو گئی اور بولی: ''میں سب کچھ جانتی ہوں۔ قاتل جس کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں اس کا نام نہیں لے سکتی۔ ایک دن جو وہ آیا تو وہ گھر میں نہ تھی۔ قاتل نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ اور دروازہ توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ پہرے دار نے روکا تو اس کے ہاتھ سے مارا گیا۔'' وزیر عدالت نے قاتل کا نام پوچھا تو اس عورت نے سہمی ہوئی کبوتری کی طرح چاروں طرف دیکھا اور ان کے کان میں کچھ کہہ کر جلدی جلدی اسے رخصت کر دیا۔

6

مہاراجہ اشوک نے کڑک کر ششو پال سے کہا: ''میعاد گزر گئی۔ کہو مجرم کا پتہ لگا؟'' اس نے کہا کہ ''ہاں میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مجرم کون ہے۔ لیکن شاستروں میں راجہ کی ذات مقدس تسلیم کی گئی ہے۔ اُسے ایشور ہی سزا دے سکتا ہے۔ وزیر عدالت کو اختیار نہیں کہ اس کو سزا دے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ قاتل کے بت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور مہاراج کو تنبیہ کر دی جائے۔'' یہ کہا اور ششو پال نے عدالت کی مہر اشوک کے سامنے رکھ دی اور اپنے گاؤں واپس جانے کی اجازت مانگی۔ لیکن اشوک نے اس کی طرف احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''آپ کی جرأت تاریخ ہند میں یادگار رہے گی۔ یہ بار آپ ہی اٹھا سکتے ہیں۔''



اعظم کریوی

نام	:	انصار احمد
قلمی نام	:	اعظم کریوی
پیدائش	:	۲۲ جون ۱۸۹۸ء بہ مقام موضع کرئی، پرگنہ چائل ضلع الہ آباد، بھارت
وفات	:	۲۲ جون ۱۹۵۴ء، کراچی میں قتل کردیے گئے۔
تعلیم	:	انٹرنس

انگریزی، اردو، فارسی اور ہندی کے علاوہ بنگلہ، گجراتی اور سنسکرت سے بھی شد بد رکھتے تھے۔

مختصر حالات زندگی

اعظم کریوی اپنے آبائی وطن موضع کرئی، پرگنہ چائل ضلع الہ آباد میں سہروردیہ جیسے معزز گھرانے میں فیاض احمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ بچپن کھیل کود میں گزرا اور شعر و شاعری کا خبط رہا۔ ۱۹۰۵ء میں اپنے ماموں احتشام الدین کے ہاں سہارن پور میں مقیم تھے جب اسکول کے ایک پنڈت جی کے خلاف پہلا شعر کہا۔ اعظم تخلص اختیار کر کے سینکڑوں غزلیں کہیں۔ نوح ناروی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشاعروں پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب صرف ترنم نے داد پائی اور بدقسمتی سے اعظم کریوی خوش گلو نہ تھے، یوں نظم کی بجائے نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس زمانے میں نوح ناروی کی زیر سرپرستی اعظم کریوی نے الہ آباد سے ادبی مجلّہ ''طوفان'' جاری کیا تھا۔ ''طوفان'' الہ آباد میں شائع ہونے والے اپنے اوّلین افسانے ''پریم کی انگوٹھی'' سے شہرت پائی۔ اس سے قبل مجلّہ ''اکبر'' الہ آباد کے مدیر اور تحت اللفظ میں مستغنی از داد غزلیں پڑھنے والے شعرا میں شمار تھا۔ لگ بھگ ۱۹۱۷ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں ملٹری ہیڈ کوارٹرز میرٹھ کے ڈیٹری برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور قیام پاکستان تک وہیں رہے۔ ۱۴ جون ۱۹۴۱ء کو ان کا بائیس برس کا جوان بیٹا مہتاب احمد، جو بی اے کا طالب علم تھا میرٹھ سے تیرہ میل دور نہر گنگ میں نہاتے ہوئے اتفاقاً ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اعظم کریوی بجھ کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے کراچی

(پاکستان) چلے آئے۔ انتہادرجے کے خوددار شخص تھے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ان کے بیسیوں افسانے کتابی صورت میں یکجا ہونے سے رہ گئے۔ سرمایہ دار پبلشرز سے ان کی کبھی نہ بنی اور سستے داموں اپنے افسانوں کوفروخت کرنے پر گمنامی کی موت کو ترجیح دی۔ احباب نے حیوانی اور انسانی ہسپتالوں میں ان کی طویل مدت ملازمت کو دیکھتے ہوئے ''ڈاکٹر'' کہنا شروع کر دیا تھا جب کہ نہ تو پی ایچ ڈی تھے اور نہ ایم بی بی ایس۔ کراچی میں ڈائریکٹوریٹ آف موریل آرمڈ فورسز میں ڈیسک ورک کرتے تھے، وائسرائے کمیشنڈ آفیسر (عرف عام میں ڈسپنسر جمعدار) تھے۔ ۲۲ جون ۱۹۵۴ء میں نامعلوم افراد نے انہیں کراچی میں قتل کر دیا۔ اُن دنوں اعظم کریوی، اخبار میں جرائم پیشہ افراد سے متعلق حقائق پر مبنی فیچر لکھا کرتے تھے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''پریم کی انگوٹھی'' مطبوعہ: ''طوفان'' الہ آباد، لگ بھگ ۱۹۱۴ء (۱)

۲۔ ''انصاف یا ظلم'' مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور، مئی ۱۹۲۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱	''پریم پتر'' (رومانی خطوط)	مطبوعہ: میرٹھ	طبع اوّل: ۱۹۱۹ء
۲	''ہندی شاعری'' (تاریخ وتنقید)	ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۳	''دیہاتی گیت'' (تاریخ وتنقید)	عصمت بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴	''پریم کی چوڑیاں'' (بارہ افسانے)	کتاب خانہ دانش محل، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۵	''دکھ سکھ'' (بارہ افسانے)	مطبع انواراحمد، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۶	''شیخ و برہمن'' (سولہ افسانے)	کتاب خانہ دانش محل، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۷	''انقلاب اور دوسرے افسانے'' (بارہ افسانے)	کتبا خانہ دانش محل، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۸	''کنول اور دوسرے افسانے'' (بارہ افسانے)	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۹	''روپ سنگھار'' (چودہ افسانے)	دارالبلاغ، لاہور	طبع اوّل: س۔ن
۱۰	''دل کی باتیں'' (بارہ افسانے)		
۱۱	''ہندوستانی افسانے''		

نوٹ: افسانوی مجموعوں میں نوّے افسانے سٹ پائے ہیں جب کہ انہوں نے ایک سو بیاسی افسانے قلم بند کیے۔ اُن کا آخری افسانہ ''مہاجر کی عید'' تھا جو روزنامہ ''جنگ'' کراچی بابت: یکم اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

غیر مدوّن:

۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۱ء اعظم کریوی نے ''نگار''، ''اکبر''، ''عالم گیر''، ''قوس وقزح''، ''نیرنگ خیال''، ''الناصر''، ''یادگار''، ''مخزن''،

''تمدن''، ''عصمت''، ''زمانہ''، ''کہکشاں'' اور'' ہمایوں'' کے لیے بنگلہ زبان سے متعدد افسانے ترجمہ کیے۔ اس سلسلے کا پہلا ترجمہ ''زمانہ'' کانپور جنوری ۱۹۲۷ء میں ''مولا'' کے عنوان سے ملتا ہے۔ جب کہ دسمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں ''بابو'' کے زیرِ عنوان افسانہ بھی بنگلہ زبان سے ترجمہ ہے۔ ان تراجم کے علاوہ مختلف ادبی جرائد میں لاتعداد تحقیقی و تنقیدی مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ خصوصاً ''عصمت کی کہانیاں''، ''دکھیا کی کہانی، میری زبانی'' اور ایک ناول ''جونکیں'' جو شائع نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ بانوے افسانے مجلّہ: ''زمانہ''، ''اکبر''، ''عصمت''، ''نیرنگ خیال''، ''ساقی''، ''عالمگیر''، ''ہمایوں'' اور ''داستان'' میں بکھرے پڑے ہیں۔

نظریۂ فن:

''میں نے آج تک، جتنے اور جیسے افسانے لکھے ہیں، وہ تقریباً کسی نہ کسی تجربہ یا مشاہدہ کے نتائج ہیں۔ کردار نگاری میرے لیے خاص چیز ہے۔ پلاٹ کی میں بہت کم پروا کرتا ہوں۔ واقعات کے نفسیاتی پہلو کو میں نے کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ افسانہ میں اس بات کا خاص خیال رکھتا ہوں کہ جو واقعہ لکھ رہا ہوں وہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے بھی یا نہیں۔

عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ موسم یا وقت کا میں زیادہ پابند نہیں۔ جب دل پر چوٹ لگی یا کسی نظارے سے متاثر ہوا تو افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔''

اعظم کریوی، جولائی ۱۹۵۴ء، کراچی

بحوالہ: ''متاعِ ادب'' مرتبہ: اظہر زیدی، مطبوعہ: میری لائبریری، لاہور، طبع اوّل: جنوری ۱۹۶۵ء)



حوالہ جات:

۱۔ یہ حوالہ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: لگ بھگ ۱۹۳۶ء

اچھوت

اعظم کریوی

شکروا چمار اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ قریب ہی اس کا اکلوتا لڑکا ''بنی'' کھیل رہا تھا۔ بنی کے سوا شکروا کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہی اب اس کی ضعیفی کا سہارا تھا۔ دن بھر محنت مزدوری سے جو کچھ مل جاتا اسی میں دونوں کا خرچ چلتا۔ لیکن دو دن سے وہ گاؤں کے زمیندار پنڈت رام پرشاد کے یہاں بیگار کر رہا تھا۔ زمیندار کو سرکار نے رائے صاحب کا خطاب دیا تھا۔ جس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔

دن بھر کی بیگار سے فرصت پا کر تھوڑی دیر ہوئی شکروا نے اپنی جھونپڑی میں قدم رکھا تھا۔ بنی نے باپ کے گلے سے لپٹ کر کہا: ''بابا موکا (مجھ کو) نئی دھوتی منگا دو۔''

شکروا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''مالک کے یہاں کام ختم ہو جائے اور کچھ انعام ملے تو اسی سے تجھ کو دھوتی منگا دوں گا۔'' بنی نے بال ہٹ سے کام لیا: ''اوں اوں میں تو ابھی لوں گا۔ مالک کے یہاں سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ میں بھی پہنوں گا۔''

شکروا نے کہا: ''پاگل نہ بن ہم غریب وہ امیر۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ؟'' بنی نے بھولے پن سے کہا: ''ہمیں غریب اور ان کو امیر کس نے بنایا ہے؟''

''ہاہاہا'' شکروا نے قہقہہ مار کر کہا: ''تو بڑا پاگل ہے۔ بھگوان بنائیں ہیں اور کون بنا سکتا ہے!''

''تو بھگوان نے ہم کو امیر کیوں نہیں بنایا؟''

''اب رام جانیں اگلے جنم میں ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی۔ اسی کی سزا ملی ہے۔''

''اگر بھگوان ہم سے خوش ہو جائیں تو کیا وہ ہم کو امیر کر دیں گے؟''

''اور نہیں تو کیا؟ بھگوان کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے۔'' ''تو بھگوان کیسے خوش ہوتے ہیں؟''

''پوجا پاٹ سے۔'' ''تو ہم پوجا پاٹ کریں گے۔''

''لیکن ہم مندر میں نہیں گھس سکتے۔''

''کیوں؟''

''ہم لوگ اُچھوت ہیں۔ پنڈت لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے گھسنے سے مندر ناپاک ہو جائے گا۔''

''تو کیا، بھگوان، مندر ہی میں رہتے ہیں اور کہیں نہیں؟''

''نہیں بھگوان تو ہر جگہ ہیں۔''

''تو میں بھی اپنی جھونپڑی میں ایک چھوٹا سا مندر بناؤں گا اور بھگوان کی پوجا کیا کروں گا۔''

''لیکن بغیر کسی پنڈت کی مدد کے پوجا نہیں مانی جائے گی۔''

بنی کا دل ٹوٹ گیا اور کچھ پوچھ ہی نہ سکا۔ اتنے میں کسی نے باہر سے آواز دی: ''ابے شکروا!'' باہر نکل کر شکروا نے دیکھا کہ زمیندار کا پیادہ، داتا دین کھڑا ہے۔ شکروا نے ادب سے پوچھا ''مہاراج کا حکم؟''

''ابھی، ہاں ابھی!''

''سرکار ابھی تو دن بھر کی بیگار سے واپس آئے ہوں۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تجھے مالک کا حکم سنا دیا ہے۔ اگر تو ابھی اسٹیشن پر نہیں جائے گا تو پھر خیر نہیں۔'' یہ کہہ کر مہاراج داتا دین تو اکڑتے ہوئے چل دیے اور شکروا آسمان کی طرف حسرت سے دیکھ کر رہ گیا۔ دن بھر بیگار میں رہا۔ سمجھتا تھا کہ رات کو آرام ملے گا، مگر غریبوں کی قسمت میں آرام کہاں؟ کچھ چبینا بنی کو دے کر اسے گدڑی پر لٹا دیا اور خود اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

2

رائے صاحب رام پرشاد کے مکان کے سامنے ایک عالی شان شامیانے میں پنڈتوں کو بھوج دیا جا رہا تھا۔ پنڈت کون تھے؟ جو بظاہر غریب برہمن بنے ہوئے تھے، لیکن جن کے گھروں میں سونا برستا تھا۔ جو دعوتیں کھا کھا کر اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ دو قدم چلنا مشکل تھا۔ اسی قماش کے برہمن آج تعلقہ دار کے یہاں انواع و اقسام کی مٹھائیاں کھا رہے تھے۔ ان سے دور چند، فاقہ کش بیگاری مزدور جنہیں پنڈتوں نے اچھوت کا خطاب دے رکھا ہے، حسرت بھری نظروں سے پنڈتوں کی توند کو دیکھ رہے تھے۔

شکروا چمار کو رات بھر اسٹیشن پر رہنا پڑا۔ وہ تھوڑی دیر ہوئی مہمانوں کا سامان لے کر گاؤں میں واپس ہوا تھا، اور اب تک اسے گھر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ وہ ایک طرف لنگوٹی باندھے چپ چاپ کھڑا تھا کہ ایک تلک دھاری پنڈت شمبھو شنکر لٹیا میں گنگا جل لیے کھڑاؤں پہنے رام رام کی مالا جپتے ہوئے اس طرف سے نکلے۔ زمین کچھ اونچی نیچی تھی۔ پنڈت جی لڑکھڑائے اور ان کا بدن شکروا چمار سے چھو گیا۔ بات معمولی تھی۔ پنڈت جی اپنے گھر کی مرمت اچھوتوں ہی سے کراتے تھے۔ مہاراجن کا ڈولہ چمار ہی اٹھاتے تھے لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں گنگا جل تھا۔ وہی گنگا مائی کا جل جس سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے۔ جس میں بھنگی، چمار، برہمن سب اشنان کرتے ہیں۔ وہی گنگا جل لٹیا میں بھر کر خود کو دیوتا سے بھی بڑھ کر سمجھنے لگے۔ غلطی تھی اپنی لیکن قصور بتایا گیا تھا شکروا چمار کا۔ جب اس نے پنڈت جی کو اپنے پاس سے گزرتے

دیکھا تو ہٹا کیوں نہیں۔ بھری سبھا میں اس نے جان بوجھ کر پنڈت جی کی ہتک کی۔ اب ان کو پھر اشنان کرنا پڑے گا۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر پنڈت جی شکروا چمار پر برس پڑے۔ ''پاپی چنڈال۔ بدمعاش۔'' غرض پنڈت جی کو جتنی گالیاں یاد تھیں وہ ختم کر دیں۔ تعلقہ دار صاحب شور و غل سن کر دوڑے آئے اور پنڈت جی سے پوچھا: ''مہاراج کیا بات ہے؟''

مہاراج نے بگڑ کر کہا: ''جہاں پنڈتوں کو بھوج دیا جاتا ہے وہاں چماروں کا کیا کام؟ دیکھیے نا اس پاپی نے جان بوجھ کر مجھے چھولیا۔ اب آپ ہی بتایئے مجھے غصہ کیوں نہ آئے۔ رام رام! آپ نے چماروں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔'' مہاراج کے آخری جملے نے تعلقہ دار کو آگ بگولا کر دیا۔ انہوں نے شکروا چمار سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ پیادے کو اشارہ کر دیا کہ ''مار سالے کو'' وہاں تو حکم کی دیر تھی۔ شکروا بھوک کے مارے یونہی مرا جا رہا تھا۔ مار پڑی تو زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ پیادے نے سمجھا کہ مکر کر رہا ہے۔ اس نے کس کر لات ماری۔ چوٹ تلی پر لگی اور وہ پھٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شکروا نے دم توڑ دیا۔ جشن میں ایسی بدشگونی، سب لوگ گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے تعلقہ دار صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ ان کو اس کا تو کوئی غم ذرا نہ تھا، کہ ایک غریب کی ہتیا ہو گئی۔ بلکہ اس کا صدمہ تھا کہ کمبخت آج ہی کیوں مرا۔ سب برہمن کھا پی چکے تھے، وہ سب رام رام کہتے ہوئے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ ایسے پاپ کی جگہ پر کیسے رہ سکتے تھے۔ برادری ان کو چھوڑ دیتی۔ لیکن تعلقہ دار کے پاس پنڈتوں کو رام کرنے کا نسخہ موجود تھا۔ لکشمی دیوی ان پر مہربان تھیں۔ ایسی صورت میں انہوں نے چماروں کو بلا کر حکم دیا کہ ''شکروا کی لاش کو لے جا کر فوراً جلا دو۔'' ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر کسی نے پولیس میں مار پیٹ کی خبر دی تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

شکروا کو مرے بیس سال ہو چکے تھے۔ تعلقہ دار رائے صاحب رام پرشاد زندہ تھے۔ لیکن چراغ سحری، مگر اس ضعیفی کے عالم میں بھی جب پرگنے کا حاکم ان کے علاقے میں آتا تو رائے صاحب فوراً حاکم کے سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ ایک دن رائے صاحب نے سنا کہ ایک نئے حاکم مسٹر ڈیوڈ ان کے علاقے میں آئے ہیں۔ فوراً پڑاؤ پر پہنچے۔ سب سے پہلے پیش کار سے ملے۔ وہ رائے صاحب کے پرانے نیاز مندوں میں سے تھا۔ اس نے رائے صاحب سے کہا: ''یہ صاحب رئیسوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ آپ ان سے نہ ملیں تو بہتر ہے۔''

''تو کیا مجھ سے بھی نہ ملیں گے؟''

''نہیں آپ جیسے رئیس سے تو ضرور ملیں گے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ ان سے مل کر آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ یہ نیچ ذات والوں سے بھی ملتے ہیں۔ پھر مجھ سے کیوں نہ ملیں گے۔''

''ہاں یہ صاحب اچھوتوں سے بہت ملتے ہیں اور ان کو کرسی پر بٹھاتے ہیں لیکن رئیسوں سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔''

''عیسائی ہے نا، لیکن اب تو میں آ گیا ہوں، مل ہی کے جاؤں گا۔ میری اطلاع تو کر دیجیے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اتنا کہہ کر پیشکار، ڈیوڈ صاحب کے خیمے میں داخل ہوا اور اطلاع کی حضور رائے صاحب رام پرشاد ملنے کے لیے آئے ہیں۔

ڈیوڈ صاحب نے کچھ سوچ کر کہا: ''اچھا اندر بھیج دو۔'' رائے صاحب نے خیمے میں داخل ہو کر نہایت ادب سے صاحب کو جھک کر سلام کیا اور پھر حسب معمول خود ہی ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھے لیکن ڈیوڈ صاحب نے ان سے ہاتھ نہ ملایا اور کہا: ''معاف کیجیے میں آپ جیسے عالی خاندان پنڈتوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا کیونکہ میں اچھوت ہوں۔'' رائے صاحب بولے۔ ''حضور ایسی باتیں نہ کریں۔ راج کو ہم ایشور کا سایہ سمجھتے ہیں۔''

''لیکن میں اچھوت ہوں۔''

''وہ کیسے؟''،''یہ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔''''ہاں یہ تو بتایئے آپ کے گاؤں میں کوئی شکر وار ہتا تھا؟''

شکروا کا نام سن کر پنڈت جی کو بیس برس کی باتیں یاد آ گئیں۔ ڈر کے مارے ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ انہوں نے دبی زبان سے کہا: ''جی ہاں میرا ایک اسامی اس نام کا ضرور تھا لیکن اس کو مرے ہوئے بیس سال ہو گئے۔''

ڈیوڈ صاحب نے کہا: ''میں نے سنا ہے آپ نے اس کو جان سے مروا ڈالا تھا۔'' رائے صاحب تن گئے:

''جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ بھلا کہیں ایسی جیو ہتیا ہو سکتی ہے؟''، ''جی ہاں، آپ بے درد تنگ نظر لوگوں سے جیو ہتیا ہو سکتی ہے! رائے صاحب ادھر دیکھئے۔ جس کو اس وقت آپ حضور کہہ کر فخر کر رہے ہیں۔ جس کو سلام کرنے آپ یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ وہ اسی بدنصیب شکروا چمار کا لڑکا بنی ہے۔'' رائے صاحب یہ سن کر بے ہوش ہو گئے۔ ڈیوڈ صاحب نے انہیں گھر بھیج دیا، جہاں وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہوئے جب ان کی ارتھی ڈیوڈ صاحب کے کیمپ سے گزری تو وہ ''رام نام ست ہے۔'' کی آواز سنتے ہی ٹوپی اتار کر کھڑے رہے۔



حامد اللہ افسر

نام : حامد اللہ

قلمی نام : حامد اللہ افسر/ افسر میرٹھی

پیدائش : ۱۹ نومبر ۱۸۹۵ء بہ مقام میرٹھ۔ بھارت

وفات : ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء لکھنؤ

تعلیم : ایم۔اے (اُردو)

ابتدائی تعلیم مولوی احمد علی محدث سے حاصل کی، بعدازاں انہیں کی نگرانی میں عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ، میرٹھ میں پائی۔ کچھ مدّت دیوبند میں رہے، اس کے بعد انگریزی کی تکمیل میرٹھ کالج میں ہوئی جہاں سے بی۔اے ۱۹۲۰ء میں کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

جدی پشتی میرٹھ کے تھے۔ معزز مفتی خاندان میں مفتی محمد عصمت اللہ کے ہاں پیدا ہوئے اور انھی کی زیرِ نگرانی ابتدائی تعلیم پائی۔ بی۔اے کرنے کے بعد ابتداً کچھ مدّت اخبار نویسی کی۔ شاعر، افسانہ نگار اور ناقد کے طور پر شہرت پائی۔ میرٹھ میں قیام کے دوران پہلی بار ۱۹۱۶ء میں پہلا مشاعرہ پڑھا۔ ان کے والد انہیں عربی اور فارسی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ مدرسہ عالیہ میں جب افسر نے کم نمبر حاصل کیے تو ان کے والد نے بدظن ہوکر انہیں مدرسے سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا۔ جہاں ایسے بیمار پڑے کہ علاج کے لیے میرٹھ واپس آنا پڑا۔ صحت یاب ہوئے تو والد نے انہیں جامعہ الازہر، قاہرہ بھیجنے کا پروگرام بنایا لیکن پاسپورٹ نہ بن سکنے کی وجہ سے رہ گئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول میرٹھ میں براہ راست نویں جماعت میں داخلہ ملا۔ اُفتاں و خیزاں آگے بڑھے۔ ۱۹۲۰ء میں بی۔اے کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا، جہاں تپ محرقہ نے آدبوچا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں ان کا کمرہ ملک بھر کے شعراء کی آماجگاہ تھا۔ جگر اور فانی اکثر ان کے مہمان

رہے۔ میٹرک کے بعد نائب تحصیل داری کو ٹھوکر ماری تھی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ جہاں سے ۲۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ علی گڑھ سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ ''نوبہار'' اور میرٹھ کے اخبار ''الخلیل'' کے مدیر رہے۔ ناٹا قد، بات بے بات کھوکھلی ہنسی ہنسنے والے افسر میرٹھی نے بچوں کے شاعر کے طور پر بے پناہ شہرت پائی۔ عقدِ ثانی کے باوجود، لاولد ہی رہے۔ لکھنؤ میں آخری ایام انتہائی عسرت میں بسر کیے۔ تپ دق کا شکار تھے۔ یو۔ پی اردو اکادمی اور حکومت نے کچھ مالی امداد کی۔ آخر بغرض علاج لکھنؤ میڈیکل کالج کے شعبہ تپ دق میں داخل کیے گئے۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء کی سہ پہر میں انتقال ہوا۔ تجہیز و تکفین اگلے روز ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ قدیم اطبائے لکھنؤ کے خاندانی قبرستان، محلہ جھوائی ٹولہ، لکھنؤ کی مٹی میں مٹی ہو گئے۔

اوّلین تخلیق:

ایک اردو غزل: ۱۹۱۶ء

اوّلین افسانہ:

لگ بھگ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''چار چاند'' (۴ افسانے)	میرٹھ	طبع اوّل: ۱۹۱۷ء
۲۔	''ڈالی کا جوگ'' (افسانے)	انڈین پریس، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
۳۔	''آنکھ کا نور'' (افسانے)	ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، میرٹھ	طبع اوّل: ۱۹۳۲ء
۴۔	''پرچھائیاں'' (افسانے)	دانش محل، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
	یہ مجموعہ آگرہ سے بھی ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔		
۵۔	''پیامِ روح'' (شاعری)	انڈین پریس، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۶۔	''جُوئے رواں'' (شاعری)	کتاب خانہ عزیزیہ، دہلی	(طبع اوّل: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۔	''ماہِ نو'' (از رابندر ناتھ ٹیگور کا ترجمہ)	کتاب خانہ عزیزیہ، دہلی	طبع دوم: ۱۹۲۳ء

یہ ٹیگور کی کتاب ''کریسنٹ مون'' کا ترجمہ ہے جو میرٹھ سے پہلی بار ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔ اس اردو ترجمہ کی بلا اجازت اشاعت پر ٹیگور کے ناشر میک میلن کمپنی، برطانیہ نے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ افسر کی اس مشکل کا حل بھی خود ٹیگور ہی نے نکالا۔

۸۔	''حکایات گاندھی''	سنگم کتاب گھر، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۴ء
۹۔	''نقد الادب'' (تنقید)	بھارگو اسکول بک ڈپو، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۱۰۔	''نورس'' (تنقید)	بھارگو اسکول بک ڈپو، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۱۱۔	''حق کی آواز'' (شاعری۔ جنگ عظیم سے متعلق نظمیں)	لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
۱۲۔	''ہفت منظر'' (ڈراما)	لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
۱۳۔	''کتابوں کی جنگ'' (تنقید)	لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۳۸ء
۱۴۔	''ہمارا جھنڈا'' (قومیات)	لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۵۸ء
۱۵۔	''پندرہ اگست'' (قومیات۔ تاریخ تحریک آزادی)	لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء
۱۶۔	''گاندھی جی کے ساتھ'' (مہاتما کے اقوال)	لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۱۷۔	''آسمان کا سایہ'' (عملی نفسیات۔ بچوں کے لیے)	الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۵۴ء
۱۸۔	''جانوروں کی عقل مندی'' (بچوں کے لیے)	سنگم کتاب گھر، دہلی	طبع اوّل:
۱۹۔	''گلیور کا سفرنامہ'' (سوئفٹ کی کتاب کا ترجمہ)		

غیر مدوّن:

غیر مطبوعہ کتب میں ایک مسدس ''رزم آخر'' اورنگ زیب اور دارشکوہ کی جنگ سے متعلق، ایک طویل مثنوی ''آدم نامہ''، تنقید سے متعلق ایک کتاب ''ذوقِ ادب کی تربیت'' اور نامکمل آپ بیتی، جسے ۱۹۶۷ء میں قلم بند کرنا شروع کیا تھا۔

میوہ فروش

حامداللہ افسر

سیٹھ فاروق بمبئی کے مشہور تاجروں میں تھے۔ ان کے مال و متاع کا اندازہ مشکل تھا۔ ان کے مقدر کی قسم کھائی جاتی تھی۔ مٹی میں ہاتھ ڈالتے تو سونا ہو جاتی۔ وہ بمبئی کی سب سے بڑی جہاز راں کمپنی کے مالک اور ایک بین الاقوامی بینک کے سب سے بڑے حصہ دار تھے۔ بمبئی کے علاوہ ان کی ایک کپڑے کی مل احمد آباد میں بھی تھی۔ اور وہاں کا مشہور ترین دیا سلائی کا کارخانہ انہیں کے روپے سے چل رہا تھا۔ سیٹھ صاحب یوں تو بمبئی کے روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر بخیل اور متکبر مشہور تھے۔ ایک پیسہ بھی خیرات نہ کرتے۔ خدا کے غریب اور نادار بندوں کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ اس کے برخلاف نورانہ، سیٹھ صاحب کی بیوی بڑی دین دار اور مخیر تھی۔ یوں تو وہ ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔ مگر بہت کشادہ طبیعت۔ کبھی کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتی تھی۔ گھر کے اخراجات میں سیٹھ صاحب بہت تنگ دل تھے۔ نورانہ گھر میں تنہا تھی۔ کوئی بات کرنے والا نہ تھا۔ میاں بیوی کے مزاج میں بعد المشرقین تھا۔ انس و محبت کا پتہ نہ تھا۔ میاں بیوی ایک ستار کے دو ایسے تار تھے۔ جو ہم آہنگ اور ہم ساز نہ ہو سکتے تھے۔

2

جنگ یورپ کو ختم ہوئے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے۔ دنیا اقتصادی الجھنوں میں گرفتار تھی۔ بڑے بڑے زبردست بنکوں کی بنیادیں مل رہی تھیں اور نئی نئی قسم کے کاغذی سکے جاری ہو رہے تھے کہ یکا یک سیٹھ فاروق کے بین الاقوامی بینک کا دوالہ نکل گیا۔ ساری ملیں اور کارخانے اسی میں ہضم ہو گئے۔ تمام جائیداد ہاتھ سے نکل گئی اور جو شخص تاجروں کا بادشاہ کہلاتا تھا، وہ آن کی آن میں فقیر ہو گیا۔

چار روز سے سیٹھ فاروق کا پتہ نہیں۔ سارے بمبئی میں کہرام مچ رہا تھا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ مطالبات پورے نہ کر سکتا تھا، اس لیے روپوش ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ نہ تھی۔ مطالبات کی پوری رقم ادا ہو جانے کے بعد ایک مکان بچ

گیا تھا۔ نورانہ پر ان تمام واقعات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ مال و متاع کے جانے کا اسے غم نہ تھا کہ اس نے اس نعمت کی کبھی بہار نہ دیکھی تھی۔ اسے جو کچھ غم تھا، وہ سیٹھ صاحب کی روپوشی کا تھا۔ نورانہ اور سیٹھ صاحب کی شادی کو بیس برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ آپس میں محبت نہ تھی، لیکن کوئی خاص اختلاف بھی نہ تھا۔ مدت کے ساتھ سے ایک قسم کی ہمدردی اور رفاقت بھی موجود تھی۔ خلاف امید جدائی نے عورت کے سینے میں محبت کے خاموش جذبات کو مشتعل کر دیا۔

نورانہ پچھتا رہی تھی: ''میں نے ان کی قدر نہ جانی۔ میں نے ان کی کوئی خدمت نہ کی۔ گھر میں سکھ اور چین نصیب ہوتا تو وہ آج اس طرح خود کو دنیا میں تنہا سمجھ کر کہیں چلے نہ جاتے۔ میں بغیر ان کے اس گھر میں کیوں رہوں۔ درو دیوار کھانے کو آتے ہیں خدا جانے وہ کب آئیں گے۔ ممکن ہے میرے مُنہ میں خاک، وہ کبھی نہ آئیں۔ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں...... نہیں، میں اپنے شوہر سے جدا نہ رہ سکوں گی۔ ان کا پتہ کس سے پوچھوں؟ مگر پتہ کی کیا ضرورت ہے تلاش اور طلب صادق کو پتہ کی ضرورت نہیں۔ پردہ! اب پردہ کس کے لیے کروں؟''

3

اس واقعہ کو پانچ سال ہو گئے۔ لوگ سیٹھ فاروق کا نام بھی بھول گئے۔ گویا وہ دنیا میں تھا ہی نہیں۔ رات بھر کی بارش کے بعد صبح نمودار ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبک اور ہلکی ہلکی لطیف ہوا نہا کر آ رہی ہے۔ سورج کی کرنوں نے شام پور کے بازاروں کی دیواروں پر ایسا ملمع کر دیا تھا کہ جس میں زندگی کی جھلک معلوم ہوتی تھی۔ ایک میوہ فروش میلا سا تھیلا لٹکائے، ہاتھ میں انگوروں کی پٹاریاں لیے ''کابل کا میوہ'' بیچتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور راحت کا اثر نمایاں تھا۔ یہ سیٹھ فاروق تھا۔ فاروق نے اس قصبے میں اپنا نام بدل دیا تھا۔ داڑھی بڑھا لی تھی۔ اس کو ''عارف'' کے نام سے قصبہ کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ دن میں دو گھنٹے پھل اور مختلف میوہ جات گلیوں میں پھیری لگا کر فروخت کرتا تھا۔ اوّل اوّل اسے چار پانچ گھنٹے تک گشت لگانا پڑا، لیکن اب اس کے گھر سے نکلتے ہی لوگ جوق جوق ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور وہ بہت جلد سودا فروخت کر کے اپنی جھونپڑی میں داخل ہو جاتا ہے۔ میوہ فروشی سے جو نفع حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کے گزارے کے لیے کافی تھا۔

عارف کو سچی راحت نصیب تھی۔ اس کی سادہ زندگی مسرت اور شادمانی سے ہم کنار تھی۔ لیکن اب تکلیف دہ خیال نے اس کی خوشی کو ملال سے بدل دیا تھا۔ وہ نورانہ کے لیے بے چین تھا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا: ''میں نے کم سخن نورانہ پر ظلم کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی آرام و آسائش سے زندگی بسر نہ کر سکی۔ اور وطن چھوڑتے وقت بھی میری خود غرضی نے مجھے اس کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔'' عارف ایک مرتبہ بھیس بدل کر بمبئی گیا بھی تھا۔ لیکن وہاں نورانہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ سیٹھ فاروق کے غائب ہو جانے کے بعد وہ بھی کہیں چلی گئی۔

4

ایک روز کا ذکر ہے کہ عارف میوہ فروش صبح کے وقت اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت میلے اور پیوند لگے کپڑے اور ایک پرانی چادر اوڑھے گھونگھٹ نکالے ہوئے آئی اور گڑگڑا کر کہا: ''عارف، خدا نے تیری دعا میں اثر دیا ہے، تو خدا کا نیک بندہ ہے۔ میں دکھیاری

ہوں۔ میرا خاوند پانچ برس سے لاپتہ ہے۔ تو خدا سے دعا کر وہ مجھے میرے عزیز شوہر سے ملا دے۔ یہ عورت نورانہ تھی۔ عارف نے نورانہ کی آواز نہ پہچانی۔ شاید یہ ہو کہ مصیبتوں کے ہجوم نے نورانہ کی آواز پر بھی کچھ اثر کیا ہو۔

مگر اتنا ضرور ہوا کہ عارف کے دل پر چوٹ سی لگی اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہیں کھو گیا ہے۔ آخر اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا: ''بی بی تم کون ہو۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے خاوند کا کیا نام ہے۔ وہ کیوں چلا گیا؟''

نورانہ نے یہ آواز ضرور کہیں سنی ہے۔ وہ جھجکی مگر پھر سنبھل کر بولی: ''خدا کے نیک بندے، میرے خاوند کا نام سیٹھ فاروق ہے۔''

عارف: ''کون! کیا تو نورانہ ہے؟ نورانہ! نورانہ! جسے تو عارف میوہ فروش سمجھ رہی ہے وہ خود تیرا بچھڑا ہوا خاوند فاروق ہے۔''



مسز عبدالقادر

نام : زینب خاتون

قلمی نام : مسز عبدالقادر/ والدہ سراج الدین ظفر

پیدائش : ۱۸۹۸ء بہ مقام جہلم۔

وفات : ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء بہ مقام لاہور

تعلیم :

گھر پر ہی معلم اور معلمات کے ذریعے سے ہوئی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پیر نیک عالم ایڈووکیٹ سے اُردو اور عربی کے علاوہ فارسی میں ''گلستان''، ''بوستان''، ''پند نامہ'' اور ''کریما'' ابتدائی کتب تھیں جو گھر پر ہی پڑھیں۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام مولوی فقیر محمد تھا جو ''آفتاب محمدیؐ''، ''صحیفہ سیف الصارم'' اور ''حدائق الحنفیہ'' کے مصنف ہیں۔ یہ ایک علمی گھرانہ تھا۔ مسز عبدالقادر کی دادی، بیراگن کے قلمی نام سے پنجابی میں سی حرفی اور بارہ ماہ لکھتی تھیں۔ ننھیال اونچی ذات کا کشمیری گھرانہ تھا۔ مسز عبدالقادر کے والد مولوی فقیر محمد اپنے وقت کے جید عالم (فاضل دیوبند) اور دینی راہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ''سراج المطابع''، جہلم اور ''سراج الاخبار''، جہلم کے مالک و مدیر تھے۔ مسز عبدالقادر کا بچپن جہلم میں گزرا۔ اپنی والدہ کی طرح سیاحت کا شوق بلکہ جنون بچپن سے تھا اور ساری زندگی ویران اور سنسان جگہوں کو دیکھنے کی شائق رہیں۔ اپنے گھر والوں سے اپنے کھانے پینے کے برتن ہمیشہ الگ رکھے۔ گوشت اور مچھلی کو کبھی چھوا تک نہیں اور ان سے ہمیشہ کراہت محسوس کی۔ یہاں تک کہ اگر ریزگاری ہاتھ سے چھو جاتی تو فوراً ہاتھ دھوتیں۔ آسمان پر اڑتے پھرتے بادلوں میں انہیں طلسماتی شہروں کی پر پیچ گلیاں، مصروف و متحرک بازار، محلات اور وسیع و عریض ہیکل دکھائی دیتے تھے۔ اپنے گھر کی

چھت پر ٹنگی ہوئی پھول دار چھینٹ اور چھت کی کڑیوں میں بھی ویران کھنڈر اور تصوراتی جہان آباد دیکھتی تھیں۔ مظاہر فطرت چاند، سورج، ستارے، ہوا، آگ اور پانی کو دیکھ کر پہروں مقام حیرت میں گم رہتیں۔ لڑکپن میں ہر وقت سوچتے رہنے کی عادت سے لاغر ہوگئیں تو ڈاکٹر میر ہدایت اللہ اور حکیم قاضی عزیز احمد کے زیر علاج رہیں۔ پیر نیک عالم پلیڈر (جوان کے فارسی کے استاد بھی تھے) کے مشورے پر پیر حافظ محمد عبداللہ آف بھاگوال کے ہاتھ بیعت کروائی گئی اور شاید انہی کے مشورے کے مطابق ساڑھے تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی برادری ہی کے ایک پختہ عمر جوان رعنا (ریلوے انجینئر) میاں عبدالقادر سے ہوگئی لیکن ذہنی انتشار اسی طرح قائم رہا۔ اپنے میاں کے ساتھ کلکتہ، بنارس، دلی اور آگرہ کی جی بھر کر سیاحت کی، یہاں تک کہ پورا ہندوستان دیکھا۔ کنکھل کے مندر، بھیم گوڑا، ہری ہر آشرم، رشی کیش، سرسوتی کنڈ، پھمن جھولا، سورگ آشرم، اجنتا، ایلورا اور ایلی فنٹا کے غار، دولت آباد، گولکنڈہ، گوالیار، رہتاس، اور کرکنٹا کے قلعہ جات ملاحظہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندومت، شومت، برہمن مت، ہنومت، نیل مت، بدھ مت، جین مت، اور اگنی مت وغیرہ کی رسومات کے مطالعہ کے ساتھ پوتھیوں، پرانوں اور شاستروں کے مہاتمی نسخہ جات کھنگال ڈالے لیکن رہیں راسخ العقیدہ مسلمان اور پابند صوم وصلوٰۃ۔ حج کیا، زیارات پر حاضری دی۔ یورپ دیکھا، لبنان، قاہرہ اور مصر میں رہیں۔ سراج الدین ظفر سمیت تین بیٹوں اور بیٹیوں کی خوشیاں دیکھیں، فالج کے مریض میاں کے سوگ میں بیٹھیں اور کہانیاں لکھیں۔ لیکن وہ بے کلی جوں کی توں رہی اور اس سے آخر دم تک نبھی۔ اٹھتر برس کی عمر تک یہ معمول رہا کہ موسم سرما، ساحل سمندر پر۔ موسم گرما پہاڑی مقامات پر، اپریل اور اکتوبر جہلم میں اور باقی وقت راولپنڈی، پشاور اور لاہور میں گزارتی تھیں۔ ان کے ایک شاعر اور افسانہ نگار بیٹے سراج الدین ظفر نے ادب میں نام کمایا۔ پہلا دل کا دورہ جاں لیوا ثابت ہوا اور ۱۱۶ کتوبر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں انتقال کرنے کے بعد شاہ بدر دیوان کے قبرستان واقع باغبانپورہ، لاہور میں مستقل ٹھکانہ بنایا۔

اوّلین افسانہ:

''لاشوں کا شہر''مشمولہ''لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے''لگ بھگ ۲۰-۱۹۱۹ء میں لکھا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

ا۔	''لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے''	اردو بک سٹال، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۲۔	''صدائے جرس''(آٹھ افسانے)	اردو بک سٹال، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۹
۳۔	''راہبہ اور دوسرے افسانے''(تین افسانے) طبع دوم: ۱۹۴۸ء، طبع سوم: ۱۹۵۱ء، طبع چہارم: ۱۹۵۴ء، طبع پنجم: ۱۹۵۶ء (اس کتاب میں ''راہبہ''، ''کاسۂ سر''اور''شگوفہ'' تین طویل مختصر افسانے ہیں)	اردو بک سٹال، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۶ء
۴۔	''وادی قاف اور دوسرے افسانے (افسانے) پانچویں بار یہ مجموعہ شعاع ادب چوک انار کلی، لاہور نے بغیر سنہ اشاعت کے شائع کیا ہے۔	اردو بک اسٹال، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۴

۵۔ ''تخت باغ'' (ناول) مکتبہ تعمیر ادب، راولپنڈی طبع اوّل: ۱۹۶۰ء

دوسری بار یہ ناول شعاعِ ادب، لاہور نے شائع کیا۔

غیر مدوّن:

ان پانچ مطبوعہ کتب کے علاوہ چار ناول نامکمل حالت میں یادگار چھوڑے۔

نظریۂ فن:

''میں نے کبھی کسی کہانی کا پلاٹ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ جب کبھی مجھے کسی کہانی کے پلاٹ کی ضرورت پڑے تو میں کسی ویران اور سنسان کھنڈر میں چلی جاتی ہوں تو وہاں ماحول کے تاثرات سے کہانی کا پلاٹ خود بخود سوجھ جاتا ہے۔ مگر اس کہانی کو قلم بند کرنے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ کیونکہ میں ایک جگہ تو ٹک کر بیٹھتی ہی نہیں۔ میرے پاؤں میں چکر ہے اور لکھنے کا وقت نہیں نکال سکتی۔'' ۱

(مسز عبدالقادر)



حوالہ جات

۱۔ بحوالہ ''خودنوشتہ حالاتِ زندگی'' از مسز عبدالقادر (کل چار صفحات غیر مطبوعہ) مملوکہ: مرزا حامد بیگ۔

بلائے ناگہاں

مسز عبدالقادر

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلہ میں رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد اس نے کٹھ کی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری۔ اب وہ ایک دولتمند شخص کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ سوسائٹی سے متنفر تھا۔ سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم کروں گا مگر موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ فصل کے موقعہ پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا......

وہاں جا کر میں زمینداری کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ دو سال تک چھٹکارا نہ ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ اس کے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ دو سال بعد جب میں واپس آیا تو میں نے سنا کہ حیدر بالکل گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں صرف ہو گئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اسکے گھر گیا۔ میرا لڑکا سلیم میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا اور جلد بدنما طور پر خشک ہو رہی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے خوف و ہراس کی علامات ظاہر تھیں...... مجھے دیکھ کر ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اسے دیر تک حیرت سے تکتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا ''کیا دیکھ رہے ہو'' میں خاموش رہا وہ دوبارہ بولا ''آؤ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے۔ میں نے آج تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا تھا۔ مگر اب زیادہ دیر تک یہ میرے دل میں نہیں رہ سکتا، میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں......''

2

سلیم کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حیدر کہنے لگا

''سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کافرستان میں کٹھ کی تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص انتہائی نیک نفس اور دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور تجارت کا کام انجام دینے میں اسے بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لیے اسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں دورہ کر کے کٹھ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے...... ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی میں بالکل ناتجربہ کار تھا، تاہم اس نے مجھے دیانتدار اور محنتی پا کر تجارت میں حصہ دار بنالیا اور میں نے اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تجارت چمک اٹھی...... انہی ایام میں ایک دفعہ میں اپنے کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا بھول کر ایک غیر آباد علاقہ میں جا پہنچا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا، میوے سے لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لیے بکثرت موجود تھے اور پیاس بجھانے کو چپہ چپہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے۔ لیکن رات کو سر چھپانے کے لیے جگہ ملنی دشوار تھی...... تمام دن ہم جنگلوں میں بھٹکتے رہے حتیٰ کہ شام قریب ہوگئی۔ شکست خوردہ آفتاب دن بھر کی خجالت سے زرد ہو کر لیلائے شب کی سیاہ فام زلفوں میں منہ چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے شور وغل مچاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے ارد گرد طواف کرنے لگے، اور گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا...... ہم اندھادھند آگے بڑھتے گئے۔ یکا یک جنگل ختم ہوگیا۔

ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے ہماری آنکھیں روشن ہوگئیں۔ ہم ایک شاداب و زرخیز میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے...... جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی دودکش سے دھوئیں کے بلغارے نکل رہے تھے۔ اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ ہم نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی۔ ایک خشک رو منحوس صورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا...... اس خوفناک قہقہے سے میرا دل ہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہولیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ردی تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی مائل گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور مکی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر ہ ایک طرف لگا دیا۔ مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس منحوس صورت آدمی کی آنکھوں میں شقاوت مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا۔ نیند کو دور کرنے کے لیے میں نے خوب قہوہ پیا...... تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت نیند کے جھونکے آنے لگے میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ جھنجھوڑا مگر بے سود۔ مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ارد گرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا...... رات کو مجھے نہایت خوفناک خواب دکھائی دیئے۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں لے جا رہے ہیں۔ یکا یک میرے سر میں سخت ٹیس اٹھی ایک تشنجی کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دوران خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اُف! پناہ بخدا، میں نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہوگیا۔ بدن کے رونگٹے سوئیوں کی طرح کھڑے ہوگئے۔ اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا...... آہ! میں ایک تیرہ و تار ڈراؤنی غار میں ایک لمبی سی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں اور سرہانے کی

طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ تھرکتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھی۔ سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا...... میز کے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا۔ جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح بڑا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ جس پر جلادوں کی طرح بڑے بڑے سیاہ لمبے گلمچھے تھے۔ انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکاری چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی دہشت سے میری زبان حلق میں پھنس گئی اور سانس رک رک کر آنے لگی...... اتنے میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ جسے سنتے ہی سرخ چہرہ جلاد نے اپنا مضبوط ہاتھ اٹھایا اور چاقو سے میرے سر میں گھاؤ لگانے لگا۔ میں شدت خوف سے پہلے ہی نیم جاں ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

3

مجھے ہوش آیا، تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ ایک طرف آبنوسی ورو کھے پر رکھے ہوئے پیتل کے بڑے سے چراغ میں چلبیل جل رہا تھا، جس کی کیف آور روشنی عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھی۔ چاند کی حسین کرنیں کھلی کھڑکی سے داخل ہو کر فرش زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ میرے سر اور گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے اور غار والا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سرہانے کی طرف ایک سایہ سا دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ فوراً کسی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا۔ ''طالع مند نوجوان، تمہیں اپنی زندگی اور جوانی مبارک ہو۔ تمہاری اس طویل اور مسلسل غشی نے مجھے تمہاری زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مگر آج آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے...... '' دلجوئی کے الفاظ سن کر میں نے مطمئن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس سال وجیہہ اور شکیل آدمی تھا۔ اس نیک دل انسان کی بڑھی ہوئی ہمدردی اور ان تھک خدمت گزاری سے میری صحت بہت جلد عود کرنے لگی، اور میں بتدریج صحت یاب ہوتا گیا...... دوران علالت میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جہاں بخت ہے۔ اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے۔ میرے استفسار پر جواں بخت نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ اس نے کہا:

''اس علاقہ میں کئی ایک ایسی وادیاں ہیں، جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پراسرار ہے، کہ کوئی اجنبی ان میں داخل نہیں ہو سکتا، اور ہر وادی میں جدا جدا قبیلے آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی، جس میں میرا قبیلہ آباد ہے۔ اسی طرح کی ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے۔ جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ان کی سردار ایک عورت ہے۔ جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے۔ اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے، اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض کو چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لیے فراہم کریں...... ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے۔'' میں نے پوچھا ''آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔'' اس نے کہا ''جوانی میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے کو اس

غار کا کسی طرح کھوج مل گیا، اور اس نے شبخون مار کر مجھے عین اس وقت چھڑایا۔ جبکہ ایک سرخ چہرہ جلاد میرے سر کو زخمی کر رہا تھا''...... جوان بخت نے کلاہ اتار کر اپنا سر مجھے دکھایا جس پر جا بجا بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ پھر کہنے لگا ''میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ جب کوئی نووارد ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور میں چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچا لیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غاریں بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ جس دن رہزن تمہیں اس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے۔ مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا۔ اور آخر کار ایک غار پر حملہ کر کے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ ہر دفعہ میرے ہاتھ سے بچ کر صاف نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لیے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔''

4

میں تقریباً چھ ماہ جواں بخت کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لیے زنجیر پا ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا تم شوق سے جا سکتے ہو۔ مگر تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہوگا۔ میں نے گھبرا کر کہا ''یہ کیوں؟'' وہ لجاجت سے بولا۔ ''عزیز من تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے، اس لیے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو ان خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے اور اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا سخت خطرہ ہے...... کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے، تو وہ شبخون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔'' میں نے افسردگی سے کہا ''تو پھر کیا میں یہاں کبھی نہ آ سکوں گا؟''، ''میرے خیال میں کبھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے کہا ''لیکن آپ کی ملاقات'' وہ میری بات کاٹ کر بولا ''یہ بھی تقریباً ناممکن ہے''...... اس ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا مجھے اس سے دلی الفت تھی۔ اس لیے اس کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی، اور میرے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ رویا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا۔ وہ گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شگفتہ چہرے پر ساوی تجلیاں نمایاں تھیں...... کامل وقفہ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور اپنی نکھری ہوئی منور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہنے لگا۔ ''ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر تم میرے مذہبی طریقے پر قسم اٹھا کر میری برادری میں شامل ہو جاؤ تو میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔'' میں نے اس شرط کو فوراً منظور کر لیا...... دوسرے دن جواں بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی، اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جواں بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے۔ پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے جواں بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو روحیں مجھے بھی وہی سزا دیں۔

اس کے بعد نیم عریاں کاہن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون کو چکھا، اور اس رسم کے اختتام پر جواں بخت نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے

وادی کا راز بتا دیا گیا اور جاتی دفعہ جواں بخت نے تاکید کی کہ جب تک میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے، اس علاقہ میں اکیلا یا کسی اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں۔ جواں بخت کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے جہاں میرے حصہ دار کا ہیڈ کوارٹر تھا...... یہ خطہ جواں بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا حصہ دار جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے زندہ سلامت پا کر بہت خوش ہوا...... جواں بخت کی دوستی سے میری تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جہاں بخت کی وادی میں کٹھ بہت کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اس کے آدمی ہمیشہ کٹھ پہنچاتے رہتے۔ انہی آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے جواں بخت سے ملنے جایا کرتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے، میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر گئی۔ اب میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقے میں سفر کرنے لگا...... ایک دفعہ میں جواں بخت کو ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے ملاقات ہوئی، یہ شخص بڑا باتونی تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی کے عمق میں ہے اس نے پریوں کو گاتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے جھٹلا دیا مگر دوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا......

ندی کے کنارے گیا تو کہیں دور پار سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نسیم بہار کی نرم رو لہروں پر مستی بکھیر رہی تھی سن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا میں با آسانی اسے عبور کر کے پار کے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے تھے...... یہ نشاط انگیز رانئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ جنگل کو وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنایا گیا ہے، اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے اردگرد خوش رنگ پھلواڑیوں کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ قریب گیا تو فرط حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سوسن کی پھلواڑی میں ایک پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا رہی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگھرو باندھے اس کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو دیکھ کر میں پھڑک گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدفی آنکھوں سے ایک ایسا کیف کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ بس کی تیز رو میں میرے ہوش و حواس تک بہہ گئے......

مجھے دیکھ کر انہوں نے راگ رنگ ختم کر دیا۔ حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے قریب بٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگی۔ جب میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں نے اس حسینہ سے نام وغیرہ دریافت کیا۔ "وہ کہنے لگی میرا نام مہ لقا ہے میں ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں۔ والدین کے انتقال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکار گاہ تھی یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں......"

میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے لمحے چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دن کی ڈھلتی چھاؤں وقت کی رفتار کا پتہ دینے لگی۔ مہ لقا سے رخصت ہو کر میں جواں بخت کی وادی کی طرف ہو لیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے نا آشنا تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے چکا ہوں۔ جواں بخت کی ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے واپس آیا تو مہ لقا کی جدائی دن بدن مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں مگر دل نہ مانا اور آخر کار اپنے کاروبار سے بددل ہو کر زیادہ تر جواں بخت کے پاس رہنے لگا۔ جواں بخت میری اس تبدیلی پر متعجب تھا۔ لیکن میں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا...... مہ لقا کی جھونپڑی جواں بخت کی وادی سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس لیے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اکثر جائے رہائش دریافت کرتی۔ مگر میں نے کبھی اس سے جواں بخت کا ذکر نہ کیا۔ اسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا۔ جو میرے کاروبار کا مرکز تھا۔ یہ سن کر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ

ڈیرا یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا...... ایک دن جب کہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا وہ بے اعتباری سے کہنے لگی۔ ''تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں۔ جب کہ تم اپنی جائے رہائش تک مجھ سے چھپا رہے ہو۔'' ''ندا'' ـ سے جھٹ بے سمجھے بوجھے میرے منہ سے نکل گیا۔ ''دوسرے کا راز میں نہیں بتا سکتا۔'' میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''آہ آپ مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے......'' درحقیقت آنسو عورت کا زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ارادے کا مرد بھی زیر ہو جاتا ہے۔ آہ میں بھی ان صدفان گوہر بار کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کر لیا۔ افسوس میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اسے اس وادی کا راز بتا دیا۔

5

رات کسی بدعہد گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی۔ جس کی نحوست سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ تیسری تاریخ کا نیا چاند افق کی تاریک گہرائیوں میں کھو چکا تھا، تارے سیاہ بادلوں میں گم ہو چکے تھے۔ تمام دنیا ایک کالے دیو کی مٹھی میں بند معلوم ہوتی تھی۔ جواں بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی۔ ایک نامعلوم خطرہ مجھے قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں جہنمی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بے چینی سے چکر لگاتا رہا...... آدھی رات کے قریب یکایک ایک گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اٹھی۔ اس پُرہول آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آہ یہ اس مہیب نقارے کی آواز تھی۔ جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی۔ خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جواں بخت کے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے نہایت عجلت سے ہتھیار لگائے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا...... یکدم رہزنوں کا ایک زبردست گروہ جواں بخت کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور جوانمردی سے لڑا مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ رہزنوں نے اس کے ساتھ ہم سب کی مشکیں کس لیں اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے نکال لائے...... ابھی وہ وادی سے نکلے ہی تھے کہ جواں بخت کا باقی قبیلہ تعاقب کرتا ہوا آ پہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ ادھر میدان کارزار گرم ہو رہا تھا ادھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچا دیا گیا۔ غار میں الاؤ جل رہا تھا، اور ایک بپھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت و استعجاب سے اچھل پڑا۔ آہ وہ مہ لقا تھی...... وہ غصے سے دانت پیس رہی تھی۔ حالت غیظ میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے مہ لقا کے اشارہ ابرو پر جواں بخت کی مشکیں کھولیں، اور اسے خونناک شیر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ مہیب شیر نے آناً فاناً جواں بخت کو اپنی مضبوط رانوں میں دبوچ کر ہلاک کر دیا...... عین اسی وقت رہزنوں کے لشکر میں بھگدڑ پڑ گئی اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے قریب پہنچ گئے۔

خطرے کو بھانپ کر مہ لقا فوراً غار سے باہر نکلی۔ اور اپنی جماعت سمیت جنگل میں غائب ہو گئی۔ حملہ آور جب غار میں داخل ہوئے تو انہیں جواں بخت کا حسرتناک انجام دیکھ کر ازحد صدمہ ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی جہاں نہایت احترام سے اسے سپرد خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک اس کا قبیلہ سوگوار رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جب کہ تمام قبیلہ جمع تھا۔ نیم عریاں کاہن نے کہا ''بھائیو میں یہ نہیں جانتا

چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے۔ لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم لوگ مقدس خون پر جہاں بخت سے وفاداری کی قسم اٹھا چکے ہو، اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جواں بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی۔ اس لیے پچاس سال کی عمر میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی، اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔'' نیم عریاں کاہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے......

کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ مگر حوصلہ کر کے دل کو برقرار رکھا اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں مجرم تھا۔ میرا سکون قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا۔ میں تجارت چھوڑ کر اپنے دیس چلا آیا۔ چونکہ میں نے جواں بخت کی بدولت بے شمار دولت کمائی تھی۔ میں امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم عریاں کاہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے خوف سے مجھے زندگی وبال ہوگئی ہے۔ رات کو شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوفناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں۔ روحیں میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جواں بخت کی کفن پوش لاش مجھے اشاروں سے بلاتی ہے، اور اسی خوف سے گوشہ نشین ہو رہا ہوں''...... حیدر کی داستان سن کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ ورنہ ایسی قسمیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور نہ ہی تم نے جان بوجھ کر غداری کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔'' میں بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم لائبریری میں سو رہا ہوگا...... میں لائبریری کی طرف گیا۔ تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا ''ابا میں نے چچا کی تمام باتیں سنی ہیں۔ وہ بہت ڈرپورک ہے۔'' میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''سلیم ایسا نہیں کہا کرتے۔'' وہ شوخی سے بولا۔ ''وہ درحقیقت بہت ڈرپوک ہے۔ دیکھو میں نے اسے ڈرانے کے لیے دیوار پر کیا بنایا ہے۔''...... میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ سلیم نے اس پر اپنی رنگین پنسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دیا۔ اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

6

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا۔ اس لیے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پولیس جمع تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی۔ اس کی شاہ رگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا اور کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر صاف نمایاں تھے...... میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جا نکلا۔ اچانک مجھے سلیم کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

سلیم کی بنائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔

O

جلیل قدوائی

نام	:	جلیل قدوائی
قلمی نام	:	جلیل قدوائی
پیدائش	:	۶ مارچ ۱۹۰۴ء بہ مقام اناؤ (اودھ) بھارت۔
وفات	:	یکم فروری ۱۹۹۶ء، راول پنڈی، پاکستان۔
تعلیم	:	ایم۔اے (اردو) الہ آباد، یونیورسٹی ۱۹۳۳ء

گورنمنٹ ہائی سکول ضلع اناؤ (اودھ) سے ایس۔ایس۔سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ایف۔اے میں احسن مارہروی سے اردو کا مضمون پڑھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۲۶ء میں بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں ایم۔اے (اردو) کرنے کی غرض سے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں اول درجہ میں ایم۔اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

جلیل قدوائی نے میٹرک تک کا زمانہ اناؤ (اودھ) میں گزارا۔ چھٹے ساتویں درجے سے ہی اردو شعر و ادبیات کا ذوق پیدا ہوا۔ اناؤ کے قصبہ موہان میں حسرت موہانی، عزیز صفی پوری اور جگت موہن لال رواں جیسی شخصیات قیام پذیر تھیں اور اناؤ میں جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، جعفر علی خان اثر اور عزیز لکھنوی اکثر آتے تھے۔ یوں اناؤ کی فضا شعر و شاعری سے معمور تھی۔ جلیل قدوائی نے زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنے شروع کیے اور ''نقیب'' بدایوں اور ''صوفی'' پنڈی بہاؤالدین میں شائع ہونے لگے۔

۱۹۲۲ء میں حصول علم کے لیے علی گڑھ چلے گئے جہاں سید سجاد حیدر یلدرم مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ یلدرم ان کے سب سے بڑے مربّی اور محسن ثابت ہوئے۔ ہم جماعت طالب علموں میں خواجہ منظور حسین اور خواجہ غلام السید بن بہت نمایاں تھے اور اُس زمانے میں

انہیں کا ساتھ رہا۔ خواجہ منظور حسین اور خواجہ غلام السیدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادبی مجلّہ کے مدیر تھے، جن کے بعد جلیل قدوائی نے ادارات سنبھالی۔ اسی زمانے میں ''ہزار داستان'' اور ''الناظر'' جیسے وقیع ادبی جرائد میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کرنے بعد جلیل قدوائی کو ظفر الملت علوی صاحب نے اپنے جریدہ ''الناظر'' کی ادارت کے لیے لکھنؤ بلالیا۔ لکھنؤ پہنچ کر جلیل قدوائی نے ''الناظر'' لکھنؤ کے کئی یادگار نمبر مرتب کیے۔ چند ماہ بعد یلدرم نے انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر میں ملازمت کی پیشکش کی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ علی گڑھ منتقل ہو گئے، جہاں ساٹھ سے سو روپے ماہوار پر انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہے۔ مضمون نویسی اور شاعری کے ذریعے ایک پروفیشنل رائٹر کے طور پر ''مخزن'' لاہور، ''معارف'' علی گڑھ، ''صوفی'' پنڈی بہاؤالدین اور ''نیرنگ خیال'' لاہور کی معرفت ابھرے۔

۱۹۳۱ء میں جب ایم۔ اے (اردو) کرنے الہ آباد گئے تو سر راس مسعود وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے نہ صرف دو برس کی طولانی رخصت حاصل کرنے میں مدد دی بلکہ دو برس کا وظیفہ خود منظور کرنے کے علاوہ سر عزیز الدین احمد سے بھی وظیفہ دلایا۔ ۱۹۳۳ء میں جلیل قدوائی کو مسلم یونیورسٹی کی انتخاب کمیٹی کے ممبران ڈاکٹر سر محمد اقبال اور سید سلیمان ندوی کی مخالفت کے باوجود شعبہ اردو میں لیکچرر منتخب کر لیا گیا۔ لیکچر شپ پر تقرر ۱۵۰ روپے ماہوار پر ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں خان بہادر سید نجم الدین احمد جعفری نے بمشاہرہ ۲۰۰ تا ۳۰۰ روپے ماہوار پر شعبہ اطلاعات، حکومت ہند میں سرکاری اخبار نویس کے طور پر بلا لیا۔ یہاں جلیل قدوائی کا مشاہرہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تھا اور ۱۹۴۰ء میں بطور اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر یہ مشاہرہ ۴۰۰ تا ۶۰۰ روپیہ ماہوار تک پہنچ گیا لیکن ادبی لحاظ سے یہ سب کچھ ترقی معکوس ثابت ہوا۔ جلیل قدوائی جتنا کام کر سکتے تھے، اتنا نہ کر سکے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بطور معاون معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی سے منسلک رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے قائم کردہ ادارے راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی، کراچی کے لیے بھی کام کرتے رہے۔ آخری زمانہ راولپنڈی میں گزرا لیکن تدفین کراچی میں ہوئیں۔

اوّلین مطبوعہ تحریر مطبوعہ:

''صوفی'' پنڈی بہاؤالدین: ۱۹۱۹ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''سیرِ گل'' (طبع زاد و ترجمہ کردہ افسانے)	مطبوعہ: علی گڑھ	طبع اوّل: ۱۹۲۷ء
	روسی افسانہ نگاروں خصوصاً چیخوف سے ماخوذ ترجمہ۔		
	دوسرا ایڈیشن زمانہ بک ایجنسی کانپور نے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔		
۲۔	''نقش و نگار'' (نظمیں/غزلیں)	سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو	طبع اوّل: ۱۹۳۰ء
۳۔	''انتخاب حسرت'' (غزلیات کا انتخاب)		طبع اوّل: ۱۹۳۰ء
۴۔	''اصنام خیالی'' (طبع زاد و ترجمہ کردہ افسانے)	اختر پرنٹنگ ورکس، علی گڑھ	طبع اوّل: ۱۹۳۳ء
۵۔	''مونا وانا'' (ڈراما از مارس میٹر لنک)	اختر پرنٹنگ ورکس، علی گڑھ	طبع اوّل: ۳۳۔۱۹۳۱ء

۶۔ ''دیوانِ بیدار'' (تحقیق) ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد طبع اوّل: ۱۹۳۸ء

اس کتاب کا مقدمہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء کے درمیان لکھا جو رسالہ ''ہندوستانی'' الہ آباد میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں میر و سودا کے معتبر معاصر میر محمدی بیدار کے کلام کو پہلی بار یکجا کیا گیا ہے۔ دیوانِ بیدار کے ایک نایاب نسخے کی ''دیوانِ بیدار'' (مملوکہ: احسن مارہروی) سے تقابلی مطالعے کے بعد کی اشاعت ہے۔

۷۔ ''تنقیدیں اور خاکے''

۸۔ ''تذکرے اور تبصرے'' مطبوعہ: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

۹۔ ''مکتوباتِ عبدالحق'' (ترتیب و تہذیب) انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی طبع اوّل:

۱۰۔ ''تذکرہ شعرائے بدنام'' (ترتیب و تہذیب) اردو اکیڈمی سندھ، کراچی طبع اوّل: نومبر ۱۹۶۵ء

یہ کتاب جرأت، انشاء، ناسخ، امانت اور رند لکھنوی کے کلام کا انتخاب ہے۔

۱۱۔ ''مرقعِ مسعود'' (سر راس مسعود سے متعلق)

۱۲۔ ''خیابانِ مسعود'' (سر راس مسعود سے متعلق)

۱۳۔ ''شعلۂ مستعجل'' (سر راس مسعود سے متعلق)

۱۴۔ ''ماموں جان'' (ڈراما: از چیخوف کا ترجمہ) یہ ''انکل وانیا'' کا ترجمہ ہے۔

۱۵۔ ''چند اکابر چند معاصر'' (خاکے)

۱۶۔ ''قطراتِ شبنم'' (نثری نظمیں)

۱۷۔ ''چشمۂ آفتاب'' (نثری نظمیں)

۱۸۔ ''نوائے سینہ تاب'' (شاعری) طبع اوّل: ۱۹۵۱ء

۱۹۔ ''خاکسترِ پروانہ'' (غزل، نظم، رباعیات و قطعات)

۲۰۔ ''اسٹنڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری'' (مرتبہ: مولوی عبدالحق نظرِ ثانی: جلیل قدوائی) انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی

۲۱۔ ''حسنِ انتخاب'' (ترتیب و تہذیب) طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۲۲۔ ''کارنامۂ ادب'' (ترتیب و تہذیب) طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۲۳۔ ''حیاتِ مستعار'' (خودنوشت)

۲۴۔ ''اردو ادب: ثقافت پاکستان'' طبع دوم: ۱۹۶۷ء
(عزیز احمد کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)

غیر مدوّن:

جلیل قدوائی کی اپنی مرتب کردہ محولہ بالا کتب کے علاوہ ان کے متعدد علمی مضامین اور لاتعداد خطوط غیر مرتب حالت میں موجود ہیں۔

نظریہ فن:

''مجھے کہانیوں میں زندگی کی اصلی نقاشی بہت پسند ہے، اسی لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ بیتے ہوئے واقعات کی کہانیاں لکھوں۔ واقعہ خواہ واقعتاً پیش آیا ہو، یا وہ صرف دماغی کیفیت ہو یا ذہنی جدوجہد وغیرہ، میں نے افسانوں کے لیے کبھی خود سے کیرکٹر نہیں تخلیق کیے...... مختصر افسانہ زندگی کی بہتی ہوئی ندی کی ایک لہر ہے، جسے برف کی قاش بنا کر ادب کے برفستان میں محفوظ کر دینا چاہیے۔''

جلیل قدوائی

بہ حوالہ: ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں''
مرتبہ: حکیم محمد یوسف حسن
دارالادب، پنجاب، بارود خانہ، لاہور، طبع اوّل: س۔ن

پتنگے

جلیل قدوائی

اختر، قصبہ س...... کا ایک نوعمر رئیس (جس کی جائیداد حال ہی میں کورٹ آف وارڈس سے چھوٹی تھی) اور آنریری مجسٹریٹ، اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا تھا۔ کچھ دن پہلے مقدمہ کی کارروائی ختم ہو چکی تھی، اور صبح تک اسے فیصلہ لکھ کر سنا دینا اور مسل کو اپنے حاکم تحصیل کے پاس بھیج دینا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ پانی ابھی ابھی برس کر کھلا تھا۔ اختر نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دی تھیں اور دروازوں پر پردے چڑھا دیئے تھے، تاکہ ہوا آسانی سے کمرے میں آ سکے۔ لیکن ہوا رکی ہوئی تھی اور کمرے میں نہیں آ رہی تھی۔ تیز روشنی دینے والا لمپ جس کے اوپر گلوب نہیں چڑھایا گیا تھا، کمرہ کی دیواروں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ دیواروں کے بعض حصّوں پر روشنی نہیں پہنچتی تھی جہاں تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ان حصّوں پر تصویروں کے سائے ٹیڑھے ترچھے ہو کر پڑ رہے تھے۔ لمپ کی چمنی نے کمرے کی چھت میں ایک بڑا ہلکے زرد رنگ کا گول دھبا ڈال رکھا تھا۔ سامنے آتش دان کے کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے شیشے چمک رہے تھے۔

اختر نے اب تک کب کا فیصلہ لیا ہوتا۔ وہ محنتی آدمی تھا اور وقت کا پابند اور ہر کام کو اپنے وقت کے اندر ختم کر لیتا تھا مگر کبھی کبھی جب اس کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو مجبوراً اسے اپنے اصول توڑنے پڑتے تھے اور وقت کے خلاف کام کرنا پڑتا تھا۔ ادھر دو دن سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ موسم کی تبدیلی اور ہوا کے وقت ناوقت چلنے نے اس کے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ کام کرنے کے لائق نہ رہا اور آرام کرتا رہا تھا۔ دن کو اس نے فیصلہ لکھ لینے کا ارادہ کیا۔ مگر ٹھیک اس وقت جب وہ کام کرنے جا رہا تھا، اس کے چند دوست اس سے ملنے آ گئے۔ جنہوں نے اس کے کئی گھنٹے خراب کئے۔ اس وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکا تھا اور اب لکھنے بیٹھا تھا۔

یکایک ایک بڑا سا سیاہ چیونٹا جس کے پر نکل آئے تھے، معلوم نہیں کہاں سے اڑ کے آیا اور لمپ کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ چکر کاٹ کر وہ اختر کے سامنے کاغذ پر آ کے گرا۔ جسے اس نے پھونک کر اڑا دیا۔ اس کے بعد ایک پروانہ آیا اور طواف شمع کرنے لگا۔ اختر نے اسے بھی پہلے کیڑے کی طرح اڑا دینا چاہا، مگر یہ زیادہ مستقل مزاج بلکہ ضدی تھا اور اس کی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ ہٹا۔ دیکھتے دیکھتے پردار

چیونٹے، پروانے، جنگلی بوٹ اور بے شمار کیڑے اور پتنگے جن کے نام کسی کو نہیں معلوم، لیمپ کے گرد جمع ہو گئے اور لیمپ کی سطح پر میز پوش پر، کاغذ پر رینگنے لگے اور دوات اور اس کی قمیص کے اندر داخل ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے باری باری اڑ کر گانا بھی شروع کر دیا۔ کچھ سیاہ رنگ کے ارد کی دال کے برابر کیڑے اڑتے اڑتے تھک کے ایک جگہ گر پڑے اور دیر تک بے حرکت گویا دم سادھے مردے کی طرح پڑے رہے۔ ان میں سے ایک طرح کی بدبو آنے لگی۔ کچھ کیڑے اور پتنگے اس کے گریبان اور آستینوں کی راہ سے اس کے کپڑوں کے اندر گھس گئے۔ بعض اس کے منہ اور رخساروں پر طمانچے مارنے لگے۔ ایک سیاہ پتنگے نے اپنے آپ کو اس کے قلم کے راستے میں لا ڈالا اور اس بات پر مصر ہوا کہ یا وہ لکھنا بند کر دے یا اسے پامال کر ڈالے۔ ایک اور کیڑا اس کے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے کاغذ کی تہ میں گھس گیا اور کاغذ اچھالنے لگا۔ اس نے کاغذ اٹھایا اور اسے پھونک کر اڑا دینا چاہا۔ مگر وہ اڑ کر کسی اور طرف جانے کے بجائے اس کے منہ کے اندر چلا آیا۔ جسے اس نے بڑی مکروہ صورت بنا کر تھوک دیا۔

''یہ اتنے سارے کیڑے آتے کہاں سے ہیں؟'' اختر پریشان ہو کر سوچنے لگا۔

''جب روشنی نہیں ہوتی تو یہ کہیں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتے اور چراغ جلتے ہی ہر طرف سے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر دوڑتے ہیں۔ شاید یہ اسی وقت پیدا ہوتے اور اسی وقت مر جاتے ہیں اور اس بری طرح جان دینے میں آخر انہیں کیا مزہ آتا ہے؟ اللہ ہی ان دیوانوں پر رحم کرے اور انہیں سمجھ دے۔ انہیں کوئی کیسے بھگائے؟ آدمی ہاتھی پکڑ سکتا ہے اور شیر مار سکتا ہے اور میدان جنگ میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا خون بہا سکتا ہے۔ مگر پروانے نہیں اڑا سکتا۔ اس نے انہیں غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی، ننھی جانیں تھیں۔ جن کی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ اڑتے تھے اور پھڑ پھڑاتے تھے۔ رینگتے تھے اور ٹھہر جاتے تھے۔ بہت سے پروانے جل کر مر چکے تھے اور بہتوں کے پر ان کے بازوؤں سے الگ ہو کر میز پوش کی سطح پر پڑے تھے اور وہ خود پرواز کی قوت کھو کے شمع کے گرد صرف رینگنے پر اکتفا کر رہے تھے۔

مگر ایسے کوئی لطف بھی کب تک اٹھائے اختر نے سوچا: ''اس کے لیے فرصت کی ضرورت ہے اور اچھی صحت کی۔ میرے پاس نہ فرصت ہے نہ اچھی صحت۔ مجھے کام کرنا ہے۔ میرے جسم میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے آرام کرنا ہے؟''...... اس نے پھر لکھنا شروع کیا۔ مگر پتنگے اسے کام سے پھر روکنے لگے۔ اسے مقدمہ کی رُوداد پڑھنا تھی۔ وکیلوں اور گواہوں کے بیانات اور بحثوں پر غور کرنا تھا۔ قانونی موشگافیوں سے سر کھپانا تھا اور خیالات اکٹھا کرنے تھے۔ مگر فی الحال ان سب سے زیادہ دشوار اور بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پروانے کیوں کر اڑائے جائیں۔ وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے پیاز کے کچھ ٹکڑے لیمپ اور میز پر رکھے۔ اس کے بعد اس نے کمرے کی سب کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازوں کے پردے گرا دیئے لیکن کیڑوں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

آخر وہ کیا کرے؟ اس کے پاس صرف یہی رات تھی اور اسی رات اسے فیصلہ لکھ کر تیار کر لینا تھا مگر وہ کیونکر لکھے؟ اگر صبح تک اس نے فیصلہ نہ لکھ لیا اور کل نہ سنا دیا اور مسل کو تحصیل نہ بھیج دیا تو اس کی بڑی سبکی ہو گی اور اس کی ساری ساکھ خاک میں مل جائے گی۔ وہ ایک باعزت رئیس تھا اور سارے حکام اور رعایا پر اس کا بڑا اثر تھا۔ معلوم نہیں فیصلے میں دیر ہوئی تو اس کا لوگوں پر کیا اثر پڑے۔ ان پتنگوں کو کیا معلوم کہ ان کے اس ننھے سے مشغلہ تفریح میں اس کے لیے کیسی تلخ مصیبت کا سامنا تھا۔ اسے غصہ سا آنے لگا۔ کمرے کی گرمی اور امس نے اس کے مزاج میں اور برہمی پیدا کی۔ وہ دروازہ کھول کر لیمپ کو باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ کے چند قطرے کاغذ پر ٹپک پڑے۔ جن کے سیل رواں نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے لکھے ہوئے کو مٹانا شروع کیا۔ اس نے تنگ آ کر قلم کاغذ پر زور سے پٹک دیا۔ جس

نے کاغذ اور میز پوش پر کئی گل بوٹے کھلا دیئے ان گل بوٹوں نے اس کے دماغی توازن میں ہلچل پیدا کی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لمپ کو پھونک مار کر گل کر دیا۔

یکدم تاریکی چھا گئی۔ کوئی چیز نہ دکھائی دیتی تھی اور چمک یا روشنی کی ایک شعاع بھی کسی طرف سے نہ آتی تھی۔ صرف تاریکی ۔۔۔ بے امان تاریکی۔ کسی فوٹوگرافر کے ڈارک روم سے زیادہ تاریک کیونکہ اس میں بھی دھیمی سرخ روشنی حیات کا پتہ دیتی ہے۔ ملٹن کی بیان کی ہوئی مشہور تاریکی سے زیادہ سیاہ تاریکی ہر طرف چھا گئی۔ کائنات جو گویا روشنی کے وجود کے ساتھ زندہ تھی سیاہ ہو گئی۔ یکدم جیسے چپ ہو گئی، مر گئی...... آہستہ آہستہ اختر نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے اور دروازے کو ڈھونڈا اور آہستہ آہستہ ٹٹولتے ہوئے وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہنچا اور بستر پر پڑ گیا۔ دن بھر سرد ہوا چلی تھی اور اس وقت بھی خنکی تھی اور دن بھر وہ ملاقاتیوں کے ساتھ تکلف سے بندھا ہوا، جکڑا ہوا، اپنی طبیعت پر جبر کر کے تکلیف سے بیٹھا رہا تھا۔ وہ آرام نہ کر پایا تھا، جس سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اب پروانوں نے آ کر اس کے دماغ میں ابتری پیدا کر دی تھی۔ اس نے بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلیں اور اپنے پیر بار بار دے مارے۔ اس کے دل و دماغ میں اس وقت ایک بے چینی تھی اور وہ اپنے کو ایک بہت بدقسمت آدمی خیال کر رہا تھا: ''مجھے ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے...... بہت کچھ...... مگر جب یہ پتنگے کچھ کرنے دیں۔'' اس نے اپنے پیروں کے نیچے پڑا ہوا کمبل اٹھا کر اپنے بدن پر ڈال لیا اور سرہانے پڑا ہوا تولیا اپنے سر اور کانوں سے لپیٹ لیا۔

آہستہ آہستہ فضائے سیاہ کو چیر کر اس کمرے کی ہر چیز اس میں سے ابھرنے لگی۔ اور صاف نظر آنے لگی۔ اس کے سرہانے اس کی چھوٹی میز تھی۔ جس پر سفید جھالردار میز پوش پڑا تھا۔ داہنی طرف دیوار سے برابر لگے ہوئے بید کے مونڈھوں کی قطار تھی۔ سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی اس کی سنگار میز تھی، جس کا بڑا صاف آئینہ تاریکی میں چمک رہا تھا...... ادھر دوسرے کمرے میں سے ستار کی لطیف اور دل ربا چھن چھناہٹ اور ہلکے رسیلے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ اس کی بیوی اور اس کی چھوٹی سالی تھیں جو موسیقی کی مشق اور آپس میں خوش فعلیاں کر رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اختر کو اس وقت ان کے سریلے قہقہوں اور رسیلی آوازوں کے بجائے غمناک اور ترحم آمیز لہجوں، ہمدرد و غمگسار آوازوں کی ضرورت تھی جو اس کے حال کو سنبھالیں ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی جو اس کا حال پوچھے اور ممکن ہو تو...... اس کے پیر دبائے۔

''میرے پیر کون دبائے؟'' اختر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر سوچنے لگا۔ خیابان کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ جس طرح کمرے کی فضائے سیاہ میں سے ہر چیز آہستہ آہستہ ابھری اور اس کی آنکھوں کے سامنے آئی تھی، اس طرح اس کے دماغ اور خیال کی دنیا میں سے دبے ہوئے۔ گڑے ہوئے خیالات ابھرنے اور دیدۂ دل کے سامنے آنے لگے۔ نہ معلوم کس طرح اسے ایک وہ رات یاد آ گئی جب ہر طرف اس طرح کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی ماں اس کے باپ سے آہستہ آہستہ سرگوشی کر رہی تھی اور سسکیاں بھرتی جاتی تھیں۔ اسے صاف یاد آیا یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک بے حد حسین لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اس لڑکی سے شادی کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ مگر اس کی ماں کے آنسو اس کے جذبۂ محبت پر غالب آئے تھے اور اس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی تھی اور اسے اس وقت نہ جانے کیوں یہ خیال کر کے افسوس ہونے لگا کہ اس کی شادی اس لڑکی سے نہیں ہوئی، جسے وہ اس قدر چاہتا تھا۔ جس کے لیے وہ دیوانہ ہو گیا تھا اور جو اَب تک کنواری تھی۔ کیا اچھا ہوتا، اگر اس اپنی اس پہلی مایوس محبت کی یاد میں اپنی زندگی شادی کے بغیر گزاری ہوتی۔ لوگ اسے دیکھتے اور اسے ایک عجیب و غریب شخصیت سمجھتے۔ ایک پُر راز ہستی جو ایک کھوئی ہوئی محبت کی یاد کو کلیجہ سے لگائے ہے اور اسی کے سہارے

زندگی ختم کرنا چاہتا ہے۔

''مگر یہ کیا؟'' اس نے خیال کیا۔ پتنگوں کو میری کھوئی ہوئی محبت سے کیا تعلق، یہ خیالات میرے دل میں کیسے آئے؟'' اور یہ وہ نہ سمجھ سکا۔ اس نے کروٹ لی اور اس کے جسم کی ہڈیاں چٹ چٹ بولیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے نیچے کا دھڑ اس کے بدن سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اس کا نہیں ہے۔ کسی دوسرے کا ہے۔ بستر پر اسے کل نہیں آ رہی تھی۔ اس کے دماغ کی کوئی کل بگڑ گئی تھی۔ اس کے خیالات میں ایک جنگ سی ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس کے جسم کا ہر حصہ اس جنگ سے مغلوب ہے۔ وہ بستر سے اٹھا اور کمبل اور تکیے لے کر بستر کے نیچے فرش پر پڑ رہا تا کہ خیالات کی آمد کو روک سکے اور انتشار دماغی کو کم کرے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور اسے اپنی زندگی کے بعید سے بعید واقعات اور حادثات یاد آتے رہے۔ جیسے اس رات خیالات نے قسم کھائی تھی کہ اس کی ساری گزشتہ زندگی اس کے سامنے لے آئیں گے......

پورے دو گھنٹے گزر گئے۔

یکدم کہیں سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس کی بیوی اپنے ہاتھ میں موم بتی لئے کمرے کے دروازہ کا پردہ ہٹا کر اندر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک چھوکری کشتی میں چائے کا سامان لیے تھی۔ فوراً جیسے مردہ زندہ ہو جائے۔ اختر چونک پڑا اور سراسیمگی میں کمبل اور تکیوں کو اٹھا کر اپنے بستر پر آیا اور ایسے اہتمام سے چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے وہ گھنٹوں سے بے خبر پڑا سو رہا ہے۔

''میں سارے میں تمہیں ڈھونڈتی پھری، کیا کام ختم کر لیا؟ ارے تم یہاں اندھیرے میں کیسے پڑے ہو؟ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ میں تمہارے لئے چائے لائی ہوں۔'' اختر نے اپنی بیوی کی یہ دلداریاں دیکھیں تو اس کا سارا انتشار دماغی اس ایک پر ترنم اور سکون آمیز صدا کی لطافت میں تحلیل ہو گیا۔

اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ فیصلہ نہیں لکھ سکا اور پھر کام کرنے بیٹھے گا۔ اس کی بیوی نے لیمپ روشن کیا۔ اسے چائے پلائی اور اس سے دیر تک پیار کی باتیں کر کے اس کا دل بڑھاتی رہی۔ خوب گہرے رنگ کی تیز چائے کی دو پیالیاں پی کر اختر کی جان میں جان آئی۔ پھر اس نے کئی سگریٹیں سلگائیں اور ان کے دھوئیں اڑائے اور کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے دفتر کے کمرے میں پھر داخل ہوا اور میز کے سامنے بیٹھ کر دو بجے صبح تک خوب دھواں دار مضمون لکھتا رہا...... میز پوش پر پتنگوں کے پر اب تک پڑے تھے۔ مگر پروانے اڑنا اور باہر سے پتنگے آنا بند ہو گئے تھے۔

○

مجنوں گورکھپوری

نام : احمد صدیق
قلمی نام : احمد صدیق مجنوں/ مجنوں گورکھپوری
پیدائش : ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء بہ مقام موضع پلڈہ (بستی) تحصیل خلیل آباد، ضلع گورکھپور (بھارت)[1]
وفات : ۴ جون ۱۹۸۸ء صبح سات بج کر پچیس منٹ پر، بہ مقام: کراچی، پاکستان
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی) آگرہ یونیورسٹی، آگرہ ۱۹۳۴ء
ایم اے (اردو) کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ ۱۹۳۵ء

ابتدائی تعلیم سینٹ اینڈریوز سکول، گورکھپور میں پائی، جہاں سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ لڑکپن میں دل کے مریض ہونے کے سبب والدین نے چار سال تک انٹر کا امتحان نہ دینے دیا۔ انٹر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کالج، علی گڑھ سے ۱۹۲۷ء اور بی۔اے سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور سے ۱۹۲۹ء میں کیا۔ درس نظامیہ اور بی اے تک کی تعلیم گورکھ پور، علی گڑھ اور الہ آباد میں حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

مجنوں گورکھپوری کے والد کا نام محمد فاروق دیوانہ تھا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر رہے۔ مجنوں کا خمیر موضع پلڈہ (بستی) کی خاک سے اٹھا۔ یہ گورکھپور کی تحصیل خلیل آباد کا ایک دور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں تھا جسے ''ملکی جوت'' بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ مجنوں کا ددھیال تھا۔ ابتدائی تربیت خلیل آباد اور مگھرے کے درمیان لکھنؤ جانے والی پختہ سڑک کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے گاؤں منجھریا میں ہوئی، یہ مجنوں کا ننھیال تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں مجنوں کی ابتدائی زندگی کے چودہ برس گزرے۔ ان کا ددھیال علم و فضل اور فقر و درویشی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں شادی ہوئی۔ (اولاد: تین بیٹے اور ایک بیٹی) ۱۹۲۹ء میں بی۔اے کر لینے کے بعد جارج اسلامیہ ہائی اسکول، گورکھ پور سے تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مجنوں گورکھپوری کی زندگی کا بیشتر حصہ کالج اور یونیورسٹی میں درس و

تدریس میں گزرا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

لیکچرر شعبہ انگریزی، سینٹ اینڈریوز کالج، گورکھپوری ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء

لیکچرر شعبہ انگریزی، سربراہ شعبہ تعلقات عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر ۱۹۳۵ء

لیکچرر (انگریزی و منطق) میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج گورکھپور، جولائی ۱۹۳۶ء تا مئی ۱۹۳۷ء

پروفیسر انگریزی، صدر شعبہ اردو، سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور، جولائی ۱۹۳۷ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء

صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی ستمبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر، علی گڑھ تاریخ ادب و ریڈر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نومبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۶۸ء

اوائل جوانی میں مجنوں تخلص اختیار کر کے شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن پہچان افسانہ نگاری اور تنقید بنی۔ اوّلین طویل مختصر افسانہ ''زیدی کا حشر'' ۱۹۲۵ء میں مکمل کیا۔ اس سے قبل فلسفیانہ مسائل و مباحث سے متعلق مضمون نگاری کی۔ اشاعتی ادارہ ''ایوان ادب'' قائم کر کے ادبی مجلّہ ''ایوان'' کا اجرا کیا۔ زندگی کا بیشتر وقت گورکھپور اور علی گڑھ میں گزرا۔ پہلی بار دسمبر ۱۹۶۷ء میں پاکستان تشریف لائے اور دوسری بار اپنی اکلوتی بیٹی اور آخری اولاد تہمینہ اور اس کے بچوں سے ملنے مئی ۱۹۶۸ء میں آئے۔ اس وقت تک فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ واپس جائیں یا یہیں کے ہو رہیں۔ یہاں تک کہ سوا برس تک ویزا بڑھواتے بڑھواتے آخر کار یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۷۸ء تک کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ دسمبر ۱۹۸۷ء میں مجنوں کے انتقال کی خبر نکلی۔ علی گڑھ، لکھنؤ اور گورکھپور میں تعزیتی اجلاس ہوئے۔ مجنوں نے اپنے انتقال سے متعلق خبر کی تردید علی سردار جعفری کو خط لکھ کر کی۔ مئی ۱۹۸۸ء میں یکلخت کمزوری بڑھنے لگی۔ ۳۰ مئی کو ہسپتال داخل کروایا گیا اور ۴ جون کو دل اور پھیپھڑے جواب دے گئے۔ ۴ جون ۱۹۸۸ء کی صبح سات بج کر پچیس منٹ پر دنیا سے اٹھ گئے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''زیدی کا حشر'' (مختصر افسانہ) تین قسطیں مطبوعہ ''نگار'' قسط اوّل: مئی ۱۹۲۵ء، قسط دوم: جون ۱۹۲۵ء اور قسط سوم: جولائی ۱۹۲۵ء

۲۔ ''گہنا'' مطبوعہ: ''نگار'' لکھنو: جون ۱۹۲۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''خواب و خیال'' (افسانے) صدیق بک ڈپو، علی گڑھ/ انجمن لکھنؤ طبع اوّل: ۱۹۴۲ء

۲۔ ''سمن پوش اور دوسرے افسانے'' (چھ افسانے) ایوانِ اشاعت، گورکھپور طبع اوّل: ۱۹۳۴ء

اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں ہی کتب خانہ علم و ادب دہلی نے شائع کیا۔ پھر اسی ادارے سے ایک ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں نکلا، جس کے کل ۱۵۲ صفحات ہیں۔ اس ایڈیشن میں ''نگاہ باز گشت'' (دوسرا مقدمہ: مرقومہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء) ''افسانہ کا افسانہ'' (مطبوعہ: ''ایوان'' گورکھپور ستمبر ۱۹۳۴ء) ''گریز'' (پہلا مقدمہ: مرقومہ ۱۴ اگست ۱۹۳۴ء) کے علاوہ چھ افسانے بہ عنوان ''دنیائے آب و گل سے دور''، ''سمن پوش''، ''سبز پری''، ''حسن شاہ''، ''محبت کا جوگ'' اور ''تم میرے ہو'' شامل ہیں۔ کتاب کے ۱۹۴۷ء والے متن کو انسان دوست ادارہ، کراچی نے ۱۹۷۱ء میں بار دگر شائع کیا۔

۳۔ ''زیدی کا حشر'' (طویل مختصر افسانہ) — اردو اکیڈمی، ناگپور، — طبع اوّل: ۱۹۳۶ء

۴۔ ''نقش ناہید'' (افسانے) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل: ۱۹۳۲ء

۵۔ ''مجنوں کے افسانے'' (افسانے۔انتخاب) — حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی — طبع اوّل: ۱۹۳۸ء

۶۔ ''سوگوارِ شباب'' (افسانے۔ترجمہ) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

۷۔ ''صیدِ زبوں'' (افسانے۔ترجمہ) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

۸۔ ''سرنوشت'' (افسانے) — ادارہ اشاعت اردو: — طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

۹۔ ''سراب'' (افسانے) — ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد، دکن — طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

۱۰۔ ''ببّیا اور دوسرے افسانے'' (افسانے) — حالی پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ — طبع اوّل: ۱۹۳۵ء

۱۱۔ ''سنگھاسن بتیسی'' (ہندی لوک کہانیاں) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

(یہ کتاب بعد میں مع فرہنگ، نول کشور، لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی)

۱۲۔ ''افسانہ'' اور اُس کی غایت (تنقید) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل: ۱۹۳۵ء

۱۳۔ ''اقبال'' اجمالی تبصرہ (تنقید/فلسفہ) — سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد — طبع اوّل: ۱۹۵۳ء

۱۴۔ ''تنقیدی حاشیے'' (تنقید) — ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد، دکن — طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

۱۵۔ ''تاریخ جمالیات'' (تنقید تاریخ) — انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی — طبع اوّل: ۱۹۵۹ء

۱۶۔ ''زہرِ عشق'' از نواب مرزا شوق (مرتبہ) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۱۷۔ ''سالومی'' از آسکر وائلڈ (ترجمہ/ڈرامہ) — کتابستان، الہ آباد — طبع اوّل: ۱۹۲۵ء

۱۸۔ ''شوپنہار'' (جرمن فلاسفر کی زندگی اور فلسفہ پر کتاب) — طبع اوّل: ۱۹۳۵ء

۱۹۔ ''گردش'' (ناولٹ) — کتب خانہ علم و ادب، دہلی — طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

۲۰۔ ''ادب اور زندگی'' (تنقید/فلسفہ) — ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اوّل:

ایک ایڈیشن مکتبہ دانیال، کراچی نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

۲۱۔ ''نقوش و افکار'' (تنقید) — صفیہ اکیڈمی، کراچی — طبع اوّل: ۱۹۶۶ء

۲۲۔ ''نکاتِ مجنوں'' (تنقید) — مکتبۂ عزم و عمل، کراچی — طبع اوّل: ۱۹۶۶ء

۲۳۔ ''شعر و غزل'' (تنقید) — ادبی اکیڈمی، کراچی — طبع اوّل:

۲۴۔ ''دوش و فردا'' (تنقید) — ادارۂ انیس اردو، الہ آباد — طبع اوّل: ۱۹۵۹ء

۲۵۔ 'غزل سرا' (تنقید) — مکتبہ جامعہ، نئی دہلی — طبع اوّل: ۱۹۶۴ء

۲۶۔ ''پردیسی کے خطوط'' (تنقید۔ دو جلدیں)	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۲۷۔ ''غالب: شخص اور شاعر'' (تنقید)	مکتبہ ارباب قلم، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۷۴ء
۲۸۔ ''مریم مجدلانی'' از مارس میٹرلنک (ترجمہ/ڈرامہ)	ایوان اشاعت، گورکھپور	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء سے قبل
۲۹۔ ''آغاز ہستی'' از برنارڈ شا (ترجمہ/ڈرامہ)	ایوان اشاعت، گورکھپور	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل
۳۰۔ ''ابوالخمر'' از ٹالسٹائی (ترجمہ)	یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل
۳۱۔ ''کنگ لیئر'' از ولیم شیکسپیئر (ترجمہ/ڈرامہ)	انڈین اکیڈمی، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۳۲۔ ''قابیل'' از لارڈ بائرن (ترجمہ)	ایوان اشاعت، گورکھپور	طبع اوّل: س۔ن
۳۳۔ ''شمسون مبارز'' از ملٹن (ترجمہ۔ رزمیہ)	ایوان اشاعت، گورکھپور	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل
۱۹۷۳ء میں ایک ایڈیشن انجمن ترقی اردو، کراچی نے بھی شائع کیا۔		
۳۴۔ ''حسن فطرت'' از عبرت گورکھپوری (تالیف)		
۳۵۔ ''ہندوستان کی بہادر عورتیں''		
۳۶۔ ''انتخاب دیوان شمس تبریز'' (ڈاکٹر نکلسن کی کتاب کی تلخیص)		طبع اوّل: ۱۹۳۸ء سے قبل

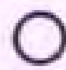
نظریۂ فن:

''میرے خیال میں فسانے کی اصل و غایت وہی ہے جو تمام فنون لطیفہ کی ہے، یعنی حقیقت کو مجاز کے پردے میں اس طرح پیش کرنا کہ دنیا اس حقیقت کو پا سکے اور اس کی متحمل ہو سکے۔ فسانہ نام ہے حقیقت کی تلاش کا اور شاعری اور تصوف کی طرح فسانہ کی اصلیت بھی وہی ہے جو بہتر فرقوں کی جنگ کی ہے۔ یعنی ''چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند''

فرق یہ ہے کہ یہ بہتر فرقے اس افسانے کو عین حقیقت سمجھتے ہیں اور ہم لوگ اس کو حقیقت کا ''نعم البدل'' جانتے ہیں۔''

مجنوں گورکھپوری

(دیباچہ ''سمن پوش'' طبع اوّل: ۱۹۳۴ء)



حوالہ جات:

۱۔ دستاویزی تاریخ پیدائش ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء ہے جو درست نہیں۔

سمن پوش

''شہید زخم شمشیر تغافل اجرہا دارد''

مجنوں گورکھپوری

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی۔ ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا، جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہوگئی تھی، اور بصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اس پیکر جمال میں محو ہو گیا جو صفحۂ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا، گویا وہ کہہ رہی تھی ''ٹھہرو! اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو۔'' اس کے رخسار گلابی تھے، بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم محویت سے چونکا۔ ایک لرزش خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ ناصری جو اپنا سامان نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا واپس آ گیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصر کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا۔ وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذب نظر صورت سامنے تھی، جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔

آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ کی طرف سے جا رہا تھا، یکا یک میرے قلب کی حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی۔ میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا، مجسمہ کے پاس بینچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کے گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا۔ جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی جانب بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا، باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا جسم کی ساخت نازک تھی، رنگ میں صباحت تھی، دوش تک وہ عریاں تھی، اس کی بلوری گردن دیکھنے والی کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے، اور وہ ان کو برابر کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ ارضی کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی، اس لیے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لیے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا، کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس نے مجھ کو مشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا، لہٰذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے ''نگار خانہ'' میں دیکھ آیا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا۔ صرف شاد کیشی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے ''سمن پوش نازنین'' کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیے، چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا، نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش، میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا، یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کیے ہوئے ارکسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی، وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کیے ہوئے بیٹھی ہے؟'' وہی جس کے گلے میں ہار ہے۔

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی اور سر ہلا کر جواب دیا ''نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے؟''

''بالکل سامنے۔'' میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا ''آرکسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے۔''

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا۔ ''خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''کوئی عورت نہیں!'' اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید مجھ کو مغالطہ ہوا'' اور فوراً بحث بدل دیا۔ جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔

جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی دردمند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی، آج اس کے سامان آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک خوبصورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ رہ رہ کر اسی پرحسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشا نہ ہونے دیتا تھا۔ جب تماشہ ختم ہوا اور سب چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ بھی اٹھی اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی، ہجوم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے'' کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سرِنو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا داہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔'' میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ ''لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لیے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو۔''

اسی کشمکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے، کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن ''سمن پوش'' اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اس کی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لیے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا اور دور تعطیل سے گزر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم و بیش ہر شخص کو گزرنا ہوتا ہے یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ ایس سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جب کہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر المناکیوں سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہر حال سائرہ کو میری طرف سے حسن ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحت ناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کر لیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

''جمال منزل'' واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی۔ جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا، جس نے ایسے دیہات میں اس ''فردوسی ارضی'' کو اپنے لیے تعمیر کرایا ہوگا۔ اس میں ذوق سلیم اور حسن لطیف کہاں تک رچا ہوگا۔ اس کے علاوہ 'جمال منزل'' سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لیے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور پھر بھی ان کو سیری نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شمیم نے کہا'' تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کیساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا، اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہو گے، اس کا نام ''جمال الدین'' تھا۔''

''جمال الدین'' میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈرامہ ''ہذیان محبت'' بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا۔'' آپ نے برا کیا۔ سہیل بھائی کے لیے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آرہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحت شب سے بھی محروم کر دیا۔''

''میں نے مسکرا کر کہا'' نہیں! نہیں! قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو گیا۔''

''میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ علم کیوں قتل کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور غالباً ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعریوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز نہیں۔''

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجے سے تمسخر و استہزاء پایا جاتا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔'' شمیم! تمہاری گفتگو نے تو مجھے بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی، یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے، جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارہ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے، تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو، بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کر کے کون سی نئی بات حاصل کی؟

آنچہ دل نام کردہ ای بہ مجاز
رو بہ پیش سگان کو انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور حیوانوں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے۔ اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلاف قلب (pericardium) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے، مگر تم کو کیا کہوں، بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہی خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے کارلائل نے اسی لیے ایسے لوگوں کا نام ''منطق تراش'' (logic Choppees) رکھا ہے۔ اسی لیے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقا کا سد باب ہو گیا۔ وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے۔

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، ورنہ آج میمتھ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو ''انسان'' کہلاتی ہے۔

میرے ہیجان کا دور شروع ہو گیا۔ میں انسان کا ''جہل مرکب'' نہیں برداشت کر سکتا یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لیے جہاں سوئی سے کام لینا چاہیے۔ وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں اور سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لیے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر ان کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں۔ اچھا اب بے کار بحث کو جانے دو ایک لطیفہ اور سنو گانے والوں میں مشہور ہے کہ ''جمال منزل'' روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی کیا تھا مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔''

میں نے اپنے دل میں کہا ''نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ۔'' شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے، انہوں نے کہا ''مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا۔''

''غلط خیال ہے۔'' میں نے جواب دیا میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہو گا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا۔''

رات زیادہ ہو چکی تھی ہم ایک دوسرے کو ''شب بخیر'' کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا۔ ''آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، دیکھیے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، آج کے مبحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا۔''

میں نے ہنس کر جواب دیا ''سائرہ، بچوں کی سی باتیں نہ کرو'' اور آ کر بستر پر لیٹ رہا، نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا، گرمی کی سہانی رت تھی، پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے میں اٹھ بیٹھا، شمیم نے کہا۔ ''ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں، یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے؟''

''کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کیے؟'' میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دیے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے ''تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ اچھا چلو ہوا کسل دور کردے گی۔''

''ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی'' یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہولیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا۔ قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علوئے تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ قرآئن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے وہاں کوئی نہیں، تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی ''سمن پوش'' یاد آ گئی تھوڑی دیر کے لیے میں پھر عالم خیال میں گم ہوگیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں'' میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا ''اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں۔'' میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں؟ جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے۔ لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرے ایماء پر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا اس لیے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا، اور زمانے کی رگڑ نے نقوش کو کافی منا رکھا تھا میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں۔ لیکن کچھ بس نہ چلا۔ شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا تا کہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا، آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز ''ناہید کا مزار'' رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا۔ جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم، فونوگراف، تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں، مگر یہاں اس کی کوشش کرنا ''بت پرستوں کے شہر میں نماز'' کے لیے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے۔ مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح پر نظرثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرہ سے سگرٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی ''سمن پوش'' اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا نہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

''تم یہاں کس لیے آئی ہو'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔ ''اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟''

اسی طرح اس نے پھر ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس لیے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔''

''کیا تم سکون سے محروم ہو؟''

''یک قلم۔'' یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

''اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ ''میرے لیے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لیے دعا نہیں کی۔ بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔'' اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

''تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا۔'' میں نے سوال کیا۔

اب ''سمن پوش'' قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا میں سمجھ گیا۔

''قتل؟'' میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

''کسی کو اس کا صحیح علم نہیں'' اس نے کہا ''آپ میرا پورا افسانہ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے۔''

''ہاں!......''

''تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟'' میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے، گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لیے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

''ذرا صبر کیجئے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں۔'' اس نے کہا ''میرا قاتل میرا شوہر ہے لیکن اس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا، جس کا مرتے دم اس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھئے، وہ مجھ کو پوجتا تھا......

آپ خاموش سنتے جایئے۔ میرے لیے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا، میرے دونوں جہاں تیری آنکھوں میں ہیں۔'' جمال منزل'' اس نے میرے لیے بنوائی تھی اور میں! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات سب اس کی تجلیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے طفیل ملی ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرض اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔''

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے، وہ دم لینے کے واسطے رک گئی، میں بے خودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

''میں پارسی تھی یعنی'' آتش پرست'' اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان شروع کر دیا'' اور ایکٹنگ میرا ذریعہ معاش لیکن اگر چہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا، مجھے کسی سے بھی انس نہ ہوا تھا۔ جمال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں پپیہے کی سی دلدوز تاثیر تھی، سوز و گداز اس کے خمیر میں

تھا۔ وہ سراپا تصویر درد تھا۔ میرا میلان ٹریجڈی کی طرف تھا اس لیے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا۔''

وہ پھر اس مرتبہ زبان تر کرنے کو رکی، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

''میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟'' اس نے نہ جانے کس حال سے پوچھا، اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔''

''بالکل نہیں! میں اس گھڑی کا مشتاق تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔'' اس نے مترحمانہ لہجہ میں کہا۔'' ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی۔''

''ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لحہ مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لیے وقف کر دی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہے۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا۔ میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ یکا یک زمانے نے ایسی گردش کی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے، بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی، تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شیدا مشہور تھا، ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں آ کر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی، اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھی مگر جمال اس کی ہولناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا، شاعر یا صناع انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں، اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا، اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لیے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا، رات کو آٹھ بجے جب کہ اس کی واپسی کا وقت تھا، میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے، بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی دفعتاً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''یہ روشنی کم کیوں کر دی؟'' میں سوال ختم کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مگر کم بخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لیے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی۔ اس کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ فیروز پھر میری سمت بڑھا لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے

جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروز کو گرفت سے چھڑایا تھا۔ جمال اف! اف! کرتا ہوا اپنے سٹڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوش غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی اس نے مجروح شیر کی طرح میرے کلائی پکڑ لی اور کہا ''دغا باز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔'' مجھ میں پندار ایسا تھا کہ ''دغا باز'' خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی بریت کے لیے ایک حرف بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے، اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لیے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ''تباہی کا شیطان'' فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا۔

ناہید کے آنسو گرنے لگے۔ میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا۔

''آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ ''اتھیلو'' کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گھنٹوں ''ڈسڈیمونا'' پر رشک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ کاش! مجھے اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا!''

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھی چلتے چلتے اس نے کہا ''ہاں ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے۔ مجھے مار کر اسے تسکین نہ ہوئی اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا۔

وفا آموختی از ما بکارِ دیگران کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگران کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے۔

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بخود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کا سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے

تو جا کر اس پیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا اور جو "اسٹڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے ممن مزار تک اس کو جاتے دیکھا، جہاں وہ نگاہ سے غائب ہوگئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا "اسٹڈیو" رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں سے ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کرسکتا ہوں اس لیے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھوگی۔

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی۔ لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لیے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا دعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے۔ کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطق اپنے اصول، موضوع اور علوم متعارفہ لیے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو مل، اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔

اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے، لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے، جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے، جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

(تکمیل ۱۹۲۶ء)



حوالہ جات

۱۔ یہ افسانہ "سمن پوش اور دوسرے افسانے" مطبوعہ: کتب داوب دہلی، طبع سوم: ۱۹۴۷ء میں کسی قدر عبارت کے فرق کے ساتھ ملتا ہے "نقوش" افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء کے لیے مجنوں نے ایک بار پھر نظر ثانی کی ہے۔

علی عباس حُسینی

نام	:	علی عباس حُسینی
قلمی نام	:	سر سید احمد پاشا/علی عباس حُسینی
پیدائش	:	۳فروری ۱۸۹۷ء بہ مقام موضع پارہ، ضلع غازی پور (یو۔پی) بھارت۔
وفات	:	۲۷ستمبر ۱۹۶۹ء
تعلیم	:	ایم۔اے (تاریخ) ۱۹۲۴ء

ابتدا میں مدرسہ سلمانیہ، پٹنہ سے عربی اور دینیات کی تعلیم پائی۔ مشن ہائی اسکول، الہ آباد سے میٹرک ۱۹۱۵ء اور انٹرمیڈیٹ ۱۹۱۷ء میں کیننگ کالج، لکھنؤ سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد ٹیچرز ٹریننگ کالج، الہ آباد سے ایل۔ٹی کیا اور ۱۹۲۴ء میں ایم۔اے (تاریخ) الہ آباد یونیورسٹی۔

مختصر حالات زندگی:

موضع پارہ، ضلع غازی پور (یو۔پی) کے سادات مولوی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سپہ سالار مسعود غازی الحسینی ترمذی کی نسل سے ہے، جنہوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں غازی پور بسایا۔ مدرسہ میں دینی تعلیم پانے کے ساتھ نماز، روزہ کی پابندی اختیار کی اور گھر والوں نے یہ دیکھ کر کہ ملائے مسجد بننے کی صلاحیت سے عاری ہیں، انہیں انگریزی پڑھنے کی اجازت دے دی۔ قصہ کہانیوں سے طبعی رغبت تھی چنانچہ دس گیارہ برس کے سن تک اردو میں ''الف لیلیٰ'' کے حافظ ہوگئے۔ سات بار فردوسی کا ''شاہنامہ'' پڑھا۔ اس زمانے میں عبدالحلیم شرر اور محمد علی طیب کا ادب میں طوطی بولتا تھا، حسینی نے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر ان دونوں کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ غرضیکہ عنفوان شباب سے پہلے اردو میں شائع ہونے والے جملہ ناول، مثنویاں اور واسوخت ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔

۱۹۱۷ء میں پہلا افسانہ ''غنچہٴ ناشگفتہ'' لکھا اور ۱۹۲۰ء میں ''سر سید احمد پاشا'' کے عنوان سے پہلا رومانی ناول مکمل کیا۔ ۱۹۲۱ء میں

ایل۔ٹی کرنے کے بعد سکول ٹیچر ہو گئے۔ بعدازاں گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنو میں ساری زندگی درس و تدریس میں گزار کر ۱۹۵۴ء میں پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ منروا مووی ٹون، بمبئی کے مالک معروف ہدایت کار سہراب مودی کے لیے فلم ''امیر تیمور'' لکھی، لیکن یہ فلم نہ بن سکی۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''جذب کامل'' مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور: ستمبر ۱۹۲۵ء

۲۔ ''پژمردہ کلیاں'' مطبوعہ: ''زمانہ'' کانپور: دسمبر ۱۹۲۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱ ''سر سید احمد پاشا'' عرف ''قاف کی پری'' (رومانی ناول) بہار گو بک ڈپو، لکھنؤ طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

۲ ''رفیق تنہائی'' (افسانے) مکتبہ اردو، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۴۲ء

''رفیق تنہائی'' کے عنوان سے ایک مجموعہ نیا ادارہ، لاہور نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ کل صفحات ۲۶۴ ہیں۔ دوسرا ایڈیشن نیا ادارہ، لاہور نے شائع کیا ہے۔

۳ ''باسی پھول'' (چودہ افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۳۹ء

یہ کتاب چودھری اکیڈمی، لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ تیسری بار یہ کتاب سلیم برادرز رابندر اسرانی، کلکتہ نے ۱۹۷۸ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں ''باسی پھول'' (۱۹۲۸ء)، ''باسی پھول'' (۱۹۳۰ء)، ''گونگا ہری'' (۱۹۳۴ء)، ''بیوی'' (۱۹۲۹ء)، ''نئی ہمسائی'' (۱۹۳۳ء)، ''عدیا تنبولن'' (۱۹۳۲ء)، ''کیے کا بھوگ'' (۱۹۲۹ء)، ''عدالت'' (۱۹۲۹ء)، ''آم کا پھل'' (۱۹۲۹ء)، ''امتحان قدرت'' (۱۹۳۰ء)، ''شکاریا شکاری'' (۱۹۳۸ء)، ''خوش قسمت لڑکا'' (۱۹۳۹ء)، ''حق نمک'' (۱۹۳۹ء) اور ''کیا کیا جائے'' (۱۹۳۸ء) کل چودہ افسانے ہیں۔

۴ ''کانٹوں میں پھول'' (افسانے) اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی

۵ ''میلہ گھومنی'' (افسانے) نیا ادارہ، سرکلر روڈ، لاہور طبع دوم:

یہ کتاب پہلی بار مکتبہ اردو، لاہور، نے شائع کی تھی

۶	''ایک ایکٹ کے ڈرامے'' (ڈرامے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۷	''عروسِ ادب'' (تنقید)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل
۸	''ندیا کنارے'' (افسانے)	پبلی کیشنز ڈویژن منسٹری براڈ کاسٹنگ اینڈ انفارمیشن، دہلی	طبع اول: ۱۹۶۴ء
۹	''ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے'' (۱۰ افسانے)	اورینٹل پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۵۶ء
۱۰	''حکیم بانماز'' (مزاحیہ قصے)	مبارک بک ڈپو، کراچی	طبع اول:
۱۱	''شاید کہ بہار آئی'' (ناول)	اُردو کتاب گھر، کراچی	طبع اول:
۱۲	''آئی۔سی۔ایس اور دوسرے افسانے'' (چودہ افسانے)	انڈین پریس، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۴۰ء

اس کتاب میں ''آئی سی ایس''، ''شیخو چچا''، ''دو شریفوں کا مقابلہ''، ''ملک خدا تنگ نیست''، ''بیلوں کی جوڑی''، ''قانون باطن''، ''بختیارک کا نسخہ''، ''شیخ کریم کی نفرت''، ''سماج کی بھینٹ''، ''شریف مزدور''، ''دل کی آگ'' اور ''پیاسی جوگن'' کل چودہ افسانے ہیں۔

۱۳	''یہ کچھ ہنسی نہیں ہے'' (افسانے)	انڈین پریس، الہ آباد	طبع اول:
۱۴	''الجھے دھاگے'' (افسانے)		
۱۵	''نورتن'' (ڈرامہ)		
۱۶	''ناول کی تاریخ وتنقید'' (تنقید)		
۱۷	''کومل نگری'' (ہندی)		
۱۸	''پھولوں کی چھڑی'' (ہندی)		
۱۹	''گائے اماں'' (ہندی)		
۲۰	''ایک حمام میں'' (افسانے)		
۲۱	''سیلاب کی راتیں'' (افسانے)		

اس کے علاوہ سکول کے مختلف درجوں کے لیے نصف درجن سے زائد نصابی کتب۔

نظریہ فن:

''اگر انسانیت کی تبلیغ ترقی پسندی ہے تو میں یقیناً ترقی پسند ہوں۔ اگر اس کے معنی مارکس کے فلسفے کو الہامی سمجھنا ہے تو میں یقینی ترقی پسند نہیں ہوں۔ حقیقت یہ کہ میں مشکک ہوں..... میں آرٹسٹ کا کام، مصوری اور دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ دینا سمجھتا ہوں۔ نظریات کا پرچار مبلغ کا کام ہے اور ان کو عملی جامہ دینا مقنن کا۔''

علی عباس حسینی

''میرا بہترین افسانہ'' مرتبہ: محمد حسن عسکری سے اقتباس

''میں نے اِس فن (افسانہ) کے متعلق جو کچھ سیکھا ہے وہ انگریزی ادب کا عطیہ ہے یا اُن یورپی زبانوں کے ترجموں کا، جو انگریزی میں ہیں۔''

علی عباس حسینی (۶ جون ۱۹۶۴ء، لکھنؤ)

''متاعِ ادب'' مرتبہ: اظہر زیدی، مطبوعہ: مکتبہ میری لائبریری
لاہور، طبع اوّل: ۱۹۶۵ء

میلہ گھومنی

علی عباس حسینی

کانوں کی سنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعے کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے چنو، منو نام۔ کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھی اور ددیہال سید واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے اور نتیجے میں ہاتھ آئے، چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑے اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو، لاابالی تھا۔ اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا کرتا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول میں ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کے کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر کے باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی اور ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ جب وہ گھونگھٹ لگائے لجاتی، سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا اس لڑکے کو روکو۔ ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔ اس نے آہستہ سے کہا:

''تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجیے۔''

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ نئی قسم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے صورت شکل دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی اس درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلے سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے سادہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا:

''اچھا گھر میں رہو اور کام کرو، دو چار دن میں تمہارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔''

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف طبیعت بھی تھے، اس کی تعریف یوں بیان کی:

''راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔''

ایک صاحب نے پوچھا: ''اور اس کے بعد؟''

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے: ''خدا جانے شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔''

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں، وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاءاللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں، کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر انہوں نے اسے نادر شاہی حکم دیا کہ

''ہم نے منو کی نسبت طے کر دی، اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہو گا۔''

بیچاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ بہت اچھا کہہ کر ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی، اس لیے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشی اسی میں ہے، اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانہ انہیں کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہیں کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی خود انہیں کے ہیں۔ غرض گھر آئی اور رات ہی میں منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی کے گھر، بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے

زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے، دن بیتتے گئے۔ مہینے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے...... کہ دفعتاً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہوا، اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی۔ جولاہن سوائے ''ماتا'' کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دیا ''آج سے یہیں رہو، گھر جانے کی ضرورت نہیں۔''

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے، اس لیے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے، اور یہاں تک کہہ دیا کہ ''اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا'' ساتھ ہی پارسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ ''اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ اٹھوا پھینکوں گا۔'' غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی اور تاڑی بند ہو گئی...... نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد، سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں اور بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔ لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انہوں نے کلمہ بہ کلمہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو ہاتھا پائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا...... اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگی اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ تھا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اسی طوفان میں طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا، ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد بیان ہوئے، تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔ وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے

ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی ریتک ایک وکیل کی طرح بحث کرتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں: ''چل بے، گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے، میں خوش میرا خدا خوش۔'' چنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور اپنے چاروں بچوں سمیت اس گھر میں منتقل ہو گیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو بیتے، تین بیتے، مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر اچک گئی۔ اکڑنا، بررنا، تن کے چلنا، سب چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہم سن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، ان کو دکھایا۔ انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا۔ بی چینا بیگم مانگتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی اور یہ چیزیں چار روپے میں کہاں نصیب۔ وہ لگا کھیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور پیسے مانگنے۔ مگر اس پر جو کچھ ملتا بھاویں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے والے تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ فوراً اٹھ کر گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر پڑا۔ اسی کے سر پر بجلی گری، منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا بے ساختہ ''ارے ماں، ارے ماں'' چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا اکڑ کا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بجری کے نیچے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑ کنے لگا۔ بیوی: ''ارے کیا ہو گیا لوگو'' کہتی ہوئی دوڑی۔ چنوں نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

''اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟'' اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی۔



محمد مجیب

نام : محمد مجیب
قلمی نام : محمد مجیب/ پروفیسر محمد مجیب
پیدائش : ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء بہ مقام لکھنؤ، بھارت
وفات : ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء بہ مقام دہلی، بھارت
تعلیم : بی۔اے (آنرز تاریخ) آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۹۲۲ء

مکتب کی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد انہیں لوریٹو کانونٹ، لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد اسلامیہ ہائی سکول، لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ دہرہ دون کانونٹ سے سینئر کیمبرج (۱۹۱۸ء) کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے، آکسفرڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں وہاں سے بی اے (آنرز تاریخ۔عہد جدید) کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد طباعت میں ٹریننگ کے لیے برلن (جرمنی) چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۲۶ء میں واپسی ہوئی۔

مختصر حالات زندگی:

محمد مجیب چاندی کا نہیں مُونہہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد نسیم ایڈووکیٹ، لکھنؤ میں اپنے زمانے کے کامیاب ترین دیوانی وکیل تھے۔ محمد مجیب نے اپنے دور کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں تعلیم مکمل کی۔ بی۔اے (آنرز) آکسفرڈ سے کرنے کے بعد برلن (جرمنی) سے طباعت میں ڈپلوما لیا۔ جنوری ۱۹۲۶ میں بحری جہاز کے ذریعے ڈاکٹر ذاکر اور ڈاکٹر عابد حسین کی ہمراہی میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے اور براستہ کولمبو (سیلون) فروری ۱۹۲۶ء میں دہلی پہنچ کر بطور لیکچرر (تاریخ) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تدریسی عملے میں شامل ہو گئے۔ تین سو روپے مشاہرہ مقرر ہوا لیکن آپ نے صرف بیس روپے ماہانہ لینا منظور کیا۔ (۱) جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کشتی ۱۹۴۷ء

تک ڈانواں ڈول رہی اور دیگر اساتذہ کی طرح مجیب صاحب کو بھی کئی کئی ماہ تنخواہ نہ ملی، عندالضرورت خازن سے پانچ دس روپے لے کر گزارا کرتے رہے جب کہ مجیب صاحب کی لیاقت کے لوگ اس دور میں بھی ہزاروں طلب کرتے تھے۔ مجیب صاحب ادبیات، سیاسیات اور تاریخ کے شعبہ جات میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہیں فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں سے بھی ماہرانہ شغف تھا۔ ڈیزائن، فن تعمیر اور مجسمہ سازی (۲) میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد دکن کے پروفیسر وہاج الدین کا ڈراما ''نکاح بالجبر'' مجیب صاحب کی ہدایت کاری میں جامعہ کی سٹیج پر پیش کیا گیا، جس میں جوتشی کا کردار خود انہوں نے ادا کیا۔ اسی سال جامعہ ملیہ کی مالی حالت کے پیش نظر ''امنائے جامعہ'' کی جگہ ''انجمن تعلیم ملی'' قائم ہوئی جس کے مجیب صاحب سمیت گیارہ اراکین نے عہد کیا کہ وہ کم از کم بیس برس تک یا تاحیات جامعہ کی خدمت کریں گے اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں گے۔

۱۹۲۹ء کے آغاز میں ان کی شادی سندیلہ (یو۔پی) کے ایک معزز خاندان میں آصفہ خاتون سے ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں مجیب صاحب کا پہلا ڈراما ''کھیتی'' خود مصنف کی ہدایت کاری میں جامعہ کی سٹیج پر کھیلا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں جامعہ کے اولین خازن سیٹھ جمنالال بجاج کی جگہ مجیب صاحب کو خازن مقرر کیا گیا اور یہ اعزازی خدمت ۱۹۴۷ء تک انجام دی۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں ان کا نام ماہنامہ ''جامعہ'' دہلی کے ادارہ تحریر میں شامل کیا گیا اور اسی ماہ ان کا دوسرا ڈراما ''انجام'' نہ صرف جامعہ دہلی میں شائع ہوا بلکہ عید کے موقع پر (تقریباً وسط جنوری) حسب معمول مصنف کی ہدایت کاری میں سٹیج ہوا۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں مجیب صاحب نے خالدہ ادیب خانم کے دورۂ ہندوستان میں ان کی راہنمائی کی۔ ۱۹۳۸ء میں نائب شیخ الجامعہ تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں جامعہ ملیہ کے یوم تاسیس کے موقع پر ''ایران کے دربار میں عرب کے سفیر'' اور ''نکاح بالجبر'' (دو ڈرامے) مجیب صاحب (نائب شیخ الجامعہ) کی ہدایت کاری میں جامعہ کی اسٹیج پر کھیلے گئے۔ جب کہ ''نکاح بالجبر'' میں انہوں نے ملازم کا کردار بھی ادا کیا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۴۶ء میں جوبلی کی چہار روزہ تقریبات (۱۵ تا ۱۸ نومبر) کے موقع پر مجیب صاحب کا تیسرا ڈراما ''خانہ جنگی'' خود ان کی ہدایت کاری میں اسٹیج ہوا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی چلے جانے پر مجیب صاحب نے جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے چارج لیا۔ ۱۹۴۹ء میں حکومت ہند کے ایک وفد کے ساتھ یو این او جنرل اسمبلی میں شرکت کی۔ ۱۹۵۱ء میں انڈو چائنا فرینڈ شپ کمیٹی کے تحت چین کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں جنیوا اور پیرس گئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونسکو کے اجلاس میں شرکت کی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء میں یوگوسلاویہ کا دورہ کیا۔ مئی ۱۹۵۵ء میں مرکزی دینی تعلیمی بورڈ جمعیت علمائے ہند کے شریک معتمد امور تعلیمی و انتظامی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں تعلیمی نظام کے مطالعے کے لیے روس تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں میکگل یونیورسٹی مانٹریال، کینیڈا میں بطور وزیٹنگ پروفیسر چلے گئے۔ جہاں سے فروری ۱۹۶۲ء میں واپسی ہوئی۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں حکومت ترکیہ کی دعوت پر انقرہ اور استنبول یونیورسٹی میں لیکچرز دیئے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۷ء میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، لندن یونیورسٹی کے زیر اہتمام (۱۷ تا ۲۲ جولائی) بین الاقوامی سیمینار میں تقسیم ہند کے موضوع پر مقالہ پڑھنے لندن تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی کے پہلے وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں غالب لیکچرز کے سلسلے میں امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور ترکی سے ہو کر واپس آئے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ایم۔اے (تاریخ) کے طلبہ و طالبات کے ساتھ قطب مینار گئے جہاں محسوس ہوا کہ ان کی یادداشت کام نہیں کر رہی، فوراً دماغی ماہرین سے رابطہ قائم کیا گیا تو پتا چلا کہ دماغ میں ایک جگہ رکاوٹ ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ان کا دماغی آپریشن کر کے وہ حصہ کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ تقریباً چار ماہ کی علالت کے بعد ۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو بہ حیثیت شیخ الجامعہ دوبارہ کام شروع کر دیا جہاں سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو چھیالیس برس کی خدمت گزاری کے بعد جامعہ سے ریٹائر

ہو گئے اور ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء کی رات طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''باغی'' مطبوعہ: ''جامعہ'' دہلی، فروری ۱۹۲۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''کیمیاگر اور دوسرے افسانے'' (نو افسانے) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۲ء
دوسری بار ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں نکلا۔

۲۔ ''کھیتی'' (ڈراما) مکتبہ جامعہ، دہلی، طبع اوّل: ۱۹۳۱ء
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ نے ۱۹۳۸ء میں اور آخری ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں نکلا۔

۳۔ ''انجام'' (ڈراما) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۴ء
یہ ڈراما اردو مرکز لاہور نے بھی شائع کیا۔

۴۔ ''تاریخ فلسفہ سیاست'' ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد طبع اوّل: ۱۹۳۶ء

۵۔ ''تاریخ ہندوستان کی تمہید'' (توسیعی خطبہ) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

۶۔ ''دنیا کی کہانی'' (ریڈیائی تقاریر) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: جون ۱۹۳۷
دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

۷ ''سلطان محمود غزنوی'' (تاریخ) ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۸۔ ''روسی ادب'' (دو جلدیں) انجمن ترقی اردو، (ہند) دہلی طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۹۔ ''خانہ جنگی'' (ڈراما) کل صفحات ۸۸۔ مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۴۶ء
دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۷۸ء میں نکلا۔

۱۰۔ ''شیدلا اور دوسری کہانیاں'' (بچوں کے لیے) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۴۸ء

۱۱۔ ''جبہ خاتون'' (ڈراما) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: اپریل ۱۹۵۲

۱۲۔ ''ہیروئن کی تلاش'' (ڈراما) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: اکتوبر ۱۹۵۳

۱۳۔ ''دوسری شام'' (ڈراما) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: اکتوبر ۱۹۵۶

۱۴۔ ''آزمائش'' (ڈراما) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: جولائی ۱۹۵۷

۱۵۔ ''تاریخ تمدنِ ہند'' (عہد قدیم) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۵۱ء

۱۶۔ ''ہماری آزادی'' (از مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ) طبع اوّل: جنوری ۱۹۵۹

یہ ''انڈیا ونز فریڈم'' کا ترجمہ ہے۔

۱۷۔ ''استاد بننے کا مزہ'' (ترجمہ) طبع اوّل: نومبر ۱۹۶۵

۱۸۔ ''آؤ ڈراما کریں'' (بچوں کے لیے) طبع اوّل:

۱۹۔ ''دیوانِ غالب'' (مرتبہ) طبع اوّل: لگ بھگ ۱۹۳۴ء

اس کتاب کی بیشتر کمپوزنگ ٹائپ خود مجیب صاحب نے کی تھی۔

۲۰۔ ''نگارشاتِ انشاء'' (مرتبہ) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اوّل:

۲۱۔ "Yugoslavia-A Birds eye View"

۲۲۔ "Ordeal: 1857 (a historical play)" Jan, 1958

۲۳۔ "World History-Our Heritage." April 1960

۲۴۔ "Education and Traditional Values." Dec. 1965

۲۵۔ "The Meaning of Indian History." (Basu Memorial Leacture)

۲۶۔ "Social Reforms among Indian Muslims" (Evelyn Hersey Memorial Leacture) April 1968

۲۷۔ "The Indian Muslims" 1967 (London)

۲۸۔ "Ghailb" 1969

۲۹۔ "Akbar" Feb. 1969

۳۰۔ "Mirza Ghalib" Dec. 1970

۳۱۔ "Islamic Influence of Indian Society" 1972

۳۲۔ "Dr.Zrkir Husain": A Biography. March 1972

زندگی میں مستقل پتا:

جامعہ نگر، دہلی۔ بھارت

اعزاز:

۱۔ پدم بھوشن، حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۶۵ء

نظریۂ فن:

''دنیا، جس میں پاک دامنی، ترغیب گناہ کی قید میں ہے اور کفارۂ گناہ، اشارہ چشم و ابرو کا منتظر......''

(بہ حوالہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی کا ایک نشریہ اکتوبر ۱۹۵۹ء)



حوالہ جات:

۱۔ بہ حوالہ: ''مجیب صاحب'' از مالک رام، مطبوعہ: ''ہماری زبان'' دہلی، یکم نومبر ۱۹۸۴ء

۲۔ غالب صدی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں مجیب صاحب نے غالب کا جو لکڑی کا مجسمہ تراشا تھا، وہ آج بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

کیمیا گر

محمد مجیب

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک ان کی حکومت کسی قدر مستحکم ہوگئی تھی۔ مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے چند حملے کیے تھے۔ ہندو تصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی اور اس بے چینی کو دور کرنے کے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حاوی ہو جانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اس کا گھر سب کا گھر ہے۔ اس کا نیا دین، دُنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح، ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی انہیں حکم ملا کہ جونپور کی طرف کچھ اور نو وارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا نام خالد پور رکھا گیا تھا، مسلمان آبادی کی بنیادیں ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے۔ رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آ گئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی۔ حکیم مسیح نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہو گئے اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرادی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں۔ وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار تھے۔ تجربہ نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دیئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا۔ ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح باوجود اپنی دلیری اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی، کچھ ہندوستان کی فضا۔ مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو اپنے جیسا آدمی سمجھتے تھے، نہ ہندوستان کو اپنے جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کی سسرال کا تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کیے نہیں برخاست کرتے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو ان کی اس قدر عزت، ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن ان لوگوں کے تعصب کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسے کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لیے طبیعت میں وہ سکون پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گزرتے گئے حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آ سکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور ان کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔ ''کاش! مجھے ایک ایسا کیمیا گر ملتا'' انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا ''جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا؟''

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا:

''جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیا گر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادر مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔'' حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی ان کی مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لیے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہیے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے۔ تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئی اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا تمام نوکر بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہے۔ پہلے تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار بنا ہے مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہی کا ماتم ہو رہا ہے۔ ان کی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود ہی رونا دھونا شروع نہیں کر دیا تھا بلکہ تمام محلّہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی۔ اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان کے خسر اور سالے آ گئے اور انہیں گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اس قدر گھبرائے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے اور قبل اس کے حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور خدا اور رسولؐ اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں ان

کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ یہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنی چاہیے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے سوچ رکھیں تھیں ان سے کام لینا چاہا مگر ان کے خسر اور سالے نے ان کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اٹھے:

''ارے وہ بے چارہ تو کچھ کہتا ہی نہیں۔ وہ خود جانے پر تیار ہے۔''

حکیم مسیح پھر کچھ عذر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں ''آپ لوگوں کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہو گا جب یہ خود اپنی زبان سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے'' ''چلیں گے، کیوں نہیں'' حکیم مسیح کے سالے نے کہا ''تم سامان تیار کراؤ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے۔''

یہ کہہ کر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قائل کرنے کے لیے بہت سے مسلمان ہمسایہ موجود تھے، بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر ان کا زندہ رہنا دشوار ہوتا، یہ لوگ بھی کبھی باری باری سے، کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے مگر حکیم مسیح نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ ان کا خالد پور کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے جانا، ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالد پور میں ایک مسلمان باقی نہ رہا ہو گا، ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہو گئے ہوں گے۔ وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائے گا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور ان کے جنازہ کی نماز تک پڑھنے کے لیے کوئی مسلمان نہ ہو گا۔ خالد پور چھوڑنا ان کے لیے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ایسی زندگی برداشت کرنا کسی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انہیں مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے فرائض سے جلد سبکدوش کیا جائے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

ان کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منا لیں گے لیکن بدقسمتی سے ان کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گزشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر ان کا تصور قابو سے نکل گیا اور ہر لمحہ ایک نیا صدمہ پہنچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کے دروازہ کی کھڑکی کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ کوئی بچہ رویا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے خالد پور میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لیے تڑپ رہے ہوں گے۔ کتنی مائیں اس وقت ہاتھ مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح چلے نہ گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کی آنکھوں میں بارہا آنسو بھر آئے۔ سر چکر کھانے لگا لیکن واپس جانے کی ہمت انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلہ نے خالد پور سے کوئی دس میل پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہو گی اور ہوا بھی یہی کچھ۔ کچھ دیر تک تو ان پر ایک غفلت سی طاری رہی جس سے ان کی تکان جاتی رہی لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے، کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے۔ جس کی تہ میں خوفناک تاریکی کے سوا

کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں ان کو خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں۔ ایک تیز آندھی جس میں ان کا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اڑا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک لمبی پتلی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لیے منڈیر پر بیٹھا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گئے مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اسے اس جگہ سے نہ ہلا سکے۔ واپس جانے پر وہ تیار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مردہ لے جانا بھی مشکل ہوگا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لیے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ مڑتے وقت ان کی نظر پھر اس مسافر پر پڑی وہ منڈیر پر بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کر لیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کاریگر کا تھا یعنی نیچے ایک موٹے سوت کی دھوتی، اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی اور سر پر ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا۔ سینہ چوڑا، پٹھے تنے اور ابھرے ہوئے، جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولاد کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال، اونچی پتلی ناک، چوڑی پیشانی، چہرہ کا نمایاں سکون، سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اس کا جسم آہنی ہے مگر آنکھوں کو دیکھتے ہی سارا طلسم ٹوٹ جاتا اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی، محبت اور ایثار تھا۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا۔ وہ جواب میں مسکرا دیئے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انہوں نے پوچھا: ''اے آہنی جسم کے مسافر! تو کہاں جا رہا ہے؟''

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا، پھر ان سے آنکھ لڑا کر کچھ مایوسی کے لہجہ میں کہا ''خالد پور!''

''مگر وہاں تو طاعون ہے۔''

''وہاں میں اسی لیے جا رہا ہوں۔''

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی اور انہیں اسی خوبصورت مردانہ جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:

''اے مسافر! کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟''

''مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ہمیشہ رہے گی۔'' مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا ''جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی خدا کو عزیز ہوگی، اگر میں نے اس کی راہ میں قربان کر دی۔''

حکیم مسیح پھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول پکا ہے۔ انہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادہ پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ دنیا میں اکیلا ہو اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لیے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

''اے مسافر! کیا دنیا میں تیرے ساتھ محبت کرنے والا کوئی نہیں؟''

''محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کسی بھلائی سے نہیں روک سکتی۔'' آخری جملہ حکیم مسیح کے سینہ میں تیر کی طرح لگا اور وہ بے تاب ہو گئے۔

''اے مسافر! تو آخر کہاں سے آیا ہے؟'' انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں خدا کا بندہ ہوں، کسی ملک کا باشندہ نہیں۔'' مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، ''جس ملک میں میرا خدا مجھے پہنچا دے وہی میرا وطن ہے، اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔''

''لیکن تیرا مکان تو ضرور ہوگا؟''

''دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی، بچے کچھ نہیں...... میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں جہاں نیند آئی وہیں سو جاتا ہوں۔''

مگر مسافر تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟''

''عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میری اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں، ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر، میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں ......''

''مگر مسافر طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟'' حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو تیار تھے اور بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔''

''محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔''

''حکیم مسیح!'' مسافر اچانک بول اٹھا: ''مسلمان کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں۔ مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ، خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو، تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔''

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیہ بھیگ گیا تھا لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی انہوں نے ''یا رسول اللہ'' کا نعرہ مارا۔ پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دیے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سن کر خالد پور کی آبادی میں ادھم مچ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہ رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آ گئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی وہ اپنا دل مضبوط کر کے ان کے مطب میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی تھیں۔ مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوا لی۔

ادھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس

نے رات کے تیسرے پہر ''یارسول'' کا ایک نعرہ سنا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لیے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔ مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی، اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:

''لالہ سیتارام کی بیوی بیمار ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لیے کوئی نہیں۔ اگر وہاں چلی جائیں ......''

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام ونشان نہ تھا، آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتارام کے گھر پہنچ گئیں......

خالد پور میں دو ماہ تک طاعون کا دورہ رہا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی تدبیر کوئی نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جس کو وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور ان کے لیے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کو تسکین دلانے کے لیے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں لیکن اس کام کے لیے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو ان کی بیوی کی اور ان کی بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاقات کے لیے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی مگر ان کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ مایوسی، خودغرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکا۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہوئے، کام کم ہوا فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لیے آتے تھے۔ ماہرین فن قدر دانی اور ہمت افزائی کے لیے، مظلوم شکایات کے لیے اور جھگڑالو انصاف کے لیے، ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ

ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔ ان کے لیے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے، گھر کا سامان، کپڑے، جواہرات ایسے جو بادشاہوں اور امیروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے مگر حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اسی محبت سے دوسروں کو دے دیتے تھے جس سے وہ ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور ان کی بیوی کو علم نہ ہو اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا دھندلا عکس ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے، خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی اس لیے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چندہ جمع کر کے ایک عالی شان عمارت بنائی جائے لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ کرنے کے لیے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے۔ اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ کبھی دو، کبھی ساری رات گزارتے تھے ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس خلوص سے ان کے چہرہ پر ایسی رونق آ گئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے، اس بیچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے مسافر کی طرح ہو حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت کو دوگونہ کرے، ان کے فرائض یاد دلاتی رہے اور انہیں ادا کرنے کی قوت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی۔ حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا۔

''تم کو شاید یاد ہو، میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیا گر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے، اس قوم میں مجھے کھپا دے۔ دیکھو اس کیمیا گر نے ہم دونوں کو کیا کیا سے بنا دیا۔''

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بی بی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما، ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دونوں اپنے کیمیا گر کے تصور میں محو ہو گئے۔

○

اوپندر ناتھ اشک

نام : مادھورام

قلمی نام : شناور، اوپندر ناتھ اشک

پیدائش : ۱۴دسمبر ۱۹۱۰ء بہ مقام جالندھر، مشرقی پنجاب، بھارت

وفات : ۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء

تعلیم : بی۔اے، ایل ایل بی

دیانند اینگلو سنسکرت ہائی سکول، جالندھر (نزد قلعہ محلّہ) کی پرائمری برانچ سے چوتھے درجے تک تعلیم پائی اور اس کے بعد ہائی سکول برانچ میں منتقل ہو گئے۔ بی۔اے، ڈی۔اے۔وی کالج جالندھر سے ۱۹۳۱ء میں اور ایل ایل بی۔ پنجاب یونیورسٹی لاء کالج، لاہور سے ۱۹۳۶ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

اشک کے والد شمال مغربی ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے، جنہیں شراب پینے اور گھر سے بے پروا رہنے کی عادت تھی اور ماں بسنتی دیوی، برہمنوں کے مشر گھرانے کی دھرم پرائن، نیک سیرت، پاک طینت عورت۔ گھریلو حالات اکثر خراب ہی رہے اور اشک چھوٹی عمر میں ہی روزی کمانے لگانے۔ آٹھویں درجے میں تھے جب پنجابی شاعری کا آغاز کیا۔ ملکھی رام اور ٹی سی گجراتی کے انداز میں پنجابی بیت کہے اور پھر یکلخت اردو کی طرف آ گئے۔ جالندھر کے استاد آذر کی شاگردی قبول کی اور اُردو غزلوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ۱۹۲۶ء میں استاد آذر جالندھری کی تنگ دلی سے ناراض ہو کر افسانہ نگاری شروع کی۔

۱۹۳۲ء میں دیانند اینگلو سنسکرت سکول جالندھر میں مدرس ہو گئے لیکن جلد ہی لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور میں حصول رزق کے لیے اشک نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے اور سیلز ایجنٹ اور پبلشر کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں فلمی دنیا میں گئے تو بہ حیثیت مکالمہ نویس، کہانی کار، گیت

کار اور اداکار، غرضیکہ سب کچھ کیا۔ پہلی شادی شیلا سے ہوئی، ان دنوں اشک ''ویر بھارت'' کے سب ایڈیٹر تھے۔ اس کے بعد اخبار ''بندے ماترم'' میں بطور سب ایڈیٹر چلے گئے۔ شیلا ٹی۔ بی کی مریضہ تھی اور گھر کا خرچ پورا نہ ہوتا تھا۔ یوں اشک نے مختلف قلمی ناموں سے Ghost Writing کی۔ ان کے لکھے ہوئے ہدایت نامے لاکھوں کی تعداد میں بکے لیکن اشک کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شیلا کا علاج گلاب دیوی (ٹی۔ بی) ہسپتال، لاہور سے جاری تھا اور اشک نے منشاء خداوندی کے خلاف جدوجہد کو انتہا تک پہنچا رکھا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے سیشن جج بننے کی ٹھانی اور یونیورسٹی لاء کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۳۷ء میں شیلا چل بسیں اور اشک ایل ایل بی کر گئے۔ اشک نے شیلا کے سورگ باش ہنے کے بعد چار برس تک شادی نہ کی۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں پریت نگر چلے گئے جہاں دو برس ''پریت لڑی'' کے ہندی/ اردو ایڈیشنوں کی ادارت کی۔ فروری ۱۹۴۱ء میں دوسری اور ستمبر ۱۹۴۱ء میں تیسری شادی کی۔ (تیسری بیوی کوشلیا ہندی اور اردو کی نمایاں افسانہ نگار تھیں) ۱۹۴۱ء میں اشک آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے منسلک ہو گئے جہاں تادیر رہے۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔

اشک نے اپنی جوانی لاہور، دہلی اور بمبئی میں گزاری۔ وہ حد درجہ اناپسند اور ضدی مشہور تھے۔ لڑکپن سے بڑھاپے تک مہینوں نہیں برسوں پیچش، سنگرنی، ملیریا، قولنج، دق، ای اوسنوفیلیا، اکیوٹ گیسٹرائٹس، کینسر اور دمہ کے مریض ہونے کے باوجود عجب شان سے زندہ رہے۔ ۱۹۷۶ء سے الہ آباد ریڈیو کے اعزازی پروڈیوسر ہونے کے علاوہ بیس برس تک تصنیف و تالیف کو ذریعہ روزگار بنائے رکھا۔ ۱۹۴۷ء سے اردو کی نسبت ہندی میں زیادہ لکھا، ہندی میں لگ بھگ پینسٹھ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک پنجابی افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ناول ''گرتی دیواریں'' بلاشبہ دنیا کا ضخیم ترین ناول ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''ودھوا کے جذبات'' مطبوعہ روزنامہ ''پرتاب'' لاہور، (سنڈے ایڈیشن) ۱۱ مارچ ۱۹۲۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب) افسانے

۱۔ ''نورتن''۔ جالندھر: شام کنیا بک ڈپو: ۱۹۳۰ء۔ ص ۹۳

مندرجہ جات: (۱) دیباچہ نظم میں: قیس جالندھری۔ ص ج (۲) طالب امن۔ ص ۳-۱۴، (۳) وہ رو رہی تھی۔ ص ۱۵-۱۴ (۴) اتنے نزدیک۔ ص ۴۲-۴۳۔ (۵) شکستلا ص ۶۵-۸۲۔ (۶) انتقام۔ ص ۸۳-۹۳

۲۔ ''عورت کی فطرت'' لاہور، چمن بک اسٹال: ۱۹۳۳ء، ۲۰۹ ص

مندرجات: (۱) تعارف پریم چند۔ ص ۷-۸ (۲) تقریب: ہری چند اختر۔ ص ۱۱-۱۶، (۳) عورت کی فطرت۔ ص ۱۷-۳۸ (۴) نئی زندگی۔ ص ۳۹-۵۸۔ (۵) تانگہ والا۔ ص ۵۹-۸۰ (۶) ناکام رقاصہ۔ ص ۸۱-۹۶ (۷) جاہل بیوی۔ ص ۹۷-۱۱۴ (۸) گودڑ کا لعل۔ ص ۱۱۵-۱۳۰ (۹) ایردما۔ ص ۱۳۱-۱۵۰ (۱۰) بہشتی کی بیوی۔ ص ۱۵۱-۱۷۲ (۱۱) کفارہ۔ ص ۱۷۳-۲۰۹

۳۔ ''ڈاچی''۔ لاہور: اردو بک اسٹال: ۱۹۳۹ء۔ ص ۲۰۸

مندرجات: (۱) پیش لفظ: اشک۔ ص ۱۲-۱۶ (۲) ڈاچی۔ ص ۱۷-۳۲ (۳) ۳۲۴۔ ص ۳۳-۶۴ (۴) امن کا طالب۔ ص ۶۵-۷۷

(۵) لیڈر۔ ص ۷۹_۹۳ (۶) احساس فرض۔ ص ۹۵_۱۱۴ (۷) خاموش شہید۔ ص ۱۱۵_۱۱۹ (۸) مایا۔ ص ۱۲۱_۱۳۳ (۹) زندگی کا راز۔ ص ۱۳۵_۱۳۰ (۹) زندگی کا راز۔ ص ۱۳۵_۱۵۴ (۱۰) سیلاب۔ ص ۱۵۵_۱۶۴ (۱۱) ڈاکو۔ ص ۱۶۵_۱۸۱ (۱۲) حربہ۔ ص ۱۸۲_۱۹۰ (۱۳) محبت۔ ص ۱۹۱_۲۰۸

۴۔ ''کونپل''۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۰ء۔ ۲۳۴ص

مندرجات: (۱) افسانے کا فن اور ترقی پسندی۔ ص ۹_۲۸ (۲) کونپل۔ ص ۲۹_۵۲ (۳) سنگدل۔ ص ۵۳_۷۱ (۴) تہذیب۔ ص ۷۳_۸۸ (۵) گوگھرو۔ ص ۸۹_۱۰۹ (۶) موتی۔ ص ۱۱۱_۱۲۷ (۷) یہ مرد۔ ص ۱۲۹_۱۴۳ (۸) زندگی۔ ص ۱۴۵_۱۶۱ (۹) راجکمار۔ ص ۱۶۳_۱۸۰ (۱۰) دولو۔ ص ۱۸۱_۱۹۶ (۱۱) ماں۔ ص ۱۹۷_۲۱۳ (۱۲) قفس۔ ص ۲۱۵_۲۳۴

۵۔ ''چٹان'' لاہور مکتبہ اردو ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۲۰

مندرجات: (۱) چٹان۔ ص ۱۱_۲۹ (۲) بینگن کا پودہ۔ ص ۳۱_۳۸ (۳) اابال۔ ص ۳۹_۵۳ (۴) بیدردی کے خواب۔ ص ۵۵_۶۶ (۵) ناسور۔ ص ۶۷_۸۰ (۶) کاکڑاں کا تیلی۔ ص ۸۱_۹۲ (۷) جھٹکے۔ ص ۹۷_۱۰۲ (۸) کالو۔ ص ۱۰۷_۱۲۰ (۹) جیتن کی ماں۔ ص ۱۲۱_۱۳۶ (۱۰) یہ انسان۔ ص ۱۳۷_۱۵۰ (۱۱) کھلونے۔ ص ۱۵۱_۱۶۰

۶۔ ''ناسور'' دلّی: ساقی بک ڈپو: ۱۹۴۳ء۔ ص ۲۰۷

مندرجات: (۱) تعارف: وقار عظیم۔ ص ۷_۲۰ (۲) تلاش۔ ص ۲۱_۲۲ (۳) جدائی کی شام کا گیت۔ ص ۲۳_۳۵ (۴) نشانیاں۔ ص ۳۶_۴۶ (۵) وہ میری منگیتر تھی۔ ص ۴۷_۶۰ (۶) پھول کا انجام۔ ص ۶۱_۷۴ (۷) نجیا۔ ص ۷۵_۸۵ (۸) بدری۔ ص ۸۶_۱۰۰ (۹) مغرور ساحرہ۔ ص ۱۰۱_۱۰۵ (۱۰) جہنم کا انتخاب۔ ص ۱۰۶_۱۲۳ (۱۱) سراب۔ ص ۱۲۴_۱۳۴ (۱۲) راجکمار۔ ص ۱۳۵_۱۴۹ (۱۳) تارابابو۔ ص ۱۵۰_۱۵۹ (۱۴) ترغیب گناہ۔ ص ۱۶۰_۱۹۰ (۱۵) ناسور۔ ص ۱۹۱_۲۰۷

۷۔ ''قفس'' دلّی: ساقی بک ڈپو: ۱۹۴۳ء ص ۱۷۸

مندرجات: (۱) حرف آغاز (اشک)۔ ص ۵_۸ (۲) قفس۔ ص ۹_۳۱ (۳) کالو۔ ص ۳۲_۳۶ (۴) بگولے۔ ص ۳۷_۴۰ (۵) وہ میری منگیتر تھی۔ ص ۴۱_۵۷ (۶) آرٹسٹ۔ ص ۵۸_۶۰ (۷) ایک جھلک۔ ص ۶۱_۷۱ (۸) ہار جیت۔ ص ۷۲_۸۷ (۹) ۳۲۴۔ ص ۸۸_۹۷ (۱۰) زندگی۔ ص ۹۸_۱۰۹ (۱۱) شاعر کی شکست۔ ص ۱۱۰_۱۲۹ (۱۲) مایا۔ ص ۱۳۰_۱۳۸ (۱۳) ترغیب گناہ۔ ص ۱۵۱_۱۷۸

۸۔ ''کالے صاحب'' دلّی: مکتبہ جامعہ: ۱۹۵۶ء ص ۱۸۷

مندرجات: (۱) پیش لفظ: محترمہ صالحہ عابد حسین۔ ص ۷_۱۴ (۲) کالے صاحب ص ۱۵_۲۸ (۳) تکلف۔ ص ۲۹_۵۲ (۴) نیل لینڈ۔ ص ۵۳_۷۶ (۵) رواقی۔ ص ۷۷_۱۰۲ (۶) خلش۔ ص ۱۰۳_۱۲۰ (۷) بچے۔ ص ۱۲۱_۱۴۲ (۸) مسٹر گھٹ پانڈے ص ۱۴۳_۱۶۴ (۹) کیپٹن رشید۔ ص ۱۶۵_۱۸۷

۹۔ ''پتنگ'' کراچی: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) طبع اول: س۔ن

۱۰۔ ''سپنے''۔ دہلی: ہند پاکٹ بکس۔ طبع اول: س۔ن

۱۱۔ ''پیرس پر بیٹھی شام'' (میں اردو افسانے) ۱۹۸۷ء

۱۲۔ ''اشک کے پنجابی افسانے''

۱۳۔ ''نیبل لینڈ'' طبع اول ۱۹۹۲ء

ناول:

۱۴۔ ''ستاروں کے کھیل''۔ دلی: ساقی بک ڈپو: ۱۹۴۲ء ص ۲۵۸

۱۵۔ ''پتھر الپتھر'' الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۷۲

مندرجات: (۱) پیش لفظ (اشک)۔ ص ۷۔۱۴ (۲) مقدمہ، اشک کے ناول اور پتھر الپتھر: ڈاکٹر عطیہ نشاط۔ ص ۱۷۔۴۰ (۳) ناول۔ ص ۴۱۔۱۷۲

۱۶۔ ''بڑی بڑی آنکھیں''

۱۷۔ ''گرتی دیواریں'' (تین جلدیں)

اس ضخیم ناول کی پہلی جلد: ''گرتی دیواریں'' ۱۹۴۷ء، دوسری جلد: ''شہر میں گھومتا آئینہ'' ۱۹۶۲ء اور تیسری جلد: ''ایک ننھی قندیل'' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

طویل ڈرامے:

۱۸۔ ''قید حیات''۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۷ء۔ ص ۱۴۳

مندرجات: (۱) یہ دو ڈرامے: ظرتونسوی۔ ص ۳۔۱۲ (۲) قید حیات۔ ص ۱۳۔۸۶ (۳) شکاری۔ ص ۸۷۔۱۴۳

۱۹۔ ''پیترے''۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۲۲

۲۰۔ ''چھٹا بیٹا''۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۱۲

مندرجات: (۱) پیش لفظ ڈاکٹر اطہر پرویز۔ ص ۹۔۱۹ (۲) چھٹا بیٹا۔ ص ۲۱۔۱۱۲

۲۱۔ ''گرداب''۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۸۱ء۔ ص ۹۶

مندرجات: (۱) پیش لفظ: ڈاکٹر اطہر پرویز۔ ص ۹۔۳۰ (۲) گرداب۔ ص ۳۱۔۹۶

۲۲۔ ''انجو باجی'' ۱۹۸۴ء

۲۳۔ ''جنت کی جھلک'' ۱۹۸۴ء

یک بابی ڈرامے:

۲۴۔ ''پاپی''۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۱ء ص ۱۹۶

مندرجات: (۱) دیوتاؤں کے سائے تلے۔ ص ۱۔۱۶ (۲) بیوہ۔ ص ۱۷۔۴۲ (۳) حقوق کا محافظ۔ ص ۴۳۔۶۶ (۴) پاپی۔ ص ۶۷۔۸۶ (۵) کراس ورڈ۔ ص ۸۷۔۱۰۲ (۶) لکشمی کا سواگت۔ ص ۱۰۳۔۱۲۲ (۷) باہمی سمجھوتہ۔ ص ۱۲۳۔۱۴۴ (۸) جونک۔ ص ۱۴۵۔۱۹۶

۲۵۔ ''چہرواہے''۔لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۲ء۔ ص ۱۷۲

مندرجات: (۱) چہرواہے ایک مطالعہ: مختار صدیقی۔ ص ۸۔۲۴ (۲) چہرواہے۔ ص ۲۵۔۴۵ (۳) میمونہ۔ ص ۴۶۔۶۴ (۴) مقناطیس۔ ص ۶۶۔۹۲ (۵) معجزے۔ ص ۹۳۔۱۰۸ (۶) چلمن۔ ص ۱۰۹۔۱۲۴ (۷) کھڑکی۔ ص ۱۲۵۔۱۳۹ (۸) سوکھی ڈالی۔ ص ۱۴۰۔۱۷۲

۲۶۔ ''ازلی راستے''۔سلطانی بک ڈپو، بمبئی: طبع اوّل: ۱۹۴۶ء

۲۷۔ ''تولیے''۔الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۵۶

مندرجات: (۱) تولیے۔ ص ۱۰۔۴۳ (۲) نیا پرانا۔ ص ۴۵۔۷۰ (۳) کیسا صاحب کیسی آیا۔ ص ۷۱۔۹۲ (۴) پرسرام۔ ص ۹۳۔۱۱۴ (۵) پکا گانا۔ ص ۱۱۵۔۱۵۶

۲۸۔ ''پڑوسن کا کوٹ'' ۱۹۸۴ء

تذکرے:

۲۹۔ ''منٹو میرا دشمن''۔الہ آباد: نیا ادارہ: طبع اوّل: ۱۹۵۵ء ص ۱۲۳

مندرجات: (۱) گذارش احوال، اشک ص ۹۔۱۶ (۲) منٹو میرا دشمن ۱۷۔۱۲۳

''میری افسانہ نویسی کے چالیس برس'' طبع اوّل: ۱۹۸۸ء

شاعری:

۳۰۔ ''برگد کی بیٹی'' طبع اوّل: ۱۹۴۷ء

۳۱۔ ''گرتی دیواریں'' (ہندی) طبع اوّل: ۱۹۴۷ء

۳۲۔ ''شہر میں گھومتا آئینہ'' (ہندی) طبع اوّل: ۱۹۶۲ء

۳۳۔ ''اک ننھی قندیل'' (ہندی) طبع اوّل: ۱۹۶۹ء

نوٹ: اس کے علاوہ لگ بھگ ساٹھ ہندی کتب شائع ہوئیں۔

غیر مدوّن:

متعدد مضامین، افسانے اور خاکے اشاعت کے منتظر ہیں۔

سورگ باش ہونے سے قبل مستقل پتا:

۵۔ خسرو باغ روڈ، الہ آباد، بھارت۔

اعزاز:

۱۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ: ۱۹۶۵ء

۲۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ (برائے ڈراما) ۱۹۷۲ء۔

۳۔ اردو اکیڈمی لکھنؤ، ایوارڈ (برائے ڈراما): ۱۹۷۳ء

۴۔ ساہتیہ وردھی: ایوارڈ، الہ آباد

نظریہ فن:

"چونکہ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، مشورہ نہیں کیا۔ خود ہی کہانیوں کو بگاڑتا سنوارتا رہا۔ اس لیے مجھے ایک کہانی کو کئی بار لکھنے کی عادت پڑ گئی۔ جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی میں برابر لکھتا رہتا ہوں۔ مجھے کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن کامیابی سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ میری بھوک ان مٹ ہے۔"

(بحوالہ: "میرا بہترین افسانہ" مرتبہ: محمد حسن عسکری)

○

حوالہ جات:

۱۔ "ترک غزوزن" از راجندر سنگھ بیدی مطبوعہ: "الفاظ" علی گڑھ مارچ تا جون ۱۹۸۲ء

پلنگ

اوپندر ناتھ اشک

دلہن کی آنکھوں پر جھکتی ہوئی کیشی کی نگاہیں اچانک پلنگ کے سرہانے گول شیشہ میں لگی اپنی ماں کی چھوٹی سی تصویر پر چلی گئیں۔ حسین کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، غلافی پلکیں، پتلی نازک ناک، ترشے ہوئے ہنستے ہونٹوں میں موتیوں کی قطار...... اور اچانک دلہن کے چہرے پر کیشی کی اپنی ماں، کے خطوط ابھر آئے...... !دونوں کے قد و قامت، ناک نقشہ میں کتنی مشابہت تھی...... کیشی کا ذہن دھندلا گیا۔ ایک کپکپی اس کی رگوں میں دوڑتی چلی گئی۔ سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر اس نے اس تصویر کو نگاہوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن بچپن سے لے کر ابھی کچھ ہی سال پہلے تک وہ نہ جانے کتنی ہی بار اسی طرح ماں کے سینے پر لیٹا تھا...... اور وہ یاد اس لمحہ اس کے ذہن کے پردے سے ہو کر نکل گئی اور اپنی دلہن کی پھیلی پھیلی مخمور آنکھیں اور گیلے رسیلے ہونٹ چومنے کے بدلے وہ اچانک بائیں جانب کو پھسل پڑا۔ چت لیٹ گیا۔ پل بھر کو اس کی نگاہیں مسہری کے خالی فریم پر چھائے موتیا کے لمبے ہاروں پر چلی گئیں۔ اس کا ہاتھ سیج پر بچھی بیلے کی کلیوں پر جا پڑا اور اس کے جی میں آئی کہ وہ اچھل کر اٹھے اور اس معطر و معنبر حجلۂ عروسی سے باہر نکل جائے۔

لیکن وہ نہ اچھلا نہ اٹھا، چپ چاپ لیٹا رہا۔ دلہن نہ جانے کیا سمجھے۔ یہی خیال لاشعور میں اسے پلنگ سے باندھے رہا۔ سر کو جھٹکا دے کر اس نے لمحہ بھر پہلے کی تصویر کو نظروں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن ایک کے بدلے کتنی ہی تصویریں ایک دوسری کے اوپر برساتی بادلوں سے امنڈ پڑیں۔

......اسی کمرہ میں۔ اسی پلنگ پر اس کے پاپا اور ممی ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ برآمدے میں پلنگڑی پر وہ پڑا ہے اور ایک ٹک انہیں تک رہا ہے۔ پاپا کے ساتھ لیٹی ماں کتنی چھوٹی، کتنی حسین لگتی ہے۔

......ماں آئینے کے سامنے بیٹھی سنگار کر رہی ہے اور وہ دروازہ کے پیچھے کھڑا چپ چاپ اسے دیکھ رہا ہے۔ آیا جس پری کی کہانی سنایا کرتی تھی، ویسی ہی حسین تو اس کی ماں ہے۔ وہ اسے دیکھ لیتی ہے اور پیار سے بلاتی ہے۔ زمین پر گھٹنے ٹیک، خوشی سے وہ اس کی گود میں سر چھپا

لیتا ہے۔ ماں ایک ہاتھ سے اس کے بال سہلاتی ہے، دوسرے سے اپنے بالوں میں کنگھی کیے جاتی ہے۔

جانے پاپا کو کیا ہو گیا ہے؟ ایک آدمی روز آتا ہے، اس کے گلے میں دو سانپ سے لٹک رہے ہیں، ان کا ایک ایک سرا دونوں کانوں میں لگا کر ان کا منہ وہ پاپا کی چھاتی پر جہاں تہاں رکھتا ہے پھر ان کے بازو میں سوئیاں چبھوتا ہے۔ پاپا نہیں روتے، پر وہ رونے لگتا ہے۔ ممی اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔

پاپا زمین پر لیٹے ہیں۔ ہلتے ڈولتے نہیں۔ گھر میں سب رو رہے ہیں۔ وہ بھی روتا ہے۔ ماں روئے جاتی ہے۔ اسے چومے جاتی ہے۔ روئے جاتی ہے۔ عورتیں اس کی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔ اس کے ماتھے کا سندور پونچھ دیتی ہیں۔ کیشی کو اس کی گود سے چھین لیتی ہیں۔ وہ روتا ہے۔ روئے جاتا ہے مگر اسے کوئی چپ نہیں کراتا۔

وہی پلنگ ہے۔ وہ اپنے پاپا کی جگہ لیٹا ہے۔ ماں اس کے ساتھ لیٹی ہے۔ ایک سادی سی سفید دھوتی پہنے ہے۔ صبح کا اجلا کمرہ میں جھانک رہا ہے لیکن ماں بے سدھ سوئی ہے۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہتا ہے...... پتلا نازک پریوں کا سا چہرہ بند آنکھیں کھلے بکھرے بال...... وہ اسے اس شہزادی سی لگتی ہے جو سحر زدہ سوئی تھی اور جسے شہزادے نے آ کر جگایا تھا...... وہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور اسے کسی (Kissy)، کر لیتا ہے۔ اس کی ماں جگ جاتی ہے۔ باہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے اور اس کی پیشانی آنکھیں اور اس کے ہونٹ چوم لیتی ہے۔

وہ اپنی ماں کے سینے پر لیٹا ہے۔ وہ اسے شہزادے کی کہانی سنا رہی ہے جو سات سمندر پار سے شاہزادی بیاہ لایا تھا۔ کہانی سنا کر وہ اس سے پوچھتی ہے۔ ''کیا تو بھی ایسی شہزادی سے شادی کرے گا۔''

''میں تم سے بیاہ کروں گا۔''

''دھت پگلے! کبھی بیٹے بھی ماؤں سے بیاہ کرتے ہیں؟''

اور وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی جیسی دلہن بیاہ کر لائے گی۔

''میں پھر یہی پلنگ لوں گا۔'' وہ پلنگ کے سرہانے لگی اپنی ماں کی حسین تصویر کو دیکھ کر ٹھنکتا ہے۔

''ہاں۔ ہاں یہ پلنگ میں تمہیں اور تمہاری دلہن کو دوں گی۔''

اور وہ اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیتی ہے۔

''کیا بات ہے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے؟'' اچانک دلہن کہنی کے بل ہو کر اس کی پیشانی اور بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہے۔

''نہیں کچھ نہیں!'' سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے یادوں کو پرے ہٹاتا ہوا کیشی ہنستا ہے...... ایک ایسی ہنسی، جو لمبی سانس جیسی معلوم ہوتی ہے۔

اس کی ماں نے تو سچ ہی کہا تھا۔ ویسا ہی بوٹا سا قد، حسین چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، تیکھے نقش، نازک ہونٹ، موتیوں جیسے دانت۔ ماں واقعی اس کی دلہن اپنے ہی جیسی لائی تھی اور حالانکہ جہیز میں بڑا خوبصورت پلنگ آیا تھا مگر ماں نے برسوں پہلے کے اپنے وعدے کے مطابق وہی اپناوالا، بڑا سا قیمتی، پلنگ حجلۂ عروسی میں بچھوا دیا تھا، پلنگ کیا، اپنا کمرہ ہی دلہن کو دے دیا تھا۔

دلہن اس پر جھکی، اس کی آنکھوں میں کہیں دور جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ چند لمحہ قبل کا اس کا جوش و خروش یک دم

سرد کیوں پڑ گیا؟ لیکن یہ جاننے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اور نہایت حجاب آمیز پیار سے وہ اس پر تھوڑا جھکی اس کے بال سہلائے جا رہی تھی۔

کیشی چند لمحے چپ چاپ لیٹا رہا پھر اچانک اس نے دلہن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا! کتنی ہی دیر تک وہ اس کے سر کو اپنے سینے پر رکھے اس کے بالوں، گالوں اور ہونٹوں کو سہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے دماغ سے تمام جالے دور ہو گئے اور سینے پر لیٹی دلہن اور اس کے گورے گداز جسم کی گرمی اس کے رگ و ریشے میں سما گئی۔ اس نے آہستہ سے اسے چوم کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کے گرم گداز سینہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سر اٹھائے، اپنی بیوی کو پیار کرے لیکن جیسے اس تصویر کا سامنا کرنے کی اس میں تاب نہ تھی...... وہیں لیٹے لیٹے بائیں ہاتھ سے اس نے اپنا تکیہ اٹھا کر اندازے سے تصویر کے آگے رکھ دیا، پھر اس نے سر اٹھایا لیکن وہ تصویر گویا اس تکیہ کے پیچھے چھپ کر اور بھی نمایاں ہو گئی تھی اور دلہن کے چہرہ پر کسی دوسرے چہرہ کے خطوط بننے لگے تھے...... نہیں...... نہیں...... نہیں! وہ جھنجھلا کر دل ہی دل میں چلایا اور پھر پھسل کر ویسے ہی چت لیٹ گیا پھر نہ جانے کیسا بگولہ سا اس کے دل میں اٹھا کہ وہ اچھلا اور حجلۂ عروسی سے باہر نکل آیا۔

برآمدے کی جھلملی سے چیت کی چاندنی بڑی شرمائی نگاہوں سے اندر جھانک رہی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ برآمدے کی محراب میں رکا۔ چپ چاپ باہر پھیلی چاندنی میں تکتا رہا۔ ٹھنڈی ہوا کے لمس سے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو کچھ عجیب سی راحت ملی لیکن وہ پلٹا نہیں بلکہ باہر نکل آیا۔ دائیں طرف پھولوں کی روش میں فلاکز اور نبیا کھلے تھے۔ سامنے ڈیلیا کے پودے، پھولوں کے بار سے جھکے، ہلکی ہوا کے جھونکوں سے جھول رہے تھے۔ گھاس کے لان کے ساتھ کٹی چھنٹی مہندی کے پیچھے کیاری میں سوسن کھلا تھا اور گلاب کی بیل کے گرد گول تھالے میں نسترپشم کے ڈھیروں پھول گویا اس چاندنی میں نہا رہے تھے...... کیشی ان راستوں میں انکتا بھٹکتا، پھولوں کے رنگوں کو جھک کر دیکھتا، بے خیالی میں انہیں چھوتا بڑھتا چلا گیا۔ سورج کی تیز روشنی میں جو پھول اپنی رنگینی سے آنکھوں کو چوندھیا دیتے تھے وہ اس خنک چاندنی میں ہی دلکش، پر سکوں اور فرحت بخش معلوم ہوتے تھے۔ زرد اور گلابی رنگ سفید سفید نظر آتا تھا اور گہرا سرخ، نیلا یا جامنی سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ کاٹج کی چار دیواری کے پاس پہنچ کر وہاں رکا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ آغاز بہار کا بیلا کھلا تھا۔ چار دیواری کے نیم تاریک سائے میں بیلے کے پھول موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ پہلے کبھی جب چاندنی راتوں میں وہ بیلا کھلا دیکھتا تو ہمیشہ کہیں پڑھے یا سنے گیت کی ایک لائن اس کے ہونٹوں پر مچل جاتی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر گنگنا اٹھتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد کھلا بیلا، میرا آنگن مہکا

آنگن مہکا

لیکن آج جب سچ مچ اس کا آنگن مہکا تھا تو وہ گیت نہ جانے ذہن کے کس تاریک گوشہ میں کھو گیا تھا۔ اپنے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ کاٹج سے گیٹ تک اور گیٹ سے کاٹج تک چپ چاپ گھومتا رہا۔ پھر جب وہ دوسری بار گیٹ سے واپس آ رہا تھا تو اس کی نظر کاٹج کے دوسرے کنارے والے کمرے کے شیشے پر گئی۔ اندر روشنی تھی۔ اس کی ماں یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس کی آنٹی اور دوسری عورتیں بھی جاگ رہی تھیں اور...... شاید انہیں کے بارے میں سوچ رہی تھیں...... اس کی ماں نے کتنی محنت اور شوق سے اس کا حجلۂ عروسی سجایا تھا۔ سارا دن کنارے والے کھانے کے کمرے میں (جن کی میز کرسیاں باہر برآمدے میں رکھ دی گئی تھیں اور جس میں بہو کو اتارا گیا تھا) ماں، آنٹی اور دوسری عورتیں

گنگنا، تھلی، مانگ بھرائی اور منہ دکھائی کی رسمیں پوری کرتی رہی تھیں۔ ساتھ کے ڈرائنگ روم میں وہ اپنے دوستوں میں گھرا بیٹھا رہا تھا۔ برابر کے اس کے اپنے کمرے میں دنیا جہاں کے سامان میں جہیز کا سارا سامان اور فرنیچر رکھا جاتا رہا تھا.................. اور ادھر کے ماں والے کمرے کو سہاگ رات کے لیے سجایا جاتا رہا تھا۔ دسیوں رسموں، مہمانوں کی آؤ بھگت اور دوسرے بیسیوں کاموں میں ابھی اور کئی راتوں کی جگی، اپنی ماں کو اس نے بارہا اس کمرے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ آنٹی اور دور کے رشتے کی اس کی ایک جوان خالہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ ماں کی خوشی کی انتہا نہ تھی گویا اتنے رت جگوں، اتنی دوڑ دھوپ، اتنی جانفشانی اور اتنے ہنگاموں کا ماحصل بس اسی کمرے کی آرائش و زیبائش تھی۔ وہ کئی بار بہانے سے آیا تھا کہ آخر وہ بھی تو دیکھے، اس کی ماں اور آنٹی وہاں کیا سجاوٹ کر رہی ہیں لیکن ہر بار اسے بھگا دیا گیا تھا۔ رات سے پہلے اسے ادھر جھانکنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

دوستوں سے باتیں کرتے رسموں میں شامل ہوتے اور عورتوں کے مذاق سنتے ہوئے کیشی کی نظریں بار بار اپنی ماں کے چہرے پر جا ٹکی تھیں۔ اگرچہ اس کی عمر اب چالیس کی ہونے کو آئی تھی اور بائیس برس کی طویل بیوگی نے کچھ عجیب سی سختی اس کے چہرے پر پیدا کر دی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ گڑھے بن گئے تھے لیکن سفید سلک کی ساڑھی میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی میں تمتمایا اس کا چہرہ کیشی کو تمام دوسری عورتوں سے زیادہ حسین نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے نہ جانے کس جادو کے زیر اثر غائب ہو گئے تھے۔ رسمیں ادا کرتی اور مہمانوں کا خیال رکھتی ہوئی اس کی ماں وقت نکال کر حجلہ عروسی کو سجانے میں لگ جاتی۔ تکان کا اس کے چہرے پر کہیں نشان تک نہ تھا۔

وہ جانتا تھا، اتنی تھکن اور شب بیداریوں کے باعث ماں بیمار پڑ جائے گی ان دنوں وہ ہر رات سونے سے پہلے ماں کے پاس جا کر اس سے کہتا تھا۔ ''ماں اب سو جاؤ!'' لیکن خود سونے کی بجائے ماں اسے اس کی چارپائی پر لے جا کر ہلکا سا تیل اس کی کنپٹیوں پر ملتی اس کی بھوؤں کو سہلاتی، اسے سلا کر خود کام میں جا لگتی...... کیشی کو بہت پہلے سر میں تیل ڈلوانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ امتحان کے دنوں میں جب وہ رات رات بھر پڑھتا تھا اور دن کو ایک آدھ گھنٹہ سونا چاہتا تھا اور اسے نیند نہ آتی تھی تو ماں اس کے سر میں تیل لگاتی تھی اور اس وقت کیشی اپنے سر پر جھکے اس کے چہرہ کو ایک ٹک دیکھتا رہتا اور سوتا نہ تھا۔ تب ماں پیار سے اس کی آنکھیں بند کر دیتی تھیں۔ انہیں آہستہ سے چوم کر اس کی بھوؤں پر اپنی ڈھیلی انگلیاں یوں جلدی جلدی چلاتی تھی اور اتنا پیار ان نرم انگلیوں میں بھر دیتی تھی کہ اس کی پلکیں بھاری ہو جاتی تھیں اور وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔ کیشی نے خود بھی یہ فن اس سے سیکھ لیا تھا۔ کبھی جب تکان یا فکر سے ماں کو نیند نہ آتی تھی تو وہ خود اس کے سرہانے بیٹھ کر بڑے ہی پیار سے اس کی کنپٹیاں سہلا کر اسے سلا دیتا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا، تیرہ، چودہ برس کا تو ایسے میں ماں کبھی کبھی اس کا سر جھکا کر اسے چوم لیتی تھی۔ جب وہ بڑا ہو گیا۔ بی اے، ایم اے کر کے یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر ہو گیا تو ماں ایسے موقعوں پر صرف اس کی پیشانی چومتی تھی اور کیشی بڑے پیار سے اسے تھپتھپا کر سلا دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا...... شادی میں آئی ہوئی عورتوں میں گھری اپنی ماں کو اٹھائے اور اسے کمرے میں لے جا کر گہری نیند سلا دے لیکن وہاں تو وہ سہاگ سیج سجانے میں لگی تھی، پھولوں کی کمی کی وجہ سے نہ جانے اس نے کتنے آدمیوں کو کہاں کہاں بھیجا تھا اور کتنا پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ...... ''ماں: تم کیوں جان ہلکان کر رہی ہو۔ تمہارا پیار ان ساری رسموں، خوشیوں، آرائش و زیبائش سے بڑا ہے۔ میرے لیے اس کا مول ان سب سے کہیں زیادہ ہے تم بیمار پڑ جاؤ گی!'' لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی ایک نہ سنے گی۔ ''میری شادی تو بیٹے کچھ یونہی ہوئی تھی۔'' اس نے کیشی سے ایک بار کہا تھا ''تمہارے پاپا معمولی کلرک تھے اور کمپٹیشن میں ابھی بیٹھے نہ

تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری بہو کے دل میں کوئی تمنا رہ جائے، پھولوں کا ایک گجرا تک نہ آیا تھا میرے لیے۔ تم ذرا دیکھنا! تمہاری دلہن کی سیج میں کیسے سجاتی ہوں۔''

اور جب حجلۂ عروسی کا پردہ اٹھا کر اسے اندر دھکیلتی اور! ''دیکھو فلسفہ ہی نہ بگھارتے رہنا۔'' کہتی اور ہنستی ہوئی اس کی جوان خالہ چلی گئی تھی تو کیشی لمحہ بھر کو حیران سا کھڑا رہ گیا تھا۔ کمرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ پلنگ اور دوسرا ساز و سامان بھی اس کا جانا پہچانا تھا۔ ماں نے اپنا ڈریسنگ ٹیبل اپنا سنگھاردان، بیپر میشی کا چوڑی بکس بمبئی سے منگایا ہوا اپنا قیمتی ٹیبل لیمپ...... سب کمرہ میں کچھ اس ڈھنگ سے سجا رکھا تھا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ نمایاں نظر آتی تھی۔ لیکن جس چیز نے کمرے کو سب سے زیادہ حسین بنا دیا تھا وہ تھے آغاز بہار کے موتیے کے پھول، پلنگ پر مچھردانی نہ تھی۔ اس کے فریم پر چھائے ہوئے موتیوں کے لمبے ہار دونوں جانب نیچے تک یوں لٹک رہے تھے کہ پھولوں کی ہری سی بن گئی تھی۔ پلنگ پر بیلے کے پھولوں کی موٹی چادر بچھی تھی جس پر دلہن پھولوں کی دیوی بنی، ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔

پل بھر کے لیے کیشی کی نگاہوں کے سامنے اس کی ماں کی شادی کا منظر گھوم گیا محکمہ انہار کے ایک معمولی کلرک کی دلہن۔ چھوٹی سی کوٹھڑی، معمولی چارپائی، لالٹین کی مدھم روشنی اور آسمانوں کو چھوتی ہوئی آرزوئیں!...... اس کے پاپا بعد میں ایگزیکٹو انجینئر ہو گئے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ رہی تھی، لیکن ماں اس یاس و محرومی کو کبھی فراموش نہ کر سکی تھی۔ اپنے بیٹے کے حجلۂ عروسی کو اپنی مرضی کے مطابق سجا کر اس نے اپنی تشنہ خواہشوں کی تکمیل کر لی تھی، لیکن وہی سجاوٹ کیشی کے لیے وبال جان ہو گئی تھی...... جدھر بھی اس کی نگاہ جاتی، وہی مناظر اس کی آنکھوں میں ابھر آتے۔

''دیکھنا فلاسفی ہی نہ بگھارتے رہنا!'' اچانک کیشی کے ذہن میں خالہ کا جملہ اور ہنسی گونج اٹھی...... تو کیا وہ اپنے ہی جال میں پھنسا ہے؟...... اس کی دلہن نہ جانے کیا سوچتی ہوگی؟ اس کے سامنے کئی واقعات گھوم گئے۔ جس میں پہلی رات مرد کی کمزوری دلہا، دلہن کی ازدواجی زندگی کو لے ڈوبی...... ''لیکن پہلی ہی رات مرد کے لیے اپنے کو مرد ثابت کرنا کیا ضروری ہے؟'' یہ عورتیں اس کے لیے کیوں اتنا تردد کرتی ہیں۔ کیا یہ سب کی سب دوسروں کی حجلۂ عروسی کو سجانے میں اپنی اپنی سہاگ رات کا لطف پھر نہیں حاصل کرتیں؟ تو کیا اس کی ماں بھی...... اس کے حجلۂ عروسی کو سجانے میں اتنی محنت کرنا۔ اپنا پلنگ وہاں رکھ دینا...... اسے پھولوں سے ویسا سجا دینا جیسا کہ اس کے دل میں اپنے حجلۂ عروسی کو سجا دیکھنے کی تمنا تھی اور اس کے پاپا کی غربت اور بے دلی کی وجہ سے جو پوری نہ ہوئی تھی...... کیشی نے سر کو جھٹکا دیا...... اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کیوں کہا تھا، میں یہی پلنگ لوں گا؟ لیکن وہ تو بچہ تھا، کیا اس کی ماں بھی بچہ تھی؟......

وہ واپس برآمدے میں آ گیا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا۔ دلہن محراب کے نیچے کھڑی ہے۔

''طبیعت کچھ خراب ہے جی؟''

''نہیں!''

''کیا مجھ سے کچھ قصور ہو گیا؟''

کیشی کا جی چاہا، زور سے قہقہہ لگائے۔ ایک ہی بات اس کے دلہن کے دماغ میں بھی چکر لگا رہی ہے۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ اسے اندر لے گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے ذہنی انتشار کو جھٹک کر وہی کرے گا جس کی سب توقع رکھتے ہیں۔ اس نے دلہن کو تھوڑی سختی سے چارپائی پر لٹا دیا...... جھٹکے سے اس کے بلاؤز کے بٹن کھول دیئے...... وہ اس پر جھکا...... لیکن دلہن نے تکیہ کو پھر اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ کیشی کی

نظر پھر اپنی ماں کی تصویر پر گئی۔ اس کا دماغ پھر دھندلا گیا۔ وہ اٹھا...... باہر جانے لگا تھا کہ دلہن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا بات ہے جی؟''

کیشی کی نظر درمیانی دروازہ کی طرف گئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ماں نے اپنے اس کمرہ میں اس کی سہاگ رات کا اہتمام کرنے کی بجائے اس کے اپنے کمرہ میں وہ سب انتظام کیا ہوتا۔ لیکن اب تو اس کا کمرہ جہیز میں آئے ہوئے فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان کا گودام بنا ہوا تھا اور اس کی چابی بھی اس کے پاس نہ تھی۔

نہایت مجبوری سے اس نے باہر برآمدے کی طرف دیکھا۔ چاندنی اب بھی بدستور جھلملی سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔

''دیکھو نا! کیسی چاندنی کھلی ہے۔ آؤ ذرا باہر گھومیں!''

دلہن اٹھی اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کیا ایک نگاہ غلط انداز آئینہ میں ڈالی۔ بالوں کی دو ایک لٹوں کو ٹھیک کیا اور ذرا سا گھونگھٹ کاڑھ کر، کیشی کے پیچھے ہولی۔

دو بار برآمدے سے گیٹ تک اور گیٹ سے برآمدے تک چپ چاپ کیشی آیا۔ دلہن نے ایک دو بار چاندنی کی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا، لیکن کیشی کو خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔

اپریل کی چاندنی غیر مرئی شراب کی مانند ان کی رگ رگ میں سما رہی تھی لیکن وہ دونوں اس کی جانب سے بے نیاز تھے۔ دلہن کو اپنے شوہر کے اس عجیب رویہ سے الجھن ہو رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں سے (جن میں سے کچھ دو دو بچوں کی مائیں تھیں) پہلی رات کے متعلق اس نے جو کچھ سن رکھا تھا۔ وہ جیسے اس کی گرفت میں آ کر دور چلا جاتا تھا۔ اپنے شوہر کی خوب صورتی، اس کی قابلیت اور فرض شناسی کی اس نے بہت تعریفیں سن رکھی تھی۔ یونیورسٹی میں وہ پروفیسر تھا اور ڈیڈی نے نہ صرف اس کے ساتھی پروفیسروں بلکہ اس کے شاگردوں تک سے اس کے متعلق ہر طریق سے ہر طرح کی معلومات حاصل کی تھیں اور پوری طرح مطمئن ہو کر ہی انہوں نے یہ رشتہ منظور کیا تھا۔ اس کا ہونے والا منگیتر سنکی ہے، اس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے؟ یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا تھا...... اپنے شوہر کی اس بے رخی کے متعلق سوچتی اور اپنے مستقبل کے قدرے مبالغہ آمیز اندیشوں میں گرفتار دلہن کبھی کبھی اپنے شوہر پر نظر ڈال لیتی اور چپ چاپ اس کے ساتھ ٹہلے جاتی...... چاندنی کی طرف اس کا ذرا بھی دھیان نہ تھا۔

اور کیشی کا دماغ ایک دلدل بنا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچ نہ پا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کئے۔ بائیں ہاتھ کی کلائی کو دائیں ہاتھ سے باندھے کندھے ذرا جھکائے، وہ چپ چاپ ٹہلے جا رہا تھا۔ جب وہ دوسری بار گیٹ تک پہنچے تو اچانک کیشی نے کہا۔ ''آؤ ذرا باہر چلیں۔''

''رات کافی ہو گئی ہے!'' دلہن نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

کیشی کو اچانک اپنے ایک دوست کی یاد آ گئی جس نے کبھی اپنے نئے عشق کا قصہ سناتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ پانی کی ٹنکی سے گراؤنڈ ٹرنک روڈ کے پھاٹک تک سڑک اتنی سنسان، سایہ دار اور پراسرار لگتی ہے کہ محبت کرنے والوں کے لیے اس سے بہتر کوئی سڑک نہیں...... اور وہ بولا۔ ''بس ذرا پانی کی ٹنکی تک جائیں گے!''

کیشی بنگلہ کا پھاٹک کھول کر باہر نکلا۔ پانی کی ٹینکی کہاں ہے۔ دلہن کو معلوم نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ کیشی اسے

وہاں کا حدود اربعہ بتانے لگا کہ کس طرف کون سی عمارت ہے کس طرح وہاں پہلے زیادہ تر ریلوے کے انگریز افسران رہے تھے، پھر کیسے آزادی کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور وہ بنگلے ہندوستانیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ آٹا مل کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہاں کیسے آٹا اور میدہ تیار کیا جاتا ہے۔ کیسے وہاں مالکوں نے کولڈ اسٹوریج بنا رکھا ہے۔ جہاں وہ لاکھوں من آلو ہر سال اسٹور کر کے بیچتے ہیں۔ پریس کے پاس پہنچ کر، اس کی کھڑکیوں کے شیشوں میں سے وہ بڑے جوش سے روٹری مشین کے کام کرنے کا ڈھنگ اسے سمجھانے لگا۔ کس طرح ایک جانب سے کاغذ لگتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب سے پورا اخبار چھپ کر اور مڑ کر نکلتا جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے پھر پانی کی ٹینکی سے گراؤنڈ ٹرنک روڈ تک کی تنہائی کی یاد آئی اور وہ مڑ کر ریلوے پھاٹک کی جانب ہولیا۔ پھاٹک بند تھا۔ لال بتی دیکھ کر کیشی نے کہا۔

''یہ پھاٹک بھی ایک مصیبت ہے۔ چوبیسوں گھڑی ایک نہ ایک گاڑی گزرتی رہتی ہے۔ اتنا بڑا اسٹیشن بن گیا، لیکن اس پھاٹک کی قسمت نہیں جاگی یہاں پل بنے تو مصیبت دور ہو!''

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی، برابر کے رستہ سے نکل کر وہ پانی کی ٹینکی تک آ گئے۔ دائیں جانب سڑک کھلی اور روشن تھی۔ بائیں جانب تاریک اور سایہ دار۔ جب کیشی ادھر مڑنے لگا تو ایک بار پھر دلہن نے کہا۔ ''چلیئے! اب گھر چلیں۔ رات کافی ہو گئی ہے۔'' لیکن کیشی نے اسے اپنے دائیں بازو میں لے لیا۔ ''چلو! کچھ دور تک چلتے ہیں۔ کیسی چھٹکی ہوئی چاندنی سڑک پر پھیلی ہے۔''

''اس جانب کیوں نہیں گئے؟ بڑی کھلی سڑک ہے۔''

''کیوں! ڈر لگتا ہے؟'' اور ذرا ہنستے ہوئے جھک کر اس نے دلہن کی پیشانی چوم لی۔

دلہن تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی۔ ''کیا کرتے ہو...... سڑک پر......!!!''

کیشی نے ہنس کر پھر اسے اپنے بازو میں لے لیا۔

''کون ہے یہاں اس وقت؟'' ہنس کر اس نے اسے چومنا چاہا، لیکن تبھی سامنے سے تیز روشنی اس کی آنکھوں میں پڑی اور لمحہ بھر بعد ایک بغیر باڈی کا ٹرک گھڑگھڑاتا ہوا ان کے پاس سے نکل گیا۔ ابھی ان کی آنکھوں کی چکاچوند دور بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے کی بتی آنکھوں میں کوندی اور پھر تو ایک کے بعد ایک...... ویسے کتنے ہی ٹرک گزر گئے...... جانے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ ''کیا خوب سنسان اکیلی سڑک ہے!'' کیشی نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کا سارا رومان ہوا ہو گیا۔

''چلیے اب چلیں۔'' دلہن نے جو پہلے ٹرک کی بتی دیکھ کر ہی اس کے بازوؤں کے حلقہ سے نکل گئی تھی۔ تقریباً روٹھے لہجے میں کہا ''میں تھک گئی ہوں۔''

''یہ کانپور روڈ ہے دن رات یہاں ٹرک اور موٹریں گھڑگھڑاتی ہیں۔'' کیشی نے اسے سمجھایا۔ ''چلو ایم۔ ٹی لائنز کی جانب چلتے ہیں گرجا تک بالکل سونی سڑک ہے۔''

''واپس چلئے! میں تھک گئی ہوں۔'' دلہن منمنائی۔

لیکن اسے پھر بازو میں بھرتا ہوا کیشی ملٹری لائنز کی کھلی سڑک پر بڑھ چلا۔

سڑک کی دونوں جانب بنگلوں پر چاندنی خاموش برس رہی تھی۔ ٹھہری نتھری، جیسے حیران کھلی سڑک، کناروں پر درختوں کے نیچے اندھیرے اجالے کے جال...... جبھی کہیں سے خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کیشی کے تصور میں! چاندنی ہی کی کھلی مسکراتی رات رانی گھوم گئی یہ

سانس فضا کو معطر بنا رہی تھی۔

کیشی نے دلہن کو پھر بازوؤں میں بھر لیا اور سڑک کے کنارے پیڑوں کے سائے میں ہو گیا۔

''کیا بہت تھک گئی ہو؟''

دلہن نے جواب نہیں دیا۔ اپنے جسم کا بوجھ اپنے شوہر پر ڈال دیا اور پیڑ کے سائے میں اسے اپنے سینے سے لگائے کیشی نے اسے چو[م] لیا۔

جبھی پرے سڑک سے ٹارچ کی روشنی چمکی۔ دونوں الگ ہو گئے۔ کیشی کا رنگ فق ہو گیا اور دل دھڑک اٹھا۔ اچانک اسے یاد آیا [کہ] ایم ٹی لائنز میں بارہ کے بعد گھومنے کی اجازت نہیں۔

چودھویں کا چاند ہو، یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم، خدا کی قسم لاجواب ہو

گہری ہری وردیاں پہنے تین چار فوجی کسی نئے فلم کا مقبول عام گانا گاتے چاندنی کے باوجود ٹارچ ان پر پھینکتے ہوئے سڑک سے گز[ر] گئے۔ گانے کی پہلی لائن سنتے ہی کیشی نے چاہا تھا کہ اپنی دلہن کو بانہوں میں بھر لے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا گائے۔

چودھویں کا چاند ہو، یا آفتاب ہو

لیکن فوجیوں کی بدتمیزی نے اس کا سارا ولولہ ختم کر دیا۔ اسے ایک دوست کی یاد آگئی جو ایم۔ ٹی لائنز کے ایک بنگلہ میں اپنی بہن کے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے تھے۔ جب ساڑھے بارہ کے لگ بھگ رکشہ نہ ملنے سے وہ پیدل آ رہے تھے تو انہیں سپاہیوں نے روکا اور دوست کو واپس بنگلہ پر پہنچ کر ثابت کرنا پڑا کہ وہ اپنی بہن ہی کے ساتھ وہاں کھانے پر آیا تھا...... اس سے پہلے کہ دلہن گھر چلنے کی التجا کرتی کیشی واپس لوٹا۔ جب فوجی نے گانا گاتے گاتے ٹارچ کی روشنی اس کی دلہن پر ڈالی تھی تو مارے غصے کے کیشی کا جی چاہا تھا کہ اسے کالر سے پکڑ، دو تھپڑ اسے جما دے لیکن اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ یونیورسٹی کا پروفیسر اپنی دلہن کے ساتھ آدھی رات کو اس سنسان مقام پر کیوں گھوم رہا ہے؟ تو وہ کیا جواب دیتا...... اور اس کا سارا غصہ اپنی ماں پر، اس پلنگ پر اور اپنی ذہنی کمزوریوں پر امنڈ پڑا۔

وہ تیز تیز چلتا واپس آیا۔ دلہن ذرا اس سے پیچھے گھسٹتی چلی آئی۔ بنگلہ میں پہنچ کر اچانک کیشی کی چال دھیمی ہو گئی لیکن دلہن نہیں رکی۔ سسکتی ہوئی وہ بڑھی چلی گئی اور جا کر پلنگ میں دھنس گئی۔ کیشی جب کمرہ میں داخل ہوا تو وہ ٹانگیں نیچی کیے چت لیٹی تھی۔ ساڑھی کا پلو ایک جانب لٹکا تھا۔ بلاؤز کے کھلے گلے سے اس کا گورا سینہ شیشے کی طرح جھلک رہا تھا۔ کیشی کا جی چاہا وہ گھٹنوں کے بل نیچے فرش پر بیٹھ جائے اور اپنا سر اس کی گود میں رکھ دے لیکن اپنی بیوی پر سے پھسلتی اس کی نظر غیر شعوری طور پر اپنی ماں کی اس تصویر پر چلی گئی اور وہ تذبذب کے عالم میں کمرہ کے درمیان کھڑا رہا۔

دلہن چپ چاپ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

کیشی کی نظریں اچانک بیچ کے دروازہ پر گئیں اور اس نے کہا۔ ''یہ کمرہ تو باہر سے بند ہے نا؟''

''جی!'' دلہن نے اسی طرح چھت پر نظریں جمائے جواب دیا۔

کیشی نے کمرہ کے دو چکر لگائے۔

''اس کی چابی کہاں ہے؟''

''آنٹی کے پاس ہوگی۔ سب سامان انہیں نے رکھوایا تھا۔''

کیشی باہر نکل، کالج کے دوسرے کونے تک گیا۔ ماں کے کمرہ کی بتی بجھ چکی تھی۔ تھکی ہوئی عورتیں سو گئیں تھیں...... اس کے دل میں آیا ماں کو جگائے لیکن خالہ جگ گئی اور اس نے مذاق کر دیا تو...... وہ واپس پھرا۔ کمرہ میں آکر کچھ لمحہ گھومتا رہا۔ اس کی نگاہ دلہن پر گئی اور وہ اسی طرح چت لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی۔ اچانک بڑھ کر اس نے بیچ کے کمرہ کا دروازہ پیچھے کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور نیچے کی چٹخنی لگی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر صرف اوپر کی چٹخنی لگی ہوگی تو اوپر کا شیشہ توڑ کر کھول لے گا لیکن اس کی ماں ہمیشہ کواڑوں کی نچلی چٹخنیاں لگاتی تھی۔

پیچھے ہٹ کر اس نے دروازہ پر ایک نظر ڈالی...... دونوں کواڑوں میں تین تین شیشے لگے تھے اور پھر لکڑی کا پلہ تھا۔ اگر وہ تیسرا شیشہ توڑ دے تو ہاتھ ڈالنے پر نچلی چٹخنی کھل سکتی تھی اور اس کے جی میں آیا کہ زور کا ایک مکا مار کر شیشہ چکنا چور کر دے لیکن تھکی ماندہ ماں کے جاگ پڑنے کا خیال اس کے جوش پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا بن گیا۔ دونوں مٹھیاں کمر کے پیچھے باندھے وہ کمرہ میں گھومنے لگا۔ دو تین چکر لگا کر وہ پھر دروازہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں دروازہ کے نچلے حصہ پر پڑیں۔ دائیں کواڑ کا کونا چوٹ کھایا تھا۔ نزدیک جا کر اس نے دیکھا۔ روغن میں ایک ہلکی سی لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ پیٹھ اس نے پلنگ کی پٹی سے لگالی اور ایڑی کا نچلا حصہ کواڑ کے اس چوٹ کھائے حصہ پر اڑا کر پورا زور لگایا۔ دروازہ تو نہیں ہلا لیکن پلنگ پیچھے کو کھسک گیا۔

چھت کی طرف تکتی ہوئی دلہن اسی طرح لیٹی رہی۔ پلنگ کے ہلنے کا جیسے اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اچانک کیشی نے اس پر ایک چور نگاہ ڈالی۔ دلہن نے اس کی جانب دیکھا۔ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا تھا؟...... طنز کی ایک خفیف سی جھلک ...... جو کسی خبطی کے کرتب دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ کیشی کے سر پر جنوں سوار ہو گیا۔ اس کی سوچ سمجھ کی ساری قوتیں سلب ہو گئیں اچھل کر وہ اٹھا اور بڑھ کر اس نے زور کا مکا نچلے بیچ کے شیشہ پر دے مارا۔

شیشہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔

دلہن لیٹی نہ رہ سکی۔ تھوڑا گھبرا کر وہ اٹھی اور اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے چڑ کر کہا۔

کیشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ ٹوٹ چکے شیشہ میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے چٹخنی کھولی۔ اس کے جسم کے بوجھ سے اچانک دروازہ پیچھے ہٹ گیا۔

بائیں ہاتھ سے کواڑ تھام، کیشی نے آہستہ سے سنبھال کر، ہاتھ باہر نکالا تو بھی کہنی کے اوپر خراش آ گئی۔

''ہائے آپ کیا کر رہے ہیں؟'' اس کی پھٹی قمیض سے خون رستے دیکھ کر دلہن نے گھبرائے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا اور اس کی خوفزدہ نگاہیں سارے کمرہ میں گھوم گئیں کہ کہیں کچھ ملے۔ جس سے وہ زخم پر پٹی باندھ دے۔

کیشی نے ادھر دھیان نہیں دیا۔ دونوں ہاتھوں سے کواڑ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ مشاق انگلیوں سے اس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ میں جہیز کا سارا سامان گڈمڈ پڑا تھا۔ فرنیچر، ڈریسنگ ٹیبل الماری، کپڑوں کی گٹھریاں، میوے مٹھائیوں کے تھال۔ ایک جانب وہ پلنگ بھی پڑا تھا۔ جو جہیز میں آیا تھا اور اس پر بے شمار کپڑے لدے تھے۔ دونوں بانہوں میں بھر کر اس نے کپڑے صوفہ پر پٹکے۔ دلہن اس کے پیچھے اندر آ گئی تھی اس کی آنکھوں میں طنز کی جگہ پھر خوف نے لے لی تھی اچانک پلٹ کر کیشی نے اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔ پل بھر وہ ان ڈری، سہمی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر، یکا یک اس نے اسے دونوں بانہوں میں بھر کر چوم لیا۔

دلہن اور بھی سہم گئی لیکن اپنے شوہر کی آنکھوں میں اس نے کرختگی کی جگہ بے پناہ محبت پائی اور اس کے گرم ہونٹوں کا لمس اپنے کانوں کے لوؤں کے نیچے گردن پر محسوس کیا تو اس کے سہمے ذرے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اس کے بال سہلانے لگی۔

علی الصباح ماں باہر آئی تو حجلۂ عروسی کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر چونکی! دبے پاؤں بڑھ کر اس نے پردہ ذرا ہٹایا۔ دل دھک سے رہ گیا...... سجا سجایا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہیں بیچ کے کھلے دروازے کے نزدیک فرش پر بکھرے شیشہ کے ٹکڑوں پر گئیں۔ چوری کے خوف سے گھبرا کر وہ ادھر بڑھی...... چوکھٹ ہی میں سن کھڑی رہ گئی...... کوچ کی گدیاں سر کے نیچے رکھے جہیز کے کھرے پلنگ پر دلہا، دلہن بے سدھ سوئے تھے!!



اشرف صبوحی

نام : سیّد ولی اشرف
قلمی نام : سیّد ولی اشرف صبوحی دہلوی/ اشرف صبوحی دہلوی/ اشرف صبوحی
پیدائش : ۱۱ مئی ۱۹۰۵ء، بہ مقام دہلی
وفات : ۲۲ اپریل ۱۹۹۰ء، بہ مقام کراچی
تعلیم : بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ابتدائی تعلیم قرآن حکیم اور اردو خوانی پر مشتمل تھی جو والدہ کی زیرِ نگرانی گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں اینگلو عربک ہائی سکول دہلی، سے میٹرک کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ دسویں جماعت میں ان کے استاد سید محمد تھے جنہیں خواجہ حسن نظامی نے ''خطیب اعظم'' کا خطاب دیا تھا۔ میٹرک کے بعد مسجد فتح پوری کے اسلامی مدرسہ میں منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے داخلہ لیا جہاں ناصر نذیر فراق دہلوی جیسے استاد ملے۔ ''اخلاقِ جلالی'' کا درس مولوی محمد اسحاق سے لیا۔ میٹرک کے زمانے میں انگریزی اپنے پھوپھا مولوی بشیر الدین احمد المعروف ڈپٹی صاحب (ابن ڈپٹی نذیر احمد دہلوی) سے پڑھی، بعد ازاں ادیب فاضل، منشی فاضل، ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پرائیویٹ طالب علم کے طور پر دے کر کامیابی حاصل کی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے والد کا نام علی اشرف تھا اور جدِ امجد سیّد اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھا شریف (فیض آباد) کے توسل سے آپ کا خاندان ''اشرفیہ'' کہلاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا تعلق بھی اسی خاندان۔ سے ہے۔ صبوحی صاحب کے والد گرامی انڈین ریلوے کے شعبہ انجینئرنگ سے وابستہ تھے، اور آپ نے نو حج کیے تھے۔ ایک بڑے عالم دین ہونے کے حوالے سے آپ کی شہرت تھی، کچھ یہی سبب ہے کہ آپ کے

خاندان میں اب بھی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہے۔

اشرف صبوحی کو بچپن اور لڑکپن میں نانی اور پرنانی کی صحبت میسر رہی جنہوں نے دہلی کی بربادی، آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کا احوال حکایتوں، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی صورت میں سنایا جو اشرف صبوحی کو اس قدر بھایا کہ کھیل کود میں دل نہ لگا۔ بچپن اور لڑکپن میں دوستی تھی تو پھوپھی زاد بھائیوں مبشر احمد اور شاہد احمد دہلوی سے، اور پھوپھی، اشرف صبوحی کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔

میٹرک کے زمانہ میں پھوپھا نے اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھا کر انگریزی کا درس دیا اور رفتہ رفتہ کتابت کی کاپیوں کی تصحیح کے لیے ساتھ بٹھانے لگے۔ یوں ان کے تلفظ اور بلند خوانی کی تصحیح بھی ہوتی گئی۔ لائق اتنے تھے کہ انیس برس کی عمر میں اپنے پھوپھا مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے مجموعہ کلام ''دیوانِ بشیر'' کی تقریظ لکھی، یہ ۱۹۲۴ء کا قصہ ہے۔ اشرف صبوحی نے ۱۹۲۹ء میں محکمہ ڈاک و تار کی ملازمت اختیار کی اور اس سال خاکہ نگاری اور افسانہ نویسی کا آغاز کیا۔ لیکن ان کی شہرت بطور شاعر اور خطیب ۱۹۲۷ء سے ہی ہو چلی تھی۔

نومبر ۱۹۲۹ء میں اشرف صبوحی نے محلہ چوڑی والاں، دہلی سے ماہنامہ ''ارمغان'' جاری کیا تو ۱۹۳۰ء میں ان کے بچپن کے لنگوٹیے یار اور پھوپھی زاد شاہد احمد دہلوی کو رسالہ ''ساقی'' نکالنے کی سوجھی۔ یوں صبوحی کا ''ارمغان'' رسالہ ''ساقی'' کا پیش رو ثابت ہوا۔ اس زمانے میں صبوحی، نثر لکھتے تو تھے لیکن شاعری کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ پھر رفتہ رفتہ نثر نے شاعری کو دبا لیا۔ ماہنامہ ''ارمغان'' ٹھیک دو برس ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء، باقاعدگی کے ساتھ نکلا اور اس شان سے کہ ناصر نذیر فراق دہلوی کا ''قصہ سات طلاقنوں کی کہانیاں'' اس میں قسط وار شائع ہوا۔ اس پرچے کے دیگر مستقل لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی خاں، (مدیر ''صلائے عام'') بے خود دہلوی، ایم اسلم اور شاہد احمد دہلوی جیسے لوگ تھے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے ان کے ڈرامے، فیچر اور بچوں کی کہانیاں نشر ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں بجلی کی فٹنگ اور بیٹری سازی کا کام سیکھا اور ریڈیو کے لیے بیٹریاں بنا کر بھلے وقتوں میں پچیس تیس روپے ماہوار پس انداز کرنے لگے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا صدر دفتر دہلی منتقل ہوا تو بابائے اردو نے مسودات کی نظر ثانی کا کام سونپا۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں آ کر پہلے ایم اسلم کے ہاں اور پھر اپنی لاہور کی قیام گاہ واقع بارود خانہ میں منتقل ہو گئے جہاں ایم اسلم کے ساتھ اپنی دوستی کے پچاس برس مکمل کیے۔ ۱۹۴۴ء کے آخر میں جب ہمدرد دواخانہ، لاہور کے لیے عارضی ڈاک خانہ کھلا تو صبوحی صاحب اس کے پہلے پوسٹ ماسٹر بنے، اور یہ سلسلہ ۱۹۶۲ء تک چلا۔ حکیم محمد سعید کے ساتھ تادیر دوستی نبھائی، ''ہمدرد صحت''، ''نونہال'' اور ''ہمدرد صحت ڈائجسٹ'' کے لیے افسانے، مضامین اور متفرق نویسی کی۔ ۱۹۶۳ء میں ''شام ہمدرد'' کا سلسلہ جاری ہوا تو اشرف صبوحی اس کے روح رواں تھے۔ بینائی زائل ہونے کے بعد کراچی میں قیام رہا اور یہیں وفات پائی۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

''تقریظ دیوانِ بشیر'' از بشیر الدین احمد، مطبوعہ: دہلی، طبع اوّل: ۱۹۲۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' (خاکے) — مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
مکتبہ صبوحی، لاہور، طبع دوم: ۱۹۶۲ء

۲۔ ''جھروکے'' (خاکے/افسانے) کتب خانہ علم وادب، دہلی

۳۔ ''بغداد کا جوہری'' (ترجمہ۔ناول) کتب خانہ علم وادب، دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۰ء

یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ کردہ ہے۔ طبع دوم ۱۹۴۳ء سے اس کتاب کا نام ''سلمے'' کردیا گیا تھا، تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں آیا۔ اس کتاب کا دیباچہ مرزا محمد سعید دہلوی نے لکھا ہے

۴۔ ''بن باسی دیوی'' (ترجمہ۔ناول) کتب خانہ علم وادب، دہلی طبع دوم: ۱۹۴۵ء

مقدمہ از مرزا محمد سعید دہلوی

۵۔ ''موصل کے سوداگر'' (ترجمہ۔ناول) کتب خانہ علم وادب دہلی

۶۔ ''غبارِ کارواں'' (خاکے/افسانے) مکتبہ دانیال، کراچی طبع اوّل: ۱۹۷۰ء

۷۔ ''دھوپ چھاؤں'' (ترجمہ۔ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۹ء

یہ لوئیز الکاٹ کے انگریزی ناول کا ترجمہ ہے۔ کل صفحات ۵۱۲

۸۔ ''ننگی دنیا'' (ترجمہ۔ناول) کتب خانہ علم وادب، دہلی

یہ چینی مصنفہ آئی۔لن چانگ کی ناول کا انگریزی کی معرفت ترجمہ ہے۔ اس ناول کو دوسری بار میری لائبریری، لاہور نے ''ننگی دھرتی'' کے عنوان سے شائع کیا۔

۹۔ ''ناشکرا خرگوش'' (ترجمہ کہانیاں) مقبول اکیڈمی، لاہور

یہ رابرٹ اسن کی انگریزی کہانیوں (بچوں کے لیے) کا ترجمہ ہے۔ جو موئسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوا۔

۱۰۔ ''بڑا ریچھ'' (ترجمہ۔کہانی) غلام علی اینڈ سنز لاہور

یہ لینڈ وارڈ کی باتصویر کہانی (بچوں کے لیے) کا ترجمہ ہے۔ جو موئسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔

۱۱۔ ''بزمِ آخر'' از فیاض (مرتبہ: اشرف صبوحی) انجمن ترقی ادب، لاہور

کتاب کو مشکل الفاظ کی فرہنگ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

۱۲ ''نرالے گویے'' (بچوں کے لیے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی طبع دوم:

۱۳۔ ''دلّی کی شادی'' (بچوں کے لیے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی طبع دوم:

۱۴۔ ''بدر شہزادی'' (بچوں کے لیے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی طبع دوم:

۱۵۔ ''شریر لڑکا'' (بچوں کے لیے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی طبع دوم:

۱۶۔ ''بوتا درزی'' (کہانی۔بچوں کے لیے)		
۱۷۔ ''پریوں کی کہانیاں'' (بچوں کے لیے)	انوار احمد پریس، الہ آباد	طبع اول: س۔ن
۱۸۔ ''پریوں کی ہنڈیا'' (بچوں کے لیے)		
۱۹۔ ''لعل شہزادہ'' (بچوں کے لیے)	صدیق بک ڈپو	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۲۰۔ ''شہزادہ بے نواز'' (بچوں کے لیے)		
۲۱۔ ''صبر بادشاہ زادہ'' (بچوں کے لیے)		
۲۲۔ ''ٹھوری تارا، ماتھے چاند'' (بچوں کے لیے)		
۲۳۔ ''ہیرامن طوطا'' (بچوں کے لیے)		
۲۴۔ ''گوہر شہزادی'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۲۵۔ ''ہرن کا دل'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۲۶۔ ''ماسٹر شامت'' (بچوں کے لیے)		
۲۷۔ ''شریر شیرا'' (بچوں کے لیے)		
۲۸۔ ''جادو کی سارنگی'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۲۹۔ ''جادو کا چھلا'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۳۰۔ ''بلوری جوتی'' (بچوں کے لیے)		
۳۱۔ ''باتونی کچھوا'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۳۲۔ ''دریا کی رانی'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۳۳۔ ''جادو کی لکڑی'' (بچوں کے لیے)		
۳۴۔ ''دعوت'' (بچوں کے لیے)		
۳۵۔ ''سرکے والی'' (بچوں کے لیے)		
۳۶۔ ''رحمت شہزادہ'' (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی	طبع دوم:
۳۷۔ ''نادان بلّے'' (بچوں کے لیے)		
۳۸۔ ''ننھا کمہار'' (بچوں کے لیے)		
۳۹۔ ''انوکھی باتیں'' (بچوں کے لیے۔ باتصویر)	مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۴۰۔ ''چار بے وقوف'' (بچوں کے لیے۔ باتصویر)	مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء

غیر مدوّن:

ان مطبوعہ تحریروں کے علاوہ لاتعداد کہانیاں، ریڈیائی فیچر، ریڈیائی ڈرامے، مواد، مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ مرتب شدہ غیر مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

۱۔ کہاوتوں کی کہانیاں (تحقیق)

۲۔ ''نجف کے موتی'' (حضرت علیؑ کے ارشادات گرامی کا ترجمہ مع شرح)

۳۔ ''مزاحیہ مضامین''

۴۔ ''نور اسلام کی جھلکیاں'' (اسلامی تاریخی واقعات)

۵۔ ''دیو کے دیس میں'' (انگریزی سے ترجمہ/کہانی)

۶۔ ''بونوں کے دیس میں'' (انگریزی سے ترجمہ/کہانی)

۷۔ ''دیوان صبوحی'' (غزلیات/قطعات/تاریخیں/نظمیں)

رسالہ ''ساقی'' دہلی، ''چمنستان''، دہلی اور ''ماہ نو'' کراچی/لاہور میں درج ذیل مواد غیر مرتب شدہ حالت میں موجود ہے:۔

۱۔	''رزم بزم''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	مارچ ۱۹۳۷ء	ص ۶۳
۲۔	''تمسخر حیات''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	جون ۱۹۳۷ء	ص ۶۱
۳۔	''اے کیوں ہم نے دیا دل''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	اپریل ۱۹۳۱ء	ص ۱۴۳
۴۔	''وائرلیس''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	اپریل ۱۹۳۱ء	ص ۱۲۰
۵۔	''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	اکتوبر ۱۹۳۱ء	
۶۔	''شوہر پرست بیوی''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	جولائی ۱۹۴۰ء	ص ۱۰۵
۷۔	''فولادی عشق''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	جولائی ۱۹۳۷ء	ص ۱۴۱
۸۔	''نئی روشنی کا اندھیرا''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	دسمبر ۱۹۳۷ء	ص ۵۳
۹۔	''قلعہ معلی کی ایک جھلک''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	جنوری ۱۹۳۸ء	ص ۲۱۸
۱۰۔	''ریل کا ایک سفر''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	اپریل ۱۹۳۸ء	ص ۸۸
۱۱۔	''ترلوکی پنڈت''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	مئی ۱۹۴۰ء	ص ۲۲
۱۲۔	''تاریخ کا ایک صفحہ''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	اگست ۱۹۴۰ء	ص ۴۰
۱۳۔	''مختصر حالات مولانا بشیر الدین احمد''	مطبوعہ: ''ساقی''، دہلی	اپریل ۱۹۳۰ء	ص ۳۴
۱۴۔	''تقریظ دیوان بشیر'' از بشیر الدین احمد	مطبوعہ: دہلی،	۱۹۲۴ء	
۱۵۔	''اردو''	مطبوعہ: ''چمنستان'' دہلی،	جنوری ۱۹۴۱ء	ص ۴۱

۱۶۔	''خدائی خوار''	مطبوعہ: ''ساقی'' دہلی،	جولائی ۱۹۳۹ء	ص ۱۵۶
۱۷۔	''شیخ زپٹے''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	ستمبر ۱۹۴۹ء	ص ۲۵
۱۸۔	''نواب آسماں قدر''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	جولائی ۱۹۵۰ء	ص ۲۰
۱۹۔	''خانصاحب کے گھر''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	اگست ۱۹۵۱ء	ص ۸۵
۲۰۔	''کوئی صورت نظر نہیں آتی''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	دسمبر ۱۹۵۳ء	ص ۴۹
۲۱۔	''مجھے کچھ کہنا ہے ان کی زبان میں''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	اگست ۱۹۵۴ء	ص ۴۱
۲۲۔	''حاجی بغلول لاہور میں''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	نومبر ۱۹۵۴ء	ص ۵۱
۲۳	''دوستی ناداں کی ہے''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	جون ۱۹۵۵ء	ص ۴۵
۲۴۔	''خواب پریشاں''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	اپریل ۱۹۵۶ء	ص ۵۷
۲۵۔	''گنج خرابات''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	فروری ۱۹۶۱ء	ص ۴۰
۲۶۔	''کل کی بات''	مطبوعہ: ''ماہ نو'' کراچی،	ستمبر ۱۹۶۱ء	ص ۳۵

وفات سے قبل مستقل پتا:

کوزی ہومز، E/۵ بلاک A /۱۳ گلشن اقبال، کراچی

نظریہ فن:

''غبار کارواں سے کررہا ہوں کارواں پیدا''

اشرف صبوحی دہلی

موٹے آ کا

اشرف صبوحی

غدر کے بعد پٹے بازی کی ہستی تو مانی ہوئی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ بیگ ابھی مرے ہیں، جن کو دعویٰ تھا کہ سو جوان ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور وار کریں، میں سب کی چوٹیں بچاتا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جاؤں گا۔ مگر چھپے رستموں میں ایک آ کا مصطفےٰ بیگ کا دم باقی رہ گیا تھا۔ جنہیں لوگ عام طور پر ''موٹے آ کا'' کہا کرتے تھے۔

چاوڑی بازار میں شاہ بولا کے بڑ سے قاضی کے حوض کی طرف چوڑی والوں کے محلے کے برابر حافظ داؤد کا کمرہ ہے۔ اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دکان رفوگری کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا یار زنجان ایک کشمیری، ناٹا سا قد، ہاتھ بھرے بھرے، ڈنٹر پھیلائے بیٹھے رفو کیا کرتے تھے۔ آ کا مصطفےٰ بیگ اپنے آخری دنوں میں اسی کمرے پر آ رہے تھے اور اس لیے عصر کے بعد عموماً مرزا یار زنجان کی دکان کے آگے مونڈھے پر ان کی بیٹھک تھی۔ ایسے ڈیل ڈول اور کلے جبڑے کے آدمی اب دیکھنے میں نہیں آتے۔ مغل بچوں کا پورا نمونہ تھے۔ بڑھاپے میں چہرے سے خون ٹپکتا تھا۔ آواز ایسی کراری کہ بولتے تو یہ معلوم ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کھال تو البتہ لٹک گئی تھی، لیکن ڈنٹروں کی مچھلیاں اب بھی ایسی طاقتور تھی کہ کیا مجال جو چٹکی تو لی جا سکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں ان کے والد اپنے وقت کے بڑے بانکے تھے۔ انہوں نے بھی قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک ابوظفر سراج الدین کا چراغ ٹمٹماتا رہا، قلعہ ہی میں رہے۔ غدر ہوا تو زخمی ہو کر قید ہوئے۔ چھوٹے تو دوجانے جا پہنچے۔ ادھیڑ عمر میں دلّی آئے اور جب تک جیئے اکنگ جیئے۔

آ کا کی نسبت سنا ہے کہ بانک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بانک خنجر بازی کا نام ہے۔ کبھی سچ مچ کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی، پھر لکڑی کی چھریاں ہو گئیں۔ اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں، مثلاً ہت کوڑا، بغلگیر، حلقوم، گولا لاٹھی، بازو بند وغیرہ۔ جس طرح ہنوٹ کی چوٹیں کاری سمجھی جاتی ہیں اسی طرح اس کے داؤں، لڑائیوں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا، صحیح نہیں معلوم۔ داستانوں میں عیاروں کی

خنجر بازی سنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ مغلوبہ میں جب تلوار چلانے کی جگہ نہ رہتی ہوگی تو خنجر اور کٹار سے کام لیا جاتا ہوگا۔ بہر حال یہ بھی ایک سپاہیانہ فن تھا اور اس کے جاننے والوں میں آ کا بھی تھے۔

آ کا کی شہزوری اور بکیتی کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہ بولا کے بڑ کا تراہا، سانڈوں کا اکھاڑہ تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ سیلانیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آ کا، یار نجان کی دکان کے آگے مونڈھے پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ بولا کے بڑ کی طرف سے ایک شور اٹھا، معلوم ہوا کہ کوئی بڑی جوڑ چھوٹی ہے۔ اتنے میں سانڈ ڈکراتے ہوئے قاضی کے حوض کی طرف چلے۔ لوگ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یار نجان نے آ کا سے کہا اوپر آ جایئے سانڈوں کا رخ اسی طرف ہے۔ آ کا نے ہنس کر جواب دیا مرزا ڈرو نہیں، جانوروں سے کیا بھاگنا، آ رہے ہیں تو آنے دو۔

سانڈوں کو اپنے زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روندن میں آ جائے یا کسی کا خوانچہ الٹ جائے، ان کی بلا سے۔ اتنے میں سانڈوں نے دکان کے آگے آ کر سینگ جوڑ لیے۔ اب پھر یار نجان نے کہا:

''آ کا دکان کے اوپر کیوں نہیں آ جاتے؟'' آ کا پھر ہنسے اور کہنے لگے:

''مرزا، یہاں بھی ایک سانڈ بیٹھا ہے۔ آنے تو دو۔'' یار نجان کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سانڈ آڑے ہو کر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ دکان کی طرف جس سانڈ کی پشت تھی اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آ کا کے مونڈھے کے قریب پٹری کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

آ کا: ''بس بھئی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ تم بھی ہٹ جاؤ۔''

لوگ ہنسنے لگے کہ آ کا جانوروں سے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں، جیسے آدمیوں سے۔ بھلا سانڈ ان کی سنیں گے۔ دو چار نے آ کا سے اصرار بھی کیا کہ اتنی جیداری اچھی نہیں، اپنا مونڈھا ہٹا لیجے مگر آ کا قطب تھے۔ قطب از جانمی جُنبد کے مصداق انہوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو آستین چڑھا کر بولے ''نہیں مانتا، اب کیا میں اُٹھوں؟''

اتنے میں پچھڑا ہوا سانڈ پٹری کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ آ کا نے اٹھتے ہی پہلے تو پچنپناتے ہوئے سانڈ کی کوکھ پر ایک لات رسید کی۔ لات کو تو وہ پی گیا، بلکہ جھنجھلا کر اس نے آ کا پر حملہ کرنا چاہا تو آ کا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں سینگ پکڑ لیے اور ایک رو میں اس کو سڑک کے بیچ میں لے گئے۔ سانڈ نے جھرجھری لے کر سینگ چھڑانے چاہے۔ سانڈ کا جھرجھری لینا تھا کہ آ کا نے گاؤ کھ کا داؤں کیا۔ سانڈ اڑا اڑا کر زمین پر آ پڑا۔ تماشائیوں میں حیرت چھائی ہوئی تھی۔ سانڈ کے گرتے ہی شور مچ گیا کہ واہ آ کا واہ کیا بات ہے سچ مچ کا گاؤ کھ آج ہی دیکھا ہے۔

سانڈ گر پڑا تو آ کا نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور بولے: ''اسی برتے پر آ کا کا مونڈھا اُٹھوا رہا تھا۔ جا اب سیدھا چلا جا، ورنہ بے چھری حلال کر دوں گا۔'' سانڈ کوئی ایک منٹ تو چپ پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس وقت بھی ڈپٹی کمشنر اور کمشنر وغیرہ کے بنگلوں پر بعض پرانی دیگ کی کھرچنیں قابوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جب حکام سے ملتے آزادی کے ساتھ اور اپنے کو لیے دیئے۔ حکام بھی ان کی ویسی ہی عزت کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوتیں، مل کر بیٹھتے تو کام کی باتوں کے

علاوہ شہر میں جو اچنبھے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے زنیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں ڈپٹی ہادی حسین خاں، شہزادہ سلیمان شاہ اور ہندوؤں میں لالہ بالا پرشاد نہر والے، خصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ دلّی والوں پر کوئی حرف نہ آئے۔

اچھا، آ کا مصطفےٰ بیگ کی سانڈ سے کشتی کے بعد جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کی ڈپٹی کمشنر بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر آ گیا۔ صاحب نے پوچھا یہ آ کا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے کہا: ''ایک باامن شہری ہے۔ لکڑی اور خاص کر بانک کے فن کا جاننے والا اب ان کے سوا شاید دلّی میں دوسرا نہیں رہا۔ رہا ان کے دیکھنے کا سوال، شام کو بلا ناغہ چاوڑی بازار میں حافظ داود کے کمرے کے نیچے ان کی نشست ہوتی ہے۔ جب جی چاہے ادھر نکل جایئے اور دیکھ آیئے۔''

صاحب بہادر: ''وہ ہمارے بنگلے پر نہیں آئیں گے؟''

ڈپٹی صاحب: ''ان آ کاؤں سے آپ واقف نہیں۔ بے بلاوے یہ بادشاہوں کے دربار میں تو گئے نہیں اور گئے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ کہاں بٹھائے جائیں گے، کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔''

صاحب بہادر: ''لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ ان پرانے دستوروں کے ہم پابند نہیں۔''

ڈپٹی صاحب: ''آپ پابند نہیں، وہ تو پابند ہیں۔''

غرضیکہ اسی طرح کی ردوبدل کے بعد صاحب نے وعدہ کر لیا کہ ہم کرسی دیں گے اور عزت کے ساتھ ملیں گے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انہیں لا کر آپ سے ملا دوں۔

آ کا کی نشست اکرام اللہ خان کے ہاں رہتی تھی۔ چنانچہ ہادی حسین خان نے ان کے ذریعہ سے آ کا کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا اور صاحب کو چٹھی لکھی کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد آ کا کو جناب کی ملاقات کے لیے رضامند کر لیا ہے۔ آپ جو دن اور وقت مقرر کریں انہیں لے کر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کی واجب تعظیم فرمائیں گے۔ صاحب نے ہادی حسین خان کی چٹھی کا فوراً جواب دیا۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وعدہ کیا کہ ملاقات چونکہ نجی ہے اس لیے دوستانہ ہوگی۔

چنانچہ جب ڈپٹی صاحب آ کا کو لے کر صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور اطلاع ہوئی تو وہ بلا تامل باہر نکل آئے۔ ڈپٹی صاحب منحنی سے آدمی تھے اور ان کے مقابلہ میں آ کا کے ڈیل ڈول اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک شیر ہے۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی، جسم کا رنگ ململ کے باریک انگرکھے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ حیران رہ گئے۔ آگے بڑھے۔ پہلے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ ملایا پھر آ کا سے، معلوم ہوا کہ فولاد کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا۔ صورت دیکھنے لگے۔

صاحب: (آ کا سے) ''آپ اچھے ہیں؟''

آ کا: ''اچھا تو خدا کا نام ہے، زندہ ہوں۔''

صاحب: (ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھ کر) ''کیا مطلب؟''

ڈپٹی صاحب: ''آ کا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے حاکم جس شہر میں ہوں وہاں برائی کا کیا کام۔ خدا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہم زندہ ہیں۔''

صاحب: (آ کا سے) ''مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔''

آ کا: ''آپ کی مہربانی۔''

صاحب: ''آپ کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ پٹا بازی کا ہنر خوب جانتے ہیں۔''

آ کا: ''پٹا بازی کیسی، میں سمجھا نہیں۔''

صاحب: ''محرم میں تعزیوں کے سامنے لکڑیوں سے جو کھیل کھیلتے ہیں کیا آپ وہ نہیں جانتے؟''

آ کا: ''صاحب خدا خدا کیجئے ایک ستر برس کے بوڑھے کو کھیل سے کیا نسبت۔''

صاحب: ''ہم نے تو بوڑھے بوڑھوں کو اچھلتے کودتے دیکھا ہے اور ہمارے ؛ پی صاحب کہتے تھے کہ آپ اُن کے استاد ہیں۔''

آ کا: ''ہاں انہوں نے دو چار گھائیاں مجھ سے سیکھی ہیں۔''

صاحب: ''گھائیاں کیا؟''

آ کا: ''لکڑی کے فن کے داؤں یا چوٹیں۔''

صاحب: ''تو کیا اس میں بھی اچھلتے کودتے ہیں؟''

آ کا: ''اُچھل کود تو پٹا بازی یا بنوٹ میں ہوتی ہے۔ بانک اور بنوٹ کو ان بوزنہ حرکتوں سے کیا تعلق؟''

صاحب: ''بانک اور بنوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے؟''

آ کا: ''ہلانے پڑتے ہیں لیکن صرف ضرورت کے وقت۔ بنوٹ کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اوٹ نہیں۔ اس کے داؤں سے دشمن بچ نہیں سکتا۔ بانک والا بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے۔ جس طرح بنوٹ کے لیے کسی ہتھیار کا ہونا لازمی نہیں۔ اس کا جاننے والا رومال کی گرہ سے بندوق کی گولی کا کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح بانک کے اگر کسی کو دو چار داؤں بھی رواں ہیں تو مقابل کے سارے ہتھیار بیکار ہیں۔''

صاحب: ''لیکن یہ فن اگلے زمانے میں شاید کچھ بکار آمد ہو۔ آج کل بندوق اور ریوالور کے مقابلے میں اسے سیکھنا وقت ضائع کرنا ہے۔''

آ کا: ''بندوق اور طمنچہ کے سامنے واقعی بانک اور بنوٹ کی کاریگری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت سے موقعے آدمی کو پیش آ جاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ فقط ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔''

صاحب: ولایت میں بوکسنگ اور فنسنگ ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لیے سیکھتے تھے۔ لیکن ریوالور کے مقابلے میں اب یہ چیزیں صرف کھیل بھی جاتی ہیں۔''

آ کا: ''بوکسنگ اور فنسنگ کیا ہوتا ہے؟''

صاحب: ''گھونسے بازی اور شمشیر زنی۔''

آ کا: ''میں نے یہ کھیل نہیں دیکھے۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں کی کشتی اور لکڑی کے فن کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔''

صاحب: ''میں نے بھی ولایت میں ان دونوں میں اچھا کمال پیدا کیا تھا۔''

آ کا: ''بہت مبارک! لیکن کبھی اُن کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملا۔''

صاحب: ''کیا مطلب؟''

آ کا: ''میرا مطلب یہ ہے، جب سے آپ نے یہ فنون سیکھے ہیں، آپ کو کبھی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی صورت پیش نہیں آتی کسی فن کی حقیقت نہیں کھلا کرتی۔''

صاحب: ''مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔''

آ کا: ''وہ لوگ گھونسے کے مقابلے میں گھونسے اور تلوار کے مقابلے میں تلوار ہی چلاتے ہوں گے۔''

صاحب: ''قطعی۔''

آ کا: ''اگر کسی کو گھونسا بازی نہ آتی ہو یا تلوار اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں گھر جائے۔''

صاحب: ''تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر غلبہ پالیں گے۔''

آ کا: ''لیکن ہمارا فن ہتھیاروں کے بغیر بھی اپنے جاننے والے کی جان بچا سکتا ہے۔''

صاحب: ''کیا آپ کو تلوار کے مقابلے میں تلوار اور گھونسے کے جواب میں گھونسے کی ضرورت نہیں۔''

آ کا: ''بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو بندوق اور طمنچہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔''

صاحب: ''میں نہیں سمجھ سکتا۔''

آ کا: ''سانڈ کے مقابلے میں میرے پاس کیا ہتھیار تھا؟''

صاحب: ''مگر سانڈ تو جانور ہے۔''

آ کا: ''آپ کا کے باز ایسے موقعے پر کیا کرتا سانڈ کی جھپیٹ سے کیونکر بچتا؟ گھونسے تو اس پر کارگر نہ ہوتے۔''

صاحب: (کچھ سوچ کر) ''اچھا آپ ہمارے کسی گھونسے باز کے مقابلے میں کیا کریں گے؟''

آ کا: ''کوئی گھونسے باز سامنے ہو تو بتاؤں، ایک گھونسے کے بعد شاید اس کا ہاتھ مدتوں گھونسہ نہ بنا سکے۔''

صاحب: ''ہم آپ کی اس شیخی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے طریق پر اگر گھونسہ ماروں تو آپ کیا کریں گے؟''

آ کا: (ہنس کر) ''مگر میں آپ کو گھونسہ مارنے کی صلاح نہیں دوں گا۔ آپ حاکم وقت ہیں اور میں ایک گوشہ نشین امن پسند۔''

صاحب: ''کچھ مضائقہ نہیں۔''

ڈپٹی صاحب: ''کوئی دوسرا انگریز اس وقت دلی میں ایسا نہیں جو گھونسہ بازی جانتا ہو؟''

صاحب: (گھنٹہ کی طرف دیکھ کر) ''قلعہ میں ایک میجر ہمارا دوست ہے، گھونسہ بازی کا پورا مشاق ہے۔ وہ شاید ابھی آجائے۔''

اتنے میں بیرے نے آ کر میجر کا کارڈ دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلالیا۔ دو چار باتوں کے بعد صاحب نے میجر سے کچھ انگریزی میں کہا۔ اس نے آ کا کی طرف بغور دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا ''ہم بڈھا آدمی ہم سے گھونسہ بازی کرنا مانگتا ہے؟''

آ کا: ''بازی وازی ہم کچھ نہیں جانتے۔''

میجر: ''پھر؟''

آ کا: ''تم گھونسہ چلاؤ، ہم دیکھیں وہ کیا چیز ہے۔''

میجر: ''تم کیا کرے گا۔ اگر مر گیا؟''

آ کا: ''خون معاف، لیکن اگر تمہارا ہاتھ ٹوٹ گیا۔''

میجر: ''(قہقہہ لگا کر)'' کچھ پروا نہیں۔''

آخر فیصلہ یہ ہوا جہاں تک ممکن ہو ضرب شدید سے احتیاط رکھی جائے۔ چنانچہ میجر صاحب نے کوٹ اتار دیا۔ قمیض کی آستینیں چڑھا لیں اور آ کا کی طرف اشارہ کیا کہ'' آیئے میدان میں۔''

آ کا: ''آپ گھونسہ بازی شروع کیجئے۔''

میجر: (ہنس کر) ''بیٹھے بیٹھے لڑے گا؟''

آ کا: ''لڑنا کیسا، تمہارے صاحب کو ایک ذرا سا چٹکلا دکھانا ہے۔'' میجر صاحب نے ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سید ہادی حسین سے کچھ کہا۔ سید صاحب نے گردن ہلا دی۔ صاحب نے میجر کو اشارہ کر دیا۔ وہ پینترا بدلتا گھونسے ہلاتا آ کا پر چلا۔ آ کا دیکھتے رہے۔ جب میجر صاحب آ کا کے قریب پہنچے اور گھونسہ ان کے منہ پر مارنا چاہا تو یکا یک معلوم ہوا جیسے کسی درخت کا گدا ٹوٹا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی جناب میجر زمین پر چت پڑے ہوئے دکھائی دیئے اور آ کا صاحب پہلے کی طرح بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ صاحب اور ڈپٹی صاحب اٹھ کر میجر کے قریب گئے۔ پوچھا: ''کیا ہوا۔'' کہنے لگا۔ ''ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہم نے گھونسہ مارنا چاہا، بڈھے نے ہاتھ مروڑ کر ہمیں گرا دیا۔''

صاحب: (آ کا سے) ''ہم تو کچھ نہیں دیکھ سکے۔''

آ کا: ''آپ کہاں چلے گئے تھے۔''

صاحب: ''ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے فن کا میجر صاحب کے فن سے دو چار منٹ مقابلہ ہوگا اس لیے پوری توجہ نہیں کی۔''

آ کا: ''ہمارے فن میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا کیا معنی؟ میجر صاحب نے گھونسہ مارا، ہم نے کیلی کر کے انہیں بچھاڑ دیا البتہ اتنی رعایت کہ کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ اگر ایسے موقعے پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کہنی اتر جاتی یا بازو ٹوٹ جاتا۔''

صاحب: ''کیلی کیا؟''

آ کا: ''ہتھیار چھیننے کا ایک داؤں ہے، مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیتے ہیں۔''

صاحب: ''مگر آپ نے تو بجلی کی سی پھرتی کی۔''

آ کا: ''ہمارے فن میں پھرتی ہی سے سارے داؤں ہوتے ہیں۔''

میجر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو پہونچے سے لے کر شانے تک سہلایا۔ اس کے بعد آ کا کے قریب آ کر آ کا کو پہلے تو بڑے غور سے دیکھا۔ ان کی تیوری پر بل نہ کپڑوں پر شکن، نہ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ پھر بڑے تپاک اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آ کا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ'' کیا آپ طمنچہ اور بندوق کی گولی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔''

آ کا: ''بندوق مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دفعہ شاید اس کی گولی بھی بچا جائیں گے۔''

صاحب: ''ناممکن ہے۔''

آ کا: ''آپ نے گھونسے بازی کا تماشا تو دیکھ ہی لیا۔ اب ان سے کہیے کہ طمنچہ چلائیں، خدا نے چاہا تو چلنے سے پہلے طمنچہ زمین پر پڑا ہو گا۔''

صاحب نے میجر کی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ لگے ہاتھوں اس بڈھے کا یہ کمال بھی دیکھ لینا چاہیے لیکن ریوالور میں کارتوس نہ ہو تا کہ اسے نقصان نہ پہنچے اور صاحب نے اپنا ریوالور لا کر میجر کو دیا۔

آ کا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میجر نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور تانا۔ ریوالور بندوق کی طرح نشانہ باندھ کر نہیں مارا جاتا بلکہ اس کی نال اونچی کر کے آہستہ آہستہ سیدھا کر کے مقابل پر جھونکتے ہیں۔ چنانچہ میجر نے ریوالور ابھی سیدھا بھی نہیں کیا تھا اور اس کی گھوڑی دبانی چاہتے تھے کہ آ کا ایک دفعہ ہی اپنی جگہ سے اڑے۔ ریوالور کی نال سیدھی ہونے نہیں پائی تھی، ہاتھ نیچے آ ہی رہا تھا کہ آ کا کے ہاتھ کی گدی اس کی کلائی پر اس زور سے پڑی کہ ریوالور چھوٹ کر دور جا پڑا اور میجر صاحب ہاتھ پکڑ کر رہ گئے۔ آ کا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

صاحب: ''آپ نے کیا کیا؟''

آ کا: (مسکرا کر) ''اسے ہت کٹی کہتے ہیں، میرے پاس لکڑی ہوتی تو یہی داؤں لکڑی سے کرتا۔ لکڑی نہیں تھی، میں نے لکڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدی سے لیا۔''

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت متعجب ہوئے۔ سید ہادی حسین خاں سے آ کا کی تعریف کی اور فرمایا ''کہ اگر یہ ہم سے کبھی کبھی ملتے رہیں تو اچھا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد آ کا رخصت ہو کر گھر آ گئے اور اس روز سے مرزا رفو گر کی دکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔

اب ایسے لوگ کہاں، قلعہ کی جو رہی سہی یادگاریں تھیں وہ بھی اٹھ گئیں۔



رشید جہاں

نام	:	رشید جہاں بیگم عرف: ''رشیدہ''
قلمی نام	:	رشید جہاں/ڈاکٹر رشید جہاں
پیدائش	:	۲۵ اگست ۱۹۰۵ء، بمقام: دہلی
وفات	:	۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء مدفین: ماسکو (سوویت یونین)
تعلیم	:	میٹرک کولیشن: ویمنس مسلم گرلز کالج علی گڑھ، ۱۹۲۲ء
		ایف۔ایس سی: از بیلا تھوبرن کالج لکھنؤ: ۱۹۲۴ء
		ایم۔بی۔بی۔ایس: لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج، دہلی: ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۹ء

مختصر حالات زندگی

ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے کے بعد یو۔پی میڈیکل سروس اختیار کی۔ میڈیکل ملازمت کے سلسلے میں کانپور، (لیڈی ڈفرن ہسپتال) دہلی، بلند شہر اور (کوئین میری ہسپتال) لکھنؤ میں قیام رہا۔ انڈین پیپلز تھیٹرز کی بانی ممبر تھیں۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں محمود الظفر، (وائس پرنسپل ایم۔اے او کالج امرتسر) سے بہرائچ میں شادی کے بعد سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر امرتسر آ گئیں اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کی۔ سادہ اور بے تکلف، منہ پھٹ اور لڑاکا مشہور تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں راسخ العقیدہ مارکسی ہوئیں اور اکثر کھدر کے لباس میں ملبوس نظر آئیں۔ ہڑتالیں کیں اور جیل کاٹی۔

۱۹۳۷ء میں میاں بیوی سب کچھ چھوڑ چھاڑ یورپ کے سفر پر نکلے۔ واپسی پر جب محمود الظفر نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا تو دونوں دہرہ دون میں رہائش پذیر ہوئے۔ وہاں کچھ مدت رشید جہاں نے پرائیویٹ پریکٹس بھی کی لیکن زیادہ تر دونوں نے سماجی و سیاسی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ واضح رہے کہ رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ نے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ واضح رہے کہ رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں اور والدہ وحید جہاں بیگم عرف ''اعلیٰ بی''، اپنے زمانے کے بہت بڑے سماجی کارکن تھے۔ وہ مسلم گرلز اسکول

علی گڑھ اور ویمنس کالج علی گڑھ کے بانی اور تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ رشید جہاں اور محمود الظفر، کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ ۱۹۳۲ء میں رشید جہاں اور محمود الظفر، لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ رشید جہاں نے یہاں بھی پرائیویٹ پریکٹس جاری رکھی اور آل انڈیا ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچر بڑی تعداد میں لکھے۔ ۱۹۴۲ء میں بیمار ہوئیں اور ۱۹۵۰ء میں معلوم ہوا کہ رشید جہاں سرطان کی مریضہ ہیں۔ وہ ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو بمبئی سے بذریعہ ہوائی جہاز علاج کے لیے ماسکو چلی گئیں۔ وہاں تین ہفتے علاج ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہیں انتقال کیا اور ویڈنسکی گورستان، ماسکو میں دفن ہوئیں۔ آل احمد سرور نے بجا فرمایا تھا کہ ''جو لوگ رشید جہاں سے ذرا قریب رہے ہیں، اُس شعلہ مجسم، آتش بیان اور پیکرِ سیماب کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔''

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

انگریزی میں ایک افسانہ ''سلمیٰ'' جو ازابیلا تھوبرن کالج لکھنؤ کے کالج میگزین میں ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ جس کا بعد میں آل احمد سرور نے اردو ترجمہ کیا۔

نوٹ: واضح رہے کہ رشید جہاں نے اپنے ابتدائی اردو افسانے کالج میگزین میں مختلف مردانہ ناموں سے شائع کروائے۔ کالج کے لیے بڑی تعداد میں ڈرامے لکھے اور ان میں اداکاری بھی کی۔ اداکاری کے میدان میں ان کی سگی بہن خورشید جہاں (المعروف رینو کا دیوی/ بیگم خورشید مرزا) نے شہرت پائی۔ رینو کا دیوی فلم ''بھابی''، ''جیون پربھات'' اور ''غلامی'' جیسی مشہور فلموں کی ہیروئن تھیں۔ جب کہ ان کے بھائی محسن عبداللہ بمبئی ٹاکیز سے متعلق رہے۔ محسن عبداللہ کی بیوی اداکارہ پراسرار نینا (فلم: ''ایک رات'' (۱۹۴۲ء) ''من کی جیت'' اور ''پرتھوی راج سنیوگتا'' کی ہیروئن) ۱۹۴۶ء میں مشہور ہدایت کار اور فلم ساز ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی فلم ''میرابائی'' میں کام کرنے کے دوران اُن سے طلاق لے کر ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی ہو گئی۔ تب سے محسن عبداللہ کراچی میں گوشہ گیر ہو گئے۔ نینا کا اصل نام شاہدہ تھا اور وہ لکھنؤ کے سابق سٹی مجسٹریٹ کی بیٹی تھی۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''انگارے'' مرتبہ: احمد علی (بہ اشتراک: احمد علی، سجاد ظہیر و محمود الظفر) اس مجموعے میں رشید جہاں کا ایک افسانہ بعنوان ''دلی کی سیر'' اور ایک ڈراما بعنوان ''پردے کے پیچھے'' شامل ہے۔ — طبع اوّل: دسمبر ۱۹۳۲ء

۲۔ ''عورت اور دیگر افسانے'' (افسانوی مجموعے) (صفحات ۱۱۴) ہاشمی بک ڈپو، ریلوے روڈ، لاہور — طبع اوّل: نومبر ۱۹۳۷ء
اس مجموعے میں چھ افسانے بعنوان ''سودا''، ''میرا ایک سفر''، ''سڑک''، ''پُن''، ''غریبوں کا بھگوان'' اور ''استخارہ'' کے علاوہ ایک ڈراما بعنوان ''عورت'' شامل ہے۔ ایک ایکٹ کے اس ڈرامے نے کتاب کے ۵۴ صفحات گھیر رکھے ہیں۔

۳۔ ''شعلۂ جوالہ'' (افسانوی مجموعہ) مرتبہ: ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر طبع اوّل: ۱۹۶۸ء

اس مجموعے میں گیارہ افسانے بعنوان ''افطاری''، ''مجرم کون''، نامی پریس، نخاس لکھنؤ
''چھدا کی ماں''، ''فیصلہ''، ''صفر''، ''آصف جہاں کی بہو''،
''وہ''، ''ساس اور بہو''، ''اندھے کی لاٹھی''، ''وہ جل گئی'' اور
''بے زبان'' کے علاوہ ایک ڈراما شامل ہے۔

۴۔ ''وہ اور دوسرے افسانے'' (افسانے، ڈرامے اور ایک مضمون) مطبوعہ: رشید جہاں یادگار کمیٹی، نئی دہلی طبع اوّل: ۱۹۷۷ء
(کل ۲۰۴ صفحات)

اس کتاب میں گیارہ افسانے بعنوان ''افطاری''، ''آصف جہاں کی بہو''، ''چور''، ''سودا''، ''چھدا''، ''وہ''، ''ساس اور بہو''، ''میرا ایک سفر''، ''بے زبان''، ''مجرم کون'' اور ''صفر'' کے علاوہ چھ ڈرامے بعنوان ''گوشۂ عافیت''، ''ہندوستانی''، ''پردے کے پیچھے''، ''پڑوسی''، ''عورت'' اور ''کانٹے والا'' کے علاوہ ایک مضمون ''منشی پریم چند اور ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس'' شامل ہے۔ کتاب کا آغاز ''اعتراف'' کے عنوان سے آنند نرائن ملا نے اور پیش لفظ سید نور الحسن نے لکھا ہے۔ کتاب میں رشید جہاں سے متعلق ہاجرہ بیگم اور ڈاکٹر پرائس کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

نوٹ: رشید جہاں نے کل تیس افسانے اور نو ڈرامے تخلیق کیے۔ انگریزی میں مضامین اور افسانے اس کے علاوہ ہیں۔

غیر مدوّن:

رشید جہاں کے جملہ انگریزی افسانے اور چھ مضامین تا حال یکجا نہیں ہو سکے۔ مضامین کے عنوانات ہیں: (۱) پریم چند اور ادیبوں کی پہلی کانفرنس۔ (۲) ہماری آزادی۔ (۳) اردو ادب میں انقلاب کی ضرورت۔ (۴) عورت گھر سے باہر۔ (۵) ادب اور عوام۔ (۶) چندر سنگھ گڑھوالی

نظریۂ فن:

''میں اپنے افسانوں میں یہی کوشش کرتی ہوں کہ جو میرے خیال ہیں ان کی ترجمانی ایمانداری سے کروں۔''

بہ حوالہ: ''میرا بہترین افسانہ'' مرتبہ: محمد حسن عسکری

نئی بہو کے نئے عیب

رشید جہاں

لو آج صبح ہی سے انہوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔

اے بہن کیا پوچھتی ہو کہ تمہاری ساس کیوں خفا ہو رہی ہیں۔ ان کی عادت ہی یہ ہے۔ ہر آئے گئے سب کے سامنے میرا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ ساری دنیا کے عیب مجھ میں ہیں۔ صورت میری بُری، پھوہڑ میں، بچوں کو رکھنا میں نہیں جانتی، اپنے بچوں سے مجھے دشمنی، میاں کی میں بیری، غرض کہ کوئی برائی نہیں جو مجھ میں نہیں اور کوئی خوبی نہیں جو اُن میں نہیں۔ اگر میں کھانا پکاؤں تو زبان پر رکھ کر فوراً تھوک دیں گی اور وہ نام رکھیں گی کہ خدا کی پناہ کہ دوسرا ابھی نہ کھا سکے۔ شروع شروع میں تو مجھے کھانا پکانے میں کافی دلچسپی تھی۔ تم جانتی ہو کہ اپنے گھر پر بھی اکثر پکا لیتی تھی اور میری اماں کو اتنا اچھا کھانا پکانا آتا ہے کہ اپنے رشتے داروں میں ہر جگہ مشہور ہیں۔ یہاں تو جو پکایا اس میں برائی نکلی کہ نمک تو دیکھو زہر، مزا ایسا کہ مٹی کھالو، ایک دن خود ہی بڑے پکائے کہ ہمارے سسر نے کہا کہ ایسے واہیات بڑے کس نے بنائے ہیں۔ خوب بڑبڑائیں کہ بس تمہیں تو بہو کے ہاتھ کی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ ساری عمر یہی تو پکا پکا کر کھلاتی رہی ہے۔ اب میں کیا بولتی خوب ہنسے کہ لو تمہارا صبر پڑا۔ میں نے سوچا کہ کام کرو اور باتیں بھی سنو تو اس سے بہتر نہ ہی کرو۔ کھانے پکانے پر ہی کیا ہے۔

سینے پرونے میں جو کبھی کبھار ایک آدھ چیز درزی سے سلوالوں تو بس پھر سنو۔ مہینوں ہر آئے گئے کے سامنے تذکرہ ہوتا ہے کہ ہماری بہو صاحب تو میم صاحب ہیں۔ وہ تو درزی سے سلواتی ہیں۔ ہر چیز درزی سے سلواتی ہیں۔ ہر چیز، اپنے بچوں کی، اُن کے کرتے پاجامے خود ہی سیتی ہوں لیکن کبھی کبھار کسی نئی قسم کی بلاؤز یا کوٹ کو دل چاہنے لگے تو درزی کو دے دیتی ہوں۔ چھپا کر دیتی ہوں۔ پھر بھی ان کے اتنے مخبر میرے پیچھے لگے رہتے ہیں کہ ہر بات کی خبر کر ہی دیتے ہیں۔ جب میں نئی نئی آئی تو ان کا ایک چکن کا کرتہ میں نے سی دیا تھا۔ ہر ایک کو دکھایا گیا اور برائی کی گئی۔ جو دیکھے چپ ہو جائے۔ اچھے خاصے کرتے کی کوئی کیسے برائی کر دے۔

جب کسی نے برائی نہ کی تو اس کو سارے ادھیڑ ڈالا اور پھر کسی اور سے سلوایا۔ دل تو میرا بھی چاہا کہ اب سب کو دکھاؤں۔ لیکن میں یہ

کیسے کرسکتی تھی۔ وہ بڑا ہونے اور ساس بننے کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہر وقت پڑھا لکھا ہونے کا طعنہ ہے۔ کوئی کتاب میرے ہاتھ میں دیکھیں تو جل جاتی ہیں۔ کسی کو خط لکھتا دیکھ لیں تو سمجھتی ہیں کہ ان ہی کی برائی لکھ رہی ہوں۔ کوئی بات ہی ان کو میری پسند نہیں اور سب سے بری بات جو لگتی ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی کبھی خوش نہ رہیں۔ کبھی اگر یہ کچھ میرے لیے لے آئیں اور خبر ہو جائے تو جل بھن کر رہ جاتی ہیں اور اٹھتے بیٹھتے ان کو طعنے دیتی ہیں کہ "تم تو بیوی کے غلام ہو" ہر وقت میری برائی ان کے سامنے کرتی ہیں۔ وہ سن کر ٹال جاتے ہیں کبھی ماں سے بگڑ بھی جاتے ہیں اور کبھی ہنس کر کہہ بھی دیتے ہیں کہ "ہاں بہت بری ہے، اماں میری دوسری شادی کر دو" اس وقت تو ان کی باتیں سناتی ہیں کہ "جو تمہارے میں یہ ہمت ہوتی تو یہ سر ہی کیوں چڑھتی" اور دوسروں کے سامنے کہتی پھرتی ہیں کہ میرا لڑکا تو اپنی قسمت کو روتا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ دوسری کر دو۔ وہ تو میں ہی ہوں کہ اپنے بچے پر ان بیوی کے لیے ظلم کر رہی ہوں۔ کوئی دوسری والی ہوتی تو کبھی کا کر دیتی۔ نہ اس کروٹ چین ہے نہ اُس کروٹ۔

بچوں کے اوپر لو۔ بالکل ناس ہو گیا ہے۔ جس بات کو میں نا کہوں گی یہ نا۔ جس بات کو منع کروں گی یہ ضرور کر کے دیں گی۔ باہر کوئی سودے والا پکارے، بچے تو ضرور مانگیں گے۔ مجھے یہ سودے والوں سے مکھیوں کا بھنکتا سودا بچوں کو لے کر دینا پسند نہیں۔ میری ضد میں ضرور لے کر دیں گی۔ پچھلے سال برسات میں بڑے لڑکے کو ملائی کی برف کھا کر زور کا بخار چڑھا۔ دو مہینے لیے بیٹھی رہی۔ اس میں ہر وقت لڑائی کہ بچے کو بھوکا مارے دے رہی ہے۔ انجکشن لگوا لگوا کر چھید کر دیے۔ روز نئے نئے تعویز آتے تھے اور ساتھ ہی مولوی صاحب جھاڑ پھونک کے واسطے لائے جاتے تھے۔ جب کسی طرح نہیں مانیں تو میں بیمار بچے کو اٹھا کر ہسپتال لے گئی کہ کچھ آرام ملے۔ وہ تو کہو بے چاری ڈاکٹرنی میری دوست ہے ورنہ کون کسی کی بات سنتا ہے۔ یہ وہاں بھی جا کر چار باتیں ڈاکٹروں، نرسوں کو اور دس مجھ کو سنا آتی ہیں۔

بچوں کو وقت پر دودھ دینے کی ہماری ساس ایسی دشمن ہیں کہ کیا بتاؤں۔ وہ کہتی ہیں کہ ماں ہو کر بچوں کی دشمن ہوں۔ بچے بلکتے رہیں اور میں بیٹھی دیکھتی رہتی ہوں اور میرا دل پتھر کا ہے۔ میں بچوں کو پیدا ہوتے ہی کسی پھل کا عرق یعنی نارنگی یا سیب کا دیتی ہوں۔ جب پہلے بچے کو میں نے دیا تو کھڑی اور بیٹھی پیٹتی تھیں کہ میں ہرگز نہیں دینے دوں گی۔ یہ تو بچے کو نمونیا کر کے مارنا چاہتی ہے۔ ہمارے سسر بچارے بڑے نیک ہیں۔ انہوں نے سمجھایا۔ جب یہ کسی طرح نہیں مانیں تو مجھے میرے میکے چھوڑ آئے۔ چھ مہینے وہاں رہی پھر یہ جا کر لے آئے۔ مہینوں بات نہیں کی رات کو کہتی تھیں کہ بچے کو اپنے پاس سلاؤ۔ میں الگ سلاتی ہوں تو ظلم کرتی ہوں۔ میرے تو تین بچے ہیں۔ سب پہلے دن سے الگ [illegible] تے ہیں کہ کوئی بھوت پریت چمٹ جائے گا۔ بچے کو اٹھا کر اپنے پاس سلاتی تھیں۔ اور تو اور رات [illegible] دیکھو تو دودھ کٹوری سے بتی ڈال کر پلا رہی ہیں۔ جو میں منع کروں تو اٹھواروں کی ٹھن جاتی ہے۔ ہر بچے پر اسی طرح دق کرتی ہیں۔

مجھ کو گندہ، پھوہڑ نہ معلوم کیا کیا کہتی ہیں۔ ذرا ان کی طرف جا کر دیکھو۔ ہر طرف پیک پڑی ہوئی، مکھیاں بھنکتی ہوئی، اس کا نام صفائی ہے۔ اگال دان پاس رکھا ہے لیکن صحن میں جب تھوکیں گی تو زمین پر۔ پاس بیٹھتے ہوئے گھن آتی ہے۔ لیکن میں جو ہر چیز جگہ پر رکھتی ہوں، چلمن مکھیوں کی وجہ سے ڈالتی ہوں تو گندی ہوں۔

اب سال بھر سے یہ خفگی کہ چولھا الگ کر دیا۔ اب کوئی کسی وقت بھی دونوں باورچی خانے جا کے دیکھ لے۔ میرے ہاں کبھی نہ ترکاری چھیلی ملے گی نہ برتن۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے ہاں ایک بھی مکھی نہ ملے گی۔ ان کے ہاں ہر وقت مکھیوں کی بارات لگی ہے۔ کہتی

ہیں کہ میں ہر جگہ گھر میں فنائل ڈال ڈال کر نحوست پھیلاتی ہوں۔ ان کے خیال میں تو سلیقہ کے یہ معنی ہیں کہ نوکروں کو خوب تنگ کرو۔ پیٹ بھر کھانے کو نہ دو۔ ہر ایک روٹی اور چاول اور دال کو بیٹھے بیٹھے گنا کرو۔ نوکر بھی تو آدمی ہوتے ہیں، دو روز میں گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ میں نوکروں کے لیے کپڑے بناتی ہوں۔ زبردستی نہلوا کر بدلواتی ہوں تو کہتی ہیں کہ میاں کے روپے کا درد نہیں، نوکروں کو بادشاہ بنا رکھا ہے اور ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کے نوکر میرے نوکروں کو دیکھ کر خراب ہوئے جاتے ہیں، میں گھر کے سب آدمیوں کو بگاڑ دیتی ہوں۔

اور تو اور گھر میں کوئی آ جائے تو خفا ہوتی ہیں کہ سامنے کیوں ہوتی ہو، پردہ کیوں نہیں کرتیں۔ اب ان کے کئی دوست ہیں جن سے بے تکلفی ہے۔ بھابی بھابی کرتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوا کہ یہ گھر پر نہ ہوئے، بس قیامت اٹھائی کہ میم بن گئی ہے۔ مردوں سے ملتی ہے، بے شرم ہے، نہ معلوم کیا کیا کہا۔ جو میں نے کہا کہ آپ کی لڑکی بھی تو بے پردہ نکلتی ہے۔ اس کا میاں تو زبردستی نکالتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تو اتنی نیک ہیں کہ ان کا نکلنے کو جی نہیں چاہتا اور میاں کے ظلم سے باہر نکلتی ہیں۔ میں اتنی خراب ہوں کہ میاں کی مرضی کے خلاف نکلتی ہوں۔ ہر ایک کے سامنے یہی کہتی ہیں کہ اپنی شرم کو غصہ کا گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا ہے۔ ہماری نند تو کسی مدرسے میں بھی نہیں پڑھیں۔ شادی کے بعد میاں نے پڑھوایا لکھایا۔ ہر جگہ آتی جاتی ہیں اور ہماری ساس کو بھی اچھی طرح معلوم ہے لیکن چھپا جاتی ہیں۔ پچھلی دفعہ آئیں تو میں نے اماں کے سامنے ہی پوچھا کہ سچ بتاؤ کیا زبردستی کی جاتی ہے جب باہر نکلتی ہو یا اپنی مرضی سے؟ وہ بولیں کیوں کیا بات ہے؟ میں تو اپنی مرضی سے نکلتی ہوں۔ اب مجھے کوئی پردے میں رکھنا بھی چاہے تو نہ رہوں۔ تو ہماری ساس سن کر کہتی ہیں کہ میرے لڑکے کو تو مجھ سے چھڑا لیا ہے۔ اس کے دل میں میری نفرت بٹھا دی۔ اب میرے دوسروں بچوں پر بھی ہاتھ صاف کرو۔ ہر میرے بچے کے سامنے میری برائی کیا کرو۔ الٹ بھی ان کا پلٹ بھی ان کا۔ وہی کام میں کروں تو برا ہو جاتا ہے اور ان کی لڑکی کریں تو اچھا ہوتا ہے۔

ان کو کبھی میرے سے ہنس کر بات کرتے تو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ انہیں سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ یہ مجھ سے کیوں محبت کرتے ہیں۔ میں کمرے میں آئی اور جو یہ خوش ہو کر مجھ سے بول لیے تو غضب ہو جاتا ہے۔ اور تو اور ہر وقت میری صورت کی برائی ان کے سامنے ہوتی ہے۔ ان کو کبھی شرارت سوجھتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اماں اور تو سب عیب ہیں لیکن شکل تو بہت اچھی ہے۔ کہنے لگتی ہیں شرم نہیں آتی جورو کی تعریف میرے سامنے کرتا ہے۔ پھر تو وہ میری تعریف کرتی ہیں، ان کو تو ہنسی آتی رہتی ہے میرا دل جل جاتا ہے۔ میں تو چپکی اٹھ کر چلی آتی ہوں۔ ہر وقت میرا مقابلہ بیٹے کے سامنے کرتی رہتی ہیں۔ بھلا کہاں ماں، کہاں بیوی۔ ان کا تو اُس دن کلیجہ ٹھنڈا ہو جس دن یہ مجھے یا تو ماریں یا گھر سے نکال دیں یا دوسری شادی کر لیں۔ اور بھی جو میری دیورانیاں، جٹھانیاں ہیں وہ الگ الگ شہروں میں ہیں۔ جب وہ آ جاتی ہیں تو تھوڑے دن تو ان کی خاطر ہوتی ہے پھر ان میں بھی عیب نکلنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ میں سب کو بلا کر ان کے خلاف "مس کوٹ" بناتی ہے۔ بری تو سب ہی بہوئیں ہیں لیکن سب سے بُری میں ہوں اور بدقسمتی سے تھوڑی پڑھی لکھی ہوں تو میم صاحب کا خطاب مل گیا ہے۔ میں تو، جب یہ اپنی بڑبڑاہٹ شروع کرتی ہیں تو میں ادھر جا کر کواڑ بند کر کے کچھ کام کرنے لگتی ہوں کہ نہ سنوں گی، نہ بُرا لگے گا۔ اب صبح سے اس بات پر بڑبڑا رہی ہیں کہ بچوں کو میں کل ٹائیفائڈ کے ٹیکے لگوا دیے۔ اُن کو تھوڑا تھوڑا بخار ہے۔ بڑا بیٹا بہت لاڈلا ہے۔ وہ جا کر پاس لیٹ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جو باتیں سنانی شروع کی ہیں، اب دو گھنٹے تو ہو گئے۔ ابھی دیکھو کب تک سلسلہ چلتا ہے۔

O

غلام عبّاس

نام : غلام عباس

قلمی نام : غلام عباس

پیدائش : ۷ نومبر ۱۹۰۹ء بہ مقام امرتسر مشرقی پنجاب، بھارت

وفات : یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی رات بہ مقام کراچی

تعلیم : ایف۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۴۴ء

ابتدائی تعلیم دیال سنگھ ہائی سکول، لاہور میں پائی۔ تعلیمی سلسلہ ٹوٹ کر جڑتا رہا۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہو سے ادیب عالم کیا، ۱۹۴۲ء میں میٹرک اور یہیں سے ۱۹۴۴ء میں ایف۔اے کیا۔ بی۔اے کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن حالات نے اجازت نہ دی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے والد کا نام میاں عبدالعزیز تھا۔ غلام عباس کی تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی اور ادبی زندگی کا آغاز تیرہ برس کی عمر میں ہوا جب دیال سنگھ ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۲۲ء کا ہے جب انہوں نے اپنا اولین افسانہ ''بکری'' قلم بند کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کا پہلا ترجمہ ''جلاوطن'' (مصنف ٹالسٹائی) جنوری ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۷ء بچوں کے معروف رسالے ''پھول'' لاہور اور خواتین کے مجبوب پر ''تہذیب نسواں'' کے نائب مدیر رہے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں پرچے دارالاشاعت لاہور کے مالک اور ادبی دنیا کی مشہور ومعروف ہستی امتیا علی تاج کی زیرنگرانی نکلا کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے منسلک ہوئے اور ریڈیو کے رسالہ ''آواز'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اسی سال ریڈیو کا ایک اور رسالہ بہ زبان ہندی ''سارنگ'' بھی جاری کیا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے، ریڈیو

کی ملازمت برقرار رہی۔ ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان کا رسالہ ''آہنگ'' ان کی ادارت میں جاری ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں کچھ وقت مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات سے وابستہ ہوکر بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں بی بی سی لندن سے بطور پروگرام پروڈیوسر وابستہ ہوئے، ۱۹۵۲ء میں وطن واپس آ کر ایک بار پھر ''آہنگ'' کی ادارت سنبھالی جہاں سے ۱۹۶۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ بی بی سی کی ملازمت کے دوران فرانس اور سپین میں کچھ وقت گزارا۔ تین شادیاں کیں، پہلی شادی ۱۹۲۹ء میں زاہدہ نامی ایک کشمیری لڑکی سے، جسے چند برس بعد طلاق دے دی۔ دوسری شادی ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ سے متعلق ذاکرہ بیگم سے (جن سے ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں) اور تیسری شادی ایک برطانوی خاتون سے، جنھوں نے مولانا احتشام الحق کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ اِس شادی سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ غلام عباس نے ریٹائرڈ زندگی کراچی میں گزاری۔ یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی رات حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوا اور پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''جاں نثار دوست''، مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور، اکتوبر ۱۹۲۷ء

۲۔ ''قربانی'' مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور، ستمبر ۱۹۲۸ء

۳۔ ''موت کا درخت'' مطبوعہ: ''نیرنگِ خیال'' لاہور، ۱۹۲۹ء

اوّلین مطبوعہ تحریر:

''جلاوطن'' (ٹالسٹائی کی کہانی کا ترجمہ) مطبوعہ: ''ہزار داستاں'' ۱۹۲۴ء

اوّلین تحریر:

''بکری'' (کہانی) تکمیل: ۱۹۲۲ء (اس وقت دیال سنگھ ہائی اسکول، لاہور کے طالب علم تھے)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱	''آنندی'' (دس افسانے) (۱) ''جواری'' (۲) ''ہمسائے'' (۳) ''کتبہ'' (۴) ''حمام میں'' (۵) ''ناک کاٹنے والے'' (۶) ''چکر'' (۷) ''اندھیرے میں'' (۸) ''سمجھوتہ'' (۹) ''سیاہ و سفید'' (۱۰) ''آنندی''	مکتبہ جدید لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۲	''جاڑے کی چاندنی'' (چودہ افسانے)	سجاد اینڈ کامران پبلشر، کراچی	طبع اول: جولائی ۱۹۶۰ء

۱۔''اوور کوٹ'' ۲۔''اس کی بیوی'' ۳۔''بھنور'' ۴۔''بانسے والا''
۵۔''سایہ'' ۶۔''سرخ جلوس'' ۷۔''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون''
۸۔''بردہ فروش'' ۹۔''تنکے کا سہارا'' ۱۰۔''پتلی بائی'' ۱۱۔''مکرجی
بابو کی ڈائری'' ۱۲۔''ایک دردمند دل'' ۱۳۔''دو تماشے''
۱۴۔''غازی مرد''

۳	''کن رس'' (نو افسانے)	الشال، لاہور	طبع اوّل: دسمبر ۱۹۶۹ء

۱۔''کن رس'' ۲۔''بہروپیا'' ۳۔''بحران'' ۴۔''سرخ گلاب''
۵۔''یہ پری چہرہ لوگ'' ۶۔''جوار بھاٹا'' ۷۔''فراز'' ۸۔''لپک''
۹۔''اوتار''

نوٹ: غلام عباس کے افسانوی مجموعوں میں کل ۳۳ افسانے یکجا ملتے ہیں اور اگر ان میں درج ذیل چھ افسانوں:

(۱) ''مجسمہ'' مطبوعہ: ''کارواں'' لاہور، ۱۹۳۳ء
(۲) ''نواب صاحب کا بنگلہ'' مشمولہ: ''۱۹۷۱ء کے منتخب افسانے'' مرتبہ: ناصر زیدی، ص ۹ تا ۱۱
(۳) ''رینگنے والے'' جریدہ، پشاور (۱) ص ۲۴۹ تا ۲۵۹
(۴) ''روحی'' تخلیقی ادب (۱) ص ۲۴۲ تا ۲۵۹
(۵) ''بندروالا'' افکار، اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۵۳ تا ۵۶
(۶) ''محبت کا گیت'' محررہ: ۳۴۔۱۹۳۳ء

کو بھی شامل کرلیا جائے تو ان کے افسانوں کی کل تعداد ۳۹ ہو جاتی ہے۔ جس سے ان کی سست رفتاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۴	''جزیرہ سخنوراں'' (طنزیہ)	کتب خانہ ہزار داستان: دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

پہلے یہ کتاب ہفتہ وار ''شیرازہ'' میں قسط وار شائع ہوئی۔ اس تصنیف
کا بنیادی خیال آندرے موروا کے ایک طنزیہ سے مستعار ہے۔

۵	''دھنک'' (افسانوی تحریر)	سجاد کامران پبلشرز، کراچی،	طبع اوّل: جون ۱۹۶۹ء
۶	''گوندنی والا تکیہ'' (ناول)	سجاد کامران پبلشرز، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۴ء
۷	''الحمرا کے افسانے'' (از واشنگٹن ارونگ کا ترجمہ)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء
۸	''زندگی، نقاب، چہرہ'' (منتخب افسانے)		طبع اوّل: ۱۹۸۴ء
۹	''برف کی بیٹی'' (بچوں کے لیے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل ۱۹۳۳ء
۱۰	''چاند کی بیٹی'' (بچوں کے لیے)، (جاپانی کہانیاں)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۱۱	''ثریا کی گڑیا'' (بچوں کے لیے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۱۲ ''چاند تارا'' (بچوں کے لیے نظمیں)

۱۳ ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
(از ایوب خان کا ترجمہ) یہ فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کی
انگریزی خودنوشت ''Friends Not Masters'' کا ترجمہ
ہے۔ کل صفحات ۴۳۰ ہیں۔

۱۴ ''دنیا کے شاہکار افسانے'' (تین جلدیں'' بہ اشتراک ترجمہ) مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن طبع اوّل: ۲۳-۱۹۲۲ء
مرتبہ: عبدالقادر سروری

۱۵	''جادو کا لفظ'' (بچوں کے لیے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: لگ بھگ ۱۹۳۷ء
۱۶	''ایک آنکھ والا دیو'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۱۷	''شہزادہ اور گلاب'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۱۸	''کھلونوں کی بستی'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۱۹	''سفر ورلڑکی'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۲۰	''اندھا فقیر'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۲۱	''ایک ٹانگ کا بادشاہ'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۲۲	''جلاوطن'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۲۳	''غلام عباس کے دس بہترین افسانے''	تخلیقات لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء

زندگی میں مستقل پتا:

مکان نمبر ۷، ایچ بلاک ۴، پیر الٰہی بخش سوسائٹی، کراچی، پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس پرائز برائے ''آنندی'' ۱۹۴۸ء
۲۔ پاکستان رائٹرز گلڈ، آدم جی ادبی انعام برائے ''جاڑے کی چاندنی'' ۱۹۶۰ء
۳۔ ستارۂ امتیاز (حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز) ۱۹۶۷ء
۴۔ چیکوسلواکیہ بین الاقوامی افسانوی ادب انعام برائے ''آنندی''

ان کے بین الاقوامی شہرت کے حامل افسانہ ''آنندی'' پر بھارت کے عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار شیام بینیگل نے ۱۹۸۳ء میں فلم ''منڈی'' بنائی۔ فلم کے اداکاروں میں نصیرالدین شاہ، شبانہ اعظمی اور سمیتا پاٹل نمایاں تھیں۔

نظریۂ فن:

''افسانہ نگاری، ادب کی سب سے زیادہ آسان صنف ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی جو صرف خط لکھنا جانتا ہو، تھوڑی سی کوشش سے افسانہ لکھ سکتا ہے بشرطیکہ۔۔۔ یہ جانتا ہو کہ زندگی کی حقیقتوں کو کم سے کم لفظوں میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے اور افسانہ، نثر کی تمام اصناف میں اسی لیے برتری رکھتا ہے کہ وہ چند صفحات میں لکھا جا سکتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پیش کر سکتا ہے۔''

(بحوالہ: ایک انٹرویو از اطہر نفیس، روزنامہ ''جنگ'' کراچی، ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء)



حوالہ جات:

۱۔ بیشتر کتب میں سنہ پیدائش ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء درج ہے، جو درست نہیں۔

۲۔ اکثر محققین نے غلام عباس کا پہلا مطبوعہ افسانہ ''مجسمہ'' مطبوعہ: ''کارواں'' لاہور ۱۹۳۳ء بتایا ہے، جو درست نہیں۔

آنندی

غلام عباس

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک وقوم کے سچے خیرخواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے۔ نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے:

''......اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساڑیوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پر مسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔''

''......اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ ہمارے نونہالان قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا۔ انہیں بھی صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگار کئے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوت حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار جوانی کے نشے میں محو، سود و زیاں سے بے پرواہ نونہالان قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسن زاہد فریب ہمارے نونہالان قوم کو جادہ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب،

''اس موقع پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے، اور اعدادوشمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے۔

''صاحبان، واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہوگیا ہے۔''

ایک رکن جو چشمہ لگائے تھے اور ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا ''حضرات ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی کاری اور پرہیزگاری اٹھتی جارہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دوردورہ ہوتا جارہا ہے، منشیات کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ قتل وغارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنان بازاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوکر ہوش وخرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے ہر جائز وناجائز طریقہ سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی وکوشش میں جامہ انسانیت سے باہر ہوجاتے اور قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جان عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔''

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سردوگرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکش حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل وعیال کو اپنے سایہ میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے۔ تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے صاحبان رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ۔ ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شوروغل ہاہاہا ہوہوہو، سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کرسکتا ہے۔

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑجاتا ہے۔''

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا، اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر سر بڑا تھا۔ جس کی وجہ سے بُردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے ''حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب وتمدن کے لیے باعث صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑدیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟''

ایک صاحب بول اٹھے: ''یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟''

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور وہاں کی ماتمی فضا میں یکبار شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے۔ ''حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔''

اس پر ایک صاحب بولے۔ ''بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔''

صدر نے کہا۔ ''صاحبان یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔''

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انہیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دیہاڑے الو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے، یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف۔ چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادل ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ اچھی خاصی مالدار تھیں اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر

تھی، منتخب کی گئی زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابک دست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان گاڑیوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی صاحب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور ایک ہنگامہ رہتا۔ اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے، اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے، سب سے پہلے اسی کی مرمت کی چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا۔ اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے، جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دوڈھائی سو راج، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے، اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا، پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کے آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت، میر عمارت، منشی، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا، پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنجسورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا۔ اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا، کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا، بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی، پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے، کسی کسی دن وہ دو پہر کے کھانے سے فارغ ہو

کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے، اوباش و بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرد اگرد چکر لگاتے رہتے فقرے کستے بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن، پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی میں ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو دحشت ہوتی تھی، وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتیں تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا۔ جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن ایک صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر، لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا، اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر تو دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا'' جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا، ان کے مجاور تھے۔'' اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کراماتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھی۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے، جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدہ کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن، اسی بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو، بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہونگے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر

چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا، جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے، عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے، ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے، اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنین اٹھکیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص اور سرور کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری، چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا، یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں، بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتی آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں، پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں جن کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز، قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے۔ جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکان دار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے ممبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تا کہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھول اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی، بعض ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں بھی پرانے رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ، تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن

ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا چونکہ دکان خاصی کھلی تھی۔ ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال ایک ایک مکان پر لے جاتا۔ اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ، سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان پر ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکتے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار، جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے۔ ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر رکھتے ہوئے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں، ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ

ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا، جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکان دار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی، سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا، غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی، جب تک تو یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں پڑھنے آنے لگے، جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرایہ اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر ایکٹری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی کرتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور وغل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسری اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ بکتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے ''آؤ، کوئی نئی بستی کو'' شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے، تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگتے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے، جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بے وقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان

بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں۔ مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی، جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانہ کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا۔ جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے، دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں ہوٹل کھل گیا۔ جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا......

اس واقعہ کو بیس برس گزر چلے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی، آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں، جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں، اور چار بینک جن میں سے دو دنیا کے بڑے

بڑے بینکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے ''حُسن آباد'' کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے ''حُسن آباد'' کے ''حَسن آباد'' کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں امتیاز نہ کرتے آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا۔ جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے ''آنندی''۔

یوں تو سارا شہر بھرا پڑا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے، جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے، کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں: ''معلوم نہیں، وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی......''

اس مرتبہ ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔



عزیز احمد

نام	:	عزیز احمد
قلمی نام	:	عزیز احمد عثمان آبادی/عزیز احمد
تاریخ پیدائش	:	۱۱نومبر۱۹۱۳ء ضلع بارہ بنکی، حیدرآباد (دکن)
تاریخ وفات	:	۱۶دسمبر۱۹۷۸ء ٹورنٹو، کینیڈا
تعلیم	:	بی۔اے (آنرز) مضامین: اردو، انگریزی، فارسی (درجہ اوّل) جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۳۴ء بی۔اے (آنرز) انگریزی زبان وادب، لندن یونیورسٹی ۱۹۳۸ء ڈی۔لٹ (اعزازی) بطور اعتراف تواریخی تحقیقات، لندن یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

مختصر حالات زندگی:

عزیز احمد نے بطور ہفت زباں مترجم، افسانہ نگار، ناولسٹ، اقبال شناس، غزل گو، محقق اور ناقد کے شہرت پائی۔

عزیز احمد کے والد بشیر احمد کاکوری کے محلّہ گھما محل میں اقامت پذیر تھے۔ ان کا شمار حیدرآباد دکن کے نامور وکلاء میں ہوتا تھا۔ عزیز احمد بچپن میں والدین کی شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد اپنے حقیقی ماموں محمد احمد کی سرپرستی میں چلے گئے۔ محمد احمد کا پیشہ وکالت تھا۔

عثمانیہ ہائی سکول عثمان آباد سے عزیز احمد نے میٹرک کے بعد ۱۹۲۸ء میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ایف۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں اعزاز کے ساتھ بی۔اے (آنرز) کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں عزیز احمد کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، مولوی وحیدالدین سلیم اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اساتذہ میسر آئے۔ طالب علمی کے زمانے میں دیگر اساتذہ کی نسبت سب سے زیادہ ربط ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور پروفیسر عبدالقادر سروری سے رہا۔ عبدالقادر سروری کے ماہنامہ مجلّہ ''مکتبہ'' کے لیے بطور معاون کام کرتے رہے۔ بی۔اے (آنرز) کے بعد مولوی عبدالحق کی کوششوں سے عزیز احمد کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا، سو ۱۹۳۵ء میں انگلستان چلے گئے۔ لندن یونیورسٹی میں قیام کے دوران ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے توسط سے ای۔ایم۔فورسٹر سے ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی

سے بی۔اے (آنرز) کی ڈگری لی اور کچھ عرصہ یورپ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ انہی ایام میں فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے کچھ عرصہ منسلک رہے اور فرانسیسی زبان سیکھی۔ ۱۹۳۸ء میں وطن واپسی پر جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی اور ۱۹۴۱ء تک بطور لیکچرر شعبہ انگریزی، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن میں رہے۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۵ء یونیورسٹی میں ہائنس شہزادی درشہوار (نواب میر عثمان علی خاں کی بہو اور زوجہ ولی عہد نظام دکن علی خان بہادر) کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء ریڈر شعبۂ انگریزی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن اور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء پروفیسر کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں استعفیٰ دے کر پاکستان ہجرت کر آئے اور ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات (مطبوعات وفلم سیکشن) کراچی، حکومت پاکستان رہے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۳ء ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ، وزارت امور کشمیر اور ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ، وزارت امور کشمیر رہنے کے بعد برطانیہ چلے گئے۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، لندن میں اوور سیز لیکچرر شعبہ اردو رہنے کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۶۲ء تا وفات، شعبہ اسلامیات ٹورنٹو یونیورسٹی (کینیڈا) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۶۹ء سے کیلی فورنیا یونیورسٹی، لاس اینجلز، امریکہ کے وزیٹنگ پروفیسر تھے۔

آخری عمر میں آنتوں کے سرطان کا شکار ہوئے۔ کینیڈا میں ان کے تین آپریشن کئے گئے۔ آخری آپریشن سے ان کی بڑی آنت نکال کر ایک پلاسٹک کی تھیلی لگا دی گئی تھی۔

عزیز احمد کو عربی زبان کی اچھی شد بد تھی۔ اردو، انگریزی، فرانسیسی اور فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا جبکہ ترکی، اطالوی اور جرمن زبانوں میں گفتگو کر لیتے تھے۔ آخری عمر میں نارویجن زبان سیکھ رہے تھے۔

ٹورنٹو (کینیڈا) میں ان کا قیام سینٹ جان بلڈنگ کے تین بیڈروم اپارٹمنٹ میں رہا۔ وفات (۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء) کے ٹھیک چھ ماہ بعد ان کی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی۔ ٹورنٹو (کینیڈا) میں دفن ہوئے۔

اوائل ۱۹۷۵ء میں آخری بار قائداعظم میموریل لیکچرز کے سلسلے میں اسلام آباد (پاکستان) آئے۔ ان کی آخری پبلک میٹنگ ۱۸ نومبر ۱۹۷۸ء کی شام فیض احمد فیض کے اعزاز میں ہونے والے مشاعرہ منعقدہ (ٹورنٹو) کینیڈا میں شرکت تھی۔

ابتدائی مطبوعہ تحریریں:

عزیز احمد نے تصنیف وتالیف کا آغاز ترجمے سے کیا۔ ان کی پہلی دو مطبوعہ تحریریں:

۱۔ ''بچپن'' (رڈیارڈ کپلنگ کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور ''نیرنگ خیال'' شمارہ ستمبر ۱۹۲۸ء

۲۔ ''شریر لڑکا'' (رابندرناتھ ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور ''نیرنگ خیال'' شمارہ دسمبر ۱۹۲۸ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ عزیز احمد نے اپنا اوّلین افسانہ ''کشاکش جذبات'' کے عنوان سے لکھا، جو پروفیسر عبدالقادر سروری کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلّہ ''مکتبہ'' حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ شمارہ نومبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ اس وقت عزیز احمد کی عمر سولہ سال تھی۔

۲۔ عزیز احمد کا دوسرا مطبوعہ افسانہ: ''باغبان'' تھا جو مجلّہ ''عثمانیہ'' جامعہ حیدر آباد، دکن کے شمارہ: ا جلد: ۴ بابت ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

افسانوی مجموعے:

ا۔ ''رقصِ ناتمام'' (گیارہ افسانے) مکتبہ جدید، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

ا۔ ''اور بستی نہیں یہ......'' ۲۔ پاپوش ۳۔ موشکا ۴۔ مدن سینا اور صدیاں ۵۔ رائیگاں تبسم ۶۔ پوشامالن ۷۔ رومتہ الکبریٰ کی ایک شام ۸۔ رقصِ ناتمام ۹۔ زون ۱۰۔ خطرناک پگڈنڈی ۱۱۔ جادو کا پہاڑ (کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا)

۲۔ ''بیکار دن بیکار راتیں'' (سات افسانے) مکتبہ جدید، لاہور طبع اوّل: دسمبر ۱۹۵۰ء

ا۔ ستاپیسہ ۲۔ جھوٹا خواب ۳۔ زریں تاج ۴۔ تصورِ شیخ ۵۔ زرخرید ۶۔ کالی رات ۷۔ بیکار دن بیکار راتیں (یہ مجموعہ احمد علی کے نام معنون کیا گیا ہے)

۳۔ ''خدنگِ جستہ'' (دو طویل افسانے) میری لائبریری، لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۵ء

ا۔ خدنگِ جستہ ۲۔ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

۴۔ ''آبِ حیات'' (تاریخی افسانے) مکتبہ میری لائبریری، لاہور طبع اوّل: س۔ن

(شعلہ زار الفت، میرا دشمن میرا بھائی، مدن سینا اور صدیاں، زریں تاج، ننھ لل، رومتہ الکبریٰ کی ایک شام اور آبِ حیات کل سات افسانوں کا مجموعہ، افتتاحیہ از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں، تعارفی تجزیات از ممتاز شیریں، مسعود جاوید، شہزاد منظر، عتیق احمد اور ابو خالد صدیقی شامل کتاب ہیں) یہ کتاب مکتبہ میری لائبریری سے شائع ہونے والی آخری کتاب تھی۔ اس کے بعد ادارہ ختم ہو گیا۔

نوٹ: مکتبہ اردو، لاہور نے دو افسانوی مجموعے ''میٹھی چھری'' اور ''کایا پلٹ'' کے عنوانات سے شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا لیکن یہ دونوں مجموعے شائع نہ ہو سکے۔

تنقید:

۵۔ ''ترقی پسند ادب'' (تنقیدی تاریخ) حیدر آباد دکن، ادارہ اشاعت اردو طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

۶۔ ''اقبال نئی تشکیل'' (تنقید) کراچی، کتب خانہ تاج آفس طبع اوّل: ۱۹۵۰ء

۷۔ ''شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید'' (بہ اشتراک آل احمد سرور) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

۱۹۷۳ء تک انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے پانچ ایڈیشن شائع کیے۔ یہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۲ء کے شعرا کا انتخاب ہے۔ عزیز احمد نے تمہید کے طور پر ۱۱ صفحات شامل کتاب کیے ہیں۔

۸۔ ''اقبال اور پاکستانی ادب'' لاہور، مکتبہ عالیہ، طبع اوّل: ۱۹۷۷ء

(تنقیدی مضامین: مرتبہ: طاہر تونسوی)

ناول/ ناولٹ:

۹۔	''ہوس'' (ناول)	مکتبہ اردو، سویرا پریس، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۱ء
		لاہور، مکتبہ جدید	طبع سوم: ۱۹۵۱ء
۱۰۔	''مرمر اور خون'' (ناول)	لاہور، مکتبہ اردو، سویرا پریس	طبع اوّل: ۱۹۳۲ء
	(دیباچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق)	لاہور، مکتبہ جدید	طبع دوم: ۱۹۵۱ء
۱۱۔	''گریز'' (ناول)	لاہور، مکتبہ اردو، سویرا پریس،	طبع اوّل: ۱۹۴۲
		لاہور، مکتبہ جدید	طبع سوم: ۱۹۵۵ء
۱۲۔	''آگ'' (ناول)	لاہور، مکتبہ اردو، سویرا پریس	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء
		لاہور، مکتبہ جدید	طبع دوم: ۱۹۴۵ء
۱۳۔	''ایسی بلندی ایسی پستی'' (ناول)	لاہور، مکتبہ جدید	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۱۴۔	''شبنم'' (ناول)	لاہور، مکتبہ جدید	طبع اوّل: ۱۹۵۱ء
۱۵۔	''مثلث'' (ناولٹ)	لاہور، مکتبہ میری لائبریری	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء

(عزیز احمد: حیات و خدمات، از ابو سعادت جلیلی، پیش لفظ از عتیق احمد، ناول کی روایت ''مثلث'' از شمیم احمد شامل کتاب ہیں۔

۱۶۔	''تری دلبری کا بھرم'' (ناول)	لاہور، مکتبہ میری لائبریری	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء

(تعارفیہ، از رفعت نواز، مقدمہ از پروفیسر عبدالسلام شامل کتاب ہیں ص ۹۳)

۱۷۔	''دو تاریخی (تیموری) ناولٹ''	لاہور، مکتبہ میری لائبریری	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء

(کتاب میں، خدنگ جستہ، اور جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں، کے علاوہ تعارف از فاروق عثمان اور افتتاحیہ از ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں شامل ہیں۔ کل صفحات ۱۵۲)

تراجم:

۱۸۔	''معمار اعظم'' (ڈراما از ہنرک ابسن)	دہلی، انجمن ترقی اردو ہند	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

(نارویجن زبان سے ''The Master Builder'' کا انگریزی کی معرفت ترجمہ، پہلے انجمن کے سہ ماہی مجلّہ ''اردو'' دہلی میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ نارویجن زبان انہوں نے بعد میں سیکھی)

۱۹۔	''فن شاعری'' (Poetics از ارسطو)	دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)	طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

(بوطیقا، کا ترجمہ معہ مقدمہ وحواشی۔ آخر میں بطور ضمیمہ مترجم کی طرف سے اشارات وتلمیحات کی وضاحت کردی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۷۷ء میں ۱۲۶ صفحات کی ضخامت میں شائع کیا۔)

۲۰۔ ''رومیو جولیٹ'' (ڈراما از ولیم شیکسپیر) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول: ۱۹۳۱ء

("Romeo and Juliet" کا ترجمہ معہ مقدمہ وحواشی۔ اس ترجمہ کو انجمن نے کراچی سے ۱۹۶۱ء میں دوبارہ شائع کیا۔)

۲۱۔ ''مقالات گارساں دتاسی'' دو جلدیں (از گارساں دتاسی) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)

فرانسیسی زبان سے A Langue Etla Litterature Hindustanies En 1871-1877 کا ترجمہ بہ اشتراک: ڈاکٹر یوسف حسین خان وڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ پہلی جلد یوسف حسین خاں، دوسری جلد اختر حسین رائے پوری و عزیز احمد۔

نظر ثانی: ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ ترجمہ انجمن کے مجلّہ ''اردو'' جلد ۱۹ شمارہ ۴ جولائی ۱۹۳۹ء تا اپریل ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ دوسری بار انجمن نے کراچی پاکستان سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۲۲۔ ''طربیہ خداوندی'' دو جلدیں (Inferno از دانتے) دہلی انجمن ترقی اردو (دہلی) طبع اول: ۱۹۴۳ء

(جرمن زبان سے ترجمہ معہ مقدمہ وحواشی "Divine Commedia" کا ترجمہ دوسری بار انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔)

۲۳۔ ''تیمور'' (از ہیرلڈلیم) لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز
بہ اشتراک موسسہ فرینکلن

(''تمرلین'' کا ترجمہ، امیر تیمور سے متعلق سوانحی فکشن)

۲۴۔ ''چنگیز خان'' (از ہیرلڈلیم' چنگیز خان سے متعلق سوانحی فکشن) لاہور، مکتبہ جدید طبع اول: ۱۹۵۲ء

۲۵۔ ''تاتاریوں کی یلغار'' (از ہیرلڈلیم) لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع دوم: ۱۹۶۰ء

("The March Of The Barbarians" کا ترجمہ، دیباچہ: مولانا غلام رسول مہر۔ بقول مولانا غلام رسول مہر یہ کتاب ''مستقل تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔'' ص۔۴۰۰)

۲۶۔ ''دنیا کے شاہکار افسانے'' حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ طبع اول: ۱۳۴۱ھ مطابق
مرتبہ: عبدالقادر سروری بہ اشتراک عزیز احمد (فرانسیسی افسانے) ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء

(یہ کتاب کئی جلدوں میں شائع ہوئی۔ جرمن افسانے، فرانسیسی افسانے، روسی افسانے اور ولندیزی افسانے، نام کی جلدوں میں عزیز احمد کے تراجم بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی افسانے، نامی جلد میں اناطول فرانس، گاشہ موپاساں، ایمائل زولا، الکش فشیر، وکٹر ہیوگو اور بالزاک کے افسانوں کو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، غلام عباس، معراج الدین شامی اور بدرالدین بدر نے اردو میں منتقل کیا۔)

۲۷۔ رسل کی ایک کتاب کا ترجمہ (تاحال دریافت طلب) دیکھیے،
مکتوبات عبدالحق، مرتبہ: جلیل قدوائی۔ ص ۵۵۴۔

تاریخ / پاکستانیت/ اسلامیات/ سماجیات:

۲۸۔ ''نسل اور سلطنت'' (تاریخ) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

یہ تاریخ سے متعلق عزیز احمد کی طبع زاد تصنیف ہے۔ کل صفحات ۱۸۹۔ آریاؤں کی نسلی برتری کے جرمن ادعا کی تاریخی بنیاد پر تحقیق، علوم الابدان اور سماجیات کے حوالے سے۔

۲۹۔ "Studies in Islamic Culture In The Indian Enviornment" (تاریخ سماجیات)، لندن Oxford Varsity Press طبع اوّل: ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۰ء

۳۰۔ "Islamic Modernism In India and Pakistan" (لندن) Oxford Varsity Press طبع اوّل: ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء

۳۱۔ "An Intellectual History of Islam In India" (جرمنی) Edinburgh Varsity Press طبع اوّل: ۱۹۶۹ء

۳۲۔ "Readings In Muslim Self- Statement In India and Pakistan 1957-1964" (بہ اشتراک Wiesbaden) طبع اوّل: ۱۹۷۰ء

۳۳۔ "Relitgion And Society In Pakistan" (جلد دوم۔ مرتبہ Lieden E.J. Brill) مشمولہ (Contribution To Asian Studies) طبع اوّل: ۱۹۷۱ء

۳۴۔ "A History Of Islamic City" جرمنی، Storia Sella Sicilia Islamica Edinburgh Varsity Press طبع اوّل: ۱۹۷۵ء

۳۵۔ "Intellectual History Of Muslims" طبع اوّل: ۱۹۷۵ء

۳۶۔ "Quqid-e-Azam Memorial Lectures" (سائیکلوسٹائل شدہ)

شاعری:

۳۷۔ ''ماہ لقا اور دوسری نظمیں'' حیدرآباد دکن، اعظم سٹیم پریس طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

اس مجموعے میں ''عمر خیام'' مثنوی مصنفہ ۱۹۳۲ء ''ماہ لقا'' مصنفہ ۱۹۳۸ء اور ''فردوس برروئے زمین'' مصنفہ ۱۹۴۲ء شامل ہیں۔

ترتیب وتہذیب:

۱۔ تحقیقی وادبی مجلّہ ''مکتبہ'' انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔ (پروفیسر عبدالقادر سروری کے شریک مدیر رہے۔)

۲۔ ''چار لقے'' مرتبہ: عزیز احمد — حیدرآباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ — طبع اوّل: ۱۹۴۷ء

غیر مدوّن: متفرق مضامین:

۱۔	''مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ اسلوب''	نقوش، لاہور، نمبر ۱
۲۔	''ہماری زبان''	نقوش، لاہور، نمبر ۲
۳۔	''فسانۂ عجائب اور پدماوت'' (تحقیق)	نقوش، لاہور، نمبر ۵
۴۔	''کشکول''	نقوش، لاہور، نمبر ۱۱، ۱۲
۵۔	''شاد عظیم آبادی''	نقوش، لاہور، نمبر ۲۱، ۲۲
۶۔	''منٹو'' (شخصیت)	نقوش، لاہور، نمبر ۳۱، ۳۲
۷۔	''جدید اردو تنقید''	سویرا، لاہور، نمبر ۴
۸۔	''اقبال اور فن برائے زندگی''	سویرا، لاہور، نمبر ۵، ۶
۹۔	''افسانۂ افسانہ'' (تنقید)	سویرا، لاہور، نمبر ۱۲
۱۰۔	''ادبی تنقید'' (تنقید)	نیا دور، بنگلور، نمبر ۱۳
۱۱۔	''کلاسیکی تصورات پر اقبال کی تنقید'' (تنقید)	نیا دور، کراچی، نمبر ۱۸، ۱۹
۱۲۔	''اقبال کا نظریۂ فن'' (تنقید)	رسالہ اردو کراچی، ۱۹۴۹ء
۱۳۔	''سب رس کے ماخذ و مماثلات'' (تحقیق)	رسالہ اردو کراچی، ۱۹۵۰ء
۱۴۔	''طلسم ہوشربا'' (تنقید/تحقیق)	اردو ادب، لاہور، نمبر ۲
۱۵۔	''اقبال کا رد کردہ کلام'' (تحقیق)	ماہِ نو، کراچی، اپریل ۱۹۵۲ء
۱۶۔	''ناول'' (تنقید)	ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۵ء

۱۷۔ "Urdu Litrature In Cultural Hearitage Of Pakistan"

(Eds. S.M. Ikran And Percival Kar. Oxford Varsity Press 1955 Spear)

(اس کتاب کا ترجمہ ''اردو ادب ثقافت پاکستان'' کے نام سے جلیل قدوائی نے کیا تھا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

"Incyclopedia Of Islam" جلد دوم، Leiden طبع اوّل: ۱۹۶۲۔۶۳ء

18- "DIN--ILAHI" Fasc. 27. pp. 296-7;

19- "Djam' iyya" (India & Pakistan) Fasc. 29, P.437;

20- "Djamati" Fasc. 29. pp.421-422

21- "Islam-d-Espagne et Inde Musulmane moderne" in (E'tudesd' Orientalism de ' diees la Memoire de levi-Povencal) Paris: G.P. Moisonneuve et Lorose, 1962.

22- "Origin of Country love and the problem of Communication" (Islamic culture, Vol. XXIII, 1949, pp.48-61).

23- "Sources of Iqbal's Perfect Man" (Iqbal, Vol. Vii, No. I-1958)

24- "La Litterature De Langue Ourdou" (Orient, Vol. VII, 1958)

25- "Le Mouvement Des Mujahidin Dans l'Inde Au Xixe Siecle" (Orient. Vol. XV, 1960, pp.105-16)

26- Influence De La Litterature Francaise Sur La Litterature Ourdou" (Orient, Vol. XI, 1959, pp.125-36)

27- "Iqbal Et La Theorie Du Pakistan" (Orient Vol. XVII, 1961)

28- "Les Musulmans Et Le nationalism Indien" (Orient, Vol. XXII, 1962, pp.75-96).

29- "Remarques Sur Les Origines Du Pakistan" (Orient, Vol. XXVI, 1963, pp.21-30).

30- "Sayyid Ahmad Khan, Jamal Al-din Al-Afghani and Muslim India" (Studia Islamica Vol. XIII, 1960, pp.55-78.)

31- "Trends in the Political Thought of Medieval India" (Studia Islamica, Vol. XVII, 1963).

32- "El Islam Espanol Y La India Musulmana Moderna" Ford International. Vol. 1, No. 4, 1960.

33- "Religious & Political Ideas of Shaikh Ahmad Sirhindi" (Rivista Degli Studi Oriental. Vol. XXXVI, 1961.)

34- "Akbar, Heretique Ou Apostat?" (Journal Asiatique No. 1, No. CCCXLIX, 1961).

35- "Monool Pressure in an Alion Land" (Central Asiatic Journal, Vol. VI, No. 3, 1961).

36- "Moghul Indien and Dar-Al-Islam" (Saeculum, No. 3, 1961).

37- "Political and Religious Ideas of Shah Wali-Ullah of Delhi" (The Muslim World, No. 4, 1962).

38- "The Sufi and the Sultan in Pre-Mughal Muslim India" (Der Islam, Nos. 1-2, 1962).

39- "Dar al-Islam and the Muslim Kingdoms of Deccan and Gujarat" (journal of World History. No. 3, 1963).

40- "The Conflicting Heritage of Sayyid Ahmad Khan and Jamal Al-Din Afghani in the Muslim Political Thought of the Indian Sub-Continent" in Trudi XXV Mejdunarodnovo Kongressa Vostokovedov, Moscova 1960, Moscow: Izdatelstvo Vostochnoi Literaturi, Vol. IV, 1963-64).

41- 'Sufism and Hindu Mystik' Seaculum, Vol. XV, No. 1-1964.

(CAMBRIDGE HISTORY OF ISLAM)

42- 'India-Pakistan' being Chapter 6 in Part VIII, Vol. II Section on Urdu Literature in Chapter I, Literature, in Part X.

43- The Islamic Contribution to Civilisation: Vol. II.

44- 'Mawdudi and Orthodox Fundamentalism in Pakistan' (Middle East Journal, Vol. 21, No. 3, 1967, pp. 369-380)

45- Universalqeschichte, No. 1/2, 1967, pp. 1-12)

1962 LEIDEN (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM)

46- 'Ghiyas-al-Din Tughluk I'

47- 'Hyiyas-al-Din Tughluk Shah (II p. 1076-77)

48- 'Hali (III, p. 93-94)

49- 'Hamasa' (Urdu Literature) III, p.119.

50- 'Hassan Dihlawi' (III, p. 249)

51- 'Hidia-IV Urdu' (III, p. 358-9)

52- 'Hikaya - IV Urdu' (III, p.375-6)

53- 'Hind - Islamic Culture' (III, p.438 - 40)

54- 'Epic and Counter-Epic in Medieval India' (Journal of the American Oriental Society. Vol. 83, No. 4, 1963, pp, 470-76)

55- 'Cultural and Intellectual Trends in Pakistan' (The Middle East journal, Vol. 19, No.1, 1965, pp. 35-44).

56- Approaches to History in the Late Nineteenth and Early Twentieth Century Muslim India' (Jounral of World History, Vol. IX, No. 4, 1966, pp. 987/1008).

57- 'Problems of Islamic Modernism with Special Reference to Indo-Pakistan Sub-Continent' (Archives De Sociologie Des Religions, Vol. 23, 1967, pp. 107-116).

58- 'An Eighteenth Century Theory of the Caliphate' (Studia Islamica, Fasc. XXVIII, 1968, pp. 135-44)

59- 'Afghani's Indian Contacts' (journal of the American Oriental Society, Vol. 89, No. 3, July-Sep. 1969. pp. 476-504).

60- "Muslim Attitude and Contribution to Music In India" (Zeitschrift Der Deutschen Morgen landischen Gesellschaft, Band 119, Heft I, 1969. pp. 86-92).

61- "L, Islam Et La Democratie Dans Le Sous-Continent Indo-Pakistan", Orient, 51-52/3-4, (1969), pp. 9-26.

62- "The Role of Ulema in Indo-Muslim History" (Studia Islamica, Fasc. XXXI, voluminis Memoriae J. Schcht Dedicate: Paris Prior, Paris: G.P. Maisonneuve-Larose, 1970, pp.1-13).

63- "Pakistan Faces Democracy" (The Round Table, No. 242m April 1970, pp. 227-238).

64- "Islam and Democracy in the Indo-Pakistan Subcountinent" in Religion and Change in Contemporary Asia", by Robert F. Spencer Ed., pp. 123-142. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1971.

65- "The formation of Sabk-i-Hindi", in Iran and Islam, in Memory of the Late Vladimir Minorsky, Ed. C.E. Bosworth. pp. I-9. Edinburgh University.

66- "Indien"; in Fischer Weltqeschichte, Band 15: Der Islam II, Herausgegeben von G.E. von Grunebaum. Frankfurt Am Main: Fischer Taschenbuch Varlac GMBH. 1971, pp. 226-287.

۶۷۔ ''ترقی پسند ادب کیا ہے؟''(مضمون) — مطبوعہ: رسالہ اردو، اورنگ آباد۔ دکن — اپریل ۱۹۳۵ء

۶۸۔ ''فراق کی شاعری''(مضمون)

۶۹۔ ''ن۔م۔راشد''(مضمون)

۷۰۔ ''ڈراما کیا ہے؟''(مضمون)

۷۱۔ ''قائداعظم سے ایک ملاقات''(یادداشت)

تبصرے:

۱۔	''لیلیٰ کے خطوط''(از: قاضی عبدالغفار)	مطبوعہ: رسالہ اردو، اورنگ آباد دکن	اپریل ۱۹۳۵ء
۲۔	''موت سے پہلے''(از احمد علی)	مطبوعہ: نیادور، بنگلور	شمارہ نمبر ۱۲
۳۔	''اور بنسری بجتی رہی''(از دیوندر ستیارتھی)	نیادور، بنگلور	شمارہ نمبر ۱۲
۴۔	''آئینہ ہندی''(مرتبہ ایس۔ایس عطاء الرحمٰن)	بلٹن آف دی سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز	جلد اول، لندن، ۱۹۶۱
۵۔	''مجموعہ اشعار شمس بلخی''(مرتبہ: سید حسن)	ایضاً	۱۹۶۱ء
۶۔	''پنجابی قصے فارسی زبان میں''(از: ڈاکٹر محمد باقر)	ایضاً	۱۹۶۱ء

۷۔	''مسلمانوں کے سیاسی افکار'' (از: رشید احمد جعفری)	ایضاً	۱۹۶۲ء
۸۔	''اسلام اور......'' (از: رشید احمد جعفری)	ایضاً	۱۹۶۲ء
۹۔	''خیر المجلس'' (از: خالق احمد نیازی)	ایضاً	جلد دوم: ۱۹۶۲ء
۱۰۔	''تعلیمات غزالی'' (از: محمد حنیف ندوی)	ایضاً	۱۹۶۴ء
۱۱۔	''الفخری'' (از: جعفر شاہ پھلواروی)	ایضاً	۱۹۶۴ء
۱۲۔	''تاریخ تصوف قبل از اسلام'' (از: بشیر احمد ڈار)	ایضاً	۱۹۶۴ء
۱۳۔	"Storie Dell E Letterature Del Pakistan" (by: Alessando Bausani)	ایضاً	(جلد سوم) ۱۹۶۱ء
۱۴۔	"Religious And Politics In Pakistan" (By:Leonardo Binder)	ایضاً	(جلد دوم) ۱۹۶۲ء
۱۵۔	"Akbar: The Religious Aspect" (By: R: Karishnamurti)	ایضاً	(جلد چہارم) ۱۹۶۲ء
۱۶۔	"History Of Afghans In India" (By: M. A. Rahim)	ایضاً	(جلد دوم) ۱۹۶۳ء
۱۷۔	"Arab Role In Africa" (By: J. Baulin)	ایضاً	(جلد دوم) ۱۹۶۳ء
۱۸۔	"Modem Islam" (By: G.E.Von Gunebaum)	ایضاً	(جلد سوم) ۱۹۶۳ء
۱۹۔	"Political Change In Morocco" (By: D.E. Ashford)	ایضاً	(جلد سوم) ۱۹۶۳ء

متفرق افسانے (غیر مدوّن):

۱۔	''نفرت کیوں تھی''	مطبوعہ: نقوش، لاہور	شمارہ نمبر ا
۲۔	''جل منڈل''	مطبوعہ: ایضاً	شمارہ نمبر ۲
۳۔	''بازیابی''	مطبوعہ: ایضاً	شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶
۴۔	''قاتل کبیر''	مطبوعہ: ایضاً	شمارہ نمبر ۲۵، ۲۶
۵۔	''کوکب''	مطبوعہ: سویرا، لاہور	شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶
۶۔	''کٹھ پتلیاں''	مطبوعہ: اردو ادب، لاہور	شمارہ نمبر ۲
۷۔	''کشاکش جذبات''	مطبوعہ: مجلّہ ''مکتبہ'' حیدرآباد، دکن	نومبر ۱۹۲۹ء

۸۔ ''باغبان'' مطبوعہ: ''عثمانیہ'' حیدرآباد، دکن شمارہ ۱۹۳۱ء

متفرق تراجم (غیر مدوّن):

۱۔ ''بچپن'' (رڈیارڈ کپلنگ کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: ''نیرنگ خیال'' لاہور ستمبر ۱۹۲۸ء

۲۔ ''شریر لڑکا'' (ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: ایضاً دسمبر ۱۹۲۸ء

۳۔ ''خراب آباد'' (Wasteland: By T.S.Eliot) مطبوعہ: رسالہ ''اردو'' اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

۴۔ ''پجارن'' (ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: ماہنامہ ''انتخاب نو'' کراچی شمارہ نمبر ۸، نومبر ۱۹۸۲ء

۵۔ عزیز احمد کی تقریباً ۱۵ منظومات بمع انگریزی متن۔ مشمولہ ''ساز مغرب'' مرتبہ حسن الدین احمد (بھارت)

متفرق فیچر/ڈرامے (غیر مدوّن):

۱۔ ''مزاحیہ فیچر'' جامعہ عثمانیہ میں اسٹیج کیا گیا ۱۹۳۱ء

۲۔ ''کالج کے دن'' (ڈراما) جامعہ عثمانیہ میں اسٹیج کیا گیا دسمبر ۱۹۳۱ء مطبوعہ مجلّہ ''عثمانیہ'' ۱۹۳۲ء

(یہ ڈراما محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر سیادت علی خاں (پروفیسر شعبہ قانون) کی نگرانی میں اسٹیج ہوا۔ ہدایات: سید محمد اکبر وفا قانی۔ اس ڈرامے میں مخدوم محی الدین، جمیل احمد، شکور بیگ، رفعت، اشرف اور ظفر الحسن نے مختلف کردار ادا کیے۔)

۳۔ ''آنسو'' (دیکھیے عزیز احمد اور ان کی ناول نگاری، از حشمت اللہ نیر)

۴۔ ''مستقبل'' بزم تمثیل حیدرآباد دکن نے اسٹیج کیا ۱۹۳۴ء

(بزم تمثیل کا پرانا نام، حیدرآباد ڈرامیٹک ایسوی ایشن، تھا۔ اس ادارے کے سرپرست نواب سرامین جنگ اور معتمد سید مصلح الدین تھے۔ ہدایات سید محمد اکبر وفا قانی کی تھیں۔)

غزلیں (غیر مدوّن):

غزلیں ''بہ سلسلہ آغوش مرگ'' ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۸ء

متفرق خطبات (غیر مدوّن):

۱۔ خطبات اسلام آباد (قائداعظم میموریل لیکچرز) بمع زبانی گفتگو اور سوال و جواب۔ موضوعاتی نشستیں متعلقہ پاکستانیات، مسلم برصغیر، عالم اسلام، مسائل تواریخ نگاری اور سسلی سے متعلق خطبات۔ اوائل ۱۹۷۵ء (سسلی سے متعلق خطبات بطور ابواب کتاب متعاقب ایڈیشن میں شامل ہیں جبکہ بقیہ لیکچرز کا مجموعہ تا حال ترتیب طلب ہے)

۲۔ امریکہ و یورپ کی جامعات اور دیگر ادارہ جات میں پیش کردہ خطبات ترتیب طلب ہیں۔

مترجمہ تصانیف:

۱۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' (ناول)۔ از عزیز احمد بعنوان THE SHORE AND THE WAVE (انگریزی) ترجمہ: رالف رسل و عزیز احمد، مطبوعہ: لندن ۱۹۸۱ء سے قبل

۲۔ ''تاریخ سسلی'' (تاریخ از عزیز احمد) اطالوی زبان میں ترجمہ

۳۔ "URDU LITRATURE IN CULTURAL HARITAGE OF PAKISTAN"
از عزیز احمد کا اردو ترجمہ بعنوان: ''اردو ادب: ثقافت پاکستان''۔ از جلیل قدوائی۔ طبع دوم: ۱۹۶۷ء

زندگی میں مستقل پتا:

ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز، یونیورسٹی آف ٹورنٹو۔ ۵ کینیڈا۔

اعزاز:

۱۔ فیلو آف دی رائل سوسائٹی آف کینیڈا۔

۲۔ اعزازی شہریت بمع مہر زریں رقم من جانب حکومت اطالیہ (اٹلی)

۳۔ عزیز احمد کے اعزاز میں یادگار مقالات کا مجموعہ Islamic Society And Culture
مرتبہ: ملٹن اسرائیل وا این۔ کے ویگل مطبوعہ: Manohar انصاری روڈ، ۲۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۹۸۳ء

۴۔ عزیز احمد لیکچرز، سالانہ انتظام ٹورنٹو یونیورسٹی، کینیڈا۔

۵۔ رکنیت اکادمی ادبیات، کینیڈا۔

نظریۂ فن:

''افسانے میں جو چیز اہم ہے، جو اس کی جان ہے اور جو کسی تکنیک کی پابند نہیں، وہ واقعہ محض واقعہ ہے۔''

عزیز احمد

بحوالہ: مضمون ''افسانہ افسانہ'' مطبوعہ: ''سویرا'' لاہور

آبِ حیات

عزیز احمد

''اور خدائے تعالیٰ نے کہا۔ دیکھو آدمی ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ نیک اور بد کو پہچاننے لگا ہے اور اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور زندگی کے درخت کا پھل بھی کھالے اور غیر فانی ہو جائے۔

اس لیے خدائے تعالیٰ نے اسے باغ عدن سے نکلوا دیا تا کہ وہ اس زمین میں ہل چلائے جس کی مٹی سے وہ بنایا گیا تھا۔

اس لئے اس نے انسان کو باہر نکلوا دیا اور اس نے باغ عدن کے مشرق میں فرشتوں کو مقرر کیا، جن کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ہر سمت پلٹ سکتی تھیں، تاکہ وہ زندگی کے درخت کے راستے کی نگہبانی کریں۔

(توریت۔ کتاب آفرینش)

گل گامش، بابل کا سب سے طاقت ور انسان، جس سے بابل کے دیوتا لرزتے تھے، اپنے دوست این کی دو کی لاش کے سامنے کھڑا تھا، اس کے چہرے کے اعصاب، غضب اور رنج کی شدت پر کھنچ گئے تھے۔ اس کے جسم کا فولاد اس آگ میں جل رہا تھا جو اس فولاد کو جلا سکتی تھی، پگھلا نہیں سکتی تھی۔

اور گل گامش نے یوں بین کیا، دیوتاؤں کے سے وقار سے۔

''میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی جو پہاڑوں کی ڈھلوان پر میرے ساتھ جنگلی جانوروں اور میدانوں کے شیروں کا شکار کرتا تھا۔ این کی دو میرا دوست، میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ پہاڑوں کے دامن میں گورخر اور میدانوں میں شیروں کا شکار کرتا تھا، جو میرے ساتھ ساتھ ہر معرکہ سر کر سکتا تھا، جو چوٹی اور چٹانوں پر چڑھا اور جس نے آسمان کے سانڈ کو پکڑا اور ہلاک کر دیا۔ جس نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا جو جنگلوں میں رہتا تھا۔ بتا اب یہ کون سی نیند ہے جس نے تجھے جکڑ لیا ہے؟ تو سیاہ پڑ گیا ہے اور مجھے دیکھ نہیں سکتا۔''

گل گامش کے دوست کی لاش نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ گل گامش نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن

خاموش تھی۔

اور تب یہ ہوا کہ رنج کی جگہ غضب اس طاقت ور، اس ہیبت ناک انسان پر طاری ہونے لگا گل گامش پر جس سے دیوتا بھی پناہ مانگتے تھے۔ اس کا دوست کسی معرکے میں، کسی بڑی لڑائی میں، شیروں کے جنگل میں یا کسی اور انسان یا دیوتا کی تلوار سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ ایک بیماری تھی، ایک بخار تھا، جس نے اس کے طاقت ور ساتھی کو اس قدر جلد نیچا دکھایا۔ وہ جو گل گامش کا ساتھی تھا اور کوئی اس کو نیچا نہ دکھا سکتا تھا۔

گل گامش نے اپنے دوست کو چادر سے چھپا دیا تھا، جیسے دلہن چادر سے چھپائی جاتی ہے اور گل گامش کی شیر جیسی آواز گونج اٹھی۔ بار بار اور پھر بار بار وہ اپنے دوست کی طرف پلٹتا اور اپنے بال نوچتا اور اپنے ناخنوں سے اپنے جسم سے زرق برق لباس تک کو کسوٹنے لگتا۔ یہ نقصان ایسا تھا کہ وہ اسے حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ گویا یہ محض ایک خواب تھا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ یہ کہ این کی دو مر ہی نہیں سکتا۔ اور اسے سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ سات دن اور سات راتیں گزر گئیں اور اس نے اپنے دوست کو دفن نہیں کیا۔ کیونکہ ابھی اسے یہ امید تھی کہ اس کے بین کی آواز سن کر اس کا دوست جاگ اٹھے گا۔

یہاں تک کہ سات دن اور سات راتیں گزر جانے کے بعد ایک سفید سا کیڑا این کی دو کی ناک سے باہر نکلا۔ یہ اس کی نشانی تھی کہ اس کی لاش اندر سے سڑنے لگی ہے اور تب گل گامش کو یقین آیا کہ انسان کی تقدیر اس کے دوست این کی دو پر غالب آ چکی ہے۔ اور اب گل گامش کے لیے یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کبھی چین نہ لے، آرام نہ اٹھائے اور بھٹکے ہوئے شکاری کی طرح گھاٹی گھاٹی، میدان میدان سر ٹکراتا پھرے۔

جنوبی بابل میں ایک شہر تھا اروک۔ اروک کے سردار ہی کا نام گل گامش تھا۔ وہ انسان تھا، دیوتا نہیں تھا۔ ہرقلیس کی طرح، ایک درمیانی کڑی جس میں انسان کی قوت اور مجبوری تھی، لیکن دیوتاؤں کا سا آہنی عزم اور استقلال۔ یہ گل گامش ظالم اور جابر تھا اور اس کی رعایا اس سے خوش نہیں تھی۔ یہ بھیڑ بکریوں اور عورتوں کا خراج وصول کرتا تھا۔ اس کے دل میں درد نہیں تھا اور اسے دوسروں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی رعایا نے تنگ آ کے بابل کے دیوتاؤں سے دعا مانگی کہ وہ گل گامش ہی جیسا ایک اور طاقت ور انسان پیدا کریں۔ اس کا ثانی تا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہیں اور رعایا کو چین ملے۔

دیوتاؤں نے اروک کی رعایا کی فریاد سن لی اور این کی دو کو پیدا کیا۔ لیکن گل گامش کا مد مقابل اور حریف بننے کی جگہ وہ اس کا دوست، ساتھی اور حلیف بن گیا۔ طاقت ور انسان اکثر ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور تب تو گل گامش کے تکبر، اس کی طاقت اور اس کی چیرہ دستی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اب وہ اپنی رعایا کو تو بھیڑ بکریوں کی طرح بہت معمولی شکار سمجھتا تھا۔ اس کی اور این کی دو کی زد سے آسمانی شکار محفوظ نہیں تھے۔ انسانوں کی کیا حقیقت تھی۔

ان دونوں نے دور دور اور بڑے بڑے خطرناک معرکوں کا بیڑا اٹھایا۔ یہ اس گنجان جنگل میں گھس گئے جو سورج کے دیوتا این لل کی ملکیت تھا اور جس کی حفاظت کے لیے اس نے ایک بڑے مہیب دیو ہواوا کو مقرر کیا تھا۔ لیکن ان دونوں نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا اور اسے ہلاک کر ڈالا اور سورج کے دیوتا این لل کے جلال کو مشتعل کر دیا۔

جب گل گامش اور این کی دو اس ہولناک شکار سے واپس آ رہے تھے تو ایشتر کی حسین آنکھ نے گل گامش کا مردانہ جلال و جمال دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئی۔ یہ ایشتر اس زمانے میں اور اس ملک میں انانہ کہلاتی تھی۔ ایشتر کے کئی نام تھے اور وہ عورتوں کی سرتاج اور زندگی کی خالقہ اور سب سے بڑی دیوی تھی۔ وہ کہیں ایشتر تھی، کہیں اشتارتے، وہی ستارہ تھی جسے آسمان پر زہرہ کہتے ہیں اور جو اپنی شہوت ناک نظروں

سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جس نے ہاروت اور ماروت کو بابل کے کنوئیں میں قید کیا، جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں نے یا زلیخا نے حضرت یوسف کو ۔ یہ ایشتر مصر میں آئی سس یا دریائے نیل تھی۔ یہی فروڈائے ٹی یا وی نس تھی یعنی حسن کی یونانی دیوی اور عشق کے دیوتا کیوپڑ کی ماں، لیکن یہی جونو بھی تھی۔ دیوتاؤں کے دیوتا زلیس کی بیوی۔ اصل میں یہ ایشتر تہموز کی ماں، بیوی اور بہن تھی جو ہر سال قتل ہوتا تھا اور جاڑے آ جاتے تھے اور نباتات پر خزاں آ جاتی تھی اور انسان اور جانور مرجھائے سے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایشتر جا کے تھموز کو زیریں دنیا میں پھر سے زندہ کرتی اور دنیا پر بہار آ جاتی۔ شاخوں سے شگوفے پھوٹ نکلتے، مصر میں دریائے نیل میں زمین کو زرخیز بنانے والی طغیانی آ جاتی، لبنان کے جنگل ہری ہری پتیوں سے لہلہانے لگتے۔ مندروں میں اور میدانوں میں عورتیں اپنے جسم اجتماعی عاشقی کے لیے وقف کر دیتیں، جانوروں کی جھولیں بھر جاتیں۔

یہی ایشتر تھی، یہی ایشتر جس کے راج کو صدیوں بعد یسوع مسیح نے درہم برہم کرنا چاہا اور مریم مجدلین کو اس چنگل سے چھین لیا۔ اسی کے چنگل میں حضرت یوسف کا حسن اسیر ہو ہی رہا تھا کہ بال بال بچ گیا۔ اور ان واقعات سے ہزاروں سال پہلے اس ایشتر نے گل گامش کا انسانی جمال دیکھا جو جلال کی ایک کیفیت تھی اور وہ گل گامش پر عاشق ہو گئی، جیسے وہ ہزاروں سال بعد وینس بن کے ایک چرواہے پر عاشق ہونے والی تھی۔

ایشتر کی آنکھوں کے جادو نے گل گامش پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کے خون میں غارت اور ریخت اور فتح کا جنون موجیں مار رہا تھا۔ عشق ایک تخلیقی فعل ہے اور عشق انا کی شکست ہے۔ اپنے اور اپنی حیات اور اپنے جسم کی شکست کا اعتراف ہے۔ عشق زمانے میں زندگی کے تسلسل کا بیج بوتا ہے اور اس وقت فتح اور طاقت کے غرور میں گل گامش کے ذہن میں بھی یہ تصور نہیں آ سکتا تھا کہ وہ فانی ہے یا اس کی زندگی یا اس کا جسم فانی ہے اور یہ کہ زندگی کے تسلسل کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ مر جائے تو کوئی اور جسم باقی رہ جائے جو اس کے جسم کے تخم سے بنا ہو اور اس طرح زندگی موت کا، اور حیات فنا کا مقابلہ کرے۔ نہیں وہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی طرح لافانی، نہ مٹنے والی ہستی اور باقی سمجھتا تھا۔

اور جب ایشتر نے دیکھا کہ اس کے حسن کا گل گامش پر کوئی اثر نہیں۔ ایک معمولی انسان ہو کے وہ دیویوں کی دیوی کو ٹھکرا رہا ہے۔ تو شدت غضب میں اس نے بھی وہی کیا جو مصر کی زلیخا کرنے والی تھی۔ اس نے گل گامش اور اس کے دوست این کی دو کو ہلاک کرنے کے لیے آسمانی سانڈ کو بھیجا جس کی سانس میں آگ تھی لیکن گل گامش اور اس کے دوست نے اس آسمانی سانڈ کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ اور کچھ طنز اور کچھ جلال کے عالم میں گل گامش نے اس سانڈ کا فالس اکھیڑ کے ایشتر کے منہ پر دے مارا۔

سورج کے دیوتا این لل کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ ابھی تک تو شاید وہ اور تھموز الگ الگ تھے، مگر صدیوں بعد وہ ایک ہی تو ہونے والے تھے۔ تھموز مصر میں اوسیرس اور ایشیائے کوچک اور روم الکبریٰ میں اے ٹس اور یونان میں اڈونس بننے والا تھا۔ اور ایشتر اس کی ماں، بیوی اور بہن تھی۔ ازلی تانیث۔ دیوی کی یہ ہتک وہ برداشت نہ کر سکا مگر گل گامش اور این کی دو پر ذاتی الزام جو اس نے لگایا وہ یہ تھا کہ گل گامش اور این کی دو نے اس مہیب دیو کو ہلاک کیا تھا جو اس کے جنگل کا چوکیدار تھا اور اس نے ایک معمولی سی بیماری، معمولی سا بخار بھیج کر گل گامش کے رفیق اور ساتھی این کی دو کو ہلاک کر دیا۔

اور اس طرح این کی دو، جس نے گل گامش کے ساتھ پہاڑوں کی ڈھلوان پر گورخر مارے تھے اور میدانوں میں شیر۔ جس نے ہواوا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کیا تھا۔ بالکل اتنی آسانی ایسی حقیر آسانی سے مر گیا جیسے مکھی مرتی ہے یا مچھر مرتا ہے، یا جیسے کوئی برساتی کیڑا ہلاک ہوتا ہے۔

گل گامش کو اس پر سخت رنج و تعب تھا۔ اب وہ ظالم اور جاہل نہیں رہا تھا۔ اور اب رعایا پر ظلم کرنے کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اب اس کے اپنے پیکر میں انسانی شعور نے پہلی مرتبہ قضا و قدر سے انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس انصاف کا جو بابل کی رعایا اپنا حق سمجھتی تھی۔ یہ کہ ہر خطا انسان کے خلاف ہی ہوسکتی ہے اور اس کی سزا ملتی ہے لیکن قدرت میں، قدرت کے اعمال اور افعال میں خطا اور سزا اور جزا کا کوئی تصور نہیں۔ یہ کہ جس کی خطا زیادہ ہوتی ہے اسے سزا نہیں ملتی، بے گناہ کو ملتی ہے۔ مثلاً گل گامش اور این کی دو کا ہی واقعہ ہے۔ ہواوا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کرنے میں بڑا حصہ گل گامش کا تھا لیکن وہ محفوظ رہا۔ اشتر کی ہتک گل گامش نے کی لیکن وہ محفوظ رہا۔ اور سورج کے دیوتا نے این کی دو کی جان لی جو محض اس کا شریک اور رفیق تھا۔ آخر موت کا کیا جواز ہے؟ اور انسان فنا کے دروازے سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ گل گامش نے سوچنا شروع کیا۔ یقیناً موت سب سے بڑی سزا ہے۔ یہ نفرت کی انتہا ہے۔ قتل اس کو کیا جاتا ہے جسے ہم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور اسے معاف نہیں کرسکتے اور اسے زندگی کے روپ میں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن یہ سزا قدرت بلا کسی خاص امتیاز کے بلا معیار، بے انصاف، بے مقصد ہر ایک کو دیتی ہے، کبھی جلدی کبھی دیر میں۔ مگر کیوں؟ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب نہ اسے ملا نہ اہل بابل کو جنھوں نے اس کی داستان تخلیق کی اور وہ آوارہ پھرتا رہا۔ وہ این کی دو کا غم بھول گیا۔ وہ جو معمولی انسان سے لے کر آسمانی سانڈ تک سب کو زیر کر چکا تھا۔ اب صرف ایک دشمن کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ موت کو۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ گل گامش موت سے ڈرتا نہیں تھا۔ اگر وہ موت سے ڈرتا ہوتا تو اب سے بہت پہلے جب اس مہیب دیو سے لڑتے لڑتے این کی دو کی ہمت جواب دینے لگی تو وہ این کی دو کو سختی سے یہ کیوں سمجھاتا۔

''میرے دوست! وہ کون ہے جو آسمان کی بلندی تک بلند ہوا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سورج کے دیوتا شمش کے ساتھ ہم مکان رہے۔ وہ محض انسان ہی تو ہے۔ اس کی زندگی کے دن محدود ہیں خواہ وہ کوئی معرکہ کیوں نہ سر کرے۔ وہ محض ہوا ہے۔ اور تم ابھی سے موت سے ڈرتے ہو۔ تمہاری ہمت اور طاقت کہاں ہے؟ دیکھو میں اس دیو پر حملہ شروع کرتا ہوں اور تم ٹھہر کے چلا کے کہو 'ہاں بڑھو۔ ڈرو مت۔' اور اگر میں مارا جاؤں تو شہرت کی وجہ سے میرا نام تو زندہ رہے گا۔ لوگ کہیں گے مہیب دیو ہواوا سے لڑنے میں گل گامش مارا گیا۔

اس طرح کی موت کے تو کوئی معنی تھے مگر یہ کیا کہ معمولی سی بیماری آئے اور این کی دو جیسے کڑیل پہلوان کا کام تمام ہوجائے۔ اور گل گامش نے موت کا مقابلہ کرنے اور موت کو شکست دینے پر کمر ہمت باندھی۔ یہ اس کا آخری اور سب سے بڑا معرکہ تھا۔ سب سے بڑی مہم۔

اب ایک ہی خیال تھا، ایک ہی فکر، ایک ہی مقصد جو دن رات گل گامش کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ یہ کہ کس طرح موت کو شکست دی جائے، کس طرح فنا کو فنا کیا جائے اور سوچتے سوچتے گل گامش کو یاد آیا کہ اس کے اجداد میں سے ایک شخص تھا (شاید وہی جسے عبرانی خضر علیہ السلام کہتے ہیں) جو اب موت کے سمندروں کے اس پار، دنیا کے اس دوسرے سرے پر رہتا تھا، اس نے بقائے دوام حاصل کرلی ہے۔ صرف اس نے، کسی اور نے نہیں...... اور کسی انسان کو بقائے دوام نصیب نہیں ہوسکی۔ بقائے دوام کا راز اسے معلوم ہوگا۔ گل گامش نے تہیہ کیا کہ وہ اس کے پاس جائے گا اور اس سے یہ راز دریافت کرلے گا۔

چنانچہ تن تنہا گل گامش نے دور دراز کا سفر شروع کیا۔ اس نے ان پہاڑوں کو طے کیا جن کے اس پار آفتاب غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے وہ اندھیارا راستہ طے کیا، جس سے آفتاب رات بھر گزرتا ہے۔ وہ مایوس ہوگیا کہ اب پھر کبھی وہ روشنی کو نہ دیکھ سکے گا۔ اور بالآخر وہ ایک بحر ذخار کے کنارے پہنچا۔ راستہ میں اسے جو کوئی ملتا اس سے وہ اس لافانی بزرگ اتناپشتم تک پہنچنے کا راستہ پوچھتا اور بقائے دوام کی تفصیلیں

پوچھتا اور بار بار اسے ایک ہی جواب ملتا۔

''گل گامش تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ بقائے دوام جس کی تمہیں آرزو ہے تمہیں نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ جب دیوتاؤں نے انسان کو بنایا تو موت اس کے نصیب میں لکھ دی اور زندگی کا راز اپنے دلوں میں محفوظ رکھا۔ گل گامش کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ۔ چین سے زندگی بسر کرو۔ دن رات ناچا گاؤ۔ نئے نئے کپڑے پہنو، نہاؤ، پانی سے سر دھولو۔ اپنے بچے کی طرف دیکھو جو تمہارا ہاتھ پکڑے ہے اور اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے کے راحت بخشو۔ انسان کو انہیں چیزوں میں مگن رہنا چاہیے۔

لیکن گل گامش عام انسانوں کا راستہ چلنے نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنی جستجو سے باز آنے والا نہ تھا۔ بقائے دوام کی آرزو اس کے تن بدن کو جلائے دے رہی تھی اور وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے اسے ایک کشتی ملی اور ایک کشتی بان جو اتنا پشتم کا ملازم تھا وہ اسے موت اور فنا کے اس بحرِ ذخار کے اس پار اتنا پشتم کے پاس لے گیا۔ اس نے اتنا پشتم سے پوچھا کہ بقائے دوام کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اتنا پشتم بھی اس کی مدد نہ کر سکا کیونکہ خود اس کو بقائے دوام اتفاقاً کچھ ایسے عجیب حالات میں حاصل ہوئی تھی، جن کا دوبارہ پیش آ سکنا ناممکن تھا۔ بہت عرصہ ہوا، بڑے قدیم زمانے میں جب دیوتاؤں نے انسان کی بدعنوانیوں اور گمراہیوں سے تنگ آ کر بنی نوع انسان کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کیا تو ان کے مشورے سے سورج کے دیوتا این لل نے زمین پر ایک عالمگیر طوفان بھیجا۔ اس طوفان میں اتنا پشتم اور اس کی بیوی اور اس کے بچوں کے سوا سب ڈوب گئے۔ اتنا پشتم کو پہلے سے آنے والے طوفان کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے ایک بڑی کشتی بنائی جس میں وہ خود، اس کے بال بچے، تمام جانوروں کے ایک ایک جوڑے کے ساتھ سوار ہو گئے۔ این لل کو کچھ دنوں کے بعد افسوس ہوا کہ اتنا بڑا طوفان بھیجنا جلد بازی کا کام تھا، اور اسے خوشی ہوئی کہ اتنا پشتم نے زندگی کے اتنے نمونے ہلاک ہونے سے بچا لئے۔ اس کے انعام میں اس نے اتنا پشتم کو بقائے دوام عطا کی۔ لیکن ایسے واقعات بار بار پیش نہیں آتے۔

گل گامش سنتا رہا۔ وہ عبرانیوں سے بہت پہلے گزرا تھا، اس لئے وہ چونک نہیں پڑا کہ ہائیں یہ تو حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ہے اور بقائے دوام نوح کو نہیں خضر کو عطا ہوئی اور این لل نے نہیں عطا کی، خدائے بزرگ و برتر نے عطا کی۔ گل گامش موجودہ سائنس دانوں سے بہت پہلے گزرا تھا اس لئے اس نے نظریہ نہیں بنایا کہ طوفان نوح شاید بحیرۂ روم کے بھرنے کی یاد ہو۔ جب جبل الطارق کے پاس کی چٹانوں کو توڑ کے بحیرۂ اٹلانٹک کا پانی ایک بہت بڑے رقبے میں گھس آیا، جس میں انسان آباد تھا، اور جہاں آبادیاں تھیں وہاں آج بحیرۂ روم ہے۔ اور نہ گل گامش نے یہ نظریہ بنایا کہ یہ بابل اور ارکی زمین میں خلیج فارس کا خروج تھا۔ اور نہ اس نے اس نظریے پر غور کیا کہ جب آخری برفانی دور کے گزر جانے پر قفقاز اور ارادات کا بہت سا برف پگھلا ہوگا تو شاید دجلہ اور فرات میں ایسی طغیانی آئی ہو کہ سارا ملک پانی میں ڈوب گیا ہو۔ نہیں گل گامش کو ماضی کے واقعات کی فکر نہیں تھی۔ وہ مستقبل کی فکر میں مبتلا تھا۔

اتنا پشتم نے گل گامش سے کہا لیکن تمہیں موت سے لڑنے کی ایسی ہی تمنا ہے تو ضرور لڑو پہلے نیند سے لڑو۔ اور وہ اس طرح کہ ایک جادو کی نیند ہے، اگر تم اس نیند سے جاگ سکے تو ممکن ہے موت کے بعد جاگ سکو۔ گل گامش جادو کی نیند سو گیا لیکن جاگنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ہلاک ہونے ہی والا تھا کہ اتنا پشتم کی بیوی کو اس پر رحم آیا اور اس نے اسے جادو کی نیند سے جگا دیا۔

لیکن گل گامش کی مہم ناکام ہو چکی تھی۔ بالآخر اس ہیبت ناک ہمت ور آدمی نے ہار مان لی اور اتنا پشتم سے ارک واپس جانے کی اجازت چاہی۔ اتنا پشتم کی بیوی نے اپنے خاوند سے درخواست کی کہ رخصت ہوتے وقت وہ گل گامش کو کوئی تحفہ دے اور اتنا پشتم نے الوداعی

عطیے کے طور پر اسے یہ گر بتایا کہ سمندر کی تہہ میں ایک درخت ہے، جو اس کے پتے کھالے اس کا بڑھاپا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ مسلسل جوان رہتا ہے۔ یہ بقائے دوام کا راز تو نہیں تھا لیکن طبعی موت کا علاج ضرور تھا۔ اور گل گامش اس دوسری موت سے نہیں ڈرتا تھا جو دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں، کسی مہم کو سر کرنے میں آ جائے۔ اتنا پشتم کے آخری تحفے سے پھر اس کی ڈوبتی ہوئی ہمت نے ایک نئی جولانی محسوس کی۔ امید کی ایک نئی کرن نظر آئی اور وہ اس لافانی مرد بزرگ سے رخصت ہوا۔

اتنا پشتم کا ملاح جو اسے موت کے سمندر کے اس پار لایا تھا، پھر اسے لے چلا۔ اس نے سمندر میں ٹھیک اس مقام پر اسے لا پہنچایا، جہاں سمندر کی اتھاہ گہرائی میں جوانی کو واپس لانے والا تحفہ تھا۔ گل گامش نے غوطہ لگایا اور سمندر کی تہہ سے اس بیش بہا پودے کو اکھیڑ لایا اور پھر گل گامش کو وہی ملاح جس کا نام ارشانابی تھا اس کے دارالحکومت اروک واپس لے چلا۔ وہ دونوں خلیج فارس کے کنارے پہنچے اور پھر شاندار پیدل زمین پر منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے لیکن دن بڑا گرم تھا، آفتاب تیز تھا، زمین تپ رہی تھی، منزل دور تھی اور سفر سخت تھا۔ ایک چشمہ نظر آیا جس کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیکھ کے اس کا جی چاہا کہ نہا کے ذرا ٹھنڈا ہو لے۔ اس نے کپڑے اتارے اور نہانے کے لیے چشمہ میں اتر پڑا۔ جوانی کو واپس لانے والے پودے کو بھی اس نے چشمہ کے کنارے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک سانپ نے اس پودے کی خوشبو سونگھی، اپنے بل سے باہر نکلا، اور پودے کو لے کے غائب ہو گیا۔ وہ بھی تو ایک سانپ ہی تھا جس نے آدم و حوا کو نیک و بد کے درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی اور زندگی کے درخت کے پتے کھالئے اس لئے سانپ کبھی نہیں مرتے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو پرانی کیچلی اتار پھینکتے ہیں۔ اور تب گل گامش نے اپنی پہلی اور آخری شکست پر ماتم کیا۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کے ملاح ارشابانی سے خطاب کر کے اس نے رونا شروع کر دیا...... وہ جو کبھی نہیں رویا تھا، این کی دو کی موت پر بھی نہیں...... اس کے دونوں رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور اس نے کہا۔

''ارشابانی کس کے لیے میں نے اپنے بازوؤں کا اتنا زور، اتنی طاقت صرف کی، کس کے لیے میں نے اپنا خون جگر خرچ کیا؟

مجھے خود کوئی نعمت میسر نہ آ سکی۔ ہاں زمین کے اندر رہنے والے سانپوں کی میں نے ضرور بڑی خدمت سرانجام دی۔

اور اہل بابل کو اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا۔ اور وہ زندگی اور موت کا چیستان حل نہ کر سکے۔

2

ایک یونانی نوجوان تھا۔ یا اسے نیم دیوتا، نیم نوجوان کہہ لیجئے کیونکہ اس زمانے تک انسانی ذہن خداؤں اور انسانوں میں زیادہ امتیاز نہیں کرنے پایا تھا۔ خیر اس نوجوان کا نام فارسی سس تھا۔ یہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور پانی میں عکس دیکھ رہا تھا...... اپنا عکس۔

اور اسے یقین تھا کہ اس کے اپنے عکس سے زیادہ حسین اور کوئی شے نہیں۔ یہ کہ اس جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اسی طرح سالہا سال چشمے کے کنارے بیٹھا اپنا عکس دیکھتا رہا۔

یہ چشمہ بھی شاید ویسا ہی تھا، کہ شاید وہی تھا جیسے وہ چشمہ جس میں نہانے کے لیے گل گامش نے کپڑے اتارے تھے اور جس کے کنارے اس نے سدا بہار جوانی کا پودا کھو دیا تھا۔ جسے سانپ چرا لے گئے تھے۔ شاید یہ فارسی سس وہی گل گامش تھا۔ مگر اب وہ ہیرو نہیں رہا تھا۔ اس کی جلال کی خصوصیات رخصت ہو گئی تھیں، جمال ہی جمال باقی رہ گیا تھا۔

اور چشمے سے جو آواز بلند ہوئی صدائے بازگشت، وہ ایک پری بن گئی، ایک عورت۔ وہ اس خوش جمال انسان پر عاشق تھی کہ اس کے اپنے بطن میں اس خوش رو نو جوان کا تخم پھلے پھولے اور وہ ایسے ہی حسین بچوں کی ماں بنے۔ آخر اس عورت کا حضرت حوا سے کچھ تو ناطہ تھا جنہوں نے سانپ کے کہنے سے نیکی اور بدی کے علم کا پھل پہلے خود کھایا پھر حضرت آدم کو کھلایا اور اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے بقائے دوام کے درخت پر فرشتوں کو پہرہ دار مقرر کر دیا کہ کہیں انسان جو نیکی اور بدی کے علم سے واقف ہو گیا تھا، بقائے دوام بھی حاصل نہ کر لے۔

چنانچہ فارسی سس نے اس پری کی آواز نہیں سنی اور اپنا عکس دیکھتا رہا اور اپنے ہی عکس پر عاشق ہوتا گیا اور یہ پری، یہ عورت اس کے عشق میں گھل گھل کے محض صدا، محض ندا، محض صدائے بازگشت بن گئی۔ اور سدا بہار جوانی کا پودا سانپوں کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک کہ فارسی سس کو اس چشمے پر شک ہوا، جس میں وہ اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ چشمہ محض ایک آئینہ تھا، ایک خطرناک آئینہ جس میں اپنے عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور شاید یہ آئینہ کسی کی حسین آنکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک عورت کی حسین آنکھ اور اسی آنکھ کی شکل کا ایک پھول ایران میں کھلا۔ ایرانیوں نے فارسی سس کا کچھ کچھ حصہ یونانیوں سے سنا تھا اور انہوں نے اس کا نام گل نرگس رکھ دیا۔

لیکن نہ یہ چشمہ اکیلا تھا، نہ یہ نوجوان اکیلا اور نہ وہ عورت وہ پری اکیلی تھی جو عشق کے غم میں گھلتے گھلتے صدائے بازگشت بن گئی تھی۔ کیونکہ بلادِ فلسطین میں ایک مقدس درخت تھا۔ جس کے سائے میں ایک کنواں تھا ایک اور نوجوان چاند کی روشنی میں اس میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے حسین جسم کو چاند کی روشنی میں نیم عریاں کر دیا تھا۔ کیونکہ چاند کے حسن اور اس کے حسن میں ایک طرح کی مشابہت تھی۔ یہاں تک کہ اس نوجوان کے والد اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آ نکلے۔ ان کی مقدس آنکھوں پر شک اور ملامت کا سایہ پڑا اور گزر گیا اور انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا ''یوسف اپنی پوشاک ٹھیک کر۔''

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی کنوؤں، کئی چشموں، کئی زندانوں سے سابقہ پڑا اور ان سب کا اپنا عکس جلوہ فگن تھا۔ فارسی سس کی طرح اپنا عکس انہوں نے چشمے میں نہیں، دلوں میں دیکھا۔ مگر کچھ دل کھرے ہوتے ہیں اور کچھ کھوٹے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اناج کا ایک خوشہ ہے اور ان کے بھائیوں کے ہاتھوں میں بھی اناج کے خوشے ہیں مگر بھائیوں کے ہاتھ کے اناج کے خوشے ان کے ہاتھ میں اناج کا جو خوشہ ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ مصر کی قحط سالی میں یہ خواب پورا ہوا، مگر اس وقت ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا۔ پھر انہوں نے خواب میں دیکھا کہ سارے کواکب ان کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ یہ خواب بھی ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا، جو کچھ دنوں بعد ان کو ایک کنوئیں میں پھینک آئے۔

اور تین دن کنوئیں کی تہہ میں گزار کے حضرت یوسف نے تزکیۂ نفس سیکھا۔ پھر فارسی سس کی صدائے بازگشت کی طرح زلیخا ان پر عاشق ہوئی۔ وہی نیکی اور بدی کا علم۔ مگر ابھی اپنے عکس کی محبت مٹنے نہیں پائی تھی اور اس مرتبہ جس غار، جس کنوئیں، جس زندان میں حضرت یوسف کو قضا و قدر نے اسیر کیا اس میں بجائے تین دن کے تین سال گزارنے پڑے۔ یہاں تک کہ تھموز اور اوسیرس کا سبق ان کی آنکھوں نے یاد کیا کہ کس طرح ہر سال دریائے نیل میں طغیانی آتی ہے اور زرخیز مٹی کی ایک تہہ جم جاتی ہے، پھر سے زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ بہار میں زندگی کا پھر سے نمو ہوتا ہے۔ نباتات، جمادات اور انسان، اور زلیخا کو بالآخر عشق کا ثمر ملا اور حضرت یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں۔

لیکن حضرت یوسف کے زمانے میں جب بیدار مغز اور نحیف الجثہ فرعون اخناتون، مذہبی تجربہ کر رہا تھا۔ اس کے ہم وطن بقائے دوام کا ایک اور بڑا دلچسپ راستہ ڈھونڈھ چکے تھے۔ انہوں نے جسم کے زوال سے انکار کر دیا تھا۔ اگر جسم باقی رہ جائے تو روح ایک دن لوٹ ہی آئے

گی۔ایک دن مردہ جسم میں زندگی جاگ اٹھے گی، جیسے بہار میں مردہ درخت میں کونپل پھوٹتی ہے۔جیسے مردہ زمین سے نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے مردہ جسم کی حفاظت شروع کی۔ پہلے ناک کے راستے سے تیز اوزار کے ذریعے سارا بھیجا نکال لیا، مسالے بھر دیئے۔نفیس اور باریک کپڑے کی کئی کئی گز لمبی پٹیوں میں سارا جسم لپیٹا اور اس کو کپڑے میں ملفوف کر کے اس پر اسی مردے کی تصویر بنائی اور یہی تصویر لکڑی کے تابوت پر تاکہ جان دھوکا نہ کھانے پائے اور جب واپس آئے تو اس جسم میں واپس آئے۔حضرت یوسف کے ہمراہی عبرانی ہنستے تھے کہ مصری مردوں کو دیوتا مانتے ہیں اور ان کے دیوتا مردہ ہیں۔اس سرزمین میں موت، حیات پر حاوی تھی فنون لطیفہ کی محرک اور ان کی سرتاج تھی۔زندگی پر حاوی تھی۔مگر انتظار زندگی ہی کا تھا زندگی کے دوام کا، زندگی کے واپس آنے کا، عبرانی ان پر ہنستے رہے، یوں معاذ اور قیامت اور مسیح موعود پر عبرانیوں کا عقیدہ بھی رائج تھا۔ مگر خیر یہ دوسری بات ہے۔اس وقت تک عبرانیوں کو وہ شبہ نہیں پیدا ہوا تھا جو ایک زوال پسند شاعر کو اپنے معشوق کے متعلق کئی ہزار سال بعد پیدا ہوا یہ کہ:۔

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

3

ایک تھا "میں" تیرھویں صدی عیسوی میں، مغربی یورپ میں، میں نے ایک خواب دیکھا۔یہ کہ بہار کا موسم ہے۔جب نباتات میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔مئی کی صبح ہے اور بلا کسی مقصد کے محض زندگی کی جوئے رواں کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں۔لیکن رفتہ رفتہ اپنا مقصد، اپنی منزل مقصود ہوتی جاتی ہے۔میں ایک باغ دیکھتا ہوں جس کے چاروں طرف چوکونی چاردیواری ہے۔باغ کے باہر کی طرف ان تمام بھوتوں کی تصویریں ہیں جنہیں باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ان بھوتوں کے نام ہیں حسد، بخل، غربت، غم، ضعیفی، میں ان بھوتوں اور چڑیلوں کی تصویریں دیکھنے کے بعد باغ کی طرف دیکھتا ہوں۔چاردیواری سے زیادہ بلند خوشنما درختوں کی ٹہنیاں ہیں جو غنچوں اور پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، چڑیوں کے زمزموں کی آواز آرہی ہے۔میں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ اس چاردیواری میں دروازہ کہاں ہے جس کے راستے میں باغ میں داخل ہوں۔دروازہ آخر مل ہی جاتا ہے جس کی چوکیدار ایک عورت ہے، جس کا نام تن آسانی ہے۔وہ مجھے بتاتی ہے کہ اس باغ کا نام باغ نشاط ہے اور نشاط دراصل ایک سردار ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ درختوں کے سائے میں عیش مناتا ہے اور یہ درخت اس نے زیادہ تر مشرق سے یعنی عربوں کے ملک سے یہاں لا کے نصب کئے ہیں۔

اس باغ نشاط میں، میں کئی دلچسپ مردوں اور عورتوں سے ملا۔ایک تو حضرت مذاق تھے جن کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم رہتا اور جو بزلہ سنجی سے باز نہیں آتے۔ایک خاتون تھیں اخلاق بیگم، بات اس طرح کرتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا پھجی جا رہی ہیں۔لیکن ان سب سے زیادہ جس سے مل کر میں متاثر ہوا ایک چھوٹا سا دیوتا تھا کیوپڈ۔عشق کا دیوتا یہ وہ تھا جو بڑوں بڑوں کا مان توڑتا تھا۔جس کی ایک نظر سے زہد مرجھا جاتا تھا۔ جس کی آنکھوں کی تپش سے عصمتیں پگھل جاتی تھیں۔عشق کے دیوتا کے ساتھ ساتھ ایک اور نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں دو ترکش تھے اور ہر ترکش میں پانچ تیر تھے۔پہلے ترکش میں جو تیر تھے ان میں سے ہر ایک پر اس کا نام کھدا ہوا تھا اور ان پانچوں تیروں کے نام یہ تھے۔ حسن، سادگی، سخاوت، ساتھ، خوش وضعی اور دوسرے ترکش میں جو ٹیڑھے تیر تھے ان کے نام تھے غرور۔بدمعاشی، بے شرمی، بے آرزوی،

پریشان خیالی۔

عشق کے دیوتا کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے میں نے ایک حسینہ کو آتے دیکھا جس کا نام حسن تھا۔ اور بھی کئی حسین جوڑے اس کے ہم رکاب تھے لیکن یہاں ان کے تفصیلی ذکر کی فرصت نہیں۔ میں تو اپنی بپتا بیان کروں گا۔ عشق کے دیوتا نے اپنے ساتھی خوش منظر کو حکم دیا کہ مجھ پر تیر برسائے۔ اب میں باغ کے درختوں میں چھپتا پھرتا تھا اور عشق کا دیوتا اور اس کا ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔ تازہ گھاس اور پھل دار درختوں کے درمیان جہاں جہاں بھانت بھانت کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ تھک کے میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہی کنواں جس کے کنارے گل گامش نے سدا بہار جوانی کا درخت کھو دیا۔

یا وہ کنواں جس میں فارسی سس اپنے عکس کو دیکھتا رہا اور عاشق ہوتا رہا اور اس نے اس پری کو ٹھکرا دیا جو اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی؟

یا وہ کنواں جس میں حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں قید کیا تھا۔ وہی قید جو زلیخا کو ٹھکرا کے بھگتنا پڑی؟

بہر حال میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا جس کے کنارے صنوبر کا درخت تھا اور کہتے ہیں کہ فرانس کے بڑے پرانے بادشاہ پے چن کے زمانے سے اب تک ایسا خوبصورت درخت کبھی روئے زمین پر نہیں اگا۔ اس درخت کے نیچے سنگ مرمر کی ایک چٹان سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔ سنگ مرمر پر ایک چھوٹا سا کتبہ تھا۔ ''یہاں حسین فارسی سس نے وفات پائی۔'' میں اب آپ کو حسین فارسی سس کا قصہ کیا سناؤں، وہ تو آپ سن چکے ہیں کہ پری اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی۔ مگر فارسی سس نے عشق کے دیوتا کی نافرمانی کی تھی اور عشق کے دیوتا نے اسے اپنے ہی عکس کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا اور اپنے عکس کے بے مصرف، بے غرض، بے نتیجہ عشق میں اس نے جان دے دی۔ کیونکہ اس طرح بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ چشمہ کنوئیں کے کنارے میں بہتا تھا آب حیات کا چشمہ نہیں تھا، نہیں یہ تو فارسی سس کا خطرناک آئینہ تھا، خطرناک چشمہ، جہاں زندگی فنا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ذرا جھانک کے تو دیکھوں کہ یہ چشمہ کیسا ہے۔ اس کا پانی صاف تھا اس میں آئینہ کی سی جلا تھی۔ اس کے اطراف دو دو انگل اونچی گھانس تھی۔ کبھی یہ کنواں خشک نہیں ہونے پاتا۔ لیکن میں نے جب غور سے اس کی تہہ کی طرف دیکھا تو مجھے دو چمکتے ہوئے سنگریزے نظر آئے۔ دو چمکتی آنکھیں۔ دو نرگس کے پھول۔ جب سورج چمکتا تو یہ دونوں سنگریزے اس طرح جگمگاتے کہ کنویں کی تہہ ان کی روشنی سے روشن ہو جاتی۔ پورے باغ کا عکس ان دونوں سنگریزوں میں نظر آ جاتا۔ تب میں سمجھا کہ یہی دو چمکتی آنکھیں، (معلوم نہیں کسی عورت کی آنکھیں؟ یا اس کی اپنی آنکھیں؟) وہ خطرناک آئینہ تھیں جن میں اپنی پرستش کر کے فارسی سس نے اپنی جان دی۔ خدا جانے فارسی سس کے علاوہ اور کتنوں نے اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ وہ خطرناک منزل ہے جہاں بڑے بڑے دل گردے والے بے بس ہرن کی طرح شکار ہو جاتے ہیں، جہاں لوگوں کو غم و غصہ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن اب میں اپنی داستان پھر سے بیان کرتا ہوں۔ ان سنگریزوں میں جہاں میں نے سارے باغ کا عکس دیکھا، وہاں میں نے ایک گلاب کا درخت بھی دیکھا۔ اس میں ایک گلاب کا پھول لگا تھا۔ یہ پھول کیا تھا ایک ایسی دوشیزہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا یہ سارا باغ اسی کے لیے لگایا گیا ہے۔ لیکن جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس حسینہ کے اطراف ایک ایسا حصار تھا، خار دار جھاڑیوں کا، کانٹوں کا کہ

اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ میں اس حسینہ گلاب کے دیدار ہی میں محو تھا کہ عشق کے دیوتا کو موقع مل گیا اور اس نے پے در پے پانچوں تیر چلائے۔ حسن، سادگی، سخاوت، ساتھ، خوش وضعی، میرے قلب وجگر ان تیروں سے چھلنی ہو گئے۔ زخموں سے چور چور ہو کے میں نے عشق کے دیوتا کی اطاعت قبول کی اور اس نے ایک سنہری کنجی سے میرے قلب کو مقفل کیا تا کہ میرے دل پر اسی کا راج رہے۔ اس نے مجھے عشق کے مراسم اور آداب سکھائے۔ اس نے کئی ساتھی میری مدد کے لیے مقرر کیے مثلاً خوش بیانی۔ ذکر حبیب۔ راز داں اور دیدار۔ لیکن سب سے بڑا دوست جو اس نے مجھے عطا کیا ایک شخص تھا جس کا نام چارہ ساز تھا اور جو اخلاق بیگم کا بیٹا تھا۔ چارہ ساز نے کہا کہ "جناب میں آپ کی گلاب کے درخت تک رہنمائی کروں گا، اس طرح کہ کانٹوں سے آپ کا دامن نہ الجھنے پائے" اس کی رہنمائی میں میں کانٹوں سے دامن بچاتا ہوا گلاب کے درخت کے قریب قریب پہنچ گیا لیکن دفعتاً ایک بدنہاد آدمی گلاب کے درخت کے قریب ہی کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کا نام رقیب یا نگہبان تھا۔ یہ وہیں کہیں گھانس پات میں چھپا بیٹھا تھا کہ ہر ایسے شخص کو گرفتار کر لے جو گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھائے اور یہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں مثلاً زبان خلق، حیا، شرم۔ لیکن ان سب میں یہ رقیب جو اصلی نگہبان تھا بڑا ہی روسیاہ تھا۔ بڑا اونچا بورا۔ اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اس سے اور چارہ ساز سے پہلے تو کچھ بحث ہوئی مگر رقیب کے تیور دیکھ کے چارہ ساز بھاگ کھڑا ہوا اور میں رقیب کے نرغے میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے ایک شریف خاتون نظر آئی جس کا نام عقل تھا اور جو عشق کو محض حماقت سمجھتی تھی۔ اس نے مجھے نصیحت کرنا شروع کی کہ عشق سے باز آ ؤ یہ محض جنون ہے۔ زبان خلق تمہیں بدنام کرے گی۔ حیا کو خود میں نے حسینہ گلاب کی حفاظت کے لیے مامور کیا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ کہہ چکی اور مجھے قائل نہ کر سکی تو وہ بھی رخصت ہو گئی۔ عشق نے میرے لئے ایک اور مددگار مقرر کیا یہ میرا رفیق اور راز دان تھا۔ اس راز دان نے کہا کہ یہ رقیب بڑا ہی بے ڈھب آدمی ہے مگر خوشامد سے یہ بھی رام ہو سکتا ہے۔ اس کی بات مان کے میں رقیب سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لیے بڑھا لیکن رقیب نے خاردار جھاڑیوں سے آگے مجھے نہ بڑھنے دیا۔ میں نے بہرحال اس سے منت سماجت سے کہا کہ "میں اپنے کئے پر نادم ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس گلاب کے درخت کے اس قدر قریب آ گیا۔ کیا کروں میں عشق کے دیوتا کا غلام ہوں اور محبت نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے صرف محبت کرنے کی اجازت دو۔ کیونکہ محبت کرنا یا نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو میرے اختیار سے باہر ہے، میں مجبور ہوں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا مگر مجبور ہوں" اس پر رقیب ذرا نرم پڑا اور اس نے کہا "تیری نیت ایسی بری نہیں معلوم ہوتی۔ تو میرے گلاب کے درخت سے دور رہ۔ تیرا جتنا جی چاہے دور سے محبت کر، مجھے اس سے سروکار نہیں مگر دوشیزہ گلاب سے دور رہنا۔" یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ رقیب پرانے معنوں میں گلاب کے درخت کا نگہبان تھا۔ نئے معنوں میں میری طرح حسینہ گلاب کا عاشق نہیں تھا۔

بہرحال کچھ اپنی چرب زبانی سے اور کچھ اپنے رفیقوں کی مدد سے میں نے رقیب کو اس حد تک رام کیا کہ مجھے گلاب کے پاس جانے کا موقع ملا اور مجھے حسینہ گلاب کا پہلا بوسہ نصیب ہوا۔ لیکن یہ بوسہ جو وصال غرضی سے بھی بہت کم تھا، غضب ہو گیا۔ سب سے پہلے زبان خلق نے چہ میگوئیاں شروع کیں۔ پھر رشک اور حیا نے زور پکڑا۔ رقیب کو ان سب نے لعنت ملامت کی کہ وہ میری اور میرے ہوا خواہوں کی باتوں میں آ گیا اور اب رقیب نے خود افسوس کرنا شروع کیا کہ کیوں اس نے غفلت برتی۔ اب رشک نے حسینہ گلاب اور گلاب کے درخت کے اطراف ایک فصیل تعمیر کی، خندق بنائی اور میرے لئے اس تک پہنچنا ناممکن بنا دیا۔ رشک کے تمام ساتھیوں اور رقیبوں نے اس نئی فصیل کی حفاظت شروع کی۔ اب میں تھا اور فراق کا عالم میں تڑپتا تھا اور کسی طرح گلاب تک پہنچ نہ سکتا تھا۔

لیکن اب عشق کے دیوتا نے امید کو میری امداد کے لیے مامور کیا۔ یہی نہیں عشق کے دیوتا نے اپنے تمام سرداروں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی اور بالآخران سب نے مل کر اس حصار پر حملہ کیا جو رقیب نے حسینہ گلاب کے اطراف بنایا تھا۔ ایک ایک کر کے زبان خلق شرم، حیا اور رقیب سب زیر ہو گئے اور مجھے گلاب تک رسائی نصیب ہوئی۔ گلاب کے درخت تک، حسینہ گلاب تک، گل بکاؤلی تک، بکاؤلی تک یہ آب حیات کے چشمے تک پہنچنے کا دوسرا اصول تھا، جو سانپ نے حضرت حوا کو سکھایا تھا کیونکہ۔ میں نے محسوس کیا کہ چشمہ آب حیات حسینہ گلاب کا دامن ہے۔

4

ایک تھا بادشاہ جس کا نام تھا عقل۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام دل تھا اور عقل نے دل کو اقلیم بدن کا سردار مقرر کیا۔ یہ شاہزادۂ دل اقلیم بدن کا نظم و نسق اچھی طرح چلا رہا تھا کہ کسی نے چشمہ آب حیوان کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ ذکر سن کے دل دیوانہ سا ہو گیا کہ آخر یہ کیسا چشمہ ہے جس کا ذکر ہر زبان پر ہے لیکن جو ہر نظر سے پوشیدہ ہے۔ بالآخر دل نے اپنے ایک معتمد رفیق نظر کو روانہ کیا کہ دنیا بھر کا چکر لگائے اور چشمہ آب حیواں کا سراغ لگائے۔

نظر، ملک ملک زمین زمین تلاش کے ارادے سے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک شہر پہنچا جس کا نام تھا عافیت۔ یہاں کے شہریار کا نام ناموس تھا۔ یہاں نظر کی دال زیادہ نہیں گلی۔ اس نے شہریار ناموس کی نصیحتیں سنیں اور آگے روانہ ہو گیا۔ حصار زہد میں اس نے ایک پیر م خمیدہ کمر کو دیکھا جس کا نام زہد تھا اس نے اسے اپنے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور شہر ہدایت پہنچا۔ یہاں کا بادشاہ قوم عاد سے تھا۔ فیل تن، دیو قامت، اس کا نام ہمت تھا اور بالآخر ہمت ہی سے اسے چشمہ آب حیات کا پہلا سراغ ملا۔

ہمت نے اسے خبر دی کہ ایک بہت بڑا شہنشاہ ہے جس کا نام عشق ہے یہ بڑا ہی باجبروت شہنشاہ ہے۔ یہ شہنشاہ عشق پتھر سے مقناطیس بناتا ہے یہ لوہے کو گلا کر موم کر دیتا ہے یہ عشق ہی تو تھا جس نے سب سے پہلی شمع جلائی اور اس پہلی شمع پر پہلا پروانہ نثار ہوا۔ اسی نے باغ میں لالے کھلائے اور بلبلوں کے دل کو داغ دیا۔ اس شہنشاہ عشق کی ایک لڑکی ہے جس کا نام حسن ہے۔ ایسی پری رو کہ آسمان کا چراغ اس کا پروانہ ہے، جہاں سوز ایسی کہ اگر دریا کی طرف دیکھے تو پانی میں آگ لگ جائے۔ شہنشاہ عشق نے اپنی اس بیٹی شاہزادی حسن کو شہر دیدار کی حکومت سپرد کی۔ یہ شہر دیدار کوہ قاف کے قریب واقع ہے۔ اس شہر میں ایک جنت نما باغ ہے جسے باغ رخسار کہتے ہیں۔ اسی باغ رخسار کے کنارے چشمہ آب حیواں واقع ہے۔

لیکن جہاں ہمت نے نظر کو شہر دیدار اور گلشن رخسار اور چشمہ آب حیواں کا پتہ بتایا، وہاں یہ بھی جتا دیا کہ یہاں سے لے کر چشمہ آب حیواں تک راستہ بڑا ہی دشوار گزار اور خطرناک ہے۔ راستے میں بڑے ہولناک بیابان آتے ہیں۔ بڑے خطرناک طلسمات ہیں۔ بڑے سگ سیرت آدمی خوار راستے میں ملتے ہیں جن کا سرتاج ایک مہیب دیو ہے جس کا نام رقیب یا نگہبان ہے۔ شہنشاہ عشق کے حکم سے یہ رقیب د سیرت دارالملک دیدار کا دربان ہے۔ اگر تو اس کے چنگل سے بچ کر نکل گیا تب کہیں شہر دیدار تک تیری رسائی ہوگی۔ جا۔ خدا تیری مدد کرے۔
نظر ہمت کے بتائے ہوئے راستے پر روانہ ہوا۔ اس کے آقا نے اسے چشمہ آب حیواں کا سراغ لگانے بھیجا تھا۔ وہ خطروں سے

ڈرے بغیر ہمت کر کے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ اقلیم عشق میں پہنچا تو دیکھا یہاں عجیب حال ہے۔ گرمی کا یہ عالم ہے کہ آگ ہوا ہے اور ہوا آگ ہے۔ زمین پتھر کی طرح سخت اور پتھر فولاد کی طرح مضبوط، یہاں سرسبزی بھی تھی لیکن کچھ اور ہی طرح کی، آنکھیں نرگس کا پھول بن گئی تھیں۔ اور لالے خون جگر سے سیراب تھے۔ جب اقلیم عشق میں قلعۂ سنگ سار کے پاس اس کا گزر ہوا تو رقیب کے سنگ سیرت سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ جب نظر نے خود رقیب کو دیکھا تو سہم گیا۔ ایک سنگ سیرت، سنگ صورت سا شخص، قوی ہیکل، دیو پیکر، طول، بے اصول، نا قبول، جھول، دیو غول، رقیب نے اسے سرزنش کی کہ اس علاقے سے گزرنے کی تجھے آخر ہمت کیسے ہوئی جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ لیکن نظر ایک عیار تھا اس نے رقیب کو رشوت میں، بہت سا سونا دیا اور اسے شہر دیدار اور باغ قامت تک پہنچا دیا گیا۔ باغ قامت کا سردار ایک بلند بالا، نازک اندام سا سردار تھا۔ اُس نے رقیب دیو سیرت کو دیکھ کے پوچھا کہ اسے پلنگ قلعہ زور آزمائی، اے نہنگ قلزم نا آشنائی، آج تیرے ساتھ یہ بیگانہ اور اجنبی سا آدمی کون ہے اور یہ یہاں کیسے پہنچا۔ رقیب نے کہا کہ مجھے دار الکلب کی عام بیماری ہے اور یہ شخص میرا طبیب ہے۔ میں اسے ساتھ لیتا آیا۔ قامت ایک فریس تھا، اس نے مجلس آراستہ کی اور دیو سیرت رقیب کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مدہوش ہو گیا۔ پھر اس نے نظر سے اس کا حال پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس کام سے آیا ہے؟

اور جب قامت اور نظر کی کھل کے باتیں ہوئیں تو قامت نے نظر کو اپنا ہم راز بنا لیا۔ اسے باغ قامت کے عجائبات دکھائے۔ رخسار کے دو سرخ سرخ گلاب۔ ان پھولوں کے درمیان غنچۂ دہن، موئے کمر، ابھی نظر باغ قامت کی سیر کر ہی رہا تھا زلف مشکبار شکار کھیلنے آئی، اس کے ساتھ سیکڑوں حبشی سورماؤں کی فوج تھی اور یہ کمند ڈال کے نظر کو گرفتار کر کے لے گئی اور نظر نے بھی اس قید سے گلشن رخسار کا نظارہ کیا۔ گلشن رخسار میں اس نے اور بہت سے عجائبات دیکھے اور وہ مبہوت سا ہو گیا۔

نظر کا ایک بھائی تھا۔ ایک یوسف گم شدہ جو ترکستان اور خاور کی سرحد پر رہا کرتا تھا۔ نظر اس کے حال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کا نام غمزہ تھا اور یہ شہزادی حسن کے دربار میں ایک بڑا ذی اثر افسر تھا۔ غمزہ نے شہزادی حسن کے حکم کی بنا پر نظر کو قید کر لیا اور قریب تھا کہ تلوار کے ایک وار سے اس کا سر قلم کر دے کہ اس نے دفعتاً اس مہرہ کو دیکھ لیا جو نظر کے بازو پر بندھا ہوا تھا اور پہچان لیا جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا اس کا اپنا بھائی ہے۔ تلوار پھینک کے وہ اس سے بغل گیر ہو گیا۔

جب حسن کو یہ معلوم ہوا تو اس نے غمزے کو حکم دیا کہ نظر کو اپنے ساتھ گلزار رخسار میں لائے۔ جب خانہ وگلزار حسن کی نظر نے سیر کی تو اسے طرح طرح کے حسین نظر آئے۔ بتان چین وخطا، سمرقند کے شکریں دہن، خوارزم کے بلا چشم، عراق کے نگار، اصفہان کے سیہ چشم، شیراز کے تنگ دہن، گلبہائے تبریز، لیلیان عرب، شکر ریزان مصر، منظر کثرت نظارہ اور شدت جمال سے مبہوت تھا کہ حسن نے اس سے سوال و جواب شروع کیے۔ حسن نے پوچھا ستارہ کا مقصود کیا ہے؟ نظر نے جواب دیا اس کی صنعت کا نظارہ کرنا۔ حسن نے پوچھا کہ چشم بینا کس لئے بنی ہے؟ نظر نے کہا رخسار زیبا کے مشاہدے کے لیے۔ اور اسی طرح کے سوال و جواب میں نظر نے اپنے شاہزادے دل کا ذکر کیا۔ حسن نے اپنا دل اسے دکھایا جو ایک گوہر سنگین تھا۔ اس کے مقابلے میں جب نظر نے شاہزادۂ دل کا ذکر کیا جس کا دل دل عادل اور دل عاشق تھا تو حسن اس کی گرویدہ ہو گئی۔

اب عشق کی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ حسن کا ایک پری تمثال غلام تھا، جس کا نام تھا خیال۔ خیال کو حسن نے نظر کے ساتھ ملک بدن بھیجا اور حسن نے نظر کو ایک طلسمی انگوٹھی دی کہ وہ اسے دل تک پہنچائے۔ اس طلسمی انگشتری کی خصوصیت یہ تھی کہ جو اسے منہ میں رکھ لیتا وہ تو

خودتو سب کی نظروں سے روپوش ہو جاتا مگر خود سب کو دیکھ سکتا۔ اس انگشتری کی مدد سے مملکت عشق کے سپاہیوں کی آنکھ سے بچ کے نظر، ملک بدن واپس پہنچ گیا۔ دل کو اس نے شہزادی حسن کے حسن و جمال کی کہانی سنائی۔ گلزار رخسار کا ذکر کیا کہ اس جنت ارضی میں چشمہ آب حیات پنہاں ہے اور بجز ساقیان حسن گل رو کے کوئی اس آب حیات کے چشمے سے واقف نہیں۔ نظر اور خیال کی لسانی سے دل کا عشق اور شدت اختیار کر گیا۔ اب عشق نے جنون کی کیفیت اختیار کی اور دل نے شہر دیدار روانہ ہونے کا ارادہ کیا لیکن دل کے ایک ناصح مشفق ہمدرد کو اس سفر کے بھید کا پتہ چل گیا۔ وہم نے دل کے والد شہنشاہ عقل کو آگاہ کر دیا اور عقل نے مصلحت اس میں دیکھی کہ اس جنون سے بچانے کے لیے اپنے بیٹے دل کو نظر بند کر دے۔ چنانچہ دل عقل کے حکم سے نظر بند کر دیا گیا۔ ادھر زندان میں دل کی حالت غیر تھی۔ ادھر نظر پھر شہر دیدار میں حسن کے پاس پہنچا اور گلزار رخسار میں تشنگی کے عالم میں اسے چشمہ آب حیواں نظر آیا۔ مگر جیسے ہی اس نے چشمے کا پانی پینے کے لیے منہ کھولا طلسمی انگوٹھی اس کے منہ سے چشمہ آب حیواں میں گر پڑی۔ نظر جو سب کی نظر سے چھپا ہوا تھا۔ سب کو نظر آنے لگا اور اسے رقیب نے گرفتار کر لیا۔

لیکن سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا یہ تھا کہ چشمہ آب حیواں اس کی نظر سے غائب ہو گیا۔ جیسے سدا بہار جوانی کا درخت گل گامش کی نظر سے غائب ہو گیا تھا۔

نظر نے بہر حال رقیب کے چنگل سے نجات پائی حسن نے غمزے کو نظر کے ساتھ پھر دل کی تلاش میں روانہ کیا۔ راستے میں حصار زہد پڑتا تھا۔ غمزے نے اس حصار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر ان دونوں نے پوستین پوش ترک درویشوں کا بھیس بدلا اور اپنی باتوں سے ناموس کو قلندر بنا دیا۔ یہ ناموس عقل کی مملکت میں ایک بڑا سردار تھا۔

لیکن توبہ کے سامنے نظر اور غمزے کی ایک نہیں چلی۔ یہ تو بڑا سخت جان سردار تھا۔ یہ غمزے کا نشان چھین کے شہنشاہ عقل کے سامنے لے گیا اور عقل نے اپنے بیٹے دل کو سمجھایا۔ دل کو قائل کر دیا۔ اور دل ایک لشکر جرار لے کر اس ارادے سے روانہ ہوا کہ شہر دیدار کو مسخر کر لے لیکن اب غمزے نے ایک نئی چال چلی۔ آہو کا بھیس بدل کے اپنے ساتھ بہت سے آہوان ختن کو شریک کر لیا اور دل کے شکار کے شوق میں ان آہوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اس طرح اپنے لشکر سے بچھڑ گیا۔ اب شہنشاہ عقل نے خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ شہر دیدار کی تسخیر کا ارادہ کیا اور شہر دیدار کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے شہر کو عقل کی زد میں پا کے شہزادی حسن نے اپنے باپ شہنشاہ عشق سے مدد مانگی اور عشق خونخوار کا مہیب لشکر دل کے لشکر کے مقابلے میں روانہ ہوا۔ زلف سرکش نے دل کی فوج پر شب خون مارا۔ ابروؤں نے کمان کڑی کی، مژگاں نے تیر چلایا اور بالآخر خیال نے دل کو قید کر لیا۔ جب دل گرفتار ہو گیا تو عقل اور دل کی سپاہ کے قدم اکھڑ گئے۔ ادھر حسن نے دل گرفتار کو چاہ زندان میں گرفتار کر لیا۔

شہزادی حسن اپنے گرفتار یعنی شہزادہ دل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کی ایک سہیلی تھی وفا۔ اس کے ساتھ وہ گلزار کی سیر کو نکلی اور یہی وفا دل کو چاہ ذقن کی قید سے باغ آشنائی میں لے آئی۔ ادھر نظر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور شہزادی حسن سے اس نے شہزادہ دل کی سفارش کی حسن نے وفا سے مشورہ کیا۔ وفا تو یہ چاہتی تھی کہ حسن اور دل ایک دوسرے کے ہو جائیں لیکن ناز کا مشورہ تھا ''خویش را مفرش ارزاں'' ناز اور وفا میں بحث ہوتی رہی۔ بالآخر حسن نے خود ایک حل سوچا حسن نے دل کو تبسم سے بے خود بے ہوش کر دیا اور پھر اپنے پہلو میں جگہ دی۔

لیکن یہ وصال عارضی تھا۔ ابھی تک چشمہ آب حیواں کا نگاہوں سے دور تھا۔ اسی عالم میں دل پر ایک مصیبت پڑی۔ رقیب کی ایک بڑی ہی مکروہ صورت، مکروہ سیرت بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا۔ وہ بھی دل پر عاشق تھی اور حسن سے جلتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی ساحرہ تھی جسے

سحر سے صورت بدلنے میں کمال حاصل تھا غیر نے ایک دن حسن کی صورت بنائی اور دل کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس کی اطلاع خیال نے حسن کو دی۔ اب حسن کے جلال کا عالم ہی اور تھا۔ دل نے غیر کے پہلو میں بیٹھ کر اس سے بے وفائی کی تھی۔ دل کو پھر قید کر دیا گیا۔ اس مرتبہ چاہ ذقن میں نہیں بلکہ وادی عتاب میں۔ ادھر غیر جو فطرتاً بدنہاد تھی۔ دل کے بھی درپے تھی۔ اس نے اپنے باپ رقیب سے دل کی شکایت کی اور رقیب نے دل اور اس کے رفیق نظر دونوں کو قلعہ ہجران میں قید کر دیا جو بیابان فراق میں واقع ہے۔

لیکن غیر کی سازش کا حال شہزادی حسن پر آشکار ہو ہی گیا۔ اب اسے ندامت ہوئی کہ ناحق اس نے دل کو اتنی سخت سزا دی اور اب دل کے فراق میں خود حسن کی حالت بگڑنے لگی۔ خیال نے حسن کا خط دل تک اور دل کا نامہ شوق حسن تک پہنچایا۔ صبر اور ہمت نے دونوں کو ڈھارس دی اور بالآخر ہمت نے حسن اور دل کی اس والہانہ محبت کی اطلاع شہنشاہ عشق کو دی۔ ہمت نے شہنشاہ عشق سے کہا کہ قدیم زمانے میں ایک شہنشاہ تھا اس کا نام فرد تھا۔ یہ شہنشاہ بڑا ہی عادل تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے دو ٹکڑے اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کر دیئے ان میں سے ایک مشرق کا تاجدار بنا دوسرا مغرب کا۔ ان میں سے ایک بھائی کی نسل سے شہنشاہ عشق ہے اور دوسرے بھائی کی نسل سے شہنشاہ عقل۔

قائل ہو کے عشق نے اپنے ایک معتبر وزیر مہر کو عقل کے دربار روانہ کیا اور جب عقل اقلیم عشق میں پہنچا تو عشق نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی اور اسے اپنی نیابت کی کرسی پر بٹھایا۔ یہ اس لئے کہ عشق کا مرتبہ اور عشق کی طاقت ہر حال میں عقل سے زیادہ ہے۔ پھر عشق نے ہمت کو بیابان فراق اور قلعہ ہجراں کی سمت روانہ کیا کہ وہ دل کو رقیب کے چنگل سے چھڑا لائے۔ جب ہمت دل کو اس قید سے چھڑا لایا تو شہر دیدار میں قامت نے دل کا استقبال کیا۔ بالآخر عشق اور عقل نے حسن اور دل کی شادی رچائی اور تب دل کو معلوم ہوا کہ چشمہ آب حیواں دہن ہے اور پیار سے زندگی تجدید ہوتی رہتی ہے۔

شادی کے بعد جب دل گلشن رخسار کی سیر کو نکلا تو ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ یہ آب حیواں کے چشمے کے کنارے تشریف رکھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے دل کو اس طلسمات کا راز سمجھایا۔ یہ کہ دل ہی اصلی خزانہ ہے اور دوسری اشیاء طلسمات ہیں جو اس خزانے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دل جان ہے اور تمام ذرات جسم ہیں۔ نظر فکر صواب ہے اور ہمت فیض راہ بیں ہے...... رقیب دیو سیرت دراصل نفس دوں ہے، غیر ابلیس لعین ہے۔ یہ وہی سانپ ہے جس نے حوا کو بہکایا اور جو گل گامش کا سدابہار جوانی کا پودا چرا لے گیا۔

اور رہ گیا یہ چشمہ آب حیات، یہ چشمہ آب حیواں۔ یہ کیسا عجیب چشمہ ہے کہ اس میں زندگی کھو بھی جاتی ہے مگر اس سے سیراب بھی ہوتی ہے۔ کبھی یہ سراب معلوم ہوتا ہے کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، کبھی اس کے کنارے سدابہار جوانی کا پودا کھو جاتا ہے۔ اسی کنوئیں میں یوسف کو قید کی سزا ملتی ہے۔ اسی آئینے میں فاری سس اپنا عکس دیکھ دیکھ کے ہلاک ہو جاتا ہے لیکن اسی سے زندگی ابلتی ہے اور زندگی کے دریا چاروں طرف جاتے ہیں۔ چاروں طرف امڈتے ہیں۔ اسی سے ابر اٹھتے ہیں اور چاروں کھونٹ زندگی کا مینہ برساتے ہیں۔ گل گامش فنا ہو جاتا ہے۔ یوسف کا حسن ایک دن باقی نہیں رہتا۔ فاری سس کا عکس مٹ جاتا ہے اور صرف چمکدار سنگریزے باقی رہ جاتے ہیں لیکن انسان فنا نہیں ہوتا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ اسی چشمے کے فیضان سے انسان زندہ ہے۔ سب سے مقابلہ کرنے کے لیے...... سانپ سے، ابلیس سے، دیوتاؤں سے اور...... اس موذی سے جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

○

سیّد فیاض محمود

نام	:	سید فیاض محمود
قلمی نام	:	سید فیاض محمود/ فیاض محمود/ گروپ کیپٹن فیاض محمود
پیدائش	:	۳، اکتوبر ۱۹۰۶ء، شملہ (بھارت)
وفات	:	یکم اور ۲ جنوری ۱۹۹۴ء کی درمیانی رات، لاہور۔
تعلیم	:	ایم اے (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۳۰ء

گورنمنٹ کالج لاہور (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے ۱۹۲۸ء میں بی۔اے (آنرز) کیا اور ۱۹۳۰ء میں ایم۔اے (انگریزی)

مختصر حالات زندگی:

سید احمد کے ہاں شملہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت سے فارغ التحصیل ہونے تک لاہور میں ہی رہے۔ ۱۹۳۰ء میں ایم۔اے (انگریزی) کر کے چھ ماہ تک نواب صاحب ہوتی (مردان) کے پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ اسی سال اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے لیکچرر کی اسامی نکلی تو درخواست گزار ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں منتخب بھی ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء تا یکم جون ۱۹۴۵ء

اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور میں بطور انگریزی کے استاد ملازمت کرنے کے بعد پاکستان ایئر فورس کے شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گئے، جہاں سے گروپ کیپٹن کے رینک پر ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر بطور ڈائریکٹر "شعبہ تاریخ ادبیات" پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے اور کئی جلدوں پر مشتمل "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" (۷۲۔۱۹۶۸ء) مرتب کی۔

۱۹۲۹ء میں تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی معرفت ابتدائی چار افسانے رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوئے اور یہیں سے بطور افسانہ نگار شہرت ملی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد "ادب لطیف" لاہور اور "ساقی" کے لیے تواتر کے ساتھ افسانہ نگاری کی۔ اسلامیہ کالج، لاہور میں میرزا ادیب اُن کے شاگرد تھے۔ آخری بتیس برس میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ادبی منظر نامے سے غائب اور گلبرگ، لاہور میں

وشہ نشیں رہے۔

ولین تحریر:

''لاٹری'' ڈراما، زمانہ تحریر: ۱۹۲۹ء

ولین مطبوعہ افسانہ:

''زبیدہ'' مطبوعہ: ''ہمایوں'' لاہور جولائی ۱۹۳۲ء

لمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ''بے رنگ و بو'' (افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۴۰ء
- ''پھول اور کانٹے'' (افسانے) دیباچہ: پروفیسر حمید خاں — اشاعت: ۱۹۴۷ء سے قبل
- تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' — مرتبہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- "Short History of Islam" — قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

  اس کتاب کے جرمن، ہسپانوی اور عربی زبان میں تراجم ہوئے۔
- "History of Islam" — قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد — طبع دوم: ۱۹۸۸ء

  یہ کتاب ٹرکی زبان میں شائع ہو کر ٹرکی میں شامل نصاب رہی۔
- "Innir History of Indo-Pakistan"
- "There was once a king" (لوک کہانی) — لوک ورثہ، اسلام آباد — طبع اوّل: ۱۹۹۰ء
- "Folk Romances of Pakistan" (لوک کہانیاں) — لوک ورثہ، اسلام آباد

یر مطبوعہ

(ا) ''پردۂ ساز'' (افسانے)۔

عزاز:

ا۔ تمغۂ پاکستان (ملٹری)

ظریۂ فن:

''...... افسانوں سے منہ موڑ لیا۔ زمانہ بدل گیا۔ نئی نئی ادبی اقدار نے جگہ لے لی۔ افسانہ ہمارے ہاں ''کہانی'' میں تبدیل ہو گیا۔ وہ یز جو اشاریت پر مبنی تھی اور جس سے زندگی کے دریچے کھل جایا کرتے تھے، ایک محدود پیمانے میں سمٹ آئی۔''

(بحوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ، محررہ: ۲۰ اپریل ۱۹۹۲ء)

کام چور

سیّد فیاض محمود

مئی کے دن تھے۔ صبح تین بجے کا عمل تھا۔ گھر کے سب لوگ صحن میں سو رہے تھے۔ رات بھر مارے حبس کے آنکھ نہیں لگی تھی۔ اس وقت کہیں سے بھولی بھٹکی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس ہوا میں اگر خنکی نہ تھی تو کم از کم حدت بھی نہ تھی۔ لوگ جو کروٹیں لیتے لیتے تھک گئے تھے، اب پاؤں پسار کے سو گئے۔ گزشتہ دن کی تکان جو اس قیامت کی رات میں دور نہ ہوئی تھی، اب تازی ہوا جسم کے بند بند سے ازالے جا رہی تھی۔ دماغوں پر ایک پُر کیف سکون طاری ہو رہا تھا۔ تمام صحن میٹھی نیند میں مدہوش تھا کہ اتنے میں پہلے آہستہ پھر ذرا زور اور زور سے اور پھر بلند آواز سے ننھے نے رونا شروع کیا۔ بیوی گہری نیند میں سو رہی تھیں، ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ننھے کی ٹانگیں اور پھر باز و رونے کے ساتھ ہی ہلنے شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حرکت میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ سرکتا سرکتا ماں کے پیٹ سے نزدیک تر ہو گیا اور اس کی ٹانگیں ماں کے جسم پر پڑنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ننھے نے پوری آواز سے چیخنا شروع کر دیا۔ آخر مرغوب جاگ اٹھا۔ پہلے دو ایک منٹ تو اسے اپنی گھبراہٹ کی وجہ معلوم نہ ہوئی پھر اسے ننھے کے رونے نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کہا ''اماں! اماں! اماں! اور پھر اور زور سے ''اماں''۔ بارے بیوی کو ہوش آیا۔ ہڑ بڑا کے جاگیں ''کیوں؟ کیا ہے؟''

''ننھا مدت سے رو رہا ہے۔ سونے نہیں دیتا۔''

بیوی نے پہلے تو ننھے کو نیم خوابی کی حالت میں تھپکنا چاہا۔ مگر ننھا چپ نہ ہوا۔ پھر ایک کہنی کے سہارے ذرا اوپر ہو کے دوسرے ہاتھ سے ننھے کو اٹھایا۔ دیکھا تو کپڑے خراب کیے ہوئے تھا۔ انہوں نے آواز دی ''کریمن! اری او کریمن!'' پھر ''کریمن! کریمن'' مگر کریمن سب سے دور اپنی چارپائی پر چت لیٹی آرام سے سو رہی تھی۔ آخر بیوی نے کہا، ''اس کم بخت پر خدا کی مار، لاکھ سر پٹکو جاگتی ہی نہیں۔ خدا جانے اسے سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے۔ او کریمن، اے، اے کریمن!'' مگر کریمن کہاں۔

تھک کے بیوی بالکل اٹھ بیٹھیں، دونوں ہاتھوں سے ننھے کو اٹھایا۔ سرہانے اسٹول پر لیمپ مدھم سا جل رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کے بتی کو اونچا کیا۔ دیکھا تو ننھے کا بچھونا سب لت پت تھا۔ اپنے جاگنے پر، اس بے وقت کی تکلیف پر اور باقی سب کے سوئے رہنے پر، بیوی کو بہت

غصہ آیا۔ آواز دی ''مرغوب او مرغوب''۔ وہ بیچارہ ابھی کچھ نیند میں تھا پھر چونک پڑا اور ذرا ترشی سے بولا: ''کیا ہے؟''

''ذرا اٹھ کے اس نامراد کو جگا تو دو۔ مُردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے۔'' مرغوب طوطا و کر اٹھا۔ جا کے کریمن کے کندھے کو ہلایا جب اس سے کچھ اثر نہ ہوا تو زور زور سے اسے جھنجھوڑا اور آوازیں بھی دیں۔ خیر کریمن کی آنکھ کھلی۔ جب چارپائی سے پاؤں نیچے رکھا تو بیوی نے غصے سے کہا ادھر آ مردار! میں گھنٹا بھر سے آوازیں دے رہی ہوں، تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پانی لا میں ننھے کو دھوؤں۔ کریمن آنکھیں ملتی ہوئی گھڑونچی سے جو صحن میں پڑی تھی، لوٹا بھر لائی اور ننھے کو دھلوایا پھر بیوی کے کہنے پر غلیظ پوتڑے بستر سے اٹھائے اور نئے بچھائے۔ باورچی خانے میں جا کے ہاتھ دھوئے اور اپنے بستر پر آ کے لیٹ رہی۔

تقریباً آدھ گھنٹا گزر گیا۔ صبح کے چار بج رہے ہوں گے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ صحن میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سانس لینے کی آوازوں پر بھی سکوت نے غلبہ پا لیا تھا۔ بیوی کے بائیں طرف کی ایک چارپائی پر ایک تین برس کا بچہ اٹھ بیٹھا اور ''اماں اماں'' کہہ کر چلانے لگا۔ جب دھیمی آواز سے کچھ نہ بنا تو اونچی آواز سے پکارنا شروع کیا۔ بیوی کی آنکھ کوئی بیس منٹ ہوئے لگی تھی کہ اب اور حملہ شروع ہوا۔ خیر اب کے جلدی جاگ اٹھیں۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا ''پانی'' اس پر بیوی نے آواز دی ''کریمن، او کریمن!''

''جی''

''اری تو ایک آواز سے نہیں اٹھ سکتی۔ پہروں کوئی جگاتا رہے پھر کہیں اٹھتی ہے۔ بشیر کو پانی دے وہ پیاس سے ہلکان ہو رہا ہے۔'' کریمن نے اٹھ کر بشیر کو پانی پلایا اور پھر گلاس کو گھڑونچی پر رکھ، جا کے سو رہی۔

اتنے میں پانچ بھی بج گئے۔ ہوا بدستور چل رہی تھی۔ اب تو اس کے جھونکوں میں کچھ خنکی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لیے سونے والوں میں سے بعض نے پائنتی سے چادریں اٹھا کر اوڑھ لی تھیں اور بے فکری کی نیند کے مزے لے رہے تھے کہ صحن کے ایک کونے سے کھانسنے کی آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ پہلے تو آہستہ جیسے کوئی گلا صاف کرتا ہو، پھر رک رک کے، پھر پوری آواز سے۔ مگر آواز میں توانائی نہ تھی، کھانسی کے ایک حملے کے بعد حلق سے ایک آدھ تکلیف کا سانس بھی نکل جاتا تھا۔ یہ بیوی کی ساس تھیں۔ جوتی، پاؤں سے ٹٹول کر پہنی اور چارپائی کی پٹی پر دونوں ہاتھوں کو دبا کے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھیں۔ اس وقت آسمان سے تاریکی غائب ہو چکی تھی۔ بیوی کے سرہانے لیمپ بدستور جل رہا تھا، اسے بجھایا، بجھا کے اسے وہاں سے اٹھا کے صحن کی اس الماری میں جہاں لیمپ رکھے جاتے تھے رکھ دیا پھر ادھر ادھر اپنے لوٹے کے لیے نظر دوڑائی کیونکہ ان کا لوٹا مخصوص تھا، کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا مگر وہ لوٹا نظر نہ پڑا۔ باورچی خانے میں بھی دیکھا، وہاں بھی نہ دکھائی دیا۔ باہر گھڑوں کے پاس بھی نہ تھا۔ حیران ہوئیں کہ لوٹا کہاں گیا۔ پہلے تو کسی اور لوٹے کی فکر میں نظر اٹھائی۔ مگر پھر جی نہ چاہا اس لیے صحن کے دوسری طرف کریمن کی چارپائی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اسے جگایا، وہ اٹھی، اٹھ کے بڑی بی بی کو سلام کیا اور پھر ان سے استفسار کے جواب میں لوٹا ڈھونڈنے چلی۔ صحن میں اس نے دیکھا، کہیں نہ تھا، بڑی بی بی نے پوچھا: ''آخر تم رات برتن دھو کے سوئی تھیں یا نہیں؟''

''جی''

''تو میرا لوٹا بھی دھویا ہوگا۔''

''جی ہاں آپ کا لوٹا تو میں نے بہت احتیاط سے صاف کیا تھا۔ دیکھوں تو شاید باورچی خانے میں رکھ دیا ہوگا۔'' باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کے بعد بڑی بی بی کا لوٹا نکال لائی۔ صحن اب کافی روشن ہو گیا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ ذرا تھوڑا سا اور سو لیا جائے پھر

یاد آیا کہ رات برتن بہت سے تھے۔ اس لیے ان کو دھوتے دھوتے دیر ہوگئی تھی اور گھڑے نہیں بھر کے سوئی تھی۔ نیند تو بہت آ رہی تھی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں مگر بیوی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اس لیے اپنا بستر لپیٹ، چارپائی اٹھائی اور دیوار سے لگا دی۔ بستر کو فالتو سامان والی کوٹھڑی میں رکھ آئی۔

صحن کے ایک کونے میں ہاتھ سے چلا کر پانی نکالنے کا نل لگا تھا اس کے پاس گھڑے اٹھا لائی اور نل سے ایک، دو، تین حتیٰ کہ پانچ گھڑوں کا پانی نکالا۔ اٹھا اٹھا کے انہیں اپنی جگہ پر رکھا پھر صحن میں آئی اور بیوی کی پائنتی سے ننھے کے مستعمل ہوتے ہوئے پوتڑے لیے اور انہیں ایک طرف ایک تسلے میں ڈال آئی پھر ادھر جا کر وہ کپڑے جو رات کو دھلوا کے سکھانے کے لیے رسیوں پر ڈال رکھے تھے۔ اٹھا لائی۔ انہیں تہ کر کے بیوی کی پائنتی پر رکھ دیا۔ پھر ہاتھ منہ دھویا۔ گیلے گیلے ہاتھ بالوں پر پھیر کے جو جو بال سوتے میں بکھر گئے تھے انہیں جما دیا، مگر چونکہ رات گرمی کی وجہ سے بہت بے آرامی سے گزر رہی تھی اور کروٹوں اور سر کے ہلنے جلنے سے بال کچھ معمول سے زیادہ بکھر گئے تھے، اس لیے وہ اپنی اسی سامان والی کوٹھڑی میں جہاں اس کا صندوق اور اس کی ایک آدھ دوسری دوسری چیز رکھی تھی، گئی اور ایک میلی سی دو تین ٹوٹے ہوئے دندانوں والی کنگھی نکال لائی۔ ابھی وہیں کھڑی کھڑی چوٹی کھول رہی تھی کہ صحن سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ ''او کریمن اری او کریمن! کہاں غارت ہوگئی؟'' کنگھی کو وہیں چھوڑ چوٹی کو باندھتی ہوئی ''جی آئی'' کہہ کر باہر نکل آئی۔ دیکھا تو بڑی صاحبزادی رقیہ اور میاں اصغر جاگے ہوئے ہیں اور وہیں سے چلا رہے ہیں ''او کریمن، او کریمن، ارے کہاں مرگئی؟'' کریمن نے کہا ''جی میں تو یہیں تھی۔ کمرے میں بستر رکھنے گئی تھی۔'' رقیہ بولیں: ''اری جھوٹ کیوں بکتی ہے، لیا ٹن کہیں کی تو تو بال بناتی آئی ہے۔''

''نہیں تو بی بی جی میں نے تو بالوں سے کنگھی تک نہیں چھوئی۔'' ''توبہ کرری توبہ! تو تو چٹیا لپیٹتی چلی آ رہی تھی، جھوٹی کہیں کی، پانی لا منہ دھوئیں، تو مجھے بھول جاتی ہے، مجھے سکول جانا ہے، اب چھ بجے کھٹا ہے، چھ بجے!''

دوسری طرف میاں اصغر بولے ''کریمن میرے کپڑے نکال لا۔ مجھے بدلنے ہیں؟''

رقیہ: ''خود اٹھ کے کیوں نہیں پہن لیتا۔ سستی کا مارا ہوا۔''

اصغر: ''تو آپا تمہیں کیوں نہیں پانی اٹھ کے لے لیتیں اور ابھی تو کسی نے آگ تک نہیں جلائی، میں آج کھا کے کیا جاؤں گا۔ اماں، اے اماں! اٹھو بھی نا، اب سکول کا وقت ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

بیوی بھی جاگ اٹھیں۔ کہنے لگیں ''ابھی تو بہت سویرا ہے، کیوں اتنا شور مچایا ہے؟'' ''شور کس نے مچایا ہے؟ میں تو آپ کو جگا رہا تھا یہ آپا ہی صبح سے چلا رہی ہیں۔''

''بکومت اصغر! اٹھتے ہی تو تم نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے کیا کیا؟''

''تو اماں کریمن سے کہو نا کچھ کرے۔ میں کھا کے کیا جاؤں گا؟''

''او کریمن''

''جی! بیوی!! ابھی آئی۔ میں بی بی جی کے لیے صابن تولیہ لا رہی ہوں۔''

رقیہ نے کہا: ''اماں یہ کریمن ایک کام میں دس گھنٹے لگاتی ہے۔ آپ اسے کچھ کہتیں بھی نہیں۔''

بیوی نے رقیہ کو تو کچھ جواب نہ دیا کریمن سے کہا۔ ''مرغوب کو جگا دے۔'' رقیہ منہ دھو رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ رات کی گرمی کی وجہ

سے کپڑے بدن سے چپک رہے ہیں۔ رات پسینا بہت آتا رہا ہے۔ اس لیے منہ ہاتھ دھونا چھوڑ کر کریمن کو حکم دیا کہ غسل خانے میں صابن اور تولیہ رکھ آئے، وہ ادھر گئی، آپ اندر سے اپنے سکول کے کپڑے نکال غسل کرنے چلی گئی۔ مگر اصغر اور مرغوب کو کون نہلائے، انہوں نے منہ ہی دھونے پر اکتفا کیا اور اندر جا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے، کریمن نے رقیہ سے فراغت پا کر جلدی جلدی آگ جلائی اور دو چار روٹیوں کا آٹا گوندھ لیا۔ اتنے میں اصغر اور مرغوب ناشتے کے لیے سر ہوگئے۔ انہیں معمول کے مطابق چھوٹے چھوٹے نمکین پراٹھے پکا دیے اور ساتھ دہی دے دیا۔

رقیہ کے لیے اب لسی بنانی تھی، کیونکہ وہ پراٹھے کے ساتھ ہمیشہ لسی پیا کرتی تھی۔ مگر کریمن تو روٹی پکا رہی تھی، لسی کون بنائے؟ رقیہ نے شور مچانا شروع کیا۔ ''میری لسی کہاں ہے؟ میری لسی نہیں بنائی؟ کریمن نے پہلے کیوں نہیں بنائی؟''...... خیر یہ گزری کہ اب تک رقیہ کی دادی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اس لیے بیوی نے ان سے کہا۔ ''اماں رقیہ کی لسی ذرا بنا دو اس نے شور مچا رکھا ہے۔'' دادی اماں نے کریمن سے پوچھا ''بلونی کہاں ہے۔'' اس نے کہا ''باورچی خانے میں۔'' وہاں بڑی بی بی کو نہ ملی تو پھر شور ہوا۔ ''یہ کریمن کبھی چیز جگہ پر رکھتی بھی ہے یا نہیں اس پر خدا کی مار، ابھی کل تو یہاں دیکھی تھی، یہاں پڑی تھی، یہاں......'' کریمن نے کہا ''باورچی خانے میں برتنوں کی الماری کے اوپر کے خانے میں رکھی تھی کسی دیگچی کے پیچھے ہوگئی ہوگی۔'' بارے بلونی ملی، لسی تیار ہوئی۔ رقیہ نے ناشتہ کیا۔ ادھر اصغر اور مرغوب نے بھی اپنا اپنا پراٹھا ختم کر لیا۔ اتنے میں رقیہ کے سکول کی ملازمہ آگئی۔ وہ اس کے ساتھ سکول چلی گئی۔ ادھر لڑکے بھی اپنے سکول کو روانہ ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد بیوی جی اٹھیں۔ اٹھ کے پہلے شب خوابی کا میلا پاجامہ تبدیل کیا پھر ہاتھ منہ دھو کر اپنی ساس سے بالوں میں کنگھی کرائی۔ اتنے میں کریمن چولھے کے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس سے کہا گیا کہ بستر بڑھائے۔ اس نے سب بستر اندر رکھے اور چارپائیاں اٹھا کر ایک طرف رکھیں پھر دالان کے آگے سے اور چولھے کے قریب قریب سے جھاڑو دی۔ تھوڑی دیر میں مہترانی آگئی اس نے کہا بی بی پہلے پوتڑے دھلوا لیجئے۔ اس لیے کریمن سے پھر کہا گیا کہ پانی بھر بھر کے مہترانی سے کپڑے دھلوائے چنانچہ آدھ گھنٹے سے زائد وقت اس کام میں صرف ہوگیا۔ بیوی کا اور اپنا ناشتہ بڑی بی بی نے تیار کر لیا تھا کیونکہ بیوی تو فقط تھوڑا بہت گوندوں کا حلوا جو بنا کر رکھا ہوا تھا، کھایا کرتی تھیں، باقی رہیں بڑی بی بی انہوں نے دہی سے ایک آدھ چپاتی کھالی۔

کریمن نے اس اثنا میں مہترانی کا گھڑا بھر دیا جس سے وہ نالیاں وغیرہ صاف کیا کرتی تھی۔ بعد میں اس نے ہاتھ وغیرہ دھو کے، نوکر کو آواز دی۔ اس سے گوشت اور میتھی یا لک کا ساگ لانے کو کہا۔ خود گھر کا آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ آج اسے کچھ فرصت سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بڑے میاں دورے پر جا چکے تھے اور آج ان کے ناشتے کی تیاری کا کام نہیں تھا۔ اتنے میں نوکر سودا سلف لے آیا۔ اس نے آواز دی کہ سودا لے لیجئے۔ کریمن آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس لیے نہ اٹھی۔ بیوی نے نوکر کی دوسری آواز پر خفا ہو کر کہا ''کیوں ری اٹھتی کیوں نہیں اور کون تیرا باوا اٹھ کے جائے۔ سنتی نہیں وہ دیر سے کھڑا آوازیں دے رہا ہے۔'' کریمن اٹھنے کو ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا۔ ''میں لے آتی ہوں تو گوندھتی رہ۔'' جب آٹا گوندھ لیا تو مسالا پیسا، آگ جلائی اور گوشت چڑھا دیا۔ اب میتھی چن رہی تھی کہ آواز آئی ''کریمن بھاگ کے آئیو، جلدی آ جلدی۔'' کریمن چلی جا رہی تھی کہ پھر بیوی جی پکاریں ''اری آتی ہے کہ نہیں ادھر ننھے نے سارا بستر خراب کر دیا ہے۔'' بارے کریمن نے جا کے ننھے کو دھلوایا۔ نیچے کے کپڑے بدلوائے اور پھر سبزی کاٹنے لگی۔

کریمن کو اب شدت کی بھوک لگ رہی تھی کیونکہ صحت مند جسم ہونے کے باعث صبح ہی سے پیٹ خالی سا لگتا تھا۔ آج رات کی باسی روٹی بھی کوئی نہ بچی تھی اور صبح کے پراٹھوں کے بعد جو دو ایک چپاتیاں پکائی تھیں۔ وہ بڑی بی بی نے کھالی تھیں پھر بھی شاید ایک آدھ ٹکڑا بچا کچھا

رہ گیا ہو اس لیے میتھی چھوڑ وہ باورچی خانے میں جانے کو تھی کہ بیوی جن کی آنکھیں دن بھر اور لوگوں کے کام میں گڑی رہتی تھیں۔ "پکاریں اب کہاں سیر کے لیے جا رہی ہے۔ یہ میتھی جلدی جلدی صاف کر۔ لڑکے آدھی چھٹی میں ابھی آ جائیں گے۔" کریمن نے کہا۔ "جی ذرا دیکھنے چلی تھی کوئی ٹکڑا بچا ہو، بھوک لگ رہی تھی۔" بولیں "تجھے ہر وقت بھوک ہی لگی رہتی ہے۔"

کریمن نے ساگ کاٹ کر دھویا اور دیگچی میں ڈال دیا۔ اب ذرا ایک لمحے کی فرصت ہوئی تھی کہ بیوی نے کہا۔ "کریمن یہ لڑکیوں کے تکیوں کے غلاف بہت میلے ہو گئے ہیں۔ انہیں اتار کے لا اور ان کا ٹرنک بھی اٹھا لا میں تجھے دھلے ہوئے غلاف نکال دوں۔" چنانچہ غلاف بدلے گئے۔ بڑی بی بی نے پوچھا "دھوبن کپڑے نہیں لائی بہت عرصہ ہو گیا ہے کیا ہوا اسے؟" بیوی نے کہا "اس کی لڑکی بیمار ہے شاید اس لیے دیر ہو گئی ہو۔ کریمن جا تو رحیم کو آواز دے۔ اسے دھوبی کے ہاں بھیجیں اور وہاں اندر سے میلے کپڑے بھی اٹھا لا کپڑوں والی کاپی بھی لا کپڑے لکھوں۔" چنانچہ کپڑے لکھے گئے۔ رحیم سے جو کبھی کا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا کہا کہ "دھوبن سے جا کے کہہ دے کہ آ کے کپڑے لے جائے پندرہ دن ہوئے خبر ہی نہیں لی۔"

کپڑے رکھ، ابھی چولھے کے پاس بیٹھی ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا "کریمن ذرا میرے بالوں میں کنگھی کر دے، اندر سے اٹھا لا میری کنگھی۔ جانے سر میں کم بخت کھجلی کیوں ہوئی جا رہی ہے۔" کریمن نے اٹھ کے بڑی بی بی کی کنگھی چوٹی کی۔ خیال آیا کہ اب تو ذرا فرصت ہے۔ اپنے بالوں میں کنگھی کر لوں۔ اس لیے اپنی کوٹھڑی میں گئی اور وہاں بال بنا کے چوٹی باندھ رہی تھی کہ بی بی جی نے آواز دی "کریمن دیکھو سالن کو، کہیں جل نہ جائے۔" کریمن آ کے پھر پکانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب دس بج گئے تھے۔ اصغر اور مرغوب آ گئے، انہیں جلدی سے روٹی پکا کر دی پھر باقی آنے کی روٹیاں پکائیں۔ آگ بجھائی، پرات دھوئی، پھر بیوی اور بڑی بی بی کو کھانا دیا۔ رقیہ کے لیے الگ سالن نکال کے رکھا اور باہر رحیم کو روٹی دی، بعد اس کے آپ روٹی کھائی۔ اب سورج سر پر آ چکا تھا۔ سارا صحن تپنا شروع ہو گیا تھا، اس لیے سب برتن اٹھا وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

بڑی بی بی نے اور بیوی نے کھانا کھا کر کریمن سے برتن اٹھانے کو کہا۔ ان کے برتن باہر کے برتن جمع کیے۔ انہیں مانجھا مگر برتنوں کو کریمن آہستہ آہستہ دھو رہی تھی، اس ڈر سے کہ اگر جلدی جلدی دھو کے فارغ ہو گئی تو دیکھتے ہی بیوی کوئی نہ کوئی کام دے دیں گی لیکن ابھی دھو ہی رہی تھی کہ ننھے میاں کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے برتنوں کو ادھر ادھر ذرا زور سے فرش پر رکھنا شروع کیا کہ آواز سن کر بیوی سمجھ جائیں کہ برتن مانجھ رہی ہے۔ مگر بیوی کیوں ننھے کو بہلانے کے لیے گود میں لے کر ادھر ادھر پھرتیں، وہیں سے آواز دی "اور کریمن، او کریمن ادھر آئیو" کریمن ہاتھ دھو کے گئی تو حکم ہوا کہ ننھے کو ذرا لے کر پھر، پنگوڑے میں بھی چپ نہیں ہوتا۔ کریمن نے پوچھا "بیوی دودھ کے لیے تو نہیں روتا؟" بیوی بولیں "تو مت مشورے دیا کر، دودھ میں نے اسے دس دفعہ پلایا ہے، اب وہ دودھ نہیں پیتا۔ معلوم نہیں اسے کیا خلل ہے؟ اسے لے کے ٹہل یہیں دالان میں۔"

یہ تھا دوپہر بھر کا کام۔ بی بی رقیہ جب اسکول سے آئیں تو انہیں کھانا دیا پنکھا جھلتی رہی، مگر بیوی نے پھر بلا بھیجا۔ کریمن ادھر گئی ہی تھی کہ رقیہ نے پھر چیخنا شروع کیا۔ "او کریمن، کریمن!" وہ بیوی کے دالان میں، انہیں پنکھا جھل رہی تھی کیونکہ دوپہر کی گرمی میں وہ تو سو گئی تھیں، مگر کریمن کو حکم دے دیا تھا کہ پنکھا جھلتی رہ۔ صبح پانچ بجے سے اٹھی ہوئی تھی۔ ابھی تک سو دفعہ اندر باہر نکلی ہو گی۔ بدن چور ہو رہا تھا۔ پنکھا جھلتے جھلتے ذرا اونگھ گئی تھی کہ رقیہ کی آواز نے چونکا دیا۔ اب جواب دیتی ہے تو خطرہ ہے کہ بیوی جاگ نہ اٹھیں اور نہیں دیتی تو بی بی رقیہ سارا گھر سر پر

اٹھالیتی ہیں۔ ناچار اٹھی اور رقیہ کے کمرے میں گئی۔ وہاں یہ کام تھا کہ ان کے کمرے کے دروازے بند کر کے باہر سے چقیں چھوڑ دی جائیں اور کہیں سے انہیں پنکھا ڈھونڈھ کے لا دیا جائے کیونکہ ان کے پنکھے پر تو ہر وقت چور لگے رہتے ہیں۔

پنکھا تلاش کرتی پھرتی تھی کہ بیوی کو مکھیوں نے تنگ کیا انہوں نے ننھے کے اوپر تو ململ کا ایک دوپٹا ڈال دیا تھا چونکہ کریمن انہیں پنکھا جھل رہی تھی اس لیے خود ویسے ہی پڑی تھیں۔ اب مکھیاں جو منہ ناک پر بیٹھنے لگیں تو وہ جاگ اٹھیں۔ کریمن کو تنی مالزادی سب کچھ بنا دیا۔ خوب خفا ہوئیں۔ خیر گزری کہ ننھا سو رہا تھا۔ آواز بہت اونچی نہیں نکالتی تھیں ورنہ شامت ہی آ جاتی۔ کریمن آئی اور ساری دوپہر بیوی کے سرہانے پیڑھی پر بیٹھی اونگھتی ہوئی پنکھا جھلتی رہی۔ بہت دیر ایک جگہ بیٹھنے سے پاؤں بھی سو گئے مگر بیٹھی اونگھتی رہی۔

سہ پہر کے وقت پھر نقل وغیرہ کا سامان کرنا تھا۔ کسی کے لیے لسی بنائی۔ کسی کو خربوزے منگوا کے دیئے اور بیوی کو حریرہ بنا کے دیا پھر شام کو سودا منگوایا۔ مسالا پیسا، ہنڈیا چولھے پر رکھی، سالن پکایا، روٹی پکائی۔ باقی دن اسی طرح گزر گیا۔ اس میں بی بی رقیہ کے کمرے میں جھاڑو دینا بھی شامل تھا کیونکہ ان کی چاندنی پر کسی نے میلا پاؤں رکھ دیا تھا۔ رقیہ نے اس کو اندھی، گدھی اور جو جو کچھ ان کے زبان پر آیا کہا اور یہ بھی کہا کہ ہمارے سر پر یہ عذاب معلوم نہیں کیوں سوار ہے۔ ایک آواز تو کبھی سنی ہی نہیں، دس آوازیں دو تو کچھ سنتی ہے اور پھر کام ایسا بد دلی سے کرتی ہے کہ نہ ہونے سے بدتر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اماں نے اسے کیوں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال سر شام کریمن نے صحن میں چارپائیاں بچھا دیں۔ ان پر سب کو کھانا کھلا کے، برتن جمع کر کے انہیں صاف کیا۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ کریمن نے ابھی ابھی برتنوں سے فراغت حاصل کی تھی۔ اب کھرا صاف کر رہی تھی۔ ٹانگیں ایسی بوجھل محسوس ہو رہی تھیں جیسے ان میں سیسہ بھرا ہوا ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں لہٰذا اس نے سوچا کہ پانی صبح اٹھ کے بھروں گی اب تو نل نہیں چلایا جائے گا اور پھر اس کے چلانے سے شور ہوگا اور سوچا کہ گھڑونچی کے گھڑے تو ابھی خالی نہ ہوئے ہوں گے کیونکہ سہ پہر کو دیکھے تھے آدھے آدھے بھرے ہوئے تھے۔ اس لیے اپنی چارپائی بچھانے چلی۔ آج پھر ہوا بند تھی مگر کل جتنا حبس نہ تھا۔ چارپائی تو بچھالی، اندر سے بستر لانا دوبھر ہو گیا۔ بہر حال لے آئی اور بچھانے کے ساتھ جو پڑی تو ایک ہی منٹ میں سو گئی۔

ابھی رقیہ اور اصغر جاگ رہے تھے، اپنے اپنے سکول کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں اصغر کو پانی کی ضرورت ہوئی۔ وہ اٹھ کے لوٹا بھرنے گیا تو دیکھا کہ گھڑے میں پانی نہیں ہے۔ بس اس نے چلانا شروع کیا۔ ''گھڑوں میں کبھی پانی ہوتا ہی نہیں۔ معلوم نہیں بہشتی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ روز دیکھتا ہوں پانی نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں؟'' اصغر کی دادی غالباً جاگ رہی تھیں، کہنے لگیں: ''بیٹا باورچی خانے میں سے لے لو'' مگر اصغر کیوں جاتا۔ وہیں سے گیا اپنی والدہ کے سرہانے اور لگا انہیں جھنجھوڑنے ''اماں! اماں! اے اماں!'' ان کی ابھی ابھی آنکھ لگی تھی یکلخت جو جاگنا پڑا بہت غصہ آیا۔ کہنے لگیں۔ ''ہے ہے تجھے صبر بھی نہیں پڑتا۔ کسی کو سونے بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ سارا دن گرمی سے آنکھوں پر نیند حرام رہی اب ذرا سوئی تھی کہ جلاد سر پر آن سوار ہوا۔''

''تو میں کیا کروں۔'' اصغر نے جھلا کے جواب دیا ''گھڑوں میں پانی بھی ہو، مجھے صحت خانے جانا ہے۔''

''تو میرے سر کیوں ہوا ہے نامراد، کریمن مردار سے کہہ وہ نواب زادی تو سر شام ہی سو جاتی ہے۔ اسے کہہ تجھے پانی نکال کے دے۔ ایسی کاہل بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ توبہ ایسی نیند کی پیاری ہے کہ پانی تک نہیں رات کو بھر سکتی۔ اُٹھا اس کام چور کو! او کریمن...... او کریمن...... اے کریمن......''

حیات اللہ انصاری

نام	:	حیات اللہ انصاری
قلمی نام	:	حیات اللہ انصاری
پیدائش	:	یکم مئی ۱۹۱۲ء بہ مقام فرنگی محل، لکھنؤ۔ بھارت
وفات	:	۱۸ فروری ۱۹۹۹ء بہ مقام لکھنؤ، بھارت
تعلیم	:	بی۔اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء
		''الکفایۃ الفکریہ'' کی اعزازی سند، مراکش یونیورسٹی

ابتداً اپنی نانی اماں سے قرآن مجید کا سبق لینا شروع کیا۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل لکھنؤ سے ''مولانا'' کی سند لے کر ۱۹۲۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا سید علی نقی، مولانا سید سبط حسن اور خلیل عرب سے عربی کی تعلیم پائی۔ میٹرک ۱۹۲۹ء میں کیا۔ جوبلی کالج، لکھنؤ سے ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ''فاضل ادب'' کیا اور ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے بی۔اے۔ مراکش یونیورسٹی نے آپ کو ''الکفایۃ الفکریہ'' (ڈاکٹریٹ) کی اعزازی ڈگری دی۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام وحید اللہ انصاری تھا۔ آپ کے جد امجد مولانا قطب الدین قصبہ سہالی، بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ مذہبی، علمی تصنیف و تالیف کا کام آپ کے خاندان میں ساڑھے چار سو برس سے ہوتا چلا آیا ہے۔ شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر نے اپنی تخت نشینی کے چار برس بعد حیات اللہ انصاریؒ کے جد اعلیٰ ملا حافظ کی علمیت کے اعتراف میں شاہی مکتوب سے نوازا۔ واضح رہے کہ تا حال اکبر کا یہ پہلا نجی خط شمار کیا جاتا ہے۔ اس خط میں جلال الدین محمد اکبر نے ملا حافظ کو چار القابات سے نوازا تھا۔

حیات اللہ انصاری نے ۱۹۲۷ء میں مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل میں کچھ مدّت درس دیا اور اس کے بعد سیاست کی طرف نکل گئے۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ سابرمتی آشرم میں دس برس گزارے۔ کانگریس میں شمولیت اختیار کی، ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۲ء ہفتہ وار ''ہندوستان''، ۱۹۴۰ء تا ۱۹۷۲ء ہفتہ وار ''قومی آواز'' اور ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۶ء ہفتہ وار ''سب ساتھ'' کے ایڈیٹر رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور تعلیم گھر، لکھنؤ سے وابستہ رہے۔ کل ہند تعلیم گھر، لکھنؤ کے بانی ہیں۔ حکومت ہند کی طرف سے دوستانہ مشن پر متعدد ممالک کا دورہ کیا اور جو ملک بچ رہے وہاں خود اپنے خرچ پر ہو آئے۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۶ء یو۔ پی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۲ء راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں راجیہ سبھا (ہند) کے ممبر تھے۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے صدر نشین رہ چکے ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''بڈھا سودخور'' مطبوعہ ''جامعہ'' دہلی: جون ۱۹۳۰ء

یہ افسانہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں قلم بند کیا۔ اس سے قبل بچوں کے لیے چند ڈرامے لکھ چکے تھے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱	''انوکھی مصیبت'' (افسانے)		طبع اوّل: ۱۹۳۸ء
۲	''بھرے بازار میں'' (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
	یہ درحقیقت ''انوکھی مصیبت'' کا دوسرا ایڈیشن ہے جبکہ اس میں چند نئے افسانوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے، دیباچہ کے نیچے ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔		
۳	ن۔م۔راشد (تنقید/کتابچہ)	دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۴	''شکستہ کنگورے'' (آٹھ افسانے)	آزاد کتاب گھر، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء
	دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔		
۵	''دس دن میں اردو'' (اردو قاعدہ)	کتاب دان، لکھنو	طبع اوّل: ۱۹۵۲ء
۶	''دس دن میں ہندی'' (ہندی قاعدہ)	کتاب دان، لکھنو	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۷	''لہو کے پھول'' (ناول)، پانچ جلدیں	کتاب دان، لکھنو	طبع اوّل: ۱۹۶۹ء
	اوپندر ناتھ اشک کے ناول ''گرتی دیواریں'' سے پہلے یہ اُردو کا ضخیم ترین ناول رہا ہے۔		
۸	''مدار'' (ناول)	کتاب دان، لکھنو	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۹	''گھروندہ'' (ناول)	کتاب دان، لکھنو	طبع اوّل: ۱۹۸۲ء
۱۰	''قاعدہ نما'' (''دس دن میں اُردو'' کا ہدایت نامہ)	کتاب دان، لکھنو	طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
۱۱	''ترقی اُردو ریڈر'' (مرتبہ)	ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۷۸ء

تعلیم بالغاں کے سلسلے کی دوسری کتاب جس میں نظمیں، اور معلوماتی مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

۱۲ ''جدیدیتی افسانے کی سیر'' (تنقید) طبع اوّل: ۱۹۸۸ء

۱۳ ''ٹھکانا'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی طبع اوّل: دسمبر ۱۹۹۱ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

B-2/4، ریور بینک کالونی، لکھنؤ بھارت۔

اعزاز:

۱۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ''لہو کے پھول'' (ناول): ۱۹۷۰ء

۲۔ الکفایۃ الفکریہ (اعزازی ڈاکٹریٹ) مراکش یونی ورسٹی۔

۳۔ کینز فلم فیسٹیول ایوارڈ: فلم ''نیچا گھر'' کی کہانی کے لیے۔

نظریۂ فن:

''زندگی کے چار مناظر بیماری، بڑھاپا، غریبی اور موت نے مہاتما گوتم بدھ کو نروان کی تلاش میں سرگرداں کر دیا تھا۔ تب زندگی ہلکی پھلکی تھی، پیداوار کی افراط تھی اور آج کی طرح کا استحصال نہ تھا، جو کہ دکانداری اور پولیس سے لے کر حکمرانی اور عالمی جنگ تک جاتا ہے اور دوسری طرف وہ صحافت، تاریخ نویسی اور مذہب کی ترجمانی تک میں گھس جاتا ہے۔ آج تو گوشۂ عافیت میں بھی مظلوم کی آہیں پہنچ کر سکون درہم برہم کر دیتی ہیں۔ اس تاریک خانے میں افسانہ نویس کا قلم، نروان تو بہت بڑی چیز ہے، روشنی کی چھوٹی موٹی کرنیں ڈھونڈتا پھرتا ہے، جہاں وہ مل جاتی ہے، حریص مکڑی کی طرح اس کو الفاظ کے جال میں مقید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۱۰ نومبر ۱۹۸۴ء)



حوالہ جات:

۱۔ مالک رام نے ''تذکرہ ماہ و سال'' میں ان کی تاریخ پیدائش یکم مئی ۱۹۱۱ء درج کی ہے، جو درست نہیں، حیات اللہ انصاری نے 10 نومبر ۱۹۸۴ء کو میرے نام ایک خط میں اپنی تاریخ پیدائش یکم مئی ۱۹۱۲ء لکھی تھی۔

آخری کوشش

حیات اللہ انصاری

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ ب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں تو اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں ئیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پیدل بھی چلنا پڑا' ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے یا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے...... وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے جب میں کلکتہ پہنچا تو کالی مل کھلی تھی راب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آگے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا چا راستہ اور...... دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے یا پھر شہر سے بلوں دور ٹھیکہ دار کی جھونپڑیاں' جس کی زمین پر اتنے آدمی سوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی' رہے اپنے لوگ' سو وہاں اپنا کون تھا؟ ب غرض کے بندے' بے ایمان' حرام زادے' ایک وہ سالا تھا بھوندوا۔ دوسرا تھا۔ بجورا اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ ملوں کے مزدور' بھائی ہیں' مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی' جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور۔ سفارش لئے موجود' یہاں سفارش رنے والا کون تھا؟...... جب جیلر نے آ کر مجھے حکم سنایا ہے کہ' تیری معیاد ختم' تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس ایک دم سے ھر کی یاد آ گئی۔ گھر! کیا چیز ہے؟

گھسیٹے کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا' اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آ کر گھسیٹے بھونچکا سارہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی۔ جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر مل تک ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھی۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آ جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرض کے جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی اب ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دُور آ کر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں' اور ادھر کے کھیتوں اور باغوں کے سلسلے آ گیا' تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا، کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں' پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے ایکدم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں' وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اس مسجد کے گرد پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار، یوں ہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار، یوں ہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا' بفاتی' بلاتی' تینو' نیولا' سورج' ملی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مار اؤ نڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا ایک باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا اڈا کہ پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا، ماں بہن کی سُناتا دوڑا اور ادھر آنا فانا میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے۔ پھر کیا تھا۔ سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاتی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے......

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آ گئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پناور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے، جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ' باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو' ان سب سے ہوا اس طرح بسی ہوئی تھی' جیسے پناوروں کی بھینی بھینی، میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت' درخت' ہوا' آنے والی صدائیں اور خوشبو' سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے' بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی، وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آ گیا۔ ان کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا، یہیں دلاری سے چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی بھنا اسی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ منے کا۔ وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا' تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے۔ شہر جاؤں گا' نوکری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرالال کی طرح ایک دم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اسی وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آ جایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور' اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ' گڑھیاں میں ڈھیلے پھینکے گی' گنگنائے گی۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی...... بڑی چڑیل تھی نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ یہاں، یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شمن میاں کی قمیض کا بٹن نوچ لیا تھا ادھر شمن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے! گھسیٹے" ...... کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیئے ان کو اتارو' پھر جرابیں اتارو' پھر انگلیوں کو تولئے سے پونچھو' پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو...... شمن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خان صاحبن پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "پھر پھاڑ لایا' اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں۔ یہ کہاں سے کھونچا لگایا؟ ...... کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔" ایک بار شمن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیض کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شمن میاں چلانے لگے۔ "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کا کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیض میں آستیں کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیریں' دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔ میں اِدھر اُدھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں لگے تھے' دیکھ لیا۔ "تو شمن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا...... سونے کا بٹن"۔ دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن۔ کلکتہ میں چار پیسے پتہ ملتا ہے، جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپڑوں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضاء میں ہلکی ہلکی خنکی تھی، جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولہے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپڑوں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوراہے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں۔ ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال، مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آ گئی۔ جو باجے گاجے لئے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اتری تھی۔

بنیا بھی آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھر ڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا ''موری چھاگل نہ بولے'' اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ اور رو دھو کر اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولہا جلاتی۔ جمیا اور شبراتن! افواہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں...... ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جو نئے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں...... واہ ری اماں جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے ''ارے آ ترا سر داب دوں''...... ''ادھر آ نجر گجرا تاروں...... چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا۔'''' دونوں وقت ملتے نہ چلا''۔ ہر وقت ٹنکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے...... کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے۔ گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے ہی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھربیریاں، کیتھے اور کیا کیا سب شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اُس نے طاق میں رکھ دی۔ میں ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے۔ ''کون کھا گیا؟'' اماں سمجھ گئیں۔ سہولت سے بولیں: ''چوہا کھا گیا ہوگا''...... ''تو کھا گئی ہے تو کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں؟'' اماں نے کہا ''کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟'' میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے۔ ''واہ کیا مجاہے۔'' جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون ہوگا؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے؟ ستر اسی برس کون جیتا ہے۔ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہوگا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ افواہ کلو کے ناتوں کی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

2

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بنیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا...... وہ جگہ تھی وہ...... ہاں...... وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا، اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوھدی کی جگہ جھانکڑوں، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدہام تھا جن کے پتلے تلے ٹیڑھے میڑھے سائے بچھوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بجبجا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولہا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز

پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ''ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں...... تم کو کیا کھلائیں گے؟''

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن، جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا' اکبارگی مرجھا گئی۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔ وہ لوگ کہیں اور اٹھ گئے ہوں گے' اور بار بار بکریوں کے موت کی کراہند اور ناہدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں' ان بالو کے گھر ندوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا' جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا' بار بار رنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

''اندر چلی آؤ نا۔''

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو بیچ بیچ کھکھارا' پھر کہنے لگا:

''کون، فقیرا؟''

''ہاں!''

فقیرا ذرا چڑ کر بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''ذرا ادھر آؤ۔''

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ذرا سنو تو بھائی' تم فقیرا ہو نا؟''

''ہاں ... کہہ تو دیا۔''

''تم یہیں رہتے ہو۔''

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہوگیا' مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا:

''میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں...... تمہارے پاس۔''

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا ''تو اندر آؤ۔''

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلا وجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلا دیا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چیتھڑا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہوگی مگر چیتھڑا ہو کر گمنام ہوگئی تھی' اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا' آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں' جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "بھیا تم تو جوانی ہی میں بُوڑھے ہو گئے۔"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

اب فقیرا ٹھٹکا۔ "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو۔ گھسیٹے تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون۔ بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہوں۔"

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر اسے لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے' اس کے آنسو دھل دھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔

تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو' یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے۔ اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اماں! ہے کیا؟"

"ہاں"۔

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں ادھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کے دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑے نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کونے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا' بدگوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھینچی ہوئی الٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی۔ اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔ باب...... باب...... باب...... باب۔"

اس کی آوازیں ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھیں' جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے تھے۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا: "جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے' پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا۔ ''اماں۔''

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔ فقیرا نے کہا: ''نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔''

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' بات کی آواز نکل رہی تھی' اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے۔ اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا۔ ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی۔

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار ابل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا' مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا...... ''بھیا! تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سیتا کروں۔''

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولہا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا ''اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟''

''نہیں' آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔''

''اب کھیتی نہیں ہوتی؟''

''وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی، میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں وہ بکیں پکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔''

''بھورے کاہے میں پکڑا گیا؟''

''سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا؟؟ فقیرا! مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن' عیش تو کر لیں گے...... دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا...... بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔''

''جھمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟''

جھمیا حرام زادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہوا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے، کسی طرح گزر بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔''

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا: ''تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا تھا ابا کہا کرتے تھے کہ ''یہ سب پلے پیٹ بھرے میں پیٹ بھرے''۔ سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گزری' جب چولہا نہ جلا ہو۔''

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔
فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا: ''کہاں رہے گھسیٹے؟''
''ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گزری وہاں' ملوں کی خاک چھانی' امیدواری میں کام کیا' بھوت گھر میں روئی ڈھوئی' ہفتوں قبض رہتا تھا' چار سال رکشا چلائی' پھر خونچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔''
فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔
فقیرا بولا: ''بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ' اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔''
گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا۔ ''تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔''
''ہاں' مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے' اور پھر باب' باب کرنے لگتی ہے۔''
گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

3

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے' دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا' اپنے میلے کرتے کے چلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں' پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑ پھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو اللہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے' ہاتھ پاؤں سکڑے کندھوں کو آگے جھکائے سوسو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔
گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر' بکریوں کے موت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب' باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو برے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھویا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک' سب سے بڑی کوفت یہ ہے کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانے دار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا' وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں' دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔
گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا' وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سلی اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں' خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین فاقے کر لینا۔ اپنے گھر کی اس زندگی سے

لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والا سنگل چاء۔ وہ دھیلے والا پان کا بیڑا! وہ پیسے کی پچیس بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے وہ یہاں ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کے جھانپوں کی مار کھائی۔ کھانے پینے کو ترستے رہے، پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لیے شہر بھاگے، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں، کہا چلو کلکتہ، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائیگی اور سب پاپ کٹ جائے گا، کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لیتا ہے تو، جمانتی لاؤ۔ میں کسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے، گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ پھمن بولا۔ دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روزانہ دیئے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ دور ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ ہسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض اُدھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا جب جو آتا کہتا سیزر لاؤ، نسی کٹ لاؤ، یہ لاؤ وہ لاؤ، یہاں کیا تھا؟ کہتے ''نہیں ہے صاحب، نہیں ہے ہجور۔'' وہ بھی تماشا کچھ دنوں رہا، نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا اس پر جو کچھ بھی آیا حرام زادی بھنگوئی کھا گئی۔ نہ جانے مُجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی ...... لنگوٹی میں پھاگ......

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا: ''پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہاری گزر نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔''

گھسیٹے نے جواب دیا: ''کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ، روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔''

''گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ، تو حصہ بتائے گا؟ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!''

گھسیٹے گرم ہو کر بولا: ''کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لیے تگڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟''

فقیرا نے طعن سے کہا: ''ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے کر جاتے ہی ہیں۔ بلی جو اتنا روپیہ لایا ہے تو کیسے لایا ہے؟''

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

''اور تو نے کیا کر لیا ہے چوٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا......''

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو، میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔ یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اٹھتا، روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لیے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دوارے بھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو، جو ساری کے پلو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس، ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے کو آیا......

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی۔ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آ جائے۔

ایک زبردست امنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔ ''بھیا فقیرا!''

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا ''میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں یہ کریں وہ کریں، سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟''

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا ''اگر کچھ چل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں...... وہ تو تم مانتے ہی نہیں...... اس میں تمہارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو، ان کے گھر دھن برس رہا ہے، دھن، کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگو سیر بھر آٹا ادھار دے دو، دو لنگوٹیاں ٹنک دے دو۔ ذرا سی تمبا کو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں نہ جائیں تو کریں کیا؟''

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا: ''اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا، کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔''

گھسیٹے نے اک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

''ہاں تمہارا ساجھی بیاہ کرنا ہے روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں

سہی۔ارے ہاں! اس طرح تو کبھی بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لیے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔''

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انہیں سن کر فقیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لیے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا۔ اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا ہے۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سونڈ جائے، جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں، وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہم اور وہ کھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھر لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو، اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کے بیٹھتے، آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کی کوئی فکر نہ تھی، آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے، ذرا یہ چھپر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے تو پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا، وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے، اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے، کیسا گدریا بدن ہے۔ جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ، دودھ دوہے، اوپلے وہ تھاپے، دہی وہ متھے، اکیلی جھوؤں بانس اٹھا اٹھا کر کھیتوں میں وہ ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھالے گا پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضان کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آ گئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی، پھر وہی جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اس دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

4

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنائی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب، باب، باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔ گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں میں چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں۔ جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آ گئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا:

''کہاں چلے فقیرا؟''

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے، گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا:

''شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لیے وہاں جا رہے ہیں۔''

''اماں کو لئے؟'' کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

''شاباش تم لوگوں کو...... اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!''

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر، ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کر باب کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر احتیاط فضول تھی کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منھ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بری رہی۔ ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باب کرنے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، عقل چندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھیے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کر سہما جاتا ہے۔ گھسیٹے فقیرے کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی، منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندے چڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے، پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدل پر میل کی کھملگ۔ چیتھڑے، ٹھیکرے، میل، آخور، بلغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، لوریاں دے دے کر، تھپک تھپک کر

سلا دینے والی مہاپاپن بے حسی!

اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو، چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو چاہے انسانیت ہو، مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ، تمہارا راستہ، پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:

''ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔''

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا: ''تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو، ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔''

ڈانٹ سنتے ہی فقیر ذرا ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا: ''چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔''

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا برتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہیے جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا: ''جب دے گا اللہ ہی دے گا۔'' فقیرا بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا میں شیرا چٹانا بھول گیا، گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کو لگتا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی جلدی میں اس کے منہ سے نکلا: ''اللہ ہر آفت سے بچائے۔'' اس صدا کو اس طرح دینے لگا، جیسے کوئی والنٹیئر انقلاب زندہ باد کہے، کیونکہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے،

دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ دردانگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا، جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لیے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے، وہ دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہوگیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو۔ پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتاردی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر بیچ میل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مر بھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے۔ گویا زندگی بھر کی بھوک، اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

''لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھالو۔ کبھی کا ہے کو کھائی ہوں گی۔''

گھسیٹے نے کچھ ٹکیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لیے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر مانگنے لگتی...... گھسیٹے جھلا کر بولا...... ''لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔''

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی مگر چبتا کیا۔ وہ بار بار منہ سے نکل

آتا اور پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پالنے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبالیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جاسکا۔ رس گلا دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھنڈی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہوگئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہ رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا، اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہوگیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہوگیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم اسرخ اسرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے...... فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی ہی کامیابی! پونے دو روپے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپیہ مہینہ! افوہ! اگر ہم کہیں کلکتے میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں مل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہوگیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کرلی ہیں۔ حصہ مانگا تو سسرا بگڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں گھر دے دوں گا، بکریاں دے دوں گا، مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اس کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا...... حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا: "فقیر سونا بعد کو، پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہیے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے، کاہے کا حصہ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہو اس کا۔"

فقیرا تلملا کر اٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہوگیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا

ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصّہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑ تا رہا ہے؟''

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصّے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا، اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہو تو اب ہم کھلائیں گے۔

''ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی۔ اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری تو لے جائے؟''

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصّے میں ماں کی طرف لپکا۔ جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا، مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارہ حد سے اونچا ہو گیا۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے۔ جس طرح بلی چوہے پر جھپٹتی ہے۔ فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عو عو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا، گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑ سے کھڑے قد نیچے گر پڑا۔ اور بڑھیا چیختی، قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے، منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں برر گئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیچا کی طرح ہونق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصّے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کسے پرواہ ہوتی ہے۔ مر گیا...... مر گیا...... ہا...... فقیرا...... ناحق مرا۔ مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے، اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں۔ میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

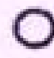
ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو...... پیاری اماں...... کلکتہ وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ ٹکیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔ لونڈے کے لونڈے، زرد زرد پھچن۔ گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا...... بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونا بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ، سینکڑوں میل سے درختوں کو تاراج کرتے مردہ پتیوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے۔ وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آ رہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔

معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا کر لے جائیں گے۔ گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھا۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا کا رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے، پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آ گیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا...... امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔



احمد علی

نام : سید احمد علی
قلمی نام : احمد علی / پروفیسر احمد علی
پیدائش : یکم جولائی ۱۹۱۰ء بہ مقام دہلی، بھارت
تاریخ وفات : ۱۴ جنوری ۱۹۹۴ء، کراچی
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی) وہائٹ میموریل گولڈ میڈل

ابتداً مرزاپور اور گوڑگاؤں کے پرائمری اسکولوں اور اس کے بعد ویسلے مشن سکول اعظم گڑھ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ منتقل ہو گئے اور ۱۹۲۵ء میں منٹو سرکل، علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں انٹر (سائنس) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ۱۹۳۰ء میں بی۔اے (آنرز) لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۳۱ء میں ایم۔اے (انگریزی) فرسٹ کلاس فرسٹ کے ساتھ پاس کیا اور وہائٹ میموریل گولڈ میڈل لے کر اسکالرشپ حاصل کی۔ اس شاندار کامیابی پر انہیں جھلا ور گولڈ میڈل بھی ملا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

احمد علی کے والد سید شجاع الدین سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے جو ۱۹۱۹ء میں وفات پا گئے۔ احمد علی کا لڑکپن تھا اور وہ پرائمری درجوں کے طالب علم تھے۔ اب ان کی تربیت چچا نے کی جو یو۔پی میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ احمد علی ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے، اسی دوران تقریباً دو برس کے لیے الہ آباد یونیورسٹی اور آگرہ کالج میں بھی پڑھایا۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء بی بی سی لندن سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۷ء پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں صدر شعبہ انگریزی رہے۔ جنوری ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء چین کی نیشنل سنٹرل یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں بھارت سے پاکستان ہجرت کر آئے اور

پاکستان فارن سروس سے منسلک ہو گئے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں انہیں ڈپٹی سیکرٹری وزارت خارجہ مقرر کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں بیرسٹر رؤف علی کی بیٹی بلقیس جہاں بیگم سے شادی ہوئی۔ ۱۹۶۰ء تک چین اور مراکش میں قونصلر اور ناظم الامور کے طور پر خدمات انجام دیں۔ واپسی پر ۱۹۷۰ء تک بزنس اینڈ انڈسٹری کے مشیر تعلقات عامہ رہے۔ ۱۹۷۰ء تا دمِ آخر لومین فیبر کس کے صدر نشیں اور منیجنگ ڈائریکٹر کے طور پر اپنا کاروبار کر رہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء کراچی یونیورسٹی کا اعزازی پروفیسر مقرر کیا تھا۔ اس دوران میں بیرون ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں اعزازی خطبے دیئے۔

پروفیسر احمد علی نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ''انڈین رائٹنگ'' کے بہ اشتراک اقبال سنگھ، مدیر رہے۔ ۱۹۴۲ء میں بین الاقوامی شہرت یافتہ بھارتی ادیب راجا راؤ کے ساتھ مل کر ''تومورو'' مرتب کیا اور ۱۹۵۰ء میں ''پاکستان پی ای این سیلنی'' کے مدیر رہے۔ احمد علی نے بطور افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، مترجم، براڈ کاسٹر، مؤلف اور سفارت کار کے شہرت پائی۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''پرانے زمانے کے لوگ'' مطبوعہ: ''نیا ادب'' اور مجلّہ ''دشوانی'' ۱۹۳۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''انگارے'' انتھالوجی مرتبہ: احمد علی، — مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ — طبع اوّل: دسمبر ۱۹۳۲ء
اس مجموعے میں سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کے ساتھ احمد علی کے دو افسانے ''مہاوٹوں کی رات'' اور ''بادل نہیں آتے'' شامل ہیں۔

۲۔ شعلے (بارہ افسانے) — نیا سنسار الہ آباد — طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
(۱) ''تصویر کے دو رخ'' (۲) ''استاد شموں خاں'' (۳) ''اس کے بغیر'' (۴) ''ہمارے ماسٹر'' (۵) ''چھچھڑ کھٹ'' (۶) ''اس کے تحفے'' (۷) ''نوروز کی رات'' (۸) ''غلامی'' (۹) ''آپ بیتی'' (۱۰) ''مزدور'' (۱۱) ''شادی'' (۱۲) ''آنکھیں'' کل بارہ افسانے شامل کتاب ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۶ء ہی میں مکتبہ اردو لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔

۳۔ ''ہماری گلی'' (سات افسانے) — انشاء پریس دہلی — طبع اوّل: ۱۹۴۲ء

(۱) ''ہماری گلی'' (۲) ''میرا کمرہ'' (۳) ''شکستہ''
(۴) ''مسز شمس الحسن'' (۵) ''مارچ کی ایک رات''
(۶) ''شراب خانے میں'' (۷) ''نوروز کی شام''

۴۔ ''قید خانہ'' (چار افسانے) — انشاء پریس دہلی — طبع اوّل: جون ۱۹۴۴ء

(۱) ''قید خانہ'' (۲) ''پریم کہانی'' (۳) ''قلعہ''
(۴) ''گزرے دنوں کی یاد''

۵۔ ''موت سے پہلے'' (ایک افسانہ) — انشاء پریس دہلی — طبع اوّل: ۱۹۴۵ء

اس کتاب کا مقدمہ آرٹ، سیاست اور زندگی سے متعلق مفصل مقالہ ہے، جسے بعد ازاں ''نقوش'' لاہور کے عصری ادب نمبر شمارہ ۱۲۹ ستمبر ۱۹۸۲ء میں شامل کیا گیا ہے۔ ''موت سے پہلے'' میں چھ تصویریں بھی شامل ہیں۔

نوٹ: ''انگارے'' میں شامل دو افسانوں سمیت احمد علی کے چاروں افسانوی مجموعوں میں کل ۲۶ افسانے ہیں۔ یوں صرف دو افسانے ''پرانے زمانے کے لوگ'' مطبوعہ: ''نیا ادب'' اور ''وشوائی اور تنہائی کا خواب'' مطبوعہ: سیپ کراچی شمارہ نمبر ۳، کتابوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، جنہیں ملا کر احمد علی کے کل افسانے ۲۸ بنتے ہیں۔

۶۔ ''Mr. Eliots Penn-World of Drems'' — لکھنؤ یونیورسٹی پریس — طبع اوّل: ۱۹۴۱ء

۷۔ ''آرٹ کا ترقی پسند نظریہ'' — انجمن ترقی اردو پریس اورنگ آباد — طبع اوّل: ۱۹۳۶ء

۸۔ ''Teaching of Poetry'' — میکسویل پریس، لکھنؤ — طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۹۔ ''Muslim China'' — کراچی: — طبع اوّل: ۱۹۴۹ء

۱۰۔ ''The Flaming Earth'' — کراچی — طبع اوّل: ۱۹۴۹ء

(انتخاب: انڈونیشیا کی شاعری کا ترجمہ)

۱۱۔ ''The Bulbul And The Rose'' — کراچی — طبع اوّل: ۱۹۶۲ء

(انتخاب: اردو شاعری کا ترجمہ)

۱۲۔ ''The Golden Tradition'' — کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیو یارک — طبع اوّل: ۱۹۷۳ء

(۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی کی اردو شاعری)

۱۳۔ "The Lamp of The Temple" طبع اوّل: ۱۹۷۰ء

(غالب کی فارسی شاعری)

۱۴۔ "The Quran" طبع اوّل: امریکہ

۱۵۔ "Problem Of Style And Technique in Ghalib" پی۔اے۔سی۔سی کراچی طبع اوّل: ۱۹۶۹ء

۱۶۔ "Failure of An Intellect" آکاش پریس، کراچی طبع اوّل: ۱۹۶۸ء

۱۷۔ "Purple Gold Mountain" کیپساک پریس لندن طبع اوّل: ۱۹۶۰ء

۱۸۔ "First Voices" (بارہ نظمیں) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی طبع اوّل: ۱۹۶۵ء

۱۹۔ "The Shadow And The Substance" کراچی یونیورسٹی پریس طبع اوّل: ۱۹۷۷ء

۲۰۔ "Twilight In Delhi" (ناولٹ) برطانیہ: طبع اوّل: ۱۹۴۰ء

۲۱۔ "دلی کی شام" یہ "Twilight In Delhi" کا ترجمہ ہے عکراش پریس، کراچی طبع اوّل: ۱۹۶۳ء

انگریزی سے یہ ترجمہ احمد علی کی بیگم بلقیس جہاں نے کیا ہے۔

۲۲۔ "UrduSelected Short Stories From (Pakistan)" مطبوعہ: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

مرتبہ: احمد علی (دیباچہ پر جنوری ۱۹۸۳ء درج ہے)

۲۳۔ "Of Rats And Diplomats"

۲۴۔ "Ocean of Night"

۲۵۔ دی فیلکن اینڈ دی ہنڈ برڈ

۲۶۔ غالب سیلیکٹڈ پوئمز

۲۷۔ میکسم گورکی از اے شارٹ سٹوری رائٹر

۲۸۔ دی لینڈ آف ٹویلائٹ

۲۹۔ بریک دی چینز

غیر مدوّن:

متعدد مضامین بہ زبان انگریزی، دو افسانے، جو ۱۹۴۵ء کے بعد کی تخلیق ہیں اور ایک مرتب شدہ کتاب: "ایک روایت کا زوال"۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

۲۱۔اے فاران سوسائٹی، حیدر علی روڈ، کراچی۔ پاکستان

اعزاز:

(۱) ستارۂ قائداعظم

(۲) اکادمی ادبیات پاکستان کے فاؤنڈنگ فیلو

نظریۂ فن:

''......افسانے میں وسعت نہیں ہوتی۔ افسانہ، انسانی زندگی، اس کے اثرات اور تاریخ کے بدلتے ہوئے رخ کو ایک حد تک پیش کر سکتا ہے اور اسی لیے لکھنے والے میں تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ گویا افسانہ ایک کڑی ہے جو اپنی جگہ معنی خیز ہونے کے باوجود محض ایک کڑی رہتا ہے۔ اس سے ذرہ بکتر نہیں بنتا۔''

احمد علی

(بحوالہ: ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' مرتبہ: طاہر مسعود: ۱۹۸۵ء)

''ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اس کی گہرائی زندگی کی گہرائی سے وابستہ ہے۔ اگر قومی زندگی میں پستی آ چکی ہے تو ادب میں بلندی کا ملنا آسان نہیں۔''

احمد علی (۲۲ جولائی ۱۹۵۴ء، کراچی)

(بحوالہ: ''متاعِ ادب'' مرتبہ: اظہر زیدی، مطبوعہ: مکتبہ میری لائبریری، لاہور، طبع اول: جنوری ۱۹۶۵ء)

O

حوالہ جات:

۱۔ اکثر کتب میں احمد علی کا پہلا افسانہ ''مہاوٹوں کی رات'' بتایا گیا ہے، جو درست نہیں۔

ہماری گلی

احمد علی

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازے کے برابر صدیق بنیئے کی اور اس کے برابر عزیز خرادی کی اور آس پاس کہاروں کی دکانیں، عطار کی دکان، پان والے کی اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی، بساطی کی، حلوائی کی دکان۔

ہمارے محلہ میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی اور اس طرح کے لوگ راستہ بچانے کے لیے میری کھڑکی کے سامنے سے گزرتے۔ کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی منڈا اپنے انگریزی ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا۔ اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا، بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا ان کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گزر جاتا۔ کبھی کبھی راہگیر عاجز آ کر لڑکوں کو مارنے کے لیے لکڑی یا چھڑی اٹھاتا اور بھاگ کر لڑکے چلاتے "لولو ہے بے، لولو ہے۔" پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لنڈو! کیا کرتے ہو؟ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟" اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا۔ "ان کی ماؤں کو تو دیکھو۔ لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں رولا مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور اپنی سفید نکونی داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا ڈالتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دورہ کرتا ہے، لڑکپن میں سبق نہ یاد کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا

اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اس نے دکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے شادی کر لی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اس کو آب خورے اور لٹیا میں خوب اچھالتا یہاں تک کہ اس میں سے جھاگ نکلنے لگتا۔ پھر کچھ سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ ہلنے تک نہ پاتا تھا۔ اکثر اس کی بیوی دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہوگئی تھی...... اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا کیوں کہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترک موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں ادھر سے ادھر ہلچل مچائے تھا، مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں۔ کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور ان میں سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا جو ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا، جس نے صبح ہی پیڑے تیار کیے تھے، کڑھاؤ مانجھا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لیے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی۔ وہ ''ہے ہے میرا لال'' کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے منہ سے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی۔

''ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے۔ میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔''

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا۔ صدیق بنئے نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے ادھر سے گزرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا۔ ''بھائی بڑا افسوس ہوا اور حادثہ کیا پیش آیا؟''

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

''تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا پلا پلایا لڑکا جاتا رہا۔'' یہ کہہ کر مرزا گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اڑنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اٹھا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹتا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پھٹے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہو گیا۔

''ہوا کیا۔ ترک موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ کڑا جوان تھا۔ ان دوزخ کے چیونٹوں اور کھدر پوشوں کا شکار ہو گیا۔''

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور گاہک کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکا یک اس کی نگاہ دال پر پڑی اور بولا۔ ''وامیاں باشا! یہ کون سی دال دے رہے ہو میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذری پھرتی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بکے گی۔''

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی اور بین کر کے روتی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ یامین کی ماں کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو وہ پرسے کے لیے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا اور اس کے ننھے بچوں کو سلائی کر کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی...... آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے بسی تاریکی کی طرح سارے محلہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی بلیوں کے غرانے اور کھڑ بڑ کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں میرے دل کو قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آ کر بیٹھتے اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا کر لیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے، ڈالیاں گر چکی تھیں اور اس کا تنا سیاہ اور بدہیئت رات کی تاریکی میں اس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لیے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اس پر جانور منڈلاتے تھے، نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلچلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کو بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اٹھتا تھا لیکن شام کی فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس موٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی پھر اس کے ساتھ ساتھ اٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اس کے بال کاٹ دیئے تھے اور اس کا سر اس کے توانا اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کو اتار لیتا یا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ ہمیشہ مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گونگوں کی طرح گن گن کرتی۔ جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے

پیچھے تالیاں بجاتا اور ''پگلی'' کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا اور منہ چڑاتا۔ عورت ''ایں ایں'' کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا ''ابے سسرو تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور ہو۔''

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے، مذاق کرتے۔ وہ بدصورت ضرور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منو جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا، لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا، اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ''کیوں، تیرے بچہ کب ہوگا؟''

اور پگلی ایک دردانگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جوڑ لیتی اور لجلجے رہتے کسی راہ گیر یا دکاندار سے مخاطب ہو کر منو کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی۔ ایک بے کس و بے بس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچالو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے......

ہندوستان میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مر جانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، کمانے لگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی بُو ان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام کوئی کام کرنے اور مر رہنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لیے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لیے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے۔ اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی، وہ کتے تھے، مرے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں سے گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے، بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پٹھے کھجاتے تھے یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے دبے دبے آتے تھے اور قصائی کی دکان کے سامنے چھیچھڑوں پر جھپٹتے لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھا لے جاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو اپنی دم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں لڑائی کر کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے۔

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی۔ وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تازہ بھنے ہوئے موٹے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور جن میں بھوک اور غربت اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی میلی ٹوپی رکھی رہتی تھی۔ گلے میں پھٹی ہوئی قمیض اور اس کی اونچی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔

عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑا رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں میر

امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانت دار آدمی تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا:

''ان سے کوئی کام شروع کر دینا اس لیے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔''

شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خوانچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلہ والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلایا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔

اسی دوران میں عبدالرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزارہا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مرد غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہر خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوکے کتے پڑے ہوئے دونے چاٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لئے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دور دور آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازے کو کسی طرح لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا اور اس کو اس بلوے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید بھگت چکا تھا لیکن اس کے گاہک اس کی آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا لیکن اب اس کا پچھلا کرارا پن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی سے نکال کر چنے تولتا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا بہت چھوٹا تھا اور اس کی چگی داڑھی پر ہمیشہ خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھنچر لیکن اس آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلہ میں بے بسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سنی، اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منہ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ جب ہندوستان اپنی نئی

بندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سننے میں آتا تھا۔ دور سے اس کی آواز آتی تھی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشت غبار ہوں[1]

لیکن محلّہ کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیوں کہ وہ چرس پیتا تھا۔

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کوابی اور مرزا کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کلو گزری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کی چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑپن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ منصف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی بیوی نے اس کو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہوگئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گزر گئے تھے لیکن محلّہ کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف گڑی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجھلا کر بولی:

''موا مشٹنڈا کہیں کا، تجھ پر خدا کی سنوار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ ڈالتا ہے۔''

منو بولا

''تیری جوانی پھر کس دن کام آئے گی؟''

''ہٹ دور ہو، موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔''

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''جھاڑو پیٹے، جوانا مرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا پٹواؤں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔''

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لیے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

''کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟''

لیکن کلو بغیر پیچھے مڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہوگئی۔ عزیز خیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا، شور سے اٹھ گیا۔ منو کو کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''ابے منو! کیا بات ہے؟''

منو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو کر ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے ذرا دیر چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا۔

''کچھ نہیں یار، کلو تھی۔''

''ابے کچھ سودا بھی پٹا؟''

''نہیں میاں ہتے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی۔ لیکن سُسری جائے گی کہاں؟''

اور بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی۔ پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن منو نے اپنی قمیض کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگریٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا۔

''لو میاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں بڑا بڑھیا سگرٹ پلاتا ہوں۔''

اور ایک سگرٹ نکال کر عزیز کو دیا۔

''ارے یار، میں نے کہا اب کے کس کا مار لایا؟''

''میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا ہوتا۔''

''میاں ہوش کی لو، اُس سے ڈرو، دوزخ میں جلو گے، توبہ کرو۔''

''جا یار، یہ بھی کیا گدھوں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں۔ میں تو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور پڑے پڑے اینڈتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگائی۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روگ پالیں۔''

''بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آ جاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔''

''اچھا یار، تو تو اس طرح باتیں کرنے لگا، میں اب چل دیا۔''

''ذری سن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے۔ قسم کھا بتا دے گا؟''

''اچھا جا کیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتا دوں گا۔''

''یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟''

''بھئی اس کی نہیں بدی تھی۔''

''دیکھ قول دے چکا ہے۔''

''اچھا جا، تُو جیتا میں ہارا۔ جو سچ پوچھو تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔''

''جدا ہی تو میں اور بھی حریان ہورہا ہوں۔''

''میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ لونڈا نمکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری کچھ اس سے چل گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میرے شکایت کردی اور بیتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہوگیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا ہو تو پیشاب سے مونچھیں منڈوادوں گا۔ ایک موقع پا کر میں نے سالے کا بستہ چرالیا۔ اس کے اندر بڑی بڑھیا بڑھیا چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگریٹ کیس پسند آ گیا۔ میں ان سے مانگ تو نہ سکتا تھا لیکن میں نے پار کردیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑالیا کروں، اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہوگیا ہے۔ یار سچ پوچھو تو یہ لوگ کبھی غریب کو مرکر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہوسکتی ہیں۔''

''لیکن اگر کبھی پکڑے گئے تو''

''پھر تو نے وہی فضول باتیں شروع کردیں۔ اچھا اب میں چلا، نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہوگی۔'' یہ کہہ کے وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپڑ مار کر روانہ ہوگیا۔

ہمارے محلہ کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سرخ رہتی تھی۔ ان کا سر تا مزی تھا لیکن پہلوؤں میں اور گدی پر ان کے پٹھے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا جس کا رنگ راکھ کا سا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکھارتے ہوئے گزرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پائجامہ اور گاڑھے کا کرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کرارا پن، گرمی کے ساتھ ساتھ وہ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور ان کی آواز بہت دور سے سنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لیے بلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار میں کمی ہوتی اور ان کے جملے بل کھاتے ہوئے ایک سناٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھو جاتے تھے۔ لوگ نثار احمد کو حضرت بلال حبشی کہتے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بچھے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے پڑ رہی تھی اور ان میں سے ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی۔ کیوں کہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گردوغبار اور دور ملوں کی چمنیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور وشغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آرہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دل شکن مایوسی تھی۔ وہ تکلیف دہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاصی پہچان ہوتی ہے، جس میں غربت اور غلاظت، زندگی کی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ گردوغبار سے میلے اور پھیکے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اڑتا ہوا گزرا اور ان کے مٹیلے رنگوں میں غائب ہوگیا۔ دور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی ممٹیوں اور میناروں سے کبوتر اڑتے تھے یا منڈلا منڈلا کر ان پر بیٹھ جاتے تھے۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنما میلی کچیلی عمارتیں اور ان کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دور دور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا زندگی کی سردمہری اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دومنزلہ مکان بن رہا تھا اور ان کی پاڑیں آسمان اور نگاہ کے درمیان سدراہ ہوتی تھیں لیکن بانسوں اور بلیوں کے رنگ نگاہ کو تکلیف نہ پہنچاتے تھے اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر ہلکے اور مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت نثار احمد کے کھنکارنے کی آواز آئی اور پھر ان کی اٹھتی

سنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کن لیکن تسکین بخش تھی کہ میری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور بڑائی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے، اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے۔ اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرے پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موہوم خیالات کا شکار میں اذان سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آ گئی حی علی الصلوۃ کی خاموشی پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر حی علی الفلاح، حی علی الفلاح کی آواز سناٹا چھاتی ہوئی، دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی باریک لمبی تان کے دھیمے سروں میں ہوتی اس آہستگی اور دل بستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا کہ آواز رک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے، ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے، بہت دور ایک اور دنیا ہے۔ جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان بپا کیے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہے۔ وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اس بات کی ترغیب دلاتی ہے۔ ہمارا ہر گیت ہمیں یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں، ہمارے گلوں میں طوق ہیں۔ ہماری زبانوں پر قفل ڈال دیئے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں، ہمارا جسم سن ہو چکا ہے، ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم کبھی زندہ بھی تھے یا سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلارے ہمیشہ سے اس کی لوریوں سے مخمور غفلت کی نیند سویا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا ایک کوابی اور ایک دو آدمی اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

''میں تو یار ہر ایک چیز میں اس کی شان دیکھ رہا ہوں۔''

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لیے لٹیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آواز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پرلے دن میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بچھیا آ رہی تھی۔ اسی جگہ ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھو اب کیا کرتی ہے۔ وللہ میں صاحب اس بچھیا نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک قلانچ ماری اور بچے کو صاف لانگ گئی۔ مجھ کو تو اس جناور کی عقل میں اس کی

شان نظر آ گئی۔''

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا، دوسرے میں آبخورہ تھا اور بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا:

''واہ واہ کیا اس کی شان ہے!''

مرزا نے لٹیا میں دودھ لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:

''ہاں میاں اس کی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کو حکم ملا کہ محل بناؤ۔ تو بس صاحب انہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آناً فاناً میں بڑے بڑے فتر اور سلیں لالا کر جمع کر دیں اور مدت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی فرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل وتنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضت سلیمان روز اس جگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف اس کے اندر کی قنلیں اور فتر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمان اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا لیکن دتے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آ چکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو اس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں اس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے مونٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن ان کو ذری بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی راکھ کی طرح یوں جھڑ گئی اور ان کا خود کا دم نکل گیا۔ ادھر تو ان کا کام تمام ہوا، ودھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رعاب شعاب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چپت بنے۔ لیکن میں تو اس بات پر حریان ہو رہا ہوں کہ اب ان قناتوں اور فتروں کو کون صاف کرے گا؟''

عزیز کے ہاتھ میں حقے کی نلی اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لٹیا تھی، اور آبخورہ والا نیچے، اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی ان ''قنلوں'' اور ''فتروں'' کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔



۱۔ یہ غزل بہادر شاہ ظفر کی نہیں۔ مضطر خیر آبادی کی ہے۔ (مرزا حامد بیگ)

راجندر سنگھ بیدی

ام : راجندر سنگھ بیدی

ی نام : محسن لاہوری / راجندر سنگھ بیدی

ائش : یکم ستمبر ۱۹۱۵ء بہ مقام لاہور چھاؤنی صبح ۳ بج کر ۴ منٹ پر

ات : ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء بہ مقام بمبئی

یم : ایف۔اے، ڈی۔اے۔وی کالج، لاہور

ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔ میٹرک ایس بی بی ایس خالصہ سکول سے ۱۹۳۱ء میں کیا۔ انٹر، ڈی۔اے۔وی کالج لاہور سے ۱۹۳۳ء میں کر کے بی۔اے میں داخلہ لیا لیکن والد نے اُسی سال استعفیٰ دے کر انہیں اپنی جگہ پوسٹ آفس میں بھرتی کروا دیا۔ یوں بی۔اے نہ کر سکے۔

تصر حالات زندگی:

بیدی کے والد ہیرا سنگھ بیدی ذات کے کھشتری اور والدہ سیوادئی برہمن تھیں۔ ہیرا سنگھ بیدی صدر بازار، لاہور میں پوسٹ مین تھے انہیں جی۔پی۔او لاہور کے پچھواڑے کوارٹر ملا ہوا تھا۔ ان کا آبائی علاقہ ''ڈلے کی'، تحصیل ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ تھا۔ ماں باپ کی محبت کی ری تھی۔ بیدی بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ وشنو ماتا کے دوارے جموں گئے اور اکثر آریہ سماج لاہور کے مندر میں والد کے ساتھ حاضری ا۔ ماں تپ دق کی مریضہ تھیں۔ باپ اور بیٹے کی دعائیں قبول نہ ہوئیں اور سیوادئی دوسرے جہاں سدھاریں۔ جس دن ان کا انتقال ہوا، شام ہیرا سنگھ اپنے بیٹے کے ساتھ غم غلط کرنے امرتسر گئے اور فلم ''سوہنی مہینوال'' دیکھی۔ بیدی نے بچپن اور لڑکپن میں انتہائی عسرت کی ی جھیلی، کچھ یہی سبب ہے کہ انٹرمیڈیٹ (۱۹۳۳ء) کے فوراً بعد بہ حیثیت کلرک، جنرل پوسٹ آفس، لاہور میں ملازمت کر لی اور داخلہ کے باوجود بی۔اے نہ کر سکے۔ ۱۹۳۰ء میں افسانہ ''بندے ماترم'' لکھ کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور ۱۹۳۲ء میں پنجابی رسالہ ''سارنگ''

مرتب کیا۔ اٹھارہ برس کے تھے جب شادی سے بچنے کے لیے اپنے آبائی گاؤں ''ڈلے کی'' (تحصیل ڈسکہ) کے ایک اجاڑ کنویں میں چھلانگ لگا دی لیکن بچا لیے گئے اور ۱۹ برس کی عمر میں (۱۹۳۴ء) سوما دیوی (سسرالی نام: ستونت کور) سے شادی ہو گئی۔ ۱۹۴۳ء میں ڈاک خانے کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ (حکومت ہند) سے وابستہ ہوئے اور چھ ماہ بعد بطور سٹاف آرٹسٹ/سکرپٹ رائٹر، آل انڈیا ریڈیو، لاہور منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں ۱۵۰ روپے ماہوار پاتے تھے اور ماڈل ٹاؤن، لاہور میں قیام پذیر تھے۔ ریڈیو کے لیے کئی یادگار ڈرامے لکھے، جن میں سے ڈراما ''حق مہر'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں لاہور ہی میں سنگم پبلشرز لمیٹڈ کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند فلموں کے سکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ مئی/ جون ۱۹۴۷ء میں فسادات کے پیش نظر اپنے بھائی ہربنس سنگھ بیدی کے ہاں روپڑ چلے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب بھارت کو آزادی ملی تو وہ شملہ میں تھے۔ ۱۹۴۸ء میں دہلی آ گئے، جہاں سے رفیع احمد قدوائی کی معرفت ریڈیو جموں کشمیر کے اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ شیخ عبداللہ کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم رہے۔ ۱۹۴۹ء میں بخشی غلام محمد سے چپقلش ہو جانے کے سبب ملازمت سے استعفیٰ دیا اور دہلی آ گئے۔ دہلی سے ڈی۔ ڈی کیشپ نے انہیں بمبئی بلا لیا اور بیدی نے ایک ہزار روپے ماہوار پر فلمیں لکھنی شروع کر دیں۔ بیدی نے یہاں رہ کر ''بڑی بہن''، ''داغ''، ''دیوداس''، ''مدھومتی''، ''پھاگن''، ''آرام''، ''انورادھا''، ''بندھن''، ''ابھیمان''، ''بسنت بہار''، ''مسافر''، ''انوپما'' اور ''ستیہ کام'' جیسی معیاری فلموں کے سکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ اس میں سے بیشتر کام رشی کیش مکرجی کے لیے کیا جبکہ سہراب مودی کے لیے ''مرزا غالب'' لکھی۔

مجموعی طور پر ستر سے زائد فلمیں لکھیں اور ''پھاگن''، ''آنکھن دیکھی''، ''گرم کوٹ'' اور ''دستک'' جیسی معیاری فلموں کے ہدایت کار کے طور پر سامنے آئے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے ایک نئی لڑکی سمن کو اپنی فلم ''آنکھن دیکھی'' کی ہیروئن کے لیے منتخب کیا اور اسے دل دے بیٹھے۔ ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس کے پرانے مریض چلے آتے تھے۔ آخری زمانے میں کینسر بھی ہو گیا۔ بیٹے نریندر بیدی سے کبھی نہیں بنی۔ ستم بالائے ستم بڑھاپے کے عشق نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ بے تحاشا پینے لگے تھے جس کا نتیجہ ۵ نومبر ۱۹۷۸ء میں فالج کی صورت میں نکلا۔ موتیا بند کا آپریشن ہوا تو بالکل معذور ہو کر رہ گئے اور تقریباً دو برس اسی بیٹے کے رحم و کرم پر رہنا پڑا، جس سے کبھی نہ بنی تھی۔ اداکارہ سمن کی محبت میں سیٹھیا سدن مانگا کی ساتویں منزل سے کود کر خودکشی کی کوشش ناکام رہی۔ آخری وقت انتہا درجے کی ذہنی پریشانی اور جسمانی معذوری کے ساتھ گزارا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء کو بمبئی میں انتقال کیا۔ اکلوتی اولاد، نریندر بیدی کا انتقال ان کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا جبکہ ایک انگریز عورت سے بیدی کی ناجائز اولاد (بیٹی) لندن میں مقیم ہے۔

اوّلین افسانہ:

''بندے ماترم''، محسن لاہوری کے قلمی نام سے ۱۹۳۰ء میں لکھا۔

مطبوعہ اوّلین افسانہ:

''مہارانی کا تحفہ''، مطبوعہ: ''ادبی دنیا''، لاہور ۱۹۳۱ء

قلمی آ ثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''دانہ ودام'' (افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۳۹ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی — طبع دوم: ۱۹۶۳ء

دوسرے ایڈیشن کے مندرجات: (۱) بھولا۔ ص ۹۔۲۴ (۲) ہمدوش۔ ص ۲۵۔۳۶ (۳) من کی من میں۔ ص ۳۷۔۵۳ (۴) گرم کوٹ۔ ص ۵۴۔۶۹ (۵) چھوکری کی لوٹ۔ ص ۷۰۔۸۶ (۶) پان شاپ۔ ص ۸۷۔۱۰۲ (۷) منگل اشٹکا۔ ص ۱۰۳۔۱۱۹ (۸) کوارنٹین۔ ص ۱۲۵۔۱۳۶ (۹) حلادان۔ ص ۱۳۷۔۱۵۲ (۱۰) دس منٹ بارش۔ ص ۱۵۳۔۱۶۵ (۱۱) وٹامن بی۔ ص ۱۶۶۔۱۸۰ (۱۲) پھمن۔ ص ۱۸۱۔۱۹۵ (۱۳) ردعمل۔ ص ۱۹۶۔۲۱۳ (۱۴) موت کا راز۔ ص ۲۱۴۔۲۲۴۔

۲۔ ''گرہن'' (۱۴ افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
نیا ادارہ، لاہور — طبع دوم:

۳۔ ''سات کھیل'' (ڈرامے) — لاہور۔ ادبی سنگم — طبع اوّل ۱۹۴۶ء

مندرجات: (۱) خواجہ سرا۔ ص ۹۔۳۴ (۲) چانکیہ۔ ص ۳۵۔۷۲ (۳) تیجھٹ۔ ص ۷۳۔۱۱۴ (۴) نقل مکانی۔ ص ۱۱۵۔۱۵۴۔ (۵) آج۔ ص ۱۵۵۔۱۹۰ (۵) رخشندہ۔ ص ۱۹۱۔۲۲۰ (۷) پاؤں کی موچ۔ ص ۲۲۱۔۲۴۳

دوسری بار یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے جون ۱۹۸۱ء میں شائع کی۔ ۱۹۴۶ء میں اس کتاب کو مکتبہ اردو، لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔

۴۔ ''کوکھ جلی'' (افسانے) — کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی — طبع اوّل: ۱۹۴۹ء

مندرجات: (۱) لمس۔ ص ۹۔۱۹۔ (۲) کوکھ جلی۔ ص ۲۰۔۲۷ (۳) بیکار خدا۔ ص ۳۸۔۵۷ (۴) ہمراہ۔ ص ۵۸۔۷۳ (۵) مہاجرین۔ ص ۷۴۔۹۵ (۶) کشمکش۔ ص ۹۶۔۱۱۷ (۷) ایک عورت۔ ص ۱۱۸۔۱۲۶ (۸) ترمیش۔ ص ۱۲۷۔۱۳۸ (۹) گالی۔ ص ۱۳۸۔۱۶۱ (۱۰) خطِ مستقیم اور قوسین۔ ص ۱۶۲۔۲۰۰ (۱۱) آگ۔ ص ۲۰۱۔۲۲۱۔

۵۔ ''ایک چادر میلی سی'' (ناولٹ) — نئی دہلی، مکتبہ جامعہ — طبع اوّل: ۱۹۶۲ء

دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔ ۱۳۶ ص

یہ ناولٹ پنجابی میں ''اک چادر ادھورانی'' کے نام سے شائع ہوا۔ پاکستان میں اس کہانی کو ہدایت کارہ سنگیتا نے ''مٹھی بھر چاول'' کے نام سے فلمایا۔ یہ ناولٹ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۶۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' (افسانے) — نئی دہلی، مکتبہ جامعہ — طبع اوّل: ۱۹۶۵ء

دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔ ۲۶۰ ص

مندرجات: (۱) لاجونتی۔ ص ۹۔۲۴ (۲) جو گیا۔ ص ۲۵۔۳۶ (۳) بَبل۔ ص ۴۷۔۸۴ (۴) لمبی لڑکی۔ ص ۸۵۔۱۲۰ (۵) اپنے دکھ مجھے دے دو۔ ص ۱۲۱۔۱۵۶ (۶) ترمیش سے پرے۔ ص ۱۵۷۔۱۸۶ (۷) حجام الہ آباد کے۔ ص ۱۸۷۔۲۱۴

(۸) دیوالہ۔ ص ۲۱۳۔ ۲۳۸ (۹) یوکلپٹس۔ ص ۲۳۹۔ ۲۶۰۔

یہ مجموعہ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' (افسانے) نئی دہلی، مکتبہ جامعہ طبع اوّل: ۱۹۷۴ء

منذرجات: (۱) ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔ ص ۷۔ ۳۵ (۲) صرف ایک سگریٹ۔ ص ۳۶۔ ۷۴ (۳) کلیانی۔ ص ۷۵۔ ۹۰
(۴) سحن۔ ص ۹۱۔ ۱۰۹ (۵) باری کا بخار۔ ص ۱۱۰۔ ۱۴۰ (۶) سونفیا۔ ص ۱۴۱۔ ۱۶۳ (۷) وہ بڑھا۔ ص ۱۶۴۔ ۱۸۷
(۸) جنازہ کہاں ہے۔ ص ۱۸۸۔ ۲۰۶ (۹) قفل۔ ص ۲۰۷۔ ۲۲۶ (۱۰) آئینے کے سامنے ص ۲۲۷۔ ۲۴۰

یہ مجموعہ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۸۔ ''مہمان'' (۶ طنزیہ افسانے) طبع اوّل: ہند پاکٹ بکس۔ دہلی، (س۔ن)
طبع دوم: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸، (س۔ن)

۹۔ ''جوگیا'' (رومانی افسانے) طبع اوّل: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸، (س۔ن)

۱۰۔ ''کندن'' (افسانے) طبع اوّل: مکتبہ اردو ادب، لاہور (س۔ن)

۱۱۔ ''بیدی کے افسانے'' (افسانے) طبع اوّل: مکتبہ اردو ادب، لاہور

۱۲۔ ''چلتے پھرتے چہرے'' (خاکے اور مضامین) طبع اوّل: مکتبہ اردو ادب، لاہور

۱۳۔ ''بے جان چیزیں'' (ڈرامے) طبع اوّل: مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۱۹۴۳ء

۱۴۔ ''مکتی بودھ'' (افسانے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، طبع اوّل: ۱۹۸۳ء

۱۵۔ ''لمبی لڑکی'' (افسانے) نیا ادارہ، لاہور

۱۶۔ ''بلی کا بچہ'' (افسانے)

۱۷۔ ''کار کی شادی'' (ڈرامے)

۱۸۔ ''روحِ انسانی'' (ڈرامے)

۱۹۔ ''لاجونتی'' (افسانے) نیا ادارہ، لاہور

۲۰۔ ''لمس'' (افسانے)

۲۱۔ ''اک چادر ادھورانی'' (پنجابی ناولٹ) مطبوعہ: دہلی

نوٹ: شمار نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰ اور ۲۱ راجندر سنگھ بیدی کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن ہیں۔)

۲۲۔ ''مقدس جھوٹ'' (بچوں کے لیے) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور طبع ثانی: ۲۰۰۷ء

۲۳۔ ''مجموعہ: راجندر سنگھ بیدی'' (افسانے/ ناول کی کلیات) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل: ۲۰۰۷ء

۲۴۔ ''اب تو گھبرا کے......'' (ڈرامے)

اعزاز:

۱۔ ''پدم شری'' (حکومت ہند کا سول اعزاز)

۲۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ

۳۔ مودی غالب ایوارڈ

۴۔ سجاد ظہیر، اردو ادب ایوارڈ

۵۔ فلم فیئر ایوارڈ

وفات سے قبل مستقل پتا:

۳۴۷۔ لنکنگ۔ روڈ، کھار۔ بمبئی ۴۹۹۹۵۲۔ (بھارت)

نظریۂ فن:

''مجھے تخیل فن پر یقین ہے، جب کوئی واقف مشاہدے میں آتا ہے تو میں من وعن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

(دیباچہ ''گرہن'' سے اقتباس)



حوالہ جات:

۱۔ بہ حوالہ ''بیدی سے ایک گفتگو'' از پدما سچدیو ترجمہ: مرغوب علی، مطبوعہ ''دستاویز'' راولپنڈی ۱۹۸۷ء

لاجونتی

راجندر سنگھ بیدی

''ہتھ لائیاں کُملان، نی لاجونتی دے بُوٹے.....''

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جاتے ہیں)

ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح وسالم تھے لیکن دل زخمی.....

گلی گلی محلے محلے میں ''پھر بساؤ'' کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تن دہی کے ساتھ کاروبار میں بساؤ'' زمین پر بساؤ'' ''اور گھروں میں بساؤ'' پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا ''دل میں بساؤ'' اور اس پروگرام کی نارآین باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی.....

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلّے ''ملاشکور'' میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکرٹری چن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لئے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام بھی لاجو تھا۔ لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے..... ''ہتھ لائیاں کمھلان نی لاجونتی دے بوٹے.....'' تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا۔ جانے وہ کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں.....؟ اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم

لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لئے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا...... انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ بن کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لئے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی ...... ''پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی......''

صاف پتہ چلتا تھا وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں ...... ''لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا عورت جس کے قابو میں نہیں آتی ......'' اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی ...... وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگا لی اور اس کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولہا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا ...... ''تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار، بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی'' لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آتیں اور وہ یہی سوچتا۔ ایک بار صرف ایک بار جو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتا دوں ...... ان بیچاری عورتوں کے اغواء ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوس ناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انہیں اپنا نہیں لیتا ...... ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ وہ ان عورتوں کو گھروں میں اور انہیں ایسا مرتبہ دینے کی پرچار کرتا، جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ...... انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں ...... کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح ...... ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے ......

گویا دل میں بساؤ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلہ ملا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا

وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا، نہ لوگوں کا شور نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سردے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے...... او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنگ مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپیگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتا اور ''دل میں بساؤ'' کے فریادی اور اندوہ گیں پروپیگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا، پر گنگناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں دنوں جب کہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ ملا شکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیئے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی ''مہندر سنگھ زندہ باد'' اور کبھی ''سوہن لال زندہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے......

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام کر رہی ہیں کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی...... سہاگ وتی...... سہاگ والی...... اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی...... تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے...... اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو در اصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں ان میں لاجو نہ تھی سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دو چند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے، اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں، پھر کہیں نیکی رام، محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا لیکن مجمع پر ایک

عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں، وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے......

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے ارد گرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور راماین کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا راماین کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا...... میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسالے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی'' کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے؟'' ...... نارائن باوا نے کہا...... ''یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ راماین کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا......

''ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا!''

''چپ رہو جی'' ...... ''تم کون ہوتے ہو؟'' ...... ''خاموش!'' مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا...... ''مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

پھر ملی جلی آوازیں آئیں...... ''خاموش!...... ہم نہیں بولنے دیں گے'' ...... اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی...... ''مار دیں گے۔''

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا...... ''تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!''

سندر لال نے کہا...... ''میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا...... رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں۔''

انہی لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے، اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے...... ''سنو، سنو، سنو......''

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے...... ''شری رام نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے باباجی، انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواش نہ کر پائے۔''

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا...... ''اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کو مہانتا کو نہیں جانتے۔''

''ہاں بابا'' ...... سندر لال بابو نے کہا...... ''اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا...... آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے...... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں اور بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کا شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے سیتہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون

کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟''

''آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے ... سیتا ... لاجونتی ... اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کر چپکا دیے تھے اور پھر وہ سب ''سندر لال بابو زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا ... ''مہاستی سیتا زندہ باد'' ایک طرف سے آواز آئی ... ''شری رام چندر ... ''

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں ... ''خاموش! خاموش!'' اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا کارت چلی گئی، بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے۔ جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ، محرر چوکی کلاں، جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ آواز پیدا کرتے ہوئے ... اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔

''ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے ... !''

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلّہ ملا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا ''گرائیں'' لال چند جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو دیا تھا دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا ...

''بدھائی ہو سندر لال۔''

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا ... ''کس بات کی بدھائی لال چند؟''

''میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔''

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا۔ ''کہاں دیکھا ہے؟'' اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ دے پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

''واگہ کی سرحد پر۔''

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا ''کوئی اور ہو گی۔''

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا ... ''نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی، لاجو ... ''

''تم اسے پہچانتے بھی ہو؟'' سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھا لی اور بولا ... ''بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟''

''ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر ... ''

''ہاں ہاں ہاں'' اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا ''تیسرا ماتھے پر'' وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آ گئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر سجا لیے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمہلانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی

کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی...... اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو...... سندر لال کا سارا جسم ایک ان جانے خوف، ایک انجانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا......

''لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟''

لال چند نے کہا...... ''ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔''

''پھر کیا ہوا......؟'' سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا ''کیا ہوا پھر؟''

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمبا کو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا...... ''سچ مچ آ گئی ہے لجونتی بھابی؟''

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے والنٹیر نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا...... ''تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو...... دیکھو...... جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟'' اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندوے چھپا رہی تھی۔''

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا ''مال'' واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا...... ''لاجو...... لاجو بھابی''...... مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں اور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی...... اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا۔ ''پانی دے دو'' اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو...... تو وہ جھٹ سے کہتا ''مر گئے'' اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر تاجر انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے، پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں ''گپتی'' کر لیتے۔ گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب ''گپتی'' کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دین، یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور

سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں ...... از بیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابل قبول عورت ایک اعتراف شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے ......

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی، وہی سندر لال کو جانتی تھی، اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی ...... محض عادتاً ...... دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق ...... دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ ......

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجو کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ موٹی ہوگئی تھی ...... سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہوگی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نکالے نہ نکلتی ہوگی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم محض غم سے اُس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہوگئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے ......

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا ...... ''ہم نہیں لیتے مسلر ان (مسلمان) کی جھوٹی عورت ......''

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے ...... ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انہیں اتنی لمبی اذیت دیئے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندرلال بابو نے اسی شدومد سے ''دل میں بساؤ'' پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنھیں سندرلال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملاشکور کی بہت سی عورتیں سندرلال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندرلال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروانہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آچکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندرلال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کرلیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندرلال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندرلال، لاجونتی کو اب ''لاجو'' کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا ''دیوی'' اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہو جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندرلال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں لیکن سندرلال لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندرلال سوجاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی، جب سندرلال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ ''نہیں'' ''یونہیں'' ''اونہوں'' کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندرلال پھر اونگھ جاتا...... البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندرلال نے لاجونتی کے سیاہ دنوں کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

''کون تھا وہ؟''

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا...... ''جماں'' ...... پھر وہ اپنی نگاہیں سندرلال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کرلیں اور سندرلال نے پوچھا۔

''اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟''

''ہاں۔''

''مارتا تو نہیں تھا۔''

لاجونتی نے اپنا سر سندرلال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا...... ''نہیں......'' اور پھر بولی ''وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی...... اب تو نہ مارو گے؟''

سندرلال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا...... ''نہیں دیوی! اب نہیں...... نہیں ماروں گا......''

''دیوی'' لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندرلال نے کہا۔ ''جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا، اپنی کرتا ہے۔''

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے

کے بعد اب ''دیوی'' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے ۔وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لئے نہیں کہ سندرلال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی...... وہ سندرلال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی، لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندرلال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ...... لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی...... اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اجڑ گئی...... سندرلال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان! پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملاشکور کے سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

ہتھ لائیاں کملان نی، لاجونتی دے بُوٹے......



حجاب امتیاز علی

نام : حجاب

قلمی نام : حجاب اسماعیل/ حجاب امتیاز علی

پیدائش : ۴ نومبر ۱۹۰۸ء بہ مقام حیدر آباد، دکن، بھارت[1]

وفات : ۱۸ اور ۱۹ مارچ ۱۹۹۹ء کی درمیانی شب، بہ مقام: لاہور

تعلیم : سینئر کیمبرج

عربی، اردو اور موسیقی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔

مختصر حالات زندگی:

حجاب کے والد سید محمد اسماعیل نظام دکن کے فرسٹ سیکرٹری تھے اور والدہ عباسی بیگم[2] اپنے دور کی نامور اہل قلم خاتون۔ آبائی وطن، حیدر آباد، دکن تھا۔ حیدر آباد اگرچہ امرا اور روسا کا شہر تھا اور معاشرت نوابانہ تھی مگر ان دنوں خصوصاً موسم سرما میں، وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑتی اور لوگ بھاگ بھوگ کر جان بچاتے۔ حجاب کے والد نے بچوں کی تعلیم کے پیش نظر اپنے گھرانے کو مدراس منتقل کر دیا، جہاں کڑاکے کی گرمی پڑتی اور یہ گھرانہ موسم کے چند ماہ، نرساپور ضلع کرشنا، جنوبی ہند میں گزارتا۔ نرساپور دریائے گوداوری کے کنارے آباد تھا۔

نرساپور میں ان کے بنگلے کو حجاب کے نانا نے اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے سجا رکھا تھا۔ حجاب آخر دم تک لمبے برآمدوں کے بالمقابل پائیں باغ کے چوڑ دروازے پر سایہ فگن املی کے درخت اور دریائے گوداوری کے ساحل کے خوابناک مناظر نہیں بھول پائیں۔

حجاب کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ عربی، اردو اور موسیقی کے استاد الگ الگ تھے۔ بچپن اور لڑکپن میں حجاب سخت تنہائی کا شکار رہیں۔ ان کی بڑی بہن ذکیہ، عمر میں ان سے بہت بڑی تھیں اور پھر انہیں دنوں میں ذکیہ کی شادی بھی ہوگئی۔ لے دے کر گھر میں والدہ کا دم غنیمت تھا اور عباسی بیگم نے ننھی حجاب کی دلجوئی بھی خوب کی۔ والدہ کی ناوقت موت نے حجاب کو یکسر تنہا کر دیا تو والد نے سرکاری دوروں میں حجاب کو اپنے

ساتھ لے جانا شروع کیا۔ یوں کو چین سے پانڈی چری اور بمبئی سے مدارس تک کے ساحلی علاقوں پر حجاب کا بچپن اور لڑکپن بیتا لیکن والدہ سے بچھڑنے کا صدمہ حجاب کے ذہن پر دائمی نقش چھوڑ گیا۔ اس زمانے میں حجاب نے بے تحاشہ لکھا اور اکثر نثر لطیف میں مرحوم والدہ کی مرثیہ نگاری کی"۔ سینئر کیمبرج کے امتحان کے دوران حجاب نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئیں اور تادیر ذہنی معالج کے زیر علاج رہیں۔ حجاب ''تہذیب نسواں'' میں مستقل لکھتی تھیں اور امتیاز علی تاج اس پرچے کے مدیر تھے۔ خطوط کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں امتیاز علی تاج نے اپنا لافانی ڈراما ''انارکلی'' مکمل کیا اور پطرس بخاری کے مشورہ پر ۱۹۳۱ء میں یہ شاہکار ڈراما حجاب سے معنون کر دیا۔ حجاب کے نام ایک خط میں تاج نے لکھا تھا:

''اتنا مختصر افسانہ اس سے پیشتر کبھی لکھا نہ آئندہ لکھوں گا۔ لیکن جن مخلصانہ جذبات کا اظہار مقصود ہے، وہ ایک ہزار لفظ میں بھی ادا ہو سکتے نہیں۔

اس مختصر عریضہ کو شرف قبولیت بخشیے۔ کتاب کا پڑھنا چنداں ضروری نہیں۔ اسے ایک ضمیمہ سمجھئے، طویل اور بے معنی۔

''تاج۔ دسمبر ۱۹۳۱ء''

۱۹۳۴ء میں سجاد حیدر یلدرم کی معرفت حجاب کی شادی امتیاز علی تاج سے بلہاری، (جنوبی ہند) کے مقام پر ہوئی اور اُس کے بعد حجاب اسماعیل، حجاب امتیاز علی کے طور پر لاہور کی مستقل شہری بن گئیں۔ ان کی شادی کے موقع پر سجاد حیدر یلدرم نے سہرہ لکھا":

اس میں کچھ نکہت ارمان فزا آتی ہے
ناز کرتی ہوئی جو باد صبا آتی ہے
للہ الحمد تجرد کی ہے تاریکی ختم
عیشِ مشروع کی اب شمع ہدیٰ آتی ہے

اس سہرہ کے دوسرے شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاج اور حجاب نے اس زمانے کے اعتبار سے تجرد کی طویل زندگی گزاری اور دونوں کی شادی پختہ عمر میں ہوئی۔ حجاب نے ''تہذیب نسواں'' کی ادارت بھی کی لیکن ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ازلی تنہائی سے تنگ آ کر ناردن انڈیا فلائنگ کلب کی رکنیت اختیار کی اور پارسی انسٹرکٹر دستور کی شاگردہ بنیں۔ اس زمانے میں ''اے'' لائسنس حاصل کرنے کے لیے چالیس سے پچاس گھنٹے کی پرواز مقرر تھی جبکہ حجاب نے یہ تربیت صرف اکیس گھنٹوں میں مکمل کر لی اور اس کے فوراً بعد سولو فلائیٹ پر نکل گئیں۔ یاد رہے کہ حجاب برصغیر پاک و ہند کی اولین ہواباز خاتون ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں۔ ان کا یہ شوق آٹھ برس تک قائم رہا۔ حجاب نے راتوں کی پرواز کی، نیچی پرواز میں مہارت کا ثبوت دیا، یہاں تک کے انہیں ایک بار Forced Landing بھی کرنا پڑی۔

حجاب ہمیشہ ادبی سطح پر متحرک اور باخبر رہیں اور یہ ادا ان کے سن و سال کے کسی اور ادیب کو ودیعت نہیں ہوئی۔ تصنیفی زندگی سے بچا ہوا بیشتر وقت اپنی بلیوں کے ناز اٹھانے میں صرف کرتی تھیں۔ ۱۸ اور ۱۹ مارچ ۱۹۹۹ء کی درمیانی شب، حمید لطیف ہسپتال، لاہور میں آخری سانس لی۔ ۱۹ مارچ کی سہ پہر مومن پورہ قبرستان، میکلوڈ روڈ، لاہور میں سپرد خاک ہوئیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''میری ناتمام محبت'' مطبوعہ: ''نیرنگ خیال'' لاہور: ۱۹۳۲ء

مجموعہ: ''میری ناتمام محبت'' کے دیباچہ میں حجاب لکھتی ہیں کہ یہ افسانہ انہوں نے ٹھیک ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں لکھا۔ جو ناقدین اس بیان کو سچ مانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ایک کم سن لڑکی ایسا عشقیہ افسانہ لکھ سکتی ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۲۷ء میں تحریر کردہ یہ افسانہ پانچ برس کی تاخیر سے ۱۹۳۲ء میں کیوں شائع ہوا؟

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''میری ناتمام محبت اور دوسرے رومانی افسانے'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۲ء
۲۔	''لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۳ء
۳۔	''خلوت کی انجمن'' (ناول)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۴۔	''کاؤنٹ الیاس کی موت'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۵ء
۵۔	''ادب زریں'' (مضامین)	عصمت بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۲ء
۶	''تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء
۷۔	''صنوبر کے سائے اور دوسرے رومانی افسانے'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء
۸۔	''نغمات موت'' (نثر لطیف)	عصمت بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل:
	یہ کتاب والدہ مرحومہ کے مرثیوں کا مجموعہ ہے اور حجاب کی اوّلین کتاب۔		
۹	''ظالم محبت'' (ناولٹ)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع سوم: ۱۹۴۰ء
	اس کتاب کا ایک ایڈیشن آئینہ ادب، لاہور نے بھی شائع کیا۔		
۱۰۔	''ممی خانہ اور دوسرے ہیبت ناک افسانے'' (افسانے)	پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور	طبع دوم: ۱۹۴۵ء
۱۱۔	''ڈاکٹر گار کے افسانے'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل:
۱۲۔	''وہ بہاریں یہ خزائیں'' (افسانے)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۴ء
۱۳۔	''ممی خانہ اور دوسرے ہیبت ناک افسانے'' (افسانے)	پبلشر یونائیٹڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء
۱۴۔	''اندھیرا خواب'' (ناول)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۰ء
	اس ناول کا دوسرا ایڈیشن آئینہ ادب، لاہور نے شائع کیا۔		
۱۵۔	''کالی حویلی''	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	طبع اوّل:
۱۶۔	''پاگل خانہ'' (ناول)		
۱۷۔	''موم بتی کے سامنے'' (۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا روزنامچہ)	آئینہ ادب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۸ء

۱۸۔ ''ننھی بیبیاں'' (ناول از لوئزا الکاٹ کا ترجمہ) — دارالاشاعت پنجاب، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۶۸ء
یہ ''Little Women'' کا ترجمہ ہے۔

۱۹۔ ''تحفے'' (ناولٹ)

۲۰۔ ''تصویر بتاں'' (مضامین) — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور — طبع دوم: ۲۰۰۷ء

۲۱۔ ''لیل و نہار'' — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور — طبع دوم: ۲۰۰۷ء

۲۲۔ ''بہاریں، جنوں اور موٹر پمپ'' (ڈرامے)

۲۳۔ ''احتیاط عشق'' (۲۵ افسانے) — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۹۴ء

۲۴۔ ''سوکھے پتے'' (ڈرامے) — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۲۵۔ ''حجاب کتاب'' (افسانوں کی کلیات) — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۲۶۔ ''چچا بھتیجیاں'' — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

وفات سے قبل مستقل پتا:

D-98، ماڈل ٹاؤن، لاہور، پاکستان۔

نظریۂ فن:

''میرا خیال ہے کہ جو کچھ لکھیں اس میں کہانی پن ہونا چاہیے۔ کہانی کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

(بہ حوالہ ماہنامہ ''پاکیزہ'' ستمبر ۱۹۷۹ء)



حوالہ جات:

۱۔ حجاب نے اپنی تاریخ پیدائش ہمیشہ اخفا میں رکھی۔ میرے نام ۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں ''میں نے عہد کر رکھا ہے کہ میں اپنی عمر کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ تحریرات پڑھیں، کھوج لگانے کا فائدہ؟ اس سے شخصی اسرار متاثر ہوتا ہے۔'' اُن کی اکلوتی بیٹی یاسمین طاہر اور داماد نعیم طاہر کے مطابق اُن کی تاریخ ولادت ۴ نومبر ۱۹۰۸ء ہے۔ حجاب کے پاسپورٹ پر ۸ نومبر ۱۹۱۸ء درج ہے جو سراسر غلط ہے۔

۲۔ ناول ''زہرا بیگم'' مطبوعہ دارالاشاعت، پنجاب، لاہور کی خالق۔ ''تہذیب نسواں'' لاہور، میں ان کے متعدد مضامین اور افسانے بکھرے پڑے ہیں۔

۳۔ رسالہ ''تہذیب نسواں'' میں اس نوع کی تحریریں تواتر کے ساتھ شائع ہوئیں۔

۴۔ کل نو اشعار ہیں۔ شادی کے تحفوں میں سب سے نمایاں عبدالرحمان چغتائی کی نارنجی اور براؤن رنگوں میں ایک پینٹنگ تھی۔

صنوبر کے سائے

حجاب امتیاز علی

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی ''نہر روحناک'' کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سنتی تھی، لوگ کہتے، اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھکے ہوئے کناروں پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے اور روحناک کی نیلی دھار وہیں سے اترتی اور کوہساروں میں سے ہوتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آنکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سن کر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جا سکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا ''جسوتی ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے۔ مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں۔''

جسوتی کو آپ جانتے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں، میں اسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔

اس نے مسکرا کر کہا ''جیسی تمہاری مرضی روحی، لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا ''خاتون میں نے سنا ہے ساحل روحناک پر ایک بہت مشاق سو سال کا بوڑھا ملاح رہتا ہے۔ اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگاتی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے۔''

میں نے بے پروائی سے کہا ''کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو۔''

جسوتی کہنے لگی ''سو سال کا ملاح، خاک کشتی چلاتا ہوگا۔''

خانہ زاد نے کہا۔ ''خاتون سنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے، اور آج تک اس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔'' غرض اسی وقت ہم نے اسے کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے، جہاں

سے سیاح، روحناک کی سیر کے لیے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ہم نے دیکھا، کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین، پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیے دعوت استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر جسوتی سے کہا۔ ''یہ خلیفہ بغداد کا محراب تفریح معلوم ہوتا ہے۔''

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پرلے سرے پر چپو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی داڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی و درخشانی نہ تھی بلکہ ـــــ جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت دیدار چمکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے روحناک کی طرف جا رہے تھے، جس کے نیل پر غروب آفتاب مچل مچل کر شہاب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا، جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو، فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لمحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی، رومان کا جزیرہ تھا۔

سیدھے اور تناور صنوبر، جیسے دم بخود کھڑے تھے، اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھپنی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ہرے نیلے اور کہیں افق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا، ہم کتنی دور نکل گئے، اور ہمارے شکارے کو چلتے کتنا وقت ہو گیا۔

یکا یک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''جناب واپس چلئے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں۔''

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے، جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا: ''راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔''

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی، جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا ''گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو؟''

''جی ہاں''

''تمہارا مکان کہاں ہے؟''

''مکان کہیں نہیں خاتون ـــــ صنوبر کے ان سایوں تلے پڑ رہتا ہوں......''

مجھے محسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

''صنوبر کے سایوں تلے'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی، تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟''

''علاج؟'' اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا: ''میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو، اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔'' میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔ ''تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔''

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ ''مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹے کی مفارقت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لیے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔''

''کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟'' میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

''یہ کوئی راز نہیں۔'' اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ ''سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں۔ کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

2

آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے کہ دنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا، جب میں اسی روحناک کے ساحل پر انہیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لیے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونہ پر پڑی...... ایک کمسن لڑکی پر، جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا اتر آئے گا۔ سمجھ لیجئے میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی۔ جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انہیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی۔''

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکا یک چلائی۔ بوڑھے نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا۔ ''یہ دیوانہ پرند کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا کہ محبت بہت ظالم چیز ہے۔

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے ابلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چپو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا:

''شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گزرے، پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رخ پلٹا دیا۔

ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکیے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ اداس لہجے میں بولی: ''میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے۔''
میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا: ''کیا خواب؟''
بیوی نے آہ کھینچ کر کہا۔ ''میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا، جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اجڑ جائے گا۔''
آج سے ستر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سن کر میرا عشق سہم سا گیا۔ میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی: ''پر اتنے فکر کی کیا بات؟''
میں نے کہا: ''فکر کیسے نہ ہو؟ شیریں ترین! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے؟''
میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ''نایاب؟ پھر کیا کرو گے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہو جائے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا۔''
نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگی۔ ''میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام باغوں میں شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔''
میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لیے چشمے پر چلی گئی تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔
میں پریشانی کے عالم میں اسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقہ میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکم شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا: ''کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں۔''
میں نے چھ اشرفیاں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔
میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور مسکرا کر بولی۔ ''اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی۔''
میں نے کہا: ''اسے فوراً بالوں میں لگا لو۔''
پر نہ جانے اس نے کس خیال سے کہا: ''میرے بال گیلے ہیں ابھی میں نہ لگاؤں گی۔ جب رات شروع ہو گی تو لگا لوں گی۔''
یہ کہہ کر اس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا، اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تازہ ہوا کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔ میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آ رہا تھا، تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔
''میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آ گیا۔''
اُس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میری نظر اس کی عبا کے کاج پر پڑ گئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔
میں نے یکلخت پوچھا: ''حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟''
حمری طبعاً شوخ تھا۔ ہنس کر بولا۔ ''کیوں؟ تمہیں کیونکر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے۔''

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب تقدیر کا فرشتہ! اس کی پیش گوئی! سب جھوٹ تھا! محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لیے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی!''

3

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی دوڑی آئی، اور اشک آلود آنکھوں سے بولی: ''افسوس، بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا! میں اب کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہوگی۔ ضرور نازل ہوگی۔'' میں نے گرج کر کہا: ''موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آ گئی۔''

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر کہا: ''تمہاری موت آ گئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشین گوئی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

وہ متعجب ہو کر بولی: ''تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لیے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اسے باغ کے دریچے میں تازہ ہوا کے لیے رکھ دیا تھا۔ اندر بال سنوارنے گئی تھی۔ واپس آ کر دیکھتی ہوں تو پھول وہاں نہ تھا۔''

اُس کی ان مکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیے۔ میں نے اس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا کہ ٹکر کھا کر اس کے سر سے خون کا ایک سرخ فوارہ پھوٹ نکلا۔

راتوں رات میں نے اسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا، جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ اتفاق سے میرا دوست حمری پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ ہنس کر بولا: ''تمہاری آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔''

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا، گویا میں اس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا: ''بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا؟ میں اسے ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا، اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔ حمری آنکھوں میں دہشت لئے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا، اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہنے لگا۔ ''کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو۔'' یہ سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا...... جس نے آج تک دنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

4

''تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

آج اس قصے کو ستر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم، اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے میری محبت دفن ہے۔''

کشتی ساحل سے آ لگی۔

اختر اورینوی

نام : سید اختر احمد
قلمی نام : اختر اورینوی/ڈاکٹر اختر اورینوی
پیدائش : ۱۹، اگست ۱۹۱۰ء بہ مقام قصبہ کاکو، جہان آباد، ضلع گیا، (بہار) بھارت
وفات : ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء پٹنہ، مدفن: قادیان (پنجاب)
تعلیم : ایم۔اے (اردو) ڈی۔لٹ

ابتدائی درس، والدہ ماجدہ سے حاصل کیا۔ قرآن شریف مع ترجمہ، اردو، فارسی اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم والد بزرگوار اور چچا جان سے حاصل کی۔ مونگیر ضلع اسکول سے ۱۹۲۶ء میں میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۸ء میں آئی ایس سی سائنس کالج، پٹنہ سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر کے وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد ایم۔بی۔بی۔ایس کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۹ء میں اس کو پاس کر کے ایم۔بی۔بی۔ایس کے دوسرے سال میں آئے۔ علیل ہوئے اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک علالت کے سلسلے میں ادرین میں مقیم رہے۔ صحت یاب ہوئے تو پٹنہ کالج میں بی اے (آنرز) انگریزی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں شاندار کامیابی حاصل کر کے گولڈ میڈل لیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

حالات زندگی:

نقوی زیدی جاجمیری (سادات) خاندان کے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید احمد صوبہ بہار کے اولین فاتح اختیار الدین بن محمد بختیار خلجی کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے۔ پیشہ آباء سپہ گری تھا۔ سید وزارت حسین کے ہاں، کٹر قادیانی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی مذہبی اور علمی ماحول ملا، جس کے اثرات آخری عمر تک رہے۔ قرآن حکیم کی سورتوں کی تفسیریں اور ''الفضل'' قادیان میں شائع ہونے

والے مضامین اختر اورینوی کے نکتہ نظر کے عکاس ہیں۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۳ء کو قصبہ ارول ضلع گیا میں معروف افسانہ نگار خاتون شکیلہ اختر سے شادی ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں ٹی۔بی کے مرض میں مبتلا ہو کر ڈیڑھ برس اٹکی سینا نوریم میں گزارا۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج سے بطور لیکچرر شعبہ اردو منسلک ہوئے۔ ساری زندگی درس و تدریس سے متعلق رہے۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے، جہاں سے ۱۹۷۳ء میں سبکدوش ہوئے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کے انگریزی رسالہ ''ہندوستان ریویو'' پٹنہ میں ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۶ء کے تمام تبصرے اختر اورینوی نے لکھے۔ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء ''معاصر'' پٹنہ کے اداریے لکھے۔ ادبی، سماجی، مذہبی اور قومی موضوعات پر ریڈیو کے لیے سینکڑوں تقاریر لکھیں۔ تادم مرگ لاولد رہے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

''بدگمانی'' مطبوعہ: ''شمیم'' پٹنہ: ۱۹۳۱ء

اسی زمانے میں یہ افسانہ ''بہارستان'' پٹنہ میں بھی شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''شہنشاہ حبش'' (ڈراما)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۲۔	''منظر و پس منظر'' (اُنیس افسانے)	ناشر: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۴۰ء
۳۔	''کلیاں اور کانٹے'' (گیارہ افسانے)	ناشر: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۴۱ء
۴۔	''انار کلی اور بھول بھلیاں'' (سات افسانے)	ناشر: اقبال بک ڈپو، پٹنہ	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۵۔	''سیمنٹ اور ڈائنامیٹ'' (افسانے)	ناشر: ضلع شاہ آباد سے	طبع اول: ۱۹۴۷ء
۶۔	''کیچلیاں اور بال جبریل'' (افسانے)	ناشر: ساتھی بک ڈپو، پٹنہ	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۷۔	''حسرت تعمیر'' (ناول)	ناشر: فروغ اردو، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۶۱ء
۸۔	''قدر و نظر'' (تنقید)	ناشر: فروغ اردو، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۵۶ء
۹۔	''تحقیق و تنقید جدید''	ناشر: کتابستان، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۶۲ء
۱۰۔	''کسوٹی'' (تنقید)	ناشر: رام نرائن، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۱۱۔	''مطالعۂ اقبال'' (کتابچہ)	ناشر: موتی لال بنارسی داس	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۱۲۔	''مطالعۂ نظیر'' (کتابچہ)	ناشر: موتی لال بنارسی داس	طبع اول: ۱۹۶۲ء
۱۳۔	''سراج و منہاج'' (تنقید)	ناشر: موتی لال بنارسی داس	طبع اول: ۱۹۶۴ء
۱۴۔	''بہار میں اردو ادب کا ارتقاء ۱۹۵۸ء تک''	ناشر: بذات خود	طبع اول: ۱۹۵۶ء
۱۵۔	''انجمن آرزو'' (شاعری)	ناشر: سنگم کتاب گھر، دہلی	: ۱۹۶۴ء

۱۶۔ ''زوال کینٹن''(ایکانکی ڈراما)

۱۷۔ ''کارواں''(ناول)

۱۸۔ ''سپنوں کے دیس میں''(افسانے)

۱۹۔ ''اختر اورینوی کے افسانے'' مرتبہ: ڈاکٹر عبدالمغنی، طبع اول: ۱۹۷۷ء

(یہ کتاب ۱۵ افسانوں کا انتخاب ۲۷۸ صفحات پر پیش کرتی ہے۔) بہار اکیڈمی پٹنہ

۲۰۔ ''ایک کاروباری''(افسانہ) مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن

غیر مدوّن:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ شاعری کا ایک مجموعہ، ریڈیائی مضامین کے دو ضخیم مجموعے اور لاتعداد تنقیدی مضامین یادگار چھوڑے۔

نظریہ فن:

''میرے کئی شائع شدہ افسانے ایسے ہیں جن میں خود میں بھی چھپا بیٹھا ہوں، اور میرے دوستوں کے نزدیک میں نے ان افسانوں میں خود اپنی رسوائی کی ہے...... میرے دماغ اور میری شخصیت کی تعمیر میں چند چیزوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ احمدیت، اقبال کی شاعری، نیاز کی فسانہ نگاری، سائنس کا مطالعہ، گھر کی فضا، اشتراکیت کا تفصیلی مطالعہ اور میری مسلسل علالت۔''

اختر اورینوی

(بحوالہ: ''میرا بہترین افسانہ'' مرتبہ: محمد حسن عسکری)

کلیاں اور کانٹے

اختر اورینوی

وہ تعداد میں نو تھیں۔ گوری، سانولی، گوارا اور ناگوار، بعض ان میں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریوں میں ملبوس طیور صبح کے چہچہوں کے ساتھ باکس اور ڈورینڈا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح آٹھ ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھی۔ درجہ اول کے کوارٹر، صحت گاہ کے عام وارڈوں سے تقریباً تین فرلانگ پورب کی جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں۔ ہر پندرہ روز۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے، دوم وسوم۔ درجہ اول کے کوارٹر تو خاصے بنگلے تھے، ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ ہسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دو کوٹھریاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے ایک تیماردار کے لیے۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سالا لمبا چوڑا کمرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے لعب ولہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو سل ودق کے جراثیم کے چند اور شکار آ جاتے تھے۔ اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ زندگی، موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر، ہسپتال اور قبرستان، ہر جگہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان، گوروں کا قبرستان، شرفاء کے مدفن اور غریبوں کے گورستان۔ ہر شہر، ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ ''صحت گاہ'' اسی کرہ پر قائم تھا اور اسی کے بھلے برے قانون کا پابند۔

ہم ان دنوں دس تھے۔ ''صحت گاہ'' کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ میں، یہاں سے نرس کوارٹر سامنے نظر آتا تھا۔ لوہے کے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی اقامت گاہ کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے مزدوروں کے ترسے ہوئے بچے پرستانی دکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے کی پارٹیوں اور پکنکوں میں ہم لوگوں کا ساتھ

رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف، ان کی برائیاں، ان کے ناز، ان کی سازشیں، ان کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تھک کر شیمہ حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گر۔نہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ ہمیں مصالحہ دار، تیکھی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد ایک سال اس وارڈ میں گزار چکے تھے اور چند ایسے بھی تھے جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ امید و ناامیدی کے تین سال، ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو نو وارد تھے۔ یہ نو گرفتار سہمے سہمے، سنجیدہ، اٹل، متردد، بے بس اور ہتجی سے نظر آتے تھے۔ چند ہفتوں میں یہ جھجک عموماً دور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے بن جاتے تھے لیکن ایک دو پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی اور گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہرکیف موت اور بیماری کے درمیاں بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوشگوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے، ہنستے تھے، جملہ بازیاں ہوتی تھیں، قہقہے لگتے تھے، نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی، اصلی اور نقلی آہیں کھینچی جاتی تھیں، سرگوشیاں ہوتی تھیں اور رازداریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا، ایک مذہب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی، پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کم از کم ایسا نظر آتا تھا۔ ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا بساتا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا، نیند اور گفتگو ممنوع، زندہ لاش کی طرح پڑے رہیے، جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجیے اور کچھ مت سوچیے، فکر و تردد ایسے مریض کے لیے مہلک ہے۔

''سو جامت کیجئے۔ اچھا! ہاں..... ں!''

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں، مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کا سوچ، موت کا سوچ، سل کا سوچ، دق کا سوچ، آرزوؤں کی لاش، ماضی کا ماتم، مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم المحسوس، ٹھوس، پیاس، محرک، خودنگر، خوبصورت اور حقیقت کا اچانک سرد اور بے حس ہو جانا، احساس و ادراک جھٹپٹانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا نامعلوم، تاریک، بے پایاں، بے زماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا، سوچنے والے دماغ، دھڑکتے ہوئے دل، تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ خیز ناقابل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ ہم صحت گاہ کی خاموشیوں میں پھسلتے ہوئے لحات کو سرکتی، گھٹتی، ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قمیصوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی کو پکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کا ٹیک مل جائے۔ ہم گاہ ٹماٹر کے دام اور پیٹی کوٹ کے حاشیے کو تخیل سے چھو کر روز زندگی کی اذیتوں سے پناہ لیتے تھے اور کبھی بے خواب راتوں کی نیند کا کاجل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح پپوٹے نڈھال ہونے لگتے تو......

''اوہ...... رے...... ے! بڑے صاحب سے کہہ دوں گی، یہ تو سونے لگے ہیں۔''

کی آواز سنائی دیتی اور گاہے گاہے گال یا پیشانی پر ایک آشنا سی چپت۔ یہ نجات دہندہ آواز میرے سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

''میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب۔ سوتا کون ہے؟'' ''آئیے آپ بھی سو جائیے۔'' یہ جواب ملتا۔ پھر کی تسکین

وہ روز طلوع آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گھنگھرو بولنے لگتے تھے۔ ہم چوکنا ہو کر اس طرف دیکھتے۔ صحت گاہ کی ویرانیوں میں روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید ساریاں سبز جھاڑیوں سے نکلتیں جیسے بیلے کے پھول کوڑھی کے اخضرین پردے سے نکلتے ہیں۔ بگلوں کا پرا قریب تر ہوتا جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پھلجڑی چھوٹتی اور ردو پھول ہم لوگوں کے وارڈ میں آ گرتے۔ ہم دسوں مریض انہیں اپنے دامن نظارہ میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی ڈیوٹی درجہ اول کے کوارٹر سے اس وارڈ میں بدلتی تو عموماً وہی ہوتا کہ بجا یا بے جا طور پر کردہ و نا کردہ غلطیوں پر ہم لوگوں کی سرزنش یوں کی جاتی:

''میں ''اے'' وارڈ میں بھلی تھی۔ کیسے اچھے مریض ہیں اے وارڈ کے، ''سی'' وارڈ کے مریض تو جان کھا جاتے ہیں۔''

''کیسے اچھے ہیں اے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں۔ بے چارے اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کرواتے ہیں جیسے میں ان کی لگائی ہوں ——'' اور بھی زیادہ دلدوز:

''گھر میں کرتے ہوں یہ ٹھاٹھ۔ شان دکھلانے آئے ہیں۔'' اے'' وارڈ میں نواب صاحب اپنا منہ تک میلا نہیں کرتے تھے۔''

ہم دسوں مریض مختلف زاویوں سے درجہ اول کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سرخ اینٹیں طنزیہ ہنسی ہنستی نظر آتیں۔ معمر نواب صاحب کی موٹر، ان کا جوان لڑکا منصف صاحب دھن راج جی کے بھائی کی توند اور شہوتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں صوبے کے صدر ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا، چالاک دفتنہ کار نور نظر، بیمار و تیماردار غرض درجہ اول کی ساری مخلوق سل کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتی، جو ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دانی کے کاربالک ایسڈ میں فنا ہونے کے لیے۔

اس روز سینے کے گھاؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کئی نرس ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کا بخار اس اور چھپے ہوئے جنسی ارمان نکالتے تھے۔

ہمارے دلوں میں بھی چور تھا اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ ضرور ایسی تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اکساتی رہتی تھی اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لیے تیار رہتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے ماضی کے نہاں خانے میں سینکڑوں مریض، بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گزرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گوندھتے ہوئے ہمیں بھی پروتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا تنوع، ہمدردی اور رونق تھی۔ ''اے'' وارڈ کے علاوہ ''اپر سی'' وارڈ اور ''لوئر سی'' وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی۔ یہ اپر اور لوئر محض زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے۔ دونوں ہی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے۔ لیکن ہمارے وارڈ کا ایکہ ساری ''صحت گاہ'' میں مشہور تھا۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحد ہی تھی۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے نازک سے لڑکے کا بڈ تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں ''اے پی'' دی جاتی

تھی۔ یہ اس صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سل کے پنجوں سے چھینا تھا۔ اسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی۔ پھر بھی وہ وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ وہ نرسوں کا ''سلونا تھا'' ننھا گوپال'' گوپال پندرہویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا۔ بہت ہی موٹا تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ غریب ساڑھے تین سال صحت گاہ میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے چلا گیا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ اس کے بدلے ایک مارواڑی آیا۔ یہ اتنا دبلا تھا کہ ہم لوگ اسے منگنی رام کا بھوت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو حیاتین کے جنون میں صرف ایک سیر ٹماٹر دن بھر میں کھا جایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مر مر کے بچے تھے۔ شاید ان کی صحت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چوتھا خود میں تھا۔ صحت گاہ میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرت نکالنے والا۔ میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی حاذق کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ۔ ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویریں بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا رہتا ہے۔ ''اب کالا کوئی نہیں رہے گا۔'' نقی، حسین تھا اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ، چونچال، بیباک اور ہنس مکھ۔ اس کی آمد سے لوئر سی وارڈ کا پلہ گراں ہو گیا تھا۔ اپر سی وارڈ میں گھوش، نرسوں کا مرکز ثقل تھا مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے لوئر سی وارڈ میں چلی جاتی تھی۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے کھانے کی میز کے گرد بڑی دل نواز فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ چہل سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت بھاتے تھے۔ دوسرے وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک داڑھی رکھتے اور نقلیں کرتے تھے، دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکہ لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیئر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر عبیر کی سرخ بندی نرسوں کے لیے سرمایہ تفریح تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بیوقوف بن کر اور جملے سہ کر اپنا حق جما لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا مگر ایک کی فطرت میں یا مائی طنز زیادہ تھا اور دوسرے میں واقفیت نمایاں۔

نقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصرجی تھے۔ گورا رنگ، جس پر سرخی کی چھوٹ تھی۔ مصرجی بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر یہ بالکل کنوارے تھے۔ اچھوت کنیا کی طرح۔ مجھے، نقی اور مصرجی کو ایک پھیپھڑے میں ''اے پی'' دی جاتی تھی۔ مصرجی کہنہ مریض تھے۔ ''اے پی'' کا کورس ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو ''فرینک نرو'' کی جراحت کے ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصرجی میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نویں صاحب ایک اڑتالیس سال کے دیسی عیسائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھنٹوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے تختے کی طرح چت لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں، کسی قسم کے آثار حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ ''زیر قدمت ہزار جان است'' اصولاً وہ اپنے سل زدہ پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیان حیات تھی۔ ہر وقت، ہر روز، ہر سال یونہی زندگی گزارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ ''صحت گاہ'' میں انہیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوگی۔ موٹا گول مٹول سا، گردن ندارد۔ لڑکا غلام ربانی بھی پربھو بابو کا مرید تھا۔ کم سخن و کم آواز مگر بسیار خوار اور بسیار خراب۔ اسے ہم لوگ ''مرغ'' کہتے تھے اور پربھو بابو کو ''پطرس ولی''۔ ''مرغ'' وضو کے علاوہ غسل بھی ''بناتا'' تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت ''پطرس دی'' بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرین اور ایشری کی آواز سنتے ہی ''مرغ'' بھی بانگ دینے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جان سینی ٹوریم تھیں۔ ایشری بیس سال کی صندلی رنگ، دراز قد، چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چلتی تھی جیسے ''اسپ تازی قدم'' چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا ''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق'' قسم کا خم! ایشری، ملنسار، دلنواز اور مجسم پردگی تھی۔ وہ نسیم خوش خرام کی مثال آزاد و ہمہ گیر تھی۔ ایشری کیتھرین کو کنوبوا کہتی تھی۔ کیتھرین پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی۔ سانولا رنگ، جراحات جفا پر نمک ریز، اس کے پھیلے اور گداز کولھے، اس کی گول کمر، اس کی مثالی ہندی چال، مست ہاتھی کی طرح۔ وہ یوں افق نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولھوں کے محور پر بالائی جسم چلتے وقت جھوم سا جاتا تھا جیسے پھل دار شاخ موٹے تنے پر لچک سی جائے، پھر اس کے کولھے پیش و پس ڈگمگا کے متانت سے آتے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ داہنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے پلو میں تناؤ پیدا کرتی اور چھوڑ دیتی تھی۔ آنچل کی پلٹن میں اس کے سینے ابھر آتے تھے اور پلو لہرنے لگتا تھا۔ کیتھرین عموماً متین سی رہتی تھی مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحر کار بن جاتی تھی اور پھر سنجیدہ۔ بجلی کا چنچل پن اور امنڈتے ہوئے کالے موج در موج بادل کی گھمبیرتا، یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں کر کے قاتل تر بناتی تھیں۔ اس کی فطرت میں بحر الکاہل کی گہرائی تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا، مارتھا اور فیمی۔ مارتھا مردانہ وار لانبی چپٹی سی عورت تھی، ہنسوڑ اور بے جھجک۔ فیمی اس کے زیر حکومت تھی۔ نرس کوارٹر کے ایک ہی کمرے میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے۔ ''فیمی تو فلاں مریض سے گھل مل کر کیوں ملی؟ فلاں نے تجھ سے چھیڑ چھاڑ کیوں کی؟'' اس جوڑے کے 'نصف بہتر' جسے پر ہر وقت پہرہ تھا۔ مارتھا، ہاں مصر جی سے خوش تھی۔ شرمیلے اچھوت کنیا سے مصر جی۔

ایک جوڑا تھا دو چچازاد بہنوں کا۔ سلوی اور فلورنس۔ دونوں گوری گوری، گداز گداز، مائل بہ فربہی عورتیں، مگر لڑکیاں کہی جانے پر مصر۔ سلوی اخلاقاً یا ضرورتاً لڑکی کہی اور سمجھی جا سکتی تھی لیکن فلورنس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی۔

میگی اور دلاری کالی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں۔ خوش اخلاق، کرم فرما، ہر دل عزیز، ایثار پسند، میگی ادھیڑ عمر کی تھی اور دلاری جوان۔ اس کے چھوٹا تا گوری سینوں کی سنگینی، ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے لحاظ سے نظریں پھسل کر صدر میں ٹھوس سہارے کے بل پر تھم جاتی تھیں۔

نویں تھی ڈولی۔ وہ سراپا ڈولی تھی۔ چھوٹا سا کھلونا، شریر آنکھیں مٹکانے اور چیں چیں کرنے والی گڑیا۔ گہرا سانولا رنگ، بوٹا سا قد، پاجی آنکھیں، کھلنڈری، بے باک، لڑ پڑنے والی اور لڑ کر ہنس دینے والی۔ یہ سب سے کم عمر تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہوگی، کبھی تو یہ بدصورت دکھتی تھی اور کبھی گوارا حد تک بھولی۔

''صحت گاہ'' ایک ویرانے میں تھی۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا اور سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ ''صحت گاہ'' کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی الگ تھلگ۔ دو ڈاکٹر، ایک کمپاؤنڈر، ایک ڈریسر، ایک ایکس رے بابو، دو کلرک، نو نرسیں، ایک میٹرن اور

سسٹر، آٹھ وارڈ بوائے، چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سل ودق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمارداروں کے، وارڈوں کے چاروں طرف باغ، جنگل اور سرخ سرخ مورم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پرشور پہاڑی ندیاں تھیں۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کے ساتھ خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی ایکس رے کے لیے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی صبح سے غمگین اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا۔ کہنے لگی:

''بڑا بنتا ہے۔ ایکس رے کرنے کے بہانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرے اور دوسروں سے جلتا ہے۔''

ڈولی نے غصے کی بے خیالی میں یہ جملے ادا کیے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش، وہ کہہ چلی۔

''نرسیں اگر ایسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔''

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبہ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو ''ڈے آف'' ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس بجھانا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کوارٹر میں دو دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں، ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں، طعنہ وطنز، چھیڑ چھاڑ اور کبھی جھوم کر گیت:

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیاں
سردتا کا ہے بھول آئے پیارے نند دیا

اور غزلیں:

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیمانہ

سیاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کئی کئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوئی۔ جوانی، عورت، بیوی اور ماں، ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے ناآسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا۔ لطافت مٹی نہ تھی۔ روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہوگی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لیے اپنے لب ورخسار ارزاں کر دیئے اور یہ مسلول سل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل ودماغ میں ہضم کر جاتے تھے۔ ''مثبت'' مریض گھمنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دیویاں بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیرت کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی، ٹی۔ بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی۔ بے حقیقت ہو جاتی تھی جیسے ملا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے اسپوٹم فلاسک میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مصر جی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

''بھائی تم بی بی اور نے بی (فیبی) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو، میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔''

میں نے کہا تھا۔ ''سیکی بھی تو ہم قافیہ ہے، اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے'' بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انہیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آ گئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید، ہولی سب تیوہار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کرلیا کرتے تھے۔ نقی کی صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آ گیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور نقی بہت قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں ''سارس کا جوڑا'' کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مصر جی وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لیے بلا لیے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اکرام نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلوا بھی بھیجا مگر ہم لوگوں نے تاب مقابلہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے جنس لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقع پر ہم لوگوں نے ڈراما کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان برپا کرتا ہوا آیا۔

نقی لوئر سی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمہ شیریں کی طرح تھیں۔ صنف نازک کے لیے دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر ایشری کی جراتوں کے سامنے بقیہ سب عقبی زمین کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی، ہر درخت پر چڑھ کر پھل کترنے والی مگر چوری چوری یہ لے اور وہ بھاگ۔

ایشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کرلیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا اور دل ہی کے لیے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔ ''مجھ سے کسی کا کڑھنا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو۔''

ایشری نے میرے سامنے ایک بار جھولے کے سائے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرینا ایشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی اس کی فتوحات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا

ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب وحجاب کا اتنا گوشہ وہ چٹکیوں سے ارادتاً ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مائگی ارماانگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرین نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور رازورانہ انداز کی نظر تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک ایشری کی ذات میں اس کو وہ ٹائپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سینی ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ ایشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی۔ مگر کیتھرین نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا۔ ''ڈارلنگ!'' اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرین نے مجھ سے شکوے کئے ''آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھابی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے.....'' کیتھرین نے اپنی سنجیدہ، شیریں، لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ لیے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نوخیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی تھیں۔ اس روز بڑے صاحب نے بھی رقابت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا ''نغمۂ شب'' گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لیے تیار ہیں۔ وہ سب کی سب وردی برطرف کئے حسین وآرزوخیز ساریوں میں لپٹی، جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقص مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایشری طوفان وسیلاب تھی۔ کیتھرین نے اپنی فطرت کا نقاب الٹ دیا تھا۔ وہ بھی ''کرسمس ایو'' میں بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک سپردگی نہ تھا۔ پوری وارڈ میں کہربائی لہر دوڑ گئی۔ معمر وکیل صاحب (جنہیں ہم لوگ پیر مغاں کہتے تھے) سے لے کر غلام ربانی تک لوگ تلاطم محسوسات میں ڈانواڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اٹھے نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اف اسی وارڈ کے ممکنات اور مواقع کتنے محدود تھے ہمارے دل میں اپنی جبیبیں اور ''اے وارڈ'' کی خلوتیں انفرادی شان میں آسودہ کھنک رہی تھیں۔

''نرسیں بڑے صاحب کے یہاں ''کرسمس ٹری'' بنانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا..... ہاں!' وہ ایک لوچ دار آواز فضا میں لہرا کر دلوں میں اتر گئی۔

''اوہ..... رے..... رے! انہیں سو کیسے جائیں گے۔ بوا تم بھی تو جان کے بتی ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی انہیں؟ ذرا مصر جی کو تو دیکھو.....''

ایک رہزن نمکین ہوش نے دکھتی ہوئی رگ چھو لی پھر جلوۂ برق فنا تبسم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور فیس کو چھیڑتی ہوئی سب نرسیں یوں چلی گئیں، جیسے آتش بازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک بیک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارہواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ بائیس کو وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم دسوں کی نظریں خالی بیڈ پر جا کر ہم آغوش ہوئیں۔ خاموش ماتم کی حالت میں پر بیتی آپ بیتی بنی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب ہمدردانہ انداز میں چپ چپ سے رہے۔

ہم اس اندوہ بلا سے پناہ چاہ رہے تھے اور انتقاماً ہم سارے جہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ ''پیر مغاں'' مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر سب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے جسم کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دیئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے میں بھی بلند آواز سے گفتگو کی، بے ہنسی کی ہنسی ہنسے اور نرسوں کا اتنے پہلوؤں اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ان میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین ''نغمہ شب'' اچانک طور پر لورسی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز اہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے الجھے ہوئے بال درست کر لیے۔ نرسیں ہارمونیم پر کرسمس کرول گاتی، چلبلیں کرتی، لڑکھڑاتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ آ گئیں چیت کی سنکتی ہوئی ہواؤں کی طرح، شباب کی امنگوں کی مثال۔ کچھ دیر کے لیے نغمے رک گئے، خندۂ بیباک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ بداماں خاموشی کا ترنم زندہ سکوت کی ابدی لے آغوش وجود میں تھر تھرا رہی تھی۔ اس کے قبل کہ بڑھ کر کوئی بجلی کا بٹن دبائے بہت سی حسرتیں پوری ہو گئیں، بہت سی آرزوئیں جوان ہوئیں، کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت ناکردہ گناہ حسرت کی داد دینے کے لیے دردناک مضحکہ کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود جرأت رندانہ پر تلا ہوا تھا۔ باہر سطح مرتفع پر چلنے والی تیز ہوائیں سرد، بوڑھے خاموش، گہرے نیلے آسمان کے سائے میں الھڑ دوشیزاؤں کی طرح لغزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں مائل انحطاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے بھک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ ڈولی اور نقی کے درمیان ایک سیکنڈ میں تھوڑی سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی تماش بنے اور بکھرے۔ نغمے پھر بلند ہوئے ہارمونیم ایشری بجا رہی تھی اور سالومی نے فادر کرسمس، کا سوانگ بھرا تھا۔ سرخ پاجامہ، سرخ عبا، نیلی اونچی خرطومی ٹوپی اور سفید لانبی داڑھی۔ ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے ''پیر مغاں'' نے بھڑ کر فادر کرسمس، سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھومر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ ''پیر مغاں'' نے ایشری کے گلے سے بندھا ہوا ہارمونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن بڑھانے کی مضرت بھولی نہ تھی۔ معمر وکیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائے اور رات کی پریاں مجسم غزل الغزلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلوؤں کے خیر مقدم میں عرض نغمہ اور گذارش رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے روز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں، صحت گاہ کی زمین سے زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوڑھے کرسمس نے سیناٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر بجرمانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں ہسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے ''پیر مغاں'' کی شادی تفریحاً

''فادر کرسس'' سے کردی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر ''مدر کرسس'' تھی۔ ''پیر مغاں'' اے میری گھر میں کے اصول سے میری ''وارڈ میں'' کہنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر میری سالی بن گئی اور کیتھرین نقی کی ''بھابی'' تھی۔ اس نوع کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ سند باد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح ''صحت گاہ'' کے صحرائی جزیرے میں بیٹھے سنسار سے الگ تھلگ انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لیے بری بھلی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لاانتہا حسرت تعمیر، بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لیے ''ڈے آف'' میں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی اور دل آویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ پہلے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انہیں حریری رومانوی اور عطر وسینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد رومان اور سینٹ تناسخ کے چکر میں پڑ کر بیسنی روٹی اور پڈنگ بن گئے۔ استمرار حیات کے لیے روزمرہ کی واقعیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا ''نقی بھائی، وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہے کہ میری بیماری اچھی ہوگئی..... تب بھائی انور ہم جا کر پھر اسکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟'' اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہتا: ''مگر پوڈنگ اور بیسنی روٹی اور کٹو بوا کے گیت۔ طبیعت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے ہے نا؟ پھر ہم سل کے مریضوں سے کون گھل مل کرے گا؟ سانپ سے کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹو بوا کا پریم کہاں ملے گا؟'' نادان اور پرارمان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لوئرسی وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چوکھا تھا۔ پربھو بابو اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے وارڈوں سے ہم سب لوگ زیادہ رقابت کرتے تھے۔ وہ سل ودق کے ہلاہل میں نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر سمیت کو گوارا بنانے کے لیے بے چین تھے۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ یسوع مسیح کی محبت، برج اور کیرم کے کھیل یا نرسوں کا لوچ جو بھی زخم پر مرہم کا پھاہا رکھ دے، جس سے بھی غم غلط ہو جائے۔ ایک روز گوپال برہم برہم سائٹل کر واپس آیا۔ اب اسے چند فرلانگ چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ رفتہ رفتہ اسے بھائی حاذق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نقی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی۔ اس بک بک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتمار ہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لیے مگر قہر مریض بر جان مریض۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب الجھن میں گزارا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور نقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اٹھ بیٹھے۔ ''کٹو بوا آبزرویشن وارڈ میں مہندر بابو سے......'' گوپال رک گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''مہندر بابو نے کٹو کے گال میں......'' اب کے اس نے بوا نہیں کہا...... ''انور بھائی کیتھرن سے مت بولئے......'' گوپال بہت خفا تھا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی، کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔

''انور بابو مجھے ٹائی باندھنی نہیں آتی۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے۔ میں آپ سے ہی تو ٹائی کا ناٹ بندھواؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ

مسکرائی، چلبلی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرین نے بھی کار خیر کرتے وقت غالباً گوپال کو دیکھ لیا تھا۔ یہ جملے آزمائشی تھے جن کے اندر احساس لغزش نے مشتبہ پذیرائی کو امید افزا بنانے کے لیے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا۔ کیتھرین چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر راز کو وہ شرمندۂ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی۔۔

''کٹو بوا کا آج ڈے آف ہے۔ وہ شہر نہیں گئیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں۔''

ان دنوں ایشری بھی اے وارڈ کے مصنف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرین اور ایشری ان دونوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو مطلع کر دیا۔ پربھو بابو اور پیر مغاں نے صاد کیا۔ طے صرف یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرین سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف ایشری سے دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں ورنہ وہ نرسیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی۔

یہ چپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے اسٹور روم سے نقی مجوب سی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے لے جا کر کہنے لگا ''سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے۔ مگر سیلاب کو سیلاب بھی کہیں روک پاتا ہے۔ چلو کشیدگی ہو چلی۔''

ایشری کی شخصیت کی طوفان دشی نقی کی شعلہ مزاجی کو پنکھا جھل گئی۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا ''مصنف بھی کیا یاد کرے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''مگر تم ایشری کو اپنا تو نہ کر سکے۔''

''تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرین کو اپنا لیا؟'' تنک کر بولا اور کامیاب ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے واقعیت کا ٹھوس پن اور جذبات پروری کی نامرادی کا زہر پن محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ کرسمس نے ہم لوگوں کی توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور توقعات کا قیام خلش نامرادی میں بس بھر دیتا ہے اور میں ذرا مثالی بلندیوں پر اڑ کر غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی۔

دو تین روز بعد میں نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیرتے جاتے تھے۔ بادشمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطف پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق ہمدردانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کیف بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔

اچانک خوشگوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

''پاگلوں کو دیکھو۔'' کیتھرین کی لوچ دار آواز عقب سے آئی۔

''پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم کر رہا ہے۔'' یہ ایشری کی شوخ بولی تھوڑی تھی۔

میں نے کہا'' آؤ ایشری! تم سے پریم کریں۔''

''واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ...... رے...... ے! دیکھو نا کنو بوا تمہیں منانے آئی ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ کیتھرین میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

''دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں'' کولو کیلسم'' کا انجکشن دیا ہے۔ چھی! کتنا پھول گیا ہے۔ بہت بے درد ہے انور بابو......'' اس نے مترحم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا...... میں بے گانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی۔

''ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لیے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہوا اور اپنا ہمارا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ننھی تو یتیم ہے نا اور میں...... میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جائے ٹی۔ بی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرین کے لنکس بہت کمزور ہیں...... اسی لیے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل ننھی کو ارٹر، ذرا سینک دے اسے۔''

وہ ایشری سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ نقی نے بڑھ کر کیتھرین کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا

''جس ڈالی پر گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آتی تھی وہ اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میری پوچھ کرے؟''

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرسش نے سکوت کی مہر توڑی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے گوپال والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرین نے ایشری سے کہا:

''سنتی ہے ننھی؟ میں مہندر کے حلق میں'' منڈلس پینٹ'' لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا انور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر رہی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانیں ایشری نے ہنستے ہوئے کہا:

''اتنا جلتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ بادشمال ان کے جانے کے بعد ذری دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہیں۔

اس واقعے کے تیسرے روز'' پیر مغاں'' صحت گاہ سے چل دیئے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انہیں پریکٹس کی اجازت دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔'' پیر مغاں'' بھی ہنستے ہوئے اپنی ''وارڈ فیلن'' سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ کتنے درد آگیں اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گزارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غمگسار۔ ہفتوں وارڈ سونا سونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو'' پیر مغاں'' منتخب کیا اور صحت گاہ اپنے زخم دمرحوم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سینی ٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ ہائے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں۔ پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر

رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سیر کی انہیں اجازت تو تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے۔ صحت گاہ، میں صرف ایک ہی رکشا تھا۔ وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پرشکستگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جانِ مستقبل کا خوف بھی انہیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس دلاری رہ رہ کر رو دیتی ہے۔ وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے بھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سینی ٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچکدار حالت ہے۔ کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے سل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے۔ اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے ہیں محاذ کا رخ کب پلٹ جائے یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لیے تواتر کے ساتھ تمثیل وادا کاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرین اور ایشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرین سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ ''انور بابو! تیرہ سال کے سن سے میں مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چمک دمک کی طرف رخ کیا۔ بہت برا ہوا انور بابو!'' کیتھرین نے ایک بار کہا۔

''آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟'' میں بولا۔

''تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں؟ دوسروں کے لیے اچھی بنو، پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔'' کیتھرین بیزاری سے کہہ اٹھتی۔

''سب تو ایسے نہیں ہوتے۔''

''کون! سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے اور مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ شادی کر لوں گی، کر لوں؟'' کیتھرین ہنسنے لگی۔

''ضرور کر لیجیے!''

''کرادو نا!''

اسے ''کرا دیجیے'' کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس کردونا، کی بے تکلفی میں ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' کی حسرت پوشیدہ تھی۔ ''ہم سل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟'' میں نے یہ ٹھس سا جواب دیا۔

''تم نرسوں کو نہیں سمجھتے انور بابو!'' اب کے بھی ''تم'' تھا۔

کیتھرین بڑی عمیق نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پرپیچ وخاردار راستوں کی طرف سامنے آ گئیں۔

کیتھرین اس نوع کی درد آشنا بات چیت کی پیاسی تھی لیکن ایشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایشری اکتا جاتی تھی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی حال اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اپنی شادکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نقی نے ایک بار ایشری سے کہا:

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

ایشری نے جواب دیا۔

''کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو شکنجے میں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں۔''

نرس سلومی کو تجسس اور ادھر ادھر کی بات ادھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرین کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سنائے اور حال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرین نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر ''گھوش'' وہ ہڈیوں کی ٹی۔ بی والا ذی فراش مریض ہریش چندر سبھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک، کمپاؤنڈر، ایکس رے بابو، یہ بھی اس کے گھائل رہ چکے تھے پر وہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرین نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دیئے تھے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایشری کا تو یہ عالم تھا کہ نقی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر، چائے کا طشت، گرم پاجامے، مفلر وغیرہ نقی کر دیے تھے۔ ایک بار وہ نقی کا سوٹ بنوانے پر مصر تھی مگر نقی نے انکار کر دیا۔ ایشری کئی دنوں تک روٹھی رہی ہے۔ اس نے شکایتاً کہا ''آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے۔''

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ تیس سالہ میگی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے اپنا سینی ٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا، اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرہ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں رد کیا جیسے ماں بیمار بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایشری اور میگی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زندہ ساریاں اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نقی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میگی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سینی ٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اسکرین بھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میگی اور

نرس سوشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یہ نئی نرس سوشیلا، سلویٰ کی جگہ پر بلائی گئی تھی کیونکہ سلویٰ نوکری سے استعفیٰ دے کر ایک موٹر ڈرائیور سے شادی کرنے دلی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسری صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی لیکن مسلسل گھر پر انے گئے لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ، بڑے لوگ، خلقت تو بائبل کی بددعا کی شکار رہتی ہے ''تیرے لیے اس زمین پر لعنتیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم و اندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔''

سلویٰ چلی گئی۔ اب پھر وہ نرس نو تھی۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تھے۔ تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے اظہار خلوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی۔ بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پناہ کرتے تھے۔ چپت کھاتے تھے، کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے ورنہ وہ شہید ناز ہو چکے تھے۔ یہ حسن زنگار ترک ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق رد بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سینی ٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر جمی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انہیں لگاؤ تھا، وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور مصر جی بھی۔ مگر مصر جی یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے، نرسوں سے مل مل کر روئے بھی مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سینی ٹوریم کا ڈاکٹر نسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ ذی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامن حیات ہے۔ ارادہ زیست بقا کا سب سے زبردست سامان ہے بد دل، اکتائے ہوئے فکر مند مریض اپنی قبر خود کھودتے ہیں۔ اپر وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادہ بقا فکر مندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس حسین کرہ کے نیرنگ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکساتے تھے اور بدیوں کو۔ ان کے لیے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مر جائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک وہمی لاشے ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا پرتو تک کہاں!

وارڈ میں جو نئے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے۔ ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ نقی، میں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور مارواڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت، بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مارتھا سے لڑائی ہوئی، کل فیمی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں، ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری صحت گاہ میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں ایشری کو کسی سے رقابت نہ تھی لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی

کرے۔ بس وہ اتنا کہتی "چپ کرو!" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سینی ٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا اربعہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئرسی وارڈ اوّل آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہیے۔ کبھی انسان غم منا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد مسوڑ اور چونچال ہوگئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا۔ ہنسی ہنسی میں وہ ناگفتنی باتوں کا تذکرہ کرڈالتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی کرسچن کالونی کے قریب مویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات کا تذکرہ کرتی اور ہنس پڑتی تھی۔

عین جوبلی کے روز دس بجے کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلو کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی، لانبے لانبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں اور بیزار و باغی جذبات سے تلملایا ہوا چہرہ، لانبا قد، دوہرا بدن، مگر بیماری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سارے سینی ٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی۔ ریڈیو بجا کر کھیل کود ہوا، نرسوں نے گانے گائے، غرض بڑی تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی اچانک علالت کے سبب ڈولی کی نائٹ ڈیوٹی ہوگئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی بہلا کر وارڈ واپس آئے تو پہلو کے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب لوگ افسردہ ہوگئے مگر ڈولی ادھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی حسرتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جانفشار خوں فشانیوں کے عادی بھی ہوگئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کرکے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بے قرار سی معلوم ہوئی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دیئے۔ میری نیند غائب ہوگئی۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یک بیک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی سیاہ آندھی تھی، روح تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بڈ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انہوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کروٹیں لینی شروع کیں۔ لوہے کا اسپرنگ دار بڈ رد بلا کے لئے طلسم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سیناٹوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ بھورکوائے وارڈ کے چوبے جی نے ڈولی کا سارا راز ہر دور کر دیا۔ برہمن تھے نا۔ بس پی کر بھی آنند ہی ہوئے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کی ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سہا دیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی نیتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے چوبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے لڑنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انہیں انتقام کے لیے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈولی سے سخت لڑائی ہوگئی۔ اس نے ایک نئے مریض خان صاحب کو بس اتنا کہا تھا۔ "کہاں چلا جاتا ہے خان؟" بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی اور

بڑھی تو اتنی کہ میں ذولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ سلسلہ کلام قطعی بند۔ ایشری اور کیتھرین نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سینی ٹوریم میں ہو گئے تھے اور نقی کو ایک سال سے کچھ زیادہ ہم دونوں اکتا گئے مگر گرمیاں درپیش تھیں اور اس موسم میں سینی ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملے کا ارادہ کیا۔ کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوبلی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینی ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے ذی فراش رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنسنے لگتا اور وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرسش دوستانہ کے تحت آئیں۔ اس کا کوئی ماموں اسے ہر ماہ روپے بھیجتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی نہیں، یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا...... ''اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، جینے کی مصیبت، گرنے کا ڈر، سل کے مریض کا علاج! سینی ٹوریم میں جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! ہونہہ! آرام واستراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوا اور مکانظ اور کچھ فکر نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری سے پہلے ہمارے پیٹ بھر ہی تو رہے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کہ بیماروں کا علاج کرنا۔'' اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا ''جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس، فورڈ کے پاس، برلا کے پاس۔ جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر مرد کو ہلاک کر دیا جائے۔

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ وہ نہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈھتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا۔

''اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔''

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس دلاری اور کیتھرین کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ دلاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے لٹائے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی ابکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرین نے اسے آ کر اپنے خاص انداز سے کہا۔ ''کرن بابو!'' تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرین کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور نقی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلوانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جریان خون کے دورے کے وقت وہ باولا ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک سنتا یا کیتھرین کی مان لیتا۔ کیتھرین نے مجھ سے دوپہر کو آ کر کہا:

''انور بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ رسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجئے گا۔ مجھے اسی وقت کرن سے بجلی کے کوندے کی طرح رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرین کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہرحال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرین نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرین کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرین کرن کے لیے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پہ بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اے۔ پی۔ وی، ہارس سیرا، کیلیشیم، امیٹین، مورفیا اور کوگورڈ کے انجکشن دیئے مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور نقی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بیک جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے رقیق غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی رقت اور لجاجت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے منہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنائی کو جاذب سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کالا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے فوراً اپنے پیسوں سے کرن کے لیے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائی۔ وہ بے پایاں ممنونیت کی نظروں سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''تم خدا سے بہت بہتر ہو۔''

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سبھوں کو حیرت ہوئی اور کیتھرین کو حیرت کے ساتھ ناقابل بیان نوعیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرین پر فقرے کسنے لگا۔ وہ قسمیں کھاتی اور صرف اتنا کہتی ''وہ پاگل ہے، بیچارہ کرن۔'' اس بیچارے سے مجھے چڑ تھی مگر حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی نادان مگر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھوٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرین سے، مجھ سے اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا پر جیلی کو یاد کر کے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ ''وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی۔ تمہاری خالص محبت تھی۔ حیوانی، بے عقل، آزاد، مہیب مگر پیاری اور اندھی محبت پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرین۔'' اس نفرت کے باوجود کیتھرین کرن کو چاہتی ہی رہی۔ وہ اس کے لیے کڑھتی تھی کہتی۔ ''ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوئے ہیں۔''

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرین کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی مجنونانہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچی تھی یا اس کی بے پناہ پرشور ذہنی قوت کے سبب۔ وہ اب میرے پاس آ آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کر پائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح تلملاتا رہا۔

گرمیوں میں سل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں لیکن کچھ تو تھیں ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جاسکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی شش و پنج کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کسے ہٹایا

جاتا۔ وہاں والوں کی رگوں میں بھی تو خون تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر موقع ملتے پر ان بیش قیمت ہستیوں کو اسے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، نقی اور جونیئر وکیل صاحب کو بیک قلم ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی، بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے مگر جون کے مہینے میں سینی ٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آ گئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا وہ پہلے، بہت خوش ہوا پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ رونے لگا وہ میرے پاس آیا اور لپٹ گیا۔ ''انور بھائی تم بھی چلو نا۔ گھر جائیں ہم انور بھائی؟ وہاں اے۔ پی کون دے گا؟ جاڑے میں جاتے یہاں سے۔ ساڑھے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بڈ پر ہو گئے۔ گوپال نے اپنے خاص گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں۔'' پھر ہم سب لوگ، نقی بھائی، آپ، پیر مغاں، مصرجی، بھائی حاذق، پربھو بابو، انور بھائی! پانچوں آدمی چلے شہر کے کنارے کرایہ کا مکان لے کر رہیں۔'' اس نے اس پروگرام کی وقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سینی ٹوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کو نوع در نوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا رس رہا ہو۔ نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ ایشری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے روز جا رہے تھے۔ ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ دکھ درد، امید و ناامید، خوشی اور موت، رفاقت اور غمگساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں دعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لوئرسی وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے مگر اس ناقابل بیان مسرت کے ساتھ شکست رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینی ٹوریم کی رفاقت بھی میدان جنگ کی رفاقت سے کم نہیں:۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا۔ کتنی ناامیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی۔ کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا۔ مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں! تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی۔ وقتی ہی سہی۔ فتح کے احساس سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر دانے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکی میں پیس لیتا ہے۔۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری، نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی۔ جیسے نقی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہو جسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لیے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو۔ وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

''اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی۔''

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور میں رہ گئے۔ نو مریض اور تھے پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں لگ

ہا تھا۔ بیزار اکتایا ہوا اور کچھ خائف۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر۔ کیتھرین نے میری بڑی دل دہی کی لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکا وتنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ آنی جانی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک۔ ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھتے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گزر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے۔ سراسر فریب مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرین نے دو دن کے لیے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ سچ ہے کوئی جنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ صال داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریب احساس ہے۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرین کو صاف کہہ دیا" دھوکا دینے سے کیا فائدہ؟ آپ کرن کو چاہتی ہیں، چاہیے۔"

وہ بگڑ گئی۔ "چاہتی تو ہوں مگر...... اور آپ کتنے تنگ نظر، سنگ دل، بدظن اور نا اعتبار ہیں۔"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھے کہے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ ستم میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا۔ میں تلملا اٹھا۔ کیتھرین نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کھچی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انہیں کیتھرین کے ہاتھ میں لوٹا دینا چاہا، پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر جھنجھناتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے پٹک دیں اور ٹ آیا۔ کیتھرین بپھر گئی اور میں نے واپس ہوتے ہوئے یہ جملے سنے:

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ڈ۔ کس پر ناز کرتے ہیں۔ مغرور آدمی! میں کسی کو بیاہتا نہیں ہوں۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے......

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی تسکین نہیں۔

کرن کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صبح کو میرے منہ سے خون آ گیا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا یہ کرہ سارے سامان حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح ن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلاء تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی وجیں مجھے ڈھانپنے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مسلسل ایک سال تک بُنا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانہ حیات کو نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی بسنت، بہار تازہ کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پر فریب تمنا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت!

زندگی کی نیرنگی نا امیدیوں میں بھی امید کے بت تراش لیتی ہے۔ یہ کیفیت گزر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شاید کیتھرین یوں

واپس آ جائے، شاید روایتی خون، ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے، مجھے مسرت ہوئی۔ میں نے زہر سے امرت بنالیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے وہ ہر آن اپنے کو بچوانا چاہتا ہے اور اس کے لیے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے۔ خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذت آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی بار بستر کر دیا گیا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے سل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوئے سوئے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پرانے زخم میں فائبروسس ہو چکی ہے، نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آ گیا ہے۔ یہ گزر جانے والا دور ہے۔ گھبراؤ مت!" نرسوں نے بھی عیادت کی، جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گزشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آتا رہا تھا۔ تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لیے روحانی، مابعد الطبیعاتی عالم کی طرف رخ کیا۔ اب کے میرا دل بنجر تھا، بالکل بنجر۔ بالکل بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے ہوا سی عشرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں پھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے۔ پائیدار اشیا، تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، وزنی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ، عورت ہے۔ مادہ کا نقطۂ کمال، جسم کے حسن تعمیر کا عروج جمیل۔ اس لیے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا جو سامان بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگتی۔ میں سوچتا کہ نرا گاؤدی ہوں۔ بدن کی رومانیت مجسم اور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں کے جالے میں الجھے رہنا بے بسی، بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے نتی اور اس کی قوت اقدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی و کارنا کردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا الم ناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا، سننا، دیکھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔ عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بیک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا، میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ، اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرین اس سال میں تو ضرور مجھ سے من ہی جائے گی، ٹوٹ گئی۔ کیتھرین بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرین کتنی خوددار و خود بین تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈولی جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا، جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی، وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری

سسٹر، آٹھ وارڈبوائے، چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سل ودق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمارداروں کے، وارڈوں کے چاروں طرف باغ، جنگل اور سرخ سرخ مورم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پرشور پہاڑی ندیاں تھیں۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کے ساتھ خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی ایکس رے کے لیے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی صبح سے غمگین اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا۔ کہنے لگی:

''بڑا بنتا ہے۔ ایکس رے کرنے کے بہانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرے اور دوسروں سے جلتا ہے۔''

ڈولی نے غصے کی بے خیالی میں یہ جملے ادا کیے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش، وہ کہہ چلی۔

''نرسیں اگر ایسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔''

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبہ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو ''ڈے آف'' ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کوارٹر میں دو دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں، ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں، طعنہ وطنز، چھیڑ چھاڑ اور کبھی جھومر کے گیت:

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیاں
سردتا کا ہے بھول آئے پیارے نند دیا

اور غزلیں:

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیمانہ

سیاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کئی کئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوئی۔ جوانی، عورت، بیوی اور ماں، ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے ناآسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا۔ لطافت مٹی نہ تھی۔ روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہوگی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لیے اپنے لب ورخسار ارزاں کر دیئے اور یہ مسلول سل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل ودماغ میں ہضم کر جاتے تھے۔ ''مثبت'' مریض گھمنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دیویاں بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیرت کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی، ٹی۔ بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی۔ بے حقیقت ہو جاتی تھی جیسے ملا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے اسپیوٹم فلاسک میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مصر جی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

''بھائی تم بی بی اور نے بی (فیبی) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو، میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔''

میں نے کہا تھا۔ ''سیکی بھی تو ہم قافیہ ہے، اپنی غزل کے لیے آپ اسے استعمال کیجئے'' بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انہیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آ گئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید، ہولی سب تیوہار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر لیا کرتے تھے۔ نقی کی صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آ گیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور نقی بہت قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں ''سارس کا جوڑا'' کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مصر جی وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لیے بلا لیے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اکرام نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلوا بھی بھیجا مگر ہم لوگوں نے تاب مقابلہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے جنس لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقع پر ہم لوگوں نے ڈراما کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان برپا کرتا ہوا آیا۔

نقی لوئر سی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمہ شیریں کی طرح تھیں۔ صنف نازک کے لیے دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر ایشری کی جراتوں کے سامنے بقیہ سب عقبی زمین کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی، ہر درخت پر چڑھ کر پھل کترنے والی مگر چوری چوری یہ لے اور وہ بھاگ۔

ایشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا اور دل ہی کے لیے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔ ''مجھ سے کسی کا کڑھنا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو۔''

ایشری نے میرے سامنے ایک بار جھولے کے سائے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرین ایشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی اس کی فتوحات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا

ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب وحجاب کا اتنا گوشہ وہ چنکیوں سے اراد تاً ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مائگی ار مانگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرین نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور رازدرانہ انداز کی فطرتاً تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک ایشری کی ذات میں اس کو وہ ٹائپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سنی ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ ایشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی۔ مگر کیتھرین نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا۔ ''ڈارلنگ!'' اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرین نے مجھ سے شکوے کئے ''آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھابی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے......'' کیتھرین نے اپنی سنجیدہ، شیریں، لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی تھم تھم کر ابلنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نوخیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی تھیں۔ اس روز بڑے صاحب نے بھی رقابت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا ''نغمہ شب'' گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لیے تیار ہیں۔ وہ سب کی سب وردی برطرف کئے حسین و آرزو خیز ساریوں میں لپٹی، جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقص مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایشری طوفان وسیلاب تھی۔ کیتھرین نے اپنی فطرت کا نقاب الٹ دیا تھا۔ وہ بھی ''کرسمس ایو'' میں بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک سپردگی نہ تھا۔ پوری وارڈ میں کہربائی لہر دوڑ گئی۔ معمر وکیل صاحب (جنہیں ہم لوگ پیر مغاں کہتے تھے) سے لے کر غلام ربانی تک لوگ تلاطم محسوسات میں ڈانواڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اٹھے نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اف اسی وارڈ کے ممکنات اور مواقع کتنے محدود تھے ہمارے دل میں اپنی جبینیں اور ''اے وارڈ'' کی خلوتیں انفرادی شان میں آسودہ کھنک رہی تھیں۔

''نرسیں بڑے صاحب کے یہاں ''کرسمس ٹری'' بنانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا...... ہاں!'' وہ ایک لوچ دار آواز فضا میں لہرا کر دلوں میں اتر گئی۔

''اوہ......رے......ے! انہیں سو کیسے جائیں گے۔ بوا تم بھی تو جان کے بنتی ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی انہیں؟ ذرا مصر جی کو تو دیکھو......''

ایک رہزن تمکین ہوش نے دکھتی ہوئی رگ چھولی پھر جلوۂ برق فتسم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور نفیس کو چھیڑتی ہوئی سب نرسیں یوں چلی گئیں، جیسے آتش بازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک بیک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارہواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ بائیس کو وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم دسوں کی نظریں خالی بڈ پر جا کر ہم آغوش ہوئیں۔ خاموش ماتم کی حالت میں پر بیتی آپ بیتی بنی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب ہمدردانہ انداز میں چپ چپ سے رہے۔

ہم اس اندوہ بلا سے پناہ چاہ رہے تھے اور انتقاماً ہم سارے جہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ ''پیر مغاں'' مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر سب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے جسم کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دیئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے میں بھی بلند آواز سے گفتگو کی، بے ہنسی کی ہنسی ہنسے اور نرسوں کا اتنے پہلو اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ان میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین ''نغمۂ شب'' اچانک طور پر لوئر سی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز ا ہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے الجھے ہوئے بال درست کر لیے۔ نرسیں ہارمونیم پر کرسمس کرول گاتی، چلیں کرتی، لڑکھڑاتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ آ گئیں چیت کی سنکتی ہوئی ہواؤں کی طرح، شباب کی امنگوں کی مثال۔ کچھ دیر کے لیے نغمے رک گئے، خندۂ بیباک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ بداماں خاموشی کا ترنم زندہ سکوت کی ابدی لے آغوش وجود میں تھرتھرا رہی تھی۔ اس کے قبل کہ بڑھ کر کوئی بجلی کا بٹن دبائے بہت سی حسرتیں پوری ہو گئیں، بہت سی آرزوئیں جوان ہوئیں، کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت ناکردہ گناہ حسرت کی داد دینے کے لیے دردناک مضحکہ کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود جرأت رندانہ پر تلا ہوا تھا۔ باہر سطح مرتفع پر چلنے والی تیز ہوائیں سرد، بوڑھے خاموش، گہرے نیلے آسمان کے سائے میں الھڑ دوشیزاؤں کی طرح لغزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں مائل انحطاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے بھک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ ڈولی اور نقی کے درمیان ایک سیکنڈ میں تھوڑی سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی قماش بنے اور بکھرے۔ نغمے پھر بلند ہوئے ہارمونیم ایشری بجا رہی تھی اور سالومی نے فادر کرسمس، کا سوانگ بھرا تھا۔ سرخ پاجامہ، سرخ عبا، نیلی اونچی خرطومی ٹوپی اور سفید لانبی داڑھی۔ ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے'' پیر مغاں'' نے بھڑ کر فادر کرسمس، سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھومر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ ''پیر مغاں'' نے ایشری کے گلے سے بندھا ہوا ہارمونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن بڑھانے کی مضرت بھولی نہ تھی۔ معمر وکیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائے اور رات کی پریاں مجسم غزل الغزلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلوؤں کے خیر مقدم میں عرض نغمہ اور گذارش رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے روز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں، صحت گاہ کی زمین سے زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوڑھے کرسمس نے سینا ٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر مجرمانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں ہسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے ''پیر مغاں'' کی شادی تفریحاً

''قادر کرسمس'' سے کردی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر ''مدر کرسمس'' تھی۔ ''پیر مغاں'' اے میری گھر میں کے اصول سے میری ''وارڈ میں'' کہنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر میری سالی بن گئی اور کیتھرین نقی کی ''بھابی'' تھی۔ اس نوع کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ سند باد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح ''صحت گاہ'' کے صحرائی جزیرے میں بیٹھے سنسار سے الگ تھلگ انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لیے بری بھلی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لاانتہا حسرت تعمیر، بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لیے ''ڈے آف'' میں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی اور دل آویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ پہلے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انہیں حریری رومالوں اور عطر وسینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد رومال اور سینٹ تناسخ کے چکر میں پڑ کر بسنی روٹی اور پڈنگ بن گئے۔ استمرار حیات کے لیے روز مرہ کی واقعیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا ''نقی بھائی، وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی...... تب بھائی انور ہم جا کر پھر اسکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟'' اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہتا: ''مگر پوڈنگ اور بسنی روٹی اور کٹوبوا کے گیت۔ طبیعت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے ہے نا؟ پھر ہم سل کے مریضوں سے کون گھل مل کرے گا؟ سانپ سے کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹوبوا کا پریم کہاں ملے گا؟'' نادان اور پرارمان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لوئرسی وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چوکھا تھا۔ پربھو بابو اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے وارڈوں سے ہم سب لوگ زیادہ رقابت کرتے تھے۔ وہ سل و دق کے ہلاہل میں نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر سمیت کو گوارا بنانے کے لیے بے چین تھے۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ یسوع مسیح کی محبت، برج اور کیرم کے کھیل یا نرسوں کا لوچ جو بھی زخم پر مرہم کا پھاہا رکھ دے، جس سے بھی غم غلط ہو جائے۔ ایک روز گوپال برہم برہم سائٹیل کروا پس آیا۔ اب اسے چند فرلانگ چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ رفتہ رفتہ اسے بھائی حاذق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نقی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی۔ اس بک بک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لیے مگر قہر مریض بر جان مریض۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب الجھن میں گزارا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور نقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اٹھ بیٹھے۔ ''کٹوبوا آبزرویشن وارڈ میں مہندر بابو سے......'' گوپال رک گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''مہندر بابو نے کٹو کے گال میں......'' ''اب کے اس نے بوا نہیں کہا......'' ''انور بھائی کیتھرن سے مت بولئے......'' گوپال بہت خفا تھا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی، کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔

''انور بابو مجھے ٹائی باندھنی نہیں آتی۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے۔ میں آپ سے ہی تو ٹائی کا ناٹ بندھواؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ

مسکرائی، چلبلی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرین نے بھی کار خیر کرتے وقت غالباً گوپال کو دیکھ لیا تھا۔ یہ جملے آزمائشی تھے جن کے اندر احساس لغزش نے مشتبہ پذیرائی کو امید افزا بنانے کے لیے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا۔ کیتھرین چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر راز کو وہ شرمندۂ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی۔۔

''کٹو بوا کا آج ڈے آف ہے۔ وہ شہر نہیں گئیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں۔''

ان دنوں ایشری بھی اے وارڈ کے مصنف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرین اور ایشری ان دونوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو مطلع کر دیا۔ پربھو بابو اور پیر مغاں نے صاد کیا۔ طے صرف یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرین سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف ایشری سے دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں ورنہ وہ نرسیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی۔

یہ چپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے اسٹور روم سے نقی مجوب سی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے لے جا کر کہنے لگا ''سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے۔ مگر سیلاب کو سیلاب بھی کہیں روک پاتا ہے۔ چلو کشیدگی ہو چلی۔''
ایشری کی شخصیت کی طوفان وشی نقی کی شعلہ مزاجی کو پنکھا جھل گئی۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا ''مصنف بھی کیا یاد کرے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''مگر تم ایشری کو اپنا تو نہ کر سکے۔''

''تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرین کو اپنا لیا؟'' تنک کر بولا اور کامیاب ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے واقعیت کا ٹھوس پن اور جذبات پروری کی نامرادی کا زہر پن محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ کرسمس نے ہم لوگوں کی توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور توقعات کا قیام خلش نامرادی میں بس بھر دیتا ہے اور میں ذرا مثالی بلندیوں پر اڑ کر غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی۔

دو تین روز بعد میں نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیرتے جاتے تھے۔ بادشمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطف پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق ہمدردانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کیف بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔
اچانک خوشگوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔
''پاگلوں کو دیکھو۔'' کیتھرین کی لوچ دار آواز عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم کر رہا ہے۔" یہ ایشری کی شوخ بولی تھوڑی تھی۔

میں نے کہا "آؤ ایشری! تم سے پریم کریں۔"

"واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ...... رے...... رے! دیکھو نا کنو بوا تمہیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرین میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں "کولو کیلسم" کا انجکشن دیا ہے۔ چھی! کتنا پھول گیا ہے۔ بہت بے درد ہے انور بابو......" اس نے مترحم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا...... میں بے گانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی۔

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لیے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہوا اور اپنا ہمارا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ننھی تو یتیم ہے نا اور میں...... میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جائے ٹی۔ بی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرین کے لنکس بہت کمزور ہیں...... اسی لیے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل ننھی کو ارٹر، ذرا سینک دے اسے۔"

وہ ایشری سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ تقی نے بڑھ کر کیتھرین کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا

"جس ڈالی پر گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آتی تھی وہ اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میری پوچھ کرے؟"

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرسش نے سکوت کی مہر توڑی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے گوپال والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرین نے ایشری سے کہا:

"سنتی ہے ننھی؟ میں مہندر کے حلق میں "منڈلس پینٹ" لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا انور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر رہی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانیں۔ ایشری نے ہنستے ہوئے کہا:

"اتنا جلتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ بادشمال ان کے جانے کے بعد ذری دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہیں۔

اس واقع کے تیسرے روز "پیر مغاں" صحت گاہ سے چل دیئے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انہیں پریکٹس کی اجازت دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیر مغاں" بھی ہنستے ہوئے اپنی "وارڈ فیلن" سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ کتنے درد آگیں اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گزارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غمگسار۔ ہفتوں وارڈ سونا سونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "پیر مغاں" منتخب کیا اور صحت گاہ اپنے زخم و مرحوم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سینی ٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ ہائے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں۔ پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر

رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سیر کی انہیں اجازت تو تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے۔ صحت گاہ، میں صرف ایک ہی رکشا تھا۔ وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پژمردگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جان مستقبل کا خوف بھی انہیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس دلاری رہ رہ کر روئے دیتی ہے۔ وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے بھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سینی ٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچکدار حالت ہے۔ کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے سل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے۔ اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے ہیں محاذ کا رخ کب پلٹ جائے یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لیے تو اتر کے ساتھ تمثیل وادا کاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرین اور ایشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف وکرم کی بارش کر دی اور دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرین سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ ''انور بابو! تیرہ سال کے سن سے میں مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چمک دمک کی طرف رخ کیا۔ بہت برا ہوا انور بابو!'' کیتھرین نے ایک بار کہا۔

''آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟'' میں بولا۔

''تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں؟ دوسروں کے لیے اچھی بنو، پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنی سی عزت بھی نہ دیں۔'' کیتھرین بیزاری سے کہہ اٹھتی۔

''سب تو ایسے نہیں ہوتے۔''

''کون! سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے اور مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ شادی کر لوں گی، کر لوں؟'' کیتھرین ہنسنے لگی۔

''ضرور کر لیجئے!''

''کرا دو نا!''

اسے ''کرا دیجئے'' کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس کر دو نا، کی بے تکلفی میں ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' کی حسرت پوشیدہ تھی۔ ''ہم سل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟'' میں نے یہ پھس سا جواب دیا۔

''تم نرسوں کونہیں سمجھتے انور بابو!'' اب کے بھی ''تم'' تھا۔

کیتھرین بڑی عمیق نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پرپیچ دخاردار راستوں کی طرف سامنے آ گئیں۔

کیتھرین اس نوع کی دردآشنا بات چیت کی پیاسی تھی لیکن ایشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایشری اکتا جاتی تھی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی حال اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اپنی شادکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نقی نے ایک بار ایشری سے کہا:

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

ایشری نے جواب دیا:

''کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو شکنجے میں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں۔''

نرس سلوی کو تجسس اور ادھر کی بات ادھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرین کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سنائے اور حال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرین نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر ''گوش'' وہ ہڈیوں کی ٹی۔ بی والا ذی فراش مریض ہریش چندر سبھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک، کمپاؤنڈر، ایکس رے بابو، یہ بھی اس کے گھائل رہ چکے تھے پر وہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرین نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دیے تھے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایشری کا تو یہ عالم تھا کہ نقی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر، چائے کا طشت، گرم پائجامے، مفلر وغیرہ نقی کر دیے تھے۔ ایک بار وہ نقی کا سوٹ بنوانے پر مصر تھی مگر نقی نے انکار کر دیا۔ ایشری کئی دنوں تک روٹھی رہی ہے۔ اس نے شکایتاً کہا ''آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے۔''

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ تیس سالہ میگی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے اپنا سینی ٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا، اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرہ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں روکا جیسے ماں بیمار بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایشری اور میگی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زندہ ساریاں اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نقی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میگی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سینی ٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اسکرین بھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میگی اور

نرس سوشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یہ نئی نرس سوشیلا، سلومی کی جگہ پر بلائی گئی تھی کیونکہ سلومی نوکری سے استعفیٰ دے کر ایک موٹر ڈرائیور سے شادی کرنے دلی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسری صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی لیکن مسلسل گھر پرانے گئے لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ، بڑے لوگ، خلقت تو بائبل کی بددعا کی شکار رہتی ہے "تیرے لیے اس زمین پر لعنتیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم واندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔"

سلومی چلی گئی۔ اب پھر وہ نرس کی نو تھی۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تھے۔ تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے اظہار خلوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی۔ بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پنا کرتے تھے۔ چپت کھاتے تھے کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے ورنہ وہ شہید ناز ہو چکے تھے۔ یہ حسن زنگار ترک ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق رد بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سینا ٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر جمی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انہیں لگاؤ تھا، وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور مصر جی بھی۔ مگر مصر جی یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے، نرسوں سے مل مل کر روئے بھی مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سینی ٹوریم کا ڈاکٹر نسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ ذی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامن حیات ہے۔ ارادہ زیست بقا کا سب سے زبردست سامان ہے بددل، اکتائے ہوئے فکر مند مریض اپنی قبر خود کھودتے ہیں۔ اپر وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادہ بقا فکرمندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس حسین کرہ کے نیرنگ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکساتے تھے اور بدیوں کو۔ ان کے لیے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مر جائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک وہمی لاشے ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا پرتو تک کہاں!

وارڈ میں جو نئے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے۔ ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ نقی، میں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور مارواڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت، بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مارتھا سے لڑائی ہوئی، کل فیبی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری صحت گاہ میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں ایشری کو کسی سے رقابت نہ تھی لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی

کرے۔ بس وہ اتنا کہتی "چپ کرو!" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سینی ٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا اربعہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئر سی وارڈ اوّل آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھیے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہیے۔ کبھی انسان غم منا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد منسوڑ اور چونچال ہوگئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا۔ ہنسی ہنسی میں وہ ناگفتنی باتوں کا تذکرہ کر ڈالتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی کرسچن کالونی کے قریب مویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات کا تذکرہ کرتی اور ہنس پڑتی تھی۔

عین جوبلی کے روز دس بجے کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلو کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی، لانبے لانبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں اور بیزار و باغی جذبات سے تململایا ہوا چہرہ، لانبا قد، دوہرا بدن، مگر بیماری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سارے سینی ٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی۔ ریڈیو بجا کر کھیل کود ہوا، نرسوں نے گانے گائے، غرض بڑی تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی اچانک علالت کے سبب ڈولی کی نائٹ ڈیوٹی ہوگئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی بہلا کر وارڈ واپس آئے تو پہلو کے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب لوگ افسردہ ہوگئے مگر ڈولی ادھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی حرکتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جانفشار خوں فشانیوں کے عادی بھی ہوگئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کر کے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بے قرار سی معلوم ہوئی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دیے۔ میری نیند غائب ہوگئی۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یک بیک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی سیاہ آندھی تھی، روح تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بڈ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انہوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کر وٹیں لینی شروع کیں۔ لوہے کا اسپرنگ دار بڈ رد بلا کے لئے طلسم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سینا ٹوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ بھورکوا ے وارڈ کے چوبے جی نے ڈولی کا سارا راز ہر دور کر دیا۔ برہمن تھے نا۔ بس پی کر بھی آنند ہی ہوئے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کی ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سہادیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی نیتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے چوبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے لڑ پڑنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انہیں انتقام کے لیے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈولی سے سخت لڑائی ہوگئی۔ اس نے ایک نئے مریض خان صاحب کو بس اتنا کہا تھا۔ "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی اور

بڑھی تو اتنی کہ میں ڈولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ سلسلہ کلام قطعی بند۔ ایشری اور کیتھرین نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سینی ٹوریم میں ہو گئے تھے اور نقی کو ایک سال سے کچھ زیادہ، ہم دونوں اکتا گئے مگر گرمیاں درپیش تھیں اور اس موسم میں سینی ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملے کا ارادہ کیا۔ کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوبلی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینی ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے ذی فراش رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنسنے لگتا اور وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرسش دوستانہ کے تحت آئیں۔ اس کا کوئی ماموں اسے برما سے روپے بھیجتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی نہیں، یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا..... ''اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، جینے کی مصیبت، گرنے کا ڈر، سل کے مریض کا علاج! سینی ٹوریم میں جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! ہونہہ! آرام واستراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوادار مکانات اور کچھ فکر نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری سے پہلے ہمارے پیٹ بھرے ہی تو رہے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کہ بیماروں کا علاج کرنا۔'' اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا ''جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس، فورڈ کے پاس، برلا کے پاس۔ جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر مرد کو ہلاک کر دیا جائے۔

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ وہ نہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈھتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا۔

''اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔''

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس دلاری اور کیتھرین کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ دلاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے لٹائے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی ابکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرین نے اسے آ کر اپنے خاص انداز سے کہا۔ ''کرن بابو!'' تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرین کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور نقی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلوانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جریان خون کے دورے کے وقت وہ باولا ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک سنتا یا کیتھرین کی مان لیتا۔ کیتھرین نے مجھ سے دوپہر کو آ کر کہا:

''انور بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ رسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجیے گا۔

مجھے اسی وقت کرن سے بجلی کے کوندے کی طرح رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرین کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہر حال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرین نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرین کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرین کرن کے لیے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پہ بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اے۔ پی۔ وی، ہارس سیرا، کیلسیم، امیٹین، مورفیا اور کوگوروڈ کے انجکشن دیئے مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور نقی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بیک جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے رقیق غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی رقت اور لجاجت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے منہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنائی کو جاذب سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کالا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے فوراً اپنے پیسوں سے کرن کے لیے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائی۔ وہ بے پایاں ممنونیت کی نظروں سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''تم خدا سے بہت بہتر ہو۔''

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سبھوں کو حیرت ہوئی اور کیتھرین کو حیرت کے ساتھ ناقابل بیان نوعیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرین پر فقرے کسنے لگا۔ وہ قسمیں کھاتی اور صرف اتنا کہتی ''وہ پاگل ہے، بیچارہ کرن۔'' ''اس بیچارے سے مجھے چڑ تھی مگر حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی نادان مگر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھوٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرین سے، مجھ سے اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا پر جیلی کو یاد کر کے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ ''وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی۔ تمہاری خالص محبت تھی۔ حیوانی، بے عقل، آزاد، مہیب مگر پیاری اور اندھی محبت پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرین۔'' اس نفرت کے باوجود کیتھرین کرن کو چاہتی ہی رہی۔ وہ اس کے لیے کڑھتی تھی کہتی۔ ''ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوئے ہیں۔''

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرین کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی مجنونانہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچی تھی یا اس کی بے پناہ پر شور ذہنی قوت کے سبب۔ وہ اب میرے پاس آ آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کر پائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح تلملاتا رہا۔

گرمیوں میں سل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں لیکن کچھ تو تھیں ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی کشش و پیچ کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اسے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کسے ہٹایا

جاتا۔ وہاں والوں کی رگوں میں بھی تو خون تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر موقع ملنے پر ان بیش قیمت ہستیوں کو اے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، نقی اور جونیئر وکیل صاحب کو بیک قلم ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی، بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے مگر جون کے مہینے میں سینی ٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آ گئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا وہ پہلے بہت خوش ہوا پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ رونے لگا وہ میرے پاس آیا اور لپٹ گیا۔ ''انور بھائی تم بھی چلو نا۔ گھر جائیں ہم انور بھائی؟ وہاں اے۔ پی کون دے گا؟ جاڑے میں جاتے یہاں سے۔ ساڑھے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بڈ پر ہو گئے۔ گوپال نے اپنے خاص گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں۔'' پھر ہم سب لوگ، نقی بھائی، آپ، پیر مغاں، مصر جی، بھائی حاذق، پربھو بابو، انور بھائی! پانچوں آدمی چلے شہر کے کنارے کرایہ کا مکان لے کر رہیں۔'' اس نے اس پروگرام کی دقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سینی ٹوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کو نوع درنوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا رس رہا ہو۔ نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ ایشری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے روز جا رہے تھے۔ ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ دکھ درد، امید و نا امید، خوشی اور موت، رفاقت اور غمگساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں وعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لور سی وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے مگر اس ناقابل بیان مسرت کے ساتھ شکست رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینی ٹوریم کی رفاقت بھی میدان جنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا۔ کتنی نا امیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی۔ کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا۔ مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں! تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی۔ وقتی ہی سہی۔ فتح کے احساس سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر دانے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکی میں پیس لیتا ہے۔۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری، نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی۔ جیسے نقی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہو جسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لیے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو۔ وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

''اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی۔''

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور میں رہ گئے۔ نو مریض اور تھے پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں لگ

رہا تھا۔ بیزار اکتایا ہوا اور کچھ خائف۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر۔ کیتھرین نے میری بڑی دل دہی کی لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکا و تنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ آنی جانی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک۔ ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھتے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گزر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے۔ سراسر فریب مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرین نے دو دن کے لیے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ سچ ہے کوئی جنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ وصال داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریب احساس ہے۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرین کو صاف کہہ دیا ''دھوکا دینے سے کیا فائدہ؟ آپ کرن کو چاہتی ہیں، چاہیے۔''

وہ بگڑ گئی۔ ''چاہتی تو ہوں مگر...... اور آپ کتنے تنگ نظر، سنگ دل، بدظن اور نااعتبار ہیں۔''

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھے کہے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ ستم میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا۔ میں تلملا اٹھا۔ کیتھرین نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کھچی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انہیں کیتھرین کے ہاتھ میں لوٹا دینا چاہا، پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر جھنجھناتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے پٹک دیں اور لوٹ آیا۔ کیتھرین بپھر گئی اور میں نے واپس ہوتے ہوئے یہ جملے سنے:

''مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ڈ.... کس پر ناز کرتے ہیں۔ مغرور آدمی! میں کسی کو بیاہتا نہیں ہوں۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے......

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی تسکین نہیں۔

کرن کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صبح کو میرے منہ سے خون آ گیا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا یہ کرہ سارے سامان حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح سن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلاء تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپنے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بُنا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانۂ حیات کو نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی بسنت، بہار تازہ کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پر فریب تمنا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت!

زندگی کی نیرنگی ناامیدیوں میں بھی امید کے بت تراش لیتی ہے۔ یہ کیفیت گزر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شاید کیتھرین یوں

واپس آ جائے ،شاید روایتی خون ،ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے ، مجھے مسرت ہوئی ۔ میں نے زہر سے امرت بنالیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے وہ ہر آن اپنے کو بچوانا چاہتا ہے اور اس کے لیے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے ۔ خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے ۔ اپنا خون بہا کر لذت آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں ۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے ۔

مجھے بھی بار بستر کر دیا گیا ۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں ۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے سل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں ۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوئے سوئے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں ۔ کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے ۔ تمہارے پرانے زخم میں فائبروسس ہو چکی ہے ، نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آ گیا ہے ۔ یہ گزر جانے والا دور ہے ۔ گھبراؤ مت!'' نرسوں نے بھی عیادت کی ، جی بہلایا اور تشفی دی ۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا ۔

گزشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آتا رہا تھا ۔ تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لیے روحانی ، مابعد الطبیعاتی عالم کی طرف رخ کیا ۔ اب کے میرا دل بنجر تھا ، بالکل بنجر ۔ بالکل بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی ۔ حیرت انگیز طور پر مجھے حواسی عشرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا ۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی تھی ۔ جو چیزیں پھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے ۔ پائیدار اشیاء تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں ۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم ، وزنی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے ۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے ۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے ۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ ، عورت ہے ۔ مادہ کا نقطہ کمال ، جسم کے حسن تعمیر کا عروج جمیل ۔ اس لیے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے ۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا جو سامان بقا ہیں ۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگتی ۔ میں سوچتا کہ نرا گاؤدی ہوں ۔ بدن کی رومانیت مجسم اور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں کے جالے میں الجھے رہنا بے بسی ، بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے ۔ مجھے نتی اور اس کی قوت اقدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی و کارنا کردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا ۔ یہ فطرت کا کتنا الم ناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی ۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا ، سننا ، دیکھنا اور چکھنا چاہتا تھا ۔ عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بیک وقت شاد کام کرتا ہے ۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا ، میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا ۔ مجھے اپنا ہاتھ ، اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں ۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا ۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا ۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرین اس سال میں تو ضرور مجھ سے من ہی جائے گی ، ٹوٹ گئی ۔ کیتھرین بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی ۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا ۔ مصیبت تنہا نہیں آتی ۔ غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں ۔ کیتھرین کتنی خوددار و خود بین تھی ۔

مگر اس کے خلاف ڈولی جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا ، جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی ، وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری

استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں...... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں...... اب ہمارا راج ہے بچہ''

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے...... اب نیا قانون ہے میاں...... نیا قانون!''

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ''نیا قانون، نیا قانون'' چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

''نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو...... قانون وہی ہے پرانا!''

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔



اختر حسین رائے پوری

نام : سید اختر حسین

قلمی نام : ناخدا/ اختر حسین رائے پوری/ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

پیدائش : ۱۲ جون ۱۹۱۲ء رائے پور (سی۔ پی) بھارت

وفات : ۲ جون ۱۹۹۲ء کراچی

تعلیم : ایم۔اے (تاریخ) پی ایچ۔ڈی (پیرس) سوبرن یونیورسٹی، پیرس، فرانس

ابتدائی تعلیم مولوی محمد یاسین کے مکتب میں پائی۔ ۱۹۲۸ء میں رائے پور سے میٹرک کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایف اے
علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے (تاریخ) کیا۔ بنارس یونیورسٹی سے سنسکرت میں ایم۔اے کی سطح
امتحان ''ساہتیہ النکار'' پاس کیا۔ پیرس (فرانس) یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کا آبائی وطن پٹنہ (صوبہ بہار) تھا۔ آپ کے والد سید اکبر حسین، علی گڑھ مسلم کالج اور طامس انجینئرنگ کالج رڑکی (دکن) کے فارغ التحصیل تھے، جو سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ ان کا تعلق محکمہ آبپاشی سے تھا۔ اختر حسین رائے پوری کی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوتا ہے، جب وہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ہمراہ اورنگ آباد، دکن گئے اور ''اردو انگلش ڈکشنری'' کی ترتیب اور انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد کے ادبی مجلّہ ''اردو'' کی ادارت میں ان کے معاون رہے اور رسالہ ''اردو'' میں ''ناخدا'' کے قلمی نام سے متعدد کتب و جرائد پر تبصرے قلم بند کیے۔ ہفتہ وار ''ریاست'' دہلی میں دیوان سنگھ مفتون کے نائب مدیر اور ہندی رسالہ ''وشوانی'' کے اعزازی مدیر رہے۔ ایک زمانے میں اپنا رسالہ ''جہاں نما'' جاری کیا۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء کا زمانہ یورپ میں گزارا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں واپس آ کر دو برس آل انڈیا ریڈیو میں نائب نیوز ایڈیٹر کے طور پر کام کیا، جہاں سے جون ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر بطور پروفیسر

شعبہ تاریخ ووائس پرنسپل ایم اے او کالج امرتسر چلے آئے، جہاں سے ۱۹۴۵ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے اُنھیں حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں معاون مشیر تعلیم کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔ پہلے معروف ماہر تعلیم سرجان سارجنٹ کے نائب کے طور پر کام کیا اور اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم) کی معاونت کی۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے بہ ذریعہ اسپیشل ٹرین پاکستان آ گئے۔ ان کی خدمات ان کی مرضی کے مطابق وزارت تعلیم پاکستان کو منتقل کر دی گئی تھیں، یوں ۱۹۵۵ء تک حکومت پاکستان کے نائب مشیر تعلیم، ڈپٹی سیکرٹری تعلیم اور کراچی ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۲ء یونیسکو سے وابستہ رہے اور بطور ناظم شعبہ ترقی ثقافت، یونیسکو، ان کا قیام ہیڈ آفس پیرس میں رہا۔ اسی حیثیت میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء صومالیہ اور ایران میں بھی قیام رہا۔ بعدازاں یونیسکو کی کراچی شاخ کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بینائی سے محروم ہونے تک جامعہ کراچی کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ مستقل قیام کراچی میں رہا۔ بعدازوفات، تدفین سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں ہوئی۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

ہندی افسانہ ''پراجت'' (شکست خوردہ) مطبوعہ ''مادھوری'' ۱۹۲۸ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''زبان بے زبانی'' مطبوعہ ''نگار'' مارچ ۱۹۳۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱ ''محبت اور نفرت'' (سولہ افسانے) ساقی بک ڈپو، دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۸ء

افسانے: (۱) زبان بے زبانی (۲) منزل ناتمام (۳) یوں ہوتا تو کیا ہوتا (۴) سمندر (۵) میرے خوابوں کا مندر (۶) وہ دونوں (۷) کاغذ کی ناؤ (۸) عورت (۹) بچپن (۱۰) زلزلہ (۱۱) میرا گھر (۱۲) اندھا بھکاری (۱۳) مجھے جانے دو (۱۴) موت (۱۵) مرگھٹ (۱۶) میری ڈائری کے چند ورق

یہ مجموعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا ہے۔ اردو اکیڈمی سندھ کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں بھی طبع ہوا۔ ایک ایڈیشن مکتبہ ماحول، کراچی نے بھی شائع کیا ہے۔

۲ ''زندگی کا میلہ'' (آٹھ افسانے) مکتبہ رزاقی، کراچی طبع اوّل: ۱۹۴۹ء

افسانے: (۱) دل کا اندھیرا (۲) جسم کی پکار (۳) تلاش گمشدہ (۴) بیزاری (۵) قبر کے اندر (۶) دیوان خانہ (۷) کافرستان کی شہزادی (۸) پتھر کی مورت

(اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں شائع کی پھر مئی ۱۹۵۶ء میں دوبارہ شائع کی ہے۔)

۳ ''آگ اور آنسو'' (افسانے) طبع اوّل: ۱۹۴۶ء

۴	''شکنتلا'' (از کالی داس کا ترجمہ)	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن	طبع دوم: ۱۹۴۳ء
۵	''پیغام شباب'' (از قاضی نذر الاسلام کا ترجمہ)	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد	طبع اوّل: ۱۹۳۸ء
۶	''گورکی کی آپ بیتی'' (تین جلدیں)	انجمن ترقی اردو، (ہند) اورنگ آباد	طبع اوّل جلد اول: ۱۹۴۰ء طبع اوّل جلد دوم: ۱۹۴۳ء طبع اوّل جلد سوم: ۱۹۴۵ء
۷	''پیاری زمین'' (از پرل ایس بک کا ترجمہ) (یہ ناول ''Good Earth'' کا ترجمہ ہے۔)	انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۱ء
۸	''مقالات گارساں دتاسی'' (دو جلدیں)	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد	طبع اوّل جلد اول: ۱۹۳۵ء طبع اوّل جلد دوم: ۱۹۴۳ء

یہ فرانسیسی زبان سے براہ راست ''La Lanngue Etla Literature Hindustanies En-1871-1877'' کا ترجمہ ہے۔ کتاب پر نظر ثانی ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کی۔ پہلی جلد کا ترجمہ یوسف حسین خان نے کیا جب کہ دوسری جلد کا ترجمہ اختر حسین رائے پوری اور عزیز احمد نے کیا۔ یہ کتاب دوسری بار انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔

۹	''حبش اور اطالیہ'' (تاریخ)	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	طبع اوّل:
۱۰	''ادب اور انقلاب'' (تنقید)		طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۱۱	''روشن مینار'' (تنقید)		طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۱۲	''ہندقدیم کی زندگی: سنسکرت ادب کے آئینے میں'' (ڈاکٹریٹ کا مقالہ) زیر نگرانی: پروفیسر لوئی رینو	مطبوعہ: سوربن یونیورسٹی، پیرس	طبع اوّل: ۱۹۳۹ء
۱۳	''گردِ راہ'' (خودنوشت)	مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۴ء
۱۴	''سنگ میل'' (تنقید)	مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

۲-L/۵۳ پی ای سی ایچ ایس کراچی، پاکستان۔

نظریہ فن:

''میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازعہ ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں، ارتقاء کے دو مختلف راستے ہیں۔ ان

میں ایک طاقت ترکیبی ہے اور دوسری تخریبی۔ گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی ہے۔"

اختر حسین رائے پوری، یکم اگست ۱۹۵۴ء، کراچی
(بہ حوالہ: "متاعِ ادب" مرتبہ: اظہر زیدی، مطبوعہ:
مکتبہ میری لائبریری، لاہور، طبع اول: جنوری ۱۹۶۵ء)

تلاش گم شدہ

اختر حسین رائے پوری

دوسرے درجہ کے مسافروں میں اختلاف رائے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے، چنانچہ سب نے سردار جھنڈا سنگھ کے اس اعلان کو جی بھر کر سراہا کہ بقائے حیات کے لیے جنگ از بس ضروری ہے۔ سردار جی نے سب کے سامنے کپڑے اتارتے اور چھپی ہوئی توند کا بھید اجاگر کرتے ہوئے کہا ''لڑائیاں بند ہو جائیں تو سب لوگ نامرد ہو جائیں۔'' توند پتلون کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی غبارہ کی طرح پھول گئی اور سردار جی کے قہقہوں کے اعتبار سے اس میں نشیب و فراز پیدا ہونے لگے۔

سردار جی کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی کمر ڈھیلی کرنا شروع کی اور تھوڑی دیر میں بجلی کے قمقمہ کے اردگرد منڈلانے والے پروانوں نے دیکھا کہ ڈبہ میں پلپلے اجسام کا انبار لگا ہوا ہے اور ان میں جنس اس حد تک مفقود ہے کہ اگر انہیں کاٹ کر قصاب کی دکان میں الٹا ٹانگ دیا جائے تو گاہک کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ بکرا کون ہے اور بیل کون!

سردار جی نے سونے سے پہلے گرو نام جپا اور ہاضمہ کی دوا کھائی، جس کا ردعمل ایک ہولناک ڈکار کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر تکیہ پر سر رکھ کر چشمہ کی کمانی کو داڑھی کے الجھوں سے نکال کر اپنی ڈائری کا مطالعہ شروع کیا، جس میں سرکاری ٹھیکوں اور ان کے متعلق انواع و اقسام کی چوریوں کا ذکر تھا۔

لالہ نتھومل نے سفید قمیص کے اندر چھپی ہوئی کثیف مرزئی کو اتارتے ہوئے توند کی سلوٹوں میں ایک عدد پسو کا انکشاف کیا اور چادر پر پان کی پیک ٹپکاتے ہوئے کہا ''کلکتہ میں جندگی مشکل ہوگئی ہے۔''

اوپر کی برتھ پر ایک ڈپٹی صاحب تخلیہ میں کپڑے بدل رہے تھے، کالر کا پچھلا حصہ کسی آنکھ او جھل کیل میں اٹک گیا تھا اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گردن کیوں بھنچ رہی ہے۔ اس کھینچا تانی میں ان کا چہرہ نشان حیرت بن کر رہ گیا تھا!

جب سب لوگ اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے تو سپاہی نے چادر سے منہ نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا دقت سے اس کا دھڑ اوپر اچھلا اور

پھر ایک نقلی ٹانگ ہوا میں ادھر لٹک کر روشنی میں چمکنے لگی۔ لکڑی کی یہ سڈول ٹانگ سیالکوٹ کے سرکاری کارخانے سے بن کر نکلی تھی۔ حکومت نے لنگڑے سپاہی کو اس ٹانگ کے ساتھ بیساکھی کا تحفہ دیا تھا۔ اللہ میاں کی عطا کردہ ٹانگ میں بھلا یہ رنگ و روغن کب ہوتا ہے۔ دوران جنگ میں سپاہی کی ٹانگ غائب ہو گئی تھی۔ اسے خود نہیں معلوم کہ یہ حادثہ کب پیش آیا۔ وہ خندق میں بندوق چھپائے بیٹھا تھا کہ نزدیک ایک دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھ بند ہو گئی۔ بہت دیر بعد جب ہوش آیا تو جسم ہلکا پھلکا اور ساتھ ہی ساتھ بے حرکت و ساکن ہو گیا تھا۔ ٹانگ، خندق سے اڑ کر ایک پیڑ کے ڈنڈ جا لٹکی تھی۔ سپاہی یہ دعویٰ تو نہ کر سکتا تھا کہ وہ چیز، جو الگنی پر میلے کپڑے کی طرح پھیلی ہوئی تھی اس کی اپنی وفا ناآشنا ٹانگ تھی لیکن یہ حقیقت بھی تو مسلمہ تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بلا اطلاع غائب ہو گئی تھی اور سرسامی کیفیت میں اسے گمان ہوا کہ جس طرح کوئی فاحشہ لڑکی خاندان کو تج کر آوارہ گردی کے لیے نکل جاتی ہے۔ یہ نمک حرام ٹانگ باقی بدن سے الگ ہو کر ہوا خوری کے لیے چل کھڑی ہوئی ہے۔

سپاہی نے نقلی ٹانگ اتار کر بیساکھی بغل میں دبائی اور ادھر ادھر اُچک کر اس کی سکت کو جانچنے لگا۔ باقی ماندہ ٹانگ نے کسی بیوہ کی طرح بدنما زندگی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور بیساکھی کے گدگدے ہتھے، بغلی گھونسہ کی طرح اس کی پسلی سے باز پرس کرنے لگے تاہم یہ امر ناقابل تردید تھا کہ بیساکھی نئی تھی اور اس میں سے تازہ وارنش کی بو آ رہی تھی۔

سپاہی کو نیند آ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا اور اس کے گھٹنوں پر آب حیات اس طرح سینچا کہ اس کی جڑوں سے ایک تنا اور پانچ ٹہنیاں اگ آئیں۔ ہر ٹہنی میں ان گنت ٹانگیں لٹک رہی تھیں۔ لنگڑوں کے لیے تو گویا یہ طوبیٰ کا درخت تھا جو اس سے ٹانگیں نوچ نوچ کر اپنے بدن میں جوڑتے اور پھر بچھڑوں کی طرح اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو پورب کی گہرائیوں سے سورج انگارہ سا منہ نکالے گھور رہا تھا۔ سپاہی نے جلدی سے وردی پہنی اور بے چینی سے اگلے اسٹیشن کا انتظار کرنے لگا جہاں اتر کر اسے گھر پہنچنا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کیوں کہ اب تک گھر والوں کو اس حادثہ کی اطلاع نہ ملی تھی اور اس لیے یہ سوچنا ناممکن تھا کہ ٹانگ کی گمشدگی ان پر کیا اثر کرے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ٹانگ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جسم کے ہر عضو کو کسی نہ کسی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ٹانگ بیچاری بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مٹی کے اس تودے اور اس کے گناہوں کا بار لادے ہر موسم میں بے تکان ماری ماری پھرتی ہے۔ میدان جنگ میں بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ مالک کا ساتھ چھوڑ کر اکیلی بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اتنے میں انجن نے سیٹی دی۔ ریل کی رفتار آہستہ ہو گئی اور پلیٹ فارم پر دیہاتی باجوں کا شور سنائی دیا۔ سپاہی نبو خاں نے وردی ٹھیک کر کے اکڑنے کی کوشش کی لیکن داہنے گھٹنے نے آنکھوں تک بے تار کی تار برقی سے ایسا پیغام بھیجا کہ ان میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ جب پلیٹ فارم سے بنو خاں زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا تو سپاہی ہراساں و مایوس سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کسی نے پکار کر کہا ”وہ رہے بنو خاں......ارے نیچے آؤ یار!“

پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی وہ باجے اور پھولوں کے ہار لیے اپنے سورما کی آؤ بھگت کے لیے آئے تھے جو سمندر پار سے میدان مار کر واپس آیا تھا۔

بنو خاں نے چھڑی کا سہارا لے کر زمین پر قدم رکھا۔ باپ نے گلے لگایا۔ کسی نے ہار پہنایا، کسی نے ہاتھ ملایا اور دیہاتی بینڈ نے

میں تو چھورا کو بھرتی کرا آئی رے

کا ترانہ چھیڑ دیا۔

یک بیک کوئی پکار اٹھا "بنو خاں کی ٹانگ!"

نعرے سرد پڑ گئے، بینڈ ساکت ہو گیا اور سب حیرت و ہیبت کے عالم میں بنو خاں کی داہنی ٹانگ کی طرف تاکتے رہ گئے۔

بنو خاں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "ابا یہ وہی ٹانگ ہے جو بچپن میں جل گئی تھی۔ اس کے بدلے مجھے نئی ٹانگ ملی ہے، جسے بازار میں خریدنا چاہو تو ڈھائی سو سے کم نہ ملے گی۔ جب پرانی ہو جائے تو بدلوا لو۔ کہو کیسی ہے؟"

لوگوں نے دیکھا کہ بنو خاں کی نئی ٹانگ دھوپ میں ہیرے کی چھڑی کی طرح چمک رہی ہے وہ جب چاہے اسے بیچ کر بیل کی ایک جوڑی خرید سکتا ہے گویا اس کی ٹانگ سے دو بیل بندھے ہوئے ہیں۔

لیکن اصلی یا نقلی ٹانگ کی صحیح قیمت کا اندازہ روپیوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ کسانوں نے سیالکوٹی ٹانگ کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا اور ان میں سے ایک مفکر نے رائے زنی کی! "اس میں شک نہیں کہ یہ دیکھنے میں سہانی ہے اور اسے کبھی کوئی روگ نہیں لگ سکتا۔ بنو خاں اسے بیچ کر سرکار سے کہہ سکتا ہے کہ گم ہو گئی اور اسے پھر نئی ٹانگ مل جائے گی۔ یہ کاروبار برا نہیں۔ لیکن اللہ میاں کی دی ہوئی ٹانگ کی بات ہی اور ہے۔"

گھر پہنچنے کے بعد بنو خاں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سب چپ چپ سے رہتے ہیں۔ بوڑھی ماں بیساکھی کو چھو کر رونے لگتی ہے۔ شام کے دھندلکے میں اس کے بچے کھیت کی مینڈ پر بیٹھے چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں..... "ابا! ایک جرمن کو پکڑنے دوڑے اور ایک گڑھے میں گر پڑے لیکن ان کی ٹانگ نے دشمن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس کے پیچھے دور تک نکل گئی۔"

"بھیا! آدمی ایک دوسرے کو مارتے کیوں ہیں؟" بھائی نے اپنے ننھے سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا! "میں کیا جانوں بس اتنا معلوم ہے کہ لوگ روپیوں کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ جو سپاہی جتنے زیادہ آدمیوں کو مارے اسے اتنا ہی زیادہ انعام ملتا ہے۔ میں بھی بڑا ہو کر سپاہی بنوں گا اور بندوق سے بہت سے دشمنوں کو ماروں گا۔ سب سے پہلے تو جلو کی جان لوں گا جس نے آج مجھے گلی میں پیٹا۔"

بنو خاں کے ماں باپ جب مل کر کنوئیں کی جگت پر بیٹھتے ہیں تو ان کی گفتگو کا موضوع اکلوتے بیٹے کی گم شدہ ٹانگ ہوتی ہے۔ بیٹے سے زیادہ انہیں اس کے گم ہونے کا دکھ ہے۔ دونوں نے مل کر اسے پیدا کیا اور پالا۔ اب جو وہ پھولنے پھلنے لگی تو بنو خاں اسے سمندر پار کے کسی دیس میں چھوڑ آیا اب دیکھو کہ وہ ایک ننگے مرغ کی طرح بیساکھی کی موٹھ پر ناچ رہا ہے۔

بوڑھا اپنے رندھے ہوئے گلے کو صاف کر کے کہتا ہے "بڑی بی پیر جمال شاہ کی درگاہ پر منت مانو شاید بنو خاں اچھا ہو جائے۔"

بنو خاں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سارا گاؤں کیوں اس کی صحیح سالم ٹانگ کو نہیں بلکہ اس کی بے وفا بہن کو ڈھونڈھتا ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی بیساکھی کا رعب بھی اس کے رنگ کے ساتھ کم ہونے لگا اور ہرایرا غیرا اسے دیکھ کر پہنچی ہوئی آواز میں یہ کہہ اٹھتا "ایسا اچھا جوان بے کار ہو گیا۔"

بنو خاں کے دوست جب نہر میں تیرتے یا گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر طرارے بھرتے نکل جاتے تو اس کے مجروح گھٹنے کے ڈنڈ پر کھجلی سی ہونے لگتی اور وہ بے اختیار چاہتا کہ پانی اور ہوا کی لہروں کو چیرتا ہوا نکل جائے۔

لیکن سب سے کٹھن گھڑی وہ ہوتی ہے جب اس کی بیوی اس کے گھٹنے پر مالش کرتی ہوئی پاس پڑوس کے نوجوانوں سے دن دیہاڑے

آنکھ ملاتی ہے اور اس کی ہر ادا پکار کر کہتی ہے کہ مجھے زندگی کا رس کون دے گا۔ چلنے میں وہ لڑکھڑاتی ہے گویا اپنے بوجھ سے آپ دبی جا رہی ہو۔ اس کی آنکھیں سامنے نہیں بلکہ دائیں بائیں دیکھتی ہیں اور جب وہ کھیت میں جاتی ہے تو دھان کی بالیاں سر ہلا کر جتاتی ہیں کہ اندر...... اس جھرمٹ میں تیرا یار مہر چھپا بیٹھا ہے۔ جب وہ کھیت سے باہر نکلتی ہے تو اس کے کپڑے گھاس کے تنکوں سے منڈھے ہوئے ہوتے ہیں......

بنو خاں یہ سب سمجھتا ہے اور اکثر اس کی بیساکھی بیوی سے دو چار بھی ہوتی ہے لیکن اس کے جوان بدن کی اینٹھن کسی اور قسم کی چوٹ چاہتی ہے۔ وہ مطلق پروا نہیں کرتی اور پھر اپنے محبوب مشغلہ میں مصروف ہو جاتی ہے۔

بے چارہ بنو خاں اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ ایک ٹانگ کی کمی یا زیادتی کتنا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے وہ کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہیں پھر بھی سب اسے رحم و کرم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی اس سے فطری تعلق نہیں رکھتا۔ ماں باپ ترس سے، بیوی ڈھٹائی اور بے حیائی سے اور اس کے بچے خوف و ہراس سے پیش آتے ہیں اور گاؤں سے ہمیشہ ایک یہ بھنبھناہٹ سننے میں آتی ہے۔ ''بنو خاں کی ٹانگ !!''

رفتہ رفتہ گم شدہ ٹانگ کا خیال بنو خاں پر جن کی طرح سوار ہو گیا اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے وہ اسی دھیان میں رہنے لگا کہ دوبارہ ٹانگ پیدا کرے اور اپنی بیوی کی سرکشی کو اس کے تلے کچل دے۔ اس کے عضو عضو کی سرمستی کو اس سے روندے اور پوچھے کہ اب کیا حال ہے۔

رات کا وقت تھا، اندھیری رات، بنو خاں بخار کی حالت میں برآمدہ میں پڑا ہوا تھا اور سب گرمی کے ستائے ہوئے باہر سو رہے تھے۔ یک بیک بنو خاں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ دور کھیت کے پاس ماچس کی روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ اس اشارہ پر اس کی بیوی چارپائی سے اٹھی آس پاس اچھی طرح دیکھا اور دبے پاؤں چل کھڑی ہوئی۔

بنو خاں دم بخود دیکھتا رہا یہ عورت ایک غیر مرد سے ملنے کیوں جا رہی تھی۔ مہر...... وہ آوارہ جس کے پاس گھر ہے نہ زمین۔ اس کے پاس کیا ہے جو بنو خاں کے پاس نہیں۔ آخر وہ کیوں بازاری کتیا کی طرح اس کے پیچھے پھرا کرتی ہے۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ یہ کرشمہ محض ٹانگ کا ہے۔ وہ جنس نایاب جو اس کے پاس سے کھو گئی۔

بنو خاں نے اٹھ کر اندر کی کوٹھری سے گنڈاسہ نکالا اور آہستہ آہستہ...... گویا میدان جنگ میں دشمن کی ٹوہ لینے نکلا ہو...... اسی روشنی کے نشان پر چلا قریب آ کر اس نے چھڑی پھینک دی اور زمین پر رینگتے ہوئے بڑھنے لگا۔

ہر طرف خاموشی تھی۔ بس جامن کے پیڑ کے نیچے کسی کے ہانپنے اور کسی کے کھل کھلانے کی آواز آ رہی تھی۔

بنو خاں کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اسے فوج کے وہ سب داؤں گھات یاد آ گئے جو شب خون مارتے وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں درندوں کی سی چمک آ گئی اور اس نے اندھیرے میں وہ دیکھا جو نہ دیکھنا چاہیے تھا۔

اس کے گنڈاسے کا بھرپور وار مہر کی داہنی ٹانگ پر پڑا اور وہ ران سے کٹ کر الگ ہو گئی۔ ایک دہشت ناک چیخ سے فضا گونج اٹھی۔ رقیب کی خون آلودہ ٹانگ بنو خاں نے اٹھائی اور اپنے زخمی گھٹنے سے باندھ لی۔

اور جب گاؤں والے وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مہر خون میں شرابور بے ہوش پڑا ہے، عورت ڈر کے مارے بے دم ہو گئی ہے اور بنو خاں وہ ٹانگ باندھے پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے!

O

اختر انصاری (دہلوی)

نام	:	امجد اختر
قلمی نام	:	اختر انصاری/ اختر انصاری دہلوی
پیدائش	:	یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء بہ مقام بدایوں، بھارت[1]
وفات	:	۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء بہ مقام علی گڑھ[2]
تعلیم	:	ایم اے (اردو) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۴۷ء
		بی۔ ٹی ٹیچرز ٹریننگ کالج، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۳۴ء

پہلے قدیم اینگلو عربک ہائی سکول، دہلی اور پھر سینٹ اسٹیفن مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۴ء میں میٹرک اینگلو عربک ہائی سکول، دہلی سے کیا اور بی۔ اے (آنرز) تاریخ، سینٹ اسٹیفن مشن کالج، (دہلی یونیورسٹی) سے ۱۹۳۰ء میں کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے لیکن بہ وجوہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ ۳۲۔۱۹۳۱ء میں قانون پڑھنا شروع کیا لیکن بوجوہ یہ سلسلہ بھی ترک کر دیا۔ بی۔ ٹی، ٹیچرز ٹریننگ کالج علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں کرنے کے بعد وہیں سے ۱۹۴۷ء میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

اختر انصاری دہلوی کا مولد بدایوں ہے لیکن اُنھوں نے وہاں زندگی کے محض چند ماہ گزارے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ بدایوں سے زیادہ دہلی کو اپنا وطن خیال کرتے تھے۔ ان کے والد ڈاکٹر محفوظ اللہ دہلوی پنجاب میڈیکل سروس کے رکن تھے اس لیے زندگی کے ابتدائی تین چار برس اختر انصاری نے پنجاب کے مختلف شہروں میں گزارے۔ اس کے بعد ان کے والد دہلی منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں اختر انصاری تین برس کے بچہ تھے، وہیں ہوش سنبھالا اور ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ جب پانچ برس کے تھے تو والدہ کا انتقال ہو گیا۔ لگ بھگ ۱۹۲۸ء میں ان کے والد، دہلی میں اسسٹنٹ سول سرجن رہنے کے بعد مستعفی ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔

اختر انصاری کی طبیعت نصابی کتابوں سے ہمیشہ باغی رہی۔ بدرجہ مجبوری امتحانات دیتے اور پاس ہوتے رہے۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان باقاعدہ تیاری کے ساتھ دیا اور امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں نثر نگاری کی طرف راغب ہوئے اور افسانہ نگاری شروع کی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سٹی ہائی سکول میں ٹیچر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں لیکچرر کی حیثیت میں تقرر ہوا جہاں سے ۱۹۵۰ء میں ٹیچرز ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے اور ریٹائرمنٹ (۱۹۷۱ء) تک وہیں رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ ہی میں مستقل قیام رہا اور تادم مرگ ادبی مشاغل کو جاری رکھا۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، علی گڑھ میں تھے جب ۷۹ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" مطبوعہ: ۱۹۳۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

١ "نغمۂ روح" (قطعات، غزلیات اور نظمیں) سول ایجنٹ، صدیق بک ڈپو طبع اول: ۱۹۳۲ء
(یہ مجموعہ دوسری بار ۱۹۳۴ء میں طبع ہوا۔)

٢ "اندھی دنیا اور دوسرے افسانے" (۲۳ افسانے) مکتبہ جہاں نما، دہلی طبع اول: ۱۹۳۹ء
(۱) "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" (۱۹۳۴ء) (۲) ستارہ (۱۹۳۵ء) (۳) یوں بھی ہوتا ہے (۱۹۳۵ء) (۴) اسکول (۱۹۳۶ء) (۵) اٹھارویں صدی کا ظلم (۱۹۳۶ء) (۶) ہسپتال (۱۹۳۶ء) (۷) متمدن دنیا کے غیر متمدن انسان (۱۹۳۶ء) (۸) بانو (۱۹۳۶ء) (۹) ایک شام (۱۹۳۶ء) (۱۰) ننھا بھکاری (۱۹۳۶ء) (۱۱) ڈپٹی صاحب (۱۹۳۷ء) (۱۲) ایک سبق (۱۹۳۷ء) (۱۳) ایک ملاقات (۱۹۳۷ء) (۱۴) چند خطوط (۱۹۳۷ء) (۱۵) دلی کی سیر (۱۹۳۷ء) (۱۶) بھوک (۱۹۳۷ء) (۱۷) اندھی دنیا (۱۹۳۸ء) (۱۸) میں نے ایسا کیوں کیا؟ (۱۹۳۸ء) (۱۹) گرمیوں کی ایک دوپہر (۱۹۳۸ء) (۲۰) خام مواد (۱۹۳۸ء) (۲۱) جرائم پیشہ لوگ (۱۹۳۸ء) (۲۲) پروفیسر صاحب (۱۹۳۸ء) (۲۳) مظلوم (۱۹۳۸ء)

٣ "نازو اور دوسرے افسانے" (۱۴ افسانے) مکتبہ جہاں نما، دہلی طبع اول: ۱۹۴۰ء
(۱) بہ بیں تفاوت رہ (۱۹۳۴ء) (۲) ایک افسانہ جو مکمل نہ ہو سکا (۱۹۳۴ء) (۳) میرے بچوں کی قسمت (۱۹۳۵ء) (۴) نازو (۵) دوست کی بیوی (۱۹۳۶ء) (۶) بزدل (۱۹۳۶ء) (۷) وہ کہاں ہے؟ (۱۹۳۶ء) (۸) زبیدہ (۱۹۳۹ء) (۹) سید صاحب (۱۹۳۹ء) (۱۰) بیرسٹر صاحب (۱۹۳۹ء) (۱۱) کسی کی کہانی چاندنی کی زبانی (۱۹۳۹ء) (۱۲) زینت (۱۹۴۰ء) (۱۳) غم نصیب (۱۹۴۰ء) (۱۴) جیسے کو تیسا (۱۹۴۰ء)

٤ "آبگینے" (قطعات) مکتبہ اردو، حیدرآباد، دکن طبع اول: ۱۹۴۱ء

۵	''افادی ادب'' (تنقید)	نیا سنسار کتاب گھر، پٹنہ	طبع اوّل: ۱۹۴۱ء
۶	''خونی اور دوسرے افسانے'' (گیارہ افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
	(۱) خونی (۱۹۳۶ء) (۲) نفرت (۱۹۳۹ء) (۳) فریب (۱۹۳۹ء) (۴) گونگا (۱۹۳۹ء) (۵) بھول (۱۹۴۰ء) (۶) لو ایک قصہ سنو (۱۹۴۱ء) (۷) دعا (۱۹۴۱ء) (۸) شہزادہ (۱۹۴۱ء) (۹) اٹھارہ آنے (۱۹۴۱ء) (۱۰) ایک واقعہ (۱۹۴۱ء) (۱۱) دریا کی سیر (۱۹۴۲ء)		
۷	''خوناب'' (غزلیات)	محبوب المطابع، دہلی	اشاعت اول: ۱۹۴۳ء
۸	''خندۂ سحر'' (نظمیں)		اشاعت اول: ۱۹۴۴ء
۹	''ایک ادبی ڈائری'' (مختلف مصنفین کے واقعات، ادب سے متعلق)	لاہور	اشاعت اول: ۱۹۴۳ء
۱۰	''روحِ عصر'' (قطعات، غزلیات اور نظمیں)	لاہور	اشاعت اول: ۱۹۴۵ء
۱۱	''لو ایک قصہ سنو'' (۱۲ افسانے) [۳]	یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ	اشاعت اول: ۱۹۵۳ء
۱۲	''انتخاب اختر انصاری'' (منتخب کلام)	یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ	اشاعت اول: ۱۹۵۷ء
۱۳	''یہ زندگی اور دوسرے افسانے'' (۲۴ افسانے)	یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ	طبع دوم: ۱۹۵۸ء
۱۴	''غزل اور درسِ غزل'' (تعلیم)	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	اشاعت اول: ۱۹۵۹ء
۱۵	''بادۂ شبانہ'' (منتخب کلام)		اشاعت اول: ۱۹۶۱ء
۱۶	''حالی اور نیا تنقیدی شعور'' (تنقید)		اشاعت اول: ۱۹۶۲ء
۱۷	"Studies in Language and Language Teaching" (تعلیم)		اشاعت اول: ۱۹۶۲ء
۱۸	''ٹیڑھی زمین'' (قطعات)		اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۱۹	''سرورِ جاں'' (غزلیات)		اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۲۰	''مطالعہ و تنقید'' (تنقید)		اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۱	"A Background to Educational Theroy" (تعلیم)		اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۲	''پرِ طاؤس'' (منتخب قطعات)		اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۳	''چند نظمیں'' (نظمیں)		اشاعت اول: ۱۹۶۷ء
۲۴	''درد و داغ'' (مثنوی)		اشاعت اول: ۱۹۶۷ء
۲۵	''شعلہ بہ جام'' (رباعیات)		اشاعت اول: ۱۹۶۸ء
۲۶	''دہانِ زخم'' (منتخب کلام)		اشاعت اول: ۱۹۷۱ء

۲۷ "Anecdotes from life of Ghalib" — اشاعت اول:۱۹۷۲ء

۲۸ ''شعلہ بکف''(منتخب رباعیات) — اشاعت اول:۱۹۷۳ء

۲۹ ''روح نغمہ''(منتخب ہندی قطعات) — اشاعت اول:۱۹۷۴ء

۳۰ ''غزل کی سرگزشت''(تنقید) — اشاعت اول:۱۹۷۵ء

۳۱ ''دلی کا روڑا''(سوانح حیات) — اشاعت اول:۱۹۷۷ء

۳۲ ''وقت کی بانہوں میں''(طویل نظم) — اشاعت اول:۱۹۷۹ء

۳۳ ''غزل اور غزل کی تعلیم''(تعلیم) — اشاعت اول:۱۹۷۹ء

۳۴ ''تعلیم، سماج اور کلچر''(تعلیم) — اشاعت اول:۱۹۷۹ء

۳۵ ''غزل کی سرگزشت''(تحقیق وتنقید)

۳۶ ''ایک قدم اور سہی''(مجموعۂ کلام)

۳۷ ''اردو فکشن: بنیادی وتشکیلی عناصر''(تنقید)

غیر مدوّن:

مضامین اور شعری تخلیقات کے علاوہ، دو افسانے:''ازلی بدنصیب''اور''غیر مرئی انسان''مطبوعہ:''نقوش''لاہور بابت: دسمبر ۱۹۷۰ء اور افسانہ:''ایک شخص''مطبوعہ:''نقوش''لاہور بابت: جنوری ۱۹۷۹ء..... نامکمل آپ بیتی:''یادوں کے چراغ''مطبوعہ:''ادیب''اور''علی گڑھ میگزین''۔

زندگی میں مستقل پتا:

''شہرزاد''جامعہ اردو روڈ، علی گڑھ(اتر پردیش) بھارت۔

اعزاز:

۱۔ ''مودی غالب ایوارڈ''برائے اردو شاعری ۱۹۸۵ء

۲۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ایوارڈ برائے مجموعی خدمات

نظریۂ فن:

''گزشتہ چند سالوں میں میری ادبی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو میرا ترقی پسندانہ رجحان رہا ہے۔ ابتدائی چند افسانوں کے علاوہ میں نے اپنے تمام افسانے اسی رجحان کے ماتحت لکھے ہیں۔''

(بہ حوالہ:''ستاروں کی محفل''مرتبہ: بشیر ہندی، صفحہ نمبر ۲۰)

حوالہ جات:

۱۔ ''عالمی اردو ادب ۱۹۸۶ء'' مرتبہ: نند کشور کرم مطبوعہ: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی، صفحہ ۲۷۵ میں تاریخ پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۰۹ء درج ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کی تاریخ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی کے لیے اختر انصاری دہلوی کے مرتب کردہ کوائف سے لی گئی ہے۔

۲۔ ''تذکرہ ماہ و سال'' از مالک رام۔

۳۔ ''لو ایک قصہ سنو'' کے متعدد افسانے اس سے قبل ''یہ زندگی'' نامی مجموعے میں شامل کیے گئے تھے۔

۴۔ ''یہ زندگی اور دوسرے افسانے'' میں ۱۹۴۲ء سے قبل لکھے گئے افسانوں کو یک جا کیا گیا ہے۔

لوایک قصہ سنو!

اختر انصاری دہلوی

''میں بھامو میں نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان واپس آ رہا ہوں۔''

چھوٹے بھائی کے متعدد خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے، برما سے آ چکے تھے۔ میری کاہلی جواب لکھنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔ روز یہ ارادہ کرتا تھا اور روز یہ ارادہ ملتوی ہو جاتا تھا۔ جب نصف درجن خطوط جمع ہو گئے اور یوں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم وبیش دو مہینے گزر چکے، تو ایک دن غیر معمولی عزم سے کام لے کر کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھا اور تہیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا اور انتہائی چرب زبانی اور دلائل آفرینی سے کام لوں گا تاکہ بنن میاں ہندوستان واپس آنے کے خیال سے تائب ہو کر بھامو میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

بنن میاں! خدا تمہیں خوش رکھے! تم خدا کو سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو لیکن میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرمایہ داروں کے وجود سے بہت پرانا ہے۔ اس لیے بھائی! میں تو اپنا خط اسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمہیں خوش رکھے۔ نیک اعمال کی توفیق دے، اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے۔ آمین! لو ایک قصہ سنو!''ایمان کی روشنی'' پر یاد آ گیا۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں برسات کا لطف اٹھانے کے لیے مہرولی میں یوسف کے یہاں مقیم تھا۔ ایک دن قطب مینار کی سیر کو گئے۔ ہم لوگ ہانپتے کانپتے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی، اور کہیں ان کے قریب ہی کچھ برقع پوش عورتیں تھیں۔ عورتیں برقع پوش ضرور تھیں مگر ان کے چہرے بے نقاب تھے اور وہ آزادی کے ساتھ ہنستی بولتی، قہقہے لگاتی اور ''اوئی اللہ'' اور ''ہے ہے'' کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے۔ بنن میاں! ذرا غور کرنے کی بات ہے یہی عورتیں جو شہری زندگی اور معاشرتی زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارا نہ کرتیں، اب اس زندگی سے دور...... بلکہ بلند!...... ہو کر اپنے آپ کو کس قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! خیر، نوجوانوں کی اس ٹولی میں ایک بگڑے دل بھی موجود تھے۔ دو چار گوری چٹی صورتیں جو دیکھیں تو اتر آئے شرارت پر۔ اپنے کسی ساتھی سے بولے ''اماں یار! روشنی تو یہاں بہت ہے پھر لالٹینوں کی کیا

ضرورت ہے؟'' ان عورتوں کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس نے پٹ سے جواب دیا ''میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہیے۔ یہ لالٹینیں تو بہت جلد بجھ جائیں گی۔'' نہ پوچھو کیا حال ہوا سننے والوں کا۔ جتنے تھے سب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کیا منہ توڑ جواب دیا ہے بڑھیا نے! کمال کر دیا سچ مچ افلاطون کی نانی تھی کمبخت! تو غرض یہ ہے بنن میاں! کہ ایمان کی روشنی بڑی چیز ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تمہید کے طور پر تھا۔ اب کام کی باتیں سنو۔ ماموں جان کے خطوط سے اور خود تمہاری تحریروں سے یہ معلوم ہوا کہ بھامو میں تمہارا جی نہیں لگتا اور تم وہاں رہنا فضول سمجھتے ہو۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو۔ اس سے ان فائدوں کے علاوہ جو مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تم اپنا وقت آسانی سے کاٹ سکو گے لیکن تم نے میرے اس خیال کو مہمل سمجھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ پڑھنے سے تمہیں دلچسپی تھی ہی کب، جواب ہوگی۔ جب طالب علمی کے زمانے میں نہیں پڑھا اور لغو سیاسی مشاغل میں وقت ضائع کیا تو اب کیا خاک پڑھو گے۔ تم کو پڑھنے کا مشورہ دینا ایک فضول اور مہمل سی بات ہے۔ مگر بنن میاں! تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں چونکہ بھامو جیسے وحشت خیز مقام پر نہیں رہا ہوں، اور گھر سے نکل کر کہیں گیا ہوں تو انگلستان گیا ہوں، اس لیے تمہاری پریشانی اور بے لطفی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یقین مانو تمہاری دماغی حالت اور قلبی کیفیت سے اتنا واقف ہوں جتنے تم خود بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کوئی صاحب کرامات بزرگ ہوں اور غیب کا حال جانتا ہوں، بلکہ صرف یہ کہ میں بھی ان حالات سے دوچار ہو چکا ہوں اور یہ آفت مجھ پر بھی بیت چکی ہے۔ تم نے میرے لندن جانے کا ذکر ناحق کیا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا کہ تم نے میرے اوپر ایک ہلکی سی چوٹ کی اور ایک لطیف طنز سے کام لیا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی موافقت میں کوئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا میری موافقت میں کہا۔ سوچ سمجھ کر بات کیا کرو بنن میاں! کیا تم نہیں جانتے کہ جس دن میں لندن پہنچا اس کے دوسرے دن لندن سے متنفر ہو گیا اور وطن کی یاد میں آنسو بہانے لگا؟ تہذیب جدید کا یہ عظیم الشان مرکز اپنی گوناگوں رعنائیوں، دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود میری توجہ کو جذب نہ کر سکا۔ چنانچہ چند ماہ نہایت بدمزگی کے ساتھ گزارے اور ہندوستان واپس آ گیا۔ میری زندگی کے اس افسوسناک واقعہ سے تم کیا نتیجہ نکالو گے؟ یہی نا کہ پردیس میں جی کا لگنا پردیس کی رنگینی یا بے رنگی پر منحصر نہیں، اگر آپ بھامو میں رہ کر وطن کے لیے بے قرار رہتے ہیں تو لندن میں بھی آپ کا یہی حال ہو سکتا ہے۔

بات یہ ہے بنن میاں! کہ انسان جب اپنے وطن اور اہل وطن سے جدا ہو کر کسی اجنبی ملک میں جاتا ہے تو اکثر و بیشتر ''ہوم سک'' ہو جاتا ہے ''ہوم سک نس'' ایک عام مرض ہے اور بہت سے غریب الوطن اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کی تخصیص نہیں۔ نہ بھامو اور لندن یا مسقط اور پیرس کی تخصیص ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

میں جس زمانے میں لندن میں تھا اس زمانے میں وہاں ایک ہندوستانی ریستوران ''کوہ نور ریستوران'' کے نام سے جاری تھا۔ یہ ٹاٹنہم کورٹ روڈ یعنی لندن کے عین مرکزی علاقے میں واقع ہے۔ دو بھائی جو ہماری اپنی دہلی کے ایک کالستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس کو چلا رہے تھے۔ میں لندن پہنچ کر دہلی کے لذیذ اور چٹپٹے کھانوں کو ترس ہی گیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ بریانی شامی کباب، روغن جوش اور مٹیا محل کی نہاری کے مزے یاد آتے تو سچ مچ منہ میں پانی بھر آتا چنانچہ ''کوہ نور'' کا کھانا میرے لیے حقیقتاً نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن کئی میل کا سفر کر کے وہاں پہنچتا اور ان کا ڈھائی شلنگ کا ڈنر کھاتا۔ کسی اور دن جاؤں یا نہ جاؤں اتوار کو ضرور جاتا تھا کیونکہ اس دن جلیبیاں بھی ڈنر کا ایک جزو ہوتی تھیں۔ تو بنن میاں! قصہ یہ ہے کہ ایک اتوار کی شام کو میں وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس وقت میرے

سوا وہاں کوئی اور نہ تھا، کیوں کہ اصل میں ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا اور میں جلیبیوں کے لالچ میں ذرا وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ میں نے ایک نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے سبب گھورنا یا ان کے کاموں میں دخل دینا وہاں بدتہذیبی خیال کی جاتی ہے اور اصل یہ ہے کہ ان فضول باتوں کے لیے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ صاحب آئے اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے کھانے میں مشغول رہا اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک آدھ اچٹتی ہوئی نظر ان کے چہرے پر پڑ گئی ہو تو اس کی مجھے خبر نہیں۔ تھوڑی دیر میں ویٹر آیا اور یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ کے واسطے کیا چیز حاضر کی جائے ان کے پاس گیا۔ جونہی ان کے منہ سے پہلا لفظ نکلا میں چونک پڑا۔ میں ان کی آواز پہچانتا تھا۔ آواز کو یاد رکھنے میں میرا حافظہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی سے بریلی بڑے ابا کے ہاں جا رہا تھا۔ علی گڑھ سے جو گاڑی ملی اس میں بہت بھیڑ تھی۔ انٹر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے تھرڈ میں جگہ ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ آزادی کے ساتھ ادھر ادھر مڑ کر دیکھ سکیں۔ بس جہاں بیٹھے ہو وہیں بت بنے بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔ خیر بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔ علی گڑھ کے اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ ڈبے میں ایک سحر آفریں نغمہ بلند ہوا۔ کیا خبر تھی کہ مسافروں کی اس بھیڑ میں ایک جادو نوا مغنی بھی ہے۔ یہ شخص مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا اور چونکہ میری پشت اس کی طرف تھی، میں اس کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ دیکھنے کی میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے گانے کو ''سرورِ خانہ ہمسایہ'' سمجھ کر سننے لگا۔ کیا بتاؤں اس کی بھاری آواز میں کتنا درد اور کتنی گھلاوٹ تھی۔ طبیعت پر نشہ سا چھا گیا۔ سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ علی گڑھ اور بریلی کے درمیان یہ شخص وقتاً فوقتاً گاتا رہا اور اس کے گانے کی وجہ سے سفر خاصا دلچسپ رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے دوران میں میں نے اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی۔ بریلی پہنچنے کے تین چار دن بعد شام کے وقت ہم سب کوئی سات آٹھ آدمی، مکان کے سامنے چبوترے پر مونڈھے اور کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب جو اپنی وضع قطع سے ایک قلندرانہ شان کے بزرگ معلوم ہوتے تھے تشریف لائے۔ گٹھا ہوا جسم، گھنی سیاہ داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، کالا تہمد اور گہرے کتھئی رنگ کا گھٹنوں سے نیچا کرتا...... وہ یقیناً کوئی صوفی تھے۔ آتے ہی بڑے ابا سے بغل گیر ہوئے اور بلند آواز سے باتیں کرنے لگے۔ میں ان کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ میں نے کہا ''حضرت! میرا خیال ہے آپ تین چار دن ہوئے دوپہر کی گاڑی سے بریلی تشریف لائے تھے۔'' کہنے لگے، ''جی ہاں! آپ کو کیسے معلوم؟ آپ بھی شاید اسی گاڑی سے آئے ہوں گے۔'' میں نے کہا ''آیا تو میں بھی اسی گاڑی سے تھا، لیکن میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔'' ''پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس گاڑی سے بریلی آیا؟'' انہوں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔ غرض کہ ان کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو رہی اور آخر میں جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا تو وہ بہت متحیر ہوئے۔ اس کے بعد بڑی دیر تک ہم نے ان کا گانا سنا۔

تو بھن میاں بات یہ ہے کہ میں آدمی کو اس کی آواز سے پہچان لیتا ہوں۔ ''کوہ نور'' میں بھی یہی ہوا جونہی وہ صاحب بولے میں ان کو پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر نصیر تھے جو کئی سال دہلی کے سول ہسپتال میں ہاؤس سرجن رہ چکے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو وہ بھی مجھے پہچان گئے۔ فوراً بولے ''آپ دہلی سے تشریف لائے ہیں؟'' میں نے کہا ''جی ہاں'' معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب میں نے اب تک آپ کو پہچانا نہیں تھا۔'' بولے، ''ہاں، میں بھی آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔'' پھر میں نے کہا، ''بہت کافی تبدیلی ہوگئی آپ میں، دو تین مہینے

کے اندر۔" انہوں نے لندن پہنچ کر نہ صرف داڑھی منڈا دی تھی، بلکہ مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں اور میرا اشارہ اسی تبدیلی کی طرف تھا۔ ہنسنے لگے "اور آپ پہلے کی نسبت کچھ دبلے بھی معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے اپنے تبصرے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہنے لگے "جی ہاں، میری صحت یہاں آ کر کچھ اچھی نہیں رہی۔ شروع میں دو تین مہینے تو "ہوم سک" رہا اور اب اکثر قبض کی شکایت رہنے لگی ہے......" "ہوم سک" سنتے ہو بجن میاں! ڈاکٹر نصیر لندن پہنچ کر "ہوم سک" ہو گئے اور دو تین مہینے تک "ہوم سک" رہے، اس قدر "ہوم سک" کہ ان کی صحت پر برا اثر پڑا اور صورت پہچانی مشکل ہو گئی۔

مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنے گھر سے دور پردیس جا کر رہے گا تو وہ پردیس خواہ باغ ارم ہو، خواہ ویرانہ، اس کا "ہوم سک" ہو جانا تقریباً لازمی ہے۔ جو لوگ تعلیم کے لیے یا کسی اور غرض سے یورپ جاتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اس دماغی بیماری میں کم از کم کچھ دنوں کے لیے ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ یورپ کے وہ مقامات جہاں یہ لوگ جا کر ٹھہرتے ہیں، رونق، چہل پہل اور گہما گہمی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ بیماری عام طور پر دو ڈھائی مہینے رہتی ہے، اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص جلد سے جلد اس کے اثر سے نجات پانا چاہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے آپ کسی نہ کسی طرح کام میں مصروف کرے اور کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی لینا شروع کر دے۔ مصروفیت اور دلچسپی! یہی دو چیزیں ہیں جو تمہاری بددلی کا علاج کر سکتی ہیں اور تمہاری بدمزگی کو دور کر سکتی ہیں اور اسی بنا پر میں نے تمہیں لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعہ میں مصروف کر دو۔

یوں بھی مطالعہ ایک اچھی اور ضروری چیز ہے۔ اگر تم مطالعے کو اپنے مشاغل کا ایک اہم جزو نہ بناؤ گے تو کیا دیس اور کیا پردیس، ہر جگہ تمہاری زندگی اجیرن ہو سکتی ہے۔ یار دوستوں کے ساتھ ہو، حق کرنے میں انسان...... ایک معقول انسان!...... اپنی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ اس روش سے اکتا جاتا اور اس کے فضول اور لغو ہونے کا قائل ہو جاتا ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

اصل میں یہ کوئی قصہ نہیں ہے، بلکہ میں ایک مشہور مصنف کا قول دہرانا چاہتا ہوں۔ سامرسٹ مام کا نام بھلا تم نے کاہے کو سنا ہو گا۔ وہ انگریزی زبان کا ایک بہت بلند پایہ ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس ہے۔ اس نے کسی جگہ لکھا ہے کہ صرف وہی لوگ بے دلی، افسردگی اور اکتاہٹ کا شکار ہوتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف گاؤدی قسم کے لوگ ہی اپنا دل بہلانے کے لیے خارجی دنیا کے محتاج ہوتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے دنیا میں بہ کثرت لوگ ایسے ہیں جو تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی علمی افلاس اور ذہنی بے مائگی میں مبتلا ہیں۔ وہ حصول مسرت کے ذرائع ہمیشہ خارجی دنیا میں تلاش کرتے ہیں اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کے دن مہینے اور سال گزرتے چلے جاتے ہیں، لیکن کبھی اس بات کی نوبت نہیں آتی کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولیں، روح کی گہرائیوں کا جائزہ لیں اور اندرونی کیفیات کا تجزیہ کریں۔ میرے نزدیک ایسے لوگوں کی زندگی گدھوں کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔

اس لیے میرا مشورہ ہے بجن میاں! کہ تم اس بات کا بالکل خیال نہ کرو بھاموا ایک ویران، پسماندہ اور غیر مہذب مقام ہے۔ اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو اور کتابوں میں دل لگاؤ۔ تمہارے خالی لمحات کو پر کرنے کے لیے مطالعہ بہترین چیز ثابت ہو گی۔ اور ہاں، ایک بات اور ذہن میں آئی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا کے ویران، پسماندہ اور غیر مہذب مقامات اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتے۔ کیا بھاموا میں انسانی زندگی اور انسانی معاشرت نہیں ہے جس کا مطالعہ کیا جا سکے؟ کیا وہاں صبح و شام کے مناظر، بہتے ہوئے دریا، کھلے ہوئے میدان اور گھنے جنگل نہیں ہیں جن میں قدرت کی جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کیا جا سکے؟ مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ سب کچھ ہے اور کسی ذی ہوش انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہاں

رہ کر ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر دہلی، لکھنؤ اور لاہور کی ہنگامہ پرور صحبتوں کی یاد میں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرے اور اپنی محرومی پر آنسو بہائے۔ میں اس عقیدے کا انسان ہوں ببن میاں! کہ آدمی اگر قطب شمالی پر بھی جا کر رہے تو اس کے پاس بیکار اور نکما رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ وہاں بھی اپنا وقت مفید مشاغل میں گزار سکتا ہے۔ یاد رکھو دنیا میں بہت کم لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کو گھر سے باہر نکلنے اور دنیا دیکھنے کا موقع ملے۔ پھر لائق افسوس ہیں وہ لوگ جن کو ایسا موقع ملتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ مجھے بھی قدرت نے ایک مرتبہ ایسا ہی بیش بہا موقع عطا کیا تھا لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہوا، کیوں کہ میں اس وقت اتنا ہی نادان تھا جتنے کہ آج تم ہو۔ زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی جو تڑپ آج میرے اندر ہے وہ اس وقت نہ تھی۔ حیات انسانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر میرے چاروں طرف پھیلا پڑا رہا لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور آج یہ حالت ہے کہ گویا زندگی کے خشک ریتلے ساحل پر ماہی بے آب کی طرح پڑا تڑپتا ہوں۔ افسوس! افسوس! افسوس! مگر اب افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل؟ خدا سے دعا ہے ببن میاں! کہ تمہیں اس طرح کبھی نہ پچھتانا پڑے!

بات سے بات نکلتی ہے۔ سیاحت و سفر کا ایک بہت بڑا فائدہ یاد آیا۔ جن لوگوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر پردیس میں رہیں اور مختلف مقامات دیکھیں ان میں ایک خود اعتمادی اور ذہن و کردار کی ایک پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ خوبیاں ان لوگوں میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں جن کو سیر و سیاحت کے مواقع میسر نہیں آتے۔ لو ایک قصہ سنو!

ابھی پچھلے دنوں ناصر بھائی نے اپنے ایک عزیز دوست سلمانی صاحب سے میری ملاقات کرائی۔ وہ دریا گنج میں رہتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اور ناصر بھائی کو مع ہمارے چند دوسرے احباب کے ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کوٹ اور شیروانیاں اتار کر بہت دیر تک ان کے خانہ باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ناصر بھائی نے کہا ''کیوں نہ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے فیروز شاہ کے کوٹلے تک ہو آئیں؟'' سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مسز سلمانی نے بھی اجازت دے دی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور یوں بھی دریا گنج سے فیروز شاہ کا کوٹلہ دور کتنا ہے چنانچہ ہم سب جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن سلمانی صاحب نے کہا، ''ذرا ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں۔'' اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ میں سمجھا کپڑے پہننے گئے ہیں مگر ناصر بھائی اور مسز سلمانی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ ناصر بھائی مجھ سے بولے، ''جانتے ہو یہ کہاں گئے ہیں؟'' میں نے کہا، ''میں تو نہیں جانتا۔'' ''اپنی والدہ سے اجازت لینے گئے ہیں۔'' ناصر بھائی نے کہا ''اجازت! کس بات کی اجازت؟'' میں نے پوچھا۔ ''اجازت اس بات کی کہ فیروز شاہ کے کوٹلے تک ٹہل آئیں۔'' ناصر بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ مسز سلمانی بھی ہنسنے لگیں۔ میں اس مذاق کو خاک نہیں سمجھا بیوقوفوں کی طرح ان دونوں کا منہ تکنے لگا۔ ناصر بھائی نے مجھے بتایا کہ سلمانی صاحب آج تک اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ کہیں جانے سے پہلے والدہ سے اجازت لینا ہمیشہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کہ ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی ہے، کبھی دو چار دفعہ سے زیادہ دہلی سے باہر نہیں گئے، اور ہمیشہ گھر پر اپنی والدہ کے سایہ عاطفت میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔

کچھ سمجھے ببن میاں! ہر چند کہ سلمانی صاحب کی یہ عادت کہ وہ گھر سے باہر جاتے وقت اپنی والدہ کی اجازت ضرور حاصل کر لیتے ہیں کوئی بری عادت نہیں ہے مگر پھر بھی میں اس کو ان کے کردار کی بہت بڑی کمزوری خیال کرتا ہوں۔ میں ابھی ان سے صرف دو چار ملاقاتیں کر سکا

ہوں۔ اگر ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تو میں یقیناً ان کی اس کمزوری کا اور ان کی زندگی پر اس کمزوری کے اثرات کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں گا۔ مگر اس وقت بھی یعنی کسی تفصیلی مطالعہ کے بغیر اتنی بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلمانی صاحب خود اعتمادی سے بالکل محروم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف گھر سے باہر جانے کے لیے بلکہ زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم اقدام کے لیے اپنی والدہ کی اجازت حاصل کرتے ہوں گے اور والدہ کی اجازت کے علاوہ بیوی سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں گے۔ ممکن ہے بچوں کی رائے بھی لے لیتے ہوں اور کچھ عجب نہیں نوکروں سے بھی صلاح کر لیتے ہوں۔ وہ تنہا اپنی ذمہ داری پر دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اور ان کی اس خوفناک کمزوری کا سبب؟ یہی کہ وہ کبھی کسی قابل ذکر مدت کے لیے گھر سے باہر نہیں رہے، انہوں نے کبھی کوئی لمبا، دراز کا سفر نہیں کیا اور ان کو کسی ایک دن بھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آج میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور غم خواروں سے دور ہوں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا نتیجہ برا یا بھلا مجھی کو بھگتنا پڑے گا۔

اب تم خود سوچ لو بٹن میاں! کہ قدرت نے تمہیں برما کے سفر پر مجبور کر کے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا یا برا! اور یہ کہ بھامو میں تمہارا قیام ضروری ہے یا نہیں۔

تم ہندوستان آنے کے لیے بے قرار ہو۔ پوچھیے کیوں، تو جواب ملتا ہے کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں، اور اگر مل بھی سکتی ہے تو برسوں کے انتظار اور مدتوں کی امیدواری کے بعد! ماموں جان کے خطوط سے تمہارے ان خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ برابر یہی لکھ رہے ہیں کہ بٹن میاں کے لیے کوشش ہو رہی ہے اور خدا نے چاہا تو جلد کامیابی ہوگی۔ ماموں جان کا خدا بھی، وہ خدا نہیں ہے جس کو تم سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو۔ اس لیے میں بھی ان کے ساتھ اس امید میں شریک ہوں کہ جلد تمہیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی لیکن تھوڑی دیر کے لیے میں تمہاری بات مانے لیتا ہوں اور یہ فرض کیے لیتا ہوں کہ جیسا تم کہتے ہو، ویسا ہی ہے، یعنی یہ کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تو اب اس کے بعد بھی میرا خیال یہی ہے کہ تمہیں بھامو میں رہنا چاہیے، کیونکہ ہندوستان میں نوکری ملنے کی امید اور بھی کم ہے۔

بات یہ ہے کہ تم ابھی تلاش معاش کے مصائب سے صحیح معنوں میں واقف نہیں ہو۔ دنیا میں لاتعداد نوجوان ایسے ہیں جو روزگار کی جستجو میں ادھر سے ادھر پھر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر جلد سے جلد بلکہ فوراً کوئی ملازمت نہ ملی تو بھوک اور فاقے سے مفر نہ ہوگا۔ جستجو اور تلاش تو اسی کی ہے جو اس ہولناک احساس کے ساتھ اور اس بھیانک خوف کو دل میں لے کر نوکری ڈھونڈھے کہ اگر کل تک مجھے نوکری نہ ملی تو میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ لو ایک قصہ سنو!

معین الدین میرا ایک بہت پرانا دوست ہے۔ جس زمانے میں ہم پنڈت کے کوچے میں رہتے تھے، وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی عربک اسکول میں پڑھتا تھا اور میں بھی، چنانچہ وہ اکثر ابا جان مرحوم سے انگریزی پڑھنے ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ تم اس کو نہیں جانتے کیوں کہ تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ جا چکا تھا۔ اس نے پانچ چھ برس میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ جب نتیجہ شائع ہوا تو اس کا نام چوتھے نمبر پر تھا۔ اس سال چار آدمی لیے جانے والے تھے بس پھر کیا تھا معین صاحب کے ٹھاٹھ ہو گئے۔ فیسیں معاف کرا کر کے تعلیم حاصل کی تھی، لیکن بی۔ اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں انگلستان سے واپس آ چکا تھا اور گھر میں پڑے پڑے ''بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے'' کا

ورد کیا کرتا تھا۔ یہ گویا نشے کے اتار کی حالت تھی اور طبیعت کی بے کیفی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ معین کا میابی کی خبر سنی تو اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے دل کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ مجھے چاہیے تھا کہ کم از کم ایک دفعہ جا کر اسے مبارک باد تو دے آتا لیکن جی نہ چاہا۔ معلوم نہیں یہ رشک وحسد کا نتیجہ تھا یا یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی جو زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں اس سے ملنے نہیں گیا۔ اور میاں! ابھی یہ خبر تازہ ہی تھی کہ یکا یک دوسری خبر ملی وہ یہ کہ معین صاحب ڈپٹی کلکٹری میں نہیں لیے گئے۔ ارے بھئی کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ پتہ لگا کہ فرقہ وارانہ تناسب کو قائم رکھنے کے لیے ایک عیسائی امیدوار کو لے لیا گیا جو بیسویں نمبر تھا اور معین صاحب کو رد کر دیا گیا۔ لیجئے بنا بنایا محل گر پڑا۔ وہ پہلی خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن یہ دوسری خبر سن کر یقیناً رنج ہوا۔ خیر اس کے بعد بہت دنوں تک میں معین کے حالات سے بے خبر رہا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ نائب تحصیلداری، اکسائز انسپکٹری اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے لیے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہوا مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال کانپور میں رہ کر دہلی واپس آیا تو ایک دن سر راہ اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ان دونوں ڈی۔ اے۔ جی۔ پی۔ ٹی کے دفتر میں چالیس روپے پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں ڈپٹی کلکٹری اور کہاں چالیس روپے کی کلرکی اور وہ بھی عارضی۔ خیر، اب پچھلے ہفتے ایک مدت کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوئی۔ آج کل اجمیری دروازے سے باہر ایک عظیم الشان نمائش ہو رہی ہے اور وہاں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ میں کسی شام ٹہلنے کا نکلتا ہوں تو اکثر و بیشتر قدم خود بخود اسی طرف کو اٹھ جاتے ہیں۔ ایک دن، رات کے ساڑھے آٹھ بجے میں ایک ریستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکا یک میری نظر معین پر پڑی جو ریستوران کے دفتر میں ایک کرسی پر مالکانہ اقتدار کے ساتھ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''کمال کرتا یہ شخص بھی!'' میں نے اپنے دل میں کہا'' اب کلرکی کرتے کرتے ریستوران کھول بیٹھا۔'' چائے ختم کر کے میں سیدھا اس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑا اور بوکھلا سا گیا'' کہو بھئی معین!'' میں نے کہا'' کیا حال چال ہیں؟ یہ ریستوران کب کھولا؟ میرا سوال یکسر مہمل تھا کیونکہ میں نے اس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر جو نتیجہ نکالا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وہ ریستوران کا مالک نہیں بلکہ ایک ادنیٰ ملازم تھا اور صبح سے شام تک وہاں بیٹھ کر بل بنانے کی خدمت اس کے سپرد تھی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اور مجھے اس کی حالت پر بہت زیادہ رحم آیا لیکن میں نے کوشش کر کے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور اپنے قدرتی انداز میں اطمینان کے ساتھ باتیں کرتا رہا تا کہ وہ یہ سمجھے کہ میرے نزدیک اس کا ریستوران میں ملازم ہونا کوئی افسوسناک اور رحم انگیز بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو خفت اس اچانک ملاقات سے اس کی ہوئی ہے اس میں مزید اضافہ کروں مگر اس نے خود ہی اپنے روزگار کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اس کی ناکامیوں اور مصیبتوں کی داستان سن کے میرا تو دل ہل گیا۔ تقدیر کا کھیل دیکھئے کہ وہ شخص جو شاید ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار ہوتا، برسوں سے اس کوشش میں ہے کہ دو وقت کی روٹی کا اطمینان ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ آج اسے اس بات کا بالکل غم نہیں ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کی بجائے ایک عارضی ریستوران میں دو وقت کے کھانے پر ملازم ہے۔ غم ہے تو یہ کہ پندرہ بیس دن بعد جب نمائش ختم ہو جائے گی اور ریستوران نہ رہے گا تو یہ دو وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا! عبرت! عبرت! عبرت!

بنن میاں! سچ پوچھو تو تم ابھی تلاش معاش کی تلخی سے دو چار ہی نہیں ہوئے اور خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے۔ تمہارے روزگار کا مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات یعنی کھانا، کپڑا وغیرہ حسب دل خواہ پوری ہوتی رہتی ہے اور آئندہ بھی ان کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے، چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ روزگار کی تلاش اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں اس آرام

اور عافیت کی قدر کرنی چاہیے۔ بر ما گئے ہو تو اب وہاں رہ کر کچھ کام بھی کرو۔ اگر اس وقت اپرنٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقل ملازمت ملنے کی امید بالکل نہ ہو، معاوضہ نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کرو، کچھ نہیں تو تجربہ ہی حاصل ہوگا۔ دفتری کاموں کی نوعیت سے واقفیت پیدا ہوگی، معلومات میں اضافہ ہوگا، قابلیت بڑھے گی اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ سرٹیفکیٹ ہی لے لو گے۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمھیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

اور جناب یہ کیا فرمایا کہ ہندوستان کو جنگ آزادی کے لیے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں یہاں بیکار پڑا سڑ رہا ہوں؟ واہ، واہ! کیا کہنے ہیں ہٹن میاں! تمہارے! قربان جایئے اس بلند خیالی کے! مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈالی ہوتی۔ باوا مر چکے، گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ ختم ہو چکی، بیوہ ماں اس انتظار میں جی رہی ہے کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور دو وقت کی روٹی کمانے کے قابل بنیں۔ یہ تو جناب کے حالات ہیں اور بات وہ کہی ہے جو صرف مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو ہی کے منہ سے نکلتی ہوئی اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے ہٹن میاں! اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں دولت سب سے اہم ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم یکسر محروم ہو۔ ایک مفلس اور قلاش نوجوان کو تو ادھر کا رخ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ لو ایک قصہ سنو!

ہندو کالج میں میرے ساتھ ایک لڑکا بھگوان داس پڑھتا تھا۔ اس کے سیاسی خیالات کچھ تمہارے جیسے تھے لیکن تم نے تو (معاف کرنا ہٹن میاں) دو چار باتیں ادھر ادھر سے سن لی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہو۔ اس کے برعکس بھگوان داس نے سیاسی لٹریچر کثرت کے ساتھ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور عمیق فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتداء میں اس کو فارسی سے بڑی دلچسپی تھی اور سعدی و حافظ کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔ اردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اس سے قریب تر کر دیا تھا لیکن اس کا یہ شوق جلد ہی ختم ہو گیا، کیوں کہ سیاست سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی۔اے میں اس نے فارسی نہیں لی بلکہ انگریزی کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات لے کر مضامین کی مثلث کو پورا کیا۔ اب اس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اردو فارسی ادب سے وہ بیزار ہو گیا۔ جس ادب کا کبھی دیوانہ وار عاشق تھا اب اس کو حقارت کے ساتھ ''مڈل کلاس لٹریچر'' کہنے لگا یہی نہیں، اور بھی بہت سی چیزیں اب اس کے نزدیک سرمایہ داروں اور دوسرے خوش حال طبقوں کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی تھیں۔ مثلاً مذہب، مروجہ اخلاق، معاشرتی رسوم، مختلف سیاسی ادارے، فنون لطیفہ کے شاہکار اور ان سب کو وہ قابل نفرت خیال کرتا۔

''پرائیویٹ پراپرٹی'' (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور زندگی اور سماج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ، غلامی، غریبی، جہالت، ہر چیز اس کے نزدیک ''پرائیویٹ پراپرٹی'' کی پیداوار تھی۔ فرانسیسی مفکر و مدبر پرودھن کا مشہور جملہ ''پراپرٹی از تھفٹ'' (پراپرٹی سرقہ ہے) ہر وقت اس کی زبان پر رہتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیوار پر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور لکھ دیتا۔ ایک دن مجھ سے بولا ''تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟'' میں نے کہا ''میں تاج محل کو ایک ایسی عمارت سمجھتا ہوں جو سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔'' کہنے لگا ''میرا یہ مطلب نہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تاج محل کے متعلق تمہارا کیا ہے؟'' میں نے کہا ''تاج محل کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔'' ''تو گویا وہ تمہارے نزدیک ایک لائق تحسین چیز ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ میں نے کہا ''بے شک وہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور لائق صد تحسین ہے۔'' ''مگر میں اس کو قابل نفرت سمجھتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ضرور سمجھو'' میں نے کہا ''آج کل اچھی چیزوں کو برا کہنا

بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب جس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک معمولی درجے کا شاعر تھا۔'' اس نے میری بات کو غور سے نہیں سنا اور اپنی کہے گیا۔''میں تاج محل کو قابل نفرت سمجھتا ہوں۔ وہ اس زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار، راجہ اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لوٹتے تھے اور ان کے خون سے اپنی محفلوں کو رنگین بناتے تھے۔'' ''تمہارا خیال صحیح ہے۔'' میں بیچ میں بول اٹھا، ''لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو بھگوان داس! تم اس وقت اسٹیج پر نہیں ہو، بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ تم اپنے ماحول سے بڑی جلدی بے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمہارے اندر بڑا عیب ہے۔'' اس نے جواب دیا ''اور تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی پیداوار ہے جو ''ام مورل'' تھا۔ بنیادوں سے لے کر چوٹی تک ''ام مورل' اس لیے تاج محل بھی ایک ''ام مورل'' چیز ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ام مورل ہے تو ہوا کرے۔ خوبصورت تو ہے، اور یہی اصلی چیز ہے۔ ایک طوائف بھی ''ام مورل'' ہوتی ہے لیکن بعض اوقات وہ حسین بھی ہوتی ہے اور اس کا ''ام مورل'' ہونا اس کے حسین ہونے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔'' اس پر وہ طوائف کا مسئلہ لے بیٹھا، کہنے لگا، ''طوائف، ام مورل'' نہیں ہوتی۔ طوائف کو ''ام مورل'' کہنا قطعی جہالت ہے۔ طوائف ''پرائیویٹ پراپرٹی'' کی پیداوار ہے..... '' میرے نزدیک اس کی گفتگو ہمیشہ ایک ہزیہ نظم ہوتی تھی اور ''پرائیویٹ پراپرٹی'' ٹیپ کا بند۔ جب وہ اس ٹیپ کے بند پر پہنچا تو میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا لیکن اس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا، ''طوائف پرائیویٹ پراپرٹی'' کی پیداوار ہے.....'' میں نے کہا ''بھگوان داس! آج تمہارا بخار بہت تیز ہے، تھوڑی دیر خاموش لیٹ کر آرام کرو۔'' وہ اٹھا اور مجھے جاہل، کوڑھ مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جلدی میں وہ پنسل بھی چھوڑ گیا جس سے اس نے میز پر پڑے ہوئے تقریباً تمام کاغذات پر ''پراپرٹی از تھفٹ'' کی مہر ثبت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست بھگوان داس اور یہ تھے میرے وہ خیالات جو بھوت بن کر یکا یک اس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ بہت جلد بھگوان داس جی اپنے مرکز ثقل سے اس حد تک ہٹے کہ انہوں نے اپنے تعلیم کو خیر باد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا ''دیکھو بھگوان داس! اب تک جو بکواس تم .... کرتے رہے ہو، اس کو میں نے کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن یہ حرکت جو تم اب کرنے والے ہو ایسی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تو یاد رکھو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یہ عمر پھر لوٹ کر نہیں آئے گی، نہ یہ مواقع جو آج تمہیں حاصل ہیں پھر میسر آئیں گے۔'' اس پر وہ بولا ''مجھے بی۔اے، ایم۔اے کر کے کیا لینا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرنی نہیں ہے جو اپنی عمر اس طرح ضائع کروں'' میں نے کہا ''چلو یوں ہی سہی، تمہیں حکومت کی نوکری نہیں کرنی ہے۔ مگر تحصیل علم بذات خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔'' ''علم کی اہمیت موجودہ حالات میں کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بس اتنا ہی بہت کافی ہے کہ ہم اردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محض عیاشی ہے۔'' ''سبحان اللہ! کیا زریں خیالات ہیں۔'' میں نے کہا ''تمہارے دماغ میں خناس سما گیا ہے، بھگوان داس! اور کوئی بات نہیں ہے۔'' لیکن اس نے نہ کبھی میرے غصے کی پروا کی تھی نہ طنز و ملامت کی۔ چنانچہ حسب معمول اپنی کہے گیا۔ ''کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کے لیے ہے، نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں.....'' میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مرض حد سے گزر چکا ہے اور اس کو کوئی سنجیدہ مشورہ دینا بالکل فضول ہے۔

اس نے کالج سے نام کٹوایا اور بمبئی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اپنی اردو اور فارسی کی کل کتابیں مجھے بخش دیں۔ ان پر لکھ دیا کہ میں

مزید تعلیم حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں اور بمبئی جا رہا ہوں تاکہ مزدوروں میں رہ کوئی مفید کام کر سکوں۔ ماں بے چاری بے پڑھی لکھی عورت وہ بیٹے کی اس عظیم الشان سیاسی بیداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اس کی قدر کرتی۔ اسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں ہی پامال ہوتی نظر آئیں۔ وہ ضلع روہتک کے کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل داس کو سمجھایا بھی اور دھمکیاں بھی دیں، اپنے غصے کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلایا مگر اس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس نے ہر خط کے جواب میں یہی لکھا: ''والدین اور اولاد کی محبت سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک عیاشانہ پہلو ہے۔ میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے اور میں اس محبت کے مقابلے میں ماں کی محبت کو ایک قطعی غیر اہم چیز سمجھتا ہوں۔'' آخر تنگ آ کر ماں نے لکھ بھیجا۔ ''اگر تم تعلیم ترک کر کے بمبئی گئے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی اور خرچ بھیجنا بند کر دوں گی۔'' مگر حضرت اپنے نئے خیالات کی ترنگ میں تھے۔ ان پر مجاہدانہ سرفروشی کا جذبہ طاری تھا۔ انہوں نے ماں کی اس دھمکی کی ذرا بھی پروا نہ کی اور بمبئی روانہ ہو گئے۔

اس بات کو مشکل سے چار مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بھگوان داس جی تشریف لیے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جسم پر ایک پھٹی ہوئی قمیص ہے اور میلا کچیلا نیکر! ''آیئے تشریف لایئے!'' میں نے کہا، ''آپ کا نام بھگوان داس ہے نا؟'' مگر وہ کسی چہل کے لیے تیار نہ تھا۔ بے جان ہو کر کرسی پر گر پڑا اور بولا ''میں بیمار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگواؤ۔''

ناشتے کے بعد جب میں اس کی داستان سننے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ خفیہ پولیس کے آدمی بھی لایا ہے۔ میں نے دل میں کہا، ''یہ کمبخت کہیں میرے سر پر کوئی آفت نہ لائے۔ ایسے خطرناک آدمی سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائیں اور بے گناہ مارے جائیں۔'' میں نے جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور تیسرے دن ٹکٹ دلوا کر روہتک روانہ کر دیا۔

اب قدرتی طور پر تم یہ جاننا چاہو گے کہ بھگوان داس پر بمبئی میں کیا بیتی اور وہ کیوں وہاں سے اس قدر جلد واپس آ گیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے جس کو اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو بتن، میاں! میرا یہ خط، خط نہ رہے گا بلکہ ایک اچھا خاصا ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بمبئی پہنچ کر بھگوان داس کو ایسی ذہنی و جسمانی تکلیف کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ بھلا کہاں ایک نازوں کا پالا نوجوان اور کہاں سیاسی زندگی کے مصائب۔ ماں نے انتہائی خوشامد کے باوجود روپیہ نہیں بھیجا اور اس سے ان مصائب میں چند درچہ اضافہ ہو گیا۔ غرض کہ ''دنیا کے عوام کی محبت'' نے اچھی طرح اپنا اثر دکھایا اور بھگوان داس کو ایسے جھٹکے دیئے کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ ''آزادی اور انصاف کی حکومت'' قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا ماں کو لکھا، ''روپیہ بھیجو، ہم دہلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے۔''

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

یہ نہ سمجھنا جن میاں! کہ بھگوان داس کی مصیبتیں یہاں ختم ہوگئیں۔ یہ تو اس کی بربادی کی محض ابتداء تھی۔ تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع کرنے کے بعد جب دوبارہ کالج میں داخل ہونے کے لیے آیا تو پرنسپل نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ غریب نے بہتیرا سر پٹکا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جس کالج میں بھی گیا یہی جواب ملا کہ تھرڈ ایئر میں داخل کریں گے۔ اس نے فورتھ ایئر سے پڑھنا چھوڑا تھا۔ اس لیے خیال تھا کہ فورتھ ایر میں ہی داخلہ مل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک سال کی بجائے دو سال ضائع ہوتے ہوئے نظر آئے۔ طبیعت تعلیم سے پہلے ہی بیزار ہو چکی تھی۔ ان نامساعد حالات سے دل اور بھی کھٹا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید تعلیم کا خیال ہی چھوڑ دیا اور ملازمت کرنے کی جی میں ٹھانی مگر ایسے شخص کے لیے ملازمت کہاں! خفیہ پولیس نے اب تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ملازمت بھلا کون دیتا۔ دو تین سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مناسب روش یہی معلوم ہوئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں اور بیوہ ماں کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔

چنانچہ اس وقت سے برابر ہمارے دوست شری بھگوان داس جی مستقل اپنی گاؤں میں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین پھیرے دہلی کے کرتے ہیں اور ہر پھیرے میں چند کتابیں سیاسیات کی یا "مڈل کلاس لٹریچر" کی خرید کر لے جاتے ہیں۔ مطالعے سے جو وقت بچتا ہے وہ خطوط لکھنے اور حقہ پینے میں صرف ہوتا ہے۔

ان کا وہ "پرائیویٹ پراپرٹی" والا فلسفہ مدت ہوئی کہ دھواں بن کر اڑ گیا۔ اب ان کے خیالات کا انداز کچھ اور ہے دوسرے تیسرے مہینے مجھے خط لکھتے رہتے ہیں جس سے میں ان کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے آخری خط جو مجھے دو ماہ قبل موصول ہوا تھا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔ "میں تم سے ایک بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوں۔ کیا زندگی کا مقصد حصول مسرت کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ فرض کیجئے آپ نے دنیا میں رہ کر بڑے بڑے کام کیے عزت بھی ملی اور نام وری بھی ہوئی۔ ایک دن آپ دنیا سے چل بسے۔ اب دنیا والے آپ کے نام کی مالا جپیں یا آپ کو غیر قانونی بنانے کی کوشش میں مختلف مقامات پر آپ کے مجسمے نصب کریں، آپ کو کسی بات سے سروکار نہیں۔ آپ تو چپکے سے کون جانے کہاں چل دیئے۔ مرنے کے بعد معلوم نہیں آپ کا کیا ہوا۔ پھر بتائیے کہ آپ کی وہ عمر بھر کی جدوجہد تگ ودو اور جانفشانی کس کام آئی۔ ہاں ایک چیز ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے اور وہ ہے مینائے حیات کا، بادہ عشرت سے سرشار ہونا ہے یعنی دل کھول کر، پیٹ بھر کے، پوری طرح ڈوب کر زندگی گزارنا۔ لیکن یہ معموریت، جسم یا ذہن کو اذیت یا کوفت میں مبتلا کر کے ہی کیوں حاصل کی جائے؟ کسی شاہد رعنا کے آغوش میں کیوں نہیں۔ کیا یہ چیز میسر نہیں آسکتی؟ میں شعراء میں خیام کے سوا کسی کو نہیں مانتا۔ باقی سب مہمل بکتے ہیں۔ زندگی کا راز اگر کسی نے پایا تو وہ یہی دیوانہ فرزانہ تھا...... میں اپنے چاروں طرف گل عذار بچے، زہرہ جبیں لڑکیاں اور حسین ورعنا لڑکوں کو دیکھتا ہوں۔ کل یہ نازک پھول کمھلا جائیں گے، یہ دوشیزائیں پوپلے منہ والی کھوسٹ بڑھیا بن جائیں گی۔ میرا ایک عزیز ہے کیسا بانکا اور سجیلا جوان تھا وہ بھی،، آج دق میں مبتلا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ موت کا بھیانک چنگل اس کی شہ رگ کے قریب آ پہنچا ہے۔ یہ ہے زندگی کی حقیقت! حسن کا ضیاع، مسرت کا اختصار۔

یہ فطرت کے وہ قانون ہیں جن کی علت غائی آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔ دنیا ایک ماتم خانہ ہے! زندگی جنازہ پرورش ہے! میں شوپنہار کو زندگی کا سب سے عمیق مبصر خیال کرتا ہوں...... فکر فردا اور غم دوش سے کچھ حاصل نہیں۔ کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ! جب موت آئے تو اطمینان کے ساتھ کہ ہم نے اپنی زندگی کے لمحات گراں کو بدذوقی اور بدتوفیقی کی نذر کر کے برباد نہیں کیا...... دنیا کے غریب؟ لیکن آپ کو ان سے کیا؟ ہمدردی! آپ کو ان سے ہمدردی ہے! خوب! مگر ان کو آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں، وہ جب چاہیں گے غاصبوں سے اپنا چھنا ہوا

مال واپس لے لیں گے۔ ہمدردی منافقت دوسرا نام ہے! اخلاق! یہ اخلاق اور اس کی ذریات کا تقاضہ ہے؟ ہوگا! مگر میں اس کی فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں۔ کس قدر پوچ اور سوقیانہ تخیل ہے!..... ''

تم نے دیکھا بھن میاں! یہ وہی شخص ہے جو کبھی تاج محل کو 'ام مورل' کہا کرتا تھا اور دنیا کی ہر اچھی بری چیز کو سرمایہ داروں کی عیاشی کہہ کر قابل نفرت ٹھہراتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے متعلق بہت سے مختلف نظریئے ہوسکتے ہیں اور ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کے لیے نہایت دشوار ہے کہ وہ کسی ایک نظریے کا ہو جائے اور تازیست اسی کا ہو کر رہے۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ کسی مخصوص فلسفے کو زندگی کا صحیح ترین فلسفہ سمجھ کر اس کی خاطر اپنے مستقبل بلکہ اپنی ساری زندگی کو خطرے میں ڈال دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ بھگوان داس کے حالات سے تم یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن میں اقتصادی خوشحالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ چیز نہیں ہے تو تم کبھی جنگ آزادی کے سپاہی نہیں بن سکتے۔ اور میاں! سپاہی وپاہی بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ جس دن بھی ذرا سی بے عنوانی کا اظہار تمہاری طرف سے ہوگا، اسی دن جیل میں ٹھونس دیئے جاؤ گے۔ اب سال چھ مہینے تک پڑے سڑا کرو۔ بے اختیار یہی کہو گے کہ اس سے تو بھاڑ میں پڑے سڑتے رہتے تو بہتر تھا اور یہ نہ سمجھنا کہ جیل میں آرام کے ساتھ گزرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ محض کہنے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات ہوتی ہیں اور وہ ترجیحی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو سلوک معمولی قیدیوں کیساتھ کیا جاتا ہے وہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے سپاہیوں کو تو وہ ہتھکڑی پہنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ لو ایک قصہ سنو!

کانپور میں میں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت ذیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن ان کا لڑکا نہایت پاجی تھا۔ مطیع اللہ نام! مگر اطاعت سے کوسوں دور! انتہائی کوششوں کے باوجود کم بخت نے کچھ پڑھ کے نہیں دیا۔ باپ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا اور جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا اس میں ہزاروں روپیہ بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح ہائی سکول کے امتحان میں پاس ہی نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہوگئی تو مجبوراً تعلیم ترک کرادی گئی۔ اب اسے لیڈری کا شوق چرایا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جراثیم کہاں سے آگئے۔ غرضیکہ قومی وملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک کپڑے کی مل میں اسٹرائک ہوئی تو آپ ماشاءاللہ ان لوگوں میں تھے جو اپنے جھوٹے سچے دعوؤں اور اشتعال انگیز تقریروں سے مزدوروں کو بہکاتے اور ورغلاتے ہیں اور ان کو غلط راستے پر ڈال کر ان کی مظلومیت میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا، وہ مع اپنے تمام ساتھیوں کے دھر لیے گئے۔ پولیس نے بے تامل ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ انہوں نے بہت ہچر مچر کی مگر وہاں بھلا کون سنتا ہے۔ چاروناچار سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں ٹھونس دیا گیا اور لاری چل پڑی۔ لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی۔ اس نے پولیس افسر کو اپنی خواہش اور ارادے سے مطلع کیا۔ پولیس افسر نے اس کی خواہش اور ارادے کو کمزور سمجھ کر کچھ اہمیت نہ دی، اور ڈانٹ کر کہا، ''ابھی نہیں، بیٹھے رہو!'' چند منٹ مطیع اللہ نے صبر کیا مگر خواہش بہت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا۔ اس لیے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جاسکا۔

اس نے پھر پولیس افسر کو یاددہانی کرائی۔ وہ کمبخت نہایت ہی شقی القلب تھا۔ پھر ٹال گیا۔ پھر ٹال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور صبر کیا لیکن اب خواہش کی قوت اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدید ہوگئی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا ناممکن معلوم ہوا۔ اس نے تنگ آ

کر پولیس افسر کو ایک ایسی دھمکی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس جگہ رکی وہ ایک غیر آباد مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ کچے پکے مکانات تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ لاری سے اتر کر ایک پولیس مین کو دور تک گھسیٹتا ہوا میدان کی جانب بھاگا جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا، ''ہتھکڑی کھولو، جلدی!''، ''ہتھکڑی تو میں نہیں کھول سکتا۔'' پولیس مین نے کہا، ''تمہارے پتلون کے بٹن کھولے دیتا ہوں......''

میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ بٹن میاں کا ساتواں خط ملا ''ہندوستان میں ستیہ گرہ شروع ہو چکی ہے، اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں......''

اب میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ بٹن میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اردو دان طبقے کو مخاطب بنا کر کہوں

لو، ایک قصہ سنو!



ابوالفضل صدیقی

نام : چودھری ابوالفضل صدیقی

قلمی نام : ابوشاہد/ چودھری ابوالفضل صدیقی / ابوالفضل صدیقی

پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۰۸ء، بمقام عارف پور، نوادہ کھیڑا، بدایوں (یو پی) بھارت

وفات : ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء بہ مقام کراچی۔ (پاکستان) دو بج کر بیس منٹ پر بروز بدھ

تعلیم : سینئر کیمرج و فارسی مکتب

فارسی اور قرآن مجید پڑھنے کے بعد مشن اسکول بدایوں (یو۔پی) میں داخل ہوئے۔ اسی ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ سینٹ جارج کالج، مسوری سے سینئر کیمرج کرنے کے بعد کہیں اور داخلہ نہیں لیا۔ سینٹ جارج کالج، مسوری اور علی گڑھ میں عارضی قیام نے انہیں روشن مزاجی عطا کی۔

مختصر حالات زندگی:

بدایوں میں عارف پور، اُن کے مورث اعلیٰ محمد عارف کی بسائی ہوئی بستی ہے، جہاں چودھری محمد ابن الحسن صدیقی بصیر ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی (علیگ) کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بدایوں کے مشہور وکیل تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد سید علاؤالدین کے وقت سے بدایوں میں آباد تھے اور مورث اعلیٰ کو فوجی خدمات کے صلے میں ایک جاگیر اور ''چودھری'' کا خطاب شاہ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ شیخ محمد عارف کے والد شیخ مہتاب علی صاحب، سید علاؤالدین کے سپہ سالار تھے۔ ان کے اجداد میں غلام مصطفیٰ یک رنگ نے ایہام گوئی میں نام کمایا۔

ابوالفضل صدیقی نے بزرگوں کی روایت کو نبھایا اور ذریعہ معاش زمینداری اور باغبانی ہی پسند کیا۔ طبیعت ہمیشہ سے دُنیوی ذمہ داریوں سے متمرا رہی۔ بیس برس کی عمر میں بنت عم (قدسیہ بیگم) سے منسلک ہوئے اور آزاد طبیعت ہونے کے باوجود نباہ کیا۔ لڑکپن اور جوانی

خونخوار کتوں، سبک رفتار گھوڑوں اور آہنی و آتشی آلات حرب کے ساتھ جنگلوں میں شکار کھیلتے گزری۔ ۱۹۳۲ء میں ابوشاہد کے قلمی نام سے نیم مزاحیہ، اصلاحی مضامین اور افسانے، اخبار ''ریاست'' میں لکھے اور یہ سلسلہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ''ادبی دنیا''، ''شاعر'' اور ''صوفی'' میں ابوالفضل صدیقی کے نام سے لکھتے رہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۵۴ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور تادم آخر کراچی (سندھ) میں رہے۔ ۳ ستمبر ۱۹۸۸ء کو فالج کا حملہ ہوا اور ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ تدفین پاپوش نگر، کراچی کے قبرستان میں ہوئی۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

مزاحیہ مضمون: ''ہمارے ایم ایل اے نینی تال میں'' مطبوعہ: اخبار ''ریاست'' (مدیر: دیوان سنگھ مفتون) ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''رہنمائے حقیقی'' مطبوعہ: ''صوفی'' پنڈی بہاؤالدین ۱۹۳۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱	''اہرام'' (افسانے) دیباچہ: سلطان حیدر جوش	ہاشمی بکڈپو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۵ء
۲	''تعزیر'' (ناول)	کتب خانہ دارالبلاغ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۳	''رموز باغبانی'' (پھلوں کی کاشت سے متعلق)	کتب خانہ دارالبلاغ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۸ء
۴	''سرور'' (ناول)	سلطانی حسین اینڈ سنز	طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۵	''انیس سو چوراسی'' (جارج آرویل کے ناول ۱۹۸۴ء کا ترجمہ)	اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۶	''چار ناولٹ'' (۴ ناولٹ)	ادب نما، کراچی،	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۷	''سرد لہو کا نوحہ'' (افسانے)	ادب نما، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۸	''شکار'' (ناول)	مطبوعہ دارالبلاغ، لاہور	
۹	''جوالا مکھ'' (آٹھ افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۱۰	''انصاف'' (تین طویل افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۱۱	''آئینہ'' (تین طویل افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۱۲	''ترنگ'' (ناول)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب، کراچی	
۱۳	''ستاروں کی چال'' (چھ افسانے)	مطبوعہ: فضلی سنز، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۹۵ء
۱۴	''شکنجہ'' (سات افسانے)	مطبوعہ: فضلی سنز، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۹۹ء
۱۵	''دن ڈھلے'' (افسانے)		

غیر مدوّن:

متعدد افسانے اور مضامین۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

۷/۴ ایف ،۴ ناظم آباد، کراچی نمبر ۱۸، پاکستان

اعزاز:

P.E.N، یونیسکو ایوارڈ برائے افسانہ: ''بچہ'' (چڑھتا سورج) ۱۹۵۶ء

نظریۂ فن:

''افسانہ نگاری نثر نگاری کے شوق کا ذریعہ ہے، درحقیقت اچھی خوبصورت نثر کا شائق ہوں۔ افسانہ کے متعلق میرا نظریہ خلوص ہے اور گہرے پہلودار مشاہدہ کی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ حقیقی معنی میں محسوس کرنے پر ہے ورنہ تھانہ دار کی ڈائری بھی تحریر ہوتی ہے مگر نہیں ہوتی۔ افسانہ جتنا حقیقی زندگی سے قریب ہوگا، اتنا ہی پُر تاثیر ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ کسی ننگے پروپیگنڈے سے پاک ہونا چاہیے۔''

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ ستمبر ۱۹۸۴



حوالہ جات:

۱۔ یہ تاریخ پیدائش ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: اردو محل لاہور س۔ن (لگ بھگ ۱۹۴۶ء) میں سے خود ان کے اپنے فراہم کردہ کوائف سے لی گئی ہے۔ مجھے صدیقی صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش ۴ ستمبر ۱۹۱۰ء بتائی تھی جو درست نہیں۔

جوالامکھ

ابوالفضل صدیقی

نہ معلوم کدھر سے عیدو کے اندر جیسے مرد تڑپ اٹھتا...... آنکھوں میں رس سا چھلک پڑتا اور سیدھا ہوتے ہوتے ہونٹ خاتون کے دہکتے رخساروں پر سے پھسلتے بیر بہوٹی سے ہونٹوں سے چپک جاتے اور ہاتھ نہایت چابک دستی کے ساتھ بھرے بھرے بدن کے گداز نقوش اور مخملیں خطوط کے نشیب وفراز کا جائزہ لینے لگتے اور پھر بڑے زور سے بھینچ لیتے اور وہ جیسے کاٹھ کے شکنجے میں کس جاتی اور یہی نہیں کہ خاتون ہی کا خون متھ جاتا، عیدو کے ہونٹ بھی چپ چپا کر دہک سے جاتے۔ بیمار آنکھوں میں لال ڈورے اچھل آتے۔ سانس تھرتھراتی جاتی۔ گویا بھولا ہوا سبق یاد آجاتا اور پچھلے پانچ سال کے رات شب برات اور عید کے ہنگاموں میں سے بس اتنی ہی استعداد باقی رہ گئی تھی، جیسے سر کچلنے کے بعد سانپ میں بل اور اینٹھ باقی رہتی ہے اور فالج کے مارے ہوئے عیدو کے اندر جیسے شہد کی صورت ڈس لہراتا اور خاتون کو تو سچ مچ اس وقت سانپ سا ڈس لیتا......

بقول شخصے زندہ در گور قبر میں پاؤں لٹکائے، زیر ناف کلیتاً مفلوج، نچلا دھڑ بےکار اور حرکت سے معذور، اور کمر کے خاص گر یہ کو تو بالکل مردہ کہئے مگر بقیہ پوری ریڑھ تندرست تھی اور اوپر کا بدن بالکل صحیح، پھر بھی خود اٹھ کر بیٹھ نہ سکتا تھا اور جب خاتون اٹھا کر بٹھا دیتی تو کھونٹا سا بیٹھا تو رہتا لیکن بس بیٹھا ہی رہ جاتا اور بغیر سہارے لیٹ نہ سکتا اور لیٹ کر بھی تختہ کی طرح پڑا ہی رہتا اور بغیر تھوڑے سے سہارے کے پوری لاش سے آسانی کے ساتھ کروٹ بھی نہ لے سکتا تھا۔

اور خاتون جب کھانا لے کر آتی تو بالعموم رات کے کھانے کے بعد لٹاتے ہوئے سہارا دیتے وقت مفلوج عیدو میں ڈیڑھ سال پہلے والا شوہر جاگ پڑتا اور پھر وہ کرموں جلی سرشام کی چھڑی مفت میں صبح تک چٹخنی رہتی...... خاتون میں شوہر گدگداتا رہتا، اور یہ بے خبر پڑا سوتا رہتا...... چھ فٹا کوروں کا لٹھا سا کھڑا، چلتے پھرتے کودتے پھاندتے خوابوں میں گم، جب اس کے بیس گرہ چکلے سینہ اور سولہ گرہ چوڑے پیٹ کے نیچے بھیلیے کی طرح چبوترا سی کمر تھی جس میں جمنا پار اور بیل کی طرح مضبوط دو ٹانگیں لگی تھیں، جمنا پار اور بیل کی طرح مضبوط اور کاٹھیاواڑی

گھوڑے کے طرح تنداتانگیں، جن کی دھمک کے مارے دھرتی پانی چھوڑتی اور پاتال تھرتھراتی ...... عیدو کو لیے لیے پھرتیں اور عیدو تو خواب میں ہی عیدو ہوتا، مگر خاتون پر ساری رات جاگتے عیدو ہی عیدو سوار رہتا......

فالج گرنے کے بعد چھ سات مہینے تو علاج کی مصروفیت اور تندرستی کی امید رہی پھر جب گاؤں اور قصبہ تک کے سب ویدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو کچھ دنوں ابدی معذوری کا شدید احساس اور دائمی ناامیدی سنگین قنوطیت سی طاری رہی، مگر پھر حالات کے استقلال اور وقت کے مرہم نے صبر کی کیفیت پیدا کر دی اور مجبور حالت سے مطمئن ہوتے ہی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں، بے معنی رجولیت نے عود کیا۔ پہلے دو ایک روز تو ذرا ڈرتے ڈرتے شروعات کی اور پھر یہ عملی اختلاط اور پیار رات کے کھانے کے بعد کا معمول بن گیا......

جیسے خود کو دھوکا دیتے ہوئے خاتون نے شروع شروع میں تو کچھ دنوں نہ معلوم کیوں، شوہر کی دل شکنی کے لحاظ میں یا شاید باطل خوش فریب سے امید میں اس جھوٹ موٹ کے کھیل کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ مگر اس کا جواب تو اس کا سوال ہی ہو سکتا تھا، اور جب سرے سے سوال ہی غائب ہے تو جواب کیا ہو سکتا تھا، جیسے کچھ اپنا منہ آپ ہی چڑا کر رہ جاتی، اور اس کے گلابی رخساروں اور پنکھڑی سے ہونٹوں پر جیسے سرِشام کالا ناگ نہ معلوم کتنے پھن مار دیتا اس کے سینہ بازوؤں اور پشت پر اور نہ معلوم کہاں کہاں مشعل سی پھر جاتی اور پھر پوری رات انگاروں پر کٹ جاتی، چٹ چٹ چٹاچٹا کباب کی طرح چٹختے، جلتے، سلگتے ...... اور ایک مرتبہ اندر ہی اندر جھنجھلا کر ذرا سنجیدگی کے ساتھ شوہر کی اس طلب مجہول پر اعتراض کیا اور اس کا جواب مانگا تو عیدو ٹٹولتا ٹٹولتا دل سے اتر کر خاتون کی بات کا جواب تلاش کرتا پیٹ تک پہنچا۔ خیر یہاں تک شاید کچھ بازگشت جیسی آواز محسوس بھی ہوتی تھی مگر اک ذرا بڑھ کر کمر پر تو موت کا سناٹا تھا اور وہ عملی چیز بھی معدوم تھی، ...... اور مس اور بوسہ خواہ حقیقی ہو یا مجازی تحریک تو رکھتا ہی ہے اور یہ تو نہ ''یہ'' ہوتا نہ ''وہ''! مگر اس بچاری کے لیے تو کسی مد میں نہ ہوتے ہوئے بھی طوفان سا تند اور آگ ساحر کی ہوتا ...... اور بغیر کسی جواز کے عیدو اپنی حرکت سے باز آنے والا نہ تھا، اس شوخ بچہ کی طرح جو تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکریاں پھینک کر گول گول متلاطم لہروں کا تماشا دیکھتا ہے اور وہ بے چاری ہر رات جیسے پچھلی پانچوں سال کی عیش کوشیوں اور شب باشیوں کے ردِعمل سے دوچار ہو کر صبح کو خمارزدہ شرابی کی طرح اٹھتی، جس کے پس منظر میں شراب کے سرور کا بھی کوئی سراغ نہ ہوتا ...... خمار ہی خمار، سرِشام کا چڑھا صبح تک!! ...... اور صبح سے شام تک اعضاء شکنی اور چٹخن ہی چٹخن! ہمہ وقت جلن ہی جلن! ...... پیاس ہی پیاس سارا دن! بھوک کی تمام رات......

2

خاتون نو جوان تھی ...... غضب کی تندرست اور بلا کی حسین، اور کل کی بات ہے، اس کی نوجوانی و تندرستی اور انسانیت اور زوجیت کے پورے پورے حقوق عیدو کندھے سے کندھا ملائے نہایت مستعدی کے ساتھ ادا کرتا رہا تھا۔ اچھے بھلے فالج لگا، اگر مر جاتا تو اس کی سوختہ نصیب جوان مٹی بھی سہارے لگ ہی جاتی، اور کہیں نہیں تو چار پنچ برادر دو بول پڑھوا کر شبراتی سے ہی پلو باندھ دیتے۔ گھر کے گھر ہی میں، اس سے کہ شبراتی دو بچوں کا باپ تھا اور اپنی جورو کا خصم، تھا تو عیدو کا بڑا بھائی، باپ کی جائیداد اور بھائی کی ناک کسی اور کے حوالے کیسے کر دیتا، میرے پاس

یا بھرے پار گھر کی بہو تھی۔ بیوہ بھاوج نہ کسی دوسری بیوی بنا کر بھرتا ہی بھرتا!...... لو اب اکیلا، اپاہج بھائی کو چارپائی پر پڑے پڑے کھلا ہی رہا تھا اور، یا مردی سے اکیلا دھڑی بھر آٹا کھانے والے کنبے کو ذرا سی آبائی زمین کھود کر پال رہا تھا، مگر خاتون تو سانپ کے منہ میں چھچھوندر تھی اور سانپ بھی گویہ نوٹا...... اور سانپ بھی نہیں مسلے ہوئے سنڈے کے پلے بندھی ہوئی...... اور خاتون کی زندگی کا دھارا ہر شام چڑھتا رہا اور ہر صبح اہلتا رہا اور بہتا پانی تو اپنی سطح خود تلاش کرتا ہے...... اور پستی میں سکون پا کر ہی دم لیتا ہے......

کمر ٹانگوں سے اپاہج عیدو کے حواس خمسہ بڑے ذکی الحس ہو گئے تھے۔ کوئی موسم ہو وہ باہر تو نکل ہی نہ سکتا تھا۔ جاڑا ہو یا گرمی معالجین نے ہر موسم میں بند جگہ میں لیٹے لٹائے پڑے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ تھوڑا بہت علاج معالجہ، رگی مالش تکور مستقل چلتی رہتی تھی۔ جاڑے کے بعد پہلی گرمی آنے پر خاتون نے اندر کوٹھری میں اس کی چارپائی کے برابر اپنی چٹائی بچھالی اور بدستور وہیں لیٹی رہی...... مگر جیٹھ، بیساکھ اور ساون بھادوں کی جلتی اُبلتی راتوں میں وہ کیسے اندر سو سکتی تھی، پھر بھی شکایت نہ کی مگر عیدو کو خود ہی احساس ہو گیا اور اس نے اصرار کر کے اس کا بستر کوٹھری کے سامنے چھپر کے برآمدے میں لگوا دیا، اور پھر جاڑوں میں برآمدے کے ایک گوشہ میں اُس نے اپنا پیال ڈال دیا اور یہ اس کے مستقل سونے کی جگہ ہو گئی اور برآمدے میں تو خاتون اور بھی چوکنی نیند سونے لگی پھر اتنے عرصہ میں شوہر کی نیند مرض کے مزاج کی بھی پوری محرم ہو گئی تھی۔ رات کے ہر حصہ میں پہلی مثار پر مچھلی کی طرح تڑپ کر بستر سے نکل آتی اور شوہر کی پٹی سے آ کھڑی ہوتی، ایک دفعہ کوٹھری میں آواز دینے کی نوبت آ جایا کرتی تھی مگر برآمدے میں تو جیسے پہلی سانس سن لیتی،...... اور عیدو کے دماغ پر تو فالج نہ گرا تھا اس کی تیمارداری اور خدمت کا شدید احساس تھا...... اس کے ساتھ اپنی تندرستی کے پانچ سالہ ازدواجی دنوں کی زندگی کی چہلوں اور ہنگاموں کی یادیں اب بھی رنگین خوابوں کی طرح علیل خون میں گونجتی تھیں، جیسے اسٹیج پر نغمہ ریزی کرتے ہوئے دو مغنی آہستہ آہستہ نغمہ ختم کرتے چلے جاتے ہیں اور دور، اور پھر بڑی دور سے میٹھی میٹھی مدھم نسائی آواز مری مری سامعہ نوازی کرتی رہتی ہے اور اب! اب تو یک طرفہ نغمہ! دوسرا سر کنسرا بھی نہیں، خاموش، گونگا!! اور آج! آج بھی اسے اس کی نوجوانی کے شدید تقاضے معلوم تھے اور وہ خاتون کے ہر پہلو کا آشنا تھا اور سچا محرم راز...... اور اب اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے قہر رانے کے ساتھ اللہ میاں نے اس کے حق میں فرشتہ رحمت بھی نازل کر دیا ہے،، اور پروگرام کی پہلی شق سے لے کر اخیر تک رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پیشتر روزانہ اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومتی۔ صبح ہی صبح پیشاب پاخانہ کے برتن لے آنا اور بٹھا کر رفع حاجت کرانا پھر تہمد کی گھنڈی لگا، لٹانا اور پیشاب پاخانہ اٹھا کر لے جانا۔ تھوڑی دیر بعد گرم گرم دودھ کا پیالہ لے کر آنا اور پھر اٹھا کر ہاتھ سے پلانا۔ دوپہر تک ایک دو مرتبہ پیشاب کرانا، اور وقت وقت پر کروٹ بدلوانا، پھر دوپہر کو شوربہ یا دال میں گلی ہوئی روٹی لے کر آنا...... اور کھڑے ہو کھلانا،...... سہ پہر تک دو مرتبہ پھر پیشاب کرانا اور چار کروٹیں بدلوانا اور پاؤں کمر پر مالش کرنا، سر میں تیل، دبا کر کنگھی کرنا، جمعہ کے جمعہ گرم پانی کی ناند بھر کر لانا اور روئی کے گالوں سے تمام بدن پر پچارا پھیرنا، سر میں بڑا اور کھلی ڈال کر صفائی کرنا، اور نہ معلوم کیا کیا کرنا، جتنی ''کریں'' تھیں سب بیوی کے ہی ذمہ تھیں اور شوہر کے سر ایک بھی نہیں، اور شاید انہیں ''کروں'' کے شدید احساس سے اس کے ٹھنڈے خون میں رات کے کھانے کے بعد لہری اٹھتی اور اس کے ہاتھ خاتون کے بدن پر ناچنے لگتے اور ہونٹ رخساروں پر سے پھسل کر ہونٹوں سے جا چپکتے...... یا نہ معلوم کیوں!...... اور عیدو فلاسفر تو تھا نہیں آدمی تھا۔ آدمی بھی ایک چہارم، اور تین چہارم مٹی کا تودہ اگرچہ چہارم بھی آدمی نہ ہوتا اور سب کا سب مٹی کا تودہ ہی ہوتا تو بھی کہتے ہیں کہ مٹی کا تودہ بھی احساس کر لیتا ہے، لیکن اس چہارم آدمی میں ہی پورے چار آدمیوں کی حس تھی اور تین چوتھائی مٹی کے تودے میں بچھو کے ڈنگ جیسی سوزش!...... وہ

خوب سمجھتا تھا کہ وہ اس کی روزی کا کفیل نہیں۔ اس کو روزی بڑے بھائی کی محنت سے ملتی ہے۔ اس کی نوجوانی کے لہراتے جذبات کا کفیل نہیں اور شاید اس کی کفالت کسی پر نہیں ہے۔ جو روزی سے زیادہ شدید تقاضا ہے اور وہ بھرا بھر جوانی چوکڑی بھولی ہرنی ہے۔ ریت کے ٹیلوں میں گم! ...... جسے اپنا راستہ یاد نہیں، بس جستیں ہی جستیں اور تلاش ہی تلاش مقدر ہے......

3

اور ماگھ پوس کی ایک یخ بستہ اندھیری رات میں خدمت اور تیمارداری کے احسان کی چٹان تلے دبے بیمار و نزار عیدو کی خلاف معمول آنکھ کھل گئی۔ کوٹھری کے دروازہ کا ایک کواڑ بند تھا۔ دوسرا آدھا کھلا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں پیال پر خاتون کا بستر تھا اور جیسے پیال پر اٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی اور پھر برآمدہ کی دہلیز پر سایہ سا جاتا معلوم ہوا اور یہ سایہ کی حرکت سے عیدو نے اندازہ کرلیا کہ خاتون اٹھ کر باہر گئی اور صحن میں دوسری جانب سے ایک اور سایہ بڑھا، اور کہرے اور دھوئی کی ڈولتی ہوئی متحرک کالی چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود اس نے بڑے بھیا کے سائے کو پہچان لیا اور سمجھ لیا کہ شبراتی اپنے کوٹھرے سے باہر نکل کر آیا۔ صحن میں دونوں سائے جمع ہوگئے۔ سامنے کٹی کا دروازہ تھا اور جیسے دونوں کٹھار کی جانب بڑھے اور کٹھار کی زنجیر اور کواڑ کھلنے کا مخصوص کھٹکا جس سے عیدو کے کان بچپن سے خوب مانوس تھے اور پھر خواہ کتنے ہی آہستہ کواڑ بند ہوئے مگر ان کی چوخ چول تو عیدو کے کانوں میں پوتڑوں میں پڑی تھی ...... اور عیدو کی کوٹھری اندھیری تھی۔ خاتون کا برآمدہ اندھیرا تھا۔ گھر کا صحن گھٹا ٹوپ تھا اور کٹھار کی کوٹھری تاریک در تاریک تھی اور عیدو کی علیل نگاہ اپنی کوٹھری کے اندھیرے کو چیرتی، خاتون کے برآمدے کے اندھیرے کو چیرتی صحن کی اندھیری کو پھاڑتی کٹھار کے کواڑوں کو توڑ کر اس پار کی تاریکیوں میں سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اندر کی گرمی اور نمی سی جیسے ناک کے نسوے پر محسوس ہو رہی تھی۔ برسات کی سیلن سی، بدبو، بھکراند، ...... گویا اسکرین پر دو کھیلتی مورتیں، زندہ! ایک جان دو قالب رونگٹا رونگٹا متحرک ہی متحرک ...... گرم ہی گرم، گرم و نم اور اسے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی ماگھ پوس ملتی جمی رات میں لو کی سی جھرجھری! ...... مگر وہ تو حرکت سے بھی معذور تھا، گرمی سے بھی محروم ...... مگر ناک کے ٹھنڈے نسوے سے لے کر ناف تک سنسناہٹ ہوگئی...... جیسے کوئی چیز بڑی تیزی سے رینگتی چلی گئی۔ سن سن سناٹا، شائیں ...... علیل خون میں جوار بھاٹا سا اٹھا اور کنارے سے دور کہیں آدھے راستہ پہنچ کر ہی مندھا گیا ...... لیکن دل تو مفلوج نہیں تھا اور دماغ بھی تندرست تھا، اور دل سے خون کی موٹی موٹی دھاریں صاف کر کر کے دماغ کی جانب اندھا دھند پھینکنی شروع کیں ...... اور دماغ نے تجزیہ کیا، اور ایک لہر سیدھی نیچے کو بڑھی مگر کمر کے پتھریلے بند سے ٹکرا کر واپس آ گئی اور جیسے ردعمل میں سرسراتے ناگوں کی طرح لہراتی دماغ کی جانب لپکی، اور سینے میں سے گزرتے ہوئے لہراتے سانپ کترا کر جیسے دل کے کسی سوراخ میں جا چھپے، اور پھر خون صاف ہو کر سلامت روی کی چال چلنے لگا۔ چند منٹ میں پوری ایک کتاب دل و دماغ کے مجادلہ پر مرتب ہو کر سینہ کے صندوق میں محفوظ ہوگئی۔ کھٹکے پر کان چونکے، کٹھار کے کپاڑ کے کھلے اور بیوی اور بھائی کے سائے پھر صحن میں کانپتے سے معلوم ہوئے، پیال کے تنکے جھنجھنائے اور خاتون کا سایہ سامنے بستر میں دبک گیا، ...... اور معذور مفلوج کے اندر سوال ابھرے اور اندر ہی جواب مل گیا، ہوں، جنس کا جائزہ لینے گئے ہوں گے بھاوج دیور کٹھار میں، ...... ''مگر آدھی رات جنس کے جائزہ کا کون وقت ہے!! ...... ہوں اونھ، ......'' اور اس نے آنکھیں بند کرلیں اور لحاف میں منہ بھی ڈھک لیا، اور آنکھیں بند کرتے ہی صبح کے پیشاب پاخانے سے لے کر نگاہ سوتے وقت کے دودھ کے

کٹورے تک چڑھ گئی اور پھر زور سے بڑھ کر ہفتہ مہینہ اور سالوں تک پیچھے دھکیلتی چلی گئی اور الٹی چل کر آگے گئی اور آگے زندگی کا ریگ زار تھا، تاریک والا، محدود اور اس کا کنارا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود بھی کہیں دور دور بھی دکھائی نہ پڑا، خاتون یا معذوری کا سہارا بڑھاپے کی ٹیک اور بیماری کی دوا...... اور عیدو دھیاتی دل اور مجبوری میں سمجھوتہ کرا کر سوگیا، اور صبح کو بالکل مطمئن اٹھا۔ جیسے شیر خوار بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں کی دہنی ہاتھوں کا تھپکا میٹھی لوری پر گہری بے خبر نیند سو کر...... اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تو جیسے اس پر ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ خاتون حسب معمول پیشاب پاخانہ کا برتن لے کر آئی۔ اپنی معذوری اور بیماری...... اس کی خدمت اور تیمارداری...... اور پھر جیسے رات کے واقعات کا ہلکا سایہ ساد ماغ کے پردہ پر منعکس ہوا، اور فوراً ہی معدوم ہو گیا...... خاتون کی بھر بھرائی جوانی...... شبراتی کی جانفشانی...... جو اپنے بل بوتے پر اکیلا ذرا سی آبائی زمین کے سہارے پورے کنبے کا بار اٹھائے ہوئے ہے!...... اور سب سے زیادہ خود اس کا اپنا بار چارپائی پر پڑے پڑے! اور وہ اور خاتون دونوں اسی پر تو لدے ہوئے ہیں...... اور پھر، پھر تو وہ یہاں تک جا پہنچا!...... اور اگر شبراتی نے اپنے اوپر خاتون کا پورا بوجھ رکھ بھی لیا تو ایسی کیا بات ہے...... اور سمجھوتہ راسخ تر ہو گیا...... بار مل گیا...... ادھار چک سا گیا...... دن کا دن چڑھا اور رات کا رات اترتا ہوا قرضہ صبح کے صبح پاک۔

4

بہار کی ایک نمناک خنک صبح کو عیدو کی آنکھ جیسے کسی شور پر کھلی۔ چڑ چڑ چڑا چڑ چھت سے دو چڑے لڑتے ہوئے چارپائی کے برابر زمین پر آگرے اور گتھ گئے اور چڑیوں کے دو جوڑے ہمیشہ سے چھت میں رہتے تھے اور عیدو کی تنہائی کے رفیق تھے اور عیدو ان میں سے ہر ایک کی جبلیت کا پورا محرم تھا، اور دن کے سنسان گھنٹوں میں ان کے مشاغل دیکھ دیکھ کر وقت کاٹتا اور دل بہلاتا تھا۔ دو تین روز سے بڑے چڑے کی چڑیا غائب تھی...... شاید کسی اور چڑے کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یا باز شکرے نے جھپٹ لی تھی اور چھوٹے چڑے کی چڑیا اس وقت مابہ النزاع تھی۔ نیچے پہنچ کر دو منٹ پھدک پھدک کر چونچ پنجوں سے پٹتی رہی، پھر کشتی ہونے لگی، کبھی یہ ادھر کبھی وہ...... کچھ دور پر چڑیا بیٹھی دیکھتی رہی۔ جیسے نتیجہ کی منتظر، چارپائی پر پڑا عیدو دیکھتا رہا، شاید نتیجہ سے بے خبر...... اور جیسے دونوں چڑوں کے خون کا جوش عیدو کے سینہ میں سمایا، چیونٹیوں کا دَل گردن سے رینگ کر کمر کی جانب بڑھتا محسوس ہوا...... پھر آگے تو راستہ بند تھا جیسے کچھ اپنا تھا ہی نہیں، گویا کسی اور کے شاید شبراتی کے کمر کو لبے رانیں پنڈلیاں فٹ تھیں اور اوپر نیچے میں ربط نہ تھا، اور جب اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو چھوٹا چڑا شکست کھا کر فرار ہو رہا تھا، اور دوسری نگاہ ڈالی تو سامنے کھنٹی پر بڑا چڑا اس کی چڑیا کے ساتھ اختلاط کر رہا تھا...... عیدو نے ایک لمبی سانس لی...... یہ تو گردن سے لے کر دُم تک پورے گریوں والا چڑا بھی شکست کھا گیا...... اور شکست کھانے کی قوت تو تھی اس میں! اور یہاں تو یہ بھی نہیں...... شکست کھا کر بھی شکست کے لیے اسے کسی کی مدد درکار ہے پاؤں سے لے کر کمر تک افتاں و خیزاں نگاہ چڑھی اور جیسے رونگٹے رونگٹے پر ٹھوکر کھاتی کمر پر پہنچ کر چاروں شانے چیت جا پڑی، آنکھیں بند ہو گئیں۔ ذرا دیر میں بھاوج کی گرج اور بیوی کی چنچناہٹ پر کان چونکے، صحن میں دونوں لڑ رہی تھیں۔ شروع شروع میں تو مکالمے گول گول رہے۔ مگر وہ دونوں سے اچھی طرح سمجھتا رہا اور لفظ لفظ کی وضاحت اس کے دماغ میں گونجتی رہی، مگر وہ سمجھے رہا کہ دیورانی جٹھانی کی روایتی تو تو میں میں ہے...... اونھ! گھریلو...... دال آٹے چاول، گڑ، تیل، گھی کے گرد گھومتی ہوئی لڑائی، جیسی گھر گھر ہوا کرتی ہے اور اس نے آنکھیں بند کر کے دبیز رضائی بھی منہ پر ڈھک لی اور خیر آنکھیں تو بند کیے بند بھی ہو جاتی ہیں، مگر یہ کان کم بخت تو

ہر وقت کھلے ہی رہتے ہیں اور سات تہوں میں دبا ؤ لاکھ انگلیاں ٹھونسو، ظالم سنتے ہی رہتے ہیں اور عیدو کے کان تو جیسے اس کے دماغ کے اندر کی آوازوں سے پن پنا پن پنا کر بھاوج کا کہا سن رہے تھے اور عیدو کی آنکھیں تو اندھیرے میں بھی دیکھتی تھیں، کھلی، بند یکساں اور اندھیرے کٹھار میں اور بھی زیادہ اور واضح!...... اور کچھ سمجھائی کا کیا سمجھنا، اور اس نے تو دل تک کو سمجھ لیا تھا...... خاتون کے طلائی مکھن سے چکنے چکنے ہاتھ ہیں۔ جن میں سہاگ کی چوڑیاں جھنجھناتی ہیں، برف کی چوٹی سا سینہ ہے، جس میں لاوا بھڑ بھڑاتا ہے۔ ریشم کی پوٹ سی کمر، جس میں مچھلیاں سی تڑپتی ہیں اور انہیں کے بل پر کھڑی ہو کر وہ اس کے کیچوے جیسے وجود کو پالتی ہے، اور کیچوا تو نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے...... اور پھر کمر ٹوٹا کیچوا تو رینگنے کا بھی اہل نہیں ہوتا تو وہ پھر کیوں دیکھے اور کیوں سنے۔

مگر کمر ٹوٹا، اندھا بہرا کیچوا تو سب سنتا رہا اور سب کچھ ہوتی رہی اور دیکھتا رہا۔ ''ہوں چھنال...... تیرا تو اللہ نے چھین لیا اور تو نے مجھ پر ہاتھ صاف کیا دن دیہاڑے۔''

''چپ، چھنال ہوئے گی تو، آئی بڑی تہمت دھرنی۔'' خاتون نے بڑی مشکل سے جھینپ دبا کر کہا۔

''اچھا رنڈی، تہمت! تہمت! کیا میں اندھی ہوں؟ اور تو تو اندھرا گئی ہے۔ آگ میں بیسوا۔'' جیسے شبراتی کی بیوی کے منہ سے یکے بعد دیگرے شعلے نکل پڑے۔

''چل نگر خصمی......'' خاتون نے سنبھلتے ہوئے جیسے کسی اور کے حلق سے نکالا۔

''جا جا چھنال! چوری اور سینہ زوری بات کرنے کے قابل ہے تو بھی......'' دروازے پر شبراتی کی مٹھار سن کر مدہم آواز میں کہا۔

''چھنال تو کہ میں، آئی بڑی، کوئی وہ بن کے۔'' شبراتی کی چاپ پر خاتون نے روہانسی آواز میں کہا۔

اور اتنے میں شبراتی کی شیر کی سی گرج سنائی دی، جس کے لوہے کی الاٹ سے قد میں بھینسے کی طرح چبوترہ سی سنگین کمر تھی۔ جس میں جمنا پار دو بیل کی طرح مضبوط اور کاٹھیاواڑی گھوڑے کی طرح تند پڑتی ہوئی ٹانگیں لگی تھیں۔ جن کی دھمک کے مارے دھرتی پانی چھوڑتی اور پاتال تھراتی تھی، جو سب کا کفیل تھا اور ہر بات کا اہل...... اور کمر ٹوٹا کیچوا، ابھی تو اسی کی اہلیت کے بل پر بلبلایا کرتا تھا۔

شبراتی کی گرج پر خاتون تو سہم کر چپکی ہوئی شبراتی کی بیوی ایک دو بار چیخی چلائی اور پھر بیل ہانکنے کے ہنٹر کے ڈنڈے کی آواز سنائی دی۔ شبراتی کے دونوں بچوں کی چیخ و پکار اور بیوی کی آہ و بکا، ذرا دیر، بس شور ہی شور! ادھر پھر ڈنڈا پیٹنے کی دھما دھم اور پھر مدھم شور اور مکمل خاموشی۔

اور یہ روزانہ نہیں تو اٹھوارے میں چار دن کا معمول بن گیا اور ہمیشہ شبراتی کا ڈنڈا بیچ میں پڑ کر بیچ بچاؤ کر دیتا اور جب شبراتی کھیت پر ہوتا، تو لڑتے لڑتے صبح سے دوپہر ہو جاتی، اور دوپہر کو خاتون عیدو کے لیے دودھ روٹی لے کر آتی تو عیدو کی آنکھیں اس سے چار نہ ہوتیں، گردن جھکائے ہی جھکائے کنورا لے لیتا اور یک دم سڑوپ جاتا جیسے چڑا چڑا، ڈرا ڈرا سا...... اور کھا پی کر بغیر ہی ہوں ہاں کے لیٹ جاتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ مبادا کہیں خاتون آج کی لڑائی کی بات چھیڑ دے......

5

اور بات تو کٹھار سے نکل کر پہلے شبراتی کی بیوی کے کوٹھرے میں پہنچی تھی اور جب وہاں شبراتی کا ادھوڑی استر جوتا ختم نہ کر سکا تو نکل کر

صحن میں ناچنے لگی اور اس ناچ کو شبراتی کا ڈنڈا نہ روک سکا، اور سب گھر والوں تک حتیٰ کہ ذہین اور تیز گوش قسم کے پڑوسیوں تک پہنچ چکی تھی البتہ عیدو کے منہ در منہ نہ پہنچی تھی۔ مگر سب کو یک گونہ حیرت ہوئی اور سب سے زیادہ عیدو کی بات تو بدستور چلتی رہی۔ مگر شبراتی کی بیوی خاموش ہوگئی اور چھ مہینے روز کی چیخ چیخ اور دھائیں دھائیں کے بعد اس کی یہ سکون کی کیفیت حیرت زا تھی...... حتیٰ کہ اب شبراتی کے کوٹھرے سے بھی بھوت چڑیل کے چیخنے کی آوازیں نہ آتیں۔

شبراتی کی بیوی کی پہاڑ سی اٹل نسائیت کا بڑی اقتصادی مصلحت کے ساتھ سمجھوتہ ہوا، اگرچہ اس کی عورت والی جبلت اندر ہی اندر لاوے کی طرح پکتی رہی مگر خارجی طور پر سکون رہا اور مصلحت کا پلو تو ہمیشہ سے بھاری رہا ہے اور وہ بھاری بھرکم پن کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ جیسے کسی خاص مطمع نظر کے تحت خونیں آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر بھی اندھی رہی، اور لالچ تو اندھا کر دیتا ہے اور بہرہ اور گونگا بھی اور آبائی زمین سے تو بڑی محبت ہوتی ہے...... اور شبراتی نے آبائی زمینداری کی کل توریث کا سبز باغ اس کے دونوں لڑکوں کے حق میں دکھایا، اور عیدو اور خاتون کو نکال دینے سے آدھی زمینداری نکل جانے کا خطرہ ظاہر کیا...... اور زن، زر، زمین کے روائتی جذبات پر زمین کا لالچ غالب آ گیا اور اولاد کے مستقبل کے لیے تو ماؤں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔

مگر آج آثار شدید تھے۔ جیسے چھیوں مہینے کے شور آج یک دم صحن میں پھٹ پڑے تھے۔ خاتون تو خیر علیحدہ تھی۔ آج منہ در منہ شبراتی اور اس کی بیوی میں ہو رہی تھی اور خلاف معمول شبراتی ڈھیلا اور بیوی تنی ہوئی تھی...... تھوڑی تو تو میں میں کے بعد شبراتی دروازہ سے نکل گیا اور شبراتی کی بیوی گلے میں رسی ڈال کر چھپر کے شہتیر میں لٹکنے لگی، بچوں نے دوڑ کر شور مچایا اور چوپالی سے اٹھ کر شبراتی اندر کو بھاگا اور خیریت گزری کے وقت پر آ گیا اور ابھی لٹکنے نہ پائی تھی کہ گلوخلاصی کر کے پکڑ لیا، تو دیواروں سے زور زور سے سر ٹکرانے لگی اور آج پہلی مرتبہ شبراتی نے اپنا ڈنڈا کھٹل محسوس کیا، اور پھانسی اترتے گلے پر ڈنڈا تو ڈنڈا تلواریں بھی کھٹل ہو جاتی ہیں...... اور شبراتی نے ہمیشہ لات سے اترنے والا بھوت بات سے اتارنا چاہا اور پھانسی کے پھندے سے نکلی ہوئی عورت کے رونگٹے رونگٹے سے زخمی شیرنی کی سی چنگاریاں چیخ پڑیں اور شبراتی کے کیوں کیا بات ہے کے رسمی سوال کے جواب میں جیسے چھ مہینے کی سینکڑوں خاموش عورتیں بکھر کر جا پڑیں۔ ''تو نہیں جانتا کیا بات ہے! تیری وہ ہوتی سوتی تو سب جانتی ہے۔ نگوڑی چھنال نے تجھے نہیں بتایا، پانچ مہینے بیت گئے بیسوا کو...... اور تو، تو میری چھاتی پہ سال بھر سے دکھ دکھاتے مونگ دل رہا ہے منا چھنلا کہیں کا مکار!''

''اور پانچ چھ مہینے بیت گئے!'' سنکر تو ایک دفعہ کو شبراتی اچھل پڑا۔ کہتے بن نہ پڑی، سٹ پٹا کر سنبھلا، چور ضرور تھا مگر کوتوال سے ساز باز کئے چور تھا۔ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔ ''جھوٹ بالکل جھوٹ بکتی ہے۔''

''میں جھوٹ بکتی ہوں...... کل سب پر کھل جائے گا اور دور کیوں جاؤ اپنی اس نگوڑی بیسوا سے پوچھ لو، اور کاہے کو دیکھ لو نا وہ سامنے کھڑی ہے چھنلا منکا سا پیٹ لیے......'' ...... اور خاتون مظلومیت کے انداز میں کھمبے کی آڑ پکڑنے لگی جیسے کوئی پھنسا ہوا چور...... اور انکھیوں سے اس جانب دیکھ کر شبراتی اچھی طرح سنبھل گیا اور ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

''تو ہی بچ، چل اتو کیا بات ہے!''

اور جیسے شبراتی کی بیوی کے نتھنوں سے چتیل سانپ پھنکار پڑے۔ ''چل چھنلے، مکار جھوٹے، فریبی، اور سال بھر سے معلوم دم دے رہا ہے بتا تیرے میرے بیچ کیا بات ہوئی تھی جو میں سال بھر سے منہ سیئے بیٹھی بھیتر ہی بھیتر پھنک رہی ہوں اور تو گل چھرے اڑا رہا ہے۔''

''کیا بات ہوئی تھی؟'' شبراتی نے اپنے ڈھیلے ڈھالے انداز کو جھٹکے دار لہجے سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''ہوں...'' اور جیسے سر سے پاؤں تک ناگنیں ہی ناگنیں لہرا پڑیں، ادب لحاظ، تہذیب، میاں بیوی سب رشتہ کٹ ہی گئے تھے۔ جواب طلبی ہی جواب طلبی تھی۔ ''آج کیسا بورا بنتا ہے۔ موا مکار، سال بھر سے مجھ رنڈیا کو دم لاسے دے رہا ہے کہ باپ کی سب جائیداد تیرے لڑکے کو ملے گی اور میری آنکھوں میں تکلے گھونپ گھونپ کے سامنے......''

''تو کیا عیدو، باپ کا بیٹا نہیں'' ڈھٹائی اور عذر لنگ کے سہارے شبراتی نے بات بدلنی چاہی۔

اور جیسے شکاری کتا خرگوش کو جھنجھوڑ پھینکتا ہے۔ ''چل دور ہو بٹ بنے! جھوٹے سب معلوم ہے کون کون حرامی باپ کا ہے اور تو کیا جانے گا۔ جانی کار حرامی بچے! تیری اماں چھنال کو بھی معلوم تھا۔ حلال کیا ہوتا ہے، منے پھنلے! نگوڑے پاپی، موئے کتے اب بتا جو تو نے سال بھر سے مجھے دم دیے، اور سوتیا ڈاہ کا جوالا مکھی بھڑ بھڑا، بھڑ بھڑا کر لاوا اگل رہا تھا۔'' مگر سال بھر کی ڈھیل میں شبراتی کی ڈھٹائی چٹان کی طرح بے حس اور اٹل ہو گئی تھی، کچھ شوخی اور بے حیائی کے ملے جلے انداز میں کہتا ہوا باہر نکلا چلا گیا۔ ''خیر یہی سہی مجھے اس سے کیا، میرے تو تینوں کو ملے گی۔''

6

اور شبراتی کے پیٹھ پھیرتے ہی چھتوں، اور چھتریوں پر گلہریوں اور چھپکلیوں کی طرح چپکی پڑوسنیں صحن میں اتر آئیں اور بات تو سب کی سب نہ معلوم کب سے جانے پڑی تھیں۔ آج نیا شگوفہ کھلا تھا، نیچے آتے ہی تجاہل عارفانہ سے دو طرفہ سوالات و جوابات کا، دغن چھڑ کا اور پھنیاں پھر بھڑک اٹھیں، ایک ہنسوڑ بہم قہقہے لگا رہی تھی۔ دوسری مسخری، ہنستے پر مخصوص سنجیدگی سے ڈانٹ رہی تھی۔ تیسری بول پڑی ''گھر بیٹھے آیا پوتا، بویا نہ جوتا۔'' کوئی ٹھنڈی پنچاتین بول پڑیں ''بویا نہ جوتا کیوں بوا؟ اس کا تو سات ہاتھ کا خصم بیٹھا ہے۔'' جب تک ایک بڑی بوڑھی نے لقمہ دیا ''بیٹا کہاں ہے، بہن لینا ہے۔ جبھی تو۔'' اور آنکھ مار کر شبراتی کی بیوی کی جانب اشارہ کیا اور شبراتی عیدو کی بیویاں غراتی ہوئی بلیوں کی طرح لڑتے لڑتے غت پٹ سی ہو گئیں۔ یہ پکی وہ کہی اور برآمدہ میں کوہنی اور بات ''ڈیکرس ڈرال'' سے بڑھ کر لپعل پوائنٹ پر پہنچ گئی۔ دنا دن ہونے لگی۔ برآمدہ کی دہلیز پر پہنچ کر شبراتی کی بیوی بڑے تڑاخے کے ساتھ بولی ''نہیں آج کھلوا کر چھوڑوں گی۔ اتنی پنچ بیبیوں کے سامنے منہ پہ بیسوا، چھنال بارہ تالی ہے!'' اور پھر ایک زہر کا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ ''بتا چھنال بتا! یہ کہاں سے لائی؟ رنڈی!'' اور ایک قدم برآمدہ کو بڑی خاتون بیچاری دو قدم پیچھے ہٹی اور عیدو کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئی۔ عیدو تو بڑی دیر سے سب کچھ خاموش پڑا سن رہا تھا اور یہ تو عورتوں کی لڑائی تھی۔ کمر کولہوں کی جنگ...... دھڑ مارا اپاہج کیا بولتا! لیکن جب لڑھتے پڑھتے بستر تک پہنچ گئی تو کمر کولہے ہی تو مفلوج تھے، زبان حلق پر تو لقوہ نہ گرا تھا اور شبراتی کی بیوی نے جس وقت ایک قدم چوکھٹ کے اندر بڑھا کر منہ سے ایک شعلہ سا نکالا ''نہیں آج کھلوا کر چھوڑوں گی چھنال سے، بول کس اپنے نکلے کا نہیں ملا تو میرے کا رکھ لیا۔ ایسی لات ماروں گی جو پل سے نکل کر جا پڑے'' تو جیسے عیدو کے اس کولہے سے اس کولہے تک کرنٹ نے شاک مار دیا۔ وہ بلبلا کر جا پڑا۔ سیلی بارود کے تودے پر انگارہ سا آ پڑا۔ منہ سے غلیظ دھواں نکلا اور گویا کمر کا مفلوج گریہ چناخ سے بولا۔ ''تو بھی نکما کہتی ہے۔ سینی ستیا! ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھ ابھی تو عیدو کی آنکھیں کھلی ہیں کہے تو بال بال میں رکھ دوں! سب بھول گئی نیک بخت'' اور پھر مخصوص انداز میں لہجہ بدل کر کہا۔ ''اس کا خیر آج شبراتی کا ہے، پھر یہ نکما نہ ہوتا تو تیرے دونوں کہاں

سے آتے کچھ یاد ہے کل کی ہی بات ہے......''

ادھر عیدو کے ڈھیر میں سے گویا دو مردوں نے تن کر بیوی کو پاک دامنی کی چادر میں ڈھانک لیا۔ ادھر خاتون سینہ تانے دندناتی برآمدہ میں آپڑی اور شبراتی کی بیوی ایک دھکے سے الٹ کر باہر صحن میں جا پڑی، آواز حلق میں بند، ساری اکڑفوں ڈھیلی، غصہ کافور، یا تو لال بھبھوکا ہورہی تھی یا پیلی پنکار پڑگئی۔ آنکھیں اپنے آپ جھک گئیں اور کڑہی سے چاٹنے لگی۔ جیسے عیدو نے اس کے سر پر گو سے بھرے ہوئے دو گھڑے ٹکرا کر پھوڑ دیئے......اور خاتون صحن میں پہنچ کر بیچ بیبیوں کے بیچ کھڑی گرج رہی تھی۔'' لے، حیادار جب تو نہیں، اب کھا پھانسی......لونڈے گھیرنی بڑی ناک والی ہے تو لٹک جا......، اور حقارت کے ساتھ ہونٹ بچکا بچکا کر پڑوسنوں سے داد طلب کر رہی تھی، اور جب تک ''ذہن تیز'' پڑوسنیں بات لے اڑیں۔

''ہے ہے بیبیو برا زمانہ ہے۔''

''چودھویں صدی ہے چودھویں! حرام حلال ہے حلال حرام!''

''اور بوا کسی کے کہے کوئی حرامی ہوجاتا ہے۔''

''اری جس کا باپ زندہ ہے اسے کون حرامی کہے!''

''اے تو بہن وہ تو پچھلی پولیس کھول رہا ہے اور اب تو معصوم ہے، آپی، گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔''

''ہاں بیبیو خدا جانے......تین برس تو منہ پہ مونچھیں رکھائے کوارا اٹھیارا بھاوج کے کولہے لگا کھاتا رہا ہے۔''

''ہوں، بہن تین چار برس بھر کے کمائی کھائی تو برے جیون برے حوالوں کہیں جا کر چوتھے برس بیاہ منگنی کی بات اٹھاتی۔''

''ہاں ہاں، سو اس وقت سب سمجھے دیور کے مال کمائی حصہ بانٹ کے مارے بسورتی ہے۔''

''ہاں ہاں بی بی ہم بھی یہی سمجھتے تھے۔ مال کھا رہی ہے کنوارے دیور کا اس لیے بیاہ منگنی نہیں پٹنے دیتی، لو آج کھل کھلا!''

''کچھ مت کہو بیبیو، توبہ کرو توبہ! چودھویں صدی ہے۔ نگوڑی چودھویں۔ شیطان ہوا پلک مارتے ڈگاتا ہے۔''

''اب دیکھ لو نہ آج اس بے چاری خصم والی پہ کیسی دندنا دندنا، چڑھ چڑھ بیٹھتی تھی اور اپنی سب بھول گئیں۔ نطفہ لپک!''

''دھوئی دھائی، چنداسی۔''

''کیوں نہ، زمانہ سیدھا ہے۔ آج مسٹنڈے خصم والی جو ہیں، لمبی ناک ہے اور چاند سے بیٹوں کی اماں ہیں'' (قہقہہ لگایا)

''پھر آج پونچھ جڑ سے لی اُسی لُچے نے!''

اور شبراتی کی بیوی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی اپنے کوٹھرے کو چلی گئی اور بڑے زور سے بخ کر کواڑ بند کر لیے اور کواڑوں کے دھاکے پر سب پڑوسنوں نے ڈراپ سین والا قہقہہ لگایا، اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا، وہ بڑبڑاتی اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

7

شام کو خاتون کوٹھری میں آئی، عیدو پر چھائی ہوئی سی، جیسے بیساکھ جیٹھ کی گرمیوں میں بیچ در بیچ آکاش بیل شاداب ہو کر گیند کی صورت

چڑھی ہوئی سوکھے سوکھے، چوسے ہوئے درخت کی ٹھرائی ٹھرائی، پتیوں اور اینٹھی اینٹھی، روڑھی بے جان سی شاخوں کو ڈھانپے ہوتی ہے...... قد ٹھگی پر کھنچا ہوا سا، سینہ پیٹ سے آگے ابلا پڑتا اور پیٹ، سینہ سے آگے ابھنا جاتا تھا اور کولہوں پر تو جیسے دو ربیوں کی چلتیاں تھل تھلا تھل تھلا کر کپڑوں سے باہر نکلی پڑی تھیں۔ عیدو نے اوپر سے نیچے تک بھانپا، دائیں سے بائیں تک پرتالا، اور وہ تو خاتون کے جوڑ جوڑ بند کا آشنا تھا۔ پانچ سالہ محرم راز اور تین سالہ رفیقہ حیات...... اندر سے باہر تک دیکھ کر اندازہ کیا کہ خاتون بن تری کی طرح پھول رہی ہے۔ جڑ سے پھنگی تک ہری بھری، اینڈتی اکڑتی، لال لال بیرا بوٹی جیسے پھل سے لدی ہوئی...... گلابی رخساروں پر برسات کی شفق پھوٹ پڑی ہے، اور پنکھڑی سے ہونٹوں پر یاقوت کی چھوٹیں تڑپ رہی ہیں اور سراپے میں بجلی سی لہرا لہرا جاتی ہے۔ بشرہ کا ہرنی جیسا مخصوص انتشار اطمینان اور سکون سے بڑھ کر بانکپن اور استغنا تک پہنچ رہا ہے، جیسے ابھی ابھی گہری نیند سو کر دو چار انگڑائیاں لے آ کھڑی ہوئی ہے۔

عیدو نے کچھ عجیب سی نگاہ ڈالی، اور خاتون نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اکھڑ پن سے جواب دیا مگر جیسے اس کا جواب الٹا ہو کر اس کے منہ پر پڑا...... اور عیدو نے معلوم کیا سوچ کر بال کی نوک سے لے کر پاؤں کی چھنگلی تک نشیب و فراز کا گہرا جائزہ لیا اور اپاہج نظریں بالوں کے گھونگر سے نکل کر چمکتی، بلند پیشانی سے پھسلتی، رخساروں اور ہونٹوں کے پیچ و خم میں ناچتی، آہستہ آہستہ صراحی دار گردن سے گھوم کر اتریں اور سینہ کی گولائیوں اور بازوؤں کے اتار چڑھاؤ میں چکرا گئیں اور وہاں سے قلابازی کھا کر کمر کولہوں کے گداز میں دھنستی لڑکھڑاتی رہیں اور پھر ابھنک بھنکار جب پیٹ کے ''پرمعنی'' ڈھلان پر پہنچیں تو جم کر رہ گئیں۔ بہتیرا پھیلائیں ٹس سے مس نہ ہوئیں...... اور عیدو نے دیکھا کہ خاتون انگیٹھی سی دہک رہی ہے۔ انگارے ہی انگارے بھرے! اور جیسے جوہڑ کے گدلے پانی کو شفق کا عکس چمکا دیتا ہے۔ عیدو کی علیل آنکھوں کے دھندلے آئینہ پر خاتون کی تمام سرخیاں مچل پڑیں...... اور اس وقت تو وہ عیدو کے لیے دودھ ملیدہ لے کر آئی تھی۔ تمام دن لڑائی کی بھینٹ چڑھا تھا، نہ دوپہر چولہا گرم ہوا تھا، نہ اب۔ گھر بھر میں کسی کے منہ پر اڑ کے کھیل گئی تھی۔ صبح کا ایک کٹورا دودھ پیے عیدو بھی تمام دن کا یوں ہی پڑا تھا...... شام کو دودھ دوہ کر شبراتی خاموشی کے ساتھ رکھ کر باہر چلا گیا تھا، اور وہ تو اٹوٹی کھٹوائی لیے اندر پڑی تھی۔ خاتون نے چپکے سے دودھ گرم کیا، جلدی جلدی دو روٹیاں پکائیں اور کھانڈ ملا کر ملیدہ کیا اور دودھ میں ڈال کر لے آئی...... کٹورا برابر تپائی پر رکھا اور معمول کے مطابق اٹھنے کو سہارا دیا، اور سہارے دیتے وقت تو دونوں کے چہروں میں بہ مشکل تین چار انچ کا فاصلہ رہ جایا کرتا تھا اور آنکھیں ایک دوسرے سے بھڑ سی جایا کرتی تھیں، اور عیدو کی آنکھوں میں تو شعلے سے لپک اٹھے! نتھنے پھول گئے، کنپٹیاں پھڑک گئیں، اور بیمار، مفلوج، اپاہج بستر مرگ کی ارزل ترین سطح سے اچک کر زندگی کی ان ہیبت ناک بلندیوں تک جا پہنچا جہاں ملک الموت کے بھی پر جلتے ہیں، عیدو کے اندر مرد پھٹا، ٹائم بم کی طرح تند اور تلوار کی طرح تیز۔ تین سال کی معذوریوں مصلحتوں اور سمجھوتوں کا تھپکا مرد! اور بیٹھ کر سیدھے ہوتے ہوتے ''غوں، غاؤں، غپ!! خاتون کا سر عیدو کے ہاتھوں کے شکنجہ میں تھا اور پتلی کھڑی ناک جبڑوں میں، اور جیسے عیدو کے جبڑوں میں نوناہروں کا زور سمٹ آیا تھا اور خاتون کے ہونٹوں پر اس کی ٹھوڑی کی ڈاٹ لگ گئی تھی، بے چاری کی چیخ بھی منہ سے باہر نہ نکل سکی، اور جب کچ، کچ، کچ گاجر کی طرح چبا کر پوری ناک نگل گیا تو خاتون کا چہرہ گرفت سے اپنے آپ آزاد ہو گیا۔

O

ملک راج آنند

نام : ملک راج آنند

قلمی نام : ملک راج آنند/ ڈاکٹر ملک راج آنند

پیدائش : ۱۲ دسمبر ۱۹۰۵ء بہ مقام پشاور، صوبہ سرحد، بھارت (حال پاکستان)

وفات : ۲۸ ستمبر ۲۰۰۴ء بہ مقام: پونا، بھارت

تعلیم : بی۔اے (آنرز) پی ایچ۔ڈی

ابتدائی تعلیم پشاور میں پائی۔ خالصہ کالج امرتسر میں زیر تعلیم رہ کر ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے بی۔اے (آنرز) کیا۔ ۱۹۲۵ء میں شکالرشپ پر برطانیہ چلے گئے۔ یونیورسٹی کالج لندن سے گریجویشن کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی، برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

زندگی کے ابتدائی چند برس پشاور (صوبہ سرحد) میں گزرے۔ اجداد، جدی پشتی پنجابی تھے۔ اس دور کا ہندوستان باج گزاری اور معاشرتی بغاوت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس ناقابل برداشت حصار کو توڑنے کی خاطر چھوٹی عمر میں ہی قلم سنبھالا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ان ابتدائی اراکین 'میں سے ہیں جنھوں نے ۳۳۔۱۹۳۲ء میں اس ادبی تنظیم کے قیام کے لیے لندن میں میٹنگ کی۔ ۳۶۔۱۹۳۵ء میں جب انجمن کا دستورالعمل زیرغور تھا تو ملک راج آنند، انجمن کے نصاب سے متعلق بحث مباحثوں میں سب سے زیادہ سرگرم دکھائی دیے۔

لندن میں قیام کے دوران لندن کاؤنٹی کونسل سکولز میں انگریزی ادب اور فلاسفی کے لیکچرر کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں ہندوستانی ادبیات کے Lever Hulme فیلو اور بی بی سی لندن میں براڈ کاسٹر رہے۔ ایم۔او۔آئی (فلمز) کے سکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کیا۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں ٹیگور پروفیسر آف آرٹ اینڈ لٹریچر کے طور پر وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی ''اسرار خودی'' اور مہاتما

گاندھی کے افکار سے متاثر تھے، آگے چل کر انڈین سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے۔ طویل مدت بمبئی میں قیام رہا اور فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کرتے رہے۔ رسالہ ''Marg'' کے ایڈیٹر رہے۔ جنوب مشرق کے اس انٹرنیشنل شہرت کے حامل ادیب کی زندگی اور فن سے متعلق چند اہم کتب طبع ہو چکی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1. "Mulk Raj Anand" By Dr. M. K. Naik, Arnold-deinemann, publishers india Pvt. Ltd. AB/9. Safdarjung Enclave, New Delhi. 110016.
2. "Mulk Raj Anand" by Dr. K.N. Sinha. World Authors Series, Twayne Publishers, New York.
3. "The Lotus and the Elephant" by Jack Lindsay, Kutub Popular, 350, Tradeo Road, Bombay-4- 034, Also reproduced in Decay and renewal by jack Lindsay, Published by Lawrence & Wishart, London, 1977; Available from Colett's Bookshop, Charing X Road, London.
4. "An Ideal of Man in Anand's Writings" by D. Riemenshneider, Kutub Popular, address as above.
5. "Mulk Raj Anand, Man and novelist" by Margaret Berry, Published by E.F. Beale, Amsterdam.
6. "So Many Freedoms" by Dr. Saros Cowasjee,
7. Muld Raj Anand, Special Number, A Miscellaneous of various articles edited by Dr. Satyanarian Singh, Department of Englishe, Kakatiya University, Vidyaranyapuri, Warangal- 506 009. A.P. India.

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''اچھوت'' مطبوعہ: ''دشارت'' ۱۹۳۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

1.	Seven Summers	Orient Paperbacks, 1950
2.	Moarning Face (Novel)	Arnold Heinemann, 1968
3.	Confiession of a Lover	Arnold Heinemann
4.	Homage to Tagore (Criticism)	
5.	Lines Written to an Indian Air (Criticism)	
6.	On Education (Criticism)	
7.	King-Emperor's English (Criticism)	
8.	The Story of India	Arnold Heinemann
9.	The Story of India	

10.	Indian Fairy Tales	
11.	More Indian Fairy Tales	
12.	The Lost Child	Lavanya
13.	Untouchable (Novel)	Orient Paperbacks, 1935
14.	Coolie (Novel)	Orient paperbacks
15.	Two Leaves and a Bud (Novel)	Orient Paperbacks,
16.	The Village (Novel)	Orient Paperbacks, 1939.
17.	Across the Black Waters (Novel)	Vision Books, 1940
18.	The Sword and the Sickle (Novel)	
19.	The Barber's Trade	Mayfair - Orient
20.	Union and other Stories	Paperbacks
21.	The Big Heart (Novel)	Arnold Heinemann
22.	The Tractor and the Corn Goddess (Novel)	
23.	Private Life of an Indian Prince	Orient Paperbacks, 1953
24.	Reflection on the Golden Ben and other Stories	
25.	The Old Woman and the Cow: Gauri	Arnold Heinemann
26.	Death of Hero	Orient Paperbacks
27.	Power of Darkness	
28.	Between Tears and Laughter	Sterling Paperbacks
29.	The Road	Sterling Paperbacks
30.	Parsian Painting (Research)	Out of Print
31.	The Hindu View of Art (Research)	Out of Print
32.	The Goldan Breath	Our of Print
33.	Apology for heroism	Mayfair
34.	Album of Indian Paintings	National Book Trust of India
35.	The Volcano	University of Baroda
36.	The Third Eye	University of Baroda

۳۷ ''سات سال''، مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۶۲ء، ناول ''Seven Summers'' کا ترجمہ از رضیہ سجاد ظہیر

۳۸ ''Indian Short Stories'' انتھالوجی بہ اشتراک اقبال سنگھ The New India Publishing Co. London

غیر مدوّن:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ ''The Buble'' اور ''A World Too Wide'' زیر طبع۔ علاوہ ازیں ملک راج آنند کے متعدد افسانے اردو رسائل اور انتھالوجیز میں بکھرے پڑے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ان کے ایک ناول ''قلی'' کا ترجمہ کیا تھا جو ''نقوش'' لاہور شمارہ نمبرہ میں شائع ہوا۔

سورگ باش ہونے سے قبل مستقل پتا:

۲۵ کف پراڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۵۔ بھارت۔

اعزاز:

۱۔ فلاسفی آف آرٹ پرائز انٹرنیشنل اکیڈمی: ۱۹۸۵ء

۲۔ پدم بھوشن، اعلیٰ سول ایوارڈ: ۱۹۶۷ء

۳۔ فیلو، للت کلا اکیڈمی: ۱۹۷۴ء

۴۔ نیشنل اکیڈمی ایوارڈ برائے "Morning Face": ۱۹۶۸ء

نظریۂ فن:

"I think beyond literature of pleasure current in most parts of the world, there lie vast unknown areas of reality, about the lives of people who have never entered literature. I feel new generations of the young specially in Asia and Africa will go into the interious and recreatre the lives of the neglected the insulted and the injured."

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۲۷ جون ۱۹۸۵ء)

O

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر ملک راج آنند، راجا راؤ، اقبال سنگھ اور سجاد ظہیر

فطرت کا دل

ملک راج آنند

دن بھر مطلع صاف رہا تھا، لیکن شام ڈھلتے ہی بادل گھر آئے تھے، اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی، اور بادل گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ہیبت ناک دیو چنگھاڑ رہا ہو اور اس کے نوکیلے دانتوں کی چمک سے بجلی کوند رہی ہو۔ دفعتاً بادلوں کی وحشت ناک گڑگڑاہٹ وادی میں گونج اٹھی، اور کسانوں کی لڑکیاں، مرغی کے چوزوں کی مانند سہم کر اپنی اپنی پھوس کی جھونپڑیوں میں دبک گئیں۔

کرنل انٹونیو ڈی سلوا جو شمالی علاقے کے قیدیوں کے کیمپ کا نگراں تھا، اسی وقت شکار سے واپس آیا تھا، اور سارجنٹ کوسمو نے اس کے سامنے تھری اسٹار مارکہ پرتگالی شراب کی بوتل رکھ دی تھی، تاکہ کرنل اپنی تھکاوٹ اور پیاس دور کر سکے۔

بنگلے کے برآمدے کے باہر کھردرے پتھروں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ قیدیوں نے ان پتھروں کو بارود کے ذریعے قریبی چٹان سے نکالا تھا تاکہ پریڈ کا میدان ہموار کیا جا سکے۔ دائیں جانب ایک قلعہ تھا جس کی دیواریں کافی بلند تھیں۔

شکار کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے بعد انٹونیو خود کو بے حد تھکا ہارا محسوس کر رہا تھا۔ معاً اسے اپنے وطن کی یاد آ گئی۔ جو لزبن کے قریب تھا، اور جہاں زیتون کے درختوں کے لاتعداد جھنڈ تھے۔ جب اس نے کوکا کولا ملی ہوئی شراب کا گھونٹ چڑھایا، تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کی اس اضطرابی کیفیت کا سبب کیا تھا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ اسے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بھی شکار ہاتھ نہ آیا تھا! اسے اپنے منہ کا تھوک بھی ترش محسوس ہونے لگا۔

''کوسمو! ان قبائلیوں سے کہو کہ رقص کریں۔''

اس نے حکم دیا۔

اس ویران مقام پر جہاں مغربی تہذیب کی آخری نشانی صرف وہ قلعہ تھا۔ اگر سیاحوں کی تفریح کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ عورتوں کے مدھم

سروں میں گائے ہوئے گیت۔ یا نقاروں کی آوازیں جو آہستہ آہستہ شروع ہو کر کافی بلند ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن گاؤں ایک میل کے فاصلے پر تھا اور گاؤں والے اپنے رقص و سرور کی محفلیں رات گئے جمایا کرتے تھے۔ حکم سن کر تمام قیدی خاموش رہے، کوسمو یوں بے حس و حرکت کھڑا رہا جیسے اس نے کرنل کا حکم سنا ہی نہ ہو۔

آسمان پر گہرے بادل منڈلاتے رہے۔

کرنل واقعی گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے اس خطے کا ہر موسم برداشت کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ حکومت پرتگال کی فوج میں کافی عرصے سے ملازم تھا۔ وہ انگلستان کی بارش کی جھڑی سے بھی مانوس تھا۔ اس لیے کہ اسے چھ ماہ سینڈھرسٹ میں ٹریننگ کے سلسلے میں رہنا پڑا تھا۔ وہ موسم کی خرابی تو برداشت کرسکتا تھا لیکن اپنی حکم عدولی کو گوارا نہ کرسکتا تھا، اس لیے وہ چیخا:

''کوسمو!''

کوسمو نے دبے پاؤں برآمدے کے قریب آ کر سلوٹ کیا۔

''کیا تم نے میری آواز نہیں سنی؟''

''جی نہیں جناب'' کوسمو نے عمداً جھوٹ بولا۔

''میں نے قبائلیوں کے رقص کا حکم دیا تھا۔''

''قبائلی تو کل ہی رقص کے لیے آئے تھے جناب، اب وہ آج دوبارہ نہیں آئیں گے۔''

''لیکن میں نے انہیں بخشش دی تھی!''

کوسمو سر جھکائے کھڑا رہا۔ بادلوں کے سائے میں اس کا چہرہ کچھ زیادہ کالا نظر آنے لگا تھا۔ دفعتاً آسمان پر گڑگڑاہٹ ہوئی اور تیز بجلی کوندگئی۔

''پہرے داروں سے کہو کہ ان کے سرغنہ بدمعاش ڈاکٹر آدم کو بلا لائیں، اور ہاں، پہرے داروں سے کہو کہ یہاں آ کر شراب سے لطف اندوز ہوں۔''

کوسمو چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔

ماحول میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

''جاتے کیوں نہیں؟''

کوسمو نے نظریں اٹھائیں۔

''جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔'' کرنل اپنے پیر پٹکتا ہوا بولا۔

اسی وقت بجلی کڑکی اور کوسمو خوف زدہ ہو کر تیزی سے میدان کی طرف بھاگا۔

ہوا میں ہلکی حرارت آ چلی تھی۔ بارش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

لیکن پلک جھپکتے ہی گہرے کالے بادلوں کا جھنڈ آسمان میں آگے سرک گیا، اور انگولا کے زیریں حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن چند آوارہ بادلوں کے ٹکڑے اب بھی پہاڑی چٹانوں پر منڈلاتے رہے۔

کرنل نے آسمان کی جانب گھور کر دیکھا، اور فوراً ہی نظریں جھکا کر شراب کی بوتل پر جما دیں۔ اس نے گلاس اٹھا کر اپنے سوکھے گال سے لگایا، گویا گلاس کی ملائم سطح سے خنکی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

باہر قدموں کی آہٹ ہوئی اور وہ اپنی کرسی میں اکڑ گیا۔

ایک مختصر مجمع کے آگے آگے ڈاکٹر آدم نظر آیا جیسے وہ دفعتاً بنگلے کے احاطے کی زمین کے اندر سے نمودار ہو گیا ہو ڈاکٹر آدم نحیف و ناتواں اور اوسط قد کا انسان تھا۔ اس کی آنکھوں کی سپیدی چمک رہی تھی، اور اس کے کوٹ کا رنگ اس کے گہرے سیاہ چہرے کے رنگ سے متضاد نظر آ رہا تھا۔

''تم غالباً ڈاکٹر آدم ہو؟''

کرنل نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر آدم نے کوئی جواب نہ دیا اور کرنل سے پانچ چھ گز کے فاصلے پر ساکت کھڑا رہا۔

قلعے کے پانچ پہرے دار اور سارجنٹ کوسمو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

ہوا میدانوں میں چکر لگا رہی تھی۔ دفعتاً قریبی پہاڑوں پر بجلی کوندی!

کرنل نے محسوس کیا کہ فطرت بھی اس قیدی پر مہربان ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ سلسلہ کلام کیوں کر شروع کرے۔ پھر اس نے اپنی حس مزاح کا سہارا لیا۔

''مجھے بتلایا گیا ہے کہ تم نے لندن میں فی کس ٹراٹ، والٹز اور ٹینگو ڈانس سیکھا ہے۔''

ڈاکٹر آدم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں انگریز حسینائیں ضرور پسند آئی ہوں گی، خاص کر اس وقت جب وہ تمہاری آغوش میں رہی ہوں گی؟ کیوں؟ میرا خیال ہے کہ صرف خادماؤں نے تمہارے ساتھ رقص کیا ہوگا۔''

قیدی کے چہرے پر درد و کرب کے آثار ابھر آئے اور کرنل کی سوقیانہ گفتگو پر اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

''اور تم اپنے ہم وطنوں کا قبائلی رقص بھول گئے؟''

ڈاکٹر آدم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ان قبائلیوں کی تکلیف دہ خاموشی نے کرنل کو ہمیشہ پریشان کیا تھا۔ اس وقت بھی ڈاکٹر کی خاموشی اسے اذیت پہنچا رہی تھی۔ کیونکہ وہ اس قیدی کے چہرے کے تاثرات سے اس کے اصلی جذبات کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ کیا یہ حبشی اپنے ردعمل کا اظہار کرنا جانتے ہی نہیں؟...... کیا یہ افریقہ کے رہنے والے بھی انسان ہیں؟

''تو پھر کوئی قبائلی رقص پیش کرو۔ ہمیں تفریح چاہیے۔''

قیدی پتھر کے بت کی مانند کھڑا رہا۔

کرنل کے غصے کا پارہ چڑھ گیا، اس نے سارجنٹ کو آواز دی......

''کوسمو!''

سارجنٹ آگے بڑھا۔

''اس بدمعاش کو وہ ٹوپی دے دو۔ وہی بے وقوفوں کی ٹوپی۔ سرخ رنگ والی جو کل میں نے قبائلیوں سے چھین لی تھی۔ اسے پہن کر ناچنے میں یہ بھلا نظر آئے گا؟''

کوسمو نے برآمدے میں ہیٹ اسٹینڈ کے قریب جا کر وہ ٹوپی اٹھائی اور کرنل کے قریب پہنچ کر ٹوپی اس کی جانب بڑھا دی۔

''بے وقوف! اسے اس کے سر پر پہنا دو۔ یا خود تم پہن لو۔ مجھے کیوں دے رہے ہو؟''

کوسمو نے ڈاکٹر آدم کے سر پر وہ ٹوپی رکھ دی۔

ڈاکٹر آدم نے یہ بے عزتی بھی اسی سکوت کے ساتھ برداشت کر لی۔

قیدی کے سر پر وہ بے ڈھنگی ٹوپی دیکھ کر کرنل کے حلق سے ایک مصنوعی قہقہہ برآمد ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خاموش ہو گیا۔ کیوں کہ کسی دوسرے نے قہقہہ لگانے میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

دفعتاً کرنل کے چہرے پر کرختگی آ گئی۔

''ذرا اس بے وقوف کو دیکھو''...... اس نے پہرے داروں کو مخاطب کر کے کہا، اور زور سے ہنس پڑا...... ''تم لوگ اس پر ہنستے کیوں نہیں ہو؟''

احاطے کی خاموشی میں گونجنے والے اس حکم کا ردعمل محض پہرے داروں کے چہرے پر ابھرنے والی شکنیں تھیں، وہ لوگ کسی قیدی کو گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے لیکن اس پر ہنسنے میں دشواری محسوس کرتے تھے...... کیوں کہ ایسا کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ ممکن ہے قیدی بھی ان پر ہنسنے لگے یا ان کے منہ پر تھوک دے...... جیسا کہ متعدد افریقی پہلے کر چکے تھے......'

کرنل نے شراب کا گھونٹ اپنے خشک حلق کے نیچے انڈیل لیا، اور تیزی سے بولا:

''ناچو...... ناچو!''

آسمان پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ لیکن ڈاکٹر آدم نے اس مہیب گڑگڑاہٹ کو اس رقص کے لیے موزوں ساز تصور نہ کیا جس کا اسے حکم دیا جا رہا تھا۔

کرنل اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا، اور قیدی کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... اور اسے چکر دیتا ہوا چلانے لگا......

''ہا۔ ہا۔ ہا۔ قبائلی رقص۔ ہا۔ ہا۔ ہا''

قیدی خاموش رہا۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے قیدی کو رہائی کا پیغام دیا۔ کیوں کہ اب بارش شروع ہونے والی تھی۔

لیکن کرنل اپنی ضد پر قائم رہا اور ہنستا رہا۔

''بے وقوف! اور بے وقوفوں کے سر پر بے وقوفوں کی ٹوپی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔''

دفعتاً کرنل نے محسوس کیا کہ حاضرین اس کے کورس میں شریک نہیں...... اس کا تمسخر شدید جھنجھلاہٹ میں تبدیل ہو گیا...... اس نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر آدم کو ایک لات ماری، اور ڈاکٹر آدم لڑھک کر پہرے داروں کی رائفل پر جا گرا......

”ناچ، بے خوف ناچ۔ نہیں تو جہنم میں جا۔“

پہرے داروں کے جسم میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے جھک کر گرے ہوئے قیدی کو اٹھا لیا۔

کرنل برآمدے میں واپس پہنچ کر اپنی آرام کرسی میں دھنس گیا۔

احاطے میں ہوا کا تیز جھونکا در آیا۔

کرنل قیدی کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔

پہرے داروں کے سروں پر بارش کا پہلا قطرہ گرا۔

”بھاگ جاؤ...... نکل جاؤ!“ کرنل چیخ اٹھا۔

بارش کی جھڑی لگ گئی۔ شاید بے دردی سے قتل کیے جانے والے افریقیوں کے بھوتوں کی بے بسی نے فطرت کا دل بھی پگھلا دیا تھا۔



احمد ندیم قاسمی

نام	:	احمد شاہ
قلمی نام	:	پیرزادہ احمد شاہ/احمد ندیم قاسمی
پیدائش	:	۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء بہ مقام انگہ، تحصیل خوشاب، ضلع شاہ پور (حال: تحصیل و ضلع خوشاب) مغربی پنجاب، پاکستان۔
وفات	:	۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح، بہ مقام لاہور۔
تعلیم	:	بی۔اے، صادق ایجرٹن کالج، بہاولپور (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ۱۹۳۵ء۔

ابتدائی چار جماعتیں پرائمری اسکول انگہ سے پاس کیں۔ ۱۹۲۵ء میں کیمبل پور کے گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل سکول میں داخلہ لیا، جہاں سے آٹھویں کلاس پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں نویں اور دسویں کی جماعتیں کالج سے وابستہ تھیں۔ ابھی میٹرک کا امتحان نہیں دیا تھا کہ شیخوپورہ منتقل ہونا پڑا۔ گورنمنٹ ہائی سکول، شیخوپورہ سے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کیا اور اگلے چار برس صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۳۵ء میں صادق ایجرٹن کالج، بہاولپور (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے اجداد مجاہدین عرب کے ساتھ ایران سے ہوتے ہوئے ملتان، ہندوستان آئے بعدازاں خوشاب سون سکیسر کے ویران پہاڑی علاقے میں اسلام آباد نامی گاؤں بسایا، جسے نادر شاہ کی یلغار نے برباد کر دیا بعد میں اس آبادی کی بنیادیں انگہ، تحصیل خوشاب سے اٹھیں۔ یہ خاندان تبحرِ علمی اور پرہیزگاری میں مشہور ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کے والد کا نام پیر غلام نبی تھا جو اپنے علاقے میں ''نبی چن'' کے نام سے معروف تھے۔ وہ ساری زندگی جذب کی حالت میں رہے، نتیجتاً ندیم کا بچپن انتہا درجہ کے افلاس میں گزرا۔ ۱۹۲۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کے بے اولاد حقیقی چچا پیر حیدر شاہ ریونیو اسسٹنٹ کیمبل پور (حال: اٹک) نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ چچا کا تبادلہ کیمبل پور سے شیخوپورہ ہوا تو ندیم ان کے ہمراہ تھے۔

۱۹۳۱ء میں ندیم شیخوپورہ سے میٹرک کرنے کے بعد بہاول پور چلے گئے۔ ان کے چچا ریٹائرمنٹ کے بعد، نواب آف بہاولپور کے مشیر مال مقرر ہوئے تھے۔ ندیم دوران تعلیم صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے مجلّہ ''نخلستان'' کے اردو اور انگریزی حصوں کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۵ء میں بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں محرر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا، جہاں سے مستعفی ہو کر اوکاڑہ میں نو دن ٹیلی فون آپریٹر رہے۔ وہاں سے استعفیٰ دے کر ایک عزیز کی وساطت سے جولائی ۱۹۳۹ء میں محکمہ آبکاری ملتان میں سب انسپکٹر بھرتی ہوئے جہاں سے ۱۹۴۰ء میں چھٹی لے کر منٹو کے پاس دہلی گئے۔ منٹو اس زمانے میں منورنجن پکچرز، دہلی کی فلم ''بنجارہ'' لکھ رہے تھے۔ ندیم نے اس فلم کے علاوہ فلم ''دھرم پتنی'' کے گیت بھی لکھے لیکن وہ فلمی ادارہ ٹوٹ گیا اور دونوں فلمیں نہ بن سکیں۔ قیام پاکستان کے بعد البتہ فلم ''آغوش''، ''دوراستے'' اور ''لوری'' کے مکالمے لکھے۔ ۱۹۴۲ء میں دہلی سے واپس آ کر محکمہ آبکاری سے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر ۲۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کو امتیاز علی تاج کے ادارے دارالاشاعت پنجاب، لاہور میں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کی ادارت سنبھالی۔ اس زمانے میں دارالاشاعت پنجاب سے انہیں ستر روپے ماہوار ملا کرتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں ''ادب لطیف'' لاہور کے مدیر ہوئے۔ سالنامہ ۱۹۴۴ء میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''بو'' اور مضمون ''جدید ادب'' شائع کرنے پر حکومت پنجاب نے ان کے خلاف فحش لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں مقدمہ کھڑا کر دیا جو ایک برس تک چلا۔ اس دوران میں ندیم شدید علیل رہے۔ مئی ۱۹۴۵ء میں مقدمہ سے بری ہو کر علالت کے پیش نظر فروری ۱۹۴۶ء میں ''ادب لطیف'' لاہور کی ادارت سے دست بردار ہوئے اور گاؤں چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پشاور ریڈیو میں بطور سکرپٹ رائیٹر ڈیڑھ برس تک ملازمت کی ۱۹۴۸ء میں شادی کے بعد مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ''سویرا'' لاہور مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور آ کر منہ بولی بہن ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ''نقوش'' لاہور کی ادارت سنبھالی اور ''نقوش'' کے پہلے دس شمارے مرتب کیے۔ ۶ جولائی ۱۹۴۸ء میں قریبی عزیزہ رابعہ کے ساتھ شادی ہوئی۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں انہیں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ ''نقوش'' اور ''ادب لطیف'' کے مالکان نے اپنے پرچوں کو انجمن کا آرگن بنانے سے معذوری کا اظہار کیا تو ندیم نے فیض، ہاجرہ مسرور، ممتاز حسین اور حمید اختر کے ساتھ مل کر الطاف پرواز کے پرچے ''سحر'' کو انجمن کا نظریاتی پرچہ بنا دیا مگر اس کا صرف ایک شمارہ ہی آ سکا۔ مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء سیفٹی ایکٹ کے تحت ندیم نے تقریباً سات ماہ جیل میں گزارے۔ ۵ مارچ ۱۹۵۳ء میں روزنامہ ''امروز'' لاہور کے مدیر ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے انتشار کے سبب سیکرٹری جنرل شپ سے دستبردار ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۵۹ء تک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند رہے۔ ۱۹۵۹ء کے اواخر میں ایوب خان کے پریس ٹرسٹ قائم کر دینے کے سبب 'امروز' سے استعفیٰ دے دیا اور فری لانس ادیب کے طور پر ''احسان'' لاہور، ''ہلال پاکستان''، ''حریت'' کراچی اور ''جنگ'' کراچی کے لیے فکاہی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۳ء میں اپنا ادبی مجلّہ ''فنون'' جاری کیا۔ ۱۹۷۴ء سے جولائی ۲۰۰۶ء مجلس ترقی ادب، لاہور کے ڈائریکٹر رہے اور مجلس کا مجلّہ ''صحیفہ'' بھی ترتیب دیتے رہے۔ دل اور پھیپھڑے کے امراض میں مبتلا ہو کر پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی، لاہور میں زیر علاج رہ کر وہیں انتقال فرمایا۔ تدفین شاہ مشائخ قبرستان، ملت چوک، سمن آباد، لاہور میں ہوئی۔

اوّلین تخلیق:

ایک رشتہ دار غلام جیلانی کی والدہ اور اپنی کم سن ہمشیرہ کی وفات کا مرثیہ (اپریل ۱۹۳۰ء)

اوّلین مطبوعہ تحریر:

نظم: مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ مطبوعہ: ''سیاست'' لاہور: جنوری ۱۹۳۱ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''بدنصیب بت تراش'' مطبوعہ: ''رومان'' لاہور، فروری ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱ ''چوپال'' (چودہ افسانے) دارالاشاعت، پنجاب، لاہور طبع اوّل: ۱۹۳۹ء
(۱) بے گناہ (۲) دیہاتی ڈاکٹر (۳) بوڑھا سپاہی (۴) ننھا مانجھی (۵) ہرجائی (۶) مسافر (۷) غیرت مند بیٹا (۸) حق بجانب (۹) آرام (۱۰) وہ جا چکی تھی (۱۱) انتقام (۱۲) غرور نفس (۱۳) یہ دیا کون جلائے (۱۴) بے چارہ

۲ ''بگولے'' (بیس افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۱ء
(۱) طلائی مہر (۲) توبہ میری (۳) بھوت (۴) ننھے نے سلیٹ خریدی (۵) بچپنہ (۶) ماں (۷) کرپا کرم (۸) بچے (۹) میرا رانجھا (۱۰) چوری (۱۱) کھیل (۱۲) پاؤں کا کانٹا (۱۳) ان بن (۱۴) قلی (۱۵) السلام علیکم (۱۶) خوش رہو (۱۷) سپنوں کا محل (۱۸) ماتوں کی میاؤں (۱۹) سرخ ٹوپی (۲۰) پرچھائیاں۔

۳ ''طلوع و غروب'' (آٹھ افسانے ایک ڈرامہ) مکتبہ اردو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۱ء
(۱) طلوع و غروب (۲) کنگلے (۳) گونج (۴) جلسہ (۵) میرا دیس (۶) جوانی کا جنازہ (۷) پکا مکان (۸) چھاگل

۴ ''گرداب'' (پندرہ افسانے) ادارہ اشاعت اردو دکن، حیدرآباد دکن طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
(۱) مسجد کے مینار (۲) کھوٹے سکے (۳) نرل دل (۴) استعفیٰ (۵) ادھورا گیت (۶) بٹوے کی باچھیں (۷) روشندانوں کے شیشے (۸) پگلی (۹) غریب کا تحفہ (۱۰) افیونی (۱۱) ایک رات چوپال پر (۱۲) رنگ و سنگ (۱۳) فساد (۱۴) انسان اور حیوان (۱۵) ہسپتال سے نکل کر۔

۵ ''سیلاب'' (بارہ افسانے) ادارہ اشاعت اردو دکن، حیدرآباد دکن طبع اوّل: دسمبر ۱۹۴۳ء
ابتداء میں دیباچہ بہ عنوان باتیں: (۱) نیم وادر بچے (۲) بڈھا کھوسٹ (۳) شادی (۴) جوانی کی سڑاند (۵) پلکوں کے سائے (۶) الجھن (۷) کانی آنکھ (۸) من کی ڈالی (۹) آزاد منش غلام (۱۰) معطر لفافہ (۱۱) سونے کی دھار (۱۲) نئی سارنگی (کل صفحات ۲۹۹) اس کتاب میں ایک ڈرامائی مکالمہ بہ عنوان: ''من کی کرچیاں'' اور ایک ڈراما ''مستقبل کے سوداگر'' بھی شامل کتاب ہے۔

۶ ''سیلاب و گرداب'' (انتخاب کل گیارہ افسانے) مکتبہ کارواں، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۶۱ء

یہ کتاب مجموعہ ''سیلاب'' اور ''گرداب'' کے مندرجہ ذیل گیارہ منتخب افسانوں پر مشتمل ہے:

(۱) الجھن (۲) بڈھا (''سیلاب'' میں اس افسانے کا عنوان ''بڈھا کھوسٹ'' ہے) (۳) کالی آنکھ (۴) من کی ڈالی (۵) نیم وا دریچے (۶) ایک رات چوپال پر (۷) ادھورا گیت (۸) حیوان اور انسان۔ (''گرداب'' میں اس افسانے کا عنوان ''انسان اور حیوان'' ہے) (۹) سونے کا ہار (۱۰) غریب کا تحفہ (۱۱) استعفیٰ

۷ ''آنچل'' (گیارہ افسانے) — ادارہ فروغ اردو، لاہور بہ اشتراک نیشنل لٹریچر کمپنی، لاہور — طبع اول: ۱۹۴۴ء

(۱) محدب شیشے میں سے (۲) جان ایمان کی خیر (۳) نشیب و فراز (۴) خربوزے (۵) نامرد (۶) سائے (۷) حد فاصل (۸) انصاف (۹) مہنگائی الاؤنس (۱۰) سانولا (۱۱) شعلۂ نم خوردہ (ندیم کے دیباچہ پر ۱۰ مئی ۱۹۴۴ء کی تاریخ درج ہے۔)

۸ ''آبلے'' (تین افسانے) — ادارہ فروغ اردو، لاہور — طبع اول: جولائی ۱۹۴۶ء

افسانوی مجموعہ: آنچل کے کور پیج پر اس مجموعے کا اشتہار ''رم جھم'' کے نام سے دیا گیا ہے لیکن بعد میں ندیم نے اس نام کو اپنے شعری مجموعے کے لیے پسند کر لیا اور ''آبلے'' کے نام سے ان تین افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔

(۱) کفارہ (۲) ہیروشیما سے پہلے کے بعد (۳) عبدالمتین ایم۔اے

۱۹۴۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ''آنچل'' کا ایک افسانہ ''محدب شیشے میں سے'' بھی شامل کر لیا گیا۔ پہلے ایڈیشن کے کل صفحات ۲۴۸ ہیں۔

۹ ''آس پاس'' (آٹھ افسانے) — مکتبہ فسانہ خواں، لاہور — طبع اول: ۱۹۴۸ء

(۱) اکیلی (۲) بھری دنیا میں (۳) افق (۴) کرن (۵) موت (۶) تکمیل (۷) ارتقاء (۸) چڑیل

۱۰ ''در و دیوار'' (آٹھ افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۴۸ء

(۱) میں انسان ہوں (۲) نیا فرہاد (۳) تسکین (۴) جب بادل امڈے (۵) سپاہی بیٹا (۶) ووٹ (۷) کہانی لکھی جا رہی ہے (۸) راجے مہاراجے

۱۱ ''سناٹا'' (دس افسانے) — نیا ادارہ، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۲ء

(۱) بڑی سرکار کے نام (۲) رئیس خانہ (۳) آتش گل (۴) ماستا (۵) الحمدللہ (۶) کنجری (۷) گنڈاسا (۸) چور (۹) نمونہ (۱۰) سناٹا

۱۲ ''بازار حیات'' (تیرہ افسانے) — ادارہ فروغ اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۵ء

(۱) پرمیشر سنگھ (۲) گل رخے (۳) خون جگر (۴) دار و رسن (۵) زلیخا (۶) بدنام (۷) ست بھرائی (۸) موچی (۹) کفن دفن (۱۰) بابا نور (۱۱) آئینہ (۱۲) ہیرا (۱۳) مخبر

۱۳ ''برگ حنا'' (دس افسانے) — ناشرین، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۹ء

(۱) بیٹے بیٹیاں (۲) ماتم (۳) کھبا (۴) دور بین (۵) شکنیں (۶) نصیب (۷) مہم بیگ (۸) وحشی (۹) جن و انس

(۱۰) امانت

۱۴ ''گھر سے گھر تک'' (سترہ افسانے) راول کتاب گھر، راولپنڈی طبع اوّل: ستمبر ۱۹۶۳ء

(۱) تمبر (۲) فیشن (۳) سفارش (۴) مائیں (۵) پہاڑوں کی طرف (۶) گڑیا (۷) قتل (۸) پاگل (۹) ماسی گل بانو

(۱۰) بے نام چہرے (یہ ''فنون'' میں گلدستہ خار کے نام سے شائع ہوا تھا) (۱۱) کپاس کا پھول (۱۲) سفید گھوڑا

(۱۳) سکوت وصدا (۱۴) آسیب (۱۵) لارنس آف تھلیبیا (۱۶) قرض (۱۷) مشورہ

۱۵ ''نیلا پتھر'' (نو افسانے) غالب پبلشرز، لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۰ء

(۱) احسان (۲) عورت صاحبہ (۳) جوتا (۴) اندمال (۵) عالاں (۶) نیلا پتھر (۷) بارٹر (۸) ایک عورت تین کہانیاں

(۹) ایک احمقانہ محبت کی کہانی

(اس کتاب میں شامل افسانہ ''بارٹر'' اس سے قبل ''فنون'' میں ''بارٹر سسٹم'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔)

۱۶ ''انگڑائیاں'' (انتھالوجی: مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب) ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد، دکن طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

۱۷ ''نقوش لطیف'' (انتھالوجی: خواتین کے افسانوں کا انتخاب) ادارہ فروغ اردو، لاہور طبع اوّل: اپریل ۱۹۴۷

افسانہ نگار خواتین کی خود نوشت سوانح کے علاوہ اس انتھالوجی میں ندیم کے مرتب کردہ سوالنامے کا جواب بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۸ ''احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے'' (مرتبہ: مظفر علی سید) مکتبہ میری لائبریری، لاہور طبع اوّل: س۔ن

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی ادارے نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے۔

۱۹ ''رم جھم'' (قطعات ورباعیات) ادارہ فروغ اردو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

۲۰ ''جلال و جمال'' (شاعری) نیا ادارہ، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۶ء

۲۱ ''شعلہ گل'' (شاعری) قومی دار الاشاعت، لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۳ء

۲۲ ''دشت وفا'' (شاعری) کتاب نما، لاہور طبع اوّل: ۱۹۶۳ء

۲۳ ''محیط'' (شاعری) التحریر، لاہور طبع اوّل: ۱۹۷۶ء

۲۴ ''دوام'' (شاعری) مطبوعات، لاہور طبع اوّل: ۱۹۷۹ء

۲۵ ''تہذیب و فن'' (تنقید) پاکستان فاؤنڈیشن طبع اوّل: ۱۹۷۹ء

۲۶ ''ادب اور تعلیم کے رشتے'' (تنقید) التحریر، لاہور

۲۷ ''پاکستان کی لوک کہانیاں'' (از میریلین سرج کا ترجمہ) شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور بہ اشتراک: موسسہ فرینکلن طبع اوّل: ۱۹۷۲ء

(ندیم نے ترجمہ کرتے وقت نظموں کا ترجمہ منظوم کیا ہے۔ اس کتاب کے مصور ایڈیشن کے کل صفحات ۲۳۲ ہیں۔)

۲۸ ''اقبال۔ ایک محاکمہ'' (تنقید۔ کتابچہ) طبع اوّل: ۱۹۷۷ء

۲۹ ''پس الفاظ'' (تنقید) طبع اول: ۲۰۰۳ء

۳۰ ''معنی کی تلاش'' (تنقید) طبع اول: ۲۰۰۴ء

۳۱ ''کیسر کیاری'' (مضامین۔ڈرامے۔تراجم) ناشر: لطیف فاروقی مکتبہ: شعروادب لاہور: طبع اول: ۱۹۴۴ء

کتاب کا دیباچہ از ندیم بہ عنوان: ''منجھائے گفتی'' پر ۵ نومبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔

کتاب میں شامل مضامین: (۱) ہم ایک موٹر خریدیں گے (۲) ایکٹرس کے آنسو (۳) بھلوال کا پتھر (۴) مسکراہٹ (۵) لمبے قد پر جواب مضمون (۶) میرے پڑوسی (۷) کتابیں پڑھنا (۸) ملتان کے تانگے (۹) سعید اللہ خان نیازی (۱۰) پٹھان اور گاڑی کا سفر (۱۱) تکیہ کلام (۱۲) ہمارے نقاد

ڈرامے: (۱) مفلس ادیب (۲) بگلا بھگت (۳) قاضی جی کا فیصلہ

تراجم: (۱) انٹرویو (مارک ٹوین) (۲) رومن راہبر (مارک ٹوین) (۳) لیل ونہار (آرٹیمس وارڈ) (۴) ایڈیٹر کا مہمان (ول کارلٹین) (اس کتاب کے کل صفحات ۲۰۸) ہیں۔

۳۲ ''منٹو کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی'' (ترتیب وتہذیب) کتاب نما، لاہور طبع اول: ۱۹۶۲ء

۳۳ ''دھڑکنیں'' (قطعات) اردو اکیڈمی، لاہور طبع اول: ۱۹۴۲ء

۳۴ ''تین ناٹک'' (بچوں کے لیے تین ڈرامے) پنجاب بک ایجنسی، لاہور طبع اول: ۱۹۴۴ء

یہ کتاب اسی ادارے نے تیسری بار ۱۹۵۰ء میں شائع کی۔ کتاب میں تین ڈرامے بہ عنوان: (۱) باغ کے گوشے میں (۲) آسمان کے گوشے میں (۳) ''کتابی کیڑا'' شامل ہیں۔

۳۵ ''لوحِ خاک'' (شاعری) اساطیر، لاہور طبع اول: ۱۹۸۸ء

۳۶ ''دوستوں کی کہانیاں'' (بچوں کے لیے) پنجاب بک ایجنسی، لاہور طبع اول: ۱۹۴۳ء

۳۷ ''نئی نویلی کہانیاں'' (بچوں کے لیے) پنجاب بک ایجنسی، لاہور طبع اول: ۱۹۴۴ء

۳۸ ''نذرِ حمید احمد خان'' (ترتیب وتہذیب) مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اول: ۱۹۷۷ء

۳۹ ''آسمان کے گوشے میں'' (ترتیب وتہذیب) پنجاب بک ایجنسی، لاہور طبع اول: ۱۹۷۷ء

۴۰ ''کپاس کا پھول'' (افسانے) مکتبہ فنون، لاہور طبع اول: ۱۹۷۳ء

۴۱ ''کوہ پیما'' (افسانے) اساطیر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۵ء

۴۲ ''جلیبیاں'' (بچوں کے لیے) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور طبع ثانی: ۲۰۰۷ء

۴۳ ''ارض وسما'' (شاعری) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اول: ۲۰۰۶ء

۴۴ ''میرے ہم قدم'' (سوانحی خاکے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اول: ۲۰۰۶ء

۴۵ ''انوارِ جمال'' (حمد ونعت، سلام) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اول: ۲۰۰۷ء

۴۶ ''بت جھڑ'' (افسانے، ناولٹ، ناول) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اول: ۲۰۰۷ء

(اس کتاب میں آخری افسانوں کے علاوہ ایک ناولٹ ''ایک ریوڑ ایک ہجوم'' کے علاوہ ان کا نامکمل ناول ''پت جھڑ'' بھی شامل ہے جو زمانۂ اسیری کی یادگار ہے اور اس کا عنوان سعادت حسن منٹو نے رکھا تھا۔)

غیر مدوّن:

محولہ بالا کتب کے علاوہ لاتعداد فکاہیہ کالم، دیباچے، فلیپ غیر مرتب حالت میں ہیں۔ پچاس کے لگ بھگ تنقیدی مضامین زیرِ ترتیب ہیں۔ میر تقی میر کا ایک انتخاب کیا جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء میں لاہور جیل میں اسیری کے دوران ندیم نے جان وولف گانگ گوئٹے کے ناول ''Die Leiden Des Yungen Werther'' کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کا مفصل دیباچہ بھی لکھ لیا تھا لیکن یہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔ یاد رہے کہ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے ''نوجوان ورتھر کی داستانِ غم'' کے عنوان سے کیا تھا جو لٹریری سنڈیکیٹ الٰہ آباد: سلیمی پریس سے ۱۹۸ صفحات کی ضخامت میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ترجمہ ندیم نے کیا، تیسرا ترجمہ ڈاکٹر محمد افضل نے ۹۷۶ میں کیا جسے مکتبہ شاہکار، لاہور نے شائع کیا۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

۱۲۔ غالب کالونی، سمن آباد، لاہور، پاکستان

اعزاز:

۱۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، برائے ''دشتِ وفا'' ۱۹۶۴ء
۲۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، برائے ''محیط'' ۱۹۷۶ء
۳۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، برائے ''دوام'' ۱۹۷۹ء
۴۔ ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' حکومت پاکستان کا سول اعزاز: ۱۹۶۸ء
۵۔ ''ستارۂ امتیاز'' حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز: ۱۹۸۰ء
۶۔ عالمی فروغ اردو ادب (دوحہ قطر) ایوارڈ: ۱۹۹۶ء
۷۔ ''نشانِ سپاس'' اکادمی ادبیات پاکستان کا کمالِ فن ایوارڈ: ۹۸۔۱۹۹۷ء
۸۔ ''غالب ایوارڈ'' (بھارت)
۹۔ اے آر وائی گولڈ ادبی ایوارڈ: ۲۰۰۲ء

نظریۂ فن:

''افسانے میں افسانے کا عنصر بہر قیمت برقرار رہنا چاہیے۔ افسانے کی یہ افسانویت ایک منضبط پلاٹ کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے،

کردار نگاری کی صورت میں بھی، ماحول نگاری کی صورت میں بھی اور باطن نگاری کی صورت میں بھی...... لیکن اگر افسانے میں سے افسانہ غائب ہوگیا تو اس صنف کو افسانے کی بجائے کوئی اور نام دینا پڑے گا۔"

احمد ندیم قاسمی

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ: مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء)



حوالہ جات:

۱۔ بہ حوالہ: "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی: اردو محل لاہور، طبع اوّل: س۔ن (لگ بھگ ۱۹۴۲ء)

۲۔ بہ حوالہ مکالمہ: "اردو افسانے کی شناخت" مطبوعہ: "ماہِ نو" لاہور، فروری ۱۹۸۷ء ص نمبر ۱۴

لارنس آف تھلیبیا

احمد ندیم قاسمی

پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں پلاش کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، کمر، پیٹھ، کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، نائی، جھیور، دھوبی، موچی، کمہار اور کسان دبا رہے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا، اس لیے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک بڑے سے غبارے کو ہوا میں اُڑ جانے سے روکنے کے لیے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے۔ ''آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا یار آیا ہوا ہے لاہور سے۔'' انہوں نے ایک لمبی کانکھ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکرانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوجے ہوئے گالوں اور گھنے گل مچھوں سے ٹکریں مار کر وہیں کہیں مر گئی۔

میں دور اس لیے بیٹھا تھا کہ میرے لیے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چوپال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر، خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا۔ بشکو، خدا بخش کا بہت چہیتا نوکر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا، مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی اس لیے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ ''اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخار تیز رہتا تو آج میں تمہیں باز کے شکار کا تماشہ نہ دکھا سکتا۔'' وہ بولا۔ ''لارنس آف عریبیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھیلبیا رکھ لیا ہے۔ تھل کے تھلیبیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ ہنسا۔ ''ابھی چائے کے بعد تم، میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا سائیں ہے۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھیلبیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی مٹھی پر بٹھائے گا اور......''

دھم دھم کی آواز سے ہم چونکے، دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر مکوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے۔ ''بھری مجلس میں کہتا ہے، ملک جی، تہبند سنبھالو، ننگے ہو رہے ہو۔ اس حرامزادے سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔''

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آ گئی شامت بے چارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا۔ ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔''

خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا۔ ''خدا بخش تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔''

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا۔ ''کیا کریں یار...... ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔''

اتنے میں بشکو چائے لے آیا طشت کو تپائی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدا بخش کے کان میں کہا۔ ''مسکین ایسا برا لڑکا تو نہیں چھوٹے ملک۔ پھر اسے مار کیوں پڑ رہی ہے؟''

''اچھا تو یہ مسکین ہے!'' خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے تو منہ میں زبان بھی نہیں...... پانچ وقت کا نمازی ہے اذان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بک دیا ابا سے!

بڑے ملک صاحب کے دھموکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مسکین ان آدمیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لیے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

''اب چھوڑ دو اس کمینے کو۔'' ملک صاحب کڑکے اور مسکین منہ کے بل، پتھر کی طرح گر پڑا۔ ''اٹھا لے جاؤ اپنی ماؤں کے اس یار کو......'' ملک صاحب پھر گرجے اور ایک ہجوم کا ہجوم مسکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ مسکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو پلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت مسکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لیے جھکے تو جھکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا۔ ''مسکین تو اذان پڑھ رہا ہے!''

پھر مسکین خود ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لیے بولا: ''سورج تو بہت ڈھل گیا پیشی کی نماز تو ہو چکی ہو گی؟''

سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک وجیہہ جوان تھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، چوپال کے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں ایک مینار چل رہا ہے۔

''آ جاتے ہیں ماں کے یار چوپال پر گپ لڑانے کے لیے۔'' بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے۔ ''چوپال پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی ننگے ہو رہے ہو...... ہو بھئی میں ننگا ہو رہا ہوں تو تم دھیان نہ دو۔ انسان دوپہر کے وقت بھی آنکھیں بند کر لے تو اس کے لیے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟'' ذرا سا رک کر انہوں نے پلٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟'' جواب کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بولے...... ''لو بھئی اسے دبا دو۔ دکھنے لگا ہے حرامزادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر۔''

''یہ حرامزادہ کون تھا؟'' میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

''اس کا نام مسکین ہے؟'' خدا بخش بولا۔ ''ذات کا جولاہا ہے۔ یہ کھیس جو ابا کے پلنگ پر بچھا ہے اسی نے بنا ہے، بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی مگر بہت بھولا ہے۔ نہ جانے ابا کو نو کنے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بدنصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔''

بشکو فوراً بولا۔ ''اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ مسکین مسکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں، جیسے مجھے بشکو کہتے ہیں۔''

''میں نے کہا۔'' یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔''

''آہستہ بولو یار۔'' خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ''انہوں نے سن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آ جائے گی۔''

''نہیں...... اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔''

خدا بخش کو میرا لہجہ اچھا نہ لگا۔ اس نے جیسے ملامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا۔ ''اصطبل میں جا کر دیکھو، بیگے نے گھوڑے تیار کر لیے ہیں یا نہیں۔ زینیں کس لی ہوں تو تم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے۔'' بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا۔ ''دیکھو میاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو میرے ابا پر...... اس علاقے کا ایک مقولہ ہے کہ سر جتنا بڑا ہوتا ہے۔ دردسر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ابا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں...... نہ کریں تو زمیندارہ کیسے چلے......'' وہ رک گیا، پھر بولا...... ''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔''

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا۔ ''لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھا یہ پائے نہیں، بلکہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔''

''گاؤں کی کھلی فضا کا تم پر الٹا اثر ہوا ہے۔'' خدا بخش بولا۔ ''تم چکرا گئے ہو۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور خدا بخش۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے۔''

''گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک۔'' بشکو ہمارے سروں پر بولا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس پر لارنس آف تھیلیبیا بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سرا دستانے میں لٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چمڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔ خدا بخش نے سر اٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا۔ ''بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے۔''

خدا بخش ہنس پڑا۔ مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی آنکھوں پر پھر سے کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لیے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین

گھوڑا تھا۔ ''اتنا موٹا تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔'' میں نے شبہ ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ ''اس کے اندر کا گھوڑا پنا مار دیا گیا ہے، اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے اسے موٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف دورے پر آتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے، ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سو، ابا نے اس کام کے لیے یہ گھوڑا چنا کہ اس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تو جبھی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو۔''

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوتیاں اٹھا کر اور نتھنے پھلا کر وہ جیسے لگام کو چبا کر اڑا جانا چاہتا تھا۔ مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کنوتیاں تو اٹھی ہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلہنیں چلتی ہیں۔

بشکو، باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنجان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حد نظر تک پھیلا ہوا ایک چٹیل ویرانہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اگے ہوئے تھے، مگر یہ کیکر بیمار سے لگتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹیڑھی اور ننگی تھیں۔ لالیاں شام سے پہلے انہی اکا دکا کیکروں پر آ کر بیٹھتی ہیں...... ''خدا بخش نے مجھے بتایا۔'' اور لالی، باز کا من بھاتا کھاجا ہے۔ میرے لارنس آف تھیلیبیا کی دہشت ہے!

میں نے کہا۔ ''خدا بخش لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی پیلی پیلی، کچی کچی باچھیں اس پر کیسا بچپنا سا طاری کیے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟''

خدا بخش بولا۔ ''اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی ٹیلا آئے گا، تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا۔ میں اور بشکو دست بستہ سنیں گے۔ مگر ابھی ذرا رک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو، بشکو کی مٹھی پر کیسے بار بار پھڑ پھڑا جاتا ہے۔ اس نے ویرانے کی بو، سونگھ لی ہے۔''

''لالی!'' بشکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا روک لیا۔ میرا گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی رک گیا۔

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے غور سے تماشہ دیکھنے کی تلقین کی۔

''یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا۔''

اس نے کہا ''مزہ آ جائے گا جب باز لالی پر جھپٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے ہوا کو ہوا کاٹ رہی ہے۔

''دیکھو۔'' خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دور ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا۔ جس نے ایک لالی کو لا بٹھایا تھا۔ ایک دم باز پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لالی کو۔ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو

اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اڑ گئی۔ مگر باز نے آن کی آن میں اس کو جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا، اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا تب اس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی، پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش بولتا رہا۔ ''اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو ــــ ہڈی پر سے گوشت کیسے اتارتا ہے، انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے تازہ اور وٹامن سے بھرپور!''

''لعنت!'' میں نے کہا۔ ''تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔''

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے نشہ ہو گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا۔ ''لارنس آف تھیلیبیا آؤٹ ہو گیا۔'' پھر ہنستا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ ''کیوں بشکو، یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں؟''

بشکو بولا: ''بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں دیکھ ہی لیا ہو، ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور گلہ کرے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' خدا بخش میری طرف مڑا۔ ''چلو تمہیں تھل کی چائے پلائیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پرانے مزارعے بابا یارو کا ڈیرا ہے، وہاں چلتے ہیں۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔''

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا، اس سے میری طبیعت بالکل نڈھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: ''جہاں چاہو چلے چلو۔''

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سرخی مائل مٹی سے لپے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا ''ایک بار میں اور بشکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گے۔ بابا یارو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا، مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہیں اور رنگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انہیں پتہ چلا تو بابا یارو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپ پھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھٹکار پر بھی اس کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔''

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پر سے اتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے، صحن میں کیکر کے بڑے بڑے درخت تھے، نیچے ایک گائے اور چند بھیڑیں، بکریاں شاید عادتاً بیٹھی تھیں کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تنوں کے سائے سے بہت دور جا چکے تھے۔ ان بھیڑوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اون بٹ رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھی اور مائی بیگاں ہانڈی میں چمچہ چلا رہی تھی جیسے پتھر ابال رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے محو تھے کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا پھر اچانک مائی بیگاں بولی۔ ''ہائے مجھے تو بہت چنتا لگ رہی ہے، رنگی کو اب تک تو آ جانا ہی چاہیے تھا۔

''آ جائے گی۔'' بابا یارو بولا۔ ''کہاں گئی ہے'' ''اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی پکی سہیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پچھلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ اتنا بڑھیا ریشم تھا کہ رنگی اسے تہ کرتی گئی اور آخر وہ اتنا ذرا سا رہ گیا کہ تمہارے چنے کے چھلے میں آ گیا۔ سو روپے کا ہو گا یہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سی بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو سمجھو فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔''

خدا بخش نے آہستہ سے کہا۔ میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔''

بشکو بولا۔ ''اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں جو شاندہ گھولتی ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔''

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رکنے، بیٹھے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھروندا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑے بن جائیں گی۔

خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فصیل پر رائفلوں والوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ تم تو جانتے ہو بابا یارو! میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچادیں گے، ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا، سوچا تمہیں دیکھتے چلیں، ٹھیک ہو نا؟ کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو ہم چلے۔'' رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خدا بخش بولا۔ ''رنگی کی فکر نہ کرو، اگر اسے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے روک لے گی...... اور اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔''

بابا یارو بولا: ''آج صبح اسے ایک جھاڑی کی جڑ میں اگی ہوئی بہت سی چونکیں ملیں۔ اس کی سہیلی جونکیں بہت پسند ہیں اس لیے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، سکھا کر پہنے اور پھر دوپہر کو جونکوں کی پوٹلی باندھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں، اگر اسے راستے میں شام پڑ گئی تو...... تو ویرانہ ہے، ڈر لگتا ہے۔''

خدا بخش نے اسے تسلی دی: ''ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے...... تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔''

واپسی پر خدا بخش نے بازوں اور شکروں کے سلسلے میں بے حساب معلومات سے مجھے لاد ڈالا، میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوشحال خاں خٹک اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے سکوں، تلواروں کے قبضوں اور لبادوں کے بٹنوں پر بازوں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر ثابت کیا کہ باز ایک شاہی پرندہ ہے، آخر میں اس نے یہ مسکت دلیل دی ''تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو۔''

''غریب آدمی تو لالیاں پالتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیروں کے موڑ پر یکایک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آ گئی تھی...... وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے...... سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کی تہ بند کرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرلے کنارے پر تھوڑی ٹیکے، جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور یہ گلاب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگی چپلی میں نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لیے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی۔ مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو

اس انتہا کا حسن کار ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی اور بشکو پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ''دیکھا چھوٹے ملک'' رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اری یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ تجھے ملکانی نے روکا نہیں ..... ؟''

''چل واپس ..... '' خدا بخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا۔ ''جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے، اتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت، چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے۔ غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی؟ چل رنگی۔''

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انہوں نے بھی اس کے حسن میں جیسے ایک چھنا کا سا پیدا کر دیا۔ ''بابا بے چارہ۔''

''ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو ..... '' خدا بخش فوراً بولا۔ ''ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے ایسے وقت ویرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے چل۔''

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی، کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوؤں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ کیا تمہارے ہاں شکروں اور کتوں کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں؟''

''ارے چپکے رہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ورنہ ابا پکڑ کر مسکین بنا ڈالیں گے۔''

بڑے ملک اٹھ کر چلے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی باری آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھیلیپیا کی تعریف کرتا رہا اور ایک بار بشکو نے آ کر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ رُکا سننے والوں کو داد تحسین کا موقع ملا۔ ''بابا رحمٰن کہتا ہے وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا وہ کہتا ہے۔ چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ببر ہے۔''

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا اور بشکو بھی میرا بستر جما کر اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا ..... آسمان اتنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر چکرا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکمل سناٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لیے کتے تک سو گئے تھے، صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کا پیکر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو ..... ! میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنے ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا، ہر زاویہ سے جانچا اور تب میں نے کہا ..... ''ہاں رنگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو، اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔''

چوپال کے زیریں آنگن میں کیکر پر چڑیوں نے واویلا مچایا، میری آنکھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا۔ ''قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ'' صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اتری اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے دیر تک پروں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب تک کر نہ بیٹھ سکی تو اڑ گئی۔ منہ اندھیرے یہ چیل کہاں سے آ گئی ہے؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا ''جہاں سے یہ

چڑیاں آئی ہیں۔"

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جب بشکو میرے لیے ملائی سے اٹا ہوا دودھ کا ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو تو خدا بخش چوپال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ "چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں۔" اس نے کہا۔ "وعدہ کہ آج میں تم سے انسانوں کی باتیں کروں گا۔"

"چلو......" میں نے کہا، پھر میں سیڑھیوں پر رک گیا...... "سنو، کیا رنگی چلی گئی؟"

دفعتاً خدا بخش کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ وہ ہنستا ہنستا میرے پلنگ پر جا گرا۔ "آخر کار پتھر میں بھی جونک لگ گئی تو...... قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ پیٹ کر کہتا رہا۔ "...... "برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر ٹوٹی تو۔" پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "یار مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آ گیا ہے۔ میں سمجھا تھا پر الو کے الو ہی ہو......" بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا۔ "وہ رنگی یونہی کیسے جا سکتی ہے؟" لسی پیئے گی، پراٹھا کھائے گی، اس کی سہیلی اسے یوں آسانی سے تھوڑی جانے دے گی۔ اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سلاتی۔ ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہوگی۔" پھر ذرا سا رک کر بولا۔ "جانے لگی تو تمہیں دکھائیں گے۔ بلکہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے یہاں کیوں نہ پئیں؟"

"چھوٹے ملک۔" بشکو چلایا اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کیکر پر سے سب چڑیاں ایک ساتھ اڑ گئیں۔

"کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں" خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی وہ ٹھیک ہیں...... پر......" بشکو کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں، نتھنے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا۔

"پر کیا؟...... کچھ بکو۔" خدا بخش نے اسے ڈانٹا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی۔ "کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ لارنس مرا پڑا ہے۔"

خدا بخش کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ ایک خاصے وقفے کے بعد بولا۔ "رنگی کو یہاں لے آؤ۔"

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا۔ "رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟"

"ہے ایک مطلب۔" خدا بخش بولا۔

حادثہ شدید تھا اس لیے میں خاموش رہا فوراً بعد بشکو واپس آیا۔ "رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک۔"

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا...... میرے باز کو اس کمینی نے مارا ہے، رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔" میں نے کہا، "لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں۔ نادان۔ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بدذات، کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔ میں اس کی......"



کرشن چندر

نام : کرشن چندر چوپڑہ

قلمی نام : کرشن چندر

پیدائش : ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء بمقام بھرت پور، بھارت (صبح چھ بجے)[1]

وفات : ۸ مارچ ۱۹۷۷ء بہ مقام بمبئی، رات گیارہ بج کر بیس منٹ پر

تعلیم : ایم۔اے (انگریزی ادب)، ایف سی کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۴ء

ایل۔ایل۔بی، لاء کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۷ء

پانچ برس کی عمر میں مینڈھ (جموں) کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔آٹھویں جماعت سے میٹرک تک وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ، کشمیر میں تعلیم پائی۔ ایف۔ایس سی، بی۔اے (۱۹۳۲ء) اور ایم۔اے (انگریزی) ایف۔سی کالج لاہور (۱۹۳۴ء) سے پاس کیے۔ایل۔ایل۔بی پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

وزیر آباد (پنجاب) کے کھتری چوپڑا خاندان میں ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ ایم۔بی۔ایس کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام امر دیوی تھا۔زمانہ طالب علمی میں بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے قربت رہی۔نتیجہ ایک ماہ لاہور قلعہ میں نظر بند رہے۔تعلیم سے فراغت کے بعد پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں کے ساتھ مل کر انگریزی پرچہ "The Northern Review" جاری کیا جو گیارہ ماہ تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں ہی انگریزی ماہنامہ (بہ اشتراک فریدہ) "The Modern Girl" جاری کیا۔اسی زمانے میں "نیا ادب" سے بھی منسلک رہے اور "نئے زاویے" کی دو جلدیں شائع کیں۔پہلی جلد اگست ۱۹۴۰ء میں چھپ کر آئی۔چند برس انگریزی مجلہ "کیریئر" کی ادارت کی۔

نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ بطور پروگرام اسسٹنٹ منسلک ہو گئے۔ لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۲ء میں ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کی فلم کمپنی ''شالیمار پکچرز'' پونا کی طرف سے لکھنے کی دعوت ملی تو ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی۔ شالیمار پکچرز کے ساتھ بھی نہ نبھی تو ۱۹۴۴ء میں بمبئی چلے آئے۔ اس وقت وہ انجمن ترقی پسند مصنفین (مرکز) کے سیکرٹری تھے۔ یہاں آ کر فلم کمپنی ''بمبئی ٹاکیز'' سے تقریباً ایک برس منسلک رہے۔ ۴۶۔۱۹۴۵ء میں نیشنل تھیٹرز کے اشتراک سے اپنی ذاتی فلم ''سرائے کے باہر'' مکمل کی اور ماڈرن تھیٹرز کے نام سے ذاتی فلم کمپنی قائم کر کے فلم ''دل کی آواز'' بنائی۔ دوسری فلم ''راکھ'' مکمل نہ ہو سکی اور اُن کی فلم کمپنی ٹوٹ گئی۔ اُس کے بعد دیگر فلم کمپنیوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی دسمبر ۱۹۳۹ء لاہور میں ودیاوتی سے ہوئی جو ۱۹۶۸ء تک نبھی۔ ودیاوتی سے تین بچے بھی ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں رشید احمد صدیقی کی مطلقہ بیٹی سلمیٰ صدیقی سے شادی کی تو مسلمان ہونا پڑا تب انہوں نے اپنا نیا نام وقار ملک رکھا۔ اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں تقریباً پانچ سو افسانے، کئی درجن ناول اور متفرق مضامین لکھے۔ افسانے اور ناول ڈکٹیٹ کروا دیتے تھے۔

اُن کا آخری افسانہ ''پاگل پاگل'' مطبوعہ ''شمع'' دہلی فروری ۱۹۷۷ء ہے اور آخری ناول ''فٹ پاتھ کے فرشتے'' آخری قسط: ''بیسویں صدی'' دہلی بابت: جون ۱۹۷۷ء۔ جب فوت ہوئے تو مسلمان دوستوں نے قرآن، سکھوں نے گرنتھ اور ہندوؤں نے گیتا پڑھی۔ تدفین پر سلمیٰ صدیقی نے بھی اصرار نہیں کیا۔ لہٰذا کرشن چندر کو ہندو رسوم کے مطابق نذرِ آتش کیا گیا۔

اردو کی اوّلین تحریر:

''پروفیسر بلیکی'' مطبوعہ اخبار ''ریاست'' دہلی۔

یہ تحریر ان کے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام کا خاکہ ہے جو ۱۹۲۸ء سے قبل شائع ہوا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''یرقان'' مطبوعہ: ''ادبی دنیا'' لاہور (سالنامہ) ۱۹۳۶ء

''جہلم میں ناؤ پر'' مطبوعہ ''ہمایوں'' لاہور: جنوری ۱۹۳۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

۱	''ہوائی قلعے'' (ہلکے پھلکے مضامین)	مطبوعہ: اردو بک سٹال، لاہور	طبع اوّل: ستمبر ۱۹۴۰ء
۲	''طلسم خیال'' (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء
۳	''نظارے'' (افسانے)	مطبوعہ: کتاب خانہ ادبی دنیا لاہور	طبع اوّل: جون ۱۹۴۰ء
۴	''نئے زاویے'' (انتخاب) پہلی جلد	مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: اگست ۱۹۴۰
۵	''زندگی کے موڑ پر (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۶	''ٹھوکے'' (مزاحیہ مضامین)	مطبوعہ: دفتر کتابت، جودھپور	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

۷	''شکست'' (ناول)	مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی،	طبع اوّل: جنوری ۴۳
۸	''ٹوٹے ہوئے تارے'' (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء
۹	''نئے افسانے'' (افسانے)	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۱۰	''دروازہ'' (ڈراما)	مطبوعہ: اردو اکیڈمی، لاہور	
۱۱	''پرانے خدا'' (افسانے)	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۱۲	''اجنتا سے آگے'' (افسانے)	مطبوعہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۱۳	''ان داتا'' (۴ طویل افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع ثانی: ۱۹۵۹ء
۱۴	''ایک روپیہ ایک پھول'' (۱۸ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۵ء
۱۵	''ایک گرجا ایک خندق'' (۱۰ افسانے)	نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۱۶	''تین غنڈے'' (افسانے)	مطبوعہ: انڈین بک کمپنی، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۱۷	''دسواں پل'' (۱۸ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
۱۸	''دل کسی کا دوست نہیں'' (۱۹ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۹ء
۱۹	''سپنوں کا قیدی'' (۱۱ افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء
۲۰	''سمندر دور ہے'' (۱۱ افسانے)	مطبوعہ: نو ہند پبلشرز لمیٹڈ، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۲۱	''شکست کے بعد'' (۱۰ افسانے)	دیپک پبلشرز، جالندھر	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۲۲	''کتاب کا کفن'' (۱۱ افسانے)	رسالہ بیسویں صدی، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۶ء
۲۳	''کشمیر کی کہانیاں'' (۱۲ افسانے)	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۵۴ء
۲۴	''مزاحیہ افسانے'' (۱۲ افسانے۔ باتصویر)	آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۲۵	''میں انتظار کروں گا'' (۱۸ افسانے)	مکتبہ شاہراہ، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۲۶	''نغمے کی موت'' (۱۱ افسانے)	ایشیا پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۲۷	''نئے غلام'' (۱۰ افسانے)	قادری کتب خانہ، بمبئی نمبر ۳	طبع اوّل: ۱۹۶۵ء
۲۸	''ہائیڈروجن بم کے بعد'' (۱۴ افسانے، ایک ڈراما اور ایک خاکہ)	ایشیاء پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی	
۲۹	''پل کے سائے میں'' (افسانے)	مکتبہ سلطانی، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۳۰	''ہم وحشی ہیں'' (۷ افسانے فسادات پر۔ دیباچہ علی سردار جعفری)	کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی نمبر ۱	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۳۱	''یوکلپٹس کی ڈالی'' (۱۵ افسانے ایک ڈراما)	ایشیا پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۵ء

۳۲	"ایک خوشبو اڑی اڑی سی" (افسانے)	مکتبہ افکار، کراچی	
۳۳	"پانی کا درخت" (افسانے)	نیا ادارہ، لاہور	
۳۴	"تاش کا کھیل" (افسانے)	رفعت پبلشرز، لاہور	
۳۵	"درد کی نہر" (افسانے)	کراچی بک ڈپو، کراچی	
۳۶	"دشت خیال" (افسانے)	ممتاز اکیڈمی، لاہور	
۳۷	"دوسری برف باری کے بعد" (افسانے)	خیام پبلشرز، لاہور	
۳۸	"سپنوں کی راہ گذر میں" (افسانے)	خیام پبلشرز، لاہور	
۳۹	"شانو" (افسانے)	رضا پبلشرز، لاہور	
۴۰	"کاک ٹیل" (افسانے)	سنگم پبلشرز، لاہور	
۴۱	"کالا سورج" (افسانے)	مکتبہ افکار، کراچی	
۴۲	"کبوتر کے خط" (افسانے)	پاشا پبلشرز، لاہور	
۴۳	"گھونگھٹ میں جلے گوری" (افسانے)	مکتبہ ماحول، کراچی	طبع اول:
		ساقی بک ڈپو، دہلی	۱۹۵۳ء
۴۴	"مینا بازار" (افسانے)	مکتبہ شاہراہ، دہلی	طبع اول: ۱۹۵۳ء
		کتاب نما، لاہور	طبع دوم: س۔ن
۴۵	"ہم تو محبت کرے گا" (افسانے)	ایشین بک سینٹر، کراچی	
۴۶	"کرشن چندر کے بہترین افسانے" (مرتبہ: اختر جعفری)	چودھری اکیڈمی، لاہور	
۴۷	"پھول کی تنہائی" (افسانے)		
۴۸	"کانچ کے ٹکڑے" (افسانے)		
۴۹	"طوفان کی کلیاں" (افسانے)		
۵۰	"الٹا درخت" (افسانے)		
۵۱	"کھڑکیاں" (افسانے)		
۵۲	"ایک عورت ہزار دیوانے" (ناول)	مکتبہ افکار، کراچی	طبع اول: ۱۹۵۷ء
۵۳	"ایک وائلن سمندر کے کنارے" (ناول)	مکتبہ افکار، کراچی	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۵۴	"باون پتے" (ناول)	شمع بک ڈپو، دہلی	طبع اول: ۱۹۵۷ء
۵۵	"پانچ لوفر، ایک ہیروئین" (ناول)	کراچی بک ڈپو، کراچی	
۵۶	"جنت اور جہنم" (ناول)	جاوید پبلی کیشنز، لاہور	

۵۷	''چاندی کا گھاؤ'' (ناول)	مکتبہ افکار، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۴ء
۵۸	''دل کی وادیاں سو گئیں'' (ناول)	مون لائیٹ بک ڈپو، لاہور	
۵۹	''سڑک واپس جاتی ہے'' (ناول)	ایشیاء پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء
۶۰	''ایک گدھے کی سرگزشت'' (ناول)	شمع بک ڈپو، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۶۱	''محبت کی رات'' (ناول)		
۶۲	''مسکرانے والیاں'' (افسانے)		
۶۳	''کارنیوال'' (ناول۔ ماخوذ)	نسیم بک ڈپو، لاہور	طبع اوّل: س۔ن
۶۴	''بوربن کلب'' (ناول)	مشورہ بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۶۵	''طوفان کی کلیاں'' (ناول)	مکتبہ شاہراہ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۴ء
۶۶	''صبح ہوتی ہے'' (رپورتاژ)		طبع اوّل: ۱۹۵۰ء
۶۷	''تاش کا کھیل'' (ناول)		
۶۸	''پہلا پتھر'' (ناول)		
۶۹	''دروازے کھول دو'' (ڈراما)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	طبع سوم: ۱۹۷۷ء
۷۰	''خرگوش کا سپنا'' (بچوں کے لیے ناول)		
۷۱	''ستاروں کی سیر'' (بچوں کے لیے ناول)		
۷۲	''ہانگ کانگ کی حسینہ'' (ناول)	اردو پاکٹ بکس، کراچی نمبر ۱۸	
۷۳	''زرگاؤں کی رانی'' (ناول)	اردو پاکٹ بکس، کراچی نمبر ۱۸	
۷۴	''غدار'' (ناول)	نیا ادارہ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۷۵	''کاغذ کی ناؤ'' (ناول)	کراچی بک ڈپو، کراچی	
۷۶	''لندن کے سات رنگ'' (ناول)	اعوان پبلی کیشنز، کراچی	
۷۷	''مالا رانی'' (ناول)	خالد پبلشنگ ہاؤس، لاہور	
۷۸	''میری یادوں کے چنار'' (ناول)	ادارہ فروغ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۷۹	''محبت بھی قیامت بھی'' (ناول)	ایشیا پبلشرز، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۷۷ء
۸۰	''جب کھیت جاگے'' (ناول)	بمبئی بک ہاؤس، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۵۲ء
۸۱	''شکست'' (ناول)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۳ء
۸۲	''گدھے کی واپسی'' (ناول)	ایشیاء پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۸۳	''درد کی لہر'' (ناول)	ایشیاء پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۳ء

۸۴	''لندن کے سات رنگ'' (ناول)	ستار پبلی کیشنز، دہلی	طبع اوّل: س۔ن
۸۵	''برف کے پھول'' (ناولٹ)	ماہنامہ ''رومانی دنیا''، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء
۸۶	''وادر پل کے بچے'' (ناولٹ)	ایشیاء پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء
۸۷	''فٹ پاتھ کے فرشتے'' ''بیسویں صدی'' میں قسط وار		جنوری ۱۹۷۷ء
۸۸	''ایک گرجا ایک خندق''		
۸۹	''کالے کوس'' (افسانے)		
۹۰	''کرشن نگر'' (مرتبہ: تاج سعید)		
۹۱	''دل کی وادیاں سوگئیں'' (ناول)	رسالہ: بیسویں صدی، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۶ء
۹۲	''صبح ہوتی ہے'' (ناول)		
۹۳	''دوسری برف باری سے پہلے'' (افسانے)		
۹۴	''اجنتا سے آگے'' (افسانے)		
۹۵	''پودے'' (رپورتاژ)	مکتبہ سلطانی، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء
۹۶	سعادت حسن منٹو (خاکہ۔ کتابچہ)		
۹۷	''آکسیرویدک المعروف عرق پرکاش'' (طنزیہ/مزاحیہ)		
۹۸	''جب کھیت جاگے''		
۹۹	''کالا باغ''		
۱۰۰	''عذرا''		
۱۰۱	''آدھے گھنٹے کا خدا'' (افسانے)		
۱۰۲	''سرائے کے باہر'' (ڈراما)		
۱۰۳	''آسمان روشن ہے'' (ناول)	ایشیاء پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۱۰۴	''مٹی کے صنم''	ایشیاء پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۶ء
۱۰۵	''سونے کی صندوقچی''		
۱۰۶	''اس کا بدن میرا چمن'' (ناول)		
۱۰۷	''نئے زاویے'' (اردو ادب کا انتخاب۔ دو جلدیں)		طبع اوّل: اگست ۱۹۴۴
۱۰۸	''گنڈک کا بھوت'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۷ء

نوٹ: کرشن چندر کی کتابوں کے اس قدر جعلی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں کہ ان کی مطبوعہ کتب کی تعداد گنتی شمار میں نہ لائی جا سکی ہے اور نہ ایسا ممکن ہے۔ البتہ اُن کے دو غیر مطبوعہ ناول کسی وقت بھی سامنے آ سکتے ہیں، جن کے حقوق اشاعت محمد ہاشم پبلشر، بمن

پرکاشن، الہ آباد کے نام محفوظ ہیں۔ (۱) ''بمبئی کی شام'' (حصہ دوم) (۲) ''ایک گلرگ کا گمنام''

اعزاز:

۱۔ سوویت نہرو ایوارڈ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۶۶ء

۲۔ پدم بھوشن جنوری ۱۹۶۹ء

۳۔ نہرو کلچرل ایسوی ایشن ایوارڈ، بمبئی، نومبر ۱۹۷۳ء

زندگی میں مستقل پتا:

''دی نش'' سینٹ فرانس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی (بھارت)

نظریۂ فن:

''اجتماعی طور پر خوبصورتی کو پالینے اور غریبی کو کھودینے ہی کو میں انسانیت کے بنیادی مسائل سمجھتا ہوں اور اکثر انہی کے متعلق لکھنا پسند کرتا ہوں۔''

(بہ حوالہ: ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی)



حوالہ جات:

۱۔ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی اور ڈاکٹر احمد حسن نے ''افکار'' کراچی کے ''کرشن چندر نمبر'' میں تاریخ پیدائش ۱۹۱۴ء درج کی ہے جو درست نہیں۔ ''ہوائی قلعے'' کے ناشر ظہیر صاحب اور ہنس راج رہبر نے تاریخ پیدائش ۱۹۱۲ء بتائی یہ بھی درست نہیں۔ نہ مقام پیدائش کسی نے درست لکھا۔ کرشن چندر کی بیگم سلمیٰ صدیقی نے کرشن چندر کی والدہ امر دیوی سے پوچھ کر جس تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش کو درست قرار دیا وہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء بہ مقام بھرت پور ہی ہے۔
بحوالہ: ''کرشن چندر: شخصیت اور فن'' (مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی) از ڈاکٹر بیگ احساس: مطبوعہ: ۱۹۹۹ء

کالو بھنگی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہ دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے "چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟...... کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لیے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لیے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لیے اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لیے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لیے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لیے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لیے اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لیے، اپنے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم ‌ ‌یک گڑھوں کے اوپر گنجی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا

کر، اپنی اہمیت جتا کر اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کر کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے اس کی چار دیواری میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک۔ اس نے ہر اجنبی کو اس کے گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا، اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا، ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لیے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا...... ہر روز، بلا ناغہ...... اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لیے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانتا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لیے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لیے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالانکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لیے اس کے متعلق اتنی سر دردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ خواہش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صم بکم مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، میٹھی کہانی بھی سن لیجیے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے اور اگر آج بھی میں نے اس کے

بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جمارہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں گھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جاسکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار، اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا، وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لیے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی...... اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں، راستے میں وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے۔ گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی، کبھی غرا کر، کبھی کان پھڑپھڑا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے کیونکہ بے چارے انسان تو نہیں

تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی گھمنڑ بیوی کروشیا لیے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سویٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لیے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا۔ اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا کہیں کوئی نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رستگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ مچی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرتائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکئی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکئی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون ہے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، ذائقہ اور معمولی سے بھنے ہوئے تھے وہ کہ انہیں بس مکئی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے میں جھاڑو لیے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لیے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لیے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لیے فاؤنٹین پن پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟''

''کوئی خاص بات، عجیب انوکھی، نئی۔''

''نہیں چھوٹے صاحب۔'' (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے، ممکن ہے......!''

''اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟'' ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں''...... وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے۔......''چار روپے کا آٹا لاتا ہوں......ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ کتنے روپے ہوگئے، چھوٹے صاحب؟''

''سات روپے۔''

''ہاں سات روپلے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیئے کو دیتا ہوں، اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے!''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکئی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے۔''

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہوگئی، جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھلکتے جھلکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے اس وقت بھی کہیں کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں چھوٹے۔ صاحب۔''

''کیوں؟''

''اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے!''
(لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

''تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

''کیا صاحب؟''

''عشق کرنے کے لیے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔''

''عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟''

''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ۔''

''عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں میں نے کی، کیسے ہوتی شادی میری،

آپ بتائیے؟'' (ہم کیا بتائیں خاک)

''تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟''

''کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب۔''

میں نے ہار کر، اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپڑاسی اس کے لیے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود ٹھیک کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھی، اس لیے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کیے، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

''ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔''

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی،، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للہ۔ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہوگئی ہے۔ تمہارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں، اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، ایک روپیہ بنئے کا۔ آٹھ روپے ہوگئے، مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہوسکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہے بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔

وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنہوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے، یہ جوانی یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نھیا سے آئی تھی، سولہ سترہ برس کی الھڑ جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو جوانوں کا عشق قبول

کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آ جاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ عشق بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر روغن، گرگٹی، ہنگامی کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لیے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔

اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لیے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لیے بھی، اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لیے بے تاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے، اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں، اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھری جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے ـــــ پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی، اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی ـــــ نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی، دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مرمٹی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بے وقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آ گئے، اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی، اور نوراں کے پاؤں پر زخم آ گئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں ـــــ خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہش کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھے منّے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لیے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو اس نے چلتے وقت خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا لیکن خلجی کے لیے نہ ریشماں رکی، نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے

لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں نوراں کی حالت غیر تھی۔ اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، سڑاند دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی، نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آ گئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لیے اس سے معافی مانگنے کے لیے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لیے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لیے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی اور دونوں خردماغ لڑکے بھی جواب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کیے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم، اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا، پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا، جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پرکیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکئی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لیے حیران ہو جاتا پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا، جو کچھ کہنا تھا، جو کچھ تم کہہ رہے ہو، تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تو مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ

تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی مل ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر باران آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنیئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ، دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لیے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپڑاسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپڑاسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے، اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الیں اور کدو جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے، ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی، اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا، اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لیے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جواب اپنے کیے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہو گئی پھر کریزی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی، اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

''اماں.....'' بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

''اماں.....'' بخت یار چلایا۔

''اماں.....'' کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا..... ''میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہو گی، تمہارے ماموں کے پاس۔''

نکر کے دو کوس ادھر انہیں بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی، پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لیے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور ادھر

ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کریدنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لیے اب تو چلے جاؤ، بہت ستایا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لیے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں، سن، تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے غلاظت دور کرے، ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے کے گرد وغبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں، تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انہیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے، تجھے ایک مصفا لباس دے دے، تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے، تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، جو کچھ تو چاہتا وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لیے مکئی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت وشفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے، جو ابھی نہیں آیا، جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا...... یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ...... آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اس کے لیے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبر دار اور دکاندار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیوں کو چھو لے، اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لیے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے پاس پار لے جائے۔

O

ممتاز مفتی

نام : مفتی ممتاز حسین
قلمی نام : ممتاز مفتی
پیدائش : ۱۱ستمبر ۱۹۰۵ء بہ مقام بٹالہ (ضلع گورداسپور) پنجاب۔
وفات : ۲۷اکتوبر ۱۹۹۵ء اسلام آباد، پاکستان۔
تعلیم : بی۔اے۔اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور: ۱۹۲۹ء
ایس۔اے۔وی۔سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج، لاہور: ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء
ڈپلوما شارٹ ہینڈ/ٹائپ، لاہور: ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء

مختصر حالاتِ زندگی:

مفتی محمد حسین کے ہاں پیدا ہوئے جو محکمہ تعلیم پنجاب سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم بٹالہ، امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں پائی۔ میٹرک ۱۹۲۱ء میں ڈیرہ غازی خان سے اور ایف۔اے ۱۹۲۷ء میں ہندو سبھا کالج امرتسر سے کیا۔ اسلامیہ کالج، لاہور سے ۱۹۲۹ء میں بی۔اے کرنے کے بعد سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب کے سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر خانیوال، دھرم سالہ، گوجرہ، چک جھمرہ، جام پور، ساہیوال، باغبان پورہ، قصور، شیخوپورہ، سانگلہ ہل اور گورداسپور کے اسکولوں میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء پڑھاتے رہے۔ لاہور میں طالب العلمی کے زمانے میں سید فیاض محمود اور مجید ملک کے ساتھ دوستی رہی جس نے ادبی ذوق کو اُبھارا۔ ۱۹۳۴ء میں ن۔م راشد سے ملاقات میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ پہلے دو مضامین گوجرہ ہائی سکول کے جریدے اور رسالہ ''نخلستان'' لاہور میں شائع ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں بطور سٹاف آرٹسٹ/سکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں اوائل ۱۹۴۷ء میں اداکار کمار اور بیگم کمار (اداکارہ پرمیلا) کی فرمائش پر ''سلور فلمز'' مین روڈ، دادر بمبئی سے منسلک ہو گئے۔ کرشن چندر اور میراجی کے ساتھ قیام رہا

اور سلور فلمز کے لیے فلم ''رضیہ سلطانہ'' کی کہانی لکھی، سکرین پلے اعظم مرزا نے تیار کیا تھا۔ یہ فلم فسادات کی نذر ہو گئی اور ممتاز مفتی ۱۹۴۷ء میں واپس لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء میں بطور سب ایڈیٹر ہفتہ وار ''استقلال'' لاہور نکالا۔ ۱۹۴۹ء میں پی۔ آر۔ سی پاکستان ایئر فورس میں سائیکالوجسٹ ہو گئے۔ لیکن یہ محکمہ ۱۹۵۰ء میں ٹوٹ گیا۔ اسی سال بطور سٹاف آرٹسٹ/ سکرپٹ رائٹر آزاد کشمیر ریڈیو، تھراڑ کھل کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں ۱۹۵۱ء تک رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۷ء اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر، کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹریٹ، راولپنڈی رہے جہاں سے ۱۹۵۷ء میں تبدیل کر کے بطور فلم آفیسر D.A.F.P کراچی بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء وینج ایڈ ڈائریکٹریٹ کراچی میں رہے۔ ۱۹۶۰ء میں قدرت اللہ شہاب (سیکرٹری برائے اطلاعات) کے او۔ ایس۔ ڈی کے طور پر ایوان صدر راولپنڈی آ گئے جہاں ۱۹۶۳ء تک رہے۔ اب ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر وزارت اطلاعات، راولپنڈی کر دیا گیا جہاں ۱۹۶۵ء تک کام کیا۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء تک او۔ ایس۔ ڈی، وزارت اطلاعات، راولپنڈی رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔ آخری زمانے میں وزارت اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ سے متعلق تھے۔ آپ کے اپنے بیان کے مطابق ابتدا میں دوستوفسکی، سگمنڈ فرائڈ، نیچے، برٹرنڈ رسل، ڈاکٹر سٹیکل اور ڈاکٹر یونگ نے متاثر کیا۔[۴]

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

— ''جھکی جھکی آنکھیں'' مطبوعہ ''ادبی دنیا'' لاہور (سالنامہ) ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''ان کہی'' (سترہ افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

(۱) آپا (۲) بیگانگی (۳) جھکی جھکی آنکھیں (اوّلین افسانہ مطبوعہ: ۱۹۳۶ء) (۴) آپ بیتی (۵) اندھیرا (۶) خلط ملط (۷) یہ دیوی (۸) نفرت (۹) محلّہ (۱۰) غسل آفتابی (۱۱) کرن محل کا بھوت (۱۲) مہندی والا ہاتھ (۱۳) اندھا (۱۴) ماتھے کا تل (۱۵) مورا (۱۶) انتقام (۱۷) سیانی

مکتبہ اردو، لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۹، اپریل ۱۹۴۳ء کو طے پایا۔

۲۔ ''گہما گہمی'' (پندرہ افسانے) — سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

(۱) بدمعاش (۲) میاں کی مرضی (۳) وہ کمرہ (۴) حد ہو گئی (۵) جب اور اب (۶) چڑ (۷) دام خیال (۸) زندگی (۹) شرابی کا راز (۱۰) اس کوچے میں (۱۱) خواب (۱۲) الصدف (۱۳) ڈاکٹر کا استعمال (۱۴) وہ انجم (۱۵) کالے سلیپر

۳۔ ''چپ'' (پندرہ افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۴۷ء

(۱) نیلی (۲) چپ (۳) پل (۴) احسان علی (۵) شائستہ (۶) باجی (۷) دوراہا (۸) پریم نگر (۹) تین خدا (۱۰) پاگل (۱۱) دروازہ (۱۲) گبرائیاں (۱۳) سہارا (۱۴) لیڈی ڈاکٹر (۱۵) پیارا پالتو

مکتبہ اردو، لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۵، جنوری ۱۹۴۷ء کو طے پایا۔ اس کتاب کا دیباچہ فکر تونسوی نے لکھا ہے جبکہ مفتی کا خاکہ بشیر رومانی (احمد بشیر) کا تحریر کردہ ہے۔

۴۔ ''اسمارائیں''(سترہ افسانے) مکتبہ جدید، لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء

(۱) سمیع و اسمارہ (۲) راں ژیاں (۳) ہائے رے یہ نوجوان (۴) جوار بھاٹا (۵) اوئی اللہ (۶) احمق (۷) موقعہ (۸) دو ہاتھ (۹) سوپور کی کھڑکی (۱۰) لکھ پتی (۱۱) ماں (۱۲) مسز کلیے کا خاوند (۱۳) خدا بخش (۱۴) گھور اندھیرا (۱۵) ریت کی لہریں (۱۶) آپ بیتی (۱۷) گوبر کے ڈھیر۔

مکتبہ جدید، لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۲، جنوری ۱۹۵۳ء کو طے پایا۔

۵۔ ''نظام سقہ''(ڈراما) مکتبہ اردو، لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء

۶۔ ''علی پور کا ایلی''(سوانحی ناول) داستان گو، لاہور طبع اول: ۱۹۶۱ء

ایک زمانے میں یہ اردو کا سب سے ضخیم ناول شمار ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں حیات اللہ انصاری نے ''لہو کے پھول'' (پانچ جلدیں) لکھ کر مفتی کا یہ ریکارڈ توڑ دیا اور اب اوپندر ناتھ اشک کا ''گرتی دیواریں'' اس سے بھی ضخیم ناول ہے۔ مفتی صاحب کے اپنے بیان کے مطابق اس ناول کے مقامات کو ''ڈی کوڈ'' کریں تو خان پور (ملتان)، جاوا (گوجرہ) دیپال پور (خانیوال) اور بام آباد (ڈیرہ غازی خان) ٹھہرتے ہیں۔ اس ناول کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ طبع دوم، میری لائبریری لاہور ۱۹۶۹ء، طبع سوم، سنگ میل، لاہور ۱۹۸۵ء اور طبع چہارم سنگ میل، لاہور ۱۹۹۱ء۔ آخری ایڈیشن میں کرداروں کے اصل ناموں کی فہرست بھی شامل کر دی گئی ہے۔

۷۔ ''گڑیا گھر''(چودہ افسانے) گلڈ اشاعت گھر، کراچی طبع اول: ۱۹۶۵ء

(۱) گڑیا گھر (۲) کھونٹ والا بابا (۳) چار گوٹ (۴) ذاتی معاملہ (۵) مینا کے پاؤں (۶) دودھیا سویرا (۷) سکارلٹ روڈ (۸) نیلی رگ (۹) عطیہ (۱۰) نومان اور منیرہ (۱۱) گھر کی عزت (۱۲) جادوگرنی (۱۳) میرا گھر (۱۴) پردہ سیمیں۔

۸۔ ''پیاز کے چھلکے''(خاکے) نیشنل پبلشنگ کمپنی، راولپنڈی طبع اول: ۱۹۶۸ء

۹۔ ''لبیک''(روداد حج) التحریر، لاہور طبع اول: ۱۹۷۵ء

(یہ کتاب دو جلدوں میں شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کی ہے)

۱۰۔ ''ہندیاترا''(سفرنامہ ہند) اظہار سنز، لاہور طبع اول: ۱۹۸۳ء

کتاب کا معاہدہ ۱۹۸۱ء میں طے پایا۔

''روغنی پتلے''(اٹھارہ افسانے) حرمت پبلی کیشنز، راولپنڈی طبع اول: ۱۹۸۴ء

(۱) سندرتا کا راکشش (۲) بش اور بشرہ (۳) پتنگ (۴) باجوؤں کی ڈھونڈ (۵) کھل بندھنا (۶) روغنی پتلے (۷) ڈائری (۸) الپسرا حویلی (۹) آغا اور اسمارائیں (۱۰) ہائنڈ موٹا (۱۱) ایک تھا بادشاہ (۱۲) ایلیئز (۱۳) پرانی شراب نئی دکان (۱۴) حلوائی کی دکان (۱۵) وہ (۱۶) ان پورنی (۱۷) دو تاج محل کا سایہ (۱۸) بت دیوتا اور سناتا

کتاب کا معاہدہ فروری ۱۹۸۴ء میں طے پایا۔ کل صفحات ۲۴۲ ہیں۔

۱۲۔ ''سے کا بندھن''(افسانے) فیروز سنز، لاہور، طبع اوّل:۱۹۸۶ء

(۱) سے کا بندھن (۲) ساری بات (۳) چٹ کپڑی (۴) چلک گاڑی، ہونکتا ہوٹر اور موم بتی (۵) ایک ہاتھ کی تالی (۶) ماناممانہ (۷) دیوی (۸) گرین ما (۹) جینی اور عفریت (۱۰) گرواس داس گرو (۱۱) دومونہی (۱۲) کس لیے؟ کیا اس لیے؟ (۱۳) اندھا فٹ پاتھیا (۱۴) کمرہ نمبر ۱۵۱۷۔ ماڈہاؤس (۱۶) سیڑھی سرکار (۱۷) ایمان اپ مین اپ (۱۸) تھرڈ مین۔

۱۳۔ ''اوکھے لوگ''(خاکے) انٹرنیشنل ہجرہ پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل:۱۹۸۶ء

(کتاب کا معاہدہ ۱۹۸۳ء میں طے پایا۔)

۱۴۔	''مجموعہ رام دین''(مضامین، رپورتاژ)	مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۸۶ء
۱۵۔	''حکایات''(بچوں کے لیے)	مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور	
۱۶۔	''تین لوک کہانیاں''(بچوں کے لیے)	مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور	
۱۷۔	''اولیاء اللہ''(دو جلدیں/ بچوں کے لیے معلومات)	مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور	
۱۸۔	''تین لوک قصے''(بچوں کے لیے)	مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور	
۱۹۔	''مفتیانے''(افسانوی کلیات)	مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور	طبع اوّل:۱۹۸۹ء
۲۰۔	''اور اوکھے لوگ''(خاکے)	مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۹۱ء
۲۱۔	''الکھ نگری''(سوانحی ناول)	مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۹۲ء
۲۲۔	''کہی نہ جائے''(افسانے)	مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۹۲ء
۲۳۔	''جماعت اسلامی''(تجزیہ۔ ممتاز حسین عاصی کے فرضی نام سے)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۴ء
۲۴۔	''Delusion of Grandeur''(فرضی نام سے)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۵ء
۲۵۔	''اوکھے اوڑے''(خاکے)	مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۹۴ء

غیر مدوّن:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد ریڈیائی ڈرامے، ریڈیائی فیچر، نشری تقریریں اور مضامین غیر مرتب صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔

زندگی میں مستقل پتا:

مکان نمبر ۲۲، گلی نمبر ۳ سیکٹر ایف ۶/۱، اسلام آباد۔

اعزاز:

۱۔ ستارۂ امتیاز، حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز

۲۔ ''نقوش'' ادبی ایوارڈ

۳۔ تمغۂ حسنِ کارکردگی، حکومت پاکستان: ۱۹۹۳ء

نظریۂ فن:

''ایک مرکزی خیال یا تاثر ضروری ہے۔ افسانے میں تاثر ہونا لازم ہے۔ اگر قاری کے دل میں تجسس پیدا کرے کہ پھر کیا ہوا تو بہت اچھے۔''

(مکتوب ۱۷ نومبر ۱۹۸۴ء، بنام مرزا حامد بیگ سے اقتباس)



حوالہ جات:

۱۔ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی میں ۱۹۰۶ء درج ہے، جو درست نہیں۔ تعلیمی اور سرکاری ریکارڈ میں تاریخ پیدائش ۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء درج ہے۔

۲۔ فلم ''میرا لال''، ''مدر انڈیا''، ''جنگلی کنگ'' اور ''بجلی'' کی مشہور اداکارہ۔ اداکار کمار اور پرمیلا نے سلور فلمز کے جھنڈے تلے ''جھنکار'' اور ''بڑے نواب صاحب'' جیسی مشہور فلمیں بنائیں۔

۳۔ مفتی صاحب نے ڈاکٹر محمد اقبال کے تتبع میں ''نطشے'' لکھا ہے، درست ''نچے'' ہے۔

۴۔ بہ حوالہ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی

آپا

ممتاز مفتی

جب کبھی بیٹھے، بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو نیم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک رات ہم سب چُپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں، آپا اور امی جان، کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو چھ سات سال کا ہوگا۔ کہنے لگا: ''امی جان! میں بھی باہ کروں گا۔''

''او، ابھی سے؟'' اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ ''اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟''

اماں کہنے لگیں۔ ''کیوں آپا کو کیا ہے؟''

''ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔'' بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

''اونہوں!'' بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں ''کیوں، دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں؟''

''میں بتاؤں کیسی ہے؟'' وہ چلایا۔

''ہاں بتاؤ تو بھلا۔'' اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولھے پر آ کر رکی، چولھے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا ''ایسی!'' پھر بجلی کی روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا۔ ''اور چھاجو باجی ایسی!'' اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے، اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں۔ ''تصدق، بدو سے پوچھنا تو آپا کیسی ہیں؟'' آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

''ہاں تو کیسی ہے آپا، بدو؟'' وہ بولے۔ ''بتاؤں؟'' بدو چلایا اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی ''اونہہ!'' بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں، پگلے اسے

ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے۔''..... ''وہ تو جلا ہوا ہے اماں!'' بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں۔ ''میرے لال تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔'' بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ ''کیوں آپا اس میں آگ ہے؟'' اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ ''میں کیا جانوں؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی۔ ''آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔'' اور وہ مسکرا کر کہتی ''پگلی!'' اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چیختا۔ ''آپا میرا دلیا۔'' ادھر ابا گھورتے ''سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟'' بیچ میں اماں بول اٹھتیں۔ ''بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے؟'' اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہلتی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اس طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے ''میں جی! کیوں جی؟'' اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا، ایک ''یہ کرو۔ وہ کرو'' والی اماں اور دن بھر حقے میں گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے۔ ''سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔''

''کیوں؟'' اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے۔ ''بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔''

اماں تنک کر بولیں۔ ''مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔''

ابا کہنے لگے۔ ''افوہ! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی، تن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔'' میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ ''بڑی آئی ہے۔ سجادہ۔ جی ہاں! اپنی بیٹی جو ہوئی۔'' اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے

دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ، گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کر صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا...... ہاں

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں، آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں، نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے ہوئے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ ''بدو، رو، نا'' اور پھر آپ ہی بیٹھی مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ وہاں بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں ''اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟'' پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے، جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے، پوچھتے۔ ''بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟''

''آپا؟'' بدو لاپروائی سے دہراتا۔ ''بیٹھی ہے...... بلاؤں؟''

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے۔ ''نہیں نہیں۔ اچھا بدو، آج تمہیں، یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں۔''

اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ مدھم آواز میں کہتے۔ ''ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔''

بدو چیخ اٹھتا۔ ''کیا ہوں میں؟'' اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ''ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے، دیکھا؟ جسے ڈھول بھی کہتے ہیں ڈگمگ، ڈگمگ سمجھے؟'' اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا، بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آگرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولھے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو، مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آجاتے وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آگھسا ہو۔

ایک دن میں، آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے کہہ رہے تھے: ''میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈز، ٹن، ڈزاور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے، سمجھے؟''

بدو بولا: ''ہم تو چھا جو باجی سے بیاہ کریں گے۔''

''اونہہ!'' بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا: ''میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں!'' اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ ''واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو!''

بدو نے کہا'' اباجو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیے۔''

''تو وہ اپنے ابا کے لیے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لیے تو نہیں!''

''میں کہوں آپا سے؟'' بدو چیخا۔

بھائی چلائے: ''او پگلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔۔ یہ دیکھو اس طرف ڈھمگ ڈھمگ۔'' بدو پھر چلانے لگا۔ ''میں جانتا ہوں تم میز بجارہے ہو نا؟'' ...... ''ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔'' بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ کشتیوں میں، اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے، آؤ ہم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان۔ لو آؤ، ٹھہرو، جب میں تین کہوں'' اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا: ''ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔''

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لیے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آگئے۔ کہنے لگے'' کیا پڑھ رہی ہو جہینا؟'' ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں...... مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی، جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا۔ ''سکول کا کام کر رہی ہوں۔''

پوچھنے لگے ''تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری آپا نے تو ''ہارٹ بریک ہاؤس'' پڑھی ہوگی۔'' وہ انکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدہم آواز میں کہا "نہیں!" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی جان بولے "اوہ کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے، نشہ ہے نشہ، خالص شہد، تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ضرور پڑھوں گی۔"

پھر پوچھنے لگے۔ "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم، آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم نہیں ہوتی جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔" مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ رہنے کے لیے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چین۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا، بیٹھی ہوئی گم سم آپا، بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے۔ "آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ! سجادہ بیٹی کیا کھانڈ اتنی سستی ہوگئی ہے۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے، کہنے لگی۔ "شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ "شاید۔ کیا خوب۔ شاید۔"

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔" صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں، جیسے ان کی عادت ہے۔ "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال کرنا چاہیے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہوگئی، کہنے لگے۔ "ارے یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا تو میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں......" اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا، ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا اس سے ملنا تو کیا بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں، کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر لے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی۔ "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا: "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے نہ جانے کیا نام ہے، اس کا ہاں! ہارٹ بریک ہاؤس"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف

دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دوایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ ''آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنی ہوئے؟'' آپا پہلے تو ٹھٹھک گئی، پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔

''اس لحاظ سے تو ہمارا گھر ہارٹ بریک ہے۔''

کہنے لگی۔ ''میں کیا جانوں؟''

میں نے اسے جلانے کو کہا۔ ''ہاں! ہماری آپا بھلا کیا جانے؟'' میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ ''مجھینا، اچھا یہ بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں کیا جانوں؟ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔'' ہنس کے کہنے لگے۔ ''آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟''

''کیوں میں لڑاکا ہوں؟'' میں نے کہا۔

بولے۔ ''نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑاکا ہو جاؤ۔'' اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ ''دیکھو جھینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے، ذرا نہ اکتائے۔'' جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ ''فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟''

بولے: ''وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا۔'' میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی، پھر کہنے لگے۔ ''وہ مجھے بے حد پسند ہے، یہاں تو جھینا ہم فیرنی کھا کر اکتا گئے۔'' میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی ''نعمت خانہ'' پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا۔ ''بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟''

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا۔ ''بدو جاؤ تو، بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے۔''

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لیا اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟ اسی رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی، مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

ان دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے، میٹرک کا امتحان دینے کے لیے ہمارے گھر آ ٹھہری۔

ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چار پائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا۔ ''ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔''

باجی کہتی۔ ''شکل تو دیکھوا پنی، پہلے منہ دھو آؤ۔'' پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور پنجم تان میں پوچھتی۔ ''ہے نا بھئی جا آن کیوں جی؟''

باجی کے منہ سے ''بھئی جا آن'' کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا ''بھائی صاحب'' کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر ''صاحب'' جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی ''صاحب'' کی جگہ ''جا آن'' کہہ کر اسے سادے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ ''جا آن'' کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔

اس کے علاوہ ''بھئی جا آن'' کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے ''بھائی صاحب'' اور باجی کے ''بھئی جا آن'' میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی۔ ''بھئی جا آن ایک بورڈ لگے گا'' یا بھائی جان کی موجودگی میں بدو سے کہتے'' کیوں میاں بدو! کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں لڑنا چاہتا ہو؟'' باجی بول اٹھتی۔ ''آپا سے پوچھئے۔'' بھائی جان کہتے۔ ''اور تم؟'' باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی، چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی، بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی۔ ''اونہہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔'' بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے۔ ''کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟'' وہ جواب دیتی۔ ''میں نے کہا چلو بھئی جا آن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔'' اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ ''بھئی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائی تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا، ہے نا بھئی جا آن۔'' ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔

''لیجئے بھئی جا آن'' اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔''

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا۔ ''خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے، کس نے بنایا ہے؟'' ساجو باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لیے۔'' بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ ''میں بتاؤں بھائی جان؟''...... آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں، جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر

آپا، انگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی۔ ''چھوڑیے چھوڑیے'' اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی، کہنے لگی۔ ''آج ایک دھندنا تا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟'' بھائی جان بولے۔ ''واہ، یہاں سے کک لگاؤ تو جانے کہاں جا پڑو۔'' غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ ''واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں!'' بھائی جان معاً بول اٹھے ''تو کیا ہاتھ سے''...... ''چپ...... خاموش......'' باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا۔ ''آپا! اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں چلو بھی۔'' وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ ''ماں کہاں ہے؟'' اور وہ ماں کے پاس جانے کے لیے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ ''آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔'' بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں۔ ''آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی پاس۔'' اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے۔ بدو ساجو سے بیاہ کرو گے؟''

''اونہہ!'' بدو نے کہا۔ ''ہم باہ کریں گے ہی نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا۔ ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔'' اماں نے پوچھا ''آپا سے کیوں نہیں؟'' تو کہنے لگا ''بتاؤں آپا کیسی ہے؟'' پھر چولھے میں جلتے ہوئے اپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ''ایسی!'' ''اور چھاجو باجی؟ میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلبل کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''ایسی!'' عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ ''ہاں یاد ہے!'' بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لیے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے۔ ''نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔'' آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا۔ ''اف کتنی سردی ہے؟'' پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے ''ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جھلسے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟'' آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ ''اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے، دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے؟''

O

کوثر چاند پوری

نام : سید علی، کنیت: ابوالمظفر
قلمی نام : سید علی کوثر/کوثر چاند پوری
پیدائش : ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء بہ مقام چاند پور، ضلع بجنور[۱]
وفات : ۱۳ جون ۱۹۹۰ء بہ مقام جامعہ نگر، نئی دہلی (بھارت)
تعلیم : طبیب کامل (طب، اردو، فارسی، انگریزی)

مختصر حالات زندگی:

حکیم سید علی مظفر کے ہاں چاند پور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ایک زمانہ میں طبیہ کالج بھوپال میں استاد رہے اور ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ پیشہ طبابت اور افسانہ نگاری رہا۔ افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار اور متفرق نویس کے طور پر شہرت پائی۔ آخری دنوں میں چیف میڈیکل آفیسر (یونانی) ہمدرد نرسنگ ہوم، نئی دہلی تھے۔ اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی میں وفات پائی۔ تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ہوئی۔

اوّلین افسانہ:

''گدازِ محبت'' مطبوعہ: ۱۹۳۶ء جو امرتسر کے ایک پرچے میں شائع ہوا۔[۲]

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''ہنی مون اور دوسرے افسانے'' (افسانے)
۲۔ ''دلچسپ افسانے'' (افسانے) طبع اوّل: ۱۹۲۸ء سے قبل
۳۔ ''شعلۂ سنگ'' (افسانے) مطبوعہ: ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی طبع دوم: ۱۹۶۳ء

۴۔ ''رنگین سپنے'' (افسانے) — مطبوعہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدرآباد دکن

۵۔ ''عورتوں کے افسانے'' (افسانے) — مطبوعہ: کتب اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۳۷ء

۶۔ ''دنیا کی حور'' (افسانے) — مطبوعہ: کتب اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۷۔ ''اشک و شرر'' (افسانے)

۸۔ ''مسکراہٹیں'' (افسانے)

۹۔ ''دلگداز افسانے'' (افسانے) — مطبوعہ: صدیق بک ڈپو، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۲۸ء

۱۰۔ ''نوک جھونک'' (افسانے) — مطبوعہ: مطبع عہد آفریں، حیدرآباد دکن

۱۱۔ ''جام جم'' (افسانے) — مطبوعہ: مطبع عہد آفریں، حیدرآباد دکن — طبع اول: ۱۹۳۱ء

۱۲۔ ''سب کی بیوی'' (ناول) — مطبوعہ: مطبع عہد آفریں، حیدرآباد، دکن — طبع اول: ۱۹۵۲ء

۱۳۔ ''چوہوں کی بستی'' (ناول)

۱۴۔ ''راکھ اور کلیاں'' (ناول) — طبع اول: ۱۹۸۱ء

۱۵۔ ''دانش و بینش'' (تنقید) — طبع اول: ۱۹۷۵ء

۱۶۔ ''آوازوں کی صلیب'' (افسانے) — طبع اول: ۱۹۷۸ء

۱۷۔ ''کاروانِ غبار'' (دور پورتاژ) — طبع اول: ۱۹۶۶ء

۱۸۔ ''دیدۂ بینا'' (تنقید/تحقیق)

۱۹۔ ''جہانِ غالب'' (تنقید و تحقیق) — مطبوعہ: مکتبہ کائنات، لاہور — طبع دوم: ۱۹۶۶ء

۲۰۔ ''ناشاد کانپوری'' (تنقید و تحقیق)

۲۱۔ ''محبت اور سلطنت'' (ناول) — مطبوعہ: مکتبہ کائنات، لاہور

۲۲۔ ''ڈھانچے'' (ناول) — مطبوعہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدرآباد، دکن

۲۳۔ ''عشق نہ دیکھے'' (ناول)

۲۴۔ ''توڑ دو زنجیریں'' (ناول)

۲۵۔ ''فریدہ موہنی کی ڈائری'' (ناول)

۲۶۔ ''مرجھائی کلی'' (ناول)

۲۷۔ ''مہکتی بہاریں'' (ناول) — مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی — طبع اول: ۱۹۸۳ء

۲۸۔ ''رات کا سورج'' (۲۹ افسانے) — ناشر: وسیم اختر، ۲۳۱ بلیماراں، دہلی نمبر ۶ — طبع اول: ۱۹۷۶ء

۲۹۔ ''پتھر کا گلاب'' (ناول) — حلقۂ فکروشعور — طبع اوّل: ۱۹۷۹ء

۳۰۔ ''گونگا ہے بھگوان'' (ناول)

۳۱۔ ''حکیم اجمل خان'' (شخصیت اور خاندان)

۳۲۔ ''ویرانہ'' (ناول) — مطبوعہ: انوار احمدی پریس، الٰہ آباد — طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

۳۳۔ ''اغوا'' (ناول)

۳۴۔ ''پیاسی جوانی'' (ناول) — طبع اوّل: ۱۹۵۵ء

۳۵۔ ''شام غزل'' (ناول) — مطبوعہ: مشورہ بک ڈپو، دہلی — طبع اوّل: ۱۹۶۴ء

۳۶۔ ''مسکرائی زندگی'' (ناول)

۳۷۔ ''موج کوثر''

۳۸۔ ''خندۂ دل''

۳۹۔ ''کوثرستان'' (آپ بیتی)

۴۰۔ ''اطبائے عہد مغلیہ'' (تاریخ) — مطبوعہ: ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی — طبع اوّل: ۱۹۵۹ء

۴۱۔ ''معجزالقانون'' (تحقیق) — مطبوعہ: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

۴۲۔ ''شیخ جی اور دوسرے افسانے'' (مزاح) — مطبوعہ: لاجپت رائے، لاہور

۴۳۔ ''آدم خور'' (جغرافیہ) — مطبوعہ: دفتر کتابت، جودھ پور

۴۴۔ ''محمد بیرم خاں ترکمان'' (سوانح) — مطبوعہ: آگرہ اخبار پریس، آگرہ — ۱۹۳۹ء سے قبل

۴۵۔ ''حالی ولطائف غالب'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: انوراحمد پریس، الٰہ آباد — ۱۹۴۴ء سے قبل

۴۶۔ ''رشوت'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: انوراحمد پریس، الٰہ آباد — ۱۹۴۴ء سے قبل

۴۷۔ ''علم وتجارت'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: انوراحمد پریس، الٰہ آباد — ۱۹۴۴ء سے قبل

۴۸۔ ''چالاک بھیڑیا'' (بچوں کے لیے) — مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، دکن

۴۹۔ ''ہیروں کی کان'' (بچوں کے لیے) — مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، دکن

۵۰۔ ''موتیوں کا انڈا'' (بچوں کے لیے) — مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، دکن

۵۱۔ ''چیونٹیوں کی بستی'' (بچوں کے لیے) — مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، دکن

۵۲۔ ''لڑکے کا خواب'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن

۵۳۔ ''سمندر کا شہزادہ'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن — طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

۵۴۔ ''وفادار دوست'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن — طبع اوّل: ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۵۔ ''محنت کا پھل'' (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: کاروان ادب، کراچی

۵۶۔ ''لیل ونہار'' (ناول)

۵۷۔ ''ماہ انجم'' طبع اوّل: ۱۹۳۷ء

اعزاز:

۱۔ یوپی اردو اکیڈمی ایوارڈ

۲۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ

۳۔ بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ

زندگی میں مستقل پتا:

۳۱۷، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی، بھارت۔

نظریۂ فن:

''ہمارا منشا افسانہ نگاری سے یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک بہترین اخلاقی روح کو حسن وعشق کے ساتھ ملا کر ایسے اعتدال پر پہنچادیں کہ اوّل الذکر کی حدت وحرارت ہماری کمزوریوں کو جلا کر فنا کر دے۔ ہمارے حواس میں ایک ایسی ضیاء اور تنویر پیدا کر دے کہ ہم دنیا کے ہر اندھیرے کو اس کی امداد سے طے کر جائیں۔''

(بہ حوالہ: دیباچہ ''دلگداز افسانے'')



حوالہ جات:

۱۔ ''ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء'' مرتبہ: گوپی چند نارنگ وعبداللطیف اعظمی میں ۸ اگست ۱۹۰۸ء درج ہے جبکہ ''بہترین انشائی ادب'' مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں تاریخ پیدائش ۱۹۰۲ء درج ہے جو درست نہیں۔

۲۔ بحوالہ: کوثر چاند پوری سے ایک انٹرویو از نریش کمار شاد، مطبوعہ: ''بیسویں صدی'' دہلی، نومبر ۱۹۶۳ء

میرا پیشہ

کوثر چاندپوری

''جے جے رام''

''جے بھگوان''

''رادھے شیام''

''سیتارام''

وہ تیزی سے یہ الفاظ دہراتا رہا۔لوگ اس کے سامنے سے گزرتے رہے۔جس چوراہا پر وہ بیٹھا تھا وہاں سے اسٹیشن،مندر اور گوردوارہ جانے والے ہندو سکھ اور مسلمان گزرتے ہی رہتے تھے۔اسٹیشن اور مندر جانے والوں کے پیروں میں چپل یا جوتے ہوتے،گوردوارہ جانے والے ننگے پاؤں ہوتے۔ان کے پیروں کی آہٹ اس وقت کانوں میں آتی جب وہ بالکل قریب پہنچ جاتے یا آگے سے گزرتے ہوئے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے۔ان میں سے کسی کو اس پر ترس نہ آتا۔وہ سوچتے کہ پیسہ دیا جائے،یا نہیں آخری فیصلہ یہی ہوتا کہ نہ دیا جائے۔نصف گھنٹہ بعد اسے خیال آیا کہ اب مندر کی طرف جانے والے باقی نہیں رہے۔گوردوارہ سے بھی عورتیں لوٹنے لگیں۔اسٹیشن کی سمت آمد و رفت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا۔سفر کرنے والے ذرا دیر کو نرم دل بھی ہو جاتے ہیں۔ان کے احساس میں خدا ترسی کا جذبہ بھر جاتا ہے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔اس نے اپنا راستہ بدلنا ضروری سمجھا اور گوردوارہ کے قریب بیٹھ کر چیخنے لگا۔

''جے گرو کی''

''جے بابا نانک کی''

سردار صاحبان کیسوں میں کنگھے لگائے چپ چاپ گزرتے رہے۔ان کے آنے کا وقت بھی نہ رہا تو وہ بازار میں گھنٹا دن ڈھلے مسجد کے دروازے پر جا بیٹھا۔وہاں خدا اور رسولؐ کے نام پر مانگنا شروع کیا۔نتیجہ وہی رہا یعنی پیسہ نہ ملا۔پھر ایک پتلی سی گلی میں گھس کر اس نے

صدائیں لگائیں۔ اس کباڑیے نے دو پیسہ کا سکہ اس طرح اس کی طرف پھینکا جیسے کئی سال کی زکوۃ نکال رہا تھا۔ اسے روئی کی ضرورت تھی۔ وہ دو پیسہ میں نہیں مل سکتی تھی۔ وہ لولا لنگڑا تھا۔ دونوں پاؤں مشین میں دب کر کٹ گئے تھے۔ پیروں پر گھٹنوں کے قریب اس نے روئی کی گیندیں باندھ لی تھیں۔ ہاتھوں میں لکڑی کے ہتوے تھامے رہتا تھا۔ ان چیزوں کی مدد سے وہ جانوروں کی مانند چاروں ہاتھ پیروں سے چلا کرتا تھا۔ گلی میں پیلی مٹی سے لدے ہوئے گدھے بھی ملے اور کتے بھی، کہیں ایک آدھ گائے چلتی پھرتی دکھائی دی۔

اس نے ایک دو منزلہ عمارت کے نیچے ٹھہر کر بلند آواز سے کہا:

''جے جے رام''

''جے بھگوان''

''رادھے شیام''

''سیتارام''

ایک عورت نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ دراصل وہ اس کو نہیں بلکہ اس گائے کو دیکھ رہی تھی جو اس کے پیچھے ذرا فاصلہ پر نالیوں کے کنارے پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے چباتی اور چبوتروں پر رکھی دال چاٹتی ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ دو تین منٹ تک اسی جگہ بیٹھا اوپر دیکھتا رہا۔ عورت کا دل پسیجتا نہ دیکھ کر وہ اسی طرح کھسکنے لگا۔ دس بارہ فٹ چلنے پر وہ دم لینے کو رکا۔ اسی وقت تھپ سے کوئی چیز اوپر سے گلی میں گری۔ اس نے مڑ کر دیکھا عورت نے نیچے اوپر رکھی ہوئی چھ سات روٹیاں گائے کے لیے پھینکی تھیں۔ جی چاہا کہ چند ہاتھ پیچھے ہٹ کر وہ گائے سے اپنا حق چھین لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ مکان کے دروازوں پر آدمی کھڑے تھے وہ پھر رینگنے لگا، بالکل ایک بے حقیقت کیڑے کی طرح، رات ایک پیالی چائے پی کر اس نے بڑے آرام سے فٹ پاتھ پر گزار دی۔ دور تک اس کے ہم پیشہ پڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو راہ چلتے لوگوں کی جیبیں کاٹ لیا کرتے تھے اور وہ بھی جو رات کو کسی دکان کا تالا توڑ کر اپنا حصہ نکال لایا کرتے تھے۔ اس کے بازو میں لیٹا ہوا نوجوان ایک دم اپنے اوپر سے ٹاٹ پھینک کر اٹھا اور سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار اسٹارٹ کر کے چلتا بنا۔ وہ سوچتا ہی رہا کہ یہ ڈرائیور تھا یا چور۔ سویرے ہی نل پر منہ دھو کر وہ ایک بہت بڑے میدان میں پہنچا۔ وہاں ایک آدمی کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ کبوتر سب جنگلی اور پردار تھے۔ دور دور سے اڑ کر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے پیروں کا گائے کے نعل جڑے ہوئے کھروں اور کبوتروں کے پروں سے مقابلہ کیا اور انسان کی غلط بخشی پر بپھر گیا اس نے سوچا کہ بھیک مانگنے کا زمانہ نہیں اسے کوئی دھندا کر لینا چاہیے۔ اسی وقت ایک نیا خیال ذہن سے ٹکرایا۔ وہ فوراً اپنے کوارٹر کی سمت مڑ گیا جہاں لیٹرین کے دروازے پر لمبا کیو لگا ہوا تھا۔ وہ آٹھویں نمبر پر لائین میں کھڑا ہو گیا ایک ہی قطار میں کارپوریشن نے چار لیٹرین بنوا دیے تھے۔ ان میں سے آدھے عورتوں کے لیے تھے۔ ان کا راستہ دوسری طرف سے تھا۔ سڑک کے دوسرے رخ پر ایک شاندار بلڈنگ تھی۔ اس کی دوسری اور تیسری منزل پر فلیش بنے ہوئے تھے۔ نچلی منزل کے کوارٹروں میں رہنے والے کارپوریشن کی غریب نواز پالیسی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ بھی یہیں ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ جو اس کے ایک رشتہ دار کے الاٹ ہو چکا تھا۔ وہ آج کل سسرال میں رہنے لگا تھا۔ صرف قبضہ بحال رکھنے کی خاطر اسے بیرونی حصہ میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ رات کو وہ یہاں نہ پہنچ سکتا تو اپنی پرانی جاگیر فٹ پاتھ پر قبضہ کر لیتا جہاں کبھی کبھی پولیس والوں کے ڈنڈوں کا مزہ چکھنا پڑتا۔ جب اس سے اگلا آدمی لیٹرین میں چلا گیا تو پیچھے سے پنڈت بالکرشن شرما نے ڈانٹ کر کہا:

''ہٹ لنگڑے آگے سے۔''

''کیوں؟''

''پہلے ہم جائیں گے۔''

''ٹٹی ہے یہ پنڈت جی، مندر نہیں۔ تم کیوں کر جا سکتے ہو۔ آگے میں ہوں۔''

''ایسی تیسی تیری، لات ماروں گا تو نالی میں جا کر گرے گا اوندھے منہ!''

''تمہاری بھی ایسی تیسی۔ میں اپاہج ضرور ہوں مگر کان کھول کر سن لو پنڈت جی، مجھ سے الجھے ہو تو بہت پچھتاؤ گے۔''

''اے ہٹ نیچ کہیں کے، لے اپنی باری کا سودا کر لے مجھ سے۔''

''لاؤ کیا دیتے ہو؟''

''ایک آنہ۔''

''پھر لگے رہو لائن میں۔ ایک ٹٹی بند ہے، ایک کھلی ہے جس میں تم جا سکتے ہو۔''

''دو آنے لے گا؟''

اس نے بارہ پیسے میں اپنی باری بیچ دی اور پنڈت جی کی جگہ سنبھال لی۔ تین چار منٹ کے اندر ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یہ روزگار بہت اچھا ہے۔ روپے کی قیمت گرنے اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے انسان نے مذہب اور اخلاق کو بھلا دیا ہے، اسے صرف اپنی ضروریات یاد رہ گئی ہیں۔ ہر چیز بدل رہی ہے، کمانے کے ڈھنگ بھی تبدیل ہو چکے ہیں، مجھے بھی پرانا پیشہ چھوڑنا پڑے گا۔ اس کی جیب میں پنڈت کے دیئے ہوئے بارہ پیسے تھے وہ اپنی باری پر لیٹرین نہیں گیا۔ جلد ہی لوٹ آیا اور ہوٹل والے سے چائے کو کہا۔

''کپ ہے لنگڑے تیرے پاس۔''

''نہیں۔''

''ڈبہ اٹھا لے نیچے پتھر پر رکھا ہے۔''

اس نے ڈبہ اٹھا لیا اور ایک لڑکے نے اس میں گرم گرم چائے انڈیل دی۔

چائے پی کر اس نے ڈبہ وہیں رکھ دیا اور بیڑی پینے لگا۔ اسی وقت گلاٹھی صاحب چائے پینے آ گئے۔ وہ دوسری منزل کے پہلے فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ گلاٹھی جی کو دیکھ کر بولا۔

''ڈبہ اٹھا لو گلاٹھی جی!''

''کیسا ڈبہ؟'' انہوں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

''نیچے پتھر پر رکھا ہے!'' اس نے طنز کی چبھن محسوس کی۔

''آپ سے مخول کرنے لگا لنگڑا'' منیجر چائے چھلنی میں کھولتے ہوئے پانی کو چھانتے ہوئے بولا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اگلے دن کے لیے منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور بڑے کاروباری ڈھنگ سے کوارٹر میں رہنے والوں کا جائزہ لیا۔ وہاں پندرہ بیس کنبے آباد تھے اور دو میں سے ایک لیٹرین میں تالا پڑا رہتا تھا۔ دوسرے پر روزانہ بڑی لمبی لائن لگتی تھی، عورتیں ادھر

نہ آتی تھیں، بچے نالی پر بیٹھ جایا کرتے تھے، اگلی صبح کو وہ جلد ہی جاگ گیا اور بندر کی چال چلتا لیٹرین کے سامنے جا پہنچا۔ وہاں ابھی فنائل چھڑکا جا رہا تھا۔ اس کی بو سے کوئی الجھن نہ ہوئی بلکہ سویرے ہی سویرے انگریزی دواؤں کی ملی جلی مہک کچھ اچھی ہی لگی۔ لائن میں پہلا نمبر اُسی کا تھا۔ دیر بعد سہگل صاحب کھانسی کے جھٹکوں سے خاموش اور نیم بیدار فضا کا سینہ چیرتے آئے۔ دور ہی سے للکار کر بولے:

''سن بے لنگڑے پہلا نمبر میرا ہے۔''

''وہ کیوں کر؟''

''ہم ہاتھ پاؤں والے ہیں، لاٹھی سے بھینس ہانک سکتے ہیں۔''

''جان تک داؤ پر لگائے بیٹھا ہوں، شریمان جی۔''

''اور تیری جان ہے کے کوڑی کی۔''

''ہاتھ لگا کر دیکھو۔''

''میرا پیٹ خراب ہے، لنگڑ دین۔''

''دماغ میرا ابھی خراب نہیں کہ سب سے پہلے یہاں آ گیا ہوں۔''

''نہیں مانے گا بھائی بندی سے۔''

''دھینگا مشتی سے بھی نہیں!''

''سالے اپاہج، پاؤں ہوتے تو آکاش سے تارے توڑ لاتا۔''

سہگل صاحب کے ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ تھا۔ اس میں سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ ڈر رہے تھے کہ پانی کم ہو گیا تو ڈبہ بھرنے نل پر جانا پڑے گا، اس وقت تک کیو میں دو چار آدمی اور لگ جائیں گے۔ سہگل صاحب نے موڈ بدل کر کہا:

ہٹ جا پیارے، راستے سے۔''

''صفائی ہو رہی ہے۔ جمعدار کے نکلتے ہی میں جاؤں گا۔''

''نہیں مانے گا۔''

''بالکل نہیں۔''

''لے پانچ کا سکہ۔''

''یہ تو بھیک منگے بھی نہیں لیتے، خوشی سے۔''

''دس کا سہی۔''

''دو اور بڑھاؤ سہگل جی، پیٹ کی خاطر آدمی ہزاروں خرچ کر ڈالتا ہے۔ یہاں کھڑے کھڑے درد ہونے لگا تو ایکسرے کھنچوانا پڑے گا۔''

''دس بہت ہیں۔''

''پھر یوں ہی چٹ پکڑے کھڑے رہو۔''

آخر کار بارہ پیسے لے کر اس نے سہگل صاحب کے لیے اپنی باری چھوڑ دی۔ لائن لمبی ہوئی جا رہی تھی۔ کوارٹروں کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ مرغوں کی بانگ رات کے سناٹے سے الجھ رہی تھی۔ پنڈت بالکرشن آج غائب تھے۔ وہ جن لوگوں کی کمزور رگ سے واقف ہو گیا تھا انہیں کا منتظر رہتا تھا۔ اس نے کل دید جی کے یہاں سہگل صاحب کو لون بھاسک پھانکتے دیکھا تھا تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ سہگل جی ذرا سویرے ہی لیٹرین آئیں گے۔ پنڈت بال کرشن کے متعلق سب ہی جانتے تھے کہ وہ کرانک ڈیسنٹری کے مریض ہیں۔ دن میں تین مرتبہ ٹٹی جاتے ہیں۔ آفس کا باتھ روم تو بقول ایک بابو جی کے ان کے نانی کا گھر ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ انہیں دو جگہ بہت سکون ملتا تھا۔ ایک ٹٹی میں دوسرے ہسپتال میں۔ کل کے تلخ تجربہ کے پیش نظر پنڈت جی آج جلد اٹھ بیٹھے اور کان میں جنیو ڈالے۔ ڈبہ ہاتھ میں لیے لیٹرین کی سمت دوڑے۔ دور سے دیکھا کہ لنگڑا دروازہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس سے پہلے ایک آدمی اور جا چکا تھا۔ دو تین اس کے پیچھے کیو میں لگے ہوئے تھے۔ وہ پنڈت جی کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر بولا:

''پنڈت جی، پالا گن!''

پنڈت جی کے پیٹ میں بڑے زور سے بل پڑ رہے تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ لنگڑا مذاق کر رہا ہے۔ جل کر بولے:

''سالا سنیچر کہیں کا!''

''میرے بس کی بات نہیں پنڈت جی، آپ تو گیہوں کھاتے ہیں۔ میں موٹا اناج لے رہا ہوں۔ ٹٹی پر میرا حق آپ سے زیادہ ہے۔''

''پگلا!''

''پنڈت جی مندروں پر تو پہلے ہی قبضہ جمائے بیٹھے ہو اب کارپوریشن کا یہ لیٹرین بھی غریبوں سے چھیننا چاہتے ہو۔ یہ دھاندلی نہیں چلے گی، نکالو آٹھ آنے اور آ جاؤ میری باری پر۔''

''چار آنے دوں گا، بھاؤ نہیں بڑھا سکتا۔''

''اور دال، نمک اور مرچ کا بھاؤ کیوں بڑھا رہے ہو؟''

پنڈت جی کے پیٹ میں پھر درد ہوا۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا ایک اٹھنی لنگڑے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''چار آنے کل لگ جائیں گے۔''

اس نے اٹھنی قبول کر لی اور آہستہ سے کہا۔

''بھگوان کرے مروڑ اور بڑھے، پیٹ کا درد کبھی دور نہ ہو۔''

وہ بہت خوش تھا۔ اسے اس دھندے پر بھروسہ ہوتا جا رہا تھا۔ دیا ہے ایشور کی، کیا روزگار دیا ہے۔ بڑے بڑوں کا دیوالہ نکلا جا رہا ہے اور اچھے اچھے ودوان مارے مارے پھر رہے ہیں۔ پاؤں سلامت تھے تو مل کے آفس میں کرسی پر بیٹھ کر کلرکی کیا کرتا تھا۔ لولے لنگڑے آدمی کو ایل۔ ڈی۔ سی کی سیٹ پر بٹھانا بھی پاپ ہے۔ مل مالک کے نزدیک۔

پنڈت جی کے باہر آتے ہی ایک آدمی اور آ گیا۔ اس نے دور ہی سے دس کا سکہ دکھاتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ میں کہا:

''بھیا، باری مجھے دو!''

''دس پیسے کے لیے دے سکتا ہوں، اچھا ہوا تم نے بھگوان کا نام نہ لیا، مجھے کسی نے پیسہ تک نہیں دیا اس کے نام پر، میں کیونکر دے سکتا

ہوں۔ تمہارے لیے اپنا ریٹ گرائے دیتا ہوں۔"

دن گزرتے رہے، گرانی اور ملاوٹ بڑھتی رہی۔ گھی، دودھ، آٹا ہوا، غرض کوئی چیز خالص نہ مل رہی تھی۔ بیماریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پیٹ میں درد، زخم اور کیڑوں کی شکایت عام ہو گئی تھی۔ اس کا کاروبار چمکتا جا رہا تھا۔ وہ کسی کے بیمار ہونے کی دعا نہ مانگتا۔ بغیر دعا مانگے ہی لوگ بیمار ہو رہے تھے۔ لیٹرین کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا پیشہ بھی اسی نسبت سے ترقی کر رہا تھا۔ وہ شام ہی سے کوارٹروں میں رہنے والوں کی نسبت معلومات فراہم کرتا رہتا۔ ضروری باتیں بہت آسانی سے معلوم ہو جاتیں۔ اس نے چار بجے رات کے بعد کا سونا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ پیٹ کے سامنے نیند کی اہمیت بھی کیا ہے۔ ایک دن پتہ چلا کہ متھرا داس صاحب کل پیٹ کا ایکسرے کرا رہے ہیں۔ رات کو مسہل لینا ضروری ہے۔ اگلا پروگرام اس نے اسی وقت بنا لیا اور چار بجتے ہی لیٹرین کے دروازے پر جا بیٹھا۔ پانچ منٹ بعد ہی متھرا داس دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی "چیخا اندر آدمی ہے گیٹ پر میں ہوں آپ لائن بنائیے جلدی سے۔"

"کیسٹر آئل پیا ہے بھیا رات کو۔"

"نہ جانے اور کس کس نے پیا ہوگا۔"

"پیارے رستہ دے۔"

آپ کو اپنے لیے الگ فلش بنوا لینا چاہیے۔ یہاں تو سب برابر ہیں۔ لنگڑے ہوں یا اندھے اور کانے۔"

متھرا داس کی حالت خراب تھی۔ پیٹ میں زخم تھا۔ صبح آٹھ بجے ایکسرے لیا جا رہا تھا۔ سوچ رہے تھے کہ دیر ہو گئی تو آنتیں صاف نہ ہوں گی۔ کوئی اور وبال بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے پیسوں کو بھی ایکسرے چارجز میں شامل کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے تو دھندا ہی کر لیا پگلے۔" یہ کہتے ہی انہوں نے جیب میں سے چند سکے نکال کر اس کی جانب پھینک دیئے۔

"کیا پھینک دیا متھرا داس جی؟"

"۲۵ پیسے۔"

"ایکسرے کی فیس کیا دی ہے؟ تم مجھے کیسٹر آئل کی قیمت سے آدھے پیسے ہی دے دو، اور جو کچھ پھینکا ہے اسے اٹھا لو۔ جھک کر پھر قاعدہ سے میرے ہاتھ پر رکھ دو۔"

ایک دن اسے اپنی جاب پر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ وہ ساڑھے پانچ بجے آیا۔ نالی پر دس بارہ لڑکے برابر بیٹھے تھے۔ وہ غور سے انہیں دیکھتا تیزی سے لائن میں جا لگا۔ چار آدمی اس کے آگے تھے۔ لائن آہستہ آہستہ لمبی ہوتی گئی۔ پنڈت بلکرشن گہری نیند سو گئے تھے۔ وہ سلیپنگ پلس کے نشہ میں لڑکھڑاتے اس کے بعد پہنچے۔ ادھر ایک اور شخص کیسٹر آئل پی کر آیا تھا۔ پنڈت جی نے اس کا حق نکالتے ہوئے کہا:

"ہٹ لنگڑے!"

"کبھی ٹیشن ہوگا پنڈت جی، آج بلدیو بھی رستہ مانگ رہا ہے۔"

پنڈت جی پرانے گاہک تھے، انہیں دس کا سکہ بڑھا کر جگہ دے دی گئی۔ رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا کہ اس نے کوارٹروں والوں کو پریشان کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے، خود کبھی صبح کے وقت ٹٹی نہیں جاتا، شام کو جاتا ہے، جب وہاں بالکل سناٹا ہوتا ہے۔ باہمی مشورے سے کارپوریشن میں اس کی شکایت کر دی گئی۔ ہیلتھ آفیسر حلقہ کے انسپکٹر کو ساتھ لے کر موقع دیکھنے آیا، اس کو بھی بلایا گیا، وہ بالکل ہراساں نہ

ہوا۔ نہایت اطمینان سے جواب دہی کے لیے تیار ہوکر آیا۔ ہیلتھ آفیسر نے نام پوچھا۔ پھر سوال ہوا پیشہ کیا ہے تمہارا؟

اس نے جوش میں آ کر ہاتھوں میں دبے ہوئے لکڑی کے ہتوے زمین پر ڈال دیئے اور گھٹنوں پر بندھی ہوئی گدیوں کے سہارے کھڑے ہوکر بولا۔

''میرا پیشہ؟''

''میرا پیشہ؟''

''خدمت خلق''

ہیلتھ آفیسر ہنس پڑا اور آدمیوں کو بھی ہنسی آ گئی۔ پھر اس نے کہا: ''پیشہ پوچھو بلیک کرنے والوں کا۔ رشوت خواروں کا یا ان لوگوں کا جو ہمارے ووٹ سے کرسی پر بیٹھتے ہیں اور ذرا سی دیر میں پارٹی بدل دیتے ہیں۔ میں کیا کرتا ہوں؟ چوری؟ گرہ کٹی؟ نقب زنی؟ یہ ایک ٹنی ہی میری بلڈنگ ہے اس پر پگڑی نہیں لیتا۔ دوگنا، تگنا کرایہ وصول نہیں کرتا۔ صرف باری بیچتا ہوں۔ چونّی سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی اس کی بولی لگاتا ہے۔ اس پر جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ بھیج دو!''



میرزا ادیب

نام : دلاور علی

قلمی نام : میرزا ادیب عاصی/ میرزا ادیب

پیدائش : ۴ اپریل ۱۹۱۴ء بہ مقام محلہ ستھاں، چوک دتا، کوچہ مغلاں، اندرون بھاٹی گیٹ، لاہور (پنجاب)

وفات : ۳۱ جولائی ۱۹۹۹ء میو ہسپتال، لاہور

تعلیم : بی۔اے (آنرز) اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۳۵ء

اسلامیہ ہائی سکول، لاہور سے ۱۹۳۱ء میں میٹرک اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۳۵ء میں بی۔اے (آنرز) فارسی کیا۔ اسلامیہ کالج میں سید فیاض محمود ان کو انگریزی پڑھاتے تھے، جن سے ادب تخلیق کرنے میں راہنمائی لیتے رہے۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام میرزا بشیر علی تھا جو پیشہ کے اعتبار سے درزی تھے۔ والد کو بیٹے کی تعلیم سے دلچسپی نہ تھی۔ دادی نے ایک بڑھئی کے سپرد کر دیا، جس کی چلم توڑ کر میرزا ادیب ایسے بھاگے کے پھر واپس نہ گئے۔ اس کے بعد انہیں ایک لوہار کے سپرد کیا گیا جس نے ساتویں دن خود چھٹی کروا دی۔ پھوپھا نے رحم کھا کر میونسپلٹی کے اسکول میں داخل کروایا اور ماں نے جھڑکیاں سہہ کر بیٹے کی تعلیم جاری رکھی۔ اسکول کے ہی زمانے میں ادب کی چینک دل میں جاگی اور عاصی تخلص اختیار کر کے کچی پکی نظمیں اور کہانیاں لکھیں[1]۔ ۱۹۳۵ء میں ''ادب لطیف'' کی ادارت سنبھالی اور سترہ برس تک ''ادب لطیف'' کو درجہ اوّل کا پرچہ بنائے رکھا۔ ۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء ہفتہ روزہ ''مصوّر'' بمبئی کی ادارت کی۔ بمبئی سے واپسی پر ۱۹۴۳ء میں چند ماہ رسالہ ''حسن پرست'' لاہور کے مدیر رہے۔ بے کاری کے چند برس گزار کر آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے بطور سٹاف آرٹسٹ/ سکرپٹ رائٹر منسلک ہو گئے اور پندرہ برس ریڈیو کی ملازمت کی، اس دوران میں ۱۹۴۸ء کے اواخر تا ۱۹۶۵ء ''ادب

لطیف'' کی مکرر ادارت سنبھالی۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۷ء فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور سے متعلق رہے اور اس کے بعد ریڈیو پاکستان، لاہور سے وابستہ ہو گئے، ریڈیو کے لیے ۱۹۷۴ء تک لکھا۔ ۱۹۷۷ء تا دمِ آخر روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور میں ''اذکار و افکار'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے رہے۔ ''لالۂ صحرا'' چوہان روڈ، کرشن نگر، لاہور میں قیام رہا اور وہیں انتقال کیا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''افسانۂ خونیں'' مطبوعہ: ''ادبِ لطیف'' لاہور (سالنامہ) ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''صحرانورد کے خطوط'' (آٹھ افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اوّل: جولائی ۱۹۴۰

(۱) افسانۂ خونیں (۲) دخترِ صحرا (۳) ملکۂ صحرا (۴) مورتی (۵) سیل حوادث (۶) حکایۂ جنوں (۷) سمارت کا قیدی (۸) چاہ بابل

۲۔ ''صحرانورد کے رومان'' (چار افسانے) نرائن دت سہگل، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

(۱) دیوی (۲) طوفان حوادث (۳) تباہی کے بعد (۴) جزیرہ ہاسورین

۳۔ ''موت کا تحفہ'' (سات افسانے) پنجاب لٹریچر کمپنی، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

(۱) موت کا تحفہ (۲) غلاموں کی بغاوت (۳) مال (۴) دیوانی (۵) شاہی رقاصہ (۶) قیدی کی سرگزشت (۷) سوکھی ہوئی ندی

(یہ مجموعہ دوسری بار رام دتہ مل اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیا)

۴۔ ''دیواریں'' (اٹھارہ افسانے) عالمگیر بک ڈپو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۷

(۱) روشنی (۲) آئینہ (۳) بادل (۴) شہ نشیں پر (۵) دروازہ (۶) نوجوان بازو (۷) دمساز (۸) کھڑکی (۹) زیر سنگ (۱۰) نئے انسان (۱۱) خلاء (۱۲) کلاک (۱۳) دیا (۱۴) گڑیا (۱۵) سرخ دوپٹہ (۱۶) کنگال دیس میں (۱۷) شبنم (۱۸) شہاب

۵۔ ''جنگل'' (چودہ افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۲ء

(۱) ایک دکان (۲) ۳۷ سال کے بعد (۳) مرکز (۴) آزادی (۵) شتر مرغ (۶) دیا (۷) جنگل (۸) بدھو میاں عبدالرحمٰن (۹) درونِ تیرگی (۱۰) زیر سنگ (۱۱) کارپوریشن ایک ڈاکٹر اور بجس نگر (۱۲) قرارداد (۱۳) آرمینیہ کا ہیرو (۱۴) ایک مصنف

۶۔ ''کمبل'' (چودہ افسانے) بک لینڈ، لاہور طبع اوّل: اکتوبر ۱۹۵۷

(۱) موت کا راگ (۲) اس کی حسین تصویر (۳) شاہی رقاصہ (۴) گونگی محبت (۵) ان داتا (۶) نوجوان خوش (۷) ٹھیک (۸) روشنی (۹) دیا (۱۰) شبنم (۱۱) مائی پھاتاں (۱۲) کمبل (۱۳) دینو (۱۴) شعلہ بے دود۔

۷۔ ''حسرتِ تعمیر'' (سترہ افسانے) التحریر، لاہور، طبع اوّل: ۱۹۷۹ء

(۱) نشہ (۲) نیلم پری (۳) کاکا چڑی مار (۴) استاد فضل الٰہی فضل (۵) شیشے کی کرچیاں (۶) گوٹے کناری والی چنریا

(۷) سوہنی کمہارن (۸) یوسف زلیخا (۹) آپا کی مرغی (۱۰) پڑھی لکھی زینب (۱۱) نمیں جی (۱۲) لالو ماشکی (۱۳) صدر دین عرف صدرا (۱۴) میاں دین محمد (۱۵) ماسی (۱۶) پیچ وخم (۱۷) دشمنی

۸۔ ''ساتواں چراغ'' (بارہ افسانے) مطبوعات حرمت، راولپنڈی طبع اوّل: ۱۹۸۳ء

(۱) امانت (۲) ساتواں چراغ (۳) گیٹ مین (۴) سائرہ (۵) بندگلی، بڑا مسئلہ (۶) ریڑھی (۷) عنایت بی بی کا انفصال (۸) درویش (۹) کاغذ کی ناؤ (۱۰) علیا کی ٹلی (۱۱) اس کی خاطر (۱۲) ایک منزل کئی راہیں

۹۔	''ان داتا'' (افسانے)	آگرہ اخبار برقی پریس، آگرہ	طبع اوّل: ۱۹۳۵ء
۱۰۔	''اندھا دیوتا'' (افسانے)		
۱۱۔	''بے کسی'' (افسانہ)	رام دتہ مل اینڈ سنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۱۲۔	''دنیائے آرزو'' (افسانے)	نرائن دت سہگل، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۱ء
۱۳۔	''غلاموں کی بغاوت'' (افسانہ)	کتب خانہ اردو، لاہور	طبع اوّل: س۔ن
۱۴۔	''موت کا راگ'' (افسانہ)	کتب خانہ اردو، لاہور	طبع اوّل: س۔ن
۱۵۔	''لاوا'' (افسانے)	عالمگیر اکیڈمی، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء
۱۶۔	''صحرانورد کا نیا خط'' (افسانہ)	لاہور،	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۱۷۔	''آنسو اور ستارے'' (ڈراما)	مکتبہ کارواں، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۱۸۔	''لہو اور قالین'' (ڈراما)	ادارہ نو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۵ء
۱۹۔	''ستون'' (ڈراما)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
۲۰۔	''فیصل شب'' (ڈراما)	گلڈ اشاعت گھر، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء
۲۱۔	''شیشے کی دیوار'' (ڈراما)	الجدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۲۲۔	''ناخن کا قرض'' (خاکے)	امتزاج پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۲۳۔	''پس پردہ'' ڈرامے (آدم جی ادبی انعام)	مکتبہ ادب جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
۲۴۔	''ماموں جان اور ماموں جان'' (ڈرامے)	مقبول اکیڈمی، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۸ء
۲۵۔	''خاک نشین'' (ڈرامے)		طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
۲۶۔	''شیشہ و سنگ'' ڈرامے (آدم جی ادبی انعام		طبع اوّل: ۱۹۷۹ء
۲۷۔	''پاکستان کو سلام'' (ڈرامہ)		طبع اوّل: ۱۹۸۴ء
۲۸۔	''خوابوں کے مسافر'' (نثر لطیف/مضامین)	کتب مینار، لاہور	طبع اوّل:
۲۹۔	''ہمالہ کے اس پار'' (سفرنامہ)		طبع اوّل: ۱۹۸۳ء

۳۰۔	''تنقیدی مقالات'' (مرتبہ: ادیب) دو جلدوں میں (برائے نصاب ایم۔اے اردو)		
۳۱۔	''بہترین ادب'' (انتخاب) مرتبہ: میرزا ادیب ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۵ء		
۳۲۔	''۱۲ انمول کتابیں'' (انتخاب) فرینکلن نیو یارک اہتمام: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور		طبع اوّل:۱۹۸۱ء
۳۳۔	''جدید امریکی افسانے'' (انتخاب) ترجمہ: میرزا ادیب	آئینہ ادب، لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۴ء
۳۴۔	''پراسرار وادی'' (ترجمہ)	تخلیق مرکز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۸ء
۳۵۔	''واشنگٹن ارونگ'' (شخصیت وفن) ترجمہ: میرزا ادیب	فرینکلن نیو یارک/لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۹ء
۳۶۔	''مٹی کا قرض'' (آپ بیتی)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل:۱۹۸۱ء
۳۷۔	''افق کے اس پار'' (ڈرامہ) ترجمہ: میرزا ادیب	لاہور	طبع اوّل:۱۹۷۳ء
۳۸۔	''میرزا ادیب کے بہترین افسانے'' مرتبہ: عرش صدیقی	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۶ء
۳۹۔	''تمیں ماں خاں'' بچوں کے لیے (ڈرامے)		طبع اوّل:۱۹۴۵ء
۴۰۔	''مٹی کی گڑیا'' (ڈرامے)		طبع اوّل:۱۹۷۲ء
۴۱۔	''سنو پیارے بچو'' (کہانیاں۔تین جلدوں میں)		طبع اوّل:۱۹۷۴ء
۴۲۔	''اے وطن میرے وطن'' (بچوں کے لیے)		طبع اوّل:۱۹۷۱ء
۴۳۔	''پانچ ڈرامے'' (بچوں کے لیے) (یونائیٹڈ بینک انعام یافتہ)		طبع اوّل:۱۹۶۸ء
۴۴۔	''شہر سے دور'' (بچوں کے لیے)		طبع اوّل:۱۹۶۶ء
۴۵۔	''چچا چونچ'' (بچوں کے لیے) (یونائیٹڈ بینک انعام یافتہ)		طبع اوّل:۱۹۷۵ء
۴۶۔	''نانی اماں کی عینک'' (بچوں کے لیے) (یونائیٹڈ بینک انعام یافتہ)		طبع اوّل:۱۹۷۷ء
۴۷۔	''جب وہ جوان تھے'' (بچوں کے لیے)		طبع اوّل:۱۹۷۲ء
۴۸۔	''مثالی طالب علم'' (بچوں کے لیے)	اُردو سائنس بورڈ، لاہور	
۴۹۔	''اذکار و افکار'' (ادبی کالم)	لاہور	طبع اوّل:۱۹۸۸ء
۵۰۔	''بہترین افسانے'' (مرتبہ: میرزا ادیب)	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	طبع اوّل:۱۹۶۳ء

۵۱۔ ''پراسرار غار'' (بچوں کے لیے) ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی
(بہ اشتراک دیگر کہانی نویس)

(بچوں کے ادب سے متعلق یہ فہرست نامکمل ہے۔ میرزا ادیب نے بچوں کے لیے ۳۵ کتابیں لکھیں، جو شائع ہوئیں)

۵۲۔ ''گلی گلی کہانیاں'' (سترہ افسانے) مقبول اکیڈمی، لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
۵۳۔ ''کرنوں سے بندھے ہاتھ'' (نو افسانے) مقبول اکیڈمی، لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۱ء

غیر مدوّن:

لاتعداد ادبی کالم اور تبصرے۔

اعزاز:

۱۔ پرائڈ آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا سول اعزاز) ۱۹۸۱ء
۲۔ بار پاکستان رائٹرز گلڈ آدم جی ایوارڈ/ یونائیٹڈ بینک ایوارڈ
۳۔ ۳ بار فلم گریجویٹ ایوارڈ

وفات سے قبل مستقل پتا:

''لالۂ صحرا'' چوہان روڈ، کرشن نگر، لاہور (پاکستان)

نظریۂ فن:

''ہر صنف ادب کی طرح کہانی کو بھی اپنے قاری سے ذہنی رابطہ استوار کرنا چاہیے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ خود کہانی کار اور اس کے معاشرے کے درمیان گہرا رابطہ ہو۔ کہانی کار اپنے لاشعور میں ڈوب کر نہ رہ جائے بلکہ اپنے عوام کے دلوں میں اتر کر اپنا مواد حاصل کرے۔ اس کا تجربہ اپنے اردگرد کے ماحول سے اثرات قبول کرے۔''

(مکتوب: بنام مرزا حامد بیگ مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء)

O

حوالہ جات:

۱۔ میرزا ادیب کی ابتدائی نظمیں ''شباب اردو'' لاہور ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئیں۔

حکائیہ جنوں

میرزا ادیب

حبیب دلنواز......!

اس وقت جب کہ میں تمہارے لیے تازہ ''رومان'' لکھ کر اپنی صحرائی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ تمہیں کیونکر بتاؤں کہ تمہارا دور افتادہ دوست تم سے ملنے، تمہارے موجودہ حالات زندگی سننے اور تمہیں اپنی زبان سے اپنے ''صحرائی واقعات'' سنانے کے لیے کس قدر بے تاب...... کس قدر مضطرب ہے۔ ! کاش تمہارا ''رومانی ذوق'' تمہیں یہاں کھینچ لائے۔ اس سے ایک تو ہماری سیاحت زیادہ پر لطف، زیادہ رومان انگیز اور زیادہ دلچسپ ہو جائے گی اور دوسرے تمہاری آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری تمہیدی عبارت سے تم کسی حد تک ضرور لطف اٹھاتے ہو گے لیکن میرے دوست! یقین کرو کہ اس سے میری چاروں طرف بکھری ہوئی رنگینیوں، دلاویزیوں اور دلچسپیوں کا پرتو بھی تمہارے سامنے نہیں آ سکتا۔ تم یہاں آ جاؤ تو تمہیں معلوم ہو کہ علی الصبح پراسرار اور کہر میں لپٹے ہوئے مشرقی افق کے سینے پر جب غاروں میں رینگتے ہوئے سانپوں کی طرح رنگ برنگ ابر بارے لہراتے ہیں تو ایک رومان پرست دل پر کیا اثر ہوتا ہے! اور جب شام کے وقت شفق کے دامن میں دھوئیں کے بادوں کی مانند درختوں کے دھبے آہستہ آہستہ نگاہوں سے غائب ہونے لگتے ہیں تو انسان پر کیا کیفیت چھا جاتی ہے اور پھر جب اس عالم میں کسی برہ کے مارے ہوئے پرندے کی غمناک، دردانگیز آواز فضا میں تھرتھراتی ہے تو روح کی گہرائیوں میں کون سا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی دن تمہارا ''رومان پرست دل'' تمہیں ''وحشت'' سکھا دے اور تم اپنی آباد و ہنگامہ پرور دنیا سے نکل کر میری ویران و پرسکون دنیا میں آ جاؤ۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟

اس ''رومان'' کے متعلق کیا لکھوں۔ یہی سمجھ لو کہ اس نے میرے دل میں مدت سے سوئے ہوئے ایک جذبے کو بیدار کر دیا ہے اور میں پھر وادی ''سیزا'' کی چاندنی راتوں کو یاد کر کے تڑپنے لگا ہوں۔ امید ہے میری طرح تم بھی اس سے متاثر ہو گے...... یہ ''داستان'' جنوں انگیز محبت کی تباہ کاریوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے......!

''محبت اور جنوں انگیز محبت......! خدا کی پناہ!

محبت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ بچپن میں یہ قول میں بھی سنا کرتا تھا اور مجھے اس کی صداقت پر ذرہ بھر اعتبار نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک وہم ہے اور ہر ایک شخص اس وہم میں اس لیے مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکا ہے اور کرتا جا رہا ہے لیکن اب میرا یہ نظریہ تبدیل ہو چکا ہے اور میں مندرجہ بالا مقولے کی صداقت کا بہ دل و جان قائل ہو گیا ہوں۔ واقعی محبت کی چنگاری ایک نہایت معمولی واقعے سے انسان کے دل کی گہرائیوں میں سلگنے لگتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ ننھی سی چنگاری دل و دماغ کو بھسم کر دینے والے آتشیں شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کوئی انسانی زندگی اس آگ کو سرد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ موت کی آندھی کا تیز و تند جھونکا اس آگ کو اور اس کے ساتھ انسانی زندگی کو شمع کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیتا ہے یا محبت ایک ایسا زہر ہے جو دل و دماغ کو مسموم کرتا ہوا روح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس بے رحم دشمن کا مقابلہ کرتا ہے، مگر بے سود۔ تا آنکہ موت کے سرد ہونٹ انسان کے ہونٹ سے لگ کر یہ ہولناک زہر اور اس ہولناک زہر کے ساتھ خونِ حیات کو بھی چوس لیتے ہیں......!

اس افسانے میں یہی ناگوار و تلخ حقیقت پائی جاتی ہے......!

امید ہے، تم بخیریت تمام ہو گے......!!

تمہارا صحرا نورد

میں کیونکر دامِ محبت میں گرفتار ہوا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا اور اس کے بتانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ یہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس طرح بدنصیب انسان محبت کے غار میں دھکیل دیئے جاتے ہیں اسی طرح میں بھی دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد جب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا تو میں نے خود کو تباہی سے بچانے کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، تمام احتیاطی تدبیروں پر سختی کے ساتھ عمل کیا لیکن میری ہر ایک کوشش خاک میں مل گئی......آہ! اس مصیبت سے نہ چھٹکارا ہونا تھا، نہ ہوا۔

میری محبوبہ، شہر کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی، چودھویں کے چاند کی شفافیت، اس کی لمبی کالی زلفیں، جاڑے کی راتوں کی تاریکی اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، ہرن کی آنکھوں کی مقناطیسیت لیے ہوئے تھیں۔ اس کے رخساروں میں خونِ ناب اس طرح چھلک رہا تھا، جس طرح چاند کے سیمیں سینہ میں شرابِ احمریں کی موجیں اچھل رہی ہوں۔ وہ جب چلتی تو یہ معلوم ہوتا کہ تالاب کی سطح پر بطخ تیر رہی ہے اور جب وہ بولتی، تو یوں محسوس ہوتا گویا دور کہیں ترنم ریز ندی بہہ رہی ہے۔ وہ یگانہ روزگار منصور کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھی مگر میری انتہائی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ بہت سنگدل واقع ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا تھا۔ وہ میری مجنونانہ محبت میری قابلِ رحم بے کسی کو دیکھتی اور نہایت سنگدلی کے ساتھ حقارت انگیز قہقہہ لگاتی ہوئی منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ میری محبت کی قدر اس کی نگاہوں میں ذرہ برابر نہیں تھی۔! وہ ظالم ہستی محبت کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ میں اپنے باغ کے حسین پھول لے کر، ایک جگہ کھڑے ہو کر اس کے انتظار میں کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتا مگر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی اور وہ انتہائی بے رخی سے اپنا راستہ تبدیل کر لیتی یا اگر میرے پاس سے گزرتی اور میں اس کے پاؤں پر پھول گرا دیتا تو ایک لفظ کہے بغیر پھولوں پر نظر ڈالے بغیر چلی جاتی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کئی بار دوستوں نے مجھ سے کہا ''اگر تم مرتے

دم تک بھی اسی طرح محبت کی آگ میں جلتے رہے جب بھی سلمٰی (میری بے رحم محبوبہ) تمہاری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اس کی بے رحمانہ محبت میں تباہ نہ کرو۔ شہر میں ہزاروں حسین دوشیزائیں ہیں۔ کیا تمہیں محبت کے لیے اور نہیں ملتی؟ سلمٰی کا خیال چھوڑ دو، ورنہ اس جنوں میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے!'' اس کی سہیلیاں کہتیں۔ ''ہم نے ہزار کوشش کی کہ سلمٰی کے دل میں تمہارا خیال پیدا کریں مگر جس طرح پتھر میں سے پانی نہیں گزر سکتا، اسی طرح اس کے دل میں بھی تمہاری محبت نہیں پیدا ہو سکتی۔ تم بھی اس سے نفرت کرنے لگو!''

میں یہ سب کچھ سن کر اپنی بدقسمتی پر افسوس کرتا مگر سلمٰی کا خیال دل میں نہ لاتا، سلمٰی سے دور بھاگنا میرے لیے قطعی ناممکن تھا۔ معلوم نہیں کہ اس حسین ساحرہ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ جس قدر میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا۔ اسی قدر اس کی محبت بڑھتی جاتی۔

میں جوشِ جنوں میں اکثر شہر سے باہر نکل جاتا اور پرانے قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتا۔ یہ قلعہ مدت سے ویران پڑا تھا اور جب سے حکومت سامین نے فوج کشی کر کے یہاں کے پہلے حاکم ہاشم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی بھی نہیں جا سکا تھا اور کوئی جا بھی کیونکر سکتا تھا؟ قلعے کے آہنی دروازے بند تھے اور ان کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔

یہ قلعہ چونکہ ایک مدت سے ویران پڑا تھا اور تھا بھی شہر سے دور، اس لیے لوگوں کا گمان تھا کہ اس میں بھوت پریت وغیرہ رہتے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان کہا کرتا تھا کہ اس نے کئی بار قلعے کی ایک کھڑکی سے ایک حسین لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ الغرض اس پرانی ہیبت ناک عمارت سے طرح طرح کی افواہیں وابستہ تھیں۔ میں قلعے کی سیڑھی پر پڑھی ہوئی چھوٹی سی چٹان کے اوپر گھٹنوں بیٹھا رہتا اور دلسوز گیت گاتا رہتا تھا۔ میں اس بوڑھے آدمی سے بہت مانوس تھا۔ اس کا نام بابا حمدی تھا اور میں ہفتے میں دو تین بار اس سے ضرور ملا کرتا تھا۔ بابا حمدی محبت کو انسانی زندگی کے لیے خوفناک ترین مرض سمجھتا تھا اور چونکہ میرے واقعاتِ محبت اس سے پوشیدہ نہیں تھے اس لیے وہ مجھے اس جنوں سے باز رکھنے کے لیے ہر وقت نصیحتیں کرتا رہتا۔ مگر اس کی نصیحتیں رائیگاں جاتیں۔ محبت کا جنوں کبھی نصیحتوں سے بھی دور ہوا ہے۔

دنیا میں صرف یہی ایک انسان تھا جس کی باتوں سے مجھے ہمدردی کی بو آتی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا۔ بابا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ تم کیا کرتے ہو مگر وہ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتا۔ پھر پھرا کر زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں۔ دنیا میں ہر جگہ میرا ٹھکانا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا۔ حمدی نہایت ہمدردانہ لہجے میں مجھے ترکِ محبت کی صلاح دیتا اور اس سلسلے میں عجیب و غریب داستانیں بھی سنایا کرتا مگر بدقسمتی سے اس کی نصیحتوں اور داستانوں کو سن کر میرے دل میں محبت کی آگ اور بھڑک جاتی اور جب میں شہر کا رخ کرتا تو سلمٰی کی یاد اس درجہ بیقرار کرتی کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

2

اس دن میں خاص طور پر غمگین و مغموم تھا۔ بے رحم سلمٰی کی سرد مہریوں نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور میں اپنے صد پارہ دل کو سینے میں لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا پرانے قلعے کی طرف جا رہا تھا۔

دن بیت چکا تھا اور فضاؤں میں تاریکی کے بادل عفریتوں کی طرح چھا رہے تھے۔ دور مغربی گوشے میں ایک بلند اور گنجان درخت

خوفناک دیو کی مانند آفتاب کی خونچکاں نعش بازوؤں پر اٹھائے آہستہ آہستہ تاریکی کی غار میں غائب ہو رہا تھا۔ میں اس خونی منظر کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ ایک دن میں بھی خون شدہ تمناؤں کو لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پرنم ہو گئیں اور میں ایک بندھی ہوئی کشتی میں بیٹھ گیا۔ میرے حقیر آنسو سطح آب پر ننھے ننھے دائرے بناتے ہوئے تحلیل ہونے لگے۔ اسی اثنا میں میں نے حمری کو قلعے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے دیکھا۔ میں کشتی سے نکلا اور حمری کے قریب پہنچ گیا۔ حمری نے قدموں کی آہٹ سن کر مڑ کر میری طرف دیکھا اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہوا اور اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔'' آج تم بہت غمگین نظر آ رہے ہو۔''

''میرا دل ٹوٹ چکا'' میں نے جواب دیا۔

''اس نے ایک لمبی آہ بھری اور غمناک لہجے میں کہا۔تم خود کو تباہ کر رہے ہو۔''

''تو کیا کروں''

''اس آگ سے نکلو ورنہ اس کے آتشیں شعلے تمہیں جلا کر خاک کر دیں گے۔''

حمری کھجور کے درخت سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ یکا یک ایک پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر قلعے کی دیوار کے پاس تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شاید وہاں وہ اپنے گھونسلے میں جا بیٹھا تھا۔ بابا حمری قلعے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پراسرار چمک پیدا ہو رہی تھیں۔ قلعے کی بلند مہیب دیواریں نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ماضی کے دھندلکوں میں عظمت چشیں اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔

''بابا میں نے اس قلعے کے متعلق عجب عجب باتیں سنی ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہاں بھوت پریت رہتے ہیں۔ کسی کا قول ہے یہاں مردوں کی روحیں چیختی چلاتی رہتی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے چیخیں بھی سنی ہیں۔ ایک بوڑھے کسان نے کہا ہے کہ اس قلعے کی کھڑکی میں سے ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا گیا ہے، تم نے بھی کچھ سنا یا دیکھا ہے؟'' میں نے حمری سے پوچھا۔ بوڑھا خاموش رہا۔۔۔خاموشی سے قلعے کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے دوبارہ استفسار کیا، اس پر اس نے کہا:

''میں نے تو یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی سنا' لوگ یونہی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں' مگر۔۔۔جو اصل حقیقت ہے۔''

''اصل حقیقت کیا ہے؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''یہاں بھی حسن وعشق کا ایک خونی کھیل کھیلا جا چکا ہے''

''حسن وعشق کا خونی کھیل، وہ کیوں کر؟''

''لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت کیا سناؤں؟''

''یہ درست ہے مگر مجھے خود پر کچھ اختیار نہیں، میں نے کہا:

''تو کیا تم محبت کی ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہیں؟''

''میں خود واقف ہوں مگر جو چیز اختیار میں نہ ہو اس پر کیا بس چل سکتا ہے؟''

اگر تم مصمم ارادہ کر لو تو یقیناً محبت کے جال سے رہائی پا سکتے ہو۔ محبت کے دل میں محبت کا جذبہ اس لیے شدت اختیار کرتا جاتا ہے'

کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کو بار بار دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے تو۔۔۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا'' میں نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جہاں بھی جاؤں گا محبت کی آگ سینے میں لے کر جاؤں گا۔''

حمدی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ تم کوشش تو کرو میرے بیٹے، ممکن ہے یہ ہولناک مرض دور ہو جائے۔ محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے یہ ہر زمانے میں تباہی پھیلاتی رہی ہے اور پھیلاتی رہے گی اگر تم نے اس سے نجات حاصل کرنے کی سعی نہ کی تو پھر تمہاری بربادی میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ میں نے ابھی کہا' تمہارے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہاں سے فی الفور چلے جاؤ''

''اچھا بابا میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

بابا حمدی کی آنکھیں قدرے چمک اٹھیں۔ اس نے میرے سامنے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا اور اپنی نرم و ہمدردانہ آواز میں کہنے لگا: یہ قلعہ انیس سال سے ویران پڑا ہے جیسا کہ تم جانتے ہو یہاں شہر کا حاکم ہاشم رہتا تھا۔ ہاشم بے حد ظالم' کینہ جو اور منتقم مزاج انسان تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس کی کسی سے نہ بن سکی اور والئی سامین ''جعفر'' سے تو اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ جعفر بہت نیک دل اور بہادر حکمران تھا۔ رعایا کا ہر فرد اس کا مطیع و فرمانبردار تھا اور چونکہ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس لیے لوگوں کو امید تھی کہ کچھ مدت بعد ولی عہد سلطنت صولت' تخت' باپ سے بھی زیادہ نیک دل اور شجاع تھا۔ عنفوان شباب میں اس نے کئی معرکے سر کیے تھے اور اب جب کہ وہ جوان تھا۔ اس کی شجاعت' دلیری اور نیک نیتی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

شہزادہ صولت' سیر و شکار کا بہت دلدادہ تھا۔ ایک دفعہ شکار کرتے کرتے بہت دور نکل گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو وفادار خادم تھے۔ تینوں راستہ بھول کر آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ رات کی تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی اور گھوڑے تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ ایک کسان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ''حمیرا'' میں پہنچ گئے ہیں۔ حمیرا اس زمانے میں یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو فوراً وہاں سے چلا جاتا۔ کیونکہ اس وقت شہزادہ اپنے جانی دشمن کی سلطنت میں پہنچ گیا تھا مگر شہزادے نے اس کی قطعاً پروانہ کی اور شب بسری کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ جیسے ہی ہاشم کو کسان کے ذریعے شہزادے کی آمد کا حال معلوم ہوا وہ اپنی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ اس نے اپنے خاص مصاحب شہزادے کو لانے کے لیے بھیجے۔ شہزادہ جانتا تھا کہ وہ دشمن کے ملک میں ہے۔۔۔ اسے خبر تھی کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہے لیکن اس نے ذرہ بھی احتیاط نہ کی اور اپنے وفادار خادموں کی مسلسل گزارشات کو کچلتے ہوئے حاکم شہر کے آدمیوں کے ساتھ محل میں پہنچ گیا۔ خادم حیران تھے کہ آخر شہزادے کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں جان بوجھ کر خطرے میں گرفتار ہو رہا ہے۔ آہ انہیں کیا خبر تھی کہ صولت' محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

صولت' ہاشم کی لڑکی ''یاسمین'' کی محبت میں گرفتار تھا اور یہی جذبۂ محبت اسے کشاں کشاں محل کی طرف لے جا رہا تھا۔ نتیجہ۔۔۔؟

نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ رات کے آخری حصے میں شہزادے کو ایک تاریک اور زمین دوز کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نہایت ہولناک فریب کیا گیا ہے۔ اس نے ادھر ادھر ٹٹولا مگر اس کی انگلیاں پتھر کی سخت دیواروں ہی سے مس ہوئیں۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ کافی دیر کے بعد اس کے کمرے میں ہلکی سی روشنی ظاہر ہوئی۔ اس روشنی میں اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک فراخ کمرے میں ہے جس کی دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ ایک طرف آہنی دروازہ ہے جو

مقفل ہے۔شہزادے کو بہت افسوس ہوا۔اب دست تاسف ملنے سے کیا ہوسکتا تھا؟

صولت کو یقین تھا کہ ظالم ہاشم اسے مار ڈالے گا مگر منتقم حکمران اسے اس طرح ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ شہزادے کا اس طرح زندہ رہنا زیادہ مفید ہے۔ممکن ہے اس کے ذریعے وہ اپنے دشمن کی سلطنت پر قبضہ کرلے۔

اسی اثناء میں ایک خادم نے دروازے کی سلاخوں میں سے کھانا اندر داخل کیا۔شہزادے نے خادم سے بہت کچھ پوچھا مگر اسے کسی بات کا جواب نہ ملا۔خادم اپنا فرض ادا کرکے چلا گیا۔

ادھر تو شہزادہ اسیر ہوگیا۔ادھر اس کے اسطرح پراسرار طور پر غائب ہوجانے سے تمام سلطنت میں سنسنی سی پھیل گئی۔لوگوں نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا مگر شہزادہ کہاں؟ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے' زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

ہاشم نے اس کے خادموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔اس لیے اب کسی ذریعے سے بھی شہزادے کی اسیری کی خبر نہیں ہوسکتی تھی حمری رکا' ایک لمبی پردرد آہ بھری اور اپنی نگاہیں پرانے قلعے کی دیوار پر جمادیں۔

ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔قلعے کے قریب ایک بلند' بے برگ و بار درخت کی شاخ پر کوئی حسرت نصیب پرندہ ماتمی صدا کے ساتھ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔درخت کے عین اوپر ایک سفید بادل چاند سے مس کرتا ہوا یوں گزر رہا تھا جیسے ایک بدقسمت محب اپنی محبوبہ کو الوداعی بوسہ دیتے ہوئے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہے۔

میں نے حمری کی طرف دیکھا۔وہ بدستور قلعے کی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے جھریاں پڑے ہوئے ماتھے کے نیچے غم میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جس طرح کسی شکستہ قبر کے گڑھوں میں نیم روشن و نیم تاریک دھبے جمے ہوئے ہوں وہ کئی لمحے اپنے خیالات میں غرق رہا پھر اپنی لمبی' کمزور اور جھریوں میں لپٹی ہوئی انگلیاں پیشانی پر پھیریں اور غم انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

جب آتش فشاں پہاڑ کے سینے سے آتشیں شعلوں کے فوارے پھوٹنے لگتے ہیں تو اردگرد کی تمام چیزیں جل کر خاک و خاکستر کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔بعینہ جو آگ اسیر شہزادے کے دل میں بھڑک رہی تھی۔اس کی حدت سے یاسمین کا دل بھی پگھلنے لگا اس نے جب دیکھا کہ اس کا جاں نثار محب محل کے اس تاریک وخوفناک کمرے میں بند کردیا گیا ہے جہاں سے آج تک کوئی سلامت نہیں نکل سکا تو وہ بے حد مضطرب و بے قرار ہوگئی۔اس کا باپ بے کسوں کو دیکھ کر متاثر ہونا جانتا ہی نہ تھا مگر اس کے برخلاف یاسمین کے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل تھا۔وہ کیونکر برداشت کرسکتی تھی کہ ایک پائیدار سلطنت کی امیدوں کا تنہا مرکز' شریف طبع اور پھر اس کا بہادر محب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے اور کسی کو اس کی خبر تک نہ ہو۔پہلے تو اس نے اپنے تمام اختیارات سے فائدہ اٹھا کر اپنے تمام نسائی حربوں کو کام میں لا کر باپ کو شہزادے کی رہائی پر مجبور کیا مگر افسوس اس کی کوئی پیش نہ چلی بلکہ برعکس اس کے ظالم حکمران اسیر شہزادے پر اور ظلم کرنے لگے۔

شہزادی کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس کی تمام امیدیں خاک میں ملادی گئی تھیں تاہم اس نے ہمت نہ ہاری محبت میں انسان کا دل زیادہ مضبوط' اس کے ارادے زیادہ بلند اور اس کی روح زیادہ قوی ہوجاتی ہے۔وہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے اور خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔ شہزادی کے دل میں محبت کا تند جذبہ موجزن تھا۔اس نے چند قابل اعتبار شخصوں کو اپنے ساتھ ملا کر شہزادے کو رہا کرانے کی کوشش شروع کردی عین اس وقت جب کہ ان کی کوشش کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ایک شخص نے غداری کی اور اس سازش کی خبر حاکم کے کانوں تک پہنچ گئی یہ دیکھ کر کہ اس کے اپنے ہی گھر میں اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے ہاشم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔آنکھوں میں خون اتر آیا۔اس نے تمام

سازشیوں کو بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر کے شہزادی کو زمین دوز کوٹھڑی میں قید کر دیا۔

دونوں بدنصیب اسیروں کو کھانا پہنچانے کا فرض صفدر انجام دیتا تھا۔ صفدر شہزادی کا پرانا نمک حلال خادم تھا اور چونکہ محل میں ہر شخص کو اس پر اعتبار تھا اس لیے اس قسم کی ذمہ داریوں کا کام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ صفدر لوہے کی سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال کر دونوں کو مقررہ وقت پر کھانا پہنچایا کرتا۔ اس کے علاوہ انہیں اس مصیبت میں تسلی بھی دیا کرتا مصیبت کا احساس خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر ایک ہمدرد دل کی ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں اس کی تلخی کو بہت حد تک دور کر دیتی ہیں۔

یاسمین اور صولت دونوں علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند تھے اور ان دونوں کی کوٹھڑیوں کے درمیان نہ معلوم کتنا فاصلہ تھا اور یہ کبھی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ دونوں کسی وقت ایک دوسرے کو مل سکیں گے۔ دونوں رات دن پتھروں کی دیواروں میں قید تڑپتے رہتے اور بدقسمتی پر آنسو بہاتے رہے۔

ایک دن صولت کوٹھڑی کی ایک دیوار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک اسے چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ اس نے پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی تو ایک حد تک وہ کھسک گیا۔ جب صفدر آیا تو صولت نے اس سے لوہے کا اوزار لانے کے لیے کہا۔ وفادار خادم کے لیے یہ جان جوکھوں کا کام تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح لوہے کا ایک اوزار صولت کو پہنچا دیا۔ صولت اوزار کی مدد سے پتھر کو ہٹانے لگا تھوڑی دیر کے بعد پتھر کچھ اور ہٹ گیا یہ دیکھ کر شہزادے کی امید بندھ گئی۔ وہ تمام رات پتھر کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دیوار میں کافی بڑا سوراخ ہو گیا۔ شہزادہ اس میں داخل ہو گیا اور یہ دیکھ کر کہ اس کے قدم زمین پر پڑ رہے ہیں۔ اس کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ تاریکی میں جلتا گیا جہاں تک کہ اس کا ہاتھ لوہے کی سلاخوں کو لگا شہزادے کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو آواز دی۔ آواز ہلکی سی گونج پیدا کرتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئی۔ اس نے دوبارہ آواز دی اب کے آواز کے جواب میں ایک مضمحل سی چیخ تھرتھرائی شہزادے نے سمجھ لیا کہ وہ اپنی محبوبہ کی کوٹھڑی کے آہنی دروازے پر کھڑا ہے۔ اس نے یاسمین کو تسلی دی اور اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا اور آتے ہی دیوار میں پتھر لگا دیئے تاکہ کوئی آئے تو اسے خبر نہ ہو دوسرے دن صفدر نے روشنی کا انتظام بھی کر دیا۔

رات کے وقت صولت دیوار میں سے نکل کر یاسمین کو کوٹھڑی کی طرف چلا۔ یاسمین سلاخوں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ دونوں تمام رات راز و نیاز میں مصروف رہے ان کے درمیان موٹی موٹی خوفناک آہنی سلاخیں حائل تھیں مگر ان کے دل ایک دوسرے سے وابستہ تھے دو تین دن بعد صولت نے یاسمین کی کوٹھڑی کی دیوار میں سے بھی پتھر ہٹا کر آمد و رفت کا راستہ بنا لیا اور یہ دونوں کے لیے بڑی خوش قسمتی تھی، شہزادی کی کوٹھڑی میں رستہ بن گیا۔ اب تو صولت دن بھر اپنے کمرے میں رہتا اور رات بھر یاسمین کی کوٹھڑی میں۔

دن گزرتے گئے اور اس راز کا علم سوائے صفدر کے کسی کو نہ ہو سکا۔ ہاشم کو کئی بار اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ آخر وہ باپ تھا لیکن صفدر نے یاسمین کے مشورے کے مطابق اس کو شہزادی سے بدظن رکھا۔ شہزادی کو یقین تھا کہ اس کوٹھڑی سے باہر نکل کر ایک تو وہ اپنے محبوب سے جدا ہو جائے گی اور دوسرے وہ اسے آزاد کرانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس طرح دو سال گزر گئے جعفر کو خبر مل گئی کہ اس کے دشمن نے صولت کو قید کر رکھا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے دشمن کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ بدنیت کینہ پرور اور انتقام جو ہاشم نے اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً صولت کو قتل کر دو۔

رات کا وقت تھا اور چونکہ صولت بیمار تھا اس لیے یاسمین اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔ مسلح سپاہی اندر داخل ہوئے۔ صولت کھڑا ہو گیا

محبت کی پتلی یاسمین اپنے محبوب سے لپٹ گئی۔ فضا میں تلواریں چمکیں۔ دو چیخیں گونجیں اور اس کے ساتھ ہی دو لاشے خون میں تڑپنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد محب و محبوبہ دونوں دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔۔''

حمری کی آنکھیں اس طرح نم آلود ہو گئیں جس طرح خزاں رسیدہ زرد زرد سوکھے سوکھے پتوں پر بارش کے قطرے گریں اور پھیل جائیں۔

اس نے میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر قلعے کی جانب دیکھا۔ لمبی آہ بھری' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں طوفان بپا ہے۔ وہ بے اختیار رونا چاہتا ہے مگر چند لمحوں ہی میں اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کی افسردہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ مایوسیوں نے آنسوؤں کو چوس لیا ہے۔ وہ رونا چاہتا ہے مگر رو نہیں سکتا۔

''یہی وہ محل ہے جس کے ایک کمرے میں دو محبت کرنے والی ہستیوں نے محبت ہی کے ہاتھوں موت کا جام پیا۔ اس واقعے کو بیتے کئی برس گزر گئے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی میرا دوست صفدر میرے سامنے بیٹھا ہوا اس دلدوز واقعے کو سنا رہا ہے۔

''صفدر آپ کا دوست تھا؟ میں نے پوچھا

''ہاں وہ میرا دوست تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ سال تک زندہ رہا۔''

3

حمری نے ایک سرد آہ بھری۔ قلعے کی طرف دیکھا۔ پھر استفسار انگیز نگاہیں مجھ پر ڈالیں اس کے بعد کسی گہری فکر میں غرق ہو گیا۔ وہ اس طرح خاموش بے حس و حرکت بیٹھا ہوا یوں نظر آ رہا تھا گویا ریت کا ایک تودہ ہے یا قلعے کی دیوار سے گرا ہوا ایک پتھر ہے چاند اس بے قرار محب کی طرح جو اپنی محبوبہ کے شانے کو نزدیک دیکھ کر انتہائی تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ آسمان کے ایک ابر آلود راستے پر اڑا جا رہا تھا۔

صولت و یاسمین کی داستان محبت سن کر میرا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ کاش میں بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی محبوبہ کے لیے دنیا کی ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کروں۔ زندگی کے ہر حملے کے سامنے سینہ سپر ہوں اور اس وقت جب کہ میری جان لبوں پر ہو۔ میری دلنواز محبوبہ ایک لطف انگیز نگاہ مجھ پر ڈال دے۔ یہی میرے لیے سب کچھ ہے یہی میری زندگی کا حاصل ہے کاش اے کاش حمری دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے زمین کو کریدنے لگا اور چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد بولا

''مجھے یقین ہے کہ اب تم اس تباہی ساماں جنوں کو اپنے دل سے نکال دو گے؟''

''یہ جنوں۔۔ افسوس یہ جنوں میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے میں نے کہا۔

حمری نے مایوس نظروں سے مجھے دیکھا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ تم بھولتے ہو نوجوان اگر اب بھی تم اس مرض سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرو تو یقیناً کامیاب ہو جاؤ۔ ہر شخص کو محبت کی آگ سے بچنا چاہیے محبت کی چنگاری شروع شروع میں تو مسرت انگیز و راحت سامان حرارت بدن میں دوڑاتی ہے مگر کچھ عرصے کے بعد جان سوز شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے میری نصیحت مانو اور محبت کی آگ سے دور بھاگو

''کاش میں ایسا کر سکتا۔۔۔ کاش یہ بات میرے اختیار میں ہوتی۔''

''سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے''

''محبت کرنے والا دل محبت پر اختیار نہیں رکھ سکتا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو کہو صولت نے کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی' بدنصیب یاسمین نے کس لیے اپنی زندگی کو تباہ کیا؟'

یہ۔۔۔ یہ'' حمری آگے نہ بول سکا۔ اس کی پلکیں نم آلود ہوگئیں۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر بولا

''انہوں نے اپنی زندگی سے دشمنی کی۔۔۔لیکن تم ان کی پیروی کیوں کرو۔۔۔؟''

میں خاموش رہا۔ اس کا جواب میں دے ہی کیا سکتا تھا۔۔؟ حمری نے قلعے پر نگاہیں جما دیں۔ میں دوسری طرف منہ پھیر کر درختوں میں سے چمکتے ہوئے دریا کے پانی کی لمبی سی سفید لکیر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ تاریکی میں چمکتی ہوئی اس سفید لکیر کی طرح میرے ظلمت کدہ دل میں بھی ایک ہلکی سی امید روشن ہے۔ اگرچہ آج سلمی مجھ سے سردمہری برت رہی ہے مگر ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں اس کی سردمہری محبت میں تبدیل ہوجائے۔ اس وقت مجھے یقیناً دنیا کی سب سے بڑی نعمت حاصل ہوگی۔ لیکن ایسا کبھی ہوگا؟ ایسا کبھی ہوسکتا ہے؟

یہ سوال میرے دل میں اس طرح پیدا ہوا جس طرح دریا میں ایک دم طغیانی آجائے سلمی جو سلوک مجھ سے کررہی ہے۔ اس کو مدنظر رکھا جائے تو پھر اس کے التفات کا گمان ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس پر ایک سفاک ساحرہ کی طرح اس کی سردمہریاں مجھے یاد آنے لگیں تین سال سے میں مسلسل اس کے ظالمانہ سلوک کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایک دفعہ بھی اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے نہیں دیکھا تھا ایک بار بھی میری طرف توجہ نہیں کی تھی۔ یہ خیالات میرے ذہن پر چھا گئے۔

یکا یک ایک خاص خیال کے دماغ میں آنے سے میں نے مڑ کر دیکھا۔۔ حمری غائب ہو چکا تھا۔

قلعے کی مہیب دیواریں صدیوں کے راز' برسوں کے واقعات اور پھر صولت و یاسمین کی حسرتناک انجام محبت کی داستان سینے میں چھپائے نہ معلوم کس کا انتظار کررہی تھیں؟ نہ معلوم کیوں سوگوار و زخم نصیب روحیں چاندکی مدھم شعاعوں کے ساز پر ماتمی اور فراقیہ نغمے گاتی ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر مضطربانہ اڑی جارہی تھیں۔۔۔۔؟

میں کچھ دیر اور وہاں ٹھہرا پھر گھر آکر لیٹ گیا۔ نیند نے مجھے دنیا اور مافیہا سے غافل کردیا۔

کچھ دیر کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ قریب ہی لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی شعاعیں جلتی ہوئی سلاخوں کی مانند میری آنکھوں میں چبھیں۔ میں نے پہلو بدل کر آنکھیں بند کرلیں حمری کی سنائی ہوئی ٹریجڈی کے واقعات یکے بعد دیگرے میری آنکھوں میں پھرنے لگے۔ میں سوچنے لگا۔ اگرچہ صولت و یاسمین محبت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تاہم ان کی خوش قسمتی میں ذرا بھر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صولت ایک بہت بڑی سلطنت کا ولی عہد تھا۔ ناز و نعم کے آغوش میں پرورش پایا ہوا۔ شاہانہ زندگی بسر کرنے والا' دنیا اور زندگی کے مصائب سے بےخبر اور محبت دل و جان سے اسے چاہ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں میں آزاد ہوں جہاں چاہوں جاسکتا ہوں جو چاہوں کرسکتا ہوں لیکن میری محبوبہ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پرنم ہوگئیں میں نے بےقرار ہوکر پہلو بدل لیا۔

یوں تو یہ تمنا کہ کاش میں موت سے پیشتر ہی اپنی ظالم محبوبہ کے دل کو فتح کرلوں۔ ہر وقت میرے دل میں بےقرار رہتی تھی۔ لیکن کسی وقت تو یہ تمنا میرے دل کے ذرے ذرے پر چھا جاتی۔

میں لیٹا رہا اور نہ معلوم کب میری یہ حالت رہی کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والا میرا نوکر تھا۔

لمپ کو جلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیرت سے مجھ سے کہا۔

''لمپ آپ نے ابھی جلایا ہے یا یہ تمام رات جلتا رہا ہے؟''

''بجھا دو اس کو'' میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ آفتاب نمودار ہو چکا تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خادم لمپ بجھا کر چپ چاپ چلا گیا۔ میں اپنے سر اور آنکھوں میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے پھر لیٹ گیا اور اس وقت کمرے سے باہر نکلا جب دن کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ اب میرے دل میں تمنا تھی کہ دن بہت جلد بیت جائے اور میں شام کو حمدی سے ملوں اور اس سے صولت اور یاسمین کے متعلق کچھ اور دریافت کروں۔ نہ معلوم مجھے ان کشتگان محبت سے کیوں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں چاہتا تھا ہر وقت انہی کے متعلق باتیں سنتا رہوں۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ میں اس باغ میں پہنچ گیا جہاں میری محبوبہ سیر کیا کرتی تھی۔ لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے لیکن میری محبوبہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں نے باغ کے حسین ترین پھولوں کو اکٹھا کر کے گلدستہ بنایا اور باغ سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

مغرب کے خونیں گوشے میں زرد رو آفتاب اس مسافر کی طرح نظر آ رہا تھا جو چلتے چلتے تھک کر ہر طرف سے مایوس ہو کر مجبوراً ایک جگہ بیٹھ جائے۔ تاریکی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اچانک مجھے دور سلمیٰ کا شگفتہ' مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ میرے دل کی ملکہ یوں نظر آ رہی تھی گویا ندی کی شفاف سطح پر ہوا کے جھونکوں سے چاند کی سیمیں شعاع لہرا رہی ہو۔

وہ تنہا تھی۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئی میں نے گلدستہ اس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وہ ذرا رکی' حقارت انگیز نظریں مجھ پر ڈالیں اور پھر روانہ ہو گئی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔

شام کی تاریکی کافی پھیل چکی تھی اور اس تاریکی میں خاک پر پڑے ہوئے پھول بہ زبان خاموشی مجھے میری بدنصیبی کی داستان سنا رہے تھے آہ میرے سوا دنیا میں کون جانتا تھا کہ یہ رنگین پھول میرے حرماں نصیب دل کے ٹکڑے ہیں۔ جنہیں نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے۔

آخر میں قلعے کے پاس پہنچا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی تک سلمیٰ کی آمد کا منتظر ہوں۔ بجلی کی رو کی طرح اپنی ناکامی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے آہ بھر کر اوپر دیکھا۔ یکایک قلعے کی کھڑکی میں سے ایک لمحے کے لیے ایک نہایت دل آویز حسین چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا اور پھر غائب ہو گیا۔

میں ٹکٹکی باندھ کر کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا مگر وہاں کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔ کیا یہ سپنا تھا؟ میرے دل میں خیال پیدا ہوا مگر اس حالت میں سپنے کا خیال کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ عالم بیداری میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

قلعے کی بلند' سنگین اور مہیب دیوار کے سینے پر تاریک بادلوں کے ہجوم میں سفید ابر پارے کی طرح چاندنی کی چادر بچھی ہوئی تھی اور سفید چادر کے ایک گوشے میں مختصر سا خلا تھا' جس میں سے ابھی ابھی ایک حسین و شاداب چہرے نے نمودار ہو کر میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔

میں نے بڑھ کر اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ دیا۔ اس حالت میں بھی کچھ دیر وہاں رہا۔ آخر یہ خیال کر کے کہ شاید حمدی سے ملاقات ہو جائے میں وہاں سے ہٹا اور کھجور کے درخت کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہوا کے سست رو جھونکے درختوں کی شاخوں کو ہلا ہلا کر چاندنی سے سرگوشیاں کر

رہے تھے میں کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا مگر وہاں حمری کا نقش قدم بھی نہیں تھا۔ میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی نگاہیں قلعے کی دیوار پر جما دیں اسی اثناء میں یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا ''یہ حسینہ یاسمین تو نہیں؟'' یہ سوال میں نے دل میں بار بار دہرایا' مگر جب حمری کے سنائے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس پر غور کیا تو میرے دل کو یقین ہو گیا کہ یہ پراسرار حسینہ کسی صورت میں بھی یاسمین نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کئی سال قبل اپنے محبوب کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہے تو پھر یہ حسینہ کون ہے؟ انہیں خیالات کو ذہن میں لیے ہوئے میں سو گیا۔ خواب میں بھی وہ پراسرار حسینہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ رات کے آخری حصے میں میں بیدار ہو گیا قلعے کی مہیب دیواریں چاندنی کو آغوش میں لیے ہوئے میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں ایک جذبہ بے تاب کے زیر اثر اٹھا اور اسی کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ جب بالکل مایوس ہو گیا تو پھر با دل ناخواستہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

4

جیسے ہی شام ہوئی' میں گھر سے نکلا اور قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ حمری اب بھی وہاں نہیں تھا۔ اس کے بعد کھڑکی کے نیچے چلا گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ کر ایک دم کھڑکی سے الگ ہو گیا ہے اس کی صورت تو میں نہ دیکھ سکا۔ لیکن میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ یہ قلعے کی حسینہ تھی۔ وہ رات بھی میں نے وہیں بسر کر دی۔ نہ صرف رات بلکہ اور کئی راتیں بھی وہیں گزر گئیں۔ میں حیران تھا کہ آخر قلعے کی اس پراسرار حسینہ نے صرف ایک جھلک دکھا کر مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے؟ میں کیوں بار بار اس کھڑکی کے نیچے آ کر کھڑا ہوتا ہوں؟

اس طرح کئی دن گزر گئے میں محسوس کرنے لگا کہ قلعے کی حسینہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے مقام حیرت یہ تھا کہ سلمیٰ کو بھی بہت حد تک میں نے بھلا دیا تھا۔

اس رات میں قلعے کے پاس پہنچا اور اس دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا جس کے سینے میں میرا سہرا سپنا غائب ہو گیا تھا۔ میں دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ اس واقعہ سے قبل گاہے گاہے حمری سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب تو میں نے اس کی شکل بھی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حمری اس حسینہ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے اس قدر بے تاب و بے قرار تھا۔

میں قلعے کے چاروں طرف گھومتا رہا کہ کوئی راستہ اندر جانے کا مل جائے مگر ایک آہنی دروازے کے علاوہ کوئی راستہ اندر جانے کا نظر نہ آیا اور اس آہنی دروازے کا یہ حال تھا کہ اس کا آدھا حصہ بڑے بڑے پتھروں میں چھپا ہوا تھا۔ پہلے تو ان بڑے بڑے پتھروں کو ہٹایا جائے پھر کہیں جا کر دروازہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ اس دروازے کو کھولنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اچانک میری نظر قلعے سے کچھ دور شاہ بلوط کے ایک درخت کے قریب ایک مٹیالی چٹان پر پڑی میں یہ سوچ کر کہ چٹان پر بیٹھ کر کھڑکی پر نگاہ پڑ سکے گی۔ اس طرف چلنے لگا اور وہاں بیٹھ کر کھڑکی دیکھنے لگا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا' پھر لیٹ گیا اور فراقیہ اشعار گنگنانے لگا۔ جیسے ہی میں نے پہلو بدلہ مجھے چٹان کے پاس ایک غار نظر آیا۔ میں فوراً چٹان سے نیچے اترا اور غار میں داخل ہو گیا۔ غار کے ایک طرف ایک سیڑھی نظر رہی میں نے سیڑھی پر قدم رکھ دیئے۔ خوف سے میرا دل دھڑکنے

لگا مگر قلعے کی پراسرار حسینہ کا شگفتہ زخندہ چہرہ میری نگاہ تخیل کے سامنے نمودار ہوا اور میں آگے چلنے لگا۔ آگے ایک اور سیڑھی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی سیڑھیاں آئیں میں امید وبیم کے عالم میں نیچے اترتا گیا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ خدا کی پناہ ہر قدم پر اندیشہ تھا کہ اب زندہ باہر نہیں نکل سکوں گا۔ سیڑھیوں کے بعد ایک تاریک راستہ تھا میں ٹٹول ٹٹول کر قدم اٹھانے لگا۔ آخر میرا ہاتھ ایک دیوار سے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خدا کی پناہ یہ دیوار ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ راستہ بند ہے۔ میں مڑا اور واپس آنے لگا ارادہ تھا کہ گھر جا کر لمپ لا کر پھر یہاں آؤں گا اور قلعہ کے اندر جانے کا راستہ معلوم کروں گا۔ واقعی یہ ایک وسیع خلا تھا۔ میں خلا میں داخل ہوا۔ میرے پاوں فرش پر پڑے اور میں آگے چلنے لگا۔ اس حسینہ سے ملنے کی امید راستے کی تاریکی کو روشن کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ میرے سامنے پتھر کی سیڑھیاں ہیں یہ منظر دیکھ کر میرا دل اچھلنے لگا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ میں قلعے میں داخل ہو گیا ہوں اور عنقریب اس پراسرار حسینہ سے ملوں گا۔ سات آٹھ سیڑھیاں تھی۔ ان سیڑھیوں کے بعد میں قلعے میں تھا۔۔

چاروں طرف گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی۔ سرو اور بلوط کے درخت جا بجا کھڑے تھے۔ حوض سوکھ گئے تھے' فوارے زنگ آلود تھے۔ تالابوں میں گرد وغبار پڑا ہوا تھا۔ میں ایک بے تابانہ ایک مجنونانہ جذبے کے زیر اثر اس پراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا کبھی مجھے خیال آتا کہ میری وہ پراسرار حسینہ کسی سرو کے سائے میں سو رہی ہے۔ کبھی گمان ہوتا کہ وہ کسی سوکھے تالاب کے کنارے کوئی غمگین گیت گا رہی ہے اور کبھی شبہ ہوتا کہ وہ مجھے آتے دیکھ کر ایک ایسی جگہ چھپ گئی ہے جہاں میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہیں پہنچ سکتا حیران تھا کہ کہاں جاؤں اسے کہاں تلاش کروں؟ آخر میں ایک تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ چاند قلعے کے مینار کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ آسمان کی نیلگوں سمتوں میں ابر کا ایک ٹکڑا ایک بے تاب محبت کی طرح آوارہ پھر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے سوکھے پتے سوگوار کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے تالاب میں گر رہے تھے۔

میں وہاں سے اٹھا اور یہ خیال لے کہ اٹھا کہ اس کھڑکی کو تلاش کرنا چاہئے۔ جس میں اس حسینہ نے جھلک دکھائی تھی مگر اس کمرے کو جس میں وہ کھڑکی تھی' تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا میں کئی کمروں میں داخل ہوا۔ ادھر ادھر ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر تھک کر میں ایک سرو کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ حسین تصورات کی نشاط زائیوں نے مجھے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ کئی راتیں عالم بیداری میں گزری تھیں۔ اب جو نیند آئی تو ایسی آئی کہ میں اس وقت بیدار ہوا جب سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ روشنی میں میں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔۔۔ مگر فضول۔ آخر میں اسی راستے باہر نکل آیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ باہر نکلتے وقت کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

5

دوسرے دن جب کہ آفتاب اپنے سفر کا تہائی حصہ ختم کر چکا تھا۔ میں اسی راستے سے قلعے میں داخل ہوا اور اس پراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا۔ میں بے تابی سے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتا۔ اضطراب کے عالم میں گنجان جھاڑیوں کے ارد گرد نگاہیں ڈالتا اور دل میں شوق فراواں لیے ہوئے پیچیدہ راستوں کو طے کرتا۔ آخر تھک کر مایوس ہو کر ایک سیاہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ یہ سیاہ پتھر قلعے کے مینار سے گرا ہوا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ درختوں کے پودوں کے میناروں کے سائے لمبے ہو گئے۔ آفتاب لب بام کی زرد مایوس اور تھکی ہوئی شعاعیں بلند درختوں اور میناروں کا سہارا لے کر فضا کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو رہی تھیں۔ لمبے لمبے سائے سسکتے ہوئے رینگتے ہوئے اندھیرے کے سمندر میں ڈوب رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پراسرار حسینہ بھی ایک سایہ بن کر سایوں کی اس دنیا میں غائب ہو رہی ہے ایک سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر چیل بیٹھی اپنی حسرتناک آواز سے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ زرد افسردہ اور سوکھے پتے ٹہنیوں سے گر گر کر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کھڑکھڑ کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ قلعے کے عین اوپر بڑے سیاہ بادل کے آخری سرے پر مدھم چاندنی یوں نظر آ رہا تھا گویا ریت کے تودے پر پھول کی ایک نازک پتی لرز رہی ہے ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ چل رہے تھے یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پاس سے گزر رہا ہے۔ میں اٹھا مڑ کر دیکھا۔ قریب و دور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا کی لہروں سے ایک پودے کی شاخیں حرکت کر رہی تھیں۔ چاند کی مدھم روشنی درختوں اور پودوں میں چھن چھن کر گر رہی تھیں۔ میں نے اس پودے کو پکڑ لیا اور دور تک نگاہیں دوڑائیں ہر طرف متجسسانہ دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ ہر قدم پر خیال ہوتا کہ قلعے کی پراسرار حسینہ پاس کے پودے میں چھپی ہوئی ہے۔ ہر لحظہ گمان ہوتا کہ وہ ساحرہ جمیل مجھے دیکھ کر کسی زمین دوز کمرے میں چلی گئی ہے۔ اگرچہ بار بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا تاہم ایک شدید پرزور اور جنون انگیز جزبہ تھا جو مجھے ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر دوڑائے پھرتا تھا۔ نگاہوں کو کوئی ہستی نظر نہیں آتی تھی مگر دل کا کامل یقین تھا کہ وہ حسینہ اسی ویران قلعے کی پراسرار خلوتوں میں سانس لے رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ نہایت دل آویز نہایت شاداب ہے وہ سحر و نغمہ کی ملکہ ہے اور ہر ہر قدم پر نشہ بکھیرتی پھرتی ہے۔

میں قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ جہاں تک کہ قلعے کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ سامنے ایک سیڑھی نظر آئی۔ میں سیڑھی سے نیچے اترا۔ اب معلوم ہوا کہ جہان قلعے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں گھاس بہت حد تک ترتیب کے ساتھ اگی ہوئی تھی پودوں کی ترتیب بھی کسی باغبان کی رہین منت تھی۔ شاخوں پر طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میرے دل میں نیا جوش نیا ولولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوا مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ دوشیزہ جسے انتہائی بے تابی کے ساتھ ڈھونڈ رہا ہوں اور اپنے معطر جلووں سے میرے خوابوں کی فضاؤں کو مہکا رہی ہے' یہاں کسی پودے کے پیچھے جہاں کسی تالاب کے کنارے بیٹھی ہے۔ میں دیر تک پھرتا رہا۔ پھر حوض کے کنارے بیٹھ گیا اور مہکتے ہوئے نشہ برساتے ہوئے تصورات کے ہجوم میں تیرنے لگا۔ نیند ایک نرم رونکہت بہ دامن جھونکے کی طرح میری آنکھوں میں آئی اور میں سو گیا۔ دیر تک سوتا رہا۔ یکایک میرے خواب حسین کے افق سے دور بہتی ہوئی ندی کے ترنم کی طرح ایک نغمہ اٹھا اور فضا میں تھرتھرانے لگا۔ میں بیدار ہو گیا۔ وہ نغمہ ابھی فضا میں لہرا رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ واقعی یہ عالم بیداری تھا۔ میں آگے بڑھا۔ ترنم ریز آواز برابر گونج رہی تھی۔ پھر یہ آواز بند ہو گئی اس کے ساتھ ہی شاخوں کے زور زور سے آپس میں ٹکرانے کی آواز کان میں آئی۔

ایک جگہ پہنچ کر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مجھ سے کچھ دور گھاس پر ایک بربط پڑی تھی۔ میرا دل و دماغ مسرت کی مستیوں میں یکسر ڈوب گیا۔ میں تیزی کے ساتھ بربط کے پاس پہنچا' ور اسے اٹھا لیا۔

یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور اسی خیال کو لیے ہوئے پودوں کی شاخیں ہٹا ہٹا کر اس غزالہ رمیدہ کو ڈھونڈنے لگا۔

اسی اثناء میں کچھ دور مجھے سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں اس کی طرف چلا۔ مگر سایہ بہت جلد غائب ہو گیا میں نے بربط کو ایک طرف

رکھ دیا اور کھڑے ہو کر دور دور تک نظر ڈالنے لگا۔ میرا گمان تھا کہ جلد ہی اس پراسرار ہستی کو دیکھ لوں گا جس کی یہ بربط ہے' مگر میرا یہ خیال فریب تخیل ہی ثابت ہوا۔ ایک جنوں انگیز جذبہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا تھا اور میں اس طرف چلنے لگا۔ جہاں ابھی ابھی میری نگاہوں نے ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاخ کی ہر جنبش پر محسوس کرتا کہ وہ پراسرار ہستی کسی پودے کے پیچھے چھپ کر شاخوں کو ہٹا کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ ہوا کی سرسراہٹ پر گمان گزرتا کہ وہ سحر طراز حسینہ مجھے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ رہی ہے۔ اپنی مسلسل کوششوں کی ناکامی کے باوجود میں نے تلاش جاری رکھی اسے ہر ہر گوشے میں تلاش کیا' ہر ہر کونے میں ڈھونڈا مگر شاید وہ پانی کی ایک لہر تھی جو دریا کے پہلو سے اٹھ کر تودہ ریگ میں غائب ہو جاتی ہے۔ یا ایک تودہ ریگ تھی جو سمندر میں گر کر پلک جھپکانے میں تحلیل ہو جاتا ہے' یا پھر وہ ایک روشن ستارہ تھی جو نمود سحر پر آسمان کی لامحدود پہنائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ پودوں کی شاخیں یوں جھکی پڑی تھیں گویا ان پر ایک عجیب و غریب طلسم کا بوجھ پڑا ہوا ہے۔

آسمان کی نیلگوں وسعتوں پر ننھے ننھے ستاروں کا کارواں' خاموش دم بخود رکا ہوا۔ چاند کی سیمیں کشتی ایک بڑے سے سیاہ بادل کے طلسماتی غار میں آہستہ آہستہ غائب ہوتی ہوئی۔ ابر پارے مبہوت و ششدر۔ ہوا حیرت زدہ' رک رک کر چلتی ہوئی۔ فضاؤں میں ہر ایک طرف طلسم کے دھند لکے زمین پر ہر طرف سحر زدہ سائے اور اس طلسم سحر کی دنیا میں سحر انگیزیوں کی اس دنیا میں ایک پراسرار حسینہ سایوں میں چھپتی سائے بکھیرتی' ایک سائے کی طرح رواں دواں۔۔

یکا یک ایک پودے کے قریب ایک سوکھی ٹہنی کو جنبش ہوئی' میرا سانس رک گیا اور قدم رک گئے۔ خیالات کی رو رک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر حمری کھڑا تھا۔

حمری دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے وہاں پہنچنا چاہا۔ ابھی دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ حمری غائب ہو گیا۔

حمری یہاں اس ویران قلعے میں میں نے خواب تو نہیں دیکھا؟ میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا؟ نہیں میں عالم بیداری میں ہوں" پھر۔۔۔؟ میں ادھر ادھر پھرنے لگا اور جب واپس آیا تو وہاں بربط کا نام و نشان بھی نہ تھا میں وہیں سو رہا۔ یہاں تک کہ قلعے کے مینار کے عقب سے سورج طلوع ہوا اور میں قلعے سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

6

دوسرے دن جب مغربی آسمان ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے لالہ فام ہو گیا۔ میں گھر سے نکل کر سب سے پہلے قلعے کے پاس کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا اور حمری کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں امید و بیم کی حالت میں دیر تک بیٹھا رہا اور جب مایوس ہو گیا تو اسی پراسرار راستے سے قلعے کے اندر داخل ہوا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی کوئی خلاف معمول واقعہ رونما ہونے والا ہے سینے میں دھڑکتا ہوا دل اور آنکھوں میں ایک دنیائے شوق و بے قراری لیے ہوئے میں قلعے کے اندر پہنچا۔۔

وہی طلسماتی دنیا تھی' وہی سحر آلود سائے اور پھر وہی میرا جذبہ تجسس' درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں اسی جگہ پہنچا۔ جہاں گزشتہ رات گزاری تھی اور پودے کے قریب بیٹھ کر آواز کا انتظار کرنے لگا۔ یکا یک کسی کنج سے ایک شیریں و دل آویز نغمہ نکل کر فضا میں

تھرتھرایا۔ میں آہستہ آہستہ سانس روکے اٹھا اور اسی کنج کی طرف جانے لگا۔ آخر ایک سائے کی طرح وہاں پہنچا۔ وہاں میری نظروں نے جو منظر دیکھا وہ میں تادم واپسیں بھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔ میں پودے سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ دوشیزہ کے سنہری بالوں کی لٹیں شعلہ رنگ رخساروں پر یوں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے شفق کے سینے پر طلائی کرنیں تیر رہی ہیں اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نہایت حسین تھیں اور ان پر بھویں یوں چھائی ہوئی تھیں گویا دریا کی سطح پر فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ لرز رہا ہے اس کی پتلی پتلی نور افگن انگلیاں بربط کے تاروں پر جنبش کر رہی تھیں مجھ پر ایک نیم بے ہوشانہ کیفیت سی چھا گئی۔ ایک ناقبل تجویہ نشہ میرے دل ودماغ کو محیط ہوگیا۔

وہ پراسرار حسینہ چاند کا ایک خواب جمیل تھی۔ پھولوں کے ذہن کا تصور حسین تھی اور پھر موسیقی کی روح سے نکلا ہوا ایک نغمہ رنگین تھی۔

میں بے اختیار ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکل کر فضا میں تھرتھرائی

''ڈرو نہیں''۔۔۔ میں نے کہا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بربط گھاس پر گر پڑی۔

''ڈرو نہیں''۔۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں تمہاری تلاش میں اتنا عرصہ سرگرداں رہا ہوں' میں نے جلدی جلدی کہا۔

وہ اور ہی پیچھے ہٹ گئی۔'' مجھے جانے دو۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی سہی ہوئی آنکھیں نم آلود ہوگئیں' میں کھڑا رہا' اور وہ وحشی ہرنی کی طرح بھاگ کر نظروں سے غائب ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسے ڈھونڈا' مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔

آخر تھک کر بربط کو اپنے سینے سے لگا کر میں لیٹ گیا۔ نیند تو نہ آسکی لیکن خوشگوار تصورات' نکہت کی موجوں کی طرح میرے دل ودماغ پر چھائے رہے۔

اس واقعے کے بعد میں نے مسلسل کئی راتیں ویران قلعے میں گزاریں مگر اس دوران میں قلعے کی ساحرہ کی جھلک تک بھی نہ دیکھ سکا۔ سوچتا تھا کہ نسوانی فطرت اتنی سنگدل ہوتی ہے یا یہ میری قسمت ہے کہ جس عورت کو بے تابانہ چاہوں وہی مجھ سے دور بھاگے مجھ سے شدید نفرت کرے پھر خیال آتا' ممکن ہے' یہ سب کچھ تخیل کی کرشمہ سازی ہو۔۔۔۔ اس سنسان اور ویران قلعے میں کوئی حسینہ نہ ہو اور میرے تخیل کی جلوہ طرازیوں نے ایک دوشیزہ کا مرمریں پیکر اختیار کر لیا ہو' یا پھر دل میں کہتا۔ یہ جھلکیاں دکھانے والی۔۔ جھلکیاں دکھا دکھا کر دل کو بے تاب کرنے والی کوئی ''بدروح'' نہ ہو جو مجھے ستا ستا کر اپنے لیے سامان مسرت پیدا کر رہی ہے۔

7

ایک شام جب کہ چاند پوری تابانی کے ساتھ فضائے آسمانی پر چمک رہا تھا میں ایک گوشے میں اپنے خیالات میں غلطاں وپیچاں بیٹھا تھا کہ اتنے میں ترنم کی لہر سامنے کے پودے کی پیشانی سے بلند ہوئی۔ میں تیزی سے وہاں پہنچا۔ وہی پراسرار حسینہ وہاں بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نازک کلائی پکڑ لی۔ کلائی پکڑتے ہی اس کے رخسار زرد پڑ گئے وہ بمشکل بولی۔

''مجھے چھوڑ دو۔۔۔''

''بھاگوگی تو نہیں۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ مجھے چھوڑ دو'' اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''یاد ہے' پہلے تم بھاگ گئی تھیں۔اس لیے۔۔۔۔''

''مجھے چھوڑ دو' کلائی میں درد ہو رہا ہے۔اوہ۔''

''اوہ کیا؟''

''میں جانا چاہتی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے جونہی میں نے تمہیں چھوڑا' تم بھاگ جاؤ گی۔''

''ہاں'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''ابھی تو تم نے کہا تھا۔ میں بھاگوں گی نہیں۔اب کہہ رہی ہو بھاگ جاؤں گی''

''مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں''

''تم مرد جو ہوئے اور دادا جان کہتے ہیں' مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے رخسار پیلے پڑ گئے۔

''کسی نے یہ کہا ہے؟''

''نہیں دادا جان نے''

''تمہارے دادا جان کون ہیں؟''

''دادا جان۔۔؟ وہی جو میرے دادا جان ہیں۔''

قلعے کی اس بھولی بھالی دوشیزہ نے محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا ''لو اب بھاگ جاؤ'' حسینہ چند قدم چلی' پھر ٹھہر گئی۔اور ربط کے تاروں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

''تم ظالم تو نہیں ہو نا'' اس نے مترنم آواز میں کہا۔

''میں تو ظلم کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' میں نے اس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''مگر دادا جان کہتے ہیں' ہر ایک مرد ظالم ہوتا ہے۔''

''تو پھر کیا تمہارے دادا جان مرد نہیں۔۔۔ان سے کیوں نہیں بھاگتیں؟''

وہ چند لمحے خاموش رہی' پھر پودے کی ٹہنی ہلا کر کہنے لگی۔ ''وہ ہرگز ظالم نہیں۔وہ تو بڑے اچھے دادا جان ہیں''

''تو پھر سمجھ لو میں بھی بڑا اچھا ہوں''

''اگر تم بڑے اچھے ہو تو میں تم سے ضرور ملا کروں گی۔''

''تمہارا نام کیا ہے۔۔۔میں نے پوچھا''

''شاہینہ''

''شاہینہ بہت اچھا نام ہے۔ میرا نام پوچھو گی؟''

''نہیں تم خود اپنا نام بتاؤ''

''میں خود بتاؤں؟'' میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''میرا نام شہاب ہے۔''

''شہاب بڑا اچھا نام ہے۔''

''کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا۔

''اوہ میری کلائی نہ پکڑو۔ تمہارے ہاتھ لوہے کے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم خوامخواہ ڈرتی ہو۔۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کتنا عرصہ تمہاری تلاش میں سرگرداں رہا تو تم شاید بہت غمگین ہو جاؤ''

''یہاں آئے کیوں تم؟''

''تمہاری تلاش میں۔۔ شاہینہ''

''میری تلاش میں تم یہاں کیوں آئے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تم سے ہر وقت باتیں کرنا چاہتا تھا۔''

''مگر میں ہر وقت باتیں نہیں کر سکتی۔ دادا جان تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔''

''تم دادا جان سے یہ نہ کہنا کہ شہاب یہاں آ گیا ہے۔ سمجھ لیا نا شاہینہ ورنہ دادا جان تم سے ناراض ہو جائیں گے''

''میں نہیں کہوں گی دادا جان سے اور اب میں جاتی ہوں۔ دادا جان یہاں نہ آ جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پودے کے پیچھے غائب ہو گی

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ پھر قلعے سے نکل آیا۔

8

جب دل کہیں اور ہو تو ایک لمحہ بھی قیامت کی گھڑی بن جاتا ہے اور مجھے تو جدائی کا پہاڑ سا دن گزارنا تھا۔

انتہائی بے چینی و بے تابی کے ساتھ طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک انتظار کی گھڑیاں گنتا رہا اور جب شام ہوئی تو بے تابی سے قلعے کی طرف روانہ ہو گیا اور اندر پہنچ کر اسی محبوب کنج میں اپنی محبوبہ دلنواز کا انتظار کرنے لگا۔

ماہ چاردہم کے بلوریں سینے سے نور کے دریا بہہ رہے تھے۔ ہر طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل کی ملکہ نغمے اور خوشبوئیں برساتی اور خوشبوؤں کی سیڑھیوں سے اترتی میری طرف آ رہی ہے جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے کنج سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا کچھ دور وہ معصوم فطرت دوشیزہ سہمی سہمی سے گھبرائی سی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔

میں نے اسے بلایا' مگر وہ وہیں سنگ مرمر کی ایک مورتی بنی ہوئی کھڑی رہی۔
میں نے دوبارہ آواز دی۔ '' آجاؤ شاہینہ''
اس نے اپنے ریشمیں بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دو قدم آگے چلی اور پھر رک گئی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔
'' کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں مگر تمہیں پرواہ ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔
''میں تو وہاں کھڑی تھی''
''وہاں کھڑی تھیں کب سے''
''بڑی دیر سے۔۔ شاید اس وقت تم یہاں نہیں تھے''
''تو تم یہاں کیوں نہ آ گئیں؟''
''اس نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔''
''تم آج بھی آ گئے کل بھی آئے تھے اور شاید پہلے بھی آتے رہے ہو''
''تم میرے آنے پر خوش نہیں؟''
''میں۔۔ مگر دادا جان۔۔۔ وہ دن بھر مجھے بتاتے رہے ہیں کہ نوجوان مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کئی قصے سنائے''
''تم نے میری آمد کے متعلق دادا جان کو بتا دیا۔؟'' میں نے مضطربانہ پوچھا۔
''وہ مسکرائی۔'' میں نے کہا تو نہیں۔ مگر''
''تم نے کہا نہیں تو پھر کوئی ڈر نہیں''
''تو تم آئندہ بھی آیا کرو گے۔؟''
''کیوں نہیں۔۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہر وقت یہیں رہوں۔''
''اوہ ایسا نہ کرنا۔ دادا جان دن کے وقت یہاں ہوتے ہیں۔ مگر تم کیوں یہاں آنا چاہتے ہو؟''
'' کیونکہ جب کسی سے محبت ہو جائے تو دل کی یہی آرزو ہوتی ہے''
''تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے''
''تم سے۔۔''
''مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اوہ'' وہ مسکرائی۔ ''لیکن دادا جان جتنی محبت تم کبھی بھی مجھ سے نہیں کر سکو گے'' میں اس کے معصومانہ چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔
''مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ میں چلی جاؤں گی اور پھر اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلوں گی۔''
''تم ناراض ہو گئیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے مگر مجھے بتاؤ۔ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟''
''ہاں۔'' اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔
''کتنی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو میں نہیں جانتی۔ شاید اتنی محبت ہے، جتنی مجھے اپنی بربط سے ہے''

یہ کہہ کر اس نے بربط کو سینے لگالیا۔ بربط کے سر پر مور کی چونچ اس کے لعلیں لبوں کو مس کرنے لگی۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں!''

''کچھ بھی نہیں؟'' تو پھر تم بتاؤ تم سے کتنی محبت کروں، لیکن یاد رکھو، میں تم سے ہرگز اتنی محبت نہیں کرسکتی، جتنی اپنے پیارے دادا جان سے کرتی ہوں۔''

''وہ محبت اس بوڑھے کے لیے رہنے دو!'' میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی:

''پھر ...!''

''پھر ... آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

وہ کچھ مضطرب سی ہوگئی۔

''شاہینہ!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''بولتی کیوں نہیں؟''

''ہاں! کہو!!''

''خفا ہوگئیں کیا؟''

''نہیں ... بالکل نہیں!''

یہ کہہ کر اس نے بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیریں اور پھر بربط میری گود میں رکھ دی۔ میں بربط بجانے لگا اور وہ مسرت انگیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ نصف رات تک ہم بربط بجاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آخر گھبرا کر دادا جان کے خیال سے مضطرب ہو کر وہ چلی گئی اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

9

اس کے بعد میں خود کوئی دنیا میں محسوس کرنے لگا۔ میرے افسردہ، پژمردہ دن، محبت کے حسین اور نکہتوں میں لپٹے ہوئے تصورات سے رنگین و معطر ہو گئے اور میری مایوس و مضمحل راتیں قلعے کی ساحرۂ جمیل کے یاسمین جلووں سے پرنور رخنداں۔ اس سے پیشتر میں خود کو دنیا کا بدنصیب ترین شخص سمجھتا تھا۔ مگر اب اپنی خوش قسمتی کو نقطۂ کمال پر تصور کرنے لگا۔ میری تمام کائنات سمٹ کر قلعے کی چاردیواری میں محدود ہو گئی اور میرے خیالات ہر چیز سے ہٹ کر صرف شاہینہ کے گرد گھومنے لگے۔ رات کو میں مسرتوں میں ڈوبا رہتا اور دن کو ان مسرتوں کے خیالات میں غرق آہ! یہ زندگی کیسی عجیب زندگی تھی۔ خوابوں کی رنگینیوں میں تیرتی ہوئی۔ نکہتوں کے گہوارے میں جھولتی ہوئی اور مسرتوں کی لہروں میں بہتی ہوئی خوش نصیب زندگی! اب بھی اس خوشگوار و دل آویز زندگی کا خیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔

''میں ہر رات قلعے میں جا کر، مخصوص تالاب کے کنارے بیٹھ کر اپنی معصوم صورت و معصوم فطرت محبوبہ کا انتظار کرتا۔ وہ مسکراتی ہوئی خراماں خراماں آتی۔ ہم دونوں شیریں و فرحت زا گیت گاتے۔ تالابوں کے کنارے ٹہلتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے اور میٹھی میٹھی پیاری پیاری

باتیں کرتے۔ اسی طرح رات گزر جاتی اور جب سورج کی پہلی کرن میرے لیے رخصت کا پیغام لاتی تو اپنی محبوبہ جاں نواز سے اجازت حاصل کر کے قلعے سے باہر نکل آتا دن پر دن، ہفتوں پر ہفتے گزرنے لگے۔ اگرچہ میں ہر رات کو اپنی شیریں ادا محبوبہ کے پاس رہتا لیکن میرے انتہائی خواہش یہ تھی کہ دن کے وقت بھی وہیں رہوں مگر اس میں ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ دن کے وقت حمری شاہینہ کو عموماً اپنے سامنے رکھتا اور اس صورت میں اس سے ملاقات کا ذریعہ کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ رات کو تو وہ بے فکر ہو کر سو رہتا اور شاہینہ کو کمرے سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا!

شاہینہ کو جو کچھ معلوم تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ لیکن ابھی تک دو باتیں قطعی طور پر میرے لیے ایک معما تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہینہ کون ہے اور حمری اس کا حقیقی دادا ہے یا وہ اسے ویسے ہی دادا کہتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حمری نے شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر کے اسے مردوں سے کیوں اس درجہ بدظن کر دیا ہے؟ میں ان دونوں باتوں پر بہتیرا غور کرتا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ اگرچہ حمری کو ہماری ملاقات کا علم نہ تھا مگر یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر وہ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک رات میں شاہینہ کے زانو پر سر رکھے اس کے سنہری لٹوں سے کھیل رہا تھا کہ حمری ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بدن فرط غصہ سے کانپ رہا تھا۔ شاہینہ کانپتی ہوئی، لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی!

''شہاب!'' حمری نے غضبناک آواز میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ شاہینہ نے حمری کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہنے لگی۔

''دادا جان! یہ ان مردوں میں سے نہیں ہے جو......''

حمری نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور اگر میں اسے جلدی سے نہ تھامتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

''بابا غصے کو قابو میں کیجئے!'' میں نے کہا۔

''یہ الفاظ کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ کمینے انسان! میں اس معصومہ کو تم ظالموں کے سائے سے بچا تا رہا ہوں، مگر آج تم نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔'' یہ کہتے ہوئے حمری کی رگیں ابھر آئیں۔ آواز زیادہ غضبناک ہو گئی۔ ''تم نے یہاں آنے کی جرأت کیوں کی، تمہارا یہاں کیا کام تھا......؟ تم اس لیے یہاں آئے کہ ایک معصوم فطرت دوشیزہ کو تباہ کر دو۔ ایک بوڑھے کے خونِ دل سے ہاتھ رنگو......؟''

''بابا سوچ سمجھ کر بات کیجئے! آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں!'' میں نے قدرے خفگی سے کہا۔

''یہ الزام ہے...... ظالم کمینے...... کیا میں تمہیں اچھی طرح نہیں جانتا۔ تمہارے دل کی ایک ایک بات سے واقف نہیں؟''

شاہینہ ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر حمری کا ہاتھ پکڑ لیا اور عاجزانہ لہجے میں کہنے لگی۔

''دادا جان! چلئے میرے ساتھ...... چلیئے نا دادا جان!''

حمری کہے جا رہا تھا۔ ''میں بوڑھا ہوں، مگر یاد رکھو جب تک میرے کمزور و ناتواں جسم میں جان باقی ہے، تم اپنے ذلیل مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں اپنے بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے طاقتور گردن کو مروڑنا جانتا ہوں۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے دکھے ہوئے دل کی بددعاؤں سے ڈرو۔ اس مظلوم و بے کس کی آہوں سے ڈرو قدرت کے خوفناک انتقام سے ڈرو۔ جاؤ دور ہو جاؤ......!''

''دادا جان چلئے میرے ساتھ دادا جان!''

''ابھی تک کھڑے ہو تم...... مردار کتے!'' حمری نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہینہ نے حسرتناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور غمگین و حسرتناک لہجے میں کہا۔ ''جاؤ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

میں مڑ کر چلنے لگا۔

''خبردار آئندہ یہاں نہ آیا......!'' حمری نے غضبناک لہجے میں کہا۔

میں نے مڑ کر شاہینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

میں قلعے سے نکلا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے نکلا کہ اپنی روشن، معطر اور رنگین دنیا کو چھوڑ کر ایک نہایت تاریک، بھیانک اور متعفن غار کی گہرائیوں میں اتر رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ پیشتر میں انتہائی مسرور انسان تھا۔ میری قسمت کا ستارہ انتہائی بلندی پر چمک رہا تھا مگر اب وقت کے ایک حقیر ترین لمحے سے گزر جانے پر، میرے تمام روشن امیدیں، رنگین تمنائیں اور خوشگوار توقعات خاک میں مل چکی تھیں۔ آہ! مسرتوں کے زینے طے کرتے ہوئے، ثریا کی بلندیوں تک جا پہنچا اور پھر پامال و مجروح ہو کر تحت الثریٰ کی پستیوں پر آ کر گرنا۔ کتنا ہمت شکن، کتنا روح فرسا انقلاب ہے!

حمری کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے شاہینہ کا مرجھایا ہوا چہرہ بھی پھر رہا تھا۔ ہر قدم پر رک رک کر میں قلعے کی طرف دیکھتا تھا۔ ہر لمحہ میرے ذہن میں اپنی بدقسمتی کا احساس زیادہ تلخ ہو جاتا تھا۔

میں اسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ میرے دل میں سیلاب اشک موجزن ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور کافی دیر تک بہتے رہے۔ اس وقت مجھے کائنات کی ہر چیز روتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ درخت سسکیاں بھر رہے تھے۔ ہوا رو رہی تھی اور مایوس، افسردہ چاند، ایک سیاہ مہیب بادل کی طرف رینگتے ہوئے اس طرح جا رہا تھا، جس طرح ایک بدنصیب محب، محبت کے زخموں سے نڈھال۔ ابنائے روزگار کے حملوں سے پامال، سینے پر داغ تمنا لیے ہوئے، موت کے اندھیرے غار کی طرف جا رہا ہو!

اسی درخت کے نیچے حمری پدرانہ شفقت کے ساتھ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا کرتا تھا اور اب اسی درخت کے نیچے میں اس کے بے رحمانہ سلوک کو یاد کر رہا تھا۔ شاہینہ کہا کرتی تھی کہ جس دن دادا جان کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا اسی دن وہ سخت ناراض ہو جائیں گے اور ممکن ہے تمہیں یہاں آنے سے روک دیں۔ مگر مجھے حمری سے سنگدلانہ سلوک کی توقع نہ تھی۔

اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ میں آنسو بہاتا رہا۔ آخر اشک ریزی ختم ہوئی۔ شاید میرے آنسو ختم ہو گئے تھے ورنہ دل تو اب بھی رونے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے قلعے پر حسرت آگیں نگاہ ڈالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دن انتہائی بیقراری کے عالم میں گزرا۔ جب شام ہوئی اور طاق مغرب پر چراغ خورشید کا شعلہ تاریکیوں کے ہجوم میں سسکیاں لینے لگا تو میرے قدم خود بخود قلعے کی طرف اٹھنے لگے۔ قلعے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر تک کھڑا رہا پھر قلعے کے اندر چلا۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا اور اس کی دھڑکن برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک مجھے افسوس ہوا کہ میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔ میں مڑا اور اسی جگہ پہنچا جہاں اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر میرا دل مایوسی میں ڈوب گیا کہ یہ راستہ بند ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ کسی چیز سے مس کر رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ سیڑھیوں کے بعد جو آہنی دروازہ ہے جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا، بند ہو چکا ہے۔ کافی دیر تک میں وہیں کھڑا رہا۔ حیران و سراسیمہ کھڑا رہا پھر باہر نکل آیا۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی اور یہ انتہائی مایوسی انتقام کی آگ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس وقت اگر حمری میرے قریب ہوتا تو یقیناً اس کی گردن مروڑ

ڈالتا۔ میں پچھتانے لگا کہ کیوں شب گزشتہ قلعے سے باہر نکل آیا۔ کیوں نہ اسے ہلاک کر ڈالا۔

تمام رات میں قلعے کے اردگرد چکر لگاتا رہا کہ شاید اندر جانے کا کوئی راستہ مل جائے مگر میری کوششیں رائیگاں گئیں۔ آخر بالکل مایوس ہو کر میں گھر پہنچا۔ میرے دل میں ایک طرف امیدوں کی خاک بکھری ہوئی تھی اور دوسری طرف انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دوسری رات بھی میں نے قلعے کے اردگرد چکر لگا کر گزار دی۔ اسی طرح کئی راتیں گزر گئیں ایک شام کو جب کہ میرا دل و دماغ غم و غصہ کی آگ میں جل رہا تھا۔ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حمری میری سامنے کھڑا تھا۔ جی میں آئی کمبخت کو مار ڈالوں مگر اس کی مایوس آنکھوں کو دیکھ کر میرا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ حمری چند لمحے گھور کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ''میرے ساتھ آؤ'' یہ کہہ کر وہ راستے کی طرف چلنے لگا جو قلعے کے اندر جاتا تھا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم قلعے کے اندر تھے حمری بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جب بیٹھ چکا تو وہ نرم اور محبت انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

''جانتے ہو، میں تمہیں کیوں لایا ہوں؟''

''نہیں!'' میں نے جواب دیا۔

تو سنو! سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قلعے کے اندر داخل ہو کر اور ایک معصوم فطرت دوشیزہ پر ڈورے ڈال کر تم نے سخت ظلم کیا۔ کاش تمہیں اندر آنے کا راستہ نہ معلوم ہوتا۔ اپنی طرف سے تو میں نے کوئی کمی نہ کی مگر جو نہ ہونا تھا۔ وہ ہو کر ہی رہا۔''

وہ رک گیا، غمناک لہجے میں کہنے لگا۔ ''شاہینہ کا معصوم دل دنیا کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ زہر ہلاہل کو شہد سمجھ رہی ہے۔''

''آپ کہہ رہے ہیں بابا!'' میں نے پہلی دفعہ پرجوش لہجے میں کہا۔

''میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں بیٹا! محبت دنیا کا خوفناک ترین مرض ہے۔ اس ظالم مرض نے صولت دیا سمین کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسی مرض سے بچانے کے لیے میں نے اپنی شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر رکھا تھا۔ مگر بدقسمت شاہینہ اس مرض میں مبتلا ہو ہی گئی۔''

''بابا تم میرے دل کا حال نہیں جانتے۔ کاش میں اپنے زخموں سے بھرے ہوئے سینے کو تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کر سکتا۔!''

''تمہیں واقعی شاہینہ سے محبت ہے؟'' حمری نے پوچھا۔

''بہ دل و جان''

''اس کا ثبوت؟''

''میرا دل راکھ ہو چکا ہے۔''

''کیا اس کے لیے قربانی کرو گے؟''

''میں اس کے لیے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں!''

''مگر یہاں قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سلمیٰ''

''سلمیٰ...... سلمیٰ کو میں بھلا چکا ہوں! وہ ایک حماقت ہے......!''

''تو کل تم شاہینہ کو بھی بھلا دو گے، ایک اور حماقت سمجھ کر!''

''نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔! تادم واپسیں نہیں ہو سکتا۔! میں مرتے دم تک شاہینہ سے محبت کرتا رہوں گا! اس کا آپ کو یقین دلاتا

ہوں!''

''تو شاہینہ کے لیے قربانی کرو گے؟'' حمری نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ہر وقت!''

''اگر تم قربانی کے لیے تیار ہو تو سمجھ لو کہ آج سے تمہیں یہیں رہنا ہو گا!''

''میری یہ انتہائی خواہش ہے۔ سب سے بڑی تمنا ہے!''

''تو آج سے تم یہیں رہو گے۔ قلعے میں سب کچھ ہے۔ تمہیں کسی چیز کی عدم موجودگی محسوس نہیں ہو گی اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو! شاہینہ کی آہ و زاری سے مجبور ہو کر میں تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اگر میں نے دیکھا کہ تمہاری محبت میں کمی آ گئی ہے اور تم میری بچی کو دھوکا دے رہے ہو تو تمہارے اور اس کے درمیان سنگین دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ تم ہمیشہ کے لیے اسے کھو دو گے۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا ارادہ بدل نہیں سکتی۔ سن لیا تم نے، میں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شاہینہ کو دھوکا دیا جائے۔ یہ کہتے ہوئے حمری کی آنکھوں سے آگ سی برسنے لگی۔

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بابا، میں مرتے دم تک شاہینہ سے اسی بیتابی کے ساتھ محبت کرتا رہوں گا!''

تمہارے الفاظ مجھے یقین دلانے سے قاصر ہیں۔ خیر میں تم پر اعتبار کرتا ہوں اب سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شاہینہ کون ہے؟''

میں نے حمری کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قسم کی چمک تھی جو سمندر کی سطح پر سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی رہتی ہے۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ صولت اور یاسمین اسی قلعے میں رہتے تھے اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ قید خانے کی سنگین دیواریں انہیں جدا نہ کر سکیں۔ وہ آپس میں ملتے رہے ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ بچی ابھی شیر خوار ہی تھی کہ اس کے والدین قتل کر دیئے گئے پھر بچی اسی غلام کے ہاں پرورش پانے لگی۔ جوان شہیدان محبت کو کھانا پہنچایا کرتا تھا اور ان کا ہمراز تھا۔ آج وہ بچی شاہینہ ہے، اور وہ غلام صفدر، یہ بوڑھا حمری......!''

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں!

''شاہینہ یاسمین کی بچی ہے؟'' میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

''ہاں یہ اُسی شہیدۂ محبت کی یادگار ہے!''

''تو یہ زندہ کیونکر رہی؟''

''بچی اپنی ماں کی کوٹھڑی میں تھی اس لیے جلادوں کے پنجے سے بچ گئی۔ میں نے بچی کو اٹھا لیا۔ اس کے بعد میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ محبت دنیا کی سب سے بڑی بیماری ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے یہاں چھپائے رکھا ہے۔ اسے اپنے والدین کی کوئی خبر نہیں!''

میں نے حمری کو اپنی محبت کا یقین دلایا اور انتہائی وفاداری کا وعدہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد میں شاہینہ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

میں پھر قلعے میں رہنے لگا۔ اب میری زندگی اس قدر مسرور، اس درجہ مطمئن تھی کہ مایوسی و اضطراب کا ہلکا سا سایہ بھی میرے دل و دماغ کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ شاہینہ کی خوبصورت آنکھیں دو چاند تھے، جن کی عطر آگیں روشنی میں میرے دل کی دنیا ہر وقت جگمگاتی رہتی اور ہر روز علی الصبح جب قلعے کے شرقی کہر میں ملفوف مینار سے پرے، بلند درختوں کے اوپر خورشید کے پیکر نوریں سے روشنی کی ندیاں بہنے لگتیں۔ میں

محسوس کرتا کہ میری یہ دنیا زیادہ روشن، زیادہ شاداب ہوگئی ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ اب کوئی غم، کسی چیز کی فکر مجھے غمگین وملول نہ بنا سکتی تھی۔

دن گزرتے جارہے تھے۔ ہر لمحہ میری مسرتوں میں اضافہ کرتا جاتا تھا اور اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ یکایک میں کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا؟ میرے اور شاہینہ کے درمیان محبت قائم تھی۔ وہ میری تمام مسرتوں کا سرچشمہ تھی اور اس کی تمام خوشیوں کا مرکز میں۔ پھر بھی ایک تھکاوٹ سی، ایک اضمحلال سا، ایک افسردگی سی میں اپنے دل ودماغ میں محسوس کرنے لگا۔ تغیر انسانی زندگی کا خاصا ہے اور شاید میری زندگی بھی کسی تغیر کی متمنی تھی۔ ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ کچھ دیر کے لیے باہر سیر کر آیا کروں؟ اس خیال کا اظہار میں نے شاہینہ کے سامنے کیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔ ''کیا مجھ سے اکتا گئے ہو؟''

یہ سن کر میرے دل پر برچھی سی لگی۔ ''کتنا بےہودہ خیال، نہ معلوم کبھی تم اتنی مایوس ویاس پرست کیوں ہو جاتی ہو؟ زندگی یہیں گزر رہی ہے۔ اس کے برعکس میں شہر میں پیدا ہوا، شہر میں رہا!''

''یہ درست ہے، تاہم میں ڈرتی ہوں، شہروں میں ہزاروں دلچسپیاں ہوتی ہیں۔''

''پاگل لڑکی! میں ہزاروں دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔''

''اب مجھے ڈر ہے، تم مجھے چھوڑ کر ان ہزاروں دلچسپیوں کی طرف نہ چلے جاؤ!''

''ایسا کبھی نہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ رات کے وقت کچھ دیر کے لیے میں قلعے سے باہر جایا کروں اور چونکہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ حمری اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لیے اس سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔

میں قلعے سے نکل جاتا اور شاہینہ مغربی مینار کے قریب کھڑے ہو کر مجھے دیکھتی رہتی۔ مغربی مینار کے بائیں طرف قلعے کی دیوار کا کچھ حصہ گر پڑا تھا، اس لیے وہاں کھڑے ہو کر انسان دور دور تک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن خلاف معمول میری طبیعت دن بھر متعفن رہی۔ میں شاہینہ سے اجازت لے کر قلعے سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس رات ''سیرو کا میلہ'' ہے اس لیے میں یہ سوچ کر کہ وہاں سے شاہینہ کے لیے چند چیزیں خرید لوں گا۔ ''نصرح باغ'' کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں باغ میں پہنچا اور اپنے آپ کو اپنے آشناؤں اور عزیزوں کی نظروں سے بچا کر چیزیں خریدنے لگا۔ اسی دوران میں میں باغ کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے۔ کچھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں واپس آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میرے سامنے دو سیاہ آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں رک گیا۔ میرے سامنے سلمیٰ کھڑی گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور تیزی سے چلنے لگا۔ ایک آدھ اور چیز خریدی اور باغ سے نکل آیا۔ مگر محسوس کر رہا تھا کہ سلمیٰ میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔

اپنی محبوبۂ دلنواز کی بےچینی کا خیال کر کے میں قلعے کو نزدیک ترین راستے سے جانا چاہتا تھا مگر جب یہ سوچا کہ کم بخت سلمیٰ برابر میرا تعاقب کر رہی ہے تو میں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ چند قدم طے کرنے کے بعد جب پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بدبخت عورت ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے منہ پھیرا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا، گویا ایک بوجھ جو میری روح کو تکلیف دے رہا تھا، اب موجود نہیں ہے۔ ایک سایہ جو میرے دل پر لہرا رہا تھا۔ اب غائب ہو گیا ہے۔

اندر جا کر میں نے تمام چیزیں اپنی محبوبہ کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ اس کی بیقرار نگاہیں ایک دم مسرت سے چمک اٹھیں اور وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

مگر نہ معلوم کیا بات تھی کہ میرا دل پھر بے چین ہو رہا تھا۔ آدھی رات گزر نے پر میں لیٹنے کو تو لیٹ گیا مگر نیند کہاں؟ ذہن میں خلش اور خیالات کا ہجوم بے قرار تھا اور میں بار بار سوچتا تھا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ سلمیٰ، جس کے جور و ستم نے مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا، اب میری طرف بار بار دیکھے، میرے پیچھے پھرے اور دیر تک پھرتی رہے؟ آخر اس تغیر کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ مجھے اپنے جال میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس التفات کے پردے میں کوئی خطرناک چال پوشیدہ ہے۔ یہی بات ہے یقیناً یہی بات ہے! میں نے دل میں کہا۔ ''لیکن میں اس کے دام تزویر میں ہرگز گرفتار نہیں ہوں گا۔ میرا دل، میرا دماغ، میری ہستی کا ذرہ ذرہ، شاہینہ اور صرف شاہینہ کے لیے وقف ہے۔ میری یہ محبوبہ جاں نواز کتنی نیک دل۔ کتنی پاکیزہ روح، کتنی معصوم فطرت لڑکی ہے!''

انہی خیالات میں راستہ کا بقیہ حصہ بھی گزر گیا۔ صبح صورت دیکھتے ہی شاہینہ مضطرب ہو گئی۔

''تمہاری آنکھیں اس درجہ سرخ۔ کیا بات ہے شہاب؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں! میں نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا اور اپنی ذہنی کوفت کو دور کرنے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگا۔ شاہینہ بار بار مجھ سے میرے اضطراب کی وجہ پوچھتی رہی مگر میں اسے ہنسی مذاق میں ٹالتا رہا۔

دو دن تک میں قلعے سے باہر نہ نکل سکا۔ تیسرے دن میری طبیعت گھبرائی۔ میں شام کو قلعے سے باہر نکلا۔ پھرتے پھراتے آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میرے سامنے وہی بد بخت عورت آ کھڑی ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ سلمیٰ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحے گزر گئے۔ میں تیزی سے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس رات میں نے شاہینہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیا اور کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ آخر میں کیوں اس بد بخت عورت سے ڈرتا ہوں۔ مجھے اس سے قطعاً محبت نہیں۔ پھر اس کی صورت دیکھ کر کیوں میرے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں؟ کیوں میری ہمت جواب دے جاتی ہے؟

میری نگاہوں کے سامنے سلمیٰ کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حرکت کرتی ہوئی آنکھیں پھرنے لگیں۔ میں سلمیٰ کے تصورات کو ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی صورت میری نگاہوں تلے پھر رہی تھی۔

میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں صاف فضا میں دھوئیں کے بادل بل پر بل کھاتے ہوئے لہرا رہے تھے۔ شام کے وقت میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ سلمیٰ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

''شہاب ذرا ٹھہرو...... اتنی تیزی سے کیوں چل رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا، مگر میں اس کی طرف توجہ کیے بغیر چلتا گیا۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بولتی گئی۔ اس کی آواز میں حسرت تھی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی اور اس کی آنکھوں میں مایوسی!

''میں تو اب تھک گئی شہاب!'' اور میرا ہاتھ پکڑنے لگی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے پودے پر گر پڑی اور میں تیزی کے ساتھ چلتا گیا۔ ایک لمحہ توقف کیے بغیر چلتا گیا!

قلعے میں پہنچا تو دیکھا شاہینہ کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ رخساروں پر جا بجا آنسوؤں کے نشان ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''آہ شہاب! تم نے مجھے بڑا بے قرار کیا۔ تم کیا جانو مجھ پر کیا گزر رہی ہے!''

''تمہارے پہلو میں بہت نازک اور ننھا سا دل ہے۔ ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے پر حسرت نگاہوں سے دیکھا اور میرے ہاتھ کو زور سے پکڑا۔ میں نے بھی اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ فضا میں ایک چکوری بے قراری سے اُدھر سے اِدھر، اِدھر سے اُدھر اڑ رہی تھی اور اس کی درد انگیز آواز ہوا میں تھر تھرا رہی تھی۔

''میرا دل گھبرانے لگتا ہے! تم قلعے سے باہر کیوں جاتے ہو؟ آئندہ یا تو باہر نہ جایا کرو، یا پھر مجھے بھی لے جایا کرو! تم یہاں سے چلے جاتے ہو تو!''

''تم پاگل ہو شاہینہ! ذرا تفریح کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔''

''باہر چلے جاتے ہو...... تفریح کے لیے...... تفریح...... اچھا؟'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

میرا دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو سینے سے لگا لیا اور میرے ذہن سے تمام کشمکش دور ہو گئی۔

چند دن کے بعد میں پھر قلعے سے نکلا۔ جب تک پھرتا رہا سلمٰی کی صورت نظر نہ آئی مگر جب قلعے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنے قریب ایک سائے کو دیکھا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ یقیناً سلمٰی نے قلعے کے اندر جانے کا پراسرار راستہ دیکھ لیا ہے۔ میں وہاں سے ہٹ گیا اور کافی دیر کے بعد قلعے کے اندر گیا لیکن جو یقین دل پر بیٹھ چکا تھا، وہ کیونکر دور ہو سکتا تھا؟

آندھی کے تیز و تند جھونکے، گنجان درخت کو گرا سکتے ہیں۔ مگر اس درخت کی شاخ سے لپٹے ہوئے جالے کو نہیں ہٹا سکتے۔ اسی طرح میری مسلسل کوششیں سلمٰی کے تصورات کو بھی میرے ذہن سے نہ نکال سکیں ہر بار جب میں قلعے سے باہر نکلتا، وہ مجھے دکھائی دیتی۔ مجھ سے بولنے کی کوشش کرتی۔ اگرچہ میں اس کا جواب نہ دیتا۔ اس کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتا تاہم وہ بدبخت عورت ایک ناگن بن کر میرے جسم کی تہوں میں گزرتی ہوئی دل کی انتہائی گہرائیوں میں اپنا زہر بکھیر رہی تھی۔

ایک دن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

''ذرا سوچو تو سہی شہاب! تمہاری یہ حرکت کتنی بے رحمانہ ہے۔ تم اس عورت سے بھاگ رہے ہو، جس کے نقش قدم پر بھی تم چومتے رہے ہو۔ میرے شہاب!!! اس تغیر کا سبب؟''

''مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بدبخت عورت!'' میں نے کہا۔

''تمہیں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں، کوئی واسطہ نہیں۔ یہ الفاظ شہاب تم کہہ رہے ہو؟''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''شاید تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ میں بھی تمہارا امتحان لیتی رہی ہوں!''

''میرا امتحان''

''میرے شہاب! میں نے تمہارا امتحان لیا تھا۔ میرا دل محبت کی آگ میں جل چکا تھا۔ مگر میں تمہاری محبت کو آزمانے کے لیے تمہاری جانب دیکھتی بھی نہ تھی اور جب تم محبت کے امتحان میں پورے اترے تو یہاں سے چلے گئے۔ نہ معلوم کہاں؟ میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ تم آ گئے! انتظار کی کیفیت سے تو تم واقف ہو۔''

انتظار کا لفظ سن کر میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے سلمٰی کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے دیکھا کچھ دور ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ایک نازک پودا اس طرح ہل رہا تھا، جیسے ابھی ٹوٹ جائے گا۔ میں نے قدم اٹھایا۔ سلمٰی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''شہاب! تم اتنے ظالم نہیں ہو سکتے!''

میں رک گیا۔ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پچھلے واقعات دہرانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے!

''افسوس! میری کمزوری! وہ تمام منحوس رات میں نے سلمٰی کے پہلو میں گزار دی!''

جب علی الصبح میں قلعے میں پہنچا تو شاہینہ کو مغربی مینار کے پاس کھڑے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور بال بے ترتیب و پریشان تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''رات بھر کہاں رہے شہاب؟''

''کہیں بھی نہیں۔ تم مضطرب کیوں نظر آ رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''رات بھر کہاں رہے شہاب؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''گھر چلا گیا تھا شاہینہ!'' میں نے جواب دیا۔

''گھر چلے گئے تھے، سچ کہتے ہو؟''

''تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟ تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں؟''

''شہاب!'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''تم پر اعتبار نہیں کروں گی تو دنیا میں کس پر کروں گی؟''

''تو پھر جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے درست مانو۔''

''تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ خیر چھوڑو اس بات کو!''

''شاہینہ! تم میں یہ بہت بری عادت ہے کہ تم بہت جلد بے چین ہو جاتی ہو!''

اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ دو تین لمحوں کے بعد اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور قریب ہی ایک پودے کے لرزتے ہوئے سائے کو دیکھنے لگی۔۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی'' جب تم یہاں نہیں ہوتے تو میرے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے تمہیں کیونکر بتاؤں کہ یہ رات میں نے کس بے تابی سے کاٹی ہے؟''

''اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم میری محبت کو بدگمان نگاہوں سے دیکھتی ہو!''

''نہیں یہ بات نہیں۔ مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔''

اپنی محبوبہ کی بے تابی دیکھ کر میرا دل پریشان ہو گیا اور اس دن میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ قلعے سے باہر نہیں نکلوں گا۔ ایک ہفتہ

گزر گیا۔ میری طبیعت گھبرائی اور انتہائی بدقسمتی یہ کہ شاہینہ سے میری طبیعت اکتا گئی۔ میں قلعے سے نکلا اور دو راتیں اور دو دن سلمٰی کے ہاں گزار دیئے۔ جس وقت واپس قلعے میں پہنچا تو حمری نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ مجھے سختی کے ساتھ باہر جانے سے روکا اور منت سماجت سے کہا "شاہینہ پر رحم کرو۔" اس دن تو میرا دل موم کی طرح نرم ہو گیا مگر چند کے بعد یہ نرم دل پتھر بن گیا میں نے قلعے سے نکلنے کا ارادہ کیا اور شاہینہ سے اجازت مانگی۔

ہماری آخری ملاقات تھی۔ آسمان پر کالی کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں اور ایک گوشے میں مایوس و مضمحل، افسردہ و پژمردہ چاندیوں نظر آ رہا تھا۔ گویا کوئی فراق کے صدموں کی ماری، مجروح دل حسینہ بستر مرگ پر آخری سانس لے رہی ہے۔ شاہینہ جنون انگیز گیت گاتی رہی اور بار بار روتی رہی۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی۔ اس نے آنسو خشک کیے اور خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہمارے قریب کھڑے ہو کر درخت کی ٹہنی سے دو پتے گرے۔ ایک تو شاہینہ کے بازو سے مس کرتا ہوا میرے پاؤں پر آ گرا اور دوسرا ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

چار ہفتے، مسلسل چار ہفتے میں ظالم چڑیل سلمٰی کے دام فریب میں گرفتار رہا۔ وہ مجھے ہر لحاظ سے اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتی رہی اور میں ظالم انسان، کمزور دل انسان اور پھر انتہائی بے وفا انسان اس کی باتوں میں آ گیا۔ آہ! اٹھائیس دن اور اٹھائیس راتیں میں نے اس کے پہلو میں گزار دیں۔ اس کے بعد جب میرے دل کا شعلہ بھڑکا تو میں جنون انگیز عجلت کے ساتھ قلعے میں پہنچا۔ مگر اب وہاں کیا دھرا تھا۔ میں نے قلعہ کا ہر گوشہ چھان مارا لیکن نہ تو شاہینہ کہیں نظر آئی اور نہ حمری۔

دنیا میری آنکھوں تلے تاریک ہو گئی۔ دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ انتہائی تلاش کے باوجود بھی مجھے ان میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ دن کا آخری حصہ گزر رہا تھا اور میں قلعے میں وحشیوں کی طرح پھر رہا تھا۔ یکا یک مغربی مینار کے پاس مجھے سفید سی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں "شاہینہ، شاہینہ" پکارتا ہوا اس کی طرف دوڑا وہاں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایک متوحش خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرے سامنے سلمٰی کا مسکراتا ہوا چہرہ بجلیاں سی برسا رہا تھا۔

"میرے شہاب! وحشیوں کی طرح کیوں پھر رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"تم...... یہاں؟"

"میں یہاں کیوں نہیں آ سکتی۔ آؤ میرے شہاب! اس ویران قلعے سے باہر نکلیں اب ہماری محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں!"

میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔

"کیا کہا تم نے؟" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

میرے چہرے کو دیکھ کر وہ خوفزدہ سی ہو گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "میں نے کہا۔ میرے شہاب! اب یہاں سے باہر نکلیں۔ دیکھتے ہو، قلعہ کتنا ویران اور سنسان ہے!"

"تم نے شاہینہ کو!"

"شاہینہ! کون شاہینہ؟" سلمٰی نے میرا الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ خود بخود اس کی گردن کی طرف اٹھنے لگے۔ دو تین لمحوں کے بعد اس کی گردن میری مضبوط گرفت میں تھی۔

''بتاؤ شاہینہ کہاں ہے؟ سچ سچ بتاؤ! ورنہ گردن مروڑ ڈالوں گا!'' میں نے اس کی گردن دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

''سنا ہے۔ وہ یہاں سے چلی گئی ہے!'' اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''سنا ہے؟...... سنا ہے؟...... سچ مچ نہیں بتاؤ گی؟ یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن کی طرف پھر ہاتھ بڑھائے۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔

''یہ سب کچھ محبت سے ہوا۔ مجھے تجھ سے محبت ہے، اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور بھی تم سے محبت کرے۔ تمہارا تعاقب کرتی ہوئی میں دو تین دفعہ یہاں آ چکی تھی اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہینہ تم سے محبت کرتی ہے اور تم اس سے۔ اس لیے میری محبت نے مجبور کیا اس کانٹے کو راہ سے ہٹا دوں۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے میں نے تمہیں اپنے ہاں رہنے پر مجبور کیا۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا اور تم وہاں نہ پہنچے میں نے قلعے میں آ کر شاہینہ اور بوڑھے سے کہہ دیا کہ شہاب اب قلعے میں نہیں آئے گا۔ وہ میرا محبوب ہے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد جب میں پھر یہاں پہنچی تو وہ جا چکے تھے!''

''کہاں؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ بوڑھے نے اس دن شاہینہ سے کہا تھا کہ شاہینہ! اب ہمیشہ کے لیے اس قلعے کو چھوڑ دیں۔ یقیناً وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں!''

میرے کانوں میں حمدی کے وہی الفاظ گونجنے لگے جو اس نے قلعے میں کہے تھے:

''ذلیل عورت! تو نے مجھے دھوکا دیا۔ اب تو بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔'' میں نے کہا اور اس کی گردن پکڑ لی۔

''شہاب! میرے شہاب!'' اور اپنی گردن چھڑانے لگی۔ میری گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ زخمی ہرنی کی طرح اس نے مجھے دیکھا اور بھاگی۔ یکا یک فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی۔ میں نے نیچے دیکھا پتھروں پر خون میں لتھڑا ہوا گوشت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو نیچے گرا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر جب یہ خیال آیا، شاید شاہینہ مل جائے، تو میں نے ارادہ ترک کر دیا اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

13

سالہا سال میں، شاہینہ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں مگر کہیں بھی اسے نہ دیکھ سکا۔ نہ معلوم حمدی اُسے...... کہاں لے گیا ہے...... کائنات کے کس گوشے میں وہ سانس لے رہی ہے!

آج میں پھر قلعے میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ جس جگہ بیٹھا ہوں، وہی جگہ ہے جہاں پہلے پہل میں نے شاہینہ سے گفتگو کی تھی...... اور...... جہاں بیٹھ کر میں اس کا انتظار کیا کرتا تھا!!

میری آنکھوں کے سامنے تاریک سائے پھر رہے ہیں۔ چند سانس باقی رہ گئے ہیں۔ کاش! میں ان آخری لمحوں میں بھی اپنی محبوبہ کو دیکھ سکوں۔!!

○

خواجہ احمد عباس

نام	:	احمد عباس
قلمی نام	:	خواجہ احمد عباس
پیدائش	:	۷ جون ۱۹۱۴ء بہ مقام پانی پت، ہریانہ
وفات	:	یکم جون ۱۹۸۷ء کی صبح بہ مقام بمبئی۔
تعلیم	:	بی۔اے، ایل۔ایل۔بی، علی گڑھ یونیورسٹی

ابتدائی تعلیم حالی مسلم ہائی اسکول قلندر صاحب شاخ، پانی پت (ہریانہ)، پانچویں سے ساتویں تک حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت۔ آٹھویں، یونیورسٹی مڈل اسکول، علی گڑھ، نویں سے بارہویں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ۔ بی۔اے (۱۹۳۳ء)، ایل۔ایل۔بی (۱۹۳۵ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

آبائی وطن پانی پت، والد کا نام غلام السبطین انصاری، والدہ کا نام مسرور خاتون، جو مولانا الطاف حسین حالی کی پوتی تھیں۔ خواجہ احمد عباس نے صحافت کی ابتداء ۱۹۳۳ء میں ''نیشنل کال'' اور ''ہندوستان ٹائمز'' میں بلا معاوضہ لکھنے سے کی اور یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ طالب العلمی کے زمانے میں اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار ''Aligarh Opinion'' جاری کیا۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء ''بمبئی کرانیکل'' سے وابستہ رہے اس دوران میں اخبار کے فلمی ناقد کے علاوہ سنڈے ایڈیشن کے ایڈیٹر رہے۔ ابتداء میں بمبئی ٹاکیز کی فلم ''نیا سنسار'' اور سرکوز فلمز کی ''نئی دنیا'' لکھ کر شہرت پائی۔ اس کے بعد فلم ''نیا ترانہ'' اور ''نئی کہانی'' لکھیں۔ ۱۹۴۶ء میں سمندر ترنگ، شیواجی پارک، بمبئی میں اُن کی ذاتی فلم کمپنی کا آفس تھا۔ ۱۹۴۰ء میں مجتبائی خاتون سے شادی ہوئی، ۱۹۵۸ء میں بیگم انتقال کر گئیں۔ انہیں دنوں قرۃ العین حیدر سے شادی کے امکانات پیدا ہوئے لیکن یہ شادی نہ ہو سکی۔

۱۹۳۷ء میں ''بمبئی کرانیکل'' سے ''Blitz'' اخبار میں چلے گئے تھے۔ فلمی دنیا سے تعلق بمبئی ٹاکیز کے پارٹ ٹائم پبلسٹی منیجر کے طور پر قائم ہوا، آگے چل کر انڈین موشن پکچرز پروڈیوسرز ایسوسی ایشن، ڈاکومنٹری پروڈیوسرز ایسوسی ایشن، فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے کرتا دھرتا رہے، بھارتیہ گیان پیٹھ کے مشیر اور فلم انسٹی ٹیوٹ آف پونا کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۶ء انڈین فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر کے طور پر کام کیا۔ دنیا کا سفر انہوں نے دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی ختم کر لیا تھا۔ وہ پہلے مشرق بعید گئے پھر جاپان، امریکہ، فرانس، اور آخر میں برطانیہ سے ہوتے ہوئے بھارت واپس آئے۔ ۱۹۴۳ء میں پیپلز تھیٹر کی فلم ''دھرتی کے لال'' نہ صرف لکھی بلکہ پروڈیوس اور ڈائرکٹ بھی کی۔ مشہور فرانسیسی فلمی ناقد پروفیسر جارج سادوں نے اس فلم کو دنیا کی سو بہترین فلموں میں شمار کیا ہے۔ خواجہ صاحب کی دوسری فلم ''انہونی'' تھی اس کے بعد اپنی کامیاب ترین فلم ''شہر اور سپنا'' (پریذیڈنٹ گولڈ میڈل) کی تکمیل تک چودہ فلمیں ''آوارہ''، ''پردیسی''، ''آج اور کل''، ''ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی''، ''شری چار سو بیس''، ''جاگتے رہو''، ''میرا نام جوکر'' اور ''بوبی'' کی کہانیاں، اسکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ خواجہ صاحب کی اردو، ہندی اور انگریزی تصانیف کی تعداد تقریباً پینتالیس کے قریب ہے اور لگ بھگ اتنی ہی فلمیں لکھیں جن میں ''سات ہندوستانی''، ''نکسل باڑی''، ''دو بوند پانی''، ''ہوا محل''، ''دھرتی کے لال'' اور ''شہر اور سپنا'' کو عالمی سطح پر سراہا گیا۔ ان کی آخری فلم ''فیصلہ'' تھی۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''ابابیل'' مطبوعہ: ''جامعہ'' دہلی ۱۹۳۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''ایک لڑکی'' (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۳۷ء طبع دوم: دسمبر ۱۹۴۹ء
۲۔	''محمد علی'' (افسانے)	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۳۶ء
۳۔	''زعفران کے پھول'' (افسانے)	مطبوعہ: کتب پبلشرز، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۴۔	''اندھیرا اجالا'' (افسانے ہندی)		
۵۔	''کہتے ہیں جس کو عشق'' (۳ طویل افسانے)	مطبوعہ: پروین بک ڈپو، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۵۴ طبع دوم: ۱۹۵۴ء
۶۔	''زبیدہ'' (ڈراما)		
۷۔	''یہ امرت ہے'' (ڈراما)	عہد آفریں پریس، حیدر آباد دکن	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء
۸۔	''چودہ گولیاں'' (ڈراما)		
۹۔	''مسافر کی ڈائری'' (رپورتاژ)	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۴ء

۱۰۔ ''نیلی ساری''(افسانے) — مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی — طبع اول: ۱۹۸۳ء

۱۱۔ ''انقلاب''(ضخیم ناول)

اس ناول کا ایک روسی ایڈیشن ''فرزند ہند'' (سن آف انڈیا) کے نام سے نوے ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔

۱۲۔ ''پاؤں میں پھول''(افسانے) — مکتبہ سلطانی، بمبئی — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۱۳۔ ''میں کون ہوں''(افسانے) — مطبوعہ: نو ہند پبلشرز، بمبئی — طبع اول: ۱۹۳۹ء

۱۴۔ ''نئی دھرتی نئے انسان''(۱۵ افسانے) — مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی — طبع اول: ۱۹۷۷ء

۱۵۔ ''گیہوں اور گلاب''(۷ افسانے) — مطبوعہ: ایشیاء پبلشرز — طبع اول: ۱۹۶۵ء

۱۶۔ ''تین پیسے''

۱۷۔ ''چار دل چار راہیں''(ناول) — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۵۹ء

۱۸۔ ''چراغ تلے''(افسانے۔ ہندی)

۱۹۔ ''رقص کرتا ہے اگر''(ناول)

۲۰۔ ''سرخ زمین اور پانچ ستارے''(رپورتاژ)

۲۱۔ ''میں کوئی جزیرہ نہیں''(آپ بیتی بہ زبان انگریزی)

۲۲۔ ''فلمیں کیسے بنتی ہیں''(بہ زبان انگریزی)

۲۳۔ ''دیا جلے ساری رات''(افسانہ) — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۵۹ء

۲۴۔ ''آدھا انسان''(ہندی) — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۵۳ء

۲۵۔ ''لوان مسوری''(افسانے۔ ہندی) — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۷۵ء

۲۶۔ "Blood And Stones" — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۳۹ء

۲۷۔ "Rice And Other Stories" — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۴۷ء

۲۸۔ "Tomorrow Is Ours" — مطبوعہ:

۲۹۔ "One Did Not Come Back" — مطبوعہ:

۳۰۔ "A Novel Of The India Of Today" — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۳۱۔ "I Write And Feel" — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۳۲۔ "Inqilab"(ناول) — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۴۵ء

۳۳۔ "Mussolini And Fascism"

۳۴۔ "Face To Face With Khruchev" — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۶۰ء

۳۵۔ "Till We Reach the Stars" — مطبوعہ: — طبع اول: ۱۹۶۱ء

۳۶۔ "Indira Gandhi: Return Of The Rose" مطبوعہ: طبع اوّل:۱۹۶۶ء

۳۷۔ "That Women-Her Seven Years In Power" طبع اوّل:۱۹۷۳ء

۳۸۔ "An Indian Looks At America"

۳۹۔ "Mera Nam Joker" مطبوعہ: طبع اوّل:۱۹۷۰ء

۴۰۔ "Boy Meets Girl" مطبوعہ: طبع اوّل:۱۹۷۳ء

۴۱۔ "Face To Face With Indira Gandhi" مطبوعہ: طبع اوّل:۱۹۷۴ء

۴۲۔ "Distant Dream"(ناول) مطبوعہ: طبع اوّل:۱۹۷۵ء

۴۳۔ "The Walls Of Glass"(ناول) مطبوعہ:

۴۴۔ "Mad, Mad, Mad World Of Indian Films" طبع اوّل:۱۹۷۷ء

۴۵۔ "Barrister At Law"(ڈراما) مطبوعہ: طبع اوّل:۱۹۷۷ء

۴۶۔ ''مسولینی فاشسٹ اور جنگ حبش''(سیاسیات) طبع اوّل:۱۹۳۹ء سے قبل

۴۷۔ ''سونے کے بت''(اردو افسانے) مطبوعہ:الحمرا،اسلام آباد طبع اوّل:۲۰۰۱ء

غیر مدوّن:

متعدد مضامین،سکرین پلے اور دو ایک افسانے۔

اعزاز:

۱۔ پدم شری ایوارڈ:۱۹۶۸ء

۲۔ میرا ایوارڈ،اردو اکیڈمی بھوپال۔

۳۔ بہار اردو جرنلسٹس ایوارڈ برائے قومی یکجہتی۔

۴۔ ہریانہ گورنمنٹ ایوارڈ (ادب)اور ایک شال۔

۵۔ پریذیڈنٹ گولڈ میڈل برائے فلم''شہر اور سپنا''۱۹۶۳ء

۶۔ کارلووی واری (اطالیہ)فلم فیسٹیول کا آرٹ اکادمی ایوارڈ برائے ہدایت کاری۔

۷۔ گمون (اسپین)فلم فیسٹیول ایوارڈ برائے''شہر اور سپنا''۔

۸۔ سنٹا باربرا (امریکہ)فلم فیسٹیول ایوارڈ برائے''شہر اور سپنا''۔

۹۔ فلم فیسٹیول (اطالیہ)میں سونے کی مور،برائے''نکسلائٹ''(نکسل باڑی)

۱۰۔ مودی غالب ایوارڈ۱۹۸۳ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

''فلومینا اپارٹمنٹ، چرچ روڈ، جوہو بمبئی ۴۰۰۰۴۹ ۔ بھارت

نظریۂ فن:

''کچھ کہنے کی بات کو دلچسپ پیرائیہ میں بیان کرنا۔ میں لوگوں کو پہنچنا اور اپنے نظریات کو پہنچانا چاہتا ہوں۔''

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ سے اقتباس)



حوالہ جات:

۱۔ مالک رام کی کتاب ''تذکرہ ماہ و سال'' میں خواجہ احمد عباس کی تاریخ پیدائش ۱۴ جون ۱۹۱۴ء درج ہے۔ جب کہ خود خواجہ صاحب نے میرے نام مکتوب میں اپنی تاریخ پیدائش ۷ جون ۱۹۱۴ء لکھ کر بھیجی اور اُسے درست کہا۔

ٹیری لین کی پتلون

خواجہ احمد عباس

شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑا ہوا صاحب اپنی نیلی کانچ کی آنکھوں سے منگو کو گھور رہا تھا۔
شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑا ہوا منگو اپنی چمکیلی کالی آنکھوں سے صاحب کو گھور رہا تھا۔

صاحب کے سر پر سلیٹی رنگ کا ''ٹوپ'' تھا۔ (اور دل ہی دل میں منگو نے اپنے آپ کو ٹوکا۔ ''ٹوپ'' نہیں ''ہیٹ'' ٹوپ تو گنوار بولتے ہیں۔ صاحب کے بدن پر چھوٹے چھوٹے چار خانوں کا کوٹ تھا۔ کوٹ کے کالر میں سے سفید قمیص اور کالی اور لال دھاریوں دار ٹائی جھانک رہی تھی۔ صاحب کی ٹانگیں نیلے رنگ کی پتلون میں تھیں۔ پتلون، صاحب کے کولہوں پر کسی ہوئی تھی اور نیچے کالے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے جوتوں تک آتے آتے گائے کی دم کی طرح پتلی ہو گئی تھی۔ پتلون کا کپڑا بڑا چمکیلا تھا۔ ملائم بھی ضرور ہوگا۔ منگو نے کانچ کی دیوار کو ناک لگاتے ہوئے سوچا۔

صاحب سے منگو کی کئی مہینے پرانی دوستی تھی۔ ہر روز منگو، صاحب کو دیکھنے آتا تھا مگر ان کے درمیان یہ کم بخت کانچ کی دیوار کھڑی تھی جو ان کو ملنے نہیں دیتی تھی۔ صاحب، شیشے کی دیواروں کے اندر قید تھا۔ صاحب درزی کی دکان کے باہر نہیں آسکتا تھا۔ منگو، درزی کی دکان کے اندر نہیں جاسکتا تھا۔ صاحب کے کاٹھ کے بدن میں جان نہیں تھی۔ منگو کے بدن میں جان تو تھی مگر اس کی جیب میں دام نہیں تھے۔ دونوں مجبور تھے۔

منگو نے شیشے کی دیوار کے باہر ہی سے صاحب کے قد کو ناپ کر سوچا۔ ہم دونوں برابر ہی ہوں گے۔ صاحب کے کپڑے میرے بدن پر فٹ آسکتے ہیں۔ ''فٹ'' منگو نے سوچا یہ چھوٹا سا انگریزی کا لفظ بولنے ہی میں نہیں سوچنے میں بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ ''فٹ'' جیسے بٹن دبا کر لگانے کی آواز بٹ۔ جیسے اس کے پلاسٹک کے تھیلے میں لگے ہوئے زپ کو کھینچنے کی آواز۔ زپ ویسے ہی ''فٹ'' جیسے صاحب کی ٹانگوں سے چپکی ہوئی پتلون۔ فٹ جیسے صاحب کی چھاتی اور کمر پر منڈھا ہوا کوٹ۔ فٹ، جیسے صاحب کے سر پر بیٹھا ہوا ہیٹ۔ فٹ!

وہ صاحب کو سر سے لے کر پیر تک۔ ہیٹ سے لے کر جوتوں تک روز دیکھتا تھا۔ مگر اس کی نظر بار بار چمکیلے نیلے رنگ کی پتلون کی مہری پر جاتی تھی۔ جہاں کاغذ کی ایک پرچی لگی تھی جس پر انگریزی میں لکھا تھا۔ ''ٹیری لین کی پتلون۔ اسی روپے''۔

اور جب وہ اس اسی روپے والی ٹیری لین کی پتلون کا مقابلہ اپنی ٹانگوں پر جھولتی ہوئی میلی ڈھیلی ڈھالی خاکی ڈبل زین کی پتلون سے کرتا تھا (جو اس نے کئی مہینے ہوئے بارہ روپے میں ''ریڈی میڈ'' خریدی تھی اور جو اس کے بدن پر بالکل ''فٹ'' نہیں تھی) تو منگو کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کی بیس سالہ زندگی کی ساری دوڑ دھوپ اسی ٹیری لین کی پتلون کو حاصل کرنے کے لیے تھی۔

منگو، ہریانے کے ایک چھوٹے سے قصبے رہتک میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنا بچپن بہت کم یاد تھا۔ اس کی ماں تو منگو کے پیدا ہونے کے سال بھر بعد ہی مرگئی تھی۔ لیکن اس کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ بچپن میں وہ کوئی کھیل بھی کھیلتا تھا یا نہیں یا اس کے بچپن کے ساتھی اور دوست کون تھے۔ شاید کوئی تھے ہی نہیں لیکن اس کو اتنا ضرور یاد تھا کہ وہ کوئی پانچ برس کا تھا جب اس کے باپ نے اسے محلے کے میونسپل پرائمری اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ داخلہ آسانی سے نہیں ہوا تھا۔ کئی بار اسے صبح سویرے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر گھر کی دھلی ہوئی دھوتی (جو اس کے باپ کی پرانی دھوتی میں سے پھاڑ کر بنائی گئی تھی) اور قمیص پہن کر پہلی پستک اور سلیٹ کو بغل میں دبا کر باپ کے ساتھ اسکول جانا پڑا تھا۔ تب جا کر ماسٹر جی نے رجسٹر میں اس کا نام لکھا تھا۔ مگر اگلے دن جب وہ اکیلا اسکول پہنچا تو اسکول کے چپراسی نے برآمدے میں پڑی ایک پھٹی ہوئی چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہاں بیٹھ جا۔'' اور منگو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جب دوسرے بچے اندر بنچوں اور ڈسکوں پر بیٹھے ہیں تو اس کو باہر برآمدے میں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ اور ساری کلاس کے ساتھ وہ بھی ''آ' آ۔ ای۔ ای۔ م۔ او'' دو دونی چار'' دو تیا چھ'' چلّا چلّا کر یاد کرتا رہتا تھا۔ مگر اس کے چھوٹے سے سر میں ایک سوال شہد کی مکھی کی طرح بھن بھن کرتا رہتا۔ سب لڑکے اندر کمرے میں بنچوں پر بیٹھتے ہیں تو صرف مجھے ہی کیوں برآمدے میں گندی پھٹی چٹائی پر بیٹھنا پڑتا ہے؟ کیوں؟ کیوں سوال کی زہریلی مکھی بھن بھناتی رہتی' کبھی کبھی ڈنگ بھی مارتی' مگر نہ جانے کیوں اس کو یہ سوال زبان تک لاتے ہوئے ایسا عجیب ڈر لگتا تھا جیسا رات کے اندھیرے میں پرانے پیپل کے کھڑکھڑاتے ہوئے سائے میں بھوت سے ڈر لگتا ہے۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ اس کے باپ نے اسے معمول سے بھی سویرے، سوتے سے جگادیا اور جب وہ اسکول پہنچا تو اس نے دیکھا ابھی ایک بچہ بھی نہیں آیا۔ تینوں کمرے اور ان کے سامنے کا برآمدہ خالی پڑے تھے اس کی کلاس کے کمرے کے دروازے کھلے تھے اندر بنچ اور ڈسک لائنوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا ایک بار جہاں اور لڑکے بیٹھتے ہیں وہاں بیٹھ کر تو دیکھوں۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ دبے پاؤں کمرے کے اندر گیا اور سب سے پچھلی لائن میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے ڈسک رکھا ہوا تھا جس میں روشنائی بھری دواتیں لگی ہوئی تھیں منگو نے ڈسک پر اپنی کتابیں اور تختی' سلیٹ' قلم' پنسلیں جمادیں۔ بنچ کے پیچھے لگی ہوئی لکڑی پر کمر ٹکا کر بغلوں میں ہاتھ دبا کر بڑی شان سے بیٹھ گیا۔

اس نے سوچا۔ ''اگر ہر روز میں بھی یہاں بیٹھ جاؤں تو کیا ہرج ہے؟''

اور شاید اس ان کہے سوال کے جواب میں چپراسی رام دین سر پر اپنا خاکی صافہ باندھتے ہوئے برابر کے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا اور منگو کو بنچ پر بیٹھا دیکھ کر چلا پڑا۔ ''ابے او۔ تجھے یہاں بیٹھنے کو کس نے کہا ہے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی پٹوائے گا۔''

عام طور سے رام دین، منگو سے بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ ماسٹر جی کی طرح اس کے ہاتھوں پر قمچیاں نہیں مارتا تھا۔ سو منگو، ڈر کے

مارے ایک دم کھڑا نہیں ہو گیا۔ وہیں بیٹھا بیٹھا بولا'' کا کا رام دین۔ میں یہاں کیوں نہیں بیٹھ سکتا؟ مجھے وہاں چٹائی پر کیوں بیٹھنا پڑتا ہے؟''

''اس لئے کہ تو اچھوت ہے'' رام دین نے جواب دیا۔ منگو کو ''اچھوت'' کے معنی نہیں معلوم تھے مگر اسے یہ لفظ سنتے ہی اپنے آپ میں سے ایسی گھناؤنی بو آئی کہ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹ کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ مگر اس جلدی میں اس کی دھوتی کا سرا ڈسک میں لگی ایک کیل میں اٹک گیا۔ چھرر سی آواز آئی اور منگو کی بائیں ٹانگ کولھے تک ننگی ہو گئی۔ پھٹی ہوئی دھوتی کو سنبھالتے ہوئے ابھی اس نے آلتی پالتی مار کر سامنے کتابیں رکھی ہی تھیں کہ رام دین نے اسکول کی گھنٹی بجانی شروع کی اور لڑکوں کی ٹولیاں بھاگ بھاگ کر اسکول میں آنے لگیں۔

لڑکے چھ کا پہاڑا یاد کرتے رہے۔ ''چھ اکن چھ۔ چھ دونی بارہ' چھ تیا اٹھارہ۔'' مگر منگو کے دماغ میں زہریلی شہد کی مکھی بھن بھناتی رہی۔ ''اچھوت۔ اچھوت۔ اچھوت''

لڑکے چلاتے رہے۔ ''آج آم لا۔ کل کام پر جا۔ سچ بول' کم تول' وہ تیرا بھائی ہے تو اس کا بھائی ہے'' مگر منگو کے کانوں میں سنائی دیتا رہا۔ تو بنچ پر نہ بیٹھ۔ تو اچھوت ہے۔ گندی چٹائی پر بیٹھ۔ تو اچھوت ہے تو کسی کا بھائی نہیں ہے تو اچھوت۔ ہے۔''

ماسٹر جی پوچھتے رہے' ہاں تو بچو بتاؤ۔ جھیل کیا ہوتی ہے؟ ساگر کیا ہوتا ہے۔ ٹاپو کیا ہوتا ہے؟''

اور منگو سنتا رہا۔ ''ہاں تو بچو بتاؤ۔ اچھوت کیا ہوتا ہے؟ اچھوت کیا ہوتا ہے؟''

اور پھر ایک دم ماسٹر جی کی قمچی کی مار اس کی کمر پر پڑی۔ ''اے منگو جواب نہیں دیتا کیا سو رہا ہے؟ چل کھڑا ہو جا۔''

منگو گھبرا کر کھڑا ہوا تو دھوتی کا پھٹا ہوا پلو نیچے گر پڑا اور اس کی بائیں ٹانگ کولہے تک سب کے سامنے ننگی ہو گئی۔ سب بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

ایک اور قمچی کی مار منگو کی کمر پر پڑی اور اسے ایسے لگا جیسے ایک لمبی ڈنگ والی بھڑ نے ایک دم اسے کاٹ لیا ہو ماسٹر جی نے چلا کر کہا۔ ''پھر کبھی پھٹی دھوتی پہن کر آیا تو تجھے اسکول سے نکال دوں گا۔''

اسکول ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب بچے ہنستے شور مچاتے باہر بھاگے تو منگو نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک قمیص اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ کوئی خاکی نیکر' کوئی نیلی نیکر' کسی کے پیروں میں موزے اور بوٹ تھے کسی کے پیروں میں چپل۔ مگر ننگے پاؤں کوئی نہیں تھا۔

اسکول سے گھر جاتے ہوئے منگو نے سوچا، اچھوت وہ ہوتا ہے جو نیکر کی بجائے پھٹی ہوئی دھوتی پہنتا ہے اور ننگے پاؤں اسکول جاتا ہے اور اس نے گھر پہنچتے ہی باپ سے کہا'' بابا۔ مجھے نیکر سلوا دو۔ اور چپل دلوا دو۔ میں ننگے پاؤں اسکول نہیں جاؤں گا۔''

تین دن کے بعد وہ نئے چپلوں کو چر رکر تا نیلی کھدر کی نیکر پہن کر سویرے سویرے اسکول پہنچا اور رام دین سے پوچھا'' کا کا اب تو میں اندر بیٹھ سکتا ہوں نا؟'' اور رام دین نے چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا'' اپنی خیریت چاہتا ہے تو بیٹھ جا اپنی جگہ۔ نیکر پہن کر بھی تُو ہے تو اچھوت'' اس دن اس نے باپ سے پوچھا'' بابا اچھوت کیا ہوتا ہے'' باپ نے جو اس وقت سڑک پر جھاڑو دے کر آیا تھا جھاڑو ٹوکری پھینک کر جواب دیا۔ اچھوت وہ ہوتا ہے جسے کوئی اونچی جات والا چھو نہیں سکتا۔''

''مگر کیوں نہیں چھو سکتا؟ ہم میں کوئی گندگی ہے کیا؟''

''ہاں بیٹا۔ گی تو ہے۔ ہم لوگ کوڑا کرکٹ جو اٹھاتے ہیں۔ ٹٹی صاف کرتے ہیں۔ گندی نالیاں دھوتے ہیں۔ سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہیں۔ اس لئے ہم اچھوت ہیں۔''

منگو نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''تو پھر میں تو یہ گندا کام نہیں کروں گا۔''

اور باپ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا ''تو نہیں کرے گا تو اور کریں گے۔ یہ کام تو کسی نہ کسی کو کرنا ہی ہے اگر ہم یہ کام نہ کریں تو سڑکوں پر کوڑے کے ڈھیر لگ جائیں۔ ہر گھر میں ٹٹی اکٹھی ہو کر سڑاند آنے لگے بیماریاں پھیل جائیں۔''

اس کا جواب منگو کے پاس نہیں تھا۔ مگر اس نے پھر کہا ''میں تو کوئی اور کام کروں گا۔''

''تب ہی تو تجھے اسکول میں بھرتی کرایا ہے۔ چار جماعت پڑھ لے گا تو تجھے دلی بھیج دوں گا۔ وہاں کچھ نہیں تو چپراسی کی نوکری مل جائے گی۔''

اور منگو نے کہا ''چپراسی نہیں' میں بابو بنوں گا۔''

منگو نے چار جماعتیں تو پڑھ لیں۔ مڈل اسکول میں بھی داخل ہو گیا۔ جہاں اس کو برآمدے میں چٹائی پر بیٹھنا نہیں پڑتا تھا کلاس روم میں ہی بنچ اور ڈسک پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ منگو کو اس کے باپ نے بتایا تھا کہ دیش آزاد ہو گیا ہے اور مہاتما گاندھی جی مرنے سے پہلے سب کو کہہ گئے ہیں کہ اچھوتوں کو اچھوت نہ کہیں ''ہریجن'' کہیں اور ان سے چھوت چھات نہ برتیں۔ سو سرکار نے ایک نیا قانون بھی بنا دیا تھا کہ چھوت چھات بند ہو جائے پر یہ قانون اسکول تک تو پہنچا تھا مگر ان کی بستی کے پاس جو اونچی جات والوں کا محلّہ تھا اس کے کنویں تک نہیں پہنچا تھا۔۔ اچھوت' ہریجن'' ہو گئے تھے مگر اس کنوئیں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے۔ مڈل اسکول میں بھی دو چار دن تو منگو بہت خوش رہا کہ اب وہ بھی کرسی میز پر بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے لیکن چند روز کے بعد اسے عجیب سا لگا کہ ان کے کمرے میں دو دو لڑکے ایک ڈسک پر بیٹھتے ہیں لیکن منگو کے برابر جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے اور برابر والے ڈسک پر دو کے بجائے تین لڑکے پھنس پھنسا کر بیٹھتے ہیں۔

منگو نے مڈل پاس کیا تو باپ نے اسکول سے اٹھا لیا۔ ابھی وہ دتی جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا باپ ہیضے میں مر گیا۔ یتیم منگو کو اس کے رشتہ دار میونسپلٹی میں بھنگی کی نوکری دلوانے کی سوچ رہے تھے کہ ان کی بستی کا ایک آدمی رلدو بمبئی سے واپس آیا' وہ وہاں کسی مل میں کام کرتا تھا۔ ایک دن منگو کو وہ راستے میں مل گیا تو اس نے پوچھا: ''کیوں منگو۔ بمبئی چلے گا؟'' سو رلدو نے اس کو بتایا کہ بمبئی میں وہ رلیا رام کہلاتا ہے۔ ایک مل میں کام کرتا ہے۔ جس چال میں وہ رہتا ہے وہاں ہر کوٹھری میں (جسے بمبئی کی بھاشا میں ''کھولی'' کہتے ہیں، بھانت بھانت جاتی کے لوگ رہتے ہیں کسی میں برہمن تو کسی میں کھشتری تو کسی میں مسلمان تو کسی میں کسان' پارسی' سکھ' مدراسی' بنگالی اور تو اور رلدو عرف رلیا رام بھی وہیں رہتا ہے اور کسی نے آج تک اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تو چھوت ہے یا اچھوت۔ ''منگو' بمبئی میں سب لوگ رات دن کام کرنے میں جٹے رہتے' کسی کو ٹائم ہی نہیں ہے ایسے سوال و جواب کرنے کا۔''

پھر منگو نے پوچھا ''مگر کھانے پینے میں تو چھوت چھات ضرور ہوتی ہوگی۔''

اور رلدو نے کہا۔ ''ارے بمبئی کے ایرانی ہوٹلوں میں سب دھرم اور جات کے لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کیا دھرم ہے کون جات ہو۔ بڑے شہر میں یہی تو مجا ہے۔ یہ چھوت چھات قصبوں اور دیہاتوں میں رہ گئی ہے۔''

رلدو واپس بمبئی گیا تو منگو بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

پہلی بار وہ ریل میں بیٹھا تو اس کو ایسا لگا جیسے ریل نہیں چل رہی ساری دنیا پیچھے کو بھاگ رہی ہے۔ رہتک کے شہر' وہاں کا مکان' ہریجنوں کی بستی کی جھونپڑیاں' کنواں، جہاں منگو کے بھائی بند پانی نہیں بھر سکتے۔ مڈل اسکول' پرائمری اسکول' منگو نے سوچا۔ میری ساری پرانی زندگی پیچھے کو جارہی ہے صرف میں آگے جارہا ہوں۔ آگے' جہاں بمبئی ہے، وہ شہر جہاں عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں جہاں رلدو، رلیارام کہلاتا ہے اور جہاں پہنچ کر منگو، منگت سنگھ ہوجائے گا۔'' کوئی میری ذات بھی پوچھے گا تو کہہ دوں گا، راجپوت ہوں۔'' اس نے سوچ رکھا تھا۔

اس ریل کے سفر نے نہ صرف منگو کو رہتک سے بمبئی پہنچادیا بلکہ اس کی سمجھ بوجھ کو بھی کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ ریل سے زیادہ اہم منگو کو ریل کا پاخانہ لگا۔ جہاں ایک زنجیر کو کھینچنے سے ہر قسم کی گندگی کو بہادیا جاتا ہے۔ منگو کو ایسا محسوس ہوا کہ اس زنجیر کے ساتھ اس کا اور اس جیسے کروڑوں ہریجنوں کا مستقبل بندھا ہوا ہے۔ اپنے باپ کی بات یاد کر کے اس نے سوچا۔ آج بابا مجھ سے پوچھتے اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو صفائی کا کام کون کرے گا؟ تو میں جواب دیتا۔ ایک پانی کی ٹنکی اور ایک لوہے کی زنجیر یہ کام کرے گی؟ اور ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوت چھات سے آزاد کردے گی۔

بمبئی پہنچ کر رلدو نے کہا۔'' منگو پہلا کام یہ کر کہ دو چار شرٹ پینٹ خرید لے۔ کرافورڈ مارکیٹ میں سلے سلائے کپڑے بکتے ہیں' اگلے دن ہی منگو نے دو ریڈی میڈ قمیض خریدیں اور دو پتلونیں۔ ڈبل دین کی ایک خاکی ایک نیلی پہلے دن ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک دم صاحب لوگ جیسا ہوگیا۔ رلدو کا ایک جان پہچان والا ایک صابن بنانے والی کمپنی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ وہاں منگت سنگھ (یعنی منگو) کو چپراسی کی نوکری بھی مل گئی۔

منگو کو ایسا لگا کہ ایک شرٹ اور ایک پتلون نے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اب وہ ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ چوپاٹی پر راجستھانی چاٹ والوں سے چاٹ لے کر کھاتا۔ بوتل کو منہ لگا کر کوکا کولا پیتا اور کوئی اس سے یہ نہ پوچھتا کیوں بے تو اچھوت تو نہیں ہے؟

پھر جیسے جیسے اس دفتر میں دن گزرنے لگے اس کو آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ شرٹ' شرٹ میں اور پتلون' پتلون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک اس کی ڈھیلی ڈھالی' میلی کچیلی پتلون تھی جو ہفتے میں ایک بار دھلتی تھی، جس کی استری ایک دن بعد غائب ہوجاتی تھی دوسری منیجر صاحب کی پتلون تھی جس کی استری اتنی نکیلی ہوتی تھی جیسے تلوار کی دھار۔ ایک رمیش بابو کی پتلون تھی جو نئے فیشن کے مطابق بندوق کے کندے کی طرح سڈول اور گاودم تھی یہاں تک کہ جوتے تک پہنچتے پہنچتے چوڑی دار پاجامے کی طرح پتلی اور تنگ ہوجاتی تھی اور تو اور ایک چندرا سٹینوگرافر کی پتلون تھی جو چمکیلے اور ملائم کپڑے کی تھی اور جو ہمیشہ ایسی لگتی تھی جیسے ابھی لانڈری سے ڈرائی کلین ہو کر آئی ہو۔

ایک دن منگو نے ہمت کر کے چندر سے پوچھ ہی لیا۔ تمہاری پتلون کی استری اتنے دنوں تک اتنی کڑک کیسے رہتی ہے؟ اور چندر نے بتایا کہ ایک نیا کپڑا ایجاد ہوا ہے جسے ٹیری لین کہتے ہیں، جسے گھر میں دھو سکتے ہیں۔ لانڈری بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جس کی پتلون بغیر استری کئے بھی ایسی لگتی ہے جیسے ابھی دھوبی نے استری کر کے دی ہو اور پھر اپنے دفتر سے چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن تک پیدل جاتے ہوئے منگو حسب معمول راستے کی دکانوں میں سجے ہوئے سامان کو دیکھتا ہوا جارہا تھا کہ اس کی ملاقات'' صاحب'' سے ہوگئی اور اس کو معلوم ہوا کہ ٹیری لین کی پتلون اسی روپے میں مل سکتی ہے۔

اس وقت تک منگو نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی تھی لیکن اس نے سنا تھا کہ جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو سوتے جاگتے ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتا ہے۔ تو پھر ضرور اسے بھی اس میری لین کی پتلون سے محبت ہی ہو گئی ہوگی ورنہ یہ کیا کہ رات کو سوتے ہوئے خواب میں بھی اسے وہی دکھائی دیتی۔ کبھی وہ دیکھتا کہ ایک لق و دق میدان ہے جہاں میری لین کی پتلون بن دھڑ کے آدمی کی طرح بھاگی چلی جارہی ہے اور وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کبھی وہ پتلون ایک نیلے پروں والے پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی ہوا میں اڑ جاتی اور منگو اسے حسرت سے دیکھتا ہی رہ جاتی۔ کبھی پتلون ایک نخریلی لڑکی کی طرح منگو کو اپنی طرف بلاتی مگر جب وہ اس کے پاس جا کر اسے چھونے کی کوشش کرتا، وہ ایک جنگلی ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتی ہوئی دور بھاگ جاتی اور سپنے کے زمین آسمان منگو پر ہنسنے لگتے اور پھر اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ لیٹا سوچتا رہتا کہ کہیں وہ پتلون بک تو نہیں گئی اور وقت سے بھی پہلے ہی وہ دفتر کے لیے روانہ ہو جاتا مگر جب وہ درزی کی دکان کے سامنے پہنچتا تو دیکھتا کہ ''صاحب'' وہاں اسی طرح کھڑا اپنی کانچ کی نیلی نیلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے' اس کے سر پر وہی ہیٹ ہے۔ اس کے بدن پر وہی چارخانے کا کوٹ اور وہی نیلی چمکیلی میری لین کی پتلون ہے اور پتلون پر وہی پرچی لگی ہوئی ہے جس پر لکھا ہے ''میری لین کی پتلون قیمت اسی روپے۔''

اسی روپے منگو نے سنا تھا کہ ان کے دفتر کا بڑا منیجر ایک دن میں اسی روپے کی شراب پی جاتا ہے۔ اسسٹنٹ منیجر مہینے میں اسی روپے کی سگریٹ پھونک دیتا ہے۔ مگر منگو کو تو مہنگائی الاونس ملا کر کل ملتے ہی تھے اسی روپے اس میں سے وہ بیس روپے مہینہ کھولی میں رہنے کا کرایہ دیتا ہے جہاں وہ اور رلدو اور ان جیسے دو اور زمین پر سوتے تھے۔ چال پرانی تھی۔ ایسا لگتا تھا اگلی برسات میں گر جائے گی۔ کھولی اندھیری تھی۔ اتنی چھوٹی کہ چار آدمی جب سوتے تھے تو اس طرح کہ ایک کی ٹانگیں دوسرے کے سر سے ٹکراتی تھیں مگر کنویں سے پانی بھر کے لانا نہیں پڑتا تھا۔ کھولی کے ایک کونے میں موری تھی جہاں پانی کا نل لگا ہوا تھا۔ برآمدے کے پرلے کنارے پر دو پاخانے تھے۔ ان کی صفائی کے لیے ہریجن بھنگی ٹوکرا جھاڑو لئے نہیں آتے تھے۔ پانی کی ٹنکی لگی تھی اور اس میں ایک زنجیر۔ زنجیر کھینچتے ہی پانی کا ایک ریلا آتا تھا اور گندگی کو بہا کر لے جاتا تھا اور منگو کو ایسا لگتا تھا وہ پانی کا ریلا ساتھ میں اس گندگی کو بھی بہا کر لے جاتا ہے جو منگو کی ساری جاتی پر ہزاروں برس سے لگی ہوئی تھی۔ اور اس کو چال میں صرف سونے کی جگہ کے بیس روپے مہینہ دینا منظور تھا مگر دس روپے مہینہ پر کسی جھونپڑی میں رہنا منظور نہیں تھا کیونکہ وہاں پاخانے میں پانی کی ٹنکی اور زنجیر لگی ہوئی نہیں تھی۔

سو اسی روپے میں سے بیس روپے کرائے کے دیتا' ساڑھے سات روپے مہینے کا اس کا ریلوے پاس تھا' ڈیڑھ روپیہ روز کھانے پر بھی لگتا تھا۔ مشکل سے اتنا بچتا تھا کہ وہ مہینے میں ایک بار کوئی فلم دیکھ سکے۔ اب اسی روپے کی میری لین کی پتلون خریدے تو کیسے خریدے؟ سو اس نے تنخواہ ملتے ہی سیونگ بینک میں حساب کھول لیا اور فیصلہ کرلیا کہ ہر مہینے بیس روپے مہینہ بچا کر اس میں ضرور ڈالے گا۔ سینما جانا اس نے بالکل بند کر دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بجائے کبھی وہ کیلے، کبھی ڈبل روٹی کھا کر ایک پیالی چائے پی لیتا۔ دفتر سے کہیں کام پر جانے کے لیے بس کا کرایہ ملتا تو وہ پیدل جاتا آتا اور کرائے کے پیسے بچا کر سیونگ بینک میں ڈال دیتا۔

ابھی بینک میں ساٹھ روپے ہی جمع ہوئے تھے کہ میری لین کی پتلون خریدنا اور بھی ضروری ہو گیا۔ ان کے دفتر میں ایک نئی اسٹینو گرافر آئی تھی۔ مس کملا راٹھور' جو منگو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ دبلی پتلی سانولی۔ مگر اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں اور اس کے سینے پر پڑی

ہوئی دو چوٹیاں، جن پر کبھی گلابی کبھی نیلے ربن بندھے ہوتے تھے، منگو کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ کملا کی پتلی لمبی انگلیوں میں جادو تھا۔ وہ ٹائپ رائٹر پر بجلی کی رفتار سے چلتی تھیں۔ منگو جب بھی کام سے خالی ہوتا وہ اپنے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا کملا کو ٹائپ کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا اسٹول جس کونے میں تھا وہ کملا کی ٹیبل سے دور نہیں تھا لیکن پھر بھی ہر روز منگو اس کو دو چار انچ اور سرکا لیتا تھا یہاں تک کہ اب وہ اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا نہ صرف کملا کو دیکھ سکتا تھا بلکہ اس کی بھینی بھینی خوشبو کو بھی سونگھ سکتا تھا۔ جس میں لکس ٹائلٹ سوپ اور کسی پاوڈر کے علاوہ جوانی کے پسینے کی سگندھ بھی شامل تھی۔ ایک دن کملا نے ٹائپ رائٹر کی مشین میں سے کاغذ نکالتے ہوئے گھنٹی بجائی تو منگو لپک کر اٹھا۔ ''یہ چٹھی اندر صاحب کو دیدو۔'' کملا نے کاغذ پکڑاتے ہوئے منگو سے کہا۔ کاغذ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گئے تو ان کی انگلیاں چھو گئیں اور منگو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے بدن میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

دفتر میں ایک بوڑھا ہیڈ چپراسی تھا جو حوالدار کہلاتا تھا۔ ایک دن اس نے منگو کو الگ لے جا کر کہا۔ ''بیٹا منگت۔ یہ تیری نجر کدھر پھسل رہی ہے بیٹا؟ تجھ سے عمر میں کم سے کم چھ برس بڑی ہے۔''

منگو نے سوچا۔ یہ بڈھا جوانی سے جلتا ہے۔ مجھے تو کملا اتنی بڑی نہیں لگتی۔ مجھ سے بڑی ہوتی تو اس کو دیکھ کر میرا دل کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے؟

پھر ایک دن جب دفتر کے سب لوگ لنچ کی چھٹی میں آس پاس کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں میں گئے ہوئے تھے منگو نے دیکھا کملا اپنی میز پر ہی بیٹھی ایک کاغذ کے پیکٹ میں سے پوری بھاجی نکال کر کھا رہی ہے۔ منگو اپنے اسٹول پر ہی بیٹھا ڈبل روٹی اور کیلے کھا رہا تھا اس نے کملا کی طرف دیکھ کر کہا ''کیوں جی آپ کھانا گھر سے لاتی ہیں؟''

کملا نے کھاتے کھاتے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔

''یہ کیلا کھائیں گی؟''

کملا پہلے تو ہچکچائی پھر مسکرا کر اس نے کیلا لے لیا۔

''تم پوری کھاؤ گے؟''

''کھالوں گا جی۔''

دو پوریوں پر بھاجی رکھتے ہوئے کملا نے پوچھا۔ ''چھوت چھات کا خیال تو نہیں ہے؟'' اور جب منگو نے سہلا کر ''نہیں'' کہا تو کملا بولی۔ ''کون جات ہو؟'' اس سوال کے لیے تو منگو تیار ہی رہتا تھا۔ کھٹ سے اس نے جواب دیا ''راجپوت۔''

''بہت اچھا'' کملا نے جواب دیا۔ ''ہم بھی راجپوت ہیں۔ لو پوری کھاؤ۔''

ابھی کملا سے منگو کی بات چیت کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ایک دن اتوار کو رلدو، منگو کو جوہو لے گیا۔ ''جوہو بڑی خوبصورت جگہ ہے'' رلدو نے کہا ''اور پھر وہاں میرے سگے والے رہتے ہیں۔ کھانا بھی وہیں کھائیں گے؟''

منگو کو اتنے مہینے بمبئی میں رہتے ہو گئے تھے لیکن اس نے اب تک جوہو کی سیر نہیں کی تھی۔ دیکھا تو خوش ہو گیا۔ سمندر کا کنارہ، نرم نرم ریت، اونچے اونچے ناریل کے پیڑ، بھیل پوری والوں کی دوکانیں، رنگین ساڑھیاں، شلوار قمیص والیوں کے ہوا میں لہراتے ہوئے دوپٹے۔ منگو

نے سوچا ایک دن کملا کو جوہو کی سیر کرانی چاہیے۔

جوہو ہوٹل اور سن اینڈ سینڈ ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ ناریلوں کے جھنڈ میں ایک دو منزل کی بلڈنگ نظر آئی۔ رلدو نے کہا: ''وہاں ہمارے سگے والے رہتے ہیں''

پہلے تو منگو نے سوچا۔ ''رلدو کے سگے والے رہتے ہیں' ہے تو بڑی خوبصورت جگہ۔'' بلڈنگ بھی پکی تھی اور ان کی چال کی طرح پرانی اور بوسیدہ نہیں تھی۔ مگر باہر ناریلوں کے جھنڈ میں تین بڑی بڑی موٹریں کھڑی تھیں، دو بند اور ایک کھلی ہوئی مگر تینوں میں سے بڑی بدبو آ رہی تھی جیسے دنیا بھر کی گندگی ان ٹرکوں میں بھری ہوئی۔ جب وہ ان کے پاس سے گزرے تو منگو نے دیکھا کہ کھلی ہوئی ٹرک گندے بدبودار کچرے سے بھری ہوئی ہے۔ ایک کالا صاڈبلا سا آدمی اور آل پہنے اس کے پاس کھڑا ہوا بیڑی پی رہا ہے۔

منگو نے پوچھا۔ ''یہاں کون رہتا ہے؟''

رلدو نے کہا۔ ''یہاں ہم رہتے ہیں۔''

یہ بلڈنگ میونسپل کارپوریشن کی بنائی ہوئی تھی، پکی بلڈنگ۔ ناریلوں کے جھنڈ میں سمندر کے کنارے بڑی خوبصورت جگہ۔ منگو کو رلدو نے بتایا کہ یہاں میونسپلٹی کے محکمہ صفائی کے مزدور رہتے ہیں یعنی بھنگی۔ ''ہمارے تمہارے جیسے ہریجن۔''

''مگر'' منگو نے حیرت سے پوچھا۔ ''اب تو صفائی کا کام مشینوں سے ہوتا ہے۔ ہر گھر کے پاخانے میں گندگی بہانے کو پانی کی ٹنکی اور زنجیر لگی ہے اب تو یہ کام کوئی بھی کر سکتا ہے؟''

رلدو نے منگو کو ایسے دیکھا جیسے وہ اسے پاگل سمجھتا ہو۔ ''منگو یہ کام ہمارے سوا اور کوئی نہیں کرتا' اور کوئی نہیں کر سکتا۔ گندے گٹروں کے اندر ہمارے سوا اور کون گھسے گا۔ سڑک کے کنارے پڑے مرے ہوئے چوہے کون اٹھائے گا؟ جھاڑو کون دے گا؟ سارے شہر کے کوڑے کے ڈھیروں کو ٹرکوں میں ڈال کر کوڑی گاہ ڈالنے جائے گا؟ سوائے ان کے جن کے باپ دادا نے سینکڑوں برس سے یہی کام کیا ہے۔''

منگو نے کہا: ''پھر تو ہم وہیں کے وہیں ہیں' سوائے اس کے کہ پہلے کوڑے کرکٹ کو ٹوکروں میں اٹھاتے تھے اب ٹرک میں بھر کر لے جاتے ہیں۔''

رلدو نے کہا ''منگو بیٹا یہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ تُو نے کبھی کوڑے کا ٹوکرا نہیں اٹھایا اس لیے تو نہیں جانتا ٹرک چلانا کتنی بڑی بات ہے۔''

اتنی دیر میں وہ دبلا سا سوکھا آدمی، جو میلا اوور آل پہنے کھڑا تھا اس نے اپنی بیڑی زمین پر پھینکی' کود کر ٹرک میں چڑھا' دھڑ سے دروازہ بند کیا اور بڑے زور سے انجن کو اسٹارٹ کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گندگی سے بھرے ٹرک پر نہیں راجہ جی کے ہاتھی پر بیٹھا ہو۔

اب وہ بلڈنگ کے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ منگو نے سوچا، ہے یہ بھی بھنگیوں کی بستی مگر ہماری حصار والی جھونپڑیوں سے تو بہتر ہے۔ چھوٹے چھوٹے مگر صاف ستھرے کمرے تھے۔ رلدو نے بتایا میونسپلٹی کرایہ بھی بہت کم لیتی ہے صرف چھ روپے مہینہ۔ برآمدے میں لٹکے ہوئے گملوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھول شاید خوشبودار بھی تھے مگر نیچے کھڑے ہوئے ٹرک کی پھیلی ہوئی بدبو میں ان پھولوں کی خوشبو دبی ہوئی تھی۔

رلدو نے منگو کو اپنے سگے والے سے ملایا۔ منسارام کو دیکھ کر منگو کو اپنا باپ یاد آ گیا۔ چہرے پر ویسے ہی زندگی بھر کی محنت کی گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں، اُسی طرح بڑھاپے سے کمر جھکی ہوئی تھی۔ منسارام ایک کمرے میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی بازار گئی ہوئی تھی۔ بیٹی کونے میں بیٹھی ہوئی اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ ''اری او منگتی۔ ادھر آ مہمان آئے ہیں۔ چائے بنا لے۔'' لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی تو منگو نے دیکھا پندرہ سولہ برس کی سانولی سی لڑکی ہے۔ گھر کا دھلا ہوا اسکول کی یونیفارم کا نیلا فراک پہنے ہوئے وہ بالکل بچی لگتی تھی۔

''اری رلدو کاکا کو تو پہچانتی ہے نا اور یہ منگو بھی اپنے حصار کا ہی ہے اپنی برادری کا۔''

منگتی نے دونوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور منگو کی ہمت نہیں ہوئی کہ منسارام سے کہے ''بھئی میں میرا نام منگو نہیں ہے۔ منگت سنگھ ہے۔'' کیونکہ پھر یہ بھی کہنا پڑتا۔ ''میں تمہاری برادری سے نہیں ہوں منسارام جی۔''

منگتی چائے بنانے کے لیے تیل کا چولہا جلا رہی تھی اور منسارام بیٹی کی تعریف کیے جا رہا تھا۔ ''چھٹی کلاس میں پڑھتی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے۔ سب کے خط پتر یہی پڑھ کر سناتی ہے۔ ہندی کی کتنی ہی کویتائیں تو منہ زبانی یاد ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اسکول کی ماسٹرنی تو کہتی ہے اسے میٹرک تک پڑھاؤ مگر رلدو بھیا تو ہی بتا چھوکری اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرے گی۔ اس کی ماں تو کہتی ہے اب کی دیوالی پر اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔''

اور یہ کہہ کر نہ جانے کیوں منسارام نے منگو کی طرف دیکھا اور منگو نے منگتی کی طرف اور منگتی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چاے کی پیالیاں آپ سے آپ کھنکنے لگیں اور پیالی منگو کو پکڑاتے ہی وہ بھاگ گئی۔

واپسی میں وہ بس اسٹینڈ پر پہنچے تو دیکھا بڑا لمبا کیو لگا ہوا ہے۔ اتوار کے دن جوہو پر بڑی بھیڑ ہوتی ہے اور شام ہوتے ہی سب شہر لوٹنے کی سوچتے ہیں۔

منگو نے کہا۔ ''رلدو کاکا۔ آج تو پھنس گئے کم سے کم تین بسوں کے بعد اپنا نمبر آئے گا۔''

اتنے میں بدبو کے ایک بھبکے کے ساتھ ایک کچرے کی ٹرک آ کر بس اسٹینڈ کے سامنے کھڑی ہوگئی، جس کو دیکھتے ہی کتنے ہی آدمیوں نے اپنی اپنی ناک بند کر لی۔ ایک میم صاحب نے سینٹ لگا رومال اپنی ناک کے آگے ہلانا شروع کر دیا۔

''اے ڈرائیور۔ یہ کچرا گاڑی یہاں سے ہٹاؤ۔''

ڈرائیور جو ایک ہٹا کٹا جوان تھا اور اوورآل کو اس شان سے پہنے تھا جیسے وہ ملٹری کی یونیفارم ہو اپنے دانت چمکاتے ہوئے بولا ''ارے تو اس کچرے کے ڈھیر کو تمہارا باپ اٹھائے گا یہاں سے؟''

اور جب تک کچرا ٹرک میں نہیں بھر اگیا وہ ٹرک وہیں کھڑی رہی اور میم صاحب کی ناک کے سامنے سینٹ بھرا رومال جھولتا رہا۔ یہاں تک کہ سینٹ ہوا میں اڑ گیا اور صرف کچرے کی بُو رہ گئی۔

ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈرائیور نے رلدو سے پوچھا۔ ''کیوں کاکا کہو تو ریل تک چھوڑ دوں۔''

رلدو نے منگو کی طرف دیکھا۔ منگو نے لمبے کیو کو دیکھا' پھر وہ دونوں ٹرک میں ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئے۔ ٹرک روانہ ہوگئی اور تب میم صاحب رومال بیگ میں واپس رکھتے ہوئے بولیں: ''ان بھنگی لوگوں کا بھی کتنا دماغ ہوگیا ہے۔''

اگلے دن منگو دفتر جانے سے پہلے خوب صابن سے رگڑ رگڑ کر نہایا' پھر دھوبی کے دھلے کپڑے پہنے' مگر پھر بھی جب وہ دفتر میں پہنچا اور کملا نے اس کی طرف مسکرا کر دھیرے سے کہا ''ہیلو'' تو بڑی دیر تک وہ کملا کی میز سے دور ہی دور رہا کہ کہیں اب تک اس میں کچرا گاڑی کی بو تو نہیں سمائی ہوئی ہے اور دل ہی دل میں وہ سوچتا رہا۔ ''اگر کبھی کملا نے وہ بدبو سونگھ لی تو پھر کبھی مجھ سے مسکرا کر بات نہیں کرے گی۔''

چند روز کے بعد رلدو نے پوچھا۔ ''کیوں' منگو منگتی کیسی لگی؟''

''کون' وہ منسارام جی کی چھوکری؟ ٹھیک ہی ہے۔''

''منگو اور منگتی۔ تمہاری جوڑی اچھی رہے گی نا؟''

منگو کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ''مگر بیٹی تو بھنگی کی ہے؟''

رلدو کو پہلے تو ایسا لگا جیسے منگو نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہو۔ پھر وہ غصے کو پی کر بولا ''اور تو کس کا بیٹا ہے؟''

''کچھ بھی ہو کاکا، میں بھنگیوں میں بیاہ نہیں کروں گا۔'' اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھولی سے باہر نکل گیا۔ سیڑھیوں سے اترتا ہوا چال سے باہر نکل گیا۔ نہ جانے کب تک سڑکوں پر گھومتا رہا۔ تھک کر ٹھہرا تو دیکھا شیشے کی دیوار کے پیچھے ''صاحب'' ٹیری لین کی پتلون پہنے کھڑا مسکرا رہا ہے' شاید اسے بلا رہا ہے' کچھ یاد دلا رہا ہے۔

منگو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیونگ بینک کی کتاب نکالی۔ اب اس کے حساب میں پچھتر روپے جمع ہو چکے تھے اس نے سوچا: ''صرف پانچ روپے کی کسر ہے۔''

دوپہر کو دفتر کی سب میزیں خالی پڑی تھیں۔ صرف کملا اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ منگو دفتر کی کینٹین سے چائے لے کر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیالی تھی جو اس نے کملا کے سامنے رکھ دی۔

''تھینک یو'' کہہ کر کملا چائے پینے لگی تو منگو نے ایک اخبار جیب سے نکالا اور کملا کی طرف دیکھے بغیر ہی بولا:

''ناز میں ''آؤ پیار کریں''۔''

''سنا ہے اچھی مزیدار فلم ہے۔''

''اس اتوار کو دیکھنے چلو گی؟''

''پتا جی سے پوچھنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ہاں کہی تو جا سکتی ہوں۔''

''پھر پوچھ کر کل بتانا۔''

اگلے دن کملا نے منگو سے کہا۔ ''اتوار کو تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔''

''اور فلم دیکھنے نہیں چلو گی؟''

''پہلے پتا جی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''تو میں ساڑھے چار بجے آ جاؤں گا۔ تمہارے پتا جی سے آگیا کر چھ بجے سینما پہنچ سکتے ہیں۔''

اگلے دن منگو نے بینک سے پچھتر روپے نکال لئے۔ پندرہ روپے دفتر کے کیشئر سے ایڈوانس لیے۔

کام ختم ہوتے ہی وہ چرچ گیٹ اسٹریٹ کی طرف بھاگا۔

شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑا ''صاحب'' اپنی نیلی کانچ کی آنکھوں سے اب بھی گھور رہا تھا۔

لیکن آج ان کے درمیان یہ شیشے کی دیوار نہیں رہے گی۔ منگو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرارے نوٹوں کو چھو کر اطمینان کیا اور پھر دکان میں داخل ہو گیا۔

''مجھے ٹیری لین کی پتلون چاہیے۔''

''کپڑا پسند کر لیجئے۔''

''بس وہ چاہیے ریڈی میڈ جو صاحب پہنے ہوئے ہے۔''

''صاحب۔ اوہ وہ ڈمی کو جو پہنائی ہوئی ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔ آپ فٹنگ روم میں جایئے ٹرائی کر لیجئے۔''

درزی پتلون لے آیا۔۔ پہننے سے پہلے منگو نے کپڑے کو چھو کر دیکھا۔ سچ مچ بڑا ملائم تھا۔ اپنی خاکی ڈبل زین کی پتلون اتار کر اس نے نئی پتلون پہن کر دیکھی۔ بالکل فٹ۔

جیسے بچ۔ جیسے زپ۔ ویسے ہی فٹ!

— جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو چکنی سلک کے استر پر ہاتھ پھسل گیا۔ واہ واہ اس نے سوچا۔ کیا پتلون ہے۔

درزی نے کہا۔ ''صاحب۔ آئینے میں دیکھ لیجئے ایسا لگتا ہے آپ کے لیے ہی سلی ہے۔''

منگو نے آئینہ دیکھا تو وہاں حصار کے بھنگی واڑے والے منگو کے بجائے ایک کالے بالوں' سانولی رنگت کا صاحب کھڑا تھا۔ جس کی ٹانگوں میں نیلی ٹیری لین کی پتلون تھی۔ پتلون پر کاغذ کی پرچی لگی ہوئی تھی۔ ٹیری لین کی پتلون۔ قیمت اسی روپے۔ اب مجھ میں اور صاحب میں فرق بھی کیا ہے؟

اس نے درزی سے کہا۔ ''یہ لیجئے اسی روپے اور پتلون کو کاغذ میں لپیٹ دیجئے۔''

کاغذ کے تھیلے میں ٹیری لین کی پتلون لئے منگو باہر نکلا تو ایسا لگا اتنی دیر میں دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہی چرچ گیٹ اسٹریٹ ہے مگر آج چہل پہل ہی الگ ہے۔ ہر آدمی خوش دکھائی دیا۔ ہر عورت خوبصورت۔ فلورا فاؤنٹین کے فوارے چل رہے تھے۔ دور سمندر کی طرف آسمان پر رنگ برنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور سڑکوں کی نیلی نیلی روشنیاں ایک ایک کر کے جلتی جا رہی تھیں۔ اب وہ خود بھی تو بدل گیا تھا۔ اب نہ وہ ایک بھنگی کا چھوکرا تھا۔ جس کو اسکول میں سب سے الگ ٹاٹ پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ نہ وہ ماڈرن سوئس کمپنی لمیٹڈ کے ہیڈ آفس کا آفس بوائے یعنی چپڑاسی تھا۔ اب وہ مسٹر منگت سنگھ تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک بڑا موٹے کاغذ کا تھیلا تھا جس پر ایک بہت بڑی درزی کی دکان کا نام اور پتہ چھپا ہوا تھا اور اس کاغذ کے تھیلے میں ایک ٹیری لین کی پتلون تھی۔

اس رات کو منگو کو کتنی ہی دیر نیند نہ آئی۔ وہ لیٹا لیٹا اپنی ٹیری لین کی پتلون کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ساتھ شرٹ بھی بڑھیا ہونی چاہیے اور جوتا بھی نیا ہو تو اچھا ہے، پھر وہ یہ سب پہن کر کملا کے گھر جائے گا۔ اس کے پتا سے ملے گا تو وہ بھی اس کے کپڑے دیکھ کر مان جائیں گے۔ لڑکا ضرور کسی بڑے اونچے گھرانے کا ہے۔ فوراً بیٹی کو اس کے ساتھ سینما جانے کی اجازت دے دیں گے۔ پہلے دو چار مہینے وہ دونوں سینما یا

شام کو اکٹھے جایا کریں گے پھر ایک دن سارا اتوار جوہو پر گزاریں گے۔ سمندر کی لہروں میں ڈبکیاں لگائیں گے۔ ناریل کا پانی پئیں گے اور مسالے دار چاٹ کھائیں گے اور شام کو جوہو ہوٹل یا سن اینڈ سینڈ میں چائے پئیں گے' پھر ٹیکسی لے کر واپس ہوں گے اور راستے میں منگو، کملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے گا۔ کملا کیا تم میری۔۔۔؟''

مگر اس وقت تک وہ سوچ چکا تھا اور خواب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی ٹیری لین کی پتلون ایک نیلے رنگ کا ہوائی جہاز بن گئی ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر نیلے آسمان پر اڑتا ہوا کملا کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

اتوار کو ٹھیک ساڑھے چار بجے اپنے نئے بوٹ چرمراتا ہوا منگو کملا کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر کملا کے پتا کے نام کی تختی تھی اور ساتھ میں گھنٹی بھی لگی تھی۔ کملا کے پتا جی نے خود دروازہ کھولا تو دیکھا ایک کسی قدر گھبرایا ہوا سا مگر اچھی صورت شکل کا بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنے نوجوان باہر کھڑا ہے۔

''جی وہ مجھے مس کملا نے۔''

آؤ بھئی آؤ اندر آؤ۔ کملا تیار ہو رہی ہے۔ تم ادھر بیٹھو۔''

چھوٹی سی فلیٹ تھی اور اس کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ وہیں کملا کے پتا نے منگو کو بٹھایا۔

منگو اپنی نئی ٹیری لین کی پتلون کی سلوٹ کو سنبھالتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کملا کے پتا جی غور سے اس کے منہ کو دیکھ رہے تھے اور منگو سوچ رہا تھا یہ بڑے میاں میری ٹیری لین کی پتلون کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔

''کہو بھئی تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی منگت سنگھ''

''سنگھ، تو تم بھی راجپوت ہو کیا؟''

''جی ہاں ہم راجپوت ہی ہیں۔''

''چندر بنسی یا سورج بنسی۔''

منگو یہ سوال سن کر بوکھلا گیا۔ پھر بات بناتے ہوئے اس نے کہا۔ ''جی یہ سب تو پتا جی کو معلوم تھا۔''

''تمہارے پتا گزر گئے ہیں کیا؟''

''جی ایک برس ہوئے ان کا دیہانت ہو گیا۔''

''بڑا افسوس ہے کیا کام کرتے تھے تمہارے پتا جی؟''

''منگو نے اس سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جلدی سے بولا:''

''جی وہ میونسپل کمیٹی میں نوکر تھے۔''

''تم کیا کرتے ہو؟''

''جی میں اسی دفتر میں کام کرتا ہوں جہاں کملا۔ مس کملا جی۔۔۔''

''ہاں مگر کیا کام کرتے ہو؟ تم بھی اسٹینوگرافر ہو؟''

''جی نہیں۔ اسٹینوگرافر تو نہیں۔''

''پھر کیا معمولی کلرک ہو؟'' کملا کے پتا جی کی آواز میں ایک عجیب سے برفیلی ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔

''جی نہیں کلرک بھی نہیں ہوں۔ بات یہ کہ میں تو ابھی۔۔ آفس بوائے ہوں۔''

''آفس بوائے؟ یعنی چپراسی۔''

''جی یہی سمجھئے مگر ہمیں آفس بوائے ہی بولتے ہیں۔''

''پگھار کیا ملتی ہے؟''

''اسی روپئے'' منگو نے جواب دیا۔ مگر اس کا جی چاہتا تھا کہ بڑے میاں اسی روپئے تنخواہ ملتی ہے تو کیا ہے میرا دل کتنا بڑا ہے یہ تو دیکھو۔ میری اسی روپئے کی ٹیری لین کی پتلون کو غور سے دیکھو، کسی بھی صاحب سے کم نہیں ہوں۔ آج اسی روپے ملتے ہیں تو کیا ہوا کل دیکھو کتنی ترقی کرتا ہوں۔

''ہوں!'' کملا کے پتانے برف سے بھی ٹھنڈی آواز میں کہا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں کملا اکیلی باہر آئی۔ نائلون کی نیلی ساڑھی پہنے۔ بالوں میں نیلے ربن لگے، بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ منگو کا جی چاہا۔ کہے ''کملا دیکھو۔ تمہاری نیلی ساڑھی اور نیلے ربن کی طرح میری ٹیری لین کی پتلون بھی نیلی ہے!'' لیکن کملا کی آنکھوں کا سرمہ گالوں کے پاؤڈر پر پھیل رہا تھا اور گلابی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی رو کر آنسو پونچھے ہیں۔

''سوری منگو'' وہ بولی۔ ''پتا جی سینما جانے کو منع کر رہے ہیں۔ تم جاؤ۔''

منگو دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اندر سے کچھ سن کر ٹھٹک گیا۔ اندر کملا کے ماتا پتا جھگڑ رہے تھے اور ان کی آوازیں دروازے کے باہر بھی منگو کا پیچھا کرتی رہیں۔

ماں کہہ رہی تھی۔ ''مجھے تو لڑکا ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے ہے۔ مگر تمہیں تو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ چوبیس برس کی تو ہوگئی۔ عمر بھر کنواری بٹھائے رکھو گے کیا؟''

اور باپ کہہ رہا تھا'' کنواری بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ میں اسی روپلی پانے والے چپراسی سے تو اپنی لڑکی نہیں بیاہ سکتا!''

سڑک پر نکل کر منگو نے پتلون کی ریشمی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ''آؤ پیار کریں'' کے دونوں ٹکٹ نکال کر پھاڑ ڈالے۔

ابھی اسٹیشن کی طرف جانے کے لیے سڑک پر مڑا ہی تھا کہ ایک بدبو کا بھپکا آیا اور ایک کچرے کی ٹرک پاس سے گزر گئی۔ منگو نے سوچا، اس نئی ٹیری لین کی پتلون کے باوجود میرے اندر کوئی بدبو بسی ہوئی ہے کیونکہ کملا کے پتانے اسے سونگھ کر مجھے باہر نکال دیا۔

اسٹیشن پر چائے کی دکان پر کھڑے ہوئے اس نے سامنے لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ بالکل صاحب لگتا ہوں، آسمانی رنگ کی دس روپے کی شرٹ، اسی روپے کی ٹیری لین کی پتلون، مجھ میں کیا برائی نظر آئی؟

اسی روپے! اسی روپے کی پتلون! اسی روپے پگھار! جات پات کی گندگی کو تو زنجیر کھینچنے سے پانی کا ریلا بہا کر لے گیا' لیکن اس

روپے پگھار کے کلنک کو کون سا گنگا جل دھو سکتا ہے؟ چائے پی کر پیالی واپس کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ بمبئی میں چائے دیتے وقت کوئی جات پات نہیں پوچھتا، لیکن بیٹی کو کسی چھوکرے کے ساتھ سینما بھیجنے سے پہلے جات پات بھی پوچھتے ہیں اور پگھار بھی۔

اگلے اتوار کو سانتا کروز سے جوہو، بس میں جاتے ہوئے منگو نے دیکھا لیڈو سینما میں بھی ''آؤ پیار کریں'' چل رہی ہے۔

منسارام نے منگو کو دیکھا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''آؤ بیٹا۔ بڑے دنوں کے بعد آئے ہو۔ منگتی کی ماں، یہ اپنا منگو ہے۔ اے منگتی مہمان آیا ہے، ذرا چائے تو بنا لے۔''

''چائے رہنے دیجئے میں تو سینما جا رہا تھا سوچا آپ لوگوں سے پوچھ لوں۔ چلیں گے آپ؟'' یہ کہہ کر اس نے ایک لہراتی ہوئی نظر منگتی کی طرف ڈالی۔

''بیٹا ہم بڈھے لوگ کیا سینما و۔نما جائیں گے۔''

''یہیں جوہو کے لیڈو میں بڑی اچھی فلم چل رہی ہے۔''

''پاس میں ہی ہے تو منگتی چلی جائے گی۔ اے منگتی جلدی سے کپڑے بدل لے۔''

منگو کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ اندر منگتی کے ماں باپ کھسر پھسر کر رہے تھے۔

''۔۔۔۔۔ برادری والے کیا کہیں گے۔۔۔''

''ارے یہ نیا جمانہ ہے۔ رلدو کہے ہے چھوکرا سریف ہے۔ پھر اپنی برادری کا ہے۔''

''۔۔۔ اری سینما جا رہی ہے تو یہ نہیں، وہ نئی والی ساڑھی پہن۔''

منگتی کپڑے بدل کر آئی تو منگو نے دیکھا کہ ساڑھی پہنتے ہی منگتی جوان ہو گئی۔ ساڑھی، سستی نقلی سلک کی تھی، لیکن نیلی تھی اور منگتی کے گدرائے ہوئے جسم پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

جوہو کی سڑک پر اور سمندر کے کنارے سینکڑوں نوجوان جوڑے چلے جا رہے تھے۔ لڑکے سوٹ پہنے تھے، کرتا پاجامہ پہنے تھے۔ لڑکیاں ساڑھیاں پہنے تھیں، شلوار قمیص، کرتا چوڑی دار پاجامہ پہنے تھیں، سب خوش تھے، سب خوبصورت تھے۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

ان میں ایک سانولا سا نوجوان تھا، جو نیلے رنگ کی ٹیری لین کی پتلون اور نئے چرمر کرتے ہوئے جوتے پہنے تھا اور اس کے ساتھ نیلی ساڑھی پہنے ایک شرمیلی سی سولہ سترہ سالہ لڑکی تھی جو بات کرتے بھی گھبرا رہی تھی۔

''کیوں جی'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ''ہم کون سی فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔''

منگو نے جواب دیا۔ ''آؤ پیار کریں''۔

○

عصمت چغتائی

نام	:	عصمت خانم
قلمی نام	:	عصمت شاہد لطیف/عصمت چغتائی
پیدائش	:	۲۱۔ اگست ۱۹۱۵ء بہ مقام بدایوں بھارت
وفات	:	۲۴۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء بہ مقام ممبئی
تعلیم	:	بی۔ اے، بی۔ ٹی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ابتدائی تعلیم آگرہ میں پائی، بی۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی اور بی۔ ٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران کچھ مدت تاریخ اور انگریزی اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے پڑھی۔ جودھ پور میں عظیم بیگ چغتائی کے ہاں قیام کے دوران قرآن اور حدیث کے مطالعہ کے دوران بھائی سے مدد لی۔

مختصر حالات زندگی:

عصمت کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی پولیس آفیسر تھے، جنھوں نے پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عصمت، دس بہن بھائیوں میں نویں نمبر پر تھیں۔ اس لیے بچپن میں بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ بڑی بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ محلّہ پنجہ شاہی، آگرہ کی گلیوں میں لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے اور چھت پر چڑھ کر پتنگ اڑانے کے دنوں میں پہلی بار اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے انہیں علی گڑھ کی فضا راس آئی۔ بڑے بھائی مرزا عظیم چغتائی کی زیر نگرانی بچپن میں ہی ٹامس ہارڈی، حجاب اسماعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کو گھول کر پی لیا۔

میٹرک کے بعد چار برس تک نصاب کی کتابیں مجبوراً پڑھیں، لیکن اس وقت تک شیکسپیئر، ابسن اور جارج برنارڈ شا کو حفظ کر چکی تھیں، جو بی۔ اے میں کام آیا۔ لڑکپن میں حجاب اسماعیل سے متاثر تھیں اور جوانی میں ڈاکٹر رشید جہاں کی چیلی کہلائیں۔ بی۔ ٹی کرنے کے دوران فلم ساز

شاہد لطیف سے جان پہچان ہوئی۔ ابتدا میں ریاست جاورہ کے ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہیں۔

۱۹۳۷ء میں اسلامیہ ہائی سکول (برائے خواتین) بریلی کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ بطور انسپکٹر آف سکولز بمبئی میں ملازمت کی۔ ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ آف میونسپل اسکولز کا عہدہ سنبھالا۔ ۲ مئی ۱۹۴۲ء میں شاہد لطیف سے شادی ہوئی، جن کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ شاہد لطیف سے اولاد، دو بیٹیاں: سیما اور سبرینہ۔ کچھ مدت پونا میں قیام کرنے کے بعد بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب فلم کے لیے اسکرپٹ نویسی اور تصنیف و تالیف کو ذریعۂ روزگار بنایا۔ ۱۹۴۳ء میں پروڈیوسر کے۔ آصف کے لیے پہلی فلم ''چھیڑ چھاڑ'' لکھی تھی۔ بطور رائٹر، ناول ''ضدی'' لکھنے پر ۱۹۴۱ء میں رائلٹی ایک سو روپیہ ملی۔ فلم ''گرم ہوا'' (۱۹۷۳ء) اور ''جنون'' (۱۹۷۹ء) کو ملا کر مجموعی طور پر لگ بھگ تیرہ فلمیں لکھیں۔ فلم ''جنون'' میں اداکاری بھی کی۔ معمولی شکل و شباہت کی گول مٹول عصمت چغتائی کی ایک آنکھ قدرے چھوٹی تھی۔ مزاج کی تیز اور ہٹ دھرم عصمت، تاش، سگریٹ اور شراب کی رسیا تھیں۔ بعد از موت جلا دینے کی وصیت کی تھی۔ وصیت کی تعمیل میں انہیں ۲۴ اکتوبر کو بمبئی کے چندن واڑی میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

''فسادی'' (ڈراما) مطبوعہ: ''ساقی'' دہلی، جنوری ۱۹۳۸ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''بچپن'' مطبوعہ: ''ساقی'' دہلی، ۱۹۳۸ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''کلیاں'' (افسانے)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۰ء
	مقدمہ: صلاح الدین احمد	طبع دوم: آئینہ ادب، لاہور، ایک ایڈیشن اردو اکیڈمی، سندھ کراچی نے بھی شائع کیا۔	
۲۔	''چوٹیں'' (افسانے۔ ڈراما۔ خاکے)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
		طبع دوم: اردو اکیڈمی سندھ کراچی،	
		طبع سوم: آئینہ ادب، لاہور	
۳۔	''ایک بات'' (افسانے)	مکتبہ اردو سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
		طبع دوم: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور	
۴۔	''چھوئی موئی'' (افسانے)	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۵۲ء
۵۔	''دو ہاتھ'' (افسانے)	طبع اوّل: شیش محل کتاب گھر، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۶۔	''دوزخی'' (خاکے)	نیا ادارہ، سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل:

۷۔	''شیطان'' (ڈرامے)	نیا ادارہ، سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۵ء
۸۔	''کنواری'' (ہندی افسانے)		
۹۔	''ہم لوگ'' (خاکے)	طبع اوّل: رفعت پبلشرز، لاہور	طبع اوّل:
۱۰۔	''زہر'' (افسانے)		
۱۱۔	''پہلی لڑکی'' (افسانے)		
۱۲۔	''دھانی بانکیں'' (ڈرامے)		طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
۱۳۔	''ضدی'' (ناول)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۲ء
	یہ ناول اردو اکیڈمی سندھ کراچی آئینہ ادب لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔		
۱۴۔	''عصمت کے بہترین افسانے'' (انتخاب)		
۱۵۔	''بہروپ نگر'' (ناول)		
	(یہ کتاب بھارت میں ''عجیب آدمی'' کے نام سے شائع ہوئی۔)		
۱۶۔	''خرید لو'' (افسانے)		
۱۷۔	''لحاف'' (افسانے)		
۱۸۔	''بدن کی خوشبو'' (افسانے)		طبع اوّل: ۱۹۷۹ء
۱۹۔	''آدھی عورت، آدھا خواب'' (افسانے)		
۲۰۔	''ٹیڑھی لکیر'' (ناول)	طبع اوّل: مکتبہ اردو سرکلر روڈ، لاہور طبع دوم: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۵ء
۲۱۔	''معصومہ'' (ناول)	طبع اوّل: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۲۲۔	''سودائی'' (ناول)	طبع اوّل: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۴ء
۲۳۔	''جنگلی کبوتر'' (ناول)		
۲۴۔	''انسان اور فرشتے'' (ناول)		
۲۵۔	''دل کی دنیا'' (ناول)	طبع دوم: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸	
۲۶۔	''عجیب آدمی'' (ناول)		
۲۷۔	''باندی'' (ناول)		
۲۸۔	''ایک قطرہ خون'' (واقعہ کربلا پر ناول)		طبع اوّل: ۱۹۷۵ء

۲۹۔ ''کاغذی ہے پیرہن'' (آپ بیتی)

۳۰۔ ''تین اناڑی'' (ناول۔ بچوں کے لیے)

۳۱۔ ''نقلی راجکمار'' (ناول۔ بچوں کے لیے)

۳۲۔ ''دوزخ'' (مضامین۔ڈراما۔افسانے)

اس مجموعے میں دو مضامین ایک ڈراما اور پانچ افسانے شامل ہیں

۳۳۔	''آدھی عورت، آدھا خواب'' (چھ افسانے)	مکتبہ شعروادب، لاہور	
۳۴۔	''عصمت کے شاہکار افسانے'' (گیارہ افسانے)	بک کارنر، جہلم	
۳۵۔	''لیڈی کلر'' (نو افسانے)	بک کارنر، جہلم	طبع اول: مارچ ۱۹۷۹
۳۶۔	''امر بیل'' (نو افسانے)	بک کارنر، جہلم	
۳۷۔	''یہاں سے وہاں تک'' (تین افسانے)	سوسائٹی پبلشرز، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۳۸۔	''سوت کا ریشم'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۳۹۔	''جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' (بچوں کے لیے)	شیخ علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء

وفات سے پہلے مستقل پتا:

''انڈس کورٹ، فرسٹ فلور، چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔ بھارت

اعزاز:

۱۔ ''اقبال سمان'' حکومت مدھیہ پردیش، بھارت: ۱۹۸۹ء

۲۔ مخدوم ایوارڈ

۳۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

۴۔ نہرو ایوارڈ

۵۔ پدم شری (حکومت ہند کا سول ایوارڈ): ۱۹۹۰ء

نظریۂ فن:

''سچا ادیب وہی ہے جو راہنمائی سے کترا جائے۔ وہی لکھے جو اس کے دل کی گہرائی سے ابھرتا ہے، جو وہ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، جو اس پر بیتی ہے۔'' عصمت چغتائی

(مضمون: ''مجھے کہنا ہے کچھ.....'' مطبوعہ: ''الفاظ'' علی گڑھ مارچ تا جون ۱۹۸۰ء سے اقتباس)

مُغل بچہ

عصمت چغتائی

— فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ ککیا اینٹ کا دومنزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اس کی ڈھٹائی سے عاجز آ کر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان وشوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید داغ کپڑوں میں ایک سنگ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال، بے خون کی سفید دھوئی ہوئی ململ جیسی جلد، ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی، پہلی نظر میں سفید لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ جیسے بسی ہوئی چاندنی کا غبار ان کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جئے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سو سے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی گم سم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھیں کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچازاد سے بیاہی تو گئی تھیں۔ مگر انہوں نے دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوارپن کی ایک صدی انہوں نے انہیں کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی ان کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اتنے کالے کہ ان کے آگے چراغ بجھے! گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سر شام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں دبک کر بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ ادلا بدلا کر گوری بی اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بیچارے کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری گوری دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔

اماں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پر دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی فتح پور سیکری کے پراسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سرمئی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے دل دھک دھک کرنے لگتے۔

"کالے میاں آ گئے۔" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے۔ گرتے پڑتے بھاگتے اور لکھیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پر ماتھا رگڑا۔ تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جاتیں۔ بھوک ہڑتال کر دیتیں گھر میں کھانا پکتا' کوئی منہ' نہ جھٹلاتا جوں کا توں اٹھوا مسجد میں بھجوا دیا جاتا' گوری بی نہ کھاتیں تو اماں بوا کیسے نوالہ توڑتے۔ بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں چھینٹے کیے۔

"گوری دلہن کالا دولہا۔"

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر کھتے رہے۔ جل کر مرنڈا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پر چھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا اتیہا ہے ساری عمر جوتیاں اٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا اتم سنسکار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ وہ زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ جاو جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی دھندار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جا پڑے بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے محور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں غلط ملط ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری کسر شان' جو کچھ اثاثہ بچا اسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا روپیہ پیسہ کی جگہ چچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پترا کھیڑ لے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد نگے جوڑے نوچ نوچ کر کھاتے۔ پان دان کی کلھیاں سل بٹے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پلنگ کی ادوائین توڑتے۔ شام کو پرانی گھسی اچکن پہنی اور شطرنج بچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیویاں چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا یا محلّہ کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی چھیڑ خانی کو جی کا گھاؤ بنا لیا جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی باپ ماں کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔ کالے میاں سر جھکا کے دولہا بن گئے۔ کسی سرپھری نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا' سر سے بہن کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردان خانہ میں اس ٹریجڈی کی خبر ہنسی میں اڑا دی گئی۔ بغیر آرسی مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

''بخدا میں اس کا غرور چکنا چور کر دوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچہ سے واسطہ پڑا ہے۔'' کالے میاں پھنکارے۔

کالے میاں شہتیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے دلہن ایک کونے میں گٹھڑی بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

''گھونگھٹ اٹھاؤ۔'' کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گڑی مڑی ہو گئی۔

''ہم کہتے ہیں گھونگھٹ اٹھاؤ۔'' کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔ سہیلیوں نے تو کہا تھا۔ دولہا ہاتھ جوڑے گا۔ پیر پڑے گا پر خبردار جو گھونگھٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پاکباز۔

''دیکھو جی تم نواب زادی ہوگی اپنے گھر کی ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگٹ اٹھاؤ ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں۔''

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور روانہ ہو گئے۔

گھر میں سونا پڑا تھا۔ ایک اکا بی جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے ہوئے تھے جب دلہن کے کمرے سے چوں بھی نہ آتی تو ان کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہوگی اتنا ہی زیادہ دند مچائے گی۔ کیا کچھ کالے میاں میں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کود کے قصہ پاک کریں۔

چپکے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب!

بڑے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے تکراریں، کھینچیں، بڑی مشکل سے دلہن نے جو بیتی تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے میاں کی دوسری گوری بی کی طرفدار۔

''وہ آخر خدائے مجازی ہے۔ اس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے۔''

ایک پارٹی جمی ہوئی تھی۔

''کہیں کسی دلہن نے خود گھونگھٹ اٹھایا ہے؟'' دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلوا کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے اور بیوی کو نان نفقہ بھیجتے رہے جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مار آتیں۔

گوری بی کلی سے پھول بن گئیں۔ ہر اتھواڑے ہاتھ پیر میں مہندی رچاتی رہیں اور بندھے ٹکے ڈوپٹے اوڑھتی رہیں اور جیتی رہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بادا کی مرن کھڑی آ پہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ بادا موت کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھے۔ کالے میاں کو طلب کیا دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے کی باریکیوں پر سکوت ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا۔ مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگھٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔'' قبلہ و کعبہ میں قسم کھا چکا ہوں میرا سر قلم کر دیجیے'' مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔''

مغل بچوں کی تلواریں زنگھیا چکی تھیں۔ آپس کی مقدمہ بازیوں نے سارا کلف نکال دیا تھا۔ بس احمقانہ ضدیں رہ گئی تھیں ایک انہیں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے تھے کسی نے کالے میاں سے پوچھا تم نے ایسی احمقانہ قسم کھائی ہی کیوں کہ اچھی بھلی زندگی عذاب ہو گئی۔

خیر صاحب گوری بی پھر سے دلہن بنائی گئیں۔ لکھیا اینٹ والا مکان پھر پھولوں اور شامت الغمر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اماں نے سمجھایا۔

''تم اس کی منکوحہ ہو بیٹی جان۔ گھونگھٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں اس کی ضد پوری کر دو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی۔ تمہاری دنیا سنور جائے گی گودی میں پھول برسیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہوگا۔''

گوری بی سر جھکائے سنتی رہیں۔ کچی کلی سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن اور جوانی کا ایک طوفان تھا جوان کے جسم سے پھوٹ نکلتا تھا۔

عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی گولے کی طرح ان کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی ان کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی انہوں نے بیسیوں گھونگھٹ نوچ ڈالے رنڈی بازی، لونڈے بازی، بیٹر بازی، کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگھٹ کی چوٹ دل میں پچھے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہوگی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں، دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔

''گھونگھٹ اٹھاؤ'' کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہنا چاہا مگر مغلئی دبدبہ غالب آ گیا؟

گوری بیگم غرور سے تمتمائی سنانے میں بیٹھی رہی۔

''آخری بار حکم دیتا ہوں۔ گھونگھٹ اٹھا دو ورنہ اسی طرح پڑی سڑ جاؤ گی اب جو گیا، پھر نہ آؤں گا۔''

مارے غصہ کے گوری بی لال بھبوکا ہو گئیں۔ کاش ان کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگھٹ خاکستر ہو جاتا۔

بیچ کمرے میں کھڑے کالے میاں کوڑیالے سانپ کی طرح جھوتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اتر گئے۔

اب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے لکڑیوں کی ٹال لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جعفاری بدگو بیلے چمیلی کی روشنی، گلابوں کے جھنڈ، شہتوت اور انار کے درخت کب کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگاتیں دوپٹہ رنگ چن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پر سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہو گئے۔ برسوں ان کا سراغ نہ ملا۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے، وہ نہ جانے کن جنگلوں میں خاک چھانتے پھرے۔ کبھی خانقاہوں میں ان کا سراغ ملتا۔ کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑے ملتے۔

گوری بی کے سنہری بالوں میں چاندی گھل گئی۔ موت کی جھاڑو کام کرتی رہی۔ آس پاس کی زمینیں مکان کوڑیوں کے مول بکتے گئے کچھ پرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے۔ کنجڑے قصائی آن بسے، پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی۔ پرچون کی دکان، ڈسپنسری ایک مرگھلا سا جنرل سٹور بھی اگ آیا، جہاں المونیم کی پتیلیاں اور لپٹن چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔

ایک مفلوج مٹھی کی دولت رس کی بکھر رہی تھی۔ چند محتاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک اودائین پر بیٹھتے تھے جھک جھک کر سلام

کرتے تھے آج ساتھ اٹھنا بیٹھنا کسرِ شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں چھجے جھول رہے تھے بچے کھچے مغل بچے افیون کا انٹا نگل کر پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے۔ تیتر' بٹیر سدھار رہے تھے اور کبوتروں کی دموں کے پَر گن کر ہلکان ہو رہے تھے۔ لفظ مرزا جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا۔ گوری بی کولہو کے اندھے بیل کی طرح زندگی کے چھکڑے میں جتی اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں۔ ان کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جونہی کالے میاں ان کے گھونگٹ کو ہاتھ لگاتے چٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اجگر پر سوار ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی قرآت پر سر دھنتا ہے پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی پھنکاریں سن کر سوتے میں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے۔ کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہوگا۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہوگا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے۔ انہیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے۔ پور پور سڑ رہی تھی روم روم رس رہا تھا۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں۔ جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

''گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔''

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا میاں کو منانے کی تیاریں شروع کر دیں۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی۔ پانی سمو کر پنڈا پاک کیا۔ سہاگ کا چکنا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔ صندوق کھول کر بور بور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پر چیکٹ تکیے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے الجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا:

''گوری بی گھونگٹ اٹھاؤ۔''

گوری بی کے ہاتھ اٹھے مگر گھونگٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں' سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھنچ گیا۔

○

قدرت اللہ شہاب

نام	:	قدرت اللہ
قلمی نام	:	قدرت اللہ رونق/قدرت اللہ جعفر/قدرت اللہ شہاب۔
پیدائش	:	26 فروری 1917ء بمقام گلگت۔[1]
وفات	:	24 جولائی 1986ء بمقام اسلام آباد۔ پاکستان
تعلیم	:	ایم۔اے۔(انگریزی)

ابتدائی تعلیم چترال اور گلگت کے اسکولوں میں پائی۔ بابا اجیت سنگھ ہری خالصہ ہائی اسکول، چمکور سے میٹرک کیا۔ ایف۔ ایس سی اور بی۔ ایس سی کے امتحانات پرنس آف ویلز کالج، جموں سے پاس کیے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ان کی تعلیم کے لیے وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

قدرت اللہ شہاب کے والد محمد عبد اللہ اولین علیگ گریجویٹ تھے۔ ریاست جموں و کشمیر میں ملازمت کے دوران اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ مہتر چترال کے دربار میں نمایاں عہدہ ملا، گلگت کے گورنر رہے۔ قدرت اللہ شہاب کی والدہ کا نام کریما بی بی تھا۔

شہاب کا بچپن گلگت اور چترال میں گزرا۔ ان کے لڑکپن میں وہاں طاعون کی وبا پھوٹی تو شہاب کو چمکور، ضلع انبالہ بھجوا دیا گیا، جہاں سے میٹرک کیا۔ ایف۔ ایس سی اور بی۔ ایس سی کرنے کے زمانے مین جموں میں قیام تھا۔ ایم۔ اے (انگریزی) کرنے کے دوران لاہور میں رہے۔ 1941ء میں انھیں سول سروس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد جب تربیت حاصل کرنے سول سروس اکیڈمی، دیرہ دون گئے تو خود کو اس ماحول میں یکسر اجنبی پایا۔ تربیت سے متعلق ان کی ابتدائی خفیہ رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ ''یہ شخص اس سروس کے لیے مکمل طور پر مس فٹ ہے۔''[2]

قیام پاکستان سے قبل بطور آئی سی ایس افسر اُڑیسہ مغربی بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔ ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ سب سے پہلے رونق اور بعد ازاں جعفر تخلص اختیار کیا۔ شہاب کی خواہش کے مطابق آزادی کے بعد ان کی خدمات حکومت پاکستان کو تفویض کر دی گئیں۔ غلام محمد میجر جنرل سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان کے سیکرٹری وفاقی سیکرٹری برائے اطلاعات ونشریات اور وفاقی سیکرٹری تعلیم رہے۔ ایوب خان کے پرسنل سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی اور کاپی رائٹ ایکٹ منظور کروایا۔

تین برس ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر رہے 1969 میں جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے فوراً بعد سرکٹ ہاؤس میں وفاقی سیکریٹریوں کے اجلاس میں بطور وفاقی سیکریٹری اطلاعات ونشریات شرکت کرنے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں دوبارہ وفاقی سیکرٹری تعلیم ہوئے۔ جون 1974 میں میں جب انکی بیگم ڈاکٹر عفت نے وفات پائی تو انہیں دائمی چپ سی لگ گئی اور محض دو برس بعد ریٹائرمنٹ لے لی۔

انتہائی کم گو مردم بیزار اور انتہا درجہ غیر متاثر کن شخصیت کے مالک قدرت اللہ شہاب کو بیک وقت پہنچا ہوا ولی اللہ سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ اور پاپی بیوروکریٹ سمجھا گیا۔ 24 جولائی 1986 تک کا زمانہ ''شہاب نامہ'' لکھنے میں صرف کیا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''چندراوتی'' مطبوعہ: ''رومان'' لاہور: 1939ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''یاخدا'' (ناولٹ) لاہور اکیڈمی لاہور طبع اوّل جون 1948ء

یہ کتاب لالہ رخ پبلی کیشنز کراچی نے بھی شائع کی ہے۔

اس ناول کے کل تین ابواب ہیں: ''رب المشرقین''، ''رب المغربین'' اور ''رب العالمین''، **کل صفحات 112**

۲۔ ''نفسانے'' (سولہ افسانے) مکتبہ جدید لاہور طبع اوّل: 1950ء

(۱) غریب خانہ (۲) شلوار (۳) جگ جگ (۴) کٹی ہے رات تو (۵) سب کا مالک (۶) ماما (۷) جال (۸) آیا (۹) تلاش (۱۰) دورنگا (۱۱) جل ترنگ (۱۲) ڈاگی (۱۳) تین تارے (۱۴) پہلی تنخواہ (۱۵) صنم پلکیت (۱۶) سٹینوگرافر

۳۔ ''ماں جی'' (سولہ افسانے) لاہور اکیڈمی لاہور طبع اوّل ۱۹۶۸ء

(۱) شلوار (۲) جگ جگ (۳) آیا (۴) تلاش (۵) دورنگا (۶) جل ترنگ (۷) پہلی تنخواہ (۸) پھوڑے والی ٹانگ (۹) پکے پکے آم (۱۰) ریلوے جنکشن (۱۱) سردار جسونت سنگھ (۱۲) ماں جی (۱۳) ایک پنکچر (۱۴) نمبر پلیز (۱۵) اور عائشہ آگئی (۱۶) سول لائین۔

(اس کے علاوہ ایک رپورتاژ ''اے بنی اسرائیل''۔ چار طنزیہ مضامین دو مضامین اور دو سفرنامے بھی اسی مجموعے میں شامل ہیں۔

نمبر شمار ۱ تا ۷ کے افسانے ''نفسانے'' میں شامل ہیں۔)

۴۔ ''سرخ فیتہ''

۵۔ ''شہاب نامہ'' (خودنوشت/آپ بیتی) سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

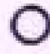
زندگی میں مستقل پتا:

مکان نمبر ۲۱، گلی نمبر ۱۰، ایف ۶/۳، اسلام آباد۔ پاکستان۔

نظریۂ فن:

''افسانے کے متعلق میرا کوئی خاص نظریہ فن نہیں ہے۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کا دل خوش ہو۔''

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۲۲/ ستمبر ۱۹۸۴ء)



حوالہ جات:

۱۔ اکثر حوالہ جاتی کتب میں ۱۹۱۹ء درج ہے۔ ۱۹۱۸ء کی تاریخ سے خود قدرت اللہ شہاب نے مجھے خط لکھ کر مطلع کیا تھا۔ میٹرک کی سند پر بھی ۱۹۱۷ء درج ہے۔

۲۔ بہ حوالہ: یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' مرتبہ: طاہر مسعود

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہیں ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھینچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے

ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے دس روپے پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالے سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔

ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضع داری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے تھے۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی اور نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے ایک جوڑا دیسی جوتا ایک جوڑا ربڑ کے چپل ایک عینک ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی کی بغل ماری اور جہاں کہے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انہوں نے اس سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے عقبیٰ سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا پہلے دوسروں کے لیے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت

روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیروبم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خوردسال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں اس کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سرراہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے چک نمبر ۵۰۶ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیئے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لئے گئے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروالیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی۔ جس سے ماں جی کے کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریے اور کلفے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھیں۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو الن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا۔ اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربع زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی

توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہتیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد وغبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ائر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیئے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لیے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

''ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا!'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

''توبہ توبہ پت'' ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں ''میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرکولیشن میں اوّل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالبعلم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں

بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلالیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خود بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی' عربی' فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں پر جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا تا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا' بجھایا' ڈرایا دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟'' سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

''جی ہاں'' عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ تکا سا جواب سن کر سرسید صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں' مکوں' تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ ''اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں''۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے ہی سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا جوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تا کہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے تھے۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

''اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی'' عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوادوں گی۔ ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ' وسیع باغ' نوکر چاکر دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی

اقتدار کا حامل تھا لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے۔ اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا۔ ''تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر رہی گئی۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو''۔ یہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا' سینا پرونا' برتن مانجھنا' کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا۔ ''مسٹر گورنر' جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں' براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں''۔

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک کونے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا ''اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟''

''میں'' ماں جی تنک کر بولیں۔ ''میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟''

''میں'' عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا۔ ''میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا' جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا''۔

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار۔۔۔۔۔۔ماں جی رشک وحسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات ''گورنری'' کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

''بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!''

عبداللہ صاحب ''علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے''۔

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاب سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی سے حال سنایا۔

مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی" ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضع دار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیرِ وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ' پوتوں پھلو" مہارانی نے کہا۔ "کبھی ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔"

مہاراجہ اور مہارانی کو کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر صبر و شکر' تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیب کے پردے میں کتنے دکھ' کتنے غم' کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا عین عالم شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی!

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکا یک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ "بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیئے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت خیال امڈ آئے۔ "ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا' ہلایا' چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی۔ "بچہ رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے رہے تھے' اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی"۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا' ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ

روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الہڑ دلہن سمجھا اور جس نے گورزی کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں' جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی' لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہوگئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔



سیّد رفیق حسین

نام : سیدرفیق حسین جعفری
قلمی نام : سیدرفیق حسین جعفری/سیدرفیق حسین
پیدائش : ۱۸۹۴ء بہ مقام محلہ شاہ گنج، لکھنؤ بھارت۔
وفات : ۲۴ اپریل ۱۹۴۴ء
تعلیم : ڈپلوما مکینیکل انجینئرنگ وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل کالج، بمبئی ۱۹۲۰ء
ابتدائی تعلیم : ظہور وارڈ سکول، اٹاوہ میں حاصل کی

مختصر حالات زندگی:

سات برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بچپن دربدری میں گزرا، کبھی بہن کے ہاں تو کبھی پھوپھی کے پاس۔ والد کے دوسری شادی کرنے پر قدرے زندگی میں قرینہ آیا لیکن اس وقت تک تعلیم کا سلسلہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ پھر کبھی سدھر نہ سکا۔ سیّد رفیق حسین اپنے زمانہ طالب العلمی میں کبھی بھی اچھے طالب العلم شمار نہ کیے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں والد اٹاوے میں تھے اور یہ نویں درجے کے طالب العلم، جب گھر سے بغیر اطلاع کے بھاگے اور بمبئی پہنچے۔ چھ ماہ تک ڈھلائی کے ایک کارخانے نیپیئر فاؤنڈری ورکس میں بطور قلی دن بھر مشقت کرتے اور رات کو پڑھتے رہے۔ جب گھر سے رابطہ قائم کیا تو باقاعدہ خرچ آنے لگا اور اُنھوں نے وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل کالج بمبئی سے ۱۹۲۰ء میں میکینیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما لیا اور جھانسی کی ریلوے ورکشاپ میں چھ ماہ تک ملازمت کی۔ ۱۹۲۱ء میں ریلوے ورکشاپ شاہ گڑھ چلے گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں بارہ برس ترائی کے جنگلات میں گزارے۔ بحرِ ہند میں بحری جہازوں پر کام کیا، حج کیا۔ ساری زندگی نیکر اور آدھی آستین کی قمیص پہنی۔ ۱۹۲۴ء میں انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز کی ایسوسی ایٹ ممبر کے طور پر چار ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں سرکاری ملازمت سے دست بردار ہو کر تجارت کی لگن میں شکر سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ ۳۲-۱۹۰۳ء کے لک بھگ شکر سازی کا کارخانہ اپنے انجام کو پہنچا تو بہار کی ایک شوگر فیکٹری میں انتہائی قلیل تنخواہ پر ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کی جگہ ملی۔ اس کے بعد کچھ مدّت علاقہ کریرا کی شوگر فیکٹری میں

چیف انجینئر رہے۔ بقول سید رفیق حسین (بحوالہ: فسانہ اکبر) چودہ ملازمتیں کیں۔ آخری زمانے میں گورنمنٹ سنٹرل ورکشاپ، کانپور میں پلاننگ سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اردو میں املا کی یہ حالت تھی کہ اپنا لکھا خود نہ پڑھ سکتے تھے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''کفارہ'' مطبوعہ: ''ساقی'' دہلی ۱۹۴۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

ا۔ ''آئینہ حیرت'' (افسانے) طبع اوّل: ساقی بکڈپو دہلی ۱۹۴۴ء

غیر مدوّن:

اس کتاب کے علاوہ ''نیا دور'' کراچی شمارہ نمبر ۴۵ میں رفیق حسین کے آٹھ افسانے (مشمولہ: ''آئینہ حیرت'') ''گھریات'' اور ''ہندوستان کی تباہی کا راز'' (دو مضامین) ''نیم کی نمولی'' اور ''فنا'' (دو طویل مختصر افسانے) اور فسانہ اکبر'' (ناولٹ) شائع ہوئے۔ رسالہ ''ساقی'' کے افسانہ نمبر جولائی ۱۹۴۰ء میں سید رفیق حسین کا ایک یکسر مختلف افسانہ ''شیریں فرہاد'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

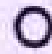
نظریۂ فن:

''جھوٹا ہوں، سچا ہوں، دیوانہ یا سنکی۔ جو کچھ بھی ہوں آپ کے آگے حاضر ہوں۔''

سیّد رفیق حسین

(بہ حوالہ: ''افسانہ اکبر'' مطبوعہ ''نیا دور'' کراچی شمارہ ۴۵۔۴۶)

''زندگی سے الگ آرٹ کا کوئی تصور کم از کم میرے ذہن میں نہیں'' (بہ حوالہ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی لگ بھگ ۱۹۴۶ء)



حوالہ جات:

۱۔ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی میں افسانہ ''حضت وہ تو نکل گئے'' پر افسانہ نگار کا نام سید رفیق حسین جعفری چھپا ہے۔

۲۔ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' میں خود نوشتہ کوائف میں انہوں نے اپنا سال پیدائش ۱۸۹۵ء لکھا ہے جو درست نہیں مجھے اصل تاریخ پیدائش سے ان کے قریبی عزیز میجر جنرل شاہد حامد نے مطلع کیا۔

۳۔ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی میں شامل سید رفیق حسین کے خود نوشتہ کوائف میں افسانہ ''کلوا'' کو اوّلین افسانہ شمار کیا گیا ہے جو درست نہیں۔

۴۔ یہ مجموعہ کراچی پاکستان سے دوسری بار ''گوری ہو گوری'' تیسری بار راولپنڈی سے ''بے زبان'' اور چوتھی بار کتاب کار پبلی کیشنز یو۔ پی بھارت سے ''شیر کیا سوچتا ہوگا'' کے نام سے شائع ہوا۔

گوری ہو گوری

سیّد رفیق حسین

چوماسہ کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ژ،ژ،ژ، پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الو کہتا تھا۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی۔ پھر منہ پر تھپڑ مارا بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر الو بولا۔ ہک ہو' ہک ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی۔ "مری جائے۔ پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہک ہو' ہک ہو۔

"اجی او جی۔ اجی او جی۔ اٹھو نا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔ بولا: سون دے ری..... اری نا کھائے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔ اوٹھو۔"

مادھو' ادھ سے تو راوڑ" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا۔ جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کہ پھر نیچے دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا، چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ پھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلملا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔ مادھو بولا "جو کا ہوا رے"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی۔ "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ بھیکا کو جگالو۔ ارے رمکلیا کو جگالو۔ ارے ان ہن کو پیڑھی کو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رمکلیا ہوا رے او رمکلیا۔ سوئے جات رے۔ ارے اٹھ اٹھ او بھیکا۔"

آٹھ برس کی دبلی پتلی رمکلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا' وہ چلائے۔ "اری میاری' موہے لئے

لے باپورے۔ اری میاری۔''

''چپ کرو چپ۔'' مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آرہی تھی۔ گڑپ۔ شل شل۔ گڑپ شل شل شل۔ گھگو بولا ''ہک ہو۔''

بسنتی روتی ہوئی چلائی۔ ''ارے پریتم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچے کی جورے''۔ کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اٹھا' دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی۔ ''اجی جاوت کہاں ہو جی۔''

باہر سے آواز آئی۔ ''مادھو بھیا ہو۔ او مادھو۔۔ ارے باڑھ آئی۔ اُٹھ رے اُٹھ۔''

شڑپ' گڑپ' شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم۔ میں۔ بکری بولی۔ ماں۔ ہاں آں۔ ماں۔ ہاں آں۔ کہیں گھیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پردے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ اٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔ مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی کلی اٹھائی' تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ منکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی۔ دری۔ پچھورا۔ کھتری سب کچھ اس پر تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا ''بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل' ارے مادھو بھاگ۔''

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا۔ رانوں تک آیا۔

''بھاگو بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کاہے ناہیں۔''

باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔ ''ارے مورے گڑوے۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رہے۔''

''چل چل' تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لئے لوں۔ اڑھنا پچھورا تو دبائے لوں''

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازہ پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا آدمی گھر میں آگئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ ''چالو۔ چالو سب چھوڑو۔ جان ہی بچائے لو' چالو' چالو۔''

اس گڑبڑ میں' جلدی میں' گھبراہٹ میں' اندھیرے میں دری' پچھورے' کپڑوں کے لیے پکارتی۔ ناج اور ناج کی کٹھیوں کے لیے پکارتی۔ برتنوں اور زیوروں کے لیے پھڑکتی بسنتی نے یہ بھی کہا۔ ''بھیارے رمکلیا کوئے لے رے'' لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا۔ ''موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے۔''

پانی کی شل شل۔ رات اندھیری۔ بادل کی گرج' بجلی کی چمک۔ کمر کمر سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی۔ پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا دوسرا سنبھلتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا۔ دوسرا اُبھرتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پردے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دور ریل کی اونچی پٹری کا رخ کیا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا انکے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اٹھالیا تھا۔ ان کو اس کا اطمینان تھا مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو کہ گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بنگلہ پر اس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے لیے بیتاب تھی۔ ''ادھر تو وہ اکلا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ ناہیں' کا جانے آیا کہ نہیں''۔ مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوئے دہرایا۔ ''کو جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے' بردے کھولے کہ ناہیں۔''

اندھیری رات تھی' ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ ادھر ادھر دور اور نزدیک آوازیں ان کی آرہی تھیں۔

''جانگی ہو جانگی۔''

''آے رہوں دادا۔''

''مرلی رے مرلی۔''

''بھلا رے بھلا۔ چالے چالو۔''

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا'' ناگا او ناگا'' اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا۔ ''لین کے گلے زیاہے نریا''۔ کوئی بولا۔ ''سنبھلے سنبھلے نکلے چالو''۔ کسی نے کہا'' ڈٹے رہو بھیا۔ ڈٹے رہنا بھیا۔ آگئی لین۔''

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی۔'' مادھو بھیا ہو۔ کو مادھو بھیا دیکھو'' کسی نے جواب دیا۔'' بڑا دکھوئی یار ہاتھ لو تو لوکت ناہیں۔''

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا۔'' بھلی ہے بھلی۔ آنت ہوں۔'''' بردے لے آیا رے؟'' ناگا چلایا۔''بسنتی' کتے بولت ناہیں''

''ارے ہے رے مورے ساتھ۔ بردے کتے چھوڑے لے آیا رے؟''

''آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔'' آڑ کے آر کی لائین پاس آگئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں' چلاتی گائیں' ممیاتی بکریاں' روتے بچے' سہمی عورتیں' پکارتے مرد' سب بھیگے' سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سونی پٹری آباد ہوگئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔

آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کرمی کم تھے۔ بچوں میں رمکلیا کم تھی۔

بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کرمی بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر وہ سوئے ہوئے تھے۔ رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی' سب دلاسہ دیتے تھے۔ ہر کوئی سمجھاتا تھا۔ رو دھو نا' صبر کر۔ شاید دونوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آگیا ہوگا۔ کسی درخت پر ہی لے کر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا۔ اس نے ہی تو کہا تھا گودی لے لے گا۔ وہی اس کو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ پر ممتا کی ماری دکھیاری چپ کیسے ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا۔

اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اراتی تھی۔ تو کان آں ھ تو کاں ہاں ھ یہ بھی دکھ بھی ماں ہے ارے کوئی جانے نا جانے۔ بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے تو کاں آں ھ۔

روتی ہچکیاں لیتی ہوئی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور روئی

''گوری رے۔ موری رمکلیا۔۔۔۔۔ ابھا ابھا ابھا''

''گوری رے اب تو ہے کون چرائے ابھا ابھا ابھا''

''گوری رے اب تو ہے کون کھلائے اوھا اوھا اوھا اوھ

''گوری رمکلیا تو گئی رے اوھا اوھا اوھا اوھ

''گوری توری رمکایا ابھا ابھا ابھا ابھا''

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔ کاں آں ھ

کوئی جانے نہ جانے' دل کی گتی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے لے کر آخر صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے مکان بہہ چکے تھے۔ اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہوگا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔ جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے ہل رہے تھے' اور پھر ان کے پار' میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا سا نالہ تھا پانی کا دھارا تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی' لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی تو موجود تھے رمکلیا نہ تھی۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا۔ اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پتیلا ڈھونڈ لیا جو کہ درختوں میں الجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پتیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھیتے ہوئے اسے لے جائیں گے مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے۔ ڈر کے مارے مرا جائے۔ پانی میں اترے ہی نہیں' بہت سمجھایا' خوشامد کی لیکن راضی ہی نہ ہوا۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آ گیا۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اس کی گردن پکڑ' مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہو گیا پتیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہو لیا اور سب باری باری پتیلے کو دھکیلتے ہوئے لے چلے۔ راستہ میں کسی نے کہا۔ ''لے اب بھائے رے سانچی سانچی نا ہیں ڈبوئیں دیں تو ہے اتے ہی۔'' بچارے نے سب اگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کا نکالنے گئے تھے اور بسنتی کے چلانے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سن کر سب نے کہا۔ ''ڈبوئے دو ایسے پاپی کو۔ کیا کرنا لے جا کر ایسے دشت کو۔''

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹری پر اتار ہی دیا۔ وہاں سیوا سمتی کے بچے خدمت گار، کانگریس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور' تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر' لال صافے والے پولس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔ مدد ان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے

تھے۔ تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال سیوا سمتی والے لائے تھے۔ امن انتظامات پولس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان، کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں ان کی مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن بسنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔ مادھو اور راگا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اسکے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ ''کا جانے بھور بھئے کتے چال گئی۔''

جب تک اندھیرا رہا۔ ہڑپ، گڑپ، گڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا اور روتے روتے بے دم گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دوہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے، جس میں سے اکا دکا پیڑ کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی، اور پھر چلائی، ڈری سہمی اور چاروں طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرا کالا ناگ تھا اور پانی ہی پانی تھا۔ جس میں پھرکی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ ہڑپ کر کے غائب ہو جاتے تھے۔ رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مونده لی تھیں اور ''اری ملیاری، اور میری میا'' کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے، کان میں آواز آئی ''تو کاں آس ھ۔''

رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

''تو کاں آس ھ''۔ آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے۔ ''ہرے رام گوری بولے'' ۔ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا۔ ''گوری ہو گوری''۔

جواب آیا۔ ''تو کاں آس ھ۔''

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا۔ وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دور سے ایک اور آواز آئی۔ ''آ ماں آں ھ'' باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس کی آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی، پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی۔ ''گوری ہو گوری۔ گوری ہو گوری۔''

''ارے گوری رے آئے جا۔
ہائے رے میانا ہیں آوت۔
گوری ہو گوری۔
گوری میا آئے جا ری۔''

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ اراکر بولی اور پھر ادھر ہی تیرتی چلی گئی، جدھر سے بچھڑے کی آواز آرہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آ گیا جہاں سر شام وہ اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی۔ لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچہ نہ چلا وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی، برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے دھکیلا۔ ایک طرف چلی، بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی تھی۔ بچہ چھ فٹ نیچے زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا اور رسی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسی کی وجہ سے ناک دب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلاتے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رخ کیا۔

رمکلیا رونے چلانے کی تھکن، ڈر خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آ کر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا ''گوری میا گوری میا۔'' کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس گئی، وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکر کھائے اور چلی اور جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی۔ رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لئے یہ دونوں بہاؤ کی ہی طرف تیرتے چل دیئے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے لیکن جہاں گاؤں والے تھے، تین میل دور بہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیئے تھے اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکلیا تھی بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کچھا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رمکلیا۔ پیچھے پیچھے بچھڑا ''او ماں آں ھ'' کے سوال جواب کرتے، گاؤں والوں میں پہنچے تو ہلچل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی، کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی: ''تم ماں آں ھ۔ ہم ماں آں ھ۔''

آواز آئی: ''بول گوری میا کی جے۔'' پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی ''بول گئو ماتا کی جے۔''



دیوندر ستیارتھی

نام	:	دیوندر بتا
قلمی نام	:	دیوندر ستیارتھی
پیدائش	:	۲۸ مئی ۱۹۰۸ء بہ مقام: بھدوڑ ضلع سنگرور (ریاست پٹیالہ) بھارت[1]
وفات	:	۱۲ فروری ۲۰۰۳ء بہ مقام دہلی بھارت
تعلیم	:	بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۲۷ء۔ ہائی اسکول موگا سے ۱۹۲۵ء میں میٹرک کیا اور ڈی اے وی کالج لاہور میں زیر تعلیم رہ کر ۱۹۲۷ء میں بی اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام لالہ دھالی رام بتا تھا۔ لیکن اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ دیوندر ستیارتھی کون تھے، کیا تھے؟ تو یہ جاننے کے لیے ان کا افسانہ ''کنگ پوش'' مطبوعہ ''ساقی'' دہلی ۱۹۴۱ء دیکھنا ہوگا' جوان کی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں کی روداد سناتا ہے اور اس کے بعد کا قصہ سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے ''ترقی پسند'' میں بیان کیا ہے۔ منٹو کے اس افسانے میں ''جوگندر سنگھ'' اور ''ترپاٹھی'' درحقیقت راجندر سنگھ بیدی اور دیوندر ستیارتھی ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں شانتی سے شادی ہوئی جس سے دو بیٹیاں ہوئیں۔ ستیارتھی کو پہلے پہل لاہور میں دیکھا گیا اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں جب لوک گیت جمع کرنے گھر سے نکلے ہیں تو گجرات' آسام' بنگال' مدھیہ پردیش' راجستھان' کشمیر اور پنجاب میں ہر جگہ دیکھا گیا' سوائے اپنے گھر کے۔ ٹھیک بیس برس بعد واپس آئے تو ایک دنیا کو پتا چلا کہ انہوں نے پنجابی، گجراتی، مرہٹی، کشمیری اور مارواڑی زبانوں کے اڑھائی سے پانچ لاکھ لوک گیت اکٹھے کر لیے ہیں لیکن یہ دنیادار لوگ اس وقت انگشت بہ دنداں رہ گئے جب ستیارتھی نے پطرس بخاری کو آل انڈیا ریڈیو کے لیے یہ چنیدہ گیت فراہم کرتے وقت کاپی رائٹ اور حق ملکیت سے انکار کر دیا اور صرف اتنا کہا ''حق ملکیت اگر کسی کا ہے تو اس دھرتی کا۔''

منٹو نے اسے پیار سے ''فراڈ'' کہا اور ستیارتھی' منٹو کے گرویدہ ہو گئے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ ''گرہن'' میں شامل لوک گیت' دیوندر ستیارتھی کی عطا تھی۔ دہلی میں پچاس برس تک دیوندر ستیارتھی کا یہ معمول رہا کہ کھدر کے میلے کرتے پاجامے اور زرد سلک کے چغے میں ملفوف' بغل

میں بھاری بستہ دبائے گھر سے نکلتے اور کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شناسا چہرے کو شکار کر لیتے۔ اکثر سنا گیا ہے کہ فلاں نے اپنے دشمن کو پانی پلا پلا کر مارا، ستیارتھی نصف صدی تک اپنے نئے اور پرانے جاننے والوں کو افسانے سنا سنا کر بے حال کرتے رہے۔ ساٹھ سے زائد کتب کے مصنف تھے۔ ''ایشیا میگزین'' میں ایک مضمون لکھنے کا معاوضہ ایک سو پچاس ڈالر ملا تو اس رقم سے انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''گدھا'' شائع کی۔

۱۹۲۸ء میں ''ویدک میتر الیہ'' اجمیر میں پروف ریڈر تھے۔ مئی ۱۹۴۶ء تا فروری ۱۹۸۴ء ''انڈین فارمنگ'' دہلی کے نائب مدیر رہے۔ مارچ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۶ء ''آجکل'' دہلی کی ادارت کی، لیکن درحقیقت ہمہ وقت فسانہ طرازی کی۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں پاکستان آئے تو واپس جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بیوی نے چار ماہ انتظار کرنے کے بعد انڈین ہائی کمیشن کو خط لکھا تو اُن کے سمجھانے بُجھانے پر واپسی ہوئی۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

مقالہ: ''پنجابی گرام ساہتیہ'' (ہندی) لوک گیتوں سے متعلق۔ مطبوعہ: ''ہنس'' الہ آباد: نومبر ۱۹۳۱ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''کنگ پوش'' مطبوعہ ''ساقی'' دہلی ۱۹۴۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''گدھا'' (پنجابی۔ گورمکھی رسم الخط میں)	ناشر: دیوندر ستیارتھی، امرتسر	طبع اوّل ۱۹۳۶ء
۲۔	''نئے دیوتا'' (افسانے)	جتا جتا ست نگر، لاہور	طبع اوّل ۱۹۴۳ء
۳۔	''اور بانسری بجتی رہی'' (افسانے)	انڈین اکیڈمی، لاہور	طبع اوّل ۱۹۴۶ء
۴۔	''میں ہوں خانہ بدوش''	مرکنٹائل پریس، لاہور	طبع اوّل ۱۹۴۱ء
۵۔	''گائے جا ہندوستان'' (ہندوستان کے لوک گیتوں سے متعلق کتاب)		
۶۔	''کتھا کہو اروشی'' (ہندی ناول)		طبع اوّل ۱۹۵۶ء
۷۔	''برہم پتر'' (ہندی ناول)		طبع اوّل ۱۹۵۸ء
۸۔	''چاند سورج کی بیرن'' اس کتاب کا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں نکلا		طبع اوّل ۱۹۵۳ء
۹۔	''دھرتی گاتی ہے'' (لوک گیت)		طبع اوّل ۱۹۴۸ء
۱۰۔	''Meet My People'' (لوک ورثہ)		طبع اوّل ۱۹۴۶ء
۱۱۔	''بیلا پھولے آدھی رات'' (لوک گیت)		طبع اوّل ۱۹۴۹ء
۱۲۔	''بندن وار'' (شاعری)		طبع اوّل ۱۹۴۹ء
۱۳۔	''چائے کا رنگ'' (ہندی افسانے)		طبع اوّل ۱۹۴۹ء
۱۴۔	''سڑک نہیں بندوق (ہندی افسانے)		طبع اوّل ۱۹۵۰ء

۱۵۔ ''رتھ کے پہیے'' (ہندی ناول) طبع اوّل ۱۹۵۰ء

۱۶۔ ''دیوتا ڈگیا پیا'' (پنجابی افسانے) طبع اوّل ۱۹۵۳ء

۱۷۔ ''تن ٹو ہیاں والا گھر'' (پنجابی افسانے) طبع اوّل ۱۹۶۱ء

۱۸۔ ''سوئی بازار'' (پنجابی افسانے) طبع اوّل ۱۹۸۲ء

۱۹۔ ''تیری قسم ستلج'' (ہندی ناول) طبع اوّل ۱۹۸۹ء

۲۰۔ ''نیل یکشنی'' (ہندی۔خودنوشت) طبع اوّل ۱۹۸۶ء

۲۱۔ ''سفرنامہ پاکستان'' طبع اوّل ۱۹۸۹ء

۲۲۔ ''گھوڑا بادشاہ''

۲۳۔ ''چتروں کی لوریاں''

غیر مدوّن:

بیسیوں اردو/ ہندی افسانے اور لوک گیت

اعزاز:

۱۔ دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ: ۱۹۷۷ء

۲۔ پنجاب بھاشا وبھاگ ایوارڈ: ۱۹۷۷ء

۳۔ پدم شری (حکومت ہند) ایوارڈ: ۱۹۷۷ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

۵/۴۶ نیو روہتک روڈ' نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵' بھارت

نظریۂ فن:

''میں نئے لوگوں کا قائل ہوں۔۔۔۔۔۔ نئے لوگوں نے موسیقی' مصوری اور شاعری کی تمام حد بندیاں توڑ ڈالی ہیں۔۔۔۔ کاش میں خوشیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

دیوندر ستیارتھی

(بحوالہ: دیوندر ستیارتھی' مرتبہ: بلراج مین را' مشمولہ: ''کتاب نما'' دہلی: مارچ ۸۴ء)

○

حوالہ جات:

۱۔ ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ بشیر ہندی (ٹنگ بھگ ۱۹۴۲ء) کے لیے ستیارتھی نے اپنا سنہ پیدائش ۱۹۰۹ء بتایا تھا جو درست نہیں۔

رفو گر

دیوندر ستیارتھی

آسمان جیسے پھٹے پشمینے کا شامیانہ۔
نیل گگن پہ دودھیا میگھ، جیسے مدھوبن میں مست تھی۔ ہندوستان کی قسم۔ کارواں سرائے سلامت، یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل!
تر ہی والا سفید گھوڑے پر کالا شہسوار۔
تر ہی بجی۔۔۔۔ پہلے دیوگیری بلاول پھر مالکوس۔
دکان کی اونچی سیڑھیاں چڑھ کے آئی آئینہ خانم اور رفوگر سے بولی:
''پہلے میری شال رفو کیجیے۔ پیشگی مزدوری۔''
پانچ کا نوٹ دے کر وہ چلی گئی۔
جس کی چاہو سوگند لے لو۔ کوئی رائے قائم کرنی مشکل۔
دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔
برگد کی آنکھ میں ابابیل کا گھونسلا' جہاں سورج کی پہلی کرن داخل ہوتی۔
برگد تلے پگلی بھکارن بڑبڑاتی:
''کچھ نہ کہو اگو: میرے علی کو کچھ نہ کہو۔''
کارواں سرائے اپنی خبر رکھتی ہے۔ محبوب کی سرگوشی ہو یا ماں کی لوری۔
جن کے قدموں کے نشان مٹ گئے' ہم ان کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔
رفوگر علی جو امام کی گنبد والی دوکان۔ اونچی سیڑھیاں' تین کھڑکیاں۔

دوستانہ جذبے سے چمکتی آنکھیں۔ جگ درشن کا میلہ۔ کون گرو، کون چیلا:

تر ہی والا اپنی دھن الاپتا رہا۔

وہی کارواں سرائے، وہی بیگم بازار، وہی دوڑتی نظریں اور وہی گم ہوتی پرچھائیاں۔ سب کی توجہ کا مرکز علی ہُو امام۔

یہ علی جو تو ہوا، یہ علی ہُو امام کیا ہوا؟

پیر باورچی بہشتی خر:

ہر فن مولا۔

کوئی اسے علی کہتا، کوئی امام۔ کوئی استاد۔

اس کے ہاتھ دعا کے لئے اوپر اٹھ گئے۔

یا پیر دست گیر، روشن ضمیر!

سامنے دیوار پر کالا ریشم، سنہرے حروف 'فاختی' چوکھٹے میں جڑا شاعر کا کلام

رسم الخط کو سلام:

ڈھوتے ڈھوتے پربت غم کا، پاؤں میں پڑ گئے چھالے
بین کرے دیوانی پچھوا، رو دیئے ماتم والے
انہونی کا چاک گریباں، کون رفو کر پائے
بول سپیرے! تم نے اب کے، کتنے بھنیئر پالے

بغل والی دیوار پر لال صوفی کے ساتھ رفوگر کی تصویر۔ دونوں کی ہنسی ہم آغوش۔ بیس برسوں پہلے کی یادگار۔

لال صوفی ہوتا تو یہیں سے شروع کرتا اپنا سفرنامہ:

میخانوں کا عام رویہ، دھینگا مشتی تا تا تھیا:

سدھی کا چمتکار

من کے آر پار

مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔

آتے جاتے لوگ کار، اس سرائے حوش۔ محفل میں چہل پہل:

کہانی کا کیا کمال سپنا نہیں آگیا بیتال

رفوگر کی ننھی منی نواسی جگنی اپنی گڑیا سے کھیلتے ہوئے گیت کا بول اچھالتی:

جاگ اری جنت کی گڑیا — جاگ اری جنت کی چڑیا

لال صوفی ہوتا تو جگنی کے ساتھ سر میں سر ملا کر گاتا۔

پنالال کی تان یہیں ٹوٹتی کہ سب کتے کاشی گئے تو ہنڈیا کس نے چاٹی!

لال صوفی کو اولاد احمد اور وارث معصوم کا سلام۔ اس کا ایک اور نام گل شہید۔

خلیل اور رحمان نے یہ کہہ کر دم لیا کہ لال صوفی تو جوانی میں بڑھاپے کا مزہ لیتا رہا۔

''اللہ میگھ دے اے اللہ میگھ دے!'' گنگناتے ہوئے اولاد احمد رفوگر کی دوکان میں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

چنچل سنگھ اور پنالال کا وہی مذاق کہ آرہی ہے چائے دارجلنگ سے

آچار یہ مہادیو' دس آئے، دس گئے!'' کہتے ہوئے کتاب محل کی طرف چل دیئے۔

گل آئینہ خانم کی موڑ پر بوڑھا برگد' رفوگر کا پڑوسی۔ امیر خسرو کی کہہ مکرنی۔

استاد سے پوچھا'' آپ کی عمر؟''

بولے' برگد سے پوچھ لو۔''

برگد کی داڑھی ہنسنے لگی۔ جیسے ہوا کہہ رہی ہو کہ بوڑھا برگد سب جانتا ہے۔

جگنی سے پوچھا'' تمہاری عمر؟''

''میری گڑیا سے پوچھ لو''۔ وہ ہنس پڑی۔

آگے چلتے ہیں' پیچھے کی خبر نہیں۔۔۔ کعبہ میرے پیچھے ہے' کلیسا میرے آگے۔۔۔

جو سب سے پیچھے رہنا چاہتا ہے' اسی کو سب سے آگے بڑھاتی ہے کارواں سرائے۔ ایک ہی داؤ میں پاسہ پلٹ سکتا ہو۔

وہ خودستائی کبھی نہ کرتا۔ گاہک سے یہی کہتا'' شاید میرا کام آپ کو پسند نہ آسکے!''

اگر کسی کو اس کا کام پسند نہ آتا تو وہ جھگڑے میں پڑنے کی بجائے صاف صاف کہہ دیتا'' آپ کچھ بھی نہ دیجئے اور رفو کی ہوئی اپنی اچکن لیتے جایئے۔''

پنالال، جگنی کو چڑیا کہہ کر چھیڑتا تو وہ کہتی :

''وہ چڑیا جاپان گئی!''

رفوگر کے ابا دست گیر کی موت پر چنچل سنگھ افسوس کرتے ہوئے کہتا:

''آگے مرنا پیچھے مرنا' پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔''

کسی کے ہاتھ میں کئی تہوں میں لپٹا ہوا کاغذ۔

کسی کی بات چاکلیٹ اور بسکٹ کے بیچ۔

کسی کی نظر ایک کونے میں پڑی جگنی کی لہنگے والی گڑیا پر۔

پتھر کی دیوار پر رنگ برنگے پوسٹر:

''سچ کو سولی۔۔''

''آنکھ کا پانی مر گیا۔۔۔''

''ڈھائی دن کی بادشاہی۔۔۔''

''پاؤں میں سنیچر۔۔''

''سفرنامہ ابن بطوطہ۔۔''

''چوڑیاں پہن لو''

''سفید گھوڑے پر کالا شہسوار۔۔۔''

امرت گیسٹ ہاؤس کے آگے مغل اعظم ہوٹل اور بیگم پل سے آگے ترکمان دروازہ۔

بھول بھلیاں اور بارہ دری کے بیچ کتاب محل۔

بک لینڈ پریس کی بغل میں لبرٹی کینٹین۔

کہیں اوورکوٹ، کہیں نیچا نکر۔

کہیں اشاڈی لکس ہوٹل، کہیں مُیا محل۔

کارواں سرائے کا نام بدل کر پانڈولپی رکھ دیا۔

یہ اور بات ہے کہ لوگوں کی زبان سے کارواں سرائے نہیں اترتی۔

واہ ری کارواں سرائے:

ندیا میں مچھلی جال

بھکارن پھٹے حال

نام بن پھول بائی۔

اس کی ہتھیلی پر پانچ پیسے کا سکہ رکھنا نہ بھولنا علی لجو امام اور ہتھیلی میں گدگدی ہونے لگتی۔

کل کی نرتکی آج کی بھکارن۔ سونے چاندی کے سکوں کی کھنک اس کے پاؤں چومتی تھی۔

پانچ پیسے کا سکہ لیتے وقت آج اس کی آنکھیں پاؤں کی طرف جھک جاتیں۔

کون سی داستان سنو گے؟ کچھ سنائیں گے، ذرا اور قریب آ جاؤ۔

دونینوں کی ایک کہانی

ماں کی لوری ایک نشانی

جو گزرو گے ادھر سے، میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے

شکستہ ایک مسجد ہے، پرانا ایک مندر ہے

''عمر بھر کون محوِ رقص رہا؟'' رفوگر نے رفو کرتے ہوئے پوچھا۔
نغمے کی سوغات۔ قوالی کی رات۔ صبح گئے' سلامت آئے۔
شالا لیکھ کے روپ میں کس یُگ کی رچنا آگے آئی؟
ننھی منی جگنی اور اس کی بڑی بہن نسیم۔
''تو نسیم کی بہن ہے جگنی؟'' پنالال نے پوچھا۔
''نہیں، نسیم میری بہن ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔
کہاں تک چپ رہیں، جب سر سے اوپر ہو گیا پانی!
آچاریہ مہادیو یہ کہتے ہوئے محل میں آئے کہ سوسنار کی' ایک لوہار کی:
''سونے سے مہنگی گھڑائی!'' وارث معصوم نے تھاپ لگائی۔
''رام دہائی! رام دہائی!'' سب کی ملی جلی آواز۔
''اپنا دامن چھڑا کر چلی گئی۔ کام روپ کے پاس جا کر رکیں گے اس کے قدم۔'' اولاد احمد نے کہا۔ اشارہ بن پھول بائی کی طرف۔
رات عاشقاں بر شاخ آہو۔۔۔ ہرن کے سینگ پر عاشقوں کی برات۔
کچھ اور پوچھیے' یہ حقیقت نہ پوچھیے!
پھولوں جیسے بازو' تھکن سے چور!
اپنی گڑیا کا بیاہ رچائے' جگنی گاتی رہی:

دھوئیں دھوئیں! تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

بن پھول کو دیکھ کر رفوگر بادشاہ بن جاتا۔ گویا اس کے ہاتھوں میں اشرفیاں کھنکنے لگتیں۔

تیس دن ' چالیس میلے
میلے میں سب لوگ اکیلے
ہم کہاں سب سے الگ؟

آج پروئیا چلی، پچھوا کے بعد۔
مرنے والے کی نہیں' جینے والے کی موت ہے!
اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی!

''میں نے تو بن پھول کو چتر لیکھا سے کم نہیں مانا''۔ پنالال کا اعلان۔

وہ سوچتا ایک دن بن پھول سڑک پر چلتے چلتے ڈھیر ہو جائے گی اور اُس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بھیڑ کندھے بدلتی رہے گی۔

کارواں سرائے کا یہی احساس کہ علی جو امام جس کا بھی کام کرتا ہے' بڑی ایمانداری سے اور دن رات ایک کر کے۔

وہ تو گاہک کو ان داتا مانتا تھا۔

اس کی نظر پرندوں کے اسپتال پر' جس کا سنگ بنیاد لال صوفی نے رکھا تھا۔

چنچل سنگھ بات کو گھیر گھار کر لاہور تک لے آیا:

''لاہور شہر''

گرہائی کا شبد۔۔۔۔۔ جانے کون سا اشارہ۔

''یہیں رہنا ہے' جب تک سوئی دھاگے کا ساتھ ہے''۔ رفوگر کا اپنا انداز۔

''تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!'' اولاد احمد نے اپنی کتاب کا حوالہ دیا۔

''سوسال جییں' سوسال دیکھیں'' آچاریہ مہادیو کی تان یہیں ٹوٹتی کہ مندر میں دیوتا جاگے۔

چنچل سنگھ یہ کہہ کر دم لیتا کہ وہ پانی ملتان رہ گیا!

اولاد احمد کے زور قلم کا نتیجہ ''ادھورا آدمی' آدھی کتاب۔''

پنالال کا قد۔۔۔۔ سوا تین فٹ مگر اس کا یہی دعویٰ:

''میں لنکا سے آیا!''

جیسے وہ اپنے آپ کو باون گزا مانتا ہو۔

گلی آئینہ خانم کی شان۔۔۔ نوگزے کی زیارت' سب پر مہربان۔

گڑیا سے باتیں کرتے کرتے جگنی بول اٹھی:

''اللہ اللہ لوریاں' دودھ بھری کٹوریاں!''

راگ راگنی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔

''پاؤں تلے پُرکھوں کی ہڈیاں''۔ آچاریا مہادیو گیان بگھارتے۔

سر کٹے دھڑ کو دفنا کر مزار گل شہید کا نام۔

لال صوفی کا ایک اور نام۔۔۔ گل شہید

اولاد احمد کی کتاب کا انتساب۔ گل شہید کا نام۔

''لوگوں کے دماغ بھی رفو ہونے چاہیں!'' رفوگر مسکرایا۔

آنکھ کی پتلی۔۔۔ پتلی بائی!۔۔ کار جہاں دراز ہے!

موتی جھیل غائب۔۔۔۔ اب وہاں چتر لیکھا کالونی کی چہل پہل۔

گاندھی گارڈن۔۔۔کمپنی باغ کا نیا نام۔
کبھی آواز کا چہرہ، کبھی پہچان چہرے کی!
خوشبو سے کہو یہ کہ ہماری طرف آئے!
جس میں آگ لگا کے جمالو دور کھڑی!
''کہیں بھی آگ لگے، بچاری جمالو بدنام۔''
آسام سے آیا کام روپ، جسے بن پھول نے الکھ نرنجن مان لیا۔
پیروں میں گھنگھرو باندھے، وہ اس کے آگے ناچتی رہتی۔
پاگل بھکارن کی اور بات، جو سڑک پر کھڑی آنے جانے والوں کو دعائیں دیتی ہے۔
کام روپ کو دیکھ کر آسام سامنے آجاتا۔
اوپر کوٹ۔۔۔سرگوشیاں ہی سرگوشیاں۔
بن پھول کے جوڑے پر گجرے کی خوشبو۔
گفتگو۔۔۔گل شہید کے مزار تک۔
علی جو امام یہ بتانا نہ بھولتا کہ وہ سورج اُگنے سے پہلے ہی پیدا ہوا اور اسی روز اس کوٹھری میں ابابیل کا بچہ انڈے سے باہر نکلا!
آچاریہ مہادیو جب کبھی ''کشمیری بے پیری!'' کہہ کر چھیڑتے تو رفو گر کہتا:
''مہاراج! میں تو آپ کو بھی بے پیر مانتا ہوں۔''
وقت کا احساس جیسے جنگلی کبوتر کی اڑان۔ اڑتا ہی جائے بس اڑتا ہی جائے!
دنگے فساد شروع ہوگئے تو کام روپ مارا جائے گا اور اسے الکھ نرنجن مان کر پیروں میں گھنگھرو باندھے اس کے آگے ناچنے والی بن پھول کی جھنکار بھی ختم ہو جائے گی۔
کبھی میوزک کانفرنس، کبھی کتابوں کی نمائش، کبھی آل انڈیا مشاعرہ۔
ہیرا لال کا بیٹا موتی لال اور موتی لال کا بیٹا پنا لال۔ تینوں بونے۔ مگر نفرت کے خلاف جہاد اُن کا ایمان جیسے بسم اللہ خان کی شہنائی یا پنا لال کا بانسری وادن۔
پٹھان کا پُوت۔۔۔کبھی اولیا، کبھی بھوت۔
مغل کی اور بات۔
اب کیا شاہانہ آن بان!
تاتاری کا قصہ ختم!
لال صوفی۔۔۔تاتاری سوداگر کے خاندان کی آخری کڑی۔
''برف کے پھول سے اٹھتا ہے دھواں دیر تلک!''

رفو گر رفو کرتے کرتے گنگنا تا رہا۔

اتہاس گو سوامی کا نام آتے ہی' مس فوک لور اور گل ہما کا نام آئے بغیر نہ رہتا۔

گل ہما یعنی برف کا پھول۔

اتہاس گو سوامی کی ''نیل یکشنی'' میں لال صوفی کو شردھانجلی دی گئی۔

بہار آئی ہے جو بن پر ابھار آیا۔

پیچھے رہ گیا بھٹیاری کا رنگ محل۔

ناک کے سیدھ چلے جاؤ تو کتاب محل کا ریڈنگ رُوم۔

کبھی گرمی کا رونا کہ چیل انڈا چھوڑے!

کبھی کڑاکے کی ٹھنڈ کہ بلبلیں مر گئیں اکڑ کے تمام!

2

ایک روز آچاریہ مہادیو بس پر سوار ہونے سے پہلے نیند کی چودہ گولیاں کھا گئے اور بس سے اتر کر کارواں سرائے کے بارہ ٹوٹی چوک میں نیلا گنبد کے فٹ پاتھ پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔

کسی نے ٹیگور ہسپتال کو فون کر دیا۔ ہسپتال کی وین آئی اور آچاریہ مہادیو کو لے گئی۔

وہاں انہیں مردہ سمجھ کر مردہ گھر میں بھیج دیا گیا۔

اگلے روز ان کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔

صبح چار بجے آچاریہ مہادیو کو ہوش آیا تو اس کے ساتھ کئی مردے۔

اپنے آپ کو مردہ گھر میں پا کر ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا سکے۔

دروازہ کھلا تھا۔

وہ سرکتے سرکتے باہر اندھیرے میں جا پہنچے اور پہرے داروں سے بچتے بچاتے ہسپتال کے احاطے سے باہر۔

کئی گھنٹے تک یہی احساس رہا کہ موت دبے پاؤں ان کا پیچھا کر رہی ہے۔

یہی خدشہ لگا رہا کہ کہیں سرکار اقدامِ خودکشی کے الزام میں نہ دھر پکڑے۔

پرانے دوستوں میں سے، جس سے بھی ملے، وہی انہیں بھوت سمجھ کر سہم گیا۔

علی جو امام نے اولاد احمد اور وارث معصوم کو ساتھ لے ٹیگور ہسپتال سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بارہ ٹوٹی چوک کے فٹ پاتھ سے لائی گئی لاوارث لاش کو سرکاری خرچ پر جلا دیا گیا۔

جب آچاریہ مہادیو اچانک بک لینڈ پریس کے پروف ریڈر پنا لال کے سامنے آئے تو وہ انہیں بھوت سمجھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ تین دن

تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔

''میں بیراگی بھیا انوراگی......'' جانے کس کس بات پر زور دیتے رہے آچاریہ مہادیو۔

چاند تاروں کے تلے، کون سا قصہ چلے!

ہماری پہچان...... رفوگر کی دکان۔

بھاری ڈیل ڈول، لمبی ڈاڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ...... ہاتھ میں سوئی دھاگا۔

سگریٹ جلانے کے لیے ماچس نہیں، لائٹر...... گل ہما کی سوغات۔

''لونگ لوس فوک لور! اور گل ہما زندہ باد!''

اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

''کبھی تو ہنسائے، کبھی یہ رلائے...... زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے......''

''ہم تو ہر آدمی کو اپنے سے آگے مانتے ہیں۔ اس کا پیار ہمیں ملے نہ ملے۔ وارث معصوم نے جیسے اندھیرے میں روشنی کی پگڈنڈی پر اتہاس گوسوامی کو چلتے دیکھا۔ دائیں مس فوک لور، بائیں گل ہما۔

اب کیا ہوگا، کسے خبر! لوک یان کے لیے جینا اور مرنا اتہاس گوسوامی کا دھرم ایمان۔

''پیار کر کے بھلانا نہ آیا ہمیں......'' رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔

کتاب محل بڑھیا لائبریری ہے جیسے کسی مفلس نے پرانے خزانے کا پتہ چلایا۔

''یہ کون سی پُستک تھی، جو تم پڑھ رہے تھے۔'' پنالال نے چنچل سنگھ سے پوچھا۔

جتنی پرچھائیاں، اتنی سیڑھیاں...... ساتھ صدیوں پرانا ہے اپنا!

''دکھیا کیوں اتنا سنسار!'' نظم بن پھول کا۔

اٹ پٹا سا بول ''پگلا کہیں کا!''

اپنے دھاگے، سدا آگے۔ کہیں خیر مقدم، کہیں الوداع۔

سوئی ڈگر ہو یا ہو سیلہ۔ تشریف لائیے حضور!

''رفوگر کے لیے ضروری ہے کہ کپڑے میں جان ہو۔'' رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔

''اب تو اپنے آپ پر آئے نہ وشواس۔'' چنچل سنگھ بول اٹھا۔

بال بچے دار پنالال نئی دلہن بیاہ لایا۔

دلہن نے اسے نیا خطاب دے ڈالا:

''چیونٹیوں بھرا کباب!''

گفتگو ہوتی رہی گھنٹوں۔

چنچل سنگھ کو یہی بات ناگوار گزرتی کہ کوئی اسے ہوٹل مہاراجہ سمجھ کر ہی اس کا احترام کرے۔

ہم کتنا ٹوٹ کے روئے جب لال صوفی کا دھڑ ملا، سر غائب۔
وارث معصوم گنگنا تا رہا:

قصیدے سے نہ چلتا ہے، نہ یہ دوہے سے چلتا ہے
حکومت کا ہے جتنا کام، سب لوہے سے چلتا ہے

وہ کون تھا، جو مسکرا کے پاس سے گزر گیا؟
آچاریہ مہادیو نے جوگی بننے کا سپنا دیکھا۔
یوگ آشرم سے لگاؤ۔
شادی سے دور۔
اس پنی کا ناش ہو، جس کی دوستی کے کارن انہیں مینڈرکس کی لت پڑ گئی۔ مٹی میں مل گیا یوگ کا سپنا۔
ہاتھ میں اخبار کا سنڈے ایڈیشن۔

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

اب کس بات کا پردہ، جب نغمہ گونج اٹھا؟
''بارہ دری'' نے سدھارتھ سینما میں گولڈن جوبلی منائی۔
رفو گر کو کیا چاہیے؟ چاک گریباں یا پھٹا ہوا دامن۔
بلبلیں مرتی ہیں اپنی بات پر!
لال صوفی کے مزار پر پھول چڑھا کر چنچل سنگھ نے دعا مانگی۔
دولت خاں کی دولت کا کرشمہ کہیے یا جادو جو سر چڑھ کے بولا۔
وہ تین بار لوک سبھا کا ممبر چنا گیا۔
یہ تہذیب کس نے سکھائی ہمیں؟
کون سے رسم الخط میں لکھتا رہا وارث معصوم؟
کالج کی کتاب پر جگنی کا اتنا ہی اعتماد جتنا کہ گڑیا کے کھیل پر۔
دھک دھک دھک دھک دل کی ڈفلی
ڈم ڈم ڈم ڈم ڈمرو باجے!

واہ رے آگیا بیتال!

سامنے اس موڑ پر پرندوں کا اسپتال۔

محرابوں سے چھن کر آئی دھوپ۔

سو کے قریب پرندے ہر ہفتے علاج کے لئے آتے۔ آشیاں سے دور، بڑھیا علاج۔

3

کارواں سرائے گل ہنا کی طرح اپنی ہی باہوں میں سمٹ جاتی اور کبھی نفرت کی آندھی پر جھنجھلائی سی لگتی۔ پنالال استاد کے لیے چلم بھر لاتا۔

سوالوں کی راتیں، جوابوں کے دن۔

جب آچاریہ مہادیو اخبار پڑھ کر سناتے تو پنالال اور اولاد احمد انہیں مذاق کا نشانہ بنانا نہ بھولتے۔ ٹیگور اسپتال میں ایک بار انہیں لاوارث لاش مان لیا تھا۔

دنگے فساد کی خبریں سنتے سنتے کبھی رفوگر کی سوئی سے دھاگا نکل جاتا، کبھی سوئی ہاتھ میں چبھ جاتی اور خون کی بوند چھلک جاتی۔

بادلو! او بادلو! او بادلو

مر گیا طوطا ہمارا مر گیا!

علی جو امام کو پسند کرنے والوں کے ڈھیر سارے نام!

"دیکھ مجھے جھوم گیا ندیا کا درپن!" "بن پھول کا نغمہ!

جانے کون کون سی یاد محفل کا دامن تھامتی رہی!

چائے آئی اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

چائے آئی چائے آئی
دگنے بھاؤ کی چائے آئی

4

آچاریہ مہادیو نے رائٹر سے سگریٹ سلگایا اور کش لے کر گنگناتے رہے:

"دوری نہ رہے کوئی، آج اتنے قریب آجاؤ!"

"چاندی جب مل گئی، ہم چاندنی سو لئے۔۔۔" اولاد احمد کی تھاپ!

ہم نے تو ہر طرح کے پھول ہار میں پرو لئے ۔۔۔'' وارث معصوم کی تان۔

قصہ پنالال کا!

رفو کرتے کرتے علی جو امام کو جانے کیا خیال آیا کہ اٹھ کر چلے گئے۔

جانے سے پہلے جیب سے نکال کر پچاس کا نوٹ چوکی پر رکھ دیا۔ شیشے کے پیپر ویٹ کے نیچے۔

اتنے میں پنالال آیا اور چپکے سے نوٹ اٹھا کر نو دو گیارہ۔

اولاد احمد نے اسے نوٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔

رفوگر واپس آیا تو اولاد احمد نے پنالال کی شکایت کی۔

''وہ نوٹ تو اسی کے لیے تھا۔'' رفوگر مسکرایا۔

رحمان یہ خبر لایا کہ دولت خاں نے کام روپ اور بن پھول کے لیے دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا سمادا نر ریستوران میں۔

''ووٹ حاصل کرنے کا نیا ہتھکنڈا۔'' وارث معصوم ہنس پڑا۔

''آج قصے کو پھپھوندی لگ گئی!۔۔۔'' اولاد احمد گنگناتے رہے۔

5

قاتل بڑا بے رحم تھا' جو لال صوفی کا سر کاٹ کر لے گیا اور دھر جھاڑیوں میں چھپا گیا۔

سوال پوچھو' جواب دیں گے۔

''قتل ناحق صوفی معصوم کا!'' اولاد احمد کی تھاپ۔

ذرا سی بھول یہ رنگ لائی۔

اب کہاں وہ کتھا گھاٹ!

پرندوں کا اسپتال ۔۔۔ کارواں سرائے کی شان۔

اسپتال کی نئی عمارت پر دولت خان نے دولت نچھاور کی۔

سدھارتھ سینما کا مالک ۔۔۔ دولت خان۔ بک لینڈ پریس کا بھی وہی پروپرائیٹر۔

سینما ۔۔۔ بیوی کے نام

پریس ۔۔۔ چھوٹے بھائی کے نام

اصل بنیاد تو عقیدت ہے ۔۔۔ یہی ایمان کی حقیقت ہے۔

سدھارتھ سینما میں نئی فلم ''لوگ کہتے ہیں۔''

مر گئے' کھو گئے' جاتے رہے۔۔

اللہ اللہ لوریاں۔۔۔دودھ بھری کٹوریاں۔۔

رشوت کا ایک نام۔۔۔چاندی کی لگام۔

کارواں سرائے پر علی جو امام کی چھاپ۔اس کی دوکان کارواں سرائے کی پہچان

6

پگلی بھکارن سوکھے پیڑ کے تنے پر پانی ڈالتی رہی۔

پیڑ پر نئے پتے آ گئے۔

خواب میں ہم اپنے ہی جنازے کے ساتھ چلتے رہے۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

پنالال کے دماغ پر سوار۔۔۔بن پھول۔

وہ مدھومتی کے کنارے موجود رہتا' جب بن پھول مدھومتی سے نہا کر نکلتی۔

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ' ٹوٹ کے برسا پانی

''میں نے پیروں میں گھنگھرو باندھے' جتنے کھاتے گھنگھرو بولیں۔'' ناچنا شروع کرنے سے پہلے بن پھول کا اپنے الکھ نرنجن سے یہی نویدن۔

دولت خاں۔چوتھی بار لوک سبھا کا انتخاب جیت گیا۔

علی جو امام کی اور بات۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کا احترام
ہو مبارک او علی جو او امام

سکھ دکھ رہتے جس میں مل کر' جھلمل بستی اس کا نام۔

لال صوفی کا سر کاٹ کرلے گیا ہتیارا

آج تک اس کا پتہ نہ چل پایا

پرندوں کا اسپتال۔۔۔اس کی بچی یادگار۔وہ جب تک زندہ رہا' پرندوں پر جان چھڑکتا رہا۔

مارا گیا لال صوفی۔۔۔جو نفرت کے خلاف لڑتا رہا۔

مزار میں دفن۔۔۔۔سر کٹا لال صوفی۔
لوگوں کا گُل شہید، جو زندگی بھر نفرت کے خلاف لڑتا رہا۔
لال صوفی کا مرثیہ۔۔۔۔اولاد احمد کی کتاب کا حرف آخر:

بانس کے پتے پر یہ شبنم	ماتم والے بولے کم کم
آنکھوں سے پلکوں کی باتیں	پھر ڈھو ڈھو روتے رہے ہم
آنسو کی کیا آب و تاب	کیسے پڑھتے رہے کتاب
یہ زندہ اور مردہ لوگ	آنسو میں موتی کی آب
کیسا پلٹا ہے یہ موسم	دم توڑے پتوں پر شبنم
وہی سوال اور وہی جواب	کہاں گیا وہ اپنا ہمدم

کھنڈر کے پیچھے چاندنی رات میں چمیلی کے منڈوے تلے سو رہی تھی بن پھول۔
اسے ناگ نے ڈس لیا۔
اس کی ارتھی کے ساتھ علی جو امام دوکان سے شمشان تک چونیاں اور اٹھنیاں نچھاور کرتا رہا۔
اب کہاں بن پھول کی جھنکار!
اولاد احمد کی زبان پر جاپان کا ایک ہائیکو:
بس ایک تتلی۔۔۔ننھی جان
مندر کے گھڑیال پر
بے خبر سوتی رہی!
کارواں سرائے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
بن پھول کے الکھ نرنجن کام روپ کی آتما بھی پنجرا خالی کر گئی۔
کارواں سرائے ارتھی کے ساتھ ساتھ
چھتیس گڑھ کے چودھری بھی شامل ہوئے
''رام رام ست ہے'' کے ساتھ ''اللہ ہو'' کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔
چنچل سنگھ نے چندن کی چتا سجائی۔
آچاریہ مہادیو نے چتا کو آگ دکھائی
تیرہ دن تک کارواں سرائے کام روپ کا سوگ مناتی رہی۔۔۔۔چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔

بچوں کا شور:

دھوئیں دھوئیں تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

7

آج مزار گل شہیدؒ پر قوالی کی رات۔
اپنا لال صوفی۔۔۔کارواں سرائے کا گل شہید
یاد رہے گا اس کا نغمہ

وہ ہندو ہوں کہ مسلم ایک ہی مٹی کے برتن ہیں
کوئی ہیں شیخ جی ان میں' کوئی ان میں برہمن ہیں

دائیں رحمان اور خلیل' بائیں اولاد احمد اور وارث معصوم۔
بیچ میں آچاریہ مہادیو۔
چپ کیوں ہو گئے؟ جواب دو۔
علی جو امام کیوں نہ آیا ہمارے ساتھ؟
رفو گر کی دوکان سے چل کر وہ بیگم پل سے گزرے۔ دائیں کھچڑی پور' بائیں چتر لیکھا کالونی۔
بارہ دری سے ہو کر عید گاہ مارگ پر چلتے چلتے کتاب محل کو پیچھے چھوڑا۔
جھلمل بستی سے آگے مزار گل شہید۔
شیطان طوفان' اللہ نگہبان۔ ہم قربان!
ان کا یہی احساس کہ یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ نہ راجہ نہ بھکاری' نہ رانی اور داسی کے بیچ کوئی دیوار!
جہاں ڈر' وہیں ہمارا گھر!
اب وہ زمانہ کہاں کہ سونا اچھالتے جاؤ۔
اولاد احمد کی یہی شکایت کہ اتہاس گو سوامی تشریف نہ لائے۔
جھوٹی قسم کون کھائے:
وارث معصوم کہہ رہا تھا کہ گل ہما اور مس فوک لور ہی چلی آتیں۔

آچاریہ مہادیو بولے:

''اگر مس نوک لور کو بھی فرصت نہ تھی تو کل ہماہی چلی آتی۔''

ہر طرف جنگل نظر آنے لگا

وصل ہو یا وصال ہو یا رب!

ہم قربان!

سات قرآن درمیان!

سب نے نہا کر کپڑے بدلے!

قوالی کی رات!

سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی پہلی منزل ہے!

اس وقت کی گردش یاد کرو جب ساز ملائے جاتے ہیں!

وارث معصوم اور اولاد احمد یہ دیکھ کر جھوم اٹھے کہ اتہاس گوسوامی پہلے سے محفل میں موجود ہیں۔

مٹی میں گلاب کی سگندھ۔

آچاریہ مہادیو نے ہاتھ جوڑ کر اتہاس گوسوامی کو پرنام کیا۔

جانے کون سی ان بوجھی پہیلی بوجھی جارہی تھی۔

اپنے تو ہیں سو سو یار   دُھنئے بنکر اور منہار
دل کی دنیا بہت اندھیری   اندھیارے میں کاروبار

اچانک درگاہ کے اندر ایک آدمی آکر چلایا:

''فساد شروع ہو گیا!''

بکھرے بال، کندھے گھائل، سر لہولہان۔

چیختے چلاتے وہ گر پڑا۔

قوالی کی محفل درہم برہم۔

اب کیا ہوگا؟

خلیل اور رحمان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اولاد احمد اور وارث معصوم بولے:

''چلو آچاریہ مہادیو! اب بھاگ چلیں۔''

وہ چلتے رہے، گرتے پڑتے چلتے رہے۔
افراتفری، وحشت غم کا پہاڑ۔
بلند عمارتیں آگ کی نذر۔
گلیاں لہولہان۔
کالی سڑکیں سرخ ہوگئیں۔
راہیں لاشوں سے پٹ گئیں۔
اپنی ہی دوکان کی سیڑھیوں پر مارا گیا علی جوامام۔
سفید گھوڑے کا کالا شہسوار
اُس کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔۔۔ گھوڑے کی ایال پر!
آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، گرتے رہے!
مارا گیا علی جوامام:
ایک ہاتھ میں سوئی، دوسرے میں دھاگا!۔۔۔۔



شفیق الرحمٰن

نام	:	شفیق الرحمٰن
قلمی نام	:	شفیق الرحمٰن
پیدائش	:	۹ نومبر ۱۹۲۰ء بہ مقام کلانور ضلع روہتک، مشرقی پنجاب
وفات	:	۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء بہ مقام راولپنڈی
تعلیم	:	ایم۔بی۔بی۔ایس (پنجاب)' ڈی۔پی۔ایچ (اڈنبرا برطانیہ)' ڈی۔ٹی۔ایم۔اینڈ ایچ (لندن) فیلو آف کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز (پاکستان)

۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' لاہور سے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا۔ آزادی کے بعد آپ کو پاکستان آرمی کی طرف سے اڈنبرا اور لندن یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھیج دیا گیا۔ دو برس وہاں رہ کر ڈی۔پی۔ایچ اور ڈی۔ٹی۔ایم اینڈ ایچ کے ڈپلوما کورس کیے۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام عبدالرحمٰن خان تھا۔ شفیق الرحمان کا بچپن سی۔پی (بھارت) میں گزرا۔ کنگ ایڈورڈ کالج' لاہور میں زمانۂ طالب العلمی کے دوران ڈرائنگ کلب کے سیکرٹری اور کالج میگزین کے ایڈیٹر (۴۲-۱۹۴۱ء) رہے۔ لڑکپن اور جوانی میں سیر و سیاحت' کرکٹ' باکسنگ اور تیراکی میں جنون کی حد تک دلچسپی رہی۔ کارٹون نگاری' مصوری اور فوٹوگرافی کے خبط اس کے علاوہ تھے۔'

۱۹۴۲ء میں ساڑھے اکیس برس کی عمر میں ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال لاہور میں چند ماہ ہاؤس جاب کیا اور اُسی سال انڈین میڈیکل سروس میں چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر ملازمت کرنے اور کئی ممالک دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی تبدیلی پاکستان آرمی میڈیکل کور میں ہوگئی اور حکومت کی طرف سے آپ کو پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ بھیج دیا گیا۔ پانچ برس

کے لیے آپ کو بری فوج سے بحریہ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں سے ستمبر ۱۹۷۹ء میں سرجن ریئر ایڈمرل کے رینک سے بطور ڈائریکٹر میڈیکل سروسز ریٹائر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا جہاں سے دسمبر ۱۹۸۶ء میں مدت ملازمت ختم ہو جانے کے بعد راولپنڈی میں ریٹائرڈ زندگی گزاری۔ آپ کی شخصیت اور فن سے متعلق کام کرنے پر یوسف ساجد کو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن نے ایم۔فل (اردو) کی ڈگری سے نوازا۔ ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء کو فوجی قبرستان، راولپنڈی میں آسودہ خاک ہوئے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''کرنیں'' (افسانے) مکتبہ اردو، لاہور: طبع اول ۱۹۴۲ء

اس کتاب کا دیباچہ حجاب امتیاز علی نے لکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ جدید، دہلی نے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔

۲۔ ''شگوفے'' (افسانے/مضامین) طبع اول ۱۹۴۳ء

۳۔ ''لہریں'' (افسانے) نفیس اکیڈمی، حیدرآباد دکن طبع اول ۱۹۴۳ء

اس کتاب مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ایک ایڈیشن ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن نے شائع کیا۔

۴۔ ''مدوجزر'' (افسانے) امرت الیکٹرک پریس، لاہور طبع اول ۱۹۴۴ء

۵۔ ''پرواز'' (افسانے) طبع اول ۱۹۴۵ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے جبکہ مکتبہ جدید دہلی نے اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں نکالا۔

۶۔ ''جنگ اور غذا کا مسئلہ'' (معاشیات) نفیس اکیڈمی، حیدرآباد دک طبع اول ۱۹۴۳ء

۷۔ پچھتاوے'' (افسانے) طبع اول ۱۹۴۶ء

سولہ افسانوں کے اس مجموعے کو ادبی دنیا، اردو بازار، دہلی نے بھی شائع کیا۔

۸۔ ''حماقتیں'' (افسانے) طبع اول ۱۹۴۷ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۹۔ ''مزید حماقتیں'' (افسانے) مکتبہ میری لائبریری لاہور طبع اول ۱۹۵۴ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۰۔ ''نئے شگوفے'' (افسانوں کا انتخاب) ہند پاکٹ بکس، دہلی طبع اول س۔ن

۱۱۔ ''دجلہ'' (ناولٹ) غالب پبلشرز، لاہور طبع اول ۱۹۸۰ء

۱۲۔ ''معاشرہ اور ذہنی صحت'' (از ایلز بتھ ایم ڈاج کا ترجمہ) مقبول اکیڈمی' لاہور

''YOUR COMMUNITY MENTAL HEALTH'' کا ترجمہ ہے۔

۱۳۔ ''انسانی تماشا'' (ناول از ولیم سرویاں ترجمہ) مکتبہ جدید، لاہور طبع اوّل ۱۹۵۶ء

یہ کتاب موسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔ ناول ''THE HUMAN COMEDY'' کا ترجمہ ہے۔

۱۴۔ ''آپ کا آپریشن'' (جراحی/ کتابچہ، از رابرٹ ایم کننگھم) مقبول اکیڈمی' لاہور طبع اوّل ۱۹۶۵ء

یہ کل ۴۴ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۵۔ ''طبع تحقیق آپ کو مہلک امراض سے بچا سکتا ہے'' مکتبہ اردو' لاہور: (طب/ کتابچہ) طبع اوّل ۱۹۶۴ء

از گلبرٹ کانٹ کا ترجمہ یہ کل ۵۶ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۶۔ ''کیا میرا بچہ تندرست پیدا ہوگا؟'' مقبول اکیڈمی' لاہور (طب/ کتابچہ) از جان گولڈ کا ترجمہ، طبع اوّل ۱۹۶۴ء

یہ کل ۵۶ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۷۔ ''درس زندگی'' (سماجیات) شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور طبع اوّل ۱۹۶۵ء

پطرس بخاری و ایڈورڈ مروکی کتاب کا ترجمہ بہ اشتراک عبدالمجید سالک کل ۱۹۸ صفحات کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۱۸۔ ''ذہنی امراض اور ان کا علاج'' (ترجمہ) مقبول اکیڈمی' لاہور طبع اوّل:

(نوٹ) شفیق الرحمٰن کے افسانوں اور مضامین سے متعلق معروف کتب کے موجودہ ناشر غالب پبلشرز' سمن آباد' لاہور ہیں۔

۱۹۔ ''شکاری اور بھوت'' (بچوں کے لیے) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع ثانی: ۲۰۰۷ء

غیر مدوّن:

کم از کم دو مجموعوں کا مواد (افسانے/ مضامین) زیر ترتیب ہے۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

۱۔ ۲۶۔ ویسٹریج 1، راولپنڈی، پاکستان۔

۲۔ معرفت۔ ایچ رحمٰن اینڈ کمپنی۔ ہارون آباد ضلع بہاولنگر' پاکستان

اعزاز:

۱۔ ہلال امتیاز (ملٹری)

نظریۂ فن:

''جو خود پر بیتی اور جن حالات میں دوسروں کو دیکھا وہ لکھ دیا۔''

(بحوالہ مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ستمبر ۱۹۸۴ء)

○

حوالہ جات:

۱۔ بہ حوالہ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی

۹۹ ناٹ آؤٹ

شفیق الرحمٰن

بڑی مشکلوں سے ہم نے وہ میچ جیتایا یوں کہئے کہ ہارتے ہارتے بچے۔ سب سے زیادہ اسکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی اسٹروک ایسا نہ تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تین رنز بنائے۔ اس کے بعد جو اچھل اچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک اسکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بے حد تیز کھیلا۔ آگے بڑھ کر وہ ہٹیں لگائیں کہ پانچ رنز کا اضافہ اور کر دیا۔ جب ہم شام کو رو پیٹ کر جیتے اور آخری کھلاڑی نے آخری ہٹ لگی تو مقصود گھوڑا ہیں رنز بنا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے گزرے تھے، وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے۔ ان کی بالنگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے دس نے بالنگ کی تھی اور گیارہواں وکٹ کیپر تھا اور مجبور تھا ورنہ وہ بھی حسب توفیق مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ٹیموں کو یہ ڈر نہیں ہے کہ کہیں ہار نہ جائیں بلکہ یہ خطرہ ہے کہ کہیں جیت نہ جائیں۔

میں مقصود گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوسٹل میں پہنچا ان کے کمرے میں مدھم روشنی میں ایک بڑے سے پلنگ پر چند حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔ شیطان بولے ''سردی زیادہ ہے اور ہم تھکے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے ہمارے لئے رضائی منگوائی اور ہم بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ مقصود گھوڑے نے پوچھا ''روفی صاحب آپ کیسے ہیں؟''

شیطان بولے۔ ''میں بفضل خدا تعالٰی بخیریت ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں تندرست ہوں۔''

میں نے سیکنڈ شو کے لیے کہا اور پوچھا کہ ''اب کیا بجا ہوگا؟''

شیطان گھڑی دیکھ کر بولے ''جمعرات ہے!''

ویسے سینما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔'' شیطان بولے ''ایک گھنٹے کا کیا ہے، دس منٹ میں گزر جائے گا۔ آج سینما اسی طرح چلیں

گے؟؟؟ رضائیاں اوڑھ کر' اور نوکر حقہ ساتھ لے کر چلے گا۔''

بڑی بحث ہوئی۔ مقصود گھوڑا بولا۔ ''میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ رضائیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ۔۔۔''

شیطان جلدی سے بولے۔ ''میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔ آج رضائیاں اوڑھ کر ہی چلنا ہوگا' سردی بہت ہے۔''

''اوورکوٹ پہن لو۔'' میں نے کہا۔

''یہ اوورکوٹ کمبخت ایسا ہے کہ اسے پہن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے۔''

''یہ وہی اوورکوٹ تو نہیں جسے الٹوایا گیا تھا؟''

''ہاں! وہی ہے! پہلے اسے الٹوایا گیا تھا' پھر سیدھا کرایا گیا ہے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔''

''یہ روشنی بہت مدھم ہے۔'' کسی نے کہا۔

شیطان نے نوکر سے پوچھا۔ ''کیوں! یہ بلب کتنے ہارس پاور کا لائے ہو؟''

اس غریب نے بلب کی ہارس پاور بتادی۔

شیطان بولے۔ ''آج بجلی ہی بہت کم آرہی ہے۔''

شیطان چلتے وقت اپنی عینک ڈھونڈنے لگے۔ کسی نے بتایا کہ ایک عینک تو ان کی ناک پر رکھی ہے۔

بولے۔ ''آج کل میرے پاس تین عینکیں ہیں۔ ایک دور کی چیز دیکھنے کے لیے دوسری نزدیک کی چیزیں دیکھنے کے لیے۔۔۔ اور تیسری ان دونوں کو ڈھونڈنے کے لیے۔''

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جج صاحب کے کنبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔۔۔ ذرا سی دیر میں ہم ٹھنڈی سڑک پر رضائیاں اوڑھے جارہے تھے اور ہمارے پیچھے نوکر حقہ تھامے آرہا تھا۔

سینما پہنچے۔ وہاں اتفاق سے میری نگاہ جج صاحب کی موٹر پر جا پہنچی۔ میں نے اندر جاتے وقت اپنی رضائی تو مقصود گھوڑے کے اوپر پھینکی اور شیطان کی نظر بچا کر دور جا بیٹھا۔ پیچھے مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو جج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں نظر نہ آجاؤں۔ مگر ذرا سی دیر میں ننھی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے پیچھے جانا پڑا! مجھے ننھی کی سیٹ ملی۔ جج صاحب نے پہلے تو میرے نہ آنے کی شکایت کی۔ میں نے امتحان کا بہانہ بنادیا۔

پھر بولے۔ ''تمہارے ساتھ وہ خواتین کون تھیں؟''

''کون سی خواتین؟''

''ابھی ابھی جو تمہارے ساتھ تھیں۔ وہ جو سامنے بیٹھی ہیں۔'' انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو حقہ پی رہے تھے۔

''ارے! لاحول ولاقوۃ! یہ خواتین تو حقہ پی رہی ہیں'' وہ چونک کر بولے۔

''جی نہیں۔۔۔ یہ خواتین نہیں ہیں۔۔۔ کچھ اور ہی ہیں۔''

میں جو کہہ رہا ہوں کہ خواتین ہیں۔۔ غضب خدا کا۔۔! مستورات کو حقہ پیتے میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔''

میں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ان دنوں رضیہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی اور میں کافی بیزار تھا۔ شیطان مجھ سے بیزار تھے۔بار بار وہ یہی کہتے کہ

''میاں اگر کوئی بس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہیے۔۔۔دوسری ابھی آتی ہو گی۔''

ان دنوں میں جتنا اسے منانے کی کوشش کرتا اتنا وہ اور روٹھ جاتی۔روٹھنے کی وجہ تھی ایک لڑکی جو ٹینس میں میری پارٹنر تھی۔اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن سب اسے عینک کہا کرتے۔اس کے خدوخال میں سب سے نمایاں چیز اس کی عینک تھی۔بڑی لمبی چوڑی اور وزنی عینک! اگر میں رضیہ کی جگہ ہوتا تو ہرگز بدگمان نہ ہوتا۔ننھی نے ہمیں چند مرتبہ اکٹھے دیکھا اور رضیہ سے کہہ دیا پھر ایک شام کو عینک نے کہا کہ ''میرے ڈیڈی شام کی ٹرین سے گزر رہے ہیں' مجھے اسٹیشن پر لے چلیے''

اس کے پاس سائیکل نہیں تھی اور ٹرین میں بہت تھوڑا وقت تھا۔میں اسے لے کر نکلا ہی تھا کہ رضیہ اور حکومت آپا مل گئیں۔ادھر اسٹیشن پر ہمیں ایک نہایت ہی کرخت قسم کے دراز ریش بزرگ ملے جنہیں ہرگز ڈیڈی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میرا اور شیطان کا امتحان نزدیک تھا اس لیے ہم دونوں جج صاحب کے ہاں سے ہوسٹلوں میں چلے آئے تھے۔ان دنوں جج صاحب بڑی سُرعت سے کوٹھیاں بدل رہے تھے شیطان جب کبھی ان سے ملتے یہی پوچھتے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔

ان کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی۔جج کے ہاں چوری! صبح صبح پتہ چلا کہ رات کو چوری ہوئی لیکن سب چیزیں جوں کی توں تھیں' پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ چرایا کیا گیا ہے۔یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور محض تفریحاً آئے تھے۔بعد میں پتہ چلا کہ میرے سارے کپ جو انگیٹھی پر اور الماریوں میں رکھے تھے' غائب ہیں۔خوب چمکیلے اور بڑے بڑے کپ تھے۔وہ کوٹھی ویسے تھی بھی سنسان سی جگہ میں۔ایک مرتبہ سارا کنبہ کسی دوسرے شہر میں گیا ہوا تھا۔میں اور شیطان سیکنڈ شو دیکھ کر دیر سے لوٹے۔کوٹھی میں بالکل اندھیرا تھا۔ہم دیوار کود کر چھوٹے راستے سے اندر چلے گئے۔اندھیرے میں آہٹ سنائی دی' دبے پاؤں جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب تالا کھولنے کی کوشش فرما رہے تھے۔جب تالا کھل گیا تو شیطان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا ''یار بڑے افسوس کی بات ہے۔''

انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہم نے انہیں کہیں نہ جانے دیا۔اندر لے آئے۔انہیں چائے پلائی گئی' چاکلیٹ کھلائے گئے۔پھر کپوں کے متعلق پوچھا گیا۔انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے نہیں چرائے۔اگر وہ چوری کرتے بھی تو کپ کبھی نہ چراتے۔سپورٹس مین معلوم ہوتے تھے۔ہم نے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا۔جج صاحب نے کوٹھی بدلی' نئی کوٹھی میں بجلی کی فٹنگ بالکل غلط تھی' پنکھا چلاؤ تو قمقمے جلتے تھے' ٹیلیفون کرو تو پنکھا چلتا تھا' ریڈیو بے حد ٹھنڈا رہتا۔ادھر سردنعمت خانے میں موسیقی سنائی دیا کرتی۔پھر جو کوٹھی بدلی تو پڑوس میں دن رات قوالیاں ہوتیں۔بینڈ بجتے' جلسے ہوتے غرضیکہ اسی طرح ہوتا رہا۔اب جو نیا مکان ملا تو ایسی جگہ کہ آس پاس بے شمار لڑکیاں رہتی تھیں۔شام کو لڑکیاں سکول اور کالج سے واپس لوٹتیں' خوب رونق ہوتی۔شیطان نے اس جگہ کا نام مینا بازار رکھا۔پروگرام یہ تھا کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوسٹل چھوڑ کر جج صاحب کے ہاں آ جائیں گے۔

جج صاحب بدستور ان خواتین کو دیکھ رہے تھے جو حقہ پی رہی تھیں۔رضیہ نے دوپٹہ اس انداز سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اس کی ناک کا ذرا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔میرے خیال میں وہ ان تمام ناکوں کے ذرا سے حصوں سے حسین تھا جو میں نے آج تک دیکھے تھے۔حکومت آپا مجھے بڑی بری طرح گھور رہی تھی۔۔۔سنو ننھی۔۔۔ایک شخص اندھیری رات میں شیر کا شکار کھیلنے ایک بہت ڈراؤنے اور تاریک جنگل میں گیا۔شیر

بولا ہرے۔۔۔اچھا ایک اور کہانی سنو۔۔۔سنو۔۔۔دو چیتے کے شکاری اور ایک چیتا۔۔چیتا۔۔۔ننھی باقاعدہ ڈر گئی۔

چلتے وقت جج صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ہمارا اگلا میچ دیکھنے ضرور آئیں گے۔

ہمارے کلب کے کپتان گیدی صاحب تھے۔ ان کا اصلی نام زیدی' مہدی یا کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کا قد بہت چھوٹا تھا۔ اور بقول شیطان کے وہ سطح سمندر سے ساڑھے چار فٹ بلند تھے۔ ان کے ساتھ ہر وقت ان کے دو مشیر ہوتے، اتفاق سے جو کافی دراز قد تھے۔ گیدی صاحب ان کے درمیان میں چلتے' شیطان نے ان تینوں کا نام ایک سو ایک ''۱۰۱'' رکھا ہوا تھا۔ ان کے قدوں کے مطابق۔

ٹیم کی انتخابی کمیٹی بھی تھی جو ایک ممبر پر مشتمل تھی۔ گیدی صاحب پر ابڈی بھی ہمارے کلب کا ممبر تھا۔ امریکہ۔ وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس بال کی طرح کھیلتا تھا۔ ہمارے کلب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم لگاتار تین میچ جیت کر فائنل کھیلنے والے تھے۔

سہ پہر کو ٹیم پریکٹس کے لیے آئی۔ گیدی صاحب میچ کے لیے بیٹنگ کی ترتیب دینے لگے۔ شروع میں وہ اور مقصود گھوڑا! ساتویں پر بڈی آٹھویں پر میں اور نویں پر شیطان۔ حساب لگانے کے بعد جب شیطان کو معلوم ہوا کہ وہ گیارہواں کھلاڑی ہیں تو مچل گئے۔ گیدی صاحب سے بولے۔ ''مجھے گیارہواں کیوں بھیجا جا رہا ہے؟''

''اس لیے کہ کوئی بارہواں نہیں ہوتا۔'' جواب ملا۔'' کپتان ہمیشہ صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کا نظریہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔''

شیطان بولے۔ ''ہر شخص کے دو نظریے ہوتے ہیں۔ اس کا ذاتی نظریہ۔۔۔اور غلط نظریہ!''

مصیبت یہ تھی کہ شیطان نہ بالر تھے نہ بیٹسمین' نہ وکٹ کیپر اور ان کا دعویٰ تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کی ٹیم میں پانچ بہترین بیٹسمین ہونے چاہئیں' چار بہترین بالر' ایک اچھا وکٹ کیپر اور ایک روفی۔ ویسے تقریباً ہر میچ میں شیطان کا اسکور صفر ہوتا۔

ہر روز جب مشرق سے سورج نکلتا ہے تو کلیاں کھل کر پھول بن جاتی ہیں۔ تتلیاں جاگ اٹھتی ہیں' پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ ہر روز سورج ڈوبتے وقت آسمان گلابی ہو جاتا ہے۔ چاندنی رات میں ایک عجیب سا فسوں آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔ لیکن حکومت آپا کو ان باتوں کا علم تک نہ تھا۔

جب ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو عجب سہانا سماں تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں ٹہنیوں اور پتوں پر رقصاں تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ گلاب کے سرخ پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بیکار تھا۔ کیونکہ نزدیک ہی حکومت آپا بیٹھی تھیں۔

حکومت آپا مجھ سے خفا اس لیے ہوئیں کہ جب وہ موٹی ہو گئی تھیں تو میں نے ان کو دبلا ہونے کا مناسب نسخہ نہیں بتایا۔ میں نے فاقہ کشی تجویز کی۔ وہ بولیں۔۔۔''نہیں کوئی کھانے کی ایسی تجویز بتاؤ جس سے دبلی ہو جاؤں۔''

بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے ان کا لنچ چھڑایا۔ ایک روز جا کر دیکھتا ہوں تو وہ چائے پر پلاؤ کھا رہی تھی۔۔۔اور میں نے ان کا لنچ پھر شروع کرا دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح شام کلیان گایا کرتی ہیں اور باتیں کرتے وقت وہ کہتی کچھ ہیں' ان کی نگاہیں کہیں اور ہوتی ہیں اور دھیان کسی اور طرف اور باتوں کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں۔۔۔اور سورج غروب ہو گیا۔

کھانے کے بعد مجھے یونہی خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپا دیر سے غائب ہیں۔ تلاش کرنے پر دیکھتا ہوں کہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے ہیں اور رومان انگیز گفتگو ہو رہی تھی۔ میں چھپ کر سننے لگا۔

شیطان بولے۔ ''سچ مچ تم بہت پیاری معلوم ہو رہی ہو۔''

حکومت آپا بولیں'' سچ مچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔''

شیطان بولے'' یقیناً ان چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے۔ جب تم جون میں آئیں تو تمہاری جون بدلی ہوئی تھی۔''

'' روپے کون مانگتا ہے تم سے۔۔ بھلا ایسی رومان پرور فضا میں جہاں باغ کا ایک تنہا گوشہ ہو فوارہ چل رہا ہو چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو وہاں روپوؤں کا کیسے خیال آسکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹ لینے لگتی ہے۔''

'' سچ مچ؟'' حکومت آپا شرما گئیں۔

'' ہاں سچ مچ''

'' بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے۔''

'' کلوروفارم کی'' شیطان بولے'' اور جانتی ہو حکومت کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟''

'' کون ہے؟''

'' آئینہ! اور کئی انسان آئینے کو بھی دھوکہ دے جاتے ہیں۔ آئینہ کچھ کہے وہ ایک نہیں سنتے' ان میں سے ایک تم ہو!''

اب حکومت آپا کچھ بگڑنے لگیں۔ شیطان جلدی سے بولے'' نہیں یہ بات نہیں ہے۔۔ یوں ہی منہ سے نکل گیا تھا۔''

پھر رومانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا بولیں۔'' رومانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کونسی ہے؟''

'' ڈکشنری'' شیطان نے جواب دیا۔

حکومت آپا شیطان کے چہرے کو غور سے دیکھتی ہیں پھر بولیں۔۔'' تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟''

'' شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے۔ کیا بتاؤں ناک لمبی کیوں ہے! یہ فطرت کے راز ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہارا ماتھا باہر کو کیوں نکلا ہوا ہے۔ تمہارے کان مڑے ہوئے کیوں ہیں' تمہارے دانت خرگوش کے دانتوں کی طرح کیوں ہیں۔۔ حکومت تم ان ہستیوں میں سے ہو جن سے اگر وقت پوچھا جائے تو گھڑی بنانے کا طریقہ بتادیں۔۔ تم ان صحرانوردوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں...... اور کل...... بھی یہیں ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور اب سب کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی واقعی لاجواب ہوگا۔''

اب تو باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ واپسی پر میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا۔ روٹھنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لیے میں نے عینک سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

شیطان بولے۔'' اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو عینک کو ہر وقت سائیکل پر بٹھائے پھروں اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز دو مرتبہ گزرا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ روٹھنا روٹھنا سب درست ہو جائے۔ میری مانو تو آج سے تم بھی رضیہ سے روٹھ جاؤ اور عینک کے ساتھ خوب چہلیں کرو اور پھر قدرت کا تماشا دیکھو۔''

میں نے ان کو اپنا خواب سنایا۔'' کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ رضیہ نے آسمانی دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے جس میں سنہرے تارے

ہیں اور روپہلی پلو جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور ہاتھ میں رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ ہے۔''

''تو جناب! آج کل خواب بھی ٹیکنی کلر میں دیکھتے ہیں۔ سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟''

''کیا؟''

''یہی کہ کوئی خواب نہ آئے۔''

میں نے ان کو بتایا کہ ''جب سے رضیہ روٹھی ہے میں تنہا سا رہتا ہوں اور میں محبت میں خوش نصیب ہرگز نہیں رہا۔''

وہ بولے۔ ''محبت میں خوش نصیب صرف ایک قسم کے انسان رہتے ہیں۔۔۔ وہ ہیں کنوارے!۔۔ اور میاں تم اگر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہو یا تنہائی سے ڈرتے ہو تو ہرگز شادی مت کرنا۔''

میں نے ایک رومان شروع کیا۔ وہ بولے۔ ''محبت کی بہترین اور مختصر ترین کہانی میں تمہیں سناتا ہوں۔۔ سنو۔۔ وہ بولا۔۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟۔۔ وہ بولی نہیں۔۔۔ اور اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔''

ہمارا میچ شروع ہوا۔ کچھ چھٹیاں تھیں اور کچھ مینا بازار کا قرب۔ ویسے بھی وہاں چاروں طرف لاتعداد ریٹائرڈ بزرگ رہتے تھے وہ سب آئے۔ ساتھ بے شمار لڑکیاں آئیں۔ ہمارے کپتان نے حسب معمول ٹاس ہارا اور ہم فیلڈ کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ ہمیں میدان پہنچ کر ہوا۔ جدھر نظر جاتی تھی رنگ برنگے ملبوسات دکھائی دیتے تھے۔

بڈی بولا۔ ''بوائے او بوائے' آج مجھے امریکہ یاد آ رہا ہے۔''

گیدی صاحب نے چمکتی ہوئی نئی گیند میرے ہاتھ میں دی میں فیلڈ جمانے لگا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا جائے غالباً وہ اس لیے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تالیاں بجیں اور بیٹسمین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بے حد موٹے تھے اور دوسرے بالکل ذرا سے تھے اور کم عمر بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسی یار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونک کر بولے ''اچھا! اتنا کم عمر اور ابھی سے ایک یار جنگ بہادر کا لڑکا۔۔۔ کمال ہے۔''

ان موٹے تازے حضرت کا نام قلندر صاحب تھا۔۔۔ شاید قلندر بیگ ہو گا یا قلندر حسین! یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا کہ جب میری تیسری گیند ان کی توند سے چھو کر وکٹ کیپر کے برابر سے گزری تو یار جنگ بہادر کے صاحبزادے ادھر سے چلا کر بولے۔۔۔ ''قلندر صاحب وہیں ٹھہریئے'' دوسرے اوور میں ہمیں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام چنومیاں تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی ہٹ لگائی۔ ادھر سے قلندر صاحب چلائے۔۔۔ ''چنومیاں وہیں ٹھہریئے!''

دیر تک یہی ہوتا رہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھہرنے کے لیے کہتے رہے۔ ایک گیند بڈی کے سامنے سے گزری لیکن اس نے ہاتھ تک نہیں ہلایا۔۔ معلوم ہوا کہ جناب لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مفت کی ایک باؤنڈری ہو گئی۔ قلندر صاحب نے ایک گیند ہوا میں اچھال دی۔ شیطان اسے بخوبی کیچ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سوائے بالر اور بیٹسمین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلندر صاحب نے وکٹ کے سامنے ٹانگ اڑا دی اور میں نے چلا کر اپیل کی تو امپائر چونک پڑے۔۔ جیسے جاگ کر بولے۔ ''ایں؟ پھر آہستہ سے کہنے لگے۔'' بھئی معاف کرنا' میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔'' یہ امپائر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے' یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہم ساری عمر بالنگ کرتے رہیں گے اور قلندر صاحب چنومیاں ساری عمر کھیلتے رہیں گے۔

دفعتاً قلندر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی۔ گیند اونچی ہوتی گئی' حتیٰ کہ نگاہوں سے غائب ہو گئی ہم سب آسمان کی طرف یوں تک رہے تھے جیسے چاند دیکھ رہے ہوں۔ پھر ایک چھوٹا سا نکتہ نظر آیا اور ہم سب کیچ کرنے کے لیے بھاگے۔ وکٹ کیپر اور مقصود گھوڑا اتنے زور سے ٹکرائے کہ دونوں عارضی طور پر بے ہوش ہو گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ پھر گیدی صاحب للکارے۔۔ ''سب ہٹ جاؤ یہ کیچ میں کروں گا۔'' گیدی صاحب دونوں ہاتھ یوں پھیلائے کھڑے تھے جیسے بڑے خشوع سے دعا مانگ رہے ہوں۔ گیند بلند فضاؤں سے اترنی شروع ہوئی اور گیدی صاحب نے ہاتھ اور بھی اونچے پھیلا دیے۔ گیند نیچے آئی۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں نہیں۔۔ شاید یہ گیند کی غلطی تھی۔۔۔ وہ سیدھی ان کے ہیٹ پر لگی ''ٹپ' سے آواز آئی۔۔ گیند اچھلی پھر ''ٹپ'' سے ہیٹ پر گری' پھر اچھلی' گری اور آہستہ سے ان کی گردن پر لڑھکتی ہوئی زمین کی طرف چل دی۔ پھر یکلخت وکٹ کیپر صاحب جو آنکھیں بند کیے بے ہوش پڑے تھے' چونکے اور گرتی ہوئی گیند کو دبوچ لیا۔

ادھر قلندر صاحب دھڑام سے گرے اور کچھ دیر کے لیے بیہوش ہو گئے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو شیطان بولے۔ ''قبلہ اب آپ کے بغیر یہ میدان خالی خالی سا معلوم ہوگا!'' واقعی قلندر صاحب نہایت موٹے تھے۔

اب جو نئے صاحب آئے انہوں نے شیطان کو دیکھا اور ان سے لپٹ گئے۔ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔

وہ بولے۔ ''آپ مجھے پہچانتے نہیں' میں وہی بیزار اختر ہوں۔''

شیطان نے بغور دیکھا اور بولے۔۔۔ ''ممکن ہے کہ آپ وہی بیزار ہوں لیکن اختر وہ ہرگز نہیں ہیں جو پہلے تھے۔''

وہ بولے۔ ''میں سچ مچ وہی ہوں۔ فقط وہی ہوں۔ فقط ذرا بدل گیا ہوں۔ پہلے سے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہے۔''

اب وہ دونوں ہیں کہ باتیں کر رہے ہیں اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر ایمپائر نے ٹوکا۔ تب بیزار اختر صاحب نے کھیلنا شروع کیا۔ میری پہلی ہی گیند انہوں نے ہوا میں اٹھا دی۔ ایک صاحب کے پاس سے گزری تو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے ان کا نام پکارا تب چونک کر انہوں نے گیند اٹھائی اور ازراہ کرم میری طرف پھینک دی۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ جس کھلاڑی کی طرف گیند جاتی فوراً اس کا نام لے کر اسے مطلع کیا جاتا۔

چنوں میاں نے گھوم کر ہٹ لگائی۔ آگے مقصود گھوڑا دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر مراقبے میں کھڑا تھا۔ ''دھم'' سے گیند اس کے پیٹ سے لگی۔ اس نے نعرہ لگا کر وہیں دبالی۔ چنو میاں آؤٹ ہو گئے اور انہیں جاتے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ شیطان دور سے بھاگے بھاگے آئے اور میرے کان میں بولے۔ ''وہ جو دو لڑکیاں دیکھ رہے ہو۔۔ وہ چنو میاں کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔''

لنچ پر معلوم ہوا کہ شیطان درست کہتے تھے۔ چنو میاں ان دونوں لڑکیوں کے لیے ہوئے آئے۔ تعارف ہوا۔ ایک بوڑھے پروفیسر اپنی لڑکیوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ ایک ہم جماعت مل گئی۔ رضیہ منہ پھیرے بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے سوڈیڑھ سو لڑکیاں اور بھی آجائیں تاکہ آج اس کے سامنے خوب چہلیں کی جائیں۔

شیطان بولے کہ ''یہ ہجوم کافی بدمذاق معلوم ہوتا ہے کسی نے ہمارا آٹوگراف نہیں لیا۔''

لنچ کے بعد مجھے اور شیطان کو باؤنڈری پر بھیج دیا گیا۔ وہاں ہم باتیں کرنے لگے۔ گیدی صاحب نے ناراض ہو کر ہمیں واپس بلا لیا اور بیٹسمین کے بالکل قریب کھڑے ہو کر فیلڈ کرنے کو کہا۔ ایسی جگہ بہت سنجیدگی سے فیلڈ کرنا پڑتا ہے۔ ہم بہت گھبرائے' یہی دعا مانگ رہے تھے

کہ کہیں کوئی کیچ نہ آ جائے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے باتیں شروع کر دیں۔

میں نے کچھ کہا۔ شیطان بولے۔ ''ملاؤ ہاتھ اسی بات پر'' انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ۔شوں سے ایک چیز آئی اور شپ سے شیطان کی ہتھیلی سے چپک گئی۔ لاحول ولا قوۃ! یہ تو گیند تھی۔ شیطان نے ایک نہایت لاجواب کیچ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پانچ وکٹوں پر سکور ایک سو اٹھانوے تھا اور وہ بیزار اختر صاحب بیاسی ناٹ آؤٹ۔ ارے۔ یہ تو سنچری پر تلا ہوا ہے۔

چائے کے بعد گیدی صاحب نے نئی گیند لی' مجھے بلایا گیا میں نے بڑی تیز گیندیں پھینکیں لیکن ان بیزار صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نئی گیند پر وہ اور بھی محتاط ہو گئے۔ ادھر وہ قبر رسیدہ ایمپائر صاحب جو دن بھر کھڑے رہ رہ کر تنگ آ چکے تھے اپنے پرانے قصے سنا رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ کیا کرتا تھا۔۔۔'' جب میں چھوٹا تھا تو یہ بات یوں تھی'' شیطان بولے۔۔۔ ''اچھا تو کیا آپ سچ مچ کبھی چھوٹے بھی تھے؟ ۔۔۔ اور وہ ناراض ہو گئے اسی خفگی میں انہوں نے میری اپیل پر نفی میں سر ہلا دیا۔ شام کو ساتھ وکٹوں پر سکور ۲۴۰ اور بیزار صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

ہم لوگ زندگی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ایک بڈی غریب تھا جو سب کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی باتوں پر کوئی ہنستا ہی نہ تھا۔ سب یہی کہتے کہ بھئی یہ تو میں نے پہلے سن رکھا ہے۔ حالانکہ بڈی کے لطیفے ہمیشہ نئے ہوا کرتے تھے۔ جب ہم بڈی کی موٹر میں واپس جا رہے تھے تو شیطان بولے ''بڈی ذرا آہستہ چلاؤ۔ تم موٹر ہمیشہ اس طرح چلاتے ہو جیسے کسی حادثے کی ریہرسل کر رہے ہو۔''

اگلے روز صبح اخبار جو پڑھتے ہیں تو اس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کیچ کا ذکر نصف کالم میں تھا۔ بیزار صاحب کی خوب برائیں کی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا تو شیطان بولے۔۔۔ ''اخبار کا رپورٹر وہاں موجود تھا۔ یہ اس کی بے لاگ رائے ہے۔''

جج صاحب ملے' بولے۔۔۔ ''اور کچھ بھی ہو جائے لیکن اس لڑکے کی سنچری نہیں ہونی چاہیے وہ نہایت بری طرح کھیلا ہے۔ اگر وہ ایک اور رن بنا گیا تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔''

کھیل شروع ہوا۔ بیزار صاحب ہر ایک گیند روک رہے تھے۔ ہجوم خاموش تھا سب ان کی سنچری کے منتظر تھے۔

شیطان کو ہر اوور کے بعد باؤنڈری سے میدان عبور کر کے دوسرے طرف جانا پڑتا تھا۔ ایک اوور میں انہیں دیر سے یہ خیال آیا کہ انہیں دوسرے طرف ہونا چاہیے۔ اور وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے انہوں نے ایک گیند دیکھی جو ان کے قریب سے گزرنے والی تھی۔ انہوں نے یونہی پکڑ لی۔۔۔ کیچ ہو گیا۔ شیطان نے پھر ایک حیرت انگیز کیچ کیا تھا۔ سب نے یہی سمجھا کہ شیطان جان بوجھ کر بھاگے تھے۔

سکور وہی تھا لیکن بیزار صاحب ابھی تک ننانوے ناٹ آؤٹ تھے اور ہم سب کے سینوں پر مونگ دل رہے تھے۔ یکا یک ہجوم میں سے چلا کر کسی نے کہا کہ ''اس سے بالنگ کراؤ جس نے ابھی کیچ کیا ہے۔''

گیدی صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی۔ شیطان کو بلا کر گینداس کے ہاتھ میں دے دی۔ شیطان نے آج تک کسی میچ میں بالنگ نہیں کی تھی۔

گیدی صاحب نے پوچھا۔ ''تم تیز گیند پھینکتے ہو یا آہستہ؟''

شیطان بولے'' مجھے کیا پتہ۔۔۔ ابھی پھینک کر دیکھوں گا!''

انہوں نے کئی دفعہ قدم گنے اور مختلف جگہوں پر نشان لگائے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ شیطان اور کرکٹ' دونوں کے لیے معجزہ تھا اور بقول شیطان کرکٹ کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے رومال سے گیند صاف کی۔ ادھر ادھر دیکھا اور عجیب بے ڈھنگے طریقے سے بھاگنا شروع کیا۔ وکٹوں کے پاس آ کر ان کے قدم غلط ہو گئے اور ایک نہایت ہی بے ہودہ گیند انہوں نے پھینکی۔ بیزار صاحب نے آگے بڑھ کر بلا گھمایا اور ایک غدر سا مچ گیا۔ لوگ چنگھاڑنے لگے' لوگ پاگل ہو گئے' میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔۔ بیزار صاحب کی سینچری پر نہیں بلکہ ان کے آؤٹ ہونے پر! شیطان کی اس بیہودہ سی گیند نے اس بیہودگی سے ان کی وکٹیں اڑائیں کہ وہ ننانوے پر آؤٹ ہو گئے۔

اس کے بعد تھوڑی دیر میں ہم نے باقی کھلاڑیوں کو بھی آؤٹ کر دیا۔ ساری ٹیم دو سو چالیس پر آؤٹ۔ شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شاباش دینے کے بہانے انہیں پیٹ کر رکھ دیا گیا۔

اب ہماری اننگز شروع ہوئی۔ میں اور عینک' رضیہ کے قریب بیٹھے اور وہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ مخالف ٹیم فیلڈ کرنے چلی اور شیطان کیمرہ لے کر لپکے۔ ان کی تصویریں اتاریں۔ پھر گیدی اور مقصود گھوڑا بلے لے کر شامیانے سے چلے۔ شیطان نے باقاعدہ پوز کرا کر ان کی تصویریں اتاریں۔ ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ ہمارے کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے چلے گئے ہمارے مخالف بالرز بڑے خطرناک ثابت ہوئے یا ہمارے بیٹسمین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے۔۔۔ جو کوئی کھیلنے جاتا وکٹوں کو ہاتھ لگا کر واپس آ جاتا۔ جب ساتویں وکٹ پر بڈی گیا تو سکور صرف ۳۲ تھا۔ بڈی کے منہ میں چیونگ گم تھی اور ہاتھوں میں بلا' جسے اس نے بیس بال کے اسٹائل پر پکڑ رکھا تھا۔ جاتے ہی اس نے ترچھے بلے سے ایک چوکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر چوکا پھر چھکا پھر چوکا۔ غرضیکہ بالرز کے چھکے چھڑا دیے۔ تیز اور آہستہ! ہر قسم کی بالنگ کو وہ ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہا تھا۔ ادھر بالر چلتا ادھر بڈی چلتا۔ جہاں گیند زمین پر پڑتی وہیں ہٹ لگتی۔ لیکن بڈی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس کے آؤٹ ہوتے ہی بقیہ کھلاڑی بھی نکل گئے۔ ساری ٹیم ننانوے پر آؤٹ اسی ننانوے پر جو بیزار اختر اکیلے کا اسکور تھا۔

جج صاحب نے فیصلہ صادر فرمایا کہ ہم ضرور ہاریں گے۔

لنچ پر گیدی صاحب بے حد بیزار تھے۔ میں اور عینک باہر گھاس پر بیٹھے چلغوزے کھا رہے تھے۔۔ وہ اپنی کسی سہیلی کا ذکر کر رہی تھی۔ اتنے میں شیطان آ گئے۔

بولے۔ ''آپ اسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہی ہیں جو لباس بہت اچھا پہنتی ہے؟''

''ہاں!''

''اور جسے لباس لگتا بھی خوب ہے۔''

''ہاں۔۔!''

''اور جو بلا کی حسین بھی ہے''

''ہاں۔۔ کیا آپ اس سے ملے ہیں؟''

''نہیں اب تک تو نہیں ملا۔۔۔ لیکن ایسی کسی لڑکی سے کون نہ ملنا چاہے گا؟ کیا آپ بھی اس سے تعارف کرا دیں گی؟''

''ضرور۔۔۔!''

شیطان اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہم دونوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیطان بڑا اشتیاق ظاہر کر رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آئی کہ شیطان کے دیوتا کوچ کر گئے۔ یہ مس ریچھ صاحبہ تھیں۔ ان پر شیطان چند ماہ پہلے بری طرح عاشق تھے عاشق کیا بلکہ بالکل دیوانے بنے ہوئے تھے۔

ادھر مس موصوفہ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر کوئی عاشق ہوتا ہوا اچھا لگے۔ یہ نام بھی ان کو خوب زیب دیتا تھا۔ وہ بے حد طویل و عریض تھیں اور کبھی بہت ناپسند۔ ویسے وہ بھی اسی سانچے کی بنی ہوئی تھیں۔ بس ذرا پرانا سا ماڈل تھا۔ وہ میک اپ خوب کرتی تھیں بعض اوقات تو وہ اپنی بیٹی سے بھی قدرے حسین معلوم ہوتی تھیں۔

شیطان کا خوب مذاق اڑایا۔۔۔ "ریچھوں کے سائے میں جو پل کر جواں ہوئے ہیں۔۔ سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ۔۔ تو ہی ناداں چند ریچھوں پر قناعت کر گیا۔ مانا کہ تیرے ریچھ کے قابل نہیں ہوں میں۔۔۔ تو اپنا ریچھ دیکھ مرا انتظار دیکھ۔۔۔!!!"

لیکن شیطان باز نہ آئے اور اس وقت تک عاشق رہے جب تک کہ ان کا موڈ عاشقانہ نہ رہا۔ پھر خود بخود راہِ راست پر آ گئے۔

مس ریچھ سے تعارف نہایت پر لطف رہا۔ ہوا یوں کہ میں اور شیطان چھٹیوں سے واپس آ رہے تھے۔ ایک جنکشن پر گاڑی بدلی' دوسری گاڑی چلنے والی تھی۔ بھاگا دوڑی میں سامان رکھوا رہے تھے کہ ہجوم میں ایک سفید ریش ضعیف شخص دکھائی دیا جو ایک بچے کی انگلی پکڑے جا رہا تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً ترس آ جاتا ہے اور اپنی جیبیں ٹٹول کر بولے۔۔۔ "میرے پاس نوٹ ہیں' تمہارے پاس کچھ ٹوٹا ہو تو اس بیچارے فقیر کو دے دو۔" جلدی تھی' گھبراہٹ میں کچھ ملتا ہی نہ تھا۔ بڑی مشکل سے دو آنے ملے جلدی سے اس فقیر کو دیئے اور قلیوں کے پیچھے بھاگے۔ ڈبے میں کافی جگہ تھی۔ گاڑی چلنے سے ذرا دیر پہلے کسی کا بہت سامان آ گیا۔ اس کے بعد ایک سالم کنبہ۔ اور اس کے بعد وہی فقیر اس بچے کے ساتھ آیا اور بیٹھ گیا۔ سارا کنبہ اسے "ابا جان" "ابا جان" کہہ کر پکار رہا تھا۔ لاحول ولاقوۃ ہم بڑے شرمندہ ہوئے۔ وہ بزرگ جو ہمیں اس وقت فقیر معلوم ہوتے تھے نہایت معزز قسم کے مالدار حضرت نکلے۔ کچھ تو ان کا لباس ضرورت سے زیادہ سادہ تھا اور کچھ ہم ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے اور کچھ شیطان کو ضرورت سے زیادہ ترس آ گیا۔ انہوں نے ہمارے دو آنے واپس کیے اور بڑے مزے کی باتیں ہوئی اسی کنبے میں مس ریچھ بھی تھیں۔ بس شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً عاشق ہو گئے۔ واپسی پر بڑی کو بتایا گیا۔ وہ بولا:

"شاید یہ پانچویں لڑکی ہے جس پر تم اس سال عاشق ہوئے ہو۔"

شیطان بولے۔ "نہیں چوتھی ہے۔۔ ایک لڑکی پر میں دو مرتبہ عاشق ہوا تھا۔

وہ تو شیطان کی خوش قسمتی سے مس ریچھ نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ وہ سیدھی ہمارے طرف آتیں۔

ہم فیلڈ کرنے جا رہے تھے تو ننھی آئی۔ بولی۔ "آپ اس طرح گیند کیوں نہیں پھینکتے؟"

پوچھا۔ "کس طرح؟"

بولی۔ "اسی طرح جیسے اس روز پھینکی تھیں۔"

پوچھا۔ "کس روز؟"

بولی۔ "میں بھول گئی' ٹھہریئے ابھی پوچھ کر بتاتی ہوں!"

اور وہ سیدھی رضیہ کے پاس گئی۔۔۔ اچھا تو یہ سلطانہ رضیہ صاحبہ ہمیں ہدایات دے رہی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا۔

میں نے سر ہلا کر کہا "اچھا"

گیدی صاحب غلطی پر غلطی کر رہے تھے۔ انہوں نے شیطان سے بالنگ کرائی۔ شیطان کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر گیدی صاحب کو جو جوش آیا تو انہوں نے خود بالنگ شروع کی اور وہ گیندیں پھینکیں جن کے متعلق ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ "گگلی" ہیں لیکن تھیں وہ کچھ بھی نہیں۔۔ سکور خوب بڑھتا جا رہا تھا۔

شیطان بار بار مجھ سے شرط لگاتے۔۔ "لگاتے ہو دس روپے چنو میاں پچاس سے اوپر اسکور کریں گے۔" میں انکار کرتا تو وہ فوراً کہتے۔۔۔ "اچھا تو پھر لگاتے ہو دس روپے چنو میاں پچاس سے نیچے سکور کریں گے۔" میں برابر انکار کرتا رہا۔ اس وقت میں بالکل کنگال تھا۔

چائے پر ان کے چار کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے اور اسکور ڈیڑھ سو تھا۔ ننھی نے پھر کاغذ کا ایک پرزہ لا کر دیا اور پھر میں نے سر ہلا کر کہا۔

"اچھا"۔

وہ پھر آئی۔ بولی۔" آپا کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی مانتا ہوں۔"

میں نے گیدی صاحب کو بڑی مشکل سے منایا۔ نئے سرے سے فیلڈ جمائی۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کافی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند ایسی تیز بریک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود اتنے بریک ہو رہے تھے۔ گیدی صاحب بولے۔" یہ اتنے تیز بریک تم نے کب سے شروع کیے؟"

میں نے کہا۔" آج سے۔۔ بلکہ ابھی سے۔!"

ایک ہٹ کو بڈی صاحب نے یوں دبوچ لیا جیسے کوئی اڑتے ہوئے بٹیر کو دبوچ لے۔۔ یہ بیزار صاحب آؤٹ ہوئے تھے۔ جب بیزار صاحب شامیانے کی طرف جا رہے تھے تو ان کے آؤٹ ہونے پر سب خوش تھے سوائے بیزار صاحب کے!

اگلی گیند کو کھلاڑی نے گلانس کیا اور بڈی نے زمین پر لیٹ کر گیند پکڑ لی اب تو شور مچ گیا۔ دو گیندوں پر دو کھلاڑی آؤٹ' آوازیں آ رہی تھیں کہ ہیٹ ٹرک کرو ہیٹ ٹرک کرو۔ لوگ طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے ہیٹ ٹرک کا خیال ہی ایسا ہے کہ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے میں نے سوچا وچا کچھ نہیں' دور سے بھاگا بھاگا آیا اور گیند پھینک دی بالکل معمولی سے گیند تھی کھلاڑی نے گھوم کر ہٹ لگائی گیدی صاحب نے اچھل کر ہوا میں کیچ کرنے کی کوشش کی ان کا ہاتھ پہنچا بھی' گیند ہاتھ سے چھوئی بھی لیکن کچھ نہ بنا گیند کا رخ بدل گیا۔ وکٹ کیپر نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا لیکن کیچ پھر بھی نہ ہوا۔ گیند پھر چھوٹی اور رخ بدل گیا۔ اتنے میں بڈی بجلی کی طرح تڑپا اور گرتی گیند دبوچ لی۔ ہیٹ ٹرک ہو گیا۔۔ سچ مچ کا ہیٹ ٹرک۔

گیدی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں نے وہی ہیٹ بڈی کے سر پر رکھ دیا۔ میرے اگلے اوور میں بڈی نے لیگ کی طرف ایک اور بہت اچھا کیچ کیا۔ ایک کیچ مقصود گھوڑے نے بہت دور باؤنڈری لائن پر کیا۔۔۔ ایک سو اٹھاون پر ساری ٹیم آؤٹ۔ چھ وکٹیں میری تھیں۔ محض لیگ تھیوری کی بدولت۔۔۔ اور یہ مشورہ رضیہ کا تھا۔ ہماری ٹیم اب چست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر امید جھلک رہی تھی۔

عینک نے دوڑ کر میرا استقبال کیا۔ شیطان دوڑے دوڑے آئے اور اور میرے کان میں بولے۔۔۔ "اگر تم مجھے کسی طرح ریچھ سے

محفوظ رکھ سکو تو کل کے اخبار میں تمہاری تعریفیں ہی تعریفیں ہوں گی۔''
پوچھا۔ ''کیونکر؟''
بولے۔ ''رپورٹر میرا دوست ہے اور سب کچھ میرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔''
میں انہیں سید ھا حکومت آپا کے پاس چھوڑ آیا جہاں رہیں تو کیا' جن بھوت بھی پھٹک نہیں سکتے۔ ننھی نے مجھے ایک چاکلیٹ دیا۔
پوچھا۔ ''کس نے دیا ہے؟''
بولی۔ ''آپا نے!''
پوچھا۔ ''کون سی آپا نے؟''
بولی۔ ''نہیں بتاتے۔''
میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہم نہیں لیتے!''
بولی' 'ان آپا نے۔''
میں نے ایک پرزے پر ''شکریہ'' لکھ کر اسے دیا اور کہا۔ ''یہ رضو کو دے دینا۔''
بولی'' آپ ہماری آپا کا ادب نہیں کرتے۔ صرف رضو کہتے ہیں۔''
میں نے کہا۔'' آپا دا پا ہوں گی تمہاری' ہمارے لیے تو وہ صرف رضو ہیں۔''
بولی۔ ''میں ابھی جا کر کہتی ہوں۔''

اب ہمیں جیتنے کے لیے تین سو رنز درکار تھے۔ برابر ہونے کے لیے دو سو ننانوے اور ہارنے کے لیے دو سو اٹھانوے یا اس سے کم۔ شام ہو چکی تھی۔ کل تیس پینتیس منٹ باقی تھے روشنی کم تھی۔ گیدی صاحب اور ان کے لمبے لمبے مشیروں نے کچھ کانفرنس سی کی اور بولے۔ ''اگر شروع کے اچھے کھلاڑی اس وقت گئے تو کہیں آؤٹ نہ ہو جائیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ اناڑیوں میں سے دو کو بھیج دیں۔ اگر وہ آؤٹ بھی ہو گئے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ وقت پورا کر دیں۔''

بڈی کو اور مجھے چنا گیا۔ ہمیں بے شمار ہدایتیں دی گئیں ہم دونوں میں سے آج تک کوئی شروع میں نہیں گیا تھا۔ بڈی کی خاص طور پر منتیں کی گئیں کہ بس گیند روک لینا اور ہٹ وغیرہ ابھی مت لگانا۔

جب ہم دونوں بلے لے کر میدان میں گئے تو چاروں طرف تالیاں بج رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی بہت مشہور کھلاڑی ہوں اور ابھی کچھ کا کچھ کر کے رکھ دوں گا۔

کھیل شروع ہوا۔ چمکتی ہوئی نئی گیند بجلی کی طرح آتی اور جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں' دیکھتا رہ جاتا۔ ادھر بڈی بھی حیران کھڑا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی گیند نہ چھو سکا۔ تیسرے اوور میں گیند بلے کی ملاقات ہوئی گیند بالر کے ہاتھ سے نکلی۔ خیال آیا کہ کٹ کروں۔ ابھی پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ گیند کا رخ بدل گیا' سوچا کہ ڈرائیو کروں مگر رخ پھر بدل گیا۔ میں ہک کی تیاری کر رہا تھا کہ پھر ایک دم روکنے میں مصلحت سمجھی اور گلانس خواہ مخواہ ہو گیا۔ گیند نہایت تیز تھی۔ باؤنڈری ہو گئی۔ اب کچھ ہمت بندھی' جہاں گیند زمین سے چھوتی اچھل کر اسے وہیں روک لیتا۔ میں بالکل کتاب کی نقل کر رہا تھا۔ سیدھے بلے سے جب گیند کو آئینہ دکھاتا تو نعرے لگتے۔۔۔ ''شاباش۔۔۔ بہت اچھے۔''

بڈی کو گیند روکنا مصیبت ہوگئی۔ ہر گیند پر وہ ہٹ لگانے کے لیے بلا اٹھاتا لیکن پھر کچھ سوچ کر صرف روکنے پر اکتفا کرتا۔ لیکن ایسے عجیب طریقے سے روکتا جیسے بلے سے گیند کو زمین میں ٹھوک رہا ہو۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں گیند کی چمک دمک سب اتار رکھ دی۔

خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا جب ہم تالیوں کے شور میں واپس لوٹے تو میں گیارہ ناٹ آؤٹ تھا اور بڈی پندرہ ناٹ آؤٹ!

رات کو میں نے شیطان سے تصویروں کے متعلق پوچھا کہ "فلم کب دھلواؤ گے؟"

بولے "کون سی فلم؟"

بولے۔ "ویسے ہی ذرا لطف رہتا ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہو تو انسان ذرا اسمارٹ معلوم ہوتا ہے۔"

اگلے روز اخبارات میں میری خوب تعریفیں تھیں۔ لطف یہ ہے کہ بالنگ کا اتنا ذکر نہ تھا جتنا بیٹنگ کا! یہ سب شیطان کی کرامات تھیں۔

اگلی صبح جج صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ بس گیندیں روکتے رہو' باہر جاتی ہوئی گیند کو مت چھوڑو اور زبردستی ہٹ مت لگاؤ' سکور خود بخود ہوتا رہے گا۔

کھیل شروع ہوا۔ ہم گیندیں روک رہے تھے۔ جو گیند سیدھی آتی اسے روک لیتے جو باہر جاتی اسے چھوڑ دیتے۔ تھوڑی دیر میں ہمیں پتہ چلا کہ رنز خود بخود ہو رہی ہیں۔ ہم دونوں نے اسکور سو تک پہنچا دیا۔ بڈی آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آ رہا تھا اور پھر شپ سے کسی نے اس کا کیچ کر لیا بیالیس رنز کر کے وہ آؤٹ ہو گیا۔ گیدی صاحب آئے لیکن بہت ڈرے ہوئے تھے۔ ایک معمولی سی گیند پر آؤٹ ہو گئے اور آؤٹ ہوتے ہی انہوں نے نعرہ لگایا۔۔۔ "بہت اچھی گیند تھی۔۔۔ گگلی تھی۔" بالر کی تعریفیں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مقصود گھوڑا آیا۔ اس نے ذرا کھیل جما دیا۔ مجھے اب گیند فٹ بال جتنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم لنچ کے لیے گئے تو سورج بھی لنچ کے لیے چلا گیا۔ بادلوں میں جا چھپا۔ لنچ کے بعد ایک ہی اوور میں ہمارے دو کھلاڑی نکل گئے۔ دو سو پر نئی گیند آئی اور مجھے ایک مرتبہ پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔

میں آہستہ آہستہ تھکتا جا رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ بیٹنگ بہت مشکل چیز ہے۔ آج تک کبھی اتنی دیر وکٹوں پر ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ کمر بری طرح دکھ رہی تھی۔ میرا اسکور ستر ناٹ آؤٹ تھا۔ میں نے آج تک کبھی اتنا اسکور نہیں کیا تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سنچری کرو اور میرا بھاگنے کا بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ چائے پر ہمارا اسکور ڈھائی سو تھا۔ شیطان اور عینک کی سہیلی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بولی۔ "مجھے لیفٹ ہینڈرز زیادہ پسند ہیں۔ وہ کھیلتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

شیطان بولے "میں آج بائیں ہاتھ سے کھیلوں گا اگرچہ میں نے بالنگ داہنے ہاتھ سے کی ہے اور پھر یہ کرکٹ تو ہے بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل۔"

مجھے ایک طرف لے جا کر بولے۔ اس لڑکی نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ تم دیکھنا آج میں کیسا کھیلتا ہوں اور وہاں آج رضیہ دن بھر اداس رہی ہے۔ روٹھنا دوٹھنا سب ختم ہو چکا ہے۔ جب بلائے بے شک چلے جانا۔۔۔۔ اور۔۔۔ مہربان ہو بلا لو مجھے چاہو جس وقت۔۔۔ والا برتاؤ کرنا۔

چائے کے بعد پہلی گیند پر ایک وکٹ نکل گئی۔ اب ایک ایک گیند پر تالی بجتی تھی۔ اسکور کرو نہ کرو ہٹ لگاؤ' چاہے روکتے رہو صاف چھوڑ دو' شور ضرور مچتا تھا۔

یکلخت ہجوم خاموش ہو گیا۔ چاروں طرف ناامیدی چھا گئی۔ اب آخری کھلاڑی آ رہا تھا۔ شیطان اپنی عینک سنبھالے' بلا گھماتے' ایک عجیب شان سے تشریف لا رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے لیفٹ ہینڈر کا اسٹائل بنایا۔ میں نے بڑی منتیں کیں کہ ''آج داہنے ہاتھ ہی سے کھیلو' یہ بائیں ہاتھ کا شوق کبھی پھر پورا کر لینا۔''

بولے۔''ہرگز نہیں۔۔۔ تم دیکھنا تو سہی' اگر زندگی نے وفا کی تو اسکور پورا کر کے دکھاؤں گا۔ جب میں جیتنے کی ہٹ لگاؤں تو عینک کی سہیلی کا چہرہ فخر سے اونچا ہو جائے گا۔''

شیطان کے محبوب سٹروک دو ہیں۔۔ لیگ بائی اور آف بائی۔۔۔ کبھی گیند پیڈوں سے بچ کر بلے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بلے سے نکل جائے تو لازمی طور پر ٹوگٹوں میں جاتی ہے۔ آؤٹ ہونے کے بعد شیطان ہمیشہ بلے کو اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے اس میں کہیں سوراخ تھا جس میں سے گیند نکل گئی۔

پہلی گیند شیطان کی تھوڑی کے نیچے سے نکل گئی دوسری گھٹنوں میں سے' تیسری ناک کو چھوتی ہوئی گئی' چوتھی کمر میں لگی۔ لیکن شیطان لیفٹ ہینڈ کا سٹائل بنائے کھڑے رہے۔

پہلے اوور کے بعد شیطان مجھ سے ملنے آئے۔ ہجوم نے سمجھا کہ کھیل کے سلسلے میں مشورہ لینے آئے ہوں گے۔ خوب تالیاں بجیں۔ شیطان بولے۔''وہ دیکھو شامیانے کے اس کونے میں عینک کی سہیلی بیٹھی ہے۔''

میں نے بتایا کہ وہ تو کوئی اور ہے اور ساتھ ہی انہوں نے عینک کے شیشے صاف کیے اور بولے۔۔۔''تو ہجوم میں کہیں ہوگی۔ کاش کہ اس وقت ایک دوربین ہوتی اور یہ پوائنٹ پر جو کھلاڑی کھڑا ہے۔ اس کی مونچھیں مجھے آؤٹ کرائیں گی۔''

اگلے اوور کے بعد پھر مجھے ملے۔ بولے۔''جانتے ہو یہ وکٹ کیپر عینک کی سہیلی کا کوئی عزیز ہے۔ بیچارے نے آج ایک بھی کیچ نہیں کیا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے ایک کیچ کرادوں۔''میں نے پھر ان کی منتیں کیں اور وہ بمشکل باز آئے۔

شیطان اتنی بری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان اس وقت کرکٹ نہیں کھیل رہے تھے بلکہ گتکا' کبڈی' ہائی جمپ اور بہت سی چیزیں ملا کر تماشے کر رہے تھے۔

مخالف بالر بولا۔''یہ بیٹنگ کیسی ہو رہی ہے؟''

''اور یہ بالنگ کیسی ہو رہی ہے؟''شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اچھل کر ایک آف بائی سکور کی' اب وہ وکٹوں کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور بائی پر بائی اسکور ہو رہی تھی۔ اسکور دو سو اسی ہو گیا میں بچانوے ناٹ آؤٹ تھا اور شیطان نے دس بائی اسکور کی تھیں میں اس قدر تھک چکا تھا کہ مجھے نہ کسی سکور کا چاؤ تھا نہ کسی میچ کا۔ بس جی یہی چاہتا تھا کہ پیڈ وغیرہ اتار کر یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں ایک گیند پر بائی لگا کر شیطان نے مجھے بلایا۔ میں چلایا اتنے میں گیند واپس آ گئی وہ چلائے واپس جاؤ' میں بری طرح بھاگا۔ گیند تیز تھی اس لیے دوسری طرف نکل گئی۔ انہوں نے پھر بلایا۔ میں پھر گیا۔ گیند واپس آ گئی پھر واپس بھاگا۔ ہم دونوں خوب بھاگے دوڑے لیکن اسکور کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی۔ اس دفعہ تو میں رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا۔

شیطان اور وکٹ کیپر خوب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ شیطان نے اسے کھانے پر مدعو کیا۔ آخری اوور آیا اور میں نے دل کڑا کر کے ایک چوکا لگا دیا۔ اب ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو میں نے گلانس کیا اور شیطان کو بلایا' وہ نہیں آئے چوتھی گیند پر پھر بلایا وہ پھر وہیں

کھڑے رہے۔ وقت ختم ہو گیا۔ اسکور دو سو چھیاسی تھا اور میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ!

شیطان بولے۔ ''میاں یہ ننانوے کا پھیر بہت برا ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ہمارے لیے بہت منحوس ہے۔ کہیں کل تمہارے ساتھ ان کا بال وہی سلوک نہ کرے جو میں نے بیزار صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ''یہ آخری اوور میں کیا حرکت کی تھی۔ میرے بلانے پر کیوں نہیں آئے؟''

بولے۔ ''اس لیے کہ اب اس خاکسار کی دو آرزوئیں ہیں۔ پہلی یہ کہ تمہاری سنچری ہرگز نہ ہو ورنہ تم ہم اناڑیوں کے زمرے سے نکل کر اپنے آپ کو بیٹسمین سمجھنے لگو گے دوسری یہ کہ جیتنے کی ہٹ میں لگانا چاہتا ہوں میں نے عینک کی سہیلی سے وعدہ کیا ہے۔''

رضیہ ملی۔ بولی۔ ''ذرا سنیئے؟''

میں چلا گیا۔ ہم دونوں باہر گھاس پر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ ''اتنے دنوں سے میں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا جی اچھا نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھی اتنے دنوں بہت مصروف رہا کچھ امتحان کی تیاری اور کچھ یہ ٹورنامنٹ کا سلسلہ۔''

میں نے لیگ تھیوری کا ذکر کیا کہ اسے یہ خیال کیونکر آیا بولی۔۔۔ ''مجھے آپ کا ایک پہلا میچ یاد تھا جس میں آپ نے اسی طرح وکٹیں لی تھیں۔''

میں نے پوچھا۔۔۔ ''کل کیا پروگرام ہے؟''

بولی۔ ''کل چھٹی ہے۔''

پوچھا۔ ''کل میرے ساتھ چلو گی ایک جگہ پکنک ہے۔''

بولی۔ ''اجازت لینا ہوگی امی سے اور حکومت آپا سے!''

کہا۔ ''عینک کی سہیلی کا بہانہ کر دینا۔ آج کل تم دونوں کافی دیر اکٹھی رہی ہو۔''

بولی۔ ''کوشش کروں گی۔''

کہا۔ ''کوشش ووشش نہیں۔۔۔۔ وعدہ کرو۔''

شرما شرما کر بولی۔ ''اچھا!''

میں شیطان کے ہوسٹل گیا۔ وہاں وہ وکٹ کیپر صاحب موجود تھے۔ کئی مرتبہ ننانوے ناٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو مجھے ہر دیوار پر جلی الفاظ میں ننانوے ناٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہوسٹل پہنچا تو بہت سے لڑکے ملے۔ سب نے یہی بار بار دہرایا۔ رات کو ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مجھے ننانوے ناٹ آؤٹ ننانوے ناٹ آؤٹ سنائی دیتا رہا۔ رات بھر میرے کانوں میں کوئی چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ ننانوے ناٹ آؤٹ ننانوے ناٹ آؤٹ!

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا۔ میچ بے حد دلچسپ ہو گیا۔ مینا بازار سالم کا سالم وہاں موجود تھا۔ تالیوں اور نعروں کے شور میں جب ہم بلے لے کر نکلے تو میرا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

شیطان کی باری تھی۔ مخالف کپتان نے اپنے ایک فاسٹ بالر کو بلا لیا۔ اس کی پہلی گیند شیطان اور وکٹ کیپر دونوں کے اوپر سے گزر گئی۔۔ بائی کی چار رنز ہو گئیں۔ اگلی گیند پر پھر یہی ہوا۔ چار رنز اور ہو گئیں۔ انہوں نے فالتو فیلڈ لے لی۔ بقیہ گیندیں بھی شیطان اور وکٹ کیپر

کے اوپر سے گزریں لیکن مزید سکور نہ ہوا۔

دوسری طرف سے انہوں نے ایک نیا بالر لگایا جس کو میں اب تک نہیں کھیلا تھا۔ وہ اوور یونہی گزر گیا۔ اگلے اوور میں شیطان نے قلابازی سی لگائی اور ایک نہایت اعلیٰ درجے کا کٹ لگایا۔ اسکور دو سو ستانوے ہو گیا اور وہیں اٹک کر رہ گیا۔ چند اوور پھر ویسے ہی خشک گزر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ وہ شور و غل مچتا تھا کہ خدا کی پناہ۔

ایک گیند پر شیطان نے گنگے کا ہاتھ دکھایا اور گیند لیگ کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دو رنز بنا لیں۔ سکور دو سو ننانوے ہو گیا۔ ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لیے ایک رن کی ضرورت تھی اور مجھے سنچری کرنے کے لیے بھی ایک رن کی ضرورت تھی۔ اوور کی تین گیندیں ابھی باقی تھیں۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تحاشا بلا گھمایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ ادھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے میں عمر بھر سنچری نہیں کر سکتا۔ صدیاں گزر جائیں سنچری نہیں ہو گی اور یہ ننانوے ناٹ آؤٹ ایک تہمت ہے جو مجھ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ ایک طوق ہے جو میرے گلے میں لٹک رہا ہے۔ یہ ایک سینگ ہے جو میرے سر پر اگا ہوا ہے اور میں اس کمبخت ننانوے ناٹ آؤٹ سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکوں گا۔

اب میری باری آئی' وہی نیا بالر گیند پھینک رہا تھا۔ گز گز بھر کی بریک کراتا تھا۔ پہلی گیند روکی' تیسری' چوتھی۔۔۔ میں کسی پر سکور نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ ادھر گیند آئی' ادھر میں نے آنکھیں بند کر کے بلا گھمایا۔ خدا جانے گیند بلے سے لگی' پیڈوں سے لگی' جوتوں سے لگی' لگی بھی یا نہیں۔۔۔ بس گیند نکل گئی دو کھلاڑی پیچھے بھاگے۔ ادھر میں بھاگا' دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔۔۔ کھلاڑی گیند کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا مگر وہ وہیں کھڑے رہے میں نے ان کو بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ نہیں ہلے۔ آخر میں ان کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنی وکٹ تک لایا اور وہاں پہنچ کر سر توڑ واپس بھاگا۔ بس رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا۔ ادھر غدر مچ گیا۔ زلزلہ آ گیا زمین کی جگہ آسمان نے لے لی اور آسمان زمین کی جگہ آ گیا۔

بڑی بھاگا بھاگ آیا اور مجھے کندھے پر اٹھا کر شامیانہ کی طرف بھاگا۔ بار بار وہ یہی کہتا تھا۔ "بوائے او بوائے۔۔۔ میں چمپئن ہوں۔ میں نے ایک کپ جیتا ہے۔ اب میں کرکٹ کا کھلاڑی ہوں۔"

شامیانے میں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم جیت بھی گئے تھے اور ایک رن سکور بھی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ امر بحث طلب تھا کہ اسے میں نے سکور کیا تھا یا محض بائی تھی۔ ایک امپائر کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ۔ کوئی کہتا تھا۔ میں نے سنچری کی ہے' کوئی کہتا تھا کہ محض ننانوے ناٹ آؤٹ ہوں۔

ادھر شیطان اس وکٹ کیپر اور عینک کی اس کیلی کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔

جب میں اور رضیہ اکٹھے چل رہے تھے تو اس نے نہایت خوشنما کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں وہ سادہ سا ہار تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔

وہ بولی۔ "یہ کوٹ ابا نے سالگرہ پر دیا تھا، میں آج اسے پہلی مرتبہ پہن رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "اب تک کیوں نہیں پہنا؟"

بولی: "میں نے سوچا کہ کسی خاص دن پہنوں گی۔"

میں نے اسے سائیکل پر بیٹھنے کو کہا۔ بولی۔ "کیریئر پر تو ٹوکری بندھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آگے بیٹھ جاؤ!"

بولی۔ "اور جو کسی نے دیکھ لیا تو؟"

کہا۔ ''کسی نے دیکھ لیا تو میری خوش قسمتی پر رشک کرے گا۔''

وہ شرما کر آگے بیٹھ گئی۔ میرا چہرہ اس کے بالوں سے چھو رہا تھا۔ ''یہ تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج پھر چرائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ نے بھی تو ان کا تیل لگا رکھا ہے'' وہ بولی۔

ہم دونوں دوست تھے۔ جب ہم دو تین میل نکل آئے تو وہ پوچھنے لگی کہ پکنک کہاں ہو رہا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور پرانے قلعے میں۔

اس نے پوچھا کہ پکنک میں اور کون کون ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ''صرف دو ہوں گے۔۔۔ میں اور تم!''

جب ہم دونوں چاندنی میں سائیکل پر واپس آ رہے تھے تو رضیہ بولی۔ ''یہ میچ تو صرف آپ کا تھا' وہ ہیٹ ٹرک خوب تھا۔ گیند پھینکتے ہوئے آپ بہت اچھے لگ رہے تھے۔''

''وہ ہیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔''

''اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ؟''

''نہیں' سو ناٹ آؤٹ۔'' میں نے مچل کر کہا۔

''ہم تو ننانوے ناٹ آؤٹ ہی کہیں گے۔ بھلا کرکٹ میں بھی ساتھیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھی سکور کیا جاتا ہے۔ یہ سب عینک کی اس سہیلی کی برکت ہے۔''

''ذرا مسکراؤ!''

وہ مسکرانے لگی۔ ''اب ذرا منہ بنا کر بھی دکھاؤ۔'' میں نے منہ بنا کر دکھایا۔ ''تم مسکراتی ہوئی کہیں اچھی معلوم ہوتی ہو۔۔۔ تمہارے لیے بھی بہتر یہی ہوگا کہ ہر وقت مسکراتی رہا کرو۔۔۔ آج آئینے میں دیکھنا۔''

''آپ آگے دیکھئے۔۔۔ بالکل سیدھ میں سائیکل سیدھی چلائیے' کہیں ٹکر نہ ہو جائے۔''

رضیہ کو چھوڑ کر میں نے شیطان کے ہوسٹل کا رخ کیا۔ راستے میں وہی رپورٹر مل گیا۔۔۔ بولا۔۔۔ ''مجھے بہت افسوس ہے کہ سنچری نہ کر سکے۔ میں نے اخبار میں آپ کے ننانوے ناٹ آؤٹ کی بڑی تعریف کی ہے۔''

''آپ سے یہ کس نے کہا؟''

''روفی صاحب نے!''

''ابھی چھپا تو نہیں؟''

''نہیں!''

میں نے اسے ساتھ لیا۔ راستے میں بڈی کو پکڑا۔ شیطان کے کمرے میں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک بڑے پلنگ پر حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے ہیں۔ رضائیاں منگائی گئیں اور ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا گیا۔ میں بار بار شیطان کو اس آخری رن کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ اسے میں نے سکور کیا ہے۔

شیطان بولے۔ ''یار عجب سپورٹسمین ہو تم بھی' صرف ایک رن کے لیے اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ اچھا تمہاری سنچری لکھوا دیں گے

بس ۔۔چلو بھئی لکھ دوان کی سینچری۔

رپورٹر نے ہمارے سامنے بیٹھ کر سب کچھ درست کیا۔ بڈی کی سفارش پر میری تھوڑی سی تعریف بھی شامل کی گئی۔

اب سیکنڈ شو کا پروگرام بنا۔ شیطان نے وہ اوورکوٹ اتار دیا جس کو پہن کر سردی زیادہ لگتی تھی۔ جو پہلے الٹوایا گیا تھا، پھر سیدھا کرایا گیا۔ سب نے رضائیاں اوڑھ لیں۔ چند حضرات ایک ایک رضائی میں دو دو ہو گئے۔ نوکر حقہ لے کر ساتھ ہو لیا۔

ذرا سی دیر میں ہم رنگ برنگی رضائیاں اوڑھے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہے تھے۔ تقسیم انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڈی بار بار کہتا تھا۔۔ ''بوائے او بوائے' آج میں اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر رہا ہوں۔ میں چیمپین ہوں' میں نے کرکٹ کا ایک کپ جیتا ہے یاہوؤ ؤو۔۔۔!''

اور جب ہم شہر کے بہترین سینما میں رضائیاں اوڑھے پکچر دیکھ رہے تھے اور حقے کے کش لگا رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ نہ ہمیں چیمپئن سمجھ رہے تھے نہ ہیرو بلکہ غالباً ایسی خواتین سمجھ رہے تھے جو حقہ پی رہی تھیں۔



محمد حسن عسکری

نام : اظہار الحق
قلمی نام : محمد حسن عسکری
پیدائش : ۵ نومبر ۱۹۱۹ء بہ مقام سراوہ، ضلع میرٹھ (یو۔ پی) بھارت[1]
وفات : ۲۸ جنوری ۱۹۷۸ء بہ مقام کراچی، پاکستان
تعلیم : ایم۔ اے (انگریزی) الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۲ء

قرآن سے بسم اللہ موضع سراوہ، ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مسلم پرائمری اسکول شکار پور (ضلع بلند شہر) سے حاصل کی۔ وہاں سے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد ڈی۔ اے انگلش مڈل اسکول سے مڈل پاس کیا اور ۱۹۳۶ء میں، مسلم ہائی اسکول بلند شہر سے میٹرک ۱۹۳۸ء میں، میرٹھ کالج، میرٹھ سے انٹر اور ۱۹۴۰ء میں الہ آباد سے بی۔ اے کرنے کے بعد وہیں سے ۱۹۴۲ء میں ایم اے (انگریزی) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

عسکری صاحب کے والد محمد معین الحق، ضلع بلند شہر میں ''کورٹ آف وارڈز'' کے ملازم تھے جہاں سے والئی شکار پور (بلند شہر) چودھری رگھوراج سنگھ کے ہاں بطور اکاؤنٹنٹ چلے گئے۔ قصبہ شکار پور، بلند شہر سے تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں اس خاندان کا قیام ۱۹۴۵ء تک رہا۔

عسکری نے ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ سراوہ (ضلع میرٹھ) شکار پور (ضلع بلند شہر) میرٹھ اور الہ آباد میں گزارا۔ ایم اے کرنے کے بعد عسکری دہلی منتقل ہو گئے اور پہلی ملازمت آل انڈیا ریڈیو دہلی میں بطور سکرپٹ رائٹر کی۔ شاہد احمد دہلوی کیا دبی مجلّہ ''ساقی'' دہلی کے ساتھ تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ کچھ مدت اینگلو عربک کالج، دہلی میں انگریزی کے استاد رہے اور اس کے بعد میرٹھ کالج، چلے گئے، جہاں قیام

پاکستان تک قیام رہا۔ اسی اثنا میں الہ آباد یونیورسٹی میں تدریس کی پیش کش ٹھکرا چکے تھے۔

۱۹۴۷ء میں لاہور منتقل ہو گئے اور سعادت حسن منٹو کے ساتھ مل کر مکتبہ جدید لاہور کے لیے دو ماہی ادبی جریدہ ''اردو ادب'' لاہور جاری کیا' جس کے صرف دو شمارے شائع ہو سکے۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی منتقل ہونے سے پہلے فری لانس ادیب کے طور پر ترجمہ نگاری کو ذریعہ روزگار بنایا۔ سید وقار عظیم کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء تا جون ۱۹۵۰ء سرکاری ادبی مجلّا ''ماہ نو'' کراچی کے مدیر رہے اور ۱۹۵۰ء میں ہی اسلامیہ کالج' کراچی میں بطور استاد منتقل ہو گئے، جہاں آخر تک رہے۔ انتہا درجہ کے قناعت پسند اور مردم بیزار واقع ہوئے تھے۔

ایک شاگرہ کے ساتھ ادھیڑ عمری کی محبت ناکام ہوئی۔ عسکری صاحب نے کتابوں' کبوتروں اور فونوگرافی میں غم غلط کیا۔ عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کی۔ اس محبت کی یادگار بالزاک کے دو مطبوعہ تراجم ہیں' جن پر عسکری کا نام نہیں۔ یہ کام آپ نے ۴۲۔۱۹۴۳ء میں کیا تھا۔ آخری زمانے میں حد درجہ کے مذہبی ہو جانے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کے چاہنے والوں میں رہے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''کالج سے گھر تک''مطبوعہ ''ادبی دنیا'' لاہور: اگست: ۱۹۴۰ء

واضح رہے کہ یہ افسانہ ۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو لکھ کر مکمل کیا گیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''میری بہترین نظم'' (مرتبہ)	کتابستان الہ آباد	طبع اول: ۱۹۴۲ء

یہ کتاب دوسری بار ساقی بک ڈپو دہلی نے ۱۹۴۴ء میں شائع کی

۲۔	''میرا بہترین افسانہ'' (مرتبہ)	ساقی بکڈپو دہلی	طبع اول: ۱۹۴۳ء

اس کتاب میں مختلف افسانہ نگاروں کے اپنے پسندیدہ افسانوں کے علاوہ حالات زندگی اور نظریہ فن سے متعلق تحریر کردہ مواد بھی شامل کیا گیا ہے

۳۔	''ریاست اور انقلاب'' (از لینن کا ترجمہ)	ہند کتاب گھر' دہلی	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۴۔	''میں ادیب کیسے بنا؟'' (از میکسم گورکی کا ترجمہ)	الجدید' لاہور	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۵۔	''جزیرے'' (آٹھ افسانے)	ساقی بک ڈپو دہلی محبوب المطابع	طبع اول: ۱۹۴۳ء

اس مجموعے میں (۱) کالج سے گھر تک (۲) پھسلن (۳) حرام جادی (۴) میلاد شریف (۵) چائے کی پیالی (۶) اندھیرے کے پیچھے (۷) ایک معمولی خط (۸) وہ تین افسانے شامل کتاب ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن آئینہ ادب' لاہور نے ۲۵۶ صفحات پر شائع کیا۔

۶۔	''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' (تین افسانے)	ساقی بک ڈپو دہلی	طبع اول: ۱۹۴۷ء

اس مجموعے میں ۱۔ ''ذکر انور'' ۲۔ ''مچھلیوں کے دام'' ۳ ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' افسانے شام کتاب ہیں

۷۔ ''آخری سلام'' (از کرسٹوفر اشروڈ کا ترجمہ)	جدید لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۸ء
یہ ناول ''Good by to Berlin''		
۸۔ ''مادام بواری'' (از گستاو فلابیئر کا ترجمہ)	مکتبہ جدید لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۰ء
یہ ناول ''Madame Bovary'' کا ترجمہ ہے		
۹۔ ''انسان اور آدمی'' (تنقید)	مکتبہ جدید لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۱۰۔ ''انتخاب طلسم ہوشربا'' (مرتبہ)	مکتبہ جدید لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۱۱۔ ''انتخاب میر'' ماہنامہ ''ساقی'' دہلی	(میر نمبر)	طبع اوّل: ستمبر ۱۹۵۸ء
۱۲۔ ''میں کیوں شرماؤں'' (از شیلا گرنس کا ترجمہ)	کتابستان، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۵۹ء
اس ترجمہ شدہ ناول کا ایک ایڈیشن لاہور سے بھی شائع ہو چکا ہے۔		
۱۳۔ ''ستارہ یا بادبان'' (تنقید)	مکتبہ سات رنگ، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۳ء
۱۴۔ ''Distribution of wealth in Islam''	مکتبۂ دارالعلوم، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۳ء
(از مفتی محمد شفیع کا ترجمہ بہ اشتراک: پروفیسر کرار حسین)		
۱۵۔ ''موبی ڈک'' (از ہرمن میلول کا ترجمہ)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
۱۶۔ ''Answer to modernism''	مکتبہ دارالعلوم، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۷۶ء
(از مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ بہ اشتراک: پروفیسر کرار حسین)		
۱۷۔ ''جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ''	آب حیات، راولپنڈی	طبع اوّل: ۱۹۷۹ء
۱۸۔ ''سرخ و سیاہ'' (از ستاں دال کا ترجمہ)	مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۱۹۔ ''وقت کی راگنی'' (تنقید)	مکتبہ محراب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۷۹ء
۲۰۔ ''جھلکیاں'' (ادبی کالم) دو جلدیں،	مکہ بکس، لاہور	طبع اوّل:
۲۱۔ ''مجموعہ محمد حسن عسکری''	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۷ء
۲۲۔ ''عسکری نامہ'' (افسانے/مضامین)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۷ء

نظریۂ فن:

''میں صرف آرٹ چاہتا ہوں، صرف و محض آرٹ..... خواہ اس میں معاشیات، سیاسیات یا دوسری فضولیات کی بھی آمیزش (آلائش) ہو، مگر سب سے پہلے اسے آرٹ ہونا چاہیے۔ میرا اعلان نامہ Gauguin کے الفاظ میں حاضر ہے: ''آرٹ تفریح کی خاطر؟ کیوں نہیں؟ آرٹ، آرٹ کی خاطر؟ کیوں نہیں؟ جب تک وہ آرٹ ہے، اس سب سے کیا ہوتا ہے۔''

(بہ حوالہ: دیباچہ ''میرا بہترین افسانہ'')

○

حوالہ جات

۱۔ ''اردو افسانہ: تحقیق و تنقید'' از ڈاکٹر انوار احمد میں مقام پیدائش بلند شہر اور تاریخ پیدائش ۱۹۲۱ء درج ہے، جو درست نہیں۔ مجھے اصل مقام اور تاریخ پیدائش سے عسکری صاحب کے بھائی محمد حسن مثنیٰ نے مطلع فرمایا۔ عسکری صاحب کا اصل نام اظہار الحق تھا جو سنہ پیدائش ۱۳۳۸ھ بمطابق ۱۹۱۹ء کا تاریخی نام بھی ہے۔

چائے کی پیالی

محمد حسن عسکری

حالانکہ وہ دیکھنا تو یہ چاہتی تھی کہ اس ایک سال کے دوران میں کون کونسی نئی دکانیں کھلی ہیں اور کون کون سے پرانے چہرے ابھی تک نظر آتے ہیں۔ وہ گورا گورا سنار کا لڑکا اب بھی دکان پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے یا نہیں، سنگر کے ایجنٹ کے یہاں وہ ننھی سی سینے کی مشین ابھی تک سامنے رکھی ہے یا بک گئی۔ مگر جب تانگے والے نے شہر سے باہر باہر جانے والی سڑک پر تانگہ موڑا تو اس نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ اپنی نگاہیں گھوڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہوئے مکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انہیں اتنی اہمیت ہی کیوں دے۔ وہ اس زبردست تحریص کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کر سکنے پر خوش تھی اور خود کو بڑا ہلکا اور سبک محسوس کر رہی تھی، جیسے وہ کسی آزمائش سے اپنے آپ کو صحیح و سالم نکال لائی ہو۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، اور سیٹ پر خوب کھل کر بیٹھ گئی۔ دوڑتی ہوئی لکیریں تانگے کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی تھیں۔۔۔ ہیچ مقدار اور ناچیز، بلکہ مضحکہ خیز لکیریں۔۔۔ اور وہ بلندی پر بیٹھی ان کی سراسیمگی سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو گھوڑا گن گن کر قدم رکھتا اور وہ کسی نہ کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دکاندار اسے دیکھ کر چونک سے پڑتے، ان کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتیں، اور وہ سوچتے ''افوہ، اب یہ کتنی شاندار ہو گئی ہے، اس کے بال کیسے چمکیلے ہیں، اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں!'' مگر ان کے دل میں تحیر اور تجسس کبھی نہ پیدا ہوتا، اور نہ ان کی آنکھوں کی چمک یہ پوچھتی ''کون ہے بھئی یہ؟ کہیں باہر سے آئی معلوم ہوتی ہے'' اس کے برخلاف ان کا انداز تو سرپرستانہ ہوتا اور ان کے خیالات کچھ اس قسم کے ہوتے: ''بھئی ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ روپ نکالا ہے! شاباش، شاباش!'' جیسے اس کے رنگ روپ نکالنے میں ان کی کوشش کو بھی دخل ہو اور وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پرتجمل چیز کے حصول پر مبارکباد دے رہے ہوں۔ ان کی ہلکی زیرلب مسکراہٹ سے معلوم ہوتا کہ وہ یہ پوچھنے والے ہیں ''کہو اچھی تو رہیں، بہت دن میں دکھائی دی ہو۔'' پھر جیسے انہیں یہ توقع ہو کہ وہ ان کی طرف شناسا نظروں سے دیکھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک یہ پروا نہ کرتے کہ اب وہ یہاں کے ''مشن گرلز اسکول'' میں نہیں پڑھتی۔ جس پر دھندلے اردو حرفوں میں ''لڑکیوں کا مدرسہ'' لکھا رہتا ہے، بلکہ ایلی نگر کے ''کرسچین گرلز انسٹی ٹیوٹ'' کی طالب علم ہے۔ اور

نہ وہ اس پر خفیف ہوتے کہ وہ جھٹکے دے دے کر اسے ہلا دے ڈال رہے ہیں وہ تو بس زمین پر پڑے پڑے گستاخانہ کہتے رہتے'' ارے اب تم سے کیا وہ تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ مہینوں تم ادھر سے اسکول آتے جاتے گزرتی رہی ہو۔ نہ جانے کتنی بار تمہارے ٹھوکریں لگی ہیں اور ایک دفعہ تو شاید تمہارے پیر میں موچ بھی آ گئی تھی۔'' بس بالکل اس بسکٹ بنانے والے کی طرح جو اسے دیکھ کر اپنے کالے ہاتھوں اور چہرے سمیت کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔'' اوہ یہ تو وہی ہے عیسائی کی۔'' اور دکانوں کے چھجوں اور پردوں کے سائے تو دونوں طرف سے اسے گھیر لیتے کھسکتے رینگتے' گھسٹتے اس کے پیچھے چلے آتے اس کے قدموں سے لپٹے جاتے اس کے جسم سے کہیں نہ کہیں چپک جانے کی کوشش کرتے بس کسی کے لہجے میں' بھینچے ہوئے گلے سے کہتے جیسے دم توڑ رہے ہوں'' بس ایک لحہ ٹھر جاؤ۔۔۔۔ بس ایک نظر۔۔۔ اپنے پرانے سایوں کی طرف'' اور ان کی یہ عاجزی اور منت سماجت بیکار نہ جاتی۔

اس کے ڈھیلے پڑتے ہی وہ اس کے دل میں گھس آتے اور سینے میں ٹانگیں پھیلا کر سو جاتے' یہاں تک کہ اس کا سر ڈھلک جاتا۔ سانس ہلکا مگر بھاری پتھر ہو جاتا' اور اس پر کسلمندی طاری ہو جاتی' جس میں بے چینی بھی شامل ہوتی۔ لیکن تانگے والے کی صرف ایک اضطراری حرکت نے اسے ان تمام پیچی ہوئی چھپاتی الجھنوں اور جھجھکوں سے بچا لیا تھا۔ اب وہ کتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی' اس کی شخصیت پگھل کر دوسری چیزوں میں نہیں ملی جا رہی تھی۔ وہ اپنا آپ تھی' صرف اور محض مس ڈولی روبنس۔۔۔ بغیر کسی جمع تفریق کے۔ گلابی فراک' سفید دوپٹہ اور اونچی ایڑی کا کالا جوتا پہنے ہوئے سفید چکنی پنڈلیاں تانگے پر مضبوطی سے جمی ہوئی۔ کہنی ٹیکے پر' سنہرے بندے دونوں طرف جھول جھول کر چمکتے ہوئے' احتیاط سے بنے ہوئے کالے بال اور پاوڈر کی خوشبو۔ اگر کوئی اسے'' ڈولی'' کہہ کر پکار لیتا تو وہ تانگے پر پیر مار کر کہتی۔ کیا فرمایا جناب نے؟ ڈولی! مگر معاف کیجئے گا میں تو مس روبنس ہوں' کرسچین گرلز انسٹی ٹیوٹ ایلی نگر کی ساتویں کلاس کی طالب علم اور میں موجود تو ہوں آپ کے سامنے دیکھ لیجئے بھلا میں ڈولی ہو سکتی ہوں'' اگر وہ محض مس روبنس بننا چاہتی تھی تو یہاں بھی کوئی سایہ' کوئی سیڑھی' کوئی دہلیز کوئی گڑھا ایسا نہ تھا جو خواہ مخواہ ضد کئے چلا جاتا'' مگر تھو تو۔ ہم تمہیں مدتوں ڈولی کے نام سے جانتے رہے ہیں۔'' شہر کے باہر جانے والی سڑک کی انفرادیت پسند کوٹھیاں اپنے آپ ہی بڑی خوددار' پر تمکنت اور بے نیاز واقع ہوئی تھیں' وہ باہر کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اگر وہ اس پر بڑی مہربان ہوتیں تو ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتیں'' اچھا تو آپ کا نام مس روبنس ہے! جی' بہت خوب۔'' ان کوٹھیوں کے مطالبہ سے تو وہ یوں آزاد ہو گئی۔ مگر دوپہر کا سورج تو عملی طور سے اس کی مدد کر رہا تھا ایک سخت گیر آقا کی طرح اس نے اپنی نگاہ کرم سے سارے سایوں کو گھیر گھیر کر سامنے سے بھگا دیا تھا' اور وہ سہم سہم کر دیواروں سے لپٹے جا رہے تھے۔ تیز دھوپ نے عمارتوں کو ایسی آنچ دی تھی کہ ان کا رنگ و نگ سب اڑ گیا تھا اور ان کے دل سے خود نمائی کے ولولے نکل چکے تھے۔ اب تو وہ جل بھنی کھڑی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔'' چاہے دیکھو' چاہے نہ دیکھو۔ جہنم میں جاؤ!'' ان کی چڑچڑاہٹ اور کوسنے بھی کتنے مضحکہ خیز تھے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے! تانگے کے تختے پر اس کے پیر کا دباؤ اسے برابر یاد دلائے جا رہا تھا کہ اسے ان گرد و پیش کی چیزوں پر حاوی ہونے کا حق حاصل ہے کیونکہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ مس روبنس ہے جس کے بازو گول اور گداز ہیں اور آستینوں سے باہر نکلے ہوئے' اور پھر یہ بھی کچھ کم نہیں کہ وہ ایلی نگر سے آ رہی ہے' جہاں شیشے کی طرح جھلکتی ہوئی کوٹھیاں' شاندار اسٹیشن اور فرح ناک کمپنی باغ۔ اگر وہ یہاں کی عمارتوں کی طرف دیکھ رہی ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ اس کے لیے جاذب نظر ہیں۔ اب کیا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اگر وہ رشک وحسد سے پھنکی جا رہی ہوں تو خیر کر بھی لے۔

اب تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی آئی تھی۔ مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہنچی تو اسے

اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہاں کے تربوزوں کے ڈھیروں' اناج کی گاڑیوں' اکوں' گھاس والیوں' بھوری مونچھوں والے کسانوں' گُڑ کی جلیبیوں پر بھنکتے ہوئے مکھیوں اور لوہے کی دوکانوں کی دوسرے شوروغل سے اوپر سنائی دینے والی ٹھناٹھن کے درمیان "مس روبنسن" ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب یا مضحکہ خیز نہیں۔۔۔ محض مہمل اور نا قابل توجہ جیسے مسز تو یوز یا میڈم گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانگے میں ایک لڑکی تھی۔ یا ر عایتاً ایک عیسائی لڑکی۔ بس جیسے اکے میں دو مرد' چار عورتیں' پانچ بچے' یا گاڑی میں لگا ہوا پہیہ۔ یا ڈھیر میں ایک تربوز۔ ہر چیز کی ہیئت معین تھی' واضح' روشن' قطعی پوری طرح اپنی لکیروں کے درمیان۔۔۔ نہ کہیں سے رنگ بہا ہوا' نہ کہیں دھندلا۔ ہر چیز کی اپنی انفرادیت تھی۔۔۔ علیحدہ' ٹھوس' مستقل' جری۔ اپنی جگہ پر مطمئن مرنجان مرنج' نہ تو وہ دوسروں کی شخصیت کا ایک حصہ دبا لینا چاہتی تھیں اور نہ گڑگڑا کر التجا ئیں کرتی تھیں کہ انہیں کوئی اپنے اندر مدغم کر لے بڑا غضب تو یہ تھا کہ وہ عداوت پر بھی آمادہ نہ تھیں۔ ڈھیر میں دبا ہوا تربوز بھی چین سے نیچے پڑا تھا' اور اسے اوپر والے تربوز سے کوئی شکایت نہ تھی اور پھر ان سب نے ایک دوسرے کی فردیت کا احترام کرنے کا کچھ ایسا سمجھوتہ کر لیا تھا' اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوشش کر رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا اختصاص اور ندرت کھو دیتی تھی۔ ایلی نگر کی مس روبنسن بھی۔ مس روبنسن کے لیے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا فضول اور غیر اہم بن گیا تھا۔ نمک کی کان میں آ کر نمک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ یہاں کے بے ڈھنگے پن پر ہنس رہی تھی' مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اس سب سے بیزار نہیں تھی' اس پر تو ایک مطمئن تعطل کی کیفیت طاری تھی۔

یوں تو منڈی اور اڈے کا تھوڑا سا درمیانی فاصلہ بھی کوئی بہت روح افزا نہ تھا' اپنا یہی ایک آدھ پان اور سوڈا واٹر کی دکان تھی' یا پھر درختوں کے نیچے نائی کے لڑکے اپنے بکسوں سے ٹیک لگائے' ایک دوسرے سے بیٹھے گپ لڑا رہے تھے مگر پھر بھی اسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا حسیاتی جمود ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کم سے کم اپنا ردعمل تو معین کر سکتی تھی۔ اس کا پیر ایک مرتبہ پھر تختے کو اسی طرح دبا رہا تھا۔ تکیہ پھر اس کی کہنی کے نیچے واپس آ گیا تھا اور خود تانگہ بھی پہلے سے اونچا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ کہ سامنے والی دکان کے گلاس میں سوڈا واٹر اس کے لیے نا قابل قبول ہے۔ وہ اس علم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ نائی کے لڑکے جو اسے کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے بولنے لگے تھے' اس کی آنکھوں اور رخساروں کو پھڑکا سکتے ہیں' اس کے ہونٹوں کو مائل بہ تبسم کر سکتے ہیں' مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔۔۔ اتنا بھی نہیں' جتنا سینما کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹریس کا' کیونکہ وہاں تو وہ دو آنے دے کر کم سے کم ایکٹریس کے گالوں پر سسکیاں بھرنے کا حق خرید لیتے ہیں۔ مگر مس روبنسن اپنے جادو کے اڑن کھٹولے میں ان کے خیالوں تک کی پہنچ سے باہر تھی۔

لیکن فرحت کی یہ لہریں دیر پا ثابت نہ ہوئیں۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ کھڑکھڑاتے ہوئے اکوں' لاریوں کی قطاروں' موٹر کے ہارن کی آوازوں' اکے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی نگر کی مجلا و مصفا اور پر سکون
آوازوں' اکے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی نگر کی مجلا و مصفا اور پر سکون
فضا میں رہنے کے بعد یہ شور و غوغا یہ ہنگامہ رستا خیز اور یہ گرد کے بادل اسے ناگوار گزر رہے ہوں اور اس نے دو ایک بار "افوہ۔۔۔ افوہ!" کرنے کے بعد منہ پر رومال رکھ لیا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی پہچانی تھیں اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ روز یہاں آتی رہی ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری جکھیڑے جاتی ہے اور لال رنگ کی نیکم پور' اور وہ ٹوٹی ہوئی چھتری والا اکہ بہت سست چلتا ہے' اور وہ ڈاڑھی والا آدمی چنگی کا منشی ہے۔ کوئی بھی چیز پر عنادنہ تھی بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد و پیش کی ساری چیزیں بڑے فخر و مباہات کے

ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار تھیں، مگر نہ جانے کیوں وہ مس روبنسن کی شخصیت کو پھیلا کر اس ماحول پر مسلط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دل کو بیٹھتا ہوا محسوس کر رہی تھی اور نہ اس سے یہ ہوتا تھا کہ ڈولی بن کر اپنے آپ کو ان چیزوں کی گود میں دے دے۔ وہ تو پہلو بدلے جا رہی تھی، سمٹی تھی، سکڑتی تھی، طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی، جیسے کوئی وار روک رہی ہو۔ کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تانگہ چلتا ہی رہے، چلتا ہی جائے اور کبھی یہ کہ بہت سے اکے سامنے ہو جائیں اور تانگہ رکا کھڑا رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو جائے اور وہ بغیر کسی کی نظر پڑے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اس کی حالت بس بالکل اس نو خیز لڑکی کی طرح تھی جو اپنی ماں کی نگاہوں سے اپنا پیٹ چھپاتی پھرے اور اگر کبھی ایسا حادثہ رونما ہو جائے تو گھنٹوں ہونٹ کاٹتی رہے۔ وہ اپنے قصبے کی لاری کو جائے پناہ سمجھ کر اس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی اور اس کے خیال سے جھجک بھی رہی تھی۔ کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ مانوس چیز تھی اور اسی کی تو اسے سب سے زیادہ تفصیل یاد تھی جب اس کی اپنی لاری کے بجائے کہیں اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اسے خوشی ہوتی تھی کہ چلو تھوڑی دیر کو تو اور بلا ٹلی۔ مگر جب اس کی لاری کے ایجنٹ نے تانگے کے قریب آ کر کہا "کہاں جانا ہے؟ حکیم پور؟" تو اسے ایک گونہ تکلیف ہوئی۔۔۔ اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اسے پہچانتا نہ ہو۔ اس نے بڑی گلوگرفتہ آواز سے جواب دیا "ہاں۔۔۔ نہیں سعد آباد۔"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں۔" ایجنٹ نے ایک اکے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "بھورے رنگ کی۔۔۔ بس تیار ہے۔"

تانگہ رکنے سے پہلے اس نے تانگے والے کو پیسے دیئے، اور جلدی سے نیچے کود پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے اور ڈرائیور کھڑکی سے ٹیک لگائے، اسٹیرنگ وہیل پر پیر رکھے سونے کی کوشش میں سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پہلے تو ڈولی نے تکلفات کو بالائے طاق کر دینا چاہا، مگر ہونٹوں تک آتے آتے اس کے لفظ بدل گئے۔ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا جیسے اسے ڈرائیور پر اعتماد نہ ہو۔ "کہاں جائے گی یہ لاری؟"

"سعد آباد۔" ڈرائیور نے سر پھیر کر جواب دیا۔

حالانکہ ڈرائیور کا رویہ ایسا تکلف آمیز نہ تھا مگر اس کی آواز سنتے ہی ڈولی کو ایسا معلوم ہوا جیسے سرد سنسناتی ہوئی ہواؤں کے درمیان ایک کمرے نے آ کر اسے چھپا لیا ہو۔ لاری کے انجن کا لمس تک اس کے لیے اسم اعظم کی وہ تختی بن گیا تھا جو اسے ہر قسم کے آسیبوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو اور ملائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کے بجے جائے گی لاری؟"

"لاری؟۔۔۔ یہی کوئی ڈھائی تین بجے۔"

وہ اپنی کوشش کے نتیجے کے بارے میں متذبذب تھی۔ وہ ایک لمحے دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا "اور اب کیا بجا ہوگا؟"

ڈرائیور نے سامنے کے شیشے، کھڑکی اور تیل کے ڈبوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا۔ "کوئی ایک ہوگا۔"

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلی بخش نہ تھا، مگر ڈولی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "اچھا تو۔۔۔"

اب تک ڈرائیور کی غنودگی پر اس کی مردانگی غالب آ چکی تھی اور اسے یہ بھی خیال آ گیا تھا کہ آخر پادری صاحب سے سلام دعا ہے ہی۔ اس لئے وہ اٹھ بیٹھا، اور کنڈیکٹر کو دو تین آوازیں دے کر ڈولی کا سامان اوپر رکھ دینے کے لیے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد مطمئن ہو گئی۔ مگر جگہ کا مسئلہ ابھی درپیش تھا۔ وہ باہر ہی سے کھڑکی کھڑکی اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ایک بڑھیا تنگ پائنچوں کا پاجامہ پہنے، پیر اوپر رکھے بیٹھی تھی، اور اپنے پوپلے منہ سے پان چبا رہی تھی۔ اس کے سامنے کی سیٹ پر ایک

آدمی جو اس کا بیٹا معلوم ہوتا تھا بیٹھا ایک گھڑی کو ٹھیک کر رہا تھا۔ بیچ کے حصے میں رجسٹروں کے ایک ڈھیر کے قریب نکر پہنے ہوئے اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک جوان سا آدمی جو گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد رومال میں بندھے ہوئے پھلوں کو جو اس کے پاس رکھتے تھے اور قریب کھسکا لیتا تھا۔ ڈولی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر کہاں بیٹھے' اور ادھر دھوپ اب نا قابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بیچ کا دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ ڈرائیور نے سر اٹھا کے کہا۔ ''بیٹھو' اندر بیٹھو۔ بس اب چلنے ہے لاری۔''

گو 'بیٹھو' ذرا چونکا دینے والی بات تھی' مگر اس کی آواز سن کر ڈولی کے دل میں یہ امید پیدا ہوگئی کہ آخری فیصلہ ڈرائیور پر چھوڑ دینے سے خود اس کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے ڈرائیور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔۔۔ اچھا۔۔۔ کہاں بیٹھوں؟''

''یہاں آ جاؤ بیچ کی سیٹ پر۔'' ڈرائیور کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

''ہاں۔۔۔ لیکن'' ڈولی نے ڈرتے ڈرتے اپیل کی کہ۔ ''اگر آگے۔''

''آگے؟۔۔۔ آگے تو جی' آج دروغہ جی جا رہے ہیں۔ آگے تو انگی جگہ ہے۔''

مگر جب ڈولی اسی طرح کھڑی رہی اور ہلی تک نہیں تو ڈرائیور نے ایک لمبی سی انگڑائی لی اور کانکھتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ''آگے بیٹھو۔'' اس نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ ہمیں کیا وہ۔ ہمارے سے چاہے کوئی بیٹھے۔ لیکن دروغہ جی جا رہے ہیں آج۔''

''ڈولی نے اندر بیٹھتے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے مورچے کے لیے بالکل آخر تک مقادمت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ گو گدا اتنا موٹا نہ تھا کہ سیٹ کی لکڑی کو اسے تکلیف دینے سے روک سکے' مگر وہ حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے تیل کے ڈبوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں اور اپنے بدن سے گرمی نکالنے اور سانس ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کئی منٹ تک رومال سے ہوا کرنے کے بعد اسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اس نے یکا یک یہ دیکھ کر لاری میں دونوں طرف آئینے لگے ہوئے ہیں' جن میں اس کا چہرہ نظر آ رہا ہے تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر دوسری نگاہ نے حیرت کو کسمساہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بال جگہ جگہ سے نکلے ہوئے تھے اور گرد سے بھورے ہو گئے تھے۔ گرمی نے اس کے چہرے کو تمتما دیا تھا' اور وہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ خشک پپڑیوں نے اس کے ہونٹوں کی سرخی زائل کر دی تھی اور اس کی آنکھیں میلی اور متوحش تھی۔ اس نے شرما کر گھبراتے ہوئے رومال سے بالوں کو جھاڑا۔ زور زور سے چہرے کو رگڑا اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیری۔ یہاں تک کہ وہ دانتوں سے چھل بھی گئے۔ آخر اس نے جھنجھلا کر آئینے کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ برابر والی لاری پر مس کجن کی تصویر لگی ہوئی تھی' ستاروں والی ہری ساڑھی' لمبے لمبے بندے' پتلی سی ناک جس میں کیل چمک رہی تھی' سرخ چہرہ' بڑی بڑی سرمئی آنکھیں۔ مگر یہ تصویر تو اسے آئینے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس لیے اس کی نگاہیں آگے بڑھ گئی اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پلکوں سے بند کر کے تصویر کی طرف جانے سے روکنے لگی۔ لاریوں کی قطار کھڑی تھی مگر اسے صرف ان کے انجن اور مڈگارڈ نظر آ رہے تھے۔ سامنے دو اکے والوں نے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے' اور اپنے اپنے اکوں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ دو ایک خوانچے والے' پانی پلانے والا اور چند کلینز جمع ہو گئے تھے اور آدھے ایک اکے والے کو شہ دے رہے تھے اور آدھے دوسرے کو۔ اخبار والا نانبائی کی دکان کے سامنے تخت پر کچھ تھکا ہوا سا بیٹھا تھا۔ وہیں برابر میں ایک آدمی بیٹھا سائیکل کی مرمت کر رہا تھا اور اس کے گرد تین چار لوگ کھڑے جلدی کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے بعد سڑک پر کنکروں کا ایک اونچا سا ڈھیر تھا جس پر بالٹی رکھ کر ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ سڑک کے پار ایک وسیع و عریض میدان تھا' خشک اور بالکل سفید دھوپ کی سختی کے باوجود مطمئن

اور ساکن۔۔۔ بے نیاز جیسے کوئی معمر اور جہاں دیدہ روایتی فلسفی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے ہلکے ہلکے غبار کا بادل اٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھ جانے کے بعد نڈھال سا ہو کر کھیتوں میں کٹے ہوئے گیہوں کے سنہرے انباروں کی طرف اڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے کچھ دور اُگے پیڑوں کی قطار تھی جن میں سے کسی گاؤں کی کچی دیواریں اور چھپر دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عورت یا بچہ درختوں سے باہر نکل آتا تھا اور ایک آدھ منٹ تک نظر آنے کے بعد پھر غائب ہو جاتا تھا۔

وہ بہت دیر تک مکمل انہماک کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ایک نورانی اور لطیف مادے کی شکل میں تبدیل ہو کر تفکرانہ انداز میں اس میدان کی وسعتوں پر چھا گیا ہے جس کے دونوں کنارے ہوا سے اڑتی ہوئی چادر کی طرح اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا جیسے اس کی روح اپنے جسم کو وہیں چھپا یا ہوا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی ہو۔ اور ایک ننھی سی ابابیل کی طرح کبھی تو ڈراؤنے خوابوں کے خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی بہار کی شاموں کے سکون و بہجت کے ساتھ سارے میدان پر چپٹ چناتی پھر رہی ہو۔ ٹانگیں ملا کر اور بازوؤں کو دونوں طرف پھیلا کر' سر کو کچھ تو اضمحلال اور کچھ جذبہ تسلی و رضا کی سرشاری سے نیچے ڈھلکائے ہوئے وہ بگولوں کے ساتھ اوپر چڑھتی چلی گئی تھی جو اسے فضا میں معلق چھوڑ کر نیچے اتر جاتے تھے اور وہاں سے آسمان کی مخملی نیلاہٹیں اسے اپنے اندر کھینچ کر بے حس بنا دیتی تھیں۔ وہ ایک آم کے پیڑ سے لگ کر گاؤں کی ایک کچی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی' اس نے آم کے پتوں کی تر و تازہ کر دینے والی خوشبو سونگھی تھی' فضا کی طراوت اور خوابنا کی اس کے جسم میں اتر گئی تھی اور وہ کچی دیوار اسے اپنی پرانی ہجولی معلوم ہونے لگی تھی۔

اس لئے جب پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کی نگاہیں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے سے مڑیں۔ ایک اکے میں سے دو تین عورتیں' بچے اور کچھ مرد اترے تھے اور اب ان کا سامان لاری پر رکھا جا رہا تھا۔ ڈولی کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں پچھلے حصے میں چند آدمی اور بیٹھ چکے تھے۔ ان کے قریب ہی نیچے چاٹ والا خوانچہ لیے بیٹھا تھا جسے دیکھتے ہی بچوں نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا تھا' اور اپنی ماؤں کو اوپر چڑھنے کی بھی اجازت نہ دے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں قطار میں سے نکل کر تیل لینے کے لیے پٹرول کے پمپ کے پاس جمع ہو رہی تھیں اور ان کے کلینر زور زور سے آوازیں لگا رہے تھے تاکہ چلتے چلتے بھی جتنے مسافر اور مل سکیں لے لیں۔ لاریوں کے چلنے کی آوازیں سنتے سنتے اور ان کی نقل و حرکت کو غیر دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے یکا یک ڈولی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو پٹرول کی دکان کے قریب بن رہا تھا اور جس کی طرف اس نے ابھی تک خیال کیا ہی نہیں تھا۔ پہلے یہ خالی زمین پڑی تھی جہاں کتے اپنی کھاڑیوں سے گرد اڑاتے رہتے تھے' اور کبھی کبھار کوئی خوانچے والا ستانے کے لیے آ بیٹھتا تھا۔ لیکن اب تو وہاں باڑیں لگی ہوئی تھیں اور ایک نیا مکان بنا کھڑا تھا' بس چھت پوری ہونے کی کسر تھی۔ مکان کے اندر اندھیرا سا تھا' اور اس کی زمین ابھی تک سیلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی' پُر کیف اور ذہن کو کند کر دینے والی خنکی تھی جو ڈولی کی ٹانگوں اور سینے میں سمائے جا رہی تھی' اس کے شانوں کو ڈھیلا اور خون کو سست کئے دے رہی تھی۔ داہنی طرف کچھ خوانچے والے بیٹھے تھے جنھیں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو اس کا چھوٹا بھائی فریڈی اس کا بستر کرے گا' اس کا ٹرنک کھولنے کو بیتاب پھرے گا یہ دیکھنے کے لیے کہ بوا اس کے واسطے کیا لائی ہیں' اور جب وہ کچھ نہ پائے گا تو بہت مایوس ہو گا اور شاید مچلنے بھی لگے۔ لاری کے آٹھ آنے اور سامان اٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد اس کے پاس چار آنے بچتے تھے۔ ایک آنہ برنس کو خط لکھنے کے لیے بھی سہی۔ تین آنے میں کچھ نہ کچھ لیا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اتر کر پھلوں والے کے پاس گئی' اور ایک منٹ تک اس کے ٹوکرے کو بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ ''سنترے کیا حساب دئے ہیں؟''

امیدوں سے بھرے ہوئے لہجے میں پھلوں والے نے کہا "پانچ پانچ پیسے دے رکھے ہیں میم صاحب۔"

"پانچ پیسے کا ایک؟"

"ہاں پانچ پانچ پیسے بڑے میٹھے ہیں میم صاحب۔ لو چکھ کے دیکھو۔"

"نہیں نہیں رہنے دو۔" اس نے تین آنے کو پانچ پیسے میں تقسیم کرتے ہوئے کہا "تین تین پیسے نہیں؟"

"تین تین پیسے کی تو خرید بھی نہیں ہیں میم صاحب۔" پھل والے نے اپنی باطل امیدوں کی اصلیت سے آگاہ ہو کر طنز سے کہا: "لو۔ کیلے لو پانچ پیسے کے دو ہیں۔"

ڈولی اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہ تھی۔ اس نے آدھی مایوس ہو کر پوچھا "کچھ کم نہیں کرو گے؟"

"کم؟ اجی تمہیں نہیں لینا دینا۔ لاؤ میں چلوں" اور پھر پھل والے نے ایک گزرتے ہوئے کسان کو پکار کر کہا۔ "لو چودھری صاحب چوس لو رسیلے ہو رہے ہیں رسیلے۔"

یکایک اس کے حلق میں ذات سی اڑ گئی اور سانس لینے کی کوشش میں کنپٹیوں میں رگیں ابھر آئیں اس کے شانے خود بخود کام کرنے والی مدافعتی آلات کی طرح نیچے جھک گئے اور بازو سخت ہو کر سینے پر آ گئے۔ اسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ جہاں وہ کھڑی تھی دفعتاً بلند ہو گئی اور ساری دنیا کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ اس کا گلا صاف ہوتے ہی پیر اپنے آپ بسکٹ والے کی طرف مڑ گئے اور اس نے تین آنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "بسکٹ۔"

"بسکٹ؟" یہ محض ایک لفظ بسکٹ والے کے لیے کسی قدر مبہم تھا۔ اس نے پوچھا ایک آنے درجن والے کہ تین پیسے درجن والے؟"

"کوئی سے۔" ڈولی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سنے تین بنڈل ہاتھ میں پکڑ لیے اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی جگہ پر واپس چلی آئی مگر بیٹھنے کے بعد تو اس کا دل اس تیزی سے دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے اب نکل کے بھاگنے والا ہو۔ ہر کھٹکے کے ساتھ تھوڑا سا نیچے کھسکتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھاتیاں بڑی بوجھل اور گرم ہو گئی تھیں اور ان میں کوئی چیز ابل رہی تھی سنسنا رہی تھی گول گول چکر لگا رہی تھی۔ ماتھے پر اور ناک کے نیچے پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا جسے خشک کرنے کی کوشش میں اس کا سانس بھاری اور دشوار بن کر اس کے دل کی حالت کو اور بے قابو کیے دے رہا تھا۔ وہ جتنی نیچی ہو سکتی تھی ہو گئی اور دوپٹہ سر اور خون سے بھرے ہوئے گالوں پر کھینچ لیا۔ دوپٹے کے لمس میں تسکین تھی دلاسا تھا ہمدردی اور غمگساری تھی شفقت اور محبت اور آخری وقت تک اس کا ساتھ دینے اور محافظت کرنے کا وعدہ۔ اس کی کھال سے دوپٹہ کیا چھوا تھا، آگ پر پانی پڑا تھا۔ اس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور چند ہی منٹ میں اس کے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی۔ مگر وہ ایسی گرانی اور تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ایک دن کے بخار کے بعد۔

تھوڑی ہی دیر بے حرکت رہنے سے سیٹ کا تختہ اس کے چبھنا شروع ہو گیا۔ دو ایک جمائیاں لینے سے بھی اس کی تسکین نہ ہوئی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لمبی سی انگڑائی لے یا ٹانگوں کو خوب تان کر پھیلا دے۔۔ لاری کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ مگر لاری کے لوہے سے زور آزمانا، اس کی ٹانگوں کے مان کا نہ تھا اور انگڑائی لینے میں یہ خدشہ تھا کہ اس کا دوپٹہ پھسل جاتا اور بازو اونچے اٹھتے جہاں سب کی نظریں ان پر پڑتیں۔ جب پہلو بدلنے سے کام نہ چلا تو اس نے ڈرائیور کو پکار کر بلایا اور وقت پوچھا۔

"اب چلے ہے" ڈرائیور نے کہا۔ "گھبراؤ کیوں ہو۔"

''مگر ویسے بجا کیا ہے؟''

''سوا دو بج رہے ہیں اب۔''

ابھی پورا پون گھنٹہ باقی تھا اور یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی رانیں پتھر ہوئی جا رہی تھیں۔ پہلے تو وہ مارے کوفت کے اپنی سیٹ کی پشت پر ڈھلک گئی' مگر اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ لاری والوں کے قاعدے، کرم کے قانون سے کسی طرح کم اٹل نہیں ہیں۔ اس نے کسی المیہ کی ہیروئن کی سی شان کے ساتھ اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا' اور بسکٹوں کے بنڈلوں سے کھیل کھیل کر اپنا دل بہلانے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ بسکٹوں کو بیٹھک میں چھپا دے گی' اور پھر اندر آ جائے گی۔ فریڈی اسے دیکھتے ہی ''ڈولی بوا' ڈولی بوا'' چیختا دوڑے گا اور آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ وہ پوچھے گا ''ڈولی بوا کیا لائی ہو؟'' ''دکھاؤ۔۔۔ انگریزی مٹھائی لائی ہو؟۔۔۔ تم کہہ گئی تھیں!'' جب اسے سارے سامان کی تلاشی لے چکنے کے بعد کچھ نہ ملے گا تو وہ ٹھن ٹھنانے لگے گا۔ وہ اسے چھیڑ چھیڑ کر ہنستی رہے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی رو دے گا تو وہ چپکے سے ایک بنڈل چھپا کر لائے گی اور کہے گی ''اچھا' آنکھیں بند کرو' دیکھو' ہم تمہیں ایک چیز دیں۔'' فریڈی کا چہرہ مسکرا پڑے گا' اور وہ اسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرے گی۔۔۔ جب فریڈی بسکٹ کھانے لگے گا تو وہ اس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے گی اور کہے گی ''ہم جب دیں گے بسکٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے۔'' فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اوس سے بھیگا ہوا گلاب رکھ دیا۔ اس کے جسم میں رس اترتا چلا جائے گا اور وہ فریڈی کی ٹانگوں کو اپنے پیٹ پر بھینچ لے گی۔ اس کے گال پر فریڈی کا تھوک لگ جائے گا۔ مگر وہ اسے صاف نہیں کرے گی' بلکہ یوں ہی رہنے دے گی۔۔۔ اس طرح یہ تینوں بنڈل کم سے کم ایک ہفتہ چلیں گے۔ گو اس نے جلدی میں تین آنے پھینک دیئے تھے' مگر خیر ٹھیک ہے۔۔۔ اب وہ برنس کو لفافہ کے بجائے کارڈ بھیج دے گی۔ چلتے ہوئے برنس نے بڑا پکا وعدہ لیا تھا خط لکھنے کا۔ چونکہ وہ وعدہ کر آئی ہے' اس لیے چھٹیوں بھر اُسے خط بھیجتی رہے گی۔۔۔ لفافہ نہ سہی تو کارڈ تو ضرور۔۔۔ مگر کارڈ پر لکھا ہی کتنا جائے گا؟۔۔ بہر حال وہ کوشش کرے گی کہ لفافہ بھیجے۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا پیسہ چھپا لیا کرے گی۔ مشین کے اشتہاروں کی ردی بیچ کر بھی کچھ پیسے جمع ہو سکتے ہیں اور جب پاپا تنخواہ لایا کریں گے تو وہ ایک دو آنے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب ماما چماریوں کو بائبل سنا کر تا جلایا کریں گی تو کسی کسی دن وہ ان سے اناج لے لیا کرے گی' اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بازار بھیج کر اس کے پیسے منگوا لیا کرے گی۔ وہ کم سے کم پندرہ دن میں ایک دفعہ تو ضرور خط بھیجے گی۔۔۔ کل رات وہ اور برنس دونوں ڈیڑھ بجے تک' ایک چارپائی پر لیٹی باتیں کرتی رہی تھیں' یہاں تک کہ ان کے پیر اور آنکھوں کے پپوٹے ٹھنڈک محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں' اور باتوں کے جوش میں بعض اوقات ان کے سینے مل جاتے تھے۔ ان کے تھوک نکلنے کی آواز بار بار ہوا میں گونجتی تھی۔ دونوں کے بازو جل رہے تھے مگر ان کا مس کتنا راحت بخش تھا' اس کا جی چاہتا تھا کہ یہ بازو بس یوں ہی ملے رہیں۔ مگر بغیر کسی خاص سبب کے اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ کام کر رہی ہے اور ڈر رہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں' اور پھر اس راحت کے احساس کی شدت بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے اسے بار بار بانہیں الگ کرنی پڑتی تھیں۔ اسے رخصت کی رات برنس نے اپنے سارے راز جنہیں وہ ہمیشہ چھپاتی رہی تھی ایک ایک کر کے بتا دیئے تھے۔ اس نے سنایا تھا کہ ایک دن جبکہ سارا اسکول مل کر سینما گیا تھا تو ایک لڑکا جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا' برابر اس کی طرف دیکھتا رہا' برنس نے بھی چند مرتبہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا' اور اندھیرے میں اس نے ایک پھول برنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اس لڑکے کا قصہ تھا جو اسے چھٹیوں میں ملا تھا جب وہ اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ یہ قصہ سنانے سے پہلے اس

نے رکتی ہوئی آواز میں کہا'' ذرا اور قریب کھسک آؤ۔'' برنس نے اپنا بازو مضبوطی سے اس کے گرد ڈال لیا تھا' اور اس کی کمر تھپتھپاتی جاتی تھی۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا' اور جسم سے لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اس نے دیوی داس بتایا تھا جو اس کے بھائی کے ساتھ پڑھتا تھا' اور بڑا گورا اور خوبصورت تھا اور ریشمی سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا' دیوی داس کی خوش مزاجی نے اس کی مدافعت پر جلد قابو پا لیا تھا۔ جب اس کا بھائی ادھر ادھر ہوتا تو وہ اسے گود میں بٹھا لیتا تھا' اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتا تھا'' ''اور وہ'' برنس نے اپنی ٹھوڑی سے سینے کی طرف اشارہ کر کے لفظ چباتے ہوئے کہا تھا: یہاں ہاتھ رکھے رہتا تھا۔'' قصہ سناتے سناتے برنس نے رک کر تکیئے سے سر اٹھا لیا تھا اور چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہنے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد ملتجیانہ لہجہ میں کہا تھا'' ڈولی ہم پیار کر لیں تمہیں'' اور اس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اس نے اپنے گرم ہونٹ ایک طویل بوسے کے لیے اس کے گالوں پر رکھ دیئے تھے' اس کے بوسے کے نیچے ڈولی کو ایسا اطمینان' بے فکری اور محفوظ ہونے کا احساس حاصل ہوا تھا جیسے چھوٹے سے کینگرو کو اپنی ماں کی تھیلی میں بیٹھ کر۔۔۔ قصے کے دوران میں اس نے اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ٹانگوں سے دور ہیں' مگر اس کا سینہ ہر سانس کے ساتھ خود بخود آگے کھسکتا چلا جاتا تھا۔ اس کے روکنے کے باوجود اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی تھیں' اور بار بار چادروں سے منہ اور ہاتھ نکال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں۔۔۔ چلنے سے پہلے وہ دونوں ساتھ ساتھ پھرتی رہی تھیں۔ اگر ان میں ذرا سا بھی فاصلہ ہو جاتا تھا تو ایسی چبھن محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے بدن جڑے ہوئے ہوں۔۔۔ برنس کی آواز میں کیسی نرمی اور حسرت اور حلق میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی نمی تھی۔۔۔ برنس کی جدائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اداس رہی تھی' خصوصاً ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کہنی رکھے باہر دیکھتی رہی تھی۔ کھیت' جھاڑیاں تار کے کھمبے' درخت قریب آنے کے بعد ناچتے ہوئے گھوم کر افق کی طرف نکلے چلے جاتے تھے' گویا وہ اسے ذرا سا دلاسا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اس کے سینے اور گلے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کے سینے کے بیچوں بیچ کوئی چیز ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی تھی جو اندر اترتی چلی جاتی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے' اور رزع میں پھڑ پھڑاتے ہوئے پردوں کی طرح اپنا سینہ دیوار کے ٹھنڈے ٹھنڈے تختے سے لگا دے اور ساری دنیا سے غافل ہو جائے۔۔۔ جب وہ لال پل آیا تھا تو اسے ذرا ڈھارس بندھی تھی کہ اس نظارے سے اس کی افسردگی دور ہو جائے گی۔ مگر ان دیوؤں کی سی سرخ ٹانگوں سے جو اسے دریا کے نیلے نیلے' چمکتے ہوئے پانی کو اچھی طرح دیکھنے نہ دیتی تھیں اور اس دھڑ دھڑ اور گھڑ گھڑ سے وہ اتنی بیزار ہوئی تھی کہ اگر پل جلدی ختم نہ ہو جاتا تو وہ مارے وحشت کی رو دیتی۔۔۔ اسے کچھ پتہ نہیں رہا تھا کہ باقی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی جوابا کی میٹھی ہوئی آواز یا کریس کی چیخیں جسے شاید لڑکیاں ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہی تھیں' یا آئرین کا بلند قہقہہ ایک لمحے کے لیے اس کے وجود کے پگھلاؤ کو روک لیتا تھا۔۔۔ برنس تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ لی ہو گی' وہ اپنے بھائی بہنوں سے باتوں میں مشغول ہو گی جو اس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے۔۔۔ برنس دھوپ سے سفید پلیٹ فارم پر اتری ہو گی' اور اس کے ہرے جوتوں کی ایڑیاں پتھروں پر کھٹ کھٹ بولی ہوں گی۔۔۔ اس نے قلیوں کو پکار کر اپنا سامان اتارنے کے لیے کہا ہو گا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی۔

برنس کی گاڑی اسٹیشن کے قریب آ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے بھڑ سے دروازہ کھول کر ڈولی کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ لیکن کہیں سر اور ہاتھ ہلانے جلانے کے بعد جا کر وہ یہ سمجھ سکی کہ حالات کا رخ کیا ہے۔ لاری پوری بھر چکی تھی اور اب ڈرائیور گاڑی چلانے کے لیے ہینڈل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں ''لو بھئی! چلی تو کسی طرح۔''

''کچھ معلوم بھی ہے؟'' ڈرائیور نے کلیئرز کو ہینڈل دیتے ہوئے کہا' پورے دس منٹ پہلے چھوڑ رہا ہوں۔''

لاری کا انجن بھر بھرانے لگا۔ ننھے ننھے چکر اس کے پیروں میں داخل ہوئے اور گول گھومتے ہلکی ہلکی چھلانگیں مارتے اور چڑھتے چلے گئے۔ پنڈلیوں' رانوں پیٹ' چھاتیوں' بغلوں' بازوؤں' کانوں اور انگلیوں کے پوروں میں پھیل گئے۔ اس نے اپنے پیر سامنے کی لوہے کی چادر پر رکھ دیئے تا کہ اس کے پیر اور جھنجھلانے لگیں۔ مگر ایک دفعہ چکروں کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ وہ دھکا پل میں آگے نہ بڑھ سکا' بلکہ پیٹ کے نچلے حصے میں اٹک کر ادھم مچانے لگا' یہاں تک کہ ڈولی نے بجلی کی سرعت سے پیر کھینچ لئے اور اپنے دونوں گھٹنے خوب کس کر ملا لئے۔ لاری اسے ہلکے ہلکے جھکولے دیتی آگے بڑھی' مگر وہ ابھی رینگ رہی چل رہی تھی کہ پٹرول کے پمپ کے پاس پھر رک گئی۔

''کیوں بھیا'' کسی نے پچھلے حصے سے پکارا'' کیا اور بٹھاوے ہے؟ یہاں پہلے ہی گھٹنے جا رہے ہیں' مرے یار۔''

مگر ڈرائیور نے اسے نا قابل اعتنا سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا' اور اتر کر پمپ والے سے دو گیلن تیل بھر دینے کے لیے کہا۔۔۔ پمپ کے اجلے صاف شیشے میں نقرئی سیال اتھلا اتھلا کر اور ٹھمک ٹھمک اوپر چڑھنے لگا۔ سب سے زیادہ جو چیز ڈولی کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے بلبلے تھے جو ابلتے ہوئے شفاف تیل میں شریر پریوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ پٹرول کی بو کے باوجود اس نے سر نہیں پھیرا تھا اور تیل کو چڑھتے اترتے دیکھتی رہی تھی جس سے اس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی' اور اس کی ہنسلی کی ہڈیوں میں سرسراہٹ ہونے لگی تھی جو اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اکوں کو گرد کے بادلوں میں چھپاتی پھر روانہ ہوئی۔ ڈرائیور گاڑی کو ٹھیک رفتار پر لا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ کلچ پر پہنچا تھا' ڈولی سانس کو حلق ہی میں روک کر کسی گمنام اور مبہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو جو اس وقت انتظار اور ارتعاش' کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک کھنچاؤ اور اینٹھن محسوس کر رہا تھا' ہوا پر، جس کی ہستی اسے ٹھوس اور مرئی معلوم ہو رہی تھی آگے جھکا دیتی تھی۔۔۔ ایسی خود سپردگی اور یقین کے ساتھ جیسے کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا رہی ہو اور جب کلچ کی چیخ ختم ہوتی تھی تو گویا وہ ایک گولی کی شکل اختیار کر کے اس کی ران میں گھس آتی تھی جسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی' اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹھوں کو ایسی سختی سے اکڑاتی تھی جیسے ان کے ڈھیلے پڑتے ہی اس کی زندگی بھی گل کر بہہ جائے گی۔

سعد آباد کی سڑک پر مڑنے کے بعد لاری کی رفتار کینڈے پر آ گئی اور اب ڈولی کے اعصاب کو کلچ کے زیر و بم کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ادھر سے ادھر کھسک کھسک کر اس نے گدے کا ایک حصہ دریافت کر لیا جو نسبتاً نرم تھا اور جہاں سے اس کی ٹانگیں پہلے سے زیادہ پھیل سکتی تھیں۔ دروازے کی طرف کا حصہ مدور تھا' ایسا گول کہ اس کی کمر اس میں بالکل ٹھیک آتی تھی اس نے اپنے جسم کو اس کے حلقۂ آغوش میں گرا دیا اور کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے اسے وہاں سے علیحدہ کر دیئے جانے کا خوف ہو' اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا گال بھی دیوار سے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی' اور لاری کا دروازہ باہر سے جل رہا تھا مگر اس کے باوجود اس کا اضمحلال کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اپنے اعضاء کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیف بن گئی تھی جس سے ہر ہر بند پورے شعور و ادراک کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیز میں اسے روشنی' تازگی' دلچسپی' ندرت اور گرمیوں کی صبح کا سا تبسم نظر آ رہا تھا' جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کو۔ اس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دور دور دوڑانا نہیں چاہتی تھی' بلکہ اپنی توجہ کو صرف سڑک کے کناروں تک محدود کئے ہوئے تھی' اور جب سڑک کا پہلا پتھر تک ایک فوری جادو کے زیر اثر دلفریب بن گیا ہو تو پھر کسی اور عجوبے کی تلاش میں آنکھوں کو سرگرداں کرنے سے کیا فائدہ!

دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک سیدھی پھیلی ہوئی تھی' اور ایک ہمیشہ آگے بڑھتے ہوئے نقرئی ستارے پر ختم ہوتی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت بھی تھے' مگر تیز دھوپ نے ان کی آدھی شخصیت اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ لاری عجب خود اعتمادی اور پندار کے ساتھ بے نیازی سے چلی جا رہی تھی' اس کی آواز دور سے سنتے ہی بیل گاڑیاں جلدی جلدی بالکل سڑک کے کنارے پر ہو جاتی تھیں' اور شہر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے گھبراتے تھے کہ بجائے الگ ہٹ جانے کے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف بھاگنے لگتے تھے۔ لاری کی رفتار اور خصوصاً بیل گاڑیوں پر اس کی فوقیت، ڈولی کے دل میں رُعب کا احساس پیدا کر رہی تھی' اور اسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مادے کی نجاست میں اس کی آلودگی اوروں کی نسبت کم ہو گئی ہے۔ انجن کی بھن بھناہٹ نے اسے دوسرے مسافروں کی گفتگو اور بحث و مباحثہ کی چیخ چاخ سے محفوظ کر دیا تھا' اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس تھرتھراہٹ نے اس کے گرد ایک ایثری حلقہ بن دیا تھا، جہاں اس کے خیال کے مطابق' اسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا' اور اس لیے پوری آزادی کے ساتھ اس کے نتھنے پھول سکتے تھے اور بند ہو سکتے تھے' اور چہرہ جو رنگ چاہے اختیار کر سکتا تھا۔ اپنے اس قلعہ بند گوشے میں سے وہ سڑک کے گزرتے ہوئے نظاروں کی سیر کر رہی تھی۔ وہ کئی ٹیلوں' مزاروں' کنوؤں اور باغوں سے اچھی طرح آشنا تھی' بلکہ بعضے بعضے درخت تک ایسے تھے جنھیں وہ پہچان سکتی تھی۔ رہٹ کنویں کو دیکھتے ہی اس نے بتا دیا تھا کہ اب اس کے بعد کھجور کے پیڑ والا باغ آئے گا۔ شہر سے دو میل آگے کنجروں کا ایک بنگلہ تھا جہاں کچھ مرد اور عورتیں سینکوں کے چھاج اور سرکیاں بنایا کرتے تھے۔ اول تو ڈولی کو ان لوگوں کے بڑھے ہوئے بالوں اور وحشت ناک حلیوں ہی سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ مگر دو دفعہ اس نے یہاں ایک چھوٹے قد اور دوہرے بدن کی عورت دیکھی تھی جس کی بڑی بڑی پُرفن آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں اور جس کی غیر معتدل چھاتیوں کی نظروں کو شرما دینے والی جنبشوں نے اس پر موٹے موٹے حرفوں میں ''نامناسب'' اور ''مشتبہ'' لکھ دیا تھا مگر جو ان ہی اوصاف کے سبب سے قابل توجہ بن گئی تھی۔ ڈولی نے لاری سے سر نکال کر اسے بار بار دیکھا تھا اور آج بھی وہ اسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر جب لاری وہاں سے گزری تو بنگلے کے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ صرف تین بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لیکن ڈولی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی' اور وہ پھر سڑک کی نت نئی سیروں کی طرف متوجہ ہو گی۔۔

مگر صرف ایک چیز جسے وہاں پانے کے لیے وہ پہلے سے تیار نہ تھی اور جسے وہاں پا کر اسے تعجب ہوا یہ ایک نیا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ چاروں طرف پکی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' ایک بہت اونچی چمنی سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا اور چند مزدور ٹوکریاں لئے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے' مگر بھٹے کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ یہ جگہ پھر بھی بے طرح خالی خالی نظر آ رہی تھی۔۔۔ ایسے اڈے پر ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی اینٹ اینٹ میں ایسی طمانیت بخش نمی تھی کہ ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ اینٹوں پر ہاتھ رکھے رہے، سیلی ہوئی مٹی کی بھینی خوشبو سونگھے' اور کونے میں کھڑے ہو کر وہاں کے ہلکے ہلکے اندھیرے کو اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سنے۔۔۔ اس مکان کی تری کی یاد اس کے خیال کو جاڑے کی ان شاموں کی طرف لے گئی جب اسکول کے فیلڈ کے ہر طرف سے دھیما دھیما دھواں ہلکے ہلکے اٹھ کر وہاں باقی بچی ہوئی لڑکیوں کو حلقے میں لے لیتا تھا اور بیرونی دنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکہ و تنہا اور مسحور خطہ بن جاتا تھا' اور وہاں کی رہنے والی مقید شہزادیوں کی کھلی ہوئی بانہوں اور ٹانگوں پر جاڑے کی ٹھنڈک ایسے آ کر لگتی تھی جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا ہو' اور کندھے اور سینے تھرتھرانے لگتے تھے۔ مگر موسم میں کچھ ایسی گم گشتی اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تقاضا کہ دو چار لڑکیاں جھوٹ موٹ کھیل میں مشغول باقی رہ ہی جاتی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ نیلے سوٹ والا لڑکا ادھر سے گزرتا تھا۔ جب تھوڑی دور سے بھی اچھی طرح شکل پہچاننے میں نہ آتی تھی مگر وہ

چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا قریب ہو کر چلتا تھا اور ڈولی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ تین دن کے اندر ہی ڈولی کو اس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی اور وہ بھی اس کے انتظار میں چہار دیواری کے قریب سے قریب ٹھہرے رہنے اور کم سے کم ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نہ معلوم وہ اتنا اکیلا اکیلا کیوں معلوم ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے ہمراہ کبھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا تھا بلکہ اس کا چہرہ بھی ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ جب ڈولی کی نگاہیں اس سے مل جاتی تھیں تو ان آنکھوں کی پر تفکر ادا سی ایک مختصر ترین لمحے کے لیے اس کے دل میں بھی کسک پیدا کر دیتی تھی۔ نیلے کوٹ میں سے اس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے اچھے معلوم ہوتے تھے اور اس کے چمکدار بالوں اور پر متانت چال کے تصور نے اس کی کتنی راتوں کو مشغول رکھا تھا۔ وہ گرمیوں میں بھی آتا رہا تھا اور جاڑوں کی دھندہٹ جانے* کے بعد اب اس کے ہونٹ بھی صاف نظر آنے لگے تھے، جن سے اس کے مزاج کی نرمی اور محبت اور اس کے دل کی حسرت سی ٹپکتی تھی۔ وہ آج بھی یقیناً آئے گا مگر میدان کو بالکل خالی پا کر بہت مایوس ہوگا۔ وہ کس طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہے گا اور ہر لمحے اس کی مایوسی بڑھتی چلی جائے گی وہ دو تین دن برابر آئے گا مگر آخر اس کی امید بالکل ٹوٹ جائے گی۔۔۔ اس کے رنج کا خیال خود ڈولی کے دل میں بار بار ٹھونگیں سی مار دیتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ آج ٹھہر گئی ہوتی! جب وہ گزر رہا ہوتا تو وہ کسی سے پکار کر کوئی ایسی بات کہتی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں میں گھر جا رہی ہے' یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتی۔ اس سے کم سے کم یہ تو ہوتا کہ اس کو اتنی شدید مایوسی کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا۔۔۔ شاید وہ اسے اپنی کوئی یادگار دیتا۔ مثلاً وہ اپنا رومال چہار دیواری کے اندر پھینک دیتا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہوتا اور وہ اسے پکار کر کہتی۔ ''ذرا سنئے۔۔۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں؟'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتی کیونکہ اس کا چہرہ خود اس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چہار دیواری کے پار چلا آتا اور دونوں کسی چیز پر بیٹھ جاتے۔ سڑک پر ایک راہ گیر بھی نہ چل رہا ہوتا اور مسٹر یس وغیرہ سب اسکول کے اندر ہوتیں۔ وہ اس کے کندھوں کے گرد بازو ڈال لیتا اور اسے پیار کرتا۔۔۔ مگر سینما میں تو اس نے دیکھا تھا کہ گالوں کے بجائے ہونٹوں کا بوسہ لیا جاتا۔ اس لئے فلم کی ہیروئن کی طرح اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا اور سر پیچھے کو جھک جاتا۔ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکتا اور اس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور انگلی سے پکڑ کر ایک لحہ دیکھتے رہنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے اپنے ہونٹ رکھ دیتا' فلمی ہیرو کی طرح اس کے ہونٹ پتلے اور نرم ہوتے۔۔۔ خود ڈولی اپنے جسم کو اس سے جس قدر قریب ممکن تھا، لگا دیتی اور اپنے گوشت میں اس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتی۔۔۔ گرمیاں یکا یک جاڑوں میں بدل جاتیں' اور ہر طرف سے دھواں اٹھ کر انہیں دوسروں کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمی کی شام کی واقعیت اور آنکھوں کو تکلیف دینے والی ماہیت اور خاکیت کی جگہ جاڑوں کی پر اسراری' ابہام اور ماورائیت لے لیتی۔ بتدریج تاریک ہوتے ہوئے لمحوں کی بیدرد گریز پائی وہیں کی وہیں جم کر رہ جاتی' وہ ایک دوسرے سے اپنا جسم لگے ہوئے پیار کی باتیں کرتے رہتے' کرتے رہتے یہاں تک کہ ان کی یکجائی کا ایک ایک لحہ ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا۔۔۔ بخارات کی طرح دھجی دھجی ہو کر اڑتے ہوئے اندھیرے سے جدوجہد کرنے والے اکیلے ستارے کی روشنی میں وہ کتنے معصوم' آمیزش و آلائش سے پاک اور مصفا و منزہ معلوم ہونے لگتے۔۔۔ جیسے آدم و حوا عرش بریں کے سائے میں اپنی ملاقات کے پہلے دن۔۔۔ بہجت و مسرت کی اس فراواں منظری کے ساتھ ساتھ ڈولی کے تحت الشعور میں طرح طرح کے تہدید آمیز خدشے اور غوغے جڑ پکڑ رہے تھے۔ جب وہ اپنے تخیل کی سحر کاری سے اچھی طرح لطف اٹھا چکی اور کسی بچی بچائی چیز کے کھوج میں ذرا سا رکی تو وہ فتنے اپنی کمیں گاہ سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال اسے بار بار ڈرائے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے بعد وہ اسے نظر نہ آیا تو۔۔۔؟ ممکن ہے وہ اس دوران میں کہیں باہر چلا جائے یا اتنی دور مکان لے لے کر وہاں سے آنا

منتقل ہو جائے یا پھر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ نیلا سوٹ کسی اور سڑک پر نظر آیا کرے اور یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے کہ اتنے دن تک نہ دیکھنے کے بعد اسے ڈولی پسند نہ رہے' اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے چکر میں آنا محض حماقت سمجھنے لگے' اور کیا خبر کہ وہ شروع سے ہی ڈولی کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو' اور محض تفنن طبع کے لیے اس سے نظر بازی کرتا رہا ہو اور اب اس مذاق سے اس کا دل بھر جائے۔۔۔ اگر وہ نہ آیا تو ڈولی کی دنیا کیسی ویران ہو جائے گی' کھیل دیل میں اس کا بالکل جی نہ لگے گا۔ وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھے گی۔ مگر ہر دفعہ اس کی نگاہ کسی خوانچے والے یا کسی بڑھے ٹہلنے والے سے ٹکرا کر واپس آ جایا کرے گی' چند دن تو وہ رات تک ٹہل ٹہل کر انتظار کرے گی' مگر پھر اس کا دل اتنا رنجیدہ اور بیزار ہو جائے گا کہ وہ سب سے پہلے واپس ہو جایا کرے گی' وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اپنے ہونٹ چبایا کرے گی' اور بولنا بالکل کم کر دے گی۔۔۔ اسے چاہیے تھا کہ پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اسے یاد تو کر لیا کرتا مثلاً وہ دیوار کے اس طرف کوئی چیز گرا دیتی' اور اس سے دوستانہ مگر انکسار کے لہجے میں کہتی' مہربانی سے ذرا اسے اٹھا دیجئے۔'' جب وہ اٹھا کر دیتا تو وہ اس کا مسکرا کر شکریہ ادا کرتی اور وہاں سے ہٹنے سے پہلے چند لمحے ٹھٹکی رہتی اور کئی دفعہ متشکرانہ اس کی طرف دیکھتی۔ تب تو یقین تھا کہ وہ اس کے دل میں جگہ پا لیتی' اور وہ چھٹیوں کے بعد بھی آنا نہ چھوڑتا۔۔۔ یا پھر کسی دن ہمت کر کے اور ساری دنیا سے مخالفت پر کمر باندھ کر وہ اسے روک لیتی اور پوچھتی'' کیا آپ کو میں اچھی نہیں لگتی؟ کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں ہے' یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر آپ اتنے الگ تھلگ اور بے پروا سے کیوں نکلے چلے جاتے ہیں؟ میں تو آپ کے خیال میں راتوں کو کتنی کتنی دیر تک جاگتی رہتی ہوں یہاں تک کہ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا ہے کلاس میں بیٹھے بھی میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں اور ٹیچر نے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکی ہوں۔'' وہ خاموشی سے سنتا رہتا اور آخر کہتا کہ۔۔۔ مگر کون جانے کہ وہ کیا کہتا!۔۔۔ یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ وہ دونوں ساتھ بیٹھے ہوتے اور وہ اس سے شرارت کرتے ہوئے کہتی:'' آیئے' لو لائک ہیٹ (Love like Hate) لکھ دیجئے۔'' وہ پہلے اوروں کے نام لکھتی' جن کے مقابلے میں وہ کبھی تو Hate لکھ دیتا اور کبھی Like لکھ دیتا اور جب وہ اسے نام دکھاتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے۔ آخر میں وہ اپنا نام لکھتی' اور بے چینی سے اس کے لکھنے کا انتظام کرنے لگتی وہ سلیٹ پر Love لکھ دیتا اور جب سلیٹ الٹی جاتی تو وہ ظاہر میں تو جھینپ کر مسکراتے ہوئے نیچے دیکھنے لگتی' مگر اس کے دل میں خوشی کا دریا امنڈ آتا اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے اور پھر وہ مگر نہ جانے پھر وہ کیا کرتا! شرما کر بھاگ جاتا! یا اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا! ممکن ہے کہ ڈولی کے کپڑے اسے پسند نہ آئے ہوں۔۔۔ کیا اچھا ہو اگر چھٹیوں کے بعد جب وہ لڑکا ادھر سے گزرے تو وہ ایمی کا ساریشمی فراک پہنے ہو۔ سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والا' جس کے گریبان پر خوبصورت سی بو بنی ہوئی تھی۔۔۔ ایمی نے بڑے فخر سے اپنا فراک سب کو دکھایا تھا' اور وہ اس کپڑے کی قیمت دو روپے گز بتا رہی تھی۔۔۔ دام تو بہت زیادہ ہیں۔۔۔ مگر ایسا بھی کیا ہے۔۔۔ جب وہ گھر پہنچے گی تو اس کی ماما کہیں گی:'' تمہارے پاپا دہلی گئے تھے' وہاں انہوں نے کپڑوں والے کی دکان پر فراک کا ایک کپڑا دیکھا۔ انہوں نے سوچا کہ ڈولی کے لئے لیتا چلوں۔ بڑا استامل گیا وہ بس ایک فراک کا ہی تھا۔'' وہ ماما سے جگہ پوچھ کر بھاگی بھاگی جائے گی' اور کپڑا نکال کر دیکھے گی تو وہ وہی سبز پھولوں والا ہوگا۔۔۔ وہ اپنے فراک کو بہترین وضع کا ترشوائے گی اور گریبان پر سیپ کے نیلے بٹن ٹکوائے گی۔ جب وہ اسے پہنے گی تو کیسی اچھی معلوم ہوگی۔ وہ اس دن دوپٹہ بالکل نہ اوڑھے گی اول تو دوپٹے سے گریباں کی ساری خوبصورتی چھپ جاتی ہے' دوسرے دوپٹہ کیا ہوتا ہے عذاب جان ہوتا ہے۔ ہر وقت سنبھالتے رہو ہاتھ ادھر ادھر ہلاؤ تو پھنس جائے۔ مسلمان سے لگنے لگتے ہیں دوپٹہ اوڑھ کر۔۔۔ یہ اچھے قاعدے ہیں اسکول کے باہر جاؤ تو دوپٹہ اوڑھ کر جاؤ، ساڑی نہ پہنو، میٹرن کے بغیر کہیں نہ جاؤ۔۔۔ وہ میٹرن ایک چڑیل ہے ذرا سامنے سے کھسکنے نہیں دیتی گر جاسے لوٹتے

ہوئے کتنی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر چلے' مگر میٹرن نے ایک نہ مانی اور کھیل کے میدان میں بھی ایسی کن سوئیاں لیتی پھرتی ہے جیسے چوری کی سازش ہو رہی ہو۔۔۔ اور ہاں' ساڑھی پہننے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کی لڑکیاں بھی تو ہیں۔ وہ رنگ برنگ کی ساڑھیاں پہن کر جاتی ہیں لاری میں دس بجے۔۔۔ یہاں صبح پانچ بجے ہی اٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اٹھنے میں دیر کرو تو ایک چیخ پکار' آفت۔ چاہے نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں مگر چل کر ناشتے کی روٹی پکاؤ۔ یہ بھی تو نہیں کہ اس کے بدلے ایک ٹکیہ ہی زیادہ مل جائے۔ وہاں تو الٹی میٹرن صاحبہ چلاتی ہوئی آئیں گی: "اس مہینے میں گھی بہت خرچ ہو گیا، مجھے دکھا کر لیا کرو روز" اور پھر اوپر سے چھوٹی لڑکیوں کی ضدیں وہ لیں گے ہم' وہ بڑی ہے۔" کام کے وقت تو بڑی سوتی رہیں اور جب سب ناشتہ واشتہ تیار ہو گیا تو چلیں نخرے کرتی ہوئی۔ یہ جی چاہتا ہے کہ بس دھکے دے اٹھائے' اور کچھ نہ کرے یہ سب ہنگامہ ختم ہو چکے تو پھر چلو اسکول۔ وہاں الگ مصیبت، سوال کیوں نہیں کیے؟ مضمون کیوں نہیں لکھا؟ دم مارنے کی مہلت ملے تو کچھ کیا بھی جائے۔ پلنگ پر پڑے بھی تو چین نہیں ملتی۔ حکم ہے کہ دس بجے کے بعد کسی کی آواز سنائی نہ دے۔۔۔ اور ہاں' اسکول میں ایک گھنٹے کی چھٹی ملے تو چلو' کھانا پکاؤ۔ اتوار کا دن ہو تو بچیوں کی جوئیں دیکھو' میلے میلے' الجھے ہوئے' جنہیں چھونے کو بھی جی نہ چاہے، بیٹھے کر یل رہے ہیں انہیں۔۔۔ کسی دن سیر کو بھی جانا نصیب ہو جائے تو میم صاحب ساتھ انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہوئی۔ آگے آگے پکارتی چلتی ہیں "پلیز' کمم ٹو می' (Please come to me) اور پھر لڑکیوں کی قطار اس فقرے کو دہراتی ہے۔ اگر میم صاحب نے سن لیا کہ کسی نے "کمم" کے بجائے "کم" کہا ہے تو بس اب اس کے پیچھے ہیں' جب تک وہ بالکل صحیح انگریزی لہجے میں لفظ ادا نہ کرے اس کا پیچھا چھوٹنا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکو نہ کچھ۔ بس قواعد سی کرتے جاؤ اور ایسے ہی واپس آ جاؤ۔۔۔ اس کے مقابلے گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھاٹھ سے دس بجے نکلتی ہیں لاری میں۔ جیسے کپڑے جی چاہتا ہے پہنتی ہیں۔ کوئی روک نہ ٹوک۔۔۔ اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوتی تو کیسا مزا رہتا۔ وہ اطمینان سے سو سلا کر اٹھتی اور اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اسکول جایا کرتی۔ وہ اس نیلی لاری کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھتی اور اس کی کہنی باہر نکلی رہتی۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑتی جاتی اور ساری دنیا اس کی نظروں کے نیچے سے کھسکتی رہتی۔۔۔ مگر وہاں کی فیس کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں' کے پانچ روپے لیے جاتے تھے' حالانکہ یہ صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی۔۔۔ فیس زیادہ سہی' مگر اس کا وہاں داخل ہونا کچھ ایسا ناممکن بھی نہ تھا۔۔۔ گھر جا کر وہ پاپا سے کہے گی کہ وہ گورنمنٹ گرلز اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔ پاپا تھوڑے سے اصرار کے بعد راضی ہو جائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنا سرٹیفکیٹ لینے اسکول جائے گی' ایمی کتنا جلتی ہے۔ دیکھو تو زرد دبلی پتلی' جیسے بھوکوں ماری بلی اور اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے بھلا اسٹیشن پر کیسا بن بن کر چل رہی تھی۔ ٹرین میں سے ہر گزرتے ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اس پر دیوانہ ہی تو ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھائے گی، ان کی قیمتیں بتائے گی، طرح طرح سے یہ جتائے گی کہ وہ اسکول کی پوری فیس دیتی ہے اور سب دوسروں کی معاف ہے۔ اسٹیشن پر بھی جب دوسری لڑکیاں ملائی کی برف لے رہی تھیں تو وہ ہاتھ میں ریشمی رومال ہلاتی ہوئی اسٹال پر گئی تھی اور ایسی آواز میں کیک اور لیمنڈ مانگا تھا کہ سب سن لیں۔۔۔ ایمی اس سے پوچھے گی "سرٹیفکیٹ کیوں لے رہی ہو تم' ڈولی؟" وہ بڑے فخر سے جواب دے گی "میں تو اب گورنمنٹ اسکول میں جا رہی ہوں!" ایمی اس کی طرف رشک سے دیکھتی رہ جائے گی' اور وہاں سے کندھے اور سر اٹھائے چلی آئے گی' اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی۔ پھر وہ روز دس بجے نیلی لاری میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول جایا کرے گی۔۔۔ اور لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی، روز طرح طرح کی ساڑھیاں پہن کر۔۔۔ کپڑوں کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ

دراصل وہ سبز پھولوں والے فراک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لیے ارادہ کرلیا کہ جب وہ پہلے پہل فراک پہنے گی تو اس دن نہا کر اچھی طرح بال بنائے گی۔ ان میں گلاب کا پھول لگائے گی، چہرے پر سیل کھڑی (جو اس کے ہاں بطور پاؤڈر کے استعمال ہوتی تھی) ملے گی' اور جوتے کو پالش سے خوب چمکالے گی۔ اسی دن وہ اپنے چار آنے والے بندے بھی نکالے گی، جن میں اودی گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر اطمینان کرے گی کہ وہ واقعی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ جمیلہ کے یہاں جائے گی۔ اس کے باہر نکلتے ہی سارے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ راستے میں اسے طاہر'ایوب اور دیپ چند ملیں گے۔ ان کی یہ ہمت تو نہ ہوگی کہ اس سے کچھ بولیں' مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگیں گے۔ آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اشارے کریں گے اور ان میں سے ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور خواہ مخواہ انگریزی لفظ بول بول کر یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دوسرے سے زیادہ فیشن ایبل اور پڑھا لکھا ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی' اس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا اور وہ بڑی متانت اور وقار کے ساتھ گزری چلی جائے گی۔ تاہم اس کا دل بلیوں اچھل رہا ہوگا اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑ پھڑانے لگیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو روک سکے گی۔ ستّے کی شبراتن بھی اس وقت اپنا ٹاٹ کا پردہ اٹھائے جھانک رہی ہوگی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر بڑی متعجب ہوگی۔ وہ آہستہ سے پکارے گی ''ڈولی!'' اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بلائے گی۔ مگر ڈولی اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دے گی اور آگے بڑھتی چلی جائے گی' اور جمیلہ تو بالکل مبہوت رہ جائے گی' وہ ڈولی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گی' اور اس کا نچلا ہونٹ لٹکا رہ جائے گا، وہ اپنے دوپٹے کو خوب پھیلا کر اچھی طرح نیچے کھینچ لے گی۔ جیسے اپنے تنگ پائنچوں کے پجامے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جائے گی اور وہ مارے رشک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اس کی اماں بھی مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھیں گی' اور فقرہ چست کرنے کی فکر میں کہیں گی ''اوہ' آج تو بڑے ٹھاٹھ سے ہو' ڈولی!'' پھر جمیلہ کی بھی زبان کھلے گی ''ہاں' ڈولی آج تو بہت ٹھاٹھ میں ہو!'' وہ اس دن جمیلہ کے ساتھ ساتھ نہ پھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اس کے فراک پر دھبہ لگ گیا تو۔ وہ بس ایک جگہ جا کر پلنگ پر بیٹھ جائے گی اور تھوڑی ہی دیر میں چلی آئے گی یہ کہہ کر ''اچھا' اب تم کام کرو گی۔ میں چلوں۔''۔ وہ جمیلہ کو بتائے گی ''اسے بو (Bow) کہتے ہیں۔'' وہ بہت سے نئے فیشنوں کا ذکر کرے گی' اور کئی انگریزی لفظ بولے گی جنہیں سن سن کر جمیلہ بہت مرعوب ہوگی اور شرم کے مارے ان کا مطلب بھی نہ پوچھے گی' بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں وہ سب سمجھ رہی ہے۔۔۔ بالکل جاہل ہے جمیلہ بھی۔ پاؤڈر کو پوڈر کہتی ہے بھلا! اردو تک تو آتی نہیں اسے اور یہ لوگ بنتے ہیں بہت، وہ کہ ہم لوگ بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کپڑے تو ذرا صاف نہیں رکھ سکتی۔ بس صبح پہنے اور شام کو میلے۔ اس کے کپڑے کتنے گندے رہتے ہیں' اور ان میں سے پسینے کی بو آتی رہتی ہے۔ بالوں کو تو بالکل جھاڑ رکھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ ذرا بیٹھ کر ان میں کنگھی ہی کرلے۔۔۔ شاید عید کے دن کچھ اچھے کپڑے پہنتی ہو۔ اب کی عید کو اس کا جی چاہا تھا کہ ذرا جا کر دیکھے کہ جمیلہ نے کیسے کپڑے پہنے ہیں' مگر وہ اس خیال سے رک گئی کہ کہیں اسے ندیدہ نہ سمجھا جائے۔۔ اس کے یہاں جمیلہ کے گھر سے سوئیاں آئی تھیں' اور اگلے دن جب وہ گئی تھی تو جمیلہ نے کہا تھا ''تم کل نہ آئیں۔ ہم تو تمہارا انتظار کرتے رہے۔ آتیں تو ہم تمہاری دعوت کرتے''۔۔۔ جمیلہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے کسی کے گھر بے بلائے نہیں جایا کرتے۔۔۔ وہ اب کے کرسمس پر ضرور جمیلہ کی دعوت کرے گی اور انگریزی میں رقعہ لکھے گی، جسے ترجمے کی کتاب میں سے نقل کیا جا سکتا ہے۔ رقعہ دیکھ کر جمیلہ کچھ نہ سمجھ سکے گی' اور پوچھے گی: ''کیا ہے یہ؟'' تب وہ اسے مطلب سمجھائے گی۔۔۔ مگر جمیلہ کہیں باہر تو نکلتی نہیں۔ تو کیا ہے؟ وہ خود جمیلہ کے ابا سے کہے گی کہ وہ اسے جانے دیں۔ اس کے کہنے

سے وہ اجازت دے دیں گے۔ پھر جمیلہ آئے گی رات کو برقع میں لپٹی لپٹائی، سمٹی ہوئی۔ وہ اسے کرسی پر بٹھائے گی۔ جمیلہ کو میز پر بیٹھ کر کھانا عجب معلوم ہوگا اور وہ کچھ سٹ پٹا سی جائے گی۔ جب جمیلہ پلاؤ کو ہاتھ سے کھانا شروع کرے گی تو وہ جلدی سے اس کی طرف چمچہ بڑھائے گی۔ لولو چمچہ سے کھاؤ۔ جمیلہ بڑی شرمندہ ہوگی اور ادھر ادھر دیکھنے لگے گی۔ ... یہ ولمو ں کے قصے' اسکول کے کھیلوں کا حال اور میم صاحب کی باتیں سنائے گی، جو اسے پریوں کے ملک کی داستانیں معلوم ہوں گی جہاں کی سیر کا وہ خیال تک نہیں کر سکتی۔ خصوصاً یہ سن کر اسے بڑی حیرت ہوگی کہ فلم دکھانے سے پہلے سینما میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ میز پر کیک دیکھ کر جمیلہ دل میں تعجب کر رہی ہوگی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جمیلہ کی طرف کیک بڑھاتے ہوئے کہے گی' لو کیک لو۔۔۔ یہ کیک ہے' انگریزی ہوتا ہے یہ اسے انڈوں سے بناتے ہیں'' وہ یہ بھی پوچھ لے گی: ''تم نے چاکلیٹ کھائی ہے جمیلہ؟ ۔۔ انگریزی مٹھائی ہوتی ہے وہ۔۔۔ اتنی بڑی بڑی تختیاں سی ہوتی ہیں۔ بڑی مزیدار ہوتی ہے' ہمیں تو میم صاحب بانٹا کرتی ہیں''۔۔۔ وہ اسے یہ بھی سنائے گی کہ ریل میں لڑکیاں کتنا ہنستی ہیں' گاتی ہیں مذاق کرتی ہیں' اور کیسا کیسا لطف رہتا ہے۔ جمیلہ للچا للچا کر رہ جائے گی اور کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے گی۔۔۔ وہ جمیلہ کو یہ بات بتائے یا نہ بتائے کہ اسٹیشن پر ایک لڑکا۔۔

ایک مٹھی ریت آ کر اس کے چہرے پر اس بری طرح گرا کہ اس کی آنکھیں اور منہ کرکرانے لگے۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی اور درخت دیوانہ وار ہل رہے تھے' آسمان گرد سے بالکل اٹ گیا تھا اور خالی کھیتوں میں دور دور تک بگولوں نے اٹھنے اور پھر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا' گویا انہوں نے ایک دوسرے سے شرط بد رکھی تھی۔ برے کی طرح چکر بناتے ہوئے اوپر چڑھنے کے باوجود ان کے ناچ کو کسی قدر دلچسپی سے دیکھا جا سکتا تھا' مگر نیچے گرنے میں ان کی سستی' ٹھہراؤ' نیم رضامندی اور ہچکچاہٹ ناقابل برداشت تھی۔ بعض دفعہ تو وہ ایسے معلق ہو جاتے تھے گویا انہوں نے بالکل ہمت ہار دی ہے اور اب بالکل آگے نہ بڑھیں گے۔ ان کی کاہلی دیکھ دیکھ کر ڈولی اپنے آپ سے تنگ ہوئی جا رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیشے پر مکا مارے یا کوئی ایسی ہی وحشیانہ حرکت کرے جس سے کم سے کم یہ تو معلوم ہو کہ اس کے اندر زندگی ہے۔ کھیت بالکل صاف پڑے تھے، صرف کہیں کہیں کھونٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بعض جگہ خالی کھیتوں کے پار سے تھوڑی سی گرد آلود ہریالی بھی زمین کے قریب قریب بچھی ہوئی نظر آتی تھی' خشک اور تر کا یہ میل، گنجی چاند کی طرح ایسا گھناؤنا تھا کہ ڈولی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کھیت اس کے پیٹ میں سے اٹھ کر حلق میں اڑ گئے ہیں اور اسے قے سی آ رہی ہے۔ سڑک کے درخت اس کے بائیں آنکھ کا نشانہ باندھ کر تیر کی طرح اڑتے ہوئے آتے تھے، جیسے اس کے دماغ کو توڑ کر پار ہو جائیں گے' مگر جب وہ قریب پہنچتے تھے تو جلدی سے بچ کر نکل جاتے تھے۔ ڈولی اس پر بالکل تیار تھی کہ وہ اس کا سر پھوڑ دیں' مگر اس کے لیے یہ پرفریب مذاق بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا اس کی آنکھوں کے ڈیلے جل رہے تھے اور پلک جھپکانے سے بجائے تسکین کے الٹی چبھن ہوتی تھی۔ پیچھے بیٹھنے والے چیخ چیخ کر بے معنی بحثیں کر رہے تھے اور اتنے لوگ ایک ساتھ مل کر بول رہے تھے کہ لاری منارۂ بابل بن گئی تھی۔ ایک آدمی اپنی آواز دوسرے سے بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ارے جناح' جناح۔۔۔ جناح نے تو وہ کیا جو۔۔۔' چند آدمی' کسان۔۔۔ کسان۔۔۔'' کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے' مگر دوسرے آدمی ان کی بات کاٹ کر خود بھی'' کسان۔۔۔ کسان۔۔۔'' کہنا شروع کر دیتے تھے' ڈولی ہزار کوشش کر رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند کر دے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی لفظ ضرور آخر اس کے مغز میں آ کر ڈھیلے کی طرح لگتا تھا۔ انجن نے الگ غوں غوں' غوں غوں مچا رکھی تھی جس کی دھن پر چکر کھاتے کھاتے اس کا سر بالکل مفلوج ہو گیا تھا اور گرا پڑ رہا تھا۔۔۔ اس سے پلک تو نہ جھپکائی جاتی تھی' مگر اس کے پپوٹے اب ڈیلوں کے کانٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے ہر چہ بادا باد کہہ کر اپنی آنکھوں کو نیم باز چھوڑ دیا اور بالکل بے حرکت

ہوگئی۔ آنکھوں کا کھلا ہوا حصہ پانی سے ڈھک گیا جس کی چپک نے پلکوں کو نیچے کھینچ لیا' اور اس کی آنکھیں آخر بند ہوگئیں۔۔۔ نیند ہونے کے باوجود وہ انجن کی بھن بھناہٹ صاف سن رہی تھی، مگر وہ اس کے سونے میں مخل ہونے کے بجائے اسے لوری دے رہی تھی' اور دوسری مداخلتوں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے، مگر اس سے زیادہ اسے زمان و مکان کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا جسم تک کھو بیٹھی تھی۔ وہ کسی لطیف شے میں بھی تبدیل نہ ہوئی تھی، بلکہ محض ایک شناخت صرف ایک خیال۔۔۔''میں''۔۔۔ باقی رہ گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک بھوری تاریکی تھی، جس میں کبھی کبھی پھیکی سی سفیدی کے دھبے دکھائی دے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ وہ انجن کی بھن بھناہٹ کے اندر سفر کر رہی ہے۔ صرف ایک دفعہ اسے سر کے بال اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا تھا جسے اس نے پہچان لیا تھا کہ آئرین کا ہے، مگر وہ ایک جھلک کے بعد ہی غائب ہوگیا تھا' اور اندھیرے کی روانی پھر اس طرح جاری ہوگئی تھی۔۔۔

لاری کے ایک دھچکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ لاری ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف جھونپڑی کے سامنے ایک عورت کئی کاٹ رہی تھی' اور دوسری طرف کائی سے ڈھکا ہوا ایک تالاب تھا جس میں تین چار بھینسیں تیر رہی تھیں اور سر اٹھا اٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہوگئے اور انتظار کر رہے تھے کہ لاری آگے بڑھے تو اپنے گلے سے ہارن بجاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگیں۔ ڈولی کا درد تو اب اچھا ہوگیا تھا مگر سر بھاری تھا اور آنکھیں نیند کی وجہ سے اچھی طرح کھل نہ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کچھ زکام سا بھی ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا سر تو بالکل بے حس ہوگیا ہے اور اس کے بجائے تھوڑی سی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اس نے گردن اکڑا اکڑا کر انگڑائی لی اور سڑک کے نظاروں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی، تاکہ اس کی گرانی کچھ دور ہو جائے۔ گاؤں سے تھوڑی دور آگے ایک بچہ روتا ہوا جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چپ ہوگیا اور اس نے ننگی ٹانگوں پر سے اپنے کرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اوپر اٹھا لیا' اور لاری کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بیل گاڑی میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنا زرد دوپٹہ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور جس کی ناک میں سونے کی کیل چمک رہی تھی۔ مگر ڈولی کو اس کے پیلے پیلے دانت بالکل پسند نہ آئے اور وہ لاری کے لیمپوں کی طرف دیکھنے لگی۔ لیمپ تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جڑے ہوئے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو گویا ہوا میں معلق تھے اور ایک تعجب خیز ہم آہنگی کے ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔۔۔ مگر ان چیزوں کے ساتھ وہ اپنی مصنوعی دلچسپی کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکی اور اسے یقین ہوگیا کہ اپنا دل بہلانے کے لیے اسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کئی یادوں اور واقعوں کو رد کر دینے کے بعد اسے خیال آیا کہ صرف ''غزل الغزلات'' ہی سے اس کی کاربرآری ہوسکتی ہے جس سے اس کا تعارف برنس نے کرایا تھا۔ ایک رات وہ بائبل لئے ہوئے اس کے پاس آئی تھی' اور لجاتے ہوئے نیچی آواز میں اس سے کہا تھا ''تم نے یہ دیکھا ہے' ڈولی؟'' اس نے ''غزل الغزلات'' کا ایک صفحہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا' اور اپنے آپ سیدھی بیٹھ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے ناخن کاٹنے لگی تھی۔ اور جب ڈولی کو بھی اس میں بہت مزا آیا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ ان دونوں نے پوری ''غزل الغزلات'' کو کئی دفعہ ساتھ بیٹھ کر پڑھا تھا' اور ڈولی نے اکیلے میں بھی' یہاں تک کہ اسے کئی مزید ارحصے یاد ہوگئے تھے اور اس کے کتنے ہی ویران اور آزردہ لمحوں میں رنگینی کا سامان بن چکے تھے اس دن کہ جب اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکا اس کی طرف دیکھتا ہوا چلتا ہے' وہ رات کو پلنگ پر لیٹی ہوئی دیر تک ان حصوں کو یاد کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنی رانیں خوب بھینچ لی تھیں بانہیں تکیے کے کے دونوں طرف پھیلا کر الٹی لیٹ گئی تھی' اور چھاتیوں کو پلنگ سے لگا کر سینے کو پوری قوت سے دبایا تھا جس کی ہلکی سی کسک میں اسے انتہائی لطف ملا تھا۔۔۔ ان ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ

کہیں لاری میں اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ جیسے وہ اپنے بدن کا کوئی حصہ عریاں کرنے والی ہو۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو جملے دہرانے شروع کر دیے تاکہ وہ ہر ایک سے پوری طرح فیضیاب ہو سکے۔۔۔ ہماری ایک چھوٹی بہن ہے۔ ابھی اس کی چھاتیاں نہیں اٹھیں ۔۔۔ تیری دونوں چھاتیاں دو آہو بچے ہیں ۔۔۔ تیری ناف گول پیالہ ہے۔۔۔ وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومے۔۔۔ میرا محبوب جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے۔۔۔ میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اور کہتا ہے میرے لئے دروازہ کھولو میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری!۔۔۔ دیکھ تُو خوبرو ہے۔ دیکھ تُو خوبصورت ہے۔۔ اس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے اور اس کا داہنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے۔۔۔ اس پر ڈولی کو یاد آیا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں جب ایک دن فریڈی کہانیاں سنتا سنتا اس کے پاس سو گیا تھا تو وہ رات بھر اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے رہا تھا۔ وہ خوب گرم رہی تھی اور اسے بڑی گہری نیند آئی تھی۔ اس لیے اس نے ارادہ کر لیا، چھٹیوں بھر فریڈی کو اپنے پاس سلائے گی۔۔۔ ایسے ہی جب ایک دفعہ برنس اس کے ساتھ سوئی تھی تب بھی وہ نیند میں بالکل بیہوش ہو گئی تھی۔ اگلے دن عیسائیوں کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا جس کے لیے وہ دن بھر کام کرتی رہی تھیں۔ وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں' اور انہیں پھر صبح سویرے اٹھنا تھا۔ برنس کا تو اتنا برا حال تھا کہ اس سے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کمرے کو نہ گئی بلکہ ڈولی کے ساتھ ہی سو رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے حال سے بالکل غافل ہو گئیں مگر پھر نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ ان کی بانہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑ گئیں اور ٹانگیں الجھ گئیں۔۔۔

صبح کو وہ تقریباً ایک ساتھ جاگیں' اور انہیں اپنی کیفیت دیکھ کر تعجب بھی ہوا۔ مگر ان کے سینے مل رہے تھے اور ان گلگلے پن اور نرماہٹ میں ایسی خاموش ہنسی تھی کہ وہ پندرہ منٹ تک ویسے ہی لیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اٹھ جانے کے بعد بھی وہ شرمائی اور لجائی نہیں رہی تھیں بلکہ ایسی مطمئن تھیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو۔۔۔ وہ دونوں جلوس کے ساتھ گئی تھیں۔ جلوس کتنا لمبا تھا! آگے آگے بڑے پادری صاحب تھے۔ ان کے بعد مرد' پھر عورتیں' پھر لڑکیاں' اور آخر میں مرد۔ وہ اور برنس دونوں ایک ہی لائن میں چل رہی تھیں اور گانے کے بیچ میں چپکے چپکے باتیں کرتی جاتی تھیں۔ سب ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے اور گانے کے ٹکڑے لمبی لمبی سلاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جن کے دو دو تین تین کے مجموعے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوں اور مشین کی طرح اٹھ اور گر رہے ہوں۔۔۔ ہاتھوں میں میخیں گاڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ یسوع نے تیرے واسطے اپنا لہو بہا دیا۔۔۔ اور وہ بھجن بھی گایا گیا تھا: میتھیو میتھیو من میں آجا' ہم کو بچا جا' پاک بنا جا۔۔۔ یہ گانا اسے اچھا تو معلوم ہوتا ہے لیکن خود گاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے اب یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سڑکوں پر سب کے سامنے گاتے پھرو؟ اسی دن ایک بیٹھی ہوئی ناک والا لڑکا جو ہاکی اسٹک لیے سائیکل پر جا رہا تھا' جلوس کو دیکھ کر اتر پڑا تھا' اور اس کی طرف شریر اور ندیدی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ اپنے پان میں سنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانت نکال کر ہنستا تھا تو اسے اتنی نفرت ہوئی کہ اس نے دوپٹہ سر اور چہرے پر کھسکا لیا تھا اور بہت دیر تک خاموش نیچی نظریں کیے ہوئے چلتی رہی تھی۔۔۔ ہاں ایمی، جلوس کے دن بڑی خوش رہتی ہے' اسے اپنے کپڑے اور خوبصورتی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے نا! گاتے ہوئے ہر طرف نظریں دوڑاتی رہتی ہے کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں یا نہیں۔۔۔ اس کے امیر ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بھی اس کی چاپلوسی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مشن کا ولیم سنگھ بھی۔ آج بھی کہ جب وہ ریل میں لڑکیوں کی نگرانی کے لیے بھیجا گیا تھا وہ ایمی کی خوشامد میں لگا ہوا تھا۔ اوروں کو تو وہ گاڑی سے قدم باہر نکالنے پر بھی ٹوک دیتا تھا' مگر ایمی سارے اسٹیشن پر گشت لگاتی پھرتی رہی تھی اور وہ اسے ایک لفظ نہ کہہ رہا تھا۔ اور اب تو وہ اپنے آپ کو قابل بھی سمجھنے لگی ہے۔ آئرین نے اسے بتایا کہ ایمی کو اب کے فرسٹ آنے کی امید ہے۔ کہیں آئی نہ ہو! اب تک ہمیشہ ہولی فرسٹ آتی رہی ہے' اور اس مرتبہ تو مس جونسن نے اسے اپنے گھر بلا کر پڑھایا تھا۔۔۔ بہت ہی اچھی

ہیں مس جونسن ۔ ان کا جوان ہنس مکھ چہرہ' اور اس پر سنہری عینک' کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے اور اس پر تو وہ بہت ہی مہربان ہیں ۔ سب سے زیادہ نمبر اسی کو دیتی ہیں اور اس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں ۔ امتحان کے قریب بیچاریوں نے خود اسے بلا کر پڑھایا تھا' اور اسے کہہ دیا تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی ان کے پاس پڑھنے آیا کرے ۔ ایک دن جب وہ ان کے ہاں بیٹھی سوال نکال رہی تھی وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں' اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں ۔ ۔ ۔ جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ ہلکے سے ان کا گال چوم لے ۔ کتنی مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ ان سے کہہ دے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ انہیں اپنے سینے سے لگا لے اور اپنے بازوؤں میں لئے رہے' مگر وہ ہر بار شرما شرما کر رہ گئی اور ان سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکی ۔ ۔ ۔ ایک مرتبہ وہ اسے اپنے ساتھ سینما بھی لے گئی تھیں وہاں سے وہ کئی گانے بھی یاد کر لائی تھی ۔ ۔ ۔ اب کیسے چھپو گے سلونے ساجنا اب کیسے چھپو گے ۔ ۔ ۔ ان کے ساتھ تو وہ چلی بھی گئی ورنہ ویسے تو وہ سینما کے لیے ترستی ہی رہتی ہے ۔ مگر کیا کرے' اسکول والے کمبخت ذرا نہیں نکلنے دیتے ۔ ایمی سے '' اچھوت کنیا'' اور '' پکار'' کی تعریف سن کر اس کا کیسا کیسا جی لوٹا ہے کہ کسی طرح اسے بھی دیکھنے کو مل جائیں' مگر بس تڑپ تڑپ کر ہی رہ گئی ۔ ۔ ۔ اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد لوٹے گی تو ضرور کوشش کرے گی کہ سینما جانا مل جائے ۔ ۔ ۔ وہ مس جونسن ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے ۔ ۔ ۔ یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ کلاس میں بیٹھی پڑھ رہی ہو اور یکایک اس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آ کھڑے ہوں ۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہوں گے اور ان کے سنہری عینک لگی ہو گی لڑکیاں بھونچکا ہو ہو کر انکی طرف دیکھیں گی' اور یہ پوچھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں ۔ جب وہ اسے بلائیں گے تو سب لڑکیاں اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی اور پھر پڑھنے سے ان کا دل اُچاٹ ہو جائے گا ۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے، وہ کن انکھیوں سے باہر دیکھتی رہیں گی ۔ وہ اس سے کہیں گے: '' ڈولی' میں ابھی ابھی آ رہا ہوں ۔ آج کل یہاں '' اچھوت کنیا'' ہو رہا ہے ۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما'' وہ خوش خوش تیار ہو جائے گی' اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر ان کے ساتھ سینما جائے گی ۔ ۔ ۔ جوزف بھائی کے سنہرے بال کیسے چمکتے ہیں' اور ان کے گورے رنگ پر نیلا سوٹ تو بہت ہی سجے گا ۔ ۔ ۔ وہ سینما ہال میں بیٹھی ان سے ہنس ہنس باتیں کر رہی ہو گی اور اتنی خوش ہو گی کہ عمر بھر میں کبھی بھی نہ ہوئی ہو گی ۔ وہ دیکھے گی کہ وہ گانا ۔ ۔ ۔ بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے ۔ ۔ ۔ جسے ایمی نے گا گا کر سارے اسکول میں پھیلا دیا ہے' کس موقع پر گایا جاتا ہے ۔ گھنٹی بجے گی' اور ہال میں اندھیرا چھا جائے گا' اور پھر پردے پر ۔ ۔ ۔

سامنے وہ سفید دھرم شالہ نظر آ رہی تھی جس کے معنی تھے کہ اب گھر قریب آ گیا ہے ۔ اس علم کے تقریباً ساتھ ساتھ اسے وہ نیا مکان زمین میں سے ابھرتا دکھائی دیا جو اڈے پر بن رہا تھا' اور اگلے جھٹکے میں وہ پورا زمین سے باہر نکل آیا ۔ اس مکان کی نمی اور ٹھنڈک اب بھی باقی تھی مگر اب اس میں کچھ تمکنت' خود اختیاری اور تفکر کا سکوت اور سنجیدگی آ گئی تھی ۔ اب وہ خواہ مخواہ گن گن نہ کر رہا تھا بلکہ اس نے اپنے رازوں کو چھت کے اندھیرے میں کھینچ لیا تھا ۔ یہ اندھیرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا' اور اس میں سے چھت بہت اونچی نظر آ رہی تھی ۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود سنسنانے لگنے کے بجائے اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر اتنا اونچا کر دے کہ اندھیرا اسے ڈھک لے ۔ ۔ ۔ ڈولی نے اپنا اوپر کا جسم اٹھا کر لاری کے باہر پھینک دیا ۔ جو شیشے میں سے سورج کی کرنوں کی طرح آسانی سے نکل گیا' اور ڈولی کی طرف منہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا ۔ وہ گویا نصف مجسمہ تھا' حالانکہ اس کے رنگ میں سنگِ مرمر کی سی درشتی نہ تھی' بلکہ اس کے، رنگ زندگی کے رنگ تھے یہ مجسمہ بالکل عریاں تھا ۔ یہ چہرہ تھا تو ڈولی کا ہی' مگر وہ کسی قدر لمبا ہو گیا تھا' خصوصاً اس کے کنپٹیوں کے پاس کے حصے اب اتنے ابھرے ہوئے نہ رہے

تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ ہیجانی بے ترتیبی نہ تھی بلکہ وہ ایک نورانی سوچ کے ساتھ میانہ وار اوپر سے نیچے آ رہے تھے۔ پیشانی بھی کشادہ تھی اور اس کی متین لمبی پلکیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھرے بھرے صاف شفاف سینے پر سے پھسلتی ہوئی انتہائی سکون کے ساتھ دو سڈول شانوں کے درمیان چھاتیوں کو دیکھ رہی تھیں جو بے داغ، نرم گلابی رنگ کی، موزوں، متناسب بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی گدگدی سے پرجوش نہ تھیں، بلکہ ان سب سے اونچی ہو کر محض اپنی خوش کامی اور سیرابی کے احساس ہی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس مجسمے کے انداز میں آرام، قرار، جمالیاتی غور و فکر اس سے منتج سرشاری اور عبودیت تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "پختگی ہی سب کچھ ہے"۔۔۔۔

اب اور زیادہ نشانیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جو اسے بتا رہی تھیں کہ گھر نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کو گزارنے کے لیے وہ یہ اندازہ لگانے لگی کہ اس کے یہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ شاید ماما، کبرون کا سایہ پہنے جھاڑو دے رہی ہوں۔۔ شاید پاپا، بازار سے لکڑیاں لے کر آئے ہوں، اور ماما ان پر بگڑ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ بھیگی ہوئی آواز میں آنٹی کی خوش نصیبی کا تذکرہ کر رہی ہوں، اور اسکے مقابلے میں اپنی۔۔۔ مگر ڈولی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے بھی گزارے جا سکتے تھے، خیالات کی اس روش سے مکدر کر لے چنانچہ اس نے نئی ریل چڑھائی۔۔۔ فریڈی اپنا نیلا نکر اور ہری قمیص پہنے گیند سے کھیلتا پھر رہا ہوگا۔ وہ اسے دیکھتے ہی چلا کر بھاگے گا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔۔۔ پاپا ابھی دورے سے واپس آئے ہوں گے، اور سائیکل رکھ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔ وہ پوچھیں گے "ارے کون ہے؟" فریڈی دوڑ کر انہیں بتائے گا "ہولی بوا آ گئیں، پاپا!" وہ کہیں گے: "تو آ گئی، بٹی ڈولی؟" اور وہ جواب دے گی "جی ہاں، پاپا"۔۔۔ ماما باورچی خانے میں اس کے لیے کوئی اچھی سی چیز تیار کر رہی ہوں گی۔ آواز سن کر وہ باہر آئیں گی اور کہیں گی "آ گئیں! لو ڈولی بھی! میں تو کہہ ہی رہی تھی کہ اب آتی ہوگی۔ تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تمہیں، روز پوچھ لیتا تھا کہ اب ڈولی بوا کے آنے میں کے دن رہ گئے۔۔۔ اور آج تو وہ صبح ہی سے تیار پھر رہا تھا"۔۔۔ ماما سفید ساڑھی پہنے ہوں گی۔ وہ اسے بتائیں گی کہ اس کے پاپا اس کے لیے ایک چھوٹی سی سفید بلی لائے ہیں جس کی اسے بڑی خواہش تھی۔۔۔۔۔

سوچنے کو تو وہ سوچے جا رہی تھی، مگر ویسے اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے پھر بھی وہ اس آخری تنکے سے چمٹی ہوئی تھی اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ ہر نئی جھونپڑی یا کنواں دیکھ کر اس کے دل پر پڑ کا لگتا تھا اور اس کے گلے کی رگیں چٹ چٹ بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تو گھر بہت دور ہے مگر اسے اس کے خلاف ناقابل تردید شہادتیں ملے جا رہی تھیں۔ وہ امید کر رہی تھی کہ لاری مجنونانہ جوش میں قصبے کے پاس سے نکل چلی جائے گی اور پھر کبھی نہ رکے گی۔ یا قصبہ خود پیچھے ہٹتا چلا جائے گا اور لاری اسے کبھی نہ پکڑ سکے گی مگر یہ علم اس کی جان نکالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تقدیر کی طرح اٹل اور ناگزیر ہے۔ وہ ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز رکاوٹوں کو توڑتی، کنکروں کو کچلتی، بھاگی چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر دیو، اور اسے قصبے کے اڈے پر لا کھڑا کرے گی جس کے سامنے وہی گڑھوں والی کنکر کی سڑک بچھی ہے جو اس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی بھنبھناہٹ پر خود ہی مست ہو ہو کر تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی اور اسے ڈولی کے جذبات کی مطلق پروا نہ تھی۔ ڈولی بیچاری تو درختوں سے بھی مدد نہ مانگ سکتی تھی، وہ تو پہلے ہی اس کے دشمن بنے ہوئے تھے، اور اسے گھر کے قریب لائے جا رہے تھے۔۔۔ آخر اس نے ایک گہرا سا سانس لیا اور پانی کے ریلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔۔۔

اڈے کے قریب پہنچ کر جب لاری کی رفتار کچھ کم ہوئی تو اس کی امید پھر ذرا جاگی کہ شاید لاری اسی طرح رینگتی ہی رہے، ورنہ کم سے کم

تھوڑا سا وقت تو اور لگ جائے۔ مگر جلد ہی کلچ ایک درشت کڑ کڑ کے ساتھ بولا اور انجن رک گیا۔ ڈولی کے کانوں میں خاموشی بھر بھرانے لگی اور اسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ڈوبی جا رہی ہے۔ سب لوگ لاری میں سے اتر رہے تھے۔ مگر وہ ہلی تک نہیں۔ آخر جب ایک لڑکے نے آخر اس سے پوچھا کہ ''اجی سامان چلے گا؟ تو اس نے گھٹتے ہوئے گلے میں سے بڑی کوششوں کے بعد ''ہاں'' نکالا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا ہو اور آخر کار اس نے اپنے آپ کو گلوٹین کے تختے پر چڑھنے کے لیے تیار کر لیا ہو۔۔۔

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اتروا رہا تھا، جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اس پار سب سے الگ کھڑی ہوگئی۔ اس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ٹانگیں اچھی طرح بوجھ برداشت نہ کر رہی تھیں۔ اسے اس خیال سے بے چینی ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت ڈولی کو اس وقت اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ کیا کر رہے ہیں یا کیا نہیں کر رہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اسے ان کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے اس لیے وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل مدھم ہوگئی تھی' اور درختوں کی ڈالیاں اپنی مرضی کے خلاف جبراً وقہراً سر سرائے جا رہی تھیں' زمین کا غبار اٹھ اٹھ آسمان پر پھیل گیا تھا اور اس نے آسمان کو گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی اس عریض چادر پر سوچ کی حیثیت ایک کسی قدر روشن داغ سے زیادہ نہ رہی تھی اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ الٹا اور دھول میں اٹا جا رہا تھا۔ چند بنجر کھیتوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معتمد شخص نے ان کے ساتھ دغا کی ہو اور اب ان میں گلے شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو۔



بلونت سنگھ

نام	:	بلونت سنگھ
قلمی نام	:	بلونت سنگھ
پیدائش	:	جون ۱۹۲۱ء بہ مقام چک بھلول، گوجرانوالہ، مغربی پنجاب، بھارت'
وفات	:	۲۷ مئی ۱۹۸۶ء بہ مقام الہ آباد، بھارت
تعلیم	:	بی۔اے الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۲ء

گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کے پرائمری اسکول سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ کچھ وقت میانوالی اور جالندھر کے پرائمری اور مڈل سکولوں میں تعلیم پائی۔ دہرہ دون کے اے۔ پی مشن سکول سے میٹرک پاس کیا۔ جمنا کرچین کالج الہ آباد سے ایف۔اے اور اس کے بعد الہ آباد یونی ورسٹی سے بی۔اے (۱۹۴۲ء) سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی

بلونت سنگھ اپنے عقائد، وضع قطع اور طور اطوار کے اعتبار سے ٹھیٹھ سکھ تھے۔ گھریلو ماحول مذہبی تھا اور گھر میں پردے کی پابندی کروائی جاتی تھی، لیکن ان کا گھرانہ مذہبی تنگ نظری کا شکار نہ تھا۔ ان کے والد سردار لال سنگھ میانوالی میں نہایت درجہ کے معمولی سرکاری ملازم تھے۔ بلونت سنگھ ابھی پرائمری درجوں میں تھے کہ والد کا تبادلہ میانوالی سے جالندھر ہو گیا اور اس کے فوراً بعد انہیں دیرہ دون کے پرنس آف ویلز ملٹری کالج کے اسٹاف میں لے لیا گیا۔ اب گھریلو حالات کچھ بہتر ہوئے اور بلونت سنگھ کو دیرہ دون کے ایک کیمبرج اسکول میں داخل کروا دیا گیا لیکن بہت جلد حالات نے پلٹا کھایا اور انہیں واپس گوجرانوالہ آنا پڑا۔ کیمبرج سکول کے بعد گوجرانوالہ کے معمولی سکولوں میں بلونت سنگھ کا جی نہ لگا اور وہ گھر سے بھاگ نکلے۔ کافی مدت آوارہ گردی کی، بالآخر پکڑے گئے اور تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جاری ہوا۔ قبلہ والد صاحب سخت گیر انسان تھے اور مالی حالات حد درجہ ناگفتہ بہ۔ یوں بلونت اپنی گھریلو زندگی سے ہمیشہ متنفر ہی رہے۔ تین مرتبہ گھر سے بھاگے۔ سکول میں

حاضری ہمیشہ کم رہی، زیادہ تر وقت مار پیٹ اور سیر و شکار میں گزارا۔ بچپن اور لڑکپن میں موسیقی اور مصوری سے لگاؤ تھا، جو آخر تک رہا۔ بانسری خوب بجاتے تھے۔ پہلا افسانہ ''ڈنڈ'' (مطبوعہ ''پرتاپ'' افسانہ ایڈیشن) اسکول کے زمانے میں لکھا۔ ابتدا میں ''مسیحی دنیا'' اور ''تیج دیکلی'' میں تواتر سے لکھا۔ اس کے بعد ''سہیل'' کی سطح تک آئے اور ''ساقی'' دہلی میں پہلا افسانہ ''سزا'' کے شائع ہوتے ہی صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں دہلی آ گئے اور ٹھیک اڑھائی برس تک وزارت اطلاعات، پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند کے رسائل ''آج کل''، ''بساط عالم'' اور ''نونہال'' کے ادارتی عملے میں رہے۔ جون ۱۹۴۸ء میں والد کے انتقال کے بعد الہ آباد منتقل ہو گئے اور میر گنج میں طوائفوں کے چوبارے کے سامنے اپنے والد کے قائم کردہ ''امپیریل ہوٹل''، چوک الہ آباد کو سنبھال لیا۔ اس زمانے کے بلونت سنگھ کی بابت اوپندر ناتھ اشک لکھتے ہیں:

''وہ بے حد خوبصورت اور قابل دید آدمی تھا۔ پورے رکشا پر کسی تھانے دار کی طرح وہ اپنے تنومند جسم کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک بڑا سا السیشن کتا لیٹا رہتا تھا۔ اور وہ اس شان سے رکشا پر بیٹھا، کبھی سول لائنز میں اور کبھی پاور ہاؤس والی سڑک پر نظر آ جاتا۔''

اس زمانے میں بلونت سنگھ نے محمود احمد ہنر کے ساتھ مل کر رسالہ ''فسانہ'' جاری کیا، جو صرف افسانوں سے متعلق پرچہ تھا۔ بعد ازاں ہوٹل بیچ کر نیتا جی نگر، منتقل ہو گئے۔ تب بھی دو پہر کو بلا ناغہ سول لائنز آتے اور لوک بھارتی میں کچھ وقت گزارتے۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی شادی کی اور ۱۹۴۹ء میں بیوی سے علیحدگی ہو گئی۔ اس کے بعد اکیس بائیس برس تک اکیلے رہے۔ دوسری شادی محترمہ منجو سے اس وقت ہوئی جب بلونت کی عمر پچاس سے تجاوز کر رہی تھی۔ منجو ان سے بیس پچیس برس چھوٹی اور الہ آباد کے ایک اسکول میں معلمہ تھیں۔

بلونت ۱۹۷۵ء سے بیمار رہنے لگے۔ انہیں آنتوں یا معدے میں تکلیف تھی۔ ۱۹۷۵ء سے ہی انہوں نے اردو میں لکھنا ترک کر دیا اور صرف ہندی کو ذریعہ اظہار رہنے دیا۔ کچھ مدت بعد ذیابیطس کے مریض ہوئے اور بینائی تقریباً زائل ہو گئی۔ آخری عمر میں چنڈی گڑھ منتقل ہونا چاہتے تھے لیکن بیگم ملازمت ترک کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ شاید انہوں نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا۔

مارچ ۱۹۸۶ء میں بلونت سنگھ نے اپنے سر کے بال کٹوا دیے تھے اور ڈاڑھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تر شوالی تھی۔ ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء کو الہ آباد میں انتقال کیا اور نیتا جی نگر، الہ آباد سے ان کی ارتھی ۲۸ مئی کی صبح دس بجے اٹھی۔ اُن کی ارتھی کے ساتھ کسی نمایاں ادیب اور شاعر کو نہیں دیکھا گیا۔ کسی روزنامے نے ان کی موت کی خبر ڈھنگ سے شائع نہ کی اور یوں تہذیبی دار الخلافہ الہ آباد سے بلونت سنگھ بے یار و مددگار چلا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''ڈنڈ'' مطبوعہ ''پرتاب'' (افسانہ ایڈیشن) دہلی لگ بھگ: ۱۹۴۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''جگا'' (افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۳ء

۲۔	''کالے کوس'' (ناول)	نیا ادارہ، لاہور	
۳۔	''پہلا پتھر'' (افسانے)	پہلا ایڈیشن، نیا ادارہ، لاہور، مکتبہ جدید لاہور	طبع دوم: ۱۹۵۳ء
۴۔	''تار و پود'' (افسانے)	نیا ادارہ، لاہور	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۵۔	''سنہرا دیس'' (افسانے)	مکتبہ جدید، لاہور	
۶۔	''ہندوستان ہمارا'' (بارہ افسانے)	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	طبع اول: جون ۱۹۷۴
۷۔	''بلونت سنگھ کے افسانے'' (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول:
۸۔	''پنجاب کی کہانیاں'' (منتخب افسانے)	ناشر: اونکار شرد، ہرپرکاشن	طبع اول: ۱۹۵۴ء
۹۔	''رات چور اور چاند'' (ناول)	ادارۂ فروغ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۵۰ء
۱۰۔	''ایک معمولی لڑکی'' (ناول)	اردو پاکٹ بکس، کراچی	طبع دوم:
	یہ ناول شاہین پبلی کیشنز، راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔		
۱۱۔	''عورت اور آبشار'' (ناول)	اردو پاکٹ بکس، کراچی	طبع دوم:
	یہ ناول شاہین پبلی کیشنز، راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔		
۱۲۔	''راوی بیاس'' (ناول)		
۱۳۔	''میں ضرور روؤں گی'' (ہندی افسانے)		طبع اول: ۱۹۵۵ء
۱۴۔	''چک پیراں کا جسا'' (افسانے)	مکتبۂ احباب، لاہور	طبع اول:
۱۵۔	''چلمن'' (افسانے)		
۱۶۔	''دیوتا کا جنم'' (افسانے)		
۱۷۔	''صاحب عالم'' (ہندی ناول)		
۱۸۔	''سونا آسمان'' (ہندی ناول)		
۱۹۔	''دواکل گڑھ'' (ہندی ناول)		
۲۰۔	''آگ کی کلیاں'' (ناول)		
۲۱۔	''باسی پھول'' (ناول)		
۲۲۔	''پھر صبح ہوگی'' (ناول)		
۲۳۔	''راکا کی منزل'' (ناول)		

غیر مدوّن:

''عہد نو میں ملازمت کے تیس مہینے'' (طویل مختصر افسانہ)، چند اردو/ ہندی افسانے۔ دو ڈرامے مطبوعہ ''آج کل'' دہلی۔

زندگی میں مستقل پتا:

۵۱۷۔ مینا نگر، نئی بستی، کیڈ گنج، الہ آباد، بھارت

اعزاز

۱۔ یو۔ پی گورنمنٹ، ادبی ایوارڈ
۲۔ پٹیالہ گورنمنٹ، ادبی ایوارڈ
۳۔ شرومنی ساہتیہ ایوارڈ، حکومتِ پنجاب

نظریۂ فن:

''میں کہانی بہت کم لکھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں زیادہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں میں افسانہ نویس ہو کر ہی نہ رہ جاؤں۔ مجھ کو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری، عصمت شاہد لطیف، سعادت حسن منٹو بہت پسند ہیں۔''
(بہ حوالہ: ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی صفحہ ۱۵۵)



حوالہ جات:

۱۔ بہ حوالہ: ''میرا پسندیدہ افسانہ'' مرتبہ: بشیر ہندی (خود نوشتہ حالات زندگی۔ صفحہ ۱۵۱)
۲۔ بہ حوالہ: ''کہانی کار: بلونت سنگھ'' مطبوعہ: ''الفاظ'' علی گڑھ مئی تا اگست ۱۹۸۸ء

جگّا

بلونت سنگھ

ماجھا کے علاقہ میں بھکین ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر رومان پرور ہوتی کہ سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے...... اور اب کے قرعہ گرنام کور کے نام پڑا تھا۔

گرنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم، سرگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پرشباب دوشیزہ کی پرزور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پرسکون سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے...... ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے اعلانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلا دیا۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ ''یہ تو نے بکرا کیوں بلایا ہے؟''

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ

جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کرا دیا ــ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا مخنہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شدگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت، جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے، جی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد، پیپل کے نیچے آ کر رکا، اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرہ کی رگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، اور اس کے سینہ پر کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا جھال کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کو لھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اولو سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے اروڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی، جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلوؤں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آ رہے ہوں...... لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا۔ ''تو کون ہے؟''

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑ کنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں، مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا۔ ''تو کون ہے؟''

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔''

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

دوشیزہ کی آنکھیں پرآب ہو گئیں۔ بولی ''گرنام!''

''تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟''

''میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو سب ہی رہتے ہیں۔''

''مجھے اپنے گھر لے چل۔'' مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔ ''کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟''

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ ''لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔''

''کیوں؟'' مرد نے اجڈ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ''تم ہنستے کیوں نہیں؟''

''ارے یہ بات؟'' یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے لبریز منکا زمین پر انڈیل دے، اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی مٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا: ''واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح!''

''واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح!''

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔ ''میں دور سے آ رہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔''

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ہر طرح سے خدمت کے......''

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے۔ اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب

ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا ایک طرف کھرلی کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھس اور کھلی کی سانی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس، دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، یہ بڑے بڑے اپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولھے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھادی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آ سکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی...... اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا، گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”گرنام! بس چار ہی ہو گیا؟“

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ ”سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔“

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شرینہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر چڑیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

اگے وچ کیلا ای۔ نکل کے مل بالو!
ساڈا او مجھنے دا ویلا ای
نکل کے مل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔
تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تھکان زدہ آواز میں بولی۔

''کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو...... ؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔'' یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آرہا ہو۔

''مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔''

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ ''تم کتنے اچھے ہو...... یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہو گے نا؟''

''ہاں!''

''گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

''تمہاری بیوی کیسی ہے؟''

''مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔''

''اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟''

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں'' گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر تھوڑی رکھ کر اپنی آنکھ کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ ''ہاں تم بڑے بھولے ہو ذرا۔''

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔
مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔
''یہ زیور تم لے لو۔''
گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ ''پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟''
اجنبی کو کچھ جواب، نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ ''پھر میں تم سے لے لوں گا۔''
گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ ''میں ان کو اپلوں میں چھپا دوں گی...... کبھی کبھی رات کو اچھے

اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔''

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ ''گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔''

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔ ''میرے پاس کیا ہے؟''

''کچھ بھی ہو۔''

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ ''یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔''

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول کا سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جارہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اماں کھانس رہی ہے...... اب میں جاتی ہوں۔''

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''جاؤں کیا؟''

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھنا لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔ ''روتی کیوں ہو؟''

''تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔''

اجنبی ہنس پڑا۔ ''میں پھر آؤں گا۔''

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ ''کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟''

''ہاں!'' اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔''

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا، اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، دامن شعلہ...... وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لیے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا

پکے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں تے
چھویاں دے بکل ٹٹ گئے..... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا:۔

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا، اور وہ تارا تھی۔ گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی، اس کے جذبہ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لیے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں، اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے، اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش

آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔

گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ:

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا۔

جگا صبح وشام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے، اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توندوالوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمدورفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اول تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرا وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا قرار کروالے، خواہ اسے یہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دفعہ بعد از غروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لیے گئی ہوئی تھی۔

جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹی باندھ کر دیکھا کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ ''میری تو گردن ٹوٹ گئی۔''

''اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟'' یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال

کے بچے کو ٹانگ پکڑا کر اٹھا دے۔

''اپلے......اور ہوتا کیا؟'' گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ ''آ رہی تھی، رستہ میں اپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔''

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ ''گرنام!'' یہ کہتے کہتے رال اس کی ڈاڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ ''گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔''

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے ہی شوخ اور الھڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ ''کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟''

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں بہت پریشان ہوں...... میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''شرم آتی تھی۔'' گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر مونچھ مسکرایا۔ ''ارے مجھ سے شرم کیسی؟''

گرنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ ''وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔''

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے......''

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''نہیں گرنام، نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہوگی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا...... ہاں تو...... مگر وہ ہے کون؟''

جگے کی آنکھیں مارے خوشی سے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی...... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔ ''تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام......''

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''اس کا نام ہے دلیپ...... دلیپ سنگھ''

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکا یک بھیانک ہو گیا۔

''دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔'' گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''گھر جاؤ۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم فوراً واپس چلی جاؤ۔'' اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی، آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی...... معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا ''...... دلیپ سنگھ؟......''

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسان کو ہڑپ کر لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو یا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گزرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پر پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی ''خونی پل'' رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام بھی کرتا

تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو خوش وضع، مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں، شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا، الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے، اس واقعہ کو وارث شاہ کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو وحشت سی ہونے لگی......

اس نے ذرا بلند آواز میں ''چھٹی'' گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو...... اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیص میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

''تم کون ہو؟'' دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

''ادھر آ'' بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا...... یکا یک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا۔ ''مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا...... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے...... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔''

''بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا...... اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں، اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں...... اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔''

دلیپ کو اس کے اجڑ پن پر تعجب ہوا۔ بولا ''میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔''

''تو گر نام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا...... آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔''

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا...... ''اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آئے۔''

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔''

اجنبی نے گرج کر جواب دیا۔ ''تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا وہ ڈنڈا جو گدھے کے ہانکنے کے لیے ہاتھ میں لیے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی، ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا، اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا ـــ مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی...... مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ ''اس طرح نہیں، دلیپ ام ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصلی جگہ پر آ گیا...... دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا،

''تیرے پاس چھوی ہے؟''

''نہیں!''

''تلوار ہے؟''

''نہیں!''

''صفاجنگ؟''

''نہیں!''

''مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔''

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

''جا'' اجنبی نے پکار کر کہا۔ ''لاٹھی لے آ۔۔۔ میں نے سُنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔''

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھائی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑ پھڑانے لگے گیدڑوں نے ہوا ہو ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین' جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم' قوی ہیکل کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جارہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا۔ ''ایک!''

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا۔ ''دو!''

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگا نے اسے بھی روکا اور کڑکا۔ ''تیں!'' یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا۔ ''او سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔''

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر اپڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا۔۔۔ کچھ دیر تک چلتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت جاننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔ گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھی، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی ہے اور اسے جلدی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا۔ ''میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔۔۔ بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔''

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لیے وہ خاموش رہے۔

۔۔۔۔اور وہ شخص یہ'' ۔یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔۔۔اور دلیپ اندر داخل ہوا۔
ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہوگئی۔
گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔اس کو شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔
جگے نے دلیپ کے کان میں کہا۔''اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے دلیپ تم مرد ہو میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔اب جبکہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تو میرا راز ظاہر نہ کرو گے۔''
جگا بلند آواز میں بولا۔''باپو! ماں!! بے بے!!! میں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔
باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔
دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کے بھاگتے ہی بنی۔پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔
جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔
گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔''تم کتنے اچھے ہو۔۔۔۔۔تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔''
قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔
شادی ہوگئی۔۔۔۔۔
کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔معاً دور سے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے ان کی سجی سجائی سانڈھیاں مردانہ اور دیو پیکر صورتیں' چمکتی ہوئی چھویاں۔۔۔عجب منظر پیش کرتی تھیں۔۔۔ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔''باپو! وہ کون لوگ ہیں؟۔۔۔یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔''
نہیں بیٹی نہیں' وہ دھرم سنگھ نہیں'' یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا۔۔۔اور ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔''آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لیے جا رہا ہے۔''

O

کرتار سنگھ دُگل

نام	:	کرتار سنگھ دُگل
قلمی نام	:	کرتار سنگھ دُگل
پیدائش	:	یکم مارچ ۱۹۱۷ء بہ مقام دھمیال، ضلع راولپنڈی، مغربی پنجاب۔
تعلیم	:	ایم۔اے (انگریزی) آنرز (پنجابی)

ابتدائی تعلیم پرائمری سکول دھمیال میں حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء گورڈن کالج، راولپنڈی میں زیرِ تعلیم رہے، اس کے بعد ایم۔اے (انگریزی) کرنے ایف۔سی کالج، لاہور چلے گئے۔ یُوں ایم اے (انگریزی) آنرز، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

موضع دھمیال، ضلع راولپنڈی کے تعلیم یافتہ کاروباری دُگل گھرانے کے جیون سنگھ دگل کے ہاں جنم لیا۔ والدہ کا نام ستونت کور تھا۔ بچپن اور لڑکپن دھمیال میں گزرا۔ گورڈن کالج، لیاقت روڈ، راولپنڈی سے بی۔اے کیا۔ یہاں طالب العلمی کے زمانے میں "گورڈنین" (ادبی مجلہ) کے ایڈیٹر تھے۔ بی۔اے کرنے کے بعد ایم۔اے (انگریزی) کرنے لاہور چلے گئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے۔ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو جالندھر سے منسلک ہو گئے۔ ترقی پسند نظریات کے سبب ان کا تبادلہ کبھی حیدر آباد ہوا تو کبھی اندور، غرضیکہ پورے ہندوستان کی سیر کی۔ چودہ برس تک ترقی سے محروم رہے۔ اپنے زمانے کے بہترین ڈراما پروڈیوسر کے طور پر شہرت پائی۔ ۱۹۶۶ء میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھے، اس دوران میں پنجابی، اردو، انگریزی اور ہندی پروگرام ترتیب دیے۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء سیکرٹری/ ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا رہے۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۶ء حکومتی مشیر برائے انفارمیشن پلاننگ کمیشن تھے۔

سرکاری ملازمت کے دوران "انسٹی ٹیوٹ فار سوشل اینڈ اکنامک چینج"، "ڈاکٹر ذاکر حسین ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن"، "پنجاب

آرٹس کونسل'' '' '' ہندی سمیتی حکومت ہند'' اور'' پنجاب ساہتیہ اکیڈمی'' کی بنیادیں رکھیں۔ متعدد عالمی سطح کے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی' متعدد ممالک گھومے۔ پبلشرز کے وفد کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں روس کا دورہ کیا۔ انٹرنیشنل رائٹرز کانفرنس منعقدہ صوفیہ ۱۹۸۲ء میں بطور ہندوستانی مندوب شرکت کی۔ فیض احمد فیض سے قبل تحریک آزادی فلسطین کے رسالہ'' لوٹس'' کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۴ء میں پنجابی یونیورسٹی کے فیلو نامزد ہوئے۔ اگست ۱۹۹۷ء میں راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

'' سویر سار'' (پنجابی) مطبوعہ :۱۹۴۱ء

اوّلین مطبوعہ (اردو) افسانہ:

'' سویر بازار'' مطبوعہ :۱۹۴۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ '' کنڈے کنڈے'' (پنجابی شاعری)	لاہور	طبع اوّل :۱۹۴۱ء
۲۔ '' بند دروازے'' (پنجابی شاعری)	دہلی	طبع اوّل :۱۹۴۸ء
۳۔ '' اک صفر صفر'' (پنجابی ڈرامے)	لاہور	طبع اوّل :۱۹۴۱ء

(اس کتاب کا دیباچہ فیض احمد فیض کا لکھا ہوا ہے۔)

۴۔ '' سویر سار'' (پنجابی افسانے)

۵۔ '' پیل پتیاں'' (پنجابی افسانے)

۶۔ '' کوڑی کہانی کردی گئے'' (پنجابی افسانے)

۷۔ '' ڈنگر'' (پنجابی افسانے)

۸۔ '' کچا ددھ'' (پنجابی افسانے)

۹۔ '' اگ کھان والے'' (پنجابی افسانے)

۱۰۔ '' نواں گھر'' (پنجابی افسانے)

۱۱۔ '' نواں آدمی'' (پنجابی افسانے)

۱۲۔ '' لڑائی نہیں'' (پنجابی افسانے)

۱۳۔ '' پھول توڑنا منع ہے'' (پنجابی افسانے)

۱۴۔ '' کرامت'' (پنجابی افسانے)

۱۵۔ ''گموراج'' (پنجابی افسانے)

۱۶۔ ''پاری میری'' (پنجابی افسانے)

۱۷۔ ''اک چھٹ چانن دی'' (پنجابی افسانے)

۱۸۔ ''سبھے سنجھوال سندائیں'' (پنجابی افسانے)

۱۹۔ ''سونار بنگلہ'' (پنجابی افسانے)

۲۰۔ ''ڈھویا ہوا بوہا'' (پنجابی افسانے)

۲۱۔ ''اقراراں والی رات'' (پنجابی افسانے)

۲۲۔ ''ترکالاں ویلے'' (پنجابی افسانے)

۲۳۔ ''اک کرن چاندنی کی'' (اردو افسانے)

۲۴۔ ''دیا بجھ گیا'' (اردو ڈرامے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی طبع اوّل:

۲۵۔ ''اوپر کی منزل'' (اردو ڈرامے)

۲۶۔ ''اجلا آنچل'' (اردو ناول)

۲۷۔ ''ٹومیی'' (پنجابی افسانوں کا انتخاب)

۲۸۔ ''سل وٹے'' (پنجابی افسانوں کا انتخاب)

۲۹۔ ''میل پتھر'' (پنجابی افسانوں کا انتخاب)

۳۰۔ ''تل چھٹ'' (افسانوں کا انتخاب)

۳۱۔ ''میری سریشٹ کہانیاں'' (پنجابی افسانوں کا انتخاب)

۳۲۔ ''اوہ گئے سجن'' (پنجابی ریڈیائی ڈرامے)

۳۳۔ ''تن ناٹک'' (پنجابی یک بابی ڈرامے)

۳۴۔ ''ست ناٹک'' (پنجابی یک بابی ڈرامے)

۳۵۔ ''پرانیاں بوتلاں'' (پنجابی ڈراما)

۳۶۔ ''کوہ کن'' (پنجابی ڈراما)

۳۷۔ ''مستھا پانی'' (پنجابی ڈراما)

۳۸۔ ''اک اکھ، اک نظر'' (پنجابی ڈراما)

۳۹۔ ''آندھراں'' (پنجابی ناول)

۴۰۔ ''مل مریداں دا'' (پنجابی ناول)

۴۱۔ ''ماہ پیو جائے'' (پنجابی ناول)

۴۲۔ ''سرد پونم دی رات'' (پنجابی ناول)

۴۳۔ ''من پردیسی'' (پنجابی ناول)

۴۴۔ ''آمی نوں کیہہ ہوگئی'' (پنجابی ناول)

۴۵۔ ''نویں پنجابی کویتا'' (پنجابی تنقید)

۴۶۔ ''سفیر دی کویتا'' (پنجابی تنقید)

۴۷۔ ''دھرم نیر پکھ دھرم'' (مذہبیات)

۴۸۔ ''گیانی گورمکھ سنگھ مسافر'' (سوانح)

۴۹۔ ''موتیوں والی'' (ہندی افسانے)

۵۰۔ ''پچپن کہانیاں'' (ہندی افسانے)

۵۱۔ ''اک کرن چاندنی کی'' (ہندی افسانے)

۵۲۔ ''پھول توڑنا منع ہے'' (ہندی افسانے)

(یہ کتاب پہلے پنجابی میں شائع ہوئی تھی۔)

۵۳۔ ''سیماریکھا'' (ہندی افسانے)

۵۴۔ ''اک اندھیری رات'' (ہندی افسانے)

۵۵۔ ''مل مریدوں کا'' (ہندی ناول)

(یہ ناول پہلے پنجابی میں شائع ہوا تھا۔)

۵۶۔ ''چولی دامن'' (ہندی ناول)

اس کتاب کا کاملیالم، سندھی اور روسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۷۔ ''چیل اور چھن'' (ہندی ناول)

۵۸۔ ''سرد پونم کی رات'' (ہندی ناول)

(یہ ناول پہلے پنجابی میں شائع ہوا تھا۔)

۵۹۔ ''اس کی چوریاں'' (ہندی ناول)

۶۰۔ ''سویرا'' (ہندی ناول)

۶۱۔ ''من پردیسی'' (ہندی ناول)

(یہ ناول پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)

۶۲۔ ''بدم شرنم'' (ہندی ڈراما)

۶۳۔ ''میٹھا پانی'' (ہندی ڈراما)
(یہ ڈراما پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)
۶۴۔ ''اک آنکھ، اک نظر'' (ہندی ڈراما)
(یہ ڈراما پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)
۶۵۔ ''پرانی بوتلیں'' (ہندی ڈراما)
(یہ ڈراما پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)
۶۶۔ ''کہانی کیسے بنی'' (یک بابی ڈراما۔ ہندی)
۶۷۔ ''مٹی مسلمان کی''
۶۸۔ ''تیرے بھائیں'' (پنجابی ناول)
۶۹۔ "Death of s Song" (Short Stories)
۷۰۔ "Come Back My Master" (-do-)
۷۱۔ "Twice Born Twice Dead" (Novel)
۷۲۔ "Contemprary Indian Short Stories" (Anthology Compitation) Vol.I
۷۳۔ "What Ails Indian Broadcasting"
۷۴۔ "Book Bublishing in India"
۷۵۔ "Literary Encounters"
۷۶۔ "The Sikh Gurus-Their Lives and Teachings"
۷۷۔ "Folk Romances of Punjab"
۷۸۔ "Iqbal-a Commenorative Volume" - (Ed)
۷۹۔ (Radio Plays) Writers Workship "To Each a Windos" 1981
۸۰۔ "Gurmukh Sing Musafir" (Biography)
۸۱۔ "Secular Perceptions in Sidh Faith"
۸۲۔ "Ranjeet Sing: A secular Sikh Monarch"

مستقل پتا:

بی۔۷، حوض خاص، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۲، بھارت۔

اعزاز:

۱۔ ''غالب ایوارڈ'' (برائے ڈراما) ۱۹۷۲ء

۲۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ برائے ''اک چیت چانن دی'' پنجابی: ۱۹۶۶ء

۳۔ ''اعزازی پرس'' (برائے پنجابی ادب) حکومت پنجاب، ہند: ۱۹۶۲ء

۴۔ ''سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ'': ۱۹۸۱ء

۵۔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف پنجابی رائٹرز آرٹسٹس ایوارڈ: ۱۹۸۳ء

۶۔ پدم بھوشن، حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز: ۱۹۸۸ء

۷۔ بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ

۸۔ ''بھائی موہن سنگھ وید ایوارڈ

۹۔ بھائی ویر سنگھ (حکومت ہند) ایوارڈ: ۱۹۸۹ء

۱۰۔ پرامن پترا ایوارڈ (حکومت پنجاب، ہند) ۱۹۹۳ء

نظریہ فن:

''افسانہ شعر کی مانند سُریلا ہوتا ہے، ناٹک کی مانند ڈرامائی ہوتا ہے اور قصہ کی مانند کہانی بیان کرتا ہے۔''

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ: اگست ۱۹۸۴ء)

پھول توڑنا منع ہے

کرتار سنگھ دُگل

اس روز جب میں بس میں سوار ہوا تو میں نے دیکھا' ایک سیٹ خالی تھی۔ یوں وہ سیٹ خالی ہی تھی لیکن اس کے خاصے حصے پر اس سواری کا قبضہ تھا' جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

میں اس خالی سیٹ کے پاس پہنچ کر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی نے اپنی تراشیدہ بھوؤں تلے سے آہستہ سے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا اور پھر پلکیں نیچی کر لیں لیکن میری سیٹ کے کافی حصہ پر اسی طرح قبضہ جمائے رکھا۔

آخر سیٹ پر جو تھوڑی بہت جگہ خالی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو وہاں ٹکایا۔

میں بہت سنبھل کر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں دوسری طرف کھڑے ہونے والی جگہ کی طرف کر لیں۔ بس کے ہر جھٹکے اور ہر موڑ پر میں اپنے آپ کو اس طرح سکیڑ کے قابو میں رکھتا کہ کہیں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی اس نوجوان سواری کیساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔

اگلے اسٹاپ پر جب بس سواریوں کے لئے کھڑی ہوئی تو فوجی سپاہیوں کا ایک ریلہ کا ریلہ بس میں سوار ہو گیا۔ انہوں نے کھڑے ہونے والی ساری جگہ بھر دی۔ بس میں اس قدر بھیڑ بھڑ کا ہو گیا کہ مجبوراً اپنی ٹانگیں مجھے اندر کر کے اپنی سیٹ کے سامنے کی طرف کر لینا پڑیں۔ اس طرح کرنے سے پہلے میں نے ایک نظر اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا لیکن اس نے جتنی جگہ میری سیٹ کی گھیر رکھی تھی اس پر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

اپنی دونوں ٹانگیں سیٹ کے سامنے کی جانب کر لینے کی وجہ سے میرا ایک طرف کا سارا جسم اس حسین ہمسفر کے جسم سے لگنا شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو انتہائی طور پر سکیڑ لیا لیکن اس کے باوجود میرا بازو اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

میرا بازو اس کے بازو سے مسلسل چھو رہا تھا اور وہ لڑکی اسی طرح اپنی سیٹ سے زیادہ جگہ پر قبضہ جمائے ہوئے بے پروائی سے خاموش

بیٹھی تھی۔ اس کا کوٹ اسی طرح پھیلا ہوا تھا، اس کی شلوار کے پائنچے اسی طرح جگہ گھیرے ہوئے تھے۔ اس کے جُوڑے میں ٹنکی ہوئی ادھ کھلی سنہری کلی ویسی کی ویسی۔ مجھے یوں لگ رہی تھی جیسے اڑ اڑ کر مجھے جھانک رہی ہو۔

بس چل پڑی۔

جب بس چلی تو ایک جھٹکے کے ساتھ میرا جسم میری اس نوجوان ہمسفر کے جسم سے چھو گیا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ لیکن میرا بازو اب بھی مسلسل اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا گرم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسے احساس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا وہ دہک کر انگارہ بن گیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد مجھے ایسے لگا جیسے میرے بازو کے اس حصہ کا لہو ساتھ والے بازو سے نسوں اور رگوں میں آ جا رہا ہے۔

مجھے ایک جھرجھری سی آ گئی اور میری آنکھیں جیسے نشے میں بند ہو گئیں مگر پھر ایک پل کے پل میں، میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

بس چلی جا رہی تھی۔

میرے دائیں طرف کھڑے ہونے والے فوجی سپاہی ایک دیوار کی دیوار بنے کھڑے تھے۔ بس سواریوں سے بری طرح بھری ہوئی تھی۔ تازہ ہوا کے لئے مجھے بائیں طرف بار بار کھڑکی کی طرف دیکھنا پڑتا تھا اور میرے بائیں طرف ہی میری وہ نوجوان ہمسفر بیٹھی ہوئی تھی۔ خاموش، بے حس و حرکت، ایک بت کی طرح۔

''یہ لڑکی کسی فوجی افسر کی بیوی معلوم ہوتی ہے۔''

کچھ دیر بعد میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

''صدر بازار سے بس میں سوار ہوئی ہوگی۔ صبح ہی صبح گھر کا سودا سلف خریدنے کے لئے دہلی جا رہی ہے۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں تو اس کا شوہر لاتا ہوگا۔ یہ تو صبح کے وقت یوں بن سنور کے اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے جا رہی ہوگی۔ یا پھر اس کی لپ اسٹک ختم ہو گئی ہو گی۔ پوڈر ختم ہو گیا ہوگا۔ دس سے لیکر ساڑھے بارہ بجے تک کناٹ پلیس حسین عورتوں سے بھرا رہتا ہے شوہروں کے دفتروں میں چلے جانے کے بعد دہلی کی نوجوان عورتیں ہرنیوں کی طرح قطاروں کی قطاروں میں گھومتی ہیں۔ کناٹ پلیس میں گھومتی گھومتی جب یہ تھک جائے گی تو کوکا کولا پیئے گی۔ اپنے شوہر کے لئے چیونگم اور اپنے بچے کے لئے لالی پاپ خرید لے گی۔ ایک ڈیڑھ بجے اس سے پہلے کہ اس کا شوہر گھر پہنچے یہ بس میں سوار ہو کر واپس گھر پہنچ جائے گی...... اس طرح یہ خوش۔ اس کا شوہر خوش، اس کا بچہ خوش، اور اس کا خدا خوش۔ اس کی زندگی کا ایک حسین دن اور کم ہو جائے گا۔''

میرے بازو کا وہ حصہ جو ابھی تک اس کے بازو سے چھو رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے من من بھر کا ہو گیا ہو، جیسے میرے بازو کا وہ حصہ درمیان کے کوٹوں اور قمیضوں کی پابندیاں دور کر چکا ہے، جیسے میرے بازو کا وہ حصہ ساتھ والے بازو سے جڑ گیا ہو۔

یکا یک میں چونک پڑا جیسے میں کوئی بہت بڑا گناہ کر رہا تھا۔ جیسے میں بے انصافی کر رہا تھا اپنی بیوی سے، اپنے بچے سے، اپنے اخلاق سے، اور اپنے مذہب سے...... اس ٹھنڈی یخ صبح کے وقت میرا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری بیوی مجھے کوس رہی ہے۔ میرا بچہ جیسے میرے پاس کھڑا مجھے گھور رہا ہو۔

میرے سارے جسم پر بار بار ایک لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں بالکل سرد پڑ گیا ہوں۔ اب نہ تو میرا بازو میری ہمسفر کے بازو سے چھو رہا تھا اور نہ میرا کوٹ اس کے کوٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ میری سیٹ پر جو جگہ تھی میں خود بخود سمٹ سمٹا کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ پر تمام فوجی سپاہی بس سے اتر گئے۔ اب دوسری طرف ٹانگیں رکھنے کے لئے جگہ خالی ہو گئی تھی اور میں اس طرف ٹانگیں سرکا کے قدرے آرام اور سکون سے بیٹھ گیا۔

بس میں جب ہجوم کم ہوا تو چاروں طرف سے ہوا آنے لگی۔ گھٹن سے نجات پا کر مسافر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اور دفتروں کے بابو اپنے ساتھ لائے ہوئے اخبارات پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ سے ایک تیرہ چودہ سال کی معصوم لڑکی بس میں سوار ہو گئی کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہوتی تھی اس نے ایک نظر بس میں چاروں طرف بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر ایک ہاتھ میں کتاب پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی میری سیٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا' ابھی کوئی مسافر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس معصوم کو بیٹھنے کے لئے کہے گا مگر دفتروں کے تمام بابو اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے۔ چھاؤنی کے کچھ دکاندار بھی اس سے بے خبر اپنی باتوں میں لگے رہے۔ تمام مرد بیٹھے ہوئے تھے اور وہ شرم و حیا میں ڈوبی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔

میرے دل نے کہا۔

''آخر تو اپنی سیٹ اس کے لئے خالی کیوں نہیں کر دیتا؟''

لیکن میں نے اپنے دل کی یہ بات جیسے سنی ان سنی کر دی بار بار میرا دل مجھے غیرت دلا رہا تھا اور بار بار میں اسے ایسے نظر انداز کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو' جیسے مجھے کوئی لالچ ہو' یا جیسے مجھے کوئی لطف آ رہا ہو۔ میں بے شرم بن کر بار بار اندر کے اشارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی میری ہمسفر مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے میں نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا تو واقعی وہ مجھے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

بس چلی جا رہی تھی۔ فر فر تازہ اور صاف ہوا آ رہی تھی۔ مسافروں کی باتیں اور آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

میں نے ایک نظر اپنی ہمسفر پر ڈالی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میری نظریں اچک اچک کر بار بار اس کی طرف جا رہی تھیں۔

میں نے دیکھا...... اس کے پاؤں کے ناخنوں پر لگی ہوئی سرخ پالش کہیں لگی ہوئی تھی اور کہیں سے اتری ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں موٹی موٹی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اتنی گوری نہیں تھی جتنا کہ انگلیوں کا رنگ' مالکہ کا چہرہ اور انگ انگ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں قدرے ٹیڑھا رکھا ہوا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ اس کے پاؤں کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں ایک لمبی عمر تک ننگے پاؤں گھر کا کام کاج کرتے رہنے کی وجہ سے ہندو عورتوں کی ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔

میں نے دیکھا...... اس کی شلوار کے ایک پائنچے پر بالکل سامنے کی طرف کیچڑ کا ایک داغ تھا۔ کیچڑ سوکھ کر مٹی جھڑ گئی تھی لیکن اس کے داغ کا نشان باقی تھا۔ شلوار کا دوسرا پائنچہ نیچے سے گھسا ہوا تھا شاید چلتے میں پاؤں تلے آ کر ایسا ہو گیا تھا۔ قمیص کے اگلے حصے پر دو چار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جو تازہ معلوم نہیں ہوتی تھیں...... اور مجھے اپنی ایک حسین دوست یاد آ گئی جو کسی لباس کو چاہے چند لمحوں کے لئے ہی پہنے مگر دوسری بار استری کئے بغیر ہاتھ نہیں لگاتی۔

میں نے دیکھا...... اس کے بالوں میں جگہ جگہ پنیں لگی ہوئی تھیں یہ پنیں بالوں کو نیچے کرنے کے لئے' بالوں کو اوپر کرنے کے لئے' بالوں کو ٹیڑھا کرنے کے لئے اور بالوں کو دوہرا کرنے کے لئے لگی ہوئی تھیں۔ سر کے پچھلی طرف ان کا جوڑا اتنا بڑا اور بھاری تھا لیکن اس پر بھی اس نے اپنے سیاہ بالوں میں ایک کالا چٹلا لپٹا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا...... اس کے چہرے پر کریم کی ایک ہلکی سی تہہ تھی جس پر پاؤڈر اور سرخی لگی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک قدرے زیادہ ہی شوخ نظر آ رہی تھی۔ لبوں پر جہاں جہاں اس کی زبان لگ چکی تھی وہاں لپ اسٹک ذرا مدہم پڑ گئی تھی۔

میں نے دیکھا...... اس کے کانوں میں کانٹے تھے۔ کانٹے قدرے بڑے تھے۔ اس کے چہرے پر کانٹے اس سے ذرا چھوٹے ہونا چاہیے تھے۔

جوں جوں میں اپنی ہمسفر کو اور زیادہ دیکھتا، میرے منہ کا ذائقہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ میرا دل پشیمان سا ہو رہا تھا اور میری آنکھوں کا نشہ جیسے اترا اترا سا محسوس ہو رہا تھا۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اخبارات پڑھنے والے مسافر کئی کئی صفحات الٹ چکے تھے۔ آپس میں باتیں کرنے والے اور زیادہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

جب بس اگلے اسٹاپ پر رکی تو ایک عورت سوار ہو کر ہمارے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی مزدور کی بیوی معلوم ہو رہی تھی۔ یکا یک میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سیٹ اس عورت کے لئے خالی کر دی۔ میں اب کھڑا تھا، ایک دو اور مسافر بھی کھڑے ہونے والے آ گئے تھے۔

بس چلی پڑی۔

اگلے اسٹاپ سے اور سواریاں آ گئیں اور کھڑے ہونے کی جگہ پھر سے بھر گئی۔ اخبار پڑھنے والوں نے اپنے پرچے رکھ دیئے اور باتیں کرنے والوں کی باتیں دھیمی ہو گئیں۔

بس چلی جا رہی تھی۔

میں کھڑے کھڑے بس کے اگلے حصے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گھوم کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا تو اس پر مزدور عورت بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی اور مزدور عورت کے ساتھ میری ہمسفر اسی طرح کسی بت کی مانند خاموش اور بے پروا بیٹھی خوشبو بکھیر رہی تھی۔

میں نے پھر دیکھا۔ مجھے ادھر سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اس کے کوٹ کا ہلکا نیلا رنگ اس کے چہرے کو اور رونق بخش رہا تھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ جیسے جم چکی تھی۔ اس کے گالوں پر شگفتگی ناچ رہی تھی۔ اس کی سوئی سوئی اداس آنکھوں میں لاکھوں جادو چھپے ہوئے تھے۔ اس کے بال' اس کا جوڑا' اس کا ماتھا' اس کی ناک' اس کے چہرے کے خدوخال یوں تھے جیسے اجنتا کے کسی بت کے ہوں۔ اب اس کے کانوں میں کانٹے بڑے نہیں معلوم ہو رہے تھے بالکل اتنے ہی تھے جتنا انہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس کے گول چہرے کو لمبا کر رہے تھے۔ بس چلی

جارہی تھی۔ میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ کریم رنگ کے سوٹ میں وہ لڑکی مجھے یوں لگی جیسے عرش سے کوئی پری اتر آئی ہو۔ جیسے سندر سپنا حقیقت بن گیا ہو۔ بس چلی جارہی تھی۔ کھڑکی سے دھوپ کی ایک کرن اس حسین ہمسفر کے چہرے پر آ کر گرنے لگی موسم سرما کی صبح کی ہلکی تپش والی دھوپ۔ ایک دم ایسے لگا جیسے وہ ساری کی ساری کھل گئی ہو۔

بس، اس اسٹاپ پر پہنچ چکی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ میں نے اس پری کی طرف دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ کومل' نازک اور سندر۔ وہ مجھے یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی نہایت پیارا پھول نازک پتیوں میں مہک رہا ہو۔ کسی باغ کا کوئی حسین پھول جس کے پاس بورڈ پر لکھا ہوا ہو:

''پھول توڑنا منع ہے''



شمشیر سنگھ نرولا

نام : شمشیر سنگھ

قلمی نام : شمشیر سنگھ نرولا

پیدائش : ۱۵ نومبر ۱۹۱۵ء بہ مقام امرتسر، پنجاب، بھارت

تعلیم : بی۔اے۔خالصہ کالج، امرتسر ۱۹۳۵ء

میٹرک کا امتحان ۱۹۳۱ء میں پاس کیا تھا۔

مختصر حالات زندگی:

امرتسر پنجاب کے ایک اوسط درجہ کے سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن میں والدین کی بے توجہی کا شکار رہے، طبیعت انوکھے پن کی طرف مائل تھی اس لیے کونین کی کڑواہٹ کو شہد تصور کر کے چاٹا، کواڑ کی چولوں میں انگلیاں دبا کر کواڑ کو زور سے بھیڑنے کی اذیت میں راحت پائی۔ بچپن میں ایک بار سڑک پر سے سو روپے کا نوٹ پڑا ملا تھا، جسے اٹھالیا اور سات روز ذہنی الجھن کا شکار رہنے کے بعد وہیں رکھ آئے۔ صحت بہت اچھی پائی تھی، اس لیے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں کبھی بیمار نہیں پڑے۔ ساری زندگی کم کھایا اور کم سوئے۔ ہر ایک کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کا مشاہدہ کرنا واحد سامان تفریح رہا۔ کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ تاش کھیلی، ریڈیو سنا، یا سینما دیکھا۔ انتہا درجہ کے تنہائی پسند اور مردم بے زار رہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد سے متعدد اداروں اور اخبارات سے منسلک رہے۔ فطری طور پر ترقی پسند واقع ہوئے تھے سو انجمن ترقی پسند مصنفین کی فرنٹ لائن میں رہے۔ پہلا اردو افسانہ ''ساقی'' دہلی ۱۹۴۲ء میں اور پہلا ہندی افسانہ ''ہنس'' بنارس ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ جنسی یا جسمانی بھوک، بے کاری یا کسی عزیز کی موت کے باعث ادب کی طرف نہیں آئے بلکہ شروع سے ادب کے ذریعے قومی اور انسانی مسائل میں دلچسپی رہی۔ بقول ان کے ''مجھے دوام کے لیے لافانی ادب لکھنے کی خواہش نہیں۔ میں اسی ایک ثانیہ کے لیے، اپنے وطن عزیز کے اس فیصلہ کن لمحہ کے

لیے لکھ رہا ہوں۔ وطن پہلی اور واحد محبت ہے اور ادب اس کے ایفا کا ایک ذریعہ۔''

کیمونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں لکھنا ترک کر دیا، جس کی واحد وجہ یہ رہی کہ ۱۹۴۷ء میں ''ایک پنکھڑی کی تیز دھار'' کے عنوان سے اردو ناول لکھا جسے شائع کرنے کے لیے کوئی پبلشر نہ مل سکا۔ واضح رہے کہ یہ وہی ناول ہے جس کے بارے میں سید سجاد ظہیر نے اپنے ایک طویل ریویو میں لکھا تھا کہ ''اگر ہندوستان میں فرقہ واریت کے خلاف معنی خیز جنگ لڑی جانی ہے تو اس ناول کو لاکھوں کی تعداد میں بانٹا جانا چاہیے۔'' ۱۹۴۸ء میں پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازمت اختیار کی اور وہاں سے ۱۹۷۳ء میں بطور انفارمیشن آفیسر ریٹائر ہوئے۔ اس وقت ترانوے برس کے ہیں۔ نئی دہلی میں رہائش پذیر ہیں اور Confluence International سے انگریزی اور ہندی میں یکے بعد دیگرے ان کی متعدد کتب سامنے آئی ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''ساقی''، دہلی ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''جالے'' (اردو افسانے)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۶ء
۲۔	''ایک پنکھڑی کی تیز دھار'' (ہندی ناول)	لوک کمل پرکاشن، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۳۔	''اندھیرے میں بھٹکتی کرن'' (ہندی ناول)	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۷۳ء
۴۔	''آدھی رات کا سورج'' (افسانے/ہندی)		
۵۔	''ہندی زبان کی سائنسی تواریخ'' (ہندی) (یہ کتاب انگریزی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔)		
۶۔	''ہندوستانی لسانیات کا سماجی پس منظر'' (ہندی)	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۷۴ء
۷۔	''تصنیف ناول کے مسائل'' (ہندی)	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۷۶ء
۸۔	''ہندوستانی فلسفہ''		
۹۔	''ہندوستانی دیومالا''		
۱۰۔	"The Man Who Stole Rainbow" (ناول)	Confluence International, India	طبع اوّل: جنوری ۲۰۰۴ء
۱۱۔	"Laughter in a Cage" (ناول)	Confluence International, India	طبع اوّل: جنوری ۲۰۰۵ء
۱۲۔	"Woman Who Sold Tears" (ناول)	Confluence International, India	طبع اوّل: جنوری ۲۰۰۶ء
۱۳۔	''اُپنیاس سراجن کی سمسیائیں'' (ہندی ناول)	Confluence International, India	طبع اوّل: ۲۰۰۸ء

نوٹ: ۲۰۰۸ء میں Confluence International, India نے ''آدھی رات کا سورج'' (ہندی افسانے)، ''اندھیرے

میں بھگتی کرن'' (ہندی ناول)، اور''ایک پنکھڑی کی تیز دھار'' (ہندی ناول) کے تازہ ترین ایڈیشن شائع کیے ہیں۔

غیر مدوّن:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ'' بے زبان'' کے عنوان سے شاہد احمد دہلوی'' ساقی'' بک ڈپو، دہلی سے شائع کرنا چاہتے تھے، جس کا مسودہ شمشیر سنگھ نرولا نے ۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو ان کے حوالے کیا۔ شاہد صاحب کراچی، پاکستان ہجرت کر آئے اور اس کے بعد اس مجموعے کی کوئی خبر نہ ملی۔

نیز ہندوستانی لسانیات سے متعلق ایک کتاب بہ عنوان'' ہندی اور علاقائی زبانوں کی تواریخ'' انگریزی اور ہندی میں اشاعت کی منتظر ہے۔

مستقل پتا:

۳۔ نوجیون وہار۔ نئی دہلی ۱۷۔ بھارت

نظریۂ فن:

'' میں افسانہ کو جدوجہد، تغیر وتبدل اور عوامی بیداری کا آلہ کار مانتا ہوں۔ افسانہ برائے زندگی، ایک بہت مبہم نعرہ ہے، جس کی وجہ سے ترقی پسند ادب ہر قسم کے لاابالی پن کو پناہ دیتا رہا۔ حاضر میں افسانہ اور ناول عوامی وقار اور انسانی مستقبل کو، جو پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں، برقرار اور سرفراز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ افسانہ روحانی پختگی پر اس وقت پہنچ پاتا ہے جب مثبت اقدار کا اظہار کرتا ہے اور تکنیکی پختگی پر اس وقت، جب اس میں ایسے کریکٹروں کی تخلیق کی جاتی ہے جو ان مثبت انسان دوست اقدار کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اگر اردو افسانہ نے ہندوستان پاکستان کی تمدنی زندگی میں فیصلہ کن رول ادا کرنا ہے تو اسے موجودہ ڈھرے سے نکل کر اپنے اپنے ملک کے غریب ترین اور پست ترین لوگوں کے احساسات کو زبان دینی ہوگی۔ ان بے زبان لوگوں کو صاحب زبان بنانا ہی اس وقت کا سب سے اہم فرض ہے اور اس کے بغیر ہمارے دونوں ملکوں کا مستقبل تاریک ہے۔''

شمشیر سنگھ نرولا

(بحوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مرقومہ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵ء)



حوالہ جات:

۱۔ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی میں تاریخ پیدائش ۱۹۱۶ء درج ہے، جو درست نہیں۔ اُسے دستاویزی کہنا چاہیے۔ خود مجھے انہوں نے اپنی درست تاریخ پیدائش سے آگاہ کیا۔

۲۔ ''ستاروں کی محفل'' مرتبہ: بشیر ہندی صفحہ ۱۰۹ مرقومہ ۱۹۴۶ء

گئو ہتیا

شمشیر سنگھ نرولا

جب سیتل پرشاد دیہاتی اکے میں ہچکولے کھاتا اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو تھکی ماندی شام اس طرف رینگ رہی تھی۔ وہاں کے بے حواس کتے بے دھڑک طریقے سے اس پر بھونک رہے تھے۔

وہ اکے سے اتر پڑا۔ سڑک پر بہت بڑا گڑھا جماہی لے رہا تھا اور اکا آگے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سڑک ہندوستان کی بیشتر سڑکوں کی طرح فٹ دو فٹ ریت اور مٹی کا ناہموار دشوار گزار راستہ تھی، جو برسات میں کیچڑ اور دلدل کی اچھی خاصی بدرو بن جاتی تھی۔ انہی خندقوں نے ہندوستانی دیہات کو دنیا کے مدوجزر سے علیحدہ کر کے وہاں کی زندگی کو ساکت اور غیر متبدل بنا دیا ہے۔

سیتل نے گڑھا پھلانگا اور گرد سے بھرے بال اور کپڑے جھاڑتا اور بار بار کھنکار کر مٹی سے اٹے سینے اور حلق کو صاف کرتا گاؤں کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ روشنی سے ڈری سہمی درختوں سے لٹکتی ہوئی چمگادڑوں نے سرمئی فضا کے دھول بھرے دھندلکے میں تیرنا اور ڈبکیاں لگانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی گز دو گز اونچی جھونپڑیوں میں سلگتے ہوئے اپلوں کا دھواں بڑی سستی سے آسمانوں کی طرف کروٹیں لے رہا تھا۔ بعید الفہم خیالات ننھی ننھی سرسراہٹوں کی طرح سیتل کے دماغ میں رینگ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔

چرواہے سوکھی سہمی گایوں کو جنگل سے واپس لا رہے تھے۔ جسے وہ لوگ جنگل کہتے تھے وہ بنجر بیاباں چٹیل زمین تھی۔ جس پر برسات میں تھوڑی سی گھاس اگ آتی جو ایک ماہ میں ہی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد تمام گلہ پیاس اور خشکی سے پھٹی ہوئی زمین کی دراڑوں میں مٹی اور مونگے کے ٹیلوں کے نیچے گھاس کی پتیاں یا جھاڑیاں تلاش کرتا پھرتا، اس خوراک سے انہیں جتنی قوت میسر ہوتی اس سے زیادہ اس کی تلاش میں خرچ ہو جاتی۔ ان کی پرقناعت آنکھوں کی گہری تہوں میں مدتوں کی بھوک چھپی ہوئی تھی۔ ان میں سے بہت سی گائیں صرف ڈھانچے ہی تھیں۔ جن کی بے ڈھب ہڈیاں، پتلی بے گوشت کھال میں سے بھیانک اور گھناؤنے طریقے سے جھانک رہی تھیں۔ تقریباً تمام کے جسم میں گھر کئے ہوئے زخم اور ناسور انہیں بیزار کر رہے تھے۔ ان پر مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ ان گئو پالوں نے کبھی بھی مویشیوں کے لیے چارہ

نہیں بویا تھا۔ ان کے اپنے اناج کے لیے ہی زمین کافی نہیں تھی۔ عموماً ان گائیوں کی کوئی پروانہ کی جاتی تھی کیونکہ ان میں سے بہت سی کئی برس ہوئے پاؤ آدھ پاؤ دودھ دے کر سوکھ چکی تھیں۔ یہ ہندوستان کی عام گائیں تھیں۔

چند بچھڑے گلے سے ہم قدم نہ رہ سکتے ہوئے ننھی کانپتی ٹانگوں سے اس کے پیچھے لڑکھڑا رہے تھے۔ ان کی سوکھی نرم ٹانگیں بڑی مشکل سے آگے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ رات کو انہیں جھونپڑیوں سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ ماؤں کا دودھ چوس کر اس پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ کی دولت کو اور بھی کم نہ کر دیں۔ بھوک جنگل میں گھومنے کی تھکان یا رات کی سردی کی وجہ سے جب وہ زندگی کی تکلیفوں سے نجات حاصل کر لیتے تو ان کی کھال ادھیڑ کر اس میں گھاس پھونس بھر دیا جاتا۔ ٹانگوں کے نیچے چار چھڑیاں لگا دی جاتیں اور دودھ دوہتے وقت اسے گائے کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تاکہ ماتا سے مجبور ہو کر وہ دودھ دیتی رہے۔

سب سے پیچھے گاؤں کی بوڑھی گائے لرزتی، ڈگمگاتی، لڑکھڑاتی بڑھے جا رہی تھی بھورا کسیلا رنگ، مریل دبلی ٹانگیں، سکڑی بجھی ہوئی دکھتی آنکھیں، ڈھیلے بوڑھے پپوٹے کناروں کے قریب سے پراسرار مگر سنجیدہ طور پر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہو۔

اس کی ہڈیاں بڑی سنگدلی سے گوشت کھال چیر کر باہر نکل رہی تھیں۔ ہر ایک ابھری ہوئی ہڈی کے کنارے دوسری ہڈیوں کے سائے میں سے دردناک طریقے سے جھانک رہے تھے۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم پھوڑے اور پھنسیاں تھیں۔ ایک کوا کولھے کی ہڈی پر بیٹھا ایک گہرے زخم میں چونچ مار رہا تھا۔ ایک اور کوا کائیں کائیں کرتا ہوا ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ چرواہوں کے تیز چلانے کے لیے ہلانے مروڑنے سے اس کی دم کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اس لیے وہ کوے کو اڑانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ ستیل اس بوڑھی گائے کی طرف بڑھا۔ درد سے اس کی بھوری پلکیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ دانت کچکچا رہے تھے۔ اس نے پپوٹوں کو اوپر اٹھایا اور کپڑائی ہوئی آنکھوں سے ستیل کو دیکھا۔ ستیل نے مٹی کی دو مٹھیاں بھر کر اس کے زخموں پر بکھیر دیں اور جلد جلد گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

شنکری بھی اس وقت گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ دو سال ہوئے جب وہ ہردوار کنبھ پر گنگا اشنان کے لیے گئی تھی تو اس کا اکلوتا لڑکا پاگل کتے کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ رات کو ارد گرد کے اجاڑ بیابان سے گیدڑ آ جاتے اور ساری رات ان کی گاؤں کے آوارہ کتوں سے لڑنے کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ کئی مرتبہ پاگل گیدڑ کتوں کو کاٹ جاتے اور ہر سال دو تین درجن آدمی عورتیں بچے ان دیوانے کتوں کا شکار ہو جاتے۔ ان بیمار فاقہ زدہ کتوں کو مروایا نہ جا سکتا تھا کیونکہ وہ جوہتیا کے پاپ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود ستیل گاؤں والوں کو سمجھانے میں ناکام رہا۔

بیٹے کی موت مائی شنکری کے لیے بہت صبر آزما ثابت ہوئی۔ وہ پاگل سی ہو گئی تھی۔ جب بھی عورتوں کو پنگھٹ کی طرف پانی بھرنے جاتے دیکھتی تو دمے کی کھانسی سے اٹکتی ہوئی آواز میں چلانے لگ جاتی۔

''بیٹا اپنے بچوں کو گھر اکیلے مت چھوڑ جاؤ'' گائیوں سے پوچھتی پھرتی کہ وہ بچھڑوں کو اکیلے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں چڑیوں کے پیچھے لڑکھڑاتی پھرتی اور ان سے التجا کرتی کہ وہ اپنے بچوں کو اکیلا نہ چھوڑیں۔ اس کے سر کے بال جھڑ چکے تھے۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ جھریوں سے بھر آیا تھا اس کی پرچھائیوں میں چھپی ہوئی غیر متحرک آنکھیں حلقوں میں ڈگر ڈگر کرتی رہتی تھیں اور لبوں کے کونے بڑے اجیرن طریقے سے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے۔ ستیل کو دیکھ کر مائی شنکری کے پھٹے سوکھے لبوں میں مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر کھنچ جاتی لیکن

اسے یہ مرجھائی ہوئی مسکراہٹ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش معلوم ہوتی۔

گاؤں کے شروع میں ٹھاکر دوارہ تھا۔ جس کے برابر میں مولسری کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھا وہاں کا زمیندار حقہ گڑگڑا رہا تھا اس کے حواری اور خوشامدی ارد گرد بیٹھے چرس اور گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ حسب معمول لغو باتیں ہو رہی تھیں۔ ٹھاکر دوارے کی پکی دیواری ناقوس اور سنکھ کی پرشور آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ شام کی آرتی ہو رہی تھی اور مندر کے پجاری "اوم جے جگدیش ہرے" چلا رہے تھے پچھلی طرف بڑ کا بوڑھا درخت کمر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے مندر کے ناکارہ سانڈ زمین پر۔ بیٹے مٹی سے جسم رگڑ رہے تھے۔ جب بھی کسی کو سر پر آتی بلا کے لیے اپائے کرنا ہوتا یا ایشور سے کوئی سفارش کرنا ہوتی تو مندر کو ایک بیل دان کرنے کا وعدہ کرتا اور مراد برآنے پر سستا بیل لا کر مندر پر چڑھا دیتا۔ وہ بیمار کمزور بیل گایوں کی نسل خراب کرتے پھرتے۔ اب وہ بنارس سے اچھی نسل کے بیل کا انتظام کر کے آرہا تھا۔ جسے پرسوں گنیش چودس کے تہوار پر وہاں کے ڈیری فارم والوں نے گائیں بیاہنے کے لیے لانا تھا۔

سیتل ٹھاکر دوارہ سے آگے بڑھا۔ مندر کے کنوئیں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اس نے ان کے پیلے جوانی کی صحت سے ناآشنا چہروں کی طرف دیکھا۔ ان کو دیکھ کر اس کے دل میں ہمیشہ ایک ہوک سی اٹھتی اور وہ سوچنے لگ جاتا کہ ان بدنصیب عورتوں کے لیے کبھی جوانی آتی ہی نہیں۔ بچپن' پھر لڑکپن کے بعد فوراً بڑھاپا اور اکثر اس سے پہلے ہی موت۔

کوئیں کی چرکھی کی کھڑ کھڑ۔ ڈول کا دھڑم سے کوئیں میں گرنے کا دھماکا اور پھر اس کے اوپر کھنچے جانے کی چوں چوں اب اس کے لیے مانوس آوازیں بن چکی تھیں۔ حسب معمول پانی بھر رہی عورت دائیں ٹانگ کوئیں میں بڑھا کر میلے کچیلے آدھ پیر سے رسے کو چرکھی پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈول کے شکستہ پیندے میں کئی سوراخ تھے اور اوپر نکلنے تک اس کا پانی آدھے سے کم رہ جاتا۔

آدھی درجن کے قریب لڑکے لڑکیاں جو ماؤں کے ساتھ کوئیں تک آئے تھے۔ ایک دوسرے کے کرتوں کا پچھلا حصہ پکڑے چھک چھک کرتے ہوئے ریل گاڑی کھینچ رہے تھے۔ قریب ہی ایک پانچ چھ سال کی لڑکی گائے بھینسوں کے پانی پینے والے حوض میں ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ چند لڑکے بکریوں کی سوکھی ہوئی مینگنیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے پر اڑا رہے تھے۔

سیتل کا گھر گاؤں کے دوسرے کنارے پر تھا۔ تکان کی وجہ سے اس کی رفتار معمول سے کم تھی۔ راستہ میں کئی جگہ گوبر کے ڈھیر سڑک روکے ہوئے تھے۔ جن پر سے مکھیاں اڑ کر چند سکینڈوں کے لیے اس کے گرد ہو جاتیں اور وہ سٹ پٹا کر قدم تیز کر دیتا۔ چندو ایک جھونپڑی کے ساتھ پیشاب کر کے بے احتیاطی سے سامنے کی طرف تھوکتا اسے رام رام کہتا ہوا' قریب سے گزر گیا۔ آگے راستہ میں ایک کھٹیا کے پائے پر دیا جل رہا تھا۔ برابر میں منگل کی بہو بیٹھی اپلوں کے لیے گوبر سنوارتے ہوئے اس زور سے ہاتھ مار رہی تھی کہ دور دور تک چھینٹیں اڑ رہی تھیں

منکت رام کی دکان جو سیتل کے گھر کے قریب ہی تھی بند ہو چکی تھی۔ بہت سے کتے دکان کے آگے کوڑے ہوئے خالی سکرے اور دہی چٹنی کے پتے چاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے پر بھونک رہے تھے۔ سیتل کو دیکھ کر انہوں نے بھونکنا اور لڑنا بند کر دیا۔

کئی کتے اگلی ٹانگ اٹھا کر ادھڑی ہوئی کھال کھجانے لگے۔۔۔ کئی تھوتھنی پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں پر منہ مارنے لگے۔ ایک کتا دم ٹانگوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔ ان کی سرخ بے بال چمڑی زخموں اور بیماریوں سے گل چکی تھی۔ جس میں سے فاقہ زدہ ہڈیاں اس طرح جھانک رہی تھیں جیسے مظلوم ظالم کی طرف دیکھ رہا ہو یہ کتے دوزخی انسانوں کی ملعون پرچھائیوں کی طرح اپنے کوڑھی جسم لیے ادھر ادھر رینگتے سارا دن گلیوں اور

کھیتوں میں غلاظت چاٹتے پھرتے اور خشمگیں غیر حیوانی آنکھوں سے ہر ایک کو گھورتے رہتے وہ شام کو بلا ناغہ اس دکان کے آگے اکٹھے ہوتے اور ساری رات لڑائی اور عف عف سے ہلڑ مچائے رکھتے۔

منگت رام کی دکان کی بائیں طرف بیڑ ے کے درخت کے نیچے ایک سپید گائے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ سال ہوا جب منگت رام کی ماں مرنے لگی تو اس نے گئو دان کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فوراً شہر جا کر گئوشالہ سے یہ گائے خرید لایا۔ پھا کا کرنے سے وہ کئی برس سے خشک ہو چکی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے نچلے حصے کٹے ہوئے تھے۔ جنہیں غالباً کسی دوسری گائے کی ٹانگوں سے پیوند دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ غیر قدرتی عجوبہ بن کر نمائش کے لیے زیادہ متبرک ہو جائے۔ اس وجہ سے منگت رام کو گائے بہت سستے داموں مل گئی تھی۔ براہمن کو رسمی طور پر دان کرنے کے بعد اسے یہاں لنا دیا گیا تھا اور وہ درخت سے گرے پتے کھا کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دو ہفتوں سے اس کی گردن پر چچڑی چمٹی ہوئی تھی۔ جو اب بہت پھیل چکی تھی۔ اسے گائے کے دل تک پہنچنے میں ابھی چھ سات روز اور تھے۔ جب جیسا کہ منگت رام کہتا تھا وہ قدرتی موت مر جائے گی۔ ستیل اس کے لیے شہر سے مرہم لایا تھا۔ گائے کے قریب جا کر چچڑیاں ٹٹول ٹٹول کر وہ مرہم لگانے لگا۔

جب ستیل گھر پہنچا تو مختلف قسم کے خیالات اسے اپنا تعاقب کرتے جان پڑ رہے تھے۔ پچھلے چند مہینوں کی یادیں دائرہ نما سائے بن کر اس کی آنکھوں کے آگے پھیل سکڑ رہی تھیں۔ اسے اس گاؤں میں آئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں ساتھ لاکھ گاؤں ہیں۔ اگر ساٹھ لاکھ نوجوان ان کی بہتری اور بہبودی کے لیے زندگی وقف کر دیں تو دس سال میں ہی اس بدنصیب ملک کی کایا پلٹی جا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہی نوجوان بننا چاہتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے بعد وہ اس گاؤں جھنجا دمیں جو بالیار ریلوے اسٹیشن سے بائیس میل جنوب مغرب کی طرف، تھا تین بیگھ زمین واہی پر لے کر آباد ہو گیا تھا۔

گاؤں کی حالت' اس کے اندازہ سے بھی خراب نکلی۔ یہ ہندوستان کے دیگر دیہات کی طرح کیچڑ اور گوبر کی بنی ہوئی چھوٹی بے ڈھب جھونپڑیوں کا جمگھٹا تھا۔ جھونپڑیاں بنانے کے لیے مٹی ایک ہی جگہ سے کھودی گئی تھی جہاں بہت بڑا گڑھا ہو گیا تھا جو برسات میں اچھا خاصا جوہڑ بن جاتا۔ آہستہ آہستہ سوکھ کر اس کا پانی گاڑھا ہوتا جاتا۔ مویشی اسی میں نہاتے گاؤں کی نیچ جاتیوں کے لوگ اسی سے پینے اور نہانے کے لیے پانی لیتے اور اسی میں برہا اور کپڑے صاف کرتے۔ اس جوہڑ پر ہر موسم میں مچھروں کی چھاؤنیاں لگی رہتی تھیں' جو رات کے وقت لوگوں کو پل بھر کے لیے بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ ہر سال درجنوں جانیں ملیریا کا شکار ہو جاتیں اور موسمی بخار کا ایک آدھ حملہ ہر ایک کو مہینوں کے لیے ناکارہ بنا جاتا۔ سال دو سال بعد چیچک اور ہیضہ بھی رہی سہی کسر پوری کر دیتے۔

جھونپڑیاں بالکل کچی تھیں۔ پوال یا کھپریل سے ڈھانپی ہوئی مٹی کی بے جان دیواریں، بارش ذرا زیادہ ہوئی تو یہ دیواریں بیٹھ جاتیں ورنہ چھتیں ضرور ٹپکنے لگتیں اور وہ چھت سے ٹپکتے پانی سے بچنے کے لیے کھاٹوں کو ایک کونے سے دوسرے کونے میں گھسیٹتے پھرتے۔ جاڑے کی راتیں یہ نیم برہنہ لوگ اپلوں کے الاؤ میں سکڑ سکڑ کر گزار دیتے۔ جب مئی اور جون میں آندھیاں اور جھکڑ چلتے تو پوال کی ہلکی چھتیں اڑ کر کئی کئی میل دور جا گرتیں اور وہ بغیر کسی پناہ کے رہ جاتے۔ جھونپڑیوں میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ چولھے کا دھواں اندر ہی چکر کاٹتا رہتا۔ لالٹین تو کیا مٹی کے تیل کے معمولی سے لیمپ بھی ان کی قسمت میں نہیں تھے۔ کڑوے تیل کے دیئے سے نکلتی ہوئی کالی سنپولیاں ہوا کو ڈس ڈس کر زہر بنایا کرتی تھیں۔ کسی بھی گھر میں پاخانہ نہ تھا۔ بچے گلیوں میں بیٹھ لیتے۔ مرد اور عورتیں باہر کھیتوں میں چلے جاتے اس غلاظت کی وجہ سے کروڑوں مکھیاں' کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض اتنا کہرام مچائے ہوئے تھے کہ جینا دوبھر تھا۔ ہر طرف گندگی اور گردتھی اور لوگوں کے

دلوں میں اس سے بھی متعفن جہالت پڑی سڑ رہی تھی۔ ہندوستان میں پھولوں کے سوا ہر چیز بودار ہے۔

گاؤں کا سب سے پیچیدہ مسئلہ وہاں کی گائیں تھیں۔ ایک سو ستر کے گلہ میں سے سو سے زائد تو سوکھی تھیں باقی صرف پاؤ ڈیڑھ دودھ دیتی تھیں۔ جو گاؤں والوں کی ضرورت کے لیے ناکافی تھا۔ رات کو یہ گائیں فصلیں خراب کرتی پھرتیں اور دن بھر باہر اجاڑ میں گھاس کی پتیوں کی تلاش میں گزار دیتیں۔ ان کے چارہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ستیل نے لوگوں کو چارہ بونے کی ترغیب دی اور خود مصری کلوور کی پت چیتاں گھاس منگوا کر اپنی زمین میں بوئی۔ وہ ایک دس سیر دودھ دینے والی گائے خرید لایا تھا جس سے وہ اپنے اسکول کے بچوں کو دودھ پلایا کرتا تھا اور وہ گاؤں کی گایوں کی نسل کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

صبح اندھیرے ستیل آس پاس کے دیہات میں اطلاع دینے چلا گیا کہ اگلے دن وہ لوگ گائیں بیاہنے کے لیے لے آئیں جب وہ شام کو لوٹا تو سارے دن کے سفر سے تھک کر چور ہو چکا تھا اور اس کے قدم بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

حسب معمول چرواہے گایوں کی دمیں مروڑتے ان کی پیٹھ پر چھڑیاں برساتے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے اور اسی طرح وہ بوڑھی گائے ان کے پیچھے پیچھے لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ معمولی سے زیادہ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ غالباً اس دن اسے کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ یکا یک وہ کھڑی ہو گئی اور گردن اٹھا کر حسرت بھری نظروں سے گرد کے بادلوں میں چھپے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگ گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ وہ زمین میں لیٹ گئی۔ ارد گرد گھومتے کتے اسے گرتا دیکھ کر ادھر دوڑے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے وہ زور زور سے بھونکنے لگے۔ جسے سن کر اور بہت سے کتے بھی ادھر آ جمع ہوئے۔ وہ پر اشتیاق تھوتھنیوں سے اسے سونگھنے اور خشک زبانوں سے اسے چاٹنے لگے۔ ان کے وحشت ناک جبڑوں میں پانی بھر آیا تھا۔ ان کی بھوکی پسلیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ گائے نے سر اٹھا کر چند بار ادھر ادھر ہلایا اور پھر بے بس ہو کر زمین پر رکھ دیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے زبان لٹک رہی تھی۔ کتے بھونکتے چیختے غراتے ہانپتے وحشی تیکھے دانت کپکپاتے اپنی شدید ضرورت سے مجبور اس کی بوٹیاں نوچنے لگے۔

ستیل بھی اتنی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ گائے ہانپ رہی تھی اور اپنی آنکھوں کی بھیگی خلا میں سے کتوں کو گھور رہی تھی۔ ستیل کو دیکھ کر کتے ڈرتے ڈراتے پیچھے ہٹ گئے سوائے ایک حاملہ کتیا کے جس کی نیلی آنکھوں سے کئی ننھی بھوکی جانیں جھانک رہی تھیں۔ دوسرے کتے ڈگمگا رہے تھے۔ اس نے مامتا سے مجبور ہو بے باکی سے لپک کر گائے کے منہ میں سے لٹکتی ہوئی زبان نوچ لی۔

گائے تڑپنے لگی اس کے ڈیلے ابھر آئے ان میں نفرت اور غصہ جھلک رہا تھا اس کی لیکھوں بھری پلکیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور چند لمحوں ہی میں وہ اپنے جسم کے دکھوں سے آزاد ہو گئی۔

ستیل کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اسے آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ تلخ گھناؤنی الجھن سے اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اس سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔ کتیا کی آنکھوں میں بھوک سے تڑپتی ہوئی ننھی ننھی جانیں۔ چھری زدہ سپید گائے کی موت کا انتظار اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں۔ بھوری گائے کے زخموں میں چونچ مارتے ہوئے کوئے ان کے سوا راستہ میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہت سی ملول زخمی آوازیں اس کے کانوں کے پردے ڈگڈگا رہی تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر ستیل نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیمپ روشن کیا، اور چار پائی پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں بے شمار متضاد خیالات ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس کے آگے گاؤں کی تمام گائیاں گھومنے لگیں۔ مریل گائیوں کی ہڈیوں کے درمیانی گڑھے یکا یک اسے بہت گہرے اور تاریک معلوم ہونے لگے، جن میں بے انتہا لوگ

ٹھوکریں کھا کر گرتے جا رہے تھے۔ گائیوں کی بھوکی ننگی پسلیاں تیز چھریاں بن کر اس کا جسم چیرنے لگیں۔

ستیل نے لیمپ کی مدھم لو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی کانپتی ہوئی تھوڑی کی طرف تاک رہی تھی اور اس کے ہیجانی جذبات کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ ماحول سے نفرت کا احساس اس پر غالب ہوتا جا رہا تھا۔ ملامت کے چبھتے ہوئے خیالات اس کے جسم پر لاتعداد کھٹملوں کی طرح رینگنے لگے، اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی نسوں میں خون کی جگہ زہر بھر دیا گیا ہے۔ کھوپڑی میں کڑوا دھواں اور وہ کھاری سمندر کو شہد کی ایک دو بوندیں ڈھال کر میٹھا کرنے کی طفلانہ کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ لیمپ کے شعلے کو بڑے انہاک سے دیکھنے لگا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ شہر ہی وہ مکھیوں کے چھتے ہیں جن میں تہذیب و تمدن کا شہد پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ہندوستان کے کم از کم آدھے گاؤں اکٹھے کر کے شہر نہیں بنا دیئے جاتے تب تک یہ جہالت دور نہیں ہوگی اور ترقی خواب ہی رہے گی۔ اس کے بہت عرصہ بعد تک وہ چکا چوند آنکھوں سے لیمپ کا چہرہ تکتا رہا۔ اس کے دماغ سے عجیب قسم کے تصورات کے بخارات اٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ذہن پر بے بسی کا سکون چھا جاتا لیکن اسے اس سکون کے حملے خیالات کی بمباری سے بھی زیادہ پریشان کر دیتے۔ اچانک ستیل کو یوں محسوس ہوا کہ یہ خیالات اس کے بھیجے میں اس طرح رینگ رہے ہیں جیسے گلے سڑے امرود میں سفید کیڑے۔ وہ ہڑبڑا کر کھاٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کنپٹیاں رگڑنے اور سر جھٹکنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے گیڈروں کی ہو ہو ہپ ہپ کتوں کی دردناک عف عف' سوروں کی چیخیں' مچھروں کی بھنبھناہٹ' الوؤں کی ہوک اور دوسری سینکڑوں قسم کی ناقابل فہم' پرشور آوازیں اس کے کانوں میں بجنے لگیں۔ اسے یہ سب پرماتما سے موت کے لیے دعائیں معلوم ہو رہی تھیں۔ باہر ہوا درختوں کو جھٹکے دے رہی تھی۔ ان کے پتوں کی سرسراہٹ سے ستیل کو یوں محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بے شمار جھرمٹ کسی دوسرے دنیا کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ کتوں کی عف عف اسے موت کے لیے بے بس خواہش معلوم ہونے لگی۔ اس کا اپنا دل بھی موت کے لیے للچانے لگا۔ اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں اسے محسوس ہونے لگا کہ ایسے تصورات کا فوارہ اس کے دل میں پھوٹ پڑا ہے جنہیں اس کی فطرت سے کوئی نسبت نہیں اور یہ اجنبی خیالات اس پر غالب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ہاتھوں کو ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔''

ستیل نے کھیتوں کے چوہے مارنے کا زہریلا سفوف آٹے میں گھولا اور اسے لے کر مکان سے باہر کتوں کی آوازوں کی طرف چلنے لگا اسے ایک زبردست کشش ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔ آسمان کی نیلی نیلی خاموشی میں ننھے ننھے بادل راستہ بھول کر بھٹک رہے تھے۔ اندھیرے کی گہری دھاریاں غم آگیں آنکھوں سے اسے تک رہی تھیں۔ جوہڑ کی تہ میں ننھے معصوم ستارے کانپ رہے تھے۔ وہ منگت رام کی دکان کے قریب پہنچا۔ تمام کتے سپید گائے کا حلقہ کئے ہوئے تھے۔ ان کے دانتوں میں ایک نئی دہشت تھی۔ بے بسی کے عالم میں ایسے کسی بیرونی طاقت کے زیر اثر اس نے زہریلے آٹے کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ وہ لپ لپ اسے چاٹنے لگے۔ ستیل کے چلے آنے کے بعد چتری کی ستائی گائے نے بھی آس پاس رینگ کر اسے چاٹ لیا۔

اگلی صبح جب ستیل بیدار ہوا تو رات کی نیم خوابی کے نقوش اس کے ذہن سے پوری طرح نہیں مٹے تھے۔ جب وہ نہا کر کپڑے بدل کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کتوں کے علاوہ سفید گائے بھی اس کی جرأت پریشان کا شکار ہو چکی ہے۔ گاؤں والے کانا پھوسی کر رہے تھے اور سب اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مختلف چیزیں بیچنے والے مندر کے اردگرد ساماں سجا رہے تھے۔ نزدیکی دیہات کے لوگ میلہ دیکھنے آنے لگ گئے۔ بھینسیں جوہڑ سے

نکل آئی تھیں اور گیلے کیچڑ بھر جسم تماشائیوں سے رگڑ رہی تھیں۔ ایک بوڑھا براہمن مندر کے برابر میں بیٹھا 'مالا' کنٹھے' جینو' گنگا جلیاں فروخت کر رہا تھا۔ قریب ہی دو دیہاتی سگریٹ کی خالی ڈبی میں سے نکلے ہوئے چاندی نما ورق کے لیے تکرار کر رہے تھے۔ چار آنے کی فوٹو والے فوٹو گرافر کے محل اور باغیچے والے پردہ کا بہت سے لوگ معائنہ کر رہے تھے۔

اتنے میں ڈیری فارم کے ملازم سانڈ لیے آپہنچے اور لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ ستیل گاؤں کی دوسری طرف 'جہاں گائیں اکٹھی کی ہوئی تھیں بیل لے جانے کے لیے مجمع کو ایک طرف کرنے لگا۔ لوگوں نے اتنا موٹا اور تندرست بیل پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیے حسب عادت منع کرنے کے باوجود لڑکے اسے چھیڑنے لگے۔ ٹھاکر کیرت سنگھ کا لڑکا اس کی دم مروڑنے لگا۔ بیل درد برداشت نہ کر سکا اور اس نے ٹھاکر کے لڑکے پر حملہ کیا۔ دم چھڑا کر وہ لوگوں کے جمگھٹے سے بھاگ نکلا' لوگ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ زمیندار کے لڑکے کو چوٹ لگی دیکھ کر کئی آدمی بیل کو لاٹھیوں اور چھڑیوں سے پیٹنے لگے۔ بیل نے بھی چند اور آدمیوں کی جوتیں لگائیں جس سے لوگوں کا غصہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ انہوں نے بیل کو اس بے رحمی سے پیٹا کہ اس کی پیٹھ سرخ ہو گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ ستیل سے لوگ ناراض تھے ہی، بیل کو بچانے کی کوشش میں وہ بھی اتنا پیٹا گیا کہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ ڈیرہ کے ملازم جنہیں خود کم و بیش چوٹیں آئی تھیں۔ ان دونوں کا بھینسا گاڑی میں ڈال کر شہر کی طرف لے گئے مندر کے ایک براہمن نے گاڑی میں بے ہوش پڑے ستیل کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھا ایشور نے گئو ہتیا کے پاپ کی کتنی جلدی سزا دی۔

گاؤں میں گئو ہتیا ہوئی تھی۔ اس لیے پجاریوں نے گنیش چودس کا تہوار منانے سے انکار کر دیا۔ شام کو ٹھاکر دوارہ میں اس کے پرائچت کے لیے تدبیریں سوچنے کے لیے پنچائت ہوئی۔ ایک سوا ایک سیر گھی کا ہون ہونا ضروری تھا کیونکہ مندر کے پجاری دیسی گھی کے دام وصول کر کے اور بناسپتی گھی جلا کر کافی نفع حاصل کر لیا کرتے تھے۔ گئو دان بھی لازمی تھا۔ ان پجاریوں کی ستیل کی دس سیر دودھ دینے والی گائے پر نظر تھی۔ مختلف قسم کے وید منتروں کا سوا لاکھ دفعہ جاپ ہونا تھا۔ گنگا جل گاؤں میں چھڑکا جانا تھا۔ اس سب پر انہوں نے دو سو روپیہ گنوادئے۔ آخر بہت منت سماجت کے بعد ایک سو روپیہ پر فیصلہ ہوا۔ جس میں سے آدھے زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا۔ ہون گئو دان اور دوسری رسومات کا چار دن کے بعد ہی مہورت نکل گیا۔

ٹھاکر کیرت سنگھ نے ستیل کی گائے اپنے پاس منگوالی۔ گاؤں والوں نے بھی دو دن میں پچاس روپے اکٹھے کر دیے۔ تیسرے دن ٹھاکر ستیل کی گائے کو شہر لے گئے۔ اسے بوچڑ خانہ میں اٹھاسی روپیہ میں بیچ دیا اور پھر گئو شالہ کا رخ کیا۔ گئو شالہ کے دروازہ پر کرشن جی کی تصویر تھی۔ نیلے رنگ کے کرشن مراری صحت مند بشاش گایوں کی سبزی سے مست کر رہے تھے اور گئو شالہ کے اندر وہی بھوکی موت کا انتظار کرتی ہوئی گائیں تھی۔ وہاں سے ٹھاکر جی نے ایک سوکھی گائے جیسی کہ گاؤں میں پہلے ہی بہت سی تھیں تیرہ روپے کو خریدی اس کے بعد بازار سے پانچ روپے کے بتاشے لیے اور باقی ستر روپے سنبھال گاؤں لوٹ آئے۔

اگلی صبح ٹھاکر دوارہ خوب سجا ہوا تھا۔ آم اور نیم کے پتوں کی جھنڈیاں اس کے چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ پر گیلے کیڑوں کے ستون کھڑے کئے ہوئے تھے۔ اندر گیرو سے جا بجا گنیش کا نشان بنا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کے فرش کو پوتر بنانے کے لیے اس پر گوبر کا لیپ کیا ہوا تھا۔ کرشن جی کی مورتی پر چندر کلا کا سنہری مکٹ جو خاص خاص موقعوں پر باہر نکالا جاتا تھا لگا ہوا تھا۔

ہون کے بعد ٹھاکر کیرت سنگھ نے گائے منگوا بھیجی۔ اس کا سارا جسم گیرو سے رنگا ہوا تھا اور اس پر لگے ہوئے چاندی کے سفید ورق

بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے سینگوں پر کناری والا وَلی لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے تمام لوگوں کا ہاتھ چھوا کر گائے براہمن کو دے دیا۔ وہ ستیل کی گائے کی بجائے اس مریل گائے کو دیکھ کر بہت ست پٹائے لیکن خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ٹھاکر جی پچاس روپے اپنی گرہ سے نکال اور پچاس گاؤں والوں کے ڈال ایک سو پجاری کے ہاتھ میں پکڑا دیے پتاشوں کا پرشاد لوگوں میں بانٹا پھر باقی کے بیس روپے بھی پجاری کے ہاتھ میں تھما کر بڑے فیاضانہ انداز میں کہنے لگے۔

''پنڈت جی یہ لو بیس روپیہ اور پوجا پاٹ خوب اچھی طرح کرنا' دیکھنا کوئی کسر نہ رہ جائے۔''



اشفاق احمد

نام	:	اشفاق احمد خان
قلمی نام	:	اشفاق احمد
پیدائش	:	۲۲ اگست ۱۹۲۵ء بہ مقام مکیسر' فیروز پور' مشرقی پنجاب' بھارت (۱)
وفات	:	۷ ستمبر ۲۰۰۴ء' لاہور
تعلیم	:	ایم۔اے (اردو) گورنمنٹ کالج لاہور' اٹالین زبان میں ڈپلوما' روم یونیورسٹی (اٹلی)' فرانسیسی زبان میں ڈپلوما' گرینوبل یونیورسٹی پیرس' فرانس' براڈ کاسٹنگ ٹریننگ نیو یارک یونیورسٹی' امریکا' بریڈ لاف رائٹرز ورکشاپ ورماؤنٹ امریکا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

راجپوت گھرانے کے محمد خاں کے ہاں مکیسر' ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن فیروز پور' مشرقی پنجاب میں گزرا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے اور مزنگ روڈ پر ایک جلے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کی۔ گھریلو حالات اچھے نہ ہونے کے سبب اشفاق احمد دفتر روزگار پہنچے' گریجوئٹ ہونے کے سبب ملازمت نہ مل سکی تو اگلے روز میٹرک کی سند دکھا کر محکمہ ریلوے میں ملازمت اختیار کی' جہاں صرف ایک دن گزارا۔ اس کے بعد مہاجرین کے کیمپ واقع والٹن میں ملازم ہوگئے۔ ایک دن سوری خانہ میں گزارا اور اگلے روز لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ والے شعبہ میں منتقل ہوگئے۔ ۱۹۵۶ء میں بانو قدسیہ سے شادی ہوئی۔ بانو اور اشفاق نے لاہور سے ادبی مجلّہ ''داستان گو'' جاری کیا۔ ریڈیو سے تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین المعروف علی بابا نے ڈراما نگاری کے سلسلے میں راہنمائی کی تو اشفاق احمد نے ''اُچی ماڑی'' جیسا مقبول ریڈیائی ڈرامہ قلم بند کیا۔ ۱۹۶۸ء میں اشفاق احمد نے لاہور ریڈیو سے ''تلقین شاہ'' پروگرام شروع کیا جو آخیر عمر تک جاری رہا۔ بطور لیکچرر شعبہ اردو' دیال سنگھ کالج لاہور سے منسلک ہوئے اور وہاں سے روم یونیورسٹی اطالیہ چلے

گئے۔ دو برس ''لیل و نہار'' لاہور مرتب کیا چار برس تک ڈائریکٹر آر۔ سی۔ ڈی ریجنل کلچر انسٹی ٹیوٹ رہے۔ ۱۹۸۷ء تک ریڈیو کے مستقل پروگرام ''تلقین شاہ'' کے علاوہ ۴۸ ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے لگ بھگ ساڑھے تین سو فیچر اور ڈرامے قلم بند کیے۔ ۱۰ برس تک اردو سائنس بورڈ لاہور کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ سرطان کا مرض لاحق تھا، لاہور میں انتقال کیا۔ تدفین ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں ہوئی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

''توبہ'' مطبوعہ ''ادبی دنیا لاہور ۱۹۴۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''ایک محبت سو افسانے'' (۱۳ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۱ء

(۱) ''توبہ'' (۲) فہیم (۳) رات بیت رہی ہے (۴) تلاش (۵) سنگ دل (۶) مسکن (۷) شب خون (۸) توتا کہانی (۹) عجیب بادشاہ (۱۰) بندرابن کی کنج گلی میں (۱۱) بابا (۱۲) پناہیں (۱۳) امی

واضح رہے کہ افسانہ ''توبہ'' کا عنوان اشفاق احمد نے ''جعفری'' رکھا تھا جسے شاہد احمد دہلوی نے ''ساقی'' میں شائع نہ کیا اور مولانا صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' کے لیے اس کا عنوان ''توبہ'' تجویز کیا۔

۲۔ ''اجلے پھول'' (۸ افسانے اور ایک رپورتاژ) بک لینڈ لاہور طبع اوّل: فروری ۱۹۵۷ء

(۱) اجلے پھول (۲) گل ثریا (۳) تنکہ (۴) حقیقت نیوش (۵) توشے بلے (۶) صفدر ٹھیلا (۷) گڈریا (۸) برکھا (۹) ایل ویرا (۱۰) روم سے متعلق رپورتاژ۔

نوٹ ''اجلے پھول'' کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۳ء میں ''گڈریا'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

۳۔ ''سفر مینا'' (گیارہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل اپریل: ۱۹۸۳ء

(۱) اَن ٹ مان (۲) قاتل (۳) قصہ گل دفتی (۴) چور (۵) مانوس اجنبی (۶) بیاجاناں (۷) محسن محلہ (۸) پانچ میل دور (۹) کالج سے گھر تک (۱۰) گاتو (۱۱) فل برائٹ

۴۔ ''طلسم ہوش افزا'' (سائنس فکشن) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۲۰۰۰ء

۵۔ ''پھلکاری'' (پندرہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۱ء

۶۔ ''صبحانے فسانے'' (بائیس افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۲۰۰۲ء

نوٹ: ان چھ مجموعوں میں اشفاق احمد کے تمام افسانے سمیٹ لیے گئے ہیں۔ اشفاق احمد کے تحریر کردہ افسانوں کی کل تعداد 81 ہے۔

۷۔ ''ٹاہلی تھلے'' (پنجابی ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۰ء

۸۔ ''مہمانِ بہار'' (ناولٹ) مکتبہ میری لائبریری' لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۵ء

۹۔ ''وداعِ جنگ'' ملک دین محمد یونائٹڈ بک ڈپو لاہور طبع اوّل جنوری ۱۹۶۰ء

ازارنسٹ ہیمنگوے کا انگریزی سے ترجمہ (دو جلدیں)

یہ ''A Farewell to arms'' کا ترجمہ ہے۔

۱۰۔ ''چنگیز خاں کے سنہرے شاہین' از رتاشی کا انگریزی سے ترجمہ مکتبہ معین الادب لاہور طبع اوّل: جنوری ۱۹۶۰ء

یہ ''The Golden Hawks of genghis'' (ناول) کا ترجمہ ہے۔

۱۱۔ ''کھیاوٹیا'' (پنجابی آزاد نظمیں) مطبوعہ سنگ میل' لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۸ء

۱۲۔ ''توتا کہانی'' (ٹی۔وی ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۸ء

۱۳۔ ''قہکار'' (مزاحیہ)

۱۴۔ ''گرماگرم'' (مزاحیہ)

۱۵۔ 'ہفت زبانی لغات'' مرکزی اردو بورڈ' لاہور

۱۶۔ ''دوسروں سے نباہ'' (از ہیلن شیکو کا ترجمہ) گوشۂ ادب' لاہور طبع اوّل:

یہ تراسی صفحات کی کتاب ''Getting along with others'' کا ترجمہ ہے۔

۱۷۔ ''کھیل تماشا'' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۱۸۔ سفر در سفر'' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۱۹۔ ''ذکرِ شہاب'' (یادنامہ) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۰۔ ''ایک محبت سو ڈرامے'' (ٹیلی ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۸ء

۲۱۔ ''من چلے کا سودا'' (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۲۔ ''شاہلا کوٹ'' (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۳۔ ''حیرت کدہ'' (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۴۔ ''ننگے پاؤں (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۱ء

۲۵۔ ''بندگلی'' (ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۶۔ ''اُچے برج لہوروے'' (ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۷۔ ''باباصاحبا'' (ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۳ء

۲۸۔ ''مہمان'' سرائے'' ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۹۔ ''زاویہ'' (تین جلدین۔ لیکچرز) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۳۰۔ ''تلقین شاہ سلسلے کے ریڈیائی فیچرز (نو جلدیں) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۳۱۔ ''عرضِ مصنف'' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۳۲۔ ''شہر آرزو'' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۳۳۔ قلعہ کہانی (ٹیلی ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول: ۱۹۹۰ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

داستان سرائے' '۱۲۱۔C' ماڈل ٹاؤن، لاہور نمبر ۱۴' پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ پرائیڈ آف پرفارمنس'' (حکومت پاکستان کا سول اعزاز) ۱۹۷۹ء

۲۔ ستارۂ امتیاز (حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز) ۱۹۹۷ء

نظریۂ فن:

''میں نے اپنے افسانوں میں پلاٹ پر بھی زور نہیں دیا اور نہ مجھے یہ پسند ہے بلکہ میری تمام تر توجہ کردار پر ہوتی ہے' جو معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور کردار ہی پلاٹ کو اور کہانی کو مرتب کرتے ہیں۔''

اشفاق احمد

(بہ حوالہ: ایک انٹرویو روبرو: حسن وقار گل: مشمولہ: ''نگار پاکستان'' سالنامہ ۱۹۸۱ء)



حوالہ جات:

۱۔ دستاویزات میں ۲ اگست ۱۹۲۷ء درج ہے، جو درست نہیں۔

گڈریا

اشفاق احمد

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے"۔ میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا"۔

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔۔۔۔۔اس کا فارسی میں ترجمہ کرو"۔

"داؤ جی کے بچے" میں نے اونگھتے ہوئے کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہو......دفع ہو جاؤ......میں نہیں......میں نہیں......آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا......داؤ جی کے بچے......کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا' پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی......اور میں بھی......میں بھی......" اپنی جوانمرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر شاباش......میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے' پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ

تو ''

''نہیں نہیں'' انہوں نے بات کاٹ کر کہا ''میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا...... شاباش اب بتا'' تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا''۔

میں نے روٹھ کر کہا'' مجھے نہیں آتا۔''

''فوراً نہیں کہہ دیتا ہے'' انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا'' کوشش تو کرو۔''

''نہیں کرتا!'' میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے'' کارکنان گزمہ خانہ رانو را توقیف کردند...... کارکنان گزمہ خانہ' تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے۔ نئی ترکیب ہے' دس مرتبہ کہو''۔

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں' ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑا' شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب ہنگامہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔'' بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا۔''

پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔



شام کو جب میں ملا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف' موئے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب'' کدو کریلا ڈھائی آنے'' کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے کچے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا تھا' پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے'' ٹھائیں'' ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید سی مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ پر

چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی ٹھٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کیا۔ ''داؤجی سلام''۔ اور داؤجی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''جیتے رہو''۔

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منمنی آواز میں چلایا۔ ''داؤجی سلام''۔

''جیتے رہو۔ جیتے رہو!!'' انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹاخ سے میرے زناٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

''شیخی خورے، کتے'' وہ چیخا۔ جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ۔

''بھلا کون ہے وہ؟''

''داؤجی!'' میں نے بسور کر کہا۔

''داؤجی!'' میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

''وہ جو بیٹھے ہیں'' میں نے آنسو پی کر کہا۔

''بکواس نہ کر'' میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ ''ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا..... شیخی خورا۔''

میں نہیں بولا اور اپنی خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤجی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤجی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کر کے گلی میں سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چندی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا..... سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثناء میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ داؤجی گیرورنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا سا لڑکا ان کا بیٹا ہے' میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ ''تجھے کیا'' اور ''بکواس نہ کر'' مگر خدا کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا' تو وہی داؤجی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤجی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پرواہ ہو

کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن' سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں' اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر '' بے بے نمستے!'' کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سے قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا۔ '' بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔''

مشین رک گئی۔

'' ہاں ہاں'' بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

'' کیا نام ہے تمہارا'' بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

'' آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے''۔ اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔ '' ہے نا بے بے؟''

'' کیوں نہیں بھائی جو ہوا''۔

'' آفتاب کیا؟'' اندر سے آواز آئی' آفتاب کیا بیٹا؟''

'' آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی'' لڑکی نے رکتے ہوئے کہا۔ '' امی چند کے ساتھ آیا ہے''۔

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پاجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی پانی کی ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ '' ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گولو مولو سا ہے''۔ پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس کاٹھ کا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

'' آفتاب کا خط آتا ہے؟'' انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

'' آتا ہے جی'' میں نے ہولے سے کہا۔ '' پرسوں آیا تھا''۔

'' کیا لکھتا ہے؟''

'' پتا نہیں جی' اباجی کو پتہ ہے۔''

'' اچھا'' انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ '' تو اباجی سے پوچھا کرنا!...... جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔''

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا۔ '' کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟''

''چوتھا'' میں نے وثوق سے جواب دیا۔

''کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی پتہ نہیں''۔ میری آواز پھر ڈوب گئی۔

''تلک الرسل'' انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی۔ وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا' معاً داؤجی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا......

''سورہ فاتحہ سناؤ۔''

''مجھے نہیں آتی جی'' میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا ''الحمد اللہ بھی نہیں جانتے؟''

''الحمد اللہ تو جانتا ہوں جی'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے ''ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!!'' پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔ جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پاجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اور جب میں نے والا الضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال تھا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا۔ مگر داؤجی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا ''داؤجی سلام'' اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہولے سے جواب دیا۔ ''جیتے رہو''۔

بے بے نے مشین روک کر کہا ''کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آ جایا کرو......''

''ہاں ہاں آ جایا کر'' داؤجی چونک کر بولے ''آفتاب بھی آیا کرتا تھا'' پھر انہوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا ''ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا ''تو مجھ سے پوچھ تو لیتا بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضگی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے' پھر اماں نے ہمدرد بن کر کہا ''اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔''

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا' مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤجی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے مصری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے ''گولو

آ گیا' پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے ''کوئی گپ سنا'' اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے، بس یونہی میرے لیے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں' پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے ''لے ایک سوال نکال۔'' اس سے میری جان جاتی تھی۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ ''چٹائی'' میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا ''اوں ہوں'' وہ سر ہلا کر کہتے ''فارسی میں بتاؤ'' تو میں تنگ آ کر جواب دیتا ''لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے'' اس پر وہ چہکار کر کہتے ''میں جو پڑھاتا ہوں گو لو ...... میں جو سکھاتا ہوں ...... سنو! فارسی میں بوریا' عربی میں حصیر'' میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ''بخشو جی بخشو' فارسی بھی اور عربی بھی، میں نہیں پڑھتا مجھے معاف کرو'' مگر وہ سنی ان سنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا' عربی حصیر۔ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے تھے...... امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے' لیکن اس کے داؤ امی چند پر بھی برابر ہوتے تھے وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا کیا ہے۔ اس نے گلاس کے ساتھ منہ لگائے لگائے ''ڈیڈ'' کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے ''قرۃ بیٹی یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟'' اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی۔ ''تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوا دیے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہوتا شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں'' اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے ''جاہل اس کا مطلب کیا جانیں'' اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے' پھر بددعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی رکتی تو داؤ جی کہتے ''ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو'' تم انہیں روکو مت' انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیوں پر چڑھ جاتے۔



نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجہ سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے' جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں' شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھینچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے' ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا' میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں

چرا کے لاتا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا۔ اور صبح دیر تک سویا رہتا' اماں میرے اس رویے سے سخت نالاں تھیں' اباجی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی' اور دن کلاس میں بینچ پر کھڑے ہو کر' سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ' فسانہ آزاد اور الف لیلیٰ ساتھ ساتھ چلتے تھے' فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے' لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بینچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا ــــــ بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند' نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھ لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔

میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور اب کدھر جانا چاہیے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا۔ مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور اباجی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی' مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی۔ اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا' چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور دیسو یب یب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیسو یب یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بڑا بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں' میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یب یب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا' "یار دیسو سب جانتا ہے۔ یہ بتا' تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر دیسو سے پوچھا "انارکلی دفتر بنائیں گے نا؟"

دیسو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں"۔

میں نے کہا انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں!

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب

بلاتے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہوگیا۔

''ہسپتال میں'' وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

''ان کو پہچانتے ہو؟'' اباجی نے سختی سے پوچھا۔

''بے شک'' میں نے ایک مہذب سیلز مین کی طرح کہا۔

''بے شک کے بچے' حرامزادے' میں تیری یہ سب......''

''نہ نہ ڈاکٹر صاحب'' داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا'' یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو......''

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا'' آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملادی''۔

''آپ فکر نہ کریں'' داؤجی نے سر جھکائے کہا۔'' یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن......''

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا'' کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کرسکتا''۔

''کرے گا' کرے گا...... ڈاکٹر صاحب'' داؤجی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا'' آپ خاطر جمع رکھیں''۔

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے'' میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آ ؤ راستے میں باتیں کریں گے۔''

اباجی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤجی نے پیچھے مڑ کر کہا'' ڈاکٹر صاحب بھول نہ جایئے ابھی بھجوادیجئے گا۔''

داؤجی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور کہا'' آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوّل نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوادوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا......''

''مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی'' میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

''تو اور کیا ہوگا گولو؟'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا'' میں بزنس کروں گا' روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں ضرور آؤں گا' پھر دیکھنا......''

اب کے داؤجی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا'' خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک ان پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔''

میں نے جل کر کہا ''مجھے کسی کی پرواہ نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی' میں اپنے یہاں خوش۔''

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا ''میری بھی پرواہ نہیں؟'' میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے۔ ''میری بھی پرواہ نہیں؟''

''او گولو میری بھی پرواہ نہیں؟''

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کی تو ہے مگر...... '' مگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا...... تو...... تو...... '' انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ ''میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک پا سے بدتر بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟ خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چیتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی' میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار...... لوگ سمجھتے ہیں...... '' داؤ جی کبھی ہاتھ جوڑتے' کبھی سر جھکاتے' کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے اشعار پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا' ان کا زانو چھوڑ کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا ''داؤ جی! داؤ جی؟'' اور داؤ جی ''میرے آقا' میرے مولانا' میرے مرشد'' کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے ''کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے'' پھر وہ پل کی دیوار سے اٹھے اور بولے ''چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے''۔ میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا' اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھمسے پنساری یعنی دیسو یب یب کے باپ کی دکان سے انہوں نے گھریلو ضرورت کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے' میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی۔ ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا۔ اور وہیں پڑھا کروں گا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک بری کین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور پاں پاں کرتی ریکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر' پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا۔

داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی' مجھے تباہ کر دیا' مجھ پر جینا حرام کر دیا' سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا' اور رات' گرمیوں کی مختصر رات' ان کے سوالات کا جواب دینے میں' گو مجھے پران کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے' اور وہ موگنگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں' میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے' وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں' میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کے آگے لا کھڑا کیا ہے' میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا ''مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا'' تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے' میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا ''داؤ جی''۔

''ہوں'' ایک گمبھیر سی آواز آتی۔

''داؤ جی کچھ اور پوچھو''۔

داؤ جی نے کہا ''بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے اس کی ترکیب نحوی کرو''۔

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا ''جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتادوں گا کوئی اور پوچھئے''۔

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کہا ''میرا گولو بہت اچھا ہے''۔

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا تو بہت اچھا صفت ہے' حرف ربط مل کر بنا مسند......

اور داؤ جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے ہاتھ اٹھا کر بولے جان پدر' تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بنایا ہے۔

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لیے پوچھا ''آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں جان داؤ کیوں نہیں کہتے؟''

''شاباش'' وہ خوش ہو کر کہتے ''ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں' روز بروز کہو یا دن پر دن اسی طرح سے......''

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا ''داؤ جی اب تو نیند آرہی ہے!''

''اور وہ ترکیب نحوی؟'' وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد چاہے میں لاکھ بہانے کرتا، ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا' مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے بیٹھے رہتے' بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے بھی کسی قدر زیادہ' شاید اس لیے کہ میں نفسیات کا ایک ہونہار طالبعلم ہوں اور داؤ جی پرانے ملائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے' پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا' لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے ''اٹھ بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ ''موٹا ہو گیا'' کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے' میں منمناتا تو چمکار کر کہتے ''بھلا ہو جائے گا بیٹا تو' گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کرے گا!'' اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ''داؤ جی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگاؤ' چاہے مجھے قتل کر دو' جان سے مار ڈالو''۔

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤ جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤ جی ان سے بہت ڈرتے تھے' وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤ جی کو کوسنے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤ جی میری بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے ''غیبت کرنا برا گناہ ہے۔

لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے' میں' میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا' تو بھی' ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں''۔ اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ ان کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید' ماتھا محراب دار اور آنکھیں چنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گربہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤ جی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بے چاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں' داؤ جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی' داؤ جی! پڑھ نہیں رہا' تنکوں کی طرح چار پائیاں بنا رہا ہے''۔

میں غصیلے بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا'' تجھے کیا' نہیں پڑھتا' تو کیوں بڑبڑ کرتی ہے ـــ آئی بڑی تھانیدارنی''۔

اور داؤ جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے'' نہ گولو مولو، بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے''۔

اور میں زور سے چلاتا'' پڑھ رہا ہوں جی' جھوٹ بولتی ہے''۔

داؤ جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چار پائیاں دیکھ کر کہتے'' قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا''۔

بی بی کہتی'' کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤ جی اس کے نیچے ہے وہ چار پائی جس سے کھیل رہا تھا''۔

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤ جی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لیے کہتی ہے، ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ فیل ہو یا پاس، اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے' تیری بہتری چاہتی ہے۔ اور داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل دیتا' گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤ جی کے یہاں آ جاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی' داؤ جی سکول کی گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی' سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا' اس کی تفصیل پوچھتے' پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤ جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آ جاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا، اس لیے وہ داؤ جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی...... ایک دن خلاف معمول داؤ جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤ جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بینچ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا'' چلیے' آج میں آپ کو لینے آیا ہوں'' انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیے۔

میں نے شرارت سے ناچ کر کہا" گھر چلئے' بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں"۔

داؤجی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے" اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا' خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی' پھر انہوں نے خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا" اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے"۔ اس دن مجھے داؤجی پر رحم آیا۔ میرا جی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس دن میں نے بے بے سے نہ کہنے کا ہی وعدہ کر کے ان کے لیے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤجی کے ہاں دودھ' پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤجی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے' ایک صبح میں دودھ سے بھرا تاملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر نہ تھی۔ وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی۔ اور گھر میں صرف داؤجی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤجی نے کہا" چلو آج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دکان سے گڑلے کر آتا ہوں' تم پانی چولہے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤجی گڑلے کر آ گئے تو انہوں نے کہا" تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں"۔ چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤجی چولہا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گلیلیو نے کہا" زمین سورج کے گرد گھومتی ہے"' گلیلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔ پانی ابل رہا تھا۔ داؤجی خوش ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ او گولو! او گولو! گلیلیو کی بات مت بھولنا' گلیلیو کی بات مت بھولنا۔ انہوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور داؤجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گلب گل بل کے ساتھ گولو گلیلیو! گولو گیلیو کئے جا رہے تھے' میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا' بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے، گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داؤجی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا۔" چائے ہے!"

بے بے نے ایک دو ہتڑ داؤجی کی کمر پر مارا اور کہا" بڈھے بروھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار پھرے' تجھے یم سمیٹے' یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھے کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں میں کل کی مرتی آج مروں تیرا من راضی ہو۔ تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرن جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا...... تجھے موت نہیں آتی...... اوں ہوں تجھے کیوں آئے گی" اس فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی' کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ" اوہ تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ انداز فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ

کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی: "میری سوت بڑھے سے تیرا کیا ناطہ ہے بتا نہیں تو اپنی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟"

بی بی بچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردگار کنم کہ گرفتار بہ مصیبتے نہ کہ معصیتے"۔

تھوڑی دیر رک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پر مکے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی"۔

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش' گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ شیون کرے' تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوبؐ کے طفیل نار جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیمؑ مجھے جرات عطا کرے' مولائے ایوبؑ مجھے صبر کی نعمت دے"۔

میں نے کہا "داؤ جی' آقائے نامدار کون؟"

تو داؤ جی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا "جان پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد' میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر' وہ میرے آقا بھی تھے' میرے باپ بھی' اور میرے استاد بھی' وہ تیرے دادا استاد ہیں...... دادا استاد......" اور انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بیشمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤ جی نے مسکرا کر کہا "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام جی ہیں۔ وہ مسیحا نہ ہو' آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا' اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤ جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے......

کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہوگا...... حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھا! میری طرف۔ سر مبارک اٹھا کر فرمایا' چوپال زادے ہمارے پاس آؤ' میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ پٹھار اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا' اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی...... میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا' بھئی ہم تم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو...... پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کہ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے گنواروں کی طرح کہا "چنتو"...... مسکرائے...... تھوڑا سا ہنسے بھی...... فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے "چنت رام ہو گا"...... میں نے سر ہلایا...... حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا۔ پاجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری......"

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چراتے تھے داؤ جی؟"

''ہاں ہاں'' وہ فخر سے بولے ''میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔''

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جلدی سے پوچھا۔ ''اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے''۔ داؤجی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی۔ اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے ''جان پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی اسکول نہیں ہوتے تھے' میں گاؤں کی بات کررہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اردگرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے...... ان کا سارا خاندان زیور تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد اُن کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدِ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے' فارسی' عربی' جبر و مقابلہ۔ اقلیدس' حکمت اور علم ہیت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحر علمی کی سب داستانیں سنیں' شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود مولانا کی تعلیم دلی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی...... ''

مجھے داؤجی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لیے میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا''۔ ''ہاں'' داؤجی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے'' ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے' بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے...... میں تو اپنی لاٹھی زمین پر ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا' اپنے بھائیوں کے پاس بوریے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گزر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے' اپنے چوبی صندوقچے سے حروف ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے ...... سبحان اللہ کیا آواز تھی' کس شفقت سے بولے تھے' کس لہجہ سے فرما رہے تھے' الف' بے' پے' تے'' اور داؤجی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ادھر رہٹ تھا۔ اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض''۔ پھر انہوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا'' اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے' دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ در فیض کھلا تھا، جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی......''

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد با ادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا۔ ''حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟'' تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے۔ ''حضرت اسماعیل چشتیؒ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جان جاناں کہہ کر پکارتے تھے' کبھی جان جاناں کی رعایت سے مظہر جان جاناں بھی کہہ دیتے تھے''۔

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤجی اچانک رک گئے اور بولے ''سبسڈی ایری سسٹم کیا تھا؟ ان انگریزوں کا برا ہو' یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر' سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوا کے پہاڑے کی طرح میں نے سبسڈی ایری سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میز سے گرائمر کی کتاب اٹھائی اور بولے'' باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا یا نہیں'' میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا''۔

داؤجی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے' تو وہ پکار کر کہتے'' سب ایک ایک شعر سناؤ'' پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا:

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے ''اولین شعر نہ سنوں گا' اردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا''۔
بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپوردم درکشید
چو خسرو برآتش قلم درکشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔
بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشوریم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ''بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے''۔
پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے۔ ''بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک شعر سنائے گی'' مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی۔
''مجھے نہیں آتے شیر' کبت''

اس پر داؤ جی کہتے۔ ''گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے'' اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤ جی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے ''میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامے میں شہادت کے دستخط کروں گا۔ میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے ''پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی' ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہوگی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا' پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خط شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خط شکستہ نہیں آتا۔ میں اپنی بہو کو سکھا دوں گا...... سن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا' پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے' خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی...... خوب...... یاددارم...... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے...... ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے۔ ''جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی

ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے''۔

''اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے' یہ سوانگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے میری تو وہ کب مانے گا' ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔''

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہوگا میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں' لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا' اس پر وہ پورا اترتا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا' بے زار و قطار رو رہی ہے' امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں'' آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔'' جیجا جی کے باپ بولے۔ ''منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے'' تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا' عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا'' یہ کیا ہوا بیٹا۔ اٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ''۔ بی بی اس طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤ جی سے لپٹ گئی' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا خجل سر تیرے سامنے خم ہے''۔ یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤ جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''منشی جی آپ فکر نہ کریں میں بچی کو کریما پڑھا دوں گا'' داؤ جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''کریما تو یہ پڑھ چکی ہے' گلستان' بوستان بھی ختم کر چکا ہوں' لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی''۔ اس پر وہ ہنس کر بولے۔ ''ساری گلستان تو میں نے بھی نہیں پڑھی' جہاں عربی آتی تھی' آگے گزر جاتا تھا...... '' داؤ جی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے' بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤ جی میرا سہارا لے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا۔

''یہ لو یہ بھی رو رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو...... او مردم دیدہ...... تجھے کیا ہو گیا...... جان پدر تو کیوں......''

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور راکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اسکے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤ جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤ جی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے۔ ''لاحول پڑھو بیٹا' لاحول پڑھو''۔

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا' بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے' اسی کا تھا۔ اس میں بیس تیس بکریاں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے

محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤجی کو 'پنڈتا جے رام جی کی' کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رانو نہیں مانتا تھا وہ اپنی مونچھ کو چبا کر کہتا۔ ''ارے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو وہی پنڈت ہوتا ہے......'' چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ 'بی بی' کے جانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا۔ ''موری تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا''۔ میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا کہ غوطہ لگایا کہ نہیں''۔ مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑ اپنے گھر گیا اور اباجی سے ساری حکایت بیان کی۔
ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا۔ اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چھٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے ''یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی، لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال سنگھ میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا ''شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟'' تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہوگا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو'' میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا ''حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے'' ہنس کر فرمانے لگے ''چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ۔ جس کا ہمیں احساس نہ ہو'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا ''اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا''...... خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے......''
داؤجی گزرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا ''خادم آ گیا'' مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا' وہ دعا دیتے' میرے والدین کی خیریت پوچھتے' گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے ''لو بھئی چنت رام ان گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھا لو'' میں سبد گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے' ہمیں باغ کا چکر دو کبھی حکم ہوتا' سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے تو تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح

جاتے دیکھا تھا اس کے بعد جرات نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپالیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے "ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر اکراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطہ عروج ہے۔ اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں، دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لیے وقف کر دیا ہے..... جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا۔ اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دست شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجر اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے' جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے تجھے یہ سعادت نصیب کی۔ چنت رام تیرا مویشی چرانا پیشہ ہے تو شاہ بتھا کا پیرو ہے اس لیے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے۔ وہ تجھے اور بھی برکت دے گا تجھے اور آسائش میسر آئے گی....."

داؤ جی یہ باتیں کرتے کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤ جی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤ جی کے 'بچے' گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے۔ "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدر یہ تیرے باپ کو کتا کہتا تھا"۔ میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب' برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گولو انہیں بہت مرغوب تھا طنبورا دوسرے درجہ پر' مسٹر ہونق اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں' مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آ چکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا

داؤ جی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں نیوں دسنا۔ تے دکھ تینوں نیوں دسنا..... دسنا دسنا دسنا دسنا..... تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گا ماروناروناروناسارے گا مارونا..... تے دکھ تینوں نیوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اٹھاتے' صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔

''سن بیٹا'' وہ بڑی محبت سے کہتے۔ ''یہ کوئی مشکل سوال ہے!'' جونہی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔ ''دیکھ پھر' میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟'' وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

''نہیں'' میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

''تو اور کون ہے؟'' وہ مایوس سے ہو جاتے۔

''وہ بچی سرکار'' میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا ''وہ بچی سرکار' وہ سب کا پالنے والا..... بول بکرے سب کا والی کون؟''

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ''داؤ جی خفا ہو گئے کیا''۔

وہ مسکرانے لگتے۔ ''چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا...... مجھے پانی تو پی آنے دے''۔

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا۔ ''لو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا''۔

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے۔ ''اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو.....''

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کل باون پراپوزیشنیں ہیں' زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا' صبح کو بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا' اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا' گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لیے سر اوپر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا۔ ''لے بھئی طنبورے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا''۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا ''اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے' میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں۔ انہیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن

ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا اقسادی السا قین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایہ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے۔ ''چنت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے''۔ میں نے جرات کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لیے حکم ربانی سے کم نہیں اس لیے خاموش ہوں' بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے'' تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی' میں نے سر جھکا کر کہا ارشاد! فرمایا'' دلی میں حکیم ناصر علی سیتانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں' اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضا مندی ظاہر کی تو فرمایا'' اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضا مند ہوں تو ہمارے پاس آنا'' ...... والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں' جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا''۔

چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس شکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب بر آمد نہ ہوتا۔ اس لا ینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ' وہ والدہ کی رضا مندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ...... ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی دو روپے چرائے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ...... گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا۔ ''بد قسمت ہوں' بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آکے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ میں وہاں سے چل دیا ...... سن رہا ہے؟''

داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خار پشت بنے' میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا۔

''جی؟''

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا'' قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں جاکھل ہیند سرسہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دن دن چلتا' اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی۔ لیکن گوہر مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا۔ جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیتانی کا دولت خانہ کہاں ہے' نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی' صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لیے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔

وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی' وہ پتھر پھوڑوں کے محلہ کی ایک تیرہ و تاریک گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فرو کش تھے۔ اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ ''کون ہے؟'' میں نے سلام کر کے کہا۔ ''حکیم صاحب سے ملنا ہے''۔ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے ''اسم گرامی'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''پنجاب سے آیا ہوں اور......'' میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے ''او ہو! چنت رام ہو؟'' میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے۔ ''مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے' لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا''۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے ''میاں اندر آ جاؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟'' میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروسِ نو کی طرح بیٹھے رہے پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''برخوردار بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا' بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بتاؤ ہندسہ کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا۔ ''بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک متساوی الساقین''۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے' میاں جلد کرو۔ نابینا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتی ہوئی انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب اس نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نہ آتا تھا۔ یونہی انگل سے میں نے ایک مقام' پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا۔ تو تیزی سے بولے ہے ہے کیا کرتے ہو' یہ نقطہ ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیر متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی''۔ پھر داؤجی دلی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں' وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا داؤجی؟'' انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''رات بہت گزر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا''۔ میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا۔ ''پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پراپوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا'' میں نے جواب دیا۔ ''حلوا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں'' انہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحرِ علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے ''چنت رام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں''۔ اس پر میں رو دیا تو دستِ مبارک محبت سے میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے'' ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا ہو تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا'' یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک میں چلے گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن متھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے۔ ''اسپ تازی بن طویلہ خر نہ بن''۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گزرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مون

برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ لیا اور ان کی فکر' اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں' خوشامدوں' گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار بجے کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد' تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤ جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورا بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سر نکال طنبورے' کی آہنگ پر بج یہ کیا کر رہا ہے! جب ہم بستی سے دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤ جی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی' قبرستان گزر گیا مگر داؤ جی تھے کہ کچھ آیتیں ہی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تھیہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں۔ اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤ جی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔

"سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ' پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑ دو' تب میرے پاس آؤ' میں یہاں بیٹھتا ہوں" میں تھیہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا' اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درخت پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تھیہ پر جا کر داؤ جی کو سوئے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں! غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤ جی تھیہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر
بہ پیش عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشت شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو' سوچ لو میں تمہیں ...... میں تمہیں بتا رہا ہوں ...... سنا رہا ہوں ...... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤ جی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ با تصویر والا جن تھا۔ جب داؤ جی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ...... تھوڑی دیر بعد داؤ جی آئے انہوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا۔ "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں

کو نے ہاتھ میں پکڑ لئے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لے لے وال فرید اڑ یا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ ان کا سر تبدیل ہو گیا' ان کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور ان کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا...... اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا' میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ گر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح داؤجی سے چمٹ گئی۔ بچ بچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی۔ ''بڈھے ٹوٹکی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں''۔ پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی ''میں مرگئی' میں جل گئی' لوگوں اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا سمبندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے میرا انگ انگ توڑ دیا ہے''۔ امی چند تو داؤجی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انہیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤجی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا۔ ''تو احمق ہے اور تیری بے بے ام الجاہلین...... میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا' اے وائے کہ تو شعور کی بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس...... صد افسوس'' بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤجی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا...... اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستے میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کالی کر کے پوچھا ''سنا بابو تیرے کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔''

میں نے اس کمینہ کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشن سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''بیٹا کیا تم سچ مچ جن' بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے ''واقعی تو بہت بھولا ہے اور میں نے خواہ مخواہ جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو ولی اور بھتے مزدور کو بلا کر برساتی بنوائی ہے' وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے کا کام ہی کرتے ہیں کہ چنائی بھی کر لیتے ہیں''۔ میں نے جل کر کہا۔ ''جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ''۔ داؤجی نے کہا ''تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔''

پھر بولے۔ ''سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی...... سمجھ گیا''۔

''سمجھ گیا'' میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور داؤ جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پلٹتے تو ''اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی'' کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

''جہانگیر'' میں نے جواب دیا۔ اور وہ عورت۔ ''نور جہاں'' ہم دونوں ایک ساتھ بولے ..... ''صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟'' میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے مثالیں؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا۔ تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بیک ان ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے ''طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ..... مادیاں گھوڑی ..... ماکیاں ..... مرغی ..... '' ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا۔ اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح کو داؤ جی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤ جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور ''اسی نمبر!! اسی نمبر'' کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا۔ ''کون سا سوال غلط ہو گیا؟'' میں نے جھوم کر کہا ''چار دیواری والا'' جھلا کر بولے ''تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کیے ہوں گے'' میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جی ہاں جی ..... گولی مارو کھڑکیوں کو'' داؤ جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے ''تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا سطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کیے ..... پورے بیس نمبر''۔

اور داؤ جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے: ''اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر تو ضرور دے گا' تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے'' اس پرچے کے بعد داؤ جی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤ جی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤ جی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کریں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج

میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا۔ انہوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں Cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرمار ہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی To Cow کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں۔ جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا...... پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لیے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی، منصفی کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار، بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسماً ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے۔ افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے۔ میں شرارتاً کھلے کھلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور اباجی لڈوؤں کی چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر میں بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے، میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی......"

"ایک ہی تو نمبر کم ہے"۔ میں نے چمک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں"۔ پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اول اول کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ، پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ "اگر مجھے اٹھنے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے" اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا۔ اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی منصفی جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی..... کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپو تاپو کھیلا کرتی تھیں بنت عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپو تاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔

انہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جا سکتے تھے نہ ہی داؤجی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی تھی نہ کرسمس کی تعطیلات میں، ایسے ہی ایسٹر گزر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے...... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنیئے، ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی' اور دو ناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والے اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا۔ اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے' دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب وغریب صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤ جی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤ جی ایسے بے وفا تھے!......

کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی' مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔

''ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔''

''کون سے گھر میں؟'' بزرگ نے پوچھا۔

''رہتکی مہاجروں کے گھر میں'' لڑکے نے کہا۔

''پھر گیا انہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔''

اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا: ''اوئے رانو جلدی آ اوئے جلدی آ...... تیری سامی...... پنڈت...... تیری سامی۔''

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انہوں نے داؤ جی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔

''یہ بڑا اچھا آدمی ہے بڑا نیک آدمی ہے...... اسے کچھ مت کہو...... یہ تو...... یہ تو......'' خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

''بتاؤں تجھے بھی...... آ گیا بڑا حمایتی بن کر...... تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا'' اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا۔ ''انصار ہو گا شاید''۔

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا: ''اب بول بیٹا' اب بول'' اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے' ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا۔ ''پہلے بودی کاٹو، بودی'' اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا: ''ٹکا دیں جے؟'' اور رانو نے کہا۔ ''جانے دو بڈھا ہے' میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا''۔ پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''کلمہ پڑھ پنڈتا'' اور داؤ جی آہستہ سے بولے:

''کون سا؟''

رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا۔ ''سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!''

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ ''چل بکریاں تیرا انتظار کرتی ہیں''۔

اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!

O

قرۃ العین حیدر

نام	:	قرۃ العین
قلمی نام	:	قرۃ العین حیدر (ادبی دنیا میں عینی اور پوم پوم ڈارلنگ کے ناموں سے پکارا گیا۔)
پیدائش	:	۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء بہ مقام علی گڑھ۔
وفات	:	۲۰ اور ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء کی درمیانی رات، ساڑھے تین بجے، نوئیڈا، بھارت۔
تعلیم	:	ایم۔اے (انگریزی)

لاہور، دیرہ دوں اور لکھنؤ کے کانونٹ سکولوں میں ابتدائی تعلیم پائی۔ گھسیاری منڈی اسکول، لکھنؤ (بنارس یونیورسٹی) سے میٹرک کیا۔ ازابیلا تھوبرن کالج، لکھنؤ (بنارس یونیورسٹی) سے بی۔اے کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ایم۔اے (انگریزی کیا)۔ مزید برآں گورنمنٹ اسکول آف آرٹس لکھنؤ اور ہیڈ رلیز اسکول آف لندن میں آرٹ کی تعلیم پائی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں انگریزی ادب کا شارٹ کورس کیا۔ ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک، لندن سے صحافت کی تعلیم لی۔

مختصر حالات زندگی:

سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر کی نامور بیٹی۔ ۱۹۵۰ء میں وزارت اطلاعات و نشریات، کراچی میں ملازم ہوئیں۔ لندن (۱۹۵۲ء) میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اتاشی رہیں۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (.P.I.A) میں انفارمیشن آفیسر ۱۹۵۴ء۔ وزارت اطلاعات و نشریات میں ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء ڈاکومینٹری فلموں کی پروڈیوسر، رائٹر کے علاوہ ''پاکستان کوارٹرلی'' کی ایکٹنگ ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان سے بھارت منتقل ہو گئیں اور ''امپرنٹ'' بمبئی کی مدیرہ کے طور پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' سے بھی وابستہ رہیں۔ سنٹرل بورڈ آف فلمز سنسر کی ممبر رہیں۔ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۷ء ساہتیہ اکاڈمی جنرل کونسل کی اردو ایڈوائزری بورڈ کی رکن کے طور پر کام کیا۔ شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں وزٹنگ پروفیسر رہیں۔ بمبئی میں قیام کے دوران انگریزی مجلّہ ''Imprint'' کی منیجنگ ایڈیٹر کے

طور پر کام کیا اور جینٹ کولن گروپ کی ممبر رہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۲ جنوری تا مارچ ۱۹۷۹ء اور شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۸۲۔۱۹۸۱ء) وزٹنگ پروفیسر رہیں۔ شادی نہیں کی۔ آخری دنوں میں اُن کا مستقل قیام نوئیڈا میں تھا۔ نوئیڈا ہی کے کیلاش ہسپتال میں آخری سانس لیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

اوّلین تحریر:

بارہ برس کی عمر میں 'بی چوہیا کی کہانی ان ہی کی زبانی'' مطبوعہ: ''پھول' لاہور: ۲۴ ستمبر ۱۹۳۸ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''یہ باتیں'' مطبوعہ: ''ہمایوں' لاہور: ۱۹۴۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''ستاروں سے آگے'' (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۷ء
۲۔	''شیشے کے گھر'' (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۴ء
۳۔	''سفینۂ غم دل'' (ناول)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۲ء
۴۔	''میرے بھی صنم خانے'' (ناول)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۴۹ء
۵۔	''آگ کا دریا'' (ناول)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۹ء
۶۔	''ہمیں چراغ ہمیں پروانے'' (ترجمہ) (یہ ہنری جیمز کے ناول کا ترجمہ ہے)	مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۸ء
۷۔	''پت جھڑ کی آواز'' (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۶ء
۸۔	''آخر شب کے ہمسفر'' (ناول)	مطبوعہ: چودھری اکیڈمی، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۷۹ء
۹۔	''کارِ جہاں دراز ہے'' (ناول۔ جلد اول) (اس ناول کی دوسری جلد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔)	مطبوعہ: مکتبہ اردو ادب، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۷۷ء
۱۰۔	''سیتا ہرن'' (ناولٹ)	مطبوعہ: کتاب نما، لاہور	طبع اوّل: س۔ن
۱۱۔	''ہاؤسنگ سوسائٹی'' (ناولٹ)	مشمولہ: ''پت جھڑ کی آواز''	طبع اوّل: ۱۹۶۶ء
۱۲۔	''چائے کے باغ'' (ناولٹ)	مطبوعہ: حلقۂ ادب، بمبئی	طبع اوّل: ۱۹۶۴ء
۱۳۔	''دلربا'' (ناولٹ)	مطبوعہ: پاکستان	طبع اوّل: ۱۹۷۶ء
۱۴۔	''اگلے جنم مجھے بیٹیا نہ کیجو'' (ناولٹ) قسط وار	مطبوعہ: ''بیسویں صدی'' دہلی	طبع اوّل: ۱۹۷۷ء

۱۵۔	''ستمبر کا چاند'' (رپورتاژ)	مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور	طبع اول: جون ۱۹۵۸
۱۶۔	''کوہ دماوند'' (سفرنامۂ ایران)	مطبوعہ: ''آج کل''، دہلی	طبع اول: ۱۹۷۸ء
۱۷۔	''پکچر گیلری'' (مضامین)	مطبوعہ: قوسین، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۳ء
۱۸۔	''چار ناولٹ''	مطبوعہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۱۹۔	''جہانِ دیگر'' (امریکا سے متعلق رپورتاژ)	مطبوعہ: مکتبہ اردو ادب، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۰ء
۲۰۔	''گلگشت (سفرنامۂ روس و کشمیر)	مطبوعہ: مکتبہ اردو ادب، لاہور	طبع اول: س۔ن
۲۱۔	''فصلِ گل آئی یا اجل آئی'' (افسانے)	مطبوعہ: خیام پبلشرز، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۸ء
۲۲۔	''جہاں پھول کھلتے ہیں'' (افسانے)		
۲۳۔	''آلپس کے گیت'' (واسل بائی کوف کی کتاب کا ترجمہ)		
۲۴۔	''جگنوؤں کی دنیا'' (افسانے)	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	طبع اول: ۱۹۹۰ء
۲۵۔	''تلاش'' (افسانے)	مطبوعہ: پاکستان (جعلی ایڈیشن)	
۲۶۔	''تین ناولٹ''	مطبوعہ: پاکستان (جعلی ایڈیشن)	
۲۷۔	''روشنی کی رفتار'' (افسانے)	مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	طبع اول: ۱۹۸۲ء
۲۸۔	''ڈان بہتا رہا'' (از شولوخوف کا ترجمہ۔ ناول)		
۲۹۔	''آدمی کا مقدر'' (از شولوخوف کا ترجمہ۔)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	طبع اول: ۱۹۶۵ء
	(یہ ''The Fate Of Man'' (ناولٹ) کا ۵۳ صفحات میں ترجمہ ہے۔)		
۳۰۔	''کچے گھروندے''		
۳۱۔	''اُڑتے خاکے''		
۳۲۔	''یاد کی اک دھنک جلے'' (افسانے)	مطبوعہ: رفعت پبلشرز، لاہور	طبع اول: س۔ن
۳۳۔	''اودھ کی شام''		
۳۴۔	''ماں کی کھیتی'' (ترجمہ/ ناول از اعتماتوف چنگیز)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	طبع اول: ۱۹۶۶ء
۳۵۔	''خضر سوچتا ہے'' (یک بابی تمثیل)		
۳۶۔	''کلیسا میں قتل'' ترجمہ: Murder In The Cathedral	مطبوعہ: ''نیا دور'' کراچی، از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ	
۳۷۔	''میرے بہترین افسانے''	مطبوعہ: پاکستان (جعلی ایڈیشن)	
۳۸۔	''قرۃ العین حیدر کے منتخب افسانے''	مطبوعہ: پاکستان (جعلی ایڈیشن)	
۳۹۔	''ڈگو'' (ترجمہ/ ناولٹ از آر فریمین)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	طبع اول: ۱۹۶۶ء

۴۰۔	''یودوکیہ'' (ترجمہ/ ناول از ویراپانووا)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۵ء
۴۱۔	''شیرخان'' (بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۲۔	''بھیڑیے کے بچّے'' (بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۳۔	''لومڑی کے بچّے'' (بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۴۔	''میاں ڈھینچو کے بچّے'' (بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۵۔	''بہادر'' (بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۶۔	''ہرن کے بچّے'' (بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۷۔	''جن حسن عبدالرحمٰن'' (دوجلدیں۔ بچوں کے لیے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	
۴۸۔	''گردشِ رنگ چمن'' (دستاویزی ناول)	مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۸ء
۴۹۔	''خیالی پلاؤ'' (ترجمہ/ ناول)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
۵۰۔	''چاندنی بیگم'' (ناول)	مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۹۸ء
۵۱۔	''درچمن ہرورقی'' (رپورتاژ)	مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور	نومبر ۱۹۶۸ء
۵۲۔	''دفتر حال وگزشت'' (رپورتاژ)		
۵۳۔	''کفِ گل فروش'' (دوجلدیں) تصویری البم	اردو اکاڈمی، دہلی	طبع اوّل: ۲۰۰۴ء
۵۴۔	''اپریل فول'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۵۵۔	''دامانِ باغباں'' (خطوط)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۲۰۰۳ء
۵۶۔	''استاد بڑے غلام علی خاں''	ہرآنند پبلی کیشنز، دہلی	طبع اوّل: ۲۰۰۳ء

اعزاز:

۱۔ ''ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ'' برائے ''پت جھڑ کی آواز'' افسانوی مجموعہ: ۱۹۶۷ء

۲۔ ''سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ'' برائے تراجم: ۱۹۶۹ء

۳۔ ''غالب ایوارڈ'': ۱۹۸۲ء

۴۔ ''پدم شری'' (قومی ایوارڈ): ۱۹۸۴ء

۵۔ غالب مودی ایوارڈ: ۱۹۸۴ء

۶۔ اقبال سمان (حکومت مدھیہ پردیش): ۸۸۔۱۹۸۷ء

۷۔ گیان پیٹھ ایوارڈ (حکومت ہند): ۱۹۹۰ء

۸۔ بھائی ویر سنگھ انٹرنیشنل ایوارڈ: ۱۹۹۱ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

۱۹۸۴ء میں: فلیٹ نمبر ۸، تاورائے، ذاکر باغ۔ نئی دہلی (بھارت) بعدازاں نوئیڈا کے ایک فلیٹ میں منتقل ہوگئی تھیں۔

نظریۂ فن:

''میں نے کوئی نسخے نہیں پیش کیے۔ میری بنیادی اپروچ انسان پرستی ہے، اس کی ساری دنیا کو آج کل ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت کو میں ضروری نہیں سمجھتی۔''

قرۃ العین حیدر

فوٹوگرافر

قرۃالعین حیدر

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد نظر فریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آ جاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گزرتی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹوگرافر اپنا ساز و سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقے میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آ پہنچتا ہے تو فوٹوگرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتہ ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لیے صبح سویرے گل دستہ لے جاتے وقت مالی فوٹوگرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹوگرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

فوٹوگرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے کہیں اور جا کر اپنی دکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبے کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے؟ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز' سفید سولا ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے بُغادری عہدے دار' ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔ رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتی تھیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے۔ یا سرکاری افسر' یا نئے بیاہے جوڑے' یا مصور یا کلاکار ایسے لوگ جو تنہائی چاہتے ہیں' ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کی جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں' ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں۔ کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے' ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے' فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آؤ جاؤ جاری ہے۔ فوٹو گرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے، لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے، وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

''اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔'' نوجوان نے اس سے کہا۔

''اچھا۔'' لڑکی دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی، جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارہ سا تھا کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آرہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرہ لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا اور دریچوں کے پردے برابر کر کے باہر چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آگئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتاً اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے تھے۔ فوٹو گرافر، جو اب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا، اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایک یورپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

''یہ اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے ایک پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومینٹک ماحول ہے!'' لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آگئے۔ نوجوان اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا ''اب سونا چاہیے''۔

''تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا۔'''' نوجوان نے فکر سے کہا

''ہاں، شب بخیر۔'' لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پچھلا گلیارہ گھپ اندھیرا پڑا تھا۔ کمرہ بے حد پرسکون اور خنک اور آرام دہ تھا۔ زندگی بے حد پرسکون اور آرام دہ تھی' لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کے دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سا سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا۔'' لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پر گر گیا۔ اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں گئی۔ دینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گل دان

براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پر اڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نو جوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔

''مالی نیچے کھڑا ہے۔ اس نے یہ گل دستہ تمہیں بھجوایا ہے۔'' اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور گل دستہ میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

''ایک فوٹو گرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ کیا تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟'' نو جوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نو جوان' لڑکی سے بھی زیادہ' مشہور موسیقار تھا مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹو گرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور ذرا جھک کر کہا۔

''فوٹو گرافر لیڈی؟''

لڑکی نے گھڑی دیکھی' ''ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے' دیر ہو جائے گی۔''

''لیڈی۔۔۔'' فوٹو گرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا'' باہر کار زار حیات میں' گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں دیکھیے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا' ادھر آیئے۔''

''بڑا لسان فوٹو گرافر ہے۔'' لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی' جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا' دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک اور گل دستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اور اس کا ساتھی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کلک۔ کلک۔ تصویر اتر گئی۔

''تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی۔ تھینک یو لیڈی۔ تھینک یو سر۔'' فوٹو گرافر نے ذرا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔ لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہرہ گرنے

لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے وہ کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹوگرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا ''فوٹوگرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا' اس کے سامنے والی دراز میں رکھ دو۔'' لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتے کے بعد سامان باندھتے ہوئے اسے دراز کھولنا یاد نہ رہی اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی نیچے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹوگرافر نے پلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے اتر گئی۔

وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایئرپورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آ کر پھاٹک میں داخل ہوئی، اس میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹھک کر انہوں نے فوٹوگرافر کو دیکھا جو کوچ دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا' مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کی بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا' اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گل دان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے۔ نووارد خاتون درمیانی بیڈ روم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آ کر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آ کر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ پھر آ کر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کو اٹھ کر انہوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونہ نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کا کروچ کاغذ کی تہہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انہوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافے میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی' جس میں سے ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہیں۔ پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایئرپورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی

سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

''کمال ہے' پندرہ برس میں کتنی بار اس سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔'' پھر اس کی آواز میں جھلاہٹ آگئی'' اور یہاں کا انتظام کتنا خراب ہوگیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ۔''

فوٹوگرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر الم سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں۔ ان کی تو آواز بھی بدل چکی تھی۔ چہرے پر درشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑچڑاپن اور بےزاری' اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

''میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا۔ میں۔۔۔ میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کی رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہوگئی ہے نا۔ یہ جگہ راستے میں پڑتی ہے۔''

''اور۔۔۔ اور۔۔۔ آپ کے ساتھی؟'' فوٹوگرافر نے آہستہ آہستہ سے پوچھا۔ کوچ نے ہارن بجایا۔

''آپ نے کہا تھا نا کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اس گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔''

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

''اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ اچھا' خدا حافظ۔'' خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئی' والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی۔

صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔



آغا بابر

نام : آغا سجاد حسین

قلمی نام : آغا بابر

پیدائش : ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء بہ مقام: بٹالہ، ضلع گورداس پور۔ بھارت[1]

وفات : ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء بہ مقام: نیویارک، امریکہ

تعلیم : ایم۔اے (تاریخ) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

میٹرک ایم۔ سی ہائی سکول، بٹالہ سے کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی۔اے (آنرز) اور بعد میں پرائیویٹ طالبعلم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم۔اے کیا۔ انفارمیشن سکول فورٹ سلوکم نیویارک کے گریجویٹ تھے۔

مختصر حالات زندگی:

عاشق حسین بٹالوی سے چھوٹے اور اعجاز حسین بٹالوی کے بڑے بھائی 'آغا بابر' آغا غلام اکبر خان کے ہاں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ لڑکپن کا بیشتر وقت لاہور میں گزرا۔ ایم اے اردو کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء پنچولی آرٹ سٹوڈیو میں مکالمہ نویس کے طور پر کام کیا۔۔ ڈراما سے طبعی مناسبت کے سبب ابتدا میں بطور ڈراما نویس شہرت پائی۔ غیر منقسم پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں بطور رپورٹر کام کیا۔ کچھ مدت حکومت پنجاب (ہند) کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں پبلسٹی افسر رہے۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کیا اور ۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ (G.H.Q) سے وابستہ ہو گئے۔ ''مجاہد'' اور ''ہلال'' کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ ۱۹۶۱ء میں انٹرنیشنل پریس انسٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام کوالالمپور، ملائیشیا میں منعقد ہونے والے مدیروں کے سیمینار میں شرکت کی۔ میجر کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے سیکریٹری رہے۔ ۱۹۷۸ء میں نیشنل کونسل آف آرٹس' راولپنڈی کے ڈائریکٹر تھے اور اُن کی رہائش سابق فری میسن ہال،

راولپنڈی، صدر میں تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد امریکا چلے گئے اور ''ریڈرز ڈائجسٹ'' کے ساتھ منسلک رہے۔ ٹیری ٹاؤن، نیویارک میں انتقال ہوا اور وہیں تدفین ہوئی۔

اوّلین معلومہ اردو افسانہ:

''ہی اینڈ شی'' ''مطبوعہ'' 'ہمایوں' لاہور۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

۱۔ چاک گریباں۔ (آٹھ افسانے) مکتبہ جدید لاہور طبع اوّل: اگست ۱۹۴۸ء

(۱) تعجب (۲) بڑے میاں سو بڑے میاں (۳) فرار (۴) زندگی کی شام (۵) میری سالیاں (۶) طلبہ کی فریاد (۷) ایک خط جو سنسر ہو گیا (۸) محبت مسبب

۲۔ ''لب گویا'' (بیس افسانے) گوشۂ ادب' لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۶ء

(۱) کبو (۲) برقع گرا پارٹی (۳) زنانہ کلب (۴) بیوگی (۵) کوڑے کے ڈھیر پر (۶) غلام زہرہ مذروب (۷) دل کی بستی عجیب بستی ہے (۸) شاپ لفٹنگ (۹) شہسوار (۱۰) ہم بدلے نہ وہ بدلے (۱۲) دستر خوان ۱۳) سبز پوش (۱۴) مسیحائی (۱۵) روح کا بوجھ (۱۶) رات والے (۱۷) جستجوئے جمال (۱۸) وہ زندگی کی بات تھی (۱۹) چارلس ہیجزا (۲۰) چال چلن

۳۔ ''اڑن طشتریاں'' (۵ ڈرامے ایک سفرنامہ اور بارہ افسانے) گوشۂ ادب' لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۸ء

(۱) باجی ولایت (۲) قصر شیخ (۳) غرارہ (۴) یگانہ غم (۵) مواد (۶) گریز (۷) الائچیاں اور لونگ (۸) حب کا تعویز (۹) ممی (۱۰) چوہے نرم رو (۱۱) پرنس تلی (۱۲) حویلی

۴۔ ''پھول کی کوئی قیمت نہیں'' (تیرہ افسانے ث) فیروز سنز' لمیٹڈ لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۶ء

(۱) چٹھی رساں (۲) جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی (۳) پھول کی کوئی قیمت نہیں (۴) بادِ صحرا (۵) مرد کا فولاد (۶) واردات (۷) لکڑی والا (۸) نہ آئیں تم کو محبتیں کرنیں (۹) کڑوی بیل (۱۰) چھجے والا مکان (۱۱) خیری مہری (۱۲) نیا پاکستان (۱۳) سروے۔

۵۔ ''بڑا صاحب'' (تین ایکٹ کا ڈراما) مینارِ ادب لاہور طبع اوّل: ۱۹۶۰ء

۶۔ ''سیز فائیر'' (ڈراما) مینارِ ادب لاہور طبع اوّل: ۱۹۴۸ء

۷۔ ''حوا کی بیٹی'' (ناول) مکتبہ علم و ادب' راولپنڈی طبع اوّل: ۱۹۷۴ء

۸۔ ''کہانی بولتی ہے'' (افسانے) فیروز سنز لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۹ء

غیر مدوّن:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ آغا بابر نے ولیم شیکسپئر کے ڈراما ''A Mid Summer Night'' کا ترجمہ ''سردیوں کی ایک رات'' کے عنوان سے اوپن ایئر تھیٹر راول پنڈی صدر کے لیے ۱۹۶۵ء میں کیا۔ افسانہ ''تلاش'' (انتخاب ''ماہ نو'' ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۵ء) ''خالہ تاج'' مطبوعہ ''سیپ'' کراچی جولائی ۱۹۷۰ء ''پھیلتا ہوا کاجل'' مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور جنوری ۱۹۷۷ء ''نسوانی آواز'' مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور ستمبر ۱۹۸۶ء ''خدوخال'' مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور دسمبر ۱۹۸۷ء اور ڈراما ''آخری شب عرف میرجی کی موت'' مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور دسمبر ۱۹۸۶ء کسی کتاب میں شامل نہیں۔ اُن کی آپ بیتی کے کئی ابواب ''ادبیات'' اسلام آباد اور ''علامت'' لاہور میں شائع ہوئے جو ''خدوخال'' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔

''ناٹک سے وابستگی'' (ڈراما کی تاریخ) اور ''آخرشب عرف میراجی کی موت'' چار ایکٹ کا اسٹیج ڈراما تا حال کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

۱۵۔ ہارلے سٹریٹ، راولپنڈی (صدر) پاکستان۔

نظریۂ فن:

''میں جب کوئی افسانہ لکھتا ہوں تو سب سے پہلے اس کا اختتام میرے ذہن میں آتا ہے۔ پھر کردار اور باقی تفاصیل اور اس طرح میرے لیے افسانے کی عمارت کو کھڑا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

آغا بابر

(بہ حوالہ ''نیشن'' لاہور مارچ 1991)



حوالہ جات:

۱۔ کچھ کتب میں تاریخ پیدائش ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء درج ہے جو درست نہیں ۱۹۱۹ء سے متعلق تاریخ پیدائش خود انہوں نے مجھے فراہم کی تھی۔

گلاب دین چٹھی رساں

آغا بابر

پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدلے گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا ''گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے؟''

''بھئی اس کی بدلی ہیرا منڈی ہوگئی ہے۔''

کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا ''سوں رب دی؟''

اکرام بولا ''سوں رب دی۔'' اور اس نے بھانڈ کی چپڑ اس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے

''اس کا کیا مطلب ہوا جی؟ رزق دینے والا تو خدا ہوتا ہے مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے۔ میں تو بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔ افسروں کو کچھ خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔'' گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اس کے ذمے ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اسی کے ایما سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلادالنبی کے موقع پر محلے کے لڑکے بالے اس کی ہدایت کے مطابق خوبصورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ دیندار لوگوں کی صحبت سے مسئلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی بنا پر اپنے پرائے بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا، ہیرا منڈی میں خط بانٹنے جائے گا۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آواز دے گا 'بی بی جی خط آیا۔ غلیظ گلیوں میں جا کر پیشہ وروں کو ان کے یاروں کے خط دے گا' جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس پر ختم ہو گے؛ جن کا مضمون صرف بدکاری ہوگا۔ کسی خط میں

ماں کی مامتا نہ ہوگی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہوگا۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہوگا اور باپ کی نگاہوں میں بے غیرتی بے شرمی بے حیائی۔۔۔وہ بُڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا ''گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے؟''

سپروائزر بولا ''آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منٹ کے لیے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔''

''بلاؤ''

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔ وہ شاید تازہ تازہ وضو کر کے دعا مانگ کر آیا تھا۔

''کیا بات ہے گلاب دین؟''

''جی' میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرا منڈی کر دی گئی ہے۔۔۔۔۔''

''تو پھر''

'جی'' ذرا خیال فرمایئے میں پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار آدمی ہوں۔ میری بڑی بے عزتی ہوگی۔''

اس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خاکی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا ''حضور' جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے وہ بدکاری کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو خط تقسیم کرے گا؟ استغفراللہ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا' جناب۔ میری گزارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔''

پوسٹ ماسٹر نے پیپر ویٹ کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا ''تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے؟''

''آپ کے بچے جیتے رہیں۔ یہی کمترین کا مطلب تھا۔''

'سرِ دست یہ مشکل ہے۔ غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھ لیتے ہیں۔ مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔''

گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین' دونوں چٹھی رساں پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نوگزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھانٹا اور بولا ''دیوی گلاب دین آ۔ ادھر سے شروع کریں'' وہ دائیں ہاتھ کو گھوم گیا۔ ''وہی'' یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے۔ ادھر سب گانے والیاں رہتی ہیں۔''

پھاٹک کے سامنے چارپائی بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مکان کے پختہ تجاوز پر ایک عورت کندھے پر تولیہ ڈالے گیلے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی۔ دوپٹہ نہ ہونے کی وجہ سے گلاب دین کو وہ بہت بے شرم دکھائی دی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ۔۔۔اس کا جی چاہا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپا لیا۔

''کل سے میری جگہ یہ چٹھیاں تقسیم کیا کریں گے۔''

''ہیں یہ نیا چٹھی رساں لگ گیا؟''

''جی ہاں''

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتوں کو پٹاخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا' پھر گلاب دین کی طرف نگاہ پھرائی۔ دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصہ اس کے بھاری جثے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنا اٹھا کر لٹھے کی چادر کو چٹوں میں دے لیا اور پھر آسودگی سے بیٹھ گیا۔ اس کی پنڈلیوں پر منڈے ہوئے بالوں کا کھردرا اغبار پھیلا ہوا تھا۔

''منشی ہوراں کا نام کیا ہے؟'' نوجوان چھوکرے نے پوچھا۔

سراج نے جواب دیا'' گلاب دین۔''

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا'' اورانجا پھل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا۔''

''وے' شرم نہیں آتی تجھے؟ سلام دعا لینے کی بجائے مسخریاں کرنے لگا۔'' تجاوز پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں کٹہرے پر اٹھا کر رکھا تھا' جس سے اس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

''ادب بی بی' اپنی شلوار جا کے سیو پہلے۔''

اس نے اپنا پاؤں کٹہرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی'' فٹے منہ' بے شرما۔''

مونچھوں والے نے ڈبیا اٹھا کر گلاب دین سے کہا'' سگرٹ پیو' مولبی جی۔''

گلاب دین بولا'' جی نہیں۔ مہربانی۔''

سراج نے سگریٹ لگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا۔

''یہ مونچھوں والا کون ہے؟''

''اس گلی کا چودھری۔''

''اور لچر سا چھوکرا؟''

''یہ بلو کے چاچے کا لڑکا ہے۔ یہ بلو ہی تو تھی، ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔ یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے' اور اوپر چوبارے میں گگ رہتی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈاک میں سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا' جس پر سرنامہ لکھا تھا زمرد سلطانہ عرف گگ۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر گلیارے میں آ پہنچے۔ بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا؟؟ چٹھی لے لو جی'' ایک خشگنی سے عورت نے آ کر خط اٹھا لیا۔

سراج بولا'' بی بی جی' کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے۔''

''اچھا منشی'' اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی'' گگ جی' چٹھی آئی ہے۔''

واپسی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ لچر سا لڑکا اسے پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون گزر گیا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔ سراج کہہ رہا تھا'' یہ نکا پان والا ہے۔ یہ شہابے کی دکان ہے۔ شہابے کے پان ساری ہیرا منڈی میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے۔ دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہابا اس وقت سویا ہوا ہوگا۔ شام کو بیٹھے گا۔ پان سگرٹ کی دکانیں دلالی کے اڈے ہیں' مولوی جی۔''

اس وقت گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے یوں براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا "خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔"

"بازار میں یہ لوگ، جو ہم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں، یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔"

ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خطوں کو پھر چھانٹا "اس گلی میں پیشہ کمانے والی بیٹھتی ہیں۔" سراج نے بغیر کسی جذبے کے کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس گلی میں سے سڑے ہوئے خربوزوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا اور عاجزی سے بولا "اس گلی میں جانا ضروری ہے؟"

"صرف ایک خط ہے۔"

"کس کا؟"

"کنجروں کے چودھری حاقو کا۔ اس گلی کی بہت کم چٹھیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے۔"

چودھری کی خضاب لگی ڈاڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اس کی پنڈلیاں سونت رہا تھا۔ قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔

"کدھر ماشٹر؟" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھری آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کیے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی "میاں مٹھو، چوری کھانی ہے؟"

گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرا لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کر بولی "منشی جی، ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی؟"

سراج نے جب نفی میں سر ہلایا تو بولی "ہائے، ہمیں کوئی چٹھی نہیں لکھتا۔"

دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے، سینہ اکڑائے ایک عورت کھڑی تھی۔ بولی "یاروں پٹی، اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے۔"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ بہت سے تماشبین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔"

گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماشبین، جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے، اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا، پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے یاد آیا کہ اس نے تماشبینوں کے ریلے میں ایک ڈاڑھی والے کو بھی دیکھا تھا؟ جس نے ماتھے پر ہار لپٹا ہوا تھا اور پھر کنجروں کے چودھری کی خضاب رنگی بھرویں ڈاڑھی اسے یاد آئی۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش اس کی نون تیل کی دکان ہوتی۔ آرام سے بیٹھا دکان کرتا۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینما کے قریب کا ماحول اسے کچھ مختلف لگا۔ اس کا جی چاہا سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تا کہ اس کے اعصاب پر سے کھچاؤ دور ہو جائے۔

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''کیوں منشی جی' تھک گئے؟''

''نہیں تو۔''

''بس یہ دو چٹھیاں اور بانٹنی ہیں۔''

یہ کہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیے۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لتے' کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر اس کے باوضو ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا' جس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی اور جو خالی پڑی تھی۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ سامنے لہسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ زمین پر چوکی بچھائے ایک چھوٹی سی لڑکی الگ بیٹھی لہسن چھیل رہی تھی۔ سراج نے گلاب دین کے کان میں کہا' یہ بدرو اور قدرو کا مکان ہے اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھمی ڈاک میں سے ایک خط جس پر بدر النسا کا نام لکھا تھا' نکال لیا۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

سراج بولا ''خط آیا' جی۔''

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں۔ سراج نے خط دینے کے لیے گلاب دین کو آگے دھکیلا۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا۔ بدر النسا خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے دو بھاری بھرکم آدمی داخل ہوئے۔ سراج بولا ''لو استاد ہوری بھی آ گئے۔ منشی جی استاد نور دین کی چٹھی دیکھنا۔''

گلاب دین خط چھانٹنے لگا کہ بدر النسا خوشی سے چلائی ''آپا کے کاکی ہوئی۔'' دونوں لڑکیاں بدر النسا کے پیچھے بھاگ گئیں۔

استاد نور الدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا: ''او حیوانو! شیطانو! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ۔''

برآمدے میں لٹکی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی: ''استاد جی' قمر کے کاکی ہوئی ہے۔''

''نصیبوں والی ہو۔ مبارکاں ہوں' اماں جی۔''

''آپ کو بھی ہوں۔ اری لڑکیو' چٹھی رساں کا منہ میٹھا کر دو۔''

استاد بولا ''ایک چٹھی رساں نہیں' دو ہیں۔''

سراج مسکرا کر بولا ''استاد جی' آپ بڑے جگتی ہیں۔ ۔ اپنا خط بھی لیا کہ نہیں؟''

گلاب دین نے نور الدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دوسرا بھاری بھرکم آدمی بولا ''آج آپ۔۔۔۔۔''

سراج نے کہا ''آج میرا آخری دن ہے۔ کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے۔''

سراج کے ہاتھ میں قدرو نے آ کر دو روپے دے دیے۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر جگت کی بڑی قسموں والے ہو۔ کنجروں کے گھر سے پہلے دن ہی بونی کر چلے ہو۔''

بدرو بولی' مسخریاں چھوڑ' استاد جی۔ باہر جا کے اپے ہوروں کو دیکھو اور کہو' گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔''

بازار میں پہنچ کر سراج نے لوہے کے جنگلے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہاں بیگماں رہتی ہے۔ وہ ساتھ والا مکان بکھو، کا ہے اس کے پیچھے وہ جو بیٹھک نظر آتی ہے' وہ استاد نور الدین کی ہے۔ اسے بدر نگلے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ دیکھنا تو ایک چٹھی

مشتری کی بھی تھی۔"

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا "ہاں"

"یہ گھر زہرہ و مشتری کا ہے۔" یہ کہہ کہ وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوگیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ لیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے کولہوں پر سے قمیص ہٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا جیسے کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔

سراج نے کھانس کر کہا "چٹھی رساں آیا۔"

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے کے لیے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے۔ جس نے ناک میں نتھنی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جا رہی تھی "آ" ۔۔۔ اسی طرح پھر کہے جا رہی تھی ۔۔۔ جا ۔۔۔

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس نے ایک روپیہ زبردستی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا "بزرگو! یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ روپیہ کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں' کل دوسرے کی جیب میں۔ پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے۔"

گلاب دین کو وہ نتھلی والی لڑکی یاد آ گئی جسے پہلا سبق یہی دیا جا رہا تھا ۔۔۔ آ ۔۔۔ جا ۔۔۔ پھر آ ۔۔۔ پھر جا ۔۔۔ "یہ اب کدھر کو؟" گلاب دین نے سراج کو اب ایک تیسری گلی میں گھستے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ "ہمیں کس بھڑوے کا ڈر ہے' منشی جی؟ ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھر پائے۔"

اس گلی میں کچے گوشت کی بساندھ آ رہی تھی' جیسی بیف مارکیٹ سے آتی ہے دو رویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتیں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بے باکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بے ہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اوپر چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کر رہی تھیں۔

سراج بولا "یہاں سب درڑ مال ہے۔" نصف گلی میں پہنچ کر اس نے کہا "منشی جی' فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا۔ اسے دے دو۔"

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا' جس کے پاس سے اسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے بہت سے تماشبین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کر رہے تھے۔ جس نے تہبند باندھ رکھا تھا' کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کر علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔ "یہ خانگی ذات کی مسلن ہے۔"

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے بڑبڑا کر پوچھا "ان خانگیوں کی کتنی تعداد ہوگی؟"

"کوئی گنتی شمار نہیں۔ خانگیاں نہیں کہتے انہیں' مولوی' مولوی جی۔ یہ کنجریاں ہیں۔ نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں۔"

"خوک" گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا۔

ڈاک تقسیم کرنے کے دو وقت تھے۔ ایک دوپہر' ایک سہ پہر۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا۔ چاروں طرف چٹھیاں

بانٹنے جانا پڑتا۔ اس بات کا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہ دے سکا۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے اسی طرح رہنے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس دے دے گا۔ مگر اسے ادھر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اس نے سوچا کسی روز ان کی چٹھی دینے جائے گا، تو روپیہ بھی واپس کر دے گا۔ مگر چٹھی ہی نہ آئی۔ جس دن آئی اس سے دو روز پہلے اس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگا لیا تھا۔

بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی تھیں۔ گاؤ تکیے پر ان کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ پاس ان کا باپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اسے دیکھتے ہی بولی ''چٹھی رساں آیا۔''

گلاب دین نے ڈاک چھانٹ کر تین لفافے اسے پکڑا دیئے۔ اس کا باپ بولا ''آؤ منشی جی، جی آیا نوں۔ لڑکیاں روز کہتی تھیں، چٹھی نہیں آئی۔ نئے منشی جی لگے ہیں۔ کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں۔''

گلاب دین بولا ''جی نہیں۔ آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔''

''میری بات کا خیال نہ کریں۔ آدمی بندہ بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام بدرالنساء اور قدرالنساء ہے۔ تیسری قمرالنساء کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔''

قدرالنساء چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی ''ابا یہی تو اس روز کا کی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے۔''

''بڑے مبارک قدم ہیں آپ، منشی جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر تو لکھ دیں۔'' اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا، بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دی اور حقہ اس کی طرف موڑ کر نوکر سے کہنے لگا ''ادئے، منشی جی کے لیے لسی لا۔''

''جی نہیں تکلیف نہ کریں۔''

''تکلیف کس بات کی، بھئی۔ گھر کی لسی ہے۔''

''کوئی لویرا ہے؟''

''بھینس ہے، منشی جی۔''

بدرالنساء بولی ''ہمارا گھرانہ تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔''

گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بدرو کا باپ بولا ''ہم کوئی ایسے ویسے نہیں۔ بڑے خاندانی کنجر ہیں۔'' پھر اس نے قمرالنساء کے نام منی آرڈر لکھانا شروع کر دیا۔ جب آخری خانہ آیا تو بولا ''یہ دو سو روپیہ تمہیں کا کی کی چوسنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تمہاری اماں کی طبیعت اچھی نہیں جوں ہی اچھی ہوئی، تمہیں ملنے آ جائے گی۔

لسی کے شکریے کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا ''کیا تکلیف ہے گھر میں؟'' چکر آتے ہیں۔ ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا منشی جی۔''

گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا ''منشی جی، جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہے کرے، بلا تکلف چلے آیا کریں۔''

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو

رہتی تھیں، ان کی پردادی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہر النساء کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔ گزشتہ روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہر النساء کو کس کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول ان کے تھنی پہنے ہوئے موٹی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدرو اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام قیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا، اچھا کھاتا، اچھا پہنتا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ ومشتری کے گھر موٹے موٹے چوتڑوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی وہ زہرہ ومشتری کی سوتیلی بہن ہے، جسے افیون کھانے کی علت ہے اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ ومشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اس لیے حامی نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چمکے، دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات کو ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور ہارنے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔

جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں، رات کو انہیں مکانوں کے دروازے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پراسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دن تھکا ہوا تھا۔ پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی عبدالکریم کے گھر کی لسی پینے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا، وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی "جانی، تجھے چٹھی رساں......"

"جا، نی گشتیے، تجھے چٹھی رساں......" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب رنڈیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین بغیر چٹھیاں بانٹے گلی میں سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا جو اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا "خیر ہے؟ آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔"

گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاتو کے پاس لے گیا، جس نے اللہ رکھی مسلن کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا، "دیکھو، منشی جی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا نا کہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو چکر یں کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلابو سے کہتی "نی تیرا خصم غلاب دین آیا ای۔" مجھ سے یہ شکایت دوسری رنڈیوں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کا پہلے ہی بڑا خیال ہے، منشی جی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے، وہ یہ کہ گلیوں میں سے آپ مردوں کی طرح گزرا کریں۔ کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا اسرا گل ہو کر رہنا چاہیے۔"

جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا "میرا خیال ہے،

رانا ہوری آئے ہیں۔''

بیٹھک میں خستہ صوفے پر، جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا، رانا صاحب بیٹھے تھے۔ صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور مہرو ایرانی سلک کے تھان کو اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلتے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آ کر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔

رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکیے پر بیٹھ گیا اور مہرو سے بولا ''منجے سے کہو منشی کو لسی پلائے۔''

بدرو بولی'' وہ بازار گیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا پھر پراسرار طریقے سے آہستہ سے بولی'' آپ ابھی جائیں مت۔''

وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار کو ہاتھوں میں سنبھالتی ناپ کر برآمدے میں پہنچی۔ وہاں سے بیٹھک میں آ کر رانا سے بولی'' اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے ہیں۔''

پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی'' منشی جی کہتے ہیں بھینس کا مالک کہتا ہے، لینا ہے تو دو دن میں آ کر اپنا مال لے جائیں۔''

باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا'' یہ دونوں بہنیں باری باری لسی بلوتی ہیں۔ اصل میں رانا جی، اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ روز کہتی تھیں ابا، نئی لے دو۔''

رانا مہین سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا'' تو لے لو نا۔ کتنے میں دیتا ہے؟''

''کیوں ابا جی، آٹھ سو مانگتا ہے؟''

''ہاں پتر۔''

''کل مجھ سے چیک لے لینا۔'' رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔

بدرو نے چونچا پن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا'' اچھا منشی جی، آپ اب جائیں۔ ڈوگر سے کہہ دیں، ابا جی آ کر بھینس لے جائیں گے۔''

بھینس؟ کیسی بھینس؟ وہ سوچنے لگا۔

اس نے باہر نکلتے ہی پنواڑی سے پوچھا'' یہ رانا ہوری کون ہیں؟''

''جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا، اس کا منشی ہے۔ کوئٹے سے آیا ہے۔ بھولے نہ بنو منشی جی۔ مال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہوگئی ہے۔ بڑا استراگل آدمی ہے۔''

استراگل کیا ہوتا ہے؟ وہ سوچتا ہوا نوگزے کی قبر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز اسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے شیو بنوا رہا تھا۔ دوسری پر چائے کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ ان کا ملازم گنجا برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی تہبند کو سمیٹے منڈی ہوئی پنڈلیاں ننگی کیے اس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرو اور مہرو گاؤ تکیو پر بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں۔

''چودھری ہوری ہیں گھر؟''

''نہیں منشی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی؟'' مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اسے پر لگ گئے ہوں۔

''تیری چٹھی کہاں سے آئے گی گشتیے'' قدرو نے جھٹ سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی۔ جس نے نہایت خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے رانا پر چھڑکی اور بولی ''منشی جی، کوئٹے کی سوغات لیتے جائیے۔ یہ چار سیئو زہرہ مشتری کے گھر دیتے جائیں اور یہ دو آپ کا حصہ۔''

بدرو نے ایک پٹھو میں سے چھ سرخ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیے جو اس نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں اڑس لیے اور لمبے لمبے سانسوں سے خوشبو کی لپٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بیٹھیں رمی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیئے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا ''منشی جی، دیگ چڑھی ہے ان کے گھر؟'' زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں نے نہیں دیکھی'' گلاب دین نے جواب دیا۔

برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے تو بڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑ لی۔

اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدرو یا قدرو کی چٹھی ملے تاکہ آج پھر ادھر کا پھیرا رہے۔

سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں ان کی بہن سے چہلیں کر رہا تھا جو اسے اپنی جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔

ادھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے۔ ادھر بھینس کی چٹکی لے رہا ہے۔ رانا استراگل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر! گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا، پنواڑی کی دکان اس کے سامنے ہے، اسی سے تصدیق کرنی چاہیے۔

پنواڑی بولا ''جو تم نے سنا ہے، ٹھیک ہے۔ رانا تو مہرو کے لیے تیار تھا۔ مگر بدرو کی ماں نہیں مانی۔''

گلاب دین نے پوچھا ''عبدالکریم اور قیم راضی تھے؟''

''قیم تو سردائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا'' پنواڑی مسکرا کر بولا ''جس کا مال اس کا گال منشی جی۔''

خوبصورتی کس طرح بیچی جا سکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جاتا، بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چٹھیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا ''کسی روز آنا۔ ہمارے گھر جلسہ ہونے والا ہے۔''

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آ گیا۔ گلاب دین نے پڑھا۔ رانا حیات بخش نے کوئٹے سے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا جلسے کے لیے روپیہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لینا۔

وہ چق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر لیٹی سگریٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی ''شکر ہے آپ بھی آئے، منشی جی۔''

''کوئی خط ہی نہیں تھا......''

''خط نہ ہوتو کیا آنا چھوڑ دینا تھا۔ ابے ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔''

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

''اب منشی جی، آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی اندر سے حقہ اٹھالا۔''

مہرو نے حقہ لاکر باپ کے پاس رکھ دیا جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا مسالا لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عبدالکریم نے کہا'' ہم قمرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ قیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں گے۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔''

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویز پیش کرتی رہیں۔ مہرو کچے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی۔ گلاب دین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی پنسل کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔

''اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ؟''

قدرو نے کہا'' ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے، اور بہت آدمیوں کے لیے پکتا ہے۔ اس میں ڈالا جاتا ہے۔''

بدرو بولی'' ہم دن بھر کیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔'' مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لیے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

''اللہ خیر رکھے۔ اب اتوار کو دیکھ لینا نا۔'' عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول، خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ عبدالکریم کے کہنے پر گنجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بدرو قدرو اور مہرو تینوں بہنیں بنی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی'' ابا جی، ہم تو بلا وادے آئے ہیں۔''

آج بدرو معمول سے زیادہ پتلی اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی۔ اور مہرو پر بہار شباب کی رنگینیاں لیے ان کے ہمرکاب اس طرح تھی۔ جیسے ڈھلی نکھری بدلیوں کے ہمرکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا'' منشی جی، آپ کوئی اوپرے تو نہیں۔ ہمارے گھروں میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اول تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہ اوڑس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔''

''حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے، قدر پتر؟''

قدرو نے کہا بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید۔ کیوں ابا جی؟''

''کچھ نہیں پتر، منشی جی کو سگرٹ دو۔''

قدرو نے سگریٹ کی ڈبیا منشی جی کے آگے کر دی جس میں گلاب دین نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔

''بس آپ ڈاک بانٹ کر سیدھے ادھر ہی آجائیں۔''

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑھ دیا اور اتوار کی صبح کو اس کے دو ساتھیوں نے آ کر کام سنبھال لیا۔ جاوتری، لونگ، دارچینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیگوں میں بڑا کفگیر گڑ گڑ بجنے لگا۔

گلاب دین پیدائشی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نورالدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بٹھا دیا۔

بدرو کے سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا دیں۔ قیم اور اس کے دو ... وں نے گاؤ تکیے لگا دیے۔ پھر آتشدان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا "آپا پدرو، ٹھیک ہے؟"

اس نے کہا "ہاں۔ جیتے رہو۔ ٹھیک ہے۔"

"آپا، سگرٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔" بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ادھر غائب ہوئی، یہ قدرو کو لے آیا اور بولا "بی بی، ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا؟"

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا "ٹھیک ہے۔"

"بی بی سگرٹ کے لیے کچھ پیسے دے دو۔" اس سے بھی دس روپے کا نوٹ ہتھیا لیا۔

دوپہر ہوئی تو طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگرٹ لیے ہوئے، چھالیہ چباتیں، سرگوشیاں کرتیں، رنگا رنگ آوازیں، رنگا رنگ لباس، گورے چہرے، سنولائے چہرے، بھرے سینے، پتلی کمریں، دلبری کی تمام ادائیں اور غمزے، ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے۔ کچھ جوان، کچھ سرشار، کچھ ادھیڑ۔ دالان جیسے قمریوں اور کبوتریوں کی غرغوں سے چہک اٹھا۔ نور پلاؤ شیرمال اور قورمہ برتایا گیا۔ ایک آتا ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبیوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجومِ دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے، اوپر کی اوپر۔

مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگرٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور مجوے سنبھالنے لگا "پتا نہیں، اپنے چٹھی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟"

استاد نورالدین بولا "بی بی نے چاول دیے تھے۔"

برآمدے میں سے بدرو بولی "میں نے دیے تھے، ابا جی۔"

"ہمارے لیے ہمیشہ اچھی خبریں لاتا ہے۔"

رات کو جب گلاب دین پہنچا، مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلمے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ نگ نے چوڑی دار پاجامے پر گھیردار قمیض پہن رکھی تھی، جسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیص کی گوٹ کے بادلے جھلمل جھلمل کرتے۔ ریشمی غرارے میں مشتری کے سرین چکی کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈے لیے گئے ہیں۔ مشتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آجا کا سبق لے رہی تھی۔ آج پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا۔ پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے، اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھیں۔ شعلہ جوالا بنی ادھر سے ادھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلو پھلجھڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دو پٹاخے باندھ رکھے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے۔ مہتابی، انار، پوپٹ، گولہ۔ لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔ تمام بجلیاں آج بدرو کے حصے میں آ گئی تھیں جس کی لم جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابریشمی پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدرو ہونٹ بھینچ بھینچ کر

باتیں کرتی تو اس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بلوریں شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔

مہرو مہرو ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کی دنبالہ دار آنکھوں میں اتنی گھلاوٹ کہاں سے آ گئی تھی۔ چوکڑیاں بھرتی پھر رہی تھی۔ تنگ لباس میں اس کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی سی ننھی اس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کہے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔ سرو قد لڑکی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو قوس بنا کر سب کو آداب کیا۔

دالان کی دہلیز پر بیٹھے گلاب دین نے پوچھا ''قیم جی، یہ لڑکی کون ہے؟''

وہ اینڈتے ہوئے بولا ''شمو میری پھوپھی کی لڑکی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں ہے۔''

گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔

سرِ راہ کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔ رنگا رنگ ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے پھولوں کا گلدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ خارِ گل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالینوں پر آ بیٹھے۔ سب سے پہلے آہوئے رم خوردہ مشتری کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھایا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شور مچا ''بدرو، بدرو۔''

بدرو نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اٹھایا، مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی کی کریز کو چٹکیوں میں تھام کر پائچے سنبھالتی بیچ میں آ بیٹھی۔ گلاب دین دہلیز پر اور اونچا ہو گیا۔ اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یاالٰہی! بدرو کی آواز کا لہرا تھا یا رم جھم۔ ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا 'کتنے کا ہے؟''

''دس کا۔''

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا بدرو کے اعضا میں یہ لچکیلا پن کہاں سے اترا آ رہا ہے اس کی آواز نکھرتی جا رہی تھی۔ ایک نوٹ، دو نوٹ، تین، چار، پانچ۔۔

''یہ کون لوگ ہیں؟''

''اپنے اپنے ملاقاتی ہیں۔ اپنی والیوں کو سلامیاں دے رہے ہیں۔''

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا، پھر شمو نے، پھر خواجہ صاحب نے، پھر شمو نے۔ سب ہنسنے لگے۔

بدرو دو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اب گگ جی سے فرمائش ہوئی۔ گگ نے پکے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنگالا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ گگ نے جوش میں آ کر گھنگھرو باندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اس نے بتاوے دے دے کر کس کس حسن ادائیگی سے زاہد و محتسب کی چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے

کر کو لپکا دے دے کر میکدے کے دروازے پر دستک دی کہ محفل کی محفل تڑپ اٹھی۔ قدرو نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی ''گگ جی زندہ باد۔''

ایک کونے سے آواز آئی ''ڈھولک لے بلو'' نے چونکتے ہوکر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بلو کے ملاقاتی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا' تیرا نیازمند ادھر بیٹھا ہے۔ بلو مسکرا دی، مہرو نے ڈھولک لا کر بلو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کو خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا بجی' وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض مہمان صوفوں سے اتر کر قالینوں پر آ بیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے' تھاپ دینے لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنے لگے۔ چکر پھیریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا ''شاباش ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔'' ان صاحب نے قدرو کے گھنگھرو باندھ دیے اور استاد کو اشارہ کیا، طبلے پر ہاتھ پڑا' تھا، قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی پنکھڑیوں کو بیچ کر کلائی پر کلائی سے گرہ باندھی۔ ایڑھی ٹھمکی۔ آنکھوں میں رس اترا۔ پلکوں کا ریشمی تناؤ ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آ گئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دین کے سینے میں اب کوئی رکی پری سانس باقی نہ تھی۔ وہ مجسم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی یہ قدرو تھی۔ اس کے پاؤں تھے' یا خط چھانٹنے کی خودکار مشین، بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ملازم محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینیوں میں رکھے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگرٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگا رنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ عبدالکریم اس کے پاس سے گزرتے گزرتے کہہ گیا ''ابھی جانا مت۔''

رات بہت بیت چکی تھی۔ اس نے دو چار جمائیاں بھی لی تھیں' مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے بدن میں پھر چستی پیدا کر دی تھی، ابھی اس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ لیا۔ وہ پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ شمو کی بلوری انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اس کے گلے میں سے نور کی آواز نکل رہی تھی۔ ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس سبکی اور آہستگی سے انہیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ واہ ہونے لگتی۔

اس کے بعد مشتری آئی۔ چہرے پر اک سلونا پن اور ان کہے خیالوں کو جھلملاہٹ۔ ناک میں فیروزے کی کیل، ہاتھ میں فیروزے انگوٹھی۔۔ اونچی کرتی کے نیچے گول گول رانوں کو غرارے میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اٹھی ''پنجابی''۔ اس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرے پنجابی گیت کی فرمائشیں جب پوری ہو چکیں تو بدرو اور گگ نے کہا ''آپا فیروزاں۔''

فیروزاں نے سگرٹ کا ایک بھرپور کش لے کے اسے مسل ڈالا۔ پھر اپنے لب لعلیں پر زبان پھیر کر خنجر خونچکاں کو آب دی اور سڈول کلائیوں میں چوڑیوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص حمکنت' وقار اور اعتماد تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی وقت میں بڑی بانکی عورت رہی ہوگی۔

کسی نے کہا ''مرزا صاحباں'' اس نے اس طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر کہا ''اچھا۔''

رات کے سناٹے میں اس کی کھرج دار آواز بلندیوں کی خبر لانے لگی۔ جب مرزا کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی تانیں اڑانے لگی' جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل

جائیں۔ صاحبان کے بول گاتے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ نوٹ کھینچتی جاتی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔

ایک نکہتِ بہار تھی جو ستاروں کی جھلملاتی روشنیوں کے ہمرکاب گزر گئی۔ مولوی گلاب دین اذان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان میں سے اٹھا اور حوض کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اسے بڑا لطف آیا، خدا کے اس وسیع وعریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگیٔ دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہو گیا۔ اس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دوپہر کو بانٹ دی، دو چٹھیاں جو اس طرف کی تھی ان کو رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

''آؤ منشی جی' کیا حال ہے؟''

''میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔''

''برا حال تھا ہمارا۔ لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں' اچھی رونق رہی' منشی جی؟ عبدالکریم نے کہا۔

''او جی رونق کمال ہو گیا۔ گگ جی نے تو حد کر دی۔''

''ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی۔ چار سو ہو گیا اسے۔ لڑکیوں کو اپنے ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی۔ بہت کچھ لے کر آئی تھی۔

''پھر؟''

''پھر یہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔''

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی ''جو اللہ کو منظور ہے۔''

پندرہ روز تک تینوں کی ہمہ وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا' جاتا تھا۔ گنجے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استاد دوں نے بقچے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر دس دن کے لیے بری امام کے میلے پر چلے گئے۔

عبدالکریم کو ان کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقے نے منہ میں سے نکال کر بولا ''تم سے کون سا پردہ ہے' پڑھ کر بھی سنا دو۔''

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ پنڈی پہنچ کر حیرت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں' جہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرا مل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلہ کیسا جائے گا۔ ویسے میلہ بہت بھر رہا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آئی ہیں۔ کچھ ابھی آ رہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ فقط' آپ کی بیٹی بدر۔

دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر روانہ کر رہے ہیں۔ ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوا لیں صوفوں کے سپرنگ بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں' وہ بھی ٹھیک کرا لیں بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں۔ پردے بھی نئے ڈلوا لیں۔ سستی نہ کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مہرو پر ایک گڑ پٹھان عاشق ہو گیا ہے۔ آپ نتھ اتروائی اس سے جو مانگیں گے' دے گا۔ میں نے اور قدرو نے کہا، یہ پردیس ہے آپ

لاہور آ کر ہمارے مہمان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے پلائے گا۔ قدرو نے کہا جو آپ کہیں۔ بولا استاد جی ہم کو بس شربتِ وصال پلا دو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استاد جی نے کہا' خان صاحب آپ آئیں تو ہم آپ کو شربتِ وصال کے کنویں میں ڈبکیاں دیں گے' غوطے کھلائیں گے۔ مہرو کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے۔ صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ مہرو بھی اس سے بڑے نخرے کروا رہی ہے۔ گگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دی تھیں۔

عبدالکریم نے خط ختم کر اطمینان کا سانس لیا اور بولا'' گلاب دینا' خدا ایسی بیٹیاں سب کو دے۔ انہوں نے باپ کو بڑی بڑی رقمیں لا کر دی ہیں اور اس پر ان کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے مہرو بھی کماؤ ہو جائے گی۔ پھر ایک جلسہ کریں گے۔''

جب عبدالکریم نے چار ہزار کے بنک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر نیم چھتی سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرا دی گئی۔ سارا گھر اجلا ہو گیا۔

لڑکیاں انیس کی صبح کو آ رہی تھیں اور انیس کو ہی پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔

سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا'' گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔''

'' کیا عرض کرنا چاہتا ہے' یہ ہر سال؟ بلا'' پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا'' یہ تمہاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو''

'' حضور' میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے۔۔۔''

پوسٹ ماسٹر نے فائل پرے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا اور بولا'' کیا کہا؟''

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی' لمبی سی ٹھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا۔

O

محمد خالد اختر

نام : محمد خالد اختر۔
قلمی نام : محمد خالد اختر۔
پیدائش : ۲۳ جنوری ۱۹۱۹ء بہ مقام الہ آباد، بہاول پور (۱)
وفات : ۲ فروری ۲۰۰۲ء بہ مقام: کراچی، پاکستان۔
تعلیم : بی۔اے۔بی ایس سی (الیکٹریکل انجینئرنگ)

بہاول نگر اور بہاول پور میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء تعلیم پائی۔ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور سے ۱۹۳۸ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں پنجاب کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی مغل پورہ، لاہور میں داخلہ لیا اور انجینئرنگ سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے سبب ۱۹۴۶ء میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی۔ ایس سی کی ڈگری لی۔ اگلے ڈیڑھ دو برس بسلسلہ پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ، انگلستان میں گزارے، جہاں سے ۱۹۴۸ء میں واپس آئے۔

مختصر حالات زندگی:

علامہ عبدالمالک کھوڑوی، سابق مُشیرِ مال، ریاست بہاول پور کے پوتے محمد خالد اختر کے والد اختر علی، بہاول پور ڈویژن میں ریونیو ڈیپارٹمنٹ سے متعلق تھے، جو ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے اور فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کے عہد میں ممبر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد ستمبر ۱۹۶۴ء میں فوت ہوئے۔ محمد خالد اختر کا بچپن بہاولنگر میں گزرا اور لڑکپن بہاول پور میں۔ بہ سلسلہ تعلیم ۱۹۳۹ء کے بعد کا بیشتر وقت لاہور میں گزرا۔ ۱۹۴۶ تا ۱۹۴۸ء کا زمانہ انگلستان میں گزرا۔ بطور الیکٹریکل انجینئر سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا سوچا تو کامیابی نہ ہوئی اور کراچی جا کر ایک غیر ملکی فرم انگلش الیکٹرک کمپنی میں بہ حیثیت سیلز انجینئر ملازمت کر لی۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں سابق بہاولپور ریاست کے محکمہ الیکٹرسٹی میں بطور ایس ڈی او منتقل ہو گئے۔ جب بہاولپور ریاست کا یہ محکمہ واپڈا میں مدغم ہوا تو بہ سلسلہ ملازمت، تین برس ملتان میں اور بقیہ وقت لاہور

میں گزرا جنوری ۱۹۸۰ء میں سپر نٹنڈنگ انجینئر (واپڈا) لاہور کے عہدے سے ریٹائر ہو کر اپنے آبائی شہر بہاول پور کو مستقل مسکن بنایا۔

دنیاوی معاملات کو نہ کبھی سمجھا اور نہ سمجھنے کی خواہش کی۔ زندگی کا بیشتر وقت انگریزی ادب کے مطالعہ میں صرف کیا۔ کراچی میں انتقال ہوا اور ڈیفنس کراچی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

قلمی آثار (مطبوعہ):

۱۔	''۲۰۱۱'' بیس سو گیارہ (سیاسی و معاشرتی طنزیہ)	مکتبہ جدید' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۲۔	''چاکیواڑہ میں وصال'' (ناول)	لارک پبلشرز' کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۵ء
	اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنگ میل لاہور نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔		
۳۔	''کھویا ہوا افق'' (مضامین / افسانے)	مکتبہ جدید' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
	اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنگ میل لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔		
۴۔	''لالٹین اور دوسری کہانیاں''	آج پبلی کیشنز' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۷ء
۵۔	''دوسفر'' (سوات اور کاغان کے دو سفر نامے)	ادارہ مطبوعات' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
	یہ سفر نامے پہلی بار مجلّہ ''فنون'' لاہور میں بالا اقساط شائع ہوئے تھے۔		
۶۔	''ایلی دنیائے حیرت میں'' (از لیوس کیرول کا ترجمہ)	نیشنل بک فاؤنڈیشن' پاکستان	طبع اوّل:
	یہ لیوس کیرول کی کتاب ''ایلس ان ونڈر لینڈ'' کا ترجمہ ہے۔		
۷۔	''چچا عبدالباقی کی کہانیاں'' (سلسلہ وار افسانے)	قوسین لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
۸۔	''مکاتیب خضر'' (خطوط)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۹۔	معلوماتی قاعدہ''	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۱۰۔	''یاترا'' (سفرنامہ)	قوسین لاہور	طبع اوّل:
۱۱۔	''مکاتیب خضر (مجموعہ خطوط)	سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۴ء
۱۲۔	ابن جبیر کا سفر'' (ترجمہ)	سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۴ء

غیر مدوّن / غیر مطبوعہ:

لیوس کیرول کی کتاب ''ایلس ان ونڈر لینڈ'' اور ''تھرو دی لوکنگ گلاس'' کے تراجم کو یکجا کر کے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن شائع کرنا چاہتی تھی، خدا جانے کیا بنا۔ مضامین اور خطوط اس کے علاوہ ہیں۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

اختر علی ہاؤس' سرکلر روڈ' بہاول پور۔ پاکستان

اعزاز:

پاکستان رائٹرز گلڈ'' آدم جی ادبی انعام' برائے ''کھویا ہوا افق'': ۱۹۶۷ء

نظریۂ فن:

''سب سے پہلے اس میں ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے۔ کہانی جس کا ایک آغاز' ایک وسط اور ایک انجام (کلائمکس) ہو۔ اس کے کردار جیتے جاگتے' پہچانے جانے والے ہوں۔ وہ اس معنی میں ''ہوشربا'' ہو کہ اسے ختم کیے بغیر چین نہ آئے۔ اسے پڑھ چکنے کے بعد اس کے کردار' واقعات اور منظر تھوڑی دیر تک ذہن میں کلبلاتے اور ہل چل مچاتے رہیں اور اسے بے چین اور مضطرب رکھیں۔۔۔ یہ ایک بہت ہی مشکل اور پراسرار Ilusive عمل ہے جس کا راز صرف استاد افسانہ نگار ہی جاتے ہیں۔ بتا شاید وہ بھی نہ سکیں۔''

(بہ حوالہ مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۸۷ء)



حوالہ جات:

۱۔ اکثر مقامات پر تاریخ پیدائش ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء درج ہے جو درست نہیں۔ محمد خالد اختر صاحب نے خود مجھے اپنی درست تاریخ پیدائش سے آگاہ کیا ہے۔

لالٹین

محمد خالد اختر

میرے خسر مستری مہتاب دین کا نام تم نے سنا ہوگا۔۔۔ اس لیے نہیں کہ وہ حکومت کا کوئی وزیر ہے یا کسی فلم کا ڈائریکٹر ہے، کسی جماعت کا لیڈر ہے، وہ تو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ ''ہے'' کی جگہ پر ''تھا'' کہنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پچھلے مہینے کی پندرہ کو جمعہ کے مبارک روز شام کے پانچ بجے مستری موصوف کے فانی اور مستعار جسے کو میری آنکھوں کے سامنے سائیں ڈوڈے شاہ کے گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے غیر فانی اور دائمی حصے کے متعلق جس کو اصطلاح عام میں روح کہا جاتا ہے، میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ کہاں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر مجھے بالکل کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر وہ حصہ سیدھا بہشت میں گیا ہو۔ مستری مہتاب دین ان بے ضرر، محنتی، غیر دلچسپ انسانی روبوٹوں میں سے تھا جو عمداً گناہ کرنے کے اتنے ہی نااہل ہوتے ہیں، جتنے نیکی کے ایک مثبت عمل کے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنی بیوی کا وفادار تھا، ایک مہربان اور منصف باپ تھا اور پانچوں نمازیں بلا ناغہ ادا کرتا تھا۔ مختصراً وہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو سیدھے بہشت میں جاتے ہیں (اگر تم بہشت کی قسم کی چیزوں میں یقین رکھتے ہو)۔ ہاں، اگر تم نے (غالباً) اس کا نام سنا ہوگا تو حال میں اخباروں میں ایک خوفناک حادثے کی ضمن میں، جس میں۔۔۔ مگر شاید تم نے نہیں سنا اور مجھے تمہاری خاطر یہ کہانی خراب نہیں کرنی چاہیے۔

مستری مہتاب دین سے میری واقفیت تین چار سال سے تھی۔۔۔ اس وقت سے جب میں پہلے پہل اپنے مربی اور مہربانی خان بہادر سخاوت علی کے توسط سے مل رائٹ شاپ میں بطور ایک غیر تربیت یافتہ مزدور بھرتی ہوا اور مستری کے ساتھ کام سیکھنے پر لگا دیا گیا۔ انسانیت کو کئی ایک لحاظ سے کئی ایک اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔۔۔۔ زندہ دل اور مردہ دل۔ باتونی اور چپ وغیرہ وغیرہ اور میں نے بھی ایک تقسیم کا سوچا ہے جو اپنے طور پر اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی اور۔ مجھ سے پوچھو تو دنیا میں دو قسم کے آدمی بس رہے ہیں۔۔ ایک وہ جو مستری ہیں اور دوسرے وہ جو مستری نہیں ہیں۔ کم از کم میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مستریوں اور غیر مستریوں میں نفسیاتی لحاظ سے جو تفاوت کی خلیج ہے، وہ کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔ میں نے کئی ایک مستریوں کے تحت کام کیا ہے، ایک دو سے میرے دوستانہ مراسم یہاں تک بڑھے ہوئے ہیں

کہ میں ان کو ان کے نام سے بلاتا ہوں' اس لیے ان کے متعلق میری رائے ایک ایسے آدمی کی رائے ہے جو "جانتا" ہے۔ میں یہ اقرار کرنے کو تیار ہوں کہ وہ سب قابلِ قدر آدمی ہوتے ہیں اور پنسل اور پیمانے کے ایسے ایسے عجائبات کر سکتے ہیں جو کم از کم میرے لیے تو حیران کن اور قابلِ رشک ہیں مگر وہ "مستریانہ" فضیلت، وہ خاموش برتری کا انداز، جس سے وہ باقی انسانیت سے الگ اور ممتاز حیثیت کا دعویٰ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایسی خصوصیت ہے جو خالص مستریانہ ہے۔ یہ نہیں کہ ان کا اس "احساس برتری" میں کچھ اپنا قصور ہے یہ یقینی بات ہے کہ اگر کل تم خود مستری بن جاؤ تو تم بھی اس برگزیدہ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت میں کچھ الگ سی، کچھ سنجیدہ سی اور کچھ پدرانہ سی شفقت کی نمائش کرنے کی کوشش کرو گے۔ پرانی روایات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور میں خود جس دن سے مستری بنا ہوں، بے حد متین اور اتنا ذمہ دار ہو گیا ہوں جیسے ایک دم میری زندگی کے دس مزید سال گزر گئے ہوں۔ مستری بننے سے پہلے میں زور زور سے ہنسنے کے لیے مشہور تھا' اب میں صرف مسکراتا ہوں اور مستری اور غیر مستری میں یہی ایک نمایاں فرق ہے۔ مگر یہ سب بحث غیر ضروری ہے اور اس تاریخ سے اس کا چنداں تعلق بھی نہیں۔ پھر بھی اس سے تم کو میرے مرحوم خسر کے کردار کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنی جماعت کا ایک مکمل نمائندہ تھا۔

مہتاب دین مل رائٹ شاپ میں ہیڈ مستری تھا۔۔۔۔ بھاری گٹھا ہوا جسم۔ کندھوں سے کچھ آگے کو جھکا ہوا چھوٹی مہین آنکھوں پر عینک لگی ہوئی۔ تنگ ماتھے پر گہری مستقل لکیریں۔ ہٹلر کی سی تراش کی موچھیں۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے وہ اپنی جماعت کا ایک صحیح نمونہ تھا۔ اس جیسے دس ہزار اور ہوں گے۔ ورکشاپ کے بیس برس اور ایک محنتی۔ وقت طلب عادت کی بدولت اس نے اپنے کام میں ایک حقیقی قابلیت اور مہارت حاصل کر لی تھی۔ سکھ چارج مین کو چھوڑ کر وہ شاپ میں سب سے زیادہ اہم اور معتبر آدمی تھا۔ ایک طرح اسی کی وجہ سے شاپ کی سوراخ کرنے والی اور کاٹنے والی مشینیں سارا سارا دن گھر گھراتی رہتی تھیں۔ اسی کے بنائے ہوئے ماپ کے پورے دائروں میں وہ سوراخ کرتی تھیں اور اسی کی کھینچی ہوئی سطروں پر وہ کاٹتی تھیں۔ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ اگر وہ کسی دن نہ آ سکتا تو شاپ کے کام کی کیا حالت ہوتی۔ غالباً شاپ کی آدھی مشینوں کو بیکار رہنا پڑتا۔ مگر مہتاب دین سورج کی طرح پابند اور گھڑی کی طرح باقاعدہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ نہ تو کبھی بیمار ہوا اور نہ ہی کسی اور وجہ سے کبھی اسے اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا۔

پہلے پہل مجھے اس کے ساتھ ہی کام پر لگایا گیا اور یہ اس کی بردباری اور تحمل کی دلیل ہے کہ جتنا عرصہ میں نے اس کے ساتھ کام کیا، اس نے کبھی میرے ساتھ غصے یا خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے لیے زیادہ کارآمد نہ تھا۔ کئی کاموں کو میں نے بگاڑا ہو گا۔ میں نیا آدمی تھا اور اپنے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا مجھے غلط فہمی تھی کہ خدا نے مجھ کو مختلف اور بہتر چیزوں کے لیے پیدا کیا ہے اور ہمیشہ میرے دماغ میں سینما کا ایکٹر یا کتابوں کا مصنف بننے کی خواہشیں بسی رہتی تھیں۔ اندریں حالات کام میں دلچسپی خاک لیتا۔ میری بجائے شاید ایک گوریلا مستری کا زیادہ معاون اور مددگار ہو سکتا۔ شروع شروع میں مستری اور میرے تعلقات میں کچھ کھنچاؤ اور دوری سی رہی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ایک مستری (اور پھر ہیڈ مستری) اور ایک معمولی ورکر میں اصلی دوستی ہے ہی ناممکن۔ دوسرے میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسا ہی محسوس کرتا جیسا کہ ایک کند ذہن لڑکا اپنے سکول ماسٹر کے سامنے۔ کبھی کبھی میں مستری کو ادھر ادھر کی باتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اگر کبھی وہ مجھے ممنون کرنے کے خیال سے مسکراتا بھی تو بڑی برتری اور دوری کے انداز میں۔ میرا مطلب ہے کہ مستری اور میں کبھی "لنگوٹیے" نہیں بن سکے۔۔۔ ان آخری دنوں میں بھی نہیں۔ اگرچہ اس نے کبھی کسی لفظ یا اشارے سے مجھ پر اس قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ پھر بھی میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مستری مہتاب دین میری پیشہ وارانہ نااہلیت کو اور ہر بات میں میری سنجیدگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر

مستری اس قدر نیک دل اور متحمل نہ ہوتا تو خان بہادر کے مربیانہ رسوخ کے باوجود میں شاپ سے کبھی کا بغیر نوٹس کے نکالا جا چکا ہوتا۔ اس صورت میں اب غالباً میرا افسر کوئی اور ہوتا۔

میں اور مستری مہتاب دین ایک ہی گلی میں رہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم ہمسائے تھے۔ تم نے وہ گلی ضرور دیکھی ہوگی جو ہوٹل ڈی ریولی کی بغل میں سے ہوتی ہوئی لنڈے بازار میں مسجد شہید گنج کے سامنے آنکلتی ہے اور تم نے اس طرح جاتے ہوئے اپنے بائیں کو ان سیاہ اور مایوس کن بالا خانوں کی قطار بھی دیکھی ہوگی، جن کی لکڑی کی عجیب منقش بالکونیوں پر ہمیشہ غلیظ اور دبیز پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس قسم کے بالا خانے تم کسی وقت ریلوے روڈ یا کسی اور روڈ پر بھی دیکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ علم نہیں کہ ان کو کس نے ایجاد کیا کون ان کا پہلا نقشہ "کرتا" مگر وہ جو ایک دائمی اور مستقل انحطاط کی حالت ان پر چھائی رہتی ہے۔ میرے لیے ان کو رومانس کی چیزیں بنا دیتی ہے۔ تم نے گزرتے وقت کئی دفعہ تعجب کیا ہوگا کہ ان بالا خانوں میں کس قسم کے لوگ رہتے ہونگے اور شاید تمہارے تصور نے خوبصورت اور مہ چہرہ زلیخاؤں کے خواب دیکھے ہوں گے، جو ان دبیز پردوں کے پیچھے ساری عمر ایک اداس کنوار پن میں گزار دیتی ہیں اور بوڑھی چڑیلیں ہو کر مر جاتی ہیں' یا کبھی تم کچھ کچھ یہ امید کرنے لگ جاتے ہو گے کہ کوئی ہاتھی دانت جیسا زرد پوش ہاتھ جس کے اوپر نازک کلائی پر طلائی کنگن لٹکا اور کھنکھنا رہے ہوں گے' تم کو پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے کسی الغوزے یا طنبورے پر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا اور ہوشربا الف لیلوی گانے کی لہریں نیچے تمہارے کانوں میں آئیں گی اور کوئی بوڑھا سفید مہربان داڑھی والا آدمی' شاید بخارا کا کوئی سوداگر بچہ' تم کو ہاتھ کی جنبش سے اوپر آنے کا اشارہ کرے گا۔۔۔ میرے دوستو۔ ان بالا خانوں میں نہ تو کوئی بخارا کا سوداگر بچہ ہے اور نہ اپنی جوانی کے کھنڈروں میں بیٹھی ہوئی زلیخائیں۔ ان میں ٹھوس اور معتبر اور سنجیدہ آدمی رہتے ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ زندگی کوئی مذاق نہیں اور اس کے ساتھ سنجیدگی سے نمٹنا چاہیے ان بالا خانوں میں سے ایک میں مستری مہتاب دین اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور اگر اب بھی تم ان مکانوں کے متعلق رومانی خیالات رکھنے یا سوچنے پر اصرار کرو تو یقیناً تم باؤلے ہو۔۔۔ میری طرح۔

اسی گلی کے نکڑ پر میرا یا یوں کہو کہ میرے دوست شیخ شیر علی' شیر فروش کا بالا خانہ ہے اور اس کے نیچے اس کی دوکان ہے، جس پر ہر وقت خالص دودھ مل سکتا ہے۔ دودھ کے خالص ہونے کی میں خود گواہی دیتا ہوں۔ مجھے دن میں کئی بار وہاں دودھ پینے کا اتفاق ہوتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ میں نے ہمیشہ دودھ کو عمدہ اور خالص پایا۔ شیخ شیر علی طبعاً دوسرے شیر فروشوں کی طرح ملاوٹ کی قسم کی چھوٹی اور ذلیل کمینگیوں پر اتر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم کو اس دکان کے پاس سے کبھی گزرنے کا اتفاق ہوا ہے تو تم نے ایک اونچے گنبد نما سر اور چشموں والے ادبی ڈھال کے چہرے والے آدمی کو دودھ کی ایک بڑی کڑھائی میں چمچا پھیرتے دیکھا ہوگا اور اگر تم چہروں کو یاد رکھنے والے آدمی ہو تو وہ چہرہ جلدی نہیں بھول سکتے۔ میرا یہ دوست ایک شاعر۔ ایک فلاسفر' ان سڑی شاعروں اور فلاسفروں میں سے نہیں جو سوا اپنے آپ کے ساری دنیا سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے متعلق اس کی ایک اپنی انفرادی روشن فلاسفی ہے اور اس کے لیے کڑھتے ہوئے دودھ میں اتنا ہی رومان' اتنی ہی شعریت ہے جتنی کہ ایک خوبصورت عورت میں۔ بے حد قابل اور ذکی ہے میرا یہ دوست۔ اس نے کچھ جدت پسند شاعری بھی کچھ سکتا ہے اور وہ ایک معرکتہ الآرا علمی مضمون "قرون وسطی کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت" کا بھی مصنف ہے جو ان اصحاب کے لیے جو بھینسوں میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں نہایت کارآمد اور مفید ہے میں نے اس کو ابھی تک نہیں پڑھا کیونکہ مجھے بھینسیں بالکل اچھی نہیں لگتیں اس کے علاوہ شیخ شیر علی نے فلم کمپنی کے لیے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔۔۔ منظر نامہ اور مکالمہ اور سب کچھ۔ اس کا نام "دوشیزہ فرانس عرف محبوبہ مصر" ہے۔ یہ عشق کی

کہانی ہے۔ خاص کر آخری سین بے حد دردناک ہے۔ جس میں شیخ کے لڑکے ہیرو اور شیخ کی لڑکی ہیروئن (ایک دوسرے شیخ کی) کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، قبروں میں سے آسمان کی طرف اٹھتی اور گاتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ شیخ شیر علی نے یہ ڈرامہ مشہور فلم کمپنی فصلی بٹیرے لمیٹڈ کو بھیجا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر فصلی بٹیرے تھوڑے بہت بھی اہل نظر ہوئے تو فوراً اس ڈرامے کو اپنی اگلی فلم کے لیے خرید لیں گے' وہ ڈرامے کو چھ سات ہزار سے کم میں قطعاً نہیں بیچے گا۔ غالباً فصلی بٹیرے اس کو اپنی فلم کمپنی میں مستقل مکالمہ نویس کے عہدے کی پیش کش بھیجیں گے۔ اس صورت میں اس کا وعدہ ہے کہ وہ دودھ کی یہ دکان مجھے سونپ جائے گا۔

ہماری دکان کے سامنے ایک دو گھر چھوڑ کر محمد الدین درزی کی دکان کے اوپر مستری مہتاب دین کا بالا خانہ تھا، جس کی بالکنی پر ہمیشہ تاریک اور غلیظ بوریاں لٹکتی رہتی تھیں۔ سورج کتنا ہی چمکیلا کیوں نہ ہو اور آسمان کتنا ہی نیلا' جس وقت تمہاری نظر ان تاریک بوریوں پر پڑتی (میری نظر اکثر ان پر پڑتی تھی تو آسمان بھورا اور میلا سا ہو جاتا اور کثیف سے بادل تمہاری روح پر چھا جاتے اور تم کو مستری مہتاب دین پر اس کے مستری ہونے کے باوجود رحم سا آنے لگتا۔ پھر مستری مہتاب دین ایک غیر دلچسپ' معمولی سا آدمی تھا اور میں جانتا تھا کہ تصور کی بلند ترین پرواز بھی اسے بخارا کے سوداگر بچے میں تبدیل نہیں کر سکتی اور اس لیے وہ عجیب اسرار اور رومانیت کا ہالا جو مجھے ساتھ کے بالا خانوں کے گرد نظر آتا تھا اور جوان کی دائمی غلاظت کو ایک خوبصورت رومان کی شکل دے دیتا تھا' مستری کے بالا خانہ کے گرد مجھے نظر نہ آتا۔۔۔ (یہ احساسات اس دن سے پہلے کے ہیں جس دن میں نے ورکشاپ سے لوٹتے وقت بوری کے پیچھے سے ہاتھی دانت جیسے ایک زرد و سفید ہاتھ کو باہر گلی میں کدو کے چھلکے پھینکتے دیکھا۔ اس دن سے تو میرا یہ عالم تھا کہ میری نظریں ہمیشہ ان تاریک غلیظ بوریوں پر یوں گڑی رہتیں جس طرح وہ دنیا کے خوبصورت ترین اور عجیب ترین حریری پردے ہوں۔ اس دن سے بوڑھا مستری مہتاب دین بھی مجھے کچھ کچھ مہربان داڑھی والا بخارا کا سوداگر بچہ لگنے لگا۔ اگرچہ اس خودفریبی کی تکمیل میں ایک خرابی یہ تھی کہ مستری مہتاب کی داڑھی نہ تھی۔ تاہم ان سب باتوں کا ذکر مناسب موقع پر تفصیل سے آئے گا۔ پہلے میں تم کو لالٹین کے بارے میں بتالوں۔۔۔ یا لالٹین کے ڈھانچے کے بارے میں، جس کا اس تاریخ میں اتنا ہی اہم مقام ہے جتنا کسی اور انسانی کردار کا، تب بھی یہ لالٹین میرے لیے زندہ تھی۔۔۔ معصوم اور بے ضرر اور بے کار' بعد میں یہ میرے گمانوں سے بھی کئی جصے زیادہ زندہ نکلی اور پھر اتنی معصوم اور بے ضرر بھی نہیں، جتنی یہ نظر آتی تھی۔

مستری مہتاب دین کے بالا خانے کے نیچے اس دروازے پر جہاں سے سیڑھیاں اوپر چڑھتی تھیں، کوئی پچیس فٹ اوپر یہ لالٹین لگی تھی۔۔۔ ایک ٹوٹا ہوا۔ زنگ خوردہ لالٹین کا ڈھانچہ جس کا لوہا اب سیاہی مائل سرخ ہو کر بکھر رہا تھا۔ دیوار میں سے نکلتا ہوا لوہے کا ایک بازو اس کو گلی کے اوپر سہارا دیے ہوئے تھا اور لوہے کا بازو کئی برس سے یہ کام کرنے کی وجہ سے کچھ تھک گیا تھا یا اندر سے دیوار میں اس کی نشست کھلی اور کھوکھلی ہو گئی تھی کیونکہ اب وہ بازو کچھ نیچے جھک آیا تھا اور اس کے ساتھ لالٹین کا ڈھانچا بھی۔ میرے خیال میں شاید ہی کبھی کسی نے اس کی طرف دھیان دیا ہو مگر میں اس کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا کہ شاید اس کی روشن ہوئے عمریں بیت گئی ہوں گی اور یہ کہ اب اس میں کبھی روشنی نہیں ٹمٹمائے گی۔ وہ ایک خاموش اور رومانی دنیا کی نشانی تھی۔ پھر یہ بجلی کے اونچے بدصورت کھمبے اس روشنی اور رومان میں کریہہ بدتمیز اجنبیوں اور غیر ملکیوں کی طرح گھس آئے تھے پہلے بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر اور بعد میں ان چھوٹی گلیوں میں بھی اور وہ چوکور خود پوش لالٹینیں جو گلیوں کی نکڑوں پر سے اندھیری راتوں کو جگاتی تھیں اور شہر کے رہنے والوں اور باہر کے مسافروں کے لیے لامحدود ممکنات کی حامل تھیں۔ جن کی مدھم زرد کانپتی روشنیوں میں گدڑی والا فقیر ایک بھیس بدلا ہوا ہارون الرشید لگنے لگتا تھا اور ناممکن ترین باتیں سچی ہونے لگتی تھیں۔۔۔ وہ چوکور خود

پوش لالٹینیں ماضی کی چیزیں ہوگئیں۔ لوگ ان کو دیواروں میں سے اکھاڑ کر لے گئے۔ اب ان دنوں تم لاہور کے سارے گلی کوچے چھان مارو' تم کو شاید ہی لالٹین کا کوئی پرانا ڈھانچا کسی دیوار کے کونے میں اٹکا ہوا مل سکے۔ کیونکہ جنگ کے بعد سے لوہا مہنگا ہوگیا ہے' لوگ اب ٹھوس اور لالچی بن گئے ہیں اور دیوار میں لگی ہوئی لالٹین کی رومانیت اور معرفت کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے زمانے میں اس لالٹین کے ڈھانچے کا دیوار میں اٹکا رہ جانا مجھے ایک عجیب بات لگا۔ غالباً کبھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں گیا تھا کیونکہ یہ بہت اونچی تھی اور دیوار کی طرح بے رنگ تھی۔ اگر کسی نے کبھی اس کی طرف دھیان دیا بھی ہوتا' اس کا لوہا اب اس قدر زنگ خوردہ اور بیکار ہو چکا تھا کہ اس کو چاندی کے سکوں میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یا شاید اسے ابھی اپنی قسمت کی تکمیل کرنی تھی اور انسانوں کے اس ڈرامے میں کرم کے ریکھے کے مطابق وہ آخری اور خوفناک پارٹ ادا کرنا تھا جس کے لیے یہ اتنے برس سے اس دیوار میں اس خطرناک حالت میں اٹکی ہوئی تھی' ان دنوں جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے ماضی کی یہ نشانی مجھے بالکل معصوم اور بے ضرر سی نظر آئی تھی اور اس چیلنج میں جو وہ بجلی کے کھمبوں کو دیتی معلوم ہوتی تھی، ایک دیدہ دلیری اور بہادری کا انداز تھا۔ اس بے چاری حرماں نصیب لالٹین پر ایک الگ' کہانی لکھی جا سکتی ہے اور اگر کوئی شاعر اس کو دیکھ پاتا تو اس پر ایک رباعی کی صورت میں ایک چھوٹا سا خوبصورت کتبہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا جو اس لالٹین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر فانی بنا دیتا۔

شاید تم اس لالٹین کے اس قدر طویل بیان سے اکتا گئے ہو گے لیکن یہ لالٹین اس تاریخ کے اہم کرداروں میں سے ہے اور میں اس کو آسانی سے چار پانچ سطروں میں ٹال دینا انصاف سے بعید سمجھتا تھا ہاں اگر تمہاری خوشی یہی ہے تو میں اب اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ البتہ میں آخری صفحے کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ وہاں تو وہ خود آ ٹپکتی ہے بہر حال اب میں اسے چھوڑتا ہوں اور اپنی کہانی جاری رکھتا ہوں۔

ہمسائے ہونے کے باوجود شاذ و نادر ہی میں اور مستری مہتاب دین گلی میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوں گے۔ کبھی بہت سویرے جب میں ورکشاپ کی ٹرین کو پکڑنے کے لیے گلی میں سے دوڑتا ہوا جاتا تو وہ مجھے ایک مطمئن چال سے خراماں خراماں جاتا ہوا ملتا۔ ''ابھی وقت ہے'' وہ اپنی چوڑی' موٹی اور بھاری جیبی گھڑی کو مستریانہ خود اعتمادی سے دیکھ کر مجھے بتاتا اور پھر ہم اکٹھے ہی ریلوے سٹیشن کے اس یارڈ تک جاتے جہاں سے ہماری ورکشاپ کی گاڑی چلتی ہے۔ اکٹھے ہی ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھتے اور اکٹھے ہی کچی صبح میں، انجنوں اور ریلوے لائنوں اور سگنلوں کے پاس سے تیس میل کی رفتار پر گڑگڑاتے ہوئے گزرتے۔ ورکشاپ میں تو میں ہمیشہ رہتا ہی اس کے ساتھ تھا۔ ورکشاپ سے واپسی کے وقت ہم قدرتاً ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے، میں اس وقت جب کہ جسم اور دماغ بالکل تھکے ہوئے ہوتے تھے، اس سنجیدہ اور غیر دلچسپ معمر آدمی کی صحبت پر اپنے ہم عمر بے فکروں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا۔ مستری کا بظاہر ایک کانی گہرا دوست تھا جو ساتھ کی لوکوشاپ میں کرین پر کام کرتا تھا وہ اور مستری ورکشاپ سے ہمیشہ اکٹھے لوٹتے۔ کبھی کبھی وہ چھٹی کا سائرن بولنے سے کچھ پہلے ہی شاپ کے باہر آ کر مستری کا انتظار کرتا۔

اس کا نام مستری رحیم بخش تھا۔ وہ ایک موٹا بھاری' عامیانہ قسم کا آدمی تھا۔۔۔ ایک لمبی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی والا آدمی جو ہاکروں کی صحبت میں رہ رہ کر اب خود اس حد تک ایک ہاکر لگنے لگ گیا تھا جس حد تک ایک انسان ہاکر لگ سکتا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے اور وحشیانہ سے تھے۔ اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی تھیں اور ان میں ایک عیارانہ دمک سی تھی۔ میں کئی دفعہ تعجب کرتا کہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش عادات اور طبیعت کے اتنے اختلافات کے باوجود کیونکہ اتنے گہرے دوست ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مستری

مہتاب دین اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے کسی سے اختلاف رائے نہیں رکھتا اور فوراً ہر شخص سے ہر معاملے میں اتفاق کر لیتا ہے اور رحیم بخش جیسے شوریدہ اور ژولیدہ آدمی کو جسے اور کوئی منہ لگنے نہیں دیتا۔ مستری مہتاب دین میں ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جو اس کی ہر بات میں ایک شاگردانہ انداز کی ہاں ملانے کو تیار رہتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ مستری رحیم بخش ہی تھا جو مستری مہتاب دین کی سوسائٹی کا متلاشی تھا۔۔۔شاید روح کے کسی سکون اور اطمینان کی خاطر جو مستری کی صحبت میں اسے حاصل ہوتا تھا۔ کئی دفعہ وہ ہماری مل رائٹ شاپ میں آ جاتا اور دیر تک ریلوے ورکشاپ کی اندرونی سیاست پر باتیں کرتا رہتا۔ اپنے چارج مینوں کو برا بھلا کہتا، اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتا اور جب وہ آدھ گھنٹے میں ایک سو ایک موضوعات پر بول چکتا اور مستری مہتاب دین اس کی ہر بات سے فوراً اتفاق کر چکتا تو وہ واپس اپنی شاپ میں اپنے کام پر چلا جاتا۔ اسے اپنی آواز سے محبت تھی جو کچھ اس قسم کی تھی جیسے ریل کے پہیے کی آواز، جسے بریک لگا دی گئی ہو۔ میں اس سے قدرتاً نفرت کرنے لگ گیا۔ میں نے اس کی کبھی پروا نہ کی۔ کبھی کبھی وہ ایک خاص پدرانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مستری مہتاب دین سے پوچھتا ''مہتابیا۔ یہ ہمارا چھوکرا اسمٰعیل کچھ سیکھ بھی رہا ہے؟؟۔۔۔' جیسے وہ ذاتی طور پر میری تربیت کا ذمہ دار اور میرا نگران ہو۔ ایسے وقت وہ مجھے بڑا برا لگتا۔ آدمی کے لیے اس کا ایک باپ ہی بہت کافی ہوتا ہے۔

مستری مہتاب دین کا شام کا وقت عموماً اس موٹی بوریوں کے پیچھے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزرتا۔ تفریحات اور کھیل تماشے اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے۔۔۔۔ ہاں ایک دفعہ میں نے اس کو مستری رحیم بخش کے ہمراہ ایک سینما میں دیکھا۔ غالباً اس کا یہ دوست جس کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا' اس کو بوریوں کے پردے والی بالکنی کے سکون سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہوگا۔۔۔ کچھ ساتھ کی خاطر اور کچھ شاید اس لیے کہ مستری مہتاب دین دونوں کے ٹکٹ خریدے گا۔۔۔ (انہوں نے غالباً مجھے نہ دیکھا۔ فلم شاید ''تھپڑ'' تھی جو ڈائرکٹر ''مار دھاڑ'' کی ہدایت کی ہوئی ہے، پہلا ہفتہ تھا اور رش بڑا زبردست تھا۔ میں لوگوں کے سروں کے اوپر لیٹا ہوا' ہاتھ ٹکٹ کی کھڑکی کے اندر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے عزیز دوست شیخ شیر علی نے مجھے پیچھے ٹانگوں سے سہارا دے رکھا تھا۔۔۔ آہ وہ بے فکری کے پیارے دن)۔

عموماً میرا شام کا وقت بھی شیخ شیر علی سے مصنفوں اور کتابوں کی باتیں کرتے گزرتا۔ شاید ہی کسی شخص کو ان حیران کن آدمیوں کے متعلق جو کتابیں اور افسانے اور نظمیں لکھتے ہیں، اتنی معلومات ہوں گی جتنی شیخ شیر علی کو، اس کی باتوں میں گہری عقیدت سے زیادہ رشک کا رنگ ہوتا تھا۔ مجھ سے پوچھو تو واقع وہ لوگ کمال کرتے ہیں۔ مجھے تو ایک خط لکھنا پڑتا ہے تو مصیبت پڑ جاتی ہے۔ آپ کی خیریت خیر مطلوب سے آگے ایک لفظ نہیں سوجھتا۔ (شیخ شیر علی کے کہنے پر میں نے ایک جاسوسی ناول ''خوفناک نقاب پوش'' کا آغاز کیا تھا مگر پہلے باب کے بعد جس میں ہیرو ہیروئن کو دیکھ کر فوراً غش کھا کر گر پڑتا ہے اور اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے میری ساری خلاقانہ طاقتیں جواب دے گئیں) خود شیخ شیر علی جو فی الواقع ایک جینئس' ایک نابغہ ہے' ابھی تک اپنا نام کسی رسالہ میں چھپا ہوا نہیں دیکھ سکا۔ اس کا معرکتہ الآرا مضمون ''قرون وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت'' پانچ چھ رسالوں سے واپس آ چکا ہے اور تو اور مدیر رسالہ ''مویشی'' تک نے بھی اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ میں نے یہ کہہ کر شیر علی کی ڈھارس بندھائی کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون اشاعت کے قابل نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ کہ غافل لوگ بھینسوں کے ماضی یا مستقبل سے قطعاً بے پروا ہیں۔ پھر بھی ''مویشی'' والا معاملہ ایسا تھا کہ اس کا جواب میرے پاس بھی نہ تھا۔

مہینے میں چار پانچ بار مستری مہتاب دین ہماری دوکان پر دودھ پینے آتا۔ کبھی اکیلا اور کبھی مستری رحیم بخش کے ہمراہ۔ ایسے موقعوں پر میں دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ میں فیاضانہ لہجے میں کہتا: ''بھائی شیر علی' مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی ذرا زیادہ ڈالنا۔'' مجھے اب تک

صرف اس قدر اثر اور رسوخ حاصل ہو سکا ہے کہ لوگوں کے دودھ میں زیادہ بالائی ڈلوا دوں اور وہ بھی صرف شیخ شیر علی کی دکان پر۔ مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی زیادہ ڈلوانے سے مجھے قطعاً غلط فہمی نہ تھی کہ وہ میری اس فیاضانہ سفارش کی وجہ سے میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ اس کی توقع ہی فضول تھی۔ میرے متعلق جو مستری کی رائے ان دنوں تھی اس کا مجھے بخوبی علم تھا اور تم بھی اس کو جانتے ہی ہو۔ میں فقط اس کو اپنا ممنون کرنے کا خواہشمند تھا۔ دراصل میں مستری کو اپنی طاقت اور رسوخ کے مطابق ممنون کر کے صرف اپنی خود بینی کے جذبہ کو تسکین پہنچا رہا تھا (اگر تم کو زیادہ بالائی والا دودھ پینے کا شوق ہے تو میں دوست بنانے کے لیے مناسب ترین آدمی ہوں)۔

اور اب میں اس شام پر آتا ہوں جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ جب شرارت کا آغاز ہوا۔ جب ایک چھوٹے ہاتھی دانت جیسے سفید ہاتھ نے بوری کے پردے سے باہر ایک تھالی کو اوندھا کر، کدو کے چھلکے تقریباً میرے سر پر الٹ دیے۔ مجھے تاریخ بھی یاد ہے۔ اگرچہ میں اس قسم کا آدمی ہوں جو کئی دفعہ سال تک بھول جاتا ہوں۔ مئی کے مہینے کی ستائیس تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ میں معمول کے مطابق شام کو ریلوے اسٹیشن سے اکیلا واپس آرہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن یہ بالا خانے مجھے روڈ سے کہیں زیادہ مایوس کن اور دل ڈھادینے والے معلوم ہوئے، ان کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا جیسے کسی نے کیچڑ سے بھرا ہوا ہاتھ میرے دل پر رکھ دیا ہو اور میں کچھ سوچنے سا لگ گیا کہ آخر میں نے اب تک خودکشی کیوں نہیں کی۔ اصل میں اس روز میرے ساتھ ورکشاپ میں بعض باتیں ناخوشگوار ہو گئی تھیں اور اس وقت مجھے زندگی کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آرہی تھی۔ مستری مہتاب دین نے مجھے لوہے کا ایک ٹکڑا ماپ کے مطابق فائل کرنے کو دیا تھا اور میں نے غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے اس کو اتنا زیادہ فائل کر دیا تھا کہ اس کی لمبائی ماپ سے آدھ انچ کم ہو کر رہ گئی تھی۔ مستری نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہا مگر میں اس کی آنکھوں میں اور بشرے پر لکھی ہوئی خفگی اور ناراضی پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سارا دن مجھے کام میں مدد دینے یا نہ دینے کے لیے بلایا تک نہیں اور میں نے بھی شرمندگی اور خفت کی وجہ سے اس کے سامنے آنے کی بجائے شاپ میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گزارنے کو بہتر سمجھا۔ یہ ہے بھی وقت گزارنے کا ایک نہایت خوشگوار طریقہ۔ میں ایک جگہ ورک مینوں میں کھڑا ہوا ان کے ساتھ گپیں ہانکنے لگا۔ وہ کام چھوڑ کر ہنس رہے تھے اور جو الفاظ اس نے میرے بارے میں استعمال کئے وہ تمہیں بتاؤں تو تم یقین ہی نہیں کرو گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری ڈیوٹی کہاں تھی۔ میں نے جواب دیا کہ مستری مہتاب دین کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا۔ ''تم اس وقت مستری مہتاب دین کے پاس کیوں نہیں ہو؟'' میں حاضر جواب نہیں ہوں۔ میں نے جلدی میں ایک نہایت احمقانہ سا جواب دیا۔ ''میں مستری مہتاب دین کو ڈھونڈنے ہی جارہا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔'' فورمین نے میرے بارے میں چند مزید ناشائستہ کلمات استعمال کے جو یہاں جگہ کی قلت کی وجہ سے لکھے نہیں جا سکتے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر میرے چارج مین کے روبرو لے گیا۔ سکھ چارج مین نیک دل آدمی تھا وہ کسی کا برا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے مہتاب دین کے ساتھ کام کرتے دیکھا تھا۔ مستری مہتاب دین کو بلوایا گیا۔ فورمین نے پوچھا۔ ''ویل مستری صاحب' یہ آدمی بھی تمہارے ساتھ کام کرتا؟'' مستری مہتاب دین نے پہلے مجھے ایک روٹھے ہوئے باپ کی طرح دیکھا اور پھر فورمین کو جواب دیا ''ہاں صاحب! ابھی میرے ساتھ کام کر رہا تھا''۔۔۔ میں نے پہلے بھی تم کو بتایا ہے کہ مستری مرحوم دل کا صاف تھا مگر یہ کہہ کر تو اس نے گویا مجھے بے داموں مول لے لیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کو گلے لگا لوں اور اس کو اس کی ہونڈا کی مکھیوں (میرا مطلب اس کی موچھوں سے ہے) کے اوپر چوم لوں۔ فورمین مجھے مستری کے حوالے کر کے چلا گیا اور یوں میری خلاصی ہوئی۔ مگر اس واقعے کی ندامت ابھی میرے دل سے گئی نہ تھی۔ کبھی سوچتا کہ یہ ورکشاپ کی نوکری میرے بس کی نہیں' اسے چھوڑ دوں۔ پھر خان بہادر کی ناراضی کا خیال آتا' کبھی دل میں فیصلہ کرتا کہ یہاں میرا

کیریکٹر تباہ ہورہا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ رائل بینڈ میں نوکری کرلوں یا سالویشن آرمی میں شامل ہو جاؤں یا کافی ہاؤس میں پارٹ ٹائم بیرا بن جاؤں۔ وہاں کے دو تین بیرے میرے دوست تھے اور رائل بینڈ میں میرا ایک دوست جہانگی رام ملازم تھا۔ میں نے اس کو ایک دو بار شادیوں پر اپنی سرخ کاڑھی ہوئی شاندار یونیفارم میں بینڈ کے ساتھ بگل پھونکتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک بھی کیا تھا۔ یہی خیالات لیے ان بالا خانوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مجھے وہ سفید ہاتھی دانت کی انگلیاں بورے سے باہر ایک تھالی اوندھاتی نظر آئیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس سپنے کی چکا چوند نے مجھے اس درجہ محو کر دیا کہ کم سے کم اس وقت مجھے مطلق پتہ نہیں کہ وہ اوندھاتی ہوئی چیز کیا تھی جو مجھ سے ایک قدم آگے نالے میں گری۔ پرانے ناولوں کے مصنفوں کے مطابق مجھے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑنا چاہیے تھا' مگر میں نے سوچا کہ برسر بازار بے ہوش ہو کر گرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور میں نے اس کو (بے ہوش ہونے کو) کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید لمبی مخروطی انگلیاں ناچنے لگیں۔ (میں وہاں سے ہٹا تو جب جا کر معلوم ہوا کہ تھالی میں سے کدو کے چھلکے گرے تھے) یہ بالا خانہ وہی تھا' جس میں مستری مہتاب دین رہتا تھا اور ان انگلیوں کی مالکہ یقیناً اس کی لڑکی رضیہ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ رضیہ کا نام میں نے ایک دو دفعہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش کی باتوں میں سن لیا تھا۔ پھر ایک دفعہ میرے سامنے مستری مہتاب دین نے رضیہ کے رشتے کے بارے میں مستری رحیم بخش سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ کسی اچھے برے پر نظر رکھے۔ تب اس کا صرف نام ہی سن کر ایک گرم سیال سی دمک میرے سارے بدن میں سرایت کر گئی تھی اور اب رضیہ کی دو انگلیاں دیکھ کر تو میں اس کا غلام ہو گیا تھا۔ مجھے یک لخت خیال آیا کہ میری عمر اب پچیس کے لگ بھگ ہونے والی ہے اور مجھے اب تک ایک شادی شدہ آدمی ہونا چاہیے تھا۔ کیا رضیہ میری بیوی بن سکے گی! لیکن مستری مہتاب دین نہیں مانے گا۔ وہ مجھے ایک نکما بے کار آدمی سمجھتا ہے' جسے کام کرنے یا سیکھنے کا بالکل شوق نہیں۔ میں اس کی نظر میں مستقل مزاج لڑکا نہیں تھا۔ میں اب خوب دل لگا کر کام کروں گا اور مستری مہتاب دین کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

رات کو میں اور شیر علی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بعد میں شیر علی کو نیند آنے لگی اور مجھے اس کو جگانے کیلئے کئی بار اس کے چٹکی لینا پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح شام سے میں بالکل نیا آدمی ہو گیا ہوں اور شادی کتنی اچھی چیز ہے۔ ان باتوں کا شیر علی پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ عورتوں کی پوری نسل ہی کے خلاف ہے۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے تجربہ حاصل تھا کہ جس آدمی پر ایک بار صنفِ نازک کا جادو چل جائے اس کو سمجھانا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر ایک سچا اور وفادار دوست ہونے کی حیثیت سے اس نے مجھے چند ذہانت بھری تجویزیں بتائیں' جن پر عمل کر کے میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا تھا اگرچہ اس نے بعد میں یہ بھی جتا دیا کہ اس کی رائے میں منزلِ مقصود اس قابل ہی نہیں تھی کہ اس کے لیے اتنا قیمتی وقت برباد کیا جائے۔

میں نے کڑک کر کہا۔ ''ابے چیز قناچیے! میں نے رضیہ کے بارے میں تمہاری رائے پوچھی ہی کب تھی؟''

اس نے جواب دیا ''مگر کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ جن سفید انگلیوں نے تمہیں پاگل بنا دیا ہے' وہ شاید رضیہ کی نہ ہوں' اس کی ماں کی ہوں' مستری مہتاب دین کی بیوی کی۔''

اس امکان کا مجھے گمان ہی نہیں تھا کہ وہ انگلیوں رضیہ کے علاوہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر میں اس بارے میں شبہ کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ان انگلیوں میں جو چمک تھی' وہ ادھیڑ عمر کی کسی عورت کی انگلیوں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ شیر علی نے مجھے جو تجویزیں بتائیں' ان میں سے پہلی تو یہ تھی کہ میں ورکشاپ میں جی لگا کر کام کروں۔ مستری مہتاب دین کے سامنے ہمیشہ ایک برخوردار بنا رہوں

اور اس کی موجودگی میں کسی سے کوئی مذاق نہ کروں۔ وجہ یہ تھی کہ مستری سنجیدہ اور متین لوگوں کو بہت وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ (اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا دوست شیر علی مستری کے خانگی حالات کے متعلق کافی واقفیت رکھتا تھا) مستری مہتاب دین کے دو چھوٹے لڑکے آوارہ تھے۔ پڑھنا پڑھانا تو ایک طرف وہ سارا سارا دن گلی کے لونڈوں کے ساتھ کنکوا بازی میں گزارتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو جس کی عمر یہی کوئی دس برس کی ہوگی' ایک دفعہ ایک فلم کی اشتہاری پارٹی کے ہمراہ ایک پوسٹر اٹھائے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ ''اگر تم مستری کے لڑکوں میں سے کبھی کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کان سے پکڑ کر اسے فوراً مستری کے سامنے لے آؤ۔ اس طرح مستری محسوس کرنے لگے گا کہ تمہیں اس کے بیٹوں کا خاص خیال ہے۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں تم کو اپنے گھر کا آدمی سمجھنے لگے گا۔''

تیسری تجویز یہ تھی کہ مستری مہتاب دین کی بیوی حکیم علم علی' مشہور موجد سرمہ۔۔۔ کی تیسری بیٹی تھی۔ حکیم صاحب کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرمہ استعمال کرے گا' وہ دن کو تارے دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ شہر لاہور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تارے ہی نظر آتے ہیں اور حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

شیر علی نے کہا کہ جب بھی تم مستری مہتاب دین سے ملو، باتوں باتوں میں حکیم علم علی مرحوم کے سرے کا ذکر ضرور لے آؤ۔ یہ ذکر ذرا اونچی آواز میں کرنا تاکہ اندر مستری کی بیوی بھی سن لے مثلاً تم قسم کھا کر ایک مادرزاد اندھے کا ذکر کر سکتے ہو جس نے مرحوم کا مشہور سرمہ استعمال کیا تو ایک ہفتے کے بعد دیکھنے لگا۔ یا تم اپنی ہی مثال دے سکتے ہو کہ جن دنوں تم یہ سرمہ استعمال کرتے تھے' تم نے عید کا چاند دو بجے دوپہر ہی کو دیکھ لیا تھا یا اسی قسم کی خرافات۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم مستری کی بیوی کے دل میں گھر کر سکتے ہو اور پھر ایسا وقت بھی آسکتا ہے' جب وہ اپنے مستری سے صاف صاف کہہ دے کہ اس دنیا میں رضیہ کے لیے مناسب ترین رشتہ تمہارا ہی ہے۔ میری طرف سے لکھ کر رکھ لو کہ جو شخص کسی عورت کے باپ کی تعریف کرے گا وہ اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم حکیم کا ذکر اتنی عقیدت سے کرو گے تو مستری کی بیوی چق اٹھا کر بے دھڑک اندر چلی آئے گی اور تمہیں بیٹا کہہ کر اپنے والد مرحوم کی طبابت کا کوئی اور محیر العقول معجزہ سنا دے گی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

دوسرے دن صبح میں اٹھا تو اس پختہ ارادے کے ساتھ کہ آج میں مستری کے قلعے پر ہلہ بول دوں گا اور اسے فتح کر کے رہوں گا۔ ورکشاپ میں میں نے پورا دن لگ کر مستری کا ساتھ دیا اور مناسب حد تک مودب رہا۔ شام کو واپس آ کر میں مستری کے بیٹوں کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس دن تو میری تلاش ناکام رہی۔ مگر دوسری شب کو میں نے ریوالی سینما کے پاس دو لڑکے دیکھے جو فلم ''تھپڑ'' پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مستری مہتاب دین کا لڑکا تھا۔ میں نے لپک کر کہا۔ ''اے فضلو! تم کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو۔'' پھر میں نے مستری کے بیٹے کو بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گلی میں لے چلا۔ اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کی بار بار کوشش کی اور میری شان میں کچھ ناشائستہ کلمات بھی استعمال کیے جو طوالت کے خوف سے یہاں نہیں لکھے جا سکتے ہے۔ لڑکے نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کھڑکیوں میں سے کئی عورتیں چقیں ہٹا کر جھانکنے لگی تھیں۔ مستری مہتاب دین بھی سیڑھیاں اترا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''یہ سینما کے آس پاس آوارہ گردی کر رہا تھا۔ اس لیے میں اسے پکڑ لایا ہوں۔''

''مگر میں۔۔۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ آخر میں کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ میں جب آج بھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا کہنا چاہیے تھا تو کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آتی۔

''خیر کوئی بات نہیں'' مستری بولا۔ ''جاؤ فضلو، سینما دیکھو۔''

خاصی دیر کے بعد میں صرف اتنا کہہ پایا۔ ''اس نے راستے میں میرا ہاتھ کاٹنے کی بھی کوشش کی۔'' مگر افسوس کہ میرے اس فقرے کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ یکسر الٹا اثر ہوا۔ سب لوگ مسکرانے لگے۔۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے بھی مسکرا دینا چاہیے تھا۔ سو میں بھی مسکرانے لگا۔ بہت عجیب مسکراہٹ جو دکھائی دیتی بھی ہے اور نہیں بھی دکھائی دیتی۔

شیر علی کا بتایا ہوا پانسہ بالکل الٹا پڑا تھا مگر مستری مہتاب دین میری نیک نیتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے سینے میں خالص سونے کا دل ہے۔ اس واقعے یا حادثے کے تین دن بعد مستری نے مجھے اور شیخ شیر علی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی کس بلا کا شاطر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ سارا دن میں رات کے کھانے کے خواب دیکھتا رہا۔ میں آئینہ کم ہی دیکھتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آئینہ دیکھنے کے فوراً بعد جو پہلا خیال میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ خودکشی کر لینی چاہیے۔ اس کے باوجود میں لاہور کے کم سے کم تین ایسے آدمیوں کا نام لے سکتا ہوں جن کے مقابلے میں مجھے بڑے اعتماد کے ساتھ خوبصورت کہا جا سکتا ہے اور پھر اصل چیز تو انسان کا دل ہوتا ہے اور اب تک پیارے قارئین تم پر ثابت ہو چکا ہوگا کہ میرا دل سونے کا ہے۔ اس روز میں نے کوئی دو گھنٹے بناؤ سنگھار میں صرف کیے۔ چار بجے کے قریب مولوی کرم الٰہی حجام کی دکان پر (جو ہائی سکول میں میرا کلاس فیلو تھا) دوبارہ داڑھی منڈائی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور مختلف زاویوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کس زاویے سے میں ذرا خوبصورت یا کم بدصورت نظر آ سکتا ہوں۔ کسی بھی زاویے کا نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ مگر میں شاید ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ساتھ آئینے پوری طرح انصاف نہیں کرتے میک اپ کے بعد کپڑوں کا مسئلہ سامنے آیا۔ نتھو دھوبی کی لانڈری میں جا کر میں نے اس سے کسی گاہک کے کپڑے کرائے پر لیے۔ یہ سوٹ ایک بہت چھوٹی ٹانگوں والے بہت موٹے آدمی کا تھا۔ نتیجہ یہ کہ کوٹ بالکل ڈھیلا تھا اور پتلون میرے ٹخنوں سے چار ایک انگل اونچی تھی۔ وہاں سے میں شیخ شیر علی کو دم بخود کرنے کے لیے اس کی دکان پر پہنچا اس نے مجھ پر ایک نظر یوں ڈالی، جیسے مجھے پہچانتا تک نہیں اور ایک گاہک کو آنکھ مار کر اسے اپنے مذاق میں شامل کرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں صاحب بہادر دودھ پئیں گے؟'' فوراً بعد مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی مجھے بنا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں اس لباس میں پروفیسر لگتا ہوں۔ لوہے کے گولے اور کیلیں اگلنے والا پروفیسر۔

شام کو شیخ شیر علی اور میں مستری مہتاب دین کے بالا خانے پر پہنچے۔ مستری کی بیٹھک ایک سستے شریفانہ انداز میں سجائی گئی تھی۔ دو تین پرانے صوفے تھے اور دیواروں پر ''بعد مدت کے لائے ہو تشریف'' کے اکٹھے تین تغرے تھے اور ترک رہنماؤں کی رنگین تصویریں تھیں ایک کونے میں گراموفون رکھا تھا جس پر قالو قوال کا ایک ریکارڈ بج رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک پھُدّ قسم کا نوجوان بیٹھا سر دھن رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اس سے نفرت ہوگئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا ''السلام علیکم پروفیسر صاحب'' اس کے بعد بھی وہ مجھے پروفیسر کہنے پر مصر رہا۔ بلکہ کھانے کے بعد تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سب حاضرین کو تاش کے کھیلوں سے محظوظ کروں۔ میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ مذاق کی ایک حد ہونی چاہیے اور حد سے باہر جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاق کرنے والے کی تربیت میں غفلت برتی گئی ہے۔ اس کے باوجود دعوت بہت کامیاب رہی۔ مستری مہتاب دین ہمیں فقیروں کی کرامات سناتا رہا۔ اس نے بتایا کہ کسی فقیر نے جھاڑی کے سائے میں آرام کیا اور جب وہاں سے اٹھا تو جھاڑی کو دعا دے گیا۔ ایک بار مستری مہتاب دین نے اپنے ساتھ دوستوں کے ہمراہ اس جھاڑی کے چند پتے کھا لیے اور یکا یک اس کی بھوک اتنی بڑھ گئی کہ پہلے تو آٹھ آدمیوں کا بندھا ہوا کھانا چٹ کر لیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا ''بھاگ جاؤ، ورنہ

میں تم کو بھی کھا جاؤں گا'' سب دوست اسے مذاق سمجھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں کو کھا گیا۔ سوائے مستری مہتاب دین کے جس کی طرف رخ کرنے کے بعد اسے ایک ڈکار آئی اور اس کی بھوک مٹ گئی۔ ان باتوں نے کمرے میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں اگر کوئی غیر ممکن الوقوع کہانی بھی سنائی جاتی تو اس پر فوراً یقین کر لیا جاتا۔ اس فضا نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں نے حکیم حاجی علم علی کے مشہور سرمے کا ذکر چھیڑ دیا اور اس مادرزاد اندھے کا ذکر کیا جس نے یہ سرمہ استعمال کرنے کے بعد عید کا چاند دن کے دو بجے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے یہ باتیں اونچے لہجے میں اور بڑے والہانہ پن سے سنائیں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے پرلی طرف مستری کی بیوی اور اس کی بیٹی سب کچھ سن رہی ہیں۔

اس کھانے کے بعد دوسرے ہی دن مستری مہتاب دین نے ورکشاپ میں اپنے لڑکوں کی پڑھائی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا اور اُسی شام سے میں ٹیوٹر کی حیثیت سے ان لڑکوں کو مستری کی بیٹھک میں پڑھانے کے لیے جانے لگا۔ (میں مڈل پاس ہوں) میں وہاں زیادہ دیر تک تو نہ ٹھہرتا مگر جتنی دیر ٹھہرتا' زنانے کے دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتا' کیونکہ میرا خیال تھا کہ رضیہ یا اس کی ماں کا مجھے زیادہ واضح طور سے دیکھنا میرے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہوگا (میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میں صورت شکل کا کچھ ایسا ہی ہوں) تیسرے دن سے میں نے دیکھا کہ ورکشاپ سے چھٹی کے بعد مستری مہتاب دین خود ہی واپسی کے لیے میرا ساتھ ڈھونڈنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک نئی روشنی سی دیکھی جو ایک آدمی کی آنکھوں میں اس شخص کو دیکھ کر آ جاتی ہے جس کو وہ دامادی کا شرف بخشنے کا آرزومند ہو۔ مستری رحیم بخش سے اب وہ بظاہر بہت کچھ کھنچ گیا تھا اور ان کے تعلقات کے درمیان یقیناً موٹے موٹے پردے حائل ہو رہے تھے۔ رحیم بخش اب بھی کبھی کبھی مہتاب دین سے گپیں ہانکنے کے لیے مل رائٹ شاپ میں آتا مگر دس بارہ منٹ بھی نہ ٹھہرتا اور اب جو باتیں وہ دونوں کرتے۔ ان میں وہ پرانا بہاؤ بے تکلفی اور دوستی کی گرمی یکسر مفقود ہوتی۔ میرے لیے یہ معمہ سمجھ سے بالاتر تھا کہ کسی طرح دو پرانے دوست بغیر کسی نمایاں وجہ کے ایک دوسرے سے کھنچے جا رہے تھے۔ لیکن میں دل ہی دل میں حالات کی اس روش پر خوش تھا۔ ایک تو یہ سرخ داڑھی والا آدمی مجھے مطلق نہیں بھاتا تھا۔ دوسرے مستری سے اس کی بے رخی اور کھنچاؤ میرے حق میں مفید ثابت ہو رہا تھا۔ میں رفتہ رفتہ مستری مہتاب دن کی دوستی اور اعتماد حاصل کر رہا تھا اور ایک لحاظ سے اس سرخ داڑھی والے آدمی کی جگہ پر قابض ہو رہا تھا۔

میں نے حالات کی اس غیر متوقع اور مبارک تبدیلی کا شیخ شیر علی سے ذکر کیا۔ اس نے مجھے کڑھائی کے اوپر سے رحم اور ترس کی نظروں سے دیکھا کہ وہ مجھے اس بے وقوف بکرے کی مانند سمجھ رہا تھا جو خود ہی قربان ہونے کے لیے بھاگا جا رہا ہو۔

اس نے کہا۔ ''اب تمہارے لیے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ تم صاف تباہی کے گڑھے کی طرف جا رہے ہو۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بوڑھے مہتاب دین کے دل نے اب تم کو اپنا داماد قبول کر لیا ہے۔ صرف تمہارے ارادہ جتانے کی دیر ہے اور بوڑھا اچھل پڑے گا میں تمہیں بتاؤں وہ اب صرف تمہاری منشا معلوم کرنے کے انتظار میں ہے۔ اب تباہی سے تمہارا بچنا مجھے محال دکھائی دیتا ہے۔''

''گدھے! اس کی انگلیاں سفید، لمبی اور مخروطی ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔'' شیخ شیر علی بولا۔ ''کئی عورتوں کی انگلیاں سفید' لمبی اور مخروطی ہوتی ہیں۔ خود میری انگلیاں لمبی اور مخروطی ہیں۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو داد بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کلبی ہے میرا دوست شیر علی' صنف نازک سے نفرت کرنے والا۔ تاہم وہ ایک دوست کی خاطر سر کٹانے کو بھی تیار رہتا ہے۔ میں نے بمشکل اس کو اس بات پر رضا مند کر ہی لیا کہ وہ اس کام کو انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے اور مناسب طریق پر مستری مہتاب سے مجھے فرزندی میں قبول کرنے کی درخواست کرے۔

''مگر ایک بات میں تم کو پہلے سے بتا دوں۔'' شیخ شیر علی بولا۔ ''جب تمہاری بیوی آ جائے گی تو تمہیں اپنے لیے ایک الگ مکان ڈھونڈنا پڑے گا۔ میں اپنے گھر میں کسی بے وقوف اور ہر بات میں دخل دینے والی باتونی عورت کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا' یہ میرے اعصاب کے لیے نقصان دہ ہے۔''

''نہیں۔ نیا مکان ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ابھی چند دنوں میں تم کو فصلی بٹیروں سے مکالمہ نویس کے عہدہ کی پیش کش آ جائے گی اور تم کو یہ مکان ہمیں سونپ کر مستقل طور پر بمبئی چلے جانا ہو گا۔ پھر بھی جب تم کبھی لاہور آؤ تو یہ یاد رکھنا کہ ہمارے مکان کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ مردانے کی بیٹھک میں ایک بستر ہمیشہ تمہارے لیے بچھا رہے گا اور میں اور رضیہ تمہارے لیے چائے کی ایک پیالی اور ایک رکابی زیادہ خریدیں گے اور ہم انہیں کسی اور کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے۔ یہ تمہارے چچا شیخ شیر علی کے لیے ہیں۔ ہم اپنے ننھوں سے کہیں گے۔''

اب یہ بتانا باعث طوالت ہو گا کہ کس طرح اسی شام شیر علی مستری مہتاب دین سے اکیلا ملنے کے لیے اس کے بالا خانے میں گیا اور کس طرح انہوں نے خوش اسلوبی سے اس معاملے کو طے کیا اور کس طرح جب شیخ نے مستری سے رخصت چاہی تو مستری کی عینک خوشی سے چمک رہی تھی۔ معاملے کے طے پانے میں بالکل کوئی دیر نہ لگی کیونکہ جتنا میں داماد بننے کے لیے بے صبر تھا، اسی قدر مستری خسر بننے کے لیے بیتاب تھا۔ دوسری صبح جب ورکشاپ کی ٹرین کی طرف جاتے ہوئے مستری مہتاب دین مجھے گلی میں ملا تو میں کچھ جھینپ سا گیا۔۔۔ سکول کے لڑکے کی طرح جو اپنی کسی شرارت پر شرمندہ ہو۔ مستری مہتاب دین بے حد خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عینک ٹمٹماتی تھی۔ اسے یقیناً مجھ میں وہ تمام خوبیاں اور اچھی عادات وصفات نظر آ رہی تھیں، جن کی ایک مکمل اور مثالی داماد سے خواہش کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود گاڑی میں ورکشاپ پہنچنے تک مہتاب دین کے چہرہ پر کبھی کبھی ایک تاریک سایہ سا آ جاتا جس طرح کوئی ضدی تکلیف دہ بھوت اس کی خوشیوں کے آنگن میں گھس آنے پر مصر ہو، کیا اس بھوت کا مجھ سے کوئی تعلق ہے؟ شاید مستری میرے چال چلن سے پوری طرح مطمئن نہیں؟ مگر اسی دن مجھ کو معلوم ہو گیا کہ اس تاریک سائے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ اسی لمحے جب مستری رحیم بخش ل رائٹ شاپ میں مستری مہتاب دین کو ملنے کے لیے آیا۔

ہم کسی پہیے پر بولٹوں کا نشان لگا رہے تھے۔۔ خسر اور داماد دونوں خوشی اور اطمینان کی ایک ابدی جنت میں بیٹھے ہوئے تھے، جس وقت وہ سرخ، وہ سرخ داڑھی والا آدمی ایک انسانی بائکر کی طرح دندناتا ہوا شاپ کے اندر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کینہ ور اور خطرناک سی نظر رکی ہوئی تھی جس طرح ایک حملہ آور مرکھنے بیل میں ہوتی ہے اور اس کو دیکھ کر مستری مہتاب دین کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر مجھ پر فوراً اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ پچھلے چند دن انہیں نہ صرف ایک دوسرے سے دور' بے اعتنائی اور بے تعلقی کے صحرا میں لے گئے تھے بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خوفناک جانی دشمنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

''مبارک ہو بھئی'' اس نے بڑے طنز سے ہنستے اور مجھے کندھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں مطلق کوئی ہنسی نہ تھی

صرف ایک خوفناک دمک تھی۔

مستری مہتاب دین سے اس نے صرف ایک پر معنی لہجے میں یہی کہا'' کہوتم آج شام کو گھر ہی پر ہو گے؟ مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔''

اور اس کے بعد وہ چلا گیا۔ میرے اعصاب بالکل تندرست ہیں۔ مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد تک میں بالکل اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں نے اور مستری مہتاب دین نے پیپے کے اوپر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہ سیاہ سایہ زیادہ گھنا ہو گیا تھا۔ مبارک؟ ایسی خوفناک مبارک کبھی کسی نے کسی کو نہ دی ہو گی۔۔۔ مبارک' جو ایک دھمکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو میری منگنی کے بارے میں بتایا کس نے تھا؟ شاید مہتاب دین' اور میری نئی نئی دوستی سے اس نے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کر لیا تھا اور پھر ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں!

اس کے باوجود اگر شام کو میری ملاقات اس نوجوان سے نہ ہو جاتی، جس سے مجھے مستری کے کھانے پر بار بار'' پروفیسر'' کہنے پر نفرت ہو گئی تھی تو میں اس واقعہ کا زیادہ خیال نہ کرتا۔ اس نوجوان کا نام میں نہیں بتاؤں گا اور کہانی کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ مال پر ایک فوٹو گراف کمپنی میں ملازم ہے اور مستری مہتاب دین کی بیوی رشتے سے اس کی پھوپھی لگتی ہے۔ میں اور شیخ شیر علی اپنے ادبی دیوتاؤں کی تلاش میں رات کو کھانا کھانے ایک ہوٹل میں گئے اور جب ہم کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کھانا آنے سے مایوس ہو کر چند سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمیوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے' یکا یک ایک گرجتی ہوئی'' ہیلو پروفیسر'' نے 'ہمیں چونکا دیا اور پیشتر اس کے کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ پروفیسر کہنے والا کون ہے وہی نوجوان ہمارے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔

اس وقت مجھے اس کے'' ہیلو پروفیسر'' میں طنز آمیز تمسخر کی ذرا سی آنچ بھی معلوم نہ ہوئی اور نہ ہی مجھے اس کا'' پروفیسر'' کہنا زیادہ برا لگا۔ کیونکہ سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمی بھی اچانک مجھے دلچسپی اور رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔۔۔ انہوں نے غالباً یہ سمجھا کہ میں اصلی پروفیسر ہوں۔

'' بڑی بھوک لگی ہے۔'' اس نے کہا'' کھانے کا آرڈر دیا ہے یا کھا چکے ہو؟ اچھا۔ بہت اچھا۔۔۔ ہاں بھئی مبارک ہو۔۔ پھوپھی نے آج صبح مجھے بتایا۔ وہ پہلے بھی تمہی کو چاہتی تھیں۔ صرف بوڑھا مہتاب دین شش و پنج میں تھا۔ وہ بھی تمہارے خلاف نہیں تھا مگر اس کے دل پر کچھ اور سوار تھا۔ تمہیں بتاؤں؟ اس کے دل پر کچھ عرصے سے وہ مستری رحیم بخش سوار تھا۔

خیر تم خوش قسمت ہو پروفیسر۔ میرا مطلب ہے۔ اپنی شکل وصورت کے مقابلے میں تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔ رضیہ ہزاروں میں ایک لڑکی ہے۔ مجھے مٹھائی کھلاؤ۔ میں نے اور پھوپھی نے زوردار طریق پر بوڑھے مہتاب دین کے سامنے تمہارے حق میں وکالت کی'' ہمیں پروفیسر چاہیے۔ پروفیسر جیسا اور کوئی نہیں۔ ہم نے مہتاب دین سے اصرار کیا اور آخر اسے منا کے چھوڑا۔ میری پیٹھ ٹھوکو۔ تمہاری کامیابی کا سہرا میرے سر ہے۔''

بعد کی باتوں نے جو اس نوجوان نے مرغ پلاؤ اور شاہی ٹکڑوں کو'' نگلتے'' ہوئے کیں (کھانے کا لفظ اس کے لیے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مہینوں کا بھوکا معلوم ہوتا تھا) ہم پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی پھوپھی کے گھر کے اندرونی حالات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے اور یہ کہ اس کی پھوپھی گھر کی کوئی بات اس سے چھپا کر نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کا ہمراز اور مشیر تھا' بظاہر اسے اپنی پھوپھی کے خانگی معاملات پر برسر بازار ایک مکمل اجنبی سے بحث کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں تھا۔

''رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔۔۔ نہایت خوبصورت لڑکی۔۔۔'' اس نے اونچی آواز میں ہمیں اور سارے ہوٹل کو سناتے ہوئے کہا۔
''میں سمجھتا ہوں تم واقعی قابلِ رشک ہو۔ وہ ایسی بیوی ہے جس پر ایک پروفیسر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔''

اس نے ہمیں اس سرخ داڑھی والے آدمی مستری رحیم بخش کے بارے میں چند ایسی باتیں سنائیں جس سے میرا خون کھولنے لگ گیا اور اس نے میری نفرت دوچند ہوگئی۔۔۔ گھناؤنی شرمناک باتیں اور بالکل غیر متوقع۔ مستری رحیم بخش ایک یہودی تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کی عادات یہودیوں کی سی تھیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو سود پر روپیہ دینے کا عادی تھا۔ کوئی عادت انسان کے بدترین اور اسفل ترین جذبات کو اس حد تک سطح پر نہیں لاتی جتنی یہ سودخوری کی عادت۔ مستری مہتاب دین بھی اس سرخ داڑھی والے آدمی کے قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ قرضہ جو پہلے پہل مستری نے دوستانہ انداز میں تھوڑا تھوڑا کر کے لینا شروع کیا تھا اور جو اب دو ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ رحیم بخش کی پہلی بیوی دو تین سال ہوئے مر چکی تھی اور اس کی لومڑی کی سی آنکھیں ایک عرصہ سے رضیہ پر تھیں۔ جب تم ایک آدمی کے مقروض ہوتے ہو تو کسی وجہ سے اس کے روبرو تم میں ایک احساس کمتری سا پیدا ہو جاتا ہے' تم اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتے۔ کمزور سادہ لوح آدمی اپنے قرض خواہ کے ہاتھوں میں آسانی سے کٹ پتلی بن جاتا ہے۔ بعینہ یہی کیفیت مستری مہتاب دین کی ہوئی۔ رحیم بخش نے مستری مہتاب دین کو ایک پاکباز اور صاف دل سیدھا آدمی سمجھ کر اس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور چالاکی کی باتیں کر کے اس سے یہ زبانی اقرار لینے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ وہ رضیہ کا رشتہ مستری رحیم بخش کو دے گا۔ اس کے عوض مستری رحیم بخش یہ لکھ دینے کو تیار تھا کہ وہ مہتاب دین سے قرضے کی ایک ایک پائی وصول کر چکا ہے۔

دوسرے دن مستری مہتاب دین زیادہ خوش تھا۔ رات کو مستری رحیم بخش نہیں آیا۔ میں نے لڑکوں سے فارغ ہو کر مستری سے باتیں شروع کیں اور رات کو جو کچھ سنا تھا اس کا ذکر چھیڑا۔۔۔ مگر احتیاط کے ساتھ تاکہ اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ میری کیا غرض ہے۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ دو ہزار کوئی بڑی رقم نہیں اور انشاءاللہ ہم دونوں مل کر مستری رحیم بخش کے قرضے کی ایک ایک پائی چکا دیں گے۔ مستری کے دل پر اس بات کا بے حد اثر ہوا کہ میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ مستری کو اب میری موجودگی سے اطمینان محسوس ہوتا تھا۔

شیخ شیر علی نے مستری سے دوبارہ مل کر میری شادی کی تاریخ بھی طے کر لی۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں۔۔۔ دن اسی طرح کسی واقعے کے بغیر گزرنے لگے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دن میرے لیے سخت انتظار اور بے پایاں خوشی کے دن تھے۔ ایک شام میں نے دروازے کے پیچھے سے رضیہ کی جھلک بھی دیکھ لی تھی۔ خوبصورتی اور معصومیت کا وہ لشکارہ اب بھی میرے دل کو منور کر دیتا ہے۔۔۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میری نیندیں اس کے خوابوں سے چھلکنے لگی تھیں۔ رضیہ کی ماں اب مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی بلکہ میرے سامنے بے دھڑک آتی جاتی اور کھلم کھلا باتیں کرتی' وہ کافی باتونی عورت تھی (کون عورت باتونی نہیں ہے!) اور اس میں ایک دلچسپ قوتِ بیانیہ تھی جس سے وہ معمولی واقعات اور عام لوگوں پر ایسا رنگ چڑھاتی تھی کہ وہ آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد اس کا باپ ایک عام سرے کا بازاری موجد معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک پہنچا ہوا ولی' جس کا سرمہ اس کا ایک ادنیٰ ترین کرشمہ ہو۔ وہ دیندار بھی تھی اور صفائی پسند بھی اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ رضیہ نے بھی یہ ساری صفات اپنی ماں سے ورثے میں پائی ہوں گی۔ وہ بھی اتنی ہی دلچسپ باتیں کرتی ہو گی' وہ بھی دیندار اور صفائی پسند ہو گی۔ میں جلد ہی رضیہ کی ماں کا لاڈلا اور چہیتا بن گیا کیونکہ مجھے بڑی بوڑھیوں کو خوش کرنے کا ایک قدرتی ملکہ

حاصل ہے۔۔۔ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ بوریوں والا بالا خانہ اب میرے لیے چمکتی ہوئی چلمنوں والا شاندار محل تھا، جس کے گرد میرے خواب منڈلاتے تھے اور وہ بدنصیب لالٹین بھی۔۔۔ (مگر میں اپنا وعدہ بھول رہا ہوں اور پھر اس کا ذکر کر بیٹھا ہوں) وہ لالٹین جو بس دیوار میں ذرا سی اٹکی ہوئی تھی میرے تصور میں کئی دفعہ جلنے لگ جاتی۔

اور اب میں ستمبر کی پہلی کے خوفناک دن پر آتا ہوں۔۔۔ وہ دن جب تقدیر کی ضرب پڑی' بجلی کی طرح ناگہانی اور لرزہ خیز تقدیر کی ضرب۔ انسانوں پر ہمیشہ اچانک آپڑتی ہے اور میرے خیال میں یہ مشیت کے لیے اچھی بات نہیں کہ۔۔۔ (مگر نعوذ باللہ میں مشیت سے جھگڑنے والا کون) حسب معمول میں اور مستری مہتاب دین اکٹھے علی الصبح ورکشاپ جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے۔ مجھے یاد ہے جب گاڑی چلی تو کسی نے زور زور سے نعت گانی شروع کر دی۔ فوراً ہی سارا ڈبہ گانے والے کا ساتھ دینے لگا اور میں اور مستری مہتاب دین بھی آہستہ آہستہ نعت کے الفاظ گانے والے کے پیچھے دہرانے لگے میں نے دیکھا کہ وہ محبت اور مذہبی عقیدت کا جذبہ جو سادہ اور نیک طبیعتوں میں اس قدر قوی ہوتا ہے' مستری مہتاب دین پر طاری ہونے لگا۔۔۔ اس حد تک کہ اس کا بدن تھرکنے لگا اور اس کی عینک بھیگ گئی اور اس کے شیشے دھندلا گئے وہ عقیدت و وارفتگی سے کانپتی ہوئی آواز میں گائے جا رہا تھا۔ اس وقت اسے یوں عقیدت سے گاتا دیکھتے ہوئے مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ آج یہ سسکتی ہوئی گاڑی اسے آخری بار ورکشاپ کی طرف لے جا رہی تھی۔۔۔ جہاں اس کے ماضی کا زیادہ تر حصہ پڑا ہوا تھا' جہاں اس نے اپنی بڑی لڑائیاں فتح کی تھیں' جہاں مشینیں اس کے اشارہ کی منتظر کھڑی رہتی تھیں۔

ورکشاپ میں مستری مہتاب دین بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ میں نے شاید یہ ذکر نہیں کیا کہ اس سے ایک دن پہلے اس کو ہیڈ مستری بنا دیا گیا تھا اور یہ امر قدرتی طور پر اس کی خوشی اور اطمینان کا موجب تھا۔ اس دن بھی میں نے اس کو ہنستے ہوئے تو نہیں دیکھا البتہ اس کی مسکراہٹیں پہلے سے زیادہ فراخ تھیں۔ ہم ایک گھنٹہ اکٹھے مل رائٹ شاپ میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد چارج مین نے مجھے ورک مینوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ پینٹ فیکٹری میں واٹر پائپ لگانے کے لیے بھیج دیا۔ جب میں واپس آیا تو مستری مہتاب دین اپنے اوزار وغیرہ اٹھائے، کچھ جھکا ہوا سا' مل رائٹ شاپ سے باہر لوکو شاپ کی طرف آ رہا تھا۔ جہاں لوہے اور بھاپ کے ان محیر العقول دیوؤں کی (جن کو تم آہنی پٹڑیوں پر بھاگتے ہوئے دیکھتے ہو) مرمت اور فٹنگ ہوتی ہے۔ اسے COMP/AIR پر کچھ کام کرنا تھا جو مل رائٹ شاپ میں دستیاب نہ تھی' میں بھی مستری مہتاب دین کے ساتھ ہو لیا کیونکہ لوکو شاپ دیکھنے کا جو موقعہ بھی آئے میں ہمیشہ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔ ہم ان ایک سوٹن کے X.B پائپ کے دیوؤں کے پاس سے گزرے جو لوکو شاپ کے باہر بے کار اور ابدی انتظار میں گھڑے ہوئے تھے' کیونکہ وہ ایک ریلوے انکوائری بورڈ کی تحقیق کے مطابق بھاگتے بھاگتے لوہے کی پٹڑیوں سے نیچے اتر جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اب انہیں شریر لڑکوں کی طرح ایک طرف بے کار کھڑا کر دیا گیا ہے، جہاں وہ کوئی شرارت نہیں کر سکتے تھے' شاید کبھی اب ریل گاڑی نہیں کھینچیں گے۔ ان کے غرور اور طاقت کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ مستری مہتاب دین نے فخریہ ان میں سے ایک انجن کی طرف اشارہ کیا جس کے پہیوں کی فٹنگ ۱۹۲۹ء میں اس نے کی تھی۔ انجنوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہم لوکو شاپ میں داخل ہوئے۔ مشینوں اور کلوں کی مسلسل کر کر' غیر زمینی بدروحوں کی طرح چیختی ہوئی COMP-AIR کی سوراخ کرنے والی سوئیاں گڑگڑاتی ہوئی ٹرالیاں' کلہاڑے اور ہتھوڑے کا شور' شعلوں کی لمبی لکیریں اندھیرے میں زبانوں کی طرح لپکتی اور غائب ہوتی ہوئیں۔ درمیان میں کہیں کہیں انجنوں کے مہیب اور سیاہ ڈھانچے کھڑے ہیں۔۔۔ خاموش اور بے حس' جن کی تیمارداری کے لیے لاتعداد مشینیں سارا دن گڑگڑاتی رہتی ہیں اور ہزاروں آدمی اپنا پسینہ بہاتے اور اپنے کپڑے سیاہ کرتے ہیں۔ کہیں کہیں دیو

ہیکل کرینوں کے آہنی پنجے نگاہ کو روکتے ہیں ۔۔۔ آہنی پنجے جو گزرنے والوں اور کام کرنے والوں کے سروں کے اوپر دھمکی کے انداز میں جھولتے رہتے ہیں' آہنی پنجے جو بڑھائے جاسکتے ہیں اور سمیٹے جاسکتے ہیں ۔ جو دو دو من بھاری پہیے کو اس طرح آسانی سے اوپر اٹھا لیے ہیں جیسے ہم روئی کا پھاہا اٹھاتے ہیں ۔ میں مسحور سا ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک آہنی پنجے کو ایک بائلر کو دبوچے اور اس کو دور ایک انجن کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھنے لگا ۔ آہنی پنجے کی حرکات کو کرین کے اوپر ٹرالی میں بیٹھا ہوا سرخ داڑھی والا ایک آدمی کنٹرول کر رہا تھا ۔۔۔ ٹرالی اپنی پٹریوں پر دوڑی رجا رہی تھی اور اس بائلر کو اپنی منزل پر لئے جا رہی تھی ۔

مستری مہتاب دین کچھ عرصے کے لیے ایک کیبن میں ایک اسسٹنٹ چارج مین سے باتیں کرنے کے لیے رکا ۔ اسسٹنٹ چارج مین نے ایک خالی COMP/AIR کی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت کوئی کام نہیں کر رہا تھا اور جسے مستری مہتاب دین اپنے استعمال میں لاسکتا تھا ۔ میں پہلے COMP/AIR سے سوراخ ہوتے نہیں دیکھا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا ۔ ہم دونوں اس ٹیوب کے پاس جا بیٹھے اور مستری مہتاب دین پنسل سے اپنے نشانات کو زیادہ واضح کرنے لگا ۔ ہمارے پاس ہی بائیں طرف ایک انجن کا آدھا اگلا ڈھانچا کھڑا تھا' چار پانچ آدمی کوئلے سے سیاہ اوورآلوں میں کھڑے ہوئے امید اور انتظار کے عالم میں اوپر چھت کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور آسمان سے کسی نعمت کے اترنے کے امیدوار ہیں ۔ ان میں سے ایک بے چین لہجے میں چلا رہا تھا ۔'' ذرا آگے ۔۔۔ اور دائیں ۔۔۔ شاباش ۔''

مستری مہتاب دین یکلخت اٹھ کھڑا ہوا COMP-AIR کی ٹیوب ذرا دور اور کچھ اونچی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے اس تک ہاتھ نہیں پہنچا سکتا تھا ۔ میں نے انجن کے گرد کھڑے ہوئے آدمیوں کی نگاہوں کے مرکز کی طرف دیکھا یہ مرکز اوپر کرین کی ٹرالی تھی جو اپنے آہنی جھولتے ہوئے ہاتھ میں ایک گول سلنڈر نما بائلر کو اٹھائے اس کو انجن کی طرف لا رہی تھی ۔ پھر یکا یک میں نے دیکھا کہ مستری مہتاب دین ٹھیک اس انجن اور اس آتے ہوئے آہنی پنجے کے درمیان کھڑا ہوا تھا ۔ میں اس کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے چلایا، اسی وقت انجن کے گرد کھڑے ہوئے دوسرے آدمی بھی چلائے میرے چلانے پر اس نے جلدی سے منہ میری طرف پھیرا اور عین اسی وقت بائلر ٹھیک اس کے منہ کے اوپر آ کر لگا ۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ایک لٹو پر کھڑا ہوں ۔ ساری ورکشاپ میری آنکھوں کے سامنے گھوم سی گئی ۔ پھر میں نے ایک پل کے لیے بائلر کی چمکتی ہوئی پینتل کور کو دیکھا جو مستری مہتاب دین کو ٹھوڑی سے جکڑے فرش پر گھسیٹ رہی تھی ۔۔۔ جب کہیں وہ آہنی پنجا اور وہ بائلر اپنے دیوانے سفر کو روک سکے ۔ مستری مہتاب دین کا جسم ایک گھڑی کی طرح نیچے فرش پر گرا ۔ یہ سانحہ اتنا ہولناک اور اچانک تھا کہ اب بھی مجھے یہ ایک مبہم سا بدخواب معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ میرے گرد ایک ہزار آدمیوں کا شور تھا ۔ ہم سب مستری کے جسم کی طرف بھاگے ۔ میرے آنکھوں کے سامنے اب بھی چرے ہوئے جبڑے کا عکس سا ہے ۔ اوورآل میں ملبوس ایک ایک آدمی نے خون میں لتھڑے ہوئے جسم پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا'' ۔۔۔۔ مر گیا ۔۔۔۔'

بہت سے آدمی اوپر ٹرالی کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ میں نے بھی اوپر دیکھا ۔ کرین کی ٹرالی میں بیٹھا ہوا آدمی اوپر سے جھکا ہوا، نیچے اپنے کئے کو دیکھ رہا تھا ۔ اس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ تھی اور مجھے اس کے موٹے ہونٹوں میں ایک خوفناک سی ہنسی چنگاریاں چھوڑتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ وہ مستری رحیم بخش تھا ۔

بعد میں سب نے کہا کہ یہ ایک حادثہ تھا ۔ شاپ میں سب سے زیادہ مغموم خود مستری رحیم بخش معلوم ہوتا تھا ۔ جس کی سرخ داڑھی

آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی اور جو ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ اپنے ایک ہی اور بہترین دوست کا قاتل ہے۔ دوسرے ورک مین اس کی ڈھارس بندھاتے' اس سے ہمدردی جتاتے اور اسے اطمینان دلاتے کہ اس میں اس کا قطعاً قصور نہیں تھا اور مستری مہتاب دین کو موت قدرت کی طرف سے آئی تھی۔

(بعد میں انکوائری پر کمیٹی نے مستری رحیم بخش کو صاف بری کر دیا۔۔۔ اسے آئندہ صرف محتاط رہنے کی ''سزا'' دی گئی۔ شاید یہ حادثہ ہی تھا)

ان دنوں کا روزنامچہ لکھنا لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔ یہ وہی پرانی رونے دھونے اور رنج والم کی کہانی ہے جو گھر کے روٹی کمانے والے کی موت کے بعد ہمارے ہزاروں گھروں میں دہرائی جاتی ہے۔ بیوہ اور رضیہ کا غم بیان کرنے کی بجائے تصور کیا جا سکتا ہے۔ میں اس بارے میں صرف اسی قدر لکھوں گا کہ میں مرحوم کی تجہیز و تکفین سے لے کر بعد کی دلدوز گھڑیوں تک اس غمزدہ کنبے کے لیے ڈھارس اور امید کا باعث بنا۔ بیوہ مجھ پر بیٹے کا دعویٰ رکھنے لگی اور میں بھی اسے اپنی ماں سمجھنے لگا۔

ان آدمیوں میں سے جو مرحوم کی ماتم پرسی اور جہلم پر آئے مرحوم کے کچھ گوجرانوالہ کے رشتہ دار بھی تھے۔۔۔ معمولی چھوٹے سے آدمی جنہوں نے رسم کے طریقے پر بیوہ اور بچوں کو گوجرانوالہ چلنے اور ان کے پاس رہنے کا مشورہ دیا۔ بیوہ نے جو ایک خوددار عورت تھی اور رشتہ داروں کے ٹکڑوں پر پلنا غلط سمجھتی تھی' انکار کر دیا۔ پھر اس کو میرا بڑا سہارا تھا۔ ان رشتہ داروں کے علاوہ ورکشاپ کے کئی ورک مین ماتم پرسی اور ہمدردی کے لیے آئے کیونکہ اپنی دینداری اور خوش خلقی کی وجہ سے مرحوم مستری ورک مینوں میں کافی ہردلعزیز تھا۔ ان لوگوں میں مستری رحیم بخش بھی شامل تھا اور اس کا غم دوسروں کے غم سے زیادہ گہرا اور حقیقی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پاس عورتوں کی طرح آنسوؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا' جسے وہ بات بات پر بہانے کو تیار تھا۔ (مگر مجھے کسی کی نیت پر شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا) بیوہ بھی اپنے غم کے شدید ترین لمحوں میں چیخ چیخ کر مستری رحیم بخش کو اپنے خاوند کا قاتل بتا رہی تھی اور اس کو غائبانہ ہزاروں بددعائیں ارسال کرتی تھی' اپنے پرسکون لمحات میں اس بات کو ماننے لگی تھی کہ اس کا خاوند ایک حادثے میں مرا ہے۔ مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہو گیا کہ مرحوم کی موت ایک حادثہ تھا اگرچہ اس یقین نے اس نفرت کو جو میرے دل میں اس سرخ داڑھی والے آدمی کے خلاف گھر کر چکی تھی' کسی طرح بھی کم نہ کیا۔

مستری مہتاب دین کی موت کے ڈیڑھ مہینے بعد میں شیخ شیر علی کی دکان پر بیٹھا اپنی شادی کے سلسلے میں مشورہ کر رہا تھا کہ مستری کا چھوٹا لڑکا فضل پیغام لایا کہ اماں بلاتی ہیں۔ چھوٹا لڑکا کچھ ڈرا اور سہما ہوا سا تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھے بغیر بالاخانے کا رخ کیا۔ اوپر پہنچا تو مجھے اندر کمرے میں سے وہ کڑکتی ہوئی شوریدہ آواز سنائی دی جو میری اس قدر جانی پہچانی تھی اور جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ بیوہ کچھ ڈری اور سکڑی ہوئی نیچے دری پر بیٹھی تھی' مستری رحیم بخش لنڈے بازار کے ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ خوداعتمادی سی تھی اور ہونٹوں میں دبی ہوئی غولانہ مسکراہٹ جو میں نے اس وقت اس کے چہرے پر دیکھی تھی جب وہ ٹرالی میں سے جھکا ہوا نیچے مستری کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا۔ ''یہی قاتل ہے' قاتل یہی ہے۔'' اس نے میری آمد کو مطلق کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی گھٹتی ہوئی قابل نفرت آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''مرحوم میرا تین ہزار روپے کا مقروض ہے۔ بے شک بہن یہ سنگ دلی معلوم ہوتی ہے کہ میں اب اس روپے کا تقاضا کروں جبکہ مرحوم کے خاندان پر یکلخت اتنی سخت مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ مگر میں کیا کروں مجھے فی الواقع اس روپے کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ نواں کوٹ میں میرے مکان کی تعمیر صرف روپے کی کمی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔''

اس نے مجھے ایک کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے جواب دیا" بے شک مرحوم میرا بہترین دوست تھا مگر روپے کے معاملے میں یہ میری پرانی عادت ہے کہ میں زبانی قول اقرار سے لکھت پڑھت کو زیادہ محفوظ سمجھتا رہا ہوں۔ میرا مقولہ ہے کہ" حساب۔ حساب ہے۔"
اس نے اپنے لمبے بھورے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالتے ہوئے کہا۔" کاغذات اب بھی میرے پاس ہیں۔ یہ سرکاری اسٹامپ والے کاغذ ہیں اور ان پر مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ اس نے فلاں فلاں تاریخ کو مجھ سے اتنا قرضہ لیا۔ عام آدمیوں سے میں روپے کے پیچھے چار آنہ سالانہ سود لیتا ہوں مگر مرحوم کو میں نے بغیر سود کے قرض دیا تھا۔"

" تین ہزار روپیہ" بیوہ گڑگڑاتے لہجے میں بولی۔" دیکھو بھائی رحیم بخش۔ تم اس کے اتنے گہرے دوست تھے۔ تمہیں معلوم ہے ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں۔ گھر کا کمانے والا چل بسا ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس مہینے مکان کا کرایہ کیسے چکاؤں گی۔ میں تمہاری پائی پائی ادا کردوں گی۔ مگر مجھے کم از کم تین چار مہینے کی مہلت تو دو۔"

" میں اُس روپے کا بالکل تقاضا نہ کرتا۔" مستری رحیم بخش بولا۔" اگر میرے نواں کوٹ والے مکان کی تعمیر روپے کی کمی کی وجہ سے رک نہ جاتی۔ تعمیر کے رکنے سے مجھے مالی نقصان ہو رہا ہے۔ اس وقت تک وہ مکان کرایہ پر چڑھا ہوا ہوتا۔ اب میں انتظار نہیں کرسکتا۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ اس آدمی کی سنگ دلی اور بے حسی نے ہمیں کچھ عرصے کے لیے مبہوت کردیا۔ اس خاموشی کو آخر اسی نے ہی توڑا" ہاں! ایک صورت ہوسکتی ہے اور تم وہ جانتی ہو" اس کے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ایک اطمینان سا جیسا شاید اس مکڑے کو محسوس ہوتا ہوگا جو ایک مکھی کو اپنے جالے میں پھنسا ہوا دیکھ لیتا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ صورت کیا تھی؛ جس کی طرف اس مکار بوڑھے نے اشارہ کیا تھا۔۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ بیوہ بھی دل میں جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ اس بوڑھے کے ہاتھ میں دینے پر اس کی موت کو ترجیح دے سکتی تھی۔ مگر عورت ایک کمزور مخلوق ہے۔۔ کمزور اور متلون مزاج۔۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ مستری رحیم بخش کے پھیلائے ہوئے جال میں کوئی چیز پھنس کر تڑپنے لگی ہے۔

بیوہ شاید اب بھی منت سماجت سے اس سنگ دل کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی مگر میں بول پڑا" مستری رحیم بخش۔ تم ان عورتوں کو زیادہ تنگ نہ کرو۔ تم میرے ساتھ نیچے دکان پر چلو۔ تمہارا سارا روپیہ میں چکاؤں گا۔۔۔ میں۔" اگرچہ مجھے اس کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا کہ میں اتنا سارا قرضہ کیسے چکا سکوں گا۔

بیوہ نے مجھے کچھ تشکر اور کچھ شک کی نظروں سے دیکھا۔ بوڑھا رحیم بخش اسی کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ شیر علی کا بنک میں کچھ روپیہ جمع ہے۔ شاید وہ مجھے ادھار دینے پر رضامند ہوجائے یا شاید قانونی طور پر کوئی ایسا رخنہ مل جائے، جس سے یہ بوڑھا مستری بیوہ سے قرضہ وصول کرنے کا حقدار ثابت نہ ہوسکے۔ جو کچھ بھی ہو اس بات کا میرے دل میں پختہ ارادہ تھا کہ اب میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا کہ بوڑھا دوبارہ جا کر بیوہ اور رضیہ کو کرلائے اور رلائے۔ جس وقت ہم بالا خانے سے اترے، رحیم بخش میرے ساتھ دکان پر چلنے کی بجائے مجھے سیڑھیوں کے دروازے کے سامنے روک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لومڑ کی سی عیاری تھی۔ وہ شاید اس شبے میں مبتلا ہو رہا تھا کہ کہیں میں سچ مچ ہی اس کا قرضہ نہ چکا دوں اور بیوہ کو اس کے چنگل سے رہائی مل جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

" میری بات سنو" وہ کہنے لگا۔" تم اس معاملے میں کیوں پڑتے ہو تم نے سارے جہاں کے دکھ درد کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔ یہ لوگ

تمہارے قریبی رشتہ دار لگتے ہیں کہ تم ان کی خاطر تین ہزار سے ہاتھ دھونے کو تیار ہو رہے ہو؟ تم کو آج کے زمانے میں شاید روپے کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہیں"۔۔۔ پھر اس نے اچانک پینترا بدلا۔ "میری بات سنو۔ مجھ سے ایک ہزار روپیہ لو اور اس معاملے میں دخل نہ دو۔ تم اس بات میں آؤ ہی نہیں۔۔۔ میں۔۔"

وہ اپنے فقرے کو مکمل نہ کر سکا۔ اس کی گھٹی آواز فوراً گویا کٹ کر رہ گئی۔ اوپر خطرناک طور پر ٹنگی ہوئی اس لالٹین کے ڈھانچے نے یہی لمحہ اپنے گرنے کے لیے چنا۔ میں نے لالٹین کو اس کے سر کے اوپر تڑاخ سے گرتے دیکھا۔ اس نے قدرتی طور پر اپنے بازو اور سر کو بچانے اور مقدر کے اس وار کو روکنے کے ارادے سے اٹھانے چاہے۔ مگر لالٹین تو ہاتھ اٹھنے سے پہلے گر چکی تھی اور مستری رحیم بخش دروازے سے باہر آخری سیڑھی پر منہ کے بل جا گرا تھا۔۔۔ ایک لمحے تک وہ درد اور تکلیف سے کلبلاتا رہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ لالٹین اس کے سر کے اوپر بیس فٹ کی بلندی سے گری تھی اور گری بھی سیدھی اپنی بھالا نما دم کے بل پر، جو ٹھوس لوہے کی تھی اور لالٹین کا سب سے بھاری حصہ تھی۔ وہ نوکدار دم اس ساری قوت کے ساتھ جو بیس فٹ کی بلندی نے اس میں پیدا کر دی تھی، اس کے سر پر آ گری اور اس کی پیشانی کو چھیدتی ہوئی نیچے سڑک پر کھنکناتی ہوئی جا پڑی۔ شیخ شیر علی نے اپنی دکان سے لالٹین کو مستری رحیم بخش کے سر پر گرتے ہوئے دیکھا۔ دو تین راہ چلتوں اور دکانداروں نے بھی یہ منظر دیکھا اور وہ بھاگتے ہوئے آ پہنچے۔

جلدی سے مستری رحیم بخش کو ایک فوجی ٹرک میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رستے ہی میں مر گیا۔۔۔ ایک حادثہ۔۔۔ نہایت افسوسناک حادثہ۔۔۔

رضیہ اب میری بیوی ہے اور ہم دونوں شیخ شیر علی کے بالا خانے میں رہتے ہیں۔ شیخ شیر علی کو ابھی تک فصلی بٹیر لمیٹڈ سے مکالمہ نویسی کی پیش کش نہیں آئی اور اس لئے اس نے چار و ناچار اپنے آپ کو ایک باتونی عورت کی موجودگی برداشت کرنے پر رضامند کر لیا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس طرح کچھ عرصے تک اس کے اعصاب پر غیر موافق اثر پڑے گا۔ مگر اس کا تو وہ بھی اقرار کرے گا کہ جو کھانے رضیہ بناتی ہے، وہ بے حد لذیذ ہوتے ہیں اور ہوٹل کے کھانوں سے کہیں زیادہ ٹھوس اور قوت بخش۔ کہتے ہیں ایک اچھی بیوی اپنے ساتھ اچھی قسمت بھی لاتی ہے۔ دوسری بیویوں کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں مگر رضیہ کی صورت میں یہ بالکل درست ہے۔ شادی کے دوسرے ہی دن مجھے فورمین نے بلا کر یہ خوشخبری دی کہ مجھے اسی مہینے سے مستری بنا دیا گیا ہے۔ (خان بہادر کا اس میں مطلق کوئی ہاتھ نہیں) رضیہ صرف میرے لیے ہی خوش قسمتی نہ لائی بلکہ میرے دوستوں کے لیے بھی، کیونکہ جس روز مجھے مستری بنایا گیا۔ شیخ شیر علی کو مدیر رسالہ "بھینس" کا خط موصول ہوا جس میں اس کے مضمون "قرون وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت" کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ بھی اسی پائے کے مضامین سے رسالے کی قلمی معاونت کو جاری رکھا جائے۔

اور کل ہی مجھے الہ دین انارکلی میں ملا۔ اسے کنڈکٹر سے ترقی دے کر چیکر بنا دیا گیا ہے۔۔۔ ایک دم چیکر!

○

رحمان مذنب

نام	:	رحمان مذنب
قلمی نام	:	رحمان مذنب
پیدائش	:	۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء بہ مقام اندرون ٹکسالی گیٹ، لاہور، مغربی پنجاب
وفات	:	۱۶ فروری کی شام ۲۰۰۰ء بہ مقام اتحاد کالونی، لاہور
تعلیم	:	ابتدائی تعلیم مدرسہ نعمانیہ، لاہور۔ اس کے بعد اپنے والد مفتی محمد عبدالستار کی زیرِ نگرانی رہے۔

مختصر حالات زندگی:

لاہور کے ٹکسالی دروازے، کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان میں رحمان مذنب کی جائے پیدائش ایسی تھی کہ اِدھر عشاء کی اذان کان میں پڑتی، اُدھر مغنیہ کی تان سنائی دیتی۔ یہ بادشاہی مسجد، لاہور کے داہنی طرف کا علاقہ ہے۔ گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر عزیز تھیٹر تھا، جہاں سارا سال ناٹک کمپنیوں کی آمد و رفت رہتی۔ عزیز تھیٹر سے متصل ہیجڑوں کی بیٹھکیں تھیں اور چند قدم پر نکیائیوں کی گلی (ممی) اور ڈیرہ درانیوں کا بازار، جو شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی شفاء منزل پر جا کر تمام ہوتا۔ اطراف و جوانب میں تکیے، جوا خانے اور چنڈو خانے تھے اور ان کے بیچ مدرسہ نعمانیہ، جہاں رات دن علم و عرفان کی بارش ہوتی رہتی۔ ہر ہائی نس اقبال بیگم، عنایت بائی ڈھیروں والی، استاد بڑے غلام علی خاں، خورشید بائی ہیجڑوں والی، استاد برکت علی خاں، مبارک علی، کامیڈین حسن علی عرف حسو، استاد عبدالوحید خاں کیرانے والے اور استاد عاشق علی خاں پٹیالے والے سبھی کا یہاں قیام تھا۔

رحمان مذنب کے والد مفتی محمد عبدالستار صاحب کا تعلق بادشاہی مسجد سے تھا۔ ان کا بیشتر وقت فقہی کتب کے مطالعہ،، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ یہ پہلی جنگ کا زمانہ تھا اور مفتی صاحب کا فتویٰ چلتا تھا۔ فتوے کی رو سے چار سال تک کے مفقود الخبر فوجیوں کی بیویوں کو کسی اور شخص سے نکاح کی اجازت مل جاتی۔ لڑکپن میں رحمان مذنب نے رات گئے تک جاری رہنے والی، اپنے ہی گھر کی علمی محفلوں

میں حاضری دی اور پہروں اپنے والد کے ذاتی کتب خانہ کی سیر کی۔ ۱۹۳۵ء میں والدہ خیر النساء کی شفقت اور ستمبر ۱۹۳۷ء میں والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوئے۔ اس سے قبل رحمان مذنب کی تخلیقی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں ان کا ڈراما ''جہاں آرا'' عزیز تھیٹر کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔ لگ بھگ ۱۹۴۰ء میں لاہور سے اندور اور وہاں سے بھوپال چلے گئے، اس کے بعد دہلی اور آخر کار ۱۹۴۶ء میں لاہور لوٹ آئے۔ بھوپال میں قیام کے دوران حاجی پور میں اپنے بہنوئی پروفیسر سید منظور علی کے لٹھ بند عزیز کی حسین بیٹی کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اسی عالم میں براستہ دہلی، لاہور واپسی ہوئی۔ تادیر کاغذ اور قلم سے نباہ کیا۔ فری لانس ادیب کی حیثیت سے تقریباً ہر موضوع پر لکھا۔ بچوں کے لیے سینکڑوں کہانیاں اور ریڈیائی ڈرامے قلم بند کیے۔ روحانیت، ماحولیات، جادو اور تاریخ کے میدان مستقل طور پر ان کی قلم رو میں رہے۔ ٹیلی ویژن کی ''الف لیلیٰ'' سیریز کے لیے رحمان مذنب کے لکھے ہوئے ڈراموں کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔ ۱۶ فروری ۲۰۰۰ء کی شام اتحاد کالونی، لاہور میں اپنے گھر کے صحن میں میز کرسی لگائے، تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف تھے کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اوّلین تحریر: ڈراما:

''جہاں آرا'' برائے عزیز تھیٹر، لاہور: ۱۹۳۴ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''پیال''، 'جامعہ' دہلی، لگ بھگ ۱۹۴۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''بجلی جان'' (افسانے) — رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ لاہور — طبع اوّل: ۲۰۰۲ء

۲۔ ''بالا خانہ'' (افسانے) — رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ لاہور — طبع اوّل:

۳۔ ''رام پیاری'' (افسانے) — رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ لاہور — طبع اوّل:

۴۔ ''خوشبو دار عورتیں'' (افسانے) — رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ لاہور — طبع اوّل: ۲۰۰۲ء

۵۔ ''پنجرے کے پنچھی'' (افسانے) — رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ لاہور — طبع اوّل: ۲۰۰۳ء

۶۔ ''ترقی پسند ادب کا مسئلہ'' (تنقید) — ناشرین، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۵۷ء

۷۔ ''جادو اور جادو کی رسمیں'' (سماجیات/مذہبیات) — ناشرین، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۵۷ء
(یہ کتاب دوسری بار ''دین ساحری'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے)

۸۔ ''سرکش روحیں'' — نسیم بکڈپو، چوک نیلا گنبد، لاہور — طبع اوّل:

۹۔ ''سو سال تک زندہ رہیے'' — نسیم بکڈپو، چوک نیلا گنبد، لاہور

۱۰۔ ''لمبی عمر اور تندرستی'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۱۔ ''خلائی تسخیر'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۲۔ ''دنیا کے نامور جاسوس'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۳۔ ''نامور جاسوس عورتیں'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۴۔ ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' (ترجمہ) — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور — طبع اوّل: ۱۹۷۱ء

یہ ''گلوری آف اسلام'' کا ترجمہ ہے۔ انعام یافتہ کتاب

۱۵۔ ''مستقبل کے ذرائع'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور — طبع اوّل:

۱۶۔ ''روس میں اسلام کا خطرہ'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۷۔ ''میرا پہلا تصویری اطلس'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۸۔ ''پانی'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۱۹۔ ''گیس'' — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور

۲۰۔ ''نہریں دریا اور بند'' (علم آب) — شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور — طبع اوّل:

۲۱۔ ''داستان آب وگل'' — ناشرین، لاہور — طبع اوّل:

۲۲۔ ''تعمیر کی راہیں'' — ناشرین، لاہور

۲۳۔ ''نور پور کی بستی'' (بچوں کے ناول) — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور — طبع اوّل:

۲۴۔ ''بھورے خان اور بھیڑیا'' (بچوں کے لیے ناول) — سن رائز پبلی کیشنز، لاہور — طبع اوّل:

۲۵۔ ''لکڑ ہارا اور چور'' (بچوں کے لیے ناولٹ) — گلڈ اشاعت گھر، کراچی — طبع اوّل: ۱۹۶۴ء

۲۶۔ ''فرعون کا خزانہ'' (بچوں کے لیے کہانیاں) — ٹیکنیکل بک ڈپو، لاہور — طبع اوّل:

۲۷۔ ''بیورج پلان'' (سماجیات از سر ولیم بیورج کا ترجمہ) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اوّل: لگ بھگ ۱۹۴۴ء

۲۸۔ ''لوہے کا آدمی'' (بچوں کے لیے کہانیاں) — ٹیکنیکل بک ڈپو، لاہور

غیر مدوّن:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ

''یونان کا عہد جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء'' (مقالہ) — مطبوعہ: ''اقبال'' لاہور — اکتوبر ۱۹۶۴ء، اپریل ۱۹۶۵ء، (۶۶ صفحات)

''دنیا کی پہلی طوائف'' (مقالہ) — مطبوعہ: ''ہمدرد ڈائجسٹ'' کراچی — اپریل ۱۹۷۰ء

''شاعری اور ڈراما'' (ترجمہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ) — مطبوعہ: ''ساقی'' کراچی

''ڈرامے کے تاریخی محرکات اور مہیجات'' (مقالہ) — مطبوعہ: ''ماہ نو''، کراچی — جولائی ۱۹۵۶ء

''ڈرامے کی ابتداء'' (مقالہ) مطبوعہ: ''اقبال''، لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء

''سوفوکلیز'' (مقالہ) مطبوعہ: ''اقبال'' لاہور اکتوبر ۱۹۵۹ء

''یونان کا تھیٹر'' (مقالہ) مطبوعہ: ''اقبال''، لاہور اکتوبر ۱۹۶۰ء

غیر مرتب حالت میں موجود ہیں

وفات سے قبل مستقل پتا:

۱۸۔ غزالی سٹریٹ، شیراز پارک، اتحاد کالونی، لاہور۔ ۱۸۔ پاکستان

اعزاز:

۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام برائے ''لکڑ ہارا اور چور'' (ناولٹ): ۱۹۶۴ء

۲۔ ترقی ادبی بورڈ، کراچی، ادبی انعام برائے ''لکڑ ہارا اور چور'' (ناولٹ): ۱۹۶۴ء

۳۔ اردو سائنس بورڈ، لاہور، اوّل انعام برائے ''وادی سندھ اور اس کا ماحول''

نظریۂ فن:

''افسانہ زندگی کی بکھری ہوئی حقیقتوں کا مظہر ہے۔ حقیقت بیانی اور انکشاف حقیقت اس کی مالابد ہے۔ اچھی سوچ، اچھے عمل، بری سوچ اور برے عمل والے...... نیک و بد، منافق اور راستباز سبھی یہاں ملتے ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن کو کماحقہ، جاننا افسانہ نگار کی اساسی ضرورت ہے۔

افسانہ نگاری کے طور طریقے اور اصول ہیں۔ کرداروں کو ملانے جلانے اور ٹکرانے کا عمل سہل نہیں۔ ان کے تصادم اور ملاپ سے کہانی کو آغاز سے انجام تک لے جانے کے لیے دقتِ نگاہ درکار ہوتی ہے۔ پھر خود افسانہ نگار کی اپنی سوچ، اپنی راہ ہوتی ہے، اپنا نظریۂ عدل ہوتا ہے۔ اپنے جذبات، تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ لکھنے کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے نظریۂ عدل سے سمت مقرر کرتا ہے۔ نیک و بد کو اپنے ترازو میں رکھتا ہے اور انصاف کرتا ہے۔ جرم و سزا کا نظام قائم رکھتا ہے، سیاہ و سفید کا فرق واضح کرتا ہے۔''

رحمان مذنب

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۸۷ء)



حوالہ جات:

۱۔ مفتی محمد عبدالستار صاحب ایک سیرۃ کی کتاب کے مصنف اور عربی کی دو کتب (مطبوعہ: ۱۹۳۶ء) کے مترجم تھے۔

پُتلی جان

رحمان مذنب

پُتلی جان کا آنا تھا کہ جانی کے یہاں صف ماتم بچھ گئی۔ ذرا کشائش پیدا ہونے کو آئی تھی کہ پٹ بند ہو گئے۔ پہلے ہی وہ کب نہال تھا کہ آفت کا یہ نیا پہاڑ سر پر آ گرا۔ غریب نے جو سنہرے خواب دیکھے اور جو کچھ سوچا تھا وہ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔

چوبارے کا حال خستہ تھا۔ کڑیاں ایک تو دھویں کی کالونچ سے اتنی بھیانک ہو رہی تھیں جیسے چڑیلوں نے اپنی ننگی باہیں پھیلا دی ہوں۔ دوسرے جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھیں۔ ان کے کڑاکے بول رہے تھے۔ پوری چھت سن رسیدگی کے باعث دم توڑ رہی تھی اور اب تو جانی کے دم توڑنے کے دن بھی آ گئے تھے۔

جو حال چھت کا وہی دیواروں کا اور فرش کا۔ ہر روز کنستر بھر پلستر جھڑتا۔ فرش کی ٹیپ تو ٹیپ اینٹیں تک اکھڑ چکی تھیں اور کھرا تو اچھا خاصا چوبچہ بن گیا تھا۔ کسے امید تھی کہ اس چوبارے کی بھی سنی جائے گی؟ پھر بھی جانی کی ہڈی بڑی کڑی تھی۔ ہمت ہارنے والی آسامی نہ تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے بالوں میں اطمینان سے کنگھی پھیری اور ''سجن گھر آ جا'' والا مخصوص گیت گانے بیٹھ گیا۔

حاجی تنکا پر اب کسے بھروسہ تھا۔'' جانی کا سہارا تو ٹوٹ چکا تھا۔ اس خود غرضی کی کوئی حد تھی۔ پُتلی جان کا آنا تھا کہ جانی اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

جانی نے نئے کپڑے پہن اور لپ سٹک لگا کر آئینے میں صورت دیکھی تو وہ دن یاد آ گیا جب یہ چوبارہ میلا اور خستہ نہ تھا۔ یہاں نئی دری بچھی تھی اور حاجی تنکا نے اچانک پیچھے سے آ کر اس زور سے بھینچ لیا تھا کہ وہ چیخ کر رہ گیا تھا۔ اس دن حاجی تنکا نے کہا تھا۔'' جانی بٹیرے کو کنگنی دی ہے۔ جی توڑ کر لڑے گا۔ تیری قسم! سب کو بھگل کر دے گا۔ ہمارے بٹیرے کی دنیا عاشق ہے۔ بتا تیری رضا کیا ہے؟''...... پھر وہ بٹیر کو بھول گیا اور شراب کے گرد ہو گیا۔ دیسی کی پوری بوتل چڑھا گیا اور نشے میں آ کر جانی کا برا حال کر دیا...... جیسے کسی نے نئی روئی دھنک کر رکھ دی ہو۔

دیر تک جانی کے بدن میں لذیذ سی ٹیس اٹھتی رہی۔ کوئی اسے تند اور جلادانہ وحشت سے نوچ لے تو وہ اف نہ کرے۔ اسے تو مزا ہی تب آئے جب نرم نرم رگوں میں میٹھے میٹھے مگر تیکھے تیکھے کانٹے رینگنے لگیں' لیکن اس کا کوئی اپنا بنے تبھی تو۔

حاجی تنکا کا بٹیر بڑا جی مار نکلا۔ اس نے سب بٹیروں کو میدان سے بھگا دیا اور اس فتح یابی کی خوشی میں چوبارے پر تمام رات گانا بجانا ہوا اور شراب کا دور چلتا رہا' پھر نہایت وسیع پیانے پر حرب و ضرب کی محفل گرم رہی۔

پھر زمانہ بدلا۔ نہ نئی وردی رہی نہ چوبارے کا اجلا پن۔ وہ گرم بازاری بھی جاتی رہی۔ یہ سب ہوا تو جانی پر ہی ہوا' اجڑا تو اسی کا چوبارہ اجڑا۔ برابر کا چوبارہ تو رشکِ جنت بن گیا۔ اس سے جانی کے سینے پر سانپ نہ لوٹتے تو کیا ہوتا۔

برابر کے چوبارے کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ جب سے موتی شاہ پکڑا گیا اور جوئے کا اڈہ بند ہوا تب سے یہ اجڑا پڑا تھا۔ یوں تو جانی کا چوبارہ بھی کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا تاہم یہ آس تو لگی تھی کہ ایک نہ ایک دن مولا مشکل کشا کے یہاں اس کی سنی جائے گی' پھر جانے کس کی دعا کا الٹا اثر ہوا کہ جانی کا چوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا اور برابر کے چوبارے پر من برس پڑا۔ صابر شاہ کی خانقاہ پر تو وہ روز ہی جاتا لیکن شاہ جی کی نظر چوک گئی اور دھوکے میں ہمسائے پر جا پڑی۔

پٹلی جانی کے آنے سے جانی کا پتا تو کٹا لیکن اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ چڑھتے سورج کی پوجا نہ کرو پر اس کی نندا بھی نہ کرو! جانی کم از کم اسی اصول کا قائل تھا۔ اس نے بڑے حوصلے سے چھاتی پر وہ پتھر رکھ لیا جس نے اس کا مکان ڈھا دیا تھا۔

پٹلی جان کا چوبارہ تین دن کے اندر اندر پرانے سے نیا ہو گیا۔ بوسیدہ چھت ادھیڑ کر نئی چھت ڈالی گئی۔ پلستر ہوا۔ ٹیپ ہوئی۔ سفیدی ہوئی اور یہ سب کچھ جانی نے جی کڑا کر کے دیکھا۔ وہی مسالہ جسے جانی کے چوبارے میں کھپنا تھا پٹلی جان کے چوبارے میں لگا۔ ایک بار تو مستری بھولے سے تگاری تیشہ لئے جانی کے چوبارے پر ہی چڑھ آیا' پر جب جانی نے کولھے پر ہاتھ دھر کر یہ کہا تو وہ جنس کے نیچے اتر آیا...... ''ہائے ہائے' صابر سائیں ہمارا نہیں پٹلی کا ہے۔ میری جان! اسی نے ہوا کا رخ پلٹ دیا تو ادھر کیوں آئے؟ مسالہ میرے ہی چوبارے کا ہے پر لگے گا برابر کے چوبارے میں۔ مستری! تیرا بھلا ہو' جہاں کی مٹی ہے اسے وہیں لگا! اب یہ اپنے یہاں نہیں لگے گی۔''

مستری تو چلا گیا لیکن جانی دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے یہ غم نہ تھا کہ اس کا چوبارہ مرمت سے رہ گیا اور پٹلی جان کے چوبارے کی سنی گئی۔ اسے یہ غم کھا گیا کہ پٹلی جان نے اس کے چوبارے کی گہما گہمی لوٹ لی۔ کون اپنا بھرا گھر اجڑتا دیکھ سکتا ہے۔ جسے قہقہوں کی برکھا میں رہنے کا چسکا پڑا ہو وہ تنہائی میں کیسے رہے؟

حاجی تنکا نے تو یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے اسے جانی سے کبھی تعلق خاطر ہی نہ رہا۔ حالانکہ دونوں کا باقاعدہ نکاح پڑھا گیا تھا۔ لیکن حاجی تنکا اب کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ تو صاف کہتا...... ''نکاح وکاح کوئی چیز نہیں۔ یونہی ڈھکوسلہ ہے۔ من کا سودا ہے۔ جب تک موج آئی' جانی سے یارانہ رکھا اور جب موج نہ رہی تو یارانہ توڑ دیا۔ کسی کا ٹھیکہ تو نہیں کہ یارانہ توڑو ہی نہیں۔''

جانی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ حاجی تنکا نکاح کر کے مکر گیا تھا۔ اس میں اس کی بڑی بدنامی تھی۔ کون اپنی بے قدری گوارا کرتا ہے؟ ناک کٹ جاتی ہے اور برادری میں باتیں ہوتی ہیں۔ اس کی تو ہستی ہی مٹ گئی۔ ذلت نے اسے دو کوڑی کا کر دیا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ جچتا ہی نہ تھا۔ نیا یارانہ ہوتا تو وہ اتنا اثر نہ لیتا اور اتنی سبکی محسوس نہ کرتا۔ پٹلی جان نے جانی کے یار کو نہیں اس کے خصم کو بھتایا اور اسے نظروں سے گرا کر خاک میں ملایا۔ جانی خلیفہ جی کے پاس جا کر رویا پیٹا لیکن وہ بے چارہ کیا کرتا۔ اس نے محض اتنا کہا۔ جانی! صبر کر مولا مشکل کشا تیری سنے گا اور تجھ پر اپنا فضل کرے گا۔ تو راستی پر ہے۔ مولا مشکل کشا سچوں کا ساتھ دیتا ہے۔ گھبرائے بات نہیں بنتی۔''

جانی نے صبر تو کر لیا پر وہ کبھی کبھی یہ بات ضرور سوچتا کہ خلیفہ جی پٹلی جان کو منع کیوں نہیں کرتے کہ کسی کو رسوا اور ذلیل نہ کرے۔ قصور

آخر پٹلی جان کا بھی تو تھا' لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ پٹلی جان کو یہاں آئے آخر دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی وہ خلیفہ جی کی بڑائی کا قائل ہی نہ ہوگا۔ خلیفہ جی کا حکم تو اسی پر چل سکتا ہے جو ان سے عقیدت رکھتا ہو۔

جانی کا چوبارہ جانی سمیت اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کا سہاگ قضا نے لوٹ لیا۔ رسوائی نے اسے سمیٹ لیا۔ وہ تاریکی کے بوجھ تلے دب گیا۔ چوبارے کا سارا پلستر اور ملبہ اس کے سر پر آ گرا۔ سانس لینا اور جینا دوبھر ہوگیا۔ برابر کے چوبارے سے جب قہقہوں کا شور اٹھتا تو اسے بھالے لگتے اور سینہ چھلنی ہو جاتا۔ اس کا چوبارہ دوزخ کا ایک ایسا ٹکڑا بن گیا جہاں سب سے بڑا عذاب نازل ہو رہا ہو۔ ایسے میں اگر جانی سانس لیتا اور جیتا رہا تو یہ اس کے حوصلے کی خوبی تھی۔

رزق خدا دیتا ہے' چنانچہ جانی بھوکا نہیں مرا۔ سینے کی مشین اس کے پاس تھی۔ اس نے صابر سائیں کے مزار پر جا کر دعا مانگی' خلیفہ جی سے مشورہ لیا اور باوفا منکوحہ کی طرح زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چوبارہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سی دکان میں جا بیٹھا۔ عذاب جہنم کسی قدر کم ہوا۔

پٹلی جان کا ستارہ دیکھتے دیکھتے زمین سے اڑ کر آسمان پر جا پہنچا۔

یہ عجیب اتفاق ہے جس علاقے میں پٹلی جان کا چوبارہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں کبھی کوئی لیڈر نہ پیدا ہوا۔ البتہ لیڈروں کا ادھر گزر ضرور تھا۔ چھوٹے موٹے لیڈر اور موری ممبر تو وہاں رات گزارنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتے لیکن ایسے عارضی لیڈروں کے نام پر بازار کا نام نہ پڑ سکتا تھا۔ علاقائی لیڈر تھے۔ سو انہوں نے بھی معاملے کی نزاکت پر کبھی توجہ نہ دی۔ ایسی اہم جگہ اور نام سے محروم رہے۔ حالانکہ الیکشن کے دنوں میں ان کی توجہ بازار کی ایک ایک اینٹ' ایک ایک کواڑ' ایک ایک کھڑکی' ایک ایک دکان اور ایک ایک چوبارے پر رہی۔ ووٹ کے سلسلے میں وہ بیسیوں بار خلیفہ جی اور پٹلی جان سے ملے بلکہ ایک لیڈر نے تو ایسے زریں موقعے پر بیٹے کی ولادت کو غنیمت جانا اور بازار بھر کو پٹلی جان کے ناچ گانے سے نوازا۔

ایک طرف کھلی سڑک تھی جو نورے پہلوان کے اکھاڑے کو نکل جاتی اور دوسری طرف رنڈی بازار تھانے تک پھیلا ہوا تھا، درمیان میں فرلانگ بھر کا یہ بے نام ٹکڑا تھا جسے لوگ رفتہ رفتہ پٹلی بازار کہنے لگے۔

جانی کو بجا طور پر رنج تھا کہ وہ یہاں نہ جانے کب سے آباد تھا لیکن کسی نے اس کے نام پر بازار کا نام نہ رکھا۔ اسے حاجی تنکا نے گھر میں ڈال کر برباد کیا۔

پٹلی بازار بہت جلد مقبول ہوگیا۔ اس کے نام ہی میں جادو کا اثر تھا۔ اگر شیخ شریف سے اسے موسوم کرتے، جس کا علاقے کی تین چوتھائی جائیداد پر قبضہ تھا۔ یا صابر سائیں کے نام سے فائدہ اٹھاتے، تب بھی بازار کی شہرت کو ایسے چار چاند نہ لگتے جواب لگے تھے۔ بازار نہایت آسانی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہوگیا نہ کسی وزیر نے رسم افتتاح کی' نہ بورڈ چسپاں ہوا نہ اخبار میں خبر چھپی۔ بات ہونے والی تھی سو ہوگئی۔

جو شوقین مزاج رنڈی بازار کی سیر کو آتے، وہ پٹلی بازار سے ہو کر جاتے اور بڑے غور سے بازار کی جان کو دیکھتے اور قدرت کے ہنر کی داد دیتے بعض تماش بین کچے بھی ہوتے جو ایسی سٹی بھولتے کہ پٹلی بازار کے ہو کے رہ جاتے۔

ایک حاجی تنکا ہی نہیں۔ پٹلی جان پر سارا جہاں مرنے لگا۔ کون تھا جو ادھر سے گزرتا اور پٹلی جان کا دیدار کئے بغیر چل دیتا لوگ اسے اس انہماک سے دیکھتے جیسے وہ عالم بالا سے اتری ہوئی نعمت ہو اور اسے دیکھنے سے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔

پٹلی جان کی رنگت ایسی تھی جیسے گورے پن اور سانولے پن نے بیاہ رچایا ہو۔ جیسے صندل کے شربت میں مالٹے کا رس ملا دیا ہو اس کی

پنڈلیاں اور بانہیں ولایتی کانچ کی طرح صاف اور چکنی تھیں۔ ان پر ہاتھ یوں پھسلتے جیسے ریشمی کپڑوں پر گرم گرم استری۔ آنکھیں یوں مٹکتیں جیسے تالاب میں ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ لمبی لمبی پلکیں سانپ کے پھن کی طرح جھومتیں۔ اسے دیکھ کر خیال آتا کہ چاند نے شفق کی نقاب اوڑھ لی ہے۔ کلائی پر زنانہ گھڑی بندھی رہتی۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں ہوتیں اور کانوں میں ٹاپس پڑے رہتے۔ عید بقرعید پر وہ گلے میں ہار ڈال لیتا۔

پنچھی جان کو مولسری کے پھولوں سے بڑی رغبت تھی۔ ہمیشہ دیر سے اٹھتا اور سورج چاہے بانس چڑھے اوپر چلا جائے، وہ مولسری کے پھول بیننے کے لئے ضرور باغ میں جاتا۔ مولسری کے پیڑوں میں ایسی جاذبیت نہیں اور پھول دیکھنے میں ایسے خوشنما بھی نہیں لیکن ان کی خوشبو دلپذیر ہوتی ہے۔ مٹھی بھر میں سمیٹ کر جب پنچھی جان انہیں سونگھتا تو یوں آنکھیں میچ لیتا جیسے خوابوں کے کسی ایسے انمول دیس میں کھو گیا ہو جہاں صرف کیف ہو، صرف لذت ہو، صرف مہک ہو۔

مولسری کے پھول کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ پھلیرے نے موتیا اور چنبیلی کے ساتھ مولسری کے پھول اور ہار بھی رکھنے شروع کر دیئے جب پنچھی جان حاجی تنکا کی دکان پر آ کر بیٹھتا تو پھلیرا ابھی آ کر کھڑا ہو جاتا اور یوں مولسری کے ہار بک جاتے۔ پنچھی بازار میں صرف مولسری کے ہار بکتے۔ انہیں ٹھکانے لگا کر پھلیرے کو رنڈی بازار کا رخ کرنا پڑتا۔

جب کوئی قدردان مولسری کا ہار خرید کر پنچھی جان کے گلے میں ڈالتا اور اسے بازو سے پکڑ کر دکان سے اٹھا کر لے جاتا تو حاجی تنکا کو بڑا تاؤ آتا لیکن کیا کرتا؟ پنچھی جان نہ تو اس کا منکوح تھا اور نہ وہ پنچھی جان کا بوجھ اٹھا سکتا تھا' جو دن میں دو بار کپڑے بدلے اور ہر ہفتے ریشمی سوٹ بنوائے۔ پیئرز سوپ کی سالم ٹکیہ سے بکرے اور چھترے کو نہلائے۔ تکیوں کے غلاف اور بستر پوش روز بدلوائے۔ نئی نئی قمیصیں شلواریں اور دوپٹے اس بے تکلفی سے مہترانی کے حوالے کر دے جیسے دادا جی کی فاتحہ کے لئے اسے کسی بہت بڑے حلوائی کی دکان مل گئی ہو اسے حاجی تنکا کیسے اپنے کھاتے میں ڈالتا' پھر ایک اور بات بھی تھی ...... پرانی ریتیں اور رسمیں مٹانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ یوں تو وہ جانی سے منہ موڑ اور رشتہ توڑ چکا تھا لیکن اتنا اسے معلوم تھا کہ نکاح پر نکاح کرنے میں بڑی قباحتیں تھیں۔ نکاح کی نئی بیل منڈھے نہ چڑھ سکتی تھی۔ ان حالات میں وہ قناعت کے اصول پر چل رہا تھا۔

جانی کا بھی گزارہ صبر و قناعت پر تھا اور حاجی تنکا کا بھی۔ دونوں کا مرض بالکل ایک نہ تھا لیکن علاج ایک ہی تھا۔ گویا صبر و قناعت امرت دھارا تھا۔

بازار میں ایسا کوئی نہ تھا جس کی نظرِ عنایت پنچھی جان پر نہ ہو۔ جب وہ مولسری کے پھول بین کر باغ سے لوٹتا یا یونہی چوبارے سے اٹھ کر بازار میں ٹہلنے چلا آتا تو گاموں کی دکان کے پھلوں سے لدے پھندے چھپے اسے اپنی طرف بلاتے۔ ریڈ بلڈ مالٹے اور سنگترے مسکرا مسکرا کر گاموں کی جانب سے خیر سگالی کا سندیسہ دیتے۔ سردیوں کے زمانے میں انہی سے دکان کی بہار ہوتی۔ جب پنچھی جان منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تو گاموں کی دکان پر جا پہنچتا اور مالٹے سنگترے اٹھا کر چھیلنے لگتا۔ کبھی کبھی چھیلتے چھیلتے باریک سی پھوار چھوٹ کر اس کی آنکھوں میں جا گرتی اور وہ ایک دم آنکھیں میچ لیتا۔ گاموں جھٹ دھوتی کا پلو اٹھا کر اس کی آنکھیں پونچھ دیتا۔ پنچھی جان کو اس سے کسی قدر سکون ملتا اور وہ مالٹے اور سنگترے کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

گاموں ہر موسم کا پھل لاتا۔ جب مالٹے، سنگترے کمیابی کی وجہ سے صرف بیماروں کے خریدنے کے لائق رہ جاتے۔ تب بھی وہ پنچھی جان کی بھینٹ چڑھانے کی خاطر ضرور لاتا۔ کبھی کیلے آتے اور پنچھی جان انہیں چھوڑ کر کسی اور پھل کی جانب ہاتھ بڑھاتا تو اس کی کلائی تھام کر

بول اٹھتا ...... ''سوہنیا! ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! مولا جانے بڑا شیریں ہے۔'' ...... پھر بن پوچھے چھلکا اتار دیتا اور کیلا بڑھا کر کہتا ...... ''شہزادیا! دکان تیری ہے جو من میں آئے کھا' لیکن ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔'' یہ درست ہے کہ کیلے لذیذ ہوتے ہیں۔ گھلے ہوئے میٹھے اور خوشبودار لیکن پتلی جان ہمیشہ ان سے کتراتا۔ مگر جتنا وہ کتراتا گاموا تنا ہی اسے ستاتا اور آخر کیلے کھا کر ہی پتلی جان کی خلاصی ہو جاتی۔

جانی یہ سب کچھ دیکھتا اور جی ہی جی میں کڑھتا۔ اسے گامو نے کبھی جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا تھا۔

حاجی تنکا بھی جلتا۔ اس کی دکان پر تو پان سگریٹ ہی ملتے اور پتلی جان کا صرف انہی پر گزارہ نہ تھا۔ اسے مالٹے' سنگترے اپنی طرف کھینچ لیتے۔ حاجی مجبور تھا۔ وہ پھل پھلاری کے دھندے سے بالکل ناواقف تھا۔ ہاں پتلی جان کو خوش رکھنے اور گامو سے اس کا پیچھا چھڑانے کی نیت سے سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی، وہ منڈی جا کر سستے داموں تھوڑا تھوڑا پھل لانے لگا۔ تھڑے پر جگہ بنا کر ٹوکرا جما دیتا لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ گامو کی دکان پر جو بہار تھی وہ یہاں کہاں؟ گاہک تو گاہک پتلی جان نے بھی توجہ نہ دی۔ وہ مالٹے لائے تو پتلی جان کیلے کھانے گامو کی دکان پر جا پہنچے حالانکہ اسے کیلوں سے نفرت تھی' پھر وہ کیلے لے آئے تو پتلی جان سردہ کھانے گامو کے پاس چلا جائے۔

حاجی تنکا سمجھ گیا کہ پتلی جان کو صرف پھل ہی سے نہیں گامو سے بھی رغبت ہے۔ جہاں تک اڈے کا تعلق تھا حاجی تنکا کی دکان سے بہتر بازار میں کوئی اڈہ نہ تھا۔ پڑے کی ایک طرف اتنی جگہ تھی کہ پتلی جان کی چوکی بچھ جائے۔ سر پر ایک تختے کے اوپر ریڈیو جما رکھا تھا۔ برابر میں نامی گرامی پہلوانوں اور ایکٹرسوں کی تصویریں لگی تھیں۔ دکان کے وسط میں بجلی کا بلب آویزاں تھا۔ چوبارے سے آ کر بیٹھنے کو جی چاہتا تو پتلی جان یہیں آ بیٹھتا۔ ایک تو یہاں نمائش ٹھیک سے ہوتی۔ دوسرے سب شوقین مزاج سہولت سے جمع ہو جاتے۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ لطیفے چلتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں کی جاتیں اور گاہک پھنستے۔ اور کہیں یہ بات نہ تھی۔

گامو کی دکان پتلی جان کا اڈہ نہ بن سکتی تھی۔ وہ اور ہی قسم کا آدمی تھا۔ اس روانی اور بے تکلفی سے مخول کرتا کہ اچھے اچھوں کے منہ پھیر دیتا۔ پتلی جان اس کے یہاں جا کر بیٹھتا تو گاہک بدک جاتے۔ بھلا ایسا کون دکاندار ہو گا جو اپنے گاہکوں کی سہولت کا خیال نہ کرے۔ ایک آدھ گاہک سے نہ بنتی ہو تو اور بات ہے۔ سب سے تو نہیں بگاڑی جا سکتی۔

گامو کی نسبت حاجی تنکا ذرا نرم طبیعت کا آدمی تھا' نہ مخول بازی میں مہارت رکھتا اور نہ پتلی جان کے گاہکوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھتا۔ سچ پوچھو تو اس کی دکانداری پتلی جان کی وجہ سے چمک اٹھی۔ جسے پان سگریٹ کی عادت نہ تھی اسے بھی یہ چسکا لگ گیا۔ کوئی خود پے نہ پے پتلی جان کو تو سگریٹ پلانے اور پان کھلانے میں اپنی نجات ضرور سمجھتا۔ حاجی تنکا پتلی جان کا احسان مند تھا اور اس لئے اسے کبھی گامو کی دکان پر جانے سے نہ ٹوکتا۔ پتلی جان کو کس بات کی کمی تھی؟ حاجی تنکا ذرا ماتھے پر تیوری ڈالے تو وہ اٹھ کر جیجے کے قہوہ خانے میں جا بیٹھے اور پھر گاہک بھی بلا حیل وحجت وہیں پہنچ جائیں۔

سورج نکلنے سے پہلے پہلے جیجے کا قہوہ خانہ کھل جاتا۔ لال لال کوئلوں کی گود میں کیتلیاں رکھی ہوتیں۔ جن کی ٹوٹیوں سے بھاپ ناچتی ہوئی نکلتی اور ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کیتلیوں کے اندر گدگدیاں اٹھتیں اور چائے کا تیز تیز فلیور پتلی جان کو پاس بلاتا۔

جیجا چائے بناتا اور خوش الحانی کے ساتھ کبھی ''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے'' کا ورد کرتا اور کبھی ''پتلی کمریا' ترچھی نجریا'' کی رٹ لگاتا۔ دن چڑھے پتلی جان کی آنکھ کھلتی تو وہ انگڑائیاں لیتا کھڑکی میں آ بیٹھتا۔ جیجا اسے دیکھتے ہی زور سے سیٹی بجاتا' پھر ہاتھ کے اشارے

سے بلاتا' کچھ دیر تو پُتلی جان متوجہ ہی نہ ہوتا۔ بس انگڑائیاں لئے جاتا اور اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کائنات انگڑائیاں لے رہی ہو۔ نیند کا نشہ ایک دم کہاں اترتا۔ جب ذرا ہوش آتا تو بھجے کی طرف دھیان دیتا۔ جیجا ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے لگاتے یا چائے تیار کرتے کرتے مسکراتا اور کہتا...... ''میری جان! چوبارے کا کھیڑا چھوڑ! ذرا ہمارے پاس آ! ہماری خاطر چائے کی ایک پیالی بھی پی لے''...... پُتلی جان کی آنکھیں دور سے نیم خوابیدہ ستارے کی طرح مستی میں کھوئی نظر آتیں۔ بڑے انداز سے صراحی دار گردن موڑ کر کہتا...... ''ہونہہ جسے کلیجے میں آگ لگائی ہو وہ چائے پیئے......''

دولا حرامی چپ نہ رہتا پرانے سینما کی سیڑھیوں پر اس کا سری پائے کا دیگچہ کھلا رہتا اور پُتلی جان کو دعوت دیتا آنکھ مار کر کہتا۔ ''میری جان! ذرا ہم پر نظر سوئی رکھنا۔ گرما گرم مال ہے۔ مغز اور مکھ ملا کر دوں گا۔ آ تو سہی۔ داتا جانے جلوہ آ جائے گا۔''

بھجا پھاڈی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی بھجے کے قہوے خانے کو اور کبھی دولے حرامی کے دیگچے کو دیکھتا' پھر تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔

صبح صبح بھجے پھاڈی کو کون خاطر میں لاتا؟ ہاں' دوپہر آتی اور اس کے یہاں کونڈی ڈنڈا کھڑکتا تو پُتلی جان وہاں چلا جاتا۔ اس وقت حاجی تنکا' گاموجیجا' دولا حرامی اور خلیفہ جی بھی آ جاتے۔ کبھی کبھی جانی بھی کچھ دیر کے لئے آ جاتا۔ مٹی کا پیالہ ساری رقابتیں اور کدورتیں مٹا دیتا۔

پُتلی جان کی ریشمی اور سرمئی آنکھوں کی دو پیالیاں سرخ نشے سے لبریز ہو جاتیں۔ ہونٹوں پر ہنسی رقص کرنے لگتی اور بہار نکھر جاتی۔ گامو گھڑا سنبھال لیتا اور ترنگ میں آ کر گانے لگتا۔ دیر تک محفل جمی رہتی اور پھر ادھر پُتلی جان نہانے کے لیے اٹھتا اور ادھر جمی ہوئی محفل بکھر جاتی۔

جسے سب چاہیں اسے ایک آدمی کیسے بس میں لائے۔ حاجی تنکا یہی غنیمت سمجھتا کہ پُتلی جان اس کی دکان پر آ بیٹھتا اور دکانداری کو چار چاند لگا دیتا اسی دکان' اسی تھڑے اور اسی چوکی پر جہاں اب پُتلی جان بیٹھتا ہے۔ کبھی جانی بیٹھتا تھا' لیکن اتنی بکری کبھی نہیں ہوئی۔ اب حال یہ تھا کہ پانوں کی ڈھولی دو دن میں غائب اور کم از کم سگریٹ کا ایک بڑا ڈبہ بھی۔ سوڈا لیمن الگ درجنوں کے حساب سے اٹھتا۔ ایک پھل ہی نہیں بکے۔

پُتلی جان کا مزاج درویشانہ تھا۔ اس میں لالچ تو رتی بھر نہ تھا۔ بازار والوں سے یوں پیش آتا جیسے یہ اس کے عزیز ہوں' بھجے کی چائے' گامو کے پھل اور دولے حرامی کے پائے رائیگاں نہیں گئے۔ وہ ان عزیزوں کا حق پہچانتا اور ادا کرتا اگرچہ یہ لوگ چوبارے پر خالی ہاتھ آتے لیکن جو چاہتے پا لیتے۔ بھجے پھاڈی کا قرض اس کی دکان میں جا کر ادا کیا جاتا۔ رہا حاجی تنکا کا معاملہ سو وہ گھر کی بات تھی۔

رات کو بارہ ایک بجے جا کر بازار سونا پڑتا اور بیوپار بند ہوتے۔ علاقے میں دو سینما تھے کوئی ان کے حساب سے دکان بڑھاتا تو رات کے دو بجے سے پہلے فارغ نہ ہوتا۔ جس دن اتفاق سے مندا رہتا۔ اس دن حاجی تنکا سینما کے حساب سے دکان بند کرتا ورنہ پہلے ہی فارغ ہو کر پُتلی جان کے چوبارے میں جا کر سو رہتا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد نیند بڑی پیاری لگتی' لیکن زندگی فقط نیند ہی تو نہیں۔ حاجی تنکا جانتا تھا کہ بعض راتیں ایسی بھی آتی ہیں جب نیند حرام ہو جاتی ہے ایسی راتوں میں صرف تین چیزوں کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی۔ ان میں سے ایک چیز وہ خود تھا' دوسری چیز پُتلی جان اور تیسری شراب۔ شراب کی اس کے یہاں کمی نہ تھی کیونکہ وہ اس کی بلیک کرتا تھا۔

پُتلی جان کو حاجی تنکا کی ذات سے اور تو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا۔ ہاں اتنی بات تھی کہ ہر وقت کی غم خواری کو ایک ساتھ میسر تھا۔ وقت بے وقت وہ آڑے آ سکتا تھا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے محلے میں کتنے ہی ایسے تھے جو اس کے اشارہ ابرو پر جان چھڑکنے کو تیار تھے لیکن وہ اپنا کھرا ہر ایک سے کیسے کہہ سکتا تھا۔

پتلی جان کو لمبا چوڑا غم نہ تھا پھر بھی کبھی کبھار اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگتا...... جیسے کوئی اس کا دردمند نہ ہو جیسے وہ دور سمندر کے اس پار کھڑا ہو جدھر سے جہازوں کا گزر نہ ہو، جیسے اس کے شاندار حال میں اداس اداس مستقبل جھانک رہا ہو۔ وہ سوچتا کہ کوئی آفت نہ آ جائے اور اس کی سہانی زندگی کا شیرازہ نہ منتشر کر دے۔ گاہے گاہے اسے یہ فکر بھی دامن گیر ہوتا کہ چند سال بعد جب اس کے چہرے کے بالوں میں سختی آ جائے گی اور ان کی کھونٹیاں نکالنے میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوگی پھر اس کا کیا حشر ہوگا۔ ابھی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ تھوڑی پر چند بال تھے۔ موچنا لے کر بیٹھ جاتا تو چند منٹ کے اندر اندر انہیں صاف کر دیتا اور جلد یوں نکل آتی جیسے چودھویں کی چاندنی میں نکھری ہوئی گلاب کی پتیاں۔ جیجا اسے تازہ ڈبل روٹی کی طرح ملائم خیال کرتا اور گاموں اس کے گودے کی طرح نرم ولذیذ۔ ایسی اداسی کے عالم میں پتلی جان گم سم حاجی تنکا کی دکان پر جا بیٹھتا اور ہولے ہولے باتیں کر کے جی بہلاتا۔ حاجی تنکا اس کا مزاج آشنا تھا۔ اسے اداس دیکھ کر خود بھی اداس ہو جاتا اور اداسی کے یہ دونوں مجسمے ایک دوسرے کے بڑے ساتھی معلوم ہوتے۔

دولت سب سے بڑی چیز سہی لیکن پتلی جان اس سے بھی بے نیاز تھا۔ دولت پیدا کرنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا' پر اسے وہ ہاتھ کا میل سمجھتا اور شیخ شریف مہینے کے مہینے کرایہ لینے آتا تو وہ نہایت بے پروائی سے نوٹ اٹھا کر پھینک دیتا۔ جنہیں شیخ شریف اس احتیاط سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا جیسے ان پر اعتبار نہ ہو۔ جیسے یہ بھاگے جا رہے ہوں۔ جسے پتلی جان ہاتھ کا میل سمجھتا اسے شیخ شریف جان سے زیادہ عزیز جانتا۔ یہی ہاتھ کا میل تھا جو ہر سال گچ گارے میں تبدیل ہو کر دکانوں' چوباروں اور کوٹھوں کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ان کے ذریعے نئے سرے سے ہاتھ کا میل جمع ہونے لگتا۔ اسی ہاتھ کے میل کے طفیل اس نے موٹر خریدی جسے وہ تب استعمال کرتا، جب اسے بڑے لوگوں سے ملنے جانا پڑتا ورنہ اپنی کٹڑی میں تو وہ یوں مسکین اور مفلس بنا رہتا جیسے اس کے پاس موٹر ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسے یہ بھی اس کٹڑی کی کسی نہایت معمولی کوٹھڑی میں رہنے والا ''دہاڑی دار'' مزدور ہو۔ جیسے یہ بھی کسی بوسیدہ دیوار کی ٹوٹی پھوٹی اینٹ ہو۔ پتلی جان کے ہاں بھی بڑا میل تھا اور جانے یہ کہاں کہاں سے جھٹ جھٹ کر آتا۔ اگر کوئی اس چوبچے کا کیمیائی تجزیہ کرتا جو چوبارے کے پرنالے کے عین نیچے واقع تھا اور جسے منگو صبح دن میں تین بار صاف کرتا تو شائد کچھ نتیجہ نکلتا۔

شروع شروع میں پتلی جان نے پیسے کی پرواہ کی اور اس سلسلے میں حاجی تنکا کا احسان اٹھاتا رہا۔ چوبارے کی مرمت بھی اسی نے کروا دی لیکن بہت جلد اس کے یہاں بھی من برسنے لگا اور وہ غنی ہو گیا۔ اب حاجی تنکا کی پیسوں والی صندوقچی پڑی رہتی اور پتلی جان اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ روپے کے بل پر حاجی تنکا اسے نہ جیت سکتا تھا ہاں' پیسے کے بغیر اس کا دل موہ لیتا تو اور بات تھی، پیار بڑی چیز ہے۔ پہلے تو اس نے پتلی جان کو چوبارہ لے کر دیا' پھر اسے اپنا اوڑھ دیا' چوبارے کے سنگ ڈیرے ڈالے اور پھر دکان بھی اسے سونپ دی۔ جس دن وہ سگریٹ کا کوٹا لینے اور سودا سلف خریدنے جاتا تو پتلی جان کو اپنی جگہ پر بٹھا جاتا۔ یوں بھی کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے تھک جاتا اور سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکیے میں چلا جاتا تو پتلی جان کو بٹھا جاتا۔ پتلی جان بے تکلفی سے صندوقچی سے پیسے نکال کر فقیروں اور بندر نچانے والوں کو دے دیتا۔ کبھی کبھی دکان پر حقے کا تمباکو ختم ہو جاتا تو یہاں سے دام نکال کر تمباکو منگواتا اور لانے والے چھوکرے چھوکری کو اکنی ادھنی تھما دیتا۔

حاجی تنکا نے کھانے پکانے کا بندوبست بھی چوبارے ہی پر کر رکھا تھا۔ وہ اس کام میں طاق تھا۔ جانی بھی بڑا کاریگر تھا لیکن حاجی تنکا کا لوہا مانتا۔ جب کبھی جانی بیمار پڑا تو اسی نے چولہا چکی سنبھالا۔

ادھر پلو قصائی نے ریڑھے سے گوشت اتارا اور ادھر حاجی تنکا پہنچا۔ سب سے اچھی بوٹی چھانٹ کر لاتا۔ دوپہر کو ہانڈی تیار کر کے پتلی

جان کے سامنے لا دھرتا۔ دونوں مل کر کھا لیتے۔

جانی بڑا جی گردے والا تھا اور کوئی ہوتا تو جان ہلکان کر بیٹھتا۔ وہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے سارا تماشا دیکھتا اور اف تک نہ کرتا۔ حاجی تنکا تو پٹلی جان کا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ جیسے دونوں کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئن ہوں۔ جانی اس کا بیا ہتا تھا لیکن اس پر اس نے کبھی اتنی جان نہ چھڑکی تھی۔

ضبط کرنے کو تو کر لیا جاتا ہے۔ لیکن انسان آخر پتھر تو نہیں۔ جس دن پٹلی جان ریشمی شلوار سلوانے کی نیت سے جانی کی کوٹھڑی میں گیا تو جانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ساٹن کا جھلملاتا ہوا لال ٹکڑا تند شعلہ بن کر اس کی کھوپڑی میں داخل ہو گیا۔ غصے کا طوفان اٹھا اور موسلا دھار برسنے لگا پہلے تو اس نے پٹلی جان کو بے تحاشا گالیاں سنائیں اور پھر کمر سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دیا۔ سینے پر چڑھ بیٹھا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اسے لہولہان کر دیا۔

شلوار اور قمیض کی دھجیاں ہوا کے شریر جھونکے اڑا کر لے گئے۔

ساٹن کی چندیاں گلے میں لپٹائے اور خاک و دھول میں سن کر جب پٹلی جان آیا تو حاجی تنکا کے سامنے رو دیا اور کہنے لگا...... مجھے داتا کوڑھی کر دے جو میں جھوٹ بولوں۔ مولا علی کی قسم! میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ شلوار سینے کو ضرور کہا تھا مجھے کیا پتہ تھا اسے مجھ سے بدلہ لینا ہے۔ کسی اور سے شلوار سلوا لیتی۔ جانی کا ٹھیکہ تھوڑی تھا۔

حاجی تنکا نے جانی کا نام سنا تو جل بھن گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جانی کی یہ مجال کہ اس کے یار پر ہاتھ اٹھائے۔ اس نے برف توڑنے کا سوا لیا اور چھلانگ لگا کر دکان سے اترا' لپک کر جانی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ جانی آنے والے طوفان سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے دور سے حاجی کو آتے دیکھا تو مضبوطی سے کواڑ بند کر لیا۔ حاجی کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے زور سے لات ماری لیکن کواڑ بڑا ڈھیٹ نکلا نہ کھلا۔ ہاں پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ حاجی نے طیش آلود لہجے میں جھلا کر کہا...... ''رانی خان کے سالے! آج میں تیرا پیٹ پھاڑ کر دم لوں گا تو اپنے آپ کو بھولو پہلوان سمجھتا ہے۔ میں یخنی بنا دوں گا۔ تیرے حمائتیوں کی ماں...... میں نے تیری بوٹی بوٹی نہ کی تو مجھے حاجی تنکا نہ کہنا' حرام کا جنا ہوا کہنا!''

شیخ شریف کا خدا بھلا کرے جس نے مضبوط کواڑ لگوا رکھے تھے ورنہ آج جانی کا پیٹ ادھڑ جاتا۔

دیر تک گودڑ گرم کر کے پٹلی جان حاجی تنکا کے پاؤں کی ٹکور کرتا رہا۔ اس وقت تو غصے کا بھوت سر پر سوار تھا پتہ نہ چلا لیکن اب درد نے بے چین کر دیا۔ جب رات بھر ٹکور کرنے کے بعد بھی درد نہ گیا تو حاجی نے لبے گوجر کو پاؤں دکھایا۔ موج آ گئی تھی لبے گوجر نے پاؤں کو بے طرح جھٹکا دیا تو حاجی کی چیخیں ہی تو نکل گئیں۔ معاملہ لمبا پڑ گیا۔

ننھے کو جانی کی حرکت اچھی تو نہ لگی لیکن وہ اسے اتنا خطاوار نہ سمجھتا۔ ایک لحاظ سے تو جانی حق پر تھا۔ پٹلی جان لاکھ بے عیب سہی لیکن جانی کا خون اس کی گردن پر تھا اور اگر جانی نے اپنے خون کا بدلہ لیا تو کیا برا کیا اسے اس کا حق پہنچتا تھا۔ پھر حاجی تنکا کہاں سے پٹلی جان کا خیر خواہ تھا۔ پٹلی جان کا بدلہ لینے کو ایک حاجی ہی رہ گیا ہے۔ جیجا بھی تو بدلہ لے سکتا تھا اور اچھی طرح لے سکتا تھا۔ حاجی تو بالکل پاجی تھا۔ ایک جھانپڑ سے تو جانی کی جان نکل جاتی اور یہ ماں کا لاڈلا پہلوان سوالے کر چلا گیا جیسے یہی تو بازار میں اکیلا غنڈہ تھا باقی تو جیسے سب شہدے تھے۔

پٹلی جان چائے پینے آیا تو ننھے نے حسرت آلود لہجے میں شکایت کہا...... ''پیارے ہم بھی تیرے محسن ہیں۔ حاجی ہم سے بڑا غنڈا تو نہیں۔ ہم جانی سے بدلہ لے کر دکھاتے۔ اسی ماں کے ماں شک نے تو ٹانگ بھی تڑوائی اور بدلہ بھی نہ لیا۔ بھلا جانی بھی کوئی شے ہے۔ اس کی کیا

ہستی ہے جو تیری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ کلیر والے کی سوں! میں اس کا لہو پی جاؤں۔ تو کہہ تو سہی۔''

پتلی جان کی آنکھوں میں خوف جھلکا اور دل میں رحم کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بولا...... ''جس کا گھر اجڑ جائے ہو وہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ جانی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اسے تو حاجی پر رنج تھا۔ غصہ مجھ پر نکالا۔''

''تیری خیر ہو! صابر پیر کی قسم' جانی بے قصور ہے۔ کوئی مرد ہوتا تو حاجی کا اندر بیٹا باہر کر کے چھوڑتا۔''

حاجی کا روگ بڑھتا ہی گیا۔ بسا گوجر بڑا استاد تھا۔ پہلوان اترے ہوئے جوڑ اسی سے چڑھواتے لیکن قسمت کی بات ہے' حاجی تنکا کی ٹانگ ٹھیک نہ ہوئی۔ اب نہ تو وہ پابندی سے قصائی کی دکان پر جاتا اور نہ گرم جوشی سے چکی چولھا کرتا' گھر کا شیرازہ پریشان ہونے لگا۔

ہر وقت ٹخنے پر پٹیاں لپٹی رہتیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہتا رہتا۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے پینترے بدلتا اور دباتا سہلاتا رہتا۔

وہی پتلی جان تھا۔ وہی چوبارہ' وہی فرصت شب تھی اور وہی اندھا جنون لیکن رچاؤ نہ تھا۔

دکان پر سکون نہ رہا بلکہ بیمار گھر کا سا ماحول پیدا ہو گیا۔ پتلی جان کا دل کمزور تھا اور اس کی طبیعت نازک تھی۔ جب ذرا گھبراہٹ محسوس کرتا، اٹھ کر بازار میں گھومنے لگتا۔ جانی یہ تغیر بڑے اشتیاق سے دیکھتا۔

جب تک دکان پر ٹھٹھا ٹھول کرنے والے جمع رہتے محفل جمی رہتی۔ پتلی جان مزے سے بیٹھا رہتا لیکن جب یہ چلے جاتے۔ وہ دکان چھوڑ کر ادھر ادھر کھسک جاتا۔ حاجی تنکا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا لیکن کچھ نہ کر پاتا۔ وہ اب ایک لمحے کے لئے بھی پتلی جان سے الگ نہ رہنا چاہتا تھا۔ پتلی جان پر وہ فریفتہ ہو چکا تھا۔ اس کی خاطر اس نے اپنا گھر اجاڑا تھا۔

حاجی تنکا کے دل میں ایسی ایسی ٹیسیں اٹھتیں جیسے کوئی اسے بار بار سولی چڑھا رہا ہو۔ وہی برف کا سوا جو اس نے جانی کا مغز چھیدنے کے لئے اٹھایا تھا آنکس کی طرح اس کی کھوپڑی میں چبھتا رہتا اسے ہر وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی نشتر لے کر نہایت بے دردی سے اس کا سینہ کھرچ رہا ہو۔ پاؤں کا درد پہلے اسے رات رات بھر سونے نہ دیتا اب اس میں ایک نیا درد' نئی ٹیس اور نئی تڑپ پیدا ہو گئی۔

پتلی جان کی زندگی پھر جمی جمائی نہ رہی۔ پہلے گھر کا کھانا میسر تھا۔ تنہائی محسوس ہوئی تو حاجی تنکا کی صحبت میں سکون مل جاتا تھا مگر اب تو جیسے ہر شے گرد و غبار کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی۔ حاجی تنکا کی زندگی میں جو بدنظمی اور بدمزگی پیدا ہوئی اس کا اثر پتلی جان پر بری طرح پڑا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا کیا علاج کرے اس نے آوارگی بڑھا دی' گاموں کی دکان' جیجے کے ہوٹل اور بیجے پہاڑی کے اڈے کے دن بھر چکر کاٹتا لیکن طبیعت سیر ہوتی نہ چین ملتا۔ ہاں اگر کچھ چین ملا تو جانی کو۔ وہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا کہ پتلی جان حاجی تنکا کی دکان چھوڑ کر جیجے کے ہوٹل میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے۔ اب وہ وہیں کھانا کھاتا اور وہیں منڈلی جماتا۔ دوپہر کو یہ منڈلی اٹھ کر بیجے پہاڑی کے یہاں جم جاتی۔ وہی روز کا سماں بندھتا۔ بھنگ گھٹتی' دور چلتے' گھڑا بجتا' تانیں اڑتیں اور...... اس کے بعد پتلی جان نہانے کی غرض سے اٹھ کر آجاتا تو محفل کا شیرازہ بکھر جاتا۔

حاجی تنکا کی دکان کے بعد جیجے کا ہوٹل غنیمت ثابت ہوا اور پتلی نے وہاں سکون محسوس کیا۔ گپ باز وہاں آجاتے اور یوں وقت کٹ جاتا۔ کبھی کبھار حاجی کی دکان پر بھی جا بیٹھتا لیکن وہاں اس کا جی نہ لگتا۔ ایک تو حاجی آہستہ آہستہ کراہتا رہتا اور دوسرے شکایتوں کا دفتر کھول بیٹھتا۔ پہلے کبھی اس نے ایسا نہ کیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا اور وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے لگ گیا تھا۔ اس نے گاموں جیجے اور بیجے پہاڑی کے خلاف خوب زہر اگلا بلکہ پتلی جان کی بے وفائی کا بھی گلہ کیا۔

جانی کے ڈوبے ہوئے دل میں امید کی ہلکی ہلکی لہریں ابھریں اور وہ سمجھا کہ مرجھائے ہوئے پھولوں میں جان پڑ گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی

ٹہنیوں سے پھر کونپلیں پھوٹ پڑی ہیں اور سوکھی کیاریوں میں شادابی آ گئی ہے۔ اس نے امید کی ایک ایسی دنیا دیکھی جس میں تازہ تازہ مہک بس گئی ہو۔ آس کا سہارا لے کر اس نے خلیفہ جی کے پاؤں پکڑے اور ان سے کہا..... ''آپ میرے مرشد ہیں۔ دین دونیا میں مجھے صرف آپ ہی کا آسرا ہے۔ میں تو تھک ہار چکی ہوں۔ جیسے بھی بنے آپ میری مدد کریں۔ حاجی کو سمجھائیں۔ وہ خوامخواہ اپنی مٹی پلید کر رہا ہے۔''

پہلے تو خلیفہ جی نے خیال کیا کہ یہ معاملہ ان کے اختیار سے باہر ہے اور انہوں نے کوشش بھی کی تو حاجی اور جانی کی بچھڑی ہوئی جوڑی پھر سے نہیں ملے گی لیکن جب جانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور مداخلت کریں گے۔

رات گئے حاجی تنکا اداسیوں کی گھنیری گھٹاؤں میں گھرا بیٹھا تھا، جیسے اسے سمندر نے دبوچ لیا ہو اور جیسے وہ اس تنہائی سے مرا جا رہا ہو۔ خلیفہ جی نے آ کر اسے اونچ نیچ سے واقف کرانا چاہا لیکن وہ تو تمام اونچ نیچ سمندر کی لہروں میں کھو چکا تھا۔ اب تو اس کے سامنے گہرائی ہی گہرائی تھی۔ وہ کسی قیمت پر جانی کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے پنچھی جان سے محبت تھی۔

خلیفہ نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور محبت کے اسرار سے کما حقہ واقف تھا۔ اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ ''حاجی جی! بن کا پنچھی پنجرے میں قید نہیں رہ سکتا۔ پنچھی جان کو تم کیا سمجھتے ہو؟ آزاد طبیعت کی بندی ہے۔ اسے کسی سے محبت نہیں اور سب سے ہے۔ اسے پابند نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی آدمی کی صفت الگ الگ ہوتی ہے۔ پنچھی جان کو خدا نے نرالی طبیعت دی ہے۔ اس سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک کو خوش رکھے اور ایک کو ناراض کرے۔ اس کی تو ایسی طبیعت ہے کہ خوش رکھے تو سبھی کو خوش رکھے۔ میری مانو جانی سے صلح کر لو! کہو تو پاؤں پکڑ وا دوں۔ معافی منگوا دوں وہ تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئے گا۔ مولا دستگیر جانے میں نے کبھی کسی کو غلط صلاح نہیں دی۔ مجھے پنچھی جان سے بیر نہیں لیکن جو سچی بات ہے وہ سچی ہی ہے اور میں نے کہہ دی ہے۔''

اس گفتگو نے حاجی تنکا کو سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے گردن جھکالی۔ پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہے گا ہی نہیں۔ جیسے وہ بولنے کی تاب ہی نہیں رکھتا لیکن تھوڑی دیر بعد بولا..... ''جانی کا نام نہ لو خلیفہ! اس نے میری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ اس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے پنچھی جان سے محبت ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پالوں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ لوگ اسے بہکا رہے ہیں لیکن اسے ضرور ٹھوکر لگے گی۔ جو لوگ اسے بہکا رہے ہیں اسے دھوکا دیں گے پھر پنچھی جان میرے پاس آئے گا۔''

خلیفہ جی کے جانے کے بعد حاجی تنکا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یہ سن کر دکھ ہوا کہ پنچھی جان کی آزاد مزاجی اسے ایک کے ساتھ وفا کرنے پر مجبور نہ کر سکے گی۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح پنچھی جان کو سب کے پنجے سے رہائی دلا کر اپنے بس میں لے آئے۔

خلیفہ جی نہ آتے تو اچھا تھا۔ انہوں نے آ کر تو اور بھالے مار دیئے۔ پہلے ہی وہ کانٹوں کی سیج پر لوٹ رہا تھا مگر اب تو یہ کانٹے اس کی روح کو بھی چھیلنے لگے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ کراہنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچتا پنچھی جان کی محبت تیکھی ہوتی جاتی اور تیزی سے چبھنے لگتی۔ ایسا لگتا جیسے وہ آندھی کا پیچھا کر رہا ہو۔ اڑتے ہوئے بٹیر کو بلا رہا تھا لیکن دانہ تو تھا نہیں پھر بٹیر کیسے پھنسے؟ خلیفہ جی نے رہی سہی امید بھی توڑ دی۔

دکان سونی پڑی رہتی جس کے دم قدم سے رونق تھی وہی نہ رہا تو رونق کہاں سے آئے؟ گاہکوں کی آمد کم ہو گئی اور اب تو وہی آتے جو پرانی وضع داری نبھائے جا رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی اداسی کے ساتھ حاجی کا دل بیٹھ بیٹھ جاتا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے روشنی گل کر دی اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل رہا ہو۔ ڈوبے ہوئے دل نے بڑی مشکل سے انگڑائی لینا چاہی لیکن چرمرا ہو کر رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ دکان بند کر کے شیر شاہ کی درگاہ پر چلا گیا۔

درگاہ پر جا کر اس کے دل میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور وہ بھنور سے نکل کر کنارے آ لگا۔ اس نے خانقاہ کے کنویں سے پانی نکالا اور وضو کیا۔ نہایت خشوع اور خضوع سے درگاہ میں داخل ہوا۔ آج سے چند سال پہلے جب وہ حج کرنے گیا تھا، تب بھی اس کے دل میں اسی طرح عقیدت کا طوفان اٹھا تھا۔ اس نے تعویذ کے قدموں میں جا کر ایک طویل سجدہ کیا اور اپنی محبت کی کامیابی کی دعا مانگی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ سائیں شیر شاہ اس کی سنیں گے اور مراد پوری کر کے رہیں گے۔ ساری رات کبھی وہ سجدے میں جاتا اور کبھی بیٹھ کر ان دو چار آیتوں کو دہراتا جو اس نے حج پر جانے سے پہلے حفظ کر لیں تھیں۔ ساری رات یونہی گذر گئی اور صبح ہوتے ہوتے اسے نیند آ گئی۔ دن چڑھے تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ شاید یونہی پڑا سویا رہتا لیکن ایک زائر نے آ کر اس خیال سے جگا دیا کہ درگاہ کی حد دو دعا مانگنے کے لئے ہے سونے کے لیے نہیں۔

رت جگے سے اس کا سارا بدن درد کرنے لگا۔ وہ دکان پر جانے کی بجائے برابر کے تکئے میں چلا گیا اور چرس کا سوٹا لگا کر وہیں سو گیا۔ دوپہر کے وقت بیدار ہوا تو اٹھ کر دکان پر آ گیا۔

جیجے کے ہوٹل میں قہقہوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ حاجی کی طبیعت جو رات بھر کی ریاضت سے کچھ ہلکی ہوگئی تھی۔ قہقہوں کی اس بوچھاڑ سے پھر بجھ گئی۔ ماحول پھر غبار آلود ہو گیا اور ایک کڑا بوجھ سینے پر آ گرا۔ قہقہوں میں جیجے اور پتلی جان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پتلی جان نے بے نیازی کی حد کر دی۔ حاجی تنکا رات بھر غائب رہا اور اس نے خبر تک نہ لی۔ حاجی تنکا نے دل میں کہا۔ اس ظالم کو ذرا بھی لگن ہوتی تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالتا اور شیر شاہ کے مزار پر جا پہنچتا۔ دونوں اکٹھے ہوتے اور مل کر دعا مانگتے تو کتنا مزا آتا۔ آخر شیر شاہ کا مزار ایسا کون میلوں دور تھا۔ بڑی مسجد کے برابر قلعے کے پیچھے ہی تو تھا۔ بہت ہوگا تو دس منٹ کا رستہ ہوگا۔ پتلی جان کو معلوم تھا کہ حاجی تنکا دکان سے اٹھ کر جاتا تو صرف تین جگہ...... ایک سودا سلف لینے بازار دوسرے سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکئے میں اور تیسرے دعا مانگنے شیر شاہ کے مزار پر۔ اسے شیر شاہ سے بلا کی عقیدت تھی۔ زندگی میں کتنی باران کے کمال دیکھ چکا تھا۔ ایک دفعہ جب گنجا ٹھوٹھی جھانسا دے کر جانی کو بھگا لے گیا تھا تو شیر شاہ ہی کی مہربانی سے جانی بخیر و عافیت واپس آیا تھا، پھر جب چوری ہوئی تو شیر شاہ نے نظر کرم کی چور پکڑا گیا اور مال برآمد ہو گیا۔ حاجی چپ چاپ دکان پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیجا پتلی جان کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوٹل سے نکلا۔ اگر گامو پیچھے سے آ کر گھونسا رسید نہ کرتا تو شاید یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔

جیجا اور پتلی جان بھجے پھاڈی کے اڈے پر چلے گئے۔ حاجی تنکا دیکھتا ہی رہا اسے خیال تھا کہ پتلی جان آئے گا اور حال پوچھے گا۔ لیکن کہاں۔ پتلی جان تو ایسا غائب ہوا کہ جب وہ بھجے پھاڈی کے اڈے سے اٹھ کر سیدھا چوبارے پر چڑھ گیا تو حاجی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ حاجی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اگلے روز چراغوں کا میلہ تھا۔ چراغوں کے میلے سے حاجی کو بڑا عشق تھا۔ اس نے کبھی میلہ نہیں چھوڑا تھا۔ جب بھی میلہ آتا وہ ایک ہفتہ پہلے سے تیاریوں میں لگ جاتا۔ جیجے، گامو، بھجے اور سب دوستوں کو بلاتا اور پروگرام تیار کرتا۔ مہینے بھر پہلے سے روپیہ جمع کرنے لگتا۔ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ایک دن پہلے اس کی پارٹی شالامار پہنچ جاتی۔ یہ لوگ اچھی سے اچھی جگہ دیکھ کر خیمہ لگاتے اور ڈیرے جماتے' گانے کی محفل جمتی۔ چائے کے دور چلتے۔ مرغ بھنتے اور خوب گہما گہمی رہتی۔ کبھی یہ جوش و خروش تھا اور اب یہ حالت تھی کہ کسی نے بھولے سے بھی تو نہیں کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ دنیا کیسی طوطا چشم تھی، گو اس میں جانے کی ہمت نہ تھی لیکن پتلی جان دعوت دیتا تو وہ چلنے کے لئے تیار ہو جاتا اور پاؤں کا درد بھول جاتا۔

زوال کے بعد پتلی بازار میں شور و غل ہونے لگا۔ گامو نے بھجے کو اور جیجے نے پتلی جان کو آواز دی۔ تھوڑی دیر کے بعد بھجے پھاڈی نے

تھڑے پر کھڑے ہو کر بازار کا جائزہ لیا۔ دولا حرامی خوانچہ سنبھال کر جا رہا تھا۔ بھجے پھاڈی نے کہا۔ ''اوئے سالے! ابھی تو نے دکان بڑھائی ہے۔ تیار کب ہوگا اور کب میلے کو جائے گا؟''

دولے نے نہایت بے پروائی سے کہا..... ''ماں کے پہلوان! تجھے بڑی جلدی ہے تو تو بے شک چلا جا۔ میں تو اب جا کر تیاری کروں گا۔ مجھے ساتھ لے لیا تو خیر صلا۔ نہیں تو میں اکیلا بعد میں آ جاؤں گا اور شالامار میں تم سے ملوں گا۔''

''تیری خوشی پیارے۔'' ہم تو تیار بر تیار ہیں.....''

دولا حرامی خوانچہ اٹھا کر گھر چلا گیا اور بھجا پھاڈی تھڑے سے اتر کے نیچے نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔

گامو ہرے رنگ کی ملتانی دھوتی' اس پر بوسکی کا نیا کرتہ اور گلابی ریشمی مندیل پہن کر نکلا۔ گامے شاہی نئی سرخ جوتی چمک رہی تھی۔ گلے میں سونے کا کنٹھا بہار دکھا رہا تھا۔ مونچھیں نوکوں تک بٹی ہوئی تھیں جیسے پولیس کے سپاہی ڈیوٹی پر کھڑے ہوں۔ پچلی جان نے چوبارے سے بیٹھے بیٹھے اسے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ گامو نے زبان میں دو انگلیاں ڈال کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ پچلی بازار گونج اٹھا۔ جیجا سیٹی سنتے ہی دکان سے باہر نکل آیا، اس کی ترچھی لمبے شملے والی لنگی اور ڈھیلی ڈھالی شلوار فراغت اور چھٹی کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک جیب میں باریک مہین گلناری رومال آدھا اندر اور آدھا باہر تھا۔

گامو نے سگریٹ کا دھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اوئے یار! میلے کب چلے گا؟''

جیجے نے پچلی جان کے چوبارے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ ''جب ہمارا دلبر پچلی جان چلے گا۔''

حاجی تنکا کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ ایک تو اس کا میلے سے رہ جانا ہی کچھ کم قیامت نہ تھا پھر پچلی جان کا ان سب کے ہجوم میں مل کر جانا اور بھی غضب تھا کوئی کہاں تک صبر کرے؟ حاجی تنکا کو تو کسی نے انگاروں پر ڈال دیا۔

پچلی جان ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھا دوسروں کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بال بکھر رہے تھے جیسے رات سایہ ڈال رہی ہو۔ کھلے گریبان سے چیکیلے بدن کا ننگا حصہ نظر آ رہا تھا جس نے شاید ید بیضا سے بھیک مانگ لی ہو۔ بھنگ پینے کے بعد سستی سی آ گئی تھی اور اس کا باسی مکھڑا پھیکی مسکراہٹوں کے بوجھ سے دب رہا تھا۔ اس کی نشے سے لبریز بڑی بڑی آنکھیں پورے بازار پر اس طرح پڑ رہی تھیں جیسے آفتاب کائنات پر کرنیں نچھاور کر رہا ہو۔ وہ کبھی گامو کو اور کبھی جیجے کو دیکھتا۔

بھجے پھاڈی نے سب کو مات کر دیا۔ اسے ساجی درزی نے اپنے خاص الخاص مشورے سے میلے کے لئے بش شرٹ سی دی۔ اس نے اسے شلوار پر ہی پہن لیا حالانکہ ساجی نے پتلون بھی تیار کر کے دی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال کر نکلا تو بالکل گلفام نظر آیا۔

حاجی سب کے ٹھاٹ دیکھ کر جل بھن گیا۔ وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ پچلی جان ان کے ساتھ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ میلے کا دن پچلی جان اس کے ساتھ گزارے' اس کے پہلو میں بیٹھے اسے مدت ہی ہو گئی تھی۔ آج پچلی جان اسے بری طرح یاد آیا۔ تصور کی ایک زبردست لہر اٹھی اور وہ اس کے ساتھ بہہ گیا۔

نہ دکان رہی' نہ لنگڑا پاؤں اور نہ اس کی غمگیں زندگی۔ وہ ایک خوبصورت محل سرا میں جا پہنچا۔ جہاں پچلی جان اس کے انتظار میں بے قرار بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنکھیں ٹکرائیں۔ ایک بھرپور مستی دھیرے دھیرے حیران آنکھوں سے گزر کر حاجی تنکا کے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے قریب جا کر پچلی جان کو بغلگیر کیا۔ ہلکی ہلکی آنچ یوں تحلیل ہونے لگی جیسے جذبات کو دم پخت کر رہی ہو قریب ہی سنہری پلنگ بچھا ہوا

تھا جس پر ریشمی بچھونا لگا تھا۔ بچھونا بالکل بجرا تھا اور اس پر نام کو سلوٹ نہ تھے لیکن پھر دیکھتے دیکھتے اس پر سلوٹ پڑنے لگے۔ جو سلوٹ داوں پر پڑ رہے تھے وہی سلوٹ پلنگ پر نمودار ہونے لگے تھے۔ غائب ہو گئے۔ صرف غسل خانہ سامنے رہ گیا۔

نل کھلا اور پانی یوں ٹپ ٹپ گر رہا تھا جیسے استاد انترے کے بول گا رہا ہو۔ کبھی نل کی دھار ہلکی پڑ جاتی اور گیت انترے سے نکل کر استائی پر آ جاتا۔ غسل خانے کا کواڑ نیچے سے شکستہ تھا۔ اس لیے اندر سے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر باہر فرش پر پڑ رہے تھے پلنگ پر گہرے نیلے رنگ کا ریشمی غرارہ دھرا تھا۔ اس میں ازار بند بھی اسی رنگ کا پڑا تھا۔ اگر سروں کو سنہری تاروں سے گوندھا نہ گیا ہوتا تو ازار بند کا پتہ ہی نہ چلتا۔ اس پر ہلکے نیلے رنگ کی لینن کی قمیض رکھی تھی اور برابر میں گہرے نیلے رنگ کا دوپٹہ پڑا تھا۔ ایک طرف سرخ پرس رکھا تھا۔ پلنگ کے نیچے سچے تلے کی جوتی دھری تھی۔

گاموں بھجا پہاڑی، دولا حرامی، بودی سائیں، گنجا ٹھوٹھی، ساجی درزی اور جیجا بجلی والا سب قہوہ خانے میں بیٹھے بے قراری سے پتلی جان کے چوبارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

— دولا حرامی بولا...... ''یار پتلی نے تو بڑی دیر لگا دی۔''

بھجے نے جواباً کہا...... ''معشوق کا کام دیر لگانا ہی تو ہے۔''

پھر میلے کے پروگرام پر اظہار خیال ہونے لگا۔ حسو تانگے پر بیٹھا سوتا لگ رہا تھا اور اس کا گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا۔ ساتھ ہی کرمو اپنے ریڑھے پر ٹانگیں پسارے پڑا تھا۔

حسو جمائی لیتے ہوئے مایوسانہ انداز میں بولا...... ''استاد جیجا! کتنی دیر اور ہے؟''

کرمو نے کان کھڑے کیے۔

جیجے بجلی والے نے بڑی بے تکلفی سے دو تین چالو قسم کی گالیاں فرمائیں اور پھر کہا...... ''تجھے تو دہاڑی پوری ملے گی، تجھے دیر سویر سے کیا؟''

''ہاں ٹھیک ہے، مجھے دہاڑی سے غرض ہے۔ دیر سویر سے کیا؟'' ...... اور اتنا کہہ کر وہ پھر سوتا لگانے لگا۔ کرمو بھی تار کا سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

نل بند ہوا۔ پانی کی ٹپ ٹپ رک گئی۔ کواڑ کھلا۔ پتلی جان مسکراتا مسکراتا باہر نکلا اور اس کا ننگا بدن یوں چمکنے لگا جیسے چاند ڈھل کر نمودار ہوا ہو۔ ایک دم زور کی چیخ نکلی اور تیز چھری اس کی نرم و نازک پسلیوں میں دھنس گئی۔ بھاگ کر کوٹھے پر چڑھنے لگا لیکن حاجی تنکا نے اس دہشت زدہ گائے کو لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور اسی ٹانگ کے نیچے دبا لیا جو لنگڑی تھی۔ اب اس میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھر گئی تھی۔ پتلی جان فریادی گائے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن قصاب نے رحم نہ کھایا بلکہ تیز چھری کو نرخرے پر رکھ کر حلق میں اتار دیا۔ خون کی دھار نکلی اور حاجی تنکا کے کپڑوں کو تر کر گئی۔

ایک مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

ایک پھول دھول میں مل گیا۔

پتلی جان کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی اور سارا بازار یوں سونا پڑ گیا جیسے کبھی دِلّی اُجڑی تھی۔

○

سریندر پرکاش

نام : سریندر کمار اوبیرائے

قلمی نام : سریندر روشٹ / سریندر پرکاش

پیدائش : ۲۶ مئی ۱۹۳۰ء بہ مقام لائل پور (حال: فیصل آباد) مغربی پنجاب۔

وفات : ۹ نومبر ۲۰۰۲ء بہ مقام بمبئی، بھارت۔

تعلیم : باقاعدہ تعلیم کہیں سے بھی حاصل نہیں کی۔

ساڑھے تین برس کی عمر میں سینڈرن اسکول، امین پور بازار، لائل پور میں داخلہ لیا تھا لیکن پہلے روز ہی ماسٹر صاحب نے ایسا تھپڑ مارا کہ پھر کبھی اسکول کا رخ نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کے والد نے اپنی دکان پر ہی اردو کی تعلیم دینا شروع کی۔ تاجور سامری، جھنگ اور چنیوٹ کے بازاروں میں ہفتے میں ایک بار لاؤڈ سپیکر پر ریڈیو کے کمرشل کی طرز پر پروگرام پیش کرتے تھے، سریندر پرکاش بھی ان کے ساتھ ہو لیے اور ان کی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔ کچھ مدت بعد آپ کے والد نے سریندر کو باری علیگ کے چھوٹے بھائی نذیر طالب، جو کہ اورینٹل کالج، لاہور میں اردو، ریاضی اور تاریخ پڑھاتے تھے، کے سپرد کر دیا۔ سریندر نے ان کی زیر نگرانی ادیب عالم کے امتحان کی تیاری کی اور صرف دو پرچے دیے۔ یوں یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ ایک روز نذیر طالب صاحب نے سریندر کو نجمہ نامی ایک لڑکی کا محبت نامہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کا جواب لکھو۔ پھر یہ خطوط کا سلسلہ ایسا چلا کہ سریندر نے ساڑھے نو سو خطوط کے جوابات لکھ مارے، تب یہ راز کھلا کہ نجمہ کی طرف سے نذیر طالب صاحب خطوط لکھا کرتے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ سریندر کی تحریر میں پختگی آئے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آبائی وطن چکوال، ضلع جہلم تھا۔ سریندر پرکاش کے والد کارخانہ بازار لائل پور میں سوڈا واٹر فیکٹری چلاتے تھے۔ اڑھائی برس کی عمر

میں سریندر کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور ساڑھے تین برس کی عمر میں ہی اسکول سے بھاگ کر انہوں نے کاروبار میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ چھ سات ماہ اپنے والد کی زیرِ نگرانی اردو پڑھنے کے بعد تاجور سامری کے ساتھ ہولیے۔ جنہوں نے سریندر کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا اور سریندر نے اپنا نام سریندر روشٹ لکھنا شروع کر دیا۔ جب والد صاحب کو اس حقیقت احوال کا پتا چلا تو انہوں نے تاجور سامری کے خلاف بیٹے کے اغوا کا کیس رجسٹر کروا دیا۔ معزز لوگوں کی وساطت سے سریندر اپنے گھر واپس آئے اور بعدازاں والد کی منشا کے مطابق نذیر طالب صاحب کی زیرِ نگرانی چلے گئے۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ ۴۵۔۱۹۴۴ء میں تاجور سامری کی تحریک پر شروع کیا، جو انہیں ٹیگور ثانی بنانا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کو دیکھتے ہوئے مولوی محمد شفیع (جو ان دنوں دھوبی گھاٹ لائل پور میں قیام پذیر تھے) اور نذیر طالب کے مشورے پر سریندر پرکاش اور ان کے والد امرتسر منتقل ہوگئے۔ سوڈا واٹر فیکٹری مولوی محمد شفیع صاحب نے خرید لی اور نقد رقم کی ادائیگی امرتسر میں کی۔ پندرہ روز امرتسر ریلوے اسٹیشن پر بے یار و مددگار پڑے رہنے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز دہلی چلے گئے جہاں سریندر پرکاش کے بڑے بھائی ملازمت کرتے تھے۔ دہلی کے ایک بینک میں سریندر پرکاش کے والد کا بیس پچیس ہزار روپیہ موجود تھا۔ کچھ مدت تو وہ روپیہ کام آیا اور اس کے بعد باپ بیٹوں نے کناٹ پلیس میں کنگھیاں اور چاندنی چوک میں کیلنڈر بیچنے شروع کیے۔ کچھ مدت بڑے تیوہاروں پر مندروں کے باہر چھوٹی چھوٹی دکانیں چلائیں اور بالآخر دہلی میں ایک بار پھر سوڈا واٹر فیکٹری قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس زمانے میں سریندر پرکاش کا اٹھنا بیٹھنا دشوا ناتھ درد، ہنس راج رہبر، پرکاش پنڈت، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور پریم ناتھ پرواز کے ساتھ ہوا۔ بعدازاں اس گروپ میں پنڈت ہری چند اختر اور دیویندر ستیارتھی بھی شامل ہوگئے۔ یہ سب لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبر تھے۔

وقت نے ایک بار پھر کروٹ لی، سوڈا واٹر فیکٹری بند ہوگئی اور سریندر کا خاندان تنگ دست ہو چلا گیا۔ دریں اثنا سریندر اپنے ماموں کے ہاں لدھیانہ چلے آئے لیکن ایک دن ان سے بھی جھگڑا ہوگیا اور گھر چھوڑ کر لدھیانہ میں ہی سائیکل رکشا چلانے لگے۔ ۱۹۶۲ء تک دہلی سے دور رہنے کے سبب لکھنے لکھانے کا کوئی کام نہ کیا۔ دہلی واپس پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہوئے اور ''ادبی مجلّہ'' ''تخلیق'' سے ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز کیا۔ ستر کی دہائی میں دہلی سے بمبئی منتقل ہوگئے، جہاں فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کی۔ بھارتی ٹیلی ویژن کے لیے دنیا کی بہترین کہانیوں پر مبنی سیریل ''خزانہ'' لکھی جسے یش چوپڑہ نے پروڈیوس کیا۔ بمبئی میں فلمی دنیا سے متعلق رہ کر ''وجے''، ''پربت کے اس پار''، ''اپنا جہان''، ''انا میکار''، ''جب اندھیرا ہوتا ہے'' اور ''سوال'' وغیرہ متعدد فلمیں لکھیں۔ از حد کھلے ذہن کے یار باش آدمی تھے۔ ذیابیطس کے مرض کا شکار ہوکر رخصت ہوئے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''دیوتا'' مطبوعہ ہفت روزہ ''پارس'' لاہور: ۴۵۔۱۹۴۴ء

واضح رہے کہ یہ افسانہ سریندر روشٹ کے قلمی نام سے لکھا جسے کرم چند پارس نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''پارس'' لاہور میں شائع کیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' شب خون کتاب گھر، الہ آباد طبع اول: جنوری ۱۹۶۸ء
(تیرہ افسانے، ایک رپورتاژ)

۲۔ "برف پر مکالمہ" (گیارہ افسانے)	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۳۔ "بازگوئی" (بارہ افسانے)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۴۔ "حاضر حال جاری" (سترہ افسانے)	تخلیق کار پبلشرز، دہلی	طبع اوّل: ۲۰۰۲ء

اعزاز:

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، برائے "بازگوئی" ۹۰۔۱۹۸۹ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

۲۔یوگی راج آشرم، نیولنک روڈ، کالینا، بمبئی ۴۰۰۰۹۸۔ بھارت

نظریۂ فن:

"میں افسانہ کے کسی سکول سے متعلق نہیں ہوں اور نہ ہی افسانہ نگاری کے فن کی باریکیوں کو سمجھتا ہوں۔ لائل پور چوک گھنٹہ گھر کے لان پر ایک بزرگ سارنگی پر نثر کو گا گا کر اور ناچ ناچ کر داستان سنایا کرتا تھا...... اور پھر بعد میں اپنے تماشہ کے عوض لوگوں سے بھیک لیتا تھا۔ میں اُس سے بہت متاثر ہوا۔ بچپن کا یہ منظر کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتا۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۸۸ء)

رونے کی آواز

سریندر پرکاش

فلاور انڈر ٹری از فری

سامنے والی کرسی پر بیٹھا ابھی ابھی وہ گا رہا تھا۔ مگر اب کرسی کی سیٹ پر اس کے جسم کے دباؤ کا نشان ہی باقی ہے۔ کتنا اچھا گاتا ہے وہ...... مجھے مغربی موسیقی اور شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی تو نہیں ہے۔ مگر وہ کم بخت گاتا ہی کچھ اس طرح ہے کہ میں کھوسا جاتا ہوں۔ وہ گاتا ر اور میں سوچتا رہا ''کیا پھول درخت کے سائے تلے واقعی آزاد ہیں؟''

وہ اب جاچکا ہے۔ جن سُروں میں وہ گا رہا تھا وہ اپنی گونج کھو چکے ہیں۔ مگر الفاظ سے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔

فلاور انڈر ٹری از فری

اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ الفاظ کی عمر سُر سے لمبی ہوتی ہے۔ شام جب وہ مجھ سے ملا خاصہ نشے میں تھا۔ طالب علمو کے ایک گروہ نے دن میں اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے ملک کے گیت اس سے سنتے رہے اور شراب پلاتے رہے۔ میرے کندھے پر اپنا دایا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مجھے سارے دن کا قصہ سنایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ ''گھر سے جب نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہ فتور تھا کہ ساری دنیا پید گھوم کر اپنا ہم شکل تلاش کروں گا۔ آٹھ برس ہونے کو آئے مجھے دوسروں کے ہم شکل تو ملتے رہے مگر اپنا ہم شکل اب تک نہیں ملا۔''

''کیا کہیں تمہیں کوئی میرا ہم شکل ملا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں! اسکینڈی نیویا میں!''...... اس نے میری طرف دیکھے بغیر اور اپنے ذہن پر زور دیئے بغیر جواب دیا۔

رات گئے تک ہم سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ جب تھک گئے تو گھر کا رخ کیا، وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کرسی پر بیٹھا ا ایک منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک دم اپنا مخصوص گیت گانا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا ''اس گیت میں جو الفاظ ہیں ان کے معنی کیا ہیں؟''

''معنی کوئی ساتھ نہیں دیتا' صرف الفاظ دیتے ہیں۔ دیتے بھی کیا ہیں۔ بس اپنے معانی کی مہر ثبت کر دیتے ہیں اور ہم ان میں سے اپنے معنی تلاش کرتے ہیں!'' اس نے جواب دیا۔

کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے کمرے کی بے ترتیبی کا جائزہ لیا اور پھر اچانک بول اٹھا۔ ''تم شادی کیوں نہیں کر لیتے اچھے خاصے معمولی آدمی ہو۔'' میں بوکھلا سا گیا۔

''بات دراصل یہ ہے۔'' میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہماری بلڈنگ کی اوپر والی منزل میں ایک وشنو بابو رہتے ہیں' وہ اس بلڈنگ کے مالک بھی ہیں ہم سب ان کے کرایہ دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انہوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا نام ''سرسوتی'' ہے۔ پھر اچانک وشنو بابو ایک مال دار عورت لکشمی سے ٹکرا گئے۔ تب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے ''لکشمی'' سے اپنا دوسرا بیاہ رچا لیا۔ اب لکشمی اور وشنو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بے چاری سرسوتی رات رات بھر سیڑھیوں میں بیٹھی روتی رہتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں ابھی طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے یا کسی لکشمی سے؟''

اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا' اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم سے گڈ نائٹ! کہا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اپنی اسی طرح کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھے گوشت پوست کے آدمی کی بجائے کوئی خیال لگتا ہے جو سمندر پار سے یہاں آ گیا ہو۔

جس عمارت کے ایک کمرے میں' میں رہتا ہوں۔ اس کے سب کمروں کی دیواریں کہیں کہیں' جیسے تیسے ایک دوسرے سے مشترک ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر کی آواز یا خاموشی دوسرے کمرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں' میری آواز یا خاموشی یا پھر چند لمحے پہلے کمرے میں گونجنے والی اس کے گانے کی آواز بھی کہیں نہ کہیں ضرور پہنچی ہوگی۔

باہر شاید رات نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اردگرد کے سب گھروں کی بتیاں بجھ گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور خاموشی دیمک کی طرح آہستہ آہستہ سب طرف رینگے جا رہی ہے۔ میں دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اور مدھم بتی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوں۔

مدھم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی طرح لگتا ہے۔ تنہائی' خاموشی اور تاریکی میں ایسا خیال خوف زدہ کر ہی دیتا ہے۔ جیسے خواب میں بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کا جسم اور ذہن سن ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی میری کیفیت ہے۔ دھیرے دھیرے میں نیچے گر رہا ہوں اور پھر اچانک مجھے لگتا ہے میں اپنے جسم میں واپس آ گیا ہوں۔

باہر سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید سرسوتی اور لکشمی میں پھر جھگڑا ہوا ہے اور سرسوتی کے رونے کی آواز سیڑھی سیڑھی اتر کر نیچے میرے کمرے کے دروازے تک آ گئی ہے' مگر یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے! میں محسوس کرتا ہوں..... ٹھیک ہے پڑوس والوں کا بچہ اچانک بھوک کی وجہ سے رونے لگ گیا ہوگا اور اس کی ماں بدستور نیند میں بے خبر سو رہی ہوگی یا پھر شاید ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گئی ہو اور بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پھر مجھے لگتا ہے ایک بچہ میرے ہی پہلو میں پڑا رو رہا ہے اور کفن میں لپٹی ہوئی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی ہے۔

''اگر درخت تہذیب کی علامت ہے تو ہم اس کے سائے میں روتے ہوئے آزاد پھول ہیں۔'' میرے ذہن میں اچانک اس کے

الفاظ کے معنی کھل اٹھے ہیں۔ جن کے سِرے وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بچہ بدستور رو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز میں درد اور دکھ کی لہریں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں مرگئی ہے۔ مگر اسے یہ کس نے بتایا ہوگا؟ اس کے باپ نے؟ مگر وہ تو بدستور سو رہا ہے۔ کیونکہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی آواز ابھی شامل نہیں ہوئی۔ یہ تو ہر کسی کو آپ ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں مرگئی ہے۔ مجھے بھی پتہ چل گیا تھا!...... بچے کے رونے کی آواز میری آواز سے کتنی ملتی جلتی ہے!.....

پھر اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''اچھے خاصے معمولی آدمی ہو۔''

میں واقعی معمولی آدمی ہوں۔ ہر صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلتا ہوں۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہوں۔ سورج کی طرف منہ کر کے دن بھر بھاگتا رہتا ہوں اور رات ہونے پر اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا پاتا ہوں۔

صبح سب سے پہلے سارس کی طرح اڑتا ہوا میں اس عمارت تک جاتا ہوں۔ جہاں ایک عورت خوب صورت کیبن میں گلاس ٹاپ کی میز پر اپنی سفید مرمریں بانہیں پھیلائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اپنے سفید بالوں کو ہر روز رنگ کے خضاب سے رنگ کر آتی ہے۔ میز پر پھیلی ہوئی اس کی بانہیں...... اس طرح لگتی ہیں جیسے کسی عورت کی برہنہ ٹانگیں ہوں۔

کیبن کے اردگرد سے کئی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اس کیبن کے شیشوں میں سے اکثر جھانکتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر واقعی وہ اپنی ننگی ٹانگیں میز پر پھیلائے ہوئے ہے تو.......

......! سیڑھیاں جہاں سے شروع ہوتی ہیں وہاں داہنے طرف ایک بڑی سی الماری لگی ہوئی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بنک کے لاکروں جیسے کئی خانے بنے ہوئے ہیں جن میں ہر آدمی اپنی ذاتی چیزیں رکھ سکتا ہے۔ مگر میں ہر روز اپنی ذات ہی کو اس میں بند کر کے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہوں اور پھر شام کو جاتے ہوئے دوبارہ اسے نکال لیتا ہوں۔

باہر تھیٹر والوں کی گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ اس کا ڈرائیور مجھے آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہتا ہے اور میں شہر کے جدید ترین تھیٹر میں پہنچا دیا جاتا ہوں۔ جس کا پنڈال بالکل سرکس کے پنڈال جیسا ہے۔ میں اس تھیٹر میں پچھلے اٹھارہ برس سے ایک ہی رول ادا کر رہا ہوں۔ سٹیج بالکل وسط میں ہے اور میرا پہلا میک اپ اتار کر ''گلی ور'' کا میک اپ اور لباس پہنا دیا جاتا ہے مکالمے سب بیک گراؤنڈ سے ہوتے ہیں۔ مجھے صرف للی پٹ والوں کی مار کھانے کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ننھے ننھے سوئیوں جیسے بھالے میرے جسم میں چبھتے ہیں۔ ان کے کمانوں سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیر میرے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ میرے مساموں سے خون کی بوندیں پسینے کی طرح نکلتی ہیں۔ مجھ میں خوبی یہی ہے کہ میں تکلیف کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لئے اتنے برسوں سے یہ سب چل رہا ہے۔ یہاں سے مجھے ملتا کچھ نہیں یہ تو محض ہابی کے طور پر ہے۔ پھر جب شو ختم ہو جاتا ہے تو مجھے ایک اسٹریچر پر لٹا کر ایک باتھ روم میں لے جاتے ہیں۔ جہاں الکوحل سے بھرے ہوئے ٹب میں مجھے ڈال دیا جاتا ہے۔ الکوحل میرے زخموں میں ٹیسیں پیدا کرتی ہے پھر ایک دم خنکی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر گھر کی طرف بڑھتا ہوں۔

ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ جب اس عمارت کے دروازے بند ہونے کا وقت آیا' تب میں پیشاب خانے میں تھا۔ میرے پیچھے دھپ سے دروازہ بند ہوا۔ میں گھبرا کر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ تب ایک آدمی نے آ کر دروازہ کھولا۔ میں اس تصور سے ہی اس قدر گھبرا گیا تھا

کہ اگر مجھے ساری رات اس پیشاب خانہ میں بند رہنا پڑتا ہے تو میری کیا حالت ہوتی۔ گھبراہٹ میں چلتے وقت میں نے اس کیبن کی طرف بھی دھیان نہ دیا کہ آیا وہ عورت چلی گئی ہے یا نہیں اور نہ اس لاکر میں رکھی ہوئی اپنی ذات ہی نکالنے کا خیال آیا۔ باہر تھیٹر کی گاڑی کا ڈرائیور ہارن پر ہارن بجائے جارہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ آج اپنی ذات کے بغیر میں اپنا رول کیسے ادا کر پاؤں گا۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس دن شو ختم ہونے پر بیٹھنا اپنی کرسیوں سے اٹھ کر میری طرف لپکی اور میری اداکاری کو اتنا قدرتی بتایا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

تب سے میں نے اپنی ذات کو اس لاکر ہی میں پڑا رہنے دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے نے کھڑکی کے پٹ کو زور سے بھینچ دیا ہے۔ میں پھر اپنے کمرے کے ماحول کی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں......

سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی سرسوتی کی سسکیوں کی آواز روتے ہوئے بچے کی کرب ناک آواز میں اب تک ایک اور آدمی کی آواز بھی شامل ہوگئی ہے۔ شاید بچے کا باپ بھی جاگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی لاش اور بلکتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ضبط نہیں کرسکا۔

ایک اچھے پڑوسی کے ناطے میرا فرض ہے کہ ان کے سکھ دکھ میں حصہ بٹاؤں۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی درخت کے سائے تلے کھلے ہوئے آزاد پھول ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے' میں اپنے کمرے کی چاروں دیوارں میں سے ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر ارد گرد کمرے میں جھانک کر انہیں سوتے ہوئے یا روتے ہوئے دیکھوں۔ کیونکہ دونوں ہی حالتوں میں آدمی بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کتنا کمینہ آدمی ہوں۔ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھنے کے شوق میں سارے کمروں کی دیواریں اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے پھر اٹھ کر خود کو ان کے کمروں میں جا کر ان کے رونے کی وجہ دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔ رونے کی آوازیں اب کافی بلند ہو چکی تھیں اور ان کی وجہ سے کمرے میں بند رہنا ممکن نہ تھا۔

میں نے وہی کفن جیسی سفید چادر اپنے گرد لپیٹی اور سیاہ سلیپر پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی میں نے دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی' میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے والی سرسوتی' بلک بلک کر رونے والا بچہ' مری ہوئی عورت اور اس کا مجبور خاوند' چاروں باہر کھڑے تھے۔

چاروں نے بہ یک زبان مجھ سے پوچھا۔

''کیا بات ہے' آپ اتنی دیر سے رو رہے ہیں؟ ایک اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ......!''



جوگندر پال

نام : جوگندر پال
قلمی نام : جوگندر پال
پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء بہ مقام سیالکوٹ، مغربی پنجاب[1]
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ: ۱۹۵۵ء

میٹرک گنڈا سنگھ ہائی اسکول، سیالکوٹ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے ۱۹۴۱ء میں کیا۔ بی۔اے مرے کالج، سیالکوٹ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے ۱۹۴۵ء میں کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ سے ایم۔اے (انگریزی) ۱۹۵۵ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام لعل چند سیٹھی (۱۹۴۸ء۔۱۸۹۰ء) اور والدہ کا نام مایا دیوی (۱۹۶۶ء۔۱۸۹۳ء) تھا۔ جوگندر پال کے والد ایک معمولی دکاندار تھے۔ ایک وقت آیا کہ کاروباری خسارے کے باعث گھربار بک گیا۔ جیسے تیسے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔اے کے زمانے میں جب والد کی ہمت جواب دے گئی تو جوگندر پال نے پرائیویٹ ٹیوشن کے ساتھ ساتھ روزانہ اجرت پر ملٹری کی ایک پیراشوٹ فیکٹری میں ڈسپیچ کلرک کی ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ مدت ایک اسپورٹس سپلائر کے ٹورنگ ایجنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں امرتسر جا کر رشتے کے ایک دولت مند ماموں کے ایجنٹ نما سکریٹری رہے لیکن تین ماہ بعد سیالکوٹ واپس آ کر مرے کالج میں ایم۔اے (انگریزی) کرنے کی غرض سے داخلہ لے لیا۔ وہاں محض چند ماہ پڑھنے کے بعد مالی پریشانیوں کے سبب کالج جانا چھوڑ دیا اور فسادات کے پیش نظر انبالہ ہجرت کر آئے۔ ۱۹۴۸ء کا سال انبالہ میں اپنے والد کی ڈیری کی دکان پر دودھ ڈھوتے رہے، اسی سال والد صاحب کا انتقال ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں جوگندر پال کی شادی کرشنا سے ہوئی۔ کرشنا پال، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

میں انگریزی کی لیکچرار رہیں۔ شادی کے بعد کرشنا کے ہمراہ نیروبی (ایسٹ افریقہ) منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۴۹ء تا ۱۹۶۴ء کینیا ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ڈیوک گلاسٹر اسکول، نیروبی میں اسکول ٹیچر رہے۔ ۱۹۶۴ء میں کینیا کی آزادی پر ایجوکیشن آفیسر کی ملازمت سے اختیاری ریٹائرمنٹ لے کر بھارت واپس آ گئے اور اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء ایس۔بی۔کالج، اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۸ء پرنسپل رہے۔ ۱۹۷۸ء میں استعفیٰ دے کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کینیا سے برٹش پینشن پاتے ہیں اور فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کرتے ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''تیاگ سے پہلے'' مطبوعہ: ''ساقی دہلی، ۱۹۴۵ء

اس سے قبل ۱۹۴۴ء میں اُن کا پہلا افسانہ: ''تعبیر'' مرے کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

۱۔	''دھرتی کا کال'' (افسانے)	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء

یہ گیارہ افسانوں کا مجموعہ افریقی سرزمین کی بو باس لیے ہوئے ہے۔ کتاب میں کرشن چندر کا ابتدائیہ اور دیوندر ستیارتھی کا خاکہ ''جامبو، جوگندر پال'' شامل ہیں۔

۲۔	''میں کیوں سوچوں'' (چھ فینسٹی، چھ افسانے اور چھ افسانچے)	ادبستان اردو، امرت سر	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۳۔	''اک بوند لہو کی'' (ناول)	مکتبہ افکار، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۲ء
۴۔	''رسائی'' (آٹھ طویل مختصر افسانے)	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۶۹ء
۵۔	''مٹی کا ادراک'' (تیرہ افسانے)	لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۷۰ء
۶۔	''سلوٹیں'' (افسانچے)	لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
۷۔	''آمد و رفت'' (ناولٹ)	انڈین بکس پبلی کیشنز، اورنگ آباد	طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
۸۔	''بیانات'' (ناولٹ)	انڈین بکس پبلی کیشنز، اورنگ آباد	طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
۹۔	''لیکن'' (بیس افسانے)	اردو پبلشرز، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۷۷ء
۱۰۔	''بے محاورہ'' (چوبیس افسانے)	کیلاش پبلی کیشنز، اورنگ آباد	طبع اوّل: ۱۹۷۸ء
۱۱۔	''بے ارادہ'' (تئیس افسانے)	زم زم بک ٹرسٹ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۱۲۔	''نادید'' (ناول)	رابطہ گروپ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۳ء
۱۳۔	''پریم چند کی کہانیاں'' (مرتبہ)	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۴ء
۱۴۔	''کتھا نگر'' (افسانچے)		طبع اوّل: ۱۹۹۷ء

۱۵۔ ''جوگندر پال کے منتخب افسانے'' (انتخاب)

۱۶۔ ''کھلا'' (افسانے)

۱۷۔ ''جوگندر پال کے شاہکار افسانے'' بک چینل، لاہور طبع اوّل: ۱۹۹۶ء

(اس کتاب میں جوگندر پال کے چھیالیس افسانے شامل ہیں)

۱۸۔ ''خواب رو'' (ناولٹ) طبع اوّل: ۱۹۹۰ء

۱۹۔ ''رابطہ'' (تنقیدی مضامین) طبع اوّل: ۱۹۹۸ء

۲۰۔ ''بے اصطلاح'' (تنقیدی مضامین) طبع اوّل: ۱۹۹۹ء

غیر مدوّن:

(۱) ''فکشن کے آرٹ پر''۔ شب خون۔ ۱۹۷۱ء (۲) ''نیا افسانہ'' نئے کلاسیک، مرہٹواڑہ یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء (۳) ''ایک اور آباد کار'' محمد طفیل کے خاکوں پر مضمون۔ نیرنگ خیال، راولپنڈی۔ (۴) ''کچھ بیدی کے بارے میں'' شیرازہ، سری نگر ۱۹۸۳ء۔ (۵) ''اردو افسانہ، زبان و بیان کے مسائل'' اوراق، لاہور، ۱۹۸۳ء۔ (۶) ''فکر تونسوی کی عمومیت'' آہنگ گیا۔ (۷) ''کولاژ'' اردو فکشن کے باب میں ایک تاثر۔ نئی نسلیں، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء۔ (۸) ''ذی جان کہانیاں'' تناظر، نئی دہلی۔ (۹) ''بیدی، خمیر و ضمیر'' دستاویز، راولپنڈی، ۱۹۸۵ء۔ (۱۰) ''فکشن کی تنقید'' آج کل، نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء۔ (۱۱) ''ایک نیا یاتری'' سلیم آغا قزلباش کے افسانوی مجموعہ ''انگور کی بیل'' کا دیباچہ ۱۹۸۶ء۔ (۱۲) ''فکشن کی تنقید کے باب میں اردو دانشوروں کا تشدد، تحکم اور تعصب'' ساؤتھ ایشیا سیمینار، خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۱۹۸۲ء۔ جوگندر پال کے افسانوں، افسانچوں اور ناولوں کے تراجم انگریزی، ہندی، پنجابی، مرہٹی، کنٹرا، ملیالم اور روسی میں ہو چکے ہیں۔ اگر اس کام کو یکجا کیا جائے تو کتاب کی کئی جلدیں بنیں۔

مستقل پتا:

۲۰۴۔ مندا کنی انکلیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۹ بھارت۔

اعزاز:

۱۔ ''اردو اکادمی اُتر پردیش ایوارڈ'' برائے ''بے محاورہ'' ۱۹۷۸ء

۲۔ ''میرا ایوارڈ'' برائے ''بے ارادہ'' ۱۹۸۳ء

۳۔ غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی، فکشن ایوارڈ: ۱۹۸۳ء

۴۔ اتر پردیش ہندی/ اردو ادب ایوارڈ: ۱۹۸۳ء

۵۔ ''پنجاب گورنمنٹ ایوارڈ'' برائے ''کتھا نگر''

۶۔ مودی غالب ایوارڈ: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

۷۔ بہادر شاہ ظفر ایوارڈ: اردو اکاڈمی، دہلی

نظریہ فن:

''افسانے کا فن اس قدر غیر رسمی ہے کہ جیسے بھی کہانی بس جائے اور اسے پڑھتے ہوئے محسوس ہو کہ اس میں جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ زندگی کی کسی سچی واردات کے مانند پہلی اور آخری بار پیش آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے میرے نزدیک کوئی تخلیقی تحریر، ارتکاب کے مترادف ہے۔ یہ غلط نہیں کہ نئی وارداتیں، نئے اسالیب کی متقاضی بھی ہو سکتی ہیں، مگر جس طرح ہماری شکلیں فطری طور پر ہمارے باطن کی آئینہ دار ہوتی ہیں اسی طرح ہر فن پارے میں اظہار کا ایک الگ مقامی تقاضہ ہوتا ہے اور اس تقاضے کے ادراک کے بغیر افسانہ نگار کو اپنے افسانے کی اصل شکل کا سراغ نہیں مل پاتا۔''

جوگندر پال (مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۲۸/ اکتوبر ۱۹۸۴ء)



حوالہ جات:

۱۔ دستاویزات میں تاریخ پیدائش ۲ اپریل ۱۹۲۵ء درج ہے۔

باہر کا آدمی

جے۔ گندر پال

جب بھی مجھے خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کا تھیلا گھومنے لگتا ہے' اس کے دائیں کندھے سے لٹکتا ہوا پھولا پھولا تھیلا' جس میں دنیا بھر کے...... لیکن ٹھہریئے' پہلے مجھے اس کا حلیہ بیان کرنا چاہیے...... اس کا چہرہ...... میری آنکھوں کے سامنے پھر اس کا تھیلا گھوم گیا ہے۔ دراصل اس کی ساری پہچان اسی تھیلے سے وابستہ ہے' شاید...... شاید اس کا کوئی چہرہ ہے ہی نہیں۔ بس آپ کسی بھی چہرے کے بارے میں سوچ لیجئے کہ یہی اس کا چہرہ ہے' پر اس چہرے پر داڑھی ضرور ہونی چاہیے' بڑی گھنی' بڑی سیاہ' منتشر داڑھی جسے دیکھ کر لگے کہ چہرے پر کوئی چہرہ نہیں داڑھی ہی داڑھی ہے...... آنکھیں؟...... اس کی آنکھیں اتنی چھوٹی ہیں کہ آپ غور سے نہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے اسے آنکھوں کے بغیر ہی نظر آجاتا ہوگا۔

جب بھی میں اس پارک میں آنکلتا ہوں تو وہ سدا یہیں ہوتا ہے۔ نہ معلوم کہاں رہتا ہے' کیا کرتا ہے' کچھ کرتا بھی ہے یا نہیں' اور کچھ بھی نہیں کرتا تو اس کا تھیلا دنیا بھر کی اشیاء سے کیونکر بھرا رہتا ہے۔ ننھے منے بچوں کے لئے چاکلیٹ' خوبصورت عورتوں کے لئے پھول' ٹورسٹس کے لئے تصویریں' بیماروں کے لئے دوائیاں' شرابیوں کے لئے بائل او پنز' سب کچھ...... سب کے لئے سب کچھ' بغیر قیمت کے' بغیر احسان کے' صرف اس لیے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے' بس!

ایک بار کسی عورت نے اس کا پھول قبول کر کے اسے پیسے ادا کرنا چاہے اور...... کیا نام ہے اس کا...... تھیلا...... میں اسے تھیلا ہی کہا کرتا ہوں'...... تھیلا روہانسا سا ہو کر رہ گیا۔

''تم مجھے اس پھول کے دس پیسے یا دس روپے دینا چاہتی ہو...... ہے نا...... پر میرا تھیلا اس لئے بھرا رہتا ہے کہ میں کسی سے ایک پائی بھی وصول نہیں کرتا۔''

اس عورت کے آدمی نے تھیلے کی جانب شک کی نظروں سے دیکھ کر اپنی بیوی کو آگے دھکیلنا چاہا' لیکن اس کی بیوی نے بدستور رکے

ہوئے بڑے پیار سے پھول اپنے جوڑے میں سجالیا۔

تھیلا خوشی سے اور پھولا پھولا معلوم ہونے لگا۔

''دیکھو بابو' اس نے عورت کے شوہر کو بتایا۔ ''وہی جوڑا ہے لیکن میرے پھول سے کتنا رنگ دار نکل آیا ہے!''

''جاؤ' جاؤ بابا' کہہ دیا نا' اپنی راہ لو۔''

''تمہارا کیا لے رہا ہے حق'' اس کی بیوی نے اسے ٹوک دیا۔

''میں کسی سے کچھ نہیں لیتا' کیونکہ میرے تھیلے میں ہر چیز پہلے ہی سے موجود ہے..... جو چاہو لے لو۔''

تھیلے کو انبساط کا دورہ پڑ جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے چٹکیاں بجا بجا کر چھوٹے سے نیم دائرے میں ناچ رہا ہے.....

''لے لو بھیا' سب کچھ لے لو' دھرتی میری ہے نہ اس کی' سب کچھ اپنا مان کے لو لو..... لے لو!''

جیسے کسی جھونپڑی میں کوئی غریب بچہ سو گیا ہو اور سپنا دیکھ رہا ہو کہ ان کے دروازے پر کہیں سے اناج کی گاڑی آ کر کھڑی ہوئی ہے اور وہ اچھل کر جوں کا توں سوئے سوئے دروازے پر آ گیا ہو۔

''لاؤ!''

''لے لو!''

تھیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ایک طرف نکل جاتا ہے' اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کی آواز کانوں میں پیہم بجتی رہتی ہے اور ہم اسے سن سن کر شاداب ہوتے رہتے ہیں۔

اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں اس پارک میں یہاں اسی بنچ پر بڑا مغموم بیٹھا تھا۔ میرے پچاس روپے جیب سے کہیں گر گئے تھے' یا کسی نے نکال لیے تھے اور مہینہ ختم ہونے میں ابھی پورے بیس روز باقی تھے' اور ہمارے دفتر میں پیشگی تنخواہ ادا کرنے کا دستور نہ تھا اور اس اجنبی شہر میں میری جان پہچان کے بہت کم لوگ تھے۔

وہ ہنستا ہوا میرے پاس آ گیا۔

''کیوں پیارے؟ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہو؟''

اس کی آواز کا اثر تھا یا میری ہمدردی کی تمنا' میں نے جھٹ اپنی ساری بپتا کھول کر بیان کر دی۔

تھیلے نے قہقہہ لگایا۔ ''تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''

تھیلے سے اس کا ہاتھ برآمد ہو کر میری طرف اس طرح بڑھا' گویا تیز ہوا سے اڑ اڑ کر کسی ثمر آفریں درخت کی ٹہنی۔ ''یہ لو' تمہارے پچاس روپے!''

میں حیرت آمیز مسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''لے لو نا' تمہارے ہی ہیں!''

''تو یہ بات ہے۔'' لیکن میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ تمہیں اب کیا لینا دینا ہے۔ تمہارے پیسے وصول ہو گئے ہیں' یہی بہت ہے۔ میری آنکھیں کئی روز دو باوردی سپاہیوں کے مانند اس کے تعاقب میں لگی رہیں۔ ہو نہ ہو' وہ ضرور کوئی ایسا ویسا دھندا کرتا ہے۔

پھر ایک روز

''بابا!''

وہ پارک کی ایک طرف جا رہا تھا کہ چند مشکوک قسم کے نوجوانوں نے اسے گھیر لیا۔

''لاؤ!''

تھیلے نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا؟...... اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر تاش کا پیکٹ ان کی طرف بڑھا دیا اور وہ سب تاش کھیلنے کے لئے وہیں اس کے قدموں میں گھاس پر بیٹھ گئے اور وہ مسکرا مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''آؤ بابا' تم بھی کھیلو۔ ہم پیسے لگا کر کھیل رہے ہیں۔''

''مجھے پیسوں سے کیا کرنا ہے بھائی؟''

''پیسوں سے کیا کیا جاتا ہے...... شراب پیو...... اور پلاؤ۔''

''مجھے جو کچھ پینا ہوتا ہے وہ پیسوں کے بغیر ہی پینے کو مل جاتا ہے...... ہاں' تمہیں پینا ہو تو......'' اس کا ہاتھ شراب کی بوتل تھامے تھیلے سے نکلا۔ ''یہ لو!''

''مفت؟''

''ہاں' لے لو' تمہاری ہی تو ہے۔''

تمہاری ہی تو ہے!...... تو...... تو اس کی ہر شے تمہاری ہی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس نے واقعی میرے ہی پیسے مجھے لوٹائے تھے۔

''لے لو!''

میرے باوردی سپاہیوں کے ہاتھوں سے ہتھکڑی نیچے گر گئی اور کھنکا پا کر تھیلے نے اپنا سر میری طرف موڑ لیا۔

''ارے تم؟...... آج پھر تو کسی نے جیب نہیں کاٹی؟''

میں خجل سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کچھ بولو بھئی' کہیں ایسا تو نہیں' کہ اب کے تم ہی کسی کی جیب کاٹ کے آ رہے ہو؟''

تاش کے پتے بانٹنے والے نوجوان نے قہقہہ لگا کر پہلی بار میری طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ ''اگر ایسا ہے تو آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ...... ہمارے مطلب کے آدمی ہو۔''

تھیلا پھر مجھے گورکھ دھندا سا معلوم ہونے لگا...... کیا پتہ...... کیا پتہ' وہ ان لوگوں کا گرو گھنٹال ہو؟

''ان سب لوگوں سے......'' اسے مخاطب کر کے میں چند قدم پرے آ گیا تا کہ وہ بھی میری طرف سرک آئے...... ''ان سب سے تمہاری بڑی گہری جان پہچان ہے؟''

''نہیں' میں کسی کو نہیں جانتا' تمہیں یا انہیں...... نہیں' تم ٹھیک کہتے ہو' میری شاید سبھی سے بہت گہری جان پہچان ہے......'' اپنی بات پر وہ کان دھر کر ہنس پڑا۔ پتہ نہیں' میں کیا بک رہا ہوں...... اور پتہ نہیں مجھے تم پر غصہ کیوں آ رہا ہے؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ سمجھدار لوگ مجھے بڑے بے وقوف لگتے ہیں۔'' پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر اپنے سامنے کی طرف چل دیا اور

دیکھتے دیکھتے کچھ اس طرح گم ہوگیا گویا میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں آ داخل ہوا ہو......

اور وہ ساری رات میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور تھیلا بدستور میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں چلتا رہا...... چلتا رہا اور وہیں کا وہیں دکھائی دیتا رہا اور میں بے چین سا پڑا رہا کہ وہ میری طرف منہ کر کے کھڑا کیوں نہیں ہو جاتا۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل میں اتر جانا چاہتا تھا تا کہ وہاں سے سارے کا سارا تھیلا اٹھا کر باہر لے آؤں اور پھر اس میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک شے کو ٹٹول لوں کہ اس میں کیا کیا بھرا ہوا ہے؟..... اگر میں اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرتا تو آج کوئی سی آئی ڈی آفیسر ہوتا...... اوائل ہی سے مجھے ہر بات کی ٹوہ لگانے کی پڑی رہتی ہے۔

میری طرف پیٹھ کئے تھیلا اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے...... وہ!...... اور وہ اس کے پیچھے۔

ٹھہرو!...... یہ رکھ لو!...... میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔

پولیس!...... تھیلا ہنسنے لگا ہے...... تمہیں پولیس سے ڈر لگتا ہے...... ہاں ہاں خوب ڈرو...... جی بھر کے تمہیں کوئی ڈاکو تھوڑا ہی بننا ہے۔ چور جتنا ڈر ڈر کر اپنا فرض پورا کرتا ہے اس کا کام اتنا ہی اچھا ہوتا ہے......

جلدی کرو پولیس......

ہاں ہاں سن لیا بھائی لیکن تم جسے پولیس کہتے ہو وہ ہے کہاں؟...... کون؟...... ایک بار مجھے بھی شک گزرا کہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس کے آگے آگے دوڑ کر میرا دم پھول گیا...... ہہ ہاہہ!...... معاملہ دراصل ہوتا یہ ہے کہ چور بیچارہ خود آپ ہی اپنے پیچھے لگا رہتا ہے...... ہہ ہہ ہا!...... چوری کر کر کے اس پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہوا تو اپنے ہی ہاتھوں ہوگا...... ہہ۔ ہہ ہا!...... تھیلے کی داڑھی میں سے اس کے چہرے کے چھپے ہوئے نقوش اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے اس کے تھیلے میں اوپر تک ٹھسا ہوا مال...... ''پولیس سے کیا ڈر؟...... ڈرنا ہی ہے تو اپنے آپ سے ڈرو اپنی ذات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دو پھر تمہیں کسی سے...... پولیس سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں......''

میں نے اپنے بستر پر بے چینی سے پہلو بدلا شاید میں سو گیا تھا اور...... اور میری آنکھیں کھلی تھیں اور...... تھیلا میرے سامنے ہوا میں جھولتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی چاہیے بلا جھجک کہہ دو۔ میرے پاس سب کچھ ہے اور میرا سب کچھ تمہارا ہے میرا نہیں چور بے چارے کا مال اپنا کہاں میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے بولو تمہیں کیا چاہیے۔''

میں آپ کو سچ بتاؤں؟...... میں نے بھی ایک بار چوری کی تھی۔ ان دنوں میں ایک بزنس مین کا سیکرٹری تھا۔ جب اسے خبر ملی کہ اس کے گھر کالے دھندے کے شک میں این فورس منٹ والے چھاپہ مارنے کی سوچ رہے ہیں تو اس نے گھر کی نقدی ادھر ادھر اوروں کے گھر رکھوا دی۔ مجھے بھی اس نے پانچ ہزار رکھنے کو دیا۔ پر دو روز بعد میں نے تھانے میں جھوٹی رپورٹ کر دی کہ میرا ڈھائی ہزار روپیہ چوری ہو گیا ہے...... اور ڈھائی ہزار لے کر کانپتا ہوا مالک کے پاس جا پہنچا...... اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنا مجھ غریب کے بس سے باہر ہے جناب آپ اپنی پوری رقم تھوڑی تھوڑی کر کے میری تنخواہ سے کاٹ لیا کریں۔ میرا مالک میری ایمانداری سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے دو چار مہینے پچاس پچاس روپے کاٹ کر باقی کی رقم مجھے معاف کر دی...... آپ یقین کیجئے ان مفت کے ڈھائی ہزار نے مجھے چند ماہ کے لئے اتنا شاہ دل بنا دیا کہ کسی جان پہچان والے کو مشکل میں پا کر مجھے بڑی مسرت ہوتی اور بڑی مشکل سے اسے مدد قبول کرنے پر آمادہ کرتا...... لو بھائی یہ تمہارے ہی ہیں!...... ایک نہایت غریب اور بوڑھے ہمسائے کو تو میں نے بیک وقت پانچ سو روپے دے دیئے...... لو چاچا روؤ نہیں ان پیسوں سے ہنسی خوشی اپنی بیٹی

کے ہاتھ پیلے کردو۔ اب یہ قصہ لے ہی بیٹھا ہوں تو باقی قصہ بھی سن لیجئے۔ بوڑھے کی بیٹی کو پتہ چلا تو اسی روز شام ڈھلتے ہی وہ سب سے چھپ کر میرے پاس آ گئی اور میرے سینے سے سر جوڑ کر جی بھر کے روئی اور میں نے ...... اب کیسے بتاؤں میں بڑا برا آدمی ہوں...... چلئے چھوڑیئے' یہی کیا کم ہے کہ غریب کا کام ہو گیا۔

میں نے بے چین ہو کر بستر پر پھر پہلو بدلا۔

پھولے ہوئے تھیلے کا سامنے کا اوپری حصہ بڑی گھنی اور بے ترتیب داڑھی مونچھ سے بھر گیا ہے۔ گھاس پھوس کے اس تودے کے نیچے سے مجھے کسی کی آواز سنائی دی ہے۔ ارے! یہ تو میری ہی آواز ہے' یا میری نہیں تو آپ کی' یا کسی اور کی' کسی کی بھی...... ''کہیں سے مجھے ایک ہزار ہاتھ آ جائے تو اسی وقت ایک سو روپے یتیم خانے میں دے آؤں اور پانچ ہزار آئے تو ڈھائی ہزار...... دس ہزار تو آٹھ...... ہاں' خدا کی قسم' آٹھ ہزار...... میرے لیے دو ہی کافی ہیں...... اور پچاس ہزار آ جائے تو خوشی سے باؤلا ہو کر یہ سارے کے سارے پیسے کسی کی مٹھی میں تھما دوں اور ننگے پاؤں دوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل جاؤں......''

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے میں بے تابی سے ہنس پڑا۔

تمہیں یقین نہیں آ رہا؟...... نہ سہی...... پر تمہیں معلوم نہیں' چور کتنا نیک ہوتا ہے۔ چرا چرا کر نیکی کا ڈھیر جمع کر لیتا ہے لیکن چوری کا مال ہوتا ہے اس لیے اپنی نیکی کو اس طرح خرچ کرتا ہے کہ اس پر نیکی کا گمان نہ ہو' اس کی چوری پکڑی نہ جائے......''

شاید میری آنکھ لگ گئی تھی' یا اگر پہلے ہی آنکھ لگی ہوئی تھی تو نیند ہی نیند میں تھک کر میں خوابیدہ ہونے لگا تھا۔

دوسرے روز شام کے وقت...... ذرا دھیان سے سنئے' اصل میں یہی واقعہ سنانے کے لئے میں نے ساری کہانی چھیڑی ہے...... شام کے وقت تھیلے سے ملتے ہی میں نے بڑے اچانک پن سے' بڑی محبت سے یہ سوال کیا...... ''تم کام وام کیا کرتے ہو؟''

میرا سوال سن کر اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا کالا چور ابھر آیا اور مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ یہ کالا چور دیکھتے ہی دیکھتے میرا گلا گھونٹ دے گا لیکن عین اس وقت پولیس کا ایک سپاہی کہیں سے وارد ہو گیا۔

''کہو بھیا' بیڑی پیو گے؟'' دفعتاً تھیلے کے چہرے میں درویش صورت مسکراہٹوں کا ہجوم امنڈ آیا اور اس کا ہاتھ بیڑی کا ایک بنڈل لیے تھیلے سے نکلا' مانو اس نے خالی خولی ہوا میں ہاتھ ڈال کر معجزے کا سماں باندھ دیا...... ''لے لو نا!''...... تمہارا ہی ہے!!''

لیکن اس اثناء میں پولیس کے تین سپاہی اور آ گئے اور اسے گھیر لیا۔

درویش صورت مسکراہٹوں کے ہجوم سے گرد اڑنے لگی۔ ''گھبراؤ نہیں' میرے تھیلے میں سب کچھ ہے...... سب کچھ تمہارا ہی ہے...... جو چاہو گے دے دوں گا۔''

''ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چپکے سے ہمارے حوالے کر دو۔''

''ہاں' ہاں' ضرور......'' تھیلے نے ہاتھ اپنے تھیلے میں ڈالا اور ساری اشیاء کو ٹٹولتے ہوئے یکبارگی اس کا چہرہ اترنے لگا......''میں......

''میں تو اپنے تھیلے میں نہیں ہوں......!''

اور پھر اپنی بات کو سن کر وہ ہنسی نہ روک سکا اور سرعت سے عقب کی خاردار جھاڑیوں کی طرف اچھل گیا اور چور نہ ہوتا تو ضرور پکڑا جاتا۔

O

غیاث احمد گدی

نام : غیاث احمد

قلمی : غیاث احمد گدی

پیدائش : ۱۷ فروری ۱۹۲۸ء بہ مقام جھریا (بہار) بھارت

تعلیم : پہلے پہل سال بھر گدی مدرسہ، جھریا میں مولوی فضل الحق سے عربی کی ابتدائی تعلیم پائی بعد میں دو برس تک گھر پر مولوی قاسم سے اردو انگریزی اور حساب کا درس لیا۔ درسی تعلیم سے محروم رہے۔ ان کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ جھریا (بہار) کے گدی مسلمان گوالوں کے خاندان سے تھے۔ آپ کے والد کا نام احمد گدی تھا، جن کا آبائی پیشہ دودھ کا کاروبار تھا۔ بچپن میں ان کے سگے چچا حبیب گدی نے گود لے لیا اور غیاث احمد گدی کا بچپن بالٹی میں دودھ بھر کر گھر گھر بانٹنے میں گزرا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ رسمی تعلیم سے محروم رہے۔

ان کے لڑکپن اور ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ ایک تھا۔ جھریا میں ایک چھوٹی سی پبلک لائبریری تھی جس کے طفیل غیاث احمد گدی اس دور کے نمایاں ادبی جرائد ''ہمایوں'' ''عالمگیر'' ''خیام'' ''ادبی دنیا'' اور ''ادب لطیف'' سے متعارف ہوئے اور ادب کی چینک دل میں جاگی۔ ۱۹۴۰ء میں کرشن چندر سے متاثر ہو کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور دس برس کی ریاضت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پچاس کی دہائی میں جب نریش کمار شاد نے کرشن چندر کا انٹرویو کیا تو انہوں نے گدی کو مستقبل کے اردو افسانے کا اہم نام قرار دیا۔ ۱۹۴۴ء میں اپنے ہی خاندان میں بانو سے شادی ہوئی اور یہ رفاقت صرف آٹھ برس رہی۔ ۱۳ فروری ۱۹۵۲ کو بانو کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ''میراث'' کے نام سے خالص افسانوی ادب کا ادبی مجلہ جولائی ۱۹۶۲ء میں جاری کیا تھا، جس کے صرف چار شمارے نکل سکے۔ غیاث احمد گدی دل کے مریض چلے آتے تھے، جنوری ۱۹۸۶ء کی درمیانی شب دل کا دورہ پڑا اور صبح پانچ بجے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''جوار بھاٹا''مطبوعہ''عالمگیر''لاہور ٗدسمبر ۱۹۴۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱ ''بابا لوگ''(نو افسانے) کلچرل اکادمی ٗ ریناہاوس گیا ٗ بہار طبع اوّل:۱۹۶۹ء

(۱) بابا لوگ (۲) پہیہ (۳) منظر و پس منظر (۴) بابے (۵) ڈور تھی جون سین (۶) بدصورت سیہ صلیب (۷) پیاسی چڑیا (۸) جوہی کا پودا اور چاند (۹) صبح کا دامن

۲۔ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''(سولہ افسانے) صبا پبلی کیشنز ٗ دھرم شالہ روڈ جھریا ٗ بہار طبع اوّل:۱۹۷۷ء

(۱) پرندہ پکڑنے والی گاڑی (۲) تج دو تج دو (۳) ڈوب جانے والا سورج (۴) ایک خوں آشام صبح (۵) قیدی (۶) نارد منی (۷) خانے تہ خانے (۸) اندھے پرندے کا سفر (۹) (۱۰) افعی (۱۰) کالے شاہ (۱۱) ایک جھوٹی کہانی (۱۲) پرکاشو (۱۳) پاگل خانہ (۱۴) دیمک (۱۵) کیمیا گر (۱۶) ہم دونوں کے بیچ

۳۔ ''سارا دن دھوپ''(بارہ افسانے) مکتبہ غوثیہ، شبستان، نیو کریم گنج، گیا، بہار طبع اوّل ۱۹۸۵ء

(۱) طلوع (۲) کوئی روشنی (۳) سورج (۴) صبح کا دامن (۵) دھوپ (۶) آخ تھو (۷) کوڑھ (۸) چہرے پہ چہرہ (۹) سائے اور ہمسائے (۱۰) سرنگ خانے (۱۱) ایک بھیگا ہوا لب (۱۲) چٹکی بھر ہریالی

۴۔ ''پڑاؤ''(ناولٹ) صبا پبلی کیشنز ٗ دھرم شالہ روڈ ٗ جھریا ٗ بہار طبع اوّل:۱۹۸۰ء

غیر مدوّن:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ پانچ نامکمل ناولٹ بعنوان ۱۔''نواب حشمت بیگ ۲''خانے تہ خانے''۳۔ پیاسی چڑیا ۴۔ تج دو تج دور ۵۔ڈوب جانے والا سورج'' کے عنوانات سے یادگار چھوڑے۔

زندگی میں مستقل پتا:

جھریا ٗ بہار بھارت

نظریۂ فن:

خوب سے خوب تر کی تلاش۔۔۔۔میرے نزدیک یہ بات اہم ہے''

غیاث احمد گدی

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۴ نومبر ۱۹۸۰ء)

سائے اور ہمسائے

غیاث احمد گدی

منور خموشی کے بلور چھنکے
کرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی
کلی چٹکی، آواز کے پھول مہکے
رنگوں کی سروں کی کوئی کہکشاں
کھل کھلاتی ہوئی گود میں آ پڑی ہے
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے، ساز چونکے
کئی نور کی اُنگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق، رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا میکدہ سامنے ہے
دھنک سامنے ہے
کسی کو یہ قصہ سناؤں......! (''بلور'': مخدوم محی الدین)

وہ دونوں جو نوے دن پہلے گھر سے بھاگے تھے، اور گھبراتے ہوئے دل کے سکون کے لیے ''شانتی نواس'' ہوٹل میں سکونت اختیار کی تھی۔

وہ دونوں بے زار بے زار سے تھے ..... !

کلا نے پلٹ کر پھیلے ہوئے بدرونق میدان کی طرف دیکھا، تو سارے میں پیروں سے کچلی اور دھوپ میں جلی ہوئی گھاس۔ بے حال پڑی تھی۔ ایک بدرنگ سا خارش زدہ کتا کچھ سونگھتا پھر رہا تھا، اور دو بیمار سے گدھے گردن نہوڑے کھڑے تھے۔

اُداسی، بے طرح اُکتا دینے والی اُداسی اس پر محیط ہو گئی۔ کلا نے پلٹ کر اُس آدمی کی طرف دیکھا، جو سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے لگا باہر کی طرف تک رہا تھا اور خود بے چین سا تھا۔

''ہم نے اچھا نہیں کیا!''

یہ کس کی آواز تھی ..... ! کلا نے محسوس کیا، یہ آواز اُس کی اپنی ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی ہے۔ جیسے خود سدھیر اس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سا لگنے لگا ہے! لیکن کلا کی آواز سن کر سدھیر چونک پڑا۔ اُسے لگا جیسے یہ آواز اس کی دیکھی بھالی، جانی پہچانی ہو ..... !

سدھیر نے کلا کو غور سے دیکھا، نوے دنوں نے کلا کو کئی جگہ سے، ہلکے ہلکے ہی سہی، مگر کھرچ ڈالا تھا۔ اور وہ کلا جو نوے دن پہلے تک اپسرا نظر آ رہی تھی، اب کچھ پھیکی پھیکی، سیٹھی سیٹھی ..... بوڑھی ..... !

لیکن نہیں، وہ بوڑھی تو نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ یہ محض اُس کا خیال ہے کہ آدمی اتنی جلد بوڑھا ہو جاتا ہے! صرف نوے دنوں میں بہاریں اپنے خیمے اُجاڑ ڈالتی ہیں!! یہ اجنبی اور کھسوٹ لینے والا خیال، شاید اس کے دل میں بہت دنوں سے پل رہا تھا، اتنے دنوں سے جتنے دنوں کی اس کی محبت تھی۔ یا شاید اس سے کچھ آگے .....

مگر کلا آج کچھ پھیکی پھیکی، سیٹھی سیٹھی بہرحال تھی۔ سدھیر کی آنکھیں کوئی عیب جو کٹنی تو نہیں تھیں، ایک معصوم صفت بچہ تھیں جو سچائی سے جو کچھ دیکھتا ہے بیان کر دیتا ہے۔ جس جلوے کو اُس نے اپنی تمام زندگی کا حاصل سمجھا تھا، وہ یہی کلا تھی نا ..... ؟

بہرحال کلا تھی۔ کوئی فرق نہیں تھا۔ ابھی ابھی وہ سو کر اُٹھی تھی، رات بھر کی کچلی ہوئی۔ اس کے لہو کے سارے چراغ ساری رات جلتے رہے تھے۔ سدھیر کے بستر کی دنیا میں چراغاں کیے ہوئے تھے ..... جو صبح ہونے سے کچھ پہلے آہستہ آہستہ بجھنے لگے۔

پھر ایک دم سے بجھ گئے ..... !

''مجھے اچھا نہیں لگتا!'' کلا نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا اچھا نہیں لگتا؟'' سدھیر نے اتنے ہی بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا ..... ''میں؟''

''نہیں نہیں، میرا مطلب ہے یہ سب کچھ ..... یہ چونچلے .....'' پھر کلا نے اپنے لمبے سیاہ گھنے اور اجنبی راہبروں کو بھٹکا دینے والے بالوں کو جھٹکا اور گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت کچھ کہنے اور کچھ نہ کہہ سکنے کے بیچوں بیچ پہنچ کر آہستہ سے بولی ''لگتا ہے کسی چیز کی کمی پڑ رہی ہے، جیسے کچھ گھٹ رہا ہے، گویا کچھ اچھا لگتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگ رہا ..... !''

''جیسے ہر شئے میں، کئی شئے .....''

''نہیں!'' کلا نے سدھیر کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔ ''نہیں، مجھے شعر بھی اچھے نہیں لگتے!''

سدھیر نے جواب نہ دیا۔ صرف پلٹ کر گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک لمحہ میں کلا اسے کیا نظر آئی؟ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ نوے دنوں میں نہ صرف وہ خود بلکہ کلا بھی کئی جگہ سے ہل گئی تھی۔ محبت کی وہ عمارت جس کی تعمیر میں ان دونوں کا لہو

جلا تھا، اس کی اینٹ کھسک رہی تھی..... نوے دنوں میں اُتنی ہی اینٹیں ہل گئی تھیں۔

''صرف دس اینٹیں رہ گئی ہیں!'' خبر نہیں سدھیر نے کہاں پہنچ کر یہ جملہ ادا کیا کہ خود اُسے ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ سوچا کہ بھاگ نکلے مگر کلا سامنے کھڑی تھی۔

''کیسی اینٹیں..... ! کیسی دس اینٹیں؟''

''محبت کرنے والے بے قرار دلوں نے ایک عمارت بنائی تھی۔'' سدھیر خاموشی سے شیو کرتا رہا۔ اور اس کا لاشعور جو بڑا سچا تھا، کھرا تھا، بے باکی سے بولتا رہا..... ''نوے دنوں میں یہ خوبصورت عمارت تیار ہوگئی، تو ایک دن ان دونوں نے اس میں پرویش کیا تھا۔ دھڑکتے ہوئے، خوف زدہ اور محبت سے سرشار دلوں نے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کیں۔ جانے کس نے کیا کہا، جانے کس نے کیا سنا کہ اس کے بعد چاروں اُور کنواری دھرتی پر، برسات کی پہلی بوندیں پڑنے سے جیسی سوندھی سوندھی، کنواری کنواری خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں، ویسے ہی کچھ خوشبو سے چاروں دشاؤں کے نتھنے مہک اُٹھے..... !''

''اُنہہ!'' کلا اُکتا گئی۔ اُس نے اپنے لمبے سیاہ بالوں کو گردن کی ہلکی جنبش سے پرے کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''تم بہت بولتے ہو، سدھیر، مختصر کرونا!''

سدھیر کا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے شیشے ہی میں سے اُسے دیکھا، جو گہری، گمبھیر اور ایک ذرا اُداس بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''اینٹیں سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہیں، کلا!''

''کیا؟''

''پہلے تم کہتی تھیں، تم بہت اچھا بولتے ہو، سدھیر؟''

پہلے پہلے..... پہلے..... ہر لمحہ جو بیت جاتا ہے وہ بہت پیارا ہوتا ہے۔ ہر جذبہ جو مر جاتا ہے دلوں میں اُس کا مزا رہتا ہے! ایسا کیوں ہوتا ہے..... ایسا کیوں ہوتا ہے..... زندگی اتنی بے وفا، اتنی بے ایمان، ایسی بے مروت کیوں ہے۔ اس کو جتنی شدت سے پکڑو، پھسل جاتی ہے۔ ریت بھری مٹھی کی طرح پل کی پل میں خالی ہوجاتی ہے۔ ایسی جاتی ہے کہ پلٹ کر نہیں دیکھتی۔ کہ کوئی نامراد اس کا دامن پکڑ کر، پوچھ لے کہ تم نے مجھے کیا دیا؟ یا جو کچھ دیا وہ سب اتنی جلدی چھینے کیوں لے رہی ہو..... ؟

''کیا سوچنے لگیں؟''

''کچھ نہیں!'' کلا چونک کر بولی۔ پھر اپنے آپ سے سہم گئی..... ''تم کیا کہہ رہے تھے، وہ نوّے اینٹوں والی بات؟''

''میں کہہ رہا تھا کلا، کہ محبت کے اس محل میں رہتے ہوئے ہمیں نوے دن بیت گئے ہیں..... ، ذرا دیر کو وہ ٹھہر گیا۔ اور کلا کے چہرے پر ردعمل پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر مسکرا پڑا..... ''اور اب صرف دس اینٹیں رہ گئی ہیں!'' سدھیر با دل ناخواستہ چُپ ہوگیا۔

کلا کے اندر کی دنیا میں کسی نے جھانک کر سرگوشی کی۔ بڑی آہستگی سے کسی چالاک کٹنی کی طرح کوئی پھسپھسایا۔ ''اور اگر دس اینٹیں بھی ہل گئیں تو؟'' جانے کہاں سے ایک طوفان سا اُٹھا اور اس کے باہر کی دنیا پر بھی چھا گیا۔ کلا کانپ سی گئی۔ اس کے چہرے پر گہرے غم کا سایہ یوں منڈلایا کہ ضبط کے بندھن ٹوٹتے محسوس ہوئے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر اُس کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی، جہاں سے سمندر، بے کراں سمندر، اس کی زندگی کا پرتیک، تنہا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ گہرا، نیلا، زہر گھلا ہوا، کروٹیں لیتا ہوا سمندر، اس کے متلون مزاج زندگی

کی طرح پہلو بدلتا ہوا سمندر... کلا کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ ایک جھکڑ سا چلنے لگا......

آرے سمندر آ...... آ تو مجھ میں سما جا کہ آنے والے لمحے میری تاک میں بیٹھے ہیں! لمحے، جو ابھی سے چین نہیں لینے دیتے۔ میرے اس سامدرک جیون میں تم ہی تم ہو۔ یا پھر...... یا پھر......!

سدھیر نے اس کے کندھوں پر یوں ہاتھ رکھا کہ اسے تنکے کا سہارا مل گیا۔

''تم خواہ مخواہ کبھی جاتی ہو، کلا! میں نوے اینٹوں کو پھر سے مضبوط کرلوں گا۔ میری محبت...... ہماری محبت میں اتنا دم ہے!''

کلا جھپٹ کے اس کے سینے سے لگ گئی۔ اور تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا: ''جانے کیوں ایسا لگتا ہے، سدھیر، ایسا لگتا...... اس کی آواز گلے کی رہ گزر میں بھٹک گئی اور وہ سدھیر کے سینے سے لگی، سسک سسک کر رونے لگی......

پھر بہت دیر ہوگئی۔ سامنے سانجھ کے بیمار سائے جھک آئے۔ تھکے ہارے دن کے رگ وپے میں تھکان ہی تھکان سرایت کرنے لگی۔

پتہ نہیں کہاں سے ایک پرندہ سمندر کی سطح پر منہ مار کر اونچائیوں کی طرف اُٹھ گیا۔ کلا سر سے پاؤں تک لرز اُٹھی۔

عین اُسی لمحہ سدھیر نے اس کی ٹھوڑی اُونچی کر کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

''چلو کہیں گھوم آئیں۔ پھر آگے سوچیں گے!''

آگے سوچنے کے لیے جتنے راستے ہو سکتے ہیں، سب کھلے پڑے ہیں۔ وہ کسی راہ پر بھی مڑ سکتی ہے۔ کوئی روکنے والا نہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ زندگی اتنی سبک سر ہوتے ہوئے بھی ایسی چٹان کی طرح بھاری کیوں ہو جاتی ہے کبھی کبھی؟

چٹان کی طرح بھاری کیوں ہو جاتی ہے؟

مگر کبھی کبھی......! یہ کبھی کبھی کی بدرونقی، یہ کبھی کبھی کی افسردگی، یہ کبھی کبھی کا بے پناہ سناٹا، مگر اس کی کبھی کبھی کی بہاریں بھی تو ہیں جو اس کی زندگی کے ویرانے میں پھول ہی پھول کھلاتی ہیں۔ ایک نغمگی کا جادو، جو اس کی ہستی کے گرد چھا جاتا ہے؟ کلا نے اس کا جواب نہیں دیا۔ کلا نے حسب معمول اپنے اُن ہونٹوں کو نہیں پونچھا جن پر ابھی ابھی سدھیر کے لبوں نے سجدے کیے تھے۔ وہ خاموشی سے سمندر کی اُور دیکھتی رہی۔ جس پر حد نگاہ سلوٹیں ہی سلوٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ابھی ابھی جس کی بے تاب سطح پر ایک پیاسا پرندہ منہ مار کر اُٹھ گیا تھا۔ لذت کا ایک لمحہ چرا کر بھاگ گیا تھا۔

اُس نے پلٹ کر سدھیر کی طرف دیکھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ میں پھیکی پھیکی، سیٹھی سیٹھی، بوڑھی......؟''

''نہیں نہیں! کلا خدا کی قسم بوڑھی نہیں!'' سدھیر نے ندامت سے مگر سچائی سے جواب دیا...... مگر سیٹھی سیٹھی......''

''وہ اس لیے کہ'' کلا نے جلدی سے بات کاٹ کر جواب دیا ''میں نے منہ نہیں دھویا ابھی دھوؤں گی تو پھر......'' کلا دفعتاً دنگ رہ گئی۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ خود حفاظتی کا یہ انوکھا، بے ایمان جذبہ کہاں سے اس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ وہ کیوں مدافعت کی ضرورت محسوس کرنے لگی ہے۔ کیا سدھیر نے اس شگفتہ چہرے سے ہی محبت کی ہے، جو کبھی کبھی اس کے پاس ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کیا ایسے لمحے میں سدھیر اُس کا نہیں ہوتا؟

کبھی کبھی سدھیر بھی تو بڑا انڈھال، تھکا ہارا دِکھتا ہے! کلا نے اپنے بے قرار ذہن پر زور دے کر سوچا، کیا ایسے لمحے میں بھی وہ اسے اتنا ہی پیارا، اتنا ہی قتل کر دینے والا محسوس ہوتا ہے؟ شاید نہیں!

شاید ہاں!

زندگی کے مثبت اور منفی انداز بہر حال باقی رہ ہی جاتے ہوں گے۔ شاید یہی زندگی کی اٹوٹ سچائی ہے۔ شاید یکسانیت سے، تواتر سے نجات حاصل کرنے کا قدرت کی طرف سے یہ صحیح راستہ ہے۔

''مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کوئی تمہارے چہرے سے تھوڑے محبت کی ہے!'' یہ سدھیر تھا جس نے اسے گلے سے لگاتے وقت یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ کلا کے ذہن کے اسپ تازی کو پھر ایک چابک سی لگی۔ اس کا حقیقت پسند دماغ دراصل محبت کرنے کے قابل ہی نہیں۔ کلا نے پھر سوچا، شاید محبت کا مفہوم یہی رہا ہو کہ اس کی آراستگی جھوٹ کی قندیلوں سے ہو۔ جھوٹ کی رنگا رنگ جھنڈیاں یہاں سے وہاں تک لرزتی رہیں، لرزتی رہیں!

''کلا، کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں!'' کلا نے قتل کر دینے والے انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی کوئی تمہاری عمر، تمہارے اس ناتواں جسم...... سے!'' اور جملہ نامکمل چھوڑ کر سدھیر کے جسم سے لپٹ گئی...... ''شاید سچ محبت کے لیے زہر ہے؟''

پھر وہ جلد ہی الگ ہوگئی۔ ''میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ پھر ہم گھومنے چلیں گے!''

آج کی شام بڑی پیاری تھی۔ آج کی شام اتنی پیاری ہوتے ہوئے بھی اُداس بھی تھی۔ جیسے شام نہ ہو، کلا ہو۔ اتنی دل آویز ہوتے بھی جس کے چہرے پر غم کا، اندرونی غم کا سایہ منڈلا رہا ہو۔ آج کی شام، سال نو کی پہلی شام اپنے دامن میں چراغوں کی بارات لیے گزر رہی تھی۔ چراغوں کی قطار، آڑی ترچھی، سیدھی، صراط مستقیم کی طرح پھیلے ہوئے چراغ مگر جن سے اردگرد ہلکا ہلکا دھواں بھی دکھ رہا ہے۔ کوئی چلتے چلتے یوں ہی دیکھتا ہے تو صرف روشنی ہی روشنی دکھتی ہے۔ کوئی پل بھر کو ٹھہر کر غور کرے تو......

چلتے چلتے اس نے ایک جگہ ٹھہر کر کلا کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے سے تھام لیا۔ ''اس روشن تابناک چراغ کے آس پاس دھواں دھواں سا کیوں اُٹھ رہا ہے! ایسی بھی کیا بات ہوگئی کلا؟''

''مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے، کچھ خوف سا، کچھ بے چارگی سی، کچھ گویا میں نے اچھا نہیں کیا۔ کبھی کبھی میری بنیاد ہل جاتی ہے۔ سدھیر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شاید وہ اینٹ جو میں نے رکھی تھی، وہ اینٹ جو تم نے رکھی تھی، وہ مضبوط نہیں پڑی تھی!''

''نہیں کلا!'' سدھیر نے اطمینان سے ٹھہر کر کسی بڑے گہرے آدمی کی طرح جواب دیا: ''یہ تمہارا وہم ہے۔ دراصل یہی وہم ہے جو محبت کو اتنا خوبصورت، اتنا ملیح بنائے رکھتا ہے کہ دل کو مسلسل اضطرار نصیب ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کلا کہ اینٹیں ہل رہی ہیں۔ لیکن صرف کبھی کبھی۔ اور تم، کلا! لگتا ہے تم کبھی کبھی ہی اس وہم سے نجات پاتی ہو۔ اس لیے تم مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہو۔ اور شاید میں تمھیں اس شدت سے نہیں چاہتا۔''

کلا نے چلتے چلتے رک کر اس کے چہرے کی طرف خاموشی سے دیکھا۔ اور جانے کیا پڑھ کر آگے بڑھ گئی۔ اور چپ سادھے چلتی رہی۔ بہت دیر ہوگئی۔ سارے میں شور وغل، ہنسی قہقہے، ننھے ہی ننھے بکھرے پڑے تھے۔ اس کے کندھے پر سدھیر کا ہاتھ تھا۔ کبھی کبھی چلنے میں اس کا پاؤں سدھیر کی ٹانگوں سے مس ہو جاتا تھا۔ شاید محبت اتنی قریب ہو جاتی ہے تو اپنا حسن کھو بیٹھتی ہے! شاید...... پھر کلا اپنے ذہن کے آزاد

پرندے سے چونک اُٹھی۔ ذرا نہیں ٹھہرتا، جدھر جی چاہتا ہے اُڑ جاتا ہے۔ اس نے ایسا کیوں سوچا، چلتے چلتے کلا نے سوچا، یہ سوچ کا پنچھی اتنا بے قرار کیوں ہے۔ کسی شاخ پر اس کے پاؤں جمتے کیوں نہیں! جب سدھیر پاس نہیں ہوتا تھا تو اس کے لیے وہ بے تاب تھی۔ اب وہ مل گیا ہے، اس سے اتنا قریب آ گیا ہے، یہ شاخ جھکتی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا کیوں؟ شاید یہ سچ ہی ہو کہ محبت قربت کے خنجر سے زخمی ہو جاتی ہے۔ پھر کلا نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا جیسے کوئی گہرے کنویں میں جھانک کر دیکھے، مگر وہاں تو سدھیر ہی سدھیر ہے...... سدھیر ہی سدھیر...... !

شاید قربت، ظاہری حسن کو آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے اور محبت کو دلوں کی گہرائیوں میں اُتار دیتی ہے۔ جیسے شبنم کا کوئی قطرہ سوکھی دھرتی پر گرتا ہے، ذرا ٹھہرتا ہے، ذرا کی ذرا اپنی چمک دکھاتا ہے، پھر دھرتی کے سینے میں ڈوبنے لگتا ہے، ڈوبتا ہی جاتا ہے۔

''دیکھو، کلا، یہ گیٹ وے آف انڈیا ہے۔ ہم لوگ اتنی بار اس کے قریب سے گزرے، دیکھا بھالا، مگر اس کی طرف ٹھہر کر دیکھا نہیں۔ یہ وہ دروازہ ہے جس کی راہ سے غیر ملکیوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم رکھے!'' سدھیر نے صرف کلا کی توجہ ہٹانے کی غرض سے کہا۔

ہوا خوش گوار تھی، سارے میں سالِ نو کی اُمنگ ہی اُمنگ تھی۔ اب کلا کے ذہن کو کہیں سے مٹھی بھر سکوں میسر آ گیا تھا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں۔ ایسے ہی ایک دروازے سے ایک اجنبی قدم نے میرے ہندوستان میں پہلی اینٹ رکھی تھی!''

''مجھے نہیں پتا تھا، کلا، میں تو ایک سیاح تھا۔ میں کیا جانتا تھا کہ تمھاری دھرتی میں اتنی کشش ہے کہ مسافر لوٹ کر جا ہی نہیں سکتا!''

کلا نے جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے نوروز کے چراغ روشن کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ سامنے سمندر کے تاریک سینے پر دُور سے آتے ہوئے ایک جہاز کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔ میں اپنی دہلیز سے لگی کھڑی تھی۔ سامنے سے کتنے جہاز آتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ مجھے کسی نے کبھی نہیں کھینچا، کسی نے کوئی آواز نہیں دی!

پھر بہت دن گزر گئے۔ جانے میری، اندر کی دنیا کو کوئی انتظار ضرور تھا، میں لاپروا تھی، باہر ہی باہر گھومتی پھرتی تھی۔ مگر اندر کسی کی بات جو تک رہا تھا۔ جب ہی میں نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا تو اندھیرے میں ایک سفید سفید مستول نظر آیا۔

پھر میرے کانوں نے دور سے آتی ہوئی ایک آواز، سائرن کی آواز سنی۔ جو مجھے کہیں کہیں سے ہی سہی، مگر مجھے برما گئی۔ پھر جہاز کنارے لگا اور کوئی اجنبی اُترا اور اُس نے بڑی آہستگی سے اپنے قدموں کی پہلی اینٹ رکھی، دھپ سے!

میری ساری دھرتی لرز اُٹھی۔ میرے ہندوستان کے سارے باطن میں ایک گونج سی سنائی دی۔ میری شاخ پر بیٹھے ہوئے کتنے ہی پرندوں نے پر تول لیے۔ یہ تم تھے!

''اور یہ تم تھیں!'' قریب کے بینچ پر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ سامنے سے ایک رنگوں کا ریلا، کچھ جوانیاں گزر گئیں۔ لہرا کر بالوں کی ایک لٹ اُس کے رخسار پر پھیل آئی، جسے سدھیر کی انگلیوں نے اپنے بے تاب لبوں سے چوم لیا۔

''اور یہ تم تھیں! میں اپنا ویرانہ لیے جہاں تہاں مارا مارا پھرتا تھا۔ ٹھیک میرے گھر سے نکلنے پر دوسرے مکان کے دریچے سے لگی تم ایک گلاب کھلاتی رہتیں اور میری جانب کلیاں بکھیرے دیتیں......''

ذرا ٹھہر کر سدھیر نے کلا کی طرف دیکھا۔ اور اس کے گلاب کو چوم لیا۔ ''پھر کیا ہوا جانتی ہو؟ پھر ان کلیوں میں لپیٹ کر تم نے ایک روز ایک موتی رکھ دیا تھا جو سیدھے میرے تلووں میں چبھا اور میری آنکھوں میں خون بن کر اُتر گیا۔''

''خون بن کر!'' کلا نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آہستہ سے احتجاج کیا ''نہیں، میں نے کسی کے لیے کوئی کانٹا نہیں رکھا تھا!''

''تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے، کلا۔ عورت کبھی اپنے سر کوئی الزام نہیں لینا چاہتی۔ خواہ، الزام کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو!''

''نہیں نہیں، میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں۔ یہ محض تمھاری غلط فہمی تھی۔''

''اسی غلط فہمی کی سیڑھیوں پر قدم رکھتا، میں ایک دن تمھارے ایوان میں پہنچ گیا اور تم کھڑی دیکھتی رہیں۔ اور زبان سے نہ سہی آنکھوں سے خوش آمدید کہا۔''

کلا چُپ رہی تو سدھیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یوں پکڑے جاتے ہیں مجرم!''

کلا نے چونک کر کہا۔ ''جھوٹے!'' اور آہستہ سے مجرموں کی طرح گردن جھکالی۔

''پھر، کلا، جانتی ہو کیا ہوا؟ برسوں سے میرے ویرانے میں ایک خشک لکڑی پڑی تھی، برق رسیدہ، لیکن آندھیوں اور جھکڑوں کے صدمے برداشت کیے ہوئے۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ سوکھی لکڑی کیوں ہے، کب سے ہے۔ میں نے جب بھی دیکھا وہ ہری نہیں تھی۔ میں ڈرتا تھا، کہیں کسی آندھی کی زد میں آ کر یہ ٹوٹ ہی نہ جائے۔ پھر سوچتا، یہ ٹوٹ ہی جائے تو بہتر۔ کیا فائدہ، اس میں اب ہریالی کہاں سے آئے گی! اس کی رگوں کا سارا لہو ناکامیوں کی جونک نے چوس لیا ہے۔ اس کی ہریالی کے سارے چراغ سمے کی صرصر نے بجھا دیے تھے۔ اب تو دھواں بھی نہیں اُٹھتا۔ یہ ٹوٹ کر بکھر ہی جاتا تو اچھا ہے۔ ٹوٹ ہی جائے!

''مگر جانے کس کونے سے کوئی نئی میں سرڈ ھنتا رہتا، میں کہتا رہتا، کوئی انکار میں گردن ہلاتا رہتا۔ یہ کون تھا؟ میں نہیں جانتا۔ یہ کہاں چھپا بیٹھا رہتا، مجھے معلوم نہیں۔ اتنے میں ایک نیا دن میری زندگی میں آیا، جب میں تمھارے قریب تھا۔ اپنے ویرانے کو چھپائے ہنستا رہا۔ باتیں کرتا رہا، باتیں سنتا رہا۔

''ان باتوں میں تمھاری آواز کی لہک، تمھارے لہجے کی شمع میری اس شاخ سے چھوگئی!''

کلا اتنی محویت سے سن رہی تھی، مگر بچوں کی طرح ہنس پڑی۔ ''ہنہ! تمھیں شاعری بھی کرنی نہیں آتی!''

''ہاں، کلا، شاعری کی زبان بھی اس جذبے کے اظہار سے قاصر ہے۔ الفاظ کو ابھی وہ انگلیاں نصیب نہیں ہوئی ہیں جو اس جذبے کو گرفت میں لے سکیں!''

''اچھا، پھر کیا ہوا؟'' اس نے گردن آڑی کر، چہرے کو گھٹنے پر رکھ لیا اور سدھیر کی طرف لگاوٹ سے دیکھنے لگی۔ ''تمہاری شاخ جل اُٹھی؟''

''نہیں سلگ اُٹھی!''

''سلگ اُٹھی، جلی نہیں۔ کیا مطلب؟''

''سلگ اُٹھی، ہولے ہولے جسے میرے تنفس نے اور سلگا دیا۔ ذرا ذرا دھواں پھیلا...... میرے ویرانے میں یہ خوشبو کیسی؟ میری شام نے پلٹ کر دیکھا اور سرشار ہوگئی۔ ارے یہ تو چندن کی مہک ہے!''

''آرزو کی شام جب سلگتی ہے تو اس میں سے چندن کی بُو پھیلتی ہے، جو دلوں کے معبد میں سوئے خداؤں کو بیدار کرتی ہے۔ عبادتوں کو عرفان عطا کرتی ہے، کلا!

''یہ دوسری اینٹ تھی، جو تمہارے نازک خوبصورت، مگر لرزیدہ ہاتھوں نے رکھی!''

کلا کے چہرے کی مملکت پر، مغرب سے مشرق تک مسکراہٹ کی صبح جھلملا اُٹھی۔ اُس نے آہستہ سے، لجا کر گردن جھکالی۔ گویا اپنے اس جرم کے انکار میں کوئی اور جرم کرنا نہیں چاہتی۔

پھر صدیاں گزر گئیں۔ کلا گردن جھکائے رہی۔ اس کی نگاہوں نے فرش میں ڈوب کر پاتال میں گم ہو جانا چاہا...... اور سدھیر دھیرے دھیرے ہنستا اور سگریٹ پیتا رہا۔

''پھر وہ دن آیا جب میں چائے پی رہی تھی'' کلا نے بھی محویت سے کہنا شروع کیا'' کہ کہیں سے تم آ گئے۔ تم نے چائے مانگی۔ میں نے بنا کر دی۔ اور میری جھوٹی پیالی کو اُٹھالیا۔ مگر اس میں چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ تم نے مایوسی سے پیالی میز پر رکھ دی۔

''افسوس!'' میرے لبوں نے ایک لفظ ادا کیا۔ مگر سدھیر تم نے پلٹ کر یوں دیکھا جیسے میں نے تمھیں ایک دولت بے بہا سے محروم کر دیا ہو۔ تم نے ایک بھونڈا سا لفظ ادا کیا۔ ''بھگوا'' جو بہت پیارا لگا۔ پھر ہم دونوں ایک کیفیت میں ہنسنے لگے!

''یہ تیسری اینٹ تھی'' سدھیر نے قطع کلام کرتے ہوئے جلدی سے کہا'' جسے ہم دونوں کے ہاتھوں نے ایک ساتھ رکھا۔''

''نہیں نہیں، میں نہیں۔''

''نہیں نہیں، میں بھی نہیں! بلکہ ہم دونوں'' کلا کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے اس نے اتنے اعتماد سے کہا کہ کلا کا سر پھر آپ سے آپ اقبال جرم میں جھک گیا۔

لیکن کلا نے پھر گردن اُٹھائی۔ ''مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو کبھی کچھ نہیں کرتی۔ میرا ہندوستان تو بڑا خاموش، پُر امن اور اپنے حال میں مست رہنے والا، میری دھرتی کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ تم ہی قزاق، لٹیرے، ڈاکو، فاتح!''

''میں تمہارے ہندوستان میں کوئی قزاق لٹیرا، فاتح، کوئی ڈاکو بن کر تو نہیں آیا، کلا! میں فقیر، ایک چشتی، ایک پیار کا نغمہ گانے والا سنت، میرے کندھے پر ملک ملک کی گرد و غبار میں اٹی کمبل تھی، ہاتھ میں کشکول تھا اور لبوں پر محبت کا نغمہ تھا!

''چپکے سے تم نے پتا نہیں کہاں سے آ کر دم کے دم میں میرے کشکول میں ایک سکہ گرا دیا۔ چھن ن ن ن نہ کی ایک نقرئی آواز آئی، جیسے پورا چاند سمندر کے کشکول میں گر پڑے اور آہستہ آہستہ اس کی سطح میں غرق ہو جائے۔ نور ہی نور..... ٹھنڈی میٹھی، کنوارے بدن کی سی میٹھی کیفیت والی چاندنی، میرے اندر کی تاریک دنیا میں گھلنے لگی!

''یکلخت میرے بھکاری نے اپنے آپ کو بے حد تونگر محسوس کیا!''

''پھر میری مملکت کے پورب پچھم میں، اُتر دکھن میں ایک حسین، پاکیزہ اور پُر وقار صبح جگمگائی۔ میری دھرتی کا ذرہ ذرہ چمکا، میرے ہندوستان کے کونے کونے نے ایک کسلمند مگر میٹھی انگڑائی لی!'' کلا بھی محویت کے عالم میں، ایک نشے کی کیفیت میں جھومتی، ماضی کے سبزہ زار کی طرف اُڑ رہی تھی۔ اُس نے اپنے آنچل کو گردن کے گرد پھینکا۔ اپنے نازک خوبصورت پتلے پتلے ہونٹوں کے مرمر پر زبان کا خنجر پھیرا، پھر دھیرے سے مسکرائی۔

''اُس دن تم بہت اُداس اُداس، کھوئے کھوئے سے تھے۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا، تم نے افسردگی سے جواب دیا۔''

''کیا کروں کلا! بڑی بیزاری، بڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے!''

''یہاں نہیں'' تم نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''مگر کلا میں یہاں روز روز تو آ نہیں سکتا (یعنی تمہارے پاس ہر وقت ہر سمے تو

نہیں رہ سکتا!'')

''ہاں! اور جس کے جواب میں تم خاموش ہو گئیں۔ تم نے میرا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ میں تم سے ایک لمحہ بھی الگ نہیں رہ سکتا اور تم خود میرے بغیر بے چین رہنے لگی تھیں۔''

''نہیں نہیں، ایسا نہیں! یہ محض تمھارا اندازہ ہے۔ میں نے اُس وقت کچھ نہیں سوچا تھا'' کلا نے انکار کیا۔ مگر سدھیر کی نظریں جب اُٹھیں، اُس کی گردن آپ سے آپ پھر جھک گئی۔

''پھر وہ دن آیا، جب تم اپنے گھر والوں کے ساتھ مسوری جا رہی تھیں۔''

''پتا نہیں، شاید دو مہینے کے لیے'' یہ تمھارا جواب تھا۔ مجبوریوں میں ڈوبا ہوا۔

''میں بھی دو مہینے کے لیے کہیں چلا جاؤں گا!'' میں نے اُداسی سے جواب دیا ''میرا ابھی اس شہر میں کون ہے، کلا؟''

یہ سن کر تم نے پلٹ کر ایسی پیار بھری، شبنم کی بوند کی طرح کلیجے میں اُتر جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، میں بہت مجبور ہوں سدھیر۔ تمھیں ساتھ لے جا نہیں سکتی، گھر والوں کو چھوڑ کر یہاں رہ نہیں سکتی اور وہاں مسوری کی شامیں مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گی!

''یہ کون سی اینٹ تھی، اور کس کے ہاتھوں نے رکھی تھی؟'' کلا نے ذرا ہنس کر، ذرا مست ہو کر، ذرا طنز سے پوچھا۔

''جانے کلا یہ کون سی اینٹ تھی اور کس کے ہاتھوں نے رکھی تھی۔ میرے، تمھارے یا دلوں میں بسنے والے خدا کے غیر مرئی ہاتھوں نے...... پھر نا معلوم، نامحسوس طور پر اینٹیں رکھی جانے لگیں...... دیواریں، فصیلیں اُٹھنے لگیں......

پھر ایک بار جب تم نے اور ہم نے اکٹھے چونک کر دیکھا تو وہ عمارت تیار ہو چکی تھی۔ محبت کی عظیم، ارفع اور سربلند عمارت، جس میں ہمارے، میرے اور تمھارے لہو کے چراغ روشن تھے۔

صرف ایک آخری اینٹ رکھنی باقی تھی......!

جبھی ہمارے جزیرے میں شک کی طغیانی آ گئی اور محبت کے سارے ایوان میں زلزلے کے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔

گھر والے جان گئے کہ باتیں کرتے کرتے کلا کہاں کھو جاتی ہے، کہ چلتے چلتے اس کے پاؤں رک سے کیوں جاتے ہیں، کہ ہنستے ہنستے اس کی ہنسی کے پرندا اپنی اُڑان کیوں بھول جاتے ہیں......!

کہ یہ میلا کچیلا، عجیب سا آدمی، موری کے پانی کی طرح بڑھتا بڑھتا دہلیز تک کیسے آ پہنچا، کہ جس کی لایعنی آمد پر دیواریں سرگوشیاں سی کیوں کرنے لگی ہیں، دروازے سے آپ سے آپ کھلنے کیوں لگتے ہیں......!

پھر یوں ہوا کہ ایک دن جب ہم دونوں ہونٹوں کے شہتوت اور بانہوں کی قوس قزح کی دنیا میں کھوئے مافیہا سے بے خبر تھے، تمھاری ماں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا......!

پھر دروازے بند کر دیے گئے۔ تمھاری سانس پر پہرے بیٹھا دیے گئے اور میرے سر پر ننگی تلواریں جھولنے لگیں۔

''یہ دیس دیس کے راج کمار ہیں، انھیں دیکھو!'' بوڑھے مہاراج نے اپنی جوان، خوبصورت، نازک اندام بیٹی کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔

سامنے راج محل سے ملحق، وسیع باغ کے بیچوں بیچ مسندوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سجے سجائے راج کمار، لبوں پر مسکراہٹ کی صبح

روشن کیے اور دلوں میں آرزوؤں کی جوت جگائے انتظار کی جلتی بجھتی قندیل روشن کیے بیٹھے تھے۔ شاخوں پر بہار کی کلیاں ہنس رہی تھیں۔ ہوائیں خوشبو کے بادل لیے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ سارے میں ایک کیفیت ایک حسن بے پناہ بکھرا پڑا تھا۔

زربفت، قیمتی، اطلس وکم خواب کے لباس۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا، کانوں اور انگلیوں میں چمچماتے ہیرے جواہرات، چہروں پر وقار، تمکنت اور سربلندی کا احساس۔ ایک سے ایک جوان ایک سے ایک خوبصورت وجیہہ، دل فریب، دل کش!

نجوگتا نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ور مالا کے پھول افسردہ ہو گئے۔ اس کے دھانی رنگ کے دوپٹے کی ریشمی کور ہوا کے ایک شریر جھونکے سے اُڑکر اُس کی آنکھ میں چبھنے لگی۔ اس نے کم خواب کے دھانی دوپٹے کو پرے پھینکا۔ اُس کی موتیوں جیسی آنکھوں سے پانی چھلک آیا۔

اُس نے پلٹ کر مہاراج کی طرف دیکھا، جن کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی، غضب کا وقار تھا۔

''ہاں بیٹی! اچھی طرح دیکھ لو۔ ملک ملک کے راج کمار براجمان ہیں، جو تمھارے یوگیا ہیں...... '' پھر مہاراج نے اپنی آواز میں باپ کی شفقت پیدا کی۔ اور ایک ذرا بھاری آواز سے گویا ہوئے: '' یہی ہمارے راج کی ریت ہے، بیٹی جب جوان ہو جاتی ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک مالا دے دی جاتی ہے۔ یہ ور مالا کہلاتی ہے۔ پھر اس کے سامنے اس کے یوگیہ پُرش ہوتے ہیں۔ جس کو وہ پسند کرے، اُس کے گلے میں......!''

نازک، خوبصورت اور کبوتر جیسے پاؤں ہرن کے چمڑے کی بنی گرگابی کے گھونسلے میں ڈوب گئے۔ ہولے ہولے راج کماری نے سیڑھیاں طے کیں۔ ساون بھادوں سی مست رفتار سے اس کے بدن کی شاخ گل لچکتی آگے بڑھی۔ سرشار ہوا کے لاپروا جھونکے اپنی رفتار بھول گئے...... یہ نجوگتا جارہی ہے...... یہ راج کماری کا خرام ہے...... ذرا سنبھل جاؤ۔

آسمان کی بلندیوں پر محو پرواز بگلوں کی روپہلی قطار ٹوٹنے سی لگی۔ نیچے دھرتی پر، باغ کے اُس کنج میں راج کماری نجوگتا کا بیاہ ہے۔ پرندوں نے مسرت سے سرشار ہو کر پلٹ پلٹ کر یوں دیکھنا شروع کیا کہ اُن کے پرواز کا حسن بکھرنے لگا اور ان کی ترتیب کی لے ٹوٹنے لگی کہ نیچے دھرتی پر نجوگتا محو خرام ہے!

راج کماری کے قدم جیسے جیسے اُٹھتے گئے، فرش کے سبزوں کی گردنیں جھکنے لگیں۔ کنج میں کوئلیں کوکنا بھولنے لگیں۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی۔ راج کماروں کی پیشانیاں شکن آلود ہوتی گئیں۔ نگاہیں ہزیمت کی آگ میں جلنے لگیں۔ دلوں میں آرزوؤں کی شمع خاموش ہوتی گئی مگر نجوگتا کے پاؤں نہیں ٹھہرے، اس کے خوابوں کا راج کمار تو کہیں نہیں...... تو کہاں وہ گیا میرے راج......!

پھر وہ باغ کے بڑے آہنی دروازے کو پار کر باہر آ گئی۔ جوتوں کے پاس۔ راج کمار کے جوتوں کے ڈھیر کے پاس دیوار سے لگا ایک پتھر کا بت تھا۔ لمبی گردن اور چھوٹی چھوٹی غیور آنکھوں والا جوان......!

کسی نے آہستہ سے کہا: ''راج کماری، یہ ہمارا دربان اور جوتوں کا رکھوالا ہے!''

ایک انگارہ سا نجوگتا کے تلوے سے چھو گیا۔ احساس کی ردا کانپی، دل کے کنول بجھنے سے لگے۔ مگر بے اختیار ہو کر وہ چیخ پڑی۔ بے رحم، بے مروت...... میرے پتھر دل محبوب......! وہ لپک کر آگے بڑھی اور پتھر کے اس بے حرکت بت سے لپٹ گئی۔ اس کے ہاتھوں نے جانے کون سے جذبے سے سرشار ہو کر ور مالا اُس پتھر کی مورتی کے گلے میں پہنا دی اور نجوگتا بے حال ہو کر بت سے لپٹ کر رونے لگی......

تب ہی درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی مشکی گھوڑی نے رقص کے انداز میں اپنے چاروں پاؤں پٹکے۔ اس کی جلد کی مشکی ردا میں لہریں پیدا ہوئیں کہ سوار نیچے اُتر آیا تھا۔ بھاری، مضبوط اور پُر وقار پاؤں کی چاپ نے دھرتی کے سینے میں زلزلہ کا جھٹکا پیدا کر دیا۔ پھر وہ سوار چل کر عین راج کماری کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"میں یہاں ہوں نجوگتا!"

نجوگتا پلٹی...... "تم!؟"

"ہاں میں، تم نے میرے گلے میں مالا پہنائی ہے" اس نے اپنا قوی بازو اس کے آگے پھیلا دیا...... "اب تم میرے ساتھ ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی!"

لپک کر راج کمار نے اس خاموش نجوگتا کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ نجوگتا کانپی، لرزی اور بے پناہ طوفان کے جھکڑ میں پھنس کر بولی:

"میرے...... میرے چوہان......!"

"میرے چوہان......!"

"میرے سدھیر......!"

سدھیر، اس کی زندگی...... سدھیر کی بانہوں میں کتنا دم ہے۔ اس کی آنکھوں میں کتنی زندگیاں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔ سدھیر، اس کے خوابوں کا سدھیر! جس کی ہر سانس اُس کی رگ رگ میں اُترتی ہے اور شمع جلاتی چلی جاتی ہے۔ ایک سایہ سا اُس کے وجود پر مسلط رہتا ہے، جو ہستی اور نیستی کے سارے فرق، ساری دوئی مٹاڈالتا ہے۔

کلا نے کروٹ لی اور اس کی چھاتی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرائی۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"اونہہ......" سدھیر نے آسمان کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ اور پھر کھو گیا۔

"بولو نا سدھیر! تم چپ رہتے ہو تو لگتا ہے جیسے...... جیسے تم بہت دور چلے گئے ہو...... کچھ بولو نا......"

"کلا، میں سوچ رہا ہوں، یہ میں اور تم، یہ مٹی، یہ شعلہ، یہ راکھ...... یہ ہستی کے سارے لچھن، یہ سب فنا ہو جائیں گے۔ سب مٹ جائیں گے۔ خلا کی پہنائیوں میں گم ہو جائیں گے۔ اس عالم امکان کے سارے اثبات...... کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ ہستی کا تار تار بکھر جائے گا......!"

کلا اُٹھ بیٹھی۔ "یہ آج تم نے پی تو نہیں لی ہے سدھیر؟ یہ کیسی سڑی گلی فلاسفی لے بیٹھے، یہ آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ ہم آج کے انسان ہیں جو زندگی کو نعمت سمجھتے ہیں اور بس...... سب کچھ ختم ہو جائے گا تو باقی کیا بچے گا؟"

"باقی بچیں گے ہم! میں اور تم......!" سدھیر کھلکھلا کر ہنس پڑا...... "آتما!" سدھیر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ پرم آتما!" پھر کلا کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس نے کلا کا سہارا لے کر آرام سے سگریٹ جلایا اور دھواں کلا کے چہرے پر انڈیل دیا۔

"جذبہ! جذبہ، کلا صرف ایک جذبہ! جو لپک کر بڑے والہانہ انداز میں بڑھتا ہے۔ جذبہ! جو جھپٹ کے اسے قبول کرتا ہے۔ پھر دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جیسے بیج ٹوٹ کر دھرتی کی اور گرتا ہے اور دھرتی جو والہانہ انداز سے اپنی کوکھ میں دبوچ لیتی ہے۔ جیسے میں بے تابانہ

تمھاری طرف بڑھتا ہوں اور تم پاگل سی اپنی آغوش میں مجھے چھپا لیتی ہو۔ جیسے آتما سرمستی کے عالم میں پرم آتما سے ملتی ہے اور پھر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں...... !

نہ آگے نہ پیچھے، نہ دائیں نہ بائیں، کہیں کوئی نہیں ہوتا نہ اوپر نہ نیچے، نہ دھرتی نہ آکاش، نہ دیواریں نہ قفس...... فقط سانس چلتی ہوتی ہے، فقط سانس...... گہری ٹوٹتی ہوئی، بکھرتی ہوئی...... کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس نے کس کو آواز دی، کس نے کس کو پکارا...... فقط ایک بازگشت ہوتی ہے۔ اور بس...... اور بس...... !!

کوئی کسی کا جواب نہیں، کہیں کسی کا جواب نہیں۔ صرف ایک صدائے بازگشت، فقط ایک گونج...... !''

''کلا، میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہوں۔ بہت پکارتا ہوں۔ مجھے کہیں پتا نہیں چلتا، کوئی اُتر نہیں ملتا۔ کسی دشا سے بھی...... !''

''اور میں بھی!''

''تب میں کہاں ہوتا ہوں؟ تمھیں پتا ہے کلا؟؟''

''مجھے اپنا بھی پتا نہیں ملتا!''

پھر بہت دیر خاموشی چھائی رہی۔ سامنے سمندر بپھرتا، گرجتا جھاگ اُگل رہا تھا۔ سمندر کے کنارے بھیگی بھیگی ریت پر وہ دونوں لیٹے رہے۔ ہواؤں کے لالچی پرندے کلا کے سیاہ بالوں کو چومتے رہے جنھیں سدھیر بار بار درست کرتا رہا۔

پھر سدھیر چت لیٹ گیا۔ ''کلا...... !'' وہ کھلے آسمان کی طرف دیکھتا رہا جہاں اندھیرا بکھرا پڑا تھا۔ کبھی کبھی بگلوں کی قطار چاندی کی لکیر کی طرح سرسراتی گزر جاتی۔ ایک اَن جانا، اَن دیکھا، غیر محسوس حسن آنکھوں کے سامنے سے گزرتا۔ جیسے کلا کا خوبصورت ننگا ہاتھ فضا میں، سرمستی کے انداز میں لہرا لہرا جائے۔

''ہوں!'' کلا اس کی چھاتی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی: ''کیا سدھیر؟''

''معراج کا علم ہے تمھیں، جب آتما پرم آتما سے ملتی ہے؟''

''نہیں، بتاؤ مجھے۔'' اُس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''بندہ اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا، ابھی آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ کسی نے نیستی سے بھی، پرے سے آواز دی۔ میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں، تم کہاں ہو؟''

''بندے کے لبوں پر پاکیزگی مسکرا پڑی۔ جواب دیا۔ آ رہا ہوں...... اور وہ چلا گیا۔''

''کہاں؟''

''خدا کے پاس!'' پھر سدھیر چپ ہو گیا۔ ایک دم سے ساکت جیسے آتما کو پرم آتما سے ملنے کا نظارہ کر رہا ہو۔ پھر کئی خاموش منٹ گزر گئے۔ تب کلا نے پوچھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

سدھیر چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک ذرا ناگوار سا لگا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے سگرٹ نکالا، جلایا اور گہرا کش لے کر دھواں آسمان کی طرف پھینک دیا۔

''کہتے ہیں ابھی وہ بستر گرم تھا، دروازے کی زنجیر جنبش کناں تھی، قدموں کی چاپ نے دم بھی نہیں لیا تھا کہ پرم آتما نے آتما سے کہا۔ اب تم جاؤ۔ بہت دیر ہوگئی...... تمہیں پتا ہے صدیاں گزر گئیں......! تب بندہ واپس آ گیا۔

''اُس نے دیکھا، نیچے زنجیر ابھی تک ہل رہی تھی، بستر ابھی گرم تھا! بندے کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہاں یہ عالم ہے اور وہاں میں صدیاں گزار آیا...... اُن صدیوں کے درمیان جب آتما پرم آتما سے مل رہی تھی، جانے خدا نے کتنی بار اپنا نام لے کر پکارا ہو۔ جانے بندے نے کتنی بار اپنے آپ کو آواز دی ہو مگر کہیں کوئی ہو جب نا کسی کو کوئی جواب دے۔ ایک دوسرے کو صرف اپنا نام بازگشت میں سنائی دیتا۔ اور کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں......!

''اُس گھڑی، وقت چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ آگے والا وقت آگے کی طرف، پیچھے سے آنے والے سمے پیچھے کی جانب، خاموش، لبوں پر انگلیاں رکھے، انہیں مت چھیڑو، انہیں مت چھیڑو......!''

ناریل کے پتوں میں ہوا سرسرائی تو کلا نے دیکھا کہ وقت تو بہت گزر گیا ہے۔ اور چاروں اَور اندھیرا اُمڈ پڑا ہے۔ جس میں آس پاس کی روشنیاں مسکرا رہی ہیں...... انہیں مت چھیڑو...... انہیں مت چھیڑو......

''چلو سدھیر بہت دیر ہوگئی۔ آج کسی اچھے سے ہوٹل میں بہت اچھا سا کھانا کھائیں گے!''

''بہت اچھی سی کلا کے بہت اچھے اچھے ارمانوں کو میرا بوسہ!''

سامنے سمندر کے تاریک سینے پر رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ خاموشی نے ہستی کے چاروں کھونٹ اپنے خیمے نصب کر دیئے تھے۔ باہر سمندر نیند کے کہرے سے آہستہ آہستہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ سارے عالم پر نیند بھی طاری تھی۔ مگر شانتی نواس ہوٹل کے ایک کمرے میں دو جسم اب بیدار ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ، کسی پرانی شراب کے نشہ کی طرح، کھڑکی سے جھوم جھوم کر ہوائیں آ رہی تھیں اور کلا کے خشک، سیاہ لمبے بالوں کی ساری خوشبوؤں کو بکھیرے دے رہی تھیں۔ ایک پتلی ریشمی چادر میں کلا کا ریشمی جسم ہولے ہولے کھولنے لگا تھا۔ ادھر سدھیر کی لمبی مخروطی انگلیوں میں لمس کی ہوس جاگنے لگی تھی......

پھر دفعتاً سدھیر نے ایک جھٹکے سے اُس ریشمی چادر کو کھینچ لیا۔ جس نے حسن کے ایک جہاں کو چھپا رکھا تھا۔ نور کا ایک سمندر تھا، اُمڈ پڑا۔ بجلی کی روشنی میں نہاتا ہوا چاندی کا بدن، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی طرح چمکا اور سدھیر کے ساتوں طبق کو روشن کر گیا۔ تب کلا نے اپنے دونوں جہان کو، خوبصورت بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کی اور کھل کھلا اُٹھی۔ سدھیر نے گہری نظروں سے دیکھا اور سرشار ہو گیا۔

''کلا!'' سدھیر اس کے سڈول بازوؤں پر انگلی پھیرتے ہوئے بڑی مشکل سے بولا...... ''کلا......!'' اس کی آواز کو ایک جھکڑ نے راستے ہی میں روک لیا۔

''ہاں!'' کلا ہستی کی سرزمین سے پاؤں اُٹھا چکی تھی۔

''جانتی ہو، سورگ کسے کہتے ہیں؟'' سدھیر کی انگلیاں چپ سادھے کسی ہوشیار عاشق کی طرح اس کے جسم کو چوم رہی تھیں۔

کلا نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ جانے کون سی کووِندا اسے پکار رہی تھی۔ جانے اس کے سمندر پر کسی غوطہ خور کا سایہ پڑ رہا تھا!

''کہتے ہیں دیہنہ کا سورگ ہی اصل سورگ ہے......!'' اس نے نیم بسمل پرندوں کی طرح تڑپتے ہوئے لب کلا کی ناف پر رکھ

دیے۔۔۔ ''جسم کی جنت!''

کلا تڑپ گئی۔ جانے کن ہاتھوں نے اسے اُٹھا کر فضا میں اُچھال دیا۔ جہاں وہ گلاب کی پتیوں کی طرح بکھر گئی۔ اس کے ہونٹ کانپے، تھرتھرائے، بڑی مشکل سے اُس نے مرتعش آواز میں کہا۔ ''سدھیر میں مر جاؤں گی!''

اُس کے دونوں ہاتھ آپ سے آپ شانوں سے الگ ہو گئے۔ پھر سب کچھ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا۔ یہ شرم و حیا، یہ میں اور تم...... ساری دوئی مٹ گئی۔ کلا نے اپنے دونوں جہان اُس کے آگے پھیلا دیے، گویا کہہ رہی ہو، یہ سب تمھارے ہیں......!

سدھیر نے ایک مست نظر سے اُس پھول سے بدن کو دیکھا اور اپنا چہرہ کلا کی دونوں دنیاؤں کے بیچوں بیچ دفن کر دیا۔

ہر شئے کیا ہے؟ جو گرفت میں آ جاتی ہے وہ اپنا جمال کھو بیٹھتی ہے!

ہر شئے کیا ہے؟ کچھ پھیکی پھیکی، کچھ سیٹھی سیٹھی۔ ہر جمال ذرا سی بدصورتی لیے پھرتا ہے...... جب دور رہتا ہے تو جمال ہی جمال ہے، حسن ہی حسن ہے۔ جب گرفت میں آ جاتا ہے، ایک دم سے قریب آ جاتا ہے، بدصورتی کی ہلکی سی تہہ چھپائے نہیں چھپتی۔ لاکھ غازہ ملو، سرخی لیپٹو، کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی چور دروازہ سے جھانک ہی لیتی ہے۔ کلا نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے دور تک پھیلی ہوئی کروٹیں لیتی ہوئی سطح کو دیکھا۔ جب ہی سدھیر کبھی کبھی ایک بے اختیار جذبے کے تحت کہہ اُٹھتا ہے کہ میں پھیکی پھیکی سی، سیٹھی سیٹھی سی دِکھتی ہوں۔ یہ افسردگی جو زندگی کے لہلہاتے ہوئے پھولوں کی کور میں چھپی رہتی ہے، کہاں سے آئی ہے؟

کلا اپنے دونوں بازوؤں پر زور دے کر کھڑکی پر جھک گئی...... شاید یہی حقیقت ہے۔ عالم کی ہر شئے نامکمل ہے۔ ایک کمی، جو ہستی کو مکمل نہیں ہونے دیتی، شاید اس کے اثبات کا انحصار اسی میں ہے۔ ایک خلش، آسودگیوں کی بہتات میں ہلکی سی ناآسودگی، جیسے یہ وسیع سمندر، یہ پانیوں کا ذخیرہ، جس کی لہریں پیاسے پرندوں کی طرح بیچوں بیچ سے اُٹھتی ہیں اور ویسے ہی پیاسی، تڑپتی، ساحل سے ٹکرا کر بکھر جاتی ہیں......!

گھٹائیں لاکھ اُٹھتی ہیں، بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُٹھتے ہیں۔ سیاہ گہرے گہرے بادل برستے ہیں، برستے ہیں، لگاتار برستے رہتے ہیں۔ سمندر کے پیاسے جسم پر بوندیں اختلاط کے نغمے بکھیرتی رہتی ہیں۔ ہر طرف وصال کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ہوائیں جھومتی ہیں۔ فضاؤں کی سانس میں عطر پھیل جاتا ہے۔ سمندر کا وجود بھیگتا رہتا ہے مگر پیاس ہے کہ ذرا یہ بوندیں رکیں، کہیں نہ کہیں سے چمک اُٹھتی ہے۔

کلا نے اپنے تخیل کے اسپ تازی کو ایڑ لگائی۔ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ وہ کہاں پہنچ گئی! اس کا لاشعور بڑا چغل خور ہے۔ مگر...... مگر وہ کیوں ایسا سوچنے پر مجبور ہے کہ جو کچھ سدھیر دیتا ہے، اُس سے اس کی جھولی نہیں بھرتی۔ ذرا سی سہی، مگر خالی رہ جاتی ہے۔ کاش وہ اپنی بے انتہا دولت میں سے مٹھی بھر اور دے دیتا جس سے اُس کا پیالہ بھر جاتا۔ بھر کے اُمڈ جاتا...... لیکن پھر بھی اس کمی کے باوصف سدھیر اسے بہت پیارا لگتا ہے۔ ایسا جان لیوا محبوب جسے دیکھ کر اس کا سمندر کروٹیں لینا بھول جاتا ہے......! پھر کلا نے سوچا، یہ معمولی شکل و صورت کا آدمی، یہ بیمار بیمار سا بجھا بجھا انسان، وہ کیوں اتنا تباہ کر دینے کی حد تک اچھا لگتا ہے۔ جو اس کا دامن بھی نہیں بھر سکتا!

شاید یہ تکمیل کی ہوس ہے۔! شاید آج سدھیر اسے نہال کر دے گا۔ شاید آج...... جو سیاہ بدہیئت بادلوں کو دیکھ کر سمندر کے سینے کو خوشیوں سے بھر دیتی ہے۔ تکمیل کی ہوس جو انسان کی خواہشوں کا راج کمار ہے، جو کبھی نہیں ملتا۔ خوابوں میں رستا بستا ہے اور وہیں ایک نہ ایک دن کھو جاتا ہے......! پھر کلا چونک کر ٹھہر گئی۔ کیا کھو بھی جاتا ہے؟ کبھی نہیں ملتا۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا؟

مگر وہ اتنی بے چین کیوں ہو جاتی ہے؟ کلا نے پھر سوچا، جو انسان کے مقدر میں نہیں ہے وہ نہ ملے۔ ایسا اضطراب کیوں، یہ تڑپ......

یہ بے قراری..... شاید یہ تکمیل کی ہوس نہیں، شاید یہ ہوس کی تکمیل کا جذبہ ہے جو اسے اتنا چاہنے والے محبوب کی آغوش میں بھی دم نہیں لینے دیتا، جو وصال کے وقت بھی کبھی کبھی چھو کر گزر جاتا ہے!

''مگر'' کلا پھر رکی۔ ''کیا یہ کی سدھیر کو بھی محسوس ہوتی ہے؟ اس نے کبھی اس کی طرف جھانک کر دیکھا تو نہیں۔ شاید اس کے تھکے ہارے پرندکو بھی وہ شاخ نہیں ملی ہو جو اُس کا وزن سنبھال سکے، جو جھکے نہیں..... کبھی اس نے پوچھا تو نہیں۔ کبھی جاننے کی ضرورت تو نہیں محسوس کی.....

''یہ پیاس کیوں ہے؟''

سامنے بے قرار سمندر کی سطح پر سلوٹیں پڑیں۔ پھر اس کے وجود کو بکھیر کر رکھ دیا۔ کلا کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیلی۔ سمندر بھی کلا کی زندگی کی طرح خود غرض ہو گیا ہے۔ اسے بھی کچھ اور چاہیے۔ اس کی ہستی پر چھایا ہوا یہ گہرا آسمان برس برس کر تھک جاتا ہے، جب بھی اس کی آتما کی پیاس نہیں بجھتی۔ ایک ناکام سی جستجو، ایک فضول سی خواہش اسے بھی تڑپاتی رہتی ہے۔ اس کے جیون سے سمندر کو کتنا گہرا ربط ہے، کتنا اٹوٹ سمبندھ.....!

یا خود اس کی زندگی کیسی سامدرک ہو گئی ہے۔ کوئی غوطہ خور کتنا گہرا اُترتا ہے۔ اس کے پاتال کے سارے سیپ، مونگے، موتی کو بٹورتا، سمیٹتا، نہارتا نہیں تھکتا۔ مگر پھر بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ کوئی موتی کسی بھاری پتھر کے نیچے دبا، وصال کے لمس سے محروم رہ جاتا ہے۔ کہیں ایک مونگا چھوٹ جاتا ہے۔ سدھیر! جسے تمہارا لمس، بے قرار لمس بھی نہیں پہنچ پاتا.....!

کلا نے ٹھہر کر، سنبھل کر ایک ذرا متوازن ہو کر سوچا، میرا سیپ تو بے قرار رہتا ہی ہے سدھیر، شاید..... شاید تمہارا لمس بھی لذت کے اس موتی کو چھو نہیں پاتا جو مجھ میں بند ہے، میرے سیپ میں بند ہے.....!

چھ دنوں کی بے رحم قید..... ! کلا مسکرائی..... ناکردہ گناہوں کی عجیب سزا.....!

ہر مہینے بلوغت کے چاند کو چھ دنوں کے لیے راہو نگل لیتا ہے۔ بلوغت گہنا جاتی ہے..... یہ عجیب دستور ہے فطرت کا۔

اُس نے کھڑکی پر کہنیوں کا بوجھ دے کر سمندر کی طرف دیکھا جس کا جوار بھی کئی دنوں بعد ختم ہو چکا تھا۔ وہ شانت تھا۔ ایسے ہی جیسے آج صبح سے کلا شانت تھی۔ اس کا چاند راہو کے کٹے ہوئے گلے سے نیچے اتر آیا تھا۔ اپنے آپ کو صفائی سے بچاتے ہوئے۔

آج سب کچھ صاف تھا۔ اندر، باہر، فضا نکھری نکھری تھی۔ ہوا دھلی دھلائی سی بہہ رہی تھی..... کلا نے آسمان کی سمت نگاہیں کیں۔ وہ بھی صاف تھا۔ اس نے آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے لامحدود، بے کراں سمندر کو بھی دیکھا۔ وہ بھی بے داغ تھا۔ نہ آسمان کے سمندر میں کوئی جوار تھا، کوئی طوفان، کوئی چھوٹی سی کشتی کا پھڑ پھڑاتا بادبان تھا۔ نہ سمندر کے آسمان میں کوئی بادل، کالا، سفید، ملگجا بادل رواں تھا۔

لگتا تھا، سمندر نے ہاتھ بڑھا کر آسمان کے چہرے کی خاک پونچھی تھی!

کلا کے سارے سیاہ بالوں کا سمندر اس کے شانوں پر جھک آیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بے قرار، اس کے محبوب سدھیر کی طرح بے قرار بالوں کو اپنے شانوں پر پھینک دیا اور ہولے سے مسکرائی۔

''آج..... آج سدھیر کو مار ڈالوں گی!''

اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا، دور بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان گلے مل رہے تھے، وہاں آگ لگی ہوئی تھی جو ہولے ہولے پھیل رہی

تھی۔ کلا کھوسی گئی۔ عجیب منظر تھا۔ دھیرے دھیرے، جیسے اچھوتے ارمانوں کی طرح آسمان اور سمندر کے بیچوں بیچ والی لالی، گہری خوش گوار ہوتی جارہی تھی اور اب ذرا دیر میں سارا سمندر لال ہورہا تھا۔ دہکتا ہوا۔ جیسے سمندر نہ ہو شراب سے چھلکتا ہوا پیالہ ہو۔

وہ کھوسی گئی۔ اپنے آپ کو دھیرے دھیرے گم ہوتے اُس نے دیکھا مگر کہاں کھوگئی۔ اُس کا اسے پتا ہی نہیں......

جب ہی کسی نے اس کے بھرے بھرے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ دفعتاً وہ چونکی۔ اس نے پلٹ کر بڑے اعتماد سے دیکھا۔

سدھیر ہی تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

مگر کلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا سنا ہی نہیں۔

اس نے محبت سے، بے پناہ محبت سے سدھیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سانولے سانولے سوکھے چہرے پر بھی شفق کی لالیاں بکھری ہوئی تھیں۔

پھر اس نے سدھیر کے بالوں کو دیکھا، وہ بھی لال تھے۔ سفید کپڑوں میں گویا آگ لگی ہوئی تھی۔

پھر اس نے کمرے میں ٹنگے پردوں کو دیکھا، صوفے کو، پلنگ کو، دیواروں کو......سب کی سب لال سرخ ہورہی تھیں۔ ساری دنیا، سارا عالم لال ہی لال تھا۔ کلا مسکرائی۔ پھر اس کی آنکھیں سدھیر کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''میں نے کہا، کیا دیکھ رہی تھیں!'' سدھیر نے دھیرے سے کہا۔

''لالی!'' کلا نے مسکرا کر لگاوٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر شفق کی جانب دیکھا، پھر سمندر کو دیکھا، پھر مانو سارے عالم کو دیکھتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھیں پھر سدھیر کے چہرے پر ٹک گئیں اور وہ ذرا پیچھے ہو کر دھیرے سے بے خودی کے عالم میں مسکرائی۔ اس کے لب ہولے سے ہلے۔

''لالی......لالی میرے لال کی......!''

اس نے شفق کو پھر دیکھا اور سارے عالم پر نظریں ڈالتی ہوئی پھر وہیں آگئی ''کہ جت دیکھوں، اُت لال''......

پھر دونوں ہاتھ کو پرواز کے انداز میں کھول دیا اور جھپٹ کر سدھیر کو اپنی آغوش میں بھرلیا ''لالی دیکھن میں گئی......!''

اس کی آواز کی بادِ صبا راستہ ہی میں بھٹک گئی تو سدھیر نے اپنے دونوں بازوؤں میں اس کے وجود کو لپیٹتے ہوئے جذبات کے عالم میں، سرگوشیوں کے انداز میں کہا ''کہ میں بھی ہوگئی لال......'' اور دھیرے سے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے جیسے سرخ آسمان، سرخ سمندر کے پیالے میں ڈوب گیا ہو۔

ہستی کا ذرہ ذرہ عالم کے کن کن میں گلال اُڑا رہا تھا جیسے نیستی نے ہستی کے وجود سے پہلی بار کھل کر ہولی کھیلی ہو۔

ذرا دیر بعد جب کلا کے پاؤں اُکھڑنے لگے، وہ جلدی سے الگ ہوگئی۔

''چلو......آج میری معیاد ختم ہوئی، چلو کہیں گھوم آئیں!''

''کلا! اس گلابی ساڑھی میں تم بہت اچھی لگ رہی ہو!''

کلا مسکرا پڑی۔ اس نے ایک بار اپنے آپ کا جائزہ لیا اور اپنے ریشمی آنچل کو گردن کے گرد پھینکتے ہوئے گھاس کے قطع پر لیٹ گئی، پھر

عجیب سی سرمستی کے عالم میں پلٹتی ہوئی بالکل اس کے قریب آ کر کھل کھلا پڑی۔

''کیسی لگتی ہوں؟'' اس نے بڑے پیار سے سوال کیا جیسے اگر سدھیر کا جواب صحیح ہوا تو انعام میں وہ جانے اُسے کیا دے بیٹھے گی۔

مگر سدھیر کے جواب دینے سے پہلے اُس نے اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔

''میں جانتی ہوں، تم کیا بولو گے!''

''کیا؟''

''اپسرا، جیسے دھنک، جیسے سرو......!''

''نہیں! جیسے کلا...... جیسے کیٹس کی کوئی نظم...... جیسے برندا بن میں کھوئی ہوئی بانسری کی لے...... جیسے گلال میں نہایا ہوا تاج...... جیسے خود تم کہ جس کی کوئی مثال نہیں......!''

''بس سدھیر!'' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے تصور میں گلال میں نہایا ہوا تاج محل تھا۔ اس کی کلپنا میں کوئی کلا تھی جسے خود اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا، نہیں جانا تھا، نہیں چوما تھا۔

سدھیر اس کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے لمبے خنک سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ کلا کی آنکھیں بند رہیں۔ اس کے کانوں میں کپکپاتی آواز آئی۔

''اور یہ تمھارے بال کلا!''

''تم کہو گے دھنکی ہوئی رات!''

''نہیں! جیسے برسات میں بھیگا ہوا جنگل، جیسے کسی بے گناہ کی طویل سزا۔ جیسے جدائی کا وہ خیال جو کبھی کبھی میرے احساسات کو گھیرے رہتا ہے!''

کلا چونک کے اُٹھ گئی۔ ''یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ تم سے کون مجھے الگ کر سکتا ہے!''

''وقت! جس کے بے شمار چہرے ہیں۔ اَن گنت ہاتھ ہیں۔ میرا دل کہیں تاریک رات میں بھٹک جاتا ہے، جب میں سوچتا ہوں کہ تم کل میرے پاس نہ ہو گی!''

کلا نے گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے گہری اُتر کر کہا۔ ''اور اگر میں آج تمہاری آغوش میں مر جاؤں؟''

سدھیر نے اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔ لیکن آہستہ سے کہا بھی۔ ''مگر مجھے یہ پسند ہے۔ میری خود غرض محبت کو یہ گوارا ہے!''

کلا نہال سی ہو گئی۔ اس پر کئی بوتلوں کا نشہ چھا گیا۔ اس نے تڑپ کر عجیب جان لیوا نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''محبت خود غرض نہ ہو تو مکمل بھی نہیں ہوتی!'' اس نے اپنے لمبے بالوں کو سر سے پرے جھٹکتے ہوئے کہا ''میرا بھی کبھی کبھی جی چاہتا ہے سدھیر، تمہیں اپنی آغوش میں اتنی زور سے بھینچوں، اتنی زور سے کہ تمہارا دم نکل جائے۔ وہیں میرے بازوؤں میں تم مر جاؤ۔ اور وہیں اپنی آغوش میں تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر لوں۔ تاکہ کوئی تمھاری مٹی کو بھی مجھ سے نہ چھین سکے!''

سدھیر نے بے حال سا ہو کر اس کو اپنی گود میں بھر لیا۔ کئی بے قرار لمحے گزر گئے۔ زلزلے کے کتنے جھٹکے آئے۔ پھر دنیا ذرا ٹھہری۔ سدھیر کی بے قرار انگلیاں اس کی پشت پر پھرتی پھراتی بلاؤز کی بٹن پر رک کر چومنے لگیں۔ پھر ذرا کی ذرا میں ایک بٹن کھل گئی۔

''ارے یہاں!'' کلانے آہستہ سے تاُمل کیا۔

''ہاں!'' دوسری بٹن بھی کھل گئی۔ ''یہاں، اسی وقت!''

''مگر لوگ آ جا رہے ہیں اور ابھی اُجالا......!'' مگر کلا کے پاؤں بھی اُکھڑ چکے تھے۔

''مجھے پروا......'' سدھیر کی آواز بکھر گئی۔ اس کی انگلیاں تیسری بٹن بھی کھول چکی تھیں۔ پھر جب ذرا دیر بعد کلا کے شانے پر، اس کے دونوں ہاتھوں نے بلاؤز کو الگ الگ تھام لیے، تو خود کلا جواب تک جھجک رہی تھی، ایک کیفیت میں اس کی آغوش سے ذرا پیچھے ہو گئی۔ اور بلاؤز سارا کا سارا اسدھیر کے ہاتھوں میں آ گیا۔ ساڑی کا پلو گر گیا تھا۔ سپردگی نے ساری شرم مٹا دی تھی۔ کلا کی آنکھیں بند تھیں۔

سدھیر نے دیکھا، ابھی سورج ٹھیک سے ڈوبا بھی نہیں تھا۔ فضا میں روشنی تھی۔ کلا کا اوپری جسم بریسیر کی قید سے بھی آزاد تھا اور کلا کا دودھیا رنگ جوڈوبتے سورج کی لالی سے گلنار ہو رہا تھا...... اس نے لپک کر کلا کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ سامنے ایک بوالہوس آدمی اسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کلا کے کان میں کہا۔ ''کوئی آدمی دیکھ رہا ہے!''

''دیکھنے دو!'' کلا کے پاؤں نیستی سے بھی پرے پڑ رہے تھے۔

ساری فضا شرابی ہو گئی۔ سانجھ سنولا گئی۔ آہستہ سے سرک کے کلا اس کے ہاتھوں سے نیچے گھاس کے فرش پر یوں پھیل گئی جیسے موتیوں کی لڑی گر پڑی ہو۔ بے حال سی کلا آنکھیں بند کیے فراق کی مدھ بھری رباعی کی طرح ہانپنے لگی۔

زمانہ پل بھر کو لڑکھڑایا۔ پھر سست رفتار سے آگے بڑھ گیا۔

ایک وسیع، بادلوں سے اٹے ہوئے آسمان کی طرح، سدھیر نے کلا کے مغرب و مشرق کو یوں ڈھک لیا کہ ہستی اور نیستی دونوں کراہ کر رہ گئیں!

کلابہ کے پُرشور ماحول اور جگمگاتی شام سے نکل کر جب وہ الفنسٹن روڈ کی طرف مڑے، جب بھی دونوں خاموش تھے۔ خاموشی سے دونوں کے قدم فٹ پاتھ پر یوں پڑ رہے تھے، جیسے چلتے چلتے کبھی، کسی وقت رک بھی سکتے ہیں۔ باتوں کے پرند، ناتوانی سے سرنہوڑے ذہن کے ویرانے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ وہ گزر خاموش تھی۔ نہ دھول اُڑ رہی تھی، نہ جھکڑ چل رہے تھے، گویا ابھی ابھی بارش ہوئی ہو، ساری دھول بیٹھ گئی ہو۔ ساری فضا صاف ہو مگر کبھی کبھی کوئی سوندھی مہک کا بھبھکا اٹھ جاتا۔ تب چلتے چلتے کلا پلٹ کر یوں اسے ایسے دیکھ لیتی کہ خود سدھیر اسے دیکھتے ہوئے دیکھ نہ لے۔ پھر بہت دیر ہو گئی تو کوئی پرند پھڑ پھڑایا۔

''اُس دن ماں کی طبیعت بہت خراب تھی!'' کلا نے نگاہیں نیچے کیے کیے آہستہ سے کہا۔ ''جانے اب کیسی ہو؟''

پہلو سے ایک تیز رفتار خوبصورت کار زن سے نکل گئی۔ دونوں نے دیکھا، ایک دھانی رنگ کا دوپٹہ کھڑکی سے لہرا رہا تھا۔ قریب سے ایک بدصورت مرد اور عورت زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

وہ خاموشی سے بدستور چلتے رہے۔ آس پاس کے شور سے الگ تھلگ دونوں تنہا تنہا سے......

پان کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے دونوں کے پاؤں رک گئے۔ سدھیر نے اور کلا نے، دونوں نے، یکبارگی آئنے میں ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک عجیب سا ملتا جلتا رنگ دونوں کے چہروں پر بکھر گیا، پھر دونوں مسکرا پڑے، پھر جانے کیوں کیسے اور دونوں ہنس پڑے۔

پان والے نے ذرا بوکھلا کر کہا۔ ''جی باؤ جی!''

''دو پان۔''

''میرے لیے زردہ اور ان کے لیے میٹھے مسالے والا۔''

پھر دونوں چل پڑے۔ وہی خاموشی گوارا سی، چپ، آس پاس کے شور و غل سے الگ تھلگ وہ دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں کھوئے کھوئے جانے کیا ڈھونڈتے رہے۔

''ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو جانا سنا تھا!'' کلا نے جانے سدھیر سے کہا کہ اپنے آپ سے پوچھا۔ ''کھوئے کھوئے کسی چیز کو ڈھونڈتے نہیں دیکھا تھا!'' پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یہ کون سی چیز تم ڈھونڈ رہی ہو؟'' سدھیر نے اس کی ہنسی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دفعتاً وہ چونک پڑا۔

''میں نہیں تم ڈھونڈ رہے ہو!'' کلا نے اطمینان سے جواب دیا۔

''یا تم ڈھونڈ رہی ہو؟'' سدھیر کو اس کا اطمینان بے جان کمزور اور کھوکھلا نظر آ رہا تھا۔

''ہم دونوں!'' کلا نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ چیز مل جائے تو وہ نوے کی نوے اینٹیں شاید ایک دن میں مضبوط بلکہ مضبوط تر ہو جائیں!''

''کون سی چیز؟ کون سی چیز تم مجھ میں ڈھونڈ رہی ہو جو تمھیں نہیں ملتی؟'' سدھیر نے پہلی بار قدرے ناگواری سے کہا۔ اس کی تیوریوں پر کئی بل پڑ گئے۔

''وہی جو تم مجھ میں ڈھونڈتے رہتے ہو!'' کلا نے کمال ضبط اور صاف گوئی سے کہا۔ ''اور تمھیں بھی نہیں ملتی!''

سدھیر سناٹے میں آ گیا۔ حقیقت ایک ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح اس کے سامنے پڑی تھی۔ اس کے لب پھڑ پھڑائے، پھر تھم گئے۔ اس نے جلدی سے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور سارا دھواں کلا کے چہرے پر پھینک کر ہنس پڑا۔ بڑی عجیب سی کھسیانی ہنسی، بڑی شکست خوردہ سی ہنسی، بسورتی ہوئی ہنسی۔

''سچ بات ہے نا!'' کلا کی انگلیوں میں ابھی تک وہ تیز چاقو تھا جس کی دھار پر خود اُس کا لہو چمک رہا تھا۔ اب اُسی چاقو سے وہ سدھیر کو قتل کرنا چاہتی تھی۔

مگر سدھیر نے وہ تیز دھار والے چاقو کو موڑ کر چپکے سے کلا کی جیب میں ڈال دیا۔

''تم پگلی ہو! میں کیا ڈھونڈوں گا...... جو کچھ مل رہا ہے، وہ میری دونوں مٹھیوں میں نہیں سما رہا ہے۔ مجھے تو اپنے ہاتھوں سے گلہ ہے جو تمہاری دولت کو سمیٹ نہیں پا رہے ہیں!''

کلا نے فوراً ہی پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ کچھ پڑھنا چاہا۔ اس کا سمندر جو دیر سے طغیانیوں کی زد میں تھا دفعتاً شانت ہو گیا۔ مگر لمحہ بھر بعد پھر ایک موج سی اُٹھی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''محبت کرنا اور کرتے رہنا کتنا کٹھن کام ہے...... کوئی میرے دل سے پوچھے۔ کوئی سدھیر کے دل سے پوچھے!''

کلا سچ کہتی ہے۔ کتنا مشکل کام ہے۔ محبت کرتے رہنا، نبھاتے رہنا، چلتے رہنا، پھر مسکراتے رہنا۔ ایک مسلسل مسرت۔ ایک مسلسل اذیت۔ یہ دونوں جذبے، ایسے آپس میں خلط ملط رہتے ہیں۔ ہر سانس تلوار بن کر آتی ہے اور پھول کی چھڑی بن کر جاتی ہے...... !

یہ جھوٹ تھا، بالکل نرا جھوٹ تھا!

جب کلا سو گئی تو وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ سلگتا رہا۔ اس کے دل کے پاس ایک تیز خون آلود چھری جھولتی رہی۔ آس پاس دھواں اُمنڈتا رہا۔ اس کے لاشعور کی بند کھڑکی کی دراز سے تیز روشنی میں چمکتی ہوئی چھری چمک چمک جاتی اور اس کے کان میں کوئی آواز کہہ اٹھتی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اور سچ اگر کوئی چیز ہے تو وہ یہ کہ کلا اپنی ساری دولت دیتے ہوئے بھی چالاک اور بے ایمان بنیے کی طرح کوئی قیمتی ہیرا چرا لیتی ہے۔ یہ کس لیے؟

کس کے لیے؟ شاید وقت کے نئے موڑ پر کوئی قرض خواہ اس کو مل جائے، تو وہ کیا کرے گی؟ شاید وہ یوں سوچ رہی ہے کہ اس کی یہ منزل نہیں۔ وہ شجر سایہ دار نہیں، جس کے نیچے بیٹھ کر وہ ساری عمر گزار سکتی ہے۔ شاید اسے بھی احساس ہے کہ وقت کے مضبوط ہاتھ ہم دونوں کو الگ بھی کر سکتے ہیں۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بے چینیوں نے اُس کی ہستی کو ہلا ڈالا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ہلکی نیلی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ در و دیوار پر زہر کا رنگ بکھرا ہوا تھا اور اس زہر کے سمندر میں کلا سوئی پڑی تھی۔

اس نے اضطرار سے بٹن دبا دیا...... روشنی، تیز دودھیا روشنی......

کلا کمان کی شکل میں شفاف بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ بال خاموش اور تاریک دریا کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ آنچل فرش کی خبر لے رہا تھا اور وہ گہری نیند میں یوں سوئی ہوئی تھی جیسے اس کو زندگی سے کچھ لینا تھا، وہ سب مل گیا ہو۔ اس کے چہرے پر غضب کا اطمینان تھا۔

سہیر مسکرا پڑا۔ اس نے جھک کر اس کے چہرے پر انگلیاں پھیریں۔ چہرے کی خوش رنگ چادر میں یہاں سے وہاں تک ہلکی سلوٹیں بیدار ہوئیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ اس نے اس کے پتلے، خوبصورت، خنجر کی دھار کی طرح خوبصورت ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں۔

''اُنہہ...... چھوڑو...... سونے دو......'' وہ کروٹ بدل گئی۔

پھر وہ کلا کے اطمینان پر مسکرا پڑا۔ اس نے سگریٹ سلگایا، بتی بجھائی اور خاموشی سے ٹہل ٹہل کر کش لگاتا رہا۔

مگر شاید یہ سچ نہیں۔ کلا کچھ نہیں چھپاتی۔ اپنی ساری کی ساری دولت اس پر سے نچھاور کر چکی ہے۔ وہ خود غرض...... لالچی ہے...... بے ایمان ہے...... شاید محبت بذاتِ خود لالچی اور خود غرض ہوتی ہے۔ اسے جتنا کچھ دو، وہ اور مانگتی ہے۔ ایک چالاک پیشہ ور بھکاری کی طرح اس کا پیٹ بھرتا ہی نہیں۔ جب ہی، اس نے سوچا، اس کے ذہن کی دنیا میں زلزلے کے جھٹکے پیدا ہوئے، جب ہی کلا کو بھی کسی چیز کی تلاش رہتی ہے۔ وہ بھی عین وقت پر اس سے کچھ مانگ بیٹھتی، جو دراصل اس کے پاس ہے ہی نہیں۔ تب وہ کیا دے، اپنا سب کچھ دے دینے کے بعد بھی کلا کی تلاش کی نظریں بے بسی اور مایوسی سے اس کی طرف تاکتی ہیں تو وہ تڑپ اُٹھتا ہے۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہ کس کے لیے چھپائے گا؟ لاکھ اس کی خاموش محبت نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کنگال ہو چکا ہے، مگر کلا مانتی ہی نہیں۔ وہ بڑی محبت اور حسرت سے مانگ بیٹھتی ہے۔ ''مجھے کچھ اور...... اور......!''

شاید جس طرح کلا کچھ نہ کچھ چھپالیتی ہے، خود اس کے اندر کا کوئی چالاک آدمی بھی کچھ رکھ لیتا ہے!

اُس نے شام کو صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے۔ ''ڈھونڈنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ تم مجھ میں اور میں تمھاری ذات میں جو کچھ تلاش کر رہا ہوں، دراصل کلا اس کا وجود ہی نہیں۔ تلاش کرنا بے کار ہے......!''

''نہیں تلاش کرنا بے کار نہیں!'' کلا نے بڑی گہری ہو کر کہا تھا۔ ''شاید یہی تلاش ہے ہماری الگ الگ ڈھونڈ، جو ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر کیے جا رہی ہے۔ یہی تلاش، جو تمھیں میرے سمندر کی گہری سے گہری تہہ میں لیے پھرتی ہے۔ ایک ایک مونگا، ایک ایک موتی، ایک ایک سیپ کو ٹٹولنے، چھونے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔''

''اور یہی جستجو ہے جو خود مجھے تمھاری ہستی کے سارے آسمان کی پرواز پر آمادہ کیے ہوئے ہے!''

پھر کلا نے گھٹنوں پر سر رکھ کر گردن جھکالی تھی۔ اور بڑے چاؤ سے کہا تھا:

''اس جستجو کو جاری رہنے دو سدھیر...... شاید تمھیں، شاید خود مجھے...... وہ سب مل جائے!''

''مگر وہ سب کیا ہے......؟'' سدھیر ٹہلتے ٹہلتے زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''شاید کچھ نہیں۔ شاید وہم...... شاید ایک مسلسل لاحاصل تگ و دو، نامکمل جستجو، شاید تکمیل کی ہوس جو خود ادھوری رہتی ہے......!

شاید ہوس کی تکمیل جو کبھی پوری نہیں ہوتی...... کبھی پوری نہیں ہوتی، کبھی نہیں کلا، شاید کبھی نہیں؟ کیونکہ یہ پوری ہو جائے تو دنیا اتنی بدرنگ محسوس ہو کہ آدمی اس کی طرف پلٹ کر دیکھے بھی نہیں، اس کی طرف تھوکے بھی نہیں...... تھوکے بھی نہیں!

اس نے پلٹ کر دیکھا کمرہ خاموش تھا۔ کلا بے خبر سو رہی تھی۔ سارے کمرے میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک گہرے زہر کا رنگ، ایک بے کراں زہر کا سمندر، جس میں کلا اکیلی سوئی تھی۔ اور وہ خود اپنے دل کی طرح بے قرار کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ کبھی اس کونے، کبھی اُس کونے...... اس زہر کے سمندر میں ایک شکستہ کشتی کی طرح سوچ کی ہواؤں کے سہارے بھٹکا پھر رہا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی ٹھکانا نہیں۔ لمحہ بھر کو قرار نہیں۔ دم لینا چاہیے، دم نہیں لے سکتا۔ ڈوب جانا چاہے تو ڈوب نہیں سکتا...... کنارا کہاں ہے، کنارا کہاں ہے......؟ شاید کنارا اس کے نصیب میں نہیں۔ شاید ڈوب مرنا بھی اس کے مقدر کی بات نہیں۔ ہر چند ہے، نہیں ہے۔

ہے...... نہیں ہے۔ کیا ہے، کیا نہیں ہے۔ ہستی اور نیستی کے بیچوں بیچ، جس بے نام سی شئے کی تلاش جاری ہے، ایک فضول سی جستجو، ایک لایعنی سی تلاش، اس کے پاس، کلا کے پاس، کیا ہے؟ کیا نہیں ہے؟...... زندگی کیا دے کر، کیا چھپا گئی ہے......؟

وہ بڑے سے دریچے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سامنے سمندر، اندھیرے میں غرق تھا۔ اُوپر آسمان بھی اندھیرے کی ردا اوڑھے بے خبر پڑا تھا۔ کہیں کہیں ستارے تھے جو ڈوبتے تھے، اُبھرتے تھے، جاگتے تھے، سوتے تھے...... پھر جاگتے تھے......

کہیں کچھ نہیں تھا۔ فضا چپ سادھے دم بخود تھی۔ سناٹا ہر طرف......

اُس کو دفعتاً وحشت سی ہوئی۔ باہر کا سناٹا، اندر کا سناٹا...... اس نے اندر کمرے کی طرف دیکھا، دیواریں چپ تھیں، دروازے، برسوں کے جاگے رہنے کے بعد، آسودگی کی نیند سونے والے بےفکر انسان کی آنکھوں کی طرح بند تھے۔ نیند......!

نیلا، گہرا، زہر آلود کمرہ......

کمرہ، زہر کا خاموش سمندر بنا ہوا تھا۔ جہاں اکیلی، پلنگ پر کلا سیپ کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ زہر...... زہر...... زہر...... وہ جل گیا۔ کلا

کی آسودگی اس کے دل کو لگ گئی ... شاید کلا کو سب کچھ مل گیا۔ سب کچھ......

وہ جھوٹ بولتی ہے کہ اسے کچھ اور چاہیے۔ اس کی التجا غلط ہے کہ جستجو جاری رہنے دی جائے۔ زندگی نے اس کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ......

اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور آہستہ آہستہ کش لیتا، خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا دل بے چینیوں اور بے قراریوں کے تحت فرش پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔

ایک ذرا آرام ملا تو آنکھوں میں آنسوؤں کا پردہ سا لہرایا......

اس نے ایک نظر کلا پر ڈالی...... کلا کی نیند...... گہری نیند......اس کے دل کو برما گئی......!

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ، سگریٹ کی راکھ کی طرح بکھر گئی۔

سدھیر نے ایک لمبی سانس لی۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر کھڑکی پر بوجھ دے کر کھڑا ہو گیا......اور گہرے تاریک سمندر کی سطح پر نظریں گاڑ دیں......

پھر بہت دیر ہو گئی۔ سمندر، سے کا سمندر کروٹیں لیتا لیتا بہت دور نکل گیا۔ سوچتے سوچتے کنپٹیاں جلنے لگیں......

''تم سوئے نہیں؟'' دفعتاً اس کے کانوں نے کلا کی آواز سنی ''کیا سوچ رہے ہو؟''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کلا جاگ اٹھی تھی۔ کمرے میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کلا کا دھندلا دھندلا وجود...... وہ اپنے لمبے بکھرے بکھرے بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔

اس نے کلا کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گردن گھما کر پھر سمندر کی طرف یک ٹک دیکھنے لگا۔

''میں پوچھ رہی ہوں، اس طرح کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں!'' جیسے اس کے لاشعور سے آواز آئی۔ ''جس دن میں چلا تھا، میرا انٹرویو تھا، سرکاری ہسپتال تھا۔ چھ سو روپے کی تنخواہ......

''ہم نے اچھا نہیں کیا کلا!''

یہ کس کی آواز تھی؟ سدھیر نے محسوس کیا۔ اس کی اپنی آواز ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی ہے۔ جیسے خود کلا، اپنی ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی لگنے لگی ہے!

لیکن سدھیر کی آواز سن کر کلا چونک پڑی۔ اسے لگا جیسے یہ آواز اس کی دیکھی بھالی جانی پہچانی ہو......!



دیویندر اسّر

نام : دیویندر ناتھ

قلمی نام : دیویندر اسّر

پیدائش : ۱۴ اگست ۱۹۲۸ء بہ مقام حسن ابدال (پنجہ صاحب) کیمبل پور (حال: اٹک) پنجاب (بھارت) حال پاکستان۔

تعلیم : ایم۔اے (معاشیات) الہ آباد یونیورسٹی: ۱۹۴۹ء

ایم۔پی۔ایس (Master Of Professionol Studies) کارنل یونیورسٹی، امریکہ: ۱۹۷۴ء

میٹرک، ایف۔اے اور بی۔اے ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج کیمبل پور سے اور ایم۔اے (معاشیات) الہ آباد یونیورسٹی (۱۹۴۹ء) سے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں دلّی یونیورسٹی سے، بی۔ایڈ اور ۱۹۷۴ء میں کمیونیکیشن آرٹ میں ایم۔پی۔ایس کارنل یونیورسٹی، امریکہ سے کیا۔ کچھ مدت کانپور میں اور ۵۰۔۱۹۴۹ء میں ایک برس امریکہ میں زیر تعلیم رہے۔

وفات : دہلی ۶/نومبر ۲۰۱۲ء

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام شری ناتھ اسّر اور والدہ کا نام اُتم دیوی تھا۔ بچپن، لڑکپن اور اوائل جوانی کے دن کیمبل پور میں گزرے۔ ابتدائی تعلیم ماں کی زیرنگرانی ہوئی۔ والد وکیل تھے اور رہائش پلیڈر لائین، کیمبل پور شہر میں تھی۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں ڈاکٹر محمد اجمل، ڈاکٹر صدیق کلیم اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق جیسے اساتذہ ملے۔ کالج میگزین ''مشعل'' کی ادارت کی اور ''مشعل'' کے لیے پہلا مضمون ''منٹو: ایک سماجی جراح'' قلم بند کیا۔ با قاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ''نظام'' بمبئی میں شائع ہونے والے مضمون سے ہوا۔ ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے، آگے چل کر جدیدیت کی تحریک کے سرخیل بنے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان کیمبل پور سے کانپور اور بعد ازآں الہ آباد ہجرت کر گیا۔ الہ آباد سے ایم۔اے (معاشیات) کرنے کے بعد کانپور ۵۰۔۱۹۴۹ء میں قیام کے دوران میلا رام وفا سے صحافت کے آداب سیکھے اور ۱۹۵۰ء میں دہلی کے ایک

پرائیویٹ کالج میں بطور لیکچرر (معاشیات) ملازمت کا آغاز کیا۔ یہاں آٹھ برس درس و تدریس سے متعلق رہنے کے بعد کچھ مدت سرکاری ملازمت کی۔ اگست ۱۹۸۶ء میں ایک انگریزی ماہنامہ کے مدیر کی حیثیت میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین الہ آباد، کانپور اور دہلی شاخ کے سیکرٹری رہے۔ آج کل دہلی میں ہیں اور صحافت کو بطور پیشہ اپنا رکھا ہے۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

''منٹو: ایک سماجی جراح'' (مضمون) مطبوعہ: مشعل'' (Torch) گورنمنٹ ڈگری کالج، کیمبل پور ۴۷-۱۹۴۶ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''چوری'' مطبوعہ: ''نسوانی دنیا'' لاہور ۱۹۴۶ء

۲۔ ''ردِعمل'': ''ساقی'' دہلی: ۱۹۴۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''گیت اور انگارے'' (افسانے) آزاد کتاب گھر، دہلی طبع اوّل: ۱۹۵۲ء

۲۔ ''شیشوں کا مسیحا'' (آٹھ افسانے) حلقہ اربابِ فکر، کراچی طبع اوّل: ۔۱۹۵۵ء

۳۔ ''کینوس کا صحرا'' (سترہ افسانے) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی طبع اوّل: ۱۹۸۳ء

اس مجموعے میں ''نیند''، ''کالے گلاب کی صلیب''، ''تین خاموش چیزیں اور ایک زرد پھول''، ''سیاہ تل''، ''پرانی تصویر نئے رنگ''، ''روح کا ایک لمحہ اور سولی پر پانچ برس''، ''گلین''، ''بجلی کا کھمبا''، ''میں وینس اور دو ہاتھ''، ''کالی بلی''، ''مردہ گھر''، ''مفرور''، ''کینوس کا صحرا''، ''ایک پری کتھا''، ''بچہ رو رہا ہے''، ''اساس کی کوئی منزل نہیں'' اور ''ہم شہر بدل گئے'' کل سترہ افسانے ہیں۔

۴۔ ''فکر اور ادب'' (تنقید) مکتبہ قصرِ اردو، دہلی طبع اوّل: ۱۹۵۸ء

۵۔ ''ادب اور نفسیات'' (تنقید) مکتبہ شاہراہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۶۶ء

۶۔ ''ادب اور جدید ذہن'' (تنقید) مکتبہ شاہراہ، دہلی طبع اوّل: ۱۹۶۸ء

۷۔ ''مستقبل کے روبرو'' (تنقید) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی طبع اوّل: ۱۹۸۶ء

اس کتاب میں چودہ مضامین شامل ہیں۔ کل صفحات ۱۲۸

۸۔ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' (دستاویزی ناول) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی طبع اوّل: ۱۹۸۸ء

اس ناول پر ایک فلم بھی زیرِ تکمیل تھی جس کا پاکستان سے متعلق منظرنامہ مرزا حامد بیگ نے قلم بند کیا تھا

۹۔ ''پھول بچہ اور زندگی'' (ہندی افسانے) طبع اوّل: ۱۹۷۵ء

۱۰۔ ''کالے گلاب کی صلیب'' (ہندی افسانے) طبع اوّل: ۱۹۷۵ء

۱۱۔ ''کراس پر لٹکی تصویریں'' (ہندی افسانے) طبع اوّل: ۱۹۷۵ء

۱۲۔ ''کہانی کا انت'' (ہندی افسانے)

۱۳۔ ''پرندے اب کیوں نہیں اُڑتے'' (ہندی افسانے) طبع اوّل: ۱۹۸۱ء

۱۴۔ ''انوکھا پہاڑ'' (ہندی افسانے)

۱۵۔ ''چنتن ساہتیہ'' (تنقید۔ ہندی)

۱۶۔ ''ساہتیہ اور مانوگیان'' (تنقید/ ہندی)

۱۷۔ ''ساہتیہ اور آدھونک یگ بودھ'' (تنقید/ ہندی) طبع اوّل: ۱۹۷۳ء

۱۸۔ ''ساہتیہ ات ادھونک چیتنا'' (تنقید/ ہندی) طبع اوّل: ۱۹۷۹ء

۱۹۔ ''ساہتیم مکتی اور سنگھرش'' (تنقید/ ہندی ق طبع اوّل: ۱۹۷۹ء

۲۰۔ ''سیکس' ہنسا' یوواپیڑھی'' (ہندی)

۲۱۔ ''اردو کی غزلیں'' مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۲۲۔ ''اردو کی ہاسیا کہانیاں'' مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۲۳۔ ''ادھونک اردو ساہتیہ'' مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۲۴۔ ''منٹونامہ'' مرتبہ: دیویندر اسر طبع اوّل: ۱۹۸۱ء

۲۵۔ ''ودروہ اور ساہتیہ'' مرتبہ: دیویندر اسر

۲۶۔ ''ساہتیہ' سنگھرش اور پریورتن'' مرتبہ: دیویندر اسر

۲۷۔ ''منٹو کی شرشٹھ کہانیاں'' مرتبہ: دیویندر اسر

۲۸۔ ''MODERN HINDI SHORT STORY''
مرتبہ: دیویندر اسر (بہ زبان انگریزی)

۲۹۔ ''اردو کی چار چیت کہانیاں'' مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۳۰۔ ''THOUGHT'' مرتبہ: دیویندر اسر (بہ زبان انگریزی)

۳۱۔ ''بھارتیہ سنسکرتی اور راشٹریہ ایکتا'' (ہندی)

۳۲۔ ''IMAGES OF KAMA'' (بہ زبان انگریزی)

۳۳۔ ''نمکین اردو کہانیاں'' مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۳۴۔ ''بھوشیہ سے سمواد'' (ہندی/ تنقید)

۳۵۔ ''منٹو کی راجنیتک کہانیاں'' مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۳۶۔ ''ادب کی آبرو'' (تنقید) طبع اوّل:۱۹۹۶ء

۳۷۔ نئی صدی اور ادب'' (تنقید) طبع اوّل:۲۰۰۰ء

غیر مدوّن:

الیکٹرانک میڈیا سے متعلق مضامین اور تنقیدی مضامین کے علاوہ تین افسانے بابت ۱۹۷۸ء ''میرا نام شنکر ہے'' مطبوعہ ''الفاظ'' علی گڑھ (افسانہ نمبر) بابت ۱۹۸۲ء '' آدمی پرندہ ہے'' مطبوعہ تخلیق لاہور بابت اگست ۱۹۹۳ء اور سدھارتھ مطبوعہ '' ذہن جدید'' دہلی بابت جون اگست ۱۹۹۴ء کے علاوہ ''مشعل'' اٹک میں شائع ہونے والے مضامین بھی کسی کتاب میں یکجا نہیں ہو سکے۔ جن میں ''منٹو: ایک ادبی جراح''، '' کچھ ٹیگور کے بارے میں''، ''انسانی زندگی کا معمارِ اعظم''، ''ٹیپو سلطان'' اور چند کتب پر تبصرے اُن کی ابتدائی تحریریں ہیں۔

مستقل پتا:

بی۳/۱۵۳ اجنک پورہ، نئی دہلی، بھارت۔

نظریۂ فن:

''ہر افسانہ کسی نہ کسی پہلو میں ''سب ورشن'' ہی ہوتا ہے۔''

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مرقومہ: ۵ جنوری ۱۹۸۹ء)۔

مُردہ گھر

دیویندر اسر

مُردہ گھر میں میری لاش پڑی ہے۔

مال گاڑی سے اُتاری گئی بند بوریوں سی پھولی، لیبل لگی تین چار لاشیں اور بھی مردہ گھر میں پڑی ہیں۔

جب میری لاش مُردہ گھر میں لائی گئی تو سورج دھیرے دھیرے دور مٹیالی پہاڑیوں کی اوٹ میں پھسل رہا تھا اور پہاڑی پر ٹکے بادلوں میں آگ کے گولے کی لال کرنیں شعلہ سی بھڑک رہی تھیں۔ اُفق سے لوٹی ہوئی لالی بند کھڑکی کے شیشوں میں جلتے لوہے سی پگھلنے لگی۔ دھند اور مٹی کے غبار میں اندھیرے کے ذرے تیر رہے تھے اور میں پہچان نہ سکا کہ مجھے مردہ گھر میں کون لایا ہے۔ سایے دھیرے دھیرے روشنی کو نگلنے لگے اور پھر روشنی اور سایے کا فرق مٹ گیا۔ کمرے میں اندھیرا کالے ناگ کی طرح رینگ رہا تھا۔ سرخی سیاہ ہو چکی تھی۔ آگ کا گولا اندھیرے کے غار میں ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا سرکتے سرکتے بہت قریب آ کر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ لاشوں کے سفید کفن بھی سیاہ پڑ گئے۔ مردہ گھر، برگد کا بوڑھا پیڑ، بجلی کا کھمبا، ہسپتال کی وسیع عمارت، سامنے نرسوں کے کوارٹر، سڑک، گھاس، پھول، کانٹے دار تاریں، سائکل اسٹینڈ، مریضوں کے کمرے، حد بندی کی دیوار...... سب پر موت کی کالی چھایا پھر گئی۔ مریض وارڈوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے ملنے والے گھر لوٹ گئے۔ ایمبولینس وین اور مردہ گھر کی گاڑی تیموں سی کھڑی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کراہ لیتا تھا۔ لوٹتا ہوا پرندہ پر پھڑ پھڑا لیتا تھا۔ ہارن بجانا منع تھا لیکن دور سے اس سناٹے میں سنائی دے جاتا تھا۔

قریب کسی کے قدموں کی آواز سنائی پڑی۔ شاید کوئی لاش اور لائی جا رہی تھی۔ لیکن آواز آگے بڑھ گئی اور کتا آواز کے پیچھے دیر تک بھونکتا رہا۔ درختوں کے پتے گر رہے تھے۔ سوکھے، کھڑکھڑاتے پتے۔ اور تیز ہوا ٹہنیوں میں گولی کی آواز کی طرح گونج رہی تھی۔

اور پھر آوازیں دھیرے دھیرے سناٹے میں کھو گئیں۔ ایسے میں کوئی پتا بھی گرتا تو میں سہم جاتا۔

مُردہ گھر کے دروازے کی درز سے روشنی کی ایک لکیر نہ جانے کہاں سے آ جاتی اور جب وہ بھی غائب ہو جاتی تو اندھیرا اور بھی گہرا ہو جاتا۔ میں مر چکا ہوں۔ پھر بھی نہ جانے کب سے ایک بے نام سا خوف میری روح میں گڑا جا رہا ہے۔ برگد کے پیڑ پر اُلٹی لٹکی چمگادڑوں کو دیکھ

کر ایک بار لاشیں بھی کانپ جاتی ہیں۔ کوئی چمگادڑ جب مردہ گھر کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف اُڑتی، ٹکراتی ہے تو کمرے میں اندھیرے کی بھٹکن اور بھی تیز اور گہری ہو جاتی ہے۔

میری موت کیسے ہوگئی؟ ابھی کچھ لمحے پہلے میں زندہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی زندہ ہوں کیوں کہ میری لاش اب بھی سردی میں ٹھٹھر رہی ہے اور مجھے اب بھی کچھ کچھ یاد آتا ہے، کچھ کچھ، مدھم مدھم سا، موہوم سا کچھ۔

مجھے کوئی روگ نہیں ہوا، پیٹ، پیٹھ پر کسی نے چھرا نہیں گھونپا، دل دماغ میں کوئی گولی نہیں لگی؛ نہ حرکتِ قلب بند ہوئی نہ دماغ کی کوئی نالی پھٹی، نہ جسم جلا، نہ دل سے درد اُٹھا، تو پھر میں اچانک مر کیسے گیا؟

ساتھ والی لاش نے شاید کروٹ بدلی۔ اب اس کے مرنے کا ایک سبب ہے، ایک سلسلہ ہے۔ شاید انسان کی مشیت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ پہلے ہلکے ہلکے کھانسی ہوئی، پھر متواتر کھانسی آنے لگی، بخار بھی ہونے لگا۔ جسم دبلا نحیف، چہرہ پیلا زرد اور دل اداس ہو گیا۔ پھر کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ اور جب خون آنے لگا تو وہ گھبرا گیا کہ اب وہ کسی دن کسی بھی لمحے مر سکتا ہے۔ اسے اندر ہی اندر کوئی کھا رہا ہے، کوئی گھن لگ گیا ہے۔ ویسے اسے کوئی بھی روگ ہو سکتا تھا۔ روگ کے انتخاب میں وہ آزاد نہیں تھا۔ ساتھ والے بستر پر پڑے پڑے اس نے ایک دن بتایا تھا کہ وہ برسوں سے اس روگ کو پال رہا ہے: بڑے پیار سے، بڑی رفاقت سے، ایسے ہی جیسے وہ کسی نظم کی تخلیق کر رہا ہے: بے اختیار، نامعلوم، بے ارادہ۔ اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ شعر کے ساتھ ساتھ دق کے جراثیم بھی پال رہا ہے، جب لکھتے لکھتے اسے زوروں کی کھانسی ہوئی، پھیپھڑوں میں درد ہوا اور خون کا ایک کالا دھبہ کورے کاغذ پر جا پڑا۔ ایک شعر کی تخلیق۔

......اندھیرے کے خلا میں بھٹکتی ہوئی، آسیب زدہ نجس سایے سی زندگی۔

''شعر اور دق کے جراثیم شاید ایک ساتھ ہی جنم لیتے ہیں، ایک ساتھ ہی پلتے ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا رومانٹک تصور تھا اس کا! جیسے تپ دق ہی شعر کا سرچشمہ ہے۔

ساتھ والے وارڈ میں کوئی یکبارگی کراہ کے ٹوٹ گیا۔

اس نے مجھے دیو مالا کا ایک قصہ سنایا:

''فیلو اسٹیٹس بڑا طاقت ور تھا لیکن اس کے پاؤں میں ایک ایسا زخم تھا جس سے بڑی نفرت انگیز بدبو آتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کے رستے ہوئے زخم اور بدبو کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے پاس ایک کمان تھی جو دشمنوں کو فنا کر سکتی تھی اور جس کا نشانہ اچوک تھا۔ مگر اس کے زخم کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ بدبودار رستے ہوئے زخم کے باعث اس کے ساتھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے، لیکن اپنے دشمنوں پر فتح پانے کے لیے انہیں اس کی ضرورت پڑی کیوں کہ صرف اس کے پاس ہی ناقابلِ تسخیر حربہ تھا۔'' ''لیکن اگر کسی کا زخم زیادہ گندا ہے تو کیا وہ اسی باعث بڑا فنکار ہے یا جس کی صلاحیت زیادہ ہے اس کا زخم بھی بڑا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر بولا:

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوال زخم کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کون زخم خوردہ ہے۔ ایک عام کند ذہن یا ایک مہا کوی......''

اس نے کروٹ بدلی۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور خون کی ایک دھار اس کے پھیپھڑوں سے پھوٹ پڑی۔ اس نے نیم بند آنکھوں سے کمرے میں پڑے سب مریضوں کو دیکھا اور پھر سو گیا۔ نرس دیر سے آئی تھی اور وہ جا چکا تھا۔

آج اس نے اپنی پریم کہانی سنائی تھی۔

چاندنی میں لپٹے ہوئے چیڑ کے درختوں سے ہوا گزرتے ہوئے رو رہی تھی۔

بے حسی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ بس اتنا یاد ہے کہ سفید کپڑوں والی کوئی عورت ٹرالی میں دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔

وہ نہ تو شاعر ہے اور نہ ہی اختلاج قلب کی مریض۔ پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟ (لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کسی بھوت کا سایہ ہے۔) جب بھی وہ کمرہ اور کھڑکیاں بند کرتی ہے اور پردے گراتی ہے تو اسے کوئی خوف جکڑ لیتا ہے۔ چاروں طرف خاموشی ہوتی ہے۔ مکمل سناٹا، لیکن وہ اس دیوار سے اس دیوار کی طرف بھاگتی ہے۔

''تم کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ لو میں دروازے کھول دیتی ہوں، کھڑکیاں کھول دیتی ہوں، پردے ہٹا دیتی ہوں۔ ایشور کے لیے باہر نکل جاؤ......'' وہ چلاتی اور پھر دروازے اور کھڑکیاں کھول دیتی ہے، پردے ہٹا دیتی اور ایک لمبی سانس لیتی اور صوفے پر مفلوج سی گر پڑتی۔ اُف۔ اور پھر جب وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کرتی اور پردے گرا دیتی، کمرے میں مکمل اندھیرا اور خاموشی ہو جاتے تو یہی ڈراما شروع ہو جاتا۔ وہ چلاتی: ''میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

کیا وہ پاگل نہیں تھی؟ جسے بند، اندھیرے کمرے میں کسی بھٹکتے ہوئے، آشیاں سے بچھڑے پرندے کے پر پھڑ پھڑانے کی آوازیں آتی ہیں۔ جہاں جہاں وہ جاتی ہے یہ پرندہ اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ وہ اس سے بھاگتی ہے، اس دیوار سے اس دیوار تک۔ ایک ریستوراں سے دوسری تفریح گاہ تک، پہاڑی مقاموں پر، سمندر کے کنارے، سنسان ویران جگہوں اور بھرے پرے بازاروں میں، لوگوں کے ہجوم میں، اکیلے...... یہ پرندہ اس کے شانے پر بیٹھا رہتا ہے۔ نہ اُڑتا ہے نہ مرتا ہے۔

جب کیزیولٹی روم میں اسے لے جا رہے تھے تو میں نے اسے دیکھا تھا: تازہ کھلے پیلے پھول کی طرح خوبصورت، کھوئی کھوئی سی، آنکھیں حیرت بھری، بکھرے ہوئے بال، جنوں خیز، خاموش، سنجیدہ...... اور جب اس نے ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھا لیں تو اس کی روح کو کچھ سکون ملا۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ شاید اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ ایک اٹوٹ نیند، عالم جذب کے لیے، جس میں محض خواب ہے، حقیقت نہیں۔ شاید یہ موت انہیں خوابوں کے باعث تھی۔ مردہ گھر میں اس کی روح پریت سی گھوم رہی تھی، ایک بھٹکے ہوئے آشیاں سے بچھڑے پرندے کی طرح...... ایک دیوار سے دوسری دیوار تک۔

''آج شام کو ملنا، سات بجے، ٹھیک سات بجے، پارک میں۔''

''او۔ کے۔'' نرس نے ڈاکٹر کو جواب دیا اور مسکرا دی اور پھر مریض کو انجکشن لگانے میں لگ گئی۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لوگ ایک چھلاوے سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟ اپنی زندگی ایک واہمے کے لیے کس طرح برباد کر دیتے ہیں!'' نرس کہہ رہی تھی۔

''پُوور سول۔ کسی سے عشق وشق ہو گیا ہوگا۔'' وہ بولی۔

میں نے کروٹ بدلی۔ کیا عشق کے بغیر انسان کی نجات نہیں؟

''سوال عشق یا خودکشی کا نہیں، سوال اس واہمے کا ہے جس کے لیے لوگ زندگی لٹا دیتے ہیں۔'' شاعر نے کہا تھا۔

''کیا حقیقت ہے اور کیا واہمہ؟ کیا صداقت ہے اور کیا شاعری؟ ان سوالوں کا جواب میں کیسے دے سکتا ہوں شاعر۔ نہ میں نے کبھی

شعر کی تخلیق کی ہے نہ ہی کسی سے پیار۔ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔''

نہ جانے اس نیم شعوری حالت میں مجھے بچپن کی باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں!

میں چھت پر پتنگ اُڑا رہا تھا۔ پتنگ اُوپر ہی اُوپر اُڑتا جا رہا تھا، آکاش کے وسیع کھلے پن میں، جیسے وہ کسی ڈور سے نہیں بندھا محض ہوا کے دوش پر اُوپر ہی اُوپر اُڑ رہا ہے۔ ایک دوسرا پتنگ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ دھیرے دھیرے سے وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ قریب آتے آتے ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔ ڈور ختم ہو رہی تھی۔ ڈر تھا کہ میرا پتنگ کٹ نہ جائے۔ میں نے ایک جھٹکا دیا، دوسرے کا پتنگ کٹ گیا۔ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ کٹا پتنگ بہت دیر تک ہوا میں تیرتا رہا اور ہم بہت دور تک اس کے پیچھے بھاگتے رہے۔ پتنگ بیری کے ایک درخت پر کانٹوں میں اُلجھ گیا۔ جھٹ میں درخت پر چڑھ گیا۔ کانٹوں میں اُلجھتے میں نے پتنگ جھپٹ لیا۔ میرا جسم زخمی ہو چکا تھا، میرے کپڑے پھٹ گئے تھے لیکن جیت کے نشے میں میں نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ جب میں نیچے اترا تو ایک بھدا سا بڑا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔

''یہ پتنگ میرا ہے!'' اس نے کہا۔

میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا: ''یہ میں نے جیتا ہے۔''

''دیتا ہے یا دوں ایک......'' اور اس نے مجھے ایک گندی گالی دی تھی۔ میں نے دریوزہ گر نظر سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے اُٹھتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں کانپ گیا۔ میں نے پتنگ اسے دے دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک چوہا ہوں جو بلی کے ڈر سے اپنے بل میں گھس گیا ہے۔

اور پھر میں نے پتنگ اُڑانا چھوڑ دیا۔ ہر کھیل: گیند بلا، ہاکی، فٹ بال......سب کچھ چھوڑ دیا۔ ہر جگہ تو بڑا لڑکا تھا۔ میں اکیلا دور نکل جاتا۔ ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا اور پلیا پر جا بیٹھتا۔ رنگ برنگی تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ میں گھنٹوں اسی طرح بھوکا پیاسا دنیا سے بے خبر کالی، پیلی، نیلی، قوس قزحی تتلیوں کے پیچھے بھاگتا رہتا یا بارش کے دنوں میں کاغذ کی ناؤ چلاتا رہتا جب تک کہ ان میں پانی نہ بھر جاتا اور وہ ڈوب نہ جاتیں۔ شاید بے کار گھومتے ہوئے ان لمحات میں میں نے محسوس کیا کہ میں شاعر ہوں۔

میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ کیوں؟ روزگار کی تلاش میں یا کسی دوسرے کے خوف سے؟ لیکن یہ فیصلہ میں نے اس دن کیا تھا جب وہ بڑا لڑکا اپنی کار میں اپنی نئی بیاہی بیوی کو لیے فرانٹے سے میرے پاس سے گزر گیا۔ کار کی دھول کے غبار میں میں لپٹ گیا۔ اس کی بیوی سے مجھے عشق نہیں تھا لیکن وہ بچپن میں میرے ساتھ پانی میں ناؤ ضرور چلایا کرتی تھی۔

''کوی تم شاعری خوب کرتے ہو، کیا اس لڑکی کو آزاد نہیں کرا سکتے؟'' میرے دل نے شاعر سے پوچھا۔

''کس لڑکی کو؟''

لیکن وہ تو مر چکا تھا۔ اس کی سب بحث ختم ہو چکی تھی۔ شاعر کا فرض کیا ہے؟ اس کا وشواس کیا ہے؟ میرے دل میں شک کے کالے بادل منڈلانے لگے۔

میرا وشواس کیوں ڈول گیا؟ میرا غصہ، میری تشدد کی خواہش اس وقت غائب ہو گئی جب آدھی رات کو جیل میں دو ہاتھ کسی دوسرے کے سرہانے کے نیچے سے ڈبل روٹی چرا رہے تھے۔

کمرے میں کار کے پہیوں کے گھسٹ کر زور سے رکنے کی آواز آئی۔ ایک دم بریک لگی اور ایک چیخ فضا میں گونج اٹھی۔ کار کی روشنی کا

آئینہ اندھیرے میں گھوم گیا اور سفید کپڑوں میں لپٹی لاشیں جگمگا اُٹھیں۔ کار ایک دم اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ کمرے کے اندھیرے میں بڑی دیر تک چیخ گونجتی رہی۔ چاروں طرف سے چیخیں گونجنے لگیں۔ دور رات کے اندھیرے میں کوئی سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ پہلے اس سے زنا بالجبر کیا گیا اور پھر اسے ننگا کر کے سردیوں کی ٹھٹھرتی رات کو بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکا دیا گیا اور اس کے سینے میں گولی داغ دی۔ اس کے سر پر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کے برہنہ جسم کا ہر زخم روشن تھا۔

ایسی ہی ایک چیخ میں نے پھر سنی۔ رات کے اندھیرے میں گاڑی دھیرے دھیرے رینگ رہی ہے۔ ایک دم نعروں کا شور بلند ہوا اور گاڑی رک گئی۔ نیزے، بھالے، بلم، تلوار لیے لوگ گاڑی میں گھس آئے۔ جسم کٹنے لگے۔ عورتیں، مرد، بچے لہو میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کسی نے ایک بچے کو چاندی کی گیند کی طرح ہوا میں اُچھالا اور پھر نیچے بھالا رکھ دیا۔ رات کے سناٹے میں ایک چیخ گونجی اور پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

صدیاں بیت چکی ہیں لیکن وہ تنہا ابھی تک سولی پر کیوں لٹکا ہوا ہے؟

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ باہر قدموں کی چاپ سنائی پڑ رہی تھی۔ برآمدے کے پتھروں پر جیک بوٹوں کی کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ۔ شور اور دھواں اور پھر ایک کال کوٹھڑی سے ایک نوجوان کو کھینچ کر نکالا گیا۔ رات کے خاموش اندھیرے میں چوروں کی طرح اسے شہر سے باہر لے جایا گیا اور ندی کے کنارے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پانی میں بہا دیا گیا۔ جیک بوٹوں کی آواز پتھروں پر بڑی دیر تک لوٹتی رہی۔

دن...... دنا...... دن...... گولیاں چل رہی تھیں۔ عورتیں، مرد، بچے، سب نہتے۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ چار دیواری کے گھیرے میں شام کی تاریکی میں انہیں گولی سے اُڑایا جا رہا ہے۔ سینوں پر گولیوں کے داغ لیے اندھیرے میں لوگ گھوم رہے ہیں اور اندھیرے کے سمندر میں اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔

اور پھر لوگ اور لوگ اور لوگ۔ ہزاروں لوگوں کی بھیڑ شاہراہ پر آگے بڑھ رہی تھی۔ سمندر کے طوفان کی طرح پھیلتی جا رہی ہے: جے جے کار کے نعرے لگاتی، پرچم لہراتی۔ اور ایک آدمی بھیڑ کے سامنے سے چلا آ رہا ہے، ایک پھٹا ہوا پھریرا لیے۔ اُلجھے ہوئے قدموں تلے دھرتی پھسل رہی تھی۔ بار بار بھیڑ کے ریلے سے وہ پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا۔ پھر بھیڑ کے بھنور میں وہ پھنس گیا۔ لوگوں نے شور مچایا: راستے سے ہٹ جاؤ نہیں تو کچلے جاؤ گے۔ لیکن وہ پریت زدہ روح کی طرح آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ لوگوں کے پاؤں تلے روندا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اُٹھ کھڑا ہوتا اور پھر کچل دیا جاتا۔ اس کا چہرہ غصے اور حقارت سے لال ہو رہا تھا۔

اچانک بھیڑ میں کہیں سے ایک ہاتھ اُٹھا، ایک خنجر بجلی کی طرح چمکا، ایک چیخ کی آواز آئی۔ پرندے ڈر کے مارے درختوں سے اُڑ گئے اور پھر یہ آواز بھیڑ کے فاتح شور میں کھو گئی۔

یہ تیسری لاش کیا اس کی ہے؟ جو کالے، پیلے، نیلے چہروں میں سے اُبھر کر آئی ہے۔ ایک لاش روندی ہوئی، کچلی ہوئی۔ لہو کا فوارہ اور دیر تک گونجتی ہوئی چیخ۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

جب خنجر بجلی سا چمکتا ہے، گولی، دن سے چلتی ہے، کوئی قتل ہوتا ہے یا خودکشی کرتا ہے تو سناٹا کیوں چھا جاتا ہے؟ کیا زخم کی کوئی زبان نہیں ہوتی؟ زخم کے ہونٹ تو ہوتے ہیں، آواز کیوں نہیں؟

''پیس از رٹن آن دی ڈور اسٹیپ ان لاوا۔'' میں نے ڈائری میں لکھا تھا۔

وہ ہاتھ کہاں ہیں؟ بے رحم، قاتل ہاتھ...... لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لوگوں کا ہجوم آگے بڑھ چکا تھا۔ دشمن ان جانا تھا، بے نام تھا،

اندھیرے میں کھو چکا تھا اور وہ اپنے دشمن (وہ اسے اپنا دوست سمجھتا تھا جس نے اسے زندگی میں ہر لمحہ دہشت زدہ رہنے کی اذیت سے نجات دلائی تھی) کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

میں نے ان ہاتھوں کو دیکھا ضرور تھا جنہوں نے اس کو قتل کیا تھا لیکن میں انہیں پہچان نہیں سکتا۔ کل تک ان ہاتھوں کو میں پہچان سکتا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھے، اس بڑے لڑکے کے، جو ایک معصوم لڑکے کو پیٹ رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو بندوقیں تانے گولیاں چلا رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ندی میں بہا رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اس لڑکی کے کمرے میں بھٹکتے ہوئے پرندے کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اندھیرے میں ایک ساتھی کی ڈبل روٹی چرا رہے تھے۔

لیکن آج میں ان ہاتھوں کو نہیں پہچان سکتا۔ شاید اس لیے کہ میں مر رہا ہوں۔ (کیا میں واقعی مر چکا ہوں؟) صبح کی پہلی کرن کمرے میں چوری چھپے داخل ہوئی۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ اگر ان لاشوں کے بارے میں میں کچھ نہ جانتا تو بات کتنی سادہ ہوتی: محبت کی تثلیث ..... ایک عورت، دو مرد، قتل، خودکشی اور تپ دق۔ لیکن یہ تثلیث نہیں تھی کیوں کہ میں بھی تو مردہ گھر میں موجود تھا۔ چوتھا آدمی۔ قدموں کی ہرآہٹ سے میں چونک جاتا۔ شاید کوئی میری لاش لینے آیا ہے۔

شام تک لوگ آتے رہے اور باری باری سب لاشیں لے گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کلاک نے تین بجائے۔ سناٹا ایک لمحے کے لیے ٹوٹا اور پھر خاموشی۔ اس سنسان، ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات میں کون آئے گا؟ اور وہ بھی ایک مردے کے لیے۔ شاید کوئی لاش لینے آیا ہے۔ میں دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھتا ہوں اور گر پڑتا ہوں۔ کمرے میں کسی کے رینگنے کی آواز آئی۔ گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنے والے کی شاید آنکھ چمک رہی تھی۔ کیا سانپ کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں؟ اس کی لال زبان شعلے کی طرح اندھیرے میں لپک رہی تھی لیکن مجھے ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا۔ سانپ میرے قریب آ گیا اور پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ صرف سانپ ہی زندہ تھا اور میں اکیلا پڑا تھا۔ میں چھت کو دیکھ رہا تھا جس کی نہ تو کڑیاں تھیں کہ گن سکتا نہ کھلا آسمان کہ تاروں کی چھاؤں ہی ہوتی۔

باہر دو آدمی باتیں کر رہے تھے:

''اس لاش کا کیا بنے گا؟ کوئی نہیں آیا۔''

دوسرا بولا: ''لاوارث ہے شاید۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازے پر زنگ لگا تالا لگا تھا۔ وقت کے سیاہ سمندر میں سفید بادبان پھیلا کے میری لاش کا جہاز صدیوں سے چل رہا ہے۔ اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ ساحل۔

مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ دوستو! اس اندھیرے میں میں کب سے بھٹک رہا ہوں۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہ میرے سامنے ایک دم آ کھڑے ہوتے ہیں: بازار میں، گلی میں، موڑ پر، سیڑھیوں پر؛ ہر اس جگہ جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے۔ بجلی کے کھمبے پر برہنہ عورت کی لاش کراس کی طرح اُٹھائے وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے: بتاؤ اس کا قاتل کون ہے؟ اور اچانک دوسری طرف سے کالے گھوڑے پر سوار شیطانی ہنسی ہنستا ہوا وہ آ جاتا ہے: بھالے کی نوک پر بچے کی لاش اُچھالتا ہوا۔ وہ دونوں صدیوں سے میرے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ میں کدھر جاؤں؟ اس گھنے اندھیرے میں مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا۔ اے خدا مجھے روشنی دو۔ لیکن خدا کہاں ہے؟ اس کی لاش بھی تو مُردہ گھر میں پڑی ہے۔

اوم نمو یروشلم ہیروشمو۔

O

انتظار حسین

نام : انتظار حسین
قلمی نام : انتظار حسین
پیدائش : ۲۱ دسمبر۔ ۱۹۲۳ء بہ مقام ڈبائی ضلع بلند شہر یو۔ پی بھارت[1]
تعلیم : ایم۔ اے (اردو) میرٹھ کالج، میرٹھ ۱۹۴۶ء

ابتدائی اور مذہبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ براہ راست کمرشل اینڈ انڈسٹریل اسکول ہاپوڑ کی آٹھویں کلاس میں داخلہ لیا ۴۳۔۱۹۴۲ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کیا اور اسی کالج سے ۱۹۴۶ء میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انتظار حسین کے والد منذر علی مذہبی آدمی تھے۔ انھوں نے ڈبائی میں کھیتی باڑی بھی کی اور تجارت بھی لیکن ناکام رہے۔ ان کا رجحان مذہب کی تبلیغ کی طرف تھا۔ وہ انگریزی زبان سیکھنے کے حق میں نہ تھے اور اپنے بیٹے کو مذہبی تعلیم دلوا کر واعظ بنانا چاہتے تھے۔ والدہ، محرم کی رسوم میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ انتظار حسین نے بچپن اور لڑکپن کے ابتدائی گیارہ برس ڈبائی میں گزارے۔ بچپن اور لڑکپن میں چھپ چھپ کر رام لیلا میں شرکت کی۔ کالج کے زمانے میں علامہ مشرقی کی تحریروں سے متاثر ہو کر فرقہ واریت کے حوالے سے مذہبی خیالات و تصورات کو رد کر دیا۔ اس میں کچھ دخل پروفیسر کرار حسین کا بھی رہا جو کالج کے زمانے میں انتظار حسین کے استاد رہے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد اقبال اور ن م راشد سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی لیکن بات چند نظموں سے آگے نہ بڑھی۔

میرٹھ میں چند ماہ راشننگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں روزنامہ ''امروز'' لاہور سے منسلک ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں روزنامہ ''آفاق'' لاہور سے وابستہ ہو کر کالم نگاری کا آغاز کیا۔ کچھ مدت بے روزگار رہنے اور ''نوائے وقت'' سے منسلک رہنے کے بعد روزنامہ ''مشرق'' کی ملازمت اختیار کی اور یہ سلسلہ ۱۹۸۸ء تک چلا۔ اس اخبار کے لیے ''لاہور نامہ'' کے عنوان سے مستقل کالم نگاری کی۔ اسٹیج

کے لیے سب سے پہلا ڈرامہ ''خوابوں کے مسافر'' لکھا اور اس کے بعد گاہے گاہے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ادبی جریدہ ''خیال'' لاہور جاری کیا جس کے صرف تین شمارے نکل سکے۔ کچھ مدت ''ادب لطیف'' لاہور کی ادارت بھی کی۔ شادی ۱۹۶۶ء میں ہوئی لیکن اولاد سے محروم رہے۔ اپنے دور کے ترقی پسند ادبا، حلقہ ارباب ذوق میں قیوم نظر کی چودھراہٹ اور لاہور کے روائتی طرز کے ادیبوں شاعروں کے ساتھ چومکھی لڑنے کے سبب ہمیشہ اردو ادب کی فرنٹ لائن میں نمایاں دکھائی دیے۔ ان دنوں ''DAWN'' کراچی میں ادب اور ثقافت سے متعلق ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''قیوما کی دکان'' (تکمیل: اپریل ۱۹۴۸ء) مطبوعہ ''ادب لطیف لاہور'' دسمبر: ۱۹۴۸ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''گلی کوچے'' (گیارہ افسانے) — شاہین پبلشرز لاہور — طبع اوّل: ۱۹۵۲ء

(۱) قیوما کی دکان (۲) خرید و حلوا بیسن کا (۳) چوک (۴) فجا کی آپ بیتی (۵) اجودھیا (۶) رہ گیا شوق منزل مقصود (۷) پھر آئے گی (۸) عقیلہ خانہ (۹) روپ نگر کی سواریاں (۱۰) ایک بن لکھی رزمیہ (۱۱) استاد

۲۔ ''کنکری'' (چودہ افسانے) — مکتبہ جدید لاہور — طبع اوّل: ۱۹۵۵ء

(۱) مجمع (۲) اصلاع (۳) محل والے (۴) یاں آگے درد تھا (۵) آخری موم بتی (۶) دیولا (۷) کیلا (۸) ساتواں در (۹) بٹ بیجنا (۱۰) پسماندگان (۱۱) ٹھنڈی آگ (۱۲) جنگل (۱۳) مایا (۱۴) کنکری

۳۔ ''آخری آدمی'' (گیارہ افسانے) — کتابیات لاہور — طبع اوّل: ۱۹۶۷ء

۴۔ ''شہر افسوس'' (سترہ افسانے) — مکتبہ کارواں لاہور — طبع اوّل: ۱۹۷۲ء

(۱) وہ جو کھوئے گئے (۲) کٹا ہوا ڈبہ (۳) دہلیز (۴) سیڑھیاں (۵) مردہ راکھ (۶) مشکوک لوگ (۷) شرم الحرم (۸) کانا دجال (۹) بگڑی نسلیں (۱۰) دوسرا گناہ (۱۱) دوسرا راستہ (۱۲) اپنی آگ کی طرف (۱۳) لمبا قصہ (۱۴) وہ اور میں (۱۵) وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے (۱۶) اندھی گلی (۱۷) شہر افسوس۔

۵۔ ''کچھوے'' (سترہ افسانے) — مطبوعات لاہور — طبع اوّل: ۱۹۸۱ء

(۱) قدامت پسند لڑکی (۲) ۳۱ مارچ (۳) فراموش (۴) بادل (۵) اسیر (۶) ہندوستان سے ایک خط (۷) نیند (۸) کچھوے (۹) پتے (۱۰) واپسی (۱۱) رات (۱۲) دیوار (۱۳) خواب اور تقدیر (۱۴) شور (۱۵) صبح کے خوش نصیب (۱۶) بے سبب (۱۷) کشتی

۶۔ ''خیمے سے دور'' (سترہ افسانے) — سنگ میل پبلی کیشنز لاہور — طبع اوّل ۱۹۸۶ء

(۱) خیمے سے دور (۲) سفر منزل (۳) حصار (۴) زناری (۵) پراگیان (۶) دھوپ (۷) برہنہ کہانی (۸) اجنبی پرندے

۷ (۹) برہمن بکرا (۱۰) وقت (۱۱) انتظار (۱۲) پلیٹ فارم (۱۳) چیلیں (۱۴) پرانی کہانی (۱۵) دسواں قدم (۱۶) خالی گھر (۱۷) خواب میں دھوپ

۷۔	''چاند گہن'' (ناول)	مکتبہ کارواں لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۳ء
۸۔	''بستی'' (ناول)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	طبع دوم: ۱۹۸۳ء
۹۔	''دن اور داستان'' (دو ناولٹ)	ادارہ ادبیات نو لاہور	طبع دوم: ۱۹۸۱ء
۱۰۔	''نئی پود'' از ایوان تورگنیف (ناول/ترجمہ)	مکتبہ اردو لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۲ء
۱۱۔	''زمین اور فلک اور'' (سفرنامے)	سنگ میل لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
۱۲۔	''ذرے (ادبی کالم)	پاکستان فاؤنڈیشن لاہور	طبع اوّل: ۱۹۷۶ء
۱۳۔	''ناؤ اور دوسرے افسانے'' امریکی افسانوں کا انتخاب (ترجمہ)	آئینہ ادب لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۸ء
۱۴۔	''فلسفہ کی نئی تشکیل'' از جان ڈیوی (ترجمہ)	شیش محل کتاب گھر لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۱ء
۱۵۔	''علامتوں کا زوال'' (تنقید)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	طبع دوم: ۱۹۸۳ء
۱۶۔	''سن ستاون میری نظر میں'' (ترتیب بہ اشتراک ناصر کاظمی)	آئینہ ادب لاہور	
۱۷۔	''سرخ تمغہ'' از سٹیفن کرین (ناول/ترجمہ)	یونائیٹڈ بک ڈپو لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
	یہ ''Red badge of courage'' کا ترجمہ ہے۔		
۱۸۔	''ہماری بستی'' ڈراما از تھارنٹن وائلڈر (ترجمہ	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
	یہ ''Our Town'' کا ترجمہ ہے کل صفحات ۲۶		
۱۹۔	''ماؤزے تنگ'' (سوانح/افکار) از سٹیورٹ شریم (ترجمہ)	نگارشات لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۶ء
	یہ ترجمہ دوسری بار پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور نے شائع کیا		
۲۰۔	''سارہ کی بہادری'' (ناول/ترجمہ) از ایلس ڈیلگیش (باتصویر بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۳ء
۲۱۔	''الف لیلہ'' از رتن ناتھ سرشار۔ مرتبہ: انتظار حسین	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	
۲۲۔	انشاء اللہ خان انشاء کی دو کہانیاں۔ مرتبہ: انتظار حسین	مجلس ترقی ادب لاہور	
۲۳۔	''قائداعظم کے لڑکپن تک کا زمانہ''	پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور	
۲۴۔	''کلیلہ دمنہ'' (بچوں کے لیے)	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسلام آباد	
۲۵۔	''باتیں اور ملاقاتیں'' (مکالمے)	مکتبہ عالیہ لاہور	

۲۶۔	''جنم کہانیاں'' (افسانے/کلیات) پہلی جلد	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	
۲۷۔	''قصہ کہانیاں'' (افسانے/کلیات) دوسری جلد	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۸ء
۲۸۔	''خالی پنجرہ (سولہ افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۳ء
۲۹۔	شہرزاد کے نام (پندرہ افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۲ء
۳۰۔	''چراغوں کا دھواں (خودنوشت)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	
۳۱۔	''لکڑہارے کا بیٹا (بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۳۲۔	''تذکرہ'' (ناول)	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	طبع اوّل:
۳۳۔	''آگے سمندر ہے'' (ناول)	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۸ء
۳۴۔	''اجمل اعظم'' (سوانح حکیم اجمل)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	
۳۵۔	''نظریے سے آگے'' (تنقید)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	
۳۶۔	''دلی تھا جس کا نام'' (تذکرہ)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	
۳۷۔	''نئے شہر، پرانی بستیاں'' (سفرنامے)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	

غیر مدوّن:

لاتعداد کالم، ڈرامے اور چند مضامین۔

مستقل پتا:

۱/۳۸ جیل روڈ لاہور

اعزاز:

۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی انعام برائے ناول ''بستی'' (جسے وصول کرنے سے انکار کر دیا)
۲۔ پرائیڈ آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا سول ایوارڈ)
۳۔ فروغ اردو ادب (دوحہ قطر) ایوارڈ: ۱۹۹۸ء

نظریۂ فن:

''میری اردو یہاں کی چڑیاں اور درخت سمجھتے ہیں۔ میں چڑیوں کے لیے لکھتا ہوں۔''

(بہ حوالہ ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' مرتبہ طاہر مسعود انٹرویو ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

○

حوالہ جات:

۱۔ ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' مرتبہ: طاہر مسعود'' ''نگار پاکستان'' افسانہ نمبر سالنامہ ۱۹۸۱ء مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری'' ''اردو افسانہ'' از ڈاکٹر انوار احمد اور جملہ سوانحی کوائف مشمولہ نصابی کتب میں تاریخ پیدائش دسمبر ۱۹۲۵ء درج ہے' جو درست نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے اسکول کے ساتھی تھے۔ جالبی صاحب کے مطابق ۱۹۲۳ء ہی درست سال پیدائش ہے۔

آخری آدمی

انتظار حسین

الیاسف اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند، میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کرتے تھے نابود ہو گئے۔ پر اس شخص نے، جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجردم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و پریشان واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اے عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے ہنسا۔ ''تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔'' اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلے کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب، ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ

ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب خوف سے اپنے آپ سکڑتا گیا اور وہ دونوں ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے، آپس میں گتھ گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضاء بگڑے۔ پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقل مند تھا اور سب سے آخری آدمی بنا رہا، تشویش سے کہا کہ اے لوگو! ضرور ہمیں کچھ ہو گیا۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا۔ اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو! وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آ لیا۔ دہشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں اور خدوخال مسخ ہوتے چلے گئے اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور اسے سکتہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی۔ سمندر کے کنارے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی، بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کٹورا بجتا تھا۔ پردم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں عالی شان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہراس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور اس سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا۔ تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی اس نے ان کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک ابن زبلون کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کیے۔ جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا۔ اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کے دودھیا گھوڑوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس کی یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ کے لیے اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا لمبے بال اس کی رات کی بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈیوڑھی کی مانند ہے اور پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں کو گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ سا اس نے خالی مکان دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا۔ جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضر! تو کہاں ہے؟ اور اے وہ کہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھاری مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہو گئیں اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے؟ اے الاخضر کی بیٹی!!!! اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کے دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ اور مجھ سے آن مل کہ

تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا کہ اس کا جی بھر آیا اور بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک اسے الیعذر کی جورو یاد آئی۔ تو الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی۔ حالاں کہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑے چلے گئے اور ہڑکی آواز وحشی ہوتی چلی گئی...... یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا۔ بنت الاخضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی اور بے شک جو جن میں سے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور الیاسف نے اپنے تیئں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور کھڑی دم کو دیکھ کر ہنسا اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کہ میں انگور کے خوشے توڑوں گا اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جوئیں چن چن کر کھاتی تھی۔ الیعذر جھرجھری لے کر کھڑا ہو جاتا اور وہ دم کھڑی کر کے اپنے پیچھے پنجوں پر اٹھ بیٹھتی۔ اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا اور الیاسف نے اپنے تیئں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنس کے ایسی بن جائے اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے، رونے اور ہنسنے سے ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا۔ دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا۔ کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا۔ یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا۔ کبھی ہنساتا تھا۔ کبھی غصہ دلاتا کہ وہ پر دانت پیسنے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا اور یوں ہوا کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا اور الیاسف کے تیئں لفظوں کی قدر جاتی رہی، کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیاں رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ آج لفظ مر گیا اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصے اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے درگزرا اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر جزیرے کے مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے تیئں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنالیا کہ محبت اور نفرت۔ غصہ اور ہمدردی۔ غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں کہ جذبے کی کوئی رَو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں

اندر سے بدل رہا ہوں۔ تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ چتری پھیل کر باہر آ رہی ہے کہ اس کے اعضا خشک، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طرح غلبہ پاؤں گا۔ جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پا لیا اور اس کے سمٹتے ہوئے اعضاء کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور لجلجے ہو گئے۔ اور اس کے جوڑ کھلنے لگے اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضاء بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے ہیئت اعضاء کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضاء کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھینے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضاء پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضاء تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضاء بگڑتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری راتیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کا مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا اور اس کی ہوس بڑھتی گئی اور انہوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب ایک شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کرنے سے منع کرتا تھا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کی مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا۔ سمندر تمہارے دست ہوس سے پناہ مانگتا ہے اور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے پر نکل گئیں اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص خود سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر یوں بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو اب مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا اور الیاسف اپنے حال پر رو دیا۔ اس کے بنائے پشتہ میں دراڑ پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لیے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں پر چھپ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے اعضاء پر نظر کی کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کہ کیا میں، میں ہی ہوں اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بیشک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آ رہا تھا اور الیاسف نے درد سے صدا کی اے بنت الاخضر اے وہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم ہے۔ قسم ہے کبوتروں کی جب وہ بلندیوں پر پرواز کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہو تجھے رات کے اندھیرے کی۔ جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے اور نیند کی اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو مجھے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئیں تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا۔ اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف، چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جی ٹھنڈا کیا۔ اس اثناء میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا تھا اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ مگر وہ بھاگتا گیا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور اُس نے دفعتاً اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دی اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔

○

انور سجاد

نام : سید انور سجاد علی بُخاری

قلمی نام : انور سجاد/ ڈاکٹر انور سجاد

پیدائش : ۲۷ نومبر ۱۹۳۴ء بہ مقام چونا منڈی لاہور

تعلیم : ایم بی ایس (پنجاب) ڈی۔ٹی۔ایم اینڈ ایچ (انگلینڈ)

مشن ہائی سکول رنگ محل' لاہور میں پانچویں جماعت تک تعلیم پائی۔ چھٹی سے میٹرک تک سنٹرل ماڈل سکول' لاہور میں رہے' میٹرک ۱۹۴۹ء میں کیا۔ ایف۔ ایس سی کرنے کے لیے میڈیکل کے مضامین کے ساتھ گورنمنٹ کالج' لاہور میں داخلہ لیا اور چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں اُنہی مضامین کے ساتھ ایف۔سی کالج' لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۳ء میں ایف۔ ایس سی تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ایف۔سی کالج لاہور میں دو برس تک بی اے کے طالب علم رہے لیکن امتحان نہیں دیا۔ ۱۹۵۵ء میں بائنی اور زوالوجی کے ساتھ ایف۔سی کالج لاہور سے بی۔ ایس سی کرنے کے بعد ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی میں داخلہ لیا جہاں سے چھ ماہ بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' لاہور منتقل ہو گئے۔ فرسٹ پروفیشنل کا فائنل اسی کالج سے پاس کیا۔ ایم بی ایس کرنے میں پانچ کی بجائے پونے چھ سال لگ گئے۔ فزیالوجی کے پرچے میں فیل ہو کر سپلمنٹری امتحان کے ذریعہ ۱۹۶۱ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ بعد ازاں لیور پول اسکول آف ٹراپکل میڈیسن انگلینڈ سے ۱۹۶۶ء میں ڈی۔ٹی۔ایم اینڈ ایچ کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انور سجاد کے والد مسلک کے لحاظ سے صوفی اور پیشہ کے اعتبار سے ایم بی ایس ڈاکٹر تھے۔ والدہ میر سردار حسین رئیس لاہور کی بھتیجی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ ان کا گھرانہ والد کی طرف سے لوئر مڈل کلاس اور والدہ کی طرف سے اپر کلاس کا ملغوبہ رہا۔ والد نے ۲۷۔۱۹۲۶ء

میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' لاہور سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنے گھر کے قریب چونا منڈی میں پرائیویٹ کلینک شروع کیا تھا' سوشل ریفارمر تھے۔ لاہور میں طبیہ کالج کے قیام میں ان کی کوششوں کو دخل تھا۔

انور سجاد کا بچپن اور لڑکپن چونا منڈی کی لائبریریوں میں چھپ چھپ کر قصے کہانیاں پڑھتے' کتے پالنے اور مسجد میں اذانیں دینے میں گزرا۔ فارن سروس اور ائرفورس میں جانے کا شوق تھا جو قد اور وزن کم ہونے کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگی تو انور سجاد'' آزاد خیال مصنفین کی انجمن'' کے شریک معتمد ہو گئے۔ آرٹس کونسل میں جانا آنا ہوا تو ۱۹۵۵ء میں تھیٹر میں اداکاری کا شوق چرایا ۱۹۶۲ء سے ریڈیو پر صداکاری کی' ڈرامے لکھے اور مصوری میں نام کمایا۔ ۱۹۶۱ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال کے ویسٹ میڈیکل وارڈ میں ہاؤس جاب کیا تھا' لگ بھگ ۱۹۶۳ء میں اپنے والد کے کلینک۔ (چونا منڈی) پر آ گئے۔ ریڈیو اور اسٹیج کے لیے ۱۹۵۸ء، اور ۱۹۶۵ء سے ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا شروع کیا' تین فیچر فلموں کے سکرین پلے لکھے۔ بطور مصور ۱۹۵۵ء میں پہلی اجتماعی نمائش میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۷ء میں پاکستان آرٹس کونسل' لاہور میں' نو مین شو' ۱۹۶۷ء میں'' ون مین شو' اور ۱۹۷۰ء میں آخری بار اجتماعی نمائش میں حصہ لیا۔ پاکستان آرٹسٹس ایکوئٹی لاہور (قیام ۱۹۷۲ء) کے بانی رکن۔ ۱۹۷۳ء میں ایکوئٹی کے صدر رہے۔ ۱۹۷۰ء۔۷۱ء میں حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری اور اگست ۱۹۷۳ء تا اپریل ۱۹۷۵ء چیئرمین پاکستان آرٹس کونسل' لاہور رہے۔ دو شادیاں کیں پہلی بیوی رتی سجاد دوسری اداکارہ زیب رحمان۔ اولاد: دوسری شادی سے ایک بیٹی۔ انور سجاد ان دنوں جیو ٹیلی وژن نیٹ ورک کراچی سے منسلک ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''ہوا کے دوش پر'' مطبوعہ'' نقوش' لاہور اپریل ۱۹۵۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''رگ سنگ'' (ناولٹ)	گوشہ ادب' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۵۶
۲۔	''چوراہا'' (افسانے)	نئی مطبوعات لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۴ء
۳۔	''استعارے'' (افسانے)	قوسین' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۷۰ء
۴۔	''خوشیوں کا باغ'' (ناول)	قوسین' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۵۔	''آج'' (افسانے)	مکتبہ عالیہ' لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۳ء
۶۔	''نیلی نوٹ بک'' (ازعمانوئیل کزاکیویچ کا ترجمہ) ناولٹ	مکتبہ دانیال' کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۳ء

لینن کی ڈائری/ زندگی سے متعلق روسی ناولٹ کا یہ تیسرا ترجمہ ہے۔ پہلی بار اس کتاب کو'' ڈائری کا راز'' کے عنوان سے رئیس احمد جعفری نے آئینۂ ادب' لکھنو کے لیے ۱۸۴ صفحات میں کیا۔ دوسری بار'' نیلی نوٹ بک'' کے عنوان سے ایک ترجمہ آزاد کتاب گھر' دہلی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا۔

۷۔	''جنم روپ'' (ناول)	قوسین' لاہور	

۸۔ ''پہلی کہانیاں'' (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل ۱۹۹۰ء

۹۔ ''صبا اور سمندر'' (ٹیلی ڈراما) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل ۲۰۰۷ء

۱۰۔ ''کارخانہ'' (ٹیلی ڈراما) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل ۲۰۰۷ء

۱۱۔ ''تلاش وجود'' (مضامین)

۱۲۔ ''سورج کو ذرا دیکھ'' (ٹیلی ڈراما)

اعزاز:

۱۔ پرائڈ آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا سول اعزاز)

مستقل پتا:

ای ۵۴۔ گلی نمبر ۳۱، گلبرگ III، لاہور۔

نظریۂ فن:

''موضوع اور ہیئت کے درمیان اس جدلیاتی توازن کا حصول، جو کسی بھی فن پارے کو دوام بخشتا ہے۔'' انور سجاد

(بہ حوالہ مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۲۱، اکتوبر ۱۹۸۷ء)



حوالہ جات:

۱۔ میٹرک کی سند پر تاریخ پیدائش ۲۷ مئی ۱۹۳۵ء درج ہے، جو درست نہیں۔

گائے

انور سجاد

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔

اب اس کا دھیلا نہیں ملنا۔

ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔

لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔

نکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں۔ جس روز سے میں نے انہی کو پہچانا ہے' اسی روز سے چتکبری کو بھی جانا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے۔ لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے میں ہر لحظہ یتیم ہوتا ہوں۔ میں' کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں' کیوں کرتا ہوں۔

''آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔'' نکے سے رہا نہیں جاتا۔

''تم نہیں سمجھتے، یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے۔''

میں نا سمجھ ہوں۔ ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔

آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔

بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں گا۔

پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ نکا ایک طرف کھڑا اپھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاباش چتکبری' میری گائے میری گئو ماتا' ہلنا نہیں' تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ' ورنہ نہیں تو۔

گائے اپنی جگہ۔ پرانی' مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ نکے کے کان بھی بند ہو رہے تھے' رفتہ رفتہ۔

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھمبا ہو جائے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کرلے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جاسکتا ہے۔

اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔

ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور کھولی میں منہ ڈال دیا تھا' جہاں ان کا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔

آپ لوگ اسے واقعی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا۔

نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟

ایک نے کہا تھا۔

بابا' یہ گائے مجھے دے دو' میں اسے۔

حکیم کی اولاد۔

دوسرے نے کہا تھا۔

بابا اس کے بغیر میں۔

مجنوں کا بچہ۔

تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا' پانچواں سارے بزرگ' سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے' جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔

او کمبخت سوداگر مجھ سے لو روپے' مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے جب' جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔

ہاہاہا۔

جب' جب میں کمانے لگوں گا۔

ہاہاہاہا۔

تب' تب تک تو چتکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہوگا۔ میں' میں کیا کروں۔

ان میں سے ایک' گائے کو لانے کے لئے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ نکا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ یونہی دیکھنے کے لئے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں پٹھے دبائے تھے' مڑ کے نکے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھر اٹھایا تھا۔

نہ' نہ' نہ۔

نکا چیخا تھا۔

بکومت۔

گائے کھڑی ہوگئی تھی۔

ہے۔ ہے۔ ہے۔

بڑے نے زور لگایا تھا۔

نہ چتکبرے۔ نہ' نہ

چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان۔

نکے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔

چلو میم صاحب! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان' قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ نکا مسکرایا' پھر فوراً اداس ہوگیا تھا۔

یہ تو بک بھی چکی ہے' اسے جانا ہی ہوگا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا۔ اس بچھڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے نکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ نکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

در فئے منہ' لعنت لکھ لعنت

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھر رکھا۔

نہ چڑھنا۔

اس کی زبان کاٹ لو۔ یہ گائے کو ورغلاتا ہے۔

ڈراتا ہے۔

نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے تختے کو دیکھا' پھر نکے کی طرف۔

در فٹے منہ' لعنت لکھ لعنت۔

نکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں' کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چتکبری جانتی ہے' جانتی ہے کہ وہ تختے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں' کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں' گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جما کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھے ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

آؤ' پیٹو۔

اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔

نکا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق' بے حس۔

یوں بات نہیں بنے گی۔

ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

تو پھر؟

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی' پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی نکے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔

نکا' جسم کا مفلوج حصہ۔

دیکھو' دیکھو' وہ تو بائیں طرف۔

ایک چونکا تھا۔

قدرتی بات ہے۔

بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکاری مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔

اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ...... یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔

نکا مفلوج وجود۔

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی۔ نکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی' قدم اٹھاتی' رکتی چلتی' بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ آہستہ سے نکے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا' تختے پر چڑھ کے پنوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جا کے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے نکے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹھوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لئے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا' پھر دوسرا کھر۔

خدا معلوم نکے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اتار کر اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اسی جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے' باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے نہیں پتہ کیا ہوا۔ نکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو' بچھڑے کو' ڈرائیور کو' بابا کو' اپنے آپ کو' یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔ کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔



بانو قدسیہ

نام : قدسیہ بانو
قلمی نام : بانو قدسیہ
پیدائش : ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء بہ مقام فیروز پور، مشرقی پنجاب، بھارت
تعلیم : ایم۔اے (اردو) گورنمنٹ کالج، لاہور ۱۹۵۰ء

ابتدائی تعلیم فیروز پور، مشرقی پنجاب میں پائی۔ میٹرک دھرمالہ سے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں کینئرڈ کالج، لاہور سے بی۔اے اور ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم۔اے (اردو) کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

فیروز پور، مشرقی پنجاب میں جاٹ خاندان کے بدرالزماں چٹھہ کے ہاں پیدا ہوئیں، جو ضلع حصار کے ایک حکومتی فارم میں ملازم تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ساڑھے تین سال کی عمر میں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ بچپن اور لڑکپن فیروز پور میں گزرا۔ قیامِ پاکستان کے بعد والدہ، ذاکرہ چٹھہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوگئیں۔ افسانہ نگاری کا شوق لڑکپن سے تھا۔ میٹرک کے بعد کنیئرڈ کالج، لاہور میں داخلہ لیا، جہاں سے بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم۔اے (اردو) کیا۔ اشفاق احمد ان کے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۵۶ء میں شادی کے بعد دونوں نے مل کر ادبی مجلہ ''داستان گو'' لاہور سے جاری کیا۔ بانو اور اشفاق اس پرچے کو اپنے ذاتی پریس سے شائع کرتے تھے اور یوں بانو اور اشفاق ''داستان گو'' کے ایڈیٹر بھی تھے اور مشین مین بھی۔

بانو قدسیہ نے ۱۹۵۰ء میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اسٹیج کے لیے سات ڈرامے: ''اہلِ کرم''، ''ستمگر تیرے لیے''، ''اک تیرے آنے سے''، ''بزدل''، ''یہ جنوں نہیں تو کیا ہے'' اور ''منزل منزل'' کے علاوہ ریڈیو کے لیے ''عاشمہ''، ''اس دیوانگی میں''، ''اڈاری''، ''کرم فرما''، ''دھواں''، ''اچی ماڑی''، ''کچ دا بنگلہ'' اور ''سایہ گل'' (سیریز) لکھی۔ ٹیلی ویژن کے لیے ''سہارے''، ''لب پہ آتی ہے''، ''صبح کا ستارہ''،

''آدم کے بعد''، ''خلیج''، ''زخم خوردہ''، ''لگن اپنی اپنی''، ''میری ڈائری''، ''سانول موڑ مہاراں''، ''زاویے''، ''سدھراں''، ''ضرب جمع تقسیم'' اور ''زرد گلاب'' (ڈرامے اور سیریل) لکھے۔ ''سلسلہ شہابیہ'' قدرت اللہ شہاب، آئی سی ایس، کو ولی کا درجہ دلانے والے ٹولے: شاہد احمد دہلوی، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کی واحد خاتون رکن۔ روشن خیال افراد کے خیال میں رجعت پسندانہ سوچ کی حامل۔ حد درجہ تخلیقی، لیکن متنازعہ ٹیلی ویژن ڈراموں کی خالق۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''واماندگی شوق'' مطبوعہ: ''ادب لطیف'' لاہور ۱۹۵۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''بازگشت'' (افسانے)	شیش محل کتاب گھر، لاہور	طبع اوّل:
		سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع دوم: ۱۹۹۳ء
۲۔	''امربیل'' (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل:
۳۔	''کچھ اور نہیں'' (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۷۶ء
۴۔	''دانت کا دستہ'' (افسانے)	شیش محل کتاب گھر، لاہور	طبع اوّل:
۵۔	''ایک دن'' (ناولٹ)	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	طبع اوّل:
۶۔	''موم کی گلیاں'' (ناولٹ)	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	طبع اوّل:
۷۔	''پُروا'' (ناولٹ)	داستان گو، لاہور:	طبع اوّل: ۱۹۶۰ء
۸۔	''شہر بے مثال'' (ناولٹ)	الحمرا پبلشرز، لاہور	طبع اوّل:
۹۔	''راجہ گدھ'' (ناول)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۱۰۔	''آدھی بات'' (سٹیج ڈرامے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	
۱۱۔	''اک تیرے آنے سے'' (سٹیج ڈرامے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	
۱۲۔	''منزل منزل'' (اسٹیج ڈرامے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	
۱۳۔	''ناقابل ذکر'' (افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
۱۴۔	''توجہ کی طالب'' (افسانوی کلیات)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
۱۵۔	''فٹ پاتھ کی گھاس'' (ٹی۔وی ڈرامے)	فیروز سنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۱۶۔	''دوسرا دروازہ'' (اکیس افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۹ء
۱۷۔	''آتش زیرپا'' (نو افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۰ء

۱۸۔	''سامانِ وجود'' (تیرہ افسانے)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۲ء
۱۹۔	''دست بستہ'' (بیس افسانے)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۳ء
۲۰۔	''دوسرا قدم'' (ڈراما)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۵ء
۲۱۔	''حوا کے نام'' (ڈراما)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۶ء
۲۲۔	''سورج مکھی'' (ڈراما)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۶ء
۲۳۔	''تماثیل'' (ڈراما)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۶ء
۲۴۔	''مردِ ابریشم'' (خاکہ)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	
۲۵۔	''دو آنے'' (بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	طبع ثانی: ۲۰۰۷ء
۲۶۔	''چہار چمن'' (چار ناولٹ)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۹ء
۲۷۔	''کچھ اور نہیں''	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	
۲۸۔	''آسے پاسے''	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	
۲۹۔	''سدھراں'' (پنجابی ٹی۔وی ڈرامے)	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	

مستقل پتا:

داستان سرائے، ۱۲۱۔C ماڈل ٹاؤن لاہور نمبر ۱۴ پاکستان۔

اعزاز:

تمغۂ امتیاز (برائے ادب) حکومت پاکستان کا سول اعزاز: ۱۹۸۳ء

نظریۂ فن:

''میرے افسانوں میں رومان سے زیادہ اُس کا تجزیہ ہوتا ہے۔'' بانو قدسیہ

(بہ حوالہ: ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' مرتبہ: طاہر مسعود صفحہ ۲۹۴)

انتر ہوت اُداسی

بانو قدسیہ

یہ پہلی بار تھی۔ اس کے بعد دو بار اور ایسے ہوا...... بالکل ایسے۔

جب میرا بایاں پاؤں بانس کی سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر تھا اور میرا دایاں پیر صحن کی کچی مٹی سے چھ انچ اونچا تھا تو پیچھے سے ماں نے میرے بال ایسے پکڑے جیسے نئے نئے چوزے پر چیل جھپٹتی ہے۔ میرا توازن کچھ ایسا بگڑا کہ میں کپڑے کی گڈی جیسی اڑنگ بڑنگ کچی مٹی پر جا گری۔ ماں کو مجھے پٹخنی دینے یا دھپا مارنے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ جب انسان کسی سے بچھڑ کر آ رہا ہو تو اس میں اتنی جان ہی کہاں ہوتی ہے۔ مجھے تو ایک گرم سانس اس وقت چاروں شانے گرا سکتا تھا۔ ماں نے تو پھر ہبکا مار کر میرے بال جھنجھوڑے تھے۔

''بول بول اس بھری دوپہر میں تو کہاں سے آ رہی ہے؟ گشتی الفتی کہاں تھی تو اس وقت؟ بول۔ گرمی ایسی کہ چھاؤں تلے دھرتی پھٹ جائے اور تو سحر کوٹھے پر کیا کر رہی تھی ناخصمی؟......''

میں چپ رہی۔

''بول کون ہے اوپر؟ اور نہ کوئی کمرہ نہ ٹٹی پھر اوپر کیا لینے گئی تھی تو؟ جس یار حمایتی سے ملنے گئی تھی اس کا میں لہو پی جاؤں گی۔ بول اس کا نام......؟''

میں اور بھی گونگی ہو گئی۔

میرا ابا بھی بڑا چپ آدمی تھا۔ لیکن اس کی چپ' اس کا گونگا پن' اس کے مرن برت سب ماں کو ستانے کے لئے ہوتے تھے۔ اسے ماں کو تڑپانے میں بڑا مزا ملتا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی مونچھوں تلے مسکراتا رہتا پر ماں کی کسی بات کا جواب نہ دیتا۔ وہ اس کچہری میں اپنی صفائی کے لئے کبھی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا۔ اسی چپ میں ابا کی ساری عزت اور زندگی بھر کی جیت پنہاں تھی۔ جب ماں بول بول کر ہلکان ہو جاتی: طعنے' بددعائیں' کوسنے' آہیں' سسکیاں سب باری باری اپنا اپنا دور ختم کر چکتیں تو ماں ہلکان ہو کر دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی آنگن میں بچھاتی اور

اس پر اوندھی لیٹ جاتی۔ ایسے میں باسی روٹی کی طرح اس کے چہرے پر ان گنت داغ دھبے نظر آنے لگتے۔ مجھے ماں پر بڑا ترس آتا۔ لیکن ابا مختلف تھا۔ عورت مرد کے اس کھیل میں جب وہ جیت چکتا۔ تو پھر چارخانے کا کھیس کندھے پر ڈال کر یوں نکل جاتا جیسے پہلوان اکھاڑے سے کشتی جیت کر جاتے ہیں۔ ماں میرے اور ابا کے درمیان بے طور ٹکرانے والی گیند تھی۔ مجھ دیوار سے ٹکراتی تو ٹپا کھا کر ابا کی طرف جاتی۔ وہاں پتھر سے سر پھوڑ کر پھر بڑک کر میری جانب آتی۔ ماں کی ساری عمر اسی بے مصرف پیش قدمی اور پسپائی میں گزر گئی اور ساری عمر اسے علم نہ ہو سکا کہ یہ کھیل صرف اسی کو تھکانے ڈالا تھا۔ بڑی رات گئے ابا لوٹتا تو ماں ایسی نیند سوئی ہوتی جو زچہ کو بچہ کی پیدائش کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ میں کنڈی کھولتی' ابا محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتا اور چپ چاپ اندر چلا جاتا۔ ابا کی ہر بات بن کہے مجھے سمجھ آتی تھی اور ماں کی باتیں ایسے تھیں جیسے گوندھے آٹے کی بھری تھالی پر اوپر ہی اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ میرے پلے کبھی کچھ نہ پڑا۔

ابا بڑا چپ آدمی تھا۔ لیکن ابا کی چپ میں ایک چال تھی۔

میں ابا کی طرح چپ نہیں۔ میری چپ حویلی کے صدر دروازے کے قدموں میں گرے ہوئے اس قفل کی مانند ہے جسے پچھلی رات چور دروازے کے کنڈے سے اتار کر پھینک گئے ہوں۔ ایسا تالا بہت کچھ کہتا ہے لیکن کوئی تفصیل بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ ساری واردات سے آگاہ ہوتا ہے لیکن اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حفاظت نہ کر سکنے کا غم' اپنی ہیچ میدانی کا احساس' اپنے مالکوں کے ساتھ گہری دغا بازی کا حیرت انگیز انکشاف اسے گم سم کر دیتا ہے۔ میری اور ابا کی چپ میں بڑا فرق تھا۔ ابا ان اونچے پہاڑوں کی طرح چپ تھا جن کے قدموں میں لہریں شور مچا مچا کر سو جاتی ہیں۔ میری چپ اس لاوے کی مانند تھی جو زمین کے اندر ابلتا' سڑتا' بہتا کہیں کا کہیں اتر جاتا ہے۔

''بول! چپ کیوں کھڑی ہے اپنے کپتے باپ کی طرح...... بول کس یار کی بغل گرم کر کے آئی ہے نامراد؟......'' اسی مصیبت کے ہاتھوں ابا نے کچھ سال پہلے بڑی لمبی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ صفائیاں پیش کرنے کے جھنجھٹ سے فارغ ہو کر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ میں ماں کو کیا بتاتی؟ کہاں سے شروع کرتی؟ اور کہاں جا کر ختم کرتی؟

''کتی! ہمارا کوٹھا سارے محلے سے نیچا ہے۔ کس کس نے تجھے آتے جاتے نہ دیکھا ہوگا...... بول؟ کتنے عرصے سے یہ سلسلہ جاری ہے؟ کون سا مہینہ لگا ہے؟ کوئی ڈاکٹر دائی تو کر مروں عزت گنوانے سے پہلے......؟''

یکدم آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے بھی میری چوٹی پکڑ کر یہی کہا تھا۔ میں اماں کو کیا بتاتی کہ ابھی ابھی میں اس کے منہ سے بھی یہی سن کر آئی تھی۔ ''بول' بتاتی کیوں نہیں' روئے کیوں جاتی ہے۔ کسی ڈاکٹرنی کی ضرورت ہے تو خرچ میں کروں گا۔ بول روتی کیوں جاتی ہے۔ کچھ بتاتی کیوں نہیں؟'' نہ میں اسے کچھ بتا سکی اور نہ اماں کو...... بچپن سے مجھے یوں لگتا ہے کہ اگر میں نے کسی سے کچھ کہا تو سمجھے گا نہیں' الٹا نہ سمجھ کر میرا دشمن ہو جائے گا۔

میں کچی مٹی سے اٹھی اور اندر غسل خانے میں چلی گئی۔

ماں کچھ دیر دروازہ دھڑ دھڑاتی رہی۔ پھر طعنے' کوسنے' بددعائیں جاری ہوئیں' ان کا سٹاک ختم ہو گیا تو وہ دیر تک دروازے کے ساتھ لگ کر روتی رہی۔ پھر اس نے اپنی پرانی تکنیک استعمال کی۔ آنگن میں چارپائی پر لیٹ گئی اور میرے پیدا ہونے سے لے کر آج تک کے تمام واقعات اونچے اونچے دہرانے لگی۔ میرا حمل اس پر کیسا بھاری تھا؟ مجھے جننے میں اس نے کیسی دردزہ برداشت کی تھی۔ پھر کیسے چھلّے میں مجھے

خسرہ نکل آئی اور وہ پورے انیس دن پلنگ پر بیٹھی رہی گود میں لے کر ...... مجھے پالنے پوسنے میں اسے جو جو مصیبت' مرحلے' قربانیاں درپیش رہیں ان کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے کرتے شام ڈھل گئی۔

جب میں باہر نکلی تو ماں کی ساری گیس نکل چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹے معصوم بچے کی طرح الانی چارپائی پر گھوک سو رہی تھی اور اس کی بائیں گال پر بان کی رسیوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ شام کو نیم کے درخت پر ان گنت چڑیاں چہچہا رہی تھیں لیکن ماں کو ان کے شور کا علم نہ تھا۔ ایسے میں اگر میں کسی کے ساتھ بھاگ جاتی تو بھی ماں کو علم نہ ہوتا۔ لیکن میں بھاگتی کس کے ساتھ؟ جن عورتوں کو مرد بھگا لے جاتے ہیں خدا جانے وہ کیسی ہوتی ہیں؟ ہم جیسی لڑکیوں سے تو کوئی بھگا لے جانے کا وعدہ بھی نہیں کرتا۔

میں چپ چاپ چارپائی کے پائے سے سر جوڑ کر بیٹھ گئی' ماں کے سوائے اس دنیا میں میرا تھا بھی کون۔ ابا کا بھی سوائے ماں کے دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لاکھ بار گھر سے گیا اور پھر اس لئے لوٹ آیا کہ اس کھوٹے سکے کو سنبھال کر رکھنے والی ایک ہی تجوری تھی۔ میرا ابا اتنا کھٹو تھا' اتنا کھٹو تھا' اتنا کھٹو تھا کہ منہ پر جھولنے والی مکھیاں بھی بالآخر اسے چھوڑ جاتیں۔ وہ بہت کم کھاتا تھا کیونکہ اسے نوالے توڑنے سے وحشت ہوتی تھی۔ آدھے پنڈے سے زیادہ کو کبھی وہ ایک وقت میں صابن نہیں لگا سکا اسی لئے وہ نہانے سے جی کتراتا تھا۔ سردیوں میں بغیر لحاف کے پڑا رہتا۔ گرمیوں میں پسینے میں نہائے نظر آتا لیکن پنکھا کبھی نہ جھلتا۔ ابا اس کھتی سے مشابہہ تھا جو بچے گلی ڈنڈا کھیلتے وقت کھود لیتے ہیں۔ کبھی کبھی برساتی پانی اس میں آپ ہی آپ بھر جاتا ہے ورنہ زیادہ عمر اس کی منہ کھولے ہی گزرتی ہے۔

ماں نے ساری عمر ابا کا ساتھ دیا۔ بول کر' طعنے دے کر' ہلکان ہو کر' سسکیاں بھر کر' دیا' رو دیا۔

ہم دونوں پکی دیواروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر ماں بوڑھی ہو گئی ...... اس بوڑھی نیم جان' گھائل کو میں کیا بتاتی۔ کہاں سے بات شروع کرتی اور کہاں جا کر ختم کرتی۔

ہمارے گھر میں ہر اس چیز کا فقدان تھا جس سے زندگی پروان چڑھتی ہے' سرشار ہوتی ہے۔ دولت' شرافت' محبت' ان چیزوں کا ہمیشہ گھاٹا ٹوٹا رہا۔ ہمیں تو ہر چیز ایسے ملی کہ سانسیں قائم رہیں۔ لیکن زندگی کے آثار کھل کر پیدا نہ ہوئے۔ جب میں تین سال کی ہوئی تب سے ماں ایک قریبی فیکٹری میں کام کرنے جانے لگی تھی۔ ابا اور میں گھر پر رہتے تھے۔ ہم دونوں اپنی اپنی چپ کے قلعے میں بند سارا دن پاس رہتے ہوئے بھی بہت دور دور رہتے۔ جب ابا گھر پر ہوتا تو یوں لگتا تھا جیسے کہیں باہر گیا ہوا ہے اور جب وہ باہر ہوتا تو لگتا تھا کہ ادھر ادھر ہی کہیں ہوگا۔

کچھ عرصہ میں اسکول جاتی رہی' پھر یہ سلسلہ خرچ کی زیادتی کے باعث بند ہو گیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کیونکہ اسکول مجھے دل سے برا لگتا تھا۔ وہاں سب لڑکیاں بڑی خوش خوش آتی تھیں۔ ان کے پاس بتانے کے لئے اتنی ساری باتیں ہوتی تھیں کہ وہ اُستانی کے پڑھاتے وقت بھی رقعوں پر پیغامات لکھ لکھ کر ایک دوسرے کو پہنچاتی رہتی تھیں۔ مجھے میری کلاس کی لڑکیاں ''بل بتوری ناساں چوڑی'' چھیڑتی تھیں۔ لیکن میں ان کو کبھی پلٹ کر کچھ نہ کہتی تھی۔ ان کی چھیڑ چھاڑ اس طعن و تشنیع کے مقابلے میں پھول کی چھڑی تھی جس سے میرا ابا میری تواضع کیا کرتا تھا۔

اسکول سے ہٹ کر میری زندگی پھر کنویں کی مال بن گئی۔ ہر وقت وہی صبح و شام' وہی چلو بھر پانی' وہی چوبچہ بھر زندگی' کبھی سیری نہیں۔

پھر ابا مر گیا۔

اس رات اس نے چارخانے والا کمبل اوڑھا' اپنی خاموشی کی مسہری تانی اور پھر ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔ ماں دنگ سی رہ گئی۔ نہ اس نے اونچے اونچے بین ڈالے نہ دیواروں سے ٹکرائی۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے وہ بنجر زمین کی طرح تڑخ گئی۔ ہمارے نہ کوئی رشتہ دار آئے' نہ قرآن

ختم ہوئے نہ گٹھلیاں پڑھی گئیں۔ بس محلے والوں نے چندہ کر کے ماں کے سر سے بوجھ اٹھا دیا' اور سوئم کے بعد ماں پھر فیکٹری جانے لگی۔

اب ابا ہر وقت گھر میں رہنے لگا۔

اس ابا سے خوف زدہ ہو کر میں کوٹھے پر چڑھ جاتی۔ ہمارے گھر کی چھت پر اونچی اونچی منڈیریں نہیں تھیں۔ بس ابھرواں کنارے تھے جن کی سوکھی مٹی میں تنکے چمکتے رہتے ہیں۔ اس کنارے پر بیٹھے ہوئے مجھے نکڑ سے آتی ماں دکھائی دیتی تو میں نیچے چلی آتی۔ محلے میں بہت لڑکیاں تھیں لیکن میری چُپ کا تالا کھول کھول کر وہ سب بیزار ہو چکی تھیں۔ اب میں تھی اور کوٹھے کی منڈیر' آسمان پر اڑنے والی چیلیں' محلے کے کبوتر اور شام کو لوٹنے والی کوؤں کی قطاریں۔

ایک روز چوتھے کوٹھے سے مجھے سیٹی کی آواز سنائی دی۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ سیٹی بجانے والا قدیر کھوکھے والا ہے۔ تب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قدیر کے پانچ بچے ہیں اور اس کی بیوی محلے کی سب سے خوبصورت عورت ہے۔ مجھے تو صرف اتنا دکھائی دے رہا تھا کہ قدیر کا پکا گھر سارے محلے میں خوبصورت اور اونچا تھا۔ اس کی کھڑکیوں میں پردے تھے اور اس کی دیواروں پر جالیاں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر ایک ہوادار کمرہ تھا جس کی کھڑکیوں پر نیم فیروزی' نیم ہرا' تازہ تازہ رنگ کیا ہوا تھا۔

یہی کمرہ میرا پہلا گھر بنا۔ اسی کمرے میں پہلی بار قدیر نے مجھے اپنے کھوکھے سے لا کر ٹھنڈی کوکا کولا پلائی۔ پلاسٹک کے کلپ' نقلی ہار' کانچ کی چوڑیاں اور ناک میں ڈالنے والا بڑا چمکدار لیکن جھوٹا کوکا دیا۔ قدیر کی ہر بات اپنے کھوکھے کی طرح تھی۔ وہ تھوڑی قیمت پر زیادہ مال خریدنے کا عادی تھی۔ اس کے ہاں ادھار قطعی بند تھا اور وہ کسی گاہک کو بھی ناراضگی کا موقع نہیں دیتا تھا۔

پتا نہیں میں ابا کے ڈر سے وہاں جاتی تھی؟

پتا نہیں جوانی میں تنہائی کا سانپ کیوں ایسے بلوں میں لے گھستا ہے؟

خدا جانے میری طغیانی جی بھر کر کچھ کھانے' کچھ ہنس لینے' کچھ وقت جھوٹی بھر کر گزارنے کی خواہش مجھے وہاں کھینچ کر لے جاتی تھی۔ غالباً کبھی کبھی کوئی وجہ نہیں بھی ہوتی۔ بس یونہی انسان زندگی کے پہیے میں ریشم کے تھان کی طرح الجھتا چلا جاتا ہے۔ قدیر کو اپنے خاندان سے بڑی محبت تھی۔ وہ ماسیوں' پھوپھیوں' ہم زلفوں کی باتیں کرتا تھکتا نہ تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بھی بڑی محبت تھی کیونکہ اس کی بیوی اس کے خاندان کا ایک اہم حصہ تھی۔ وہ وصال کے لمحوں میں بھی اسی کا نام لے لے کر مجھ سے لپٹتا رہتا۔ اس کی محبت پھوکے انداز کی تھی جس سے میرے لہو کا طائر کبھی بھی زخمی ہو کر نہ گرتا۔ بلکہ اوپر ہی اوپر...... اور اوپر اڑتا چلا جاتا۔

اپنے بچوں کی باتیں کر کے قدیر کو بڑی خوشی ملتی تھی۔ اپنی خاندانی روایات کا' اپنی محلے کی ساکھ اور برادری کی عزت کا اسے بڑا پاس تھا۔ قدیر بھی دراصل طغیانی سے ناآشنا تھا۔ اس کی ساری زندگی بھی معاشرے کے پیمانوں میں ناپ تول کر گزری تھی۔ وہ اتنی چھوٹی عمر سے کھوکھا چلا رہا تھا کہ اب اس کی اپنی زندگی خالی کھوکھے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ ان سب قیود کے باوجود وہ بڑے اہتمام سے مجھے ملتا تھا' وہ بڑے حساب سے اپنے کھوکھے سے ایسی چیزیں میرے لئے لاتا جو اس کے بال بچوں کی حق تلفی نہ کرتیں۔ وہ اپنی زندگی کی لذتیں یوں اکٹھی کرتا تھا جیسے کوئی بڑی بی حساب کا پان لگا رہی ہو۔ برابر کا چونا' برابر کا کتھا' چٹکی بھر زردہ۔ اس کی جذباتی زندگی بھی ایک خاص پیمانے پر چلتی تھی۔ نہ یہاں کوئی ادھار تھا نہ فضول خرچی...... وہ جو کچھ مجھے دیتا فوراً اس کی قیمت وصول کر لیتا۔

لیکن میری بول نکارے والی ماں یہ سب کچھ کیسے سمجھ سکتی تھی؟

جب بڑی شام گئے اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میں سمجھی شدید غم نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے۔ لیکن پھر وہ میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی "بول بدبخت کون سا مہینہ لگا ہے تجھے؟ بول مر؟" میں اسے کیسے سمجھاتی کہ ایسے لکھے داروں کے ساتھ مہینے نہیں چڑھا کرتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ نہ کبھی نفع ہوتا ہے نہ نقصان۔ صرف زندگی کا بہی کھاتہ ایسے ہندسوں سے بھر جاتا ہے جنہیں کوئی پڑھ نہیں سکتا۔

"بول' پھر ملے گی تو اس سے...... بول؟"

پورے ہاتھ کا چانٹا آیا اور بجلی کی طرح میرے جسم سے گزر گیا۔ میں ماں کو کیا بتاتی کہ مجھے قدیر سے ملنے کا کچھ ایسا شوق بھی نہیں تھا۔ یہ بات اگر میں قدیر یا ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتی تو غالباً وہ دونوں مجھے جان سے مار دیتے۔

"بول گشتی...... بول حرام خور! ملے گی اس سے......؟

میں نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔ اپنے دکھ کی وجہ سے نہیں۔ میرے اپنے کوئی دکھ نہیں تھے۔ لیکن میں اسے اس قدر ہلکان ہوتے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اگر وہ مجھے مارتی رہتی تو شاید مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ لیکن اب وہ اپنے منہ پر چانٹے مار رہی تھی۔ اپنے بال کھسوٹ رہی تھی۔ اسے یوں اپنے سے بدلہ لیتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔

میں نے بڑی قسمیں کھائیں کہ پھر قدیر سے نہ ملوں گی۔ قرآن اٹھایا۔ اس کے بعد میں کبھی قدیر کے کوٹھے پر نہیں گئی۔ لیکن ماں چونکہ سارا دن فیکٹری میں کام کرتی تھی اس لئے اسے کبھی یقین نہ آسکا کہ میرے عہد سچے تھے۔ وہ مجھ سے بڑی محتاط ہو گئی تھی۔ جب میں سو جاتی تو وہ چوری چوری آ کر میری قمیص میرے پیٹ سے اٹھاتی اور بڑے پولے پولے ہاتھوں سے میرے پیٹ کی ٹوہ لیتی۔ اسے پورا شک تھا کہ یہ اندر ہی اندر بڑھ رہا ہے۔ کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر وہ میرے سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے رونے لگتی' جیسے بلیاں مستی میں آ کر بولتی ہیں۔

قدیر نے میرے کھاتے کو پھر کبھی نہ کھولا۔

نہ میں کبھی اس کے کوٹھے پر گئی۔ ڈوبی رقم پر وہ زیادہ وقت ضائع کرنے کا عادی نہ تھا۔

اتنے سارے میل جول کے باوجود نہ کوئی نفع ہوا نہ نقصان...... زندگی چلو بھر پانی کھینچتی رہی۔ نہ کوئی طغیانی آئی' نہ سیری کا احساس بڑھا۔ بس صرف سانس کی ڈوری نہ ٹوٹی۔

پھر ایک دن فیکٹری سے ماں بڑی خوش لوٹی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ تھا۔

"لے کھا ہاجرہ...... کھا...... تیرے تو نصیب کھل گئے آ چندر یے مٹھائی کھا۔ تیری بات پکی کر کے آئی ہوں بادامی باغ میں......"

بات پکی کرانے کا شوق میرے دل میں قدیر نے ڈالا۔ وہ اتنی پریت سے اپنی بیوی کی باتیں کیا کرتا تھا کہ میرا دل بھی کرتا کوئی میرے متعلق ایسی ہی باتیں کیا کرے۔ میرا خیال تھا کہ ایک روز مجھے دیکھنے والیاں آئیں گی۔ پھر ایک سہرے والا چہرے پر رومال رکھے آئے گا۔ میں اس کے چمکدار بوٹوں کو دیکھتی گھر سے رخصت ہو جاؤں گی۔ مجھے جنگل کے اس پار جانے کا بڑا شوق تھا۔

"آ...... منہ لپیٹ کر نہ پڑی رہا کر۔ تیرا انتظام تو اللہ نے خود کیا۔ منیجر صاحب کی بیوی خود میرے پاس آئی۔"

"سن رہی ہے ہاجرہ؟...... نازاں پٹی...... سن رہی ہے......؟"

"سن رہی ہوں ماں......"

''پھر خوش کیوں نہیں ہوتی......؟''

''خوش ہو رہی ہوں...... ماں''

ماں رازداری سے میرے پاس آ کر بیٹھی ہوئی آواز میں بولی...... ''منیجر کی بیوی بولی میری بہن کا بیٹا ہے۔ پڑھا لکھا تو نہیں ہے' پر جائیداد کا اکیلا وارث ہے۔ ہم تو جائیداد کا لفظ بھی منہ سے نہیں لے سکتے' تو جائیداد والی ہو جائے گی۔ میں خود بادامی باغ گئی تھی منیجر صاحب کی کار میں' گھر دیکھ کر آ رہی ہوں۔ پکی حویلی ہے دو منزلہ۔ پنکھے' ریڈیو' ٹیلی ویژن' قالین' سب کچھ ہے گھر میں...... لے لڈو کھا۔ اوپر والی منزل میں لڑکا رہتا ہے۔ بڑا گھر ہے' ساری عمر ریشم پہنے گی۔ اس کچے کوٹھے کے عذابوں سے بچی رہے گی۔

خوش ہو جا...... جس کا کوئی سدھارنے والا نہ ہو' رب اس کے کام کرتا ہے...... رج کھا رج سونا......''

بڑی دیر بعد میں نے پوچھا...... ''اور وہ...... وہ کیسا ہے......؟''

''جیسا گھر ہوتا ہے ویسے لوگ ہوتے ہیں اس میں رہنے والے۔ ایسے گھروں میں کوئی ہما شما تھوڑی رہتے ہیں۔''

''کیسی شکل ہے اس کی......''

''ماں خوبصورت ہے تو بیٹا بھی خوبصورت ہوگا۔ گوری چٹی' یہ بڑا سا کوکا ناک میں' پورا بازو چوڑیوں سے بھرا ہوا۔ کوئی پیاری باتیں کرتی ہے ہاجرہ' کوئی پیاری باتیں کرتی ہے۔ بیٹھیے بہن جی...... کھائیے بہن جی' یہ گدی کمر کے پیچھے رکھ لیں۔ ٹھنڈا پئیں گی کہ گرم...... میرا تو جی وہاں سے آنے کو نہیں کرتا تھا' سچ ہاجرہ......''

میں چپ رہی۔

''بادامی باغ والی کہہ رہی تھی ہاجرہ! بہن جی ہمیں صرف لڑکی چاہیے جو ہمارے گڈو کو خوش رکھے' اس سے ہمدردی کرے' اس کا دل لگائے۔ ہمیں کسی چیز کی طمع نہیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے' اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اگر ہمیں لالچ ہوتا تو ہم امیروں کی لڑکی کبھی کی لے آتے۔ ہمیں تو یہ پتا ہے غریبوں میں غیرت ہوتی ہے' محبت ہوتی ہے' شرافت ہوتی ہے......''

میں اندر ہی اندر ہنس دی۔ بادامی باغ والی نہیں جانتی تھی کہ ان ہی تینوں کے فقدان سے غریبی پیدا ہوتی ہے...... دولت کا فقدان تو فقط غریبی کو سدا بہار بناتا ہے۔ اصلی بہار تو ان تینوں ہی کے نہ ہونے سے ہوا کرتی ہے۔

''لے موئے کھا...... اصلی موتی چور کے لڈو ہیں' لے کھا......''

اماں اس روز بڑی خوش تھی۔ وہ ہانڈی بھونتے ہوئے کچھ گنگناتی رہی۔ پھر محلے والوں کو یہ خبر سنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کا چہرہ دغ دغ کر رہا تھا۔ میں نے ماں کو اس قدر خوش کبھی نہیں دیکھا۔ نکاح سے ایک رات پہلے تو ماں اسی طرح ہنستی گنگناتی رہی۔ شادی سے ایک دن پہلے جب شام کو بادامی باغ سے لوٹی تو اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا اور وہ چپ چپ تھی۔ مشکل سے وہ سوٹ کیس لا کر آنگن میں رکھا جس میں کپڑے اور زیور تھے۔ اس کے بعد وہ بغیر مجھے آواز دیئے اندر غسل خانے میں چلی گئی۔ نہ اس نے سوٹ کیس کھول کر مجھے کپڑا زیور دکھائے' نہ منہ سے کچھ بولی۔ اس رات کے بعد میری ماں نے پھر مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

آدھی رات کو میں اس کی سسکیوں کی آواز سن کر جاگ گئی۔ وہ سوٹ کیس کھولے کپڑوں کو گھور رہی تھی۔

''کیا ہوا اماں......؟''

''کچھ نہیں تو سوچا......''

''پھر تو رو کیوں رہی ہے......؟''

ماں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے طعنے کو سنے بددعائیں زندہ ہوا کرتی تھیں۔ آج مجھے اس بغلگیری سے یوں لگا گویا اس کی جان جسم چھوڑ رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے بچھڑنے کا غم کر رہی ہے۔ لیکن میرا اپنا دل ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔ یہاں نہ کسی سے ملنے کی خوشی تھی' نہ کسی سے بچھڑنے کا رنج۔ میری زندگی کے ماہ و سال تو یوں گزرے تھے جیسے کسی گودام میں نئے سال کا کیلنڈر لٹکا لٹکا پرانے سالوں سے جا ملے۔

ماں صبح تک مجھ سے لپٹی رہی اور روتی رہی اور جب میری شادی کا دن طلوع ہوا اور اس کی پہلی سفیدی ابھرنے لگی تو ماں بولی......

''دیکھ ہاجرہ! نصیب سے نہ جھگڑنا۔ عورت کی ساری زندگی نصیب سے چلتی ہے۔ مجھے دیکھ تیرہ برس کی بیاہی آئی تھی۔ ایک دن شوہر کی کمائی کا چھوٹا پیسہ تک نہیں ملا۔ ایک دن اس گھر کے مالک نے مجھے بچی بھر پیار بھی نہیں دیا۔ پر رانئے میں نے نصیب سے جھگڑا نہیں کیا۔ جو میرے کرم اچھے ہوتے تو سب کچھ مل جاتا' ہاتھ پاؤں مارے بغیر مل جاتا۔ سنتی ہے کہ نہیں؟ کسی کو اللہ دولت دیتا ہے تو اولاد نہیں دیتا' اولاد ہوتی ہے تو صحت نہیں ملتی۔ اتنے تارے اللہ نے نہیں بنائے جتنے غم بنائے ہیں۔ سب اپنے اپنے تارے کا غم سہنے کو آئے ہیں اس جہان میں۔'' پہلی بار مجھے شک گزرا جیسے ماں مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے' مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے' کیونکہ ان دونوں کی اسے عادت نہیں تھی۔

''کیا بات ہے ماں......؟''

''کوئی بات نہیں۔ ہر ماں بیٹی کو کچھ نہ کچھ ساتھ دیتی ہے۔ میں تجھے جہیز تو دے نہیں سکتی۔ دلاسہ بھی دے کر رخصت نہ کروں......''

مجھے رونا آ گیا اور میں ماں سے لپٹ گئی......

''جب میں یہاں سے فیکٹری جاتی ہوں تو راستے میں کئی مین ہول کھلے ملتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں ان میں راہ گیر گر بھی پڑتے ہیں۔ ہاجرہ! یوں سمجھ لے سوچیے ہمارے رب نے ہر چوڑائی کے' ہر گہرائی کے مین ہول بچھا رکھے ہیں اپنی دنیا میں۔ آخر آدمی کب تک بچے گا۔ بندہ بشر ہے لمبی سیاہ زندگی ہے' کسی نہ کسی کھڈ میں تو گر کر ہی رہے گا......؟''

''تو مجھے صاف صاف بتاتی کیوں نہیں کیا بات ہے؟ ......ہوا کیا ہے...؟''

''کوئی بات نہیں' کچھ نہیں ہوا۔ نیا گھر ہوگا' نئے لوگ ہوں گے۔ وہاں تیری ماں نہیں ہوگی لیکن غریبی بھی نہیں ہوگی۔ ہر جگہ کا اپنا سکھ ہے' اپنا دکھ ہے۔ جو لڑکی میکے کے سکھ یاد کرتی رہے وہ کبھی سسرال گھر جا کر خوش نہیں ہوتی......''

''تجھے کسی نے کچھ کہا ہے ماں؟......بتا تو بتاتی کیوں نہیں......؟''

میری ماں چپ رہی۔ اس کی چپ میری اور ابا کی چپ سے بھی اٹل تھی...... کیونکہ شادی کی دوسری رات میری ماں چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میری سسرال والوں نے خاموشی سے اس کو سپرد خاک کر دیا اور مجھ کو نہ بتایا۔ وہ مجھے دو صدمے ایک ہی وقت میں نہ دینا چاہتے تھے۔

جس طرح ست ماہے بچے کو مصنوعی حرارت میں رکھ کر اس دنیا میں رہنے کے قابل بناتے ہیں' اسی طرح میری سسرال والوں نے مجھے آسائش' آرام اور بڑی چاپلوسی کی روئی میں بچا بچا کر کئی دن رکھا تا کہ گند سے بہت پہلے میں اس گھر کی دولت بھری زندگی کی عادی ہو

جاؤں۔ جتنے دن گھر میں مہمان رہے' یہی سننے میں آیا کہ گڈو بیمار ہے اور نچلی منزل میں اپنی ماں کے کمرے میں ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ ایک نظر گڈو کو دیکھ آؤں' اس کی بیمار پرسی کروں' پر دوسری منزل سے نیچے جانے کی ہمت پیدا نہ ہوئی۔

میری ساس میری ماں کا الٹ تھی۔ گوری گوری' گول گول...... چپ چپ سی' بڑی صابر' بڑی برداشت والی' کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنا غم ہوتا کہ مجھے اس سے ڈر آنے لگتا۔ ماں کی موت کے بعد سب سے پہلے میری ساس نے میرا دل جیت لیا۔ وہ چپ چپ بیٹھی ہوتی تو مجھے بڑا دکھ ہوتا' جیسے ماں کو دیکھ کر ہوتا تھا۔

جس رات پہلی بار میں گڈو سے ملی' دیر تک ساس میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس کا ہاتھ میرے گھٹنے پر تھا اور وہ بار بار اسے تھپک رہی تھی۔ وہ جس بات کا سرا پکڑتی' بیچ میں ادھورا چھوڑ کر چپ چاپ میرا منہ تکنے لگتی۔

''گڈو صاحب کا اب کیا حال ہے جی؟......''

''ٹھیک ہے اب تو' آج آئے گا تیرے پاس......''

ان دیکھے دولہے کی آرزو روشن سورج کی طرح میرے دل سے طلوع ہوگئی۔

''کبھی کبھی جو تصور عورت دولہے کا بناتی ہے ہاجرہ! دولہا اس سے مختلف ہوتا ہے۔ پر ساری چیز عورت کا جذبہ ہے...... گھر عورت بناتی ہے' بچے عورت جنتی ہے۔ مرد تو ایسے ہی گھر کے باہر نام کی تختی ہوتی ہے......''

میرا دل پہلی بار ڈرا...... لیکن پھر میں نے سوچا گڈو شاید بدصورت ہو اسی لئے یہ تمہید باندھ رہی ہے' شاید اتنے دن اسی لئے اسے میرے پاس آنے بھی نہیں دیا۔ لیکن میری ساس کو شاید علم نہ تھا کہ اتنے دن سسرال میں رہ کر میں پریشان ہوگئی تھی۔ اب مجھے اچھے برے آدمی کی پہچان نہ رہی تھی۔ مجھے اپنا شوہر درکار تھا۔

بڑی دیر تک ساس یونہی بے مصرف چپ چاپ میرے پاس بیٹھی رہی۔ پھر جب وہ آدھی دہلیز کے اندر اور آدھی باہر تھی' تب وہ بولی ''سن ہاجرہ! ہم لوگ تیری بڑی قدر کریں گے' صرف تو گڈو کی قدر کرنا۔ وہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے' پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی۔ دیکھ بیٹی! جو کچھ وہ تجھے نہ دے سکے تو ہم سے مانگنا۔ میرے پاس گڈو سے اور کوئی قیمتی چیز نہیں ہے......''

میں اپنی ساس کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پر وہ جیسے اپنے دل کی بھٹی کو آنسوؤں اور باتوں سے ٹھنڈا کر رہی تھی...... ''میرے رشتہ داروں میں لڑکیوں کا کال نہیں ہے۔ لیکن میں غریب گھر کی لڑکی اس لئے لائی کہ غریبوں میں ہمدردی ہوتی ہے...... وہ محبت کرنا جانتے ہیں۔ اب گڈو جیسا بھی ہے تیرا ہے ہاجرہ...... جیسا بھی ہے......صرف تیرا ہے......!''

میری ساس جلدی سے رخصت ہوگئی۔

اس کی بات ٹھیک تھی کہ گڈو صرف میرا تھا۔ لیکن افسوس میں اس کی اتنی بھی نہ ہوسکی جتنی میں قدر کی تھی۔

رات کے پچھلے پہر گڈو کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے باہر کچھ کھسر پھسر ہوتی رہی' پھر گڈو اندر آیا۔ وہ اندر آتے ہی مجھے ایسے چمٹا جیسے بچھو درخت سے چھپکی ڈالتا ہے۔ اس کے پیچھے میری ساس اور بڑی دو نندیں کھڑی تھیں۔

''لتاں میری دلھن...... میری بیوی...... میری لتاں جی پاری پاری دلھن جی......''

میری ساس نندوں نے جلدی سے اسے مجھ سے جدا کر دیا۔

''کیا کر رہا ہے گڈو...... !''

''دیکھو دلھن! یہ مجھے تمہارے پاس نہیں آنے دیتی تھیں۔ کہتی تھیں دولہن بھاگ جائے گی۔ تو بھاگے گی؟ بتا میں کوئی برا ہوں...... میں اپنا قاعدہ لا کر تمہیں سناؤں؟ کہاں ہے میرا قاعدہ...... لاؤ...... لاتے کیوں نہیں؟ میں دلھن کو قاعدہ سناؤں۔''

میری ساس نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ رونے لگا۔

''سب مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں ہم تمہارا بھلا کر رہے ہیں۔ میں کیوں چپ رہوں بڑی آپا۔ تم چپ ہو جاؤ، تم دفع ہو جاؤ۔ میری دولہن ہے۔ میں اس سے بولوں گا...... بولوں گا...... ہاں بولوں گا......''

ڈھیلی مسہری کبھی کبھی بانسوں کے ساتھ باندھ کر لگانی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ایک سرے پر ڈنڈوں کا کر اس ٹھیک کرو تو دوسرے سرے کے ڈنڈے سرک کر پائیوں کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی میری ساس نندیں تو تھمو کر کے گڈو کو انسان کے روپ میں پیش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ڈھیلی مسہری مجھ پر تان کر جلدی سے نیچے چلی گئیں۔ ان کا خیال تھا خطرے سے اوجھل ہوتے ہی خطرہ ٹل جائے گا۔

یہ آغاز تھا۔

مین ہول میں گرنے کا آغاز۔

ایک نیم دیوانے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز۔ میں نے اتنی عمر بغیر اچھا کھائے پیئے گزاری تھی کہ اگر گڈو عام سا دیوانہ ہوتا تو شاید میں بڑی رضا و رغبت سے آسائش اور دولت کی زندگی میں ڈوب جاتی۔ لیکن گڈو دیوانہ ہونے کے ساتھ عاشق مزاج بھی تھا۔

اسے بغلگیر ہونے، چومنے، مساس کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ میں سارا سارا دن اس کے ساتھ پلنگ پر پڑی رہوں۔ وہ ناشتے کی میز سے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگتا ......

گڈو ناشتہ کرنے دے ہاجرہ کو......''

''ایک بات ہے امی...... میری پالی امی! پرائیویٹ بات۔ کمرے میں کرنے والی۔''

''ٹوسٹ تو ختم کر لینے دے بیچاری کو۔'' میری بڑی نند کہتی۔

پھر وہ سب کے سامنے میرے کان میں منہ ٹھونس کر ایک آدھ ایسی بات کہتا جو سب کو سنائی دیتی اور جس کا تعلق جسم کے ایسے حصوں سے ہوتا جن کا ذکر عام طور پر لوگ نہیں کیا کرتے۔

''اٹھ ناں ضروری کام ہے......''

''تو چل، ابھی آ جائے گی ابھی......''

وہ مجھے دوپٹے سے گھسیٹنا شروع کر دیتا۔

''جلدی چل...... چل ناں......''

کمرے میں پہنچ کر میرا اچنکارنا بولنا، اسے پرے پرے کرنا سب بیکار تھا۔ وہ بندروں کی طرح اچک اچک کر مجھے چومنے لگتا۔ میں زیور کپڑا اتارنے میں حجت کرتی تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتا۔ ایسے ہی لمحوں میں گڈو مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ کیوں کہ اس

سنہری بالوں والے دیوانے کو روتا دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے رحم کے اندر کہیں دکھ کی ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور میرا جی اسے گود میں اٹھانے کو چاہتا۔

عجیب سے دن تھے' عجیب سی راتیں۔ تیز بخار میں آنے والے خوابوں کی طرح ان کا حجم' ان کی جسامت کچھ بھی درست نہ تھا۔ نہ جانے دن کو سورج نکلتا بھی تھا کہ نہیں' خدا جانے راتوں کو اندھیرا ہوتا بھی تھا کہ نہیں۔ میری ساس میری آؤ بھگت میں لگی رہتی تھی' نئے نئے زیور' خوبصورت کپڑے آتے رہتے تھے۔ میری نندیں مجھ سے شرمندہ شرمندہ پرے پرے رہتی تھیں۔ میرا سسر البتہ کبھی کبھی مجھے پاس بٹھا کر زندگی کی اونچ نیچ سمجھایا کرتا تھا۔

گڈو پر کبھی کبھی سیانے پن کے دورے پڑتے تو مجھے بڑی امید بندھ جاتی۔ شاید کوئی معجزہ کوئی کرامت ہو جائے۔ ایسے دنوں میں کوئی گڈو کو پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سر پر ٹوپی پہن کر' بازو پر جائے نماز لٹکائے میرے پاس آتا' اور بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا...... دیکھ ہاجرہ! میں مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے جارہا ہوں' تم کھانا کھا کر سو جانا' بیٹھی انتظار نہ کرتی رہنا۔''

پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی کی ایسی نارمل بات سن کر میری ساس کا لب ولہجہ نارمل ہو جاتا۔ ''سو جائے گی سو جائے گی' تم فکر نہ کرو' تم آرام سے نماز پڑھنے جاؤ......''

واپسی پر وہ سب کو سلام کر کے اپنے کمرے میں آتا۔ بڑی دیر تک وہ ایک معمر آدمی کی طرح دانت صاف کرتا رہتا۔ پھر صوفے میں بیٹھ کر بیڈ لیمپ کی روشنی میں وہ کتابیں دیکھتا رہتا جن کا پڑھنا اس کے لئے مشکل تھا۔ بڑی رات گئے وہ پلنگ پر آتا اور میری طرف پیٹھ کر کے سو جاتا۔ فرزانہ ہوتے ہی اسے مجھ سے کوئی غرض نہ رہتی تھی۔

ایسے ہی دنوں میں وہ بڑے تواتر کے ساتھ میرے سسر کے ساتھ فیکٹری جانے لگتا۔ واپسی پر خاموشی سے کھانا کھاتا' فیکٹری کے مسائل پر گفتگو کرتا اور پھر مجھے ملے بغیر سینما دیکھنے چلا جاتا۔

ان دنوں میری ساس زمین سے دو دو فٹ اونچا چلنے لگتیں۔

''ہم نے سب کچھ گڈو کے نام منتقل کروا دیا ہے ہاجرہ! کوٹھی' مربعے' فیکٹری' سب کچھ یہ سب تو اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی' سب کچھ تیرا ہے...... میرا اور گڈو کا۔''

یہ دن بڑے پرسکون ہوتے تھے۔

اگر میں غلطی سے اسے کسی کے سامنے ہاتھ بھی لگا لیتی تو وہ بدک جاتا' ذرا آواز گرا کر کہتا...... ''کیا کرتی ہے ہاجرہ! کسی کا لحاظ بھی نہیں تمہیں' میری جوان بہنیں دیکھتی ہیں......''

لیکن یہ دن زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ ازلی درد کی طرح کسی صبح اٹھتے ہی گڈو اپنے چولے کو اتار اصلی روپ میں آ جاتا۔ جب گڈو ہوش میں ہوتا ان دنوں سسرال میں اوپر نیچے قہقہے ہی قہقہے ہوتے۔ میری نندوں کے رشتوں کی باتیں ہوتیں' سارا گھر مینٹی شو دیکھنے جاتا' رشتہ داروں کی دعوتیں ہوتیں۔ میری ساس فراخ دلی سے مجھے سب سے ملاتی اور اونچی آواز میں کہتی...... ''میری ہاجرہ کا جادو دیکھا بہن جی؟ جو کام ڈاکٹر نہ کر سکے' میری بہو نے کر دکھایا۔ دس سال سے سرت ماری گئی ہے گڈو کی...... اب دیکھ لو چنگا بھلا...... ہوش مند ہو گیا ہے...... ہاجرہ نے اسے زندگی دی ہے...... ہاجرہ نے اسے انسان بنا دیا ہے......''

مجھے اپنی ساس کی فراخ دلی سے بڑی شرم آتی ۔ وہ ماں تھی اس لئے اس کا جذبہ سچا تھا۔ اور میں عورت تھی اور چونکہ میری ضرورتیں ادھوری تھیں اس لئے جو کچھ بھی میں ظاہر کرتی تھی اندر محسوس کرنے سے عاری تھی۔

اگر میری ساس کا بس چلتا تو وہ خود گڈو کی بیوی بن جاتی اور ساری عمر اسے اپنے پروں تلے یوں چھپائے رکھتی جیسے بطخ سوں سوں کرتی اپنے انڈوں کو سیتی ہے۔ کبھی کبھی گڈو پلنگ پر پیشاب کر دیتا تو چوری چوری خود ہی چادریں گدے دھو دیتی۔ مجھ پر گڈو کی دیکھ بھال کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ میں اپنی ساس کو دیکھ کر سوچتی رہتی ایک انسان کی اتنی ساری کمزوریوں پر کوئی اس نفاست سے پردہ ڈال سکتا ہے؟ اتنی بڑی کوتاہی کے باوجود اسے اس قدر جی جان سے قبول کر سکتا ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے اللہ میاں بھی اپنی مخلوق کو اسی لئے موت کے پردے میں چھپا لیتا ہے تا کہ ابلیس اس کی مخلوق کی کوتاہیوں کا مذاق نہ اڑائے۔

اپنی ساس کے سامنے مجھے اپنا وجود ایک چور کا سا لگتا تھا۔ اس گھر کی ساری آسائشیں' سارے آرام' چاؤ' چونچلے بیکار گئے۔ میں گڈو کے لئے اپنے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ میں کوشش کرتی تھی' عزم کرتی تھی' لیکن جہاں سلائی کی ضرورت ہو وہاں ٹانکے پن سے کام نہیں چلتا۔ جہاں تن من دھن سے تپسیا کی ضرورت ہو وہاں وقتاً فوقتاً کی چوما چاٹی سے گزر اوقات نہیں ہو سکتی۔

خدا جانے یہ گڈو کے باعث ہوا؟

خدا خبر ماں کی موت کے بعد میرا دل خالی پنجرے کی طرح ہو گیا تھا۔

یا اللہ کی مرضی تھی۔

زندگی کبھی سیدھا راستہ نہیں پکڑتی۔ اسے تنگ پگڈنڈی' بنجر راستے' پتھریلے' کھنگریالے مقامات سے گزرنے کا بہت شوق ہے۔ مرغزاروں میں چلنے والے جان بوجھ کر کانٹوں سے الجھتے ہیں۔ امیروں کی زندگی میں ہمیشہ ڈاکٹر' دکھ اور بڑے بڑے ناسور ہوتے ہیں۔

یہ دوسری بار تھی۔

جب میرا بایاں پاؤں آخری سیڑھی پر اور میرا دایاں پیر سنگ مرمر کے خوبصورت فرش سے چھ انچ اونچا تھا' میری ساس نے پیچھے سے میرے بال پکڑ لئے۔ جو انسان گناہ کے احساس سے میری طرح بوجھل ہو وہ تو اپنے پاؤں پر مشکل سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسے گرانے کے لئے مار پیٹ دھول دھپے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''بول' یہ آدھی رات کو تو کدھر سے آ رہی ہے؟...... بول حرام زادی!''

میرا سر پکے فرش سے گالف کی گیند کی طرح ٹکرایا۔

''اوپر نہ کمرہ' نہ پاخانہ...... صرف برساتی میں اتنی رات گئے تو کیا کرنے گئی تھی؟ نامراد بول!

میرا دل و دماغ' روح' خصلت سب پتھر کے ہو چکے تھے۔

''بول کون تھا وہ؟ کون ہے ہماری عزت کے ساتھ کھیلنے والا......؟''

میری ساس تیسری منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی زار زار رو رہی تھی اور اوپر برساتی میں کمبل اوڑھے' دسمبر کی سردیوں میں میرا سسر ٹھٹھر رہا تھا۔ میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ میں اس کی عزت کے ساتھ کھیلنے والی نہیں ہوں۔ میں تو اس کی عزت بنانے والی ہوں۔ لیکن کچھ باتیں جب ہونٹوں پر آتی ہیں تو عجب قسم کا جھوٹ لگتی ہیں۔

''کون تھا اوپر؟ کون ہے ہمارے گھر میں سیندھ لگانے والا؟ مردار' حرام خور' احسان فراموش' کچھ تو بول!''

میں ٹھنڈے فرش پر چت لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اپنی ساس کو کیا بتاؤں۔ کہاں سے شروع کروں اور کہاں جا کر ختم کروں؟ کیا وہ اتنی ساری الجھاؤ کی باتیں سمجھ بھی سکے گی؟

''سن ہاجرہ! یا تو تو اس کا نام بتا دے سیدھے سبھاؤ یا پھر میں تجھے کھڑے کھڑے طلاق دلا دوں گی۔''

مجھے اپنی ساس سے پیار ہو گیا تھا۔ میں اسے سیدھے سبھاؤ کیسے کسی کا نام بتا سکتی تھی؟

''ہاجرہ! میں نے تیری کیسی کچھ خدمت نہیں کی اور اس کا تو نے یہ بدلہ دیا کلموہی...... ؟ بول' بتا اس کا نام' دیکھ میں نے آج تک کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا لیکن...... لیکن بول ہاجرہ' بتا تو کون تھا اوپر......؟''

میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ میں نے بھی اس کی خدمتوں کے بدلے میں اتنی بڑی گناہ کی گانٹھ سر پر اٹھائی تھی۔ گانٹھ بازار کی ان گانٹھوں سے مشابہہ تھی جن سے پرانے بودار استعمال شدہ صاحبوں کے کپڑے نکلا کرتے ہیں۔

شروع سردیاں تھیں۔ جب ایک روز میرا سسر میرے پاس آیا۔ اس روز گھر کے تمام لوگ گڈو کو لے کر ایک مزار پر دیگ چڑھانے گئے ہوئے تھے۔ مجھے بخار تھا اس لئے میں ان کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ میرے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی' جیسے کوئی چڑیا آ کر بار بار راستہ تلاش کرنے میں ٹکرا رہی ہو۔

بڑی دیر بعد ایک مری سی آواز آئی ''ہاجرہ!......''

میں نے دروازہ کھولا تو میرا سسر کھڑا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اب......''

''ٹھیک ہے جی......''

جب میں لوٹنے لگی تو اس نے میری کلائی پکڑ کر بڑی ترماہٹ سے کہا: ''ڈاکٹر صاحب آئے تھے......''

''آئے تھے جی......''

بڑی دیر تک وہ میرے پلنگ کے پاس صوفے میں بیٹھ کر دوائیوں کے پمفلٹ پڑھتا رہا۔ شاید وہ اپنے اندر نفس مضمون تیار کر رہا تھا۔ جب میں نے تھک کر اس کی طرف پشت کر لی تو وہ کھنکار کر بولا۔

''تم سے ایک بات کرنی ہے ہاجرہ! پتا نہیں تم میری بات کو کس روشنی میں سمجھو......؟''

''جی فرمایئے......''

''گڈو میرا اکلوتا بیٹا ہے اور میری ساری جائیداد اس کے نام ہے......''

''اللہ نے چاہا تو گڈو صاحب ٹھیک ہو جائیں گے جی...... امی جی ترت مراد کے دیگ چڑھانے گئی ہیں۔''

''ٹھیک اس نے کیا ہونا ہے' امریکہ تو میں پھر آیا...... ایک صورت ہے......''

وہ کون سی صورت تھی؟ اس کے انتظار میں میں کتنی دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔

''گڈو کے اگر بچہ ہو جائے تو میری عزت بچ سکتی ہے۔ اس گھر کا بوٹا ضرور لگنا چاہیے۔''

پھر یک دم میرے سسر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے' قطرہ' قطرہ......

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس گھر کو بوتا کیوں لگنا چاہیے اور بوتا لگنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے بوڑھے سسر پر ترس آ رہا تھا۔

''مجھے بچالو' میرے گھر کی خوشی کو بچالو...... اس گھر کی عزت' خوشی' نام سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے ہاجرہ!......''

میری ساس تیسری منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی احسانات کی وہ فہرست گنوا رہی تھی جو اس تھوڑے سے عرصے میں اس نے مجھ پر کئے تھے۔ باڑے کی شاپنگ' ہوٹلوں کے ڈنر' فلموں کے نام بار بار اس کے ہونٹوں پر آ رہے تھے۔ دور کہیں ایک مرغ۔ صبح خیز باریک سی آواز میں اذان دے رہا تھا۔ مجھے اپنی ساس کا وجود ٹپا کھائی گیند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے دیوانے بیٹے کے عشق سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو چکی تھی۔ اس وقت پتا نہیں کیوں مجھے اپنی ماں بہت یاد آ رہی تھی!

میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ مجھے بھی گرز گاؤ سر زیر نہ کر سکتا تھا۔ مجھ پر ڈاکہ ڈالنے والے نے ابریشمی کمند کو استعمال کیا تھا۔ میں اپنی ساس کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ جو رشتہ عزت بچانے سے شروع ہوا تھا وہ حمل ٹھہر جانے کے بہت بعد تک کیوں جاری رہا؟ کئی باتیں تاریخ کے واقعات کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی کئی تاویلیں کئی تھیوریاں تو ہو سکتی ہیں' لیکن سچائی اور اصلیت تک پہنچنا قریب قریب ناممکن ہے۔

''بتا ہاجرہ میں آخری بار پوچھ رہی ہوں' آخری بار بتا ہماری خوشیوں سے کھیلنے والا کون ہے۔''

میری ساس بیچاری' ممتا کی ماری ہوئی کیسے سمجھ پاتی کہ جب سے دنیا بنی ہے' ایک ہی کھیل انسان کا سچا اور اصلی کھیل رہا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کھیل کے ساتھ عزت کو نتھی نہ کیا ہوتا تو بنی نوع ہنستے کھیلتے بہت دور نکل جاتے۔ اب تو بندھے ٹکے اصولوں سے کوئی رتی بھر بھٹکا اور عزت کے لالے پڑ گئے۔ خدا جانے پہل کس کافر عشق نے کی۔ اور افزائش نسل کے کھیل کے ساتھ عزت کا تصور تعویذ کے طور پر باندھ دیا۔ پتہ نہیں کہ کس صدی میں کس نئی سوچ والے نے مذہب عشق اور جسمانی تعلقات کی ضرورت کو یکجا کر کے حدیث عشق تیار کی۔ اب تو عزت' اعضائے جنس اور محبت ایسے عجیب قسم کے تکون بن گئے ہیں جن کا ہر زاویہ صلیب کی طرح زاویہ قائمہ اور ہر ضلع قیامت سے بھی لمبا ہے۔

''ہاجرہ! میں آخری بار پوچھ رہی ہوں' تیرے پیٹ میں کسی کا حمل ہے......؟''

میرے جی میں آئی چیخ کر کہوں' آج تک کسی کو میرے حمل کی خوشی نہیں ہوئی۔ جو بھی جاننا چاہتا ہے یہی جاننا چاہتا ہے کہ حمل کس کا ہے؟ کیا حمل بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ کیا اس حمل کی خوشی کی جا سکتی ہے جو جائز بندھے ٹکے اصولوں کے تحت ہوتا ہے؟ اگر فطرت کا بھی منشا یہی ہوتا تو عورت کو اپنی اولاد سے کبھی پیار نہ ہوتا۔

''بول ہاجرہ! کون ہے وہ......؟ اگر بتا دے گی تو قسم خدا کی میں حرام کی اولاد کو بھی اپنی کہوں گی' پر اگر تو نے نہ بتایا تو...... تو تجھے طلاق دلوا دوں گی......''

میں اپنی ساس کو بتانا چاہتی تھی' لیکن مجھے اس عورت سے پیار تھا' اس کے دکھ سے گہری ہمدردی تھی۔ میں ایک ہی جملے میں اس کا دوہرا نقصان نہیں کر سکتی تھی۔

میں اپنے گھر چلی آئی...... چپ چاپ!

یہاں ہر وقت میرا ابا رہتا تھا۔ بولنے' جھڑکنے اور احسان جتانے والی ماں جانے کہاں چلی گئی تھی؟

اور آج اچانک بائیس برس گزر جانے کے بعد......

یہ تیسری بار تھی!

جس وقت میرا دایاں پیر سیڑھی کی آخری ٹیک پر تھا اور میرا بایاں پاؤں زمین سے سوا چھ انچ اونچا تھا' کسی نے پیچھے سے میرا چونڈا پکڑ لیا میرا جسم تو پہلے ہی زینہ اترنے سے ہانپ رہا تھا' اسے زمین پر گرتے دیر نہ لگی مجھے یوں لگا جیسے گرتے ہی میری کنپٹی سے ہلکی سی خون کی دھار نکلنے لگی ہے۔

''اس وقت آدھی رات کو تو کہاں سے آ رہی ہے ماں؟...... بول بتا...... اور دوسری منزل میں تیرا کیا کام تھا اس وقت؟''

میں چپ رہی۔

جوان بیٹے کو میں کیا بتاتی کہ بیٹوں کو پالنے میں ماؤں کو کیا کچھ کر گزرنا پڑتا ہے۔

''میں نے ادھر ادھر سے بہت سی باتیں سُن رکھی ہیں۔ تیرا کیا تعلق ہے مالک مکان سے؟ بول...... شیخ صاحب سے تیرا کیا ناطہ ہے؟''

میں چپ رہی۔

''میں اسے کیا بتاتی کہ شیخ صاحب ہمارے محسن تھے۔ انہوں نے برسوں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ کرائے کے پیسے کبھی وصول نہیں کئے تھے اور اس کے علاوہ ہر طرح کی مدد کی تھی۔

''میں...... میں تجھے کیا سمجھتا تھا ماں...... میں' میں سمجھتا تھا تو جنت کی حور ہے' فرشتہ ہے' میں سمجھتا تھا کہ...... کہ کیا ہوا میرا باپ دیوانہ تھا' میری ماں تو......''

جوان آدمی کے آنسو بے دریغ اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ وہ بچپن سے آج تک کی ساری محرومیاں گنوا رہا تھا۔ باپ کے گھر سے ٹوٹی ہوئی ہر آس اسے ڈس رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے جھگڑ رہا تھا' دنیا سے جھگڑ رہا تھا۔

''بول کون تھا اوپر...... بول ماں شیخ صاحب سے تیرا کیا ناطہ ہے......؟''

پہلی بار میری زبان کھلی۔ چپ کے مہیب دہانے سے آواز آئی:

''میرا کسی سے کبھی بھی کوئی ناطہ نہیں رہا بیٹا!

میرا کسی سے بھی کوئی ناطہ نہیں رہا......''



بلراج مین را

نام	:	بلراج مین را
قلمی نام	:	بلراج راہی/ بلراج مین را/ مین را
پیدائش	:	۱۷جون ۱۹۳۵ء بہ مقام ہوشیار پور، بھارت
تعلیم	:	ایف۔اے

ابتدائی تعلیم نوشہرہ سے حاصل کی۔ سناتن دھرم ہائر سکینڈری سکول، دہلی سے ۱۹۵۲ء میں ایف۔اے کیا۔ والد کی وفات اور نامساعد حالات کے سبب تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

مختصر حالات زندگی:

ہوشیار پور، غیر منقسم پنجاب میں سات پشتوں سے آباد، نتھو رام مین را کے ہاں پیدا ہوئے۔ بچپن، ہوشیار پور اور نوشہرہ میں گزرا۔ والد فوج میں ملازم تھے اس لیے بچپن اور لڑکپن میں مختلف فوجی چھاؤنیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ قیام پاکستان سے قبل لائل پور کے محلہ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور ریل بازار میں اُن کے والد کی دکان تھی۔ والد کی ناوقت وفات کے سبب تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا البتہ والدہ کا ساتھ تادیر رہا۔ اہل خانہ کے لیے روکھی سوکھی فراہم کرنے کے لیے بلراج مین را کو اوائل جوانی میں ہی جز وقتی کام کرنا پڑے۔ کارل مارکس، گوتم بدھ اور دستوئیفسکی کی راہ پر چلتے اور ہر روز ہلاک ہوتے ہوئے ٹریڈ یونین سے پیشہ ورانہ رابطہ رہا۔ لگ بھگ ۱۹۶۴ء میں راجن بابو (ٹی۔بی) ہسپتال دہلی میں لیبارٹری اسسٹنٹ بھرتی ہوئے تو ہسپتال سے قریب ہی رہائش رکھی۔ دورانِ ملازمت، ستر کے دہے میں ادبی مجلہ ''شعور'' دہلی کے چھ شمارے مرتب کیے۔ ''مین را جرنل'' بھی اُن کا مرتب کردہ ایک یادگار جریدہ ہے۔ لگ بھگ چالیس برس کی ملازمت کے بعد اسی ہسپتال سے ۲۰۰۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ جوانی میں برس ہا برس، رات گئے تک کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی ادبی محافل اور مے خانوں میں چہکنے والا ''اینگری ینگ مین'' اب دل کے عارضہ اور ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کے سکڑ جانے کی تکلیف میں مبتلا ہو کر ایک زمانے سے اپنے گھر میں مقید ہوگیا ہے۔

گھر بھی دہلی کے مضاف 'روہنی' میں ہے۔ جہاں احباب کے لیے آنا جانا جوئے شیر لانا ہے۔

کتب بینی کی چینک اور دریا گنج، پرانی دلی میں فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے سیکنڈ ہینڈ کتب کے بیوپاریوں سے یارانے کے سبب پھولے ہوئے سانس اور رعشہ زدہ ہاتھوں کے باوجود مہینے میں دو ایک بار اتوار کے روز اُدھر جانا ہوتا تھا۔ اب وہ بھی موقوف ہوا۔

کل اڑتیس افسانے، ادبی مجادلوں سے متعلق چند مضامین اور مجلّہ ''شعور'' کے اداریتی نوٹس کے علاوہ سوانحی یادداشتوں پر مبنی ایک نامکمل تحریر ''گنی پگ'' (۱۹۸۵ء) مین را کا کل ادبی اثاثہ ہے۔ گزشتہ تیس برس سے مین را نے افسانہ نہیں لکھا۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''کیلنڈر'' مطبوعہ: ''مشرب'' کراچی: اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ یہ افسانہ 'بلراج راہی' کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔

۲۔ ''بھاگوتی'' مطبوعہ: ''ساقی'' کراچی: ستمبر ۱۹۵۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''مقتل'' (سینتیس افسانے) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی طبع اول: ۲۰۰۷ء

(کمپوزیشن سیریز کے چھ افسانے، ''وہ''، ''شہر کی رات''، ''مقتل''، ''حسن کی حیات''، ''رفتار''، ''لمحوں کا غلام''، ''انٹروورٹ''، ''پرورٹ''، ''انا کا زخم''، ''میرا نام میں ہے''، ''غم کا موسم''، ''ظلمت''، ''بھاگوتی''، ''دھن پتی''، ''بیزاری''، ''جسم کی دیوار''، ''کمپوزیشن موسم سرما: ۶۴ء''، ''کمپوزیشن دسمبر ۶۴ء''، ''کوئی روشنی کوئی روشنی''، ''ایک مہمل کہانی''، ''آ تمارام''، ''ہوس کی اولاد''، ''ریپ''، ''ساحل کی ذلت''، ''سڑک ماضی کی''، ''تہہ در تہہ''، ''بس سٹاپ''، ''واردات''، ''جسم کے جنگل میں ہر لمحہ قیامت ہے مجھے''، ''گنی پگ'' (نامکمل) اور ''پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ'' (کل سینتیس افسانے) اور چند مضامین شامل کتاب ہیں۔ ''مقتل'' میں مین را کا اولین افسانہ ''کیلنڈر'' شامل نہیں کیا گیا۔ کل صفحات: ۳۲۸

نوٹ: اس سے قبل ''مقتل'' میں شامل مواد ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے ''سرخ و سیاہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع کروایا تھا۔ جس کے صفحہ ۳۲۱ تا ۳۲۷ پر بلراج مین را کا پہلا افسانہ ''کیلنڈر'' مطبوعہ: ''مشرب'' کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء شامل کتاب ہے۔

مستقل پتا:

پلاٹ ۱۰۵، پاکٹ: ۳، سیکٹر: ۲۴، روہنی، نئی دہلی، بھارت

اعزاز:

۱۔ غالب ایوارڈ برائے ''مقتل'': ۲۰۰۷ء

نظریۂ فن:

''ایک شہری جو قلی ہے اور ایک شہری جو افسانہ نگار ہے (ویسے ایک قلی، افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے اور افسانہ نگار، قلی بھی) دونوں میں کیا فرق ہے؟ یہی نا کہ افسانہ نگار علم کے میدان میں قلی سے آگے ہے۔ اسی لیے افسانہ نگار کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔ اُسے تمام سماجی مسائل کی تفتیش کرنا ہوگی۔ سماجی برائیوں اور امراض کی تہہ تک جانا ہوگا اور ہر عوامی مسئلے پر ایک مضبوط سٹینڈ بھی لینا ہوگا۔

(''تنبولا'' مشمولہ: ''مقتل'' مطبوعہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، طبع اوّل: ۲۰۰۷ء)

وہ

بلراج مین را

جب اس کی آنکھ کھلی، وہ وقت سے بے خبر تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا۔ اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا۔

سگریٹ کا پیکٹ پھینک کر اس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور ماچس تلاش کی۔

ماچس خالی تھی۔

اُس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔

خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔

اُس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔

بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچسیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔

اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ سب خالی تھیں۔

اس نے لحاف اتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔ دو بج رہے تھے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟

ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی۔

اُس نے تمام کمرہ چھان مارا۔

کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر باسکٹ، پتلون کی جیبیں...... ماچس کہیں نہ ملی۔ اس نے ایک ایک کتاب الٹ دی...... کوئی دیا سلائی نہ ملی۔

کمرے کی حالت بری ہوگئی تھی۔

کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔ کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے' ٹرنک کھلا ہوا تھا۔ کوئی آ جائے اس سے۔

رات کے دو بجے.......... کمرے کی یہ حالت؟

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے؟

ماچس کہاں ملے گی۔

ماچس کہیں نہ ملی تو......؟

تو کہیں.......

میرا دھڑکتا ہوا دل خاموش نہ ہو جائے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی۔

میں وقت سے بے خبر تھا.......... ایک بار آنکھ کھل جائے تو پھر آنکھ نہیں لگتی۔

ماچس کہاں ملے گی؟

اس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دسمبر کی سرد رات تھی' سیاہی کی حکومت' خاموشی کا پہرہ۔

کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے وہ چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا۔ جب اس نے قدم اٹھائے وہ راستہ سے بے خبر تھا۔

رات کالی تھی' رات خاموش تھی اور دور دور تا حد نظر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور.......

چوراہے پر اس کے قدم رک گئے۔

یہاں تیز روشنی تھی کہ دودھیا ٹیوبیں چمک رہی تھیں۔ لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دکانیں بند تھیں۔ اس نے حلوائی کی دکان کی جانب قدم بڑھائے۔

ممکن ہے' بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے' دہکتا کوئلہ' دم بہ لب کوئلہ!

حلوائی کی دکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔

وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا کہ چبوترے پر بنی گٹھڑی کھل گئی۔

کون ہے؟ کیا کر رہے ہیں؟

میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں۔

پاگل ہو گیا...... بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے!

تو پھر؟

پھر کیا؟ گھر جاؤ!

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

ہاں۔ مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

تم پاگل ہو! جاؤ! میری نیند مت خراب کرو' جاؤ۔

تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟

ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہوگی۔ جاؤ تم!

وہ سڑک پر آ گیا۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

اس نے قدم بڑھائے۔

چوراہا پیچھے رہ گیا' تیز روشنی پیچھے رہ گئی۔ کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔

اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔

لیمپ پوسٹ' لیمپ پوسٹ' لیمپ پوسٹ' ان گنت لیمپ پوسٹ پیچھے رہ گئے۔ دھیمی روشنی والے لمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔ یکا یک اس کے قدم رک گئے۔ سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا!

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

ہاں۔ مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے' میں اس علت سے بچا ہوا ہوں۔

میں سمجھا......

کیا سمجھے؟

شاید آپ کے پاس ماچس ہو۔

میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں اس علت سے بچا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔

اُس نے قدم بڑھائے۔

سگریٹ اُس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا کہ تھک گیا تھا۔

وقت سے بے خبر اس کے تھکے تھکے قدم اٹھ رہے تھے۔

لیمپ پوسٹ آتا' مدھم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔

پھر لیمپ پوسٹ مدھم روشنی' پھر سیاہی۔

وہ لبوں میں سگریٹ تھامے دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا۔

اس کی دور' اندر پھیپھڑوں تک دھواں کھینچنے کی طلب شدید ہوگئی تھی۔

اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

شب خوابی کے لباس اور چادر میں اسے سردی لگ رہی تھی۔

وہ کانپ رہا تھا اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا۔ وقت سے بے خبر۔ لیمپ پوسٹوں سے بے خبر......

ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔ سامنے پل تھا۔ مرمت طلب پل۔

حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

اس نے لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ......

کون ہے؟

وہ خاموش رہا۔

سیاہی کی ایک انجانی تہہ کھول کر سپاہی اس کی طرف لپکا۔

کیا کر رہے تھے؟

کچھ نہیں!

میں کہتا ہوں کیا کر رہے تھے؟

آپ کے پاس ماچس ہے؟

میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو ماچس ہے...... کون ہو تم؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔ آپ کے پاس ماچس ہو تو......

تم یہاں کچھ کر رہے تھے؟

میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا...... آپ کے پاس ماچس ہو تو......؟

تم کون ہو۔ کہاں رہتے ہو؟

میں......

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن!

اور تمہیں ماچس چاہیے...... ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو...... ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

ماڈل ٹاؤن! اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

دور دور، تا حد نظر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

چلو میرے ساتھ تھانے تک...... ماڈل ٹاؤن...... ؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے...... ماچس چاہیے نا! تھانے میں مل جائے گی۔

سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔

تھانہ اسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔

وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کئی آدمی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

سب سگریٹ پی رہے تھے۔

میز پر سگریٹ کے کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔

صاحب! یہ شخص پُل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے، ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

کیوں بے؟

اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کرلوں...... مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے۔

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن۔ کیا میں آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟

کون ہو تم؟

میں اجنبی ہوں۔ کیا میں ماچس......

ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟

تین ماہ سے۔ ماچس......

ماچس...... ماچس کا بچہ...... اجنبی...... جاؤ اپنے گھر...... ورنہ بند کردوں گا...... ماچس......

جب وہ تھانے سے باہر آیا۔ وہ بُری طرح تھک چکا تھا۔

اُس نے اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کیا۔

اس کی ناک سوں سوں کرنے لگی تھی اور اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔

سگریٹ پینا ایک علّت ہے!

میں نے یہ علّت کیوں پال رکھی ہے؟

ماچس کہاں ملے گی؟

نہ ملی تو؟

وہ وقت سے بے خبر تھا' لیمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا' سڑک سے بے خبر تھا' اپنے بدن سے بے خبر تھا۔

وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔

پو پھٹی اور وہ دم بھر کو رکا۔

دم بھر کو رکا اور پھر سنبھلا۔

سنبھلا اور اس نے قدم اٹھانا ہی چاہا کہ......

سامنے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رکا۔

اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔

آپ کے پاس ماچس ہے؟

ماچس؟

آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟

ماچس کے لیے تو میں......

وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔

آگے' جدھر سے وہ خود آیا تھا۔

اس نے قدم بڑھایا۔

آگے' جدھر سے وہ آیا تھا۔



خان فضل الرحمٰن

نام : فضل الرحمٰن
قلمی نام : خان فضل الرحمٰن
پیدائش : ۱۹۱۴ء بہ مقام رائے ضلع سہارن پور (یو۔پی) بھارت
وفات : ۱۹۹۵ء بہ مقام، لاہور
تعلیم : ایم۔اے۔ایل ایل بی لکھنؤ یونیورسٹی: ۱۹۳۸ء

چوتھی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں مسلم ہائی اسکول، انبالہ سے میٹرک کیا۔ ایف اے (۱۹۳۴ء) اور بی۔اے (۱۹۳۶ء) کے امتحانات گورنمنٹ کالج، لاہور سے پاس کیے۔ ایم۔اے اور ایل ایل بی کے امتحانات لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں پاس کیے۔

مختصر حالات زندگی:

ہمالہ کے ذیلی پہاڑ شوالک کے دامن میں خان فضل حق کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاں صاحب کا تعلق انتہائی متمول گھرانے سے تھا۔ بچپن اور لڑکپن نہر جمن کے کنارے شوالک پہاڑ کے دامن میں رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ گزرا۔ جوانی میں عشق لڑائے۔ اکثر اپنا سفری تھیلہ اٹھائے دیرہ دون سے سرینگر تک نکل جاتے۔ آبشاروں اور سبزہ زاروں سے پٹے پڑے اس ماحول نے انگریزی اور اردو میں شاعری اور افسانہ نگاری پر اکسایا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور شہر کو اپنا مستقل گھر بنایا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ بیشتر وقت ہائی کورٹ سے متعلق رہے۔ لیکن عدالت میں وکالت سے زیادہ اپنے باطن کی وکالت کی۔ تاریخ اور نامور شخصیات سے دلچسپی رہی اور ڈوب کر لکھا۔ ایک زمانے تک لاہور کی ادبی محفلوں کی رنگینی ان کے دم قدم سے رہی۔ اتنا لکھا کہ خود انہیں یاد نہیں رہا۔ اوائل جوانی کا بیشتر کام ضائع ہوگیا، اس کے باوجود ہزاروں صفحات کا مواد غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے۔ گرمیاں کوہ مری میں گزارتے تھے اور وہاں بھی قلم کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ جنس نگاری اُن کے ذاتی

تجربات کی عطا تھی۔ حلقۂ اربابِ ذوق میں افسانہ سناتے تو ایک چارٹ بھی ساتھ لاتے جس پر سے ان پہاڑی مقامات کی نشان دہی کر دیتے جہاں ہیرو نے کمال مہارت سے ہیروئن کو گھیرنا ہوتا۔ بڑھاپے کی شادی نے کہیں کا نہ رکھا۔ نابھ روڈ پرانی انار کلی پر اپنے مکان کے سامنے پر ہجوم روڈ پر ان کی جوان بیوی کم و بیش روزانہ ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور وہ سر جھکائے سنتے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''گھی شکر''، مطبوعہ: ''سویرا'' ۱۹۵۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ''ادھ کھایا امرود'' (افسانے) مکتبہ میری لائبریری، لاہور طبع اوّل: ۱۹۵۶ء

اس کتاب کی اشاعت کی تھوڑی مدت بعد حکومت پاکستان نے کتاب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی عائد کر دی۔

۲۔ ''درشن رین'' (افسانے) نام مطبع ندارد طبع اوّل: ۱۹۸۴ء

لاہور سے یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ سول ایجنٹ کے طور پر مکتبہ میری لائبریری، لاہور کی مہر لگی ہے۔ پرنٹ لائن نہ ہونے کا سبب خان فضل الرحمٰن کی بطور جنس نگار اچھی یا بری شہرت ہے۔ اس سے قبل خاں صاحب کے اولین افسانوی مجموعے ''ادھ کھایا امرود'' کی فروخت پر حکومت پاکستان نے پابندی عائد کر دی تھی۔ ''درشن رین'' میں کل پانچ افسانے مع نقشہ جات شامل ہیں۔ افسانوں کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ ''درشن رین''۔ ۲۔ ''کچھڑی اور دودو''۔ ۳۔ ''اگنی''۔ ۴۔ ''گوری گوری، کوری کوری''۔ ۵۔ ''پیلے روڑے ڈنڈے''

اس کتاب کے کل ۲۵۵ صفحات ہیں۔

۳۔ ''ترک بہادر'' (تاریخی ناول) مکتبہ میری لائبریری، لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۴ء

کتاب کے کل صفحات ۱۶۸۔

۴۔ ''سلک اوک ٹاؤن'' (ناول) مکتبہ میری لائبریری، لاہور طبع اوّل: ۱۹۸۵ء

اس ناول میں بقول مصنف ایک صالح انگریز کی ثناخوانی کی گئی ہے اور برطانوی عہد کی برکتوں کی تعریف۔ مصنف عہد انگلشیہ کا پرستار ہے۔

غیر مدوّن:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب برائے طباعت تیار ہیں:

۱۔ ٹرائے کے میدان پر کھیلے جانے والے کھیل سے متعلق ناول۔

۲۔ شیلے اور ہیرٹ کی ٹریجڈی سے متعلق ناول۔

۳۔ نیپال سے متعلق ایک طویل مختصر افسانہ۔

۴۔ علامہ اقبال سے متعلق ایک کتاب۔

۵۔ مرزا غالب سے متعلق ایک ناول۔

۶۔ افغانستان کی جنگ آزادی سے متعلق ایک ناول۔

۷۔ بھارت سے مسلمانوں کی ہجرت (۱۹۴۷ء) سے متعلق دو ناول۔

۸۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ سے متعلق ایک ناول۔

۹۔ حجاز مقدس کا سفرنامہ۔

۱۰۔ ''آنکھوں کا نگرہ'' (ناول)

۱۱۔ متعدد ناول اور ناولٹ بہ زبان انگریزی۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

نابھ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور۔

نظریہ فن:

''کینوس بہت وسیع ہونا چاہیے ورنہ گھٹن اور تواردجیسی برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔ افسانوں میں نئے نئے الفاظ، قدیم اردو اور متروک الفاظ کا استعمال ہونا چاہیے۔ ماحول کی نقشہ کشی لازم ہے۔ اگر ہو سکے تو نقشے اور تصاویر بھی ہونا چاہیں۔''

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

نربسی

خان فضل الرحمٰن

گاؤں کا ہر ایک آدمی اچرج میں تھا کہ نربسی کیسے دڑو لنجے کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ پرانے مندر کے جگن بنسی یا چک اور عز لتی کا بھی یہی خیال تھا۔ دڑو موٹا بھسک تھا جبکہ نربسی چھریری' وہ چھٹ آنکھا' یہ بڑ آنکھی' وہ گھور میل تھا' یہ ایسی تھی جیسے چنے کے اوپر سے ابھی ابھی چھلکا اتارا ہو۔ مگر جوانی پر چڑھتے ہی اس کا چہرہ گلابی گلابی ہو گیا تھا۔

دڑو کی آواز غوک اور جھنگے ایسی تھی۔ جبکہ کالا کا دگر نربسی کی آواز پر مرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ لڑکی اگر گاین بن جائے' اور ساتھ کنچنی بھی' اور میلہ کرے' تو میلہ لوٹ لے' مجرا کرے' تو تماشیوں کی جیبیں خالی کر دے' کوئی دھن پتی اس کے ساتھ شب بسری کرنا چاہے' تو اپنے دھن سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہ سچ مچ درو ڑی ہے۔

جب تک دڑو لنجے کی بیوی زندہ رہی، وہی نربسی کی پال پوس کرتی رہی' اور اس کے بعد دڑو لنجا اسے انگوٹھی کے نگ کی طرح سے رکھ رہا تھا۔

دڑو کی بیوی اس سے گت تھی، جسے وہ سراؤگیوں کے گاؤں جین پورے سے لایا تھا۔ اس کے گاؤں میں کسی نے بھی اپنی لڑکی اسے دینے کی حامی نہیں بھری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نوزائیدہ لڑکی کے لئے زچہ خانہ ہی میں شادی کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے کانوں میں گرام یا چک کی یہ آواز پڑی تھی "دڑو تجھے تو یہ بات کہہ کر لاجنا چاہیے" تو اس نے جواب دیا تھا۔ "یا چک جی میں نے کچھ برا تو نہیں کیا۔ اگر میرا اس سے بیاہ ہو گیا' تو میں اسے آپ ہی پال لوں گا۔"

پھر جین پورہ سے دڑو کے ساتھ نربسی اور اس کی ماں آ گئی تھی۔ اس سیٹھوں کے قصبہ میں یہ راجوں کے ساتھ مزدوری کرنے گیا تھا۔ جہاں اس نے کئی سال گزارے تھے۔ اسی قصبہ سے وہ نربسی' وراس کی ماں کو ساتھ لے کر آیا تھا اور اسے گاؤں کی وہ زمین بھی مل گئی تھی جسے اس کے مالک نے جین پورہ کے کسی سراوگی کے پاس رہن رکھا ہوا تھا۔ جین پورہ سے لوٹنے کے بعد اس نے اپنی زمین میں کھیتی شروع کر دی تھی۔

2

گاؤں میں عزلتی یا چک کو بڑا دان دہ اور دور دیا دان سمجھتے تھے۔ جب کسی نے اس سے پوچھا کہ ''یا چک جی۔ آپ تو گاؤں کے مہاجان ہیں تو زربسی اور دڑ ونیجے کا بھید تو آپ ہی کھولیں گے۔'' اس نے جواب دیا تھا۔ ''میں کوئی دیوک تو نہیں اور جس کو لجے کو برا ہما، وشنو اور شیو نے ڈھانپا ہوا ہے، میں اس کو لجے کو کھولنے والا کون؟ یہ راجوں کے ساتھ مزدوری کرنے گیا تھا، لوٹا تو جسے کوئی عورت نہیں ملتی تھی وہ عورت والا بھی بن گیا۔ زمین بھی اسے مل گئی۔ زربسی کو اس کی دایا دی کہتے ہیں۔ وہ کتنی بھدرک ہے۔ یہ کتنا بھدا۔ اتنے چتوں پر بھی کوئی اسے زبوجھ سمجھے تو یا چک اسے کیا سمجھا سکتا ہے۔ زربسی، زربسی نہیں کام لتا ہے۔''

زربسی اس گاؤں میں ایسی تھی جیسے کھنڈے جیسے مکانوں کے درمیان کوئی تاج محل لا کھڑے کرے اور گرام یا چک کا لڑکا سوم دت واقعی سوم دت تھا۔ اس کے چاہنے والے اسے جغا سیر کہتے تھے اور ان غلچوں کا بھی ایک ہجوم تھا۔

خوبصورتی میں یہاں سوم دت اور زربسی کے سکے چل رہے تھے۔ مگر اس جگہ میں وہی نسبت تھی جو مور اور مورنی میں ہوتی ہے۔ سوم دت زربسی سے نمبر لئے ہوئے تھے۔ زربسی تو مجہول النسب تھی جب کہ سوم دت جگن جنسی تھا۔ جو ہندوؤں میں اونچی ذات گنی جاتی ہے۔ زربسی جب بھی سوم دت سے ملتی، تو گذارش سی کرتی ہوئی معلوم ہوا کرتی تھی اور گذارش بھی شربت وصل کی۔ اس کا جی چاہا کرتا تھا کہ سوم دت اس کی ہنکا ہنکی، ٹوکا ٹا کی، نوکا نوکی کرنے لگے۔

3

اس گاؤں کے درمیان ایک نہر بہتی تھی۔ جس طرح سے لکھنؤ گومتی کے شمال میں آباد ہے اور جنوب میں بھی، اس طرح سے گاؤں کا آدھا حصہ شمال میں تھا آدھا جنوب میں، دونوں حصے ایک لکڑی کے پل سے ملائے ہوئے تھے۔ گاؤں سے کچھ دور مشرق میں نہر دو دھاروں میں پھٹ گئی تھی اور یہ دونوں دھاریں درمیان میں جزیرہ بنا کر بعد میں ایک ہو جاتی تھیں۔ جزیرے میں ہو گلے اور نیم کھڑے ہوئے تھے۔ دیہاتی بولی میں یہ مقام دھموئی کہلاتا تھا۔ جو دومنہی کا بگڑا ہوا ہے۔ جس کے معنی دومنہوں کے ہیں۔

جس طرح سے مغربی یو۔ پی کے اس نواح کا کوئی بھی نوجوان گھر سے روٹھتا، تو وہ لاہور آ کر دم لیتا تھا، اس طرح سے اُس گاؤں کے کسی نوجوان کو اپنی لگتی کا لب لباب کھینچتا ہوتا، تو وہ اسے ساتھ لے کر دھموئی کی رنگ بھوم میں دم لیتا تھا۔ کسی آنے جانے والے نے نہر کی پٹڑی سے جزیرہ میں آنے جانے کے لئے نہر کی شاخ پر پہاڑ سے بہہ کر آنے والے چیڑ کے لیے سلیپر کی کیبل بنا دی تھی۔

زربسی نے بڑی التجاؤں، تمناؤں، مرادوں اور ریچولوں کے ساتھ سوم دت کو راضی کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ معانقے ہی نہیں بلکہ ٹوکا، ٹوکی، نوکا، نوکی کرے۔ اس کا تو بھاگ جاگ گیا تھا۔ زربسی کی اس لڑکے پر ٹوٹ کر طبیعت آئی ہوئی تھی۔ اس کا دل اس کو دیکھتے ہی یہ چاہنے لگتا تھا کہ وہ دونوں دمن میں غلاطم غوطہ ہوں۔ کبھی وہ اس کے ہونٹوں کو دیکھے جایا کرتی تھی۔ کبھی چھاتی، پیٹرو اور رانوں کو......

جنم اشٹمی کی رات، بھادرا کی بدی آٹھ کو، زربسی اور سوم دت دھموئی کے جزیرہ میں ملنے والے تھے۔ آج رات وہ اس لڑکے کے ہونٹوں، چھاتی، پیڑو اور رانوں سے وہ کام لینے والی تھی جو اس کی ہونے والی دلہن کا حق تھا۔

سانجھ ہوئے سوم دت اپنے بڑوٹی والے کھیت میں اپنی بھینس کے لئے چری کاٹ رہا تھا کہ زربسی نے جوار کی کچھ سٹیاں توڑیں اور سوم دت کے مارتے ہوئے کہا: ''ارے کھوئے جانے اور نہ کاٹ تھک جائے گا۔''

4

سوم دت نے یہ آواز سنی تو اس نے منہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور زربسی نے اپنی طلسماتی آنکھیں اس کی رس بھری آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید اس طرح سے سوم دت اسے ابھی اپنا لوازمہ بنالے گا۔ وہ کھڑا ہو گیا تو لڑکی نے اس کے ہاتھ سے گراسی اس طرح سے چھینی کہ اس کے ہاتھ سوم دت کے ہاتھوں کو خوب چھو سکیں۔

سوم دت نے زربسی کو خود ہی گراسی دیتے ہوئے کہا: ''اچھا چتوان جی' ہتیشی جی میرا ہاتھ بٹانے آئے ہو۔ تو چری تم ہی کاٹ کے دکھاؤ۔'' زربسی نے کچھ ہی پودے کاٹے تھے کہ سوم دت نے زربسی سے گراسی لیتے ہوئے کہا:

''بس بس کلائی میں چنکا آ جائے گا جب دھموئی پر کوئی تڑپھ رہی تھی اور کوئی تڑپا رہا تھا' تو میرے کانوں میں ایسی ہی ''بس بس'' کی آواز پڑی تھی۔''

زربسی: وہ آواز میری ہی تو تھی۔

سوم دت: تیرے ساتھ تو میرا ایسا پھندا ابھی نہیں پڑا۔ وہ ڈاک منشی کی کموری سی کچریا سی دھی تھی جس کا ناس ونس ایسا روپ واں ہے کہ اسے دیکھتے جائے۔

زربسی: میرا ناس ونس کیسا ہے؟

سوم دت: تیری شیاول آنکھیں اچھی ہیں۔ جن سے تو مجھے اس طرح سے دیکھتی رہتی ہے۔ جس طرح سے ہماری بھینس دور رکھی ہوئی کنڈالی کو' جس میں اس کے لئے 'گڑ' چنیہ' اور چوکر ملی ہوئی ہوتی ہے پر تیرا گلابی چہرہ مہا سیو چھم ہے۔

زربسی: سوائے میرے گلابی پن کے' تجھے میری اور کوئی شے اچھی نہیں لگتی؟

سوم دت: یہ میں بغیر دیکھے کیسے بتا دوں۔

زربسی: ڈاک منشی کی لڑکی کے مقابل تو مجھے فالتو سمجھتا ہے۔

سوم دت: اس سے مجھے فارغطی مل چکی ہے۔ تجھ سے ملنا ہے۔ یہ تو بعد میں ہی فیصلہ ہوگا کہ فالتو کون ہے۔ کبھی کبھی وہ جیمان ہونے کے بعد اس طرح سے منڈکاری بھی مار لیتی ہے کہ جیسے اسے مجھ سے کچھ بھی سروکار نہ ہو اور میں بلاؤں تو ہاں بھی نہیں کرتی۔ مگر یہ سناٹا پلک جھپکنے تک کا ہوتا ہے کیونکہ وہ آپ سے آپ میری گلبیاں کرنے لگتی ہے۔

زربسی: میں کل کہاں ملوں؟

سوم دت: دھموئی پر ملیں گے۔ پر دکھن وشا سے جو چڑھا آ رہا ہے۔ جھم جھم ہو گئی تو؟ تو میگھ ناد نہیں سن رہی؟

زبسی: سن رہی ہوں، تو پرانے شوالے کے مانڈھے میں ملیں گے۔ جہاں آموں کا دیوریاں کھڑا ہے ہررے ہتھیلے رامھک اور کرپاہین میں، توری ٹھگوریوں سے ہاری ہوئی ہوں۔ تو وعدہ پر کبھی پورا نہ اترا اور اپنی فضی جوانی ڈاک منشی کی کوودی کھریاسی پہ نچھاور کرتا رہتا ہے۔

سوم دت: میں اس پر اپنا کچھ نچھاور نہیں کرتا۔ وہ میری سیوکائی میں اپنا سب کچھ نچھاور کرتی رہتی ہے اور چلچلاتے ہوئے ''بس بس'' کرتی رہتی ہے۔ جتنی لوکوائی اس میں میرے لئے ہے اتنی تو تجھ ہی میں میرے لئے نہ ہوگی۔

زبسی: میں دھموئی پہ تجھ سے پہلے پہنچ جاؤں گی۔

سوم دت: ہم دونوں کا وہاں ایک ساتھ جانا ٹھیک بھی نہیں۔ پر جو تجھے وہاں میرا اگر بھ رہ گیا۔

زبسی: مجھے تُو پیارا ہے تو تیرا اگربھ بھی پیارا ہوگا۔

سوم دت: وہ سہانے ناس ونس والی میرا لایا ہوا اگربھ پاتک کھایا کرتی ہے تو بھی کھالینا۔

زبسی: یہ تیری مرضی۔

سوم دت: وہ تو میرے پاس آتے ہی ننگ دھڑنگ ہو جایا کرتی ہے۔

زبسی: اسے ننگ دھڑنگ ہوتے ہوئے وریڑا نہیں آتی۔

سوم دت: اسے وریڑا آئے یا نہ آئے، تُو اپنی بات بتا؟

زبسی: جیسا تو کہے گا ویسا ہی کروں گی؟

سوم دت: پہل کس کی ہوگی؟

زبسی: تیری۔

سوم دت: نہیں تیری۔

زبسی: اچھا منظور۔

5

شام ہوئے چٹھی رساں نے گاؤں میں خبر کردی کہ وہ ڈاک تقسیم کرکے نہر کی پٹڑی آرہا تھا کہ اس کی نگاہ دھموئی کے جزیرہ پر پڑی۔ جہاں ہنڈار آپس میں کھلاڑیاں کر رہے تھے۔ چٹھی رساں درست گو مشہور تھا۔ اس خبر پر کھا گڈریا اپنی بکریوں کی حفاظت کے لئے درکھال پر لٹھ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جن جن گاؤں والوں کو ہنڈاروں کی خبر پہنچی تھی انہوں نے گھروں کے دروازے سویرے ہی بھیڑ لئے تھے۔ گرام پہریا تک گلیاروں میں ''جاگو جاگتے رہیو'' کی آوازیں دینے کے لئے نہیں نکلا تھا۔

مگر ایک ہستی تھی جسے جزیرہ میں ہنڈاروں کی موجودگی کا علم تھا۔ پر وہ پھر بھی اَنت کی ریچھوار سلیپر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تاکہ سوم دت کے آنے پر اس کے ساتھ جزیرہ میں جا سکے۔ اسے یقین تھا کہ ہنڈار جزیرہ سے چلے گئے ہوں گے۔ اس نے کال بینی میں چمبیلی کے سفید پھول سجائے ہوئے تھے ماتھے پر سیندوری بندی لگائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سرمہ بھرا ہوا تھا۔ اسے سوم دت کا انتظار تھا۔ دیکھتے دیکھتے اتنی دیر ہوگئی

تھی کہ ایک اونچے نیم کے اوپر آسمان میں کچ پچیا سجا ہوا تھا۔ بنات النعش گردوں اس کے سر پر آ گئی تھی' اور جنم اشٹمی کا چیپڑ لگا، اردھ چندر نکل آیا تھا۔

جب کہ اس گاؤں کی کام لتا تو سوم دت کی آمد کے بعد رمن کے لئے پڑی کی طرف آنکھیں پھرا پھرا کر پھڑک رہی تھی کہ وہ آ کر اسے برومند کرے۔ وہ خود ڈاک منشی کی کموری اور کچریا سی خوبصورت ناس ونس والی لڑکی کے ساتھ پرانے شوالہ کے ویران مانڈھے میں ہنکا ہلکی' ٹوکا ٹوکی' ٹوکا ٹوکی کرتے ہوئے اسی کا بھرنا بھر رہا تھا۔ وہ سوم دت کے سروانگ سے بہرہ مند ہو رہی تھی اور سوم دت اس کے سروانگ سے بہرہ مند ہو رہا تھا۔ ڈاک منشی کی لڑکی کے گھرے ہو رہے تھے۔ جب کہ نربسی کا ٹھینگا بج گیا تھا۔

اگلے دن دوپہر ہوئے جب ہالنیں' ہالیوں کی روٹیاں لے کر کھیتوں میں جا رہی تھیں' بھادوں کا سورج بھر مانڈ پر پہنچ چکا تھا' تو چٹھی رساں نے خبر دی کہ وہ دھموئی کی طرف سے آ رہا تھا۔ جہاں اس نے پھٹے ہوئے زنانے کپڑے دیکھے اور وہیں کسی عورت کا سر پڑا ہوا تھا۔

6

چٹھی رساں کی گفتگو دڑولنجا بھی سن رہا تھا۔ نربسی گھر سے رات ہوئے نکلی تھی اور اب تک اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اسی وقت نربسی کے باپ' اجت پرشاد جین' کی موٹر بھی دڑولنجے کے دروازہ پر آ رکی تھی۔ اس کی بیاہتا کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس کے ڈر سے نربسی اپنا ہی نہیں گئی تھی۔ نربسی کی خانگی ماں کو اجت پرشاد کا پیٹ رہ گیا تھا۔ یہ نربسی اپنے باپ کی واحد اولاد تھی اور وہ اب اسے لینے کے لئے آیا تھا۔

اجت پرشاد جین' دڑولنجا' چٹھی رساں اور نربسی کا ہیلا برادر لبی کار میں بیٹھ کر دھموئی پہنچے تو چٹھی رساں کی تصدیق ہو گئی۔ اجت پرشاد زور زور سے رو رہا تھا' دڑو کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور وہ ہنگی ہو گیا تھا۔

موٹر نربسی کی باقیات کو لے کر پرانے شوالہ پہنچی' تو سوم دت مانڈھے کے پاس قطعی بیگانہ سا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرہ پر غم کے کوئی آثار نہیں تھے۔ نہ اس لاڑھے کی آنکھوں میں چھوٹا سا ٹیسوا۔ اس کے لئے تو نربسی فصل میں کھڑا ہوا بجن تھی جو کٹ گیا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے ذرا سی بھلمنساہٹ یا درماندگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نربسی کی رقیب' ڈاک منشی کی خوبصورت ناس ونس والی' اور ہنکا ہلکی کے وقت "بس بس" کرنے والی لڑکی ایک طرف کو اس طرح سے کھڑی ہوئی تھی جیسے وہ کسی مدمقابل کے ساتھ جھڑپنے والی ہو۔ وہ سوم دت سے بارم بار سب کا دودش حاصل کر چکی تھی۔ جب کہ کالا کاونگر بچک سا کھڑا ہوا تھا۔

گاؤں چھوڑنے سے پہلے نربسی کے باپ نے ہیلے کی تمام رقم غریب غرباء میں تقسیم کر دی تھی۔



خالدہ حسین

نام : خالدہ

قلمی نام : خالدہ اصغر/ خالدہ اقبال/ خالدہ حسین

پیدائش : ۱۸ جولائی ۱۹۳۸ء بہ مقام لاہور، مغربی پنجاب، پاکستان

تعلیم : ایم۔اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

لاہور کالج برائے خواتین سے بی۔اے اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے (اُردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

پیدائش لاہور میں ہوئی اور ۱۹۶۵ء تک مسلسل وہیں قیام رہا۔ آپ کے والد ڈاکٹر اصغر انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور کے وائس چانسلر تھے۔ سائنس کے شعبہ کے باوجود ان کا ادب سے گہرا لگاؤ تھا چنانچہ گھر کی نجی محفلوں میں خالدہ نے حفیظ جالندھری، احسان دانش اور فیض احمد فیض جیسے نامی شعراء کو دیکھا اور سنا۔

خالدہ اپنے گھر میں ایک بہن اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث والدین اور بہن بھائیوں کی بے حد لاڈلی رہیں۔ بھائیوں نے اردو شعر و ادب کے علاوہ مغربی فکشن کا ذوق پیدا کیا اور تازہ ترین کتب فراہم کرنے میں بخل سے کام نہ لیا۔ خالدہ نے ۱۹۵۴ء میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کی شادی ڈاکٹر اقبال حسین سے ہوئی جو انجینئرنگ کے شعبہ سے متعلق ہیں۔ شادی سے پہلے خالدہ کا قلمی نام خالدہ اصغر رہا اور اس کے بعد دو ایک افسانے خالدہ اقبال کے نام سے لکھنے کے بعد ایک مدت تک ادبی افق سے غائب رہیں۔ اس تعطل کے بعد دوبارہ افسانہ نگاری شروع کی تو خالدہ حسین کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۹ء میں اپنے میاں کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئیں۔ کراچی اور اسلام آباد میں قیام کے دوران بطور لیکچرار درس و تدریس سے متعلق رہیں۔ آج کل اسلام آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں''مطبوعہ:''قندیل''لاہور:۱۹۵۶ء

۲۔ ''دل دریا''مطبوعہ:''ادبِ لطیف''لاہور (سالنامہ)۱۹۶۰ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''پہچان''(سترہ افسانے)	خالدہ پبلی کیشنز،کراچی	طبع اوّل:۱۹۸۰ء
۲۔	''دروازہ''	خالدہ پبلی کیشنز،کراچی	طبع اوّل:۱۹۸۴ء
۳۔	''مصروف عورت''	سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور	طبع اوّل:۱۹۸۹ء
۴۔	''ہیں خواب میں ہنوز''(اکیس افسانے)	دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد	طبع اوّل:۱۹۹۵ء
۵۔	''میں یہاں ہوں''(پندرہ افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور	طبع اوّل:۲۰۰۵ء

غیر مدوّن:

محولہ بالا افسانوی مجموعوں کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جاسکتا ہے۔خالدہ حسین نے ایک ناول بھی شروع کررکھا ہے۔

مستقل پتا:

۲۲۰۔اسٹریٹ ۳۲،جی ۸/۲،اسلام آباد۔پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ پرائڈ آف پرفارمنس (حکومتی سول ایوارڈ):۲۰۰۵ء

نظریۂ فن:

''جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو لکھتی ہوں۔کہانی لکھنے کا عمل میرے لیے اپنے وجود کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش ہے۔ ان دونوں دنیاؤں کے ساتھ جو میرے اندر اور باہر بہتی ہیں اور یوں مسلسل بہتی ہیں کہ دونوں کے بہاؤ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔تو جب مجھے اپنا آپ خطرے میں محسوس ہوتا ہے،میں اپنے آپ کو لکھنے پر مجبور پاتی ہوں۔شاید فنا کا خوف،بقا کی حسرت،زندگی کی محبت مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔میں اس حقیقت کا شدید احساس رکھتی ہوں کہ قلم انسان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑی امانت ہے اور یہ امانت کسی منطق کے تحت کسی کو نہیں ملتی بلکہ جس کسی دیوانے کے نام قرعہ فال نکل آئے،اس کا امین ٹھہرتا ہے۔مگر ہر کوئی یہ بارِ امانت اٹھانے کا اہل نہیں ہوتا۔یہیں سے لکھنے والے کا المیہ شروع ہوتا ہے اور یہ تو محض مقدر کی بات ہے کہ انسان کبھی وہ چیز لکھ سکے کہ دنیا میں اس کا آنا رائیگاں نہ جائے۔''

(بہ حوالہ:مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۱۳۰ کتوبر ۱۹۸۸ء)

پرندہ

خالدہ حسین

ہاں! میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ زینے پر پوری گیارہ سیڑھیاں۔ پھر دروازے کی ہلکی سی آہٹ اور وہ قدم، نرم رواں بادلوں کے سے تیرتے قدم۔ ادھر اس دہلیز سے اندر ہوں گے اور اس کمرے کا وجود بدل جائے گا۔ میں بدل جاؤں گا۔ ایک ان دیکھا مفہوم اس کمرے میں، میرے، اس کے، ہر چیز کے گرداگرد تن جائے گا۔ وہ آہستگی سے اپنے سرد ہاتھ سے میری کلائی تھامے گی۔ اس کی بے وزن انگلیاں میری نبض ٹٹولیں گی اور گھڑی کی ٹک ٹک چاروں سمت فضا بن کر بہنے لگے گی۔

"گڈ" وہ سرہانے رکھے چارٹ پر جھک جائے گی۔

"رات نیند کیسی آئی؟" وہ کرسی میرے قریب کھسکا لے گی۔ تب مجھے وہ تمام باتیں بھولی بسری، دور افتادہ، ادھر ادھر کونوں کھدروں میں پڑی، خاک اٹی یاد آ جائیں گی۔ ایک دم سے، ایک ساتھ، ایک ہی ساعت میں اور میں اسے بتاؤں گا۔ دیکھو یہ جو ایک سیدھی لکیر کا تسلسل ہمارے تمہارے ذہنوں میں ہے سب فریب ہے۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کہیں بھی کوئی پہلے یا بعد شروع اور آخر، آگے اور پیچھے نہیں۔ سب کچھ ایک ہی ہے۔ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل رہی ہیں۔ ایک محلول ہے، میرے سامنے میری زبان پر یا شاید میری آنکھوں میں، بے رنگ، بے ذائقہ محلول، جس طرح بے کار، بے ذائقہ زبان اور یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وجود ہے اور یہ سب کچھ میں اس سے نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ اسی ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ مگر میں کہتے کہتے میرے سب الفاظ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ اس کمرے کے بعد آگے قطار میں اور بھی کمرے ہیں اور سب میں ایک ایک میں، ہاں ایک ایک میں اسی طرح بستر پر کسی ایک ساعت کا منتظر۔ اس سے خائف، اس سے پناہ لیے پڑا ہے اور کیا معلوم میں ان میں سے کون سا ہوں۔ چنانچہ میں اس سے صرف اسی قدر پوچھتا ہوں:

"کیا تم کو بھی ایک ساعت۔ ایک پیچھے پیچھے لپکنے والی ساعت کا انتظار ہے اور تم اس سے خائف ہو۔ ایک تجسس کے ساتھ؟"

''ہاں ہم سب اس کے منتظر ہیں۔ اس سے خائف ہیں اور متجس۔''

''مگر تم ابھی۔ تمہیں مجھ پر کتنی ہی فوقیتیں حاصل ہیں!''

''تم نے پھر بھاری بھاری لفظ بولے۔ دیکھو میں یہ فوقیتیں وغیرہ نہیں سمجھتی۔ میں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچتی ہوں کہ لفظ...... خالی لفظ نہایت مبتذل چیز ہے۔''

''مبتذل؟ تو کیا تم بھی......''

''ہاں...... تم عجیب آدمی ہو...... نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم سے وہ تمام باتیں کہہ دیتی ہوں جو میں کبھی کسی قیمت پر کسی اور سے نہ کہوں...... لفظوں میں سوچنا...... محسوس کرنا نہایت مبتذل حرکت ہے۔''

''تو پھر کس طرح سوچا اور محسوس کیا جائے۔'' میں آپس میں محلول ہوتی ساعتوں میں بہہ گیا۔ ایک بے ذائقہ بے رنگ احساس میری زبان پر تھا اور یہی سب پر محیط تھا۔''

''یہی تو مصیبت ہے۔ اسی لیے میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔'' اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کے اطمینان سے کہا۔ مجھے اس کی خود فریبی پر ہنسی آ گئی اور پہلی بار میں نے نہایت اعتماد کے محسوس کیا کہ میں ہر طرح سے کہیں بہتر ہوں۔ اس پر فوقیت رکھتا ہوں۔

''شاید اس لیے کہ تم لکھ ہی نہ سکتی تھیں۔ تم اچھی رائٹر نہ تھیں، لکھنے والے تو کبھی لکھنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سب کے سب جھوٹے ہوتے ہیں، بناوٹی۔''

''ہاں شاید...... یہ بھی درست ہو...... میں نے کب کہا کہ میں لکھنے والی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں غصے کا سایہ لہرایا۔ لکھنے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ہاں یوں تو بہت سے لکھتے ہیں...... لکھتے رہیں گے۔ دراصل میں نے تو یہ جانا تھا ایک دم...... ایک عجیب خاموش، پرسکون دوپہر میں...... اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ زندگی کہیں بھی نریشن نہیں۔''

''نریشن؟''

''ہاں! کہیں بھی نریشن نہیں...... ہاں لفظ ہیں اور عمل اور وقت ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے اور کچھ ناقص لفظ اور ادھورا عمل، تو یہ نریشن تو دراصل ہم خود بناتے ہیں۔ عمل کو لفظوں میں لکھنے کے مجرم ہم خود ہیں۔ مجرم اس لیے کہ وہ تسلسل جو ہم پیدا کرتے ہیں، وہ منطق جو اس میں لا ڈالتے ہیں، اس کے جھوٹ سچ کو نہیں جانتے محض ایک مفروضہ کی بنا پر لکھ ڈالتے ہیں، لہٰذا یہ غلط ہے۔''

''مگر جب ہم لکھیں گے نہیں تو لفظوں میں سوچیں گے ضرور۔''

''اور سوچ۔ سوچ بغیر عمل کے نہایت مبتذل ہے۔''

''تو پھر ہم کیا کریں؟''

''عمل...... صرف عمل...... اور لکھنا اور سوچنا تو صرف نبیوں اور ولیوں کا حصہ ہے۔''

''تم بھی حیران کرتی ہو...... سخت حیران۔'' میں نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو...... لیٹے رہو...... اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کے مجھے لٹا دیا۔

اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں تو منتظر ہوں۔ وہ سب بھی منتظر ہیں اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے، اس کو مجھ پر کتنی فوقیتیں حاصل

ہیں۔کوئی گننا چاہے تو نہ گن سکے۔

''دیکھو...... یہ سب انتہائی غلط ہے کہ ہم اپنی سوچ کو یوں بحث میں لائیں۔آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔''

''ہم''...... تو کیا میرے تمہارے درمیان وجود کے مفہوم کا کوئی رشتہ بھی ہے۔اگر ہے تو یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے۔ان باقی تمام کے ساتھ بھی ہے،تو تم اس طرح علامت سی بن جاتی ہو اور یہ سب نہایت غلط بات ہے۔بہر حال میں تو تمہیں بتانے والا تھا کہ میں وہاں پھر گیا تھا۔''

''تم...... تم وہاں گئے تھے؟ وہ اپنی حیرت نہ چھپا سکی اور فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ رہی۔

''ہاں...... میں وہاں گیا تھا۔مگر تم کب یقین کرو گی......''شاید میری آواز میں حد سے زیادہ آزردگی تھی۔

''نہیں...... نہیں...... اگر تم چاہو گے تو میں یقین کروں گی۔تم وہاں گئے تھے؟''

''ہاں...... میں وہاں پھر گیا تھا۔آج بھی دھوپ بہت تیز تھی۔سڑک تپ رہی تھی۔میرا سر یوں تھا جیسے کیتلی میں پانی ابلتا ہو۔پیاس کے مارے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔مگر سنو یہ کتنی عجیب بات ہے۔وہاں کی سڑکیں بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں۔وہ کناروں کناروں سے، جہاں جہاں سے گلیوں کی اینٹیں اکھڑی تھیں،اسی طرح تھیں۔گھروں کی کھڑکیوں پر رنگین چقیں اسی طرح گری تھی۔وہ کونے والا مائی جنت کا مکان ہے۔اس کا بوریئے کا پردہ تو ہوا میں ہلتا تھا اور حد ہے اس نے اب تک اس کا سوراخ مرمت نہیں کیا تھا۔نالیوں میں خربوزے کے بیج اور آموں کے چھلکے پڑے تھے۔تو جب میں اسکول والی گلی پار کر کے آگے بڑھا تو میرے گھر کا لکڑی کا دروازہ ادھ کھلا تھا حالانکہ ان گلیوں میں بھیڑ بکریوں کا گھس آنا تو ایک عام سی بات ہے۔پھر بھی ان لوگوں نے دروازہ کھلا رکھا تھا...... تو میں بغیر دستک دیئے اندر چلا گیا۔اندر نہایت اندھیرا تھا اور ٹھنڈک سی۔ڈیوڑھی پار کر کے صحن میں پہنچا تو بڑی اچھی پرسکون روشنی تھی۔آنکھوں کو آرام دینے والی۔سامنے برآمدے میں تخت پوش پر ماں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور حقے کی نے اس کے منہ میں تھی۔مجھے دیکھ کر ماں نے کہا:''بڑی سخت لُو چل رہی ہے۔تم کہاں گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہو۔چلو نمکین لسی کا گلاس پیو۔وہاں میز پر جگ رکھا ہے۔''میں میز کی طرف بڑھا تو ماں نے پیچھے سے کہا:

''اور یہ کیا تم نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔تم جانتے ہو مجھے ان سب کا سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔پانی کی ناپاکی کی مصیبت الگ۔ تمہارے ابا بھی سخت ناراض ہو رہے تھے۔''میں نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

''کیوں...... کیوں ناراض ہو رہے تھے؟''

''بھئی کیا عذاب ڈال رکھا ہے۔''اس نے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔تب میں نے دیکھا برآمدے کی چھت میں جو بڑا کنڈا پنکھے کی خاطر لگا تھا اس میں رنگین ڈوری کے ساتھ وہ لٹک رہا تھا...... ایک پنجرہ۔

''اس میں کیا ہے؟''میں گلاس چھوڑ کر آگے بڑھا۔مگر اس پنجرہ پر کپڑا پڑا تھا۔میں نے اسے ہٹانا چاہا تو ماں چلائی۔

''رہنے دو...... یہ کپڑا نہیں ہٹاؤ۔بیمار ہے بیچارہ...... ڈر جائے گا...... مر جائے گا۔''نفرت کی سیاہ لہر میرے پیٹ میں اٹھی۔

''تو پھر ادھر کیوں رکھا ہے اسے؟''میں دھاڑا۔اس پر ماں بولی:''میں کیا جانوں،تمہیں تو لے کر آئے تھے۔رکھ گئے تھے بغیر کچھ کہے سُنے۔''

''میں......؟ ہاں تو کیا حرج ہے...... ہاں...... میں نے ہی رکھا ہے...... پھر......؟''میں غصہ میں باہر آ گیا۔''کیا تم جانتی ہو وہ پنجرہ

وہاں کیوں ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔
"نہیں ...... میں نہیں جانتی اور کیا تم جانتے ہو کہ وہ مکان، وہ گلیاں ...... آج سے بیس برس پہلے کارپوریشن والوں نے ڈھادی تھیں۔ تمہاری ماں کی زندگی ہی میں؟"
"نہیں، نہیں ...... میں نہیں جانتا ...... مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں وہاں گیا تھا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔
"ہاں ...... تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب میں چلوں۔ وقت ہو گیا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مگر اس کے جانے کے بعد ...... فوراً بعد میں نے اگلے روز اس کے آنے کی ساعت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل کر سیال بنیں، میری آنکھوں کا خون، پورے وجود کے اندر باہر چاروں سمت بہہ نکلی تھیں اور وہ یہ کہہ گئی تھی کہ لفظوں میں سوچنا اور سوچ کے متعلق سوچنا نہایت مبتذل حرکت ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ اور میں ...... ہم دونوں ابتذال سے اس قدر خوفزدہ ہیں۔ مگر یہ کیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی ...... اس کی آنکھوں میں اس کی آنکھوں میں ایک جانتا ہوا سا ...... راز بھرا احساس تھا وہ یقیناً جانتی ہے، سب جانتی ہے کہ وہ میرے برآمدے کی چھت سے لٹکتا پنجرہ وہاں کیوں ہے۔ کیا میں اسے وہاں رکھ آیا تھا؟ ماں کہتی ہے ...... اور وہ اس پر لپٹا کپڑا؟ ہاں رات کو پرندے جانوروں سے ڈرتے ہیں ...... شاید اسی لیے ...... مگر ماں کہتی ہے وہ بیمار ہے۔ وہ پردہ ہٹا تو ڈر جائے گا، مر جائے گا۔ تو کیا وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ شاید وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اب اس کے آنے کی ساعت، جو ایک روشن دیوار کی طرح کہیں میرے پیچھے کھڑی تھی اور میں اس کے سایہ میں تھا۔ اب اس دیوار نور کے میرے قریب آنے میں آوازوں، لفظوں اور ادھوری حرکتوں کے رینگتے سرسراتے ٹکڑے حائل ہیں۔
اس کے قدموں کی چاپ پر میں سنبھل کر ہی بیٹھا۔ میرا رواں رواں ساعت بن گیا اور گھڑی کی ٹک ٹک کا سمندر چاروں سمت بہنے لگا۔
"گڈ ......" اس نے آہستہ سے کرسی آگے کھسکائی۔ "رات نیند کیسی آئی؟"
"سنو روز تم مجھ سے پوچھتی ہو ...... آج تم بتاؤ ...... رات تمہیں نیند کیسی آئی؟" وہ کچھ ٹھٹھکی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔
"نیند ......؟ نیند دراصل بہت ہی ذاتی قسم کی ...... بے حد ذاتی قسم کی چیز ہے اور میں اس کا حجاب نہایت ضروری سمجھتی ہوں۔"
"تم مجھے حیران کرتی ہو۔" میں نے پھر کہا۔ جب تم میں اور مجھ میں ایک خاموش معاہدہ ہے ...... مگر میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ نیند سے پہلے کے چند لمحے وہ ہیں، جب ہم بالکل تنہا اور نہتے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے اردگرد کے تمام حصار ٹوٹ چکتے ہیں تو اس وقت محض ایک خوف مجھے گھیر لیتا ہے۔ وہ تم جانتے ہو ......؟"
"ہاں میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔"
"ہاں یہ خوف کہ یہ نہتہ لمحہ اگر کبھی ختم نہ ہُوا تو ...... اگر یہی ہمارے حصے کا تمام وقت بن گیا تو ......؟"
"ہاں ...... تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم کو مجھ پر اتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ تم خود کہتی ہو یہ مبتذل ہے۔"
"یہ سوچ نہیں ...... اس کے لفظ ہیں ...... یہ تو احساس ہے۔
محض احساس ...... دن کے اجالے میں ہم اپنے آپ کو دوسروں میں کھو دینے کی کوشش کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ وہ لمحہ ختم ہوا۔ مگر یہ سب غلط ہے۔ رات، نیند اور فنا ہم پر تنہا آتی ہے۔ تم نے سنا ...... تنہا۔"
"ہاں ...... میں نے سنا ...... میں نے سن لیا ...... مگر میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ تنہا نہ ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں؟ کیا یہ بالکل ناممکنات

میں سے ہے؟" میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا..... مگر اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے مجھے لٹا دیا۔

"لیٹے رہو..... لیٹے رہو..... یہ میں نہیں جانتی....." اس نے فوراً مجھ سے نگاہ چُرائی۔ اور باہر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے یہ خزاں کا موسم ہے۔ باہر ٹھنڈی صبح..... تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ خشک بالکل خشک اور درختوں سے خشک پتے مسلسل ہر لمحہ۔ ہر آن گرتے چلے جارہے ہیں۔ صبح وشام..... اور کبھی کبھی اچانک بے حد مصروفیت میں رک جاتی ہوں..... یکدم مجھے خیال آتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا آخری دن ہے۔ چنانچہ میں اپنے اس آخری دن کو دیکھتی ہوں۔ ایک کی اترتی دھوپ کو اور جب دیواروں کو اور سوچتی ہوں یہ میرا آخری دن ہے۔ یہ کیسا لگتا ہے اور شاید ہر کوئی کبھی، کسی وقت اچانک رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ آخری دن ہے۔ مگر میں بھول گئی ہم نے طے کیا تھا کہ کبھی اپنی سوچ پر بات نہ کریں گے۔"

"نہیں..... نہیں..... ہمیں ضرور بات کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ بہت سی باتیں جب نہ کی جائیں تو ٹھوس واقع بن جاتی ہیں اور پھر ان کو ختم کرنا، ان سے بچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔" میں نے اسے روکنے کی نہایت کمزوری کوشش کی۔ وہ گھڑی دیکھ رہی تھی۔

"تم وقت کی اتنی پابند ہو..... کیوں اتنی پابند ہو۔ تم ایک لمحہ پہلے آتی ہو نہ بعد میں۔ دو پل رک جانے کو، کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"کیوں..... یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔ دراصل مجھے گھر وقت پر پہنچنا ہوتا ہے۔ جب میں ان کو کھانا کھلاتی ہوں تو میری تمام بے کار سوچ مر جاتی ہے، میں خوش ہوتی ہوں۔ مگر پھر کچھ ہی دیر میں وہ لڑھکتے موتیوں کی طرح مجھ سے الگ۔ دور ہو جاتے ہیں اور عمل رک جاتا ہے۔ وقت رواں رہتا ہے، لفظ یلغار کرتے ہیں اور یہ سب انتہائی بے سود ہے۔"

"ہاں..... تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر....."

"اچھا..... دوا کھانا نہیں بھولنا..... اور سر اونچا رکھو ادھر تکیہ پر....."

وہ بادلوں کے سے تیرتے قدموں سے چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا..... اوہ خدا..... اس کے جاتے ہی یہ مجھے اتنا کچھ یاد کیوں آ جاتا ہے۔ مجھے تو اُس سے پوچھنا تھا، اُس پنجرہ کے متعلق اور اس کے اندر رہنے والے کے بارے میں۔ پھر یہ سب کچھ کل پر ملتوی ہو گیا۔ لیکن نیند سے پہلے کا ایک یہ نہتہ لمحہ اگر طویل ہو گیا۔ مخلول ہو گیا اور ساعتوں میں تو سب کا رنگ بدل جائے گا..... ذائقہ بدل جائے گا..... اور ہم سب کے سب اس میں بہہ جائیں گے۔

مگر اچانک مجھے برابر والے کمرے سے پلنگ اور کرسیاں گھسیٹنے کی آواز آئی..... پھر بوجھ گھسیٹتے، بمشکل سیڑھیاں اترتے ناہموار قدموں کا ہجوم..... اور سب کچھ تھم گیا۔ تو یہ واقعی کسی کا، ساتھ والے کا آخری دن تھا۔ یہ کیسا تھا؟ اس نے کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑانے کی کوشش کی..... وہاں کہیں کہیں اکا دکا پتے اڑ رہے تھے اور بس..... تو یہ دن بھی اور دنوں کا سا تھا اور پھر ایک دم مجھے ہنسی آ گئی۔ تو ایک بار پھر وہ کوئی دوسرا تھا..... میں نہیں تھا۔ میرے پیٹ میں ایک تاریک ہستی حل حل کرتی تھی۔ اچھا وہ کل سب سے پہلے مجھے یہی خبر دے گی۔

مگر میرا خیال غلط تھا۔ اس نے اگلے روز مجھے یہ خبر نہ دی۔ وہ اسی طرح ایک خوشگوار واہمے کی صورت وارد ہوئی، میری نبض گنی اور چارٹ پر جھک گئی۔ اس کی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے گزری رات کی بھولی بسری ساعتیں یوں یاد آئیں جیسے صدیوں پہلے کی بات۔ اتنی جلد ان پر خاک اٹ گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''میری طرف دیکھو۔'' میں نے ڈوبتی آواز میں کہا..... میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اوپر میرے درمیان وجود کے مفہوم کا کون سا رشتہ ہے۔ مگر وہ اسی طرح جھکی چارٹ پر لکھتی رہی۔ شاید وہ بھی اس رشتہ کا تعین کرنا چاہتی تھی اور مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ گرم لہو میری کنپٹیوں اور آنکھوں میں کھولنے لگا۔ میرا سر بھاپ بن کر اڑ گیا۔

''میری نبض نہ گنو..... میرا بلڈ پریشر نوٹ نہ کرو..... اس کاغذ کو چاک کر دو۔'' میں نے گویا زہر گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نہ بھی آؤ تو کیا ہے۔ لیکن یہ تو تمہارا فرض ہے۔ مجھے بتاؤ اور کیا کیا فرض ہے..... میں نے..... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔'' میں نے غصہ سے کانپتی آواز میں کہا۔ میری مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔

''سکون..... سکون..... لیٹ جاؤ.....'' اس نے مجھے آہستگی سے لٹانا چاہا۔

''نہیں..... تم نے ایک ان کیا معاہدہ توڑا ہے۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی میں بیٹھی رہی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ خاموش رہی اور گھڑی ٹک ٹک بولتی رہی۔

—''سنو..... اگر سن سکتی ہو تو سنو..... میں وہاں پھر گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں..... جب آج میں وہاں گیا تو ماں وہاں تخت پوش پر بیٹھی چاول چُن رہی تھی اور گھر کا آنگن ایسا تھا جیسے ابھی ابھی اباجی ناراض ہو کر، بول بول کر، باہر نکلے ہوں..... ماں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ آج جانے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آ رہی..... کوئی ہل جل نہیں۔''

''کس میں سے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے برآمدے کی چھت سے لٹکے اس ڈھکے ڈھکائے پنجرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے چاہا کہ لپک کر اُٹھا کر دیکھوں کیا بات ہے۔ مگر ماں نے مجھے روک دیا۔

''نہیں نہیں..... رہنے دو۔ بیمار ہے بے چارہ۔ ڈر جائے گا۔ مر جائے گا۔ وہ آتی ہی ہو گی۔ خود ہی دیکھے گی۔''

''وہ کون.....؟'' میں نے پوچھا تو اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا..... میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں..... تم..... اور تم کہتی ہو تم وہاں کبھی نہیں گئیں۔''

''میں کھڑی تھی؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ہاں تم..... اور پھر جانتی ہو، سب سے بڑا نہ بتہ لمحہ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تم چپکے سے آئیں، پنجرہ کا غلاف اٹھایا..... پھر تمہارے مُنہ سے عجب حقارت اور کراہت بھری آواز نکلی ''اوں ہوں'' تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے اٹھایا۔

''اُوں ہوں..... سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے.....'' تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا..... اس کو جو اُس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی..... میں آگے لپکا، دیکھوں..... اسے دیکھوں۔ مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آ دبایا کہ کہیں یہ اس نہتے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رُک گیا۔ چلا آیا بھاگتا ہوا۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں۔''

''نہیں..... نہیں..... مجھے نہیں دکھاؤ.....'' اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار ٹھنڈک بھرے ہاتھ رکھے۔ ''مجھے نہیں دکھاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے..... ہم ایک دوسرے کے زخم نہیں دیکھیں گے، مگر کیا تمہیں یقین ہے کل رات جو آوازیں برابر کے کمرے سے آئیں وہ اسی کمرے کی تھیں، تمہارے کی نہ تھیں؟''

O

منشا یاد

نام : محمد منشا

قلمی نام : یاد بھٹی/محمد منشا یاد/منشا یاد

پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء بہ مقام موضع ٹھٹھہ نستر نزد جنڈیالہ شیر خاں، تحصیل و ضلع شیخوپورہ پنجاب۔

تعلیم : ڈپلوما: سول انجینئرنگ، ۱۹۵۷ء

ایم۔اے (اردو۔ پنجابی)

ایم۔بی ہائی سکول حافظ آباد سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۵ء میں پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ رسول سے ۱۹۵۷ء میں سول انجینئرنگ کا ڈپلوما کیا۔ ۱۹۶۴ء میں فاضل اردو اور ایف۔اے کے امتحانات بطور پرائیویٹ امیدوار پاس کیے۔ ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے بی۔اے اور ۱۹۶۷ء میں حشمت علی اسلامیہ کالج، راولپنڈی سے ایم۔اے (اردو) بطور پرائیویٹ امیدوار کیا۔ بعد ازاں پرائیویٹ طالب العلم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۷۲ء میں ایم۔اے (پنجابی) کیا۔

وفات : اسلام آباد ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۲ء

مختصر حالات زندگی:

ضلع شیخوپورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹھٹھہ نستر کے طبیب حاجی نذیر احمد کے ہاں یکم شوال بروز عید پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول میں دورانِ تعلیم اپنی رہائش گاہ سے اسکول تک پہنچنے کے لیے سائیکل پر بیس میل کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ بچپن اور لڑکپن میں لوک داستانیں اور پنجابی قصے کہانیاں پڑھتے پڑھتے شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ میٹرک کرنے کے زمانے میں ان کی چند نظمیں اور کہانیاں پندرہ روزہ ''ہدایت'' لاہور میں شائع ہوئیں۔ اس پرچے کو نظر زیدی مرتب کیا کرتے تھے۔ والدہ کی وصیت اور خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہا اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے انہیں میٹرک کے بعد سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے

ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ ۱۹۵۸ء میں پی ڈبلیو ڈی شعبہ بحالیات راولپنڈی میں بطور سب انجینئر آئے، کچھ وقت کوہ مری میں گزارا۔ ۱۹۶۰ء میں بطور سب انجینئر سی۔ڈی۔اے (دارالحکومت اسلام آباد کا ترقیاتی ادارہ) سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ ۱۹۸۰ء میں سی۔ڈی۔اے کے افسر تعلقات عامہ مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۸۳ء میں ''افسر اعلیٰ شکایات'' سی۔ڈی۔اے مقرر ہوئے، ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر، کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی، اسلام آباد سے ریٹائر ہوئے۔۔

حلقۂ ارباب ذوق اسلام آباد کی بنیاد رکھی۔ تقریباً دس برس تک حلقۂ ارباب ذوق اسلام آباد اور ''بزم کتاب'' اسلام آباد کے سیکرٹری رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے پنجابی اور اردو میں متعدد ڈرامے لکھے۔ ''علامت''، لاہور کے شریک مدیر اور اسلام آباد کی ادبی انجمنوں کی روح رواں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''کہانی'' مطبوعہ ''داستان گو'' لاہور نومبر ۱۹۵۹ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''بند مٹھی میں جگنو'' (اردو افسانے)	ماورا پبلشرز، راولپنڈی	طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
	(اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبۂ شاہکار لاہور نے شائع کیا ہے)		
۲۔	''ماس اور مٹی'' (اردو افسانے)	ماڈرن بک ڈپو، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۰ء
۳۔	''خلا اندر خلا'' (اردو افسانے)	مطبوعات حرمت، راولپنڈی	طبع اوّل: ۱۹۸۳ء
۴۔	''وقت سمندر'' (اردو افسانے)	ماڈرن بک ڈپو، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۵۔	''وگدا پانی'' (پنجابی افسانے)	پنجابی ادبی بورڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
۶۔	''۱۹۷۷ء کے شاہکار افسانے'' (مرتبہ)	مکتبۂ شاہکار، لاہور	طبع اوّل ۱۹۷۸ء
	(مختلف افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا انتخاب)		
۷۔	''منتخب افسانے: ۸۰۔۱۹۷۹ء'' (بہ اشتراک: فتح محمد ملک)	مطبوعات حرمت، راولپنڈی	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۸۔	''منتخب افسانے: ۱۹۸۱ء'' (بہ اشتراک: فتح محمد ملک)	مطبوعات حرمت، راولپنڈی	طبع اوّل: ۱۹۸۲ء
۹۔	''منتخب افسانے: ۸۳۔۱۹۸۲ء'' (مرتبہ: محمد منشایاد)	مطبوعات حرمت، راولپنڈی	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
۱۰۔	''درخت آدمی'' (افسانے)	بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۱ء
۱۱۔	''دُور کی آواز'' (افسانے)	ماڈرن بک ڈپو، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۹۴ء
۱۲۔	''تماشا'' (افسانے)	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۹۸ء
۱۳۔	''خواب سرائے'' (افسانے)	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع اوّل: ۲۰۰۵ء

۱۴۔ ''ناواں تاواں تارا'' (پنجابی ناول) دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد طبع اول: ۱۹۹۷ء

۱۵۔ ''منشا یاد کے منتخب افسانے'' مثال پبلشرز، فیصل آباد طبع اول: ۲۰۰۸ء

غیر مدوّن:

مضامین اور ٹیلی ڈراموں کا ایک مجموعہ۔

اعزاز:

۱۔ وارث شاہ ہجرہ ایوارڈ (اکادمی ادبیات پاکستان) برائے ''وگدا پانی'': ۱۹۸۷ء

۲۔ نقوش ایوارڈ

۳۔ وارث شاہ ایوارڈ، اکادمی ادبیات پاکستان، برائے ''ناواں تاواں تارا'': ۱۹۹۸ء

۴۔ پرائڈ آف پرفارمنس (حکومتی سول ایوارڈ): ۲۰۰۴ء

۵۔ فروغ اردو ادب ایوارڈ (دوحہ قطر): ۲۰۰۸ء

مستقل پتا:

''افسانہ منزل'' ۸۔ سیونتھ ایونیو، جی سیون فور، اسلام آباد

نظریۂ فن:

''افسانہ اختصار اور وحدت تاثر کا حامل ہو۔ اس میں کہانی کا تار یا خیال کا تسلسل موجود ہو۔ اظہار فطری اور دلکش ہو، لیکن محض کسی واقعہ کا سادہ بیان نہ ہو۔ اس میں تخلیقی کاوش اور افسانویت موجود ہو۔ موضوع میں نیاپن اور تنوع ہو۔ فکر و احساس کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ پڑھنے والے کا اپنا تجربہ اور واردات بن جائے، بحیثیت مجموعی زندگی اور فن کو آگے بڑھائے۔''

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ: مارچ ۱۹۸۶ء)

راستے بند ہیں

منشا یاد

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

میں اُس سے پوچھتا ہوں۔

"جب تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟"

وہ پہلے روتا اور پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

"میں میلے میں نہیں آیا...... میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ سُجھائی نہیں دیا۔"

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آ جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ ہارن بجاتی اور دھواں اُڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دُھول سے اَٹے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے۔ لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور وغل کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاؤڈ سپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی

ہیں۔ جھولوں کی چیخیں، ڈھولوں کی گھمکاریں' مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی بک جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے۔ وہ اسے کسی سُریلے نغمے کی طرح سنتا اور چاٹتا ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی بوتلوں کی دکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے میرے لئے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا' اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اس بھٹی کے قریب کھڑا اجھلستا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اس کی ہتھیلی پر گرم گرم پوری رکھی ہو۔ عجیب داہیات انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا' جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے' ناچتی گاتی عورتیں' سرکس کے جانوروں کے کرتب' موت کے کنوئیں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی' اوپر نیچے جاتے جھولے۔ فلم کی سکرین پر درد گانے گاتے ہوئے عاشق و معشوق اور مداری کے توپ چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو خرچ بھی کچھ نہیں آتا مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں' مٹھائیوں' فالودوں' آئس کریموں' سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا۔ گھورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے اور حالانکہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں' پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اکتا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

الٰہی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے پر ہر وقت مُجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سروں پر رکھے اور دانتوں سے پکڑے ہوئے نوٹ چن چن کر تھک جاتی ہیں اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ پھر سردار محمد تھانیدار ہے اسے اعتباری آدمیوں کی ضرورت بھی ہے لیکن میں نے اسے سردار محمد کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ علیا نائی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ رچھانی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے حجامتیں بنانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہرو سانسی ایک آدمی ہے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لئے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اسے دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے حالانکہ اس نے زندگی بھر اسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اسے مہرو سانسی اچھا لگتا ہے شائد اس لئے کہ مہرو گندی جھوٹی چیزیں سہی ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا

ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آ گئی تو وہ کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لئے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا۔ تخت پوش کے نیچے قلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دوران مہرو کو باہر نکل کر دو بار گلے میں انگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آ جاتی تو ایک آدھ بار اور قے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا اس سے بے پروہ ہو کر رہتا تو یقیناً بھٹک جاتا...... چلمیں بھرتا...... دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر قلاقند یا گلاب جامنیں کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکاندار یا پولیس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ٹک جیسی آواز سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

وہ حلوہ پوری، قلاقند اور بالوشاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بہلتا۔ اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے، لعن طعن کی ہے، لیکن وہ مصر ہے کہ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے، جن کے ذائقے سے وہ ناآشنا ہے۔ گزشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو مجھے زندہ نہ دیکھے گا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب الجھن میں ہوں۔ شائد وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زندہ، خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب، جھولوں کے مناظر اور مسخروں ہیجڑوں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے، بھنے ہوئے گوشت، روسٹ مرغ اور قلاقند کے ذائقوں کے لئے قتل و غارت پر اُتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے ''جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقوں سے محروم کیوں ہوں؟''

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور اسے کیسے سمجھاؤں اور بھٹکنے سے کیسے بچاؤں؟ میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا پرتو ہیں یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قلاقند کھا رہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے کہیں روسٹ مرغ اُڑاتا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ وہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے

اور اس لذت میں برابر کا حصہ دار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھادی جائے تو وہ اس سے سر مو اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

''ٹک'' بوتل کھلنے کی آواز آتی ہے۔

ایک پتلا دبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

''واہ وا...... کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے۔'' پھر آستین سے منہ پونچھ کر کہتا ہے۔''مزا آ گیا۔'' سیخ کبابوں کی خوشبو پھیلی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم روک لیتی ہے۔

وہ منہ کھولے بغیر تکوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے چباتا ہے۔ پھر ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی ہو تو مزا دیتا ہے۔''

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظریں بالوشاہی کے تھال پر ہیں۔ وہ دکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے بالوشاہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے اس کا منہ تھک جاتا ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے مگر بالوشاہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ میں کہتا ہوں ''اور کھاؤ۔''

''نہیں بس۔'' وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں۔

''منہ سلونا کرو گے؟''

''ہاں......''

پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑکڑاتے ہیں۔

''کیسے ہیں؟''

''بہت اچھے ہیں بس ذرا مصالحہ تیز ہے۔''

''اور کیا پسند کرو گے؟''

''میں نے آج تک سیب نہیں چکھا۔''

میں اسے پھلوں کی دکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

''یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو۔''

وہ ایک سیب نگاہوں سے اٹھاتا ہے دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔

''یہ تو ناشپاتی ہے۔''

''یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔''

وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے ''یہ امرود ہے۔''

''یہ امرود نہیں سیب ہے۔''

وہ پھر کوشش کرتا ہے پھر کہتا ہے:

''یہ آزو ہے۔''

''یہ آزو نہیں ہے۔'' مجھے غصہ آجاتا ہے ''تم اُلو کے پٹھے ہو۔''......

وہ مجھے اُداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے۔

''مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں۔''

''اچھا چھوڑو'' ...... میں کہتا ہوں۔''اب آگے چلتے ہیں۔''

ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

''کیا بات ہے بھائی؟'' ...... وہ پوچھتا ہے۔

''حادثہ ہو گیا...... آدمی ٹرک کے نیچے آکر کچلا گیا۔''

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے ...... پھر کہتا ہے

''ٹرک ...... میرے اوپر سے ٹرک گزر رہا ہے!''......

''نہیں'' ...... میں چلاتا ہوں......

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں، وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے......!



رشید امجد

نام : اختر رشید
قلمی نام : اختر رشید ناز/رشید امجد
پیدائش : 5 اپریل 1940ء بہ مقام سرینگر، کشمیر (بھارت)
تعلیم : ایم۔اے (اردو)، پی ایچ۔ڈی

ابتدائی تعلیم برن ہال اسکول، سرینگر میں حاصل کی۔1955ء میں ڈینیز ہائی اسکول، راولپنڈی سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ 1962ء میں ایف اے 1964ء میں بی اے اور 1967 میں گورڈن کالج راولپنڈی سے ایم اے (اردو) کرنے کے بعد 1991ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے "میراجی: شخصیت اور فن" کے موضوع پر کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

مختصر حالات زندگی:

سرینگر کے قالینوں کے نقاش غلام محی الدین مونس نقشی کے ہاں سرینگر، کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر 1947 میں والد، والدہ بڑی بہن اور سات سالہ رشید امجد پر مشتمل یہ مختصر سا خاندان دیگر قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ چوک رلیہ بازار سے ملحقہ کشمیری بازار کے محلہ نانک پورہ میں محکمہ متروکہ وقف املاک کے زیر انتظام آ جانے والے گرونانک جی کے غیر آباد گوردوارہ میں آ کر آباد ہو گیا۔ والد زیادہ دیر نہ جیئے۔ گھر کے باقی ماندہ افراد، جن میں دو چھوٹی بہنوں کا اضافہ ہو گیا تھا، کی کفالت کے لیے 1956ء میں رشید امجد نے 501۔ سنٹرل ورکشاپ، راولپنڈی میں کلرک کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ 1966ء تک چلا۔ 1966ء تا 1967ء سی۔بی اسکول دریا آباد میں ٹیچر رہے۔ اسی دوران میں راولپنڈی کے جگت استاد غلام رسول طارق کی مشاورت سے افسانہ نگاری کا آغاز ہوا تو گوروجی کا گردوارہ بیسویں صدی عیسوی کے آٹھویں دہے تک راولپنڈی، اسلام آباد کے افسانہ نگاروں کی ادبی بیٹھک بنا رہا۔ ایم اے کر لینے کے بعد 1968ء میں اردو کے لیکچرر کے طور پر فیڈرل گورنمنٹ کالج، واہ کینٹ چلے گئے۔ 1971 میں بدلی ہو کر ایف جی سرسید کالج، راولپنڈی آئے۔ 1976 میں رخسانہ نسرین سے شادی

ہوئی اولاد: ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ 1978ء میں اسسٹنٹ پروفیسر 1993ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 1999ء میں پروفیسر بنے۔ ''دستاویز''، ''دریافت'' اور ''تخلیقی ادب'' کے مدیر رہے۔ مارچ 2000ء میں پروفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ جولائی 2001ء سے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز' اسلام آباد میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو ہیں۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''سنگم'' مطبوعہ ''ادبِ لطیف'' لاہور بابت: ستمبر 1960ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''بیزار آدم کے بیٹے'' (افسانے)	دستاویز پبلیشرز' راولپنڈی	طبع اوّل: 1974ء
۲۔	''ریت پر گرفت'' (افسانے)	ندیم پبلی کیشنز' راولپنڈی	طبع اوّل: 1978ء
۳۔	''سہ پہر کی خزاں'' (افسانے)	دستاویز پبلشرز' راولپنڈی	طبع اوّل: 1980ء
۴۔	''پت جھڑ میں خود کلامی'' (افسانے)	اثبات پبلی کیشنز' راولپنڈی	طبع اوّل: 1984ء
۵۔	''بھاگے ہے بیاباں مجھ سے'' (افسانے)	مقبول اکیڈمی' لاہور	طبع اوّل: 1988ء
۶۔	''وشت نظر سے آگے'' (افسانوں کی کلیات)	مقبول اکیڈمی' لاہور	طبع اوّل: 1991ء
۷۔	''عکس بے خیال'' (افسانے)	دستاویز مطبوعات، لاہور	طبع اوّل: 1993ء
۸۔	''دشت خواب'' (افسانے)	مقبول اکیڈمی' لاہور	طبع اوّل: 1993ء
۹۔	''کاغذ کی فصیل'' (افسانے)	دستاویز مطبوعات، لاہور	طبع اوّل: 1993ء
۱۰۔	''گم شدہ آواز کی دستک''	فیروز سنز' لاہور	طبع اوّل: 1996ء
۱۱۔	''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' (افسانے)	حرف اکادمی' راولپنڈی	طبع اوّل: 2002ء
۱۲۔	''تمنا بے تاب'' (خود نوشت)	حرف اکادمی' راولپنڈی	طبع اوّل: 2001ء
۱۳۔	''ایک عام آدمی کا خواب'' (افسانے)	حرف اکادمی' راولپنڈی	طبع اوّل: 2002ء
۱۴۔	''عام آدمی کے خواب'' (افسانے)	پورب اکادمی' اسلام آباد	طبع اوّل: 2007ء
۱۵۔	''نیا ادب'' (تنقید)	تعمیر ملت پبلشرز' منڈی بہاوالدین	طبع اوّل: 1969
۱۶۔	''رویے اور شناختیں'' (تنقید)	مقبول اکیڈمی ف لاہور 1988	طبع اوّل: 1988ء
۱۷۔	''یافت و دریافت (تنقید و تحقیق)	مقبول اکیڈمی لاہور 1989	طبع اوّل: 1989ء
۱۸۔	''شاعری کی سیاسی و فکری روایت (تحقیق)	دستاویز مطبوعات' لاہور 1993	طبع اوّل: 1995ء
۱۹۔	''میراجی شخصیت و فن'' (تحقیق)	مغربی پاکستان اکیڈمی' لاہور	طبع اوّل: 1995ء

۲۰۔ ''پاکستانی ادب کے معمار'' (میرا جی) (تحقیق)	اکادمی ادبیات پاکستان	طبع اوّل: 2006ء
۲۱۔ ''پاکستانی ادب'' (چھ جلدیں) مرتبہ	ایف جی سرسید کالج' راولپنڈی	طبع اوّل: 1984/1980ء
۲۲۔ ''اقبال فکر و فن'' (مرتبہ)	ندیم پبلی کیشنز' راولپنڈی	طبع اوّل: 1984ء
۲۳۔ ''تعلیم کی نظریاتی اساس'' (مرتبہ)	ندیم پبلی کیشنز' راولپنڈی	طبع اوّل: 1984ء
۲۴۔ ''مرزا ادیب' شخصیت و فن'' (مرتبہ)	مقبول اکیڈمی لاہور	طبع اوّل: 1984ء
۲۵۔ ''پاکستانی ادب (نثر) 90 (مرتبہ)	اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد	طبع اوّل: 1991ء
۲۶۔ ''پاکستانی ادب (نثر و افسانہ) 91ء (مرتبہ)	اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد	طبع اوّل: 1995ء
۲۷۔ ''پاکستانی ادب'' (نثر و افسانہ) 94ء (مرتبہ)	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	طبع اوّل: 1995ء
۲۸۔ ''مزاحمتی ادب'' (مرتبہ)	اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد	طبع اوّل: 1995

غیر مدوّن:

متعدد تنقیدی مضامین

مستقل پتا:

52-c' لین A-7 گلستان کالونی' راولپنڈی

اعزاز:

-1 ''نقوش'' ایوارڈ برائے تنقیدی مضمون ''میرا جی کی نظمیں'' 95-1994ء

-2 ''پرائیڈ آف پرفارمنس (حکومتی سول ایوارڈ) 2006ء

نظریۂ فن:

''میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہونے کا احساس ہے۔ یہ میری مجبوری نہیں میرا اظہار ہے کہ اظہار کے بغیر کسی شے کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ جو وجود رکھے گا، وہ اس وجود کا احساس بھی کرائے گا۔ میرے اظہار کا ذریعہ لفظ ہے۔ میں لفظوں کو جوڑ جوڑ کر اپنے آپ کو منکشف کرتا ہوں۔ میرا سفر، ناک کی سیدھ میں نہیں۔ جو کچھ نظر آتا ہے میرے تجربے' مشاہدے اور مطالعے کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ جب بھی لکھنے بیٹھتا ہوں تو یہ تجربہ میری کہانی میں ایک خارجی معنویت پیدا کرتا ہے' اسے سماج سے جوڑتا ہے اور اس میں روحِ عصر اور جدید حسیت پیدا کرتا ہے۔ میرا باطنی سفر پیچ در پیچ ہے کہ یہاں کوئی منزل نہیں، ایک سرمئی دھند ہے جس میں چلتے رہنا' چلتے ہی رہنا' ایک مبہم سی سچائی' ایک ایسا تجربہ جسے بیان کرنے کے لیے علامت اور استعارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی میری کہانی کا اثاثہ ہے۔ یہ میری کہانی کا باطن ہے' اس کی اندرونی معنویت ہے جو اسے ماورائے عصر بناتی ہے۔''

(مکتوب بنام: مرزا حامد بیگ' بابت 14 اپریل 2008ء)

○

حوالہ جات:

۱۔ غلام محی الدین اردو، پنجابی اور کشمیری زبان کے شاعر تھے۔ مونس تخلص اور نقاش ہونے کے سبب ''نقشی'' کہلاتے تھے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہوئے (۱) ''ضرب حسین'' (سانحہ کربلا پر نظمیں) مطبوعہ لاہور (۲) ''کلام مونس'' مطبوعہ مقصود پبلشرز اردو بازار لاہور طبع اول ۲۰۰۲ (۳) نقش خیال'' (مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی) مطبوعہ اسلوب پبلشرز اسلام آباد طبع اول ۲۰۰۷ء

ڈوبتی پہچان

رشیدامجد

سُورج جب قبرستان کے گھنے درختوں سے الجھتا، رینگ رینگ کر اپنے بل میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا' مستری نے قبر کا کام مکمل کرلیا۔

پچھلے کئی مہینوں سے اس کی خواہش تھی کہ ماں کی قبر پکی کرائے لیکن خالی جیبیں اس خیال کو تھپتھپا کر آنے والے دن کی جھولی میں ڈال دیتیں۔ وہ اندر ہی اندر سلگ سلگ کر خیالوں ہی خیالوں میں کبھی اینٹیں' کبھی سیمنٹ' کبھی ریت خریدتا' ماں کی خوبصورت سی سل بنواتا اور سونے سے پہلے اس خیال کو پوری توجہ سے آنے والے دن کی جیب میں ڈال دیتا۔ بہت دن ہوئے اس کے ڈرائنگ روم میں ایک تصویر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی ماں کی تصویر ہے۔ لیکن کچھ کا کہنا تھا کہ یہ کوئی خیالی تصویر ہے۔۔۔ تصویر میں ایک عورت غم میں گندھی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے خالی منظر کو گھور رہی تھی۔ خالی یوں کہ منظر میں جو وادی تھی وہ اپنے دریاؤں کے باوجود دست بدعا تھی۔ وہ اس تصویر کے بارے میں جاننے کا شوق تو رکھتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس تصویر کی وادی اتنے سارے دریاؤں کے باوجود کسی بنجر دھند میں کیوں لپٹی ہوئی ہے۔ دریاؤں کا پانی سوکھ کیوں گیا ہے اور زمین کے ہاتھ خالی کیوں ہوئے جا رہے ہیں؟ لیکن اس کے لیے اس نے کبھی لمبی چوڑی چھان بین نہیں کی۔ ایک دو بار ماں سے پوچھا مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ بلکہ الٹا اس سے پوچھ بیٹھی کہ وہ تصویر کے بارے میں اتنا متجس کیوں ہے؟

جب کبھی وہ ڈرائنگ روم میں اکیلا ہوتا' تصویر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی وہ اس کے خطوط میں شناسائی کی روشنی تلاش کرتا۔ بہت پہلے جب وہ چھوٹا تھا اس نے اپنے باپ سے بھی یہی سوال کیا تھا۔ باپ نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسے تیز نظروں سے گھورا اور کہا۔۔۔ ''تم اپنی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہے۔''

جس دن اس کا باپ فوت ہوا تصویر بلک بلک کر روئی۔ لیکن اس وقت اسے اپنا ہوش نہیں تھا' وہ خود چھلک چھلک کر رو رہا تھا۔ بعد میں دوسرے تیسرے دن جب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو اس نے ماں کو بتایا کہ تصویر بھی روئی تھی۔ ماں ہنس پڑی۔۔۔ ''پگلے' کہیں تصویریں بھی روتی ہیں'' ماں کی ہنسی گہرے غم میں گندھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ کہے بغیر ڈرائنگ روم میں چلا آیا اور تصویر کے

سامنے کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ آنکھیں صاف ڈھلی ہوئی تھیں اسے شبہ سا ہوا کہ ان میں نمی تیر رہی ہے اور منظر اپنی وادی سمیت بھوک کی دھند میں لپٹا اپنی پہچان کھو رہا ہے۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک عورت ہونٹوں پر غم میں گندھی مسکراہٹ سجائے سامنے کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ وادی جس کی راہیں خشک ہوئی جا رہی تھیں اور ہونٹوں پر نفرتوں کی پپڑیاں جم رہی تھیں وہ اونگھ گیا۔

اس کی ماں مر رہی تھی اور تصویر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ بڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ جس دن برسات کی پہلی جھڑی لگی وہ ساری رات کروٹیں لیتا رہا۔ بار بار خیال آتا کہ پانی قبر میں گھس گیا ہے اور ماں سردی سے ٹھٹھرتی دیوار سے لگی اسے آوازیں دے رہی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ بارش میں بھیگتا قبرستان آیا۔ قبر ٹھیک ٹھاک تھی لیکن اسے شبہ رہا کہ پانی کہیں نہ کہیں سے رس رس کر اندر جا رہا ہے وہ گورکن کی کوٹھڑی میں پہنچا وہ چائے پی رہا تھا۔ اس کی بات سن کر اس نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔ ''فکر نہ کرو پانی اندر نہیں جا سکتا۔''

''پھر بھی کسی اور طرف سے۔۔۔ میرا طلب ہے نیچے ہی نیچے کہیں سے'' گورکن دو تین لمحے اسکی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔۔۔'' اچھا بارش بند ہو جائے تو میں تھوڑی سی مٹی اور ڈال دوں گا'' وہ اطمینان سے سر ہلاتا واپس آ گیا۔ اگلے دن بارش پھر ہوئی اور زور شور سے ہوئی۔ وہ بھیگتا بھیگتا صبح سویرے قبرستان آیا۔ بہت سی قبریں بیٹھ گئی تھیں مگر اس کی ماں کی قبر اسی طرح تھی پھر بھی اسے شبہ رہا کہ وہ بیٹھ رہی ہے گورکن اس کی بات سن کو بولا۔۔۔''تو پھر پکی کرا لو'''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' واپس آتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن قبر پکی کرانے کے لیے اس کے پاس پیسے جمع نہ ہو سکے بارشیں روز ہوتیں' وہ قبرستان جاتا' ہر روز کچھ اور قبریں بیٹھ جاتیں۔ اس کی ماں کی قبر بھی خاصی نیچی ہو گئی۔ تاہم ابھی اس کی شکل وصورت قائم تھی۔ ساری رات اسے یہی احساس رہتا کہ پانی بوند بوند اندر جا رہا ہے اور اس کی ماں سردی سے ٹھٹھری دیوار سے لگی اسے اوازیں دے رہی ہے تصویر نے بھی چپ سادھ رکھی تھی۔ غم میں گندھی مسکراہٹ پتھر ہو گئی تھی۔ شاید اس نے مڑ کر دیکھ لیا ہے لیکن پیچھے تو گہرا اندھیرا ہے اور آگے دھند ہی دھند۔۔۔ دھند' اس دھند میں سنبھل سنبھل کر قدم قدم چلتا' وہ گھوم پھر کر اس غم آلود مسکراہٹ کی چار دیواری میں لوٹ آتا۔ کبھی تو یہ مسکراہٹ غم کی قید سے آزاد ہو گی۔ وہ سوچتا اور ہر صبح تصویر کی دہلیز پر آ کھڑا ہوتا لیکن مسکراہٹ اسی طرح غم آلود' سامنے کا منظر اداس' وادی کے بلکتے بھوکے چہرے ویران' مسکراہٹ غم آلود' منظر کا چہرہ اداس ضرورتیں نوکیلے ناخنوں سے اس کے جسم کو مسلسل ادھیڑ رہی تھی۔ تھکی انگلیوں سے جینے کی موہوم امیدوں کو ٹٹولتا وہ بے دم ہو گیا اور سوچنے لگا کہ تصویر بیچ ڈالے تو ڈھیر سارے روپے مل سکتے ہیں ایک دوست نے ایک بار کہا تھا۔۔۔''اس تصویر کو کوئی بھی غیر ملکی مہنگے داموں خرید لے گا''۔ تصویر بیچنے کا خیال شاید اسی دن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت اسے یہ بات اتنی بری لگی کہ وہ اس دوست سے سچ مچ لڑ پڑا۔ مسکراہٹ غم آلود' سامنے کا منظر دھندلا' ضرورتوں کے ہاتھ لمبے اور لمبے ہوتے چلے گئے۔ اس نے ایک دن چپکے سے تصویر بیچ ڈالی۔

ڈھیر سارے پیسے ملے تو خالی ہاتھ سمٹ گئے اور آسائشیں خود بخود اس کی دسترس میں چلی آئیں دن کی سختی میں نرمی آ گئی۔۔۔ لیکن رات کو تصویر کی خالی جگہ اس کی ماں آ کھڑی ہوتی اور غم آلود مسکراہٹ کے ساتھ بڑی حسرت سے اسے دیکھتی رہتی اس نے سوچا اس کی وجہ کا خالی ہونا ہے' سو اس نے وہاں کیلنڈر لٹکا لیا۔ کیلنڈر لگنے سے دن اور مہینے اس کی مٹھی میں آ گئے ماں اب خواب میں آنے لگی۔ وہی غم آلود مسکراہٹ اور حسرت بھی نظریں اس نے سوچا شاید ماں قبر میں خوش نہیں۔ قبر پکی کروانے کا خیال پھیل کر اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ قبر پکی کرانے کا کام اگلے دن شروع ہو گیا۔ دو مستریوں نے شام تک کام کر لیا۔ نام کی سل بھی لگ گئی۔ اس رات وہ عجیب طرح کی نیند سویا۔

خواب میں اس نے دیکھا وہ بہت بڑے کمرے میں دوڑ رہا ہے۔ دھند گہری ہوگئی ہے اور دیواریں' فرش' چھت سب اس دھند میں گم ہوئے جارہے ہیں صبح سویرے اس نے اگر بتیوں کا پیکٹ لیا اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبر پر اگر بتیاں لگا کہ جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اچانک ایک شبہ نے سرسرا کر اس کے ہاتھوں کو ڈس لیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ تو اس کی ماں کی قبر نہیں ہے۔ اس کی ماں کی قبر تو ساتھ والی ہے جو اسی طرح کچی ہے۔ یہ غلطی کس سے ہوئی؟ اس سے یا مستریوں سے' یقیناً۔ یہ مستریوں کی غلطی ہے وہ انہیں قبر دکھا کر چلا گیا تھا۔ انہوں نے غلطی سے ساتھ والی قبر پکی کر دی۔۔۔ اب کیا ہو۔۔۔ کیا ہو؟

سارا دن ماں بوند بوند اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں اترتی رہی۔ دوسرے دن مستری ساتھ والی قبر پکی کر رہے تھے۔ شام کو اس نے غور سے قبر کا جائزہ لیا۔۔۔ ہاں یہ اس کی ماں ہی کی قبر ہے۔ اگلی صبح اگر بتیاں جلا کر جب وہ دعا مانگ کر واپس مڑنے لگا تو شک رینگ رینگ کر پھر اس کے ذہن میں اتر آیا۔ یہ قبر بھی اس کی ماں کی نہیں۔ اس نے غور سے دونوں پکی قبروں کو دیکھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی ماں کی قبر نہیں ہے وہ تو ان سے اگلی ہے۔ شک اور یقین کی اس دھند میں تیسری چوتھی اور پھر پانچویں اور چھٹی قبر بھی پکی ہوگئی۔ لیکن اسے یہی شبہ رہا کہ ان میں سے کوئی بھی قبر اس کی ماں کی نہیں۔

اب ہر رات وہ خواب دیکھتا کہ قبر کی چھت بیٹھ رہی ہے۔ پانی بوند بوند رس رہا ہے اور ماں سردی سے ٹھٹھر رہی ہے' تصویر کے منظر میں اداس میلے کبوتر اڑ رہے ہیں ان کی اڑان میں شکست اور تھکاوٹ ہے۔ چہرے بلک رہے ہیں اور خوف جسموں پر دستک دے رہا ہے' جسم بھر رہے ہیں ریزہ ریزہ۔۔۔ ریزہ ریزہ۔

اس نے وہ ساری قطار پکی کروا دی۔ لیکن اب اسے یہ شبہ ہوا کہ اس کی ماں کی قبر اس قطار میں ہے ہی نہیں' وہ تو اگلی قطار میں ہے۔ اب دوسری قطاروں کی قبروں کے پکے ہونے کا کام شروع ہوا۔ ہر روز ایک قبر پکی ہوتی اگلی صبح اگر بتیاں جلا کر دعا مانگتے اسے خیال آتا کہ یہ اس کی ماں کی قبر نہیں ہے' وہ اس سے اگلی قبر پکا کرنے کا کام شروع کراتا۔ مطمئن ہو کر گھر جاتا۔ خواب میں تصویر کی غم آلود مسکراہٹ والی عورت اداس سوچ میں رہن رکھا منظر اپنی پرتیں کھولتا۔ اس کے ہونٹ ہلتے مگر آواز سنائی نہ دیتی۔ بھوک سے بلکتی وادی میں ٹھٹھرتے چہرے' اداس غم آلود مسکراہٹ بوند بوند رستا پانی۔۔۔ سوالیہ نشان۔۔۔ سوالیہ نشان۔۔۔

ادھورے الجھے ہوئے نشان۔ دوسری کے بعد تیسری اور چوتھی قطار کی قبریں پکی ہوتی گئیں لیکن اس کی ماں کی قبر اسی طرح کچی رہی۔ رات کو خواب میں تصویر کی غم آلود مسکراہٹ قبر کی بیٹھی چھت' بوند بوند رستا پانی اور سردی سے ٹھٹھرتی ماں' دھندلاتے دھندلاتے اداس خالی منظر میں گم ہو جاتے۔ جس دن قبرستان کی آخری قبر بھی پکی ہوگئی' اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور ساری پکی قبروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا..... ''ان میں سے کوئی ایک قبر میری ماں کی بھی ہے مجھے معلوم نہیں مگر وہ پکی تو ہوگئی ہے نا.....''

اگلی صبح سورج ابھی مشرق کی چلمن سے جھانکنے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اس نے بیوی اور بچوں کو جگایا اور کہا کہ وہ سب اس کے ساتھ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے چلیں۔ قبرستان پہنچ کر اس نے بیوی بچوں سے کہا کہ وہ سب قبروں پر اگر بتیاں اور پھول لگا دیں۔ اس کی بیوی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''بھئی یہ سب میری ماں کے پڑوسی ہیں..... اور دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ سے کہا..... سچی بات ہے، مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان میں سے میری ماں کی قبر ہے کونسی.....''

قبروں پر اگر بتیاں لگیں تو سارا قبرستان خوشبو سے مہک اٹھا۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، دعا مانگ کر سب نے ہاتھ نیچے کر

لیے لیکن اس کے ہاتھ خلا میں ہی پتھر ہو گئے۔ اسے یاد آیا، یہ تو وہ قبرستان ہی نہیں جس میں اس نے اپنی ماں کو دفن کیا تھا۔ تو اس کی قبر ابھی تک کچی ہے...... تصویر میں ایک عورت غم میں گندھی مسکراہٹ کے ساتھ خالی منظر کو دیکھ رہی ہے......

قبر کی چھت دھیرے دھیرے بیٹھ رہی ہے۔ پانی بوند بوند رس رہا ہے اور ماں دیوار سے لگی ٹھٹھر رہی ہے۔ جھکے، ڈھلکے شانوں کے ساتھ سب سے پیچھے آتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے کہا...... ''میں دوسرے قبرستان کی ایک ایک قبر پکی کروادوں گا۔''

اسے خیال آیا اس شہر میں تو کئی قبرستان ہیں'' کوئی بات نہیں'' وہ بڑبڑایا...... میں اس شہر کے سارے قبرستانوں کی ایک ایک قبر پکی کرا دوں گا۔'' اطمینان کے پرندے نے ایک لمحہ کے لیے رنگ برنگے پر پھڑ پھڑائے اور دوسرے لمحے خالی منظر میں گم ہو گیا...... اسے خیال آیا...... کیا معلوم یہ وہ شہر ہی نہ ہو جہاں اس کی ماں دفن ہے۔



بلراج کومل

نام : بلراج کومل
قلمی نام : بلراج کومل
پیدائش : ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء بہ مقام سیالکوٹ، مغربی پنجاب۔
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور: ۱۹۵۳ء
بی۔اے کا امتحان فیروز پور سے ۱۹۴۸ء میں پاس کیا تھا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام، حکومت رائے۔ بچپن اور لڑکپن سیالکوٹ میں گزرا۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے۔ ن۔م۔راشد، میراجی، فیض اور اختر الایمان کے بعد آزاد نظم کا اعتبار بحال رکھنے والے شعراء میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا، جب انہوں نے اپنی پہلی نظم ''اکیلی'' لکھی۔ افسانے کے میدان میں بہت ست رو لیکن بہت عمدہ۔ ۱۹۸۶ء تک ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر، محکمہ تعلیم دہلی رہے۔ پبلک ریلیشنگ کے فن سے عاری، نفیس طبع، دہلی کی شاموں کو رنگین بنانے والے، یاروں کے یار۔ بھری محفل میں گم سم رہنے والے، حد درجہ کم آمیز بلراج کومل سے مل کر زندگی سے محبت ہو جاتی ہے۔

اوّلین مطبوعہ تحریر:

نظم: ''اکیلی'' مطبوعہ: ''سنگ میل'' پشاور، مرتبہ: فارغ بخاری و رضا ہمدانی، ۱۹۴۸ء

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''روشنی روشنی''، مطبوعہ: ''ادبی دنیا'' لاہور: ۱۹۶۴ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''آنکھیں اور پاؤں'' (افسانے)	اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۱ء
۲۔	''میری نظمیں'' (شاعری)	مکتبہ فنکار، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۵۴ء
۳۔	''رشتۂ دل'' (شاعری)	ادارہ ''ادبی دنیا''، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۶۳ء
۴۔	''ناریل کے پیڑ'' (شاعری۔ منتخب نظمیں۔ دیوناگری حروف میں)	آریہ بک ڈپو، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۶۷ء
۵۔	''ہریالی کا ایک ٹکڑا'' (ہندی ناولٹ)	لٹریسی ہاؤس، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۶۸ء
۶۔	''سفر مدام سفر'' (شاعری)	شب خون کتاب گھر، الہ آباد	طبع اوّل: ۱۹۶۹ء
۷۔	''انتخاب'' (منتخب شاعری)	انجمن ترقی اردو، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۷۱ء
۸۔	''نژادِ سنگ'' (شاعری)	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۷۵ء
۹۔	''پرندوں بھرا آسمان'' (شاعری)	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۴ء
۱۰۔	''ادب کی تلاش'' (تنقید)	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
۱۱۔	''شہر میں ایک تحریر''	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
۱۲۔	''منتخب نظمیں'' (انگریزی ترجمہ)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۱۳۔	''خلا کے معجزے'' (از ایم سندرراجن کا ترجمہ)	نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۰ء
۱۴۔	''تو رودت'' (از پی سین گپتا کا ترجمہ)	ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۸۵ء
۱۵۔	''تواتر اور تسلسل'' (تنقید)	ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی	طبع اوّل:
۱۶۔	''اگلا ورق'' (شاعری)	میڈیا انٹرنیشنل، دہلی	طبع اوّل: ۲۰۰۶ء
۱۷۔	''اکیلی'' (منتخب نظمیں)	گوہر پبلشرز، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۱۸۔	''سانپ اور رسّی'' (ترجمہ ناول) یہ راجہ راؤ کے ناول کا ترجمہ ہے	ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی	طبع اوّل: ۱۹۹۶ء
۱۹۔	''اندھیرے میں سلگتے حروف'' (شاعری)	ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی	طبع اوّل: ۲۰۰۱ء

غیر مدوّن:

انگریزی اور اردو میں لکھے گئے لاتعداد مضامین/تبصرے اور نظمیں۔

مستقل پتا:

ای۔۱۳۹ کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹، بھارت

اعزاز:

۱۔ حکومت ہند، وزارت تعلیمات، ایوارڈ برائے ناولٹ: ''ہریالی کا ایک ٹکڑا'' ۱۹۳۹ء
۲۔ اتر پردیس اردو اکادمی ایوارڈ برائے: ''سفر مدام سفر'' (شاعری): ۱۹۷۱ء
۳۔ اُتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ برائے ''آنکھیں اور پاؤں'' (افسانے): ۱۹۸۲ء
۴۔ امتیاز میر ایوارڈ، لکھنؤ: برائے شاعری ۱۹۷۷ء
۵۔ دہلی اردو اکادمی ایوارڈ برائے شاعری ۱۹۸۲ء
۶۔ ساہیتہ اکادمی (دہلی) ایوارڈ برائے ''پرندوں بھرا آسمان'' ۱۹۸۵ء
۷۔ فراق فاؤنڈیشن ایوارڈ ۱۹۹۵ء
۸۔ انٹرنیشنل ساحرہ فاؤنڈیشن ایوارڈ ۲۰۰۰ء
۹۔ بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ ۲۰۰۳ء
۱۰۔ پنجاب سرکار شرومنی ایوارڈ ۲۰۰۴
۱۱۔ غالب ایوارڈ برائے: اردو شاعری ۲۰۰۶ء

نظریۂ فن:

''شعر اور نثر کی حد بندیاں اگرچہ مبہم ہیں لیکن افسانہ بہرحال نثری صنف اظہار ہے۔ اس کی مخصوص ساخت ہی اس کی پہچان ہے۔ سفر واقعہ و کردار، گوشت پوست اور زمین جزیات و تفصیلات کا سفر بھی ہے اور مرحلہ تکمیل میں لفظ و معنی کے استعاراتی امکانات کا سفر بھی۔ افسانہ آئینۂ زندگی بھی ہے اور بعض اوقات شعری انداز میں تجربے کا جوہر بھی۔ افسانے کی علامتی نوعیت اس کے پورے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ محض جزوی شعبہ نہیں۔''

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۲۷، اگست ۱۹۸۴ء سے اقتباس)

کنواں

بلراج کومل

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کردیئے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نتیجتاً اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا مشغلہ باقاعدہ طور پر اختیار کرلیا۔ جب وہ ایک کنواں پھلانگ چکتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ ایک اور کنواں پھلانگے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورت حال کا انتخاب کرتا اور تماشائیوں کی تالیوں اور واہ واہ کے درمیان کنواں پھلانگنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی مقامی رفتہ رفتہ شہرت کا درجہ اختیار کر گئی اور اب اس کا نام بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا۔

کسی بھی فرد کا کوئی دعویٰ ایسا نہیں ہے جس کو چیلنج کرنے کے لیے دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چنانچہ گولنکر کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ڈاک سے ایک خط ملا۔ یہ خط ایک اجنبی کی طرف سے تھا جس نے گولنکر کو کنواں پھلانگنے کے مقابلہ کے لیے چیلنج بھیجا تھا۔ گولنکر نے خط پڑھا اور خط پڑھتے ہی اس کے مردانہ وقار نے تقاضا کیا کہ وہ چیلنج منظور کرلے۔ چنانچہ گولنکر نے فوراً چیلنج کرنے والے کو تحریری اطلاع دی کہ وہ کسی وقت بھی باہمی خط کتابت کے ذریعہ طے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہوئیں اور مقابلے کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ مقامی اور قومی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کردیا گیا۔

اگرچہ گولنکر کہنہ مشق کھلاڑی تھا اور بہت سے کنویں پھلانگ چکا تھا۔ جوں جوں مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ ان خدشات پر قابو پانے کے لیے گولنکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس لیے مقابلہ سے قبل کنواں پھلانگنے کی کچھ مشق ضروری ہوگی۔ جو مقابلے کا فیصلہ، نتیجہ کن انداز سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد گولنکر نے شہر کے تمام کنوؤں کا، جن میں سے اکثر وہ پھلانگ چکا تھا، بغور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنویں کا قطر ناپا۔

بھلانگنے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے گولنکر جیسی شہرت کے مالک کے لیے شہر کے کنوؤں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کے لیے شہر سے باہر ایک ویران کنویں کا انتخاب کیا۔ کنواں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنواں ہے اس کنویں کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس کی منڈیر، اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خالی زمین کا حدود اربعہ اس کنویں کے مماثل تھا جو آخری مقابلہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

کنویں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب تیاری کی ضرورت تھی۔ گولنکر نے تمام تیاری دو چار روز میں مکمل کرلی اور ایک صبح کنویں کی طرف روانہ ہوگیا۔

مارچ کی یہ صبح بڑی خوبصورت تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا لوگوں کے چہروں پر مسرت تھی بچے آنگنوں میں کھیل رہے تھے۔ زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چلتا ہوا نظر آرہا تھا۔ گولنکر رنگ و بو کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے دھیرے دھیرے تیز ہوتے ہوئے ہاؤ ہو میں سے گزر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جارہا تھا جہاں اسے کنواں پھلانگنے کی مشق کرنی تھی۔ اس کا دل اس کا دماغ اس کا پورا وجود زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم اعتماد سے اٹھ رہے تھے اور اس کے چہرے پر کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلے میں شامل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ جیت چکا ہو۔

شہر کی ایک نواحی بستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گزرا۔ سبزے پر کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چھکا لگایا۔ گولنکر کا دل مسرت سے چھلک اٹھا۔ نواحی بستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آ گیا جہاں خوبصورت بنگلوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی۔ ایک مکان کے باہر ایک گول مٹول، سرخ و سپید بچہ ٹافی کھا رہا تھا۔ گولنکر نے اس کے ملائم صحت مند گالوں کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فطرت کا سارا حسن کھیتوں کی ہریالی اور سونے میں سمٹ آیا تھا۔ گولنکر کچھ دیر اس حسن سے سرشار ہوتا رہا اور پھر جھنڈ کے اندر داخل ہوگیا۔ کنویں کے قریب پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان کے اس وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کنویں کی منڈیر پر سوکھا مارا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے کنویں کے اندر جھانک رہا تھا اجنبی گولنکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا اس لیے جب گولنکر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑا۔ گولنکر نے اپنے ردعمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا:

''تم کون ہو؟''

اجنبی اب بھی کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور گولنکر پر ایک تحقیر آمیز نظر کر کے کنویں کے اندر جھانکنے کے عمل میں دوبارہ مصروف ہوگیا تھا۔

گولنکر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گولنکر نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں پوچھتا ہوں، تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟''

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنویں کے پیندے سے ہٹائیں اور گولنکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گولنکر کو یکا یک محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی

روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔ گولنکر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ گولنکر اپنے غصے کا اظہار کر پاتا۔ اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے:

''دو انسانوں کے درمیان ہمدردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے مقاصد ایک جیسے ہوں۔''

''تو تم ہمدردی کی تلاش میں ہو۔''

''شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں کسی سوال کا جواب نہیں چاہتا ہوں۔''

گولنکر چکر میں آ گیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا:

''دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو۔''

''آخر تم کیا چاہتے ہو۔'' گولنکر نے پوچھا۔

''میں چاہنے یا نہ چاہنے کے عمل سے بہت دور نکل چکا ہوں۔''

گولنکر کے ذہن میں ایک اور سوال کوندے کی طرح لپکا۔

''کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟''

''زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔'' اجنبی نے جواب دیا۔

''گولنکر کے چہرے پر مسرت اور اعتماد کی روشنی نمودار ہوئی وہ اجنبی کی پراسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں؟''

''مجھے اب دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

گولنکر کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''یقیناً تمہارا گھر ہو گا۔ تمہاری بیوی ہو گی، بچے ہوں گے۔''

''تھے! اب نہیں ہیں۔'' اجنبی نے ایک بار پھر کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کہاں گئے؟''

''مر گئے۔''

''کس طرح مر گئے؟''

''جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے، بیماری سے، قتل سے۔''

''یہ تو عام بات ہوئی خاص طور پر تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟''

''اجنبی شاید گولنکر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کے جواب دے چکا تھا اس لیے برہم ہو کر بولا:

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟''

''کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

دوستی کے نام پر اجنبی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پورے زور سے چیخا:

''چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔''

گولنکر مسکرایا۔

''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔''

''تو پھر تم کون ہو؟'' اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود حیران ہو گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا۔ میرا نام گولنکر ہے میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنواں پھلانگنے والا ہوں۔''

''مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تمہیں میرے ساتھ دلچسپی ہے اس لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟''

اجنبی کی آنکھوں میں غصے کی بجلی ایک پل کے لیے لہرائی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا:

''مجھے کنواں پھلانگنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''نہ سہی۔ لیکن میں کنواں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر......''

اجنبی کے یہ الفاظ سن کے گولنکر سناٹے میں آ گیا۔

''شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو۔''

''جی ہاں۔ اپنے تمہارے تمام انسانوں کے۔''

''لیکن تمہارے بیوی بچے کیا ہوئے؟''

اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی گزرنا چاہتا ہے۔

جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل......

''لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔'' گولنکر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

''میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ تم کنویں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازدار بن گئے ہو۔''

''خودکشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے۔''

گولنکر کو اجنبی کی باتوں سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مزید گہری ہو گئی۔

''لیکن اس زندگی کے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں۔''

''جی ہاں میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر حاوی ہیں۔ فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔''

''فرض کرو تم خودکشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے کیوں کہ میں تمہیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہو جائیں گے۔''

''مجھے اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کے لیے کبھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم نادان ہو۔''

''کون جانتا ہے کون نادان ہے۔''

دونوں آدمی اپنے سوالات اور جوابات میں الجھ گئے تھے تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا:

''تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکے۔''

اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہوئی۔

''میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا رہا ہوں۔''

''تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو۔''

اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے:

''میں نے کہا نا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری فیصلہ ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمہیں کیا زحمت ہے۔''

''میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے۔ میں یہ حق تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔''

''میں اسے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوبصورت ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش کرو۔''

''مجھے تمہارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرض محال اگر زندگی خوبصورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو۔''

''اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلہ پر عمل کرنا چاہتے ہو۔ تم خوشی سے خودکشی کرو۔ میں یہاں سے چلتا ہوں۔''

یہ کہہ کر گولنکر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنویں پر چڑھ گیا اور کنویں کے اندر کودنے کے لیے تیار ہو گیا۔

گولنکر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آ گیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا:

''میرا ایک آخری سوال باقی ہے۔''

''پوچھو!'' اجنبی نے فاتحانہ انداز میں کہا:

''تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟''

''تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟''

''میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا۔''

''ٹھیک یہ بات میں کہتا ہوں۔ یہ کنواں میرے لیے مناسب تھا۔''

اس جواب سے گولنکر کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا:

''کیا تم اپنی خودکشی چند منٹوں کے لیے ملتوی کر سکتے ہو؟''

''آخر تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کرنے کے لیے آیا تھا کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے لیے مقابلہ میں حصہ لینا ہے۔''

'''تو میں کیا کروں۔ تم سمجھتے ہو۔ اس مسخرے پن سے تم مجھے متاثر کرلو گے۔''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں جہاں تک تمہیں متاثر کرنے کا تعلق ہے۔ تم جہنم میں جاؤ۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

''شوق سے پورا کرو۔ لیکن جلدی، کیونکہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے صبر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں۔''

یہ کہہ کر اجنبی کنویں کی منڈیر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ گولنکر نے کنویں کی منڈیر سے مخصوص فاصلہ ناپ کر زمین پر کچھ نشان لگائے۔ ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ اپنے جسم کو تولا اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کنویں کی جانب بڑھا راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے بھرپور جست لگائی۔ اجنبی کے دل کی دھڑکن اس دوران میں تیز ہوگئی۔ جست لگاتے ہی گولنکر کا جسم ہوا میں ایک قوس سی بناتا ہوا کنویں کے اوپر سے گزرنے لگا اور عین اس لمحہ جب اجنبی کی توقع تھی کہ گولنکر کے دوسری طرف ہوگا ایک پرزور دھما کہ ہوا گولنکر کا جسم کنویں کی منڈیر کی اندرونی سطح کے ساتھ زور سے ٹکرایا اور پھر کنویں کی پوری گہرائی کا فاصلہ طے کرتا ہوا دھم سے پانی میں جا گرا۔

اجنبی کی آنکھیں پھیل کر روزن بن گئیں۔ اس کا پورا وجود فطری ردعمل کی زد میں آ گیا اور وہ ڈوبنے والے کی تقدیر سے غافل اپنے ارادوں اور فیصلوں سے غافل، درختوں کے جھنڈ کو چیرتا، سرسبز و شاداب کو اپنے پانوں تلے روندتا شہر کی جانب بھاگ نکلا۔



اسد محمد خاں

نام : اسد محمد خاں

قلمی نام : اسد محمد خاں

پیدائش : ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء بہ مقام بھوپال، بھارت

تعلیم : بی۔اے کراچی یونیورسٹی۔

شاہجہانی ماڈل اسکول، بھوپال سے میٹرک (۱۹۴۹ء) کرنے اور چند ماہ حمیدیہ کالج، بھوپال میں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد تنہا پاکستان آ کر انتہائی نامساعد حالات میں ۱۹۵۲ء میں جناح کالج، کراچی سے انٹر اور سندھ مسلم آرٹس کالج، کراچی سے بی۔اے کیا۔ بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے سے قبل جے جے اسکول آف آرٹ بمبئی سے کمرشل آرٹ میں ڈپلوما کورس کر چکے تھے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آفریدی اور کزئی پٹھانوں کے قبیلہ میر عزیز خیل کے میاں عزت خاں کے ہاں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد بھوپال کے ایک مقامی اسکول میں مصوری کے استاد تھے اور شانتی نکیتن کے تربیت یافتہ۔ والدہ منور جہاں، میرزا غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں کی پوتی اور بانی ریاست بھوپال سردار دوست محمد خاں نویں پیڑھی میں اسد محمد خاں کے جد ہیں جو ۱۷۰۳ء میں مالوہ بندیل کھنڈ میں وارد ہوئے تھے۔ اسد محمد خاں نے سترہ برس کی عمر میں حمیدیہ کالج، بھوپال کے زمانہ طالب العلمی میں بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر سترہ دن جیل میں گزارے اور ۱۹۵۰ء میں تن تنہا بھوپال سے لاہور آ گئے۔ اُن سے پہلے اُن کے بڑے بھائی پاکستان ہجرت کر آئے تھے اور مرے کالج، سیالکوٹ میں زیرِ تعلیم تھے۔

لاہور پہنچ کر ریلوے ٹریننگ اسکول، والٹن، لاہور سے یک سالہ تربیت کے بعد پاکستان ویسٹرن ریلوے میں بطور اسسٹنٹ اسٹیشن

ماسٹر ملازمت کا آغاز کیا۔ تاہم حیدرآباد، سندھ میں حالات سازگار نہ پاکر کراچی کا رُخ کیا اور بطور کمرشل آرٹسٹ کام کرنے لگے۔ ''روزنامہ احسان'' لاہور کے لیے کارٹون بنائے۔ کچھ مدت ٹریول ایجنٹ اور ریڈیو پر نیوز ریڈر رہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹریفک ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت راس آئی، جہاں سے بطور انسپکٹر درآمدات جون ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوئے۔

دو شادیاں کیں۔ آبائی وطن بھوپال میں ہونے والی پہلی شادی (۱۹۶۲ء) برقرار نہ رہ سکی۔ پہلی بیگم سے ایک بیٹا ہے جو بنگلور، بھارت میں کمپیوٹر ہارڈ ویئر کے شعبہ سے وابستہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہونے والی دوسری شادی ایک کزن، فرزانہ سے ہوئی جن سے تین بیٹیاں ہیں۔

۱۹۶۵ء سے جز وقتی طور پر ریڈیو پاکستان، کراچی اور پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے اور گیت لکھ رہے ہیں۔ ڈراموں میں ''شیر شاہ سوری'' اور گیتوں میں ''موج بڑھے یا آندھی آئے دیا جلائے رکھنا ہے''''زمین کی گود رنگ سے امنگ سے بھری رہے''''تم سنگ نیناں لاگے، مانے نا ہیں جیارا'' بہت مقبول ہوئے۔ ایک زمانے میں ان کی پہچان گیت نگاری اور نظم نگاری کے حوالے سے تھی۔ ۱۹۷۱ء میں افسانہ ''باسودے کی مریم'' شائع ہوا تو مین سٹریم کے افسانہ نگار تسلیم کر لیے گئے۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

''باسودے کی مریم'' مطبوعہ: ''فنون'' لاہور: ۱۹۷۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''کھڑکی بھر آسمان'' (تیرہ افسانے/نظمیں)	ناشر: اسد محمد خاں، کراچی	طبع اول: ۱۹۸۲ء
۲۔	''برجِ خموشاں'' (چودہ افسانے)	ابن حسن پریس، کراچی	طبع اول: ۱۹۹۰ء
۳۔	''غصے کی نئی فصل'' (گیارہ افسانے، پانچ تراجم)	آج، کراچی	طبع اول: ۱۹۹۷ء
۴۔	''نربدا'' (بارہ افسانے)	سٹی پریس بک شاپ، کراچی	طبع اول: ۲۰۰۳ء
۵۔	''تیسرے پہر کی کہانیاں'' (افسانے)	اکادمی بازیافت، کراچی	طبع اول: ۲۰۰۶ء
۶۔	''جو کہانیاں لکھیں'' (افسانوی کلیات)	اکادمی بازیافت، کراچی	طبع اول: ستمبر ۲۰۰۶ء
۷۔	''رُکے ہوئے ساون'' (گیت)		طبع اول: ۱۹۹۷ء

غیر مدوّن:

متعدد ریڈیائی اور ٹیلی ڈرامے۔

مستقل پتا:

A/8-F، سیکٹر X-6، گلشن معمار، کراچی، پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ (اکادمی ادبیات پاکستان) برائے: ''زبدا'': ۲۰۰۳ء

۲۔ عالمی فروغ اردو ادب (دوحہ قطر) ایوارڈ: ۲۰۰۷ء

نظریۂ فن:

''اگر لکھنے والے کو مصور پر اور بت تراش پر اور موسیقار، گائیک، رقاص اور تمثیل کار پر سبقت لے جانے کا شوق ہے تو اُسے کچھ ایسا کر کے دینا پڑے گا کہ جو اپنے جوہر میں، اپنے Concept میں تازہ، طاقت ور، سچا اور خالص ہو۔''

(''میں کیوں لکھتا ہوں'' مشمولہ: ''چہارسو'' راولپنڈی: جنوری، فروری ۲۰۰۸ء)

ترلوچن

اسد محمد خاں

جو کچھ ہوا اس سے پہلے یہاں انسانی بستیاں موجود تھیں اور جانور، درخت، دریا اور پہاڑ بھی تھے۔ ایک تواتر کے ساتھ موسم آتے رہتے تھے۔ چیزیں اُگتی تھیں، بڑھتی، پھیلتی اور پرانی ہوتی تھیں اور رسان سے مرجایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی قہقہہ مار کر ہنس بھی دیا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر سب ٹھیک ہی تھا۔ عین الحق یہ سب کچھ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی کتے کا مُوت اس کی پٹی کھول کر چیزوں کی فہرست نہ چُرا لے جاتا جو اس نے اتنی دل سوزی سے تیار کی تھی، تو عین الحق ہرگز ہرگز وہ نہ کرتا جو اُس نے کیا۔

اُس نے جو کچھ کیا وہ وقتی اشتعال اور مایوسی کے تحت کیا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اب تو کچھ تھا ہی نہیں جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔

اور جو کچھ ہوا، وہ پلک جھپکتے ہو گیا۔ پٹی خالی دیکھ کر اس نے اَلوک، پرلوک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشتِ شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی، ایک ذرا کندھا جھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پشت پر لیا، سیدھے ہاتھ کی مٹھی پر مٹھی کس کر الا اللہ کہا اور ہوا میں جیسے کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔

یہاں تک بھی ٹھیک تھا، بات کچھ زیادہ بگڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد تو عین الحق نے غضب ہی کر دیا۔ وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے اسکنگ پلاسٹر کا وہ ٹکڑا اپنی پیشانی سے نوچ پھینکا جسے وہ پابندی سے نماز کے گٹے والی جگہ پر چپکا لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے سر جھکایا، زمین کی طرف دیکھا اور تمام و کمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

سو اب ڈھوئیں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا اور عین الحق جانتا تھا کہ ڈھوئیں اور راکھ کو ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خاتمہ ہے۔

یہ سب ایک بلی سے شروع ہوا تھا۔ ایک دن گلی سے گزرتے ہوئے اس نے اچانک اُس بلی کو دیکھا اور اسے فہرست بنانے کا خیال آ

گیا۔ وہ بلی اس قدر زخمی، اتنی میلی اور جگہ جگہ سے اتنی نچی کھچی تھی کہ ساری باتیں کاغذ پر لکھے بغیر یاد نہیں رکھی جا سکتی تھیں۔ اس نے سوچا، فہرست بنانا اچھا رہے گا۔ وہ اب تک چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا آ رہا تھا۔ لیکن چیزیں اتنی بہت سی ہو گئی تھیں اور برابر بڑھتی جا رہی تھیں اور ان کی تفصیل اتنی طولانی ہوتی جا رہی تھی کہ اب ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بھولنا شروع نہ کر دے۔ اس لیے اس نے ایک بڑے کاغذ پر سات سو چھیاسی لکھا اور نمبر شمار اور نام اشیاء اور ان کے کوائف اور کارہائے مجوزہ اور تاریخ عمل درآمد کے خانے بنائے اور ان خانوں میں اس نے سب چیزیں درج کرنا شروع کر دیں۔ تاریخ عمل درآمد کا خانہ ابھی خالی رکھا اس لیے کہ پہلے وہ چیزوں کو اور ان کی تفصیل کو حافظے سے کاغذ پر منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ باقی عمل درآمد میں دیر ہی کتنی لگتی۔ فہرست مکمل ہونے کے بعد وہ کسی بھی دن اور کسی بھی وقت کارہائے مجوزہ کے خانے میں لکھی ہوئی باتوں پر عمل درآمد کر کے معاملے نمٹا سکتا تھا۔

تو اس نے سب سے پہلے نمبر شمار ایک پر بلی کو درج کیا اور اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوزہ میں درج کیا کہ اسے نئی کھال وغیرہ دینی ہے اور تاریخ عمل درآمد کا خانہ خالی چھوڑ دیا۔ دوسرے نمبر پر عین الحق نے ہیڈ کانسٹیبل لطافت میر خاں کی بیوہ رقیہ بیگم کا مسئلہ درج کیا، وہ اسی بلاک کے ایک لاولد مکان میں تنہا رہتی تھی، اسے عرق النساء کی شکایت تھی اور دکھ اور تنہائی میں اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ یہاں کارہائے مجوزہ کے خانے میں اس نے طے کیا کہ رقیہ بیگم کو عرق النساء سے چھٹکارا دینا ہے اور ایک لے پالک کے بیٹے بیٹیوں سے اس گھر کا صحن آباد کرنا ہے۔ رقیہ بیگم کے بعد اس نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا، جو بہتر برس کا تھکا ماندہ امرد پرست تھا۔ اس کا گھربار نہیں تھا، دکان کے تھڑے پر ہی سو رہتا تھا۔ اسے خوب صورت لڑکوں کو دکان پر بٹھانے اور اسلامی تاریخی ناول پڑھوا کر سننے کا شوق تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ لڑکے بھاگ بھاگ جاتے تھے اور انہیں یاد کر کر کے روتا تھا اور فتح یرموک کتنے ہی دن ملتوی رہتی تھی۔ عین الحق نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا اور اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوزہ میں لکھا کہ ایک خوب صورت اور باوفا لڑکا ہمہ وقت موجود رہے تا کہ بھورے خاں جدائی اور دکھ میں دہرانہ ہو جائے اس لیے کہ بہتر برس بہت ہوتے ہیں۔ پھر اس نے ہزارے سے آئے ہوئے شیر زمان موچی اور اس کے نیک نفس بھائیوں کو درج کیا جو فجر سے پہلے اٹھ کر شیر زمان کی چارپائی پر اکڑوں بیٹھ جاتے تھے اور اس سے اٹک اٹک کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ان سب کی بیویاں ملک میں تھیں اور وہ دن بھر شیر زمان کی ہدایت کے مطابق جوتے گانٹھتے اور ٹیپ ریکارڈ پر سلطان میاں قوال کی قوالیاں سنتے تھے۔ عین الحق نے ان کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوزہ میں درج کیا کہ ان سب کا ان کی بیویوں سے ملاپ کرانا ہے اور لکھا کہ شیر زمان کی بواسیر خونی رفع کرنی ہے کیوں کہ وہ بچوں اور قلیل آمدنی والے کم زور لوگوں سے بھی نرمی سے بات کرتا تھا۔ پھر عین الحق نے عقاب کے سے تجسس والی مائی نوراں مسی کو درج کیا جس کے پنجے بھی عقاب کے تھے اور عین الحق نے اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوزہ میں لکھا کہ مائی نوراں مسی کو نئی ریڑھ کی ہڈی دینی ہے اور بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک مکانوں کی عقبی گلی میں وافر مقدار میں پلاسٹک کے ٹکڑے، ہڈیاں اور ردی کاغذ مہیا کرنا ہے جو عرصہ بارہ سال تک فراہم رہیں، کس لیے کہ نوراں کا ناسور اسے اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دے گا۔ عین الحق نے دفع ناسور از پنڈلی لکھ کر کاٹ دیا کیوں کہ اس طرح بعض گھروں سے ملنے والا الخصوصی بونس بند ہونے کا احتمال تھا اور یہ بات کسی عنوان بھی نوراں کے لیے مناسب نہ تھی۔ پھر بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک آتے ہوئے، پارک سے متصل، مدکامنی کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر عین الحق نے دیکھا کہ تنور والے محمد دولا نے مدکامنی کے نوعمر تنے سے اپنا مینڈھا باندھ باندھ کر اس کی نرم چھال کو ادھیڑ دیا ہے، تو عین الحق نے ادھڑی ہوئی چھال کے نم دائرے سے اپنی انگلیوں کے پور مس کیے اور مدکامنی کے پیڑ سے وعدہ کیا اور پیڑ کے

کوائف درج کیے، پھر کارہائے بجوز میں لکھا کہ بدکامنی کا زخم بھرتا ہے اور تالیفِ قلب کے لیے نئی کونپلیں بھی دیتی ہیں۔ پھر اس نے پولی ٹکنک والے سہیل کو درج کیا، جسے بیرونِ ملک بھیجنا تھا، اور عبدالقدیر قادری اور عترت حسین زیدی کو درج کیا، جنھیں ترقیاں دینی تھیں اور عین الحق کی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں۔ اس نے برتن قناتوں والے تگے کو درج کیا جو گھر والی کی نعش بدعنوانیوں کے سبب ڈھیہ گیا تھا اور پور پور سے ہلاک ہو رہا تھا، تو عین الحق نے یہ لکھا کہ اس بی بی کے نظام میں مناسب تبدیلیاں کر کے اسے تگے کی اطاعت میں بحال کرتا ہے۔ اور عین الحق نے موٹر سائیکل والے لڑکے کو درج کیا جو صبح و شام چکر لگاتا تھا اور بلاک نمبر تین میں وہ بچی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ عین الحق نے اسے اداسی سے موٹر سائیکل پر چکر لگاتے دیکھا اور نرم سرگوشیوں میں وعدہ کیا کہ سب انتظام کر دیا جائے گا۔ اور اس نے کموگاز کی بیمار مرغی کو درج کیا اور اسی طرح چیزوں کی فہرست طولانی ہوتی چلی گئی۔

وہ چراغ جلے بیٹھتا تو کہیں رات ڈھلے دن بھر کے اندراجات مکمل کر پاتا۔ اور اب یہ ہونے لگا کہ دو نمبر یا تین نمبر بلاک سے آٹھ نمبر تک آتے آتے کبھی ایک آدھ چیز بھول جاتا اور اسے دوبارہ موقعے پر پہنچ کر اندراج مکمل کرنے پڑتے سو اسی جھنجٹ میں چار نمبر بلاک کی حمیرا کا لوکیمیا درج ہونے سے رہ گیا۔

اور جب اس اندراج کی ضرورت نہ رہی تو بلاک نمبر چار کے اختتام پر عین الحق ظاہر ہوا۔

وہ سڑک کی طرف سے گلی میں مڑا اور اس نے دیکھا کہ مسجد نور کا چھوٹا والا گہوارہ پھولوں میں رکھا ہوا ہے۔ عین الحق پیلا پڑ گیا۔ اس نے لرزتے کانپتے ہوئے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟ وہ گہوارے کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا چھ نمبر بلاک تک گیا اور اس نے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا اور وہ چھ نمبر سے آٹھ نمبر بلاک کے سرے تک دوڑتا ہوا گیا اور خجالت کے آنسوؤں میں بھیگتے ہوئے اس نے گہوارے کا پایا تھام لیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا اور ہولے ہولے اپنی صفائی میں کہتا چلا کہ بی بی میں بھول گیا تھا! بٹیا میں بھول گیا تھا! اماں میں بھول گیا تھا! اور آٹھ نمبر بلاک کی حد پر اس نے گہوارے کا پایہ چھوڑ دیا۔ پھر عین الحق نے ایک چیخ کی بازگشت میں بلاک نمبر دو کی طرف سعی کی اور پکارتا چلا کہ میں بھول گیا تھا! پھر باقی دن اور باقی رات وہ اسی چیخ کی بازگشت میں رہا۔ وہ بلاک دو سے بلاک آٹھ تک اور بلاک آٹھ سے بلاک دو تک گونج کی طرح سنسناتا رہا اور جو کچھ درج ہونے سے رہ گیا تھا دیوانہ وار اپنی یادداشت میں محفوظ کرتا گیا۔ ایک ایک مکان پر سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے حافظے میں سب چیزوں اور سب لوگوں کی حاجت مندیاں اور تمام چھوٹے بڑے دکھ محفوظ کیے اور طے کیا کہ مرغ کی بانگ سے پہلے انہیں فہرست میں درج کرے گا اور جب مرغ بانگ دے رہے ہوں گے تو عمل درآمد کرے گا۔

ایک پہر رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آیا اور یہ دیکھا کہ کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا ہے اور اس کی پیٹی اوندھی پڑی ہے۔ کوئی کتے کا مُوت اس کی فہرست چرا لے گیا تھا۔

پیٹی خالی دیکھ کر عین الحق نے حیرانی میں چھ طرفوں پر نظر ڈالی اور مایوسی میں سر ہلایا اور گمان سے بالاتر ہوا اور تب ہی عین الحق نے اہلوک، پرلوک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشت شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی، ایک ذرا کندھا جھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پشت پر لیا اور مٹھیاں کس کر ہوا میں کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔ پھر وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا اور جھٹکے سے اپنی پیشانی کا پلاسٹر نوچ پھینکا۔ پھر عین الحق نے سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھا اور تمام و کمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

O

مرزا حامد بیگ

نام : حامد حسین

قلمی نام : مرزا حامد بیگ / ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

پیدائش : 29 اگست 1949ء بہ مقام کراچی (سندھ) پاکستان

تعلیم : ایم۔اے (اردو) پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی)

گورنمنٹ پرائمری اسکول تھرڑی محبت، ضلع دادو (سندھ) میں ابتدائی دو کلاسیں سندھی میڈیم کے ساتھ پڑھیں گورنمنٹ ہائی سکول دادو (سندھ) کی معرفت ویسٹ پاکستان ڈرائنگ امتحان 1961ء میں پاس کیا۔ میٹرک ڈی۔سی ہائی اسکول نواب شاہ (سندھ) سے 1966ء میں کرنے کے بعد سندھ مسلم آرٹس کالج کراچی کا طالب العلم رہا۔ ایف۔اے اسلامیہ کالج سکھر (سندھ) سے 1968ء میں کیا۔ بی۔اے 1971 اور ایم اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور سے 1972 میں کیا۔ ڈاکٹریٹ کا موضوع ''اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم'' تھا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے Ph.D کی ڈگری 1986ء میں ملی۔

مختصر حالات زندگی:

میرا آبائی وطن علاقہ چھچھ، موضع کمالہ، تحصیل حضرو، ضلع اٹک ہے۔ میرے جد اعلی مرزا محمد بیگ عہد اکبری (1750ء) میں صوبیدار اٹک تھے۔ والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب غوث الزماں حضرت جی بابا اٹکی (پ 1626ء) سے جاملتا ہے جن کی قوم چغتہ مغل اور وطن ماوراء النہر ملک ترکستان تھا۔ میرے پرکھوں میں اٹک کے محمد عبدالشکور شاکر بہ عہد اورنگ زیب عالمگیر، فارسی اور اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

والد محترم محمد اکرم بیگ پولیس آفیسر تھے لہذا میرا بچپن اور لڑکپن سندھ میں گزرا۔ پنجابی اور سندھی کے لوک قصے پڑھتا تھا، پتنگ بازی اور مصوری کرتا تھا، تاوقتیکہ 1965ء میں قیام نواب شاہ کے دوران انگریزی کے بزرگ ادیب اور ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھانور داس چندانی نے

رابندر ناتھ ٹیگور سے روشناس کروایا اور میری کچ مچ تحریروں کی پذیرائی کی۔ انٹر کرنے کے دوران سندھ مسلم آرٹس کالج کراچی میں 67-1966 ڈراما کلب کا ممبر رہتے ہوئے میوزک اینڈ ڈراما سینٹر بندر روڈ کراچی سے پیانو اور بینجو کی تربیت حاصل کی پاکستان بر ماشیل کی منعقد کردہ مصوری کی نمائش میں حصہ لیا۔ 1966ء میں اس نمائش کا افتتاح فیض احمد فیض نے کیا تھا۔ 1968 میں والد صاحب ڈی ایس پی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو ہم لوگ سندھ سے کیمبل پور چلے آئے۔ 1971 میں انسپکٹر پولیس سندھ کی ملازمت سے بھاگ کر ایم اے اردو کرنے لاہور کا رُخ کیا۔ 1972 تا 1974ء لاہور میں بے روزگاری کاٹتے ہوئے گل پروڈکشنز، قیوم خاں بلڈنگ، رائل پارک لاہور کے فلم ساز و ہدایت کار رحیم گل کے اسسٹنٹ کے طور پر 1971ء میں پشتو فلم ''موسیٰ خاں گل مکئی'' مکمل کی، حلقہ ارباب ذوق (ادبی) لاہور کا جوائنٹ سیکرٹری اور حلقہ ارباب ذوق، راولپنڈی کا سیکرٹری رہا۔ لاہور ریڈیو اور پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے صدا کاری، ڈراما نگاری اور اداکاری کی۔ اپنے ہی تحریر کردہ ڈراما ''لاٹ صاحب کی سواری'' (پروڈیوسر شاکر عزیز) میں مرکزی کردار ادا کیا۔ پاکستان آرٹسٹس اکیڈمی، لاہور کا بانی رکن ہوں۔ 28 فروری 1974 تا اکتوبر 1974 بطور ریسرچ اسکالر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور ملازمت کی۔ 30 اکتوبر 1974ء کو بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج جھیکا گلی چلا گیا۔ گورڈن کالج راولپنڈی، سیٹلائٹ ٹاؤن کالج راولپنڈی اور گورنمنٹ کالج اٹک میں مختلف حیثیتوں میں تدریس سے منسلک رہا۔ 8 مئی 1977 کو شوکت جہاں سے شادی ہوئی۔ اولاد: تین بیٹے۔ چھ ادبی جرائد ''لفظ''، ''گورڈونین''، ''اورنگ''، ''مشعل''، ''گل بکاؤلی'' اور ''کریسنٹ'' کا مدیر رہا۔ حال پروفیسر، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور۔

اوّلین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ''افسانہ وافسوں کی حبشی رات'' مطبوعہ ''لفظ'' جشن صد سالہ نمبر (مدیر مرزا حامد بیگ) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور: ۱۹۷۲ء

۲۔ ''دلیل کی ہیبت'' مطبوعہ: نیرنگ خیال، لاہور (مدیر حکیم یوسف حسن) شمارہ: ۵۴۳۔۵۴۲ (خاص نمبر) ۷۳۔۱۹۷۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	''گمشدہ کلمات'' (سولہ افسانے)	خالدین، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۱ء
		دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع دوم: ۲۰۰۲
۲۔	''تار پر چلنے والی'' (افسانے اور ناولٹ)	پولیمر پبلی کیشنز، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۴ء
		دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع دوم: ۲۰۰۵ء
۳۔	''قصہ کہانی'' (پنجابی افسانے)	پنجابی ادبی بورڈ، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۴ء
۴۔	''گناہ کی مزدوری'' (افسانے)	بلاغ، اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۹۱ء
۵۔	''لاکر میں بند آوازیں'' (افسانے۔ ہندی ترجمہ)	پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز نئی دہلی	طبع اول: ۲۰۰۱ء
۶۔	''افسانے کا منظر نامہ'' (تنقید)	مکتبہ عالیہ، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۱ء
		اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد	طبع دوم: ۱۹۸۳ء

۷۔	''تیسری دنیا کا افسانہ'' (تنقید)	خالد ین لاہور	طبع اوّل: ۱۹۸۲ء
۸۔	''اردو اور صوفی ازم'' (تنقید/تحقیق)	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۹۔	''کتابیان تراجم علمی کتب'' (کتابیات)	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۱۰۔	''عزیز احمد: کتابیات''	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۶ء
۱۱۔	''ترجمے کا فن نظری مباحث'' (تحقیق)	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
۱۲۔	''اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ'' (تحقیق و تنقید)	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
		کلاسیک، لاہور	طبع دوم: ۱۹۹۹ء
۱۳۔	''کتابیات تراجم: ادب'' (تحقیق)	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۷ء
۱۴۔	''مغرب سے نثری تراجم'' (تحقیق و تنقید)	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۸ء
۱۵۔	''اطالیہ میں اردو'' (تحقیق)	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
۱۶۔	''پاکستان کے شاہکار اردو افسانے'' (انتخاب)	الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد	طبع اوّل: ۲۰۰۰ء
۱۷۔	''مقالات'' (تحقیق و تنقید)	پولیمر پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۱ء
		گل بکاؤلی، لاہور	طبع دوم: ۲۰۰۷ء
۱۸۔	''اردو افسانے کی روایت'' (اردو افسانے کی تاریخ)	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۹۱ء
		دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع دوم: ۲۰۰۹ء
۱۹۔	''حمیدہ کی کہانی'' (کہانی)	یونیسکو/علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۹۲ء
۲۰۔	''اردو کا پہلا افسانہ نگار: راشد الخیری''	راشد الخیری اکیڈمی، کراچی	طبع اوّل: ۱۹۹۲ء
۲۱۔	''مصطفیٰ زیدی کی کہانی''	ابلاغ، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۹۳ء
۲۲۔	''زناری'' (افسانے/تراجم)	کلاسیک، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۵ء
۲۳۔	''نسوانی آوازیں'' (خواتین کے افسانے)	سارنگ پبلی کیشنز، لاہور	طبع اوّل: ۱۹۹۶ء
۲۴۔	''ٹی۔ ایس ایلیٹ'' (تحقیق)	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع اوّل: ۱۹۹۹ء
۲۵۔	''عالمی کلاسیک'' (لیکچرز)	اورینٹ پبلشرز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۰ء
۲۶۔	''باغ و بہار'': نسخہ فیض اللہ، ۱۸۴۳ء (مرتبہ)	اردو سائنس بورڈ، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۴ء
۲۷۔	''اردو ادب کی شناخت'' (تنقید)	اورینٹ پبلشرز، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۷ء
۲۸۔	''ظواہر السرائر'' (تذکرہ)	اردو سائنس بورڈ، لاہور	طبع اوّل: ۲۰۰۷ء
۲۹۔	جانکی بائی کی عرضی (افسانے)	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	طبع اول ۲۰۱۱ء

غیر مدوّن:

فنونِ لطیفہ سے متعلق مضامین، ٹیلی ڈراموں کا ایک مجموعہ، تنقیدی مضامین اور نامکمل خودنوشت

اعزاز:

۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام برائے "قصہ کہانی": ۱۹۸۴ء

۲۔ نیشنل بک کونسل آف پاکستان، ایوارڈ برائے: "گناہ کی مزدوری": ۱۹۹۱ء

۳۔ "نیشنل بک کونسل آف پاکستان، ایوارڈ برائے: "مصطفیٰ زیدی کی کہانی": ۱۹۹۳ء

۴۔ "تمغۂ امتیاز"، سول ایوارڈ، حکومتِ پاکستان، ۲۰۱۰ء

مستقل پتا:

۲۲۵۔نشتر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔پاکستان

نظریۂ فن:

"سفید پوش طبقہ پرائیویٹ SELF پر پہرے بٹھاتا ہے اور ہمیں DECADENT کہا جاتا ہے جبکہ ہم نے لفظ کی ہمہ جہتی اور نفسگی تک اپنی ذات کے حوالے سے رسائی حاصل کی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بہت بڑا انکشاف ہے، جس کا اظہار ہم نے اپنی چیدہ تخلیقات میں کیا ہے۔"

(مرزا حامد بیگ)

مُغل سرائے

مرزا حامد بیگ

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور وہ دونوں' ملگجے اندھیرے میں دھندلائے ہوئے متحرک دھبّوں کی طرح چُپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔ اُن کے ساتھ فٹ پاتھ پر سفیدے کی قطار میں بہتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اب صاف سنائی دے رہی تھی' اور وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتے' یہاں' اس جگہ پہلی بار ٹھٹھک کر رکے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے' پیچھے سے آتے ہوئے کھلنڈرے نوجوانوں کی ایک ٹولی بہت دیر تک انہیں اپنے گھیرے میں لیے چلتی رہی تھی اور وہ اُن کے بیچ' مجرموں کی طرح سر جھکائے' بہت آہستہ قدم اٹھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اب وہ ہنستی گاتی ٹولی بہت آگے نکل گئی تھی اور دور تک کوئی نہ تھا' البتہ اُن کے کندھے ابھی تک آپس میں رگڑ کھا رہے تھے۔ لڑکا قدرے جھک کر چل رہا تھا اور اُس کا بل کھایا ہوا بایاں بازو لڑکی کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔

وہ دونوں اِس خطے میں نو وارد تھے اور محض سُنی سنائی پر یہاں تک نکل آئے تھے۔ اب وہ سفیدے کی قطار کے اس سرے پر آخری درخت سے ٹیک لیے کھڑے تھے اور دور تک ملگجا اندھیرا ہر طرف لوٹیں لے رہا تھا۔

دونوں اپنے سفری تھیلوں کے بوجھ سے ذرا ذرا آگے کو جھکے ہوئے' کسی حد تک ہراساں بھی تھے۔ لڑکے نے ٹارچ نکال کر لوٹیں لیتے ملگجے اندھیرے میں دودھیا روشنی کی کمندیں ہر طرف پھینکیں اور مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ دونوں کو اپنی ٹانگیں زمین میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ دیر تک یہیں اسی جگہ بھاری سفری تھیلوں کے بوجھ تلے دبے بے بسی سے آگے پیچھے جھولتے رہے۔

اُن کو ان حالوں کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ ایک بڑے شور کے ساتھ دو سرپٹ آتے ہوئے گھوڑوں کے پیچھے دائیں بائیں جُھولتی ہوئی بگھی' ایک جھٹکے کے ساتھ ان سے چند قدم آگے نکل کر ساکت ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اطراف کے دروازے کھلے اور چمکتے ہوئے بھالوں کو سنبھالے' دو بجھے ہوئے چہروں والے افراد نے انہیں کمال تہذیب کے ساتھ بگھی میں' نرم جھولا نما نشست پر لا بٹھایا اور چلے۔

لڑکی کو لپیٹ میں لیے ہوئے بازو کی گرفت اب ڈھیلی پڑ گئی تھی اور دونوں جس خوف کے ابھی کچھ دیر پہلے اسیر ہوئے تھے' وہ خواب و خیال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عجب خود سپردگی کے عالم میں ہوا کے دوش پر تھے اور تیز ہوا میں ان کے اوپر کو اٹھے ہوئے نرم کالروں میں' آدھے چھپے ہوئے نیم خوابیدہ آنکھوں والے مطمئن چہرے دائیں بائیں جھول رہے تھے۔

ایک جگہ بگھی دھیرے دھیرے رکتی گئی اور انہوں نے جانا کہ جیسے ایک ٹھہرے ہوئے غضب ناک پانی کے دھارے کو راہ دی گئی ہو۔ وہ جب باادب خدام کا سہارا لیے' بگھی سے باہر آئے ہیں تو سفری تھیلوں کے بوجھ سے ان کے کندھے آزاد تھے اور ان کے سامنے آہنوس کا پیتل جڑا' دیو ہیکل دروازہ دھیرے دھیرے کھلتا چلا جا رہا تھا اور اس کے اندر کی سمت کھینچتے اور قوسیں بناتے ہوئے زنجیر' غضب ناک پانی کے دھارے کا شور باہر اُگل رہے تھے۔

دروازے کی دونوں چوکیوں پر ٹھہرے ہوئے لیمپ پوسٹ' اپنی زرد لرزتی ہوئی روشنی اُگلتے' بہت نمایاں اور ایک حد تک افسردہ نظر آئے۔

وہ دونوں' ایک بار پھر کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے۔ لڑکے کے بل کھائے ہوئے بازو نے لڑکی کو ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرخ بانات کی وردیوں میں' کمر کے گرد دھاری دار پٹکے لپیٹے ہوئے پستہ قد خدام' ان کے سفری تھیلوں کو احتیاط سے سنبھالے ''رپ رپ'' کرتے ان کے پیچھے چلے آتے تھے۔

استقبالیہ کی نیم روشن محراب تلے' لٹکی ہوئی مونچھوں اور گلوں سے کانوں کی طرف مڑی ہوئی نوکدار قلموں والے میزبان نے جھک کر انہیں خوش آمدید کہا اور ہمراہ ہو لیا۔ وہ راستے میں بچھتا چلا جا رہا تھا اور اُس چرب زبان نے مجال ہے کہ انہیں بات کرنے کا موقع دیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا:

''حضور' یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کا موقع ہاتھ آیا۔ پرتگالی' ولندیزی' فرانسیسی اور انگریز سبھی ہمارے سر آنکھوں پر' اور عرب ریاستوں کے شیخ تو ہمارے بھائی بند ہیں...... حضور خاطر جمع رکھیے......''

اس وقت وہ ڈھلی ہوئی سرخ اینٹوں والی راہداریوں پہ چل رہے تھے اور ان کے دونوں اطراف میں' کھلے تالابوں کے شفاف پانی میں درختوں کا گہرا عکس کانپ رہا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا ملائے چلے جا رہے تھے اور سامنے' بچھتا ہوا میزبان:

''بندہ پرور! ہمیں یقین ہے کہ مغل سرائے کا شہرہ سن کر ہی آپ چلے ہوں گے۔ یقیناً آپ نے جو کچھ سنا' وہ الف سے یے تک درست ہے' یہاں سرائے کے مہمانوں کو روائتی مغل رکھ رکھاؤ کے ساتھ ٹھہرایا جاتا ہے اور اب کیا عرض کروں' عنقریب آپ خود کمال مہربان ہوں گے اور ہماری خدمات کے معترف بھی......''

گیندے کے پھولوں اور بنفشے کے دور تک پھیلے تختوں کو عبور کر کے وہ چیڑھ کے چھوٹے دروازوں والی قطار کے ساتھ ہو لیے۔ پھر تنگ غلام گردشوں کا مرحلہ آیا۔ یہاں ہر دس قدم پر دروازوں کے ساتھ سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی مشالوں کا دھواں نیچی چھت پر سیاہی کا لیپ کر رہا تھا۔ وہ احتیاط سے جھکے جھکے میزبان کے پیچھے چلتے رہے' پھر وہ ایک جگہ رکا اور ایک زنگ آلود تالے کو کھولتے ہوئے سامنے سے ہٹ کر ادب سے جھکا' تب ان کے سامنے ایک دروازہ مُہیب چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ پھر وہ لپک جھپک اندر گیا اور آتش دان کو روشن کر آیا۔ وہ دونوں دروازے میں کھڑے تھے اور ملازمین ان کے سفری تھیلے کمرے میں ایک طرف رکھ کر کب کے جا چکے تھے۔ پھر میزبان نے جھک کر اجازت

چاہی اور رفتہ رفتہ آتش دان میں چٹختی ہوئی لکڑیوں اور اُڑتے ہوئے شراروں کی مدھم روشنی میں اندر کا ماحول واضح ہوتا چلا گیا۔

ان کے سامنے نیچی چھت کے نیم روشن کمرے میں بھاری پلنگ کے سرہانے آتش دان کے عین اوپر دو ہلالی تلواریں ٹمیالے رنگ کے ڈھال کے آر پار ٹھہری ہوئی تھیں۔ کمرے میں دیواروں سے سہمے ہوئے ہرن اور بارہ سنگھے بس کمرے میں نکلا ہی چاہتے تھے۔ پھر جانے کہاں سے جھک کر آداب بجالاتی' لچکتی ہوئی دو کنیزیں برآمد ہوئیں' دروازے میں سہما ہوا جوڑا جڑ کر کھڑا تھا۔ وہ آئیں اور لڑکی کو سہارا دیتی ہوئی بغلی دروازے میں غائب ہو گئیں۔ لڑکا ہمت کر کے ان کے پیچھے چلا لیکن اس کے پاؤں نیچے بچھے ہوئے قالین میں دھنستے چلے جا رہے تھے اور وہ بڑی مشکل میں تھا' جانے کیوں اُس پر غنودگی غلبہ پانے لگی اور وہ لڑکھڑا سا گیا۔ جب اُسے ہوش آیا ہے تو اس نے دیکھا کہ اس کی ساتھی لڑکی' کوئی مغل شہزادی ہے' جو بڑے پلنگ پر اطلس و کمخواب میں ماہتاب کی طرح کھلی ہوئی ہے۔ اس لمحے وہ نیم غنودگی میں بغلی کمرے سے ہوتا ہوا دو نازک اندام کنیزوں کے بازوؤں میں لپٹا لپٹایا آگے بڑھ رہا تھا۔

اور وہ خود جیسے کوئی مغل شہزادہ' ڈھاکے کی ململ پر سنہری صدری اور کمر کے گرد پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ ٹھیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالے ہوئے تھا۔ جس کے دستے پر ریشمی پھندنا اُس کے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جھول رہا تھا۔

وہ نیم غنودگی میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس نے تخلیہ چاہا تھا۔ کمرے میں اب صرف مور چھل ہلاتی ہوئی دو کنیزیں رہ گئی تھیں اور شاید پلنگ پر نیم دراز مغل شہزادی نے کوئی فرمائش کر دی تھی۔ ایسے میں بغلی کمرے سے کوئی ایک وجود' بہت گہرا گھونگھٹ نکالے ہوئے ظاہر ہوا تھا اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ چاندی کی اونچی سماوار' جس کے نیچے آگ دہک رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے قرینے سے سجا کر پلٹ گیا تھا۔

وہ لڑکا جیسے کوئی مغل شہزادہ' بغیر کچھ کھائے پیئے پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اس کی آنکھیں مُندھتی چلی گئیں۔ شاید کچھ دیر وہ سویا بھی ہوگا' اس اثناء میں برابر سے اٹھ کر اس کی ساتھی لڑکی...... مغل شہزادی نے کمرے کا چکر لیا اور پائیں باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی میں ٹھہری رہی۔

پھر جیسے جیسے رات بیت رہی تھی' نیچے دور تک نکل گئے گھنے درختوں میں عجب طرح کی غُراہٹوں کا شور ابھرتا چلا گیا۔ درختوں سے بھرا مار کر چڑیاں اور کوّے شور کرتے ہوئے آسمان کی طرف اٹھنے لگے۔

شور بڑھ رہا تھا۔ باہر چاندنی میں راہداریوں کے ساتھ ساتھ تھوہر کی اونچی اونچی دیواریں' گھاس کے تختوں پر ٹھہری ہوئی سنگ مرمر کی کرسیاں اور کاسنی پھولوں سے گندھی بنفشے کی موئی تھیں سب رفتہ رفتہ ماند پڑ گئیں اور ہر سمت سے بڑھتا' کروٹیں لیتا ہوا' پاگل کر دینے والا شور ہر طرف بھر گیا۔

لڑکی گھبراہٹ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی تھی' یہاں تک کہ کمرے میں میزبان کی آواز گونجی:

''حضور بے فکر رہیئے۔ یہ شور خود کردہ ہے اور محض آپ کی تفنن طبع کی خاطر۔ اس وقت ہمارے تنخواہ دار ملازمین کی ٹولیاں پائیں باغ کے کونے کھدروں میں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی ملی جلی آوازیں' باہر کے مناظر میں قدرتی رنگ بھرنے کی خاطر ہیں۔ حضور...... نچنت رہیئے......''

میزبان نے لپک کر باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے سامنے ریشمی پردوں کو برابر کر دیا۔

آوازیں مسلسل آ رہی تھیں' جیسے بھیڑیوں کے غول نکل آئے ہوں اور اُنہوں نے سرائے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ البتہ

میزبان کی وضاحت سن کر لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر وہ پائیں باغ کو چلنے کے لیے ضد کرنے لگی۔ لیکن لڑکا تھکا ہوا تھا اور اسے نیند بھی آ رہی تھی۔

یکا یک لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور متجسس نگاہوں کے ساتھ قلانچیں بھرتی ہوئی' کھڑکی سے دوسری طرف کود گئی۔ ایسے میں میزبان اُسے پکارتا رہ گیا' اور وہ گھاس کے نرم تختوں اور کاسنی پھولوں پر بلا خوف وخطر چلتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چُھپے ہوئے تنخواہ دار ملازمین کو پرندوں کی مصنوعی آوازیں پیدا کرتے ہوئے ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھی۔ اوپر درختوں کی شاخوں سے الجھتے ہوئے پرندے اس کے سر پر چکر کھاتے' اس کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے اور وہ اپنے آپ میں مگن مغل سرائے کے پائیں باغ سے ملحقہ گھنے جنگل میں اترتی چلی گئی۔

اندر' سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں لڑکا ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا' اور اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نیند میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کا نام لے کر پکار رہا ہو۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گم سم بیٹھا رہا' پھر اس نے لڑکی کی بابت دریافت کیا۔ اس موقع پر میزبان کو اس نے پہلی بار پریشان دیکھا۔ وہ اپنے کمال تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی چرب زبانی کا بے مثل مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کی کانپتی ٹانگیں اور اس کے چہرے پر کورے لٹھے کے کھلتے ہوئے تھان اور اس کی نمناک آنکھیں اور زبان کی لکنت' سب اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

لڑکا اپنی سنہری صدری پر لپٹے ہوئے پٹکے میں اُڑسا ہوا جڑاؤ ٹھیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کانوں میں پہنے ہوئے سفید مُندرے' گلے کی مالائیں اور جڑاؤ بازوبند وہیں نوچ کر پھینک دیئے' پھر وہ کونے میں رکھی مانند پڑتی ہوئی مشال کو ایک ہاتھ میں تھامے پائیں باغ میں اتر گیا' سرائے کا میزبان اس کے پیچھے گرتا پڑتا چلا آتا تھا۔ پیچھے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور لڑکا سب سے بے نیاز اس کا نام پکارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر صبح کی دھندلاہٹ میں' وہ وہاں تک پہنچ ہی گیا جہاں چکر کھاتے اور اوپر سے جھکی ہوئی شاخوں میں الجھتے ہوئے پرند واویلا کر رہے تھے۔ دفعتاً قریب کی جھاڑیوں سے تیر کی طرح دو سائے نکلے اور جنگل کی ترائی میں گم ہو گئے۔

لڑکا اس کا نام لے کر وہیں جھک گیا تھا' بجھی ہوئی مشال وہیں رہ گئی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت کمر میں مڑے ہوئے خنجر پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

سورج اب دھیرے دھیرے خاصا اوپر اٹھ آیا تھا اور میزبان کہہ رہا تھا:

''حضور' مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ پائیں باغ اور اُس سے ملحقہ علاقے میں جانے کیسے' بیچ بیچ کے بھیڑیئے اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں' مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لیے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہو گی کہ آپ کے نقصان کی تلافی......''

اِدھر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں دبیز سرخ قالین پر دوسنری تھیلے رہ گئے تھے اور ان کے قریب ہی چاندی کی اونچی سماوار' جس کے نیچے راکھ اڑ رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے جُوں کے تُوں قرینے سے سجے رکھے تھے۔

○

اشاریہ: افسانہ نگار اور اُن کے افسانوی مجموعے

آغا بابر: چاک گریباں (اگست 1948ء)، لب گویا (1956ء)، اُڑن طشتریاں (1958ء)، پھول کی کوئی قیمت نہیں (1986ء)۔

آمنہ ابوالحسن: کہانی (1965ء)۔

آمنہ نازلی: ننگے پاؤں۔

ابراہیم جلیس: آزاد غلام، آسمان کے باشندے، چالیس کروڑ بھکاری، زمین جاگ رہی ہے، کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں، اُلٹی قبریں، زرد چہرے، بھوکا ہے بنگال، تکونا دیس۔

ابوضیاء اقبال: دشمن۔

ابوالفضل صدیقی: اہرام (1935ء)، مردلہو کا نوحہ (1960ء)، جوالامکھ (1986ء)، انصاف (1986ء)، آئینہ (1986ء)، ستاروں کی چال (1995ء)، شکنجہ (1999ء)، دن ڈھلے، دفینہ، آخری افسانے۔

احمد جاوید: غیر علامتی کہانی (1983ء)، چڑیا گھر (1996ء)۔

احمد داؤد: مفتوح ہوائیں (جون 1980ء)، دشمن دار آدمی، خواب فروش (1996ء)

احمد شجاع حکیم: حُسن کی قیمت۔

احمد شریف: حویلی سے کھیت تک۔

احمد عباس: ایک لڑکی (1937ء)، محمد علی (1936ء)، زعفران کے پھول (1948ء)، پاؤں میں پھول (1948ء)، میں کون ہوں (1949ء)، دیا جلے ساری رات (1959ء)، گیہوں اور گلاب (1965ء)، نئی دھرتی نئے انسان (1977ء)، نیلی ساری (1982ء)، سونے کے بُت (2001ء)

احمد علی: انگارے (1932ء)، شعلے (1936ء)، ہماری گلی (1942ء)، قید خانہ (جون 1944ء)، موت سے پہلے (1945ء)

احمد ندیم قاسمی: چوپال (1939ء)، بگولے (1941ء)، طلوع و غروب (1941ء)، گرداب (1943ء)، سیلاب (1943ء)، آنچل (1944ء)، آبلے (1946ء)، آس پاس (1948ء)، در و دیوار (1948ء)، سناٹا (1952ء)، بازار حیات

(1955ء)، برگِ حنا (1959ء)، پت جھڑ: افسانے۔ ناولٹ۔ ناول ادھورا (2007ء)۔

احمد ہمیش: مکھی، کہانی مجھے لکھتی ہے۔

احمد یوسف: روشنائی کی کشتیاں، آگ کے ہمسائے، ۲۳ گھنٹے کا شہر۔

اختر انصاری دہلوی: اندھی دنیا اور دوسرے افسانے (1939ء)، نازو اور دوسرے افسانے (1940ء)، خونی اور دوسرے افسانے (1943ء)، لو ایک قصہ سنو (1953ء)، یہ زندگی اور دوسرے افسانے (طبع دوم: 1958ء)

اختر اورینوی: منظر و پس منظر (1940ء)، کلیاں اور کانٹے (1941ء)، انارکلی اور بھول بھلیاں (1944ء)، سیمنٹ اور ڈائنامیٹ (1947ء)، کیچلیاں اور بالِ جبریل (1960ء)، سپنوں کے دیس میں، اختر اورینوی کے افسانے: مرتبہ: ڈاکٹر عبدالمغنی (1977ء)، ایک کاروباری۔

اختر جمال: پھول اور بارود (1967ء)، انگلیاں فگار اپنی (1971ء)، زرد پتوں کا بن (1981ء)، سمجھوتہ ایکسپریس (1990ء)۔

اختر حسین رائے پوری: محبت اور نفرت (1938ء)، آگ اور آنسو (1946ء)، زندگی کا میلہ (1949ء)

اسد محمد خاں: کھڑکی بھر آسمان: افسانے، نظمیں (1982ء)، بُرج خموشاں (1990ء)، غصے کی نئی فصل (1997ء)، نربدا (2003ء)، تیسرے پہر کی کہانیاں (2006ء)

اسلم سراج الدین: سمر سامر (1997ء)

اشرف صبوحی دہلوی: جھروکے (افسانے، خاکے)، غبار کارواں: افسانے، خاکے (1970ء)

اشفاق احمد: ایک محبت سو افسانے (1951ء)، اُجلے پھول (1957ء)، سفر مینا (1983ء)، پھلکاری (1991ء)، صبحانے افسانے (2002ء)

اوپندر ناتھ اشک: نورتن (1930ء)، عورت کی فطرت (1933ء)، ڈاچی (1939ء)، کونپل (1940ء)، پنجم چٹان (1941ء)، ناسور (1943ء)، قفس (1943ء)، کالے صاحب (1956ء)، ٹیرس پر بیٹھی شام (1987ء)، ٹیبل لینڈ (1992ء)

اعجاز راہی: تیسری ہجرت۔

اعظم کریوی: پریم کی چوڑیاں (1943ء)، دُکھ سکھ (1943ء)، شیخ و برہمن (1943ء)، انقلاب اور دوسرے افسانے (1944ء)، کنول اور دوسرے افسانے (1944ء)، رُوپ سنگھار، دل کی باتیں، ہندوستانی افسانے۔

اقبال متین: اُجلی پرچھائیاں (1960ء)، نچا ہُوا البم (1972ء)، خالی پٹاریوں کا مداری (1977ء)، آگہی کے ویرانے (1980ء)، مزبلہ (1988ء)، میں بھی فسانہ تم بھی کہانی (1993ء)، شہر آشوب (2002ء)۔

اقبال مجید: دو بھیگے ہوئے لوگ (1970ء)، ایک حلفیہ بیان (1984ء)، شہر بدنصیب (1997ء)

اکرام اللہ: جنگل۔

الطاف فاطمہ: وہ جسے چاہا گیا، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، تارِ عنکبوت (1990ء)

الیاس احمد گدی: آدمی (1981ء)

اُمت الوحی: شاہد وفا۔

امجد الطاف: کچے دھاگے۔

امجد طفیل: اٹیک شاپ، مچھلیاں شکار کرتی ہیں (2007ء)
امرتا پریتم: ایک تھی انیتا
انتظار حسین: گلی کوچے (1952ء)، کنکری (1955ء)، آخری آدمی (1967ء)، شہر افسوس (1972ء)، کچھوے (1981ء)، خیمے سے دُور (1986ء)، خالی پنجرہ (1993ء)، شہرزاد کے نام (2002ء)۔
انجم عثمانی: شب آشنا (1977ء)، سفر در سفر (1984ء)
انوار احمد: ایک ہی کہانی، پہلے سے سُنی ہوئی کہانی۔
انور زاہدی: عذابِ شہر پناہ، مندروالی گلی (2008ء)
انور سجاد: چوراہا (1964ء)، استعارے (1970ء)، آج (1983ء)، پہلی کہانیاں (1990ء)
انور عظیم: اجنبی فاصلے (1970ء)، قصہ رات کا (1970ء)
انور قمر: چاندنی کے سپرد، چوپال میں سُنا ہوا قصہ۔
اے۔حمید: منزل منزل، خزاں کا گیت، کچھ یادیں کچھ آنسو، مٹی کی مونا لزا۔
بانو قدسیہ: بازگشت، امربیل، کچھ اور نہیں، دانت کا دستہ، ناقابلِ ذکر (1985ء)، دوسرا دروازہ (1999ء)، آتشِ زیرپا (2000ء)، سامانِ وجود (2002ء)، دست بستہ (2003ء)
بشیشر پردیپ: پیاس (1958ء)، کاجل اور دُھواں (1965ء)، پھر سے اجنبی (1973ء)، سوغات (2000ء)
بلراج کومل: آنکھیں اور پاؤں (1981ء)
بلراج مین را: مقتل (2007ء)
بلونت سنگھ: جگا (1943ء)، پہلا پتھر (طبع دوم: 1953ء)، تارو پود (1944ء)، سنہرا دیس، ہندوستان ہمارا (1974ء)، چک پیراں کا جسّا۔
پریم چند: سوزِ وطن (جون 1908ء)، پریم پچیسی (1915ء)، پریم بتیسی (1920ء)، خاکِ پروانہ (1928ء)، خواب و خیال (1928ء)، فردوسِ خیال (1929ء)، پریم چالیسی: دو جلدیں (1930ء)، آخری تحفہ (1934ء)، زادِ راہ (1936ء)، نجات (1936ء)، دودھ کی قیمت (1937ء)، واردات (1937ء)، دیہات کے افسانے (1939ء)، جیل (1940ء)۔
تسنیم سلیم چھتاری: کسک (1941ء)، رقصِ شرر کے بعد۔
تقی حسین خسرو: کوندے (1978ء)، آتے جاتے (1982ء)، منظر اک بلندی پر (1987ء)۔
جلیل قدوائی: سیرِ گل (1927ء)، اصنامِ خیالی (1933ء)
جمیلہ ہاشمی: آپ بیتی جگ بیتی (1969ء)، اپنا اپنا جہنم (1983ء)، رنگ بھوم (1987ء)
جوگندر پال: دھرتی کا کال (1961ء)، میں کیوں سوچوں (1962ء)، رسائی (1969ء)، مٹی کا اِدراک (1970ء)، سلوٹیں (1975ء)، لیکن (1977ء)، بےمحاورہ (1978ء)، بےارادہ (1981ء)، کتھانگر (1997ء)، کھلا۔
جیلانی بانو: روشنی کے مینار (1958ء)، نروان (1964ء)، پرایا گھر (1979ء)، رات کے مسافر (1979ء)، روز کا قصہ

(1987ء)، بات پھولوں کی (2001ء)

حامد اللہ افسر: چار چاند (1917ء)، ڈالی کا جوگ (1927ء)، آنکھ کا نور (1932ء)، پرچھائیاں (1943ء)۔

حامد علی خاں، مولانا: افسونہائے عشق

حسن منظر: رہائی (1981ء)، ندیدی (1982ء)، انسان کا دیش (1991ء)، خاک کا رُتبہ۔

حسن نظامی، خواجہ: غدر دہلی کے افسانے: آٹھ جلدیں (1922ء۔1914ء)، جگ بیتی (1917ء)، مرزا مغل کی بیٹی۔

حسین الحق: پس پردۂ شب، صُورتِ حال، مطلع، سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ۔

حیات اللہ انصاری: انوکھی مصیبت (1938ء)، بھرے بازار میں (1942ء)، شکستہ کنگورے (1944ء)۔

خاتون اکرم: گلستانِ خاتون، پیکرِ وفا، پھلجڑی۔

خالد جاوید: بُرے موسم میں (اگست 2000ء)، تفریح کی ایک دوپہر۔

خالدہ حسین: پہچان (1980ء)، دروازہ (1984ء)، مصروف عورت (1989ء)، ہیں خواب میں ہنوز (1995ء)، میں یہاں ہوں (2005ء)

خان فضل الرحمٰن: ادھ کھایا امرود (1956ء)، ورش رین (1984ء)۔

خدیجہ مستور: کھیل، بوچھار، چند روز اور، تھکے ہارے، ٹھنڈا میٹھا پانی۔

خورشید، اداکارہ/افسانہ نگار: آبشار

دیویندر اسر: گیت اور انگارے (1952ء)، شیشوں کا مسیحا (1955ء)، کینوس کا صحرا (1983ء)

ذکاء الرحمٰن: درد آئے گا دبے پاؤں، میں اور زمین (1987)، خوابِ سنگین (فروری 1991ء)

راجندر سنگھ بیدی: دانہ و دام (1939ء)، گرہن (1942ء)، کوکھ جلی (1949ء)، اپنے دُکھ مجھے دے دو (1965ء)، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (1974ء)، لمبی لڑکی، مکتی بودھ، لاجونتی۔

راحت آرا بیگم: پریمی، بانسری، غنچہ۔

راشد الخیری: سات رُوحوں کے اعمال نامے: افسانے/مضامین (1917ء)، گوہرِ مقصود (1918ء)، سرابِ مغرب (فروری 1918ء)، جوہرِ عصمت (جنوری 1920ء)، قطراتِ اشک (1921ء)، سوکن کا جلاپا (1921ء)، ستونتی (1926ء)، منازلِ ترقی (1927ء)، بچہ کا کُرتہ (1927ء)، امین کا دمِ واپسیں (1927ء)، گلدستۂ عید: افسانے/مضامین (1927ء)، سیلابِ اشک (1928ء)، قلبِ حزیں: افسانے/مضامین (1928ء)، طوفانِ اشک (1929ء)، تمغۂ شیطانی (1929ء)، مہدِ مغرب: افسانے/مضامین (1929ء)، تفسیرِ عصمت (1929ء)، ولایتی منعمی (نومبر 1929ء)، نسوانی زندگی (1931ء)، سودائے نقد (1932ء)، چہار عالم (1935ء)، دادا لال بجھکو (1935ء)، گردابِ حیات (1936ء)، بساطِ حیات (1937ء)، سُسکی ہوئی چیناں (1937ء)، خُدائی راج (1938ء)۔

رام لعل: آئینے (1941ء)، انقلاب آنے تک (1949ء)، نئی دھرتی پُرانے گیت (1958ء)، گلی گلی (1960ء)، آواز تو پہچانو (1963ء)، اکھڑے ہوئے لوگ (1972ء)، گزرتے لمحوں کی چاپ (1974ء)، معصوم آنکھوں کا بھرم (1978ء)، ڈوبتا اُبھرتا آدمی (1988ء)، ایک اور دن کو پرنام (1990ء)

رتن سنگھ: پہلی آواز، پنجرے کا آدمی، کاٹھ کا گھوڑا، پناہ گاہیں۔

رحمان مذنب: پگلی جان (طبع دوم: 2002ء)، بالا خانہ، رام پیاری، خوشبودار عورتیں (2002ء)، پنجرے کے پنچھی (2004ء)۔

رُخسانہ صولت: گیلے حرف۔

رشید امجد: بیزار آدم کے بیٹے (1974ء)، ریت پر گرفت (1978ء)، سہ پہر میں خزاں (1980ء)، پت جھڑ میں خود کلامی (1984ء)، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے (1988ء)، عکس بے خیال (1993ء)، دشت خواب (1993ء)، کاغذ کی فصیل (1993ء)، گم شدہ آواز کی دستک (1996ء)، ست رنگے پرندے کے تعاقب میں (2002ء)، ایک عام آدمی کا خواب (2002ء)

رشید جہاں: عورت اور دوسرے افسانے (1937ء)، شعلۂ جوالہ، مرتبہ: سعید الظفر (1968ء)، وہ اور دوسرے افسانے (1977ء)۔

رضیہ سجاد ظہیر: اللہ کی مرضی، رنگ روتے ہیں، زرد گلاب، اللہ دے بندہ لے۔

رضیہ فصیح احمد: آنکھ مچولی، درد کے افسانے، دو پاٹن کے بیچ، بارش کا آخری قطرہ۔

زاہدہ حنا: قیدی سانس لیتا ہے (1983ء)، راہ میں اجل ہے (1993ء)

ساجدہ رشید: ریت گھڑی (1981ء)، نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی (1990ء)، ایک چھوٹا سا جہنم (2004ء)

ست پرکاش سنگر: آشا دیپ بجھے نا

سیتا رتھی، دیویندر: نئے دیوتا (1943ء)، اور بانسری بجتی رہی (1946ء)

عیش بترا: ویران بہاریں (1960ء)، بوند بوند ساگر (1962ء)، آڑی ترچھی لکیریں (1978ء)، اُڑتے لمحے (1982ء)

سجاد حیدر یلدرم: خیالستان (فروری 1911ء)، حکایات و احساسات (1926ء)، حکایت لیلیٰ مجنوں۔

سحاب قزلباش: بدلیاں

سُدرشن، مہاشہ: چندن (1920ء)، سدا بہار پھول (1921ء)، قوس قزح (1921ء)، آزمائش اور دیگر افسانے، بہارستان (1925ء)، صبح وطن، پارس (1926ء)، چشم و چراغ (1928ء)، طائرِ خیال (1930ء)

سراج الدین ظفر: آئینے (1943ء)

سریندر پرکاش: دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم (جنوری 1968ء) برف پر مکالمہ (1981ء)، بازگوئی (1989ء)، حاضر حال جاری (2003ء)

سعیدہ اختر: ستارے

سعیدہ بزمی: حجاب

سعید عبدل: پرچھائیاں

سلام بن رزاق: ننگی دوپہر کا سپاہی

سلطان حیدر جوش: صبر کی دیوی، مساوات، اتفاقاتِ زمانہ (1914ء)، فسانہ جوش (1926ء)، جوشِ فکر

سلیم اختر: کڑوے بادام (1988ء)، کاٹھ کی عورتیں (1989ء)، مٹھی بھر سانپ (1992ء)، چالیس منٹ کی عورت

(1994ء)، آدھی رات کی مخلوق (1999ء)، نرگس اور کیکٹس: افسانے/ناولٹ (2005ء)

سیج آہوجا: جہنم جمع میں، طلسم دہشت (2003ء)، قید در قید، بڑی دل آسمان (2004ء)

سہیل عظیم آبادی: الاؤ، تین تصویریں، چار چہرے۔

سید رفیق حسین: آئینہ حیرت (1944ء)

سید انور: آگ کی آغوش میں، سورج بھی تماشائی، منزل کی طرف۔

سید فیاض محمود: بے رنگ و بُو (1940ء)، پھول اور کانٹے

سید محمد اشرف: بادِ صبا کا انتظار

سیدہ حنا: جھوٹی کہانیاں، پتھر کی سل

شائستہ اکرام: کوشش ناتمام

شردن کمار ورما: گرتے ہوئے درخت

شفق: کٹی ہوئی زمین، کانچ کا بازیگر

شفیق الرحمٰن: کرنیں (1942ء)، لہریں (1943ء)، مدوجزر (1944ء)، پرواز (1945ء)، پچھتاوے (1946ء) حماقتیں (1947ء)، مزید حماقتیں (1954ء)

شکیلہ اختر: درپن (1943ء)، لہو کے مول، آنکھ مچولی (1947ء)، ڈائن (1956ء)، آگ اور پتھر (1967ء)، آخری سلام

شمس آغا: اندھیرے کے جگنو

شمشیر سنگھ نرولا: جالے (1946ء)

شوکت تھانوی: نورتن، گرگٹ، موٹر کی کانٹے، ہم زلف، مسکراہٹیں، سیلاب تبسم، طوفانِ تبسم، کچھ کچھ، قاعدہ بے قاعدہ، نمک مرچ، سودیشی ریل۔

شوکت صدیقی: تیسرا آدمی (1952ء)، رات کی آنکھیں، راتوں کا شہر، کوکا بیلی، کیمیا گر، اندھیرا اور اندھیرا۔

شیر محمد اختر: ننگا پاؤں، سائے بھنور، بادلوں میں

صادق الخیری: بنتِ قمر، دھنک، سفینے، منجدھار، یا حبیبی، شمع انجمن۔

صادق حسین: پھولوں کے محل (1963ء)، شہر اندر شہر (1988ء)

صالحہ عابد حسین: بات چیت (1927ء)، نقشِ اول (1939ء)، تین چہرے تین آوازیں، سازِ ہستی (1946ء)، نو نگے، نراس میں آس (1948ء)

صدیقہ بیگم سیوہاروی: ہچکیاں، دودھ اور خون، پلکوں میں آنسو، ٹھیکرے کی مانگ، درد کے آنسو، رقصِ بسمل، آنکھ مچولی۔

صدیق عالم: آخری چھاؤں (1982ء)، لیمپ جلانے والے (2008ء)

صلاح الدین اکبر: البم اور سائے، پتھر اور آنسو

ضمیر الدین احمد: سوکھے ساون، پہلی موت

طارق چھتاری: باغ کا دروازہ

طارق محمود: سہ حدّہ (1984ء)، آخری چال (1988ء)، بند دروازہ (1996ء)

ظہورالحق شیخ: تلخوابیاں (1992ء)

عابد سہیل: سب سے چھوٹا غم (دسمبر 1975ء)، جینے والے (دسمبر 1998ء)

عاشق حسین بٹالوی: سوز ناتمام

عبدالرحمٰن چغتائی: کاجل، لگان

عبدالصمد: بارہ رنگوں والا کمرہ

عرش صدیقی: باہر کفن سے پاؤں، ساعتِ مسترد۔

عزیز احمد: رقصِ ناتمام (1945ء)، بے کار دن بے کار راتیں (دسمبر 1950ء)، خدنگ جستہ (1985ء)، آبِ حیات۔

عصمت چغتائی: کلیاں (1940ء)، چوٹیں (1942ء)، ایک بات (1942ء)، چھوئی موئی (1952ء)، دو ہاتھ (1962ء)، زہر، پہلی لڑکی، خرید لو، لحاف، بدن کی خوشبو (1979ء)، دوزخ، آدمی عورت آدھا خواب، لیڈی کلر، امربیل، یہاں سے وہاں تک (1981ء)

عظیم بیگ چغتائی: قرض مقراض المحبت است، روحِ ظرافت (افسانے/مضامین)

عفراء بخاری: فاصلے (1964ء)، نجات (1999ء)، ریت میں پاؤں (2003ء)، آنکھ اور اندھیرا (جون 2009ء)

علی امام: نہیں

علی تنہا: کئی دنوں کا دن (1985ء)، سورج کے سب لوگ (1998ء)

علی حیدر ملک: بے زمین بے آسمان۔

علی سردار جعفری: منزل

علی عباس حسینی: رفیقِ تنہائی (1942ء)، باسی پھول (1939ء)، آئی سی ایس (1940ء)، میلہ گھومنی، کانٹوں میں پھول، ندیا کنارے (1964ء)، ہمارا گاؤں (1956ء)، یہ کچھ ہنسی نہیں ہے، الجھے دھاگے، ایک حمام میں، سیلاب کی راتیں

عنایت اللہ: منزل منزل دل بھٹکے گا، سوزِ عشق جاگ

عوض سعید: سائے کا سفر (1969ء)، رات والا اجنبی (1977ء)

غلام الثقلین نقوی: بند گلی، شفق کے سائے، نغمہ اور آگ، نگی کا گیت، لمحے کی دیوار۔

غلام عباس: آنندی (1948ء)، جاڑے کی چاندنی (جولائی 1960ء)، کن رس (دسمبر 1969ء)، زندگی نقاب چہرہ: کلیات (1984ء)

غیاث احمد گدی: بابا لوگ (1969ء)، پرندہ پکڑنے والی گاڑی (1977ء)، سارا دن دھوپ (1985ء)

فضل حق قریشی: آج کے افسانے، آج کل کے رومان۔

فہمیدہ اختر: کشمالہ، اپنے دیس میں۔

فیروز عابد: اندھی گلی میں جسم (1981ء)، نقش بر آب (1985ء)

قاسم محمود سید: قاسم کی مہندی

قاضی عبدالستار: پیتل کا گھنٹہ (1964ء)، آئینۂ ایام: مرتبہ: ڈاکٹر محمد غیاث الدین (1995ء)

قاضی عبدالغفار:	لیلیٰ کے خطوط، عجیب، مجنوں کی ڈائری، تین پیسے کی چھوکری
قدرت اللہ شہاب:	نفسانے (1950ء)، ماں جی (1968ء)، سرخ فیتہ
قرۃ العین حیدر:	ستاروں سے آگے (1947ء)، شیشے کے گھر (1954ء)، پت جھڑ کی آواز (1966ء)، فصلِ گل آئی یا اجل آئی (1968ء)، روشنی کی رفتار (1982ء)، جہاں پھول کھلتے ہیں، جگنوؤں کی دنیا (1990ء)، تلاش، یاد کی اک دھنک جلے، میرے بہترین افسانے۔
قمر احسن:	آگ، الاؤ، صحرا۔
قمر عباس ندیم:	شیشے کی آبرو۔
کرتار سنگھ دُگل:	اِک کرن چاند کی، تل چھٹ۔
کرشن چندر:	طلسم خیال (1937ء)، نظارے (جون 1940ء)، زندگی کے موڑ پر (1943ء)، نئے افسانے (1943ء)، پُرانے خدا (1944ء)، ٹوٹے ہوئے تارے (1947ء)، ہم وحشی ہیں (1947ء)، اجنتا سے آگے (1948ء)، تین غنڈے (1948ء)، ایک گرجا ایک خندق (1948ء)، نغمے کی موت (1953ء)، مینا بازار (1953ء)، کشمیر کی کہانیاں (1954ء)، یوکلپٹس کی ڈالی (1955ء)، ایک روپیہ ایک پھول (1955ء)، کتاب کا کفن (1956ء)، مزاحیہ افسانے (1957ء)، ان داتا (1959ء)، دل کسی کا دوست نہیں (1959ء)، شکست کے بعد (1960ء)، سپنوں کے قیدی (1961ء)، میں انتظار کروں گا، نئے غلام (1965ء)، ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی، پانی کا درخت، تاش کا کھیل، درد کی نہر، دشتِ خیال، دوسری برف باری کے بعد، سپنوں کی راہ گزر میں، شانو، کاک ٹیل، کالا سورج، کبوتر کے خط، گھونگھٹ میں چلے گوری، ہم تو محبت کرے گا، پھول کی تنہائی، کانچ کے ٹکڑے، طوفان کی کلیاں، الٹا درخت، کھڑکیاں، کالے کوس، دوسری برف باری سے پہلے، آدھے گھنٹے کا خدا۔
کشمیری لال ذاکر:	اک کرن روشنی کی، جب کشمیر جل رہا تھا، ذاکر کی تین کہانیاں، اُداس شام کے آخری لمحے۔
کلام حیدری:	بے نام گلیاں (1955ء)، صفر (1974ء)، الف لام میم (1979ء)
کمار پاشی:	پہلے آسمان کا زوال
کوثر چاند پوری:	دلگداز افسانے (1928ء)، ہنی مون اور دوسرے افسانے، دلچسپ افسانے، شعلۂ سنگ (1963ء)، رنگین سپنے، عورتوں کے افسانے (1937ء)، دنیا کی حُور (1938ء)، اشک و شرر، مسکراہٹیں، نوک جھونک، جامِ جم (1941ء)، شعلۂ سنگ (1963ء)، رات کا سورج (1976ء)، آوازوں کی صلیب (1978ء)۔
ل۔ احمد اکبر آبادی:	انشائے لطیف (افسانے/مضامین)
مانک ٹالہ:	پیاسی بیل۔
مجنوں گورکھ پوری:	سمن پوش (1934ء)، ہتیا اور دوسرے افسانے (1935ء)، مجنوں کے افسانے (1938ء)، خواب و خیال (1942ء)، نقشِ ناہید (1942ء)، سرنوشت (1944ء)، سراب (1945ء)، زیدی کا حشر (1946ء)۔
محشر عابدی:	محشرستاں۔
محمد احسن فاروقی:	افسانہ کر دیا۔

محمد حسن عسکری: جزیرے (1943ء)، قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے (1947ء)

محمد خالد اختر: کھویا ہوا افق (1968ء)، لالٹین اور دوسرے افسانے (1997ء)، چچا عبدالباقی کی کہانیاں (1985ء)۔

محمد عاصم بٹ: اشتہار آدمی، دستک (2009ء)

محمد علی ردولوی: گناہ کا خوف، کشکول محمد شاہ فقیر، نادر کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ کشکول، مرتبہ: سید علی کاظم (1980ء)

محمد عمر میمن: تاریک گلی (1990ء)

محمد مجیب، پروفیسر: کیمیا گر اور دوسرے افسانے (1932ء)

محمود احمد قاضی: ہوا (1979ء)، ٹھہرا ہوا موسم (1995ء)

محمود شکیل: ٹکڑے ٹوٹے دل کے

مدھوسودن: اُجالے سے پہلے

مرزا حامد بیگ: گمشدہ کلمات (یکم جنوری 1981ء)، تار پر چلنے والی (1984ء)، گناہ کی مزدوری (1991ء)، حمیدہ کی کہانی (1992ء)، جانکی بائی کی عرضی۔

مستنصر حسین تارڑ: سیاہ آنکھ میں تصویر

مسز عبدالقادر: لاشوں کا شہر (1936ء)، صدائے جرس (1939ء)، راہبہ اور دوسرے افسانے (1946ء)، وادی قاف اور دوسرے افسانے (1954ء)

مسعود اشعر: آنکھوں پر دونوں ہاتھ (1975ء)، سارے فسانے (افسانوی کلیات)، اپنا گھر (2004ء)

مشتاق قمر: لہو اور مٹی، معتوب شہر

مشرف احمد: جب شہر نہیں بولتے (1986ء)

مظہر الاسلام: گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو۔

مظہر الزماں خاں: ہارا ہوا پرندہ (1979ء)

مقصود الٰہی شیخ: برف کے آنسو۔

مُلا رموزی: صبح لطافت، زندگی (افسانے/مضامین)، مضامین رموزی (افسانے/مضامین)

ممتاز شیریں: اپنی نگریا، میگھ ملہار

ممتاز مفتی: ان کہی (1943ء)، گہما گہمی (1944ء)، چپ (1947ء)، اسمارائیں (1953ء)، گڑیا گھر (1965ء)، روغنی پتلے (1984ء)، سے کا بندھن (1986ء)، کہی نہ جائے (1992ء)

منٹو، سعادت حسن: آتش پارے (1936ء)، منٹو کے افسانے (1940ء)، دُھواں (1941ء)، افسانے اور ڈرامے (1942ء)، لذت سنگ (1947ء)، سیاہ حاشیے (1948ء)، پھندے (1948ء)، ٹھنڈا گوشت (1950ء)، خالی بوتلیں خالی ڈبے (1950ء)، نمرود کی خدائی (1950ء)، بادشاہت کا خاتمہ (1951ء)، یزید (نومبر 1951ء)، سڑک کے کنارے (1953ء)، سرکنڈوں کے پیچھے (اکتوبر 1954ء)، پھندنے (جنوری 1955ء)، بغیر اجازت (1955ء)، بُرقعے (1955ء)، شکاری عورتیں (1955ء)، رتی ماشہ اور تولہ (1955ء)، بیس غیر مطبوعہ کہانیاں (1952ء)، لاؤڈ اسپیکر:

افسانے/مضامین (1955ء)، تلخ ترش شیریں (افسانے/مضامین)

منشا یاد: بند مٹھی میں جگنو (1975ء)، ماس اور مٹی (1980ء)، خلا اندر خلا (1983ء)، درخت آدمی (1991ء)، دُور کی آواز (1998ء)، تماشا (1998ء)، خواب سرائے (2005ء)

منیر احمد شیخ: لمحے کی بات

منیر الدین احمد: زرد ستارہ (1988ء)، شجر ممنوعہ (1991ء)، بہشت حرام (1999ء)، بچھڑی ہوئی کونج (2001ء)، لافانی عشق (2008ء)

مہندر ناتھ: چاندی کے تار، یہاں سے وہاں تک، نئی بیماری۔

میرزا ادیب: ان داتا (1935ء)، صحرا نورد کے خطوط (جولائی 1940ء)، دنیائے آرزو (1941ء)، صحرا نورد کے رُومان (1942ء)، بے کسی (1944ء)، موت کا تحفہ (1944ء)، دیواریں (1947ء)، جنگل (1952ء)، لاوا (1947ء)، کمبل (اکتوبر 1957ء)، حسرت تعمیر (1979ء)، ساتواں چراغ (1983ء)، صحرا نورد کا نیا خط (1960ء)، گلی گلی کہانیاں (1987ء)، کرنوں سے بندھے ہاتھ (1991ء)، غلاموں کی بغاوت، موت کا راگ۔

میرزا ریاض: آندھی میں صدا، بے آب سمندر۔

ناصر بغدادی: بے شناخت (1990ء)، مغلوب (2004ء)

نجم الحسن رضوی: چشم تماشا

نجمہ انوار الحق: پھول کی زبانی

نیاز فتح پوری: ایک شاعر کا انجام (1913ء)، نگارستان (1929ء)، نقاب اٹھ جانے کے بعد (1942ء)، جمالستان (1933ء)، حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے، مختارات نیاز (افسانے/مضامین)، شہاب کی سرگزشت، شبستان کا قطرۂ گوہریں، قربان گاہ حسن، کیوپڈ وسائیکی۔

نیر مسعود: سیمیا (1984ء)، عطر کافور (1993ء)، طاؤس چمن کی مینا (1997ء)، گنجفہ (2008ء)۔

واجدہ تبسم: توبہ توبہ، شہر ممنوع، اُترن، آیا بسنت سکھی، نتھ اُترائی، محبت، آئینے کے سامنے (1978ء)، روزی کا سوال، کیسے سمجھاؤں، جیسے دریا (1970ء)، میرے بہترین افسانے، کنگن محل (1971ء)، پوجا کا مان، پھول کھلنے دو، زخم دل

ہاجرہ مسرور: چرکے (1944ء)، ہائے اللہ (1946ء)، چوری چھپے، اندھیرے اُجالے، تیسری منزل، چاند کی دوسری طرف۔

ہرچرن چاولہ: عکس آئینے کے (1975ء)، ریت سمندر اور جھاگ (1980ء)۔

ہنس راج رہبر: اپنا افق، ہم لوگ، اب اور تب

یوسف چودھری: تیسری دنیا کے چاند (1992ء)

یوسف حسن، حکیم: سوسائٹی کے گناہ، دوشیزہ

یونس جاوید: تیز ہوا کا شور، آوازیں، میں ایک زندہ عورت ہوں (2004ء)

O



ممتاز افسانہ نگار اور صاحبِ نظر نقاد مرزا حامد بیگ (تمغۂ امتیاز) کی کتاب ''اُردو افسانے کی روایت'' (۹۱۰۳ء۔۲۰۰۹ء) اُردو افسانے کا صد سالہ انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اُردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ، جس میں اُردو کے پہلے افسانے کی واضح نشاندہی کرنے اور اُردو کے اوّلین افسانوں اور افسانہ نگاروں کا جامع تعارف کروانے کے ساتھ رسمی اور اکتسابی تحقیق وتنقید کی اُڑائی ہوئی گرد کو صاف کر کے بہت سے جینوئن افسانہ نگاروں کی پہچان ممکن بنائی گئی ہے۔

داستان اور قصوں سے افسانے تک کے عبوری دور، نیز ادبی تحاریک اور موضوعی حوالوں سے مختلف ادوار قائم کر کے افسانوں کے جائزہ کے ساتھ شاملِ انتخاب افسانہ نگاروں کی سینیارٹی کا تعین اُن کے اوّلین مطبوعہ افسانوں کے سالِ اشاعت کے حوالے سے کر دیا گیا ہے۔

شاملِ انتخاب افسانہ نگاروں کے سوانحی خاکوں میں مصدقہ تاریخ پیدائش و دفیات ناموں، تعلیمی کوائف، اوّلین تحریروں اور اوّلین مطبوعہ افسانوں کی نشاندہی، اعزازت کی تفصیل، تصاویر، عکسِ تحریر، آٹو گراف اور نظریہ فن کی شمولیت نے ''اُردو افسانے کی رویت'' کو انسائیکلو پیڈیائی وقار سے ہمکنار کر دیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۱ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا تھا۔ گزشتہ اٹھارہ برس میں کئی افسانہ نگار رخصت ہوئے، کئی ایک نے اپنی شناخت مستحکم کی اور اُن کا نیا کام سامنے آیا۔ یوں بہت سے اضافاجات کے ساتھ اب اس کتاب کا Revised Edition پیش کیا جا رہا ہے، اس احساسِ افتخار کے ساتھ کہ اس کتاب میں شامل افسانہ نگاروں سے متعلق کوائف و افسانہ نگاروں سے براہِ راست یا افسانہ نگاروں کے متعلقین سے حاصل کردہ ہیں۔ نیز ان حاصل کردہ معلومات کو دستاویزی سطح پر بھی جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو افسانہ نگاروں سے متعلق پوری دنیا میں ریسرچ اسکالرز اور ناقدین اس حوالہ جاتی دستویز میں فراہم کردہ معلومات پر بھروسہ کرتے ہیں۔



AALMI MEDIA PVT LTD.

1/1,Kirti Appartments, Mayur Vihar, Phase-1, Delhi-110091

Mob.: 09717474307

E-mail : rehmanbey@gmail.com

0/-